آسان تفسیر قرآن مجید

حصہ اول

نام کتاب : آسان تفسیر قرآن مجید
مؤلف : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات : ۸۷۴
سن اشاعت : ربیع الاول ۱۴۳۶ھ، جنوری ۲۰۱۵ء
تعداد اشاعت : ایک ہزار (۱۰۰۰)
کمپیوٹر کتابت : محمد نصیر عالم سبیلی (العالم اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد، فون نمبر: 9959897621 91+)

باہتمام

المعھد العالی الاسلامی حیدرآباد انڈیا

ناشر

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، حیدرآباد۔
- بیت الحمد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد۔
- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)۔
- دکن ٹریڈرس، نزد مغلپورہ پانی کی ٹنکی، حیدرآباد۔
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، حیدرآباد۔

آسان تفسیر

قرآن مجید

آسان وسلیس اُردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح، جس میں مستند احادیث کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے، انبیاء اور ان کی اقوام سے متعلق واقعات کے ذیل میں دعوتی نکات اور سبق آموز پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، قرآن مجید سے مستنبط ہونے والے شرعی احکام اور خاص کر جدید مسائل پر توجہ دی گئی ہے، اہل مغرب کی جانب سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے اور عصر حاضر کے غیر اسلامی اور نادرست افکار ونظریات کے بارے میں قرآن مجید کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے۔

حصہ اول

(الفاتحہ ـــــ الکہف)

از

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ (الإسراء:۹)

یقیناً یہ قرآن سب سے سیدھے راستے کی رہنمائی کرتا ہے اور ان ایمان والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں، بڑے اجر کی خوشخبری سناتا ہے۔

فہرست مضامین

○ ○ ○

تقدیم

برائے آسان تفسیر قرآن مجید

از : فقیہ الاسلام مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تقبل اللہ خدماتہ الثمینۃ للعلم والعلماء والمسلمین!

مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی اپنی دینی، تحقیقی اور تصنیفی اہم خدمات کی وجہ سے ملت کے اربابِ علم میں اپنی ایک قابل اعتماد پہچان پیدا فرما چکے ہیں، اس کے پیش نظر ترجمہ وتفسیر قرآن کریم میں مولانا موصوف نے اپنی اس علمی وقیع پہچان کو مکمل دیانت وامانت کے ساتھ برقرار رکھنے کے لئے جس قدر احتیاط کو ملحوظ رکھا ہوگا، وہ ان کے مسلّم علم ودیانت کے تحت کسی تحقیق وتفتیش کی ضرورت مند نہیں ہے۔

مولانا نے جس پرداز پر آیاتِ قرآنی کی تشریح فرمائی ہے، اس میں تفسیر کے درج ذیل اساسی اُصولوں کو بحمد اللہ بطور خاص پیش نظر رکھا ہے، جس نے کتاب کو تمام تر شبہات سے مبرا کرکے مکمل طور پر قابل اعتماد اور لائق استفادہ بنادیا ہے۔

- تفسیر قرآن مجید میں اصل اول یہ ہے کہ ترجمہ میں قرآن کریم کے ہر لفظ کے حقیقی معنی لئے جائیں؛ لیکن اگر کسی اہم شرعی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو اس صورت میں توسعاً مجاز متعارف معنی بھی لئے جاسکتے ہیں۔
- دوسرا اُصول یہ ہے کہ مفہوم کلام کو شاہدین وحی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے تائید بھی حاصل ہو۔
- تیسرا اُصول یہ ہے کہ ترجمہ وتشریح میں کوئی چیز نصوصِ ظاہرہ شرعیہ کے قطعاً برخلاف نہ ہو۔

ان تینوں اُصولوں میں سے اگر اصل کہیں ملحوظ نہ رہے تو وہ تاویل ’ تاویل قریب‘ ہوگی اور اگر اصل اول ودوم کی رعایت نہ ہو تو وہ تاویل ’ تاویل بعید‘ ہوگی، یہ دونوں تاویلات مفہوم ومراد کے اعتبار کو ساقط نہیں کریں گی؛ البتہ اگر تینوں ہی اُصولوں سے تعبیر منحرف ہو تو وہ تفسیر نہیں؛ بلکہ تحریف قرار دی جائے گی —— پس ان تینوں اُصولوں کی رعایت رکھنے کی صورت میں تفسیر وتشریح قرآن کریم صحیح، معتبر ومعتمد اور مستند قرار دی جائے گی، پیش نظر ترجمہ وتشریح کے تفصیلی اور مکمل مطالعہ کا موقع تو بہ تقاضائے عمر وغیر معمولی ضعف اور تسلسل علالت کی وجہ سے مکمل میسر نہ آسکا؛ لیکن جہاں تک بھی مطالعہ ممکن ہوا، اس میں ان ہی مذکورہ اُصول ثلاثہ کی پوری رعایت ملحوظ نظر آئی۔

عصر حاضر میں فکری آزادی کے نام پر بے راہ روی کے پیش نظر قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے چند باتیں مشورۃً عرض کردینے میں کوئی مانع چوں کہ نظر نہیں آتا؛ اس لئے عرض ہے کہ :

○ قرآن کریم اس مکمل ترین نظامِ حیات پر مشتمل ہے، جو اللہ رب العزت کی جانب سے عالمگیر نبی ورسول محمد ﷺ کو بصورت قرآن کریم عطا فرمایا گیا ہے — بوجہ حفاظت خداوندی — اللہ تعالیٰ کی یہ آخری کتاب انسانی دست بُرد سے محفوظ دنیا کی واحد کتاب ہے، جس کا اپنے عہدِ آغاز ہی کی طرح تمام عظیم خصوصیات اور کیفیات کے ساتھ قیامت تک باقی رہنا ضروری ہے اور کتبِ سابقہ کی طرح اس کے تحفظ کا ذمہ دار صرف مخاطب قوم ہی کو قرار نہیں دیا گیا؛ بلکہ حق تعالیٰ خود اس کے محافظ بنے؛ لیکن ساتھ ہی عملی بنیاد پر مخاطب اُمتِ اسلامیہ کو بھی خدمتِ تحفظ میں شریک فرمایا گیا، جس کی حدیث نبوی ﷺ میں یہ وضاحتیں موجود ہیں :

ان اللہ یبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لها دینها۔ (حدیث)

یعنی حضرات مجددین انسان کی جدت پسند فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف دلائل میں تجدید کرتے ہیں، مسائل میں نہیں۔

نیز ارشاد ہے :

یحمل هذا العلم من کل خلف عدو له ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین۔

یہ تحریف انتحال اور تاویل انسان کی فطری جدت پسندی سے پیدا ہوتی ہے۔

○ اسی کے ساتھ نہایت قابل لحاظ چیز یہ بھی ہے کہ وقت کے ساتھ ارتقا پذیر انسانی تہذیب وتمدن کے پیدا کردہ نئے افکار و نئے رجحانات مسلَّم حقائق کے برخلاف نئے اعتراضات اور نئی تلبیسات کی تولید کا ذریعہ بنتے ہیں، جن کی نوعی کثرت کو جمود و جحود کے دو عنوانوں سے یاد کیا جاسکتا ہے۔

پس تشریح قرآن میں اس خصوصیت قرآنی کو بھی پیش نظر رکھنا شارح کی اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ تشریح قرآن میں جمود و جحود کو قطعاً دراندازنہ ہونے دیں، تعلیماتِ قرآن کریم میں انسانوں کے بے شمار تہذیبی اور تمدنی فکری ارتقا کا تحمل نہ کرنا وہ تنگ نظری ہے کہ جو اسلام کی عالمگیر تعلیمات کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسلام کی عالمگیری کے برخلاف 'جمود' غیر اسلامی جزئیت پسندی کا نام ہے — اور 'جحود' فکری، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی، ارتقائی تبدیلیوں کا شرعی گنجائشوں کے باوجود ساتھ نہ دے سکنے سے عبارت ہے اور اسلام کے ان سے بے تعلق ہونے کے غیر معقول فکر وخیال کا نام ہے، ان دونوں سے دامن کش ہو کر ہی اسلام کی آفاقیت جلوہ ریز ہوسکتی ہے

اور وہ یہی انسانیت نواز نظام کا قانون 'اسلام' ہے، بہ الفاظ دیگر جمود وجحود قرآن کریم کی آفاقیت کے نافی بن کر قاری کو قرآن کی عطا کردہ انسانیت عظمیٰ کی راہ سے بھٹکانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں، گویا جمود وجحود سے بے اعتنائی برت کر ہی قرآنی ہدایات کے مطابق فطری تہذیب سے انسانیت کو آراستگی حاصل ہوسکتی ہے اور اللہ کے نازل فرمودہ اس نظام قرآنی کی یہی دو اساسی خصوصیت ہے کہ جس کی کوئی نظیر بلا استثناء نہ اقوام عالم کے مذاہب میں موجود ہے اور نہ افکار انسانی میں۔

○ بالفاظِ دیگر جمود وجحود وتعلیماتِ اسلام کی وہ دو مخالف قوتیں ہیں کہ ان کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ کتاب وسنت سے ماخوذ عقائد میں، عبادات میں، معاشرات میں، معیشات میں اور معاملات میں جتنے فتنے اور بدراہیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ تمام کی تمام ان ہی جمود وجحود کے بطون سے پیدا ہوئی ہیں؛ کیوں کہ ان نام نہاد علماء نے ان ہی کو بنیاد بنایا ہے کہ جن کا نہ علم میں استناد صحیح ہے اور نہ تربیت میں انتساب معتبر ہے، یہی نام نہاد علماء اپنے غیر عالمانہ خودساختہ وقار کو بے علم یا کم علم مسلمانوں میں برقرار رکھنے کے لئے جمود وجحود سے زیادہ کسی چیز کو موٴثر نہیں پاتے اور وہ ان کے لئے دین کے نام پر اپنی خودساختہ رسوم کو عباداتی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، جو بدعات کا سرچشمہ بن جاتی ہیں اور ان کو جاہل عوام دین کی حیثیت سے قبول کر لیتے ہیں، اس کے دفاع کی واحد صورت صرف یہی نہیں ہے کہ تشریحات قرآن مجید کی تاویل میں جمود وجحود سے کلی اجتناب برتا جائے؛ بلکہ ان علماء سوء کے دینِ صحیح سے محروم رکھنے کا ذریعہ بننے کی حیثیت کو بھی واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا جائے۔

پیش نظر تفسیر وترجمہ قرآن میں جمود وجحود کا عنوان اختیار کئے بغیر ان سے پیدا ہونے والے عقائد واعمال فاسدہ کا الحمدللہ مدلل سدباب موجود ہے، جس سے یقین ہے کہ اس کی افادیت علماء ہی میں نہیں؛ بلکہ عوام میں بھی بڑے وسیع پیمانے پر ہوگی، حق تعالیٰ اس خدمتِ عظیمہ کو قبول ومقبول فرمائے اور شارح محترم کے لئے اس کو زادِ آخرت فرمائے، آمین یارب العالمین۔

(حضرت مولانا) **محمد سالم قاسمی** (دامت برکاتہم)
(مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند)

۲ر محرم ۱۴۳۵ھ
۷ر نومبر ۲۰۱۳ء

○ ○ ○

پیش لفظ

الحمد لله رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسوله الکریم ، سیدنا محمد واٰله وأصحابه اجمعین ، أمابعد۔

بچپن سے یہ مقولہ ''لیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد''(۱) برابر پڑھنے اور سننے میں آتا رہا اور اس کے مصادیق سے بھی گوش و بینا آشنا ہوتے رہے، اس دور میں احقر کا خیال ہے کہ اس مقولہ کا مصداق بڑی حد تک ہمارے صدیق محترم فاضل گرامی مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ بھی ہیں ، یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ وہ اس عصر کے ممتاز ترین فقیہ اور عظیم مصنف و مفتی ہیں، جن کے فتاویٰ کثیر جلدوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں اور وہ مجمع الفقہ الاسلامی الہندی کے سب سے اعلیٰ منصب (جنرل سکریٹری) پر فائز ہیں ، نیز رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے قائم کردہ ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کے رکن بنائے گئے ہیں اور اپنی خوبیوں اور فقہی بصیرت کی وجہ سے عالَم کے بہت سے حصوں میں بلائے جاتے ہیں ؛ لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ آں محترم قرآن مجید کی تفسیر کے بھی ذوق آشنا ہیں بلکہ اس کی مہارت رکھتے ہیں ؛ چنانچہ زیر نظر مجموعہ ''آسان تفسیر'' اس کا شاہد عدل ہے، جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی نظر و فکر کا محور صرف علم فقہ ہی نہیں رہا ؛ بلکہ علم تفسیر بھی رہا ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کے افادات وافاضات میں مزید تقویت و ترقی عطا فرمائے اور ان کے نفع کو عام و تام کرے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

جیسا کہ مشہور ہے ہر پچاس سال اور پچاس میل کے بعد زبان میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آجاتی ہے، یہی بات قرآن مجید کے اُردو تفسیر و تراجم میں بھی کم وبیش پائی جاتی ہے ؛ چنانچہ اب سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کا شاہ عبد القادر دہلوی رحمہ اللہ کا اُردو ترجمہ قرآن مجید جسے اپنے زمانے میں ''ہست قرآن درزبان اُردوی''(۲) کہا جاتا تھا، وہ بھی کچھ عرصہ بعد اُردو دانوں کے لئے بہت سے مقامات پر سمجھ سے بالاتر ہوگیا ؛ چنانچہ اس کے ایک صدی سے بھی زائد بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ نے اس کی تسہیل کی اور اس کی زبان کو اپنے زمانے کے

(۱) ''اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت سے بعید نہیں کہ ایک شخص میں سارے عالم کی خوبیاں جمع کردے''۔

(۲) ''اصل مقولہ بزبان ''عسکری'' ہے، عسکر لشکر کو کہتے ہیں، اُردو زبان کو عسکری اس لئے کہا گیا کہ اس کی بنیاد لشکر میں پڑی تھی''۔

مطابق بنانے کی کوشش کی ؛ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس میں بھی کہنگی کے آثار ظاہر ہونے لگے ، تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے ترجمہ اور تفسیر کی ، پھر اسی کو سامنے رکھ کر بہت سے علماء نے (جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ بھی ہیں) تسہیل اور تیسیر کی خدمت انجام دی ، اب اسے بھی نصف صدی سے زائد عرصہ گزر گیا ، تو پھر علماء عصر کو زمانہ حال کے مطابق تفسیر و ترجمہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ؛ چنانچہ کچھ ہی عرصہ پہلے محقق عصر حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے پاکستان میں یہ خدمت انجام دی اور تقریباً وہی خدمت ہندوستان میں ہمارے محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دام ظلہم ومدت فیوضہم بجالائے ، **فجزاهم الله أحسن الجزاء**۔

موصوف نے اپنے ترجمہ اور تفسیر میں تمام متداول معتبر علماء کی تفاسیر و تراجم کو سامنے رکھ کر ؛ بلکہ ان کا عطر کشید کر کے یہ سعادت حاصل کی ہے — تفسیر کے سرورق پر اس طرح کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے : '' آسان اور سلیس اُردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح ، جس میں مستند احادیث کی روشنی میں قرآنی تعلیمات کو واضح کیا گیا ہے ، انبیاء اور ان کی اقوام سے متعلق واقعات کے ذیل میں دعوتی نکات اور سبق آموز پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ، قرآن مجید سے مستنبط ہونے والے شرعی احکام اور خاص کر جدید مسائل پر توجہ دی گئی ہے ، اہل مغرب کی جانب سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے اور عصر حاضر کے غیر اسلامی اور نادرست افکار ونظریات کے بارے میں قرآن مجید کے موقف کی وضاحت کی گئی ہے '' — یہ تعارف '' قامتِ موزوں پر چست قبا '' کے مصداق ہے ، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط ؛ بلکہ جو کچھ لکھا ہے ، یہ تفسیر اس کا کامل نمونہ ہے ۔

یہ تفسیر اور ترجمہ فی الحال صرف '' سورۂ کہف '' کے اخیر تک ہے ؛ لیکن خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ جلد ہی مکمل ہو کر ناظرین کی تشفی و تسکین اور قرآن فہمی میں آسانی پیدا کرنے والی ثابت ہوگی ، اللہ تعالیٰ سے دُعاء ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ نافع اور مقبول بنائے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مصنف کو تادیر صحت وسلامتی کے ساتھ رکھے ۔

ایں دُعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

(حضرت مولانا) محمد برہان الدین سنبھلی (مدظلہ العالی)
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

۲۹ / ذیقعدہ ۱۴۳۴ھ
۶ / اکتوبر ۲۰۱۳ء

○ ○ ○

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے!

تمام تعریفیں اس مالک کائنات کے لئے ،جس نے کائنات کی یہ بستی بسائی ،نوع بنوع پھولوں اور پھلوں کا دستر خوان چنا،سورج اور چاند کے چراغ جلائے ،آسمان کی جبین ناز کو ستاروں سے سجایا،حضرت انسان کو یہ شرف بخشا کہ انھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا اور کتاب ربانی کا حامل بنایا گیا،جس کی شفقت ومحبت ستر ماؤں سے بڑھ کر ہے،اور جس کی رحمت بے پناہ اور حدِ شمار سے باہر ہے۔

لاکھوں درود وسلام ہو اس نبی عربی اُمی ﷺ پر،جن کے نورِ عالم تاب سے کائنات کے ذرہ ذرہ تک ہدایت کی روشنی پہنچی ،جس کو مخلوقاتِ عالم پر فضیلت کا تاجِ گہر بار پہنایا گیا،جس کے ذریعہ علم وحکمت کا گلِ سدا بہار انسانیت کو عطا ہوا اور جس نے ظلم وجور کی آگ میں جھلستی ،بلکتی اور سسکتی ہوئی انسانیت کو امن وآشتی ،عدل ومساوات اور تکریم انسانیت کا آبِ حیات پلایا۔

اس حقیر پر اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار احسانات ہیں،ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے طویل عرصہ سے اسلامی علوم کی تدریس کی سعادت حاصل ہے اور درسِ نظامی کی مروجہ کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو،جو اس نے نہیں پڑھائی ہو، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''رحمتِ عالم'' سے اس حقیر کا تدریسی سفر شروع ہوا اور اسے صحیح بخاری اور پھر مختلف شعبوں کے تخصصات میں شامل کتابوں تک کا درس دینے کا شرف حاصل ہوا،اس دوران جن چند کتابوں کو بار بار پڑھانے کا موقع ملا اور جسے اندرونی چاہت اور قلبی رغبت کے ساتھ پڑھایا،ان میں ترجمۂ قرآن مجید اور جلالین شریف بھی ہے، خاص کر ان دونوں مضامین کا 'نصف اول' سالہا سال تک پڑھانے کی سعادت حاصل رہی ،جن طلبہ نے اس حقیر سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا ہے،وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ آپ قرآن مجید کا ترجمہ کردیں؛لیکن میں نے اِسے اُن کی طفلانہ خواہش پر محمول کیا اور کبھی خیال بھی نہ آیا کہ یہ سعادت میرے حصہ میں آئے گی۔

۱۴۱۹ھ کی بات ہے کہ ایک صاحبِ نسبت بزرگ (جن کی وفات ہوچکی ہے) سے تعلق رکھنے والے ایک صاحبِ ذوق مصنف نے مجھ سے بہ اصرار اور بار بار خواہش کی کہ قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر حواشی اس حقیر کے قلم سے آجائے ،جو ایک ہی جلد میں ہو؛کیوں کہ آج کل تفصیلی تفسیریں پڑھنے کا مزاج کم ہوتا جارہا ہے اور لوگ مختصر کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں،ان کے اصرار اور اس اصرار پر بار بار کی تاکید اور یاددہانی کی وجہ سے بالآخر میں نے ہمت کرلی اور تبرکاً

یکم رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کو عصر کے بعد دُعاء کر کے اس کام کو شروع کیا؛ چنانچہ ۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ کو پہلے پارہ کا ترجمہ مع حواشی مکمل ہوا، اور ماہِ مبارک کے اختتام تک پوری سورۂ بقرہ کا؛ لیکن کام شروع کرنے کے باوجود طبیعت میں برابر تردد سا رہا، استخارہ بھی کرتا رہا؛ یہاں تک کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اس حقیر نے اعتکاف کے دوران خواب میں دیکھا کہ وہ گڑ کا ایک بڑا ڈھیلا اپنے ہاتھ میں تھامے ہوا ہے اور حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب مظاہری دامت برکاتہم کو پیش کر رہا ہے، حضرت قاری صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ہی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، انھوں نے ہمارے ہاتھ سے لے کر یہ گڑ حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کو پیش فرمادیا، اور انھوں نے خوشی کا اظہار کر کے مسکراتے ہوئے اسے قبول فرمالیا، اس سے میں نے یہ تعبیر لی کہ یہ 'گڑ' جو اپنی مٹھاس کی وجہ سے مرغوب ہوتا ہے، سے مراد قرآن مجید کی یہ خدمت ہے، قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کا اس کو قبول کرنا گویا اہل سنت والجماعت کے افکار کی صحیح ترجمانی کی توثیق ہے اور حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمہ اللہ کا اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر پیش کرنا اللہ کے نیک بندوں کی بارگاہ میں اس کاوش کی قبولیت اور پذیرائی ہے؛ چنانچہ اس کے بعد اس کام کے سلسلہ میں طبیعت میں انشراح پیدا ہوگیا، جب حضرت قاری صاحب دامت برکاتہم رحمہ اللہ سے اپنا خواب نقل کیا تو انھوں نے بھی اس خیال کی تصدیق وتوثیق فرمائی، (۱) اب دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے۔

اگر یہ کام تسلسل کے ساتھ ہوتا رہتا تو کب کا مکمل ہو چکا ہوتا؛ لیکن مشاغل کی کثرت، مختلف اداروں کی انتظامی ذمہ داریاں، درمیان میں آنے والے علمی کام اور تدریسی اشغال کی وجہ سے یا تو میں اس کام کو حرمین شریفین کے سفر کے درمیان کرتا، یا رمضان المبارک اور خاص کر اس کے آخری عشرہ میں اعتکاف کے دوران؛ اسی لئے اس کام میں غیر معمولی تاخیر ہوتی چلی گئی، جب 'المعہد العالی الاسلامی' نے طے کیا کہ مورخہ: ۲-۴؍ربیع الاول ۱۴۳۲ھ مطابق: ۶-۸؍فروری ۲۰۱۱ء کو 'بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار' رکھا جائے تو اسی زمانہ میں پاکستان کے ایک عالم دین کا جو وہاں کی کسی دینی جامعہ میں استاذ حدیث ہیں، خط آیا کہ میں نے آپ کی ''قاموس الفقہ'' کا مطالعہ کیا ہے؛ اس لئے اللہ نے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپ کو لکھوں کہ مختصر حواشی کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ آپ کے قلم سے ہوجائے، انشاء اللہ یہ اُمت کے لئے نافع ہوگا……، ان دونوں محرکات کی وجہ سے ارادہ ہوا کہ جتنا کام ہو چکا ہے، اس کو طبع کردیا جائے؛ چنانچہ سورۂ فاتحہ اور قرآن مجید کی ابتدائی سات طویل سورتوں یعنی اعراف کے ختم تک کا ترجمہ اور مختصر حواشی اس وقت شائع کئے جارہے ہیں، اس حقیر کی نظر میں اس سے دو فائدوں کی توقع ہے، ایک یہ کہ قارئین اس میں جو کمی محسوس کریں گے، اس سے مطلع کریں گے تو آئندہ کام میں اس کو ملحوظ رکھا جاسکے گا، اور جو حصہ شائع ہورہا ہے، آئندہ ایڈیشن میں اس کی بھی تصحیح کردی جائے گی، دوسرے جب کسی کتاب کا کچھ

---

(۱) افسوس کہ مؤرخہ ۲۳؍ربیع الاول ۱۴۳۳ھ کو حضرت قاری امیر حسن صاحب رحمہ اللہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

حصہ چھپ جاتا ہے تو لوگوں کی طرف سے اس کی تکمیل کا تقاضہ ہوتا ہے اور اس تقاضہ سے کام کو انجام تک پہنچانے کی تحریک پیدا ہوتی ہے، اس حقیر کی تالیف ''قاموس الفقہ'' میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے، شاید اس طرح یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

ارادہ تھا کہ اس ترجمہ کے ساتھ ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا جائے، جس میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب اور مختلف عہد میں ہونے والی تفسیری خدمات، نیز تفسیر کے اُصول وقواعد کا اختصار اور جامعیت کے ساتھ ذکر ہو جائے؛ لیکن اِس وقت ہجوم کار کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ہے، انشاء اللہ جب یہ کام مکمل ہوگا، اس وقت کوشش کی جائے گی کہ اِس ارادہ کی بھی تکمیل ہو جائے۔(۱)

البتہ اس موقع پر اُن چند اُمور کا تذکرہ مناسب ہے، جن کو اس حقیر نے ترجمہ اور حواشی میں ملحوظ رکھا ہے، ترجمہ میں جن باتوں کی رعایت کی گئی ہے، وہ یہ ہیں :

♦ اس حقیر کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کا ترجمہ رواں، سلیس اور عام فہم زبان میں ہو جائے اور ایک حد تک زبان و بیان کی چاشنی بھی برقرار رہے، ہمارے بزرگوں کے جو ترجمے موجود ہیں، وہ نہایت عمدہ اور بصیرت افروز ہیں؛ لیکن عربی زبان کے علاوہ تمام زبانوں میں ادب کے معیارات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں اور محاورات واصطلاحات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں اُردو زبان بھی شامل ہے؛ اس لئے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ بعض اُردو تراجم کے الفاظ مشکل ہیں یا ان میں زبان و بیان کی خوبصورتی نہیں ہے؛ حالاں کہ یہ ترجمہ کی خامی نہیں ہوتی؛ بلکہ وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ زبان میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا اثر ہے؛ لہٰذا لوگوں کی سہولت کے لئے ضروری ہے کہ جیسے جیسے زبان اور اس کے ادب میں تبدیلی آئے، قرآن مجید کے ایسے ترجمے کئے جائیں، جن میں اس عہد کے ذوق کی رعایت ہو، یہی اس کاوش کا اصل محرک ہے!

♦ میں نے کوشش کی ہے کہ عمومی طور پر یہ ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ، شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ، شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ترجمہ سے باہر نہ جائے؛ البتہ الفاظ کی تسہیل اور زبان و بیان میں موجودہ اُسلوبِ تحریر کی رعایت رکھی جائے، اس حقیر کو بہت بعد میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ کا ترجمہ ملا، جو پہلے ''کشف الرحمٰن'' کے نام سے چھپا تھا اور آج کل ہندوستان میں ناپید ہے، یہ ترجمہ سہل اور عام فہم ہونے کے اعتبار سے امتیازی شان کا حامل ہے؛ چنانچہ اخیر کے حصہ میں اس ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جہاں کہیں ترجمہ میں اہل علم کو تردد ہو سکتا تھا، وہاں ہم نے اپنے ترجمہ کا ماخذ بھی لکھ دیا تھا؛ بعد کو یہ حواشی حذف کر دیئے گئے؛

(۱) بحمد اللہ اس نئے ایڈیشن میں یہ مقدمہ شامل اشاعت ہے۔

کیوں کہ عوام کو اس کا سمجھنا دشوار ہوتا؛ البتہ کہیں کہیں اب بھی اس طرح کی وضاحت موجود ہے (۱)؛ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ راقم الحروف نے صرف انھیں تراجم قرآنی کے مطالعہ پر اکتفا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان کے اکثر ترجمے پیشِ نظر رہے ہیں، حسبِ موقع ان سے فائدہ بھی اُٹھایا گیا ہے اور ان سب کی قدر ومنزلت اس حقیر کے دل میں ہے ـــــ **فجزاهم الله خير الجزاء** ـــــ نیز ان عربی کتب تفسیر اور کتب لغت کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو الفاظ قرآنی کو حل کرنے میں معاون ہیں۔

♦ ترجمہ کے درمیان یوں تو تمام ہی مترجمین کے کام کی عظمت اور ان کی محنت وکاوش کا اندازہ ہوا؛ لیکن محسوس ہوا کہ خاص طور پر مولانا تھانوی رحمہ اللہ کا ترجمہ غیر معمولی تفکر پر مبنی ہے اور ایک ایک لفظ کا ناپ تول کر ترجمہ کیا گیا ہے، صلات کی رعایت اور صرفی لحاظ سے ابواب کی خصوصیات کا لحاظ وغیرہ بھی قدم قدم پر ملحوظ ہے، اسی بنا پر بعد کے مترجمین خاص کر مولانا عبدالماجد دریابادی، اور بعض دوسرے اہل علم اور اصحابِ نظر نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بمقابلہ دوسرے مترجمین کے ایک گونہ جدید اور زیادہ بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور گذشتہ مترجمین کے ترجمہ پر قناعت کا راستہ اختیار نہیں کیا ہے، جو اُن کے مقام اور شان کے عین مطابق ہے، اس موقع پر ترجمے سے بعض نمونے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

- ← ''مِنْ قَبْلُ'' (انعام:۸۴): پہلے زمانہ میں۔
- ← ''كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ'' (انعام:۱۰۵): ہم اس طور پر دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں۔
- ← ''وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ'' (انفال:۲۱): حالاں کہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔
- ← ''فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ'' (توبہ:۱۸): تو ایسے لوگوں کی نسبت توقع ہے کہ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔
- ← ''اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ'' (توبہ:۴۶): اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو۔
- ← ''فِتْنَةً'' (یونس:۸۵): تختۂ مشق۔
- ← ''قِبْلَةً'' (یونس:۸۷): نماز پڑھنے کی جگہ۔
- ← ''لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ'' (رعد:۳۸): ہر زمانہ کے مناسب خاص خاص احکام ہوتے ہیں۔

---

(۱) اس نئے ایڈیشن (۱۴۳۵ھ) میں یہ بچے کھچے حواشی بھی دو چار مقامات کے علاوہ حذف کردیئے گئے ہیں؛ کیوں کہ عوام ان کو سمجھنے میں دشواری محسوس کریں گے اور اہل علم دوسرے تراجم اور عربی واُردو کی کتبِ تفسیر سے رُجوع کریں گے تو انشاء اللہ ترجمہ کا ماخذ سمجھ جائیں گے۔

← ''الرُّءْیَا'' (بنی اسرائیل:۶۰): تماشا۔

← ''وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا'' (بنی اسرائیل:۸۲): ظالموں کو اس سے اور اُلٹا نقصان بڑھتا ہے۔

← ''فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا'' (کہف:۹۴) کیا ہم لوگ آپ کے لئے چندہ کر کے کچھ رقم جمع کر دیں؟۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ترجمے میں اس طرح کی بہت سی تعبیرات موجود ہیں، جن میں لفظ کے بعینہٖ ترجمہ کے بجائے قرآن مجید کے مفہوم کو ملحوظ رکھا گیا ہے، آپ سے پہلے بھی ترجمہ میں اہل علم اس کی رعایت کرتے رہے ہیں کہ پڑھنے والے کو قرآن کا مقصد سمجھ میں آجائے، چاہے ظاہری الفاظ سے کسی قدر ہٹی ہوئی تعبیر ہو، جیسے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے ''لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ'' (یوسف:۱۱۱) کا ترجمہ کیا ہے: ''البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے، عقل والوں کو'' —— یا جیسے: ''فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا'' (بنی اسرائیل:۱۶) کا ترجمہ: ''اُکھاڑ مارا ہم نے ان کو اُٹھا کر'' مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ کے ترجمہ ''کشف القرآن'' میں بامحاورہ ترجمہ بہ مقابلہ شیخ الہند کے زیادہ ہے، جیسے: ''لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ'' (حجر:۳۹) کا ترجمہ: ''ان سب کو بہاریں دکھلا دوں گا''۔

اس حقیر نے بھی کوشش کی ہے کہ الفاظ قرآنی کے دائرہ میں رہتے ہوئے ترجمہ بامحاورہ اور عام فہم ہو۔

♦ قرآن مجید کے بعض فقرے ایسے ہیں کہ ان کے اُردو ترجمہ کو اصل الفاظ کے دائرہ میں رہتے ہوئے خوبصورت بنایا جاسکتا ہے، جیسے: یحیی و یمیت، ''جِلاتا ہے اور مارتا ہے'' اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے ''وہی زندگی بھی عطا کرتا ہے اور موت سے بھی دوچار کرتا ہے'' یا جیسے ''ھدانی'' اس کا ترجمہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ''ہدایت دی مجھ کو'' اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے ''مجھے ہدایت سے نوازا، یا: ہدایت سے سرفراز کیا'' —— ایسی تعبیرات سے زبان میں روانی اور خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے، ہمارے بزرگوں میں حضرت تھانوی نے اس کو جابجا برتا ہے اور اس حقیر نے بھی اس کی کوشش کی ہے۔

♦ زبان کوئی بھی ہو، وہ فعل، فاعل، مفعول اور فعل کے متعلقات پر مشتمل ہوتی ہے؛ لیکن ہر زبان میں ترتیب الگ ہوتی ہے، جیسے عربی میں پہلے فعل پھر فاعل پھر مفعول پھر اس کے متعلقات ذکر کئے جاتے ہیں؛ لیکن اُردو میں پہلے فاعل، پھر مفعول، اور متعلقاتِ فعل اور آخر میں فعل کا ذکر کیا جاتا ہے، راقم الحروف نے کوشش کی ہے کہ اُردو قواعد کے لحاظ سے کلمات کی جو ترتیب ہونی چاہئے وہ اختیار کی جائے، اس میں یہ اہتمام تو نہیں ہو پاتا ہے کہ قرآن مجید کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ترجمہ آجائے، جیسا کہ شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے —— اور یقیناً اس کی بھی اپنی افادیت ہے —— لیکن یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ لوگ اس کا مفہوم آسانی سے سمجھ سکیں گے اور مانوس ترتیب ہونے کی وجہ سے ان کو پڑھنے میں رغبت ہوگی۔

♦ ہر زبان کا اپنا اپنا اُسلوب ہے، بعض زبانوں میں ایک حرف کا تکرار ناگوارِ خاطر نہیں ہوتا؛ لیکن دوسری زبان

میں اس کا تکرار پسند نہیں کیا جاتا، جیسے حروف عاطفہ کا استعمال ہے، عربی میں اس کا تکرار نامناسب نہیں سمجھا جاتا؛ لیکن اُردو میں قارئین کو اس سے گرانی ہوتی ہے، مثلاً عربی میں کہا جائے ''صلی رشید وحمید وساجد وعابد'' تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ بلکہ یہی طریقۂ تعبیر مروج ہے؛ لیکن اُردو میں اس کو اس طرح کہیں گے ''رشید، حمید، ساجد اور عابد نے نماز پڑھی''، یعنی آخر میں حرفِ عطف ''اور'' کا استعمال ہوگا اور اس سے پہلے کوما پر اکتفاء کیا جائے گا، ترجمہ میں اس حقیر نے اس کو ملحوظ رکھا ہے، مولانا میرٹھی رحمہ اللہ اور مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

♦ بعض اوقات ایک ہی لفظ کی مراد کو اُردو میں ظاہر کرنے کے لئے سیاق وسباق اور قرائن واحوال کے اعتبار سے الگ الگ تعبیر ہوتی ہے، جیسے 'قَالَ' کا معنی ہے: ''کہا'' لیکن قول اگر سوال کرنے والے کی طرف سے ہو تو اس کا ترجمہ ''سوال کیا، یا استفسار کیا، یا دریافت کیا'' بھی ہوسکتا ہے، اگر اس لفظ کی نسبت جواب دینے والے کی طرف ہے تو ''جواب دیا'' بھی کہا جاسکتا ہے، اگر بندہ اپنے رب سے کہہ رہا ہے تو کہا جاسکتا ہے: ''عرض کیا'' اگر رب نے اپنے بندہ سے کہا تو بہتر ترجمہ ہوگا: ''ارشاد فرمایا'' کبھی موقعہ کے لحاظ سے 'کہنے لگا' یا 'بول پڑا' کی بھی تعبیر ہوسکتی ہے۔

اسی طرح ''ما کسب'' یا ''ما اکتسب'' وغیرہ کا ترجمہ سیاق اور قرینہ کے اعتبار سے ''اعمال'' بھی ہوسکتا ہے، ''نیک اعمال'' بھی، ''بداعمال'' بھی، ''کرتوت'' بھی، ''کارستانی'' بھی، غرض کہ اس لفظ کی نسبت جن لوگوں کی طرف ہے، ان کے لحاظ سے مختلف تعبیرات استعمال کرنے کی گنجائش ہے، راقم الحروف نے ترجمہ میں اس پہلو کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔

♦ عربی قواعد کے لحاظ سے کچھ حروف ''حروف مبانی'' کہلاتے ہیں، جو صرف الفاظ کو بنانے اور ان کی ترکیب کے کام آتے ہیں، کچھ وہ ہیں جن کو ''حروف معانی'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ ہوتے تو ہیں حروف؛ لیکن معنی دار ہوتے ہیں، اکثر ان کے معانی ومفاہیم سیاق وسباق سے متعلق ہوتے ہیں: 'ب، ف، علیٰ، اِلیٰ' وغیرہ ایسے ہی حروف میں ہیں، اُردو ترجمہ میں ان کے لئے الگ الگ تعبیر اختیار کی جاتی ہے، جیسے: 'ف' کا ترجمہ ان الفاظ میں ہوسکتا ہے: ''پس، پھر، اس لئے، چنانچہ، کیوں کہ، لہٰذا'' وغیرہ — اسی طرح ''ل'' کو اُردو میں مختلف الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جیسے: ''واسطے، کے لئے، کیوں کہ، چوں کہ، حق، ملکیت'' وغیرہ۔

ترجمہ میں ایسی تعبیرات کو الفاظ قرآنی سے باہر نہیں سمجھنا چاہئے، جیسے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ نے ''فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ'' (یوسف:۱۵) میں ''فـــ'' کا ترجمہ ''آخرکار'' سے کیا ہے: ''آخرکار جب لے کر چلے یوسف کو''، اسی طرح حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے نحل:۰۷ میں ''لِکَیْ'' کا ترجمہ کیا ہے: ''جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ'' اس طرح کے ترجمہ کے بارے میں یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ الفاظ قرآنی سے ہٹ گیا ہے؛ کیوں کہ ان حروف کے معانی زیادہ تر سیاق وسباق کے تابع ہوتے ہیں۔

غرض کہ اس طرح کے جو حروف ہیں، عربی زبان کے ماہرین نے ان کے جو معانی ذکر کئے ہیں، ان سب کو ایک ہی تعبیر میں جمع نہیں کیا جاسکتا، اس کے لئے مناسب حال تعبیر اختیار کی جائے تو پڑھنے والوں کو اس کی حقیقی مراد سمجھ میں آئے گی۔

♦ ہر زبان میں کچھ الفاظ یا فقرے محذوف ہوا کرتے ہیں، جیسے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے شروع میں ''فعل'' محذوف ہے یا ''الرحمٰن الرحیم'' کے درمیان حرف عطف ''و'' محذوف ہے، ضروری نہیں کہ اُردو میں بھی ایسے الفاظ یا فقرہ کو حذف کر دیا جائے؛ لہٰذا ایسی آیات کا اُردو ترجمہ کیا جائے تو ان الفاظ کا بعض مقامات پر ذکر کر دینا ضروری ہوگا اور بعض مقامات پر کم سے کم بہتر ہوگا، بظاہر یہ الفاظِ قرآنی میں تصرف معلوم ہوتا ہے؛ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

♦ عربی زبان میں بعض صیغے یا الفاظ ایسے ہیں، جو ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال رکھتے ہیں، جیسے ''اتقوا'' اس کے معنیٰ 'ڈرو' بھی ہوسکتا ہے، ڈرا کرو، ڈرتے رہو، نیز ''بچو'' بھی، یا جیسے: ''كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ'' (صافات: ۱۱۰) میں اکثر حضرات نے ''محسنین'' کا ترجمہ ''نیک کاروں'' سے کیا ہے؛ لیکن شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے ''احسان کرنے والوں'' سے، یا جیسے: ''يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ'' (انعام: ۱۲۵) کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور بعض دیگر حضرات نے ناپاکی سے کیا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے ''عذاب'' سے۔

اسی طرح عربی میں مضارع کا صیغہ حال کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور مستقبل کے بھی، مستقبل کے واقعات جیسے آخرت کے تذکرہ میں اگر ماضی کا صیغہ استعمال کیا جائے تو بعض دفعہ اس سے مستقبل کا معنیٰ مراد ہوتا ہے اور بعض اوقات گذشتہ واقعات کے ذکر میں مضارع کا صیغہ آتا ہے؛ لیکن اس میں ماضی کا معنیٰ مراد ہوتا ہے، قرائن کے اعتبار سے ماضی کا ترجمہ مستقبل سے اور مضارع کا ترجمہ ماضی سے اہل علم کے یہاں متداول رہا ہے، جیسے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ نے ''نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ'' (اعراف: ۱۰۰) کا ترجمہ کیا ہے: ''ہم نے مہر کردی ہے ان کے دلوں پر، سو وہ نہیں سنتے'' — اسی طرح ''الف، لام'' عربی میں کبھی استغراق کے لئے آتا ہے، کبھی جنس کے لئے اور کبھی عہد کے لئے، مثلاً ''المؤمنون'' کا لفظ ہے، پہلی صورت میں اس کا ترجمہ ہوگا ''تمام اہل ایمان'' دوسری صورت میں ''اہل ایمان'' اور تیسری صورت میں: ''اُن اہل ایمان'' — ایسی صورتوں میں مترجم کی ذمہ داری ہے کہ وہ سیاق وسباق کا خیال رکھتے ہوئے اس کا صحیح مفہوم متعین کرے۔

اسی طرح ''تنوین یعنی دو زبر، دو زیر، دو پیش'' کا معاملہ ہے، یہ ایک حرکت ہے، یہ کبھی تعظیم یعنی کسی چیز کی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے آتی ہے اور کبھی تحقیر یعنی مقدار یا معیار کے اعتبار سے کسی چیز کے چھوٹے ہونے کو ظاہر کرتی ہے، جیسے پہلی صورت میں ''ظلم'' کے معنی ہوں گے: 'بڑا ظلم' یا 'ظلم عظیم' اور دوسرے معنی کے لحاظ سے مثلاً ''شیٔ'' کے معنی ہوں گے

''معمولی چیز'' یا ''تھوڑی چیز'' اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے اگر ظلم کے ترجمہ میں ظلم کے ساتھ 'بڑا' کا لفظ بڑھا دیا جائے، یا ''شیٔ'' کے ترجمہ میں چیز کے ساتھ 'معمولی' کا اضافہ کردیا جائے تو یہ الفاظ سے آزاد ترجمہ نہیں؛ بلکہ الفاظِ قرآنی کے دائرہ میں ہے، اسی میں یہ بھی ہے کہ کبھی اسم فاعل کا ترجمہ مستقبل سے یا بعض اسماء مشتقہ کا ترجمہ فعل سے کردیا جاتا ہے، جیسے ''غفور'' کا ترجمہ ''بخش دیتے ہیں'' یا ''علیم'' کا ترجمہ ''جانتے ہیں'' وغیرہ۔

◆ علماء صَرف نے مختلف ابواب کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، یا مختلف افعال اور اسماء مشتقہ کے جو امتیازات بتائے ہیں، اس سے بھی ترجمہ میں مدد ملتی ہے، جیسے 'تفعل' میں محنت اور تکلف کے ساتھ کسی عمل کو انجام دینے کے معنی ہوتے ہیں، یا جیسے فعل ماضی میں ثبوت اور دوام کے معنی ہوتے ہیں، جیسے: ''إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ '' میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ''إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کے معنی ہیں ''اَلَّذِيْنَ اَثْبَتُوْا عَلَى الْكُفْرِ '' غور کیا جائے تو اس میں وہی ثبوت کے معنی ملحوظ ہیں؛ چنانچہ ایسے مواقع پر اگر ''اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کا ترجمہ کیا جائے: ''جو لوگ کفر پر جم گئے ہیں'' یا ''جو لوگ کفر پر بضد ہیں'' تو یہ اسی مفہوم کی ترجمانی ہوگی۔

اسی قبیل سے یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ '' وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ '' (توبہ: ۷۶) کا ترجمہ کیا ہے: ''وہ تو رُوگردانی کے عادی ہیں'' کیوں کہ اسم فاعل کا صیغہ بعض اوقات مستقبل میں استمرار کو ظاہر کرتا ہے۔

◆ قرآن مجید میں بعض الفاظ مختلف مواقع پر دو مختلف معنوں میں آئے ہیں، جیسے '' آیات'' کہ اس کے معنی نشانیوں کے بھی ہیں، آیات کے بھی ہیں اور احکام کے بھی، یا جیسا کہ اوپر گذرا کہ تقویٰ کے معنی ڈرنے کے بھی ہیں اور بچنے کے بھی، اس طرح کے الفاظ کے ترجموں میں بھی مترجمین کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے؛ لیکن یہ کوئی جوہری اور اساسی اختلاف نہیں ہے، سلسلۂ کلام کو سامنے رکھ کر اس کا معنی متعین ہوگا۔

◆ انبیاء کرام معصوم اور صحابہ مغفور ہیں، ترجمہ میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اگر قرآن مجید کے کسی فقرہ کے مروجہ معنی سے اس سلسلہ میں غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہو تو اس لفظ کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایسی تعبیر اختیار کی جائے کہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، جیسے: ''وَوَجَدَكَ ضَآلاًّ فَهَدٰى'' کا ترجمہ کیا جائے ''اس (اللہ) نے آپ کو ہدایت (وحی) سے محروم پایا تو آپ کو ہدایت (وحی) سے نوازا'' تو اس میں پیغمبر کی طرف اعتقادی یا عملی گناہ کی نسبت نہیں ہوتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم سے سورج چاند، ستاروں سے الوہیت کے سلسلے میں جو گفتگو ہوئی ہے، ہم نے اس کو اسی لئے استفہامیہ فقرہ قرار دیا ہے، اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ''هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا'' کے ترجمہ میں خاص احتیاط برتی گئی ہے۔

◆ اکثر اُردو مترجمین نے اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھنے والے افعال وضمائر کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے، جیسے اللہ معاف کرتا ہے، اے میرے رب تو قبول کر، وغیرہ، غالباً ایسا اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت ''توحید'' کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے؛ لیکن جب اللہ نے خود اپنے لئے 'جمع متکلم' کا صیغہ استعمال کیا ہے، تو اس کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا،

جمع کا صیغہ احترام کے لئے ہے، عربی زبان میں واحد کے صیغہ کو بے ادبی نہیں سمجھا جاتا؛ لیکن اردو زبان میں واحد کے صیغہ، اس یا تو، تم وغیرہ کی ضمیر کو خلافِ ادب سمجھا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''میرے والد آئے'' یا استاذ سے کہا جاتا ہے: ''آپ نے کتاب پڑھائی'' اگر اس کے بجائے کہا جائے: میرا والد آیا، تونے کتاب پڑھائی، تو اُردو محاورہ میں یقیناً اسے خلافِ ادب سمجھا جائے گا؛ اس لئے اس حقیر نے اللہ کی طرف منسوب افعال اور ضمائر میں جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور مخاطب کی ضمیر کا بھی 'تو اور تم' کے بجائے ''آپ'' سے ترجمہ کیا گیا ہے، اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے خطاب کیا ہے، وہاں بھی 'تو' کے بجائے 'آپ' کی تعبیر رکھی گئی ہے، جیسے: ''قُلْ'' کے معنی تو کہہ دے، کی بجائے ''آپ کہہ دیجئے'' وغیرہ۔

♦ ہر زبان میں کلام کے درمیان بعض وضاحتی جملے بھی آجاتے ہیں، ان کو اصطلاح میں 'جملہ معترضہ' کہا جاتا ہے، آج کل جملہ معترضہ کو لکھنے کا طریقہ یہ مروج ہے کہ اس جملہ کے شروع اور آخر میں ڈیش (—) کھینچ دیتے ہیں، اس سے پڑھنے والوں کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے، راقم الحروف نے آیات کے ترجمہ میں آنے والے جملہ معترضہ کو اسی طرح لکھا ہے؛ تاکہ قارئین کو سہولت ہو۔

♦ اُردو زبان میں ہر زبان کی طرح کچھ تحریری رموز ہیں، جیسے سوال اور استفہام کے لئے: ''؟'' وقفہ کے لئے: ''،'' اگر وقفہ ہو لیکن اگلے جملہ سے مربوط ہو تو: ''؛'' اگر بات مکمل ہو رہی ہو تو: ''۔'' اگر کسی کا قول نقل کرنا ہو تو کہی ہوئی بات پر: ''......'' اگر خطاب یا فریاد یا ندا یا اظہار تعجب ہو تو: ''!'' — چنانچہ اس حقیر نے ان علامات کا قرآن مجید کے ترجمہ میں بھی استعمال کیا ہے؛ تاکہ قارئین کو سہولت ہو؛ لیکن متن قرآن مجید میں کسی بھی علامت کے اضافہ سے احتیاط برتی گئی ہے اور قرآن مجید کے جو رموز واوقاف مروج ہیں، ان کے نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

وضاحتی حاشیوں میں جن اُمور کو ملحوظ رکھا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

♦ عام طور پر تفسیر وحدیث اور فقہ کی مستند کتابوں پر اعتماد کیا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ ضعیف اور بے اصل روایات کے ذکر سے بچا جائے، خاص طور پر امام رازی کی ''مفاتیح الغیب''، قرطبی کی ''الجامع لاحکام القرآن''، ''تفسیر ابن کثیر'' اور ''تفسیر بغوی'' سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے؛ لیکن قریب قریب تمام ہی اہم تفسیریں سامنے رہی ہیں، یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ احادیث کو کتب تفسیر کی بجائے کتبِ حدیث سے اور مسائل فقہیہ کو کتبِ فقہ سے نقل کیا جائے؛ البتہ کہیں کہیں اس کا اہتمام نہیں ہو پایا ہے۔

♦ کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ دور کے فکری مسائل کی طرف خصوصیت سے اشارہ کر دیا جائے، آج کی دنیا میں اسلام کے خلاف جو غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں، حسبِ موقع انھیں دور کیا جائے اور مستشرقین کے اعتراضات کا رد کیا جائے۔

♦ احکام سے متعلق آیات کے ذیل میں کوشش کی گئی ہے کہ فقہی مسائل واضح ہوجائیں اور اگر عصر حاضر سے مربوط کوئی فقہی مسئلہ ہوتو اس پر بھی روشنی ڈال دی جائے؛ چوں کہ ہندوستان میں عام طور پر اہل سنت فقہ حنفی کے متبع ہیں؛ اس لئے مسائل 'فقہ حنفی' کے مطابق لکھے گئے ہیں اور فقہاء کے اختلاف پر بحث نہیں کی گئی ہے؛ تاکہ عوام کے لئے تشویش اور ذہنی انتشار کا باعث نہ بن جائے، خدانخواستہ اس کا سبب مسلکی تنگ نظری نہیں ہے، اللہ کا شکر ہے کہ یہ حقیر ان تمام آراء —— جو کتاب وسنت سے ثابت ہوں یا جو سلف صالحین کے اجتہادات کا نتیجہ ہوں —— کو یکساں طور پر قابل احترام سمجھتا ہے؛ البتہ کہیں کہیں بہ تقاضۂ ضرورت اختلاف رائے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اسی طرح اختلافی مسائل میں احناف کا نقطۂ نظر نقل کرتے ہوئے دلائل کے ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے؛ کیوں کہ مختصر حواشی کے لئے یہ بات موزوں نہیں تھی؛ لیکن کچھ لوگ عوام میں غلط فہمی پیدا کرتے ہیں اور کسی رائے کو کتاب وسنت کے یکسر خلاف قرار دیتے ہیں، وہاں وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

♦ دوسرے ادیان ومذاہب کے جو نظریات اسلام سے مختلف ہیں، ان پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی تردید کی گئی ہے، اسی طرح وہ افکار باطلہ جن کے حامل ایسے لوگ ہیں، جو اُمت مسلمہ کے دائرہ میں ہیں، نام لئے بغیر ان کا بھی رد کیا گیا ہے؛ البتہ کوشش کی گئی ہے کہ مثبت لب ولہجہ اور تذکیری اُسلوب ہو، جو لوگ ان کے استدلال سے واقف ہوں، وہ پڑھتے ہوئے محسوس کریں گے کہ اس عبارت میں ان کے اعتراضات کا رد ہے۔

♦ جا بجا احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اس سے دین وشریعت پر انسان کا یقین وایمان بڑھتا ہے، خاص کر ایسے مواقع پر جن کو ملحدین ہدفِ اعتراض بناتے ہیں۔

♦ معجزات کے بارے میں اس حقیر نے سلف صالحین کے طریقہ کے مطابق تاویل وتوجیہ سے اپنا دامن بچایا ہے، جو لوگ معجزات کی تاویل کرتے ہیں، ان کے دل میں کھٹک ہوتی ہے کہ یہ خلافِ عادت اُمور کیسے وجود میں آسکتے ہیں یا یہ اَنہونی باتیں کیسے واقع ہوسکتی ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ممکن اور ناممکن، ہونی اور اَنہونی، موافقِ عادت اور خلافِ عادت مخلوق کے اعتبار سے ہے، خالقِ کائنات کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں اور اس کی کارسازی کسی عادت کی محتاج نہیں، اگر اس حقیقت پر ایمان ہوتو شکوک وشبہات کے سارے کانٹے دل سے نکل جائیں اور ذہن وفکر کی ساری گتھیاں سلجھ جائیں۔

♦ اس بات کو خاص طور پر اس حقیر نے ملحوظ رکھا ہے کہ جہاں پر کوئی ایسا مضمون آیا، جو دعوتِ دین کی اہمیت، دعوت کے طریقۂ کار، داعی کے اوصاف وغیرہ سے متعلق ہوتو اس کے ذیل میں اس پہلو کو واضح کردیا جائے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں فقہی احکام سے متعلق زیادہ سے زیادہ پانچ سو آیات ہیں، جس میں وہ تمام آیات شامل ہیں جن میں صراحتاً یا اشارۃً مسائل شرعیہ آئے ہیں؛ لیکن بقیہ قرآن مجید اصل میں کتابِ دعوت ہے، یا تو اس میں وہ مضامین ہیں جن کی دعوت دی جائے

یا گذشتہ اقوام کو ان کے انبیاء کے دعوت دینے کا ذکر ہے یا دعوت کی اہمیت اور اس کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ اس لئے ایمانیات کے بعد قرآن مجید کی تعلیمات میں زیادہ قابل توجہ دعوتی و اصلاحی مضامین ہیں۔

◆ یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ حواشی میں جو باتیں لکھی جائیں، وہ آسان زبان میں ہوں اور عوام بھی ان سے استفادہ کرسکیں؛ لیکن اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ زبان وادب کے اعتبار سے اصحابِ ذوق کے لئے ناگوارِ خاطر نہ ہوجائے اور عام فہم بنانے کے لئے زبان وادب کے تقاضوں کو بالکل ہی قربان نہ کردیا جائے۔

ترجمہ اوران حواشی کی کمپوزنگ میری دوسری تحریروں کی طرح عزیزی مولانا محمد نصیر عالم سبیلی سلمہ نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ کی ہے، میرے دوسرے عزیز مولانا محمد عبداللہ سلیمان مظاہری نے آیاتِ قرآنی کے ساتھ ترجمہ اور حواشی کی سیٹنگ کی ہے،(۱) حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی بڑی عنایتیں میرے شریکِ حال رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزاء خیر عطا فرمائے، کوشش کی گئی ہے کہ ہر صفحہ کا حاشیہ اسی صفحہ پر آجائے اور اگر اس صفحہ پر پورا نہ ہوتو آئندہ صفحہ پر لیا جائے، نیز اس صفحہ کے حواشی میں صفحہ گذشتہ اور صفحہ موجودہ کے درمیان فرق کرنے کے لئے نصف صفحہ سے کم تک ایک لکیر کھینچ دی گئی ہے؛ تاکہ قارئین کو اندازہ ہوجائے، نیز گذشتہ صفحہ میں بقیہ حواشی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تیر کا نشان "←" کھینچ دیا گیا ہے اور یہی نشان آئندہ صفحہ کے شروع میں بھی ہے؛ تاکہ گذشتہ صفحہ سے اس کا ربط واضح ہوجائے۔

آیات، ترجمہ اور حواشی میں ترتیب یہ اختیار کی گئی ہے کہ صفحہ کی پیشانی پر آیات لکھی گئی ہیں؛ کیوں کہ متن قرآن کے بغیر مجرد ترجمہ اور توضیحات کا لکھنا درست نہیں، اب ایک صورت تو یہ تھی کہ ہر سطر کے نیچے اس کا ترجمہ لکھا جاتا، پھر اگلی سطر لکھی جاتی؛ جیسا کہ عام طور پر قرآن مجید کے ترجمے چھپے ہوئے ہیں؛ لیکن اس میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلسل ترجمہ پڑھنا چاہے تو درمیان میں الفاظ قرآنی والی سطر کے آجانے سے وقفہ پیدا ہوجاتا ہے اور رکاوٹ محسوس ہوتی ہے، دوسرے اگر کوئی شخص باوضوء نہ ہوتو وہ ترجمہ کی سطروں کو ہاتھ لگا سکتا ہے، اگر درمیان میں قرآن مجید کے الفاظ آجائیں تو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

ترجمہ کی سطروں کے بعد نیچے حاشیہ درج کیا گیا ہے، نیز آیت و ترجمہ اور ترجمہ و حواشی کے درمیان لکیریں رکھی گئی ہیں؛ تاکہ امتیاز قائم رہے، اس بات کی بھی رعایت کی گئی ہے کہ اصل ترجمہ کا خط بمقابلہ حواشی کے نمایاں ہو؛ کیوں کہ ترجمہ اصل مقصود ہے، اس کے پڑھنے میں دشواری نہیں ہونی چاہئے، حواشی کا خط بھی نہ بہت باریک ہے اور نہ بہت موٹا؛ تاکہ پڑھنے میں دشواری بھی نہ ہو اور کتاب کا حجم زیادہ بڑھنے بھی نہ پائے۔

---

(۱) اب اس نئے ایڈیشن میں پوری سیٹنگ مولانا محمد نصیر عالم سبیلی (العالم اُردو کمپیوٹرس، حیدرآباد) نے کی ہے۔

اس موقع پر شعبۂ حدیث وفقہ سال دوم کے طلبہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ جابجا ان کے ذریعہ حوالہ جات کی تخریج کرائی گئی، پروف ریڈنگ کا کام بھی زیادہ تر اِن ہی طلبہ نے کیا ہے، نیز چند اچھے حفاظ نے میری خواہش پر آیات کے متن کو دیکھا ہے؛ تاکہ اعراب وغیرہ کی غلطی رہ نہ جائے، اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائیں اور علم نافع وعمل صالح سے نوازیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے زبان وقلم قاصر ہے کہ اس نے اپنی کتاب کی خدمت میں اس گنہگار کو حصہ عطا فرمایا، اب اسی کی بارگاہ میں ملتجی ہوں کہ وہ اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق سے بھی نوازے، قلم کو صواب وسداد پر قائم رکھے اور اِس حقیر کوشش کو اِس گنہگار کے لئے حسن خاتمہ اور آخرت کی نجات کا ذریعہ بنادے، **واللہ ھو المستعان۔**

۹ر صفر المظفر ۱۴۳۲ھ — **خالد سیف اللہ رحمانی**

۱۴ر جنوری ۲۰۱۱ء — (بیت الحمد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد)

اضافہ طبع جدید

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا (۱۴۳۲ھ، ۲۰۱۱ء) میں ترجمہ سورۂ اعراف کے ختم تک طبع ہوا، پھر نومبر ۲۰۱۲ء میں دسویں پارہ کے ختم تک ترجمہ مع حاشیہ زمزم پبلشرز کراچی (پاکستان) نے طبع کیا، عدیم الفرصتی اور مختلف اداروں سے متعلق تنظیمی ذمہ داریاں پہلے بھی کام میں حارج تھیں اور اب بھی ہیں؛ اس لئے زیادہ تر کام شعبان ورمضان المبارک ۱۴۳۴ھ کے دوران ہوا، بہرحال جو بھی ہوا، اللہ کا کرم ہے، اس طرح اب سورۂ کہف کے ختم تک ترجمہ مع حواشی پریس میں جارہا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت سے نوازیں اور اس کی تکمیل کو آسان فرمادیں۔

اس موقع پر راقم الحروف نے پہلے کے مطبوعہ حصہ پر بھی نظرثانی کی ہے، کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطی تھی، اسے درست کیا ہے، اس بات کی کوشش کی گئی کہ ترجمہ میں حسبِ ضرورت بین القوسین ایسی عبارت بڑھادی جائے کہ حواشی پڑھے بغیر بھی صرف ترجمہ پڑھنے سے مفہوم واضح ہوجائے، جن آیات میں کسی خاص گروہ سے خطاب ہے، ان کے شروع میں بریکٹ کے اندر ''اے مسلمانو، اے اہل کتاب، اے ایمان لانے والو، اے رسول!'' وغیرہ کا اضافہ کردیا گیا ہے؛ تاکہ سمجھنے میں سہولت ہو اور واضح ہوجائے کہ اِن ارشاداتِ خداوندی کے مخاطب کون ہیں؟ ہر زبان میں کچھ محذوفات ہوا کرتے ہیں اور اہل زبان ان کو بہ سہولت سمجھ لیتے ہیں، عربی زبان میں محذوفات کا نسبتاً زیادہ معمول ہے، تفسیر جلالین

اور تفسیر مدارک وغیرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ان محذوفات کو ذکر کر دیا ہے، اس طرح قرآن مجید کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے، یہ محذوفات کبھی تو نحوی وصرفی ضرورت کے تحت ہوتے ہیں اور کہیں مفہوم ومراد کی تکمیل کے لئے، اصطلاح میں پہلی صورت کو ''محذوف'' اور دوسری صورت کو ''مقتضیٰ'' کہا جاتا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس دوسری نوعیت کے محذوفات کو بھی بریکٹ میں ذکر کر دیا جائے؛ تاکہ قرآن مجید کا سمجھنا آسان ہوجائے —— اس ایڈیشن میں اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ شخصیتوں اور مقامات کے جو نام ذکر کئے جائیں، ان پر حرکت بھی لگادی جائے؛ تاکہ عام قارئین کو آسانی ہو۔

عرصہ سے خیال تھا کہ اس کتاب کے مقدمہ کے طور پر قرآن مجید، تاریخ تفسیر اور اُصولِ تفسیر سے متعلق کچھ ضروری نوٹس شامل کر دیئے جائیں، اس بار شوال ۱۴۳۴ھ میں کچھ موقع ملا اور ضروری معلومات مختلف کتابوں سے جمع کر کے املاء کرائی گئیں اور جو باقی رہ گئیں، ان کی زیراکس سفرحج (۱۴۳۴ھ) میں ساتھ رکھ لی گئی اور سفر کے دورانِ مکہ مکرمہ اور منیٰ میں اس کام کو پورا کیا گیا، یہ مقدمہ بھی اس ایڈیشن میں شامل اشاعت ہے، انشاء اللہ کچھ اضافہ کے ساتھ الگ سے بھی یہ ''آسان اُصولِ تفسیر'' کے نام سے شائع ہوگا اور اُس کی ترتیب نصابی کتاب کے طرز پر ہوگی۔

دارالعلوم دیوبند میں مجھے جن اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا، اب ان میں ایک ہی بزرگ خانوادۂ قاسمی کے چشم وچراغ استاذی وسندی حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی عمت فیوضہم باحیات ہیں، اللہ تعالیٰ ہم لوگوں پر تادیر ان کا سایہ عاطفت قائم رکھے، ان کی ضعیف العمری اور غیر معمولی نقاہت وکمزوری کی وجہ سے مجھے ہمت نہیں ہورہی تھی کہ ان سے اپنی اس حقیر خدمت پر کچھ لکھنے کی درخواست کروں؛ لیکن دل اس پر بھی آمادہ نہیں تھا کہ یہ خدمت ان کی دُعاء سے محروم رہ جائے؛ اس لئے میں نے ان سے کچھ دُعائیہ کلمات لکھنے کی درخواست کی، انھوں نے بڑی بشاشت کے ساتھ اس کو قبول فرمایا اور باوجود ضعف وعلالت کے متعدد مقامات سے پڑھ کر ایک قیمتی تحریر عنایت فرمائی، جو اس کتاب میں ''تقدیم'' کے عنوان سے شامل ہے اور اس حقیر کے لئے نہ صرف حوصلہ افزائی کا بلکہ سعادت وبرکت کا بھی باعث ہے۔

خواہش تھی کہ اس کتاب پر کسی ایسی شخصیت سے چند سطریں لکھائی جائیں، جو علم تفسیر میں امتیازی شان رکھتی ہو، اس سلسلہ میں نظر رُکی ہمارے مخدوم وبزرگ حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم پر، جو سالہا سال سے تفسیر کی اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے ہیں اور تدریسی اعتبار سے تفسیر کو بجا طور پر ان کا امتیاز خیال کیا جاتا ہے، مولانا محترم اِدھر کئی سال سے مفلوج ہونے کی وجہ سے ایک حد تک معذوری سے دوچار ہیں؛ لیکن اس کے باوجود جب میں نے درخواست کی اور اپنا مسودہ بھیجا تو انھوں نے بھی نہایت نشاط کے ساتھ میری گذارش کو قبول فرمایا اور پھر ایک قیمتی اور حوصلہ افزا تحریر عنایت فرمائی، جو عین اس وقت مجھے موصول ہوئی، جب میں حج کے سفر پر تھا، مولانا کی شفقت وعنایت اس حقیر

کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے اور رہی ہے؛ لیکن اِس وقت علالت ومعذوری کے باوجود ان کی اس کرم فرمائی کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے، اللہ تعالیٰ عافیت کے ساتھ ان کے سایۂ عاطفت کو دراز فرمائے، ان کی یہ تحریر ''پیش لفظ'' کے عنوان سے شامل کتاب ہے، **فجزاهم الله أحسن الجزاء۔**

اس سے پہلے کتاب کی کمپوزنگ کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ قرآن کی کمپوزنگ کمپیوٹر کے الگ پروگرام سے ہوئی تھی اور ترجمہ وحواشی کی کمپوزنگ الگ پروگرام سے؛ اس لئے سیٹنگ میں کشش بھی نہیں تھی اور ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ اس کو یکجا طور پر کمپیوٹر میں پڑھنا اور ویب سائٹ پر ڈالنا ممکن نہ تھا، اللہ تعالیٰ بے حد اجر عطا فرمائے عزیز گرامی مولانا محمد نصیر عالم سبیلی سلمہ ولد مولوی محمد نور عالم صاحب (جالے، ضلع دربھنگہ، بہار) کو، کہ انھوں نے قرآن مجید کی کتابت کے لئے بھی ایسا پروگرام حاصل کیا، جو اُردو تحریر کے پروگرام سے ہم آہنگ ہے، نیز بڑی ہی محنت اور خوش سلیقگی کے ساتھ کمپوزنگ بھی کی، سیٹنگ بھی کی اور مختلف مفید باتوں کی رعایت ملحوظ رکھی، جیسے گذشتہ ایڈیشن میں ترجمہ قرآن میں آیت کے ختم پر صرف دائرہ بنا ہوا تھا، آیت نمبر درج نہیں تھا، اس نئے ایڈیشن میں ترجمہ کے ساتھ آیت نمبر بھی درج کیا گیا ہے، ہر صفحہ کی پیشانی پر پارہ اور اس کا نمبر، نیز سورت اور اس کا نمبر تحریر کیا گیا ہے، انشاء اللہ اس سے مطالعہ کرنے والوں کو بڑی سہولت ہوگی، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، ان کی عمر اور رزق میں برکت دے اور قرآن مجید کی اس خدمت کو ان کے لئے اور ان کے والدین کے لئے زادِ آخرت بنادے۔ آمین

اس سے پہلے اس کتاب کا نام راقم سطور نے ''آسان ترجمہ وتشریح قرآن مجید'' رکھا تھا؛ لیکن چوں کہ یہ نام کسی قدر طویل ہو جاتا تھا، اس لئے اب اس کا نام ''آسان تفسیر قرآن مجید'' رکھ دیا گیا ہے؛ تاکہ لوگوں کو بولنے میں آسانی ہو۔

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ اس کی کتنی بھی تلاوت کی جائے، انسان بے لطف نہیں ہوتا اور ہر بار تلاوت سے ایک نئی لذت حاصل ہوتی ہے، یہی حال معانیٔ قرآن کا بھی ہے، قرآن مجید کے الفاظ میں جس قدر تدبر سے کام لیا جائے، انسان پر نئے نئے معانی کھلتے ہیں، وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کے علمی اعجاز سے پردہ اُٹھتا جاتا ہے اور جب کوئی نئی صورت حال پیش آتی ہے تو اگر اس صورتِ حال کے پس منظر میں قرآن کا مطالعہ کیجئے تو لگتا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے بندے کی دستگیری کے لئے ایک چراغِ راہ سامنے رکھ دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: ''**لا يخلق عن كثرة الرد ولا تنقضي عجائبه**''۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۹۰۶)

یہ کیفیت درحقیقت قرآن مجید کی خدمت میں بھی موجود ہے اور اس خدمت میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی شامل ہے کہ بیک وقت قرآن کے کئی خدام اپنے خصوصی ذوق اور امتیازی وصف کا استعمال کرتے ہوئے اس خدمت کا شرف حاصل کرتے ہیں اور ہر ایک کو کچھ نئے لعل و گہر ہاتھ آجاتے ہیں، جیسے بیسویں صدی کے آغاز میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ

کے صاحبزادگان شاہ عبدالقادر صاحب ؒ، شاہ رفیع الدین صاحب ؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحب ؒ نے تقریباً ایک ہی زمانے میں قرآن مجید کے بامحاورہ اُردو ترجمہ، لفظی اُردو ترجمہ اور فارسی ترجمہ وتفسیر کا کام انجام دیا، پھر تقریباً نصف صدی کے بعد قریب قریب ایک ہی زمانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی ؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ اور حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ؒ نے قرآن مجید کا ترجمہ، مختصر حواشی اور تفصیلی تفسیر کے ذریعہ اُردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مختلف اہل علم کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ موجودہ لب ولہجہ سے ہم آہنگ قرآن مجید کا ترجمہ پیش کریں؛ چنانچہ مشہور عالم اور صاحبِ نظر مصنف حضرت مولانا محمد تقی عثمانی کا ''آسان ترجمہ قرآن'' (توضیح القرآن) کے عنوان سے ایک عام فہم ترجمہ مع حواشی منظر عام پر آیا ہے اور بحمد اللہ اسے پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے، یہ ترجمہ اُس وقت میرے علم میں آیا، جب میں سورۂ اعراف مکمل کر چکا تھا اور مسودہ پریس میں جا چکا تھا، دوسرا ترجمہ ''آسان ترجمہ'' ہی کے نام سے مولانا سید محمد بلال حسنی ندوی کا بھی اس وقت منظر عام پر آیا اور مؤلف نے مجھے بھی عنایت کیا، جب سورۂ کہف کی تکمیل ہو چکی تھی، یہ ترجمہ بھی آسان اور لفظی ترجمہ سے قریب ہے اور حواشی مختصر لیکن مولانا عثمانی کے حواشی کے مقابلہ میں نسبتاً تفصیلی ہیں، تیسرا ترجمہ محب گرامی قدر مولانا سید سلمان حسینی ندوی کے قلم سے ''آخری وحی'' کے نام سے سامنے آیا ہے، جس کا مسودہ سورۂ بقرہ کے ختم تک اس حقیر نے دیکھا ہے، اس میں مصنف نے بنیادی طور پر ترجمانی کا راستہ اختیار کیا ہے اور حواشی کے بجائے بین القوسین توضیحات کے ذریعہ قرآن مجید کے مطالب کو پیش کیا ہے، تینوں خدمتیں اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل ہیں، اس لئے خیال ہوا کہ اس کام کو موقوف کر دیا جائے؛ لیکن جب اس نقطۂ نظر سے ان تینوں ترجموں کو بنظرِ غور دیکھا تو محسوس ہوا کہ اس حقیر نے جو نہج اختیار کیا ہے، وہ بہت حد تک ان تراجم سے مختلف ہے اور وضاحتی حاشیے تو خاصے مختلف ہیں، بعض اور دوستوں سے بھی گذارش کی کہ وہ سورۂ اعراف تک طبع شدہ اس حقیر کا ترجمہ اور ان تینوں کو ملا کر دیکھیں اور رائے دیں، تو سبھوں کی رائے یہی ہوئی کہ اس کام کو تکمیل تک پہنچانا چاہئے؛ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے ہر انسان کی ظاہری صفات وکیفیات، رنگ وروپ اور آواز وغیرہ میں فرق رکھا ہے اور جیسے ہر شخص کے اندرونی جسمانی اعضاء میں ایک طرح کا تشخص موجود ہے، جس کو آج کی جینیٹک سائنس نے اور بہتر طور پر ثابت کر دیا ہے، اسی طرح انسان جن کاموں کو انجام دیتا ہے، گوان کے درمیان کتنی ہی مماثلت ہو؛ لیکن ان میں ایک طرح کا تشخص بھی قائم رہتا ہے؛ اس لئے ایک ہی موضوع پر اگر ایک سے زیادہ اہل علم قلم اُٹھاتے ہیں تو ان میں بعض اُمور میں اشتراک کے ساتھ ساتھ بہت سی باتوں میں ہر ایک کا امتیاز قائم رہتا ہے، مختلف زمانوں میں اسلامی علوم کی جو خدمات انجام دی گئی ہیں، یا ایک ہی زمانہ میں ایک ہی مضمون پر مختلف اہل علم نے جو کام کیا ہے یا ایک ہی کتاب کی

ایک ساتھ کئی کئی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان کی بنیاد واساس یہی ہے، اس لئے اس حقیر نے اس بے بضاعت کوشش کو جاری رکھا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مفید اور نافع بنائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہ حقیر فقہ کے موضوع پر خصوصاً اور دوسرے اسلامی موضوعات پر عموماً قلم اُٹھانے کی کوشش کرتا رہا ہے اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ عوام وخواص اور علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سبھوں کے درمیان اسے قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی ہے؛ لیکن قرآن مجید کی اس خدمت کو انجام دیتے ہوئے جس درجہ رغبت، قلبی آمادگی، انشراح اور مسرت کا احساس ہوتا رہا ہے، اب تک شاید کسی اور کام میں اس درجہ انبساط حاصل نہیں رہا، یہ یقیناً قرآن مجید کی برکت ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کرادیں، اسے دنیا وآخرت میں قبولیت سے نوازیں اور ذہن وفکر اور قلم کو صواب وسداد پر قائم رکھیں، واللہ ھو الموفق وبہ نستعین۔

۱۲/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — **خالد سیف اللہ رحمانی**

۱۴/جنوری ۲۰۱۴ء — (بیت الحمد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد)

○ ○ ○

آسان تفسیر قرآن مجید

مقدمۂ مؤلف

فہرست مقدمہ

پہلا باب : قرآن مجید — تعارف و احکام

دوسرا باب : تفسیر قرآن — عہد بہ عہد

تیسرا باب : تفسیر قرآن — اُصول وقواعد

○ ○ ○

پہلا باب

قرآن مجید — تعارف و احکام

قرآن مجید کا اصل نام ''قرآن'' ہے، خود قرآن مجید نے اپنے لئے تہتر بار اس نام کا استعمال کیا ہے، — عربی قواعد کے لحاظ سے اس لفظ کا ماخذ کیا ہے؟ اس سلسلہ میں تین اقوال نقل کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس کا مادہ ''ق، ر، ء'' ہے، جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، یعنی ایسی کتاب جو خوب اور بار بار پڑھی جائے گی، زیادہ تر اہل علم کی یہی رائے ہے، خود قرآن مجید کے ارشاد: ''إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ'' (القیامۃ: ۱۷-۱۸) سے اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی اصل ''ق، ر، ن'' ہے، جس کے معنی ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کے ہیں، کیوں کہ قرآن مجید کے مضامین ایک دوسرے کے مشابہ، باہم مربوط اور اختلاف و تعارض سے خالی ہیں، یہ رائے علامہ ابوالحسن اشعریؒ کی طرف منسوب ہے، تیسرا قول امام شافعیؒ کا ہے کہ قرآن کا لفظ کسی اور لفظ سے مشتق (یعنی نکلا ہوا) نہیں ہے؛ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کا علم اور نام ہے، جیسا کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُترنے والی اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُترنے والی کتاب کا نام ہے — اس حقیر کو یہی زیادہ درست نظر آتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کے جو نام دوسرے ذکر کئے گئے ہیں، وہ دراصل قرآن کی ''صفات'' ہیں، بعض اہل علم نے ''کتاب'' اور ''فرقان'' کو بھی اسماء قرآن میں شمار کیا ہے؛ لیکن قرآن مجید میں تورات کو بھی ''کتاب'' اور ''فرقان'' کہا گیا ہے: ''وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ'' (البقرۃ: ۵۳، نیز دیکھئے: الانبیاء: ۴۸) — اس لئے حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل نام ''قرآن'' ہی ہے، اور جن دیگر الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ درحقیقت قرآن کی صفات ہیں نہ کہ نام۔

تعریف

اصطلاح میں قرآن مجید کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

> قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے، جس کے الفاظ محمد ﷺ پر نازل کئے گئے ہیں، جو تواتر کے ساتھ منقول ہے، جس کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی ہے اور جو سورۂ ناس پر ختم ہوتا ہے۔

''الفاظ کے نازل کئے جانے'' سے حدیث نکل گئی، خواہ حدیث قدسی ہی کیوں نہ ہوں، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حوالہ کے ساتھ اپنا ارشاد نقل کیا ہے؛ کیوں کہ اس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے۔

''محمد ﷺ پر نازل کئے جانے'' سے گذشتہ آسمانی کتابیں خارج ہوگئیں؛ کیوں کہ وہ دوسرے پیغمبروں پر نازل کی گئی ہیں۔

''تواتر کے ساتھ نقل کئے جانے'' کا مطلب یہ ہے کہ اتنے لوگوں نے اس کو نقل کیا ہے کہ بہ ظاہر ان کا جھوٹ پر متفق

ہونا ممکن نہیں، اس سے شاذ قراءتیں یا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب بعض شاذ اقوال نکل گئے۔

سورۂ فاتحہ سے ابتداء اور ''سورۂ ناس پر اختتام'' سے قرآن مجید کا مزید تعارف ہو جاتا ہے۔

نزولِ قرآن

قرآن مجید تین مرحلوں میں نازل ہوا ہے :

(۱) سب سے پہلے ''لوحِ محفوظ'' پر اُتارا گیا: ''بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ، فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ'' (بروج:۲۱-۲۲) ''بلکہ یہ بلند پایہ قرآن ہے، اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے'' اسی کو دوسری جگہ 'کتاب مکنون' کہا گیا ہے: ''إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ، فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ '' (الواقعۃ:۷۷-۷۸) ''یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں ثبت ہے''۔

(۲) دوسرا نزول آسمانِ دنیا کی طرف ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ '' (دخان:۳) ''ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے'' نیز فرمایا گیا: ''إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ''۔ (قدر:۱)

(۳) تیسرا مرحلہ آپ ﷺ پر نازل کئے جانے کا ہے، جس کی تکمیل تقریباً ۲۳؍سال کے عرصہ میں ہوئی۔

نزولِ قرآن مجید کی کیفیت

رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن مجید کی بنیادی طور پر دو کیفیتیں ہوتی تھیں :

(۱) اللہ تعالیٰ نے براہ راست آپ ﷺ پر القاء فرمایا اور یہ صرف سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں، جو واقعۂ معراج کے موقع پر نازل ہوئیں، حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے؛ البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام حجاب کے واسطہ سے تھا، بالمشافہ نہیں تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام فرشتہ کے ذریعہ آپ ﷺ پر بھیجا ہے۔

قرآن مجید میں وحی کے ان دو طریقوں کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے :

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللهُ إِلَّا وَحْياً أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۔ (الشوریٰ:۵۱)

کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے وہ برتر اور حکیم ہے۔

آپ پر وحی نازل کئے جانے کے لئے جس فرشتہ کا انتخاب کیا گیا، وہ ہیں: حضرت جبرئیل — حضرت جبرئیل علیہ السلام کے آپ پر وحی لانے کی تین صورتیں تھیں :

(۱) وہ ان دیکھی شکل میں آتے، جب آپ ﷺ پر وحی پیش فرماتے تو گھنٹے بجنے کی یا مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز آتی۔

(۲) کسی انسانی شکل میں آتے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں آتے ہیں تو زیادہ تر حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں آتے ہیں اور یہ مجھ پر سب سے آسان صورت ہوتی ہے۔

(۳) حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل شکل میں نظر آتے، ایک بار مقام ''اجیاد'' پر آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھا ہے (تفسیر قرطبی: ۱۹/۲۴۱، وکذا فی فتح القدیر: ۵/۵۵۲)، جمہور کے نزدیک ''ولقد رأہ بالافق المبین'' (التکویر: ۲۳) سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی کو ان کی اصل صورت میں دیکھنا مراد ہے۔

''انبیاء'' پر وحی کی دو اور صورتیں بھی ہیں، جن میں ایک صورت خواب کی تھی، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرتے ہوئے دیکھا (صافات: ۱۰۱-۱۰۲) یا رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب ہی کو پیش نظر رکھ کر صحابہ کو عمرہ کے لئے کوچ کرنے کا حکم فرمایا، جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔

دوسری صورت وہ ہے جس کو حدیث میں: ''نفث فی الروع'' سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

إن روح القدس نفث فی روعی أنه لن تموت نفس حتی تستکمل رزقها وأجلها، فاتقوا الله وأجملوا فی الطلب۔ (ابونعیم فی الحلیہ بسند صحیح، جلدنمبر: ۱۰/۲۷)

روح القدوس نے مجھے الہام کیا کہ کوئی انسان اس وقت تک مر نہیں سکتا، جب تک وہ اپنی روزی اور عمر پوری نہ کرلے؛ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور رزق کی طلب میں اعتدال سے کام لو۔

لیکن آپ ﷺ پر ان دونوں طریقوں سے ''وحی غیر متلو'' کا نزول ہوا ہے، جس کو آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور جس کو ہم ''حدیث'' سے تعبیر کرتے ہیں، قرآن مجید کی کوئی آیت اس طریقہ پر نازل نہیں ہوئی ہے۔

قراءتیں

رسول اللہ ﷺ پر نہ صرف قرآن مجید کے الفاظ نازل کئے گئے؛ بلکہ ان کی ادائیگی کا لب ولہجہ بھی آپ ﷺ پر پیش فرمایا گیا؛ چنانچہ ارشاد ہے: ''فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ'' (قیامۃ: ۱۷) لیکن ایک ہی لفظ کی ادائیگی کے لئے عرب کے مختلف قبائل کے درمیان اُسلوب کا کسی قدر فرق پایا جاتا تھا، قرآن مجید کو ان تمام لہجوں میں ادا کرنے کی اجازت دی گئی، یہی مختلف لہجے ''قراءت'' کہلائے۔

قراءت کی اصطلاحی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

العلم بکیفیة اداء کلمات القرآن الکریم واختلافها منسوبة لنا قلها۔ (منجد المقرئین لابن الجوزی: ۶۱)

قراءت اس علم کا نام ہے، جس سے قرآن کریم کے کلمات کی ادائیگی کی کیفیت اور نقل کرنے والے کی نسبت کے ساتھ اس سلسلہ میں اختلافات کا علم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ مختلف عرب لہجوں میں قرآن مجید پڑھا کرتے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم ان مختلف لہجوں کے ناقل اول تھے، خلفاء راشدین: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اس سلسلہ میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، پھر تابعین کے ذریعہ اس فن کی ترویج و اشاعت ہوئی، تابعین میں: یزید بن قِطَاع، عبدالرحمن اَعْرج، مجاہد، سعید بن جُبَیر، عِکْرَمہ، عطاء، حسن بصری، عَلْقَمہ، اَسْود نَخْعی، زید بن حُبَیْش رحمہم اللہ اور مسروق وغیرہ کا اس علم میں نمایاں رول رہا ہے۔ (اُصول التفسیر وقواعد: ۴۳۷-۴۳۸)

پہلی دفعہ ان مختلف قراءتوں کو جس شخصیت نے فنی طور پر مرتب کیا، وہ ہیں: ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ (م: ۲۳۴ھ)، انھوں نے ۲۰ قراءتوں کو جمع کیا، پھر بعد کو بھی اس میں کمی و اضافہ کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ امام ابوبکر احمد بن موسیٰ بن عباس بن مجاہد تمیمی رحمہ اللہ (متوفی: ۳۲۴ھ) نے سات معروف ومتواتر قراءتوں کو مرتب کیا اور ’’کتاب السبعة فی القراءات‘‘ تالیف فرمائی، بنیادی طور پر جن صحابہ سے یہ قراءتیں مستفاد ہیں، نیز جو امام قراءت اس کے ناقل ہیں، پھر ان سے جن شاگردوں نے اس کو اخذ کیا ہے اور ان کے ذریعہ اس کی اشاعت ہوئی ہے، اس کو ذیل کے نقشہ میں دیکھا جا سکتا ہے:

اسماء صحابہ	ائمۂ قراءت	ائمہ کے مشہور تلامذہ
○ حضرت علی کرم اللہ وجہہ	○ عاصم بن ابی نجود کوفی (م: ۲۱۷ھ)	○ حَفُص بن سلیمان (م: ۱۸۰ھ)
		○ شعبہ بن عیاش (م: ۱۹۳ھ)
○ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ	○ حمزہ بن حبیب کوفی (م: ۱۵۶ھ)	○ خَلّاد بن خالد (م: ۲۲۰ھ)
		○ خَلَف بن ہشام (م: ۲۲۹ھ)
	○ علی بن حمزہ کسائی (م: ۱۶۹ھ)	○ حَفُص بن عمرو دوری (م: ۲۴۶ھ)
		○ ابوالحارث لَیث بن خالد (م: ۲۴۰ھ)
○ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ	○ عبداللہ بن عامر شامی (م: ۱۱۸ھ)	○ ہِشام بن عامر دمشقی (م: ۴۴۵ھ)
		○ عبداللہ بن احمد معروف بہ ابن ذکوان (م: ۲۴۲ھ)
○ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	○ عبداللہ بن کثیر مکی (م: ۱۲۰ھ)	○ محمد بن عبدالرحمن قُنبُل (م: ۲۹۱ھ)
		○ احمد بن محمد بزی (م: ۲۵ھ)
○ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ	○ ابوعمرو زبان بن علاء بصری (م: ۱۵۴ھ)	○ حفص بن عُمَر ودوری (م: ۲۴۶ھ)
		○ صالح بن زیاد سرسی (م: ۲۶۱ھ)
	○ نافع عبدالرحمن مدنی (م: ۱۲۰ھ)	○ عیسیٰ بن مینا، معروف بہ ’’قَالُون‘‘ (م: ۲۲۰ھ)
		○ عثمان بن سعید، معروف بہ ’’وَرْش‘‘ (م: ۱۹۷ھ)

پھر علامہ ابن الجزری نے اس میں مزید تین قراءتوں کا اضافہ کیا ہے، ان ائمہ قراءت کے نام اس طرح ہیں:

اسماء ائمہ	ائمہ کے مشہور تلامذہ
○ ابوجعفر یزید بن قعقاع مدنی (م: ۱۳۰ھ)	○ ابن وَرْدان (م: ۱۶۰ھ)
	○ ابن جُمّاز (م: ۱۷۰ھ)

○ یعقوب بن اسحاق حضرمی کوفی (م:۲۰۵ھ)
○ رُوَیس (م:۲۳۸ھ)
○ رَوح (م:۲۳۵ھ)

○ خلف بن ہشام (م:۲۲۹ھ)
○ اسحاق (م:۲۸۶ھ)
○ ادریس (م:۲۹۲ھ، ولایت:۲۰۰ھ)

ان تینوں قراءتوں کو ملا کر ''قراءات عشرہ'' کہا جاتا ہے، امام قراءت سے جو طریقہ منسوب ہوتا ہے، اس کو ''قراءت'' کہتے ہیں اور جس نے ان سے نقل کیا ہو، اس کو ''روایت'' کہتے ہیں، جیسے: قراءت عاصم بہ روایت ''حفص'' یا قراءت نافع بہ روایت ''ورش'' وغیرہ۔

بہت سی قراءتوں میں سے ان سات یا دس قراءتوں کے انتخاب کے لئے بنیادی طور پر اہل علم نے تین معیارات مقرر کئے ہیں :

(۱) وہ قراءت تواتر کے ساتھ منقول ہو — جو شاذ قراءت ہو، اس کا اعتبار نہیں، جیسے: ''وَلاَ تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ'' (البقرۃ:۲۳۷) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ''ولا تَنَاسَوْا'' منقول ہے، مگر یہ روایت شاذ ہے۔

(۲) وہ قراءت مصاحف عثمانی کے دائرہ میں آتی ہو — جیسے: ''مالک یوم الدین'' مصحف عثمانی میں اس لفظ کو ''ملک'' لکھا گیا ہے، جس کو ''مالک'' بھی پڑھا جاسکتا ہے اور ''ملک'' بھی — اگر مصحف عثمانی سے مختلف ہو تو اس کا اعتبار نہیں، جیسے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی قراءت میں ''وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى'' (اللیل:۳) کی بجائے صرف ''والذکر والانثٰی'' منقول ہے، یہ مصحف عثمانی کے خلاف ہے۔

(۳) وہ عربی زبان کے قواعد کے موافق ہو، جیسے: ''وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِيْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ'' (النساء:۱) — اس میں امام حمزہ کی روایت ''م'' کے زیر کے ساتھ ''وَالْأَرْحَامِ'' ہے، مگر یہ معتبر ہے؛ کیوں کہ یہ عربی قواعد کے مغائر نہیں۔

جو قراءتیں ان معیارات پر پوری اُترتی ہوں، ان ہی کا اعتبار ہے۔

موجودہ دور میں پوری دنیا میں تین قراءتیں مقبول و معمول ہیں :

(۱) قراءت عاصم بہ روایت حفص: خلیجی ممالک، برصغیر، ترکی، افغانستان، مصر اور تمام مشرقی ممالک۔

(۲) قراءت نافع بہ روایت وَرش: تیونس، جزائر، سوڈان، مغرب اقصی اور مصر کے بعض علاقے۔

(۳) قراءت نافع بہ روایت قالون: تیونس، مصر اور لیبیا کے بعض علاقے۔

اسبابِ نزول

قرآن مجید کا اصل موضوع انسانیت کی ہدایت ہے اور قرآن کی تمام آیات بنیادی طور پر اسی مقصد کے تحت نازل ہوئی ہیں؛ لیکن بعض آیات کسی خاص واقعہ کے پس منظر میں اُتاری گئی ہیں، اس واقعہ کو ''سببِ نزول'' کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے مقصد و منشاء کو سمجھنے کے لئے اسبابِ نزول کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّأَحْسَنُوْا وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (المائدۃ:۹۳)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا تو اس سے پہلے وہ جو کچھ کھا چکے ہیں، اس سلسلہ میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ انھوں نے گناہ کو چھوڑ دیا، ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے، پھر گناہوں سے بچتے رہے اور ایمان لائے، پھر گناہوں سے پرہیز کرنے پر قائم رہے اور نیک عمل کیا، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ آیت شراب کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، حضرت قُدامہ بن مَظعون رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اس آیت کی وجہ سے شراب کو مباح خیال کرتے تھے؛ لیکن اس غلط فہمی کا ازالہ اس کے سببِ نزول سے ہوتا ہے، اس کا شانِ نزول منقول ہے کہ جب شراب کے حرام ہونے کی آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہمارے بعض بھائیوں کی اس حال میں وفات ہوئی ہے کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ شراب ناپاک ہے :

إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (المائدۃ:۹۰)

بے شک شراب، جوا، مورتیاں اور فال نکالنے کے تیر، گندی باتیں ہیں اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو؛ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔

اس موقع پر مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ حرام ہونے سے پہلے جو لوگ ان چیزوں کو کھا پی چکے ہیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے :

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ ۔ (البقرۃ:۱۱۵)

اور مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے، تم جس طرف بھی منھ کرو، اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے۔

اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سفر ہو یا حضر، قبلہ کا استقبال واجب نہیں ہے، کسی بھی طرف رُخ کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات اجماع کے خلاف ہے، اس آیت کا سببِ نزول یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک تاریک رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، ان کو قبلہ کی جہت کا اندازہ نہیں ہوسکا، ہر ایک نے اپنے اجتہاد کے اعتبار سے رُخ متعین کر کے نماز ادا کرلی، ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، گویا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی انسان پر قبلہ مشتبہ ہوجائے اور سمت کا اندازہ نہ ہوسکے تو وہ اپنے قلبی رجحان پر عمل کرے گا؛ کیوں کہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہے اور تمام سمتیں اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔

اسبابِ نزول کی اسی اہمیت کی وجہ سے مفسرین نے ان کو نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے، علی ابن مدینی استاذ امام بخاری،

حافظ ابن حجر، علامہ واحدی اور علامہ سیوطی رحمہم اللہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے علامہ واحدی رحمہ اللہ کی ''اسباب النزول'' اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی ''لباب النقول'' بڑی اہم اور جامع کتابیں ہیں؛ البتہ ان کتابوں میں بکثرت ضعیف روایات بھی منقول ہیں۔

کسی واقعہ کے سببِ نزول سے واقف ہونے کی دو صورتیں ہیں :

ایک صورت یہ ہے کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہو، جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں چھپ کر صحابہ کرام کو نماز پڑھایا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلند آواز میں قرآن پاک پڑھتے، مشرکین جب سنتے تو قرآن کو برا بھلا کہتے، نیز قرآن مجید نازل کرنے والے اور اسے لے کر آنے والے کی شان میں گستاخی کرتے، اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا :

وَلاَ تَجْهَرْ بِصَلاَتِكَ وَلاَ تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلاً ۔ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

اور اپنی نماز میں نہ زیادہ بلند آواز میں پڑھو اور نہ بالکل آہستہ، اس کے درمیان کا راستہ اختیار کرو۔

یعنی قرآن مجید اتنی زور سے نہ پڑھیں کہ مشرکین سن لیں اور قرآن کو برا بھلا کہیں اور اتنا آہستہ نہ پڑھیں کہ آپ کے رفقاء بھی سن نہ سکیں، (بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۷۲۲) —— کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوال کیا جاتا، اس کے جواب میں آیت نازل ہوتی، جیسے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں مدینہ کے ایک کھیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ یہودیوں کا ایک گروہ گذرا، ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ان سے ''روح'' کے بارے میں دریافت کرو اور بعض نے کہا: مت پوچھو، کہیں ایسی بات نہ کہہ دیں، جو تم لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہو، بہر حال ان میں کچھ لوگوں نے پوچھ ہی لیا، آپ تھوڑی دیر اس طرح رُکے رہے کہ گویا انتظار میں ہوں، میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی :

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي ۔ (بنی اسرائیل: ۸۵)

لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کررہے ہیں، آپ کہہ دیجئے: روح میرے پروردگار کے حکم سے بنی ہے۔ (بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، حدیث نمبر: ۶۸۶۷)

کبھی سببِ نزول کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی خاص واقعہ کے سبب نزول ہونے کی صراحت نہیں ہوتی؛ لیکن مضمون کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس مضمون یا اس پس منظر میں نازل ہوئی ہے، جیسے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کہا کرتے تھے: اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے پشت کی جانب سے ہم آغوش ہوگا تو ''اَحول'' (مسلم، کتاب النکاح، باب جواز جماعہ الخ، حدیث نمبر: ۳۶۰۸) بچہ پیدا ہوگا؛ چنانچہ آیت نازل ہوئی :

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ ۔ (البقرة: ۲۲۳)

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں تو اپنی کھیتی پر جس طرح چاہو آؤ۔ (مسلم عن جابر، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۳۶۰۸)

کبھی ایک ہی آیت سے متعلق مختلف اسبابِ نزول ذکر کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک روایت سند کے اعتبار سے معتبر یا زیادہ معتبر ہوتی ہے اور دوسری غیر معتبر یا کم معتبر ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں جو روایت زیادہ معتبر طریقہ پر ثابت ہے، وہ قبول کی جائے گی، جیسے: رسول اللہ ﷺ کو کچھ تکلیف ہوگئی، آپ دو تین شب قیام لیل نہیں کر پائے، ایک عورت آئی اور اس نے کہا: اے محمد! میرا خیال ہے کہ (نعوذ باللہ) تمہارے شیطان نے تم کو چھوڑ دیا ہے اور دو تین راتوں سے تم سے دور ہوگیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں :

وَالضُّحٰی ، وَاللَّیْلِ إِذَا سَجٰی ، مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی۔ (الضحیٰ: ۱-۳)

آفتاب کی روشنی کی قسم اور رات کی تاریکی کی، جب چھا جائے کہ آپ کے پروردگار نے نہ تو آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے ناراض ہوا۔ (بخاری، باب التفسیر سورۃ الضحیٰ، حدیث نمبر: ۴۶۶۷)

اس کے مقابلہ میں طبرانی کی روایت ہے کہ ایک کتے کا بچہ رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوا اور آپ کی چار پائی کے نیچے مرگیا، چار دنوں تک آپ پر وحی نازل نہیں ہوئی، آپ نے حضرت شعبہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ پتہ نہیں کیا بات پیش آئی ہے کہ جبرئیل نہیں آئے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے گھر میں جھاڑو دی تو چار پائی کے نیچے سے کتے کے بچہ کی لاش ملی، اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (الطبرانی فی الکبیر، حدیث نمبر: ۶۳۶)

علامہ ھیثمی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس کی سند میں بعض غیر معروف رواۃ ہیں، — پس یہ روایت سند کے اعتبار سے بھی ضعیف ہے اور عقلاً بھی نا قابل قبول؛ کیوں کہ آپ] کی طبیعت میں بے حد نظافت تھی، پھر کیسے ممکن ہے کہ چار دنوں تک گھر میں جھاڑو نہ دی گئی ہو اور چار دنوں میں تو لاش کی بد بو پھیلنے لگتی ہے، پھر بھی آپ کو کچھ اندازہ نہ ہوا ہو۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آیت کے نازل ہونے کے سلسلہ میں احادیث میں دو اسباب کا ذکر ہوتا ہے، دونوں کا ذکر صراحتاً کیا جاتا ہے اور دونوں روایتیں معتبر طریقہ پر ثابت ہوتی ہیں، ایسی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آیت ایک ہی واقعہ کی مناسبت سے دو بار نازل ہوئی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک موقع پر نازل ہوئی ہو اور اسی طرح کے کسی اور موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا تو نقل کرنے والے نے خاص اسی واقعہ کو اس کا سببِ نزول خیال کرلیا ہو، جیسے بخاری کی روایت ہے کہ آیت لعان، (النور: ۶) حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی، (بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۳۷۸) اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ آیت عبید بن عجلانی کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ (بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۴۳۳۶)

البتہ اُصولی طور پر یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اگر کوئی آیت کسی خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہو تو اس کا حکم اسی واقعہ تک محدود نہیں رہے گا؛ بلکہ اس طرح کے جو بھی واقعات پیش آئیں، سب پر یہی حکم جاری ہوگا، جیسے آیت لعان کا حکم ایسے تمام واقعات کے لئے عام ہے، مذکورہ واقعات تک محدود نہیں، یا افک (تہمت اندازی) کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سلسلہ میں پیش آیا؛ لیکن یہ حکم ان تمام لوگوں کے لئے عام ہے، جو کسی پاکدامن مسلمان پر تہمت لگائیں، اس سلسلہ میں اہل علم کے یہاں قاعدہ معروف ہے :

العبرۃ لعموم اللفظ لا بخصوص السبب ۔ (الدر المختار: ۳/ ۳۱۴)

لفظ کے عام ہونے کا اعتبار ہے نہ کہ سبب کے خاص ہونے کا۔

نسخ

پہلے جو احکام دیئے گئے تھے، ان کو ختم کر دینے کو ''نسخ'' کہتے ہیں۔

یہ بات تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ایک حکم دیا جائے، جو ہمیشہ کے لئے ہو، پھر تجربہ سے وہ درست ثابت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا حکم دیں؛ کیوں کہ یہ تو علم و واقفیت میں نقص اور کمی کی وجہ سے ہوتا ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ 'نسخ' بندہ کے علم کے اعتبار سے حکم میں تبدیلی ہے، اللہ تعالیٰ کے علم کے اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں؛ بلکہ اللہ کی طرف سے پہلے سے اس حکم کی جو مدت مقرر تھی، نسخ کے ذریعہ اسی کی اطلاع ہے؛ اسی لئے بعض علماء نے نسخ کی تعریف کی ہے کہ یہ حکم شرعی کی انتہاء مدت کو بیان کرنے کا نام ہے: ''هو بيان انتهاء الحكم الشرعي'' (کشف الاسرار: ۳/ ۳۰۰) جیسے ایک دانا طبیب مریض کو بہ یک وقت مختلف مراحل میں آنے والی دواؤں سے آگاہ نہیں کرتا؛ بلکہ ایک نسخہ لکھتا ہے، پھر چند دنوں بعد اس کی جگہ دوسری دوا تجویز کرتا ہے، یہ طبیب کے علم میں پہلے سے ہے، مگر مریض خیال کرتا ہے کہ معالج نے دوا میں تبدیلی کر دی ہے، مثلاً: شراب کے حرام ہونے کا حکم تین مرحلوں میں دیا گیا، پہلے مرحلہ میں فرمایا گیا کہ اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے، (البقرۃ: ۲۱۹) دوسرے مرحلہ میں ارشاد ہوا کہ نماز پڑھنے کے وقت نشہ کی حالت میں ہونے سے بچو، (النساء: ۴۳) تیسرے مرحلہ میں شراب مکمل طور پر حرام کر دی گئی، (المائدۃ: ۹۰) —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر پہلے ہی مرحلہ میں شراب مکمل طور پر حرام کر دی جاتی تو شاید عربوں کے لئے اس سے بچنا دشوار ہوتا۔ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، حدیث نمبر: ۴۷۰۷)

قرآن مجید نے پہلی آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے، اسی طرح خود قرآن مجید میں بھی بعض احکام کا نسخ ہوا ہے، قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے، (البقرۃ: ۱۰۶، النحل: ۱۰۱) لیکن منسوخ احکام کی تعداد کیا ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، متقدمین تقریباً پانچ سو آیات کو منسوخ قرار دیتے تھے، اگر ایک حکم ایک جگہ مطلق ذکر کیا گیا اور دوسری جگہ قید کے ساتھ، یا ایک جگہ حکم 'عام' رکھا گیا اور دوسری جگہ ''خاص'' تو وہ ایک لفظ کو دوسرے لفظ کی وضاحت قرار دینے کی بجائے ''نسخ'' کہتے تھے، یہ تعبیر مجازاً تھی؛ ورنہ منسوخ تو وہ احکام ہیں، جو بالکل ہی ختم کر دیئے گئے ہوں۔

نسخ کے اس حقیقی معنی کے لحاظ سے علامہ ابن عربی رحمہ اللہ نے ۲۱ آیات کو منسوخ مانا ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ان میں سے دو آیات (نساء: ۸، نور: ۵۸) کا حکم اب بھی باقی ہے اور ان پر عمل مکمل طور پر ختم نہیں کیا گیا ہے، اس طرح علامہ سیوطی رحمہ اللہ کے نزدیک ۱۹ آیتیں منسوخ ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے ان ۱۹ر میں سے پانچ کو منسوخ قرار دیا ہے اور باقی پر فی الجملہ عمل باقی ہے، یہ پانچ آیتیں یہ ہیں:

(۱) سورۂ بقرہ (آیت: ۱۸۰) —— یہ آیت میراث (نساء: ۱۱-۱۴) سے منسوخ ہے۔

(۲) سورۂ بقرہ (آیت: ۲۴۰) جس میں عورت کی مدت ایک سال ذکر کی گئی ہے —— اس کی ناسخ بقرہ: ۲۳۴ ہے،

جس میں عدت وفات چار ماہ دس دن کردی گئی ہے۔

(۳) سورۂ انفال (آیت: ۶۵) جس میں ۲۰ مسلمان مجاہدین کو دوسو کافر فوجیوں کے مقابلہ لازمی طور پر جمے رہنے کا حکم دیا گیا ہے — اس کو انفال: ۶۶ نے منسوخ کر دیا ہے، جس میں سو مجاہدین کو دوسو غیر مسلم فوجیوں کے مقابلہ جمے رہنے کا حکم ہے۔

(۴) سورۂ احزاب (آیت: ۵۲) — رسول اللہ ﷺ کو ابتداء بلا تحدید تعداد نکاح کی خصوصی اجازت دی گئی تھی، بعد کو مزید نکاح سے منع فرما دیا گیا۔ (احزاب: ۵۲)

(۵) سورۂ مجادلہ (آیت: ۱۲) اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سرگوشی کا شرف حاصل کرنے کے لئے پہلے صدقہ کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا — بعد میں اس لزوم کو ختم کر دیا گیا۔ (مجادلہ: ۱۳)

مضامین قرآن مجید

قرآن مجید میں جو مضامین آئے ہیں، بنیادی طور پر وہ چھ ہیں :

(۱) احکام۔

(۲) جدل (علمی تردید)۔

(۳) تذکیر بآلاء اللہ (اللہ کی نعمتوں کے ذریعہ دعوتِ ہدایت)۔

(۴) تذکیر بایام اللہ (قیامت اور عذاب کے تذکرہ کے ذریعہ دعوت)۔

(۵) تذکیر بالموت (موت اور موت کے بعد کے حالات کے ذریعہ دعوت)۔

(۶) امثال۔

جدل

''جدل'' سے مراد کسی فکر کی مدلل تردید کرنا ہے، قرآن مجید میں اس کے زمانۂ نزول کے پس منظر میں خاص طور پر چار گروہوں پر رد کیا گیا ہے :

(۱) مشرکین

مشرکین پر رد کرتے ہوئے ان کی اصل بیماریوں کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا ہے، شرک کا عمومی سبب دو باتیں تھیں، تشبیہ اور آباء واجداد کی اندھی تقلید — تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ صفات واختیارات میں بعض مخلوقات کو خدا کے مشابہ قرار دیتے تھے اور خدا کی طاقت میں شریک مانتے تھے؛ اس لئے وہ ان کو معبود کے درجہ میں رکھتے تھے، قرآن مجید نے بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات اور قدرت میں یکتا ہیں، کوئی ان کا ہمسر اور مشابہ نہیں ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے کہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالیٰ براہ راست چلا رہے ہیں اور اس میں کسی مخلوق کے محتاج نہیں ہیں، جیسا کہ انسان مملکت کے نظام کو چلانے میں مددگاروں کا محتاج ہوتا ہے۔

مشرکین مکہ شرک کے حق ہونے پر ایک دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ان کے آباء واجداد سے یہی ہوتا آیا ہے اور پھر

اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ان کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اولاً تو ابراہیم علیہ السلام توحید خالص پر قائم تھے، دوسرے اگر آباء واجداد خود ناواقف ہوں تو ان کی تقلید کرنا عقل کی رو سے بھی غلط ہے؛ کیوں کہ ناواقف کی تقلید انسان کو گمراہی کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

اگرچہ مشرکین مکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام وحضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور انسانی ضرورتوں سے دوچار ہیں، پھر آپ کیسے اللہ کے پیغمبر ہو سکتے ہیں؟ قرآن نے اس کی تردید کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ جو پیغمبر پہلے گذر چکے ہیں، وہ بھی انسان ہی تھے، انسانوں کے درمیان کسی انسان ہی کو نبی بنانا مصلحت کا تقاضہ ہے؛ تاکہ وہ اپنے متبعین کے لئے نمونہ بن سکیں؛ کیوں کہ کوئی فرشتہ یا جنات انسان کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پھر یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کے مالک ہیں تو اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جس کو چاہیں، اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمائیں۔

مشرکین مکہ کو ’’بعث بعد الموت‘‘ سے بھی انکار تھا، قرآن مجید نے ان کا رد کیا اور اس کو عقل اور فطرت کے ذریعہ سمجھایا کہ جیسے زمین مردہ ہو جاتی ہے اور پھر اللہ بارش کے ذریعہ اس کو زندہ کرتے ہیں، اسی طرح اللہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کریں گے۔

(۲) یہود

یہود اگرچہ توحید پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کو مانتے تھے؛ لیکن اس کے باوجود وہ مختلف برائیوں میں مبتلا تھے، ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر صرف اس لئے ایمان نہیں لاتے تھے کہ آپ ﷺ بنو اسماعیل میں سے ہیں نہ کہ بنو اسحاق میں سے، اس کے علاوہ وہ تورات کے احکام میں لفظی اور معنوی تحریف کے بھی مرتکب تھے، وہ تورات کے بعض احکام غریبوں اور کمزوروں پر نافذ کرتے تھے اور دولت مندوں اور طاقتوروں کو چھوڑ دیتے تھے —— قرآن مجید نے یہ اور اس طرح کی دوسری اخلاقی برائیوں پر تنقید کی ہے اور خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل کے قصص وواقعات کے حوالہ سے ان پر رد کیا ہے۔

(۳) نصاریٰ

عیسائیوں کے تین بنیادی عقائد ہیں: ان پر قرآن مجید نے تنقید کی ہے :

اول : عقیدۂ تثلیث یعنی عیسائیوں کے نزدیک تین خدا ہیں، باپ یعنی خالق کائنات، بیٹا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس، یہ تین مل کر ایک بنتے ہیں۔

دوسرے : حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پہ چڑھائے جانے کا عقیدہ، یعنی ان کے خیال کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں گناہ کیا تھا، ان کا گناہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اس کے کفارہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ اپنے بیٹے کو پیدا کیا، جو سولی پر چڑھائے گئے اور وہ پوری نسل انسانی کے گناہوں کے لئے کفارہ بن گئے۔

تیسرے : حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی بشارت دی تھی، یہ بشارت ''احمد'' کے نام سے تھی، عبرانی زبان میں احمد کا ترجمہ اس کے ہم معنی لفظ ''فارقلیط'' سے کر دیا گیا؛ حالاں کہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، پھر معنوی تحریف بھی کی کہ ''فارقلیط'' کا ترجمہ ''قابلِ تعریف'' کے بجائے ''مددگار'' کرنے لگے۔

قرآن مجید نے موقع بہ موقع عیسائیوں کی ان تینوں گمراہیوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور انسانی عقل وفطرت کی دلیلوں سے رد کیا ہے۔

(۴) منافقین

منافقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے آپ کو بظاہر مسلمان کہتے تھے اور کلمہ طیبہ پڑھتے تھے؛ لیکن اپنے دل میں کفر کو چھپائے رہتے تھے، ان کا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا یا تو مسلمانوں کے خوف سے ہوتا تھا یا کچھ مادی فائدے —— جیسے مالِ غنیمت اور مالِ زکوٰۃ —— حاصل کرنے کے لئے۔

بظاہر یہ چاروں طبقے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہوتے تھے؛ لیکن درحقیقت قرآن مجید میں ان تمام طبقوں کا ذکر موجود ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مختلف گروہ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

تذکیر بآلآء اللہ

اس سے مراد اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید نے جا بجا آسمان و زمین کی تخلیق، بارش و پانی کے نظام، پھلوں اور کھیتیوں کی پیداوار وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے نعمت عطا فرمانے والے خدا کی بندگی کی دعوت دی ہے۔

تذکیر بایّام اللہ

ایام اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی فرماں برداری کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک فرمایا اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو کیا سزائیں دیں؟ —— قرآن مجید نے اس کے لئے مختلف انبیاء اور ان کے احوال کو بیان کیا ہے، جن کو ''قصص'' کہا جاتا ہے، قرآن نے بعض قصص کو مخاطب کی ضرورت اور واقعات کی مناسبت سے بار بار ذکر فرمایا ہے، جیسے: حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون وغیرہ کے واقعات، اور بعض کا ایک دو جگہ ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، جیسے: حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ، یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کی ملاقات، اصحابِ کہف اور ذوالقرنین کے قصے۔

تذکیر بالموت

انسان کو سب سے زیادہ خوف دلانے والا اور صحیح راستہ پر قائم رکھنے والا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان کو مرنا اور اپنے اعمال کا

حساب دینا ہے، اس لئے قرآن مجید میں اس مضمون کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

احکام ومسائل

قرآن مجید نے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں؛ چنانچہ اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً پانچ سو آیات وہ ہیں جن میں عملی زندگی کے احکام بیان کئے گئے ہیں، شیخ عبدالوہاب الخلاف نے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آنے والے صریح احکام کے اعداد وشمار اس طرح ذکر کئے ہیں :

- احوالِ شخصیہ : ۷۰
- قانونِ شہریت : ۷۰
- جرم وسزا : ۳۰۱
- عدالتی قوانین : ۱۳
- دستوری قوانین : ۱۰
- اقتصادی قوانین : ۱۰
- قومی وبین قومی تعلقات : ۲۵۔ (علم اُصول الفقہ: ۳۱-۳۲)

امثال

مثالوں سے کسی بات کا سمجھنا آسان ہوتا ہے، اسی لئے قرآن نے توحید، رسالت، بعث بعد الموت، ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھایا ہے، ان امثال کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو آسانی کے ساتھ بات سمجھ میں آجائے اور نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے :

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ۔ (الزمر: ۲۷)

اور ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

قرآن مجید میں امثال کی کل تعداد ۱۶۶ ہے۔

رسم قرآنی

عربی زبان میں حروف جس طرح بولے جاتے ہیں، عام طور پر اسی طرح لکھے بھی جاتے ہیں؛ جب کہ بعض زبانوں میں حروف کے تلفظ اور کتابت کی شکل الگ الگ ہوتی ہے، جیسے انگریزی میں "C" لکھا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا تلفظ "K" کی طرح ہوتا ہے، یا "S" لکھا جاتا ہے اور اس کا تلفظ "Z" کی طرح ہوتا ہے، عربی زبان کی کتابت عام طور پر ایک مقرر اُصول کے مطابق ہوتی ہے؛ لیکن قرآن مجید کی کتابت میں کہیں کہیں الگ منہج اختیار کیا گیا ہے؛ اس لئے عربی زبان کے عام طریقۂ کتابت کو ''رسم قیاسی'' اور قرآن مجید کے طریقۂ کتابت کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ''رسم عثمانی'' کہا جاتا ہے :

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اس کی نسبت اس لئے کی جاتی ہے کہ آپ نے مصحف قرآنی کے متعدد نسخے تیار کرائے اور مختلف علاقوں میں بھیجے، وہ اسی طریقۂ تحریر کے مطابق تھے — رسم عثمانی کی کیا حیثیت ہے؟ اس سلسلہ میں اہل علم کے تین اقوال ہیں :

(۱) یہ طریقۂ تحریر توقیفی یعنی من جانب اللہ ہے، اس میں اختیار کو دخل نہیں، خود رسول اللہ ﷺ نے اسی طریقہ پر وحی کی کتابت کرائی تھی۔

(۲) یہ طریقۂ تحریر ہے تو اجتہادی، جس کو عہد عثمانی کے کاتبین نے اختیار کیا تھا؛ لیکن اسی وقت اس پر صحابہ کا اجماع و اتفاق ہو گیا اور اُمت میں اسے قبول عام و تام حاصل ہو چکا ہے۔

(۳) قرآن مجید کا رسم الخط بھی اجتہادی ہے اور عربی زبان کی دوسری تحریروں کے مطابق اسے لکھنا اور اگر کسی زمانہ میں کوئی تبدیلی ہو تو اسے قبول کرنا جائز ہے۔

ان میں سے تیسرے قول کے مطابق مصحف قرآنی کی کتابت میں رسم عثمانی کی پابندی ضروری نہیں، پہلے اور دوسرے قول کے مطابق رسم عثمانی کی پابندی ضروری ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں، یہی جمہور کا مسلک ہے، امام احمد رحمہ اللہ نے تو اس کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے :

تحرم مخالفة خط مصحف عثمان في ياء أوْ واؤ أوْ ألف أوْ غير ذلک۔ (کشاف القناع:۱/۱۳۶)

ی، و، الف وغیرہ میں حضرت عثمان غنیؓ کے مصحف کے خط کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

رسم عثمانی پر قائم رہنے کے متعدد فوائد ہیں، جن میں دو نہایت اہم ہیں، ایک : حفاظت قرآن؛ کہ جیسے قرآن مجید کے الفاظ محفوظ ہیں اور عہد نبوی سے نقل ہوتے آئے ہیں، اسی طرح اس ''خط'' کی صورت میں قرآن مجید کا وہ طریقہ کتابت بھی محفوظ ہے، جو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اختیار کیا گیا، دوسرے : مصحف عثمانی میں کتابت کا ایسا منہج اختیار کیا گیا کہ اس میں مختلف قراءتیں اور مختلف قبائل کے لہجے جمع ہو جاتے ہیں، گویا رسم عثمانی تمام قراءتوں اور لہجوں کو سموئے ہوا ہے۔

جمع قرآن

قرآن مجید موجودہ ترتیب کے مطابق نازل نہیں ہوا، اس کی موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق حضرت محمد ﷺ کے زیر نگرانی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعہ انجام پائی، عہد نبوی ﷺ میں اس کی حفاظت دو پہلوؤں سے کی گئی :

(۱) حفظ کے ذریعہ۔

(۲) کتابت کے ذریعہ۔

بصورتِ حفظ

عہد نبوی ﷺ میں جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا، اہل عرب پڑھنا لکھنا بہت کم جانتے تھے، اس وقت پڑھنے لکھنے کے

وسائل یعنی کاغذ وغیرہ بھی آسانی سے میسر نہیں تھے اور لوگ کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے یاد کر لیتے تھے، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، یوں بھی اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوتِ حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، وہ طویل قصائد، مشہور جنگوں کے واقعات، نسب نامے حتیٰ کہ اپنے جانوروں تک کے پشت ہا پشت کے نسب نامے زبانی یاد رکھتے تھے؛ چنانچہ قرآن نازل ہوا تو انھوں نے پورے ذوق وشوق سے اسے یاد کرنا شروع کر دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن سیکھنے اور اسے یاد رکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، اسی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ عہد نبوی ﷺ میں ہی حفاظ صحابہ کی ایک بڑی تعداد وجود میں آ گئی تھی، روایات میں تقریباً چالیس صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر ملتا ہے، جنھوں نے پورا قرآن یاد کر لیا تھا، ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں :

خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، حضرت سعد، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عمرو بن العاص اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت عبداللہ ابن زبیر، حضرت عبداللہ ابن سائب، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو درداء، حضرت مجمع بن حارثہ، حضرت انس بن مالک اور ان کے چچا ابو زید، اُمہات المومنین حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہم ۔ (مناہل العرفان: ۱/ ۱۷۴)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عہد نبوی ﷺ میں کل صحابہ جنھیں پورا قرآن یاد تھا، چالیس ہی تھے، یہ تو وہ اصحاب ہیں جن کا نام روایات میں محفوظ رہ گیا ہے، ورنہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں قرآن مکمل حفظ کر لیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غزوۂ بئر معونہ جو آنحضور ﷺ کی زندگی میں پیش آیا، صرف اس ایک غزوہ میں ستر حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم کے شہید ہونے کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ہونے والی جنگ یمامہ میں بھی اتنے ہی حفاظ شہید ہو گئے تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد نے پورا قرآن حفظ کر لیا تھا، پھر ایسے صحابہ کا تو کوئی شمار نہیں جنھوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے: کیوں کہ نماز میں قراءت فرض ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے قرآن سرے سے یاد ہی نہ ہو، پھر حفاظ کی یہ تعداد عہد بہ عہد بڑھتی ہی رہی اور اس طرح ایک بڑی تعداد کے ذریعہ سینہ بہ سینہ قرآن مجید منتقل ہوتا رہا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

بصورتِ کتابت

قرآن کی حفاظت کا خصوصی اور نہایت اعلیٰ انتظام ہوا کہ اسے حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ بھی محفوظ کیا گیا، نبی ﷺ قرآن کی کتابت کا خاص اہتمام فرماتے تھے، جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی، سب سے پہلے اسے لکھواتے، پھر پڑھوا کر سنتے اور اس کی اصلاح فرماتے؛ تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے اور تب جا کر اس کی عام اشاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ نہ صرف آیات کو لکھوایا کرتے ؛ بلکہ سورتوں کے اندر آیات کا مقام اور سورتوں کی ترتیب کی بھی نشاندہی فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتبِ وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے، (ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب سورۃ توبۃ، حدیث نمبر:۳۰۸۶) عرب میں اس زمانہ میں کاغذ کمیاب تھا؛ اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھیں؛ البتہ کبھی کبھی میسر آنے پر کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے جاتے تھے اور پھر یہ کتابت شدہ صفحات رسول اللہ ﷺ کے دولت خانہ میں محفوظ کر دیئے جاتے۔ (مناہل العرفان:۱/۱۷۸)

اس کام کے لئے آپ ﷺ نے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مقرر فرمایا تھا، ان کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے، یعنی چالیس صحابہ تھے، جو نبی کریم ﷺ کے لئے کتابتِ وحی کا فریضہ انجام دیتے تھے، ان میں سے چند مشہور صحابہ کے نام ہیں :

حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ثابت بن قیس، حضرت معاویہ، حضرت ابان بن سعید، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہم۔

اس طرح عہد نبوی ﷺ ہی میں قرآن مجید پورا کا پورا لکھا ہوا موجود تھا اور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کی ترتیب متعین فرما دی تھی، بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس بھی قرآن کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، گرچہ وہ مختلف ٹکڑوں، ہڈیوں اور پارچوں پر لکھے ہوئے تھے، خود حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھ کر قرآن کو کاغذ کے مختلف ٹکڑوں سے اکٹھا کیا کرتے تھے: ''كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم نؤلف القرآن من الرقاع'' (ترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل الشام والیمن، حدیث نمبر:۳۹۵۴) اس کا اندازہ ان روایات سے بھی ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ نے قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان کی ہے اور دشمن کے علاقہ میں قرآن کے نسخے لے جانے سے منع فرمایا ہے؛ تاکہ دشمن اس کی بے حرمتی نہ کریں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مکمل طور سے لکھا ہوا تھا اور مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس بھی اس کے نسخے موجود تھے۔

عہدِ صدیقی میں

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک واقعہ پیش آیا کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدشہ محسوس کیا کہ کہیں اس طرح کی مزید جنگوں میں حفاظ کی بڑی تعداد شہید نہ ہو جائے؛ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ اُمت کی اجتماعی تصدیق سے ایک نسخہ تیار کرائیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ابتداءً ایک ایسے کام کو انجام دینے میں تامل ہوا، جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بار بار توجہ دلانے پر ان کو بھی اطمینان ہوگیا، اب اس اہم کام کے لئے کسی غیر معمولی صلاحیت کے حامل فرد کی ضرورت تھی؛ چنانچہ ان کی نظر انتخاب

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر پڑی؛ کیوں کہ وہ نوجوان، سمجھدار، بااعتماد شخص تھے، حافظ قرآن بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کا فریضہ بھی انجام دے چکے تھے، یہ کام اس قدر ذمہ داری کا متقاضی اور اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا، جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا'' فوا اللہ لو کلفونی نقل جبل من الجبال الخ۔ (بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن، حدیث نمبر: ۴۷۰۱)

اس مرحلہ میں جمع قرآن کی اہمیت اور اس سلسلے میں کئے جانے والے غیر معمولی اہتمام کا اندازہ اس طریق کار سے لگایا جاسکتا ہے، جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر اختیار کیا، انھوں نے قرآن کا یہ نسخہ محض اپنے حفظ یا دیگر حفاظ صحابہ کی یادداشت کی بنیاد پر تیار نہیں کیا؛ بلکہ اس کے لئے ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ؛ لیکن انتہائی باوثوق اور محفوظ طریقہ کا انتخاب کیا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک اپنے نسخے میں کوئی آیت درج نہیں کرتے تھے، جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی دونوں شہادتیں نہ مل جاتیں، پھر وہ لکھی ہوئی آیات تب ہی قبول فرماتے تھے، جب اس تحریر کے سلسلے میں دو لوگ گواہی دے دیتے کہ یہ آیات آنحضور ﷺ کی نگرانی میں لکھی گئی تھیں، پھر ان طریقوں سے اکٹھا کی ہوئی آیات کا مقابلہ ان مجموعوں سے کیا جاتا تھا، جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیار کر رکھے تھے؛ چنانچہ تحقیق کے ان اعلیٰ اُصولوں کے تحت اُمت کی اجتماعی تصدیق سے قرآن مجید کا ایک نسخہ وجود میں آیا، اگر ہم اس نسخے کی تیاری کے سلسلہ میں برتی جانے والی غیر معمولی احتیاط اور محفوظ طریق کار کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مقصد صرف قرآنی آیات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا نہیں تھا، کیوں کہ اس طرح کے تو بے شمار نسخے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس موجود تھے؛ بلکہ اس کا مقصد ایک ایسا نسخہ تیار کرنا تھا، جو اُمت کی اجتماعی تصدیق کے ذریعہ تیار شدہ ہو اور جس کی موجودگی میں آگے چل کر کسی فتنہ واختلاف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

عہدِ صدیقی کے کام کی خصوصیات

عہد صدیقی میں مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق قرآن کا جو نسخہ تیار ہوا، وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا :

- قرآن کا یہ نسخہ نہایت اعلیٰ تحقیقی اُصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور اس میں اُمت کی اجتماعی تصدیق شامل تھی۔
- اس نسخہ میں تمام آیات آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی تھیں؛ البتہ ہر سورہ علاحدہ علاحدہ لکھی گئی تھی۔
- یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔
- اس میں صرف وہی آیتیں شامل تھیں، جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری رمضان المبارک میں آپ ﷺ کو پورا قرآن سناتے وقت پڑھی تھیں اور اسی ترتیب کے مطابق تھیں، اگر کوئی منسوخ التلاوۃ آیت رہی ہو تو وہ اس میں شامل نہیں تھی۔

آپ رضی اللہ عنہ کی حیات میں یہ نسخہ آپ کے پاس رہا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ ہوگیا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد مروان نے اپنے عہد حکومت میں اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع کردہ مصاحف کے رسم الخط پر اُمت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا؛ چنانچہ مناسب نہ تھا کہ کوئی ایسا نسخہ باقی رہے، جو رسم الخط میں عثمانی مصاحف سے مختلف ہو۔

عہدِ عثمانی میں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں جمع قرآن کی نوعیت جاننے سے قبل ایک بنیادی نکتہ سے واقف ہونا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم مختلف طریقوں سے پڑھا ہے، ان مختلف طریقوں کو قرآن کی قراءتیں کہا جاتا ہے اور قرآن میں ان تمام قراءتوں کی گنجائش ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف قراءتوں کے مطابق قرآن کی تعلیم دی تھی۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اس وقت تک اسلام کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں اور اسلام دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ ان صحابہ سے قرآن سیکھتے، جو ان کے علاقہ میں موجود تھے، اس طرح مختلف صحابہ سے قرآن سیکھنے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف قراءتیں رائج ہوگئیں، اب جب وہ لوگ کبھی آپس میں ملتے تو اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط سمجھتے، اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہوتا اور بعض مرتبہ نوبت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے تک پہنچ جاتی، ظاہر ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسا دور اندیش خلیفہ اس اہم معاملہ کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا، انھیں متعدد ذرائع سے اس طرح کے واقعات کی اطلاع مل چکی تھی اور خود مدینہ میں بھی اس قسم کے بعض واقعات پیش آئے تھے؛ چنانچہ انھوں نے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور بالآخر وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام اُمت کو ایک مصحف پر جمع کر دیا جائے؛ تاکہ پھر کوئی اختلاف وافتراق پیش نہ آئے۔

عہدِ عثمانی کے کام کی خصوصیات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جو حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم پر مشتمل تھی، بعد میں چند اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس میں شامل کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، اس کمیٹی نے اس کام کے لئے درج ذیل طریقۂ کار اختیار کیا :

(۱) اس مصحف کی تیاری کے لئے انھوں نے بنیادی طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تیار کردہ صحیفہ کو سامنے رکھا، یہ صحیفہ اس وقت حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لئے ان سے حاصل کیا تھا۔

(۲) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو صحیفہ تیار ہوا تھا، اس میں سورتیں مرتب شکل میں نہ تھیں، بلکہ ہر سورت الگ

الگ جزء میں لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے ایک نسخہ میں آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق سورتوں کو مرتب شکل میں تحریر کیا۔

(۳) اس مرحلہ کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ ان حضرات نے قرآن کریم کو لکھنے کے لئے ایسا رسم الخط منتخب کیا، جس میں قرآن کی تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی غرض سے نہ تو ان پر نقطے لگائے گئے اور نہ ہی اعراب؛ تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جاسکے، یہی وہ اصل کام تھا، جس کے لئے عہد عثمانی رضی اللہ عنہ میں جمع قرآن کی ضرورت پیش آئی تھی۔

(۴) اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی قراءت میں اختلاف ہوتا تو اس کو قریش کی لغت کے مطابق لکھا جاتا؛ کیوں کہ قرآن مجید اصل میں قریش ہی کی لغت میں نازل کیا گیا تھا۔

اس طریق کار کے مطابق قرآن کریم کا جو نسخہ تیار ہوا، اس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی؛ کیوں کہ اس نسخہ میں تمام قراءتیں شامل تھیں اور ہر شخص اپنی قراءت کے مطابق ان سے تلاوت کرسکتا تھا۔

اس کمیٹی نے اس نئے مرتب کردہ مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کل پانچ مصحف تیار کرائے تھے؛ لیکن معروف عالم ابوحاتم سجستانی رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ سات مصاحف تیار کرائے گئے تھے، ان میں سے ایک مصحف مکہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ میں محفوظ رکھا گیا، اس طرح پوری اسلامی سلطنت میں ایک ہی نسخہ کو رائج کردیا گیا۔

قرآن کریم کے یہ معیاری نسخے تیار کرانے اور انھیں پوری اسلامی مملکت میں پھیلا دینے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ تمام ذاتی نسخے جلا دینے کا حکم دیا، جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے؛ تاکہ مصحف تیار کرانے کا ان کا مقصد حاصل ہوسکے اور ساری اُمت ایک ہی مصحف پر جمع ہوجائے اور پھر کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہے؛ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک قرآن مجید کی کتابت کے لئے وہی خط رائج ہے، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، اسی لئے اسے ''رسمِ عثمانی'' کہا جاتا ہے اور مصاحف کو اسی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے۔

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کے کلمات کی ترتیب توقیفی ہے اور آیات کی ترتیب بھی توقیفی ہے، اس میں اجتہاد کو دخل نہیں؛ بلکہ جس ترتیب سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ پر نازل کیا، اسی ترتیب سے آپ نے اس کی کتابت کرائی اور اسی طرح مصحف صدیقی اور مصحف عثمانی میں اسے تحریر کیا گیا؛ اسی طرح قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے، یعنی اس میں اجتہاد کو دخل نہیں، جیسا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ پر کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لکھو جس میں یہ اور یہ بات ذکر کی گئی ہے (سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر: ۳۰۱۱) جمہور کی رائے یہ ہے کہ سورتوں کے جو نام ہیں وہ بھی توقیفی ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے سورتوں کو ان ناموں سے موسوم فرمایا ہے؛ اسی لئے حدیث میں بہت سی سورتوں کے نام وارد ہوئے ہیں، جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اقرؤا الزهراوين: البقرة و آل عمران''۔ (مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قرأۃ القرآن وسورۃ البقرۃ، حدیث نمبر: ۱۹۱۰)

آیات کی مقدار کے اعتبار سے قرآن کی ان سورتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا :

(۱) **طِوال** : یہ سورۂ بقرہ سے سورۂ توبہ تک کی سات طویل سورتیں ہیں۔

(۲) **مِئِین** : وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ زیادہ یا کچھ کم آیتیں ہیں، یہ انفال سے لے کر غافر تک تیرہ سورتیں ہیں۔

(۳) **مَثانی** : جن میں سو سے کم اور عموماً مفصلات سے زیادہ آیتیں ہیں، یہ سورۂ رعد سے سورۂ فتح تک اٹھائیس سورتیں ہیں۔

(۴) **مُفصّلات** : جو سورۂ ق سے شروع ہو کر سورۂ ناس پر ختم ہوتی ہیں، پھر ان میں سورۂ حجرات سے بروج تک ''طِوال مفصّل'' اور بروج سے سورۂ بینہ تک ''اَوساطِ مفصّل'' اور اس کے بعد کی سورتیں ''قِصار مفصّل'' کہلاتی ہیں۔

تسہیل تلاوت کی کوششیں

پھر جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا اور اسلام ان لوگوں تک پہنچا جو عربی زبان سے ناواقف تھے، تو انھیں قرآن پڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک قرآن میں نہ تو نقطے لگائے گئے تھے اور نہ ہی حرکات کی ضرورت محسوس کی گئی تھی، اسی طرح تلاوتِ قرآن مکمل کرنے میں آسانی کے لئے قرآن میں مختلف حصوں کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی؛ چنانچہ بعد کے ادوار میں جیسے جیسے ضرورت محسوس کی گئی، تلاوتِ قرآن میں آسانی پیدا کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے، جن کے نتیجے میں ہر شخص خواہ وہ عربی زبان سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو، اس قابل ہو گیا کہ قرآن کو آسانی سے پڑھ سکے — تسہیل تلاوت کے یہ اقدامات درج ذیل ہیں :

قرآن مجید پر نقطے

شروع میں اہل عرب میں نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، وہ بغیر نقطوں کے لکھنے اور پڑھنے کے عادی تھے؛ چنانچہ مصاحف عثمانی بھی نقطوں سے خالی تھے، ان مصاحف کے نقطوں سے خالی ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اس طرح اس میں تمام متواتر قراءتیں سما سکیں؛ لیکن جب اسلام غیر عربوں تک پہنچا، تو انھیں بغیر نقطوں کے قرآن پڑھنے میں مشکل پیش آنے لگی؛ لہٰذا ان کی آسانی کے لئے قرآن پر نقطے لگائے گئے۔

قرآن پر نقطے لگانے کا یہ کام عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں انجام پایا، عبدالملک بن مروان نے یہ اہم کام حجاج بن یوسف کے سپرد کیا تھا اور حجاج بن یوسف نے اسے نصر بن عاصم لیثی اور یحییٰ بن یعمر عدوانی کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر نقطے لگانے کا کام سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی رحمہ اللہ نے انجام دیا اور یہ کہ عبدالملک بن مروان سے پہلے ابن سیرین کے پاس بھی ایک نقطوں والا قرآن موجود تھا، ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ابوالاسود دؤلی رحمہ اللہ نے قرآن پر سب سے پہلے نقطے لگائے؛ لیکن یہ ایک انفرادی عمل تھا اور ان کے ذاتی نسخے تک محدود تھا، پھر اس کے بعد ابن سیرین رحمہ اللہ نے بھی اپنے ذاتی مصحف پر نقطے لگائے، پھر عبدالملک بن مروان کے ذریعہ یہ کام سرکاری سطح پر انجام پایا۔

اِعراب

نقطوں کی طرح شروع میں قرآن کریم پر حرکات (زیر، زبر، پیش) بھی نہیں تھیں؛ کیوں کہ عربوں میں اس کا رواج نہ تھا اور وہ بغیر حرکات کے لکھنے پڑھنے کے عادی تھے؛ لیکن جب غیر عرب لوگ قرآن پڑھنے میں غلطیاں کرنے لگے تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ قرآن پر حرکات لگائی جائیں؛ چنانچہ سب سے پہلے ابوالاسود دؤلی رحمۃ اللہ علیہ نے حرکات وضع کیں؛ لیکن یہ حرکات اس طرح کی نہ تھیں، جیسی آج کل معروف ہیں؛ بلکہ زبر کے لئے حرف کے اوپر ایک نقطہ، زیر کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ، پیش کے لئے حرف کے سامنے ایک نقطہ اور تنوین کے لئے دو نقطے لگائے گئے، بعد میں خلیل بن احمد نے ہمزہ اور تشدید کی علامتیں وضع کیں۔

اس کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے یحییٰ بن یعمر رحمۃ اللہ علیہ، نصر بن عاصم رحمۃ اللہ علیہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے بیک وقت قرآن پر نقطے اور حرکات دونوں لگانے کی فرمائش کی، اس موقعہ پر نقطوں اور حرکات میں التباس کے خوف سے ان حضرات نے وہ حرکات وضع کیں، جو آج بھی معروف ہیں۔

مَنزِلیں، پارے اور رُکوع

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کرتے تھے، انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار متعین کر رکھی تھی اور قرآن کو سات حصوں میں تقسیم کیا تھا، ان میں سے ہر حصہ کو ''حزب'' یا ''منزل'' کہا جاتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ سات احزاب کسی معنی اور مفہوم کی رعایت کرتے ہوئے نہیں بنائے گئے تھے؛ بلکہ محض اس لئے بنائے گئے تھے کہ ہر حصہ ایک دن میں ختم ہوجائے اور اس طرح سات دنوں میں پورا قرآن ختم ہوسکے، ان احزاب کی تقسیم اس طرح تھی کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا سات سورتوں کا، چوتھا نو سورتوں کا، پانچواں گیارہ سورتوں کا، چھٹا تیرہ سورتوں کا اور آخری سورہ ''قٓ'' سے آخر قرآن تک کا تھا۔

پورے قرآن کو برابر کے تیس حصوں میں بھی تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے ''اجزاء'' یا ''پارے'' کہلاتے ہیں، یہ تقسیم من جانب اللہ نہیں ہے اور عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اس کا وجود بھی نہ تھا، حجاج بن یوسف کے زمانہ (۴۳ھ تا ۹۵ھ) میں یہ تقسیم عمل میں آئی، اس تقسیم میں قرآن کے معانی ومطالب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے؛ بلکہ قرآن کو پڑھنے، حفظ کرنے اور قرآن کی تعلیم میں آسانی کی غرض سے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی ہے، بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے یہ بات پسند فرمائی تھی کہ وہ مہینے میں ایک بار قرآن ختم کرلیا کریں، غالباً اسی ہدایت کے پیش نظر یہ تقسیم کی گئی؛ تاکہ ہر مسلمان روزانہ ایک جزء پڑھ کر مہینے میں ایک قرآن ختم کرنے کا شرف حاصل کرسکے۔

جس طرح پورے قرآن کو تیس مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اسی طرح ہر حصے کو مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یہ حصے ''رکوع'' کہلاتے ہیں، یہ تقسیم معنی کے اعتبار سے کی گئی ہے، یعنی جہاں ایک سلسلۂ کلام مکمل ہوا،

وہاں رکوع مکمل ہوگیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ از خود یہ نہیں سمجھ سکتے کہ کس جگہ تلاوت کا سلسلہ ختم کر دینا مناسب ہوگا؛ چنانچہ ان کی سہولت کے لئے یہ تقسیم عمل میں لائی گئی، تعیین رکوع کے سلسلہ میں آیتوں کی ایک مناسب تعداد کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس طرح ایک پارہ عموماً پندرہ سے بیس رکوعوں میں منقسم ہے، اس کا مقصد آیات کی ایک ایسی متوسط مقدار کی تعیین ہے، جو ایک رکعت میں پڑھی جا سکے اور اس کو رکوع اسی لئے کہتے ہیں کہ نماز میں اس جگہ پہنچ کر ''رُکوع'' کیا جائے۔

رُموزِ اوقاف

قرآن مجید کی تلاوت میں سہولت کے لئے ایک اہم اور مفید کام یہ کیا گیا کہ آیات کے درمیان ایسی علامتیں مقرر کر دی گئیں، جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ رکنا یا ٹھہرنا کیسا ہے؟ ان علامتوں کو ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، ان کی مدد سے ایک عربی سے ناواقف انسان بھی درست طریقہ سے تلاوت کر سکتا ہے اور صحیح جگہ پر ٹھہر سکتا ہے، ان علامات کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ غلط جگہ پر وقف کرنے سے معنی میں بسا اوقات غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، معنی کی اسی تبدیلی سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ علامات وضع کی گئی ہیں، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابوعبداللہ محمد بن طیفور سجاوندیؒ نے وضع کی ہیں، ان میں سے کچھ اہم رموز درج ذیل ہیں :

ط : اس کا مطلب ہے کہ یہاں بات پوری ہوگئی ہے، اس لئے یہاں وقف کرنا بہتر ہے۔

ج : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا جائز ہے۔

ز : اس کا مطلب ہے کہ یہاں وقف کرنا تو درست ہے؛ لیکن بہتر ہے کہ وقف نہ کیا جائے۔

م : یہ وقفِ لازم کا مخفف ہے، یعنی یہاں وقف نہ کیا جائے تو آیت کے معنی میں فحش غلطی کا امکان ہے؛ لہٰذا یہاں وقف کرنا ضروری ہے۔

لا : اس کا مطلب ہے کہ یہاں نہ ٹھہرا جائے اور اگر اس مقام پر وقف کیا جائے تو بہتر ہے کہ اسے دوبارہ لوٹا کر پڑھا جائے۔

قف : اس کے معنی ہیں ٹھہر جاؤ، یہ اس جگہ لایا جاتا ہے، جہاں پڑھنے والے کو یہ خیال ہو سکتا ہو کہ یہاں وقف درست نہیں۔

قرآن مجید — پریس میں

جب تک پریس ایجاد نہیں ہوا تھا، قرآن کریم کے تمام نسخے قلم سے لکھے جاتے تھے، ہر دور میں ایک جماعت نے کتابتِ قرآن کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا، پھر جب پریس ایجاد ہوا، تو سب سے پہلے ۱۱۱۳ھ میں ہیمبرگ کے مقام پر قرآن کریم طبع ہوا، جس کا ایک نسخہ اب تک دار الکتب المصریہ میں موجود ہے، اس کے بعد متعدد مستشرقین نے قرآن کریم کے نسخے طبع کرائے؛ لیکن یہ نسخے اسلامی دنیا میں مقبول نہ ہو سکے، مسلمانوں میں سب سے پہلے مولائے عثمان نے روس کے شہر سینٹ

پیٹرس برگ میں ۱۸۸۷ء میں قرآن کریم کا ایک نسخہ طبع کرایا، اسی طرح قازان میں بھی ایک نسخہ چھاپا گیا، ۱۸۲۸ء میں ایران کے شہر تہران میں قرآن کریم کو پتھر پر چھاپا گیا اور پھر اس کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں عام ہوگئے۔

کچھ اہم اعداد و شمار

- قرآن مجید کی کل سورتیں : ۱۱۴
- مکی دور میں نازل ہونے والی سورتیں : ۸۶
- مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتیں : ۲۸
- قرآن مجید کی کل آیات : ۶۲۳۶
- قرآن مجید کے کل کلمات : ۷۷۹۳۴
- قرآن مجید کے کل حروف : ۳۲۳۰۱۵
- قرآن مجید کے کل اجزاء (پارے) : ۳۰
- قرآن مجید کے کل احزاب : ۷
- قرآن مجید میں سجدوں کی تعداد : ۱۵

  (جن میں سے ایک کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہاں سجدہ کیا جائے گا یا نہیں؟)
- قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ : سورہ بقرہ
- قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت : بقرہ ۲۸۲ (آیت مداینت)
- قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ : سورہ کوثر
- قرآن مجید کتنے سال کی مدت میں نازل ہوا؟ : تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ چودہ دن
- پہلی وحی : سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیات
- آخری وحی : سورہ توبہ کی آخری دو آیات
- عہد نبوی ﷺ میں قرآن مجید کے ان حفاظ کی تعداد، جن کے ناموں کی صراحت ملتی ہے : ۴۰
- کاتبین وحی کی تعداد : ۴۰

مکی و مدنی سورتیں

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، یہ تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے، مدینہ ہجرت سے پہلے جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مکی ہیں، خواہ وہ کسی بھی جگہ نازل ہوئی ہوں اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مدنی ہیں، خواہ کسی مقام پر نازل ہوئی ہوں، آیات اور سورتوں کے درمیان مکی اور مدنی کی یہ تقسیم اگرچہ نبی کریم ﷺ سے مروی نہیں، لیکن بعد میں صحابہ اور تابعین نے آیات اور سورتوں کے بارے میں وضاحت کی کہ فلاں سورہ یا آیت مکی ہے اور فلاں مدنی، اس کے علاوہ بعض دیگر شواہد کی بنیاد پر بھی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی سورہ یا آیت مکی ہے یا مدنی؟

مکی اور مدنی سورتیں چوں کہ مختلف حالات اور ماحول میں نازل ہوئیں اور ان کے مخاطب بھی مختلف تھے، اسی لئے ان کے انداز اور اُسلوب میں فرق پایا جاتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چوں کہ زیادہ تر عرب کے بُت پرستوں سے تھا اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی؛ اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بُت پرستی کی مدلل تردید، مظاہر فطرت پر غور و فکر کی دعوت اور قرآن کریم کی شانِ اعجاز کے اظہار پر دیا گیا۔

مکی سورتوں کی خصوصیات

مکی سورتوں کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) مکی سورتوں میں عام طور سے مشرکین اور بُت پرستوں کو خطاب کیا گیا ہے اور اہل کتاب اور منافقین کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔

(۲) مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر و نشر کی منظر کشی، آنحضرت ﷺ کو صبر و تسلی کی تلقین اور پچھلی اُمتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان سورتوں میں احکام و قوانین بہت کم بیان ہوئے ہیں۔

(۳) مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی اور مختصر ہیں اور ان کا اُسلوب بیان زیادہ پُرشکوہ ہے، ان میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔

اس کے علاوہ مکی سورتوں کی پہچان کے لئے بعض علماء کے نزدیک چند مخصوص علامات بھی ہیں، جو درج ذیل ہیں :

(۱) مکی سورتوں میں عموماً ''یا ایھا الناس'' (اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں لفظ ''کلا'' (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں آیتِ سجدہ آئی ہے، مکی ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورہ جس میں آدم و ابلیس کا واقعہ آیا ہے، مکی ہے۔

مدنی سورتوں کی خصوصیات

مدینہ طیبہ میں چوں کہ ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، بُت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا؛ اس لئے یہاں احکام و قوانین اور حدود و فرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی اور اسی کے مناسب اُسلوبِ بیان اختیار کیا گیا ہے۔

مدنی آیات اور سورتوں کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں :

(۱) مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہل کتاب اور منافقین سے ہے۔

(۲) مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد و قتال کے احکام اور حدود و فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) مدنی آیات اور سورتیں طویل اور مفصل ہیں اور ان کا اُسلوبِ بیان مکی سورتوں کی بہ نسبت سادہ ہے۔

اس کے علاوہ مدنی سورتوں کی بعض علامات درج ذیل ہیں :

(۱) مدنی سورتوں میں عموماً ''یا ایھا الذین آمنوا'' (اے ایمان والو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں جہاد کی اجازت یا اس کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

اِعجاز قرآن

معجزہ کے معنی ایسی چیز کے ہیں، جس کو پیش کرنے سے مخلوق عاجز ہو، کسی چیز کے معجزہ ہونے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں :

اول : یہ کہ مدعی نبوت نے مخالفین کو اس کے مقابلہ کی دعوت دی ہو۔

دوسرے : جن کو چیلنج دیا گیا ہو، ان کے سامنے مقابلہ کرنے کا محرک موجود ہو۔

تیسرے : مقابلہ اور مزاحمت کی کوشش میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

اگر غور کریں تو قرآن مجید میں یہ تینوں باتیں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ نے بار بار چیلنج کیا کہ جو لوگ اس کو خدا کی کتاب نہیں مانتے وہ اس کی نظیر لا کر دکھائیں، کبھی پورے قرآن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ اس کی مثال نہیں لا سکتے، کبھی دس سورتیں لانے کا چیلنج کیا گیا اور کبھی کہا گیا کہ اس جیسی ایک ہی سورت لا کر بتادو :

○ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً۔ (اسراء:۸۸)

کہہ دو کہ اگر انسان اور جنات سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو وہ ہرگز نہ لاسکیں گے؛ اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں؟

○ قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللهِ هُوَ أَهْدَى مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (قصص:۴۹)

(اے نبی) ان سے کہو: اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب، جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو۔

○ أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُوْنِ اللهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (ہود:۱۳)

کیا یہ کہتے ہیں کہ (آپ نے) اسے گڑھ لیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو تم بھی دس سورتیں اسی کی مثل گڑھی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن کو بھی تم (بلا) سکتے ہو بلا، لو اگر تم سچے ہو۔

○ وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (بقرہ: ۲۳)

ہم نے جو کتاب اپنے بندہ (محمد رسول اللہ ﷺ) پر اُتاری ہے، اگر اس (کے اللہ کی طرف سے ہونے) میں تم کو شک ہو تو تم اس جیسی ایک سورت بھی لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو، اگر تم سچے ہو۔

قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کا محرک بھی موجود تھا؛ کیوں کہ اہل مکہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کا انکار کرتے تھے اور آپ کی مخالفت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی؛ حالاں کہ یہ بات ان کے لئے بہت آسان تھی کہ وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے لوگوں کو قرآن مجید پر ایمان لانے سے روکتے۔

اس چیلنج کے قبول کرنے میں کوئی مانع بھی نہیں تھا؛ کیوں کہ ان کی زبان بھی عربی تھی اور وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان پر ناز کیا کرتے تھے۔

قرآن کا یہ چیلنج اور معجزہ ہونا کس پہلو سے ہے، اس سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں کہی ہیں اور ان میں حقیقت ونتیجہ کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

زبان و بیان

یہ بات سبھوں کو تسلیم ہے کہ قرآن مجید زبان و بیان اور بلاغت کے اعتبار سے ایک زبردست معجزہ ہے، اس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی تھا، جنھوں نے عہد نبوت میں آپ ﷺ کی بدترین مخالفت کی، اس سلسلہ میں دو مثالیں بہت واضح ہیں: ایک ولید بن مغیرہ کی جو ابوجہل کا بھتیجہ تھا، جس نے قرآن مجید سننے کے بعد کہا :

واللہ ! إن لقوله حلاوة ، وإن عليه لطلاوة ، وإن أعلاه لمثمر ، وإن أسفله لمعذق ، وإنه ليعلو وما يعلى عليه۔ (بیہقی فی شعب الایمان، حدیث نمبر: ۱۳۴)

خدا کی قسم! ان کے کلام میں ایک شیرینی ہے، اس میں حسن وشادابی ہے، اس کی شاخیں ثمر آور ہیں اور اس کی جڑ سیراب ہے، یہ بلند رہے گا اور کوئی اس سے بلند نہ ہو سکے گا۔

دوسرا واقعہ عتبہ بن ربیعہ کا ہے، جو مشرکین مکہ کی طرف سے ترجمان بن کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بادشاہت، عورت اور مال و زر کی پیشکش کی تھی، جب آپ نے اس پر قرآن کی چند آیات تلاوت فرمائیں تو ایسا متاثر ہوا کہ قریش کی طرف آنے کے بجائے اپنے گھر چلا گیا اور جب قریش مکہ نے سوال کیا تو بے ساختہ بول اُٹھا :

واللہ ما هو بشعر ، ولا بسحر ، ولا بكهانة ، وقد ناشدته بالرحم أن يكف خشية أن ينزل بكم العذاب ، وقد علمتم أن محمدا إذا قال شيئاً لم يكذب۔ (الدر المنثور: ۷/۴۵)

خدا کی قسم! یہ کلام نہ تو شعر ہے، نہ جادو اور نہ کہانت، میں نے ان کو رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ رُک جائیں، اس خوف سے کہ کہیں تم پر عذاب نازل نہ ہو جائے، تم کو اچھی طرح اس بات کا علم ہے کہ محمد (ﷺ) جب کچھ کہتے ہیں تو غلط نہیں ہوتا۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی کوشش کی، انھوں نے ایسا مضحکہ خیز کلام پیش کیا، جس کو سن کر عربی کا معمولی زبان داں اور جس کا ترجمہ سن کر ایک عام انسان بھی ہنسے بغیر نہ رہے گا، مثلاً: مسیلمہ کذاب نے قرآن مجید کے مقابلہ میں ایسا کلام پیش کرنے کی کوشش کی، جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس پر (نعوذ باللہ) اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، جیسے اس نے سورۂ عادیات کے اُسلوب پر یہ بے معنی فقرے کہے :

والطاحنات طحناً ، والعاجنات عجناً ، والخابزات خبزاً ، والثاردات ثرداً، واللاقمات لقماً ، إهالة وسمناً ، لقد فضلتم على اهل الوبر ، وماسبقكم أهل المدر ، ريفكم فامنعوه والمقبر فاْووه والباغي فناوؤه۔

قسم ہے گیہوں پیسنے والیوں کی اور آٹا گوندھنے والیوں کی اور روٹی پکانے والیوں کی اور ثرید بنانے والیوں کی اور لقمہ بنانے والیوں کی، چربی کو اور گھی کو، تم کو خیمے والوں پر فضیلت دی گئی ہے اور مٹی کے گھر والے تم پر سبقت حاصل نہیں کر سکے، اپنے دیہات کی حفاظت کرو، ان کو قبر میں پہنچا دو اور باغی کو دور کرو۔

اسی طرح بعض اور لوگوں نے قرآن کے مقابلے میں کچھ کہنا چاہا تو اللہ نے ان کی حماقت کو بے غبار کرنے کے لئے سورۂ فیل کے طرز پر ان سے درج ذیل بے کیف و بے معنی جملے کہلوائے :

الفيل ما الفيل ، وما أدراک ما الفيل ، له ذنب وبيل وخرطومه طويل ، وماذاک من خلق ربنا بقليل۔

ہاتھی، ہاتھی کیا ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ ہاتھی کیا ہے؟ اس کی سخت دُم ہوتی ہے اور لمبی سونڈ ہوتی ہے، ہمارے پروردگار کی مخلوق میں اس کی کمی نہیں ہے۔

یا یہ فقرے کہلوائے :

الم تر إلى ربک کيف فعل بالحبلى ، أخرج منها نسمة تسعى ، بين شرا سيف وحشى۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے حاملہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس سے چلنے پھرنے والا انسان نکالا، پسلیوں اور پیٹ کے بیچ سے۔

بعد کے ادوار میں بھی بعض ملحدین نے اس قسم کی کوشش کی ہے، جیسے: ابوالعلاء معری، ابوالطیب متنبی اور عبداللہ بن المقفع؛ لیکن ہمیشہ یہ کوشش نامسعود اور نامراد ثابت ہوئی، ابن مقفع (م: ۱۴۲ھ) جس نے کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ کر کے عربی ادب کی دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے، کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے بڑی محنت کے ساتھ قرآن کے مقابلہ میں کچھ لکھنے کی کوشش کی؛ لیکن جب ایک بچے سے قرآن کی یہ آیت سنی :

وقيل يأرض ابلعي مائک ويا سماء أقلعي۔ (ہود: ۴۴)

اور کہا گیا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا۔

تو جو کچھ لکھا تھا اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور اس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہا کہ اس کلام کا مقابلہ ممکن نہیں اور یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر عربی زبان و ادب کے شہسوار انگشت بدنداں ہیں اور اس کا صحیح ادراک وہی لوگ کرسکتے ہیں، جو عربی زبان اور اس میں معانی و بلاغت کا ادراک رکھتے ہوں؛ لیکن دو باتیں وہ ہیں جن کو عام لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں، ایک: بعض مفاہیم کے لئے مفردات کا انتخاب یا ایجاد، جیسے :

- بھلائی اور برائی کے لئے عربی زبان میں بہت سے الفاظ ہیں؛ لیکن قرآن نے اس کے لئے ایک نئی اور اچھوتی تعبیر اختیار کی ہے، اور وہ ہے "معروف" اور "منکر" — معروف بھلائی کے لئے اور منکر برائی کے لئے، معروف کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو جانی پہچانی ہو، جس کا لوگوں میں عام چلن اور رواج ہو اور منکر کے اصل معنی اَن پہچانی چیز کے ہیں، جو خلافِ معمول کبھی پیش آجائے، پس نیکی کو معروف کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی سماج میں نیکی کا عام چلن ہونا چاہئے اور منکر سے برائی کو تعبیر کرکے اس جانب اشارہ کیا گیا کہ اگر سماج میں کبھی برائی کا کوئی کام ہو بھی جائے تو وہ خلافِ معمول محسوس ہو۔
- دنیا کی مختلف زبانوں اور مختلف مذہبی کتابوں میں نیز خود عربی زبان میں بھی کسی انسان کی مدد کرنے اور کسی شخص کو کچھ دینے کے لئے مختلف الفاظ مروج رہے ہیں؛ لیکن قرآن مجید نے اس کے لئے ایک خاص اصطلاح "زکوٰۃ" کی استعمال کی ہے، زکوٰۃ کے اصل معنی پاک ہونے کے ہیں، یعنی یہ تصور دیا گیا کہ جب تم کسی غریب بھائی کی مدد کرتے ہو تو تمہارا مال پاک صاف ہوجاتا ہے، پس جیسے انسان کو جسم اور کپڑے کے میل وکچیل کے دور ہونے پر کوئی رنج وافسوس نہیں ہوتا؛ بلکہ خوشی اور مسرت کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح زکوٰۃ دے کر انسان کو خوش ہونا چاہئے نہ کہ رنجیدہ، اس خوبصورت تعبیر کے علاوہ کیا کسی اور لفظ سے یہ مفہوم ادا ہوسکتا ہے؟
- کہیں دو مدمقابل مفہوم کو بیان کرنے کے لئے ایک میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اور دوسرے میں واحد کا، اور اس میں گہری معنویت سموئی ہوئی ہے، جیسے "من الظلمات إلی النور" ظلمات، ظلمت (تاریکی) کی جمع ہے، جس سے گمراہی کے راستوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور نور (روشنی) سے اسلام کی طرف، پہلے لفظ کو جمع لاکر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ گمراہی کے بہت سے راستے ہیں اور نور کو واحد لاکر یہ بات واضح کردی گئی کہ ہدایت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اسلام۔
- میاں بیوی کے ازدواجی تعلق کے لئے عربی زبان میں متعدد الفاظ ہیں؛ لیکن قرآن نے ایک موقع پر کہا ہے :

فأتوا حرثكم أنی شئتم۔ (البقرۃ: ۲۲۳)

توتم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔

اس تعلق کو "کھیتی پر آنے سے" تعبیر کرکے بہ یک وقت تین باتوں کی طرف اشارہ کردیا گیا، اول یہ کہ جیسے ایک کسان کو اپنے ہی کھیت میں کاشتکاری کا حق ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے کھیت میں، اسی طرح ایک مرد کے لئے صرف اپنی منکوحہ ہی سے

یہ تعلق جائز ہے، دوسرے: اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ جنسی انتفاع اس طور پر ہونا چاہئے کہ وہ فطری راستے میں ہو؛ کیوں کہ جب ہی اس کو اولاد کی شکل میں پیداوار حاصل ہوسکتی ہے، اس کے لئے غیر فطری راستہ اختیار کرنا جائز نہیں، تیسرے: کسی شوہر کے لئے اپنی بیوی سے تعلق کا مقصد صرف جنسی خواہش کی تکمیل نہ ہونی چاہئے؛ بلکہ حصولِ اولاد ہونا چاہئے۔

یہ تو چند مثالیں کسی خاص فکر وانتخاب کے بغیر ہیں، ورنہ قرآن مجید کے جس لفظ کو جہاں سے اُٹھائیے، ایسا لگتا ہے کہ ایک دُرِ بے بہا ہے اور اس کو جہاں رکھا گیا ہے، وہی اس کی جگہ ہے۔

دوسری بات جس کو عام لوگ بھی محسوس کر سکتے ہیں، یہاں تک کہ غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی، وہ ہے کسی تکلف اور تصنع کے بغیر قرآن مجید کے الفاظ اور فقروں کے درمیان صوتی آہنگ، یہ وہ چیز ہے کہ ایک ایسا شخص جو عربی زبان سے بالکل واقف نہیں ہوتا، وہ بھی جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے یا قراءت کو سنتا ہے تو عش عش کرتا ہے۔

- جیسے کہیں آیات کا ایسا تسلسل، جس میں ہر آیت کا اختتام ''و، ن'' پر ہوتا ہے :

  قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ، هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ۔ (مومنون:۱-۱۱)

- کہیں ایسی آیات کا سلسلہ جن کے اخیر میں ''یاء'' اور ''نون'' یا اس کے ہم وزن الفاظ آئے ہیں، جیسے: سورۂ انبیاء، آیت نمبر: ۶۸ تا ۹۱۔
- کہیں اخیر میں الف اور اس سے پہلے زبر والا حرف، جیسے سورہ نباء آیت: ۶ سے لے کر سورت کے ختم تک ایک ہی طرح کا آہنگ: ''مہادا، ازواجا، سباتا، لباسا، معاشا، شدادا'' وغیرہ۔
- کہیں فقرے تاء تانیث پر ختم ہوتے ہیں، جیسے سورۂ تکویر اور سورۂ انفطار کی ابتدائی آیات۔
- کہیں اخیر میں ''ھا'' کا اختتامیہ، جیسے پوری کی پوری سورۃ ''شمس'' —— غرض کہ پورے قرآن مجید میں تقریباً ہر سورت اور ہر رُکوع کا ایک الگ منفرد اور خوبصورت آہنگ پایا جاتا ہے، جو پڑھنے والے کو نہ کبھی سیر ہونے دیتا ہے اور نہ سننے والے میں کبھی اس سے اُکتاہٹ پیدا ہوتی ہے، یہ محض خوش عقیدگی نہیں؛ بلکہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ عربی زبان کا ایک حرف نہیں جانتے؛ بلکہ بعض وہ لوگ جو قرآن مجید پر ایمان بھی نہیں رکھتے، وہ بھی جب قرآن کو سنتے ہیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ان کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

فطرت سے ہم آہنگ قانون

قرآن کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو وہ ''قوانین'' ہیں، جن کو قرآن نے پیش کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآن کی تعلیمات پوری طرح انسانی فطرت اور ضرورت و مصلحت سے ہم آہنگ ہیں اور آج پوری دنیا قرآن کے پیش کئے ہوئے دستورِ حیات سے خوشہ چینی پر مجبور ہے، یوں تو زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی قانون کی افادیت تجربات کی روشنی میں واضح ہوچکی ہے؛ لیکن یہاں چند مثالوں کے تذکرہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے :

- دنیا کے اکثر مذاہب اور قوانین میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کتنی ہی

نفرت کیوں نہ ہو، مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے، اس کے نتیجہ میں اخلاقی قدریں بھی پامال ہوتی تھی اور بعض اوقات عورتوں کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے تھے، قرآن نے نہ صرف طلاق کی اجازت دی ؛ بلکہ اس کے لئے منصفانہ طریقۂ کار کی بھی رہنمائی کی ، ہندومت اور عیسائیت دنیا کے دو بڑے مذاہب ہیں ، ان کے یہاں طلاق کا کوئی تصور نہیں تھا ؛ لیکن ان مذاہب کے بہ شمول آج دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین میں طلاق کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

- اکثر مذاہب میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی گنجائش نہیں تھی ، قرآن نے نہ صرف اس کی اجازت دی ہے ؛ بلکہ اس کی تلقین کی ہے ، آج اس قانون کی معقولیت سے اور اس کے مبنی بر انصاف ہونے سے کوئی سمجھدار آدمی انکار کرسکتا ہے ؟

- بیشتر قوانین میں خواتین کے لئے حق میراث نہیں تھا ، یا تو بڑے بیٹے کو میراث ملتی تھی ، یا بالغ بیٹے کو ، یا زیادہ سے زیادہ بیٹوں کو ؛ لیکن اسلام نے عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا اور آج پوری دنیا میں عورتوں کے لئے میراث کے استحقاق کو تسلیم کیا جارہا ہے۔

- قرآن مجید نے سخت جرائم پر جسمانی سزائیں مقرر کی ہیں ، آج ماہر نفسیات اس بات پر متفق ہیں اور جرائم کے اعداد و شمار اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جسمانی سزائیں ہی مجرم کو جرم سے روکنے میں مؤثر ہوتی ہیں۔

- قرآن نے قتل اور جسمانی زیادتی کی سزا میں مجرم کے قتل کے مقابلہ قتل اور جسمانی نقصان کے مقابلہ اسی قدر نقصان کا حکم دیا ہے ، جس کو '' قصاص '' سے تعبیر کیا گیا ہے '' وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ '' (البقرۃ:۱۷۹) —— یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ قاتل کے لئے قتل کی سزا ہی مؤثر ہوتی ہے ؛ چنانچہ کئی ملکوں میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اسے جاری کیا گیا ہے۔

- قرآن نے مالیاتی قوانین کے ضمن میں اس بات کی تلقین کی ہے کہ مالیاتی معاملات تحریری شکل میں ہونے چاہئیں :

> إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ۔ (البقرۃ:۲۸۲)
>
> جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے اُدھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

آج پوری دنیا میں اکاؤنٹ کے تحریری ریکارڈ کو ، ضروری سمجھا جاتا ہے اور خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

غرض کہ آپ قانون کے جس شعبہ کو بھی دیکھیں ، قرآن مجید کا پیش کیا ہوا قانون انسانی فطرت اور ضرورت سے حد درجہ مربوط ہے ، صحراء عرب کے ایک اُمی شخص کے لئے یہ بات کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا قانون وضع کرے ، جو قیامت تک متمدن دنیا کی رہنمائی کرتا رہے اور جس میں تمام مفاسد کا علاج موجود ہو ؟ —— یہ یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں ؛ بلکہ خود خالق کائنات کا برحق کلام ہے۔

قصص وواقعات

قرآن مجید نے ماضی کے ان قصص وواقعات کو بھی بیان کیا ہے، جن سے عالم عرب میں کوئی شخص واقف نہیں تھا، نہ ان کے اشعار میں کہیں اس کا ذکر آتا تھا اور نہ ان کے یہاں مروج کہانیوں میں اس کا کوئی سراغ تھا، مکی زندگی میں یہود ونصاریٰ کے علماء سے آپ کی کوئی ایسی طویل ملاقات نہیں ہوئی، جس میں انسان ایک دوسرے کی معلومات سے واقف ہوتا ہے، مدینہ جانے کے بعد اگرچہ کہ یہودیوں سے آپ کا سابقہ رہا؛ لیکن آپ کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مخاصمانہ تھا اور زیادہ تر آپ کی نبوت کا امتحان لینے کے لئے وہ اُلٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے، اس کے باوجود آپ نے انبیاء بنی اسرائیل اوران سے پہلے کے واقعات کو قرآن مجید میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں پندوموعظت کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں بعض قصص تو ایسے ہیں کہ جن کا خود تورات یا انجیل میں بھی ذکر نہیں ہے، یا وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کے ہیں، جیسے: اصحابِ کہف کا واقعہ، ذوالقرنین کا واقعہ، اصحابِ اُخدود کا قصہ وغیرہ۔

پھر بعض واقعات کے بیان میں قرآن نے گذشتہ آسمانی کتابوں کی تحریفات کو سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے، جیسے تورات کے بیان کے مطابق خدا نے چھ دنوں میں کائنات کی تخلیق کی اور چوں کہ اس تخلیقی عمل نے اسے تھکا دیا تھا؛ اس لئے ساتویں دن اس نے آرام کیا، (پیدائش: ۲:۲) قرآن مجید نے چھ دن میں کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا ہے؛ لیکن اس کے بعد کہا گیا ہے کہ اللہ تھکتے نہیں ہیں، (قٓ: ۳۸) مقصد یہ ہے کہ ساتویں دن اللہ کے آرام کرنے کا ذکر درست نہیں ہے؛ کیوں کہ تھک جانا خالق کی شان نہیں ہے۔

یا جیسے تورات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے، قرآن نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے: ''وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا'' (البقرۃ: ۱۰۲) اس طرح ایک پیغمبر کی زندگی پر جو غبار ڈالا گیا تھا، قرآن نے اسے صاف کر دیا ہے — حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف بھی تورات نے گناہ کی نسبت کی ہے، قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ گناہ تک پہنچے نہیں تھے: ''ولقد همت به وهم بها، لولا أن رأى برهان ربه''۔ (یوسف: ۲۴)

غرض ان واقعات تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسائی نہیں تھی اور اگر رسائی ہوتی بھی تو آپ صرف سنے سنائے واقعات بیان کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں گذشتہ تحریف شدہ کتابوں میں جو غلط بیانی کی گئی تھی، اس پر کیسے تنبیہ فرما سکتے تھے؟

پیشین گوئیاں

قرآن کریم نے مختلف اُمور کی پیشین گوئی بھی کی، یہ پیشین گوئی بہ ظاہر ناموافق حالات میں کی گئی؛ لیکن وہ غیر معمولی طور پر پوری ہوئی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

○ نزولِ قرآن کے وقت جزیرۃ العرب کے دو طرف دو بڑی طاقتیں تھیں، مشرق کی طرف ایرانی بادشاہت اور مغرب کی طرف رومی بادشاہت، ایرانی مشرک اور آتش پرست تھے؛ اس لئے ان کی فتح مشرکین مکہ کے لئے باعث مسرت ہوتی تھی، رومی عیسائی تھے اور کسی نہ کسی درجہ توحید کے قائل تھے؛ اس لئے رومیوں کی کامیابی مسلمانوں کے لئے

اطمینان کا باعث ہوتی تھی اور وہ اسے عقیدۂ توحید کے غلبہ کے سلسلہ میں فالِ نیک تصور کرتے تھے، جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا، اس وقت ایرانی فوج پے بہ پے رومیوں کو شکست دے رہی تھی، اس نے رومیوں کے اکثر شہر فتح کر لئے تھے، یہاں تک کہ وہ روم کے دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئے تھے، اس وقت بہ ظاہر اس بات کی کوئی اُمید نہیں تھی کہ رومی دوبارہ ایران کے مقابلہ کھڑے ہوسکیں گے، ان حالات میں سورۂ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں :

الٓمّٓ ، غُلِبَتِ الرُّوْمُ ، فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ، فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ، بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۤءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ، وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الروم:١-٦)

رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور وہ دن وہ ہوگا کہ جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ نصرت عطا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے، یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ کبھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کی گئی ؛ بلکہ یہ بھی فرمایا گیا کہ یہ فتح صرف ''بضع سنین'' یعنی تین سے نو سال کے اندر رومیوں کو حاصل ہوجائے گی، یہ خبر اس وقت اتنی خلافِ توقع تھی کہ ابی بن خلف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شرط باندھ لی، مگر ظاہری حالات کے خلاف رومیوں نے ہجرت کے دوسرے سال ٦٢٢ء میں ایرانیوں کو شکست فاش دے کر اپنے سارے علاقے واپس لے لئے، یہی وہ وقت تھا جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے مقابلہ اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود فتح وکامرانی حاصل ہورہی تھی، قرآن نے ''یومئذ یفرح المؤمنون بنصر اللہ'' (جس دن کہ ایمان والے اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) کا وعدہ بھی کیا تھا، گویا کہ سورۂ روم کی ان آیات میں بیک وقت دو پیشین گوئیاں تھیں، دونوں ظاہری حالات کے خلاف تھیں اور دونوں ہی پوری ہوئیں۔

○ اس وقت کا تصور کیجئے جب آپ ﷺ نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ پہنچے، جب ہجرت کے دوران آپ مقامِ جحفہ پر پہنچے، جہاں سے مکہ کی طرف راستہ نکلتا تھا تو فطری طور پر وطن اور مکہ جیسے مقدس وطن کی جدائی پر آپ کو ملال ہوا، اس موقع پر قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی :

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ۔ (القصص:٨٥)

اے نبی یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں پہلی جگہ (مکہ مکرمہ) واپس لانے والا ہے۔

غور کیجئے کہ کیا اس وقت دوبارہ مسلمانوں کے مکہ پہنچنے کا کوئی تصور بھی کیا جاسکتا تھا؛ لیکن ٹھیک اس آیت کے نازل ہونے کے آٹھ سال بعد مسلمان مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔

○ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کررہے ہیں، نبی کا خواب چوں کہ وحی کے درجہ میں ہوتا ہے؛اس لئے آپ نے عمرہ کے لئے سفر کا اعلان فرمادیا؛ لیکن اہل مکہ نے رکاوٹ پیدا کی، صلح حدیبیہ کے بعد سے آپ واپس ہوگئے اور اگلے سال عمرۃ القضا فرمایا، اس خواب کو دیکھنے کے بعد قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں :

لَقَدْ صَدَقَ اللهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاءَ اللهُ آمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِن دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحاً قَرِيْباً۔ (الفتح:۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک حق کے مطابق تھا، انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے، اپنے سر منڈاؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہیں جانتے تھے، اس لئے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی۔

بہ ظاہر اس وقت اس بات کی توقع نہیں تھی کہ جو مسلمان مکہ سے بے یار و مددگار نکال دیئے گئے ہیں، وہ پھر دوبارہ اس شہر میں داخل ہوں گے، مامون رہیں گے اور عمرہ کا فریضہ انجام دیں گے؛ لیکن اگرچہ پہلے سال مسلمان عمرہ نہیں کرسکے؛ لیکن اگلے ہی سال یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

○ اسی طرح قرآن نے یہ پیشین گوئی کی کہ من جانب اللہ یہ کتاب ہمیشہ محفوظ رہے گی :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (الحجر:۹)

اس نصیحت نامہ کو ہم نے اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کون خیال کرسکتا تھا کہ دوسری مذہبی کتابیں تہہ وبالا کردی گئیں اور انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں نے ان کی اصل شکل بدل کر رکھ دی، قرآن مجید اس سے محفوظ رہ سکے گا؛ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کتنی ہی بار مسلمانوں نے شکست کا سامنا کیا، آبادی کی آبادی نذر آتش کردی گئی، کتب خانے جلا دیئے گئے اور بستی کی بستی قتل عام میں تہہ تیغ کردی گئی؛ لیکن اس کے باوجود ایک حرف کے فرق کے بغیر قرآن مجید آج تک محفوظ ہے، نہ صرف کتابوں میں محفوظ ہے؛ بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں نے اسے محفوظ کر رکھا ہے اور صرف قرآن کے الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے؛ بلکہ قرآن کا رسم الخط، قرآن کی صحیح تشریحات، عربی زبان اور نزولِ قرآن کے زمانے کے اُسلوب بیان کی بھی من جانب اللہ حفاظت کی گئی۔

اس کے علاوہ بھی قرآن کی متعدد پیشین گوئیاں ہیں، جو بہ ظاہر ناموافق حالات میں دی گئیں؛ لیکن غیر معمولی طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پورا فرمایا۔

سائنسی حقائق

قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ایک اہم پہلو وہ سائنسی اور کائناتی حقائق ہیں، جن سے قرآن نے پردہ اُٹھایا ہے اور جن کا نزولِ قرآن کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہ ہوسکتا تھا، قرآن مجید میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں، یہاں چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے :

○ سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی وجود تھا، ایک دھماکہ کے ذریعہ اس کے حصے بکھرے ہوئے اور اس طرح وہ نظامِ شمسی وجود میں آیا، جس کا حصہ یہ عالمِ ارض ہے، قرآن مجید نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا۔ (الانبیاء: ٣٠)

کیا جو لوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں انھیں علم نہیں کہ آسمان و زمین ایک ملے ہوئے تھے،
پھر ہم نے دونوں کو الگ کر دیا۔

○ قرآن مجید کا ارشاد ہے :

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ۔ (الانبیاء: ٣٠)

اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے، سو کیا پھر بھی یہ لوگ یہ ایمان نہیں لاتے۔

آج یہ بات تجربہ و مشاہدہ میں آچکی ہے کہ تمام حیوانات اور نباتات کی زندگی پانی پر موقوف ہے، جب پانی کا درجۂ حرارت کم ہوتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں آکسیجن کو محفوظ کرلیتا ہے اور جب منجمد ہوتا ہے تو آکسیجن خارج کرتا ہے، جس سے سمندری جانوروں کو اپنی زندگی کے بچانے میں مدد ملتی ہے۔

○ ایک عرصہ تک سائنس دانوں کی رائے تھی کہ ''ذرہ'' (Atom) ناقابلِ تقسیم ہے، گذشتہ صدی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''ایٹم'' بھی تقسیم ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ وہ بھی پروٹون، نائیٹرون اور الیکٹروں پر مشتمل ہوتا ہے، سائنس کی دنیا میں اس سے ایک انقلاب آگیا، یہی تحقیق نیوکلیر بم کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی، اب قرآن مجید کی اس آیت کو ملاحظہ کیجئے جو بتاتی ہے کہ ذرہ بھی تقسیم ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ ''ذرہ'' سے چھوٹی شئے بھی کائنات میں موجود ہے :

وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِن ذٰلِكَ
وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔ (یونس: ٦١)

اور آپ کے پروردگار سے ذرہ برابر (بھی کوئی چیز) غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی، مگر یہ سب کتابِ مبین میں ہے۔

○ موجودہ دور کے سائنسی اکتشافات میں یہ بھی ہے کہ جب انسان فضاء میں بلندی کی طرف چڑھتا ہے تو آکسیجن کم ہونے لگتی ہے، جہازوں اور راکٹوں کے سفر میں مسافر اس کا تجربہ کرتے ہیں، نزولِ قرآن مجید کے زمانہ میں نہ فضائی سواریاں تھیں،

نہ انسان نے چانداور مریخ تک رسائی حاصل کی تھی؛ لیکن اس وقت قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا :

وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِيْ السَّمَاءِ۔ (الانعام:۱۲۵)

اور جس کے لئے وہ ارادہ کرلیتا ہے کہ اسے گمراہ رکھے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کردیتا ہے، جیسے اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔

○ قدیم ترین عہد سے انسان یہ تصور کرتا رہا ہے کہ مذکر ومؤنث کا نظام صرف جانداروں میں ہے؛ لیکن سائنس کی موجودہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ نظام بناتات میں بھی ہے اور جمادات میں بھی، یہاں تک کہ الیکٹرک کی پیدائش میں بھی مثبت اور منفی پہلوؤں کا دخل ہوتا ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہا ہے :

○ وَمِن كُلِّ شَيْئٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (الذاریات:۴۹)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

○ سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (یٰسین:۳۶)

وہ ذات جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس یعنی نوعِ انسانی میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

یہ دوسری آیت صراحت کرتی ہے کہ نر و مادہ کا نظام نباتات میں بھی ہے، انسانوں میں بھی اور ایسی چیزوں میں بھی جن کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں تھا۔

○ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جنین جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو بہ ظاہر وہ ایک غلاف میں نظر آتا ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ تین باریک جلدوں میں ہوتا ہے، ان جھلیوں کے الگ الگ نام "Endo Derm, Meso Derm, Ecto Derm" بھی دیئے گئے ہیں، قرآن نے غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقاً مِن بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ۔ (الزمر:۶)

وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر انھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔

’’ظلمت‘‘ کے اصل معنی تاریکی کے ہیں، یہ یہاں حجاب کے ہم معنی ہے؛ کیوں کہ یہ جھلی روشنی کو اندر پہنچنے سے روکتی ہے۔

○ پودوں میں ہوا کے ذریعہ نر پودے کے مذکر اعضاء مادہ پودے میں منتقل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بارآور ہوتے ہیں، عربی زبان میں بارآور کرنے کو ’تلقیح‘‘ کہتے ہیں، غالباً قرآن مجید کی اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوْهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِيْنَ۔ (حجر:۲۲)

اور ہم ہی پانی سے لائی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں، پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں، پھر وہی (پانی) ہم تم کو پلاتے ہیں اور تم اس کو جمع کرنے والے نہ تھے۔

- جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جاندار کا مادۂ منویہ بہت سے زندہ جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے، جن کو مائیکرو اسکوپ کی مدد سے ہی دیکھا جاسکتا ہے، ان جراثیم کا سر بھی ہوتا ہے، گردن بھی ہوتی ہے اور دم بھی ہوتی ہے، یہ اپنی شکل میں جونک کے مشابہ ہوتا ہے، قرآن مجید نے اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کس طرح اس حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے :

إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (العلق:۱-۲)

صرف یہی نہیں؛ بلکہ انسان جن تخلیقی مراحل سے گذرتا ہے اور جن کو موجودہ سائنس نے واضح کیا ہے، قرآن مجید نے ٹھیک اسی طرح انسان کے تخلیقی مراحل کا ذکر فرمایا ہے۔ (المومنون: ۱۴)

- اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں مختلف ایسی چیزیں رکھی ہیں، جن سے اس کی شناخت متعلق ہے، جیسے: شکل وصورت، آواز، رنگ، جسم پر پائی جانے والی بعض علامات، انسان غالباً ابتداء آفرینش سے ہی اس سے واقف ہے؛ لیکن انیسویں صدی میں اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ انسان کی انگلیوں پر جو نشانات ہیں، وہ ہر انسان کے دوسرے انسان سے الگ ہیں، قرآن اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

أَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ، بَلٰی قَادِرِیْنَ عَلٰی أَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهُ۔ (القیامۃ: ۳-۴)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کے پور پور تک ٹھیک بنادینے پر قادر ہیں۔

خاص طور پر انگلیوں کے پور کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہ ایک انسان کی شناخت ہے، غرض کہ قرآن مجید آپ اپنے کتابِ الٰہی ہونے کی دلیل ہے اور ابدی معجزہ ہے :

- زبان و بیان کے اُسلوب کے لحاظ سے۔
- حکیمانہ قانون کے لحاظ سے۔
- گذشتہ قصص و واقعات کے بیان کے اعتبار سے۔
- مستقبل کی پیشین گوئیوں کے اعتبار سے۔
- سائنسی حقائق سے پردہ اُٹھانے کی جہت سے۔

ترجمۂ قرآن

قرآن مجید کے معنی ومفہوم کو غیر عربی زبان میں منتقل کرنے کو ''ترجمہ'' کہتے ہیں، ترجمہ کی دو صورتیں ہیں :

(۱) ترجمۂ تفسیریہ۔

(۲) ترجمۂ حرفیہ۔

''ترجمہ تفسیریہ'' سے مراد ہے کہ الفاظ قرآنی کی پابندی کئے بغیر مفہوم ومراد کی وضاحت کردی جائے، جس کو اُردو زبان میں عام طور پر 'تفسیر' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے جائز ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید تمام انسانیت کے لئے ہدایت ہے، اگر دوسری زبانوں میں قرآن مجید کی تشریح وتوضیح نہ ہوسکے، تو جو لوگ عربی زبان سے واقف نہیں ہیں، وہ کس طرح قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرسکتے ہیں؟

''ترجمہ حرفیہ'' سے مراد ہے لفظ بہ لفظ قرآن مجید کا معنی لکھنا، خواہ ٹھیٹھ لفظی ترجمہ ہو یا سلیس و بامحاورہ —— اس دوسرے ترجمہ کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف تھا کہ قرآن مجید کا ایسا ترجمہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ قرآن ایک معجزاتی کلام ہے اور قرآن مجید کی اعجازی کیفیت عربی الفاظ ہی میں پنہاں ہے، دوسری زبان میں قرآن مجید کے لفظی حسن و جمال اور اثر انگیزی کی صلاحیت کو منتقل کرنا ممکن نہیں۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ اگرچہ قرآن مجید کے کلمات اور فقروں کی خوبصورتی اور تاثیر کو کسی اور زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن قرآن مجید کا پیغام —— جو اس کا اصل مقصد ہے —— کو تو منتقل کیا جاسکتا ہے، ہمارے زمانہ میں تقریباً اسی نقطۂ نظر پر اہل علم کا اتفاق ہوچکا ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مشہور فقیہ علامہ سرخسی رحمہ اللہ کے بقول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اہل فارس کے لئے فارسی زبان میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کیا تھا —— البتہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے والا عربی زبان سے، اس کے گرامر اور اس کے اُسلوب بیان سے بھی واقف ہو اور اس زبان سے بھی جس میں وہ ترجمہ کررہا ہے، ترجمہ میں قرآن کے ہر ہر لفظ کا معنی نقل کیا جائے، کسی لفظ کو چھوڑا نہ جائے، نیز پوشیدہ ضمیروں اور ترکیبی حیثیتوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے، نیز ترجمہ متن قرآن کے ساتھ ہو، ایسا نہ ہو کہ صرف ترجمہ چھاپ دیا جائے اور متن قرآن کو چھوڑ دیا جائے؛ یہ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن پڑھنے والوں کا رشتہ قرآن مجید سے قائم رہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کا متن عربی زبان میں ہی لکھا جائے؛ کیوں کہ دوسری زبانوں میں عربی تلفظ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

ان سب رعایتوں کے ساتھ بھی قرآن کا جو ترجمہ ہوگا، وہ خود قرآن مجید کے حکم میں نہیں ہوگا، نماز میں اس کا پڑھنا کافی نہیں ہوگا، جیسا کہ جمہور فقہاء کا اور حنفیہ کا راجح قول ہے، ترجمہ کے پڑھنے پر تلاوت کا اطلاق کرنا درست نہیں ہوگا اور تنہا ترجمہ کو بغیر وضو کے ہاتھ لگانے کی گنجائش ہوگی۔

قرآن مجید سے متعلق فقہی احکام

قرآن مجید سے متعلق بہت سے فقہی احکام بھی ہیں: جن کا اہل علم نے ذکر کیا ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ طوالت کا باعث ہوگا؛ لیکن چند ضروری احکام جو عام طور پر لوگوں کو پیش آتے ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ دو طرح کے ہیں، ایک: قرآن کی تلاوت سے متعلق، دوسرے: قرآن کے احترام اور تعظیم سے متعلق۔

قرآن مجید کی تلاوت سے متعلق

○ جب آدمی قرآن کی تلاوت کرنا چاہے تو بہتر ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہنے اور قبلہ رُخ ہو کر تلاوت کرے، پہلے ''أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پھر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھے، اس کے بعد قرآن کی تلاوت شروع کرے۔

○ ہر نئی سورت کے شروع ہونے پر بسم اللہ پڑھنا چاہئے؛ البتہ اگر سورۂ توبہ ہی سے تلاوت شروع کر رہا ہو تب تو شروع میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر سورت کی تلاوت کرے اور اگر اوپر سے تلاوت کر رہا ہو تو سورۂ توبہ کے شروع میں ''بسم اللہ'' نہیں پڑھے؛ کیوں کہ مصحف عثمانی میں سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھا گیا ہے۔

○ قرآن مجید کی تلاوت کے لئے کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے، کھڑے ہو کر بھی تلاوت کی جاسکتی ہے، بیٹھ کر بھی، لیٹ کر بھی، پیدل یا سواری پر چلتے ہوئے بھی، تکیہ وغیرہ سے ٹیک لگائی ہوئی حالت میں بھی؛ البتہ بہتر ہے کہ ادب کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے تلاوت کی ہیئت اختیار کی جائے۔

○ بیت الخلاء اور حمام یا اس طرح کی گندگی والی جگہوں میں قرآن کی تلاوت جائز نہیں، یہ قرآن کے ادب کے خلاف ہے۔

○ جس مرد یا عورت پر غسل واجب ہو یا جو عورتیں ناپاکی کی حالت میں ہوں، ان کے لئے زبان سے قرآن مجید کا پڑھنا جائز نہیں؛ البتہ ایسے لوگ قرآنی دُعاؤں کو دُعاء کی نیت سے پڑھ سکتے ہیں۔

○ جس شخص کو وضو کی ضرورت ہو، وہ قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر زبانی قرآن پڑھ سکتا ہے؛ البتہ قرآن مجید کو چھو نہیں سکتا اور اس طرح قرآن کی کتابت بھی نہیں کرسکتا کہ اس کا ہاتھ کاغذ سے لگتا ہو؛ البتہ اگر قرآن ایسے غلاف میں ہو جو غلاف قرآن کے ساتھ چسپاں کیا ہوا نہ ہو اور الگ کیا جاسکتا ہو تو اس غلاف کو چھو سکتے ہیں، اسی طرح کوئی اور کپڑے کی مدد سے بے وضو شخص قرآن مجید کو پکڑ سکتا ہے، اگر قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر ہو اور ترجمہ وتفسیر کے الفاظ قرآن مجید کے کلمات سے زیادہ ہوں تو بغیر وضو کے بھی اس کو چھوا اور پکڑا جاسکتا ہے؛ البتہ اس بات کی رعایت ضروری ہے کہ الفاظ قرآنی پر اس کا ہاتھ نہ لگے، یہی حکم ان مردوں اور عورتوں کے لئے بھی ہے جو ناپاکی کی حالت میں ہوں۔

○ جہاں لوگ دوسرے کاموں میں مشغول ہوں، وہاں زور زور سے قرآن کی تلاوت کرنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ قرآن کا ادب یہ ہے کہ لوگ تلاوت قرآن کو بغور سنیں اور یہاں اس پر عمل نہیں ہوسکے گا، اس طرح قرآن مجید کی بے حرمتی ہوگی؛ اس لئے اجتماعی قرآن خوانی بھی مکروہ ہے؛ کیوں کہ اس میں ہر شخص خود قرآن مجید پڑھتا ہے اور دوسرے کی تلاوت نہیں سنتا؛ البتہ اگر تعلیم کے لئے اس طرح پڑھا جائے تو حرج نہیں؛ کیوں کہ قرآن کا علم حاصل کرنا ایک اہم ترین فریضہ ہے۔

○ اگر انسان کسی اور کام میں مشغول ہو؛ لیکن قرآن مجید کی تلاوت بھی کرتا جائے اور قرآن مجید کی طرف اس کی توجہ باقی رہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

○ اگر تلاوتِ قرآن کریم کے درمیان رسول اللہ ﷺ کا یا انبیاء کا ذکر آجائے، یا تلاوت کے درمیان کوئی ذکر کردے تو صلاۃ وسلام کے لئے تلاوت کو موقوف نہیں کرنا چاہئے؛ البتہ یہ بہتر ہے کہ تلاوت سے فراغت کے بعد صلاۃ وسلام کے کلمات کہہ دے۔

○ اگر تلاوت کے درمیان اذان ہوتو بہتر ہے کہ تلاوت روک کر اذان کا جواب دے؛ کیوں کہ تلاوت تو وہ بعد میں بھی کرسکتا ہے؛ لیکن اذان کے جواب دینے کا موقع باقی نہیں رہے گا اور اس کے اجر سے محروم رہ جائے گا۔

○ بہتر ہے کہ کم سے کم تین دنوں میں قرآن مجید ختم کرے، نیز قرآن ختم کرتے وقت دُعاء کرنا مستحب ہے اور اُمید ہے کہ اس وقت کی دُعاء مقبول ہوگی۔

○ موبائیل، کمپیوٹر اور اس طرح کی الکٹرانک آلات کی اسکرین پر جب قرآن مجید کی آیات موجود ہوں تو اسکرین کو بغیر پاکی کے چھونا درست نہیں ہوگا؛ البتہ اسکرین کے علاوہ بقیہ حصوں کو چھویا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ وہ غلاف کے درجے میں ہے۔

قرآن مجید کے ادب واحترام سے متعلق

○ عام حالات میں قرآن مجید کو سر کے نیچے رکھنا مکروہ ہے؛ لیکن اگر سفر کی حالت میں قرآن کی حفاظت کے لئے سر کے نیچے رکھا جائے تو فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، یہی حکم اس صورت میں بھی ہے، جب قرآن کسی صندوق وغیرہ میں ہو تو اگر ایسے صندوق پر قرآن کی حفاظت کے لئے بیٹھے تو اس کی گنجائش ہے، عام حالات میں درست نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں حفاظت مقصود ہے نہ کہ بے احترامی۔

○ قرآن کی طرف پاؤں پھیلا کر رکھنا مکروہ ہے؛ لیکن اگر قرآن مجید اوپر ہے اور اس سمت میں نیچے پاؤں پھیلایا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

○ قرآن مجید کی طرف پشت کرنا اور اسے پھاند کر جانا خلافِ ادب ہے، نیز قرآن مجید کو زمین پر رکھنا بھی مکروہ ہے۔ (الفتاویٰ الحدیثیه للهیتمی: ۱۶۴)

○ جس کمرہ میں قرآن مجید ہو؛ لیکن چھپا ہوا ہو، جیسے غلاف میں ہو یا الماری کے اندر ہو تو اس میں بیوی سے صحبت کرنے میں حرج نہیں۔

○ انسانی تھوک اگرچہ ناپاک نہیں ہے؛ لیکن گندگی ہے، اس لئے قرآن مجید میں تھوک لگانا یا تھوک لگائی ہوئی انگلی سے قرآن مجید کے ورق کو چھونا اور پلٹنا جائز نہیں؛ بلکہ بعض علماء نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ (حاشیه الشروانی علی تحفة المحتاج: ۱؍۱۵۳)

○ قرآن مجید کی طرف پاؤں پھیلا کر رکھنا سخت گناہ ہے اور اگر قرآن کو اہم نہ سمجھتے ہوتے اس پر پاؤں رکھا تو یہ کفر ہے۔

○ قرآن مجید کی کتابت پاک صاف کاغذ وغیرہ پر کرنی چاہئے ، ایسی چیز پر قرآن مجید کی کتابت کرنا درست نہیں ہے جو بچھائی جاتی ہو؛ بلکہ ایسی چیز پر لکھنا مکروہ تحریمی ہے، اگر دیوار پر قرآن کی آیات لکھی جائیں اور اس کا اندیشہ نہ ہو کہ وہ زمین پر گر جائیں گی اور لوگوں کے روندنے میں آجائیں گی تو کوئی حرج نہیں ہے۔

○ قرآن مجید کا جو نسخہ بوسیدہ اور نا قابل تلاوت ہو گیا ہو، اس کو پاک کپڑے میں لپیٹ کر ایسی جگہ دفن کر دینا چاہئے ، جہاں نجاست کے ڈالے جانے کا اندیشہ نہ ہو، ایسے پرانے نسخوں کو جلانا بہتر نہیں ہے، یہ بھی جائز ہے کہ قرآن کے حروف کو مٹا دیا جائے ، غالباً موجودہ دور میں کیمیکل کے ذریعہ یہ عمل آسان ہو گیا ہے۔

○ قرآن مجید صرف تبرکاً گھر میں رکھنے کی کتاب نہیں ہے؛ بلکہ اس کی تلاوت کرنی چاہئے ؛لیکن اگر یونہی تبرکاً گھر میں قرآن پاک رکھے اور تلاوت میں اس سے غفلت ہوتی ہو تو یہ صورت بھی جائز ہے ؛ کیوں کہ مقصود قرآن مجید کا احترام و تعظیم ہے۔

○ قرآن مجید کی تزئین اور اس پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھانا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ بھی تعظیم و توقیر کے جذبہ کے تحت ہوتا ہے۔ (البحر الرائق: ۸/ ۲۰۳)

○ قرآن مجید کو مصحف عثمانی کے مطابق ہی لکھنا واجب ہے، رسم عثمانی سے ہٹ کر لکھنا جائز نہیں۔

(قرارات المجمع الفقھی الاسلامی، رابطہ عالم اسلامی، منعقدہ: ۱۴۵۴ھ)

○ قسم تو اللہ کی کھانی چاہئے ؛لیکن چوں کہ اس زمانہ میں لوگ کثرت سے قرآن کی قسم کھاتے ہیں ؛ لہٰذا اگر کوئی شخص زبان سے قرآن کی قسم کھائے یا قسم کی نیت سے قرآن مجید پر ہاتھ رکھے یا قرآن مجید اُٹھائے تو قسم ہو جائے گی اور اس پر قسم کے ہی احکام جاری ہوں گے۔ (مجمع الانہر: ۱/ ۵۴۴)

○ عربی الفاظ کا تلفظ بہت لطیف اور نازک ہے، کسی اور زبان میں اس تلفظ کی رعایت نہیں ہوسکتی، اس لئے عربی کے علاوہ کسی اور زبان جیسے انگریزی وغیرہ میں متن قرآن کا لکھنا جائز نہیں، علامہ ابن ہمام ؒ نے ''الکافی للحاکم الشھید'' سے اس کی صراحت نقل کی ہے، (فتح القدیر: ۱/ ۲۰۱) اور علامہ سیوطی ؒ نے اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق نقل کیا ہے، (الاتقان: ۲/ ۲۷۱) البتہ بعض علماء نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ عربی متن بھی لکھا جائے اور اس کے ساتھ دوسری زبان میں بھی نومسلموں کے لئے تحریر کر دیا جائے تو حرج نہیں۔

○ ○ ○

دوسرا باب

تفسیر — عہد بہ عہد

تفسیر کی تدوین وارتقاء کو بنیادی طور سے تین ادوار پر تقسیم کیا جاتا ہے :

- عہدِ اول : رسول اللہ ﷺ کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زمانہ۔
- عہدِ دوم : تابعین کا زمانہ۔
- عہدِ سوم : تبع تابعین اور ان کے بعد کا دور۔

یہ تیسرا عہد تفسیر کی تدوین کا اصل زمانہ ہے، جس میں یہ خدمت تین مرحلوں میں انجام پائی ہے۔

تفسیر — عہدِ نبوی و عہدِ صحابہ میں

رسول اللہ ﷺ کے ذمہ صرف قرآن مجید کو پہنچانا ہی نہیں تھا؛ بلکہ اس کی تشریح بھی آپ کی ذمہ داری تھی؛ اس لئے تفسیر قرآن کا آغاز آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے ہوتا ہے؛ چنانچہ کتبِ حدیث میں تفسیر سے متعلق مستقل ابواب قائم کئے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں کتنی ہی حدیثیں حضور ﷺ سے نقل کی گئی ہیں؛ بلکہ پورا ذخیرۂ حدیث ہی الفاظِ قرآنی کی تشریح یا اس کے مجمل احکام کی توضیح ہے۔

حضور ﷺ سے براہِ راست قرآن مجید کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا ہے؛ اس لئے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن سے قرآن مجید کی تشریح وتوضیح منقول ہے؛ لیکن دس صحابہ وہ ہیں، جن کو اس فن میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ان کے نام یہ ہیں :

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
(۳) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ	(۴) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ
(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما	(۶) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
(۷) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما	(۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما
(۹) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ	(۱۰) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما

پھر ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابی بن

کعب رضی اللہ عنہم سے تفسیری روایات منقول ہیں، خاص کر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''ترجمان القرآن'' کا خطاب دیا ہے، اور ان کی تفسیری مرویات سب سے زیادہ تفسیر کی کتابوں میں منقول ہیں؛ لیکن محدثین کے نزدیک ان میں سے بہت کم روایتیں قابل اعتبار ہیں۔

ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ تر جو تفسیری روایات منقول ہیں، ان کی سندیں مختصر طور پر ذکر کی جاتی ہیں ؛ تاکہ ان کی تفسیری روایات میں سے معتبر اور نامعتبر مرویات کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے :

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرویات

(۱) مُعاویہ بن صالح، علی بن ابی طلحہ، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۲) قَیس بن مسلم کوفی، عطاء بن السائب، سعید ابن جُبَیر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۳) محمد ابن اسحاق، محمد بن ابی محمد مولیٰ آلِ زید بن ثابت، عِکرمہ، سعید بن جُبَیر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۴) اسماعیل بن عبدالرحمن سُدِّی کبیر، ابو مالک، ابوصالح، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۵) عبدالملک بن جُرَیج، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۶) ضَحّاک بن مُزاحِم ہِلالی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۷) عطیہ عَوفی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۸) مُقاتِل بن سلیمان خُراسانی، مجاہد، ضَحّاک، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

(۹) محمد بن سائب کَلْبی، ابوصالح، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

ان میں سے پہلی سند حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرویات میں سب سے قوی سمجھی گئی ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی سند کی مرویات کو اپنی کتاب میں تعلیقاً نقل کیا ہے، دوسری سند بھی معتبر ہے، جسے بخاری و مسلم کے معیار پر مانا گیا ہے، تیسری سند حسن کے درجہ کی ہے؛ البتہ پہلی دو سندوں سے کم تر سمجھی گئی ہے، چوتھی اور پانچویں سندیں قابل تحقیق ہیں، نہ اِن اَسناد کی تمام مرویات معتبر ہیں اور نہ تمام مرویات نامعتبر ہیں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں سندیں ضعیف اور نامعتبر سمجھی گئی ہیں — یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیری مرویات کو علامہ ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی مصنف: ''القاموس المحیط'' نے ''تنویر المقباس'' کے نام سے جمع کیا ہے، یہ روایتیں محمد بن سائب کلبی کے واسطے سے ہیں، جن کو محدثین نے نہ صرف ضعیف مانا ہے؛ بلکہ ان کو واضع حدیث بھی قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرویات

(۱) اَعمش، ابوالضحیٰ، مَسروق، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۲) مجاہد، ابومَعمر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۳) اَعمش، ابووائل، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔

(۴) سُدِّی کبیر، مُرّہ ہمدانی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔

(۵) ابوَروق، ضحّاک، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما۔

ان میں سے پہلی، دوسری اور تیسری سندیں نہایت قوی ہیں اور خود امام بخاری رحمہ اللہ نے ان سندوں سے روایت لی ہے، روایت کا چوتھا سلسلہ مختلف فیہ ہے؛ کیوں کہ سدی کبیر کو بعض اہل علم نے معتبر مانا ہے اور بعض نے نہیں اور پانچویں سند معتبر نہیں ہے؛ اس لئے کہ ضحاک کی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرویات

سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف چوں کہ بہت سی روایتیں غلط طور پر منسوب کردی گئی ہیں؛ اس لئے زیادہ تر مرویات محدثین کے نزدیک معتبر نہیں مانی گئی ہیں، عام طور پر ان سندوں کو قابل اعتبار سمجھا گیا ہے، جو اہل بیت کے ثقہ راویوں سے ہیں، یا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے شاگردوں کے سلسلہ سے مروی ہیں؛ چنانچہ حسبِ ذیل تین اَسناد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفسیری مرویات کے سلسلے میں معتبر مانی گئی ہیں :

(۱) ہِشام، محمد بن سیرین، عبیدہ سَلْمانی، علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۲) ابن ابی حسین، ابوطفیل، علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۳) ابن شہاب زُہری، علی زین العابدین، حسین بن علی رضی اللہ عنہ، علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

ان میں سے تیسری سند نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے اور اس کا شمار 'اصح الاسانید' یعنی صحیح ترین سندوں میں ہے، پہلی سند سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں روایت نقل کی ہے اور دوسری سند بھی معتبر مانی گئی ہے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی مرویات

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی تفسیری مرویات بھی مختلف سندوں سے منقول ہیں، جن میں بعض معتبر اور اکثر نامعتبر ہیں، معتبر سندیں دو ہیں :

(۱) ابوجعفر رازی، رَبیع ابن انس، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔

(۲) وکیع، سفیان ثوری، عبداللہ بن محمد بن عَقِیل، طُفیل بن ابی بن کعب، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔

دوسری سند میں عبداللہ بن محمد رحمہ اللہ پر بعض محدثین کو کلام ہے؛ لیکن امام احمد رحمہ اللہ اور مختلف محدثین نے ان کی روایت کو مستند مانا ہے۔

ان صحابہ کے علاوہ اُم المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم سے بھی بعض آیات کی تفسیر نقل کی گئی ہے۔

تفسیر — عہد تابعین میں

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا دور آتا ہے، اس دور میں بھی تدریس اور نقل و روایت کے ذریعہ علم تفسیر کی اشاعت عمل میں آئی، اس دور میں مکہ، مدینہ اور عراق تفسیر کے اہم مراکز تھے، مکہ میں امام مجاہد، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جُبَیر رحمہم اللہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام عِکْرمہ اور طاؤس رحمہما اللہ فن تفسیر کے امام سمجھے جاتے تھے، یہ سب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے خصوصی شاگردوں میں ہیں، مدینہ کے علماء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام زید بن اسلم، ابوالعالیہ اور محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ نمایاں تھے، محمد بن کعب رحمہ اللہ کو حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے اور ابوالعالیہ کو ان تینوں صحابہ کے علاوہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی استفادہ کا موقع ملا تھا، اور زید بن اسلم رحمہ اللہ نے اکابر صحابہ کو پایا تھا۔

عراق کی درسگاہِ تفسیر کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے رکھی تھی اور یہاں کے ممتاز علماء تفسیر میں عَلْقمہ بن قَیس، مسروق بن اجدع، اسود بن یزید، مُرہ ہمدانی، عامر شَعبی، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، عہد تابعین کے ان مفسرین کے اقوال کثرت سے کتبِ تفسیر میں پائے جاتے ہیں۔

چند باتیں اس دور کو عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے ممتاز کرتی ہیں :

(۱) تابعین کے عہد میں مکی، مدنی اور عراقی مدارسِ تفسیر کی بنیاد پڑی، اہل مکہ عام طور پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی آراء کو اختیار کرتے تھے، اہل مدینہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی اور اہل عراق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی آراء کو ترجیح دیتے تھے۔

(۲) اس دور میں اسرائیلی روایات تفسیر میں بکثرت داخل ہوگئیں، کیوں کہ مختلف اہل کتاب علماء دامن اسلام میں آئے اور انھوں نے اپنی سابقہ معلومات کو بھی قرآن مجید کے بیان و تشریح کے لئے استعمال کیا۔

(۳) یوں تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی بعض آیات کی تشریح میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا؛ لیکن عہد تابعین میں اس طرح کا اختلاف نسبتاً بڑھ گیا۔

(۴) اسی عہد میں مختلف اعتقادی فرقے قدریہ اور جبریہ وغیرہ پیدا ہوئے، جن کے بعض عقائد اہل سنت والجماعت سے مختلف تھے۔

تیسرا عہد — تدوینی مراحل

تفسیر کا تیسرا عہد 'تبع تابعین' سے شروع ہوتا ہے، یہی عہد ہے جب اس فن کی تدوینی کوششوں کا آغاز ہوا اور یہ تدوین تین مراحل میں انجام پائی :

پہلا مرحلہ : محدثین نے احادیث کے مجموعوں میں احادیثِ تفسیر کا باب قائم کیا اور تفسیر قرآن کے ذیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات اور صحابہ و تابعین کے جو اقوال منقول تھے، انھیں جمع کردیا، ان محدثین میں یزید بن ہارون سُلمی رحمہ اللہ (متوفی: ۱۱۷ھ)، شُعبہ بن حَجّاج رحمہ اللہ (متوفی: ۱۷۰ھ)، وکیع بن جراح رحمہ اللہ (متوفی: ۱۹۷ھ)، سفیان بن عُیَینہ رحمہ اللہ (متوفی: ۱۹۸ھ) عبدالرزاق بن ہُمام رحمہ اللہ (متوفی: ۲۱۱ھ)، وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اسی طریقہ کو بعد میں امام بخاری رحمہ اللہ

اور امام ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اختیار کیا۔

دوسرا مرحلہ : پورے قرآن مجید کی بالترتیب تفسیر کا تھا، اس سلسلہ میں ابن ماجہؒ رحمہ اللہ (متوفی: ۲۷۳ھ)، ابن جَرِیر طَبَری رحمہ اللہ (متوفی: ۳۱۰ھ)، ابوبکر بن منذر نیساپوری رحمہ اللہ (متوفی: ۳۵۸ھ)، ابن ابی حاتم رحمہ اللہ (متوفی: ۳۲۷ھ)، امام حاکم رحمہ اللہ (متوفی: ۴۰۵ھ)، وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان حضرات نے تفسیری روایات کو کتبِ حدیث کا جزء نہیں بنایا؛ بلکہ مستقل ایک فن کی حیثیت سے انھیں جمع کیا، گویا اس مرحلہ میں فن تفسیر نے فن حدیث سے الگ مستقل صورت اختیار کی؛ لیکن ان مجموعوں میں بھی تفسیری روایات کے نقل کرنے پر اکتفاء کیا گیا اور اس پر بحث ومناقشہ کی صورت عام طور پر اختیار نہیں کی گئی، اس سے ابن جریر طبری رحمہ اللہ کا استثناء ہے، جنھوں نے تفسیری اقوال نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل بھی ذکر کئے، اقوال میں ایک کو دوسرے پر ترجیح بھی دی اور آیات سے احکام کا استنباط بھی کیا؛ چنانچہ ابن جریر طبری کو آئندہ آنے والے مفسرین کے لئے اساس وبنیاد ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اور مفسرین کی ایک بڑی تعداد نے تفسیر میں اسی نہج کو اختیار کیا ہے، جو طبری کا تھا؛ البتہ بعض نے تفسیری احادیث کو پوری سند کے ساتھ ذکر کرنے کے بجائے اختصار اور آسانی کے لئے اَسناد حذف کردیں اور اقوال نقل کرنے پر اکتفاء کیا۔

تفسیر کی تدوین کا تیسرا مرحلہ : وہ ہے جس میں 'تفسیر بالماثور' کے ساتھ ساتھ 'تفسیر بالمعقول' کو بھی شامل کیا گیا، یعنی صرف تفسیری احادیث اور صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال نقل کرنے کے بجائے اجتہاد واستنباط کے ذریعہ قرآن مجید سے اخذ کئے جانے والے احکام واشارات کو بھی تفسیر کا جزء بنادیا گیا، اس طرح فن تفسیر حدیث، لغت، قراءت، نحوی وصرفی ابحاث، معانی وبلاغت کے نکات، عقلی توجیہات، فقہی احکام، قصص وواقعات کے سلسلہ میں تاریخی شہادتوں وغیرہ کا ایک ایسا مجموعہ بن گیا، جس میں ہر جہت سے قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تفسیر قرآن کے مستقل فنی شکل میں مدون ہونے کے بعد سب سے پہلی کتاب جو آج ہمارے درمیان ہے، وہ 'تفسیر طبری' ہے، لیکن ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے بھی قرآن کی مکمل تفسیر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں جن چند شخصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ان کے نام اس طرح ہیں :

- سعید بن جبیر (شہید: ۹۴/۹۵ھ) —— ان کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے عبدالملک بن مروان (متوفی: ۸۶ھ) کی خواہش پر اس کے لئے تفسیر لکھی تھی۔
- ممتاز معتزلی عالم عَمرو بن عُبَید رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے حسن بَصری رحمہ اللہ سے قرآن کی تفسیر لکھی تھی۔
- ابن جُرَیج رحمہ اللہ (متوفی: ۱۵۰ھ) کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے تین ضخیم جلدوں میں قرآن کی تفسیر تحریر کی تھی۔
- ابن ندیم رحمہ اللہ نے 'کتاب الفہرست' میں نقل کیا ہے کہ ''سب سے پہلی تفسیر فَرَّاء (متوفی: ۲۰۷ھ) نے لکھی ہے'' —— جس کی بعض جلدیں شائع ہوچکی ہیں، اس طرح موجودہ کتابوں میں اسے تفسیر کی قدیم ترین کتاب کہا جاسکتا ہے، مگر ابھی یہ نامکمل ہے۔

معانی القرآن

اس وقت دنیا میں تفسیر کی جو پہلی کتاب مطبوعہ شکل میں موجود ہے، وہ شیخ ابوزکریا یحییٰ بن زیاد فرّاء (متوفی: ۲۰۷ھ) کی ہے، جس کو ابن ندیم نے ''کتاب الفہرست'' میں تفسیر کی پہلی کتاب مانا ہے، یہ ۱۴۴ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، نحو میں ان کا بڑا بلند مقام مانا گیا ہے، مصنف نے متقدمین کے طریقہ کے مطابق اس تفسیر کو املاء کرایا تھا، ان املا نویسوں میں محمد بن جہم سَمّری رحمہ اللہ (متوفی: ۲۷۷ھ) بھی تھے، ان کا یہ نسخہ ماضی قریب تک مخطوطوں کی شکل میں تھا، اب یہ احمد یوسف نجاتی اور محمد علی نجار کی تحقیق کے ساتھ ''معانی القرآن'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے، اس میں قرآن مجید کی حرفاً حرفاً تفسیر کا التزام نہیں کیا گیا ہے؛ بلکہ مصنف نے اہم الفاظ اور آیات کی تشریح کی ہے، اس مختصر تفسیر میں نحوی وصرفی قواعد پر بھی توجہ دی گئی ہے، مصنف کے سن وفات سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ تفسیر دوسری صدی کے اواخر میں لکھی گئی ہوگی، غرض کہ جیسے دوسری صدی کے اوائل میں فنی ترتیب کے ساتھ احادیث کا مرتب کیا ہوا ذخیرہ ہمارے سامنے ہے، اسی طرح اس صدی کے اواخر کا یہ تفسیری خزانہ بھی اُمت کے سامنے ہے۔

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے، اب قیامت تک دوسری کتاب نازل نہیں ہوسکتی؛ اس لئے اس کتاب کی خدمت سے بڑھ کر کوئی اور سعادت نہیں ہوسکتی، قرآن کی خدمت کی بنیادی طور پر دو اہم جہتیں ہیں، ایک کا تعلق الفاظِ قرآن سے ہے اور دوسرے کا تعلق معانی قرآن سے، مفسرین نے اسی دوسرے پہلو کو لیا ہے اور قرآن مجید کے معانی ومطالب کی تشریح ووضاحت کی ہے، تشریح ووضاحت میں مختلف اہل علم نے اپنے ذوق اور علمی اختصاص کے اعتبار سے قرآن کی خدمت کی ہے، جیسے کسی نے نحو وصرف اور لغت کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، کسی نے معانی وبلاغت کے پہلو کو، کسی نے احکامِ شرعیہ کے استنباط پر توجہ دی ہے اور کسی نے تصوف کے حقائق اخذ کرنے کی کوشش کی ہے؛ لیکن بنیادی طور پر تفسیر میں دو منہج اختیار کئے گئے ہیں: تفسیر بالماثور اور تفسیر بالمعقول۔

تفسیر بالماثور سے مراد ہے: قرآن، حدیث، آثار صحابہ اور تابعین کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کی تشریح۔

تفسیر بالمعقول سے مراد ہے: کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ کے ساتھ ساتھ اجتہاد واستنباط، لغت ومعانی اور دوسرے ذرائع سے بھی استفادہ کرتے ہوئے قرآن کے معانی ومطالب متعین کرنا، اس کو ''تفسیر بالرائ'' بھی کہتے ہیں، ایک رائے وہ ہے جو قرآن وحدیث میں اجتہاد اور صحیح استنباط کر کے قائم کی جائے، جیسے فقہاء ومتکلمین کرتے ہیں، یہ رائے محمود اور قابل تحسین ہے، دوسری رائے وہ ہے جس میں اپنی خواہش اور تعصب یا جہالت کا دخل ہو، جیسا کہ فرقِ باطلہ نے کیا ہے، حدیث میں جو تفسیر بالرائے کی ممانعت کی گئی ہے، اس سے یہی دوسری قسم کی رائے مراد ہے۔

تفسیر بالماثور

تفسیر بالماثور کے منہج پر جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، اس سلسلہ کی سب سے پہلی اور سب سے اہم کتاب ''جامع البیان فی تاویل اٰی القرآن'' ہے، جو تفسیر طبری کے نام سے معروف ہے، یہ مشہور محدث وفقیہ ابوجعفر محمد بن جریر طَبری رحمہ اللہ

(۲۲۴-۳۱۰ھ) کی تالیف ہے، جو طَبَرِستان کے رہنے والے تھے، یہ روایات اپنی سند سے نقل کرتے ہیں، عام طور پر ان کی روایات معتبر مانی گئی ہیں؛ البتہ انھوں نے کَعْب احبار اور وَہْب بن مُنَبِّہ کے حوالہ سے بہت سی اسرائیلی روایات بھی نقل کردی ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب ابوالفداء اسماعیل ابن کثیر دمشقی شافعی رحمہ اللہ (متوفی: ۷۷۴ھ) کی ''تفسیر القرآن العظیم'' ہے، جو تفسیر ابن کثیر کے نام سے معروف ہے، اس کتاب میں کتب احادیث کے حوالہ سے کثرت سے تفسیری روایات نقل کی گئی ہیں، بہت سے مقامات پر معتبر اور نامعتبر ہونے کے اعتبار سے حدیث کا درجہ بھی بیان کیا گیا ہے؛ لیکن ہر جگہ اس کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے، اسرائیلی روایات نقل کرتے ہوئے بے اصل اور خلافِ عقل باتوں پر تنقید بھی کی گئی ہیں، تفسیر طبری کے مقابلہ اس میں ضعیف روایتیں کم ہیں اور مختصر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اہل علم کے درمیان اس کو پذیرائی حاصل رہی ہے۔

تفسیر بالماثور کی تیسری اہم کتاب ''الدرُّ المنثور فی التفسیر بالماثور'' ہے، جو مشہور مؤلف علامہ جلال الدین بن عبدالرحمن بن ابوبکر سُیُوطی شافعی رحمہ اللہ (متوفی: ۹۱۱ھ) کی ہے، کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں دس ہزار سے زیادہ احادیث وآثار نقل کئے گئے ہیں؛ البتہ اس میں ضعیف روایتیں بھی بکثرت ہیں اور مؤلف نے احادیث کا درجہ ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔

ان کے علاوہ تفسیر بالماثور کی کچھ اہم کتابیں یہ ہیں:

- بَحر العلوم (المعروف بہ: تفسیر سَمَرقَندِی)، تالیف: نصر بن محمد سَمَرقندی رحمہ اللہ (م: ۳۷۳ھ)۔
- الکشف والبیان (المعروف بہ: تفسیر الثَّعلبی)، تالیف: احمد بن ابراہیم رحمہ اللہ (م: ۴۲۷ھ)۔
- معالم التنزیل (المعروف بہ: تفسیر البَغَوی)، تالیف: الحسین بن مسعود رحمہ اللہ (م: ۵۱۰ھ)۔
- المحرر الوَجیز تفسیر الکتاب العزیز (المعروف بہ: تفسیر ابن عطیہ)، تالیف: عبدالحق بن غالب الاندلسی (م: ۵۴۶ھ)۔
- الجواہر الحِسَان فی تفسیر القرآن (المعروف بہ: تفسیر الجواہر)، تالیف: عبدالرحمن بن محمد الثَّعلبی (م: ۸۷۶ھ)

تفسیر بالمعقول

تفسیر بالمعقول کے پہلو سے سب سے اہم کتاب ''مفاتیح الغیب'' (تالیف: ابوعبداللہ محمد ابن عمر فخر الدین الرازی الشافعی، م: ۶۰۶ھ) ہے، یہ تفسیر اپنی ضخامت اور تفصیل کی وجہ سے ''تفسیر کبیر'' کے نام سے معروف ہے، علامہ رازی نے احادیث وآثار کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ علم کلام، فقہ وقراءت، نحو وصرف، بلاغت اور حکمت وفلسفہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور فرق باطلہ کے رد پر بھی خصوصی توجہ دی ہے؛ اگرچہ بعض ناقدین نے کہہ دیا ہے کہ اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے: ''کل شئ فیہ إلا التفسیر'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تنقید مبنی بر انصاف نہیں ہے؛ بلکہ یہ روایت ودرایت کو جامع نہایت اہم تفسیر ہے؛ البتہ بعض مقامات پر فلسفہ کے مضامین میں ضرورت سے زیادہ شرح وبَسط ہے۔

تفسیر بالمعقول کی ایک مقبول کتاب علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد محمود نَسَفی (م: ۷۰۱ھ) کی ''مَدَارِکُ التنزیل وحقائق التاویل'' ہے، جو 'تفسیر مدارک' کے نام سے معروف ہے، انھوں نے 'تفسیر کشّاف' سے زیادہ استفادہ کیا ہے، اس تفسیر میں مؤلف نے اختصار کو ملحوظ رکھا ہے، عربی قواعد کی بحثوں کو اہتمام سے نقل کیا ہے، جس سے عبارت فہمی میں بڑی مدد ملتی ہے، قراءت سبعہ کو ضرور نقل کرتے ہیں، احکام فقہیہ پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں اور فقہاء کے اختلاف اور دلائل کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہیں، اسرائیلیات بہت کم نقل کرتے ہیں، اگر اس میں کوئی بات اسلام کے مزاج کے خلاف ہے تو اس پر نقد بھی کرتے ہیں، برصغیر کے بہت سے دینی مدارس میں ایک زمانہ میں ''جلالین'' کی بجائے یہی تفسیر داخل نصاب تھی، غالباً مزید اختصار کی وجہ سے اس کی جگہ ''جلالین'' نے لے لی۔

تفسیر بالمعقول میں تیرہویں صدی کی ایک اہم کتاب علامہ ابو الفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ (۱۲۱۷-۱۲۷۰ھ) کی تفسیر ''روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی'' ہے، یہ تفسیر پہلی تفسیروں کا نچوڑ اور بعد کی تفسیروں کا ماخذ ہے، مصنف نے تفسیر ابن عطیہ، البحر المحیط، کشّاف، تفسیر ابی السعود، بیضاوی اور تفسیر کبیر سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، بہت سی جگہ ان کی آراء نقل کر کے ان پر تنقید بھی کرتے ہیں، مصنف نے اعتقادی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے، وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کے زبردست ترجمان اور معتزلہ اور روافض وغیرہ کے ناقد ہیں، فقہی مسائل میں ان کا زیادہ رجحان حنفیہ اور شوافع کی طرف ہے، مگر بعض مسائل میں ان کی رائے دونوں سے مختلف بھی ہوتی ہے اس تفسیر میں نحوی قواعد کی بحثوں پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے اور کائناتی حقائق کو بھی مصنف نے جا بجا تفصیل سے پیش کیا ہے، اسرائیلیات کے بارے میں مصنف کا رویہ محتاط ہے اور بعض مفسرین نے جو اسرائیلیات نقل کی ہیں، ان کو نقل کر کے ان پر تنقید بھی کی ہے، مصنف نے ''مِنْ بابِ الاِشارات'' کے عنوان سے آیاتِ قرآنی پر صوفیاء کی واردات کو بھی نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ تفسیر بالمعقول کی چند اہم کتابیں یہ ہیں :

- انوار التنزیل واسرار التاویل (المعروف بہ: تفسیر البیضاوی)، تالیف: عبداللہ بن عمر البیضاوی (م: ۶۸۵ھ)۔
- لباب التاویل فی معانی التنزیل (المعروف بہ: تفسیر الخازن)، تالیف: عبداللہ بن محمد المعروف بالخازن (م: ۷۴۱ھ)۔
- البحر المحیط، تالیف: محمد بن یوسف بن حیان الاندلسی (م: ۷۴۵ھ)۔
- تفسیر الجلالین (المعروف بہ: تفسیر الجلالین)، تالیف: جلال الدین محلی (م: ۸۶۴ھ)، جلال الدین السیوطی (م: ۹۱۱ھ)۔
- غرائب القرآن ورغائب الفرقان (المعروف بہ: تفسیر النیسابوری)، تالیف: نظام الدین الحسن محمد النیسابوری (م: ۷۲۸ھ)۔
- ارشاد العقل السلیم (المعروف بہ: تفسیر ابی السعود)، تالیف: محمد بن محمد مصطفی طحاوی (م: ۹۵۲ھ)۔
- السراج المنیر (المعروف بہ: تفسیر الخطیب)، تالیف: محمد الشربینی الخطیب (م: ۹۷۷ھ)۔

فقہی منہج پر

قرآن مجید کا ایک اہم مضمون زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق احکام کی رہنمائی ہے؛ چنانچہ بعض اہل علم نے قرآن کی تفسیر میں خاص طور پر اس پہلو پر زور دیا ہے اور فقہی منہج پر تفسیر لکھی ہے، ایسی کتابوں میں بعض وہ ہیں، جن میں پورے قرآن مجید کی تفسیر کی گئی ہے؛ لیکن احکام فقہیہ کے اخذ واستنباط پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، اس لحاظ سے دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

تفسیر قُرطُبی

فقہی منہج پر پورے قرآن مجید کی سب سے اہم تفسیر علامہ ابو عبد اللہ محمد قرطبی رحمہ اللہ (م: ۶۷۱ھ) کی تفسیر ''الجامع

لأحکام القرآن والمبین لما تضمنه من السنة وای الفرقان'' ہے، مصنف کی نسبت سے اسے ''تفسیر قرطبی'' بھی کہا جاتا ہے، یہ تفسیر اپنی جامعیت، وضاحتِ بیان اور حسن ترتیب کے اعتبار سے عربی کی چند منتخب تفسیروں میں سے ایک ہے؛ اسی لئے بعد کے مفسرین نے کثرت سے اس سے استفادہ کیا ہے، کتاب کے شروع میں مصنف کا تفصیلی مقدمہ ہے۔

مصنف کا منہج یہ ہے کہ وہ اپنی تمام بحثوں کو ابتداء میں ہی تقسیم کردیتے ہیں، مثلاً: ''بسم اللہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں ۲۷ بحثیں ہیں، پھر نمبر وار اُن مباحث کو ذکر کرتے ہیں، صرفی، ادبی، فقہی اور اعتقادی، نیز لغوی بحثیں الگ الگ ذکر کی جاتی ہیں، احادیث وآثار کے ساتھ ساتھ مصنف نے عربی زبان کے قواعد، فصاحت وبلاغت کے اُصول، شعراء کے کلام سے استفادہ اور فقہاء کے استنباط واجتہاد کے تذکرہ کا التزام کیا ہے، دوسرے اہل علم کی آراء نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ترجیح دیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے ہیں اور فقہی مباحث — خواہ صراحتاً مذکور ہوں یا قرآنی اشارات سے اخذ کئے جاسکتے ہوں — پر مؤلف کی خصوصی توجہ ہوتی ہے، وہ فقہی اعتبار سے مالکی ہیں؛ لیکن تمام فقہاء کی آراء اور دلائل کو انصاف سے نقل کرتے ہیں اور بعض دفعہ دوسرے مکاتب فقہ کی آراء کو ترجیح بھی دیتے ہیں۔

تفسیر مَظہری

یہ ہندوستان کے مشہور بزرگ مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ کے خلیفۂ خاص قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ (متوفی: ۱۲۲۵ھ) کے قلم سے ہے، یہ تفسیر یوں تو ہر پہلو سے گرانقدر معلومات کا ذخیرہ ہے؛ لیکن فقہی احکام پر مصنف نے خصوصی توجہ دی ہے، جو آٹھ جلدوں میں طبع ہوچکی ہے؛ حالاں کہ یہ تفسیر اپنی جامعیت اور فقہی مباحث کے احاطہ کے اعتبار سے ایک ممتاز تفسیر ہے، مگر عالم عرب میں ابھی اس کا کما حقہ تعارف نہیں ہو پایا ہے، اس کا اُردو ترجمہ بھی متعدد جلدوں میں شائع ہوچکا ہے۔

ان کے علاوہ کچھ کتابیں وہ ہیں جن میں صرف آیاتِ احکام ہی کی تفسیر کی گئی ہے، تقریباً ہر دبستانِ فقہ میں اس پہلو سے قرآن مجید کی خدمت کی گئی ہے؛ لیکن اس سلسلہ کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

(۱) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر جصاص)، تالیف: احمد علی رازی جصاص (م: ۳۷۰ھ)۔

(۲) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر الکیا الھرَّاسِیْ)، تالیف: علی بن محمد الطبری الکیا لہراسی (م: ۵۰۴)۔

(۳) الاکلیل فی استنباط التنزیل (المعروف بہ: تفسیر السیوطی)، تالیف: جلال الدین السیوطی (م: ۹۱۱ھ)

(۴) احکام القرآن (المعروف بہ: تفسیر ابن العربی)، تالیف: محمد عبداللہ الاندلسی (م: ۵۴۳ھ)۔

(۵) تفسیرات احمدیہ، تالیف: ملا محمد جیون (م: ۱۱۴۰ھ)۔

(۶) نیل المرام، تالیف: نواب صدیق حسن خان (م: ۱۳۰۷ھ)۔

ادبی پہلو پر

قرآن مجید کا ایک امتیازی پہلو زبان وبیان کے اعتبار سے اس کا فصاحت وبلاغت کے اوجِ کمال پر ہونا ہے؛ بلکہ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے اور اسی لئے جو اہل مکہ قرآن مجید کو انسانی کلام قرار دیتے تھے، قرآن نے انھیں اس کی نظیر پیش کرنے کا

چیلنج کیا ہے، جو آج تک موجود ہے؛ اس لئے قرآن مجید کی بلاغت اور لسانی اعتبار سے اس کے محاسن مفسرین کا خاص موضوع رہا ہے اور مختلف مفسرین نے اس کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں تفسیر کی جس کتاب کو امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے، وہ علامہ ابو القاسم جار اللہ محمود زمخشری خوارزمی (۵۳۸-۴۶۷ھ) کی تفسیر ''کشاف'' ہے، اس تفسیر کا پورا نام ''الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوہ التاویل'' ہے، علامہ زمخشری کے بعد جن اہل علم نے تفسیر کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، انھوں نے عموماً کشاف سے استفادہ کیا ہے اور اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ادبی محاسن کو سمجھنے میں کشاف سے استفادہ کئے بغیر چارہ نہیں ہے؛ البتہ مصنف فکری اعتبار سے معتزلی ہیں؛ چنانچہ انھوں نے کشاف میں ان افکار کی بھرپور ترجمانی کی ہے، اس لئے کشاف کے مطبوعہ نسخوں پر دو حاشیے بھی شائع کئے گئے ہیں، ایک سید شریف علی جرجانی رحمہ اللہ کا، دوسرا علامہ ناصر الدین احمد اسکندری مالکی رحمہ اللہ کا، جس کا نام ہے ''الانصاف فی ماتضمنہ الکشاف من الاعتزال'' یہ دوسرا رسالہ — جیسا کہ نام سے ظاہر ہے — علامہ زمخشری رحمہ اللہ کے معتزلانہ افکار کی تردید اور اہل سنت والجماعت کی تائید وترجمانی میں ہے۔

فِرَقِ باطلہ کی تفسیریں

قرآن مجید چوں کہ احکام شرعیہ کی اساس و بنیاد ہے اور ادلہ شرعیہ میں اول درجہ پر ہے، اس لئے مختلف اعتقادی مکاتبِ فکر نے قرآن مجید کی تفسیریں مرتب کی ہیں، جن میں اہل سنت کے علاوہ، اہل تشیع اور معتزلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

معتزلہ میں یوں تو مختلف مفسرین کا ذکر ملتا ہے، جن میں ابو ہاشم عبد السلام جبائی (متوفی: ۳۲۱ھ)، ابو مسلم اصفہانی (متوفی: ۳۲۲ھ) وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، لیکن اس حلقہ کی دو کتابیں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں:

(۱) تنزیہ القرآن عن المطاعن: یہ قاضی عبد الجبار ہمدانی شافعی (متوفی: ۴۱۵ھ) کی تفسیر ہے، جس میں عربی زبان اور معتزلی عقائد کے نقطۂ نظر سے ہونے والے اشکالات کو حل کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

(۲) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل: یہ علامہ زمخشری حنفی رحمہ اللہ (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ) کی مشہور تفسیر ہے، جس کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے، جہاں زبان وادب کے پہلو سے یہ ایک بے مثال تفسیر ہے، وہیں اس کتاب میں علامہ زمخشری رحمہ اللہ فکر اعتزال کے زبردست وکیل وترجمان اور اہل السنت والجماعت کی فکر کے زبردست ناقد نظر آتے ہیں۔

اہل تشیع اور خاص کر فرقۂ اثنا عشریہ کے یہاں بھی فن تفسیر پر بڑی توجہ رہی ہے، اس فرقہ کی اہم کتب تفسیر اور ان کے مصنفین کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

(۱) تفسیر الحسن العسکری: امام حسن عسکری رحمہ اللہ (۲۳۱ھ-۲۶۰ھ)۔

(۲) مجمع البیان لعلوم القرآن: ابو علی فضل بن حسین طبرسی (متوفی: ۵۳۸ھ)۔

(۳) الصافی فی تفسیر القرآن الکریم: ملا محسن کاشی (یہ گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں ہیں)۔

(۴) بیان السعادۃ فی مقامات العبادۃ: سلطان بن محمد خراسانی (یہ چودہویں صدی ہجری کے علماء میں ہیں)۔

○ ○ ○

تیسرا باب

تفسیر — اُصول وقواعد

تفسیر کا مادہ ''ف، س، ر'' ہے، جس کے معنی واضح کرنے اور کھولنے کے ہیں، علم تفسیر سے معانی قرآن کی وضاحت ہوتی ہے؛ اس لئے اسے تفسیر کہتے ہیں۔

تفسیر کی فنی تعریف کے سلسلہ میں اہل علم نے مختلف باتیں لکھی ہیں؛ لیکن ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، اس سلسلہ میں علامہ بدرالدین زرکشیؒ کی تعریف بہت واضح ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں :

علم يفهم به كتاب الله المنزل على نبيه محمد صلى الله عليه وسلم وبيان معانيه، واستخراج أحكامه وحكمه۔

وہ علم جس سے محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو سمجھا جائے، اس کی مرادات کو واضح کیا جائے اور اس سے احکام اور حکمتوں کا استخراج کیا جائے۔

اس تعریف میں قرآن سے متعلق سارے علوم شامل ہیں، قراءت، اسباب نزول، مفردات القرآن، قرآن کی ترکیبی حیثیت کا علم، جو نحو وصرف اور معانی و بیان کے جاننے پر موقوف ہے اور قرآن سے احکام کا اخذ واستنباط اور اس کے قصص وواقعات اور آیاتِ منسوخہ سے آگہی؛ کیوں کہ ان سب کو جانے بغیر معانی قرآن کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

تفسیر سے قریبی ایک اور لفظ ''تاویل'' ہے، ''اَول'' کے معنی رجوع کرنے کے ہیں، جب کسی کلام کی وضاحت کرنی ہوتی ہے، تو الفاظ کے واسطہ سے معانی کی طرف رُجوع کیا جاتا ہے، اسی مناسبت سے تشریح قرآنی کے لئے تاویل کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، اس میں اختلاف ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے تفسیر اور تاویل ایک ہی ہے، یا دونوں میں کچھ فرق ہے؟ زیادہ تر لوگوں کا رجحان یہ ہے کہ ابتدائی دور میں تو تفسیر اور تاویل کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا تھا؛ لیکن بعد کے ادوار میں ان دونوں اصطلاحات کے درمیان تھوڑا سا فرق کیا جانے لگا، تفسیر وتاویل کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، مگر زیادہ تر اہل علم کا رجحان امام ابوالمنصور ماتریدی کے قول کی طرف ہے کہ آیات کے متبادر معنی کو بیان کرنا اور آیات کے واضح مفہوم کو نقل کرنا 'تفسیر' ہے اور آیت سے دلیل کی بنیاد پر ایسا معنی مراد لینا، جس کی طرف بلا تأمل ذہن نہ جاتا ہو، یا جس میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو، ان میں سے ایک معنی کو متعین کرنا 'تاویل' ہے —— ویسے یہ محض تعبیری اختلاف ہے، قرآن کی تشریح وتوضیح پر اس اختلاف کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تفسیر کے ماخذ

تفسیر کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ تفسیر قرآن مجید میں کن مآخذ سے استفادہ کیا جائے گا؟ دوسرے قرآن مجید کی تفسیر کرنے کے لئے کیا شرائط واوصاف ضروری ہیں؟

قرآن مجید کے مقصد ومعنی کو سمجھنے کے لئے جن ذرائع سے رُجوع کیا جاتا ہے، وہ چھ ہیں :

(۱) قرآن مجید۔	(۲) حدیث۔
(۳) آثارِ صحابہ۔	(۴) لغت۔
(۵) رائے۔	(۶) گذشتہ آسمانی کتابیں۔

قرآن مجید سے تفسیر

ان میں سب سے اہم اور زیادہ معتبر ذریعہ خود قرآن مجید ہے، قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے اہم کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) مجمل کا بیان، یعنی قرآن مجید کی ایک آیت میں کوئی حکم اجمال وابہام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، دوسری آیت سے اس کے مقصد ومراد کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے :

○ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَتَلَقّٰى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ۔ (البقرۃ:۳۷)

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لئے۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا :

قَالاَ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ۔ (الاعراف:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ ہم کو معاف نہ کریں اور ہم پر رحم نہ کریں تو یقیناً ہم بڑے گھاٹے میں آجائیں گے۔

○ اس دوسری آیت نے واضح کردیا کہ ''کلمات'' سے یہی دُعائیہ کلمات مراد ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ۔ (الفاتحۃ:۶)

ہمیں سیدھا راستہ دکھائے، ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا۔

''اَلَّذِيْنَ أَنعَمتَ عَلَيْهِمْ'' سے کون لوگ مراد ہیں؟ ''نساء:۶۹'' اس کو واضح کرتی ہے :

وَمَن يُّطِعِ اللهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُوْلٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُوْلٰٓئِكَ رَفِيْقاً۔ (النساء:۶۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا، جن پر اللہ نے انعام

کیا ہے، یعنی پیغمبر، صدیق، شہداء اور صالحین، کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت!

معلوم ہوا کہ اس سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں۔

(ب) کبھی ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوسکتے ہیں، دوسری آیت سے اس کا معنی متعین ہوتا ہے، مثلاً :

وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (الحج:۲۹)

اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔

''پرانا گھر'' کوئی اور بھی ہوسکتا ہے، —— دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ اس سے مکہ مکرمہ میں تعمیر ہونے والا 'کعبۃ اللہ' مراد ہے :

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا۔ (آل عمران:۹۶)

بے شک پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لئے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے اور وہ بابرکت بھی ہے۔

(ج) کبھی کسی گروہ کا ایک آیت میں مبہم طور پر ذکر کیا جاتا ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ اس سے کونسی قوم مراد ہے؟

كَمْ تَرَكُوْا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُوْنٍ ، وَزُرُوْعٍ وَمَقَامٍ كَرِيْمٍ ، وَنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فَاكِهِيْنَ ، كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْماً آخَرِيْنَ۔ (الدخان:۲۵-۲۸)

کتنے ہی باغ، چشمے، کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے، کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کررہے تھے، ان کے پیچھے دھرے رہ گئے، یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنادیا۔

کونسا گروہ ہے جو باغات اور چشموں سے محروم ہوگیا اور کونسی قوم ہے جس نے اس کی جگہ لی؟ —— یہاں اس کی صراحت نہیں ہے؛ لیکن ایک دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ پہلی قوم سے قوم فرعون مراد ہے، جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا اور جس قوم نے ان کی جگہ لی، وہ قوم بنی اسرائیل ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

فَأَخْرَجْنَاهُمْ مِّن جَنَّاتٍ وَعُيُوْنٍ ، وَكُنُوْزٍ وَمَقَامٍ كَرِيْمٍ ، كَذٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا بَنِىْ إِسْرَائِيْلَ ، فَأَتْبَعُوْهُم مُّشْرِقِيْنَ۔ (شعراء:۵۷-۶۰)

اس طرح ہم انھیں ان کے باغوں، چشموں، خزانوں اور ان کی بہترین قیام گاہ سے نکال لائے یہ تو ہوا ان کے ساتھ اور (دوسری طرف) بنی اسرائیل کو ان سب چیزوں کا وارث کردیا، صبح ہوتے ہوئے یہ لوگ ان کے تعاقب میں چل پڑے۔

(د) کبھی ایک آیت میں کوئی بات مطلق انداز پر کہی جاتی ہے، دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ یہ حکم مطلق نہیں ہے؛ بلکہ قید کے ساتھ ہے، مثلاً :

وَمَن يَكْفُرْ بِالإِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ۔ (المائدۃ:۵)

اور جو ایمان لانے سے انکار کرے اس کا عمل اَکارت ہوجائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ ارتداد مطلقاً ''حبطِ عمل'' کا باعث ہے؛ لیکن دوسری جگہ وضاحت فرمائی گئی کہ یہ حکم اس صورت میں ہے، جب کہ اس کو توبہ کی توفیق نہ ہو اور حالت کفر ہی میں اس کی موت ہوجائے :

وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِيْنِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُوْلَـئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ (البقرۃ:۲۱۷)

اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جو شخص دین سے مرتد ہوجائے اور کفر کی حالت میں مرے تو (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے نیک) عمل غارت ہوجائیں گے۔

(ہ) کبھی ایک آیت میں حکم عام ہوتا ہے اور دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ حکم خاص ہے، مثال کے طور پر :

○ فَانكِحُواْ مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاء مَثْنَى وَثُلاَثَ وَرُبَاعَ۔ (النساء:۳)

تو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو دو، تین تین، چار چار۔

بہ ظاہر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی عورت پسند ہو، چار کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے نکاح کرنا حلال ہے؛ لیکن قرآن مجید کی دوسری آیت مُحَرَّم عورتوں کی تخصیص کرتی ہے کہ ان سے نکاح کرنا حرام ہے :

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ ... الخ۔ (النساء:۲۳)

تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں حرام کی گئی ہیں۔

○ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ ... الخ۔ (المائدۃ:۳)

تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت حرام قرار دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ حرام چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے :

أَوْ دَماً مَّسْفُوحاً۔ (الانعام:۱۴۵)

معلوم ہوا کہ ''دم'' سے ''دمِ مسفوح'' یعنی بہتا ہوا خون مراد ہے، جو رگوں میں ہوتا ہے، نہ کہ وہ خون جو گوشت میں ہوتا ہے۔

(و) کبھی ایک جگہ نسبتاً غیر معروف لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ زیادہ معروف لفظ؛ تاکہ پہلے لفظ کی وضاحت ہوجائے، مثال :

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيْلٍ۔ (الحجر:۷۴)

اور ان لوگوں پر کنکر کے پتھر برسا دیئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِيْنٍ۔ (الذاریات:۳۳)

تاکہ ان پر پکی مٹی کے پتھر برسا دیں۔

معلوم ہوا کہ ''سجیل'' سے مراد ''طین'' (مٹی) کی کنکری ہے۔

(ز) کبھی ایک جگہ کسی واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیلی کیفیت بیان کر دی جاتی ہے، جیسے:

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوْسٰى أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ۔ (البقرة:۵۱)

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا، پھر موسیٰ کے (جانے کے) بعد تم نے (پوجا کرنے کے لئے) بچھڑا بنالیا۔

دوسری جگہ چالیس راتوں کی تفصیل ذکر کی گئی ہے:

وَوَاعَدْنَا مُوْسٰى ثَلَاثِيْنَ لَيْلَةً وَأَتْمَمْنَاهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ (الاعراف:۱۴۲)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر اسے دس راتوں سے پورا کر دیا، اس طرح رب کی مقرر کی ہوئی مدت چالیس راتیں پوری ہوگئیں۔

واقعات وقصص کے ذکر میں بیشتر مقامات پر قرآن مجید میں یہی اُسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

(ح) کبھی ایک آیت میں ''وقت'' کے ذکر کے بغیر کسی مضمون کو بتایا جاتا ہے اور دوسری آیت سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس کا تعلق کس زمانہ سے ہے، یا دنیا سے ہے یا آخرت سے؟ مثلاً:

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرة:۱۴۳)

تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔

دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق قیامت کے دن سے ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا۔ (النساء:۴۱)

پھر جب ہم ہر اُمت میں سے گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے لائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا؟۔

حدیثِ نبوی سے تفسیر

قرآن مجید کے بعد دین وشریعت کو جاننے اور سمجھنے کا سب سے اہم اور سب سے مستند ذریعہ ''حدیث'' ہے؛ اسی لئے قرآن مجید کی تفسیر وتشریح میں بھی حدیث کو بڑی اہمیت حاصل ہے؛ کیوں کہ صرف قرآن مجید کو پہنچا دینا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں تھی؛ بلکہ اس کی تشریح وتوضیح بھی آپ ﷺ کے ذمہ تھی:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ (النحل:۴۴)

اور ہم نے آپ پر بھی نصیحت نامہ اُتارا ہے؛ تاکہ آپ لوگوں پر ظاہر کر دیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا اور تاکہ وہ غور کریں۔

حدیث کے ذریعہ مختلف جہتوں سے قرآن مجید کی تفسیر و وضاحت ہوتی ہے۔

(الف) بعض دفعہ آپ ﷺ نے ایک آیت سے دوسری آیت کی تفسیر فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی :

الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔ (الانعام:۸۲)

جولوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کی آمیزش سے محفوظ رکھا۔

تو ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے آپ پر ظلم نہ کیا ہو؟ —— آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہاں ظلم سے ''شرک'' مراد ہے، جیسا کہ لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا :

يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ (لقمان:۱۳)

اے میرے بیٹے ! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''تلقى عيسىٰ محبته و لقاه الله'' (بخاری، کتاب التفسیر، باب ولم یلبس الایمانھم بظلم، حدیث نمبر:۴۶۲۹) میں ''لقاہ'' سے مراد ہے: ''سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ أَنْ أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ'' (المائدۃ:۱۱۶، ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ المائدۃ، حدیث نمبر:۳۰۶۲) ''تو پاک ہے، میرا یہ کام نہ تھا کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں''۔

(ب) کبھی آپ ﷺ نے اپنے الفاظ میں کسی آیت کی تفسیر فرمادی :

(۱) خواہ پہلے تفسیر ذکر کردی ہو، پھر آیت تلاوت فرمائی ہو، جیسے :

○ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو طلب کیا جائے گا، وہ کہیں گے: لبیک وسعدیک (یعنی حاضر ہوں) اے میرے پروردگار! پھر اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے: کیا تم نے میرا پیغام پہنچادیا؟ وہ کہیں گے: جی ہاں، اللہ تعالیٰ ان کی اُمت سے دریافت فرمائیں گے: کیا نوح نے تم کو میرا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: میرے پاس تو کوئی ڈرانے والا آیا نہیں، اللہ تعالیٰ حضرت سے نوح علیہ السلام سے پوچھیں گے: تمہارا گواہ کون ہے؟ چنانچہ اُمتِ محمدیہ گواہی دے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام آپ کا پیغام پہنچا چکے ہیں اور رسول اللہ ﷺ تم لوگوں پر گواہی دیں گے، یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی :

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرۃ:۱۴۳)

اور رسول تم پر گواہ ہوں گے۔ (بخاری کتاب التفسیر، سورہ بقرہ، حدیث نمبر:۴۲۱۷)

(۲) یا پہلے آیت ذکر فرمائی ہو، پھر اس کی تشریح کی ہو، جیسے :

○ حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، آپ ﷺ نے اپنے خطبہ میں ''ناقہ'' (حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی) اور اس کے کاٹنے والے کا ذکر فرمایا اور یہ آیت پڑھی: ''إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا'' (الشمس:۱۲) پھر فرمایا: یہ حرکت عزیز عارم نامی شخص نے کی، جو ابوزمعہ کی طرح اپنی قوم میں بڑا با اثر واقع ہوا تھا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ والشمس وضحاہا، حدیث نمبر:۴۹۴۲)

○ حضرت عُقْبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا :

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ۔ (الانفال:٦٠)

دشمنوں کے مقابلہ جہاں تک ہو سکے، قوت مہیا کرو۔

—— پھر فرمایا: یاد رکھو! قوت سے مراد تیر اندازی ہے، قوت سے مراد تیر اندازی ہے، قوت سے مراد تیر اندازی ہے۔ (مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الرمی الخ، حدیث نمبر: ۱۹۱۷)

(ج) کبھی ایسا ہوا کہ صحابہ کو کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی، جیسے :

○ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے "حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الأسود" (البقرۃ:۱۸۷) کے سلسلہ میں دریافت کیا کہ سفید اور سیاہ دھاگہ سے کیا مراد ہے، کیا یہ دو دھاگے ہیں؟ آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی: سیاہ دھاگہ سے رات کی سیاہی مراد ہے اور سفید دھاگہ سے دن کی سفیدی۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود، حدیث نمبر: ۴۵۱۰)

○ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لیس أحد یحاسب إلا هلک" (جس کا بھی حساب لیا جائے گا، وہ ضرور ہی ہلاک ہوگا) میں نے عرض کیا: کیا اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں ہے :

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ، فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَسِيراً۔ (الانشقاق:۷-۸)

آپ ﷺ نے فرمایا: اس آیت میں حساب سے مراد صرف حساب کا پیش کرنا ہے؛ البتہ جس سے حساب کی بابت سوال وجواب ہوگا، مناقشہ ہوگا، وہ تو ہلاک ہو کر ہی رہے گا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب سوف یحاسب حساباً یسیرا، حدیث نمبر: ۴۹۳۹)

(د) کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے قرآن مجید کے کسی لفظ کے بارے میں سوال کیا، پھر خود ہی اس کی وضاحت فرمائی، مثلاً :

○ جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا: تمہیں معلوم ہے کہ کوثر کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک نہر ہے، جس کا میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، یہ ایک حوض ہے، جس پر قیامت کے دن میری اُمت آئے گی، اس کے برتن ستاروں کے برابر ہیں، (مسلم، کتاب الصلاۃ، باب حجۃ من قال البسملۃ آیۃ من کل سورۃ الخ، حدیث نمبر: ۴۰۰) —— اس ارشاد سے "کوثر" کی تفسیر معلوم ہوگئی۔

(ہ) بعض اوقات قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی خاص لفظ کی آپ نے صراحت کے ساتھ تفسیر نہیں فرمائی؛ لیکن اس کے ذریعہ قرآن مجید کے کسی لفظ یا فقرہ کی تفسیر سمجھی جا سکتی ہے :

○ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاَةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ۔ (البقرۃ:۲۳۸)

تمام نمازوں اور (خاص کر) درمیانی نماز کی پابندی کرو اور اللہ کے سامنے خاموش کھڑے ہوا کرو۔

—— اس آیت میں "صلوٰۃ وسطیٰ" (درمیانی نماز) سے کونسی نماز مراد ہے؟ اس کی وضاحت آپ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے، جو آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے دن فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمیں "صلوٰۃ وسطیٰ" سے روک دیا، یہاں تک کہ سورج

غروب ہوگیا، (بخاری، کتاب التفسیر، باب حافظوا علی الصلوٰۃ والصلاۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر: ۴۵۳۳) اس سے وضاحت ہوگئی کہ ''صلوٰۃ وسطیٰ'' سے نمازِ عصر مراد ہے؛ کیوں کہ اسی کا وقت سورج غروب ہونے سے پہلے ہے۔

○ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے مَسّ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے بچہ چیختا ہے، سوائے حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو :

وِاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ (آل عمران:۳۶)

میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔

○ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہود مغضوب علیہم ہیں اور نصاریٰ گمراہ ہیں، (ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ الفاتحہ، حدیث نمبر: ۲۹۵۳) ——— آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ'' کی تفسیر ہو سکتا ہے۔

(و) کبھی صحابہ کے درمیان کسی آیت کے مفہوم کے سلسلہ میں اختلاف پیدا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی، اس طرح اختلاف بھی دور ہوگیا اور آیت کی تشریح بھی ہوگئی، جیسے :

''لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی'' (التوبۃ:۱۰۸) ''جس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر اول روز سے پڑی ہے، وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں'' سے کونسی مسجد مراد ہے؟ اس سلسلہ میں دو حضرات کے درمیان بحث ہوگئی، ایک کا کہنا تھا کہ اس سے مسجد قبا مراد ہے، دوسرے کا دعویٰ تھا کہ مسجد نبوی مراد ہے، دونوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، آپ نے فرمایا: مسجدِ نبوی مراد ہے۔ (ترمذی، باب ما جاء فی المسجد الذی اسس علی التقویٰ، حدیث نمبر: ۳۲۳)

(ز) کبھی قرآن مجید میں ایک حکم ''عام'' ذکر کیا جاتا ہے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے؛ بلکہ بعض افراد اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ۔ (النساء:۱۱)

اللہ تم لوگوں کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔

یہ حکم بہ ظاہر تمام اولاد کے لئے عام ہے؛ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مورث کا قاتل وارث نہیں ہوگا، (ترمذی، کتاب الفرائض، باب ما جاء فی إبطال میراث القاتل، حدیث نمبر: ۲۱۰۹) اور کافر وارث نہیں ہوگا۔ (ترمذی، کتاب الفرائض، حدیث نمبر: ۲۱۰۷)

(ح) کبھی قرآن مجید میں ایک حکم مطلق ذکر کیا جاتا ہے، حدیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس حکم کے ساتھ بعض قیود بھی ملحوظ ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا۔ (المائدۃ:۳۸)

چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔

یہاں مطلق ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ گٹے سے بھی ہوسکتا ہے، کہنی سے بھی اور مونڈھے سے بھی؛ لیکن حدیث نے واضح کردیا کہ یہاں گٹے سے ہاتھ کاٹنا مراد ہے۔ (السنن الکبریٰ، کتاب السرقۃ، باب السارق یسرق، حدیث نمبر: ۱۷۰۲۵)

(ط) بعض دفعہ قرآن مجید میں ایک لفظ مبہم ذکر کیا گیا ہے، جس کے معنی واضح نہیں ہیں، آپ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اس کو واضح فرمادیا۔

- قرآن مجید میں فرمایا گیا :

إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوداً۔ (الاسراء: ۷۸)

بے شک صبح کی نماز حضوری کا وقت ہے۔

اس میں ''مشہود'' سے کیا مراد ہے؟ یہ واضح نہیں ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ''تشهده ملائكة الليل وملائكة النهار'' (ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۱۳۵) یعنی ''فجر کے وقت رات اور دن دونوں کے فرشتے حاضر رہتے ہیں''۔

- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

عَسٰى أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً۔ (الاسراء: ۷۹)

عجب کیا ہے کہ آپ کا پروردگار آپ کو مقام محمود میں جگہ دے۔

حدیث سے معلوم ہوا کہ ''مقامِ محمود'' سے ''شفاعت'' مراد ہے، (ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۱۳۷) یعنی قیامت میں آپ ﷺ کو شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

(ی) قرآن مجید میں عملی زندگی سے متعلق بیشتر احکام اجمالاً دیئے گئے ہیں، حدیث کے ذریعہ ان کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے :

- اقیموا الصلوٰۃ : نماز قائم کرو۔
- آتوا الزکوٰۃ : زکوٰۃ ادا کرو۔
- حج البیت : بیت اللہ کا حج کرنا۔

میں نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے، مگر قرآن مجید میں اس کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے، حدیثیں ان عبادات کی پوری کیفیت کو واضح کرتی ہیں۔

(ک) بعض واقعات قرآن مجید میں اختصار کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، حدیث میں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے :

- حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا واقعہ۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب اذ قال موسیٰ لفتاہ الخ، حدیث نمبر: ۴۷۲۵-۴۷۲۶)
- اصحاب اُخدود کا واقعہ، جو سورۂ بروج میں آیا ہے۔ (مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب قصۃ اصحاب الاخدود الخ، حدیث نمبر: ۳۰۰۵)
- واقعہ معراج، جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل کے بالکل شروع میں ہے۔ (آیت نمبر: ۱)

(ل) بعض اوقات حدیث سے قرآن مجید میں مذکور کسی حکم کے منسوخ ہونے کا علم ہوتا ہے، جیسے :

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ۔ (البقرة:۱۸۰)

توتم پر والدین اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طریقہ پر وصیت کرنا فرض ہے۔

حدیث نے واضح کر دیا کہ یہ حکم منسوخ ہے اور ورثہ کے لئے وصیت کا اعتبار نہیں ہے: ''لا وصية لوارث''۔

(ترمذی، کتاب الوصایا، باب ما جاء لا وصیۃ لوارث، حدیث نمبر:۲۱۲۱)

آثارِ صحابہ

پوری اُمت میں صحابہ کو فہم قرآن کے اعتبار سے تین ایسی خصوصیتیں حاصل ہیں، جن میں ان کا کوئی شریک وسہیم نہیں، اول: یہ کہ انھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سنا بھی تھا اور سمجھا بھی تھا، نیز جہاں کہیں ان کو اشکال پیش آیا، انھوں نے آپ سے دریافت کر کے اپنی تشفی بھی کی تھی، دوسرے: قرآن مجید ان کے سامنے نازل ہوا؛ اس لئے وہ نزول آیات کے پس منظر سے واقف تھے، وہ واقعات وحالات ان کے سامنے تھے، جن کی بنا پر بعض آیات نازل ہوئیں اور جن کو ان آیات کا معنی ومقصد متعین کرنے میں بڑی اہمیت حاصل ہے، تیسرے: ہر زبان میں الفاظ کا استعمال بدلتا رہتا ہے، یہ تبدیلی زمان ومکان کی تبدیلی سے بھی آتی ہے اور قبائل کے لب ولہجہ کے فرق سے بھی؛ چوں کہ صحابہ قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے؛ اس لئے قرآن مجید ان کی لغت میں نازل ہوا تھا اور وہ پوری طرح اس کے مفردات سے واقف تھے؛ اسی لئے تفسیر کا ایک اہم ماخذ آثار صحابہ کو مانا گیا ہے۔

صحابہ کی تفسیر ووضاحت مختلف جہتوں سے قرآن مجید کو سمجھنے میں مدد ومعاون ہوتی ہے :

(الف) قرآن مجید کے بعض مضامین میں بہ ظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، صحابی کی تفسیر اس تعارض کو دور کرتی ہے، جیسے :

○ ایک صاحب نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے چند اشکال پیش کئے، ان میں دو یہ تھے کہ ایک طرف قرآن مجید کا بیان ہے کہ قیامت کے دن کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے دریافتِ حال کر سکیں گے: ''فَلَآ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ'' (مومنون:۱۰۱) دوسری طرف فرمایا گیا: وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے: ''وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ'' (الصافات:۲۷) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۂ مومنون کی آیت کا تعلق پہلی بار صور پھونکے جانے سے ہے اور دوسری آیت کا تعلق دوسری بار صور پھونکے جانے کے بعد سے —— دوسرا سوال یہ تھا کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن لوگ سچائی کو چھپا نہیں سکیں گے: ''وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللهَ حَدِيْثًا'' (النساء:۴۲)، دوسری طرف فرمایا گیا کہ قیامت کے دن مشرکین کہیں گے: ہم شرک نہیں کیا کرتے تھے: ''رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ'' (الانعام:۲۳) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب مشرکین دیکھیں گے کہ اللہ ایمان والوں کو معاف کر رہے ہیں تو کہیں گے کہ ہم شرک نہیں کیا کرتے تھے، پھر ان کی زبان پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضاء بولنے لگیں گے، تو اب وہ کوئی سچائی چھپا نہیں سکیں گے —— اس طرح کے متعدد اشکال تھے، جن کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حل کیا۔

(بخاری، کتاب التفسیر، باب سورۃ اذا الشمس کورت)

(ب) بعض آیات کے مفہوم میں ابہام ہے، صحابہ کے اقوال سے اس کی وضاحت ہوتی ہے، جیسے :

○ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ۔ (النجم:۱۸)

اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے سبز رفرف مراد ہے، جس نے پورے اُفق کو گھیر لیا تھا: ''رأى رَفْرَفاً أخضر قَدْ سَدَّ الأُفُق''۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب لقد رأى من آیات الکبریٰ، حدیث نمبر:۴۸۵۸)

○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ، فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ۔ (النجم:۹-۱۰)

یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل شکل میں دیکھنا ہے، جب کہ ان کو چھ سو پر لگے ہوئے تھے: ''رأى جبريل له ست مائة جناح''۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب فکان قاب قوسین أو ادنی، حدیث نمبر:۴۸۵۶)

(ج) بعض الفاظ قرآنی کی مراد صحابہ کے بیان سے معلوم ہوتی ہے، مثالیں :

○ قرآن مجید میں ہے :

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ۔ (مرسلات:۳۲)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ہم لوگ تین تین ہاتھ یا اس سے بھی زیادہ لکڑیاں جمع کرتے تھے اور اس کو موسم سرما کے لئے محفوظ کر دیتے تھے، اس کو ہم ''قصر'' کہتے تھے۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب قوله إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ، حدیث نمبر:۴۹۳۲)

○ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ''كأساً دهاقاً'' کی مراد بتائی ہے کہ جام بھرا ہوا ہو اور مسلسل دیا جائے، نیز زمانۂ جاہلیت کے کلام سے استدلال کیا ہے۔ (بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاہلیت، حدیث نمبر:۳۸۳۹)

(د) قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں، جن کا واقعاتی پس منظر صحابہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، جیسے :

○ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُوا فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ۔ (البقرۃ:۱۹۸)

تم پر (حج کے موقعہ سے) اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عُکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز کے بازار زمانۂ جاہلیت میں لگا کرتے تھے، ان بازاروں میں خلاف شرع کام بھی ہوتے تھے؛ اس لئے صحابہ کو تامل ہوا کہ کیا وہ ان بازاروں میں تجارت کر سکتے ہیں؟ اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب لیس علیکم جناح الخ، حدیث نمبر:۴۵۱۹)

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ۔ (البقرۃ:۱۹۹)

پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں، وہیں سے تم بھی پلٹو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قریش حج میں عرفات نہیں جاتے تھے، مزدلفہ ہی میں قیام کرتے تھے، یعنی حدودِ حرم سے باہر جانے کو اپنی شان کے خلاف تصور کرتے تھے، دوسرے حجاج عرفات بھی جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی اس بے جا رسم کو ختم کر دیا اور اس آیت میں حکم دیا گیا کہ جیسے دوسرے لوگ عرفات جاتے ہیں تم بھی عرفات کو جاؤ۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ، حدیث نمبر: ۴۵۲۰)

(ہ) قرآن مجید کی تعبیر سے بہ ظاہر بعض احکام کے صرف جائز ہونے کا گمان ہوتا ہے، صحابہ نے اس کا جو پس منظر نقل کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے؛ بلکہ یہ عمل واجب ہے، جیسے :

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ اللهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (البقرۃ: ۱۵۸)

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے؛ اس لئے جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس پر ان دونوں کی سعی کرنے میں مضائقہ نہیں۔

''لا جناح'' کی تعبیر عام طور پر جائز ہونے کے معنی میں استعمال ہوتی ہے؛ اس لئے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان ''سعی'' ضروری نہیں ہے، صرف جائز ہے؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت واضح کرتی ہے کہ ایسا نہیں ہے اور یہاں ''لا جناح'' کی تعبیر اس پس منظر میں ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں صفا و مروہ پر بت رکھے ہوئے تھے، لوگ سعی کرتے ہوئے ان کی عبادت کا تصور رکھتے تھے، فتح مکہ کے بعد اگر چہ یہ بت گرا دیئے گئے، مگر پھر بھی صحابہ کو اس قدیم نسبت کی وجہ سے کراہت ہوتی تھی، اس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۲۴۸)

○ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلاَةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ (النساء: ۱۰۱)

تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہے کہ کفار تم کو ستائیں گے۔

اس آیت کی ظاہری تعبیر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یعلی بن اُمیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ اب تو لوگ امن کی حالت میں ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہی خیال مجھے بھی ہوا تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تم پر اللہ کی طرف سے صدقہ ہے؛ اس لئے اللہ کے صدقہ کو قبول کرو، (مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب صلوۃ المسافرین وقصرہا، حدیث نمبر: ۶۸۶) یعنی یہ حکم تو فتنہ کے زمانہ میں دیا گیا تھا؛ لیکن زمانۂ امن میں بھی یہی حکم باقی ہے۔

(و) قرآن مجید کے بعض احکام بہ ظاہر عام معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن صحابی رسول کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مراد خاص ہے، جیسے :

○ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا۔ (آل عمران: ۱۸۸)

جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے نہیں کیا، اس پر ان کی تعریف ہو۔

مَرْوَان نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ اس آیت کی رو سے تو ہم سب عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا تعلق یہودیوں سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بعض باتوں کے بارے میں دریافت فرمایا، انھوں نے سچائی کو چھپایا اور بدل کر جواب دیا، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ سچائی کو چھپانے اور غلط بیانی کرنے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس جواب پر ان کو شاباشی دی جائے، (بخاری، کتاب التفسیر، باب واولات الاحمال اجلھن الخ، حدیث نمبر: ۴۹۰۹) —— غرض کہ آیت کا مضمون عام نہیں ہے؛ بلکہ یہودیوں کے لئے خاص ہے۔

○ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آئے، وہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان صاحب نے دریافت کیا: جس عورت کو شوہر کی وفات کے چالیس دنوں بعد ولادت ہو، اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ولادت اور چار ماہ دس دنوں میں سے جو لمبی مدت ہو، وہ اس کی عدت ہوگی، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ولادت پر اس کی عدت پوری ہوجائے گی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری بھی یہی رائے ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام ''کُریب'' کو حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا، اُم المومنین نے فرمایا کہ سَبیعہ اسلمیہ کے شوہر قتل کردیئے گئے؛ جب کہ وہ حمل کی حالت میں تھیں، وفات کے چالیس دنوں بعد ان کو ولادت ہوئی، پھر جلد ہی ان کے لئے نکاح کا پیغام آیا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح کردیا، (بخاری، کتاب التفسیر، باب واولات الاحمال اجلھن الخ، حدیث نمبر: ۴۹۰۹) —— معلوم ہوا کہ سورۂ بقرہ ۲۳۴ کا حکم عام نہیں ہے؛ بلکہ حاملہ عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

(ز) بعض دفعہ قرآن مجید میں افراد یا گروہ کا مبہم ذکر کیا گیا ہے، صحابہ کے اقوال سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِن تَتُوبَا إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ۔ (التحریم: ۴)

اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے) کیوں کہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں اور اگر نبی کے مقابلہ میں تم نے باہم جتھ بندی کی تو جان رکھو کہ اللہ ان کا مولیٰ اور تمام صالح اہل ایمان اور سب ملائکہ اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عائشہ وحفصہ مراد ہیں، رضی اللہ عنہما۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب وإذا سر النبی ... إلی بعض ازواجه، حدیث نمبر: ۴۹۱۴)

هَٰذَانِ خَصْمَانِ اخْتَصَمُوا فِي رَبِّهِمْ۔ (الحج: ۱۹)

یہ دو فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملہ میں جھگڑا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جو غزوۂ بدر میں ایک دوسرے کے مدمقابل معرکہ آراء ہوئے تھے، یعنی مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی، حضرت حمزہ اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم، مشرکین مکہ کی طرف سے عُتبہ، شیبہ اور ولید بن عُقبہ۔ (بخاری کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل، حدیث نمبر: ۳۹۶۸)

(ح) کبھی صحابہ کے بیان سے کسی حکم کا منسوخ ہونا معلوم ہوتا ہے، جیسے :

○ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۔ (البقرۃ: ۱۸۴)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ روزہ فرض ہونے کے بعد ابتداء میں گنجائش رکھی گئی تھی کہ جو روزہ نہیں رکھنا چاہیں، وہ فدیہ ادا کر دیا کریں، پھر بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا، (بخاری، کتاب التفسیر، باب فمن شہد منکم الشہر الخ، حدیث نمبر: ۴۵۰۷)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی اس آیت کا منسوخ ہونا نقل کیا ہے۔ (حوالۂ مذکورہ، حدیث نمبر: ۴۵۰۶)

○ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجاً يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ (البقرۃ: ۲۳۴)

اور تم میں سے جن لوگوں کی وفات ہو جائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دنوں تک روکے رکھیں، پھر جب یہ اپنی عدت پوری کر لیں تو وہ اپنی ذات کے بارے میں درست طریقے پر جو بھی قدم اُٹھائیں (اے بیوہ عورتوں کے اولیاء!) تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں اور تم جو بھی عمل کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ اس دوسری آیت سے منسوخ ہے۔
(بخاری، کتاب التفسیر، باب والذین یتوفون منکم الخ، حدیث نمبر: ۴۵۳۰)

تفسیر صحابہ کا حکم

صحابہ کے تفسیری اقوال کی حیثیت کیا ہوگی؟ —— اس سلسلہ میں اہل علم کی بحث کا حاصل یہ ہے :

(الف) جس بات میں نہ اجتہاد کا دخل ہو نہ مفردات قرآن سے واقفیت کا، یعنی نہ اس کی بنیاد لغت و زبان پر ہو، وہ ''حدیثِ نبوی'' کے درجہ میں ہے؛ کیوں کہ ضرور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی یہ بات فرمائی ہوگی —— جیسے ماضی کی خبریں، مستقبل کی پیشین گوئیاں، جنت و دوزخ کی صفات، ثواب و عقاب وغیرہ —— البتہ جن صحابہ کے بارے میں معلوم ہو کہ سابق آسمانی کتابوں سے بھی وہ واقف تھے، ماضی کے احوال سے متعلق ان کی وہ روایات 'حدیث' کے درجہ میں نہیں ہیں، جن کا ذکر تورات و انجیل میں آیا ہے۔

(ب) جن مسائل کے بارے میں صحابہ کی تفسیر منقول ہے، ان میں اجتہاد کا یا لغت و زبان کا دخل تو ہے؛ لیکن اُمت نے اس کو بالاتفاق قبول کر لیا ہے تو یہ بھی 'اجماع' منعقد ہونے کی وجہ سے حجت ہے۔

(ج) جن اُمور میں اجتہاد و رائے کا دخل ہے، یا زبان و لغت سے تعلق ہے، یا گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی اس طرح کا مضمون آیا ہے اور ان صحابی کا سابق آسمانی کتابوں سے بھی تعلق رہا ہے، ان کے تفسیری اقوال حدیث کے درجہ میں نہیں ہیں۔

عربی زبان ولغت

آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کے لئے اللہ تعالیٰ نے جس زبان کا انتخاب فرمایا ہے، وہ ''عربی'' ہے :

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (الزخرف:۳)

ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے؛ تاکہ تم لوگ سمجھو۔

کیوں کہ یوں تو قرآن مجید کی مخاطب قیامت تک آنے والی پوری انسانیت ہے؛ لیکن اس کتاب کے اولین مخاطب ''عرب'' تھے؛ اس لئے جن الفاظ کو ''شرعی اصطلاح'' کے طور پر استعمال کیا گیا ہو، جیسے: صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، وراثت، وصیت، رسالت، ملائکہ وغیرہ، کو چھوڑ کر قرآن مجید میں جو بھی الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان کا وہی مفہوم ہوگا، جو عربی زبان میں استعمال ہوتا رہا ہے اور جو معنی عربوں میں معروف رہا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

واضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْناً۔ (البقرۃ:۶۰)

پتھر پر اپنی لاٹھی مارو؛ چنانچہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

عربی قواعد کی رُو سے ''ضرب'' کے بعد حرف رابطہ کے طور پر اگر ''ب'' آئے تو اس کا معنی ''مارنے'' کے ہیں، اگر ''فی'' آئے تو ''چلنے'' کے معنی لئے جاتے ہیں، مگر قرآن مجید کے بعض اُردو مترجمین نے معتزلہ کی تفسیر کو قبول کرتے ہوئے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھیں تو بارہ چشمے بہتے ہوئے نظر آئیں گے'' یہ ترجمہ عربی لغت کے بالکل خلاف ہے۔

عربی زبان میں بھی اسی معنی کا اعتبار ہوگا، جو نزولِ قرآن مجید کے وقت مروج تھا اور صحابہ اس لفظ سے جو معنی سمجھتے تھے، اگر بعد کو یہ لفظ کسی اور معنی میں استعمال ہونے لگے تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، جیسے :

- صدقہ : قرآن مجید میں یہ لفظ اعانت وتبرع کے عمومی معنی میں استعمال ہوا ہے، جس میں زکوٰۃ بھی شامل ہے؛ لیکن بعد کو فقہ کی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' کو چھوڑ کر صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کے معنی میں اس کا استعمال ہونے لگا۔
- فرض : فقہ کی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے ضروری احکام کے لئے بولا جاتا ہے، جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت الفاظ سے ثابت ہوں؛ لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ 'مقرر کرنے' وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر گمراہ فرقوں نے قرآن مجید کو اپنی سوچ کے مطابق ڈھالنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ عربی الفاظ کو اس کے معروف اور صحابہ کے عہد میں مروج معنوں سے ہٹا کر نیا معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہاں اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں :

- مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ۔ (الاحزاب:۴۰)

لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

''ختم'' کے معنی مہر بند کردینے کے ہیں، یعنی کسی چیز کو اس طرح بند کردیا جائے کہ باہر کی کوئی چیز اندر داخل نہ ہوسکے؛ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ سلسلۂ نبوت آپ پر مکمل ہوگیا ہے، اب قصر نبوت میں کوئی اور داخل نہیں ہوسکتا، اس لفظ کی یہ مراد اس

درجہ واضح ہے کہ عہد نبوی میں جن جھوٹے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا، انھوں نے بھی یہ تو کہا کہ مجھ پر فرشتہ وحی لے کر آیا ہے؛ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ میری نبوت محمد ﷺ کی مہر سے جاری ہوئی ہے، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا؛ کیوں کہ وہ لوگ عربی زبان سے واقف تھے اور یہ شخص عربی زبان کے اُسلوبِ بیان سے بھی نابلد تھا۔

○ إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ۔ (الشعراء: ۱۵۳)

تم پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے۔

قادیانیوں نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> سحر کے معنی کھانا دیئے جانے کے بھی ہوتے ہیں، تقریباً ہر نبی جو دنیا میں آیا ہے، اسے کہا گیا ہے کہ تو مسحر یا مسحور ہے، یعنی کچھ لوگ تجھے رشوت دے کر اپنے کام میں لا رہے ہیں۔ (تفسیر صغیر: ۴۷۷)

حالاں کہ عربی زبان میں ''سحر'' کے معنی کھانا دیئے جانے کے نہیں ہیں، یہ محض دھوکہ ہے؛ چوں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکا؛ اس لئے قرآن مجید میں جہاں بھی معجزات یا فوق العادۃ واقعات کا ذکر آیا ہے، قادیانی اسی طرح اس کی تاویل کرتے ہیں۔

○ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ (القیامۃ: ۱۶-۱۸)

اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے؛ لہٰذا ہم جب اسے پڑھ رہے ہوں، اس وقت تم اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

''ثم'' کے معنی کسی چیز کے ''تراخی'' یعنی تھوڑی تاخیر کے ساتھ بعد میں ہونے کے آتے ہیں، اس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہم آپ کے سینۂ مبارک میں قرآن مجید کو محفوظ بھی کر رہے ہیں اور پھر اس کی تشریح و توضیح بھی آپ کو بتائیں گے؛ کیوں کہ آپ کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہی قرآن کا بیان ہے، (نحل: ۴۴) مگر مہدوی حضرات نے ''ثم'' کے لفظ کی یہ تفسیر کی کہ ایک ہزار سال کے بعد سید محمد جونپوری پر معانی قرآن کا نزول ہوا، گویا ان کے خیال کے مطابق ایک ہزار سال تک قرآن مجید کے معانی ومطالب سے مسلمان بے خبر رہے، اس کا غلط اور خلاف عقل ہونا ظاہر ہے — یا جیسے: ''هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ'' (البقرۃ: ۲) میں ''ہدی'' سے مہدی مراد لینا اور اس کو ''المھدی للمتقین'' کا ہم معنی قرار دینا۔ (نور ایمانی)

○ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ۔ (النساء: ۳)

تو جو عورتیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار۔

عربی زبان کے عرف کے لحاظ سے اس آیت میں زیادہ سے زیادہ چار نکاح کی اجازت دی گئی ہے، مگر بعض منحرف افکار کے حاملین نے اس سے نو شادیوں تک کی اجازت کا معنی اخذ کیا، جو عربی لغت کی رو سے بالکل غلط ہے۔

○ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ۔ (المائدۃ: ۳)

تم پر مردار، خون اور سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔

بعض گمراہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ خنزیر کا صرف گوشت حرام ہے، چربی نہیں؛ لیکن عربی زبان کی رو سے یہ بالکل غلط ہے، عربی زبان میں ''لحم'' کا اطلاق ''شحم'' (چربی) پر بھی ہوتا ہے۔

○ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (البقرۃ:۲۴۱)

اور مطلقہ عورتوں کے لئے رواج کے مطابق متاع ہے۔

''متاع'' کا ترجمہ بعض انگریزی مترجمین نے Maintanance (نفقہ) سے کردیا ہے، اس کی وجہ سے ہندوستان کی سپریم کورٹ نے فیصلہ کردیا کہ مطلقہ کو تاوفات یا تا نکاح ثانی نفقہ ادا کرنا ہوگا؛ حالاں کہ عربی زبان میں ''متاع'' تحفہ یا رُخصتانہ کو کہتے ہیں، جو ایک دفعہ دیا جاتا ہے، نہ کہ نفقہ کو، جو بار بار اور مسلسل دیا جاتا ہے۔

○ عربی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض دفعہ کلمات قرآنی کی ایسی تشریح کی جاتی ہے، جو ایک لطیفہ سے کم نہیں، جیسے :

یَوْمَ نَدْعُوْ كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ۔ (الاسراء:۷۱)

جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما کے ساتھ بلائیں گے۔

امام کے معنی سردار اور قائد کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگ اپنے مقتدیٰ کے ساتھ بلائے جائیں گے، مگر بعض لوگوں نے خیال کیا کہ ''امام'' اُم (ماں) کی جمع ہے اور مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا۔

تفسیر بالرائے

غور و تامل سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ ''رائے'' ہے؛ چنانچہ اگر انسان قرآن مجید کے مقصود و مطلوب تک پہنچنے کے لئے غور و فکر کرے اور تفسیر قرآن مجید کے جو وسائل ہیں، ان کے ذریعہ کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ رائے ''محمود'' (پسندیدہ) ہے اور سلف صالحین کی کوئی تفسیر اس سے خالی نہیں، اور اگر انسان نے پہلے سے کوئی رائے قائم کرلی، جو کتاب و سنت کی عام تعلیمات، شریعت کے عمومی مزاج و مذاق اور سلف صالحین کے متفقہ اور متوارث فکر و عمل کے مغائر ہو اور بہ تکلف قرآن مجید سے اسے ثابت کیا جائے تو ایسی رائے ''مذموم'' (ناپسندیدہ) ہے اور اسی کو ''تفسیر بالرائے'' کہتے ہیں، جس کی حدیث میں مذمت کی گئی ہے — تفسیر بالرائے کی چند مثالیں اس طرح ہیں :

○ روافض کا کہنا کہ آیت قرآنی :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ۔ (النساء:۵۱)

آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (الٰہی) کا کچھ حصہ دیا گیا؟ وہ بتوں پر اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

میں نعوذ باللہ ''جبت و طاغوت'' سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

○ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً۔ (البقرۃ:۶۷)

اللہ تم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

میں نعوذ باللہ بعض شیعہ مفسرین کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مراد لینا۔

○ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ۔ (الزمر:۶۲)

اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

سے معتزلہ کا یہ معنی اخذ کرنا کہ قرآن مجید بھی مخلوق ہے۔

○ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ۔ (ص:۴۲)

اپنا پاؤں زمین پر مار۔

سے بعض صوفیاء کا رقص کے جواز پر استدلال کرنا۔

○ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ۔ (الاعراف:۱۶۶)

ذلیل بندر بن جاؤ۔

کو ''مسخ'' کا عذاب تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہنا کہ اللہ نے ان سے فرمایا تھا: ''بندر کی طرح ذلیل ورسوا ہو جاؤ''۔

یوں تو ہر عہد میں فرق باطلہ نے اپنے فاسد خیالات کو ثابت کرنے کے لئے تفسیر بالرائے کا ارتکاب کیا ہے؛ لیکن خاص کر معتزلہ اور شیعہ نے اس پہلو سے بڑا نقصان پہنچایا ہے، واللہ ہوالہادی۔

گذشتہ آسمانی کتابیں

قرآن مجید کا ایک اہم مضمون گذشتہ انبیاء اور ان کی قومیں ہیں، قرآن مجید میں انبیاء بنی اسرائیل اور ان سے پہلے کے پیغمبروں کے قصص وواقعات اور اپنی قوم سے ان کے مذاکرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، ان واقعات کا ذکر سابقہ مذہبی کتابوں میں موجود ہے، ان کتابوں میں تورات، زبور اور انجیل کی صراحتاً؛ لیکن اجمالی طور پر تصدیق کی گئی ہے، اجمالی تصدیق سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ آسمانی کتابیں پوری طرح اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہیں؛ بلکہ ان میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی ردوبدل بھی ہوا ہے؛ اس لئے ان کتابوں سے قرآنی قصص کو سمجھنے میں خاص طور پر مدد ملتی ہے؛ مگر اس کا لحاظ ضروری ہے کہ خالص اور کھوٹ کا فرق باقی رہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیلی روایات کے تفسیری ذخیرہ میں داخل ہو جانے کی وجہ سے کافی نقصان بھی پہنچا ہے؛ کیوں کہ بعض اسرائیلی روایات اسلام کے بنیادی افکار وتصورات کے مغائر ہیں، مثلاً: اسلام کی نظر میں انبیاء معصوم ہیں؛ کیوں کہ وہ اپنی قوم کے لئے اُسوہ ونمونہ کا درجہ رکھتے ہیں؛ لیکن بائبل میں مختلف پیغمبروں ''حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہ السلام'' وغیرہ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ انتہائی ناشائستہ؛ بلکہ بے ہودہ ہے۔

گذشتہ آسمانی کتابوں اور قرآن مجید کے تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ متعدد اُمور کے سلسلہ میں قرآن نے بائبل کے بیان کی تصحیح کی ہے اور جو غلط فہمی بائبل کے بیان سے پیدا ہو سکتی تھی، اس کو دور کیا ہے۔

بائبل میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو غلط کار ٹھہرایا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو کفر کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، (اسلاطین ۱: ۱-۴) — اس پس منظر میں قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔ (البقرۃ:۱۰۲)

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا؛ لیکن شیاطین نے کیا۔

بائبل میں جنت میں ہونے والی لغزش کو حضرت حوا علیہا السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، (پیدائش: ۳/۱-۶) اسی وجہ سے یہودی وعیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ سمجھا گیا، قرآن نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی طرف لغزش کی نسبت کی ہے :

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ۔ (البقرۃ:۳۶)

آخر شیطان نے اسی درخت کے باعث ان دونوں کو لغزش میں مبتلا کیا اور اس سے ان کو نکال کر ہی چھوڑا۔

اور چوں کہ بہ حیثیت مرد حضرت آدم علیہ السلام پر اس لغزش سے بچنے کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی؛ اس لئے کہیں ان کی طرف اس بھول چوک کی نسبت کی گئی :

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ۔ (طٰہٰ:۱۲۱)

اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔

اس طرح عورتوں پر سبب گناہ ہونے کا جو داغ لگا تھا، قرآن مجید نے اس کو دھو دیا۔

بائبل میں تخلیق کائنات کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں کائنات کو پیدا کیا اور پھر ایک دن آرام کیا، (پیدائش: ۲:۲) گویا خدا کو بھی تکان ہوتی ہے اور آرام کی ضرورت پڑتی ہے، قرآن مجید کا بیان ہے :

وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ۔ (قٓ:۳۸)

اور ہم کو کوئی تکان نہیں ہوئی۔

ان اُمور کو سامنے رکھتے ہوئے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں جمہور کا تصور یہ ہے کہ :

(الف) بائبل کی جو باتیں قرآن وحدیث کے مطابق ہیں، وہ قبول کی جائیں گی۔

(ب) بائبل کی جو باتیں قرآن وحدیث کے بیان کے خلاف یا اسلام کے بنیادی تصورات سے متصادم ہیں، ان کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(ج) جن باتوں کی نہ قرآن، حدیث سے تصدیق ہوتی ہو نہ تکذیب، اور نہ وہ اسلامی تصورات سے متصادم ہیں، تو ان کے بارے میں سکوت وتوقف اختیار کیا جائے گا؛ البتہ سابقہ کتب آسمانی کے حوالہ سے ان کو نقل کرنا جائز ہوگا —— اسرائیلی روایات کے بارے میں ان اُصولوں کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے ان دو ارشادات پر ہے :

- لا تصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوا ھم۔

(بخاری، کتاب الشہادات، باب لا یسال اہل الشرک الخ، حدیث نمبر: ۴۲۱۵)

اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔

- حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج۔ (بخاری، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۲۴۷)

بنی اسرائیل کی باتیں بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

تفسیر کی شرطیں

قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بڑی ذمہ داری کا کام ہے؛ کیوں کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے؛ اس لئے

علماء نے تفسیر قرآن کے لئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جو لوگ ان کے حامل نہ ہوں، ان کے لئے قرآن مجید کی کسی تفسیر کو سنا دینا تو جائز ہے؛ لیکن خود تفسیر کرنا یا تفسیر لکھنا جائز نہیں۔

وہ شرطیں حسبِ ذیل ہیں :

(۱) قرآن مجید کا علم، اور ایک موضوع سے متعلق مختلف مقامات پر جو آیتیں آئی ہیں، ان سے واقف ہونا؛ کیوں کہ تفسیر قرآن کا سب سے بڑا ماخذ خود قرآن مجید ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قرآن کی تمام آیات پر انسان کی نظر ہو، اسی طرح قرآن مجید میں بعض احکام منسوخ بھی ہیں، یہ ضروری ہے کہ وہ منسوخ اور ناسخ احکام کا ادراک رکھتا ہو۔

(۲) احادیث اور آثارِ صحابہ سے واقفیت؛ کیوں کہ فہم قرآن مجید کے لئے دوسرا سب سے اہم ماخذ احادیث وآثار ہیں، احادیث ہی میں وہ مرویات بھی شامل ہیں، جو آیات کے اسبابِ نزول سے متعلق ہیں۔

(۳) عربی زبان سے اچھی طرح واقف ہونا، عربی زبان میں لغت بھی شامل ہے، نحو وصرف کے قواعد بھی شامل ہیں اور معانی وبلاغت کے اُصول بھی؛ کیوں کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے اور جب تک انسان ان علوم سے واقف نہیں ہوگا، وہ قرآن کے مفاہیم کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

(۴) قرآن مجید کی مختلف قرأتوں سے واقف ہونا؛ کیوں کہ قرآن کو سمجھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، نیز بعض دفعہ ایک قرأت دوسری قرأت کے مفہوم کو متعین کرنے میں مدد ومعاون ہوتی ہیں۔

(۵) اُصولِ دین یعنی اعتقادات اور خاص کر اہل سنت والجماعت کے فکری نقطۂ نظر سے واقف ہونا؛ تاکہ تفسیری اقوال میں صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز کر سکے۔

(۶) اُصولِ فقہ میں گہری بصیرت رکھتا ہو؛ تاکہ قرآن مجید کے الفاظ سے صحیح معنی مستنبط کر سکے اور اپنے استنباط واجتہاد میں الفاظ کے دائرے کو پیش نظر رکھے۔

(۷) وہ گذشتہ مفسرین کی تفسیری آراء سے بھی واقف ہو؛ تاکہ اجماعی اور اختلافی مسائل میں فرق کر سکے اور صحیح نتائج تک پہنچ سکے۔

(۸) ایک اہم شرط انسان کی عملی زندگی سے متعلق ہے کہ وہ اللہ کی خشیت رکھتا ہو، اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات پر پورا یقین ہو؛ تاکہ قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی خواہشات کی پیروی اور بے جا تاویل وتشریح کا مرتکب نہ ہوجائے۔

جن علوم کو تفسیر قرآن مجید کے لئے شرط کا درجہ دیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ وہ سب ہر وقت ذہن میں مستحضر ہوں؛ بلکہ یہ بات کافی ہے کہ اس کے اندر بوقت ضرورت ان علوم کی کتابوں سے مراجعت کی صلاحیت موجود ہو، جن لوگوں کی ظاہری زندگی یہ بتاتی ہے کہ وہ شریعت کی اطاعت اور سنت کی اتباع وپیروی سے دور ہیں یا جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ عربی زبان سے بھی واقف نہ ہوں، نہ ان کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے طور پر تفسیر کریں اور نہ دوسرے مسلمانوں کے لئے درست ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی تفسیر کو مستند اور معتمد سمجھ کر ان کی رائے کو قبول کرلیں۔

○ ○ ○

سُورَةُ الفَاتِحَة

- سورہ نمبر : (۱)
- رکوع : (۱)
- آیتیں : (۷)
- نوعیت : مکی

جس چیز سے آغاز وافتتاح ہو، عربی زبان میں اس کو ''فاتحہ'' کہتے ہیں ؛ چوں کہ قرآن مجید کا آغاز اسی مبارک اور جامع سورت سے ہوتا ہے؛ اس لئے اس کا نام ''فاتحہ'' ہے، گویا یہ قرآن مجید کا دیباچہ اور مقدمہ ہے، اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور خدا اور بندہ کے رشتہ کو واضح کیا گیا ہے کہ بندہ عابد ہے اور خدا معبود، بندہ حاجت مند ہے اور خدا حاجت روا، کائنات پرورش کی محتاج ہے اور خدا رب و پروردگار، انسان دین و دنیا کی ہر بھلائی کے لئے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا مکلف ہے اور خدا دنیا و آخرت کی نعمت سے سرفراز کرنے والی ذات ہے، قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ بندے کو اس کے رب سے جوڑ دیا جائے اور وہ ہدایت کو پالے، اس طرح گویا سورتِ فاتحہ ایک اجمال ہے اور پورا قرآن مجید اس کی تفسیر، مختلف مناسبتوں سے سورۂ فاتحہ کے اور بھی نام ہیں: ''اُم الکتاب'' (الرعد:۳۹) اور ''سبع مثانی'' (الحجر:۸۷) کا ذکر تو خود قرآن میں ہے، اس کے علاوہ ''کنز ، وافیہ ، الحمد ، الصلوٰۃ اور کافیۃ'' وغیرہ نام بھی آئے ہیں، (کشاف:۱/۱۱) اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بارہ نام ذکر کئے ہیں۔ (تفسیر قرطبی:۱/۱۱)

سورۂ فاتحہ پہلی مکمل سورت ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، مختلف روایتوں میں اس سورہ کے مکہ میں نازل ہونے کا ذکر آیا ہے، اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورہ ''حجر'' میں ''سبع مثانی'' کے نام سے سورۂ فاتحہ عطا کئے جانے کا ذکر موجود ہے، (الحجر:۸۷) اور سورۂ حجر بالاتفاق ''مکی'' ہے، (تفسیر قرطبی:۱/۱۱۵) بعض روایتوں میں مدینہ میں اس سورہ کے نازل ہونے کا ذکر آیا ہے، (دیکھئے: مجمع الزوائد:۶/۳۱۴، مصنف ابن ابی شیبہ:۱۰/۵۲۲) اس لئے بعض حضرات کی رائے ہے کہ غالباً یہ سورت دو دفعہ نازل ہوئی ہے، ایک دفعہ مکہ میں اور دوسری دفعہ مدینہ میں، اگر یہ بات درست ہو تو یہ بھی اس سورہ کے امتیازات وفضائل میں سے ہے کہ دو دو بار اس کو نازل کئے جانے کا اہتمام فرمایا گیا۔

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ اس سورت میں سات آیات ہیں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو مسجد سے باہر نکلنے پر قرآن کی سب سے عظیم سورت سکھاؤں گا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ تھام لیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ مسجد سے باہر آنے لگے تو میں نے یاد دلایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں، وہ ''الحمد للہ'' ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ ولقد آتیناک من المثاني والقرآن العظیم، حدیث نمبر: ۴۷۰۳)

سورۂ فاتحہ کی فضیلت پر متعدد صحیح حدیثیں منقول ہیں، احادیث کے علاوہ اس سورت کی فضیلت وعظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ اسے نماز کی ہر رکعت کا جزء بنایا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ''لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب'' (بخاری، باب وجوب قراءۃ للإمام والمأموم ألخ، حدیث نمبر: ۷۵۵) چنانچہ امام اور تنہا نماز ادا کرنے والے کے لئے نماز میں سورتِ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، مقتدی کے لئے امام کی قراءت کافی ہے؛ اس لئے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مقتدی ہو، اس کے لئے امام کی قراءت کافی ہے ''من کان له إمام فإن قراءۃ الإمام له قراءۃ'' (سنن بن ماجة، کتاب إقامة الصلاۃ وسننها، باب إذا قرأ الإمام فأنصتوا، حدیث نمبر: ۸۹۹) حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے، وہ ناقص ہے؛ سوائے اس کے کہ نمازی امام کے پیچھے ہو، '' إلا أن یکون وراء الإمام '' (دار قطنی، باب من کان له إمام الخ، حدیث نمبر: ۱۲۲۸) ابتداء میں صحابہ امام کے پیچھے بھی قرآن پڑھا کرتے تھے؛ چنانچہ اسی سلسلہ میں آیت (الأعراف: ۲۰۴) نازل ہوئی کہ جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو، (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۵۲) امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ (آثار السنن: ۱/ ۸۴) اس لئے جمہور اُمت کا نقطۂ نظر صحابہ کے عہد سے آج تک یہی رہا ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی جائے اور سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں۔

○ ○ ○

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝۱

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں۔﴿۱﴾ ۝۱

﴿۱﴾ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر جائز اور اچھا کام اللہ کے نام سے شروع کرنا چاہئے اور یہی رسول اللہ] کا معمولِ مبارک تھا، جن کاموں کو شروع کرنے کے لئے آپ ﷺ سے کوئی خاص ذکر منقول ہے، اس موقع پر وہی ذکر پڑھا جائے گا، جیسے: کھانے سے پہلے ''بسم الله وبركة الله'' سونے سے پہلے ''اللّٰهم بإسمك أموت وأحيىٰ'' اور جانور ذبح کرتے ہوئے ''بسم الله ، الله اكبر'' اور جن مواقع پر آپ ﷺ سے کوئی ذکر منقول نہ ہو، ان کو ''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ'' سے شروع کرنا چاہئے۔

- ''بسم اللہ'' قرآن مجید کی ۱۱۳ سورتوں یعنی سوائے سورۂ توبہ کے تمام سورتوں میں آیا ہے اور سورۂ نمل میں ''جزءِ آیت'' کی حیثیت سے آیا ہے؛ اس لئے اس پر اتفاق ہے کہ ''بسم اللہ'' قرآن مجید کا جزء ہے؛ البتہ سورتوں کے درمیان جو ''بسم اللہ'' آیا ہے، وہ بطورِ علامت وامتیاز کے ہے، سورتوں کا جزء نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورتوں کا فصل ''بسم اللہ'' کے نازل ہونے سے جانتے تھے (ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ ، حدیث نمبر: ۷۸۸) اس لئے نماز میں ''بسم اللہ'' کو آہستہ پڑھنا ہے نہ کہ زور سے ، حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا کی ، یہ حضرات اپنی قراءت (یعنی: بلند آواز میں تلاوت) ''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ'' سے شروع فرماتے تھے۔ (بخاری، باب مایقول بعد التکبیر، حدیث نمبر: ۷۴۳)
- ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' دونوں کے معنی عربی زبان میں 'رحم کرنے والے' کے ہیں، اہل علم کا خیال ہے کہ ''رحمٰن'' سے دنیا کی رحمت کی طرف اشارہ ہے اور ''رحیم'' سے آخرت کی رحمت کی طرف؛ اس لئے کہ عربی زبان میں ''رحمٰن'' کے وزن پر آنے والے الفاظ میں شدت اور عجلت کے معنی پائے جاتے ہیں، جیسے: ''سکران'' (جو حالتِ نشہ میں ہو) ''غضبان'' (جو غصہ کی حالت میں ہو) ظاہر ہے کہ غصہ اور نشہ نہایت شدید کیفیت کے ساتھ طاری ہوتا ہے؛ لیکن اس کا اثر جلد ہی جاتا رہتا ہے، یہی حال دنیا میں اللہ کی رحمتوں کا ہے کہ یہ رحمت شدید ہے مؤمن ہو یا کافر، فرمانبردار ہو یا نافرمان، سب پر رحمت خداوندی کا سایہ موجود ہے؛ لیکن مرنے کے ساتھ ہی یہ رحمت کی چادر اٹھالی جائے گی اور ہر ایک کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق معاملہ ہوگا — ''رحیم'' کے وزن پر جو الفاظ عربی میں آتے ہیں، ان میں دوام و پائیداری کی کیفیت پائی جاتی ہے، جیسے ''جمیل'' (خوبصورت) ''کریم'' (شریف) وغیرہ، خوبصورتی اور شرافت عارضی وصف نہیں ، مستقل اور پائیدار وصف ہے، آخرت میں جن لوگوں کو رحمت خداوندی حاصل ہوگئی، وہ سدا کے خوش نصیب ہیں، پھر کبھی محرومی نہیں؛ اسی لئے ''رحیم'' سے آخرت کی نہ ختم ہونے والی رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۲ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝۳ مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝۴ اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝۵

ساری تعریف اللہ ہی کے لائق ہے ﴿۱﴾ جو تمام جہانوں کے پالنے والے ہیں ﴿۲﴾ ۝۱ بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝۲ بدلہ کے دن کے مالک ہیں ﴿۳﴾ ۝۳ (اے اللہ!) ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ۝۴

﴿۱﴾ اگر مخلوق میں کوئی چیز قابل تعریف نظر آئے تو وہ اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے؛ اس لئے اصل میں یہ بھی تعریف اللہ ہی کی ہے، یوں تو ہر مذہب میں خدا کی تعریف کرنا سکھایا گیا ہے؛ لیکن چوں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا نام نامی ہی ''احمد'' تھا، جس کے معنی ''خوب تعریف کرنے والے'' کے ہیں؛ اس لئے آپ ﷺ نے زندگی کے ہر عمل سے اللہ تعالیٰ کی ''حمد'' کو جوڑ دیا ہے، کھا کر فارغ ہوں تو اللہ کی حمد، سو کر اُٹھیں تو اللہ کی حمد، استنجاء سے فراغت ہو تو اللہ کی حمد، چھینک آئے تو اللہ کی حمد، یہاں تک کہ اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور مزاج پرسی کی جائے تب بھی کہا جائے: ''الحمد للہ علی کل حال'' کہ ہر حال میں اللہ کی حمد کرتا ہوں، آپ ﷺ نے جس طرح مؤمن کی زبان کو حمد الٰہی سے تر کیا ہے، اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔

﴿۲﴾ تمام جہانوں میں زمین، چاند، سورج، آسمان وغیرہ بھی داخل ہیں اور مختلف مخلوقات فرشتے، جن، انسان اور حیوانات وغیرہ بھی —— ''رب'' اس ذات کو کہتے ہیں جو درجہ بہ درجہ اور مرحلہ بہ مرحلہ کسی چیز کی پرورش اور دیکھ ریکھ کرے، اللہ کو ''رب العالمین'' کہہ کر اس طرف اشارہ ہے کہ تمام عالم ہر لمحہ خدا کی ربوبیت کا محتاج ہے، ایسا نہیں کہ اللہ نے کائنات کو پیدا کر کے چھوڑ دیا ہو، اب از خود پورا نظام کائنات چل رہا ہو اور کائنات خدا کی محتاج نہ رہی ہو؛ جیسا کہ بعض فلاسفہ اور ملحدین کا نقطۂ نظر تھا، اسی غلط خیال کی تردید کے لئے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا بار بار ذکر کیا ہے۔

﴿۳﴾ مالک وہ ہے جو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار رکھتا ہو، آپ پتھر کے مالک ہیں، تو آپ کو اختیار ہے کہ اس کو مسجد کے منبر میں لگائیں یا بیت الخلاء کے فرش میں، قیامت کے دن کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل مختار ہیں، جس کا قصور چاہیں معاف کر دیں اور جس کو چاہیں سزا دیں، اسلام سے پہلے بعض مذاہب کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ گنہگاروں کو گناہ کی سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، وہ گناہ کو معاف نہیں کر سکتا، عیسائیوں کے ''عقیدۂ کفارہ'' کی بنیاد یہی ہے کہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ انسانیت کے گناہ کو معاف کرنا چاہتے تھے؛ مگر ایسا کرنا اس کے لئے روا نہیں تھا؛ اس لئے (نعوذ باللہ) مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں قربانی کے لئے بھیجا؛ تا کہ وہ انسانیت کے گناہ کا کفارہ بن سکے، قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت اور بدلہ کے دن کا مکمل مالک ہے۔

﴿۴﴾ عبادت میں وہ تمام باتیں داخل ہیں جو بندگی کا حصہ ہیں، یعنی: نماز، سجدہ، قربانی، قسم، نذر، کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے جائز ہیں، اللہ کے سوا کسی زندہ یا مردہ کے لئے جائز نہیں، اور دُعاء صرف اللہ ہی سے کی جائے گی، اللہ کے ماسوا سے استمداد اور استعانت حرام ہے۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ﴿۶﴾ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ۬ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ﴿۷﴾ ع

ہمیں درست راستہ پر چلایئے، ان لوگوں کے راستہ پر جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے،﴿۱﴾﴿۵﴾ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر غضب ہوا﴿۲﴾ اور نہ ان لوگوں کا جو راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔﴿۳﴾﴿۷﴾

﴿۱﴾ کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے؟ خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے کہ وہ چار ہیں: ''انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین'' (النساء:۶۹) گویا ان کی راہ پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا دین میں مطلوب ہے، معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں آباء واجداد کی اتباع سے منع کیا ہے، اس سے وہ آباء واجداد مراد ہیں، جو حق راستے سے ہٹے ہوئے تھے، جو لوگ راہِ حق پر ثابت قدم تھے، ان کی راہ پر قائم رہنے کی تو دُعاء کرائی گئی ہے، اسی سے ائمہ مجتہدین کی تقلید کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ صالحین میں تھے۔

﴿۲﴾ انسان کی گمراہی کا ہمیشہ دو میں سے ایک سبب ہوتا ہے، حق اور سچائی کی تلاش میں کوتاہی اور اس کی وجہ سے نادانستہ گمراہی کا ارتکاب، ''ضالین'' سے یہ لوگ مراد ہیں، دوسرے: سچائی کو جاننے کے باوجود اس کا انکار، ایسے لوگ غضب شدید کے مستحق ہوتے ہیں، یہ ''مغضوب علیہم'' ہیں، قرآن مجید نے ان دونوں گروہوں کی غلطی سے بچانے کے لئے دُعاء سکھائی ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مغضوب علیہم'' کا مصداق یہود اور ''ضالین'' سے مراد عیسائی ہیں، (مجمع الزوائد:۳۱۴/۶، بحوالہ مسند أحمد، نیز دیکھئے: صحیح ابن حبان:۱۸۴/۱۶، عن عدی بن حاتم) اس کا مقصود یہ ہے کہ مغضوب گروہوں اور قوموں میں ایک یہود اور گمراہوں اور ضالین میں ایک عیسائی ہیں، نہ یہ کہ صرف یہی قومیں اس سے مراد ہیں، اور ایسا آپ نے اس لئے ارشاد فرمایا کہ عیسائیوں نے نبی برحق حضرت مسیح علیہ السلام کے سلسلے میں افراط سے کام لیا اور ان کو ''رسول اللہ'' سے ''ابن اللہ'' (خدا کا بیٹا) بنا دیا؛ اس لئے وہ گمراہ ہوئے اور ''ضالین'' کے زمرہ میں داخل ہوئے، یہودیوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ تفریط کی، ان کی ایذاء رسانی اور اہانت کے درپے ہوئے؛ اس لئے بار بار اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، گویا اُمت کو دونوں باتوں سے منع فرمایا گیا، اس سے بھی کہ اللہ کے نیک بندوں کے معاملہ میں افراط اور مبالغہ سے کام لیا جائے، کہ یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے، اور اس سے بھی منع کیا گیا کہ ان کے بارے میں اہانت وتحقیر کا رویہ اختیار کیا جائے؛ کہ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

﴿۳﴾ سورۂ فاتحہ کے ختم پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے، اس کے معنی ہیں: ''اے رب! قبول فرمالیجئے'' ابومیسرہ سے مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ فاتحہ پڑھائی، جب ''وَلَا الضَّآلِّيۡنَ'' پر پہنچے تو کہا کہ آپ آمین کہیں؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہا، (مصنف ابن أبي شيبة، باب ما ذكر في آمين الخ، حدیث نمبر:۸۰۴۴) اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے باہر بھی ''آمین'' کہنا مسنون ہے، نماز میں امام اور مقتدی دونوں آمین کہیں گے، حدیث میں آمین کا زور سے کہنا بھی منقول ہے اور آہستہ کہنا بھی؛ اس لئے دونوں طرح آمین کہنا درست ہے؛ البتہ آہستہ کہنا افضل ہے؛ کیوں کہ ''آمین'' بالاتفاق دُعاء ہے اور قرآن مجید نے دُعاء کا ادب یہی بتایا ہے کہ آہستہ کی جائے، ''وَادۡعُوۡا رَبَّكُمۡ تَضَرُّعًا وَّخُفۡيَةً''۔ (اعراف:۵۵)

سُوۡرَةُ البَقَرَة

- سورہ نمبر : (۲)
- رکوع : (۴۰)
- آیتیں : (۲۸۶)
- نوعیت : مدنی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے، جو سب سے طویل سورت بھی ہے اور بہت سے احکام وہدایات کا مجموعہ بھی، اس سورہ میں گائے کے متعلق بنی اسرائیل کا واقعہ آیا ہے، ’’بقرۃ‘‘ کے معنی گائے اور بیل کے ہیں، اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام ’’بقرۃ‘‘ ہے، اس سورہ کی زیادہ تر آیات آپ ﷺ کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں؛ لیکن بعض آیات بالکل آخر دور کی بھی ہیں، جیسے حرمت سود سے متعلق آیات، بہر حال یہ سورت مدنی ہے، یہ سورت ۲۸۶ یا ۲۸۷ آیات پر مشتمل ہے، اور یہ اختلاف اس لئے ہے کہ علماء قراءت کے نزدیک ایک مقام پر وقف اور آیت کے ختم ہونے کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۵)

یہ مضامین کی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم سورتوں میں سے ایک ہے، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اس سورت میں ایک ہزار خبریں، ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی ہیں، (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۵) اس میں مسلمانوں، کفر پر جمے ہوئے لوگوں اور منافقین تینوں سے خطاب کرنے کے علاوہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے، نماز وزکوۃ کی فرضیت، جادو کرنے کی حرمت، قانون قصاص، احکام وصیت، روزہ کے احکام، چاند کی تاریخ کا معتبر ہونا، جہاد اور حج وعمرہ کے مسائل، شراب اور جوے کی مذمت، یتیموں سے متعلق تنبیہات، نکاح اور میاں بیوی کے تعلق سے متعلق بعض قوانین، طلاق، رضاعت، عدت اور مہر سے متعلق ہدایات، ایلاء اور قَسم کے احکام پر بیان کئے گئے ہیں، اور قرآن کی سب سے طویل آیت (بقرہ: ۲۸۲) —— جو دَین کی دستاویز سے متعلق ہے —— وہ بھی اسی سورت میں ہے، جس کو آیت ’’مداینت‘‘ کہتے ہیں، نیز آیۃ الکرسی اور وہ آخری دو آیتیں جن کی خصوصی فضیلت ہے، اسی سورت میں شامل ہیں، احادیث میں اس سورہ کے فضائل بہ کثرت وارد ہیں، حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’سورۂ بقرہ کو سیکھو کہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کو چھوڑ دینا حسرت ومحرومی‘‘ (مسند أحمد: ۵/ ۳۵۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنالو، شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے، جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے‘‘ (ترمذی، فضائل قرآن، حدیث: ۲۸۷۷) اس سے معلوم ہوا کہ خاص طور پر گھروں میں اس سورہ کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

❍ ❍ ❍

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

الجزء ١

الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۛۚ فِیۡهِ ۛۚ هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۝٢ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ
وَیُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۝٣

شروع اللہ کے نام سے، جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف، لام، میم ﴿۱﴾ ۝١ اس کتاب ﴿۲﴾ میں کوئی شک وشبہ نہیں ﴿۳﴾، یہ اللہ کا ڈر رکھنے والوں کے لئے رہنما ہے ﴿۴﴾ ۝٢ جو اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ﴿۵﴾ ۝٣

﴿۱﴾ ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے، سلف صالحین کی عام طور پر یہ رائے ہے کہ اس کی صحیح مراد سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہیں، گویا ان حروف کے ذریعہ اصحابِ عقل ودانش کا امتحان ہے، نادان کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ اس کو تحقیق وجستجو کا حکم دیا جائے اور دانا کا امتحان یہ ہے کہ اس کے فکر وتدبر کے لئے سرحدیں مقرر کردی جائیں کہ اِن سے آگے قدم نہیں رکھنا ہے، انسانی عقل کہیں رکنا نہیں چاہتی، چاند پر قدم رکھ دیا تو مریخ پر قدم ڈالنا چاہتی ہے، مریخ زیر قدم آجائے تو سورج کو اپنا اسیر بنانا چاہتی ہے؛ چنانچہ اِن ''حروفِ مقطعات'' کا مقصود عقل انسانی کا امتحان ہے کہ خدا کے منشاء کے مطابق وہ اس کی کھوج میں پڑنے سے باز رہے، پھر چوں کہ ان حروف کے معانی معلوم ہونے پر نہ دنیا کا کوئی حکم شرعی موقوف ہے اور نہ آخرت میں نجات یا عذاب: اس لئے انسان کے اس سے ناواقف ہونے میں کچھ حرج نہیں۔

﴿۲﴾ قرآن کو ''کتاب'' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ایک مُصحف اور کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکا تھا، جس کا ایک ایک حرف آج تک محفوظ ہے، یہ محض متفرق یادداشتوں کا مجموعہ نہیں، جسے پیغمبر ﷺ سے ان کے مختلف اصحاب نے موقع بہ موقع سنا ہو، پھر سینہ بہ سینہ ان کی روایت ہوئی ہو اور بعد کو یہ یادداشتیں الفاظ ومعانی کی نوع بہ نوع تبدیلیوں کے ساتھ نقل اور جمع کی گئی ہوں، دنیا میں اسلام کے سوا دوسرے اہل مذاہب کے پاس جو مذہبی صحیفے موجود ہیں، ان کا یہی حال ہے: اسی لئے وہ صحائف نہ لفظی تبدیلیوں سے محفوظ رہے، نہ معنوی تحریفات سے۔

﴿۳﴾ یعنی قرآن مجید کے اللہ کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، نیز قرآن مجید میں جتنے حقائق وواقعات بیان کئے گئے ہیں، گذشتہ اقوام کے قصص وواقعات ہوں، مستقبل کی خبریں ہوں یا کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کا ذکر ہو، خواہ ان کا تعلق فلکیات سے ہو، طبعیات سے ہو یا حیاتیات سے، یہ سب حقیقت پر مبنی ہیں، ان کے بارے میں شک وشبہ کا کوئی کانٹا دل میں نہیں چبھنا چاہئے، اگر کسی بات میں شبہ ہو تو یہ انسان کی عقلِ کوتاہ اور فہمِ نارسا کا قصور ہے، نہ یہ کہ قرآن مجید کا بیان غلط ہے؛ چنانچہ آج تک نت نئی سائنسی تحقیقات حرف بہ حرف قرآن مجید کی تصدیق کرتی جاتی ہیں۔

﴿۴﴾ جیسے سورج کی روشنی ہر شخص تک پہنچتی ہے؛ لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جس کو ''دیکھنے والی آنکھ'' بھی میسر ہو، ←

← جو آنکھ ہی سے محروم ہو، اس کے لئے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں برابر ہے، بادل ہر زمین پر برستا ہے؛ لیکن سیراب وہی زمینیں ہوتی ہیں، جن میں پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہو، چٹیل اور سنگلاخ زمین کو بارش سے کچھ نفع نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن مجید کے مخاطب تو تمام انسان ہیں؛ لیکن قرآن مجید کی دعوتِ ہدایت سے فائدہ انھیں لوگوں کو حاصل ہوگا، جو ہدایت کے طلب گار بھی ہوں، اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دل میں خدا کا خوف ہو، گناہ اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی خواہش ہو اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ ہو، ایسے ہی لوگوں کو ''متقین'' کہا گیا ہے۔

﴿۵﴾ ''تقویٰ'' قلب کی اندرونی کیفیت ہے، ایمان و عمل سے اس کا اظہار ہوتا ہے؛ اس لئے تقویٰ والوں کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں، اول: ایمان و یقین، دوسرے: جسمانی افعال کا صالح ہونا، تیسرے: مالی معاملات کا درست اور منشاءِ ربانی کے مطابق ہونا۔

- ایمان سے مراد ''غیب'' پر ایمان ہے، یعنی اُن اَن دیکھی حقیقتوں پر یقین کرنا، جو نگاہ اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں؛ ورنہ آنکھوں دیکھی بات پر کون یقین نہیں کرتا؟ اللہ تعالیٰ کا وجود، اللہ تعالیٰ کی صفات، نبوت، وحی، فرشتوں کا وجود، قرآن مجید اور پہلی آسمانی کتابیں، آخرت کا قائم ہونا، پھر اس میں حساب و کتاب اور ثواب و عذاب، یہ سب ''غیب'' کی باتیں ہیں، جو توہمات نہیں ہیں؛ بلکہ ان ساری حقیقتوں کا علم اللہ اور اس کے رسولوں کے ذریعہ ہوا ہے، جس سے زیادہ قابل اطمینان اور لائق اعتبار کوئی اور ذریعۂ علم نہیں، ظاہر ہے کہ جو نظامِ غیبی پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ قرآن پر ایمان نہیں لاسکتا اور جو قرآن ہی پر ایمان سے محروم ہو، وہ قرآن سے فائدہ کیوں کر اٹھا سکتا ہے؟
- تقویٰ کی دوسری علامت اور قرآن سے فیضیاب ہونے کی دوسری شرط ''اقامت صلوٰۃ'' یعنی تمام آداب وحقوق کی رعایت کے ساتھ نمازوں کا ادا کرنا ہے، نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس میں انسان کا پورا وجود خدا کے سامنے بچھ جاتا ہے، نگاہ کا دائرہ، زبان کے بول، اعضاء کی نقل و حرکت، غرض کہ ہر عضو حکم خداوندی اور سنت نبوی کا پابند ہے؛ پس گویا نماز ان تمام اعمالِ صالحہ کا عنوان ہے، جن کو جسم کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے، روزہ ہو، حج ہو، خلق اللہ کی خدمت ہو، جہاد ہو، دل و نگاہ اور جسم کے ایک ایک عضو کی گناہ سے حفاظت ہو، ''اقامت صلوٰۃ'' گویا بدن سے انجام دیئے جانے والے اِن تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔
- تقویٰ کی تیسری پہچان اور قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے تیسرا ضروری وصف ''انفاق'' یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے، اس میں زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ بھی شامل ہیں، صدقاتِ نافلہ بھی داخل ہیں اور ماں باپ، بیوی، بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور مہمانوں غرض خدا کے تمام ہی بندوں کے ساتھ حسن سلوک بھی، جو شخص دوسروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہ نہ ہو، وہ حرام طریقہ پر دوسرے بھائی کا مال کیسے حاصل کرسکتا ہے؟ وہ یقیناً سود، جوا اور کمائی کے حرام طریقوں سے بھی اپنے مال کی حفاظت کرے گا، پس گویا ''انفاق'' کے لفظ میں ''مال'' سے متعلق شریعت کی تمام ہدایات کی طرف اشارہ ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾
اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ
عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾

اِس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری گئیں ، اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۴﴾ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت یافتہ ﴿۲﴾ ، اور پورے کامیاب ہیں ﴿۳﴾ ﴿۵﴾ بے شک جو لوگ کفر پر بہ ضد ہیں ﴿۴﴾ ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے ﴿۵﴾ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۔ ﴿۶﴾

﴿۱﴾ یہ گویا ''غیب پر ایمان'' ہی کی مزید تشریح وتوضیح ہے ، قرآن مجید پر تو تفصیلی ایمان مطلوب ہے ، یعنی قرآن نے گذشتہ یا آئندہ کی جن باتوں کی خبر دی ہے ، ان کا یقین کرنا ، جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے ، ان کو حلال اور جن کو حرام قرار دیا ہے ، ان کو حرام سمجھنا بھی مومن ہونے کے لئے ضروری ہے ، قرآن مجید کے کسی مستحب حکم کا انکار بھی باعث کفر ہے ؛ لیکن پہلی آسمانی کتابوں پر ''اجمالی ایمان'' کافی ہے ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء پر یہ کتابیں نازل فرمائی تھیں ، اس کا یقین کرے ؛ البتہ موجودہ حالات میں یہ کتابیں جن مضامین پر مشتمل ہیں ؛ چوں کہ ان میں بہت کچھ تبدیلی اور ملاوٹ ہوچکی ہے ؛ اس لئے تنہا ان پر یقین نہیں کیا جاسکتا ۔

﴿۲﴾ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگی گئی تھی ، سورۂ بقرہ کے شروع میں بتادیا گیا کہ قرآن مجید اسی دُعاء کا جواب ہے اور انسانیت کے نام اس کے خالق ومالک کا ''ہدایت نامہ'' ہے ، پھر چند اوصاف کا ذکر کر کے وضاحت فرمادی گئی کہ یہ ہدایت یافتہ ہونے کی صفات وعلامات ہیں ۔

﴿۳﴾ ''فلاح'' کے معنی عربی زبان میں ہر نوع کی بھرپور کامیابی کے ہیں ، کامیابی وکامرانی کے لئے عربی زبان میں اس سے بڑھ کر کوئی لفظ نہیں ؛ پس گویا ایمان اور ہدایت میں صرف آخرت ہی کی نہیں ؛ بلکہ دنیا کی کامیابی وکامرانی بھی مضمر ہے ۔

﴿۴﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر : ''ا ثبتو علی الکفر'' منقول ہے ؛ س لئے اس کا ترجمہ ''کفر پر بہ ضد ہونے'' سے کیا گیا ہے ، یعنی بہت سے کافروں کو ایمان کی توفیق ہوگی ؛ لیکن ابوجہل وابولہب اور اس طرح کے لوگ جو دیدہ ودانستہ حق کو قبول کرنے سے انکار کررہے تھے اور سچائی کو جان لینے کے باوجود کفر پر بہ ضد تھے ، ان پر دعوت وتبلیغ کی کوئی کوشش کامیاب ثابت نہ ہوگی ۔

﴿۵﴾ یہ ڈرانا اور نہ ڈرانا ان کے حق میں برابر تھا ، نہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو بہرحال تبلیغ دین کا اجر حاصل ہوتا ، معلوم ہوا کہ دعوتِ حق رد کردی جائے ، تو یہ ان لوگوں کی محرومی ہے ، جو اس دعوت کو قبول نہ کریں ، داعی بہرحال اجر وثواب کا حقدار ہوگا ۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾ ع ۱
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ
وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ؕ﴿۹﴾ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (وقف لازم)
فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا
تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، ﴿۱﴾ نیز ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۷﴾ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے؛ حالاں کہ وہ حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں ﴿۲﴾ ﴿۸﴾ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں، مگر (درحقیقت) وہ اپنے آپ ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور ان کو اس کا احساس تک نہیں ہے ﴿۳﴾ ﴿۹﴾ اُن کے دلوں میں بیماری ہے، خدا نے اُن کی بیماری اور بھی بڑھادی ہے، ﴿۴﴾ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے؛ کیوں کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ﴿۵﴾ ﴿۱۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو، تو کہتے ہیں کہ ہم ہی تو ہیں اصلاح کرنے والے۔ ﴿۶﴾ ﴿۱۱﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد رکھی ہے؛ لیکن جب آدمی عناد کے جذبہ سے کسی بات کے نہ ماننے پر بہ ضد ہوجاتا ہے تو اس کی یہ استعداد آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے، اب دل میں حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، کان موجود ہیں؛ لیکن کان سے دلوں کا فاصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سنی اَن سنی ہوجاتی ہے، آنکھیں موجود ہیں؛ لیکن وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر خدا تک پہنچنے سے قاصر ہیں، اسی کیفیت کا اس آیت میں ذکر ہے، ایسا نہیں ہے کہ خدا کے مہر لگانے کی وجہ سے وہ کفر پر بہ ضد ہیں؛ بلکہ جانتے بوجھتے ان کے انکار و عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے اور ان کو بے توفیق اور محروم کردیا ہے، گویا ان کا انکار و عناد سبب ہے اور بے توفیقی اس کا نتیجہ۔

﴿۲﴾ مدینہ میں ایک گروہ ایسا تھا جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا؛ لیکن یہ حقیقت میں کافر تھا، ان کو ''منافقین'' کہا جاتا تھا، یہاں اگلی تین آیتوں تک اسی گروہ کا ذکر ہے۔

﴿۳﴾ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دھوکہ سے باخبر ہیں، وحی الٰہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمان بھی ان فتنہ انگیزیوں سے بے خبر نہ تھے؛ اس لئے درحقیقت وہ خود ہی دھوکہ میں تھے اور ان کو اس کا اندازہ تک نہ تھا۔

﴿۴﴾ بیماری سے مراد چھپا ہوا کفر و نفاق ہے، اسلام کو جوں جوں فروغ ہوتا تھا اور نبوت محمدی ﷺ کا پودا تناور ہوتا جاتا تھا، ان کی اسلام کے بارے میں حسد اور جلن میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی کو ان کی بیماری میں اضافہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿۵﴾ یعنی مسلمان ہونے کا غلط دعویٰ کرتے تھے۔

﴿۶﴾ عقیدہ و عمل کے تمام بگاڑ کی جڑ کفر و شرک ہے اور یہ کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں ←

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا
اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

آگاہ رہو! کہ یہی ہیں فساد مچانے والے؛ لیکن سمجھتے نہیں ہیں ﴿۱۲﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ (اخلاص کے ساتھ) ایمان لائے ہیں، تم بھی ایمان لے آؤ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں، جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو کہ وہ خود بے وقوف ہیں؛ لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتے «۱» ﴿۱۳﴾ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے ہیں «۲» اور جب اپنے شیاطین «۳» کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں کے ساتھ) محض مذاق کر رہے ہیں۔ «۴» ﴿۱۴﴾

← نت نئی سازشیں مرتب کرتے رہتے تھے، اسی کو زمین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنا فرمایا گیا ہے، ہر زمانہ میں مفسدین کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ فساد پیدا کرتے ہیں اور اس کو نام اصلاح کا دیتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی عقیدہ وعمل کے بگاڑ کی جتنی تحریکیں اٹھیں، انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا، منافقین کے اس تذکرہ میں تنبیہ ہے کہ ہر شخص جو اصلاح کا دعوی کرے، اس کی بات کو پرکھے اور کسے بغیر قبول نہ کر لینا چاہئے، کہ ہر چمکنے والی چیز ہیرا نہیں ہوتی۔

«۱» منافقین کی ملاقات کمزور غریب مسلمانوں سے ہوتی تو بعض اوقات وہ اپنے نفاق کی چھپی ہوئی بیماری کو ظاہر کر دیتے، اس پر یہ مسلمان ان سے کہتے کہ وہ بھی اوروں کی طرح اخلاص اور دل وزبان کی رفاقت کے ساتھ ایمان لے آئیں، تو یہ کہتے کہ ہم کچھ بے وقوف ہیں کہ ان کی طرح مسلمان ہو جائیں؟ حالاں کہ یہ خود ان کی بے وقوفی تھی کہ ایمان سے محرومی سے بڑھ کر کیا خسران ونقصان ہو سکتا ہے؟ جو لوگ دین کے بارے میں شکوک وشبہات کے کانٹے اپنے قلوب میں چھپائے رہتے ہیں، اپنی کوتاہ عقل کی ترازو میں خدا اور رسول کے احکام کو تول کر ان کے معقول و نا معقول ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں اور سماجی و خاندانی مجبوریوں کے تحت علانیہ اسلام سے بغاوت کا اعلان بھی نہیں کر سکتے، ہمیشہ ان کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ مخلص دین داروں اور شریعت کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے مسلمانوں کو وہ بے وقوف، نا معقول اور دقیانوسی تصور کرتے ہیں۔

«۲» جو مسلمان سماج میں ذی وجاہت تھے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ، ان سے خوشامد میں اپنے پکے مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے؛ تاکہ اسلام کے ظاہری فوائد سے محروم نہ ہوں۔

«۳» 'شیطان' حق سے دور اور سرکش کو کہا جاتا ہے، خواہ انسان ہو یا جنات، قرآن مجید میں یہ لفظ گرچہ شیاطینِ جنات کے لئے زیادہ استعمال ہوا ہے؛ لیکن سرکش انسانوں کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے، یہاں شیاطین سے منافقین کے سردار اور ان کے خاص رفقاء مراد ہیں۔

«۴» یعنی اسلام کے جو ظاہری فوائد ہیں، جان، مال کی حفاظت، مالِ غنیمت میں حصہ داری اور نکاح کا تعلق، وہ ہم مسلمانوں سے حاصل کر رہے ہیں۔

اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ وَ یَمُدُّہُمْ فِیْ طُغْیَانِہِمْ یَعْمَہُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا
الضَّلٰلَةَ بِالْہُدٰی ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُہُمْ وَ مَا کَانُوْا مُہْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُہُمْ کَمَثَلِ الَّذِی
اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَہٗ ذَہَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِہِمْ وَ تَرَکَہُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ لَّا
یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ فَہُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْہِ ظُلُمٰتٌ
وَّرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَہُمْ فِیْٓ اٰذَانِہِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَ اللّٰہُ
مُحِیْطٌۢ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾

اللہ بھی ان کے ساتھ مذاق کررہے ہیں اور اُن کو ڈھیل دیتے جاتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۵﴾ یہی
لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی ہے، نہ ان کی تجارت نفع بخش ہے اور نہ یہ ہدایت کے پانے
والے ہیں ﴿۱۶﴾ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب آگ نے اس کے گردوپیش کو روشن
کردیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی چھین لی اور ان کو تاریکی میں چھوڑ دیا، کہ انھیں کچھ نظر نہیں آتا ﴿۱۷﴾ (وہ حق کو قبول
کرنے کے معاملہ میں) بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اب وہ (ہدایت کی طرف) واپس نہیں آئیں گے ﴿۲﴾ ﴿۱۸﴾
یا ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے زوردار بارش ہورہی ہو، اس میں اندھیرے بھی ہیں، گرج بھی اور بجلی بھی، وہ اپنے
کانوں میں کڑک کی وجہ سے موت سے ڈر کر انگلیاں ٹھونسے ہوئے ہیں؛ حالاں کہ اللہ کفر کرنے والوں کو گھیرے
ہوئے ہیں۔ ﴿۱۹﴾

﴿۱﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس منافقانہ عمل کی سزا ان کو دے رہے ہیں کہ ان کو ڈھیل دیتے جارہے ہیں؛ تاکہ وہ حق تک رسائی سے مسلسل محروم رہیں اور سخت سزا کے حقدار ہوجائیں، عربی زبان میں یہ محاورہ ہے کہ کسی چیز کے بدلہ کو بھی اسی نام سے ذکر کیا جاتا ہے، جیسے خود قرآن مجید نے کہا: جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُہَا کہ ''برائی کے بدلہ اسی کے مثل برائی درست ہے'' ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ ''برائی'' نہیں؛ مگر تقابل کے طور پر اس کو بھی ''برائی'' کہا گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل مذاق اُڑانے کی سزا ہے نہ کہ خود مذاق اُڑانا؛ لیکن بہ طورِ محاورہ اس کو بھی ''استہزاء'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

﴿۲﴾ اسلام کے بارے میں تمام منافقین کی سوچ یکساں نہ تھی، بعض تو قبولِ حق کے لئے بالکل ہی تیار نہ تھے، گویا ان کے کان تھے؛ لیکن حق کو قبول کرنے سے محروم اور بہرے، زبان تھی؛ لیکن حق کے اقرار واعتراف سے عاجز، آنکھیں تھیں؛ لیکن حق کے ادراک کی صلاحیت سے قاصر، یہ کفر میں زیادہ سخت تھے اور یہ مثال ان ہی لوگوں کی ہے، کہ نبوت کا نور ان کے سامنے دوپہر کے آفتاب کی طرح روشن تھا؛ مگر انھوں نے اپنے آپ کو اس کی روشنی سے محروم رکھا تھا۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ع ۲ ۱۳
اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ
لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

بجلی کی یہ حالت ہے کہ لگتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی ہی کو اچک لے گی، جب ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اگر اللہ چاہیں تو ان کے کان اور آنکھیں چھین لیں، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۰﴾ اے لوگو! ﴿۲﴾ اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا فرمایا؛ تا کہ تم (خدا کے عذاب سے) بچو ﴿۳﴾ ﴿۲۱﴾ جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی ﴿۴﴾ اور بادل سے پانی برسائے ﴿۵﴾ پھر تمہاری غذا کے لئے اس سے پھل پیدا کئے، پس سب کچھ جانتے بوجھتے کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ۔ ﴿۶﴾ ﴿۲۲﴾

﴿۱﴾ یہ منافقین کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے، جو مسلمانوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کو دیکھ کر ایک دو قدم اسلام کی طرف بڑھتے تھے؛ لیکن پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاؤں اور آزمائشوں کو دیکھ کر اپنے قدم پیچھے ہٹا لیتے تھے، ان کا دینِ حق کی طرف بڑھنا بھی دنیا کے حقیر مفادات کے لئے ہوتا تھا اور پیچھے ہٹنا بھی دنیا کی محرومیوں کے خوف سے ہوتا تھا، جو لوگ ایمان میں مخلص نہ ہوں اور شک اور تذبذب کے مرض میں مبتلا ہوں، ہمیشہ ان کا یہی طرزِ عمل ہوا کرتا ہے۔

﴿۲﴾ اوپر تین طرح کے لوگوں کا ذکر آیا ہے: علانیہ کافروں کا، ان منافقین کا جن کو اسلام کی طرف کبھی رغبت نہ ہوتی تھی اور ان منافقین کا جو اسلام کی مادی فتوحات کو دیکھ کر بعض اوقات اسلام کی طرف راغب ہوتے تھے، اب ان تینوں گروہوں کو ملا کر خطاب ہے، — عام طور پر قرآن میں غیر مسلموں کو ''یٰٓاَيُّهَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) ہی کے لفظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ ''تقویٰ'' گناہ سے بچنا بھی ہے اور عذاب سے بچنا بھی، یہاں بھی دونوں مراد لئے گئے ہیں، مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے دوزخ سے بچنا مراد لیا ہے۔

﴿۴﴾ زمین کو فرش بنانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو رہائش کے لائق بنایا، اگر زمین دلدلی ہوتی تو انسان کا اس پر قیام دشوار ہو جاتا، جیسا کہ فضاء کے بعض سیاروں کی سطح کے بارے میں بتایا جاتا ہے، ''سماء'' (آسمان) میں فضاء بھی داخل ہے، چھت کا کام حفاظت ہے، اسی طرح فضاء میں مختلف سیاروں اور بالخصوص سورج سے زمین کی طرف آنے والی مہلک اور نقصاندہ آلائشوں کو جذب کر لینے اور تحلیل کر دینے کی صلاحیت ہے، یہ زمینی مخلوقات کی حفاظت کا ایک قدرتی نظام ہے، غالباً اسی پس منظر میں آسمان کو چھت کہا گیا ہے۔

←

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا
النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا
مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

ہم نے جو کتاب اپنے بندہ (محمد رسول اللہ ﷺ) پر اُتاری ہے، اگر اس (کے اللہ کی طرف سے ہونے) میں تم کو شک ہو تو تم اس جیسی ایک سورت بھی لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو، اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور یقیناً نہیں کرسکو گے تو (دوزخ کی) اس آگ سے بچو، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو ایمان نہ لانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۲۴﴾ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھا عمل کیا، ﴿۲﴾ ان کو خوشخبری دے دیجئے کہ اُن کے لئے ایسی بہشتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جب کبھی اُن کو اِن باغات سے پھل کھانے کو دیئے جائیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے، جو اِس سے پہلے ہمیں دیا گیا تھا اور (واقعی) ان کو ملتا جلتا پھل دیا جائے گا ﴿۳﴾ ان کے لئے بہشت میں پاکیزہ بیویاں بھی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۵﴾

← ﴿۵﴾ عربی زبان میں ''سماء'' کے معنی بادل کے بھی ہیں اور ابن کثیر کے بہ قول یہاں ''بادل'' ہی مراد ہے؛ اس لئے آسمان کے بجائے ''بادل'' سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۶﴾ قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہے، کائنات کی ایک ایک شئ توحید خداوندی کی دلیل ہے اور اس کے خالق کے ایک اور یکتا ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے جابجا کائنات کی ان نشانیوں سے توحید پر استدلال کیا ہے، جن کو ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دن ورات اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔

﴿۱﴾ قرآن مجید کے اللہ کا کلام ہونے کی دلیل خود قرآن ہے، زبان و بیان، اُسلوبِ کلام کی ندرت، اثر انگیزی و دلآویزی، معانی ومضامین کی گہرائی و گیرائی، اس کے پیش کئے ہوئے نظام حیات کی قانونِ فطرت سے مطابقت و ہم آہنگی، قصص و واقعات کی صحت و درستگی، پیش گوئیوں کی حرف بہ حرف تکمیل اور اس کی انقلاب انگیزی کی صلاحیت، ہر پہلو سے قرآن ایک بے نظیر اور بے مثال کلام ہے اور بجائے خود کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے، قرآن مجید نے اپنے زمانۂ نزول ہی میں عربوں کو (جو زبان و بیان کے بادشاہ تھے) چیلنج دیا تھا کہ اگر قرآن کو کتابِ الٰہی نہیں مانتے تو اس جیسی دس سورتیں (ہود: ۱۳) یا کم سے ایک سورت (بقرہ: ۲۲) ہی لے آؤ اور فرمایا گیا کہ اگر جنات وانسان مل کر بھی کوشش کریں گے تو اس میں کامیاب نہ ہوسکیں گے، (بنی اسرائیل: ۸۸) اس چیلنج کو تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گذر چکا ہے، مگر نہ کوئی زبان ہے جو اس کے مقابلہ کھل سکی اور نہ کوئی قلم ہے جو اس کے مقابلہ اٹھ سکا۔

﴿۲﴾ ''عمل صالح'' قرآن کی ایک اہم اصطلاح ہے، اس سے ایسا عمل مراد ہے جو اللہ کے حکم سے ہو، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ ←

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَا ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

وقف لازم

یقیناً اللہ کو اس سے عار نہیں کہ مچھر یا اس سے بھی گئی گذری ﴿۱﴾ کسی شئ کی مثال دیں، ﴿۲﴾ جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے یہ مثال بالکل برموقع ہے اور جو لوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا کیا مقصود ہے؟ اللہ تعالیٰ اسی مثال سے بہتوں کو ہدایت سے محروم کر دیتے ہیں اور بہتوں کو ہدایت عطا فرماتے ہیں، ﴿۳﴾ اور اللہ ہدایت سے صرف ایسے نافرمانوں ہی کو محروم کرتے ہیں، جو مضبوط وعدہ کر کے اللہ سے وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۶﴾

← کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو اور اس عمل سے خدا ہی کی خوشنودی مقصود ہو، جو عمل اللہ کے حکم کے خلاف ہو، گو بہ ظاہر بہتر نظر آئے؛ لیکن عمل صالح نہیں، جیسے عیدین کے دن روزہ، مکروہ اوقات میں نماز، ایامِ تشریق میں عمرہ وغیرہ، کوئی عمل حکم خداوندی کے تحت ہو؛ لیکن سنت نبوی ﷺ کا خیال نہ رکھا جائے، تو یہ بھی عمل صالح نہیں، آج کل جو بدعات مروج ہیں، وہ اسی قبیل کی ہیں، اطاعتِ الٰہی بھی ہو، سنت نبوی ﷺ کے مطابق بھی ہو؛ لیکن ریا اور دکھاوا مقصود ہو تو یہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور گو صورت کے اعتبار سے نیک عمل ہے؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے عمل صالح میں اس کا بھی شمار نہیں۔

﴿۳﴾ یا تو یہ مطلب ہے کہ وہ ان پھلوں کو دنیا کے پھلوں کی طرح پائیں گے اور کہیں گے کہ یہ ویسے ہی پھل ہیں؛ لیکن جب کھائیں گے تو ذائقہ اور لذت میں زمین و آسمان کا فرق پائیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ خود جنت کے پھل شکل میں ایک دوسرے کی طرح ہوں گے اور مزے میں مختلف۔

﴿۴﴾ دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں، یا تو انسان زندہ رہتا ہے اور نعمت اس سے چھن جاتی ہے، یا نعمت باقی رہتی ہے اور خود انسان دنیا سے اُٹھا لیا جاتا ہے، غرض فنا کی بیماری انسان کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے اور ان نعمتوں کے ساتھ بھی؛ لیکن آخرت میں انسان کی زندگی بھی ابدی ہوگی اور جنت کی نعمتیں بھی لازوال۔

﴿۱﴾ ''مافوقه'' سے ایسی چیز مراد ہے جو حقارت میں مچھر سے بھی بڑھ کر ہو۔

﴿۲﴾ بعض اہل کفر اس بات پر معترض تھے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، اس کے باوجود اس میں مچھر، مکھی وغیرہ کا تذکرہ ہے، جو اللہ کی جلالت شان اور اس کی کتاب کی عظمت کے خلاف ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک نامعقول بات تھی، حقیر چیز کی مثال حقیر چیز ہی سے دی جائے گی، اگر قرآن میں بتوں اور مورتیوں کے عجز کی مثال مچھر مکھی سے دی گئی ہے، تو یقینا یہی اس موقع کے لئے بہترین مثال ہے، اگر ہاتھی اور شیر سے ان کی مثال دی جاتی تو یہ مقصود کے خلاف ہوتا۔

﴿۳﴾ یعنی ایمان نہ لانے والوں نے اس مثال کی معقولیت پر اعتراض کیا، جو ان کے لئے گمراہی کا باعث ہوا اور مسلمانوں نے اس کی تصدیق کی تو یہی ان کے ایمان میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ ←

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ
وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳/۹

جس چیز کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، اسے کاٹتے ہیں ﴿۱﴾ اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، ﴿۲﴾ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ﴿۲۷﴾ تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؛ حالاں کہ تم بے جان تھے، ﴿۳﴾ اللہ نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت دیں گے، پھر (دوبارہ) زندہ کریں گے، ﴿۴﴾ پھر اللہ ہی کے پاس تم لوٹائے جاؤ گے، ﴿۵﴾ ﴿۲۸﴾ وہی ہے جس نے تمہارے واسطے زمین کی تمام چیزیں پیدا کیں، ﴿۶﴾ پھر آسمان کا ارادہ کیا اور سات درست آسمان بنادئے، ﴿۷﴾ اور اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ ﴿۲۹﴾

← ﴿۴﴾ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں ظاہر فرمایا اور ان سے اپنی توحید کا اور رب ہونے کا اقرار لیا، جس کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے، (الاعراف: ۱۷۲) شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ خدا کی طرف لپکنا انسان کی فطرت کا حصہ ہے اور اگر آدمی سماجی اور خاندانی اثر سے آزاد ہوکر کائنات کے وجود یا خود اپنے وجود میں غور کرے اور عبرت کی نگاہ ڈالے تو خدا کے اقرار پر مجبور ہوجائے، اسی عہد اور فطرتِ انسانی میں اس عہد کی بازگشت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کفر کرکے اس عہد کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

﴿۱﴾ یعنی خدا نے جن تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، جیسے خدا اور بندہ کا تعلق، انبیاء اور اُمتوں کا تعلق اور ایک انسان سے دوسرے انسان کا تعلق، ان کو یہ توڑنے کے مرتکب ہیں اور اس کی دلیل وہ سلوک ہے جو یہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔

﴿۲﴾ فساد سے اسلام کی مخالفت، مسلمانوں سے عداوت اور ظلم وناانصافی مراد ہے۔

﴿۳﴾ یعنی تم نطفۂ بے جان، پھر خون، پھر گوشت کا ٹکڑا تھے اور اسی سے اللہ نے ایک بولتا، دیکھتا، سنتا، چلتا، پھرتا انسان بنادیا۔

﴿۴﴾ یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔

﴿۵﴾ ایمان عمل کی جڑ ہے، ایمان ہی سے عمل کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور عقیدۂ آخرت ایمان وعمل صالح کا محرک ہے، اگر آخرت کا شوق اور خوف نہ ہو تو نہ کسی نیک کام کی رغبت ہو اور نہ کسی برائی سے بچنے کی توفیق؛ اسی لئے قرآن عام طور پر جہاں ایمان وعمل کی ترغیب دیتا ہے یا کفر اور گناہ سے روکتا ہے، اپنی بات کو آخرت کے تذکرہ پر ختم کرتا ہے۔

﴿۶﴾ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو اشیاء ہیں، ان میں اصل انسان کے لئے جائز اور مباح ہونا ہے، سوائے اس کے کہ شریعت کی طرف سے کسی چیز کی ممانعت ثابت ہوجائے، یہی حکم معاملات میں بھی ہے، کہ معاملات کے جو طریقے مروج ہوجائیں، ←

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

وہ وقت قابل ذکر ہے جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ ﴿۱﴾ بنانے والا ہوں، انھوں نے کہا کہ کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو رکھیں گے جو فساد برپا کریں اور خون بہائیں، اور ہم تو آپ کی تسبیح، حمد اور پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اللہ نے ارشاد فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۰﴾

← جب تک ان میں ممانعت کی کوئی وجہ نہ ہو، درست ہوں گے؛ البتہ عبادات کا حکم اس سے مختلف ہے، عبادات میں وہی طریقہ درست اور مشروع ہوگا، جس کا قرآن وحدیث سے ثبوت ہو، جس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہ ہو وہ درست نہیں؛ بلکہ بدعت ہے، جیسے کوئی عبادت انفرادی طور پر ثابت ہو تو اس کو اجتماعی طور پر ادا کرنا، جن اذکار کا آہستہ کہنا منقول ہو ان کو زور زور سے کہنا، جو مستحب کے درجہ میں منقول ہیں ان کو واجب کا درجہ دے دینا درست نہیں ہے، ان سب کا شمار بدعت میں ہے۔

﴿۷﴾ آسمان کا سات ہونا اور ان کا محسوس طور پر پایا جانا اس آیت سے واضح ہے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین بھی سات ہیں، (الطلاق: ۱۲) اگر انسان کی آسمان تک رسائی نہیں ہوئی ہے اور زمین کی سات تہوں کو ابھی اس نے دریافت نہیں کیا ہے، تو یہ ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے کہ کسی چیز کا معلوم نہ ہونا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔

﴿۱﴾ فرشتوں کا یہ کہنا کچھ اعتراض کے طور پر نہ تھا؛ بلکہ کمالِ نیاز مندی کے ساتھ محض عرضِ مدعا تھا، کہ حمد وثناء اور تسبیح وتقدیس میں تو ہم لوگ ہمہ دم مصروف ہیں ہی، اور جو اُمور ہمارے حوالہ کئے جاتے ہیں، ان کو بجالانے میں بھی کوئی کسر نہیں رکھی جاتی، زمین میں انسان سے پہلے جنات کے قیام کا تجربہ ہمیں بھی ہے اور اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ نئی زمینی مخلوق بھی سب کی سب نیکوکار نہ ہوگی، اس میں فساد مچانے اور خونریزی کرنے والے لوگ بھی ہوں گے، تو صد فی صد فرمانبردار اور اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے ایسی مخلوق کا وجود میں لانا مفید نظر نہیں آتا، جن میں اچھے لوگ بھی ہوں اور مفسدین واشرار بھی۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام مفسدین اور بگاڑ پیدا کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسے: شرعی سزائیں، آخرت میں کافروں اور گنہگاروں پر عذاب، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بعض صفات وہ ہیں جن کا ظہور خطا کاروں سے متعلق ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا غفار ہونا، عَفُو ہونا، ستار ہونا، وغیرہ، اگر ایسی مخلوق نہ ہوتی جس میں نیکوں کے ساتھ برے اور فرمانبرداروں کے ساتھ خطا کار بھی ہوں تو نہ یہ احکامِ الٰہی جاری ہو پاتے اور نہ اللہ تعالیٰ کی ان بلند صفات کا اظہار ہو پاتا؛ اس لئے ایسی مخلوق کا وجود ضروری تھا، جو خیر وشر کے سلسلہ میں امتحان لئے جانے کے لائق ہو اور نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیت رکھتی ہو، فرشتے برائی ونافرمانی پر قادر ہی نہ تھے اور جنوں میں نیکی کی صلاحیت نہایت مغلوب تھی؛ اس لئے وہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں تھے، غالباً اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کے بارے میں فرمایا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾

اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے، ﴿۱﴾ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تمہاری بات صحیح ہے تو ان کے نام تو بتاؤ؟ ﴿۲﴾ ﴿۳۱﴾ فرشتے بول اٹھے: آپ کی ذات پاک ہے، ہمیں تو صرف وہی معلوم ہے جو آپ نے ہمیں سکھایا ہے ﴿۳﴾، بے شک آپ ہی پورے علم و حکمت والے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۳۲﴾

﴿۱﴾ عربی زبان میں ''اسم'' صرف نام ہی کو نہیں؛ بلکہ علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ کے بہ قول اس کو کہتے ہیں جس سے کسی شئ کی ذات کی معرفت حاصل ہو، ''ما یعرف به ذات الشئ'' اس لئے مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت آدم کو علیہ السلام صرف اشیاء کے نام ہی نہیں؛ بلکہ ان کے حقائق و خواص بھی بتا دیئے گئے تھے؛ گویا آج تک کائنات کی جن پوشیدہ حقیقتوں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے اور اَن جانی باتیں علم کی روشنی میں آتی جاتی ہیں، وہ اُسی علم کا ظہور ہیں، جو بارگاہِ ربانی سے حضرت آدم علیہ السلام کو عطا ہوا تھا، — ویسے غور کیا جائے تو چیزوں کو نام سے موسوم کرنا بھی انسان ہی کی خصوصیت ہے، دوسری مخلوقات اس سے محروم ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، مثلاً اگر انسان پھلوں اور غذاؤں، آدمیوں اور شہروں کے نام رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور فرض کیجئے کہ اسے یہ کہنا ہوتا کہ مجھے حمید کے ذریعہ مدینہ کی کھجور بھیج دو، تو اس کا تعبیر کرنا کتنا دشوار ہوتا؟ اس لئے اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے واسطہ سے بنی آدم ہی کو ناموں کے ذریعہ چیزوں کی شناخت اور تعیین کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔

﴿۲﴾ ''اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ'' کے اصل معنی ہیں: ''اگر تم سچے ہو'' — لیکن فرشتوں سے جھوٹ کا احتمال نہیں کہ وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہی نہیں ہیں؛ اس لئے یہاں مراد یہ ہے کہ ''اگر تمہاری بات صحیح ہے'' کیوں کہ عربی زبان میں ''صدق'' کے معنی صواب اور درست کے بھی آتے ہیں۔

﴿۳﴾ نام تو غالباً حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سامنے ہی بتائے گئے؛ لیکن وہ اسے اخذ نہ کر سکے؛ اسی لئے جب سوال ہوا تو اپنے عجز کا اظہار کرنا پڑا، اصل میں فرشتوں کا علم محض تقلیدی ہے، وہ استنباط کی صلاحیت سے محروم ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت سے نوازا ہے؛ اس لئے وہ معلومات میں غور کر کے نامعلوم باتوں کو بھی اخذ کر لیتا ہے۔

﴿۴﴾ یعنی زمین میں احکامِ الٰہی کو جاری کرنے کے لئے علم و فہم بھی مطلوب ہے، محض صالحیت کافی نہیں؛ بلکہ صلاحیت بھی ضروری ہے، ہم اس حکمت سے واقف نہیں تھے، — اس سے عبادت پر علم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ عبادت میں تو فرشتے بڑھ کر تھے، انسان کو یہ مقام علم ہی کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی۔

قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾

اللہ نے فرمایا: آدم! تم فرشتوں کو ان کے نام بتاؤ، جب آدم نے ان کے نام بتادیئے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو بھی خوب جانتا ہوں، جن باتوں کو تم ظاہر کرتے ہو، ان سے بھی واقف ہوں اور جن کو (دل میں) چھپائے رکھتے ہو، ان سے بھی؟ ﴿۳۳﴾ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوجاؤ، تو سوائے ابلیس کے سب سجدہ میں گر پڑے ﴿۱﴾، اس نے نہیں مانا اور تکبر میں مبتلا ہوگیا اور (دراصل) وہ تھا ہی کافروں میں، ﴿۲﴾ ﴿۳۴﴾ اور ہم نے کہا: آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہیں اور جہاں چاہیں آسودہ ہوکر کھائیں ﴿۳﴾، (البتہ) اس درخت کے قریب کبھی نہ پھٹکنا، ﴿۴﴾ ورنہ تمہارا شمار خطا کاروں میں ہوجائے گا۔ ﴿۵﴾ ﴿۳۵﴾

﴿۱﴾ سجدہ سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس سے پیشانی کا زمین پر رکھنا مراد نہیں؛ بلکہ محض حضرت آدم علیہ السلام کی بڑائی اور جلالت شان کو تسلیم کرنا مراد ہے؛ اس لئے کہ عربی زبان میں ''سجود'' کے معنی ''خضوع وتذلل'' کے بھی آتے ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے سجدہ کی مخصوص صورت یعنی پیشانی کا زمین پر رکھنا ہی مراد ہے؛ لیکن یہ سجدہ عبادت وبندگی کے طور پر نہ تھا کہ یہ تمام شریعتوں میں اللہ کے ماسوا کے لئے حرام رہا ہے؛ بلکہ احترام وتعظیم کا سجدہ مراد ہے، جو پہلی اُمتوں میں جائز تھا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ظاہر ہے (یوسف:۱۰۰) اور شریعت محمدی میں اسے بھی حرام فرما دیا گیا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے ماسوا کو سجدہ کی گنجائش ہوتی تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ شوہروں کو سجدہ کریں، (مشکوٰۃ مع المرقاۃ:۶/۲۷۲) ایک رائے یہ بھی ہے کہ سجدہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو کیا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت قبلہ کی تھی۔ (تفسیر آیات الأحکام لمحمد علی السائس:۱/۶۰)

﴿۲﴾ ''کان من الکافرین'' کا ترجمہ دونوں طریقہ سے کیا گیا ہے: ''شیطان کافروں میں سے ہوگیا'' اور ''شیطان کافروں میں سے تھا''، یعنی وہ بہ باطن کفر کو چھپائے ہوئے تھا اور یہ بات پہلے ہی سے خدائے علیم وخبیر کے علم میں تھی، دوسرا ترجمہ الفاظِ قرآن سے زیادہ قریب ہے۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ کھانا پینا اور ازدواجی تعلق تقویٰ وبزرگی اور دینی کمالات کے منافی نہیں ہے۔

﴿۴﴾ اس درخت کا نام نہ قرآن میں مذکور ہے نہ صحیح حدیثوں میں، عوام میں جو گیہوں مشہور ہوگیا ہے، اس کی کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔

﴿۵﴾ ''ظلم'' کا لفظ قرآن مجید میں متعدد جگہ گناہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، گناہ پیغمبر کے شایانِ شان نہیں؛ اسی لئے ''خطا کار'' کے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ
وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ
تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

آخر شیطان نے اسی درخت کے باعث اُن دونوں ﴿۱﴾ کو لغزش ﴿۲﴾ میں مبتلا کر دیا اور ان کو اس سے نکال کر ہی چھوڑا، ہم نے کہا کہ (اب) تم سب (یہاں) سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے، ﴿۳﴾ تمہارا ٹھکانہ زمین میں ہوگا اور (وہاں) ایک خاص مدت تک تمہارا رہنا سہنا ہوگا ﴿۳۶﴾ پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لئے، ﴿۴﴾ (اور توبہ کی) اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی، بے شک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۳۷﴾ ہم نے کہا: تم سب نیچے اُتر جاؤ، ﴿۵﴾ اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶﴾ ﴿۳۸﴾

﴿۱﴾ ''عنہا'' کے دو معنی کئے گئے ہیں اور دونوں کی گنجائش ہے: اول یہ کہ اس سے ''جنت'' مراد لی جائے، دوسرے اس سے وہی ممنوع درخت مراد لیا جائے، آیت میں اس سے پہلے دونوں ہی کا ذکر آیا ہے، ہندوستان کے اہل علم میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے دوسرا۔

﴿۲﴾ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ اور ایسا صغیرہ گناہ جو مروت و شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہو، کا صدور بالاتفاق انبیاء سے نہیں ہوسکتا، ایسے ''صغائر'' جو عام انسانی شرافت کے خلاف نہ سمجھے جاتے ہوں، کا ارتکاب انبیاء سے ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے؛ البتہ لغزشوں اور خلافِ اولیٰ باتوں کا صدور انبیاء سے بھی ہوسکتا ہے، یہی اکثر علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، اور انبیاء سے ان کے صدور کی حکمت یہ ہے کہ انبیاء کے انسان اور بشر ہونے کا پہلو اُمت کے ذہن میں باقی رہے اور وہ ان کی شان کے بارے میں افراط اور مبالغہ سے کام نہ لیں، حضرت آدم علیہ السلام کا اس درخت کے پھل سے کھانا، حضرت یونس علیہ السلام کا قبل از وقت نینویٰ سے ہجرت کر جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بلا ارادہ ایک قبطی کو قتل کر دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقع پر ''انشاء اللہ'' کہنا بھول جانا اسی قبیل سے ہے، اُمت کی تو ایسی لغزشیں بارگاہِ خداوندی میں یوں ہی معاف ہیں، انبیاء کی شان اور ان کے مقام کے لحاظ سے اتنی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت ہو جاتی ہے، کہ جس کے رتبے ہیں سوا اُس کو سِوا مشکل ہے!

﴿۳﴾ یا تو اس سے شیطان اور فرزندانِ آدم کی باہمی عداوت مراد ہے یا خود انسان کی باہمی عداوت۔

﴿۴﴾ یعنی یہ پہلی توبہ تھی، جو کسی انسان کو اپنے رب کریم سے طلب کرنی تھی؛ اس لئے خداوند کریم ہی نے حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے، اس سے وہ دُعاء مراد ہے جس کا ذکر ''الاعراف: ۲۳'' میں ہے۔

﴿۵﴾ گویا توبہ قبول ہونے کے بعد بھی انسان کے لئے زمین میں قیام پذیر ہونے کا حکم باقی رہا؛ کیوں کہ اس کے بغیر انسان کو زمین کی خلافت سونپنے کا مقصد حاصل نہ ہوسکتا تھا۔

←

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ يٰبَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ
فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَ لَا
تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں، ﴿۱﴾ کو جھٹلائیں گے، وہ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے ﴿۲﴾ ﴿۳۹﴾ اے بنی اسرائیل! ﴿۳﴾ میں نے تم پر جو انعام کئے ہیں، ان کو یاد رکھو، ﴿۴﴾ اور تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں گا ﴿۵﴾ اور صرف مجھ ہی سے ڈرتے رہو ﴿۶﴾ ﴿۴۰﴾ میں نے جو کتاب نازل کی ہے، جو تمہارے پاس پہلے سے موجود کتاب کی تصدیق کررہی ہے، ﴿۷﴾ اس پر ایمان لے آؤ، تم ہی اس کے پہلے انکار کرنے والے نہ بن جاؤ، ﴿۸﴾ نہ حقیر قیمتوں کے بدلہ میری آیات کو بیچ ڈالو ﴿۹﴾ اور صرف (میرے ہی غضب سے) ڈرا کرو۔ ﴿۱۰﴾ ﴿۴۱﴾

← ﴿۶﴾ کسی تکلیف دہ بات کے پیش آنے سے پہلے جو گھبراہٹ اور اندیشہ ہوتا ہے، اس کو ''خوف'' اور پیش آنے کے بعد جو دکھ اور صدمہ ہوتا ہے، اسے ''حزن'' کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کی پیروی کرنے والوں کو نہ مستقبل کا کوئی خوف ہونا چاہئے اور نہ گذرے ہوئے حالات پر کوئی رنج۔

﴿۱﴾ ''آیات'' کے معنی احکام الٰہی کے بھی ہوسکتے ہیں اور اللہ کی اُن نشانیوں کے بھی، جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں اور اپنی زبانِ حال سے ہر لمحہ اور ہر آن خدا کے وجود اور اس کی توحید کی گواہی دے رہی ہیں۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ جیسے اہل جنت ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے، اسی طرح دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

﴿۳﴾ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے، ان کے بارہ لڑکے تھے، ان ہی سے یہود کے تمام قبائل پیدا ہوئے؛ اس لئے قرآن میں یہود و نصاریٰ کو ''بنی اسرائیل'' سے مخاطب کیا گیا ہے، اس میں ان کے لئے تنبیہ بھی ہے کہ یعقوب جیسے ہادی و مہدی کی نسل سے ہو؛ لیکن ہدایت سے دور ہو۔

﴿۴﴾ بنی اسرائیل کو دنیا میں جو غلبہ دیا گیا اور اکثر انبیاء کرام کو ان کی نسل سے پیدا فرمایا گیا، اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿۵﴾ تورات میں یہود سے ہمیشہ احکام خداوندی پر کاربند رہنے کا عہد لیا گیا تھا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ تم کو تمام قوموں میں ایک خصوصی مقام دیا جائے گا، بائبل کے الفاظ میں: ''تم ساری قوموں سے زیادہ میرے ایک خزانہ میں خاص ہوگے'' (خروج ۱۹:۵)، اسی دوطرفہ عہد کا غالباً یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔

﴿۶﴾ یعنی عزت وجاہ اور مال وزر کے ہاتھ سے نکلنے کا خوف نہ کرو، جو یہودیوں کے اسلام قبول کرنے میں اصل رکاوٹ تھا۔

﴿۷﴾ تورات وانجیل کی تصدیق بجائے خود قرآن مجید کی صداقت کی دلیل ہے، انبیاء کرام کا طریقہ یہی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں؛ اس لئے کہ ان سب کا سرچشمۂ ہدایت ایک ہی ہے، اس کے برخلاف اہل دنیا اپنی عظمت جتانے کے لئے ایک دوسرے کی تکذیب کرتے ہیں اور دوسرے کو نیچا دیکھا کر اپنا قد اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ←

وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپاؤ، ﴿۴۲﴾ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور (میرے سامنے) جھکنے والوں کے ساتھ جھک جاؤ«۱» ﴿۴۳﴾ کیا تم لوگوں کو تو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؛«۲» حالاں کہ تم کتابِ (الٰہی) کی تلاوت بھی کرتے ہو؟«۳» کیا تم عقل سے کام ہی نہیں لیتے ؟؟ ﴿۴۴﴾ صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو،«۴» نماز بے شک دشوار ہے؛ لیکن خدا کا خوف رکھنے والوں پر دشوار نہیں۔ ﴿۴۵﴾

← «۸» یعنی تمہیں کفر و انکار کی قیادت نہ کرو؛ اس لئے کہ فطری طور پر سماج کے پڑھے لکھے لوگ جب کسی بات کا انکار کرتے ہیں تو عوام بھی ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں، یہود اہل کتاب ہونے کی وجہ سے عرب میں صاحبِ علم تصور کئے جاتے تھے، مشرکین عرب کو اپنے اُمّی اور اَن پڑھ ہونے کا خود اعتراف تھا؛ اس لئے ان کا انکار دوسروں کو بھی انکار پر آمادہ کرتا تھا، گویا یہ دوہرے جرم کے مرتکب تھے، خود گمراہ رہنے کے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے؛ اس لئے ان سے یہ بات فرمائی گئی۔

«۹» اللہ کے کلام کے مقابلہ بہ ظاہر کتنی بڑی قیمت ادا کر دی جائے، حقیر ہوگی؛ اس لئے اس میں مطلق کلام خداوندی کو بیچنے کی ممانعت ہے، خواہ کم قیمت لی جائے یا زیادہ۔

«۱۰» ''فَاتَّقُوْنَ'' کے معنی ''مجھ سے یعنی میرے غضب سے ڈرو'' کے بھی کئے گئے ہیں اور ''میرے غضب سے بچو'' کے بھی، دونوں کی گنجائش ہے۔

«۱» لفظی ترجمہ ہوگا: ''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رُکوع کرو'' بعض حضرات نے یہی ترجمہ کیا ہے، رُکوع کے معنی جھکنے اور عاجزی کرنے کے بھی ہیں، مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے، رکوع سے نماز والا رُکوع مراد لیا جائے، تو اس آیت سے نماز میں جماعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا گیا نہ کہ تنہا۔

«۲» اہل مکہ علماءِ یہود سے آپ ﷺ کی نبوت کے بارے میں استفسار کرتے تو بعض اوقات وہ اعتراف کرتے کہ آپ ﷺ کے اندر وہ علامات موجود ہیں، جو پہلی آسمانی کتابوں میں آخری نبی کے لئے بتائی گئی ہیں؛ مگر عزت و جاہ کی حرص خود ان کو مسلمان ہونے نہ دیتی تھی، اسی کا ذکر ہے۔

«۳» جس میں آپ ﷺ کے نبی ہونے کے بارے میں پیشین گوئیاں موجود تھیں۔

«۴» ''نماز'' تعلق مع اللہ کا عنوان ہے، مومن کے لئے یہی تعلق سب سے بڑا ہتھیار اور فتح و نصرت کی کلید ہے؛ اسی لئے ←

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝۴۶ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا
نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝۴۷ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ
نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْــًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ
يُنْصَرُوْنَ۝۴۸

جنھیں اپنے رب سے ملاقات کا اور اس بات کا یقین ہے کہ انھیں اللہ ہی کی طرف واپس جانا ہے۝۴۶ اے بنی اسرائیل! میں نے تم پر جو انعام کیا تھا اور تم کو تمام عالم پر بڑائی عطا کی تھی، ﴿۱﴾ اسے یاد کرو۝۴۷ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، نہ کسی کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ ﴿۲﴾ ۝۴۸

← پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف انسانی ضروریات سے متعلق نمازیں رکھی ہیں، بارش کے لئے استسقاء، سورج و چاند گہن کے موقع پر کسوف وخسوف کی نماز، استغفار کے لئے نماز جنازہ، گناہ ہو جائے تو نمازِ توبہ، کسی معاملہ میں مفید اور غیر مفید پہلوؤں کی بابت تردد ہو تو نمازِ استخارہ اور کوئی بھی حاجت درپیش ہو تو نمازِ حاجت —— ''صبر'' کے معنی برداشت کرنے کے ہیں، جب آدمی بے برداشت ہو جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بجائے مشتعل جذبات کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرتا ہے تو بے تدبیری اور بدتدبیری کا شکار ہو جاتا ہے، پس صبر، ہوش گوش کے ساتھ تدبیر کے مطابق کام کرنے کا نام ہے، اللہ کی طرف توجہ اور دنیا میں سنجیدہ تدبیر یہی کامیابی کی کلید ہے؛ اسی لئے ان دونوں کو خدا کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

﴿۱﴾ اسلام سے پہلے ایک طویل عہد تک —— جب کہ دنیا میں ہر طرف شرک اور بت پرستی چھائی ہوئی تھی —— صرف بنی اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور ان کے درمیان یکے بعد دیگرے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا، توحید کے حامل ہونے اور انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے وہ یقیناً اس وقت تمام عالم پر فضیلت رکھتے تھے؛ لیکن یہ فضیلت ایمان وعمل کی بنیاد پر تھی، نہ کہ رنگ ونسب کی وجہ سے؛ اسی لئے جب خاتم النبیین محمد رسول ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اور بنی اسرائیل نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، تو فضیلت کا یہ تاج ان کے سر سے اُتار کر اُمت محمدیہ کے سر پر رکھ دیا گیا، اب بنو اسرائیل ''مغضوب علیہم'' اور ''ضالین'' ٹھہرے اور اُمتِ محمدیہ ''خیر اُمت'' کے لقب سے سرفراز کی گئی۔ (آلِ عمران:۱۱۰)

﴿۲﴾ یعنی دنیا میں مدد کے جتنے طریقے ہیں، وہ سب کام نہ آئیں گے، یہود سمجھتے تھے کہ اپنے بزرگوں کی سفارش سے ان کا کام چل جائے گا اور عیسائیوں کا خیال تھا کہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی قربانی ان کے لئے فدیۂ نجات کا کام کرے گی، ان سب کی تردید ہوگئی، مسلمان بھی ضرور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں؛ لیکن یہ شفاعت بھی صرف انھیں کے حق میں مقبول ہوگی، جن کے لئے خود اللہ تعالیٰ اجازت دیں (البقرۃ:۲۵۵) اور یہ اجازت ایمان اور عمل صالح کی بنا پر ہوگی۔

وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ
فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اوراس وقت کوبھی یاد کرو کہ ہم نے تم کوفرعون کے لوگوں سے نجات عطا کی ،﴿۱﴾ جوتم پر بدترین عذاب ڈھاتے تھے، تمہارے بیٹوں کوذبح کر دیتے تھے،عورتوں کوزندہ رہنے دیتے تھے،﴿۲﴾ اوراس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی ﴿۴۹﴾ وہ وقت بھی یاد کرو کہ جب ہم نے تمہارے لئے سمندرکوشق کر دیا، پھرتم کو بچالیااورفرعون کے لوگوں کوڈبو دیا،تم (اس منظرکواپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے ﴿۳﴾ ﴿۵۰﴾ اور یاد کروجب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ لیا، پھرتم نے موسیٰ کے (جانے کے) بعد (پوجا کرنے کے لئے)بچھڑا بنالیا،﴿۴﴾ اورتم نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی۔ ﴿۵۱﴾

﴿۱﴾ ’’آلِ فرعون‘‘ سے صرف فرعون کی اولا د مرادنہیں ہے؛ بلکہ اس کی پیروی کرنے والے بھی مراد ہیں،’فرعون‘ نام نہیں ؛ بلکہ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں بنی اسرائیل جن شاہانِ مصر کے زیر عتاب آئے، وہ یکے بعد دیگرے دوفرمانروا تھے۔

﴿۲﴾ ایک نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک اسرائیلی لڑکا فرعونیوں کی سلطنت اورمذہب کونیست ونابود کردے گا،اس خبر پر فرعون نے عام حکم جاری کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے یہاں جولڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دیا جائے اورلڑکیوں کورہنے دیا جائے، کہ ایک توان سے یہ خطرہ نہیں تھا، دوسرے ان سے خدمت لینےاوراپنے حرم میں لانے کا فائدہ بھی متعلق تھا، بائبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے۔(دیکھئے:خروج:۱/۱۵-۲۲)

﴿۳﴾ جب خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کوساتھ لے کررات کی تاریکی میں مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت کی توبنو اسرائیل راستہ بھٹک گئے اوراورصورتِ حال یہ ہوگئی کہ بنواسرائیل کے آگے مشرق کی طرف بحر قلزم کا شمالی کنارہ، دائیں بائیں پہاڑیاں اور پشت پر مغرب کی طرف سے فرعون کا لشکر جرار’’نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن‘‘ اس وقت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی خصوصی مدد فرمائی،سمندرکے پانی میں بیچوں بیچ خشک راستہ بن گیا،جس کے دونوں طرف پانی کی دیواریں کھڑی تھیں،بنواسرائیل راستہ عبور کر کے دوسری طرف آگئے اورجب اسی راستہ میں فرعون کا لشکر آیا تو پانی مل گیااور پورالشکر غرقاب ہوگیا، بنواسرائیل ساحل سے اس منظرکود یکھ رہے تھے،اسی واقعہ کی یاد دلائی جارہی ہے، بائبل میں بھی اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ (بائبل: ۱۴:۲۱-۲۲اوراس کے بعد)موجود ہے۔

﴿۴﴾ مصریوں سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کوشریعت خداوندی کی ضرورت پڑی،توحید پروہ پہلے ہی سے قائم تھے،اب حلال وحرام کے احکام کی ضرورت تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو’طور‘ نامی پہاڑ کی چوٹی پر طلب فرمایا کہ یہاں چالیس روز معتکف ہوں؛لیکن اسی درمیان بنی اسرائیل نے مصریوں یا کنعانیوں کی گوسالہ پرستی سے متاثر ہوکرسونے کا ایک بچھڑا بنالیااوراس کی پوجا شروع کردی،قرآن میں دوسری جگہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے(البقرۃ:۵۴)اور بائبل میں بھی اس کا ذکر ہے۔(خروج:۲۳)

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ
وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ
بَارِىٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ
حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اس کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کر دیا؛ تاکہ تم شکر گذار بنو ﴿۵۲﴾ اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق اور ناحق کے درمیان فیصلہ کرنے والی چیز عطا کی؛ تاکہ تم سیدھی راہ چلتے رہو ﴿۱﴾ ﴿۵۳﴾ اور وہ وقت بھی یاد کئے جانے کے لائق ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! تم نے (پوجنے کے لئے) بچھڑا بنا کر اپنے آپ پر (بڑا) ظلم کیا ہے؛ اس لئے اب اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے توبہ کرو اور اپنے لوگوں کو (خود ہی بہ طورِ سزا) قتل کرو ﴿۲﴾ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی تمہارے حق میں بہتر ہے؛ چنانچہ (تم نے اس حکم پر عمل کیا اور) اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۵۴﴾ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے کہا: اے موسیٰ ہم آپ کی بات کا یقین نہیں کریں گے، جب تک ہم علانیہ اللہ کو دیکھ نہ لیں؛ چنانچہ بجلی کی کڑک نے تم کو آ پکڑا اور تم (یہ منظر) دیکھ رہے تھے۔ ﴿۳﴾ ﴿۵۵﴾

﴿۱﴾ ''فرقان'' کے معنی اس چیز کے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتی ہو، اب یا تو یہ ''کتاب'' یعنی ''تورات'' ہی کی تفسیر ہے، یا تورات کے احکام وقوانین مراد ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی وہ مدد غیبی جو ان کو فتح مند اور ان کے دشمنوں کو مغلوب کرتی جاتی تھی یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہونے والے خصوصی معجزات مراد ہیں، جیسے عصا اور ید بیضا کا معجزہ۔

﴿۲﴾ شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا قتل تھی؛ اس لئے حکم ہوا کہ جو لوگ بچھڑے کی پوجا کرنے کے گناہ سے بچے رہے، وہ اپنے ان قریبی لوگوں کو قتل کر دیں، جو شرک اور گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوئے ہیں؛ چنانچہ بائبل کے بیان کے مطابق ایک ہی دن میں تقریباً تین ہزار آدمی مارے گئے، (خروج: ۳۲/۲۷-۲۸) شریعت اسلامی میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے؛ بشرطیکہ مرتد ہونے والا توبہ نہ کرے، احادیث اور عہد صحابہ کا تعامل تو اس سلسلہ میں صراحت ووضاحت کے ساتھ موجود ہے ہی، اس آیت سے بھی اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

﴿۳﴾ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر تشریف لائے تو بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ ہم کیوں کر تسلیم کریں کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ستر نمائندوں کو ساتھ لیا اور پھر 'طور' کے دامن میں پہنچ کر خدا سے اس کتاب کی تصدیق کے ملتجی ہوئے، ان حضرات نے سر کے کانوں سے کلام الٰہی سنا کہ یہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، اس ندائے غیبی کو سن کر بھی مطمئن نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ نہ معلوم کس کی آواز تھی؟ جب تک ہم اپنے سر کی آنکھوں سے خدا کو دیکھ نہ لیں گے، تورات ←

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۵۶ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۵۷

پھر ہم نے تمہارے مرنے کے بعد تم کو زندہ کیا؛ تاکہ تم شکر گذار بنو ﴿۱﴾ ۝۵۶ اور ہم نے تم پر بادل کو سایہ فگن کردیا اور من وسلویٰ اتارا کہ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تو کو دے رکھی ہیں، ان میں سے کھاؤ، ﴿۲﴾ انھوں نے (ہمارے حکم کی خلاف ورزی کرکے) ہمارا کچھ نقصان نہ کیا؛ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ ﴿۳﴾ ۝۵۷

← کو اللہ کی طرف سے نہ مانیں گے، ظاہر ہے ان کا یہ مطالبہ قطعاً بے جا اور نا روا تھا، خدا کی غیر محدود ذات کا دیدار اِن محدود اور کمزور آنکھوں سے ممکن نہیں، اس جسارت پر بہ طورِ عذاب ایک بجلی کڑکی اور سب مر گئے، اس میں عبرت بھی تھی کہ جب ایک بجلی کی کڑک برداشت کرنے کی طاقت نہیں، تو تجلی الٰہی کی دیدار کی کیا طاقت ہوگی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل خدا ناترس لوگ ہیں، کہیں الٹے مجھے ہی نہ بدنام کریں کہ کسی سازش سے ان کو مروا دیا ہے؛ اس لئے ان کو زندہ فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ نے دوبارہ ان کو زندہ فرمایا، یہاں اسی واقعہ کا ذکر ہے، بائبل (خروج:۱۹/۱۶) میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ مگر بہت سرسری۔

﴿۱﴾ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ستر بزرگانِ بنی اسرائیل صرف بے ہوش ہوئے تھے، اسی کو موت اور دوبارہ ہوش میں آنے کو زندہ کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے؛ لیکن آیت کے ظاہری الفاظ سے حقیقی موت کے طاری ہونے اور دوبارہ زندہ کئے جانے کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا منشاء یہ تھا کہ وہ بیت المقدس کو —— جو اُن کا قبلہ تھا —— مشرک قوموں سے پاک کریں اور اس کو پھر سے توحید کا مرکز بنائیں، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر بیت المقدس کے پاس پہنچے اور انھوں نے قومِ عمالقہ (جو اس وقت بیت المقدس پر قابض تھے) کا ڈیل ڈول دیکھا تو جہاد سے صاف انکار کردیا، اس کی سزا ان کو یوں ملی کہ ان کے چالیس برس ایک صحرائی میدان میں اس طرح گذرے کہ صبح سے شام تک پھرتے رہتے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے محروم رہتے، اس صحرا میں نہ کوئی مکان تھا، نہ ہرا بھرا درخت، نہ کوئی کھانے کی چیز ہی میسر تھی، خدائے کریم نے اس سرکش قوم پر اُس وقت بھی رحم کھایا، دھوپ سے بچاؤ کا یہ سامان فرمایا کہ ان پر مستقل ابر کا سایہ کردیا، بائبل میں بھی اس کا ذکر ہے، (خروج:۱۳/۲۱-۲۲) اور غذا کا یہ سروسامان ہوا کہ ایک میٹھی سی دانہ دار شبنمی چیز روز اس ریگستان کے درختوں پر گرتی جو ''ترنجبین'' کی طرح ہوتی، دوسرے بٹیر بڑی تعداد میں ان کے پاس آجاتے، ان کا گوشت بھی غذا کے کام آتا، بائبل میں بھی ''من'' کا ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ دھنیے کی بیج کی طرح سفید اور مزے میں شہد کی طرح ہوتا تھا۔ (خروج:۱۶/۳۱)

﴿۳﴾ اللہ کی طرف سے حکم تھا کہ وہ من وسلویٰ کو روز کھائیں، اس کا ذخیرہ نہ کریں اور نہ کسی دوسری غذا کا مطالبہ کریں؛ مگر انھوں نے دونوں باتوں کی خلاف ورزی کی، جب ذخیرہ کرنا شروع کیا تو یہ معجزاتی غذا سڑنے لگی، اپنا نقصان کرنے سے غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ
قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا
غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۶ ۱۳ ۶
وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ
عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ
مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے کہا: اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور جہاں سے چاہو آسودہ ہو کر کھاؤ اور (ہاں) دروازۂ شہر میں تواضع کے ساتھ سر جھکا کر داخل ہونا اور کہتے جانا کہ ''ہمیں بخش دیجئے'' ہم تمہاری خطائیں معاف کردیں گے اور اچھے عمل کرنے والوں کو مزید نوازیں گے ﴿۵۸﴾ مگر اِن ظالموں نے اس بات کے بجائے جو کہنے کا حکم دیا گیا تھا، اس کے برخلاف بات کہی، تو ہم نے بھی ظالموں پر ان کی نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب اُتار دیا ﴿۱﴾ ﴿۵۹﴾ اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دُعاء کی تو ہم نے کہا: پتھر پر اپنی لاٹھی مارو؛ چنانچہ اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ﴿۲﴾ ہر قبیلہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ پہچان لی، (ہم نے کہا:) اللہ کی عطا فرمائی ہوئی رزق کھاؤ، پیو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔ ﴿۶۰﴾

﴿۱﴾ اس شہر سے بیت المقدس اور زیادہ تر اہل علم کی رائے کے مطابق ''اریحا'' نامی شہر — جو آج کل ''جریکو'' کے نام سے جانا جاتا ہے — مراد ہے، جھکتے ہوئے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تواضع اور فروتنی کے ساتھ داخلہ ہو، عام فاتحین کی طرح اکڑفوں کے ساتھ داخل نہ ہوا جائے، زبان سے بھی عجز و نیاز کا اظہار ہو، استغفار ہو، اسی کے لئے عربی زبان میں لفظ ''حِطَّة'' ہے، جس کے معنی ہیں: ''معاف کردیجئے!'' لیکن یہ ایسی سرکش و سرتاب اور انبیاء کی عدول حکمی و ایذاء رسانی کے درپے قوم تھی کہ اس نے بجائے استغفار کے استہزاء آمیز کلمات کہنے شروع کردیئے؛ چنانچہ ان پر عذابِ الٰہی کے طور پر پلیگ کی بیماری مسلط کردی گئی، جس میں ہزاروں لوگ مرگئے، اسی عذاب کو ''رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ'' کہا گیا ہے۔

﴿۲﴾ مصر و فلسطین کے درمیان جس صحرا اور بیابان میں بنی اسرائیل اپنے طرزِ عمل کی پاداش میں بھٹک رہے تھے، وہاں پانی کا میسر آنا بھی آسان نہ تھا؛ چنانچہ بنی اسرائیل کی خواہش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء فرمائی، حکم الٰہی سے ایک مخصوص چٹان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، متعدد سیاحوں نے سینا کے علاقہ میں ایک ایسی چٹان کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے، یہ ایک معجزہ تھا، اس کا یہ مطلب بیان کرنا کہ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی کے سہارے پہاڑی پر چڑھے تو وہاں پانی کے بارہ چشمے نظر آئے'' — جیسا کہ بعض حضرات نے لکھا ہے — نہ عربی زبان کی تعبیر سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ یہ کوئی ایسا واقعہ ہے کہ خاص طور پر اس کی یاد دلائی جاتی، ممکن اور ناممکن انسانوں کے اعتبار سے ہے، ←

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ
الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ
اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ
النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۟﴿۶۱﴾ ع

اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح ﴿۱﴾ کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے؛ اس لئے آپ اپنے پروردگار سے دُعاء کریں کہ ہمیں زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں —— ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز —— فراہم کریں، موسیٰ نے کہا: کیا تم بہتر چیز کے بدلہ معمولی چیز لینا چاہتے ہو؟ ﴿۲﴾ (اگر یہی اصرار ہے) تو کسی شہر میں اتر جاؤ کہ تم کو تمہاری مطلوبہ چیزیں مل جائیں، (اِن جسارتوں کی وجہ سے) ان پر ذلت اور پستی ﴿۳﴾ مسلط کردی گئی اور وہ غضبِ الٰہی کے مستحق قرار پائے، یہ اس لئے کہ وہ احکام خداوندی کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کردیتے تھے، ﴿۴﴾ اور اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور (اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود سے) بار بار نکل جاتے تھے۔ ﴿۶۱﴾

← اللہ تعالیٰ کی قدرت کے لئے ممکن وناممکن اور دشوار وآسان کی کوئی تقسیم نہیں۔

﴿۱﴾ ''طعام واحد'' کا اصل معنی ''ایک کھانا'' ہے؛ لیکن دو کھانوں ''من'' اور ''سلویٰ'' کا ذکر خود قرآن مجید میں ہے؛ اس لئے مراد ایک طرح کا کھانا ہے، ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی 'من وسلویٰ' جیسی عمدہ، لذیذ اور بے محنت حاصل ہونے والی غذا کی جگہ یہ معمولی ساگ سبزی کی خواہش کرتے ہو!

﴿۳﴾ ''مسکنت'' کا اصل معنی ''محتاجی'' ہے، مولانا دریابادی رحمہ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے، مسلسل فقر وافلاس قوم کے اندر دناءت وپستی کی کیفیت بھی پیدا کردیتا ہے؛ گویا یہ پستی محتاجی کا نتیجہ ہے؛ اسی لئے مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ اور مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے ''پستی'' سے ترجمہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ فقر واحتیاج تو آنی جانی چیز ہے اور آج دولت جتنی یہود کے پاس ہے شاید کسی اور قوم کے پاس ہو؛ لیکن دناءت وپستی ایسا وصف ہے جس سے کبھی یہ قوم آزاد نہ ہوسکی اور نہ آج ہے۔

﴿۴﴾ قتل کے ساتھ ''ناحق'' کا لفظ محض اظہارِ واقعہ کے لئے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل تو ناحق ہی ہوگا، خود بائبل کے بیان کے مطابق یہودیوں نے یسعیاہ نبی، یرمیاہ نبی، زکریا نبی اور یحییٰ نبی کا قتل کیا اور اپنے تئیں بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کی بھی کوشش کی، انبیاء کے ساتھ ان کی بدسلوکی کی داستان بہت دراز ہے اور بائبل کا عہد عتیق اور عہد جدید اب بھی اس شقاوت کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

بے شک مسلمان اور وہ یہودی، نصاریٰ، اور صابی، جو اللہ، اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے اور عمل صالح کرتے تھے، ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، نہ ان کے لئے اندیشہ ہے اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے ﴿۱﴾ ﴿۶۲﴾ اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر 'طور' کو اٹھالیا تھا، کہ جو کتاب ہم نے دی ہے، اس کو مضبوطی سے تھام لو اور جو احکام اس میں درج ہیں، ان کو یاد رکھو؛ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۳﴾

﴿۱﴾ آیت میں چند باتیں قابل توجہ ہیں :

- یہاں ''نصاریٰ'' سے حقیقی عیسائی یعنی وہ لوگ مراد ہیں، جو حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول یقین کرتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں؛ اس لئے کہ جو حضرت مسیح علیہ السلام کو ''ابن اللہ'' مانتے ہیں، وہ تو اللہ پر ایمان ہی سے محروم ہیں اور یہاں اللہ پر ایمان رکھنے کی شرط ہے۔
- ''صابی'' سے کونسی قوم مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہے، تاہم ان اقوال سے اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں اس نام سے ایک ایسی قوم موجود تھی، جو توحید و رسالت پر ایمان رکھتی تھی اور اپنے آپ کو کسی ایسے پیغمبر سے منسوب کرتی تھی، جن کی نبوت کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہے۔
- اللہ پر ایمان ''رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان'' کو بھی شامل ہے، چوں کہ مسلمان، یہودی، نصاریٰ اور صابی رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہی تھے؛ اس لئے رسول پر ایمان رکھنے کا مستقل اور علاحدہ ذکر نہیں فرمایا گیا۔
- خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اب آپ کی شریعت پر عمل کرنا ہی ''عمل صالح'' ہے؛ اس لئے اب ''عمل صالح'' سے شریعت محمدی پر عمل کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ توحید و آخرت پر ایمان اور اچھے اعمال کافی نہیں ہیں؛ بلکہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور شریعت کے احکام میں سے اولین حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرنا بھی ہے۔

﴿۲﴾ اولاً تو بنی اسرائیل نے تورات کو اللہ کی طرف سے ماننے میں ہی بہت پس و پیش سے کام لیا اور خدا کی آواز سننے اور خدا کو دیکھنے کی جسارت انگیز شرطیں لگائیں، پھر جب ماننے سے چارہ نہ رہا تو کچھ احکام کے بارے میں مطالبہ کرنے لگے کہ ان کو نکال دیا جائے، اس ناشائستہ مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر 'طور' نامی پہاڑ کو اُٹھالیا کہ تورات کو قبول کرو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے ریزہ ریزہ کردیئے جاؤ گے، اب جا کر اس سرکش قوم نے تورات کو قبول کرنے کی ہامی بھری، بائبل میں بھی یہ واقعہ آیا ہے؛ لیکن صرف پہاڑ کے ہلنے اور دھواں اٹھنے کا ذکر ہے، (خروج: ۱۹/ ۱۷-۱۸) قرآن مجید کا بیان بالکل واضح ہے کہ خود پہاڑ ان پر اٹھالیا گیا تھا، ←

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ اِذْ قَالَ
مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ
بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی (اپنے عہد سے) پھر گئے، تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً تباہ وبرباد ہو گئے ہوتے ﴿۶۴﴾ اور تم میں سے جن لوگوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں زیادتی کی، ان سے بھی تم واقف ہی ہو؛ چنانچہ ہم نے ان سے کہا کہ تم لوگ ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۶۵﴾ پھر ہم نے ان کو ان کے عہد کے لوگوں کے لئے بھی اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی عبرت کا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنا دیا (۱) ﴿۶۶﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تم کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں، تو وہ کہنے لگے: کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جاہلوں جیسا کام کروں (۲) ﴿۶۷﴾ کہنے لگے کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دُعاء کیجئے کہ ہم پر واضح فرمادیں کہ وہ گائے کیسی ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتے ہیں: وہ گائے نہ بوڑھی ہو، نہ بالکل باچھی ہو، دونوں کے درمیان ہو، پس جو حکم تم کو دیا جا رہا ہے، اسے کر گذرو۔ ﴿۶۸﴾

← یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ دین میں تو جبر واکراہ نہیں ہے، یہاں جبر سے کیوں کام لیا گیا؟ اس لئے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن جو مسلمان ہو، اس کو احکامِ اسلام کے ماننے پر یقیناً مجبور کیا جائے گا، بنی اسرائیل ایمان لا چکے تھے؛ لیکن تورات کے تمام احکام کو ماننے سے گریز کر رہے تھے؛ اسی لئے ان کو مجبور کیا گیا۔

---

(۱) یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، اس زمانہ میں مقامِ ''ایلہ'' میں یہودیوں کی ایک بڑی آبادی واقع تھی، یہود کو تورات میں جو احکام دیئے گئے تھے، ان میں ایک یہ تھا کہ ''ہفتہ'' کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص رکھیں اور اس دن کسبِ معاش سے اجتناب کریں، یہ حکم اتنی تاکید کے ساتھ تھا کہ اس کی مخالفت کی سزا موسوی شریعت میں قتل تھی (خروج: ۳۱/ ۱۴-۱۵) ایلہ کے یہودیوں نے اس کی مخالفت کی اور حیلہ بہانہ سے اس دن بھی مچھلی کا شکار کرنے لگے، اس پر یہ عذاب نازل ہوا کہ یہ بندر بنا دیئے گئے، تین دنوں تک اسی حال میں رہے اور اس کے بعد مر گئے، اللہ ہی اصل صورت بنانے والے ہیں، ''یُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ'' (آلِ عمران: ۶) جو صورت بنا سکتا ہے، اس کے لئے صورتوں اور جسم کے قالبوں کا بدل دینا کیا مشکل ہے؟

(۲) ''اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ'' کا اصل معنی ہے: ''میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں'' مقصود یہی ہے کہ نبی ہونے کے باوجود (جس کا ایک ایک قول اللہ کی طرف سے ہوتا ہے) جاہلوں کی سی بات کیسے کر سکتا ہوں؟

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَ اِنَّآ اِنْ
شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَ لَا تَسْقِي
الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَ مَا كَادُوْا
يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ع ۸/۸

کہنے لگے: اپنے رب سے ہمارے لئے اس کی بھی درخواست کیجئے کہ ہمیں اس گائے کا رنگ بتادیں، موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتے ہیں کہ وہ گائے خوب گہری زرد رنگ کی ہونی چاہئے کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہوجائے ﴿۶۹﴾ کہنے لگے کہ ہماری خاطر اپنے رب سے دُعاء کیجئے کہ ہمیں بتادیں کہ اس کی صفات کیا ہوں؛ کیوں کہ گائے کے بارے میں ہمیں اشتباہ ہوگیا ہے؟ اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں گے ﴿۷۰﴾ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتے ہیں کہ وہ کام میں لی جانے والی گائے نہیں ہو، نہ زمین جوتتی ہو، نہ کھیتی میں آب پاشی کرتی ہو، عیب سے صحیح وسالم ہو، اس میں کوئی داغ دھبہ بھی نہ ہو، کہنے لگے: اب آپ نے ٹھیک ٹھیک بتایا ہے، پھر ان لوگوں نے گائے ذبح کی اور لگتا نہ تھا کہ وہ یہ کریں گے ﴿۱﴾ ﴿۷۱﴾ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب تم لوگوں نے ایک شخص کو قتل کردیا، پھر اس کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جس بات کو تم چھپا رہے تھے، اللہ تعالیٰ کو اس کا ظاہر کرنا منظور تھا۔ ﴿۷۲﴾

﴿۱﴾ بنی اسرائیل میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ قاتل کا پتہ چلنا چاہئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ایک گائے ذبح کرنے اور اس کے گوشت سے مقتول کے جسم کو چھونے کا حکم فرمایا کہ اس سے مردہ ایک لمحہ کے لئے زندہ ہو اٹھے گا اور قاتل کی نشاندہی کردے گا، اگر وہ بلا قیل وقال کوئی بھی گائے ذبح کردیتے تو شاید کافی ہوجاتی؛ مگر اصل میں وہ اس مطالبہ میں مخلص نہ تھے اور چاہتے نہ تھے کہ جرم کا پردہ فاش ہو؛ اس لئے گائے کی تفصیلات کے بارے میں سوال پر سوال شروع کردیا، پہلے عمر پوچھی، پھر رنگ پوچھا، پھر اس کے اوصاف دریافت کئے، وہ تو تیسری بار ان کی زبان سے ''انشاء اللہ'' نکل گیا؛ ورنہ شاید اب بھی ان کی سیری نہ ہوتی، خدا خدا کرکے ان کو بات سمجھ میں آئی، تلاش کی گئی تو یہ خوبصورت سنہری گائے ایک یتیم کی ملکیت تھی، اُس بہانہ اِس غریب کو بھی منھ مانگی قیمت مل گئی، غالباً گائے اور سنہری گائے کا انتخاب اس لئے فرمایا گیا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سونے کی خود ساختہ گائے ہی کی پرستش میں مبتلا ہوگئے تھے، تو ایسی ہی گائے ان کے ہاتھوں ذبح کرائی گئی؛ تاکہ گائے کی تقدیس ہمیشہ کے لئے ان کے دل سے نکل جائے، اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جن ملکوں میں پڑوسی قوم گائے کی پوجا کرتی ہو، وہاں خاص کر مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہ کرنی چاہئے؛ اس لئے کہ وہاں ذبح گاؤ توحید کے شعار کی حیثیت رکھتا ہے، اسی حکم میں ہمارا ملک ہندوستان بھی ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞۷۳
ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا
يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞۷۴ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞۷۵

چنانچہ ہم نے کہا کہ مقتول کو (اِس گائے) کا کوئی ٹکڑا مارو، ﴿۱﴾ اسی طرح اللہ مردہ کو زندہ کریں گے اور اللہ تم کو اپنی نشانیاں دیکھاتے ہیں کہ تم سمجھ سکو ۞۷۳ بہر حال، ہم نے اس کو مارنے کو کہا، پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل پتھر کی طرح؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگئے، کہ پتھر بھی بعض ایسے ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں، بعض وہ ہیں کہ پھٹ پڑتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں ﴿۲﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں ۞۷۴ (مسلمانو!) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالاں کہ ان میں ایک گروہ ایسا رہا ہے، جو اللہ کا کلام سنتا اور جانتے بوجھتے اس میں تحریف کرتا رہا ہے۔ ﴿۳﴾ ۞۷۵

﴿۱﴾ چنانچہ مقتول پر گائے کے کسی ٹکڑے سے مارا گیا اور وہ زندہ ہو اُٹھا، یہ بہ طورِ معجزہ تھا، جو خدا بے جان اور بے صورت مادہ منویہ، خون اور گوشت سے دانا و بینا انسان پیدا کرسکتا ہے، اس کے لئے انسان کے مردہ؛ لیکن موجود قالب میں دوبارہ روح کا پیدا کرنا کیا دشوار ہے؟؟؟

﴿۲﴾ یعنی بعض پتھروں سے زیادہ نفع ہوتا ہے اور بعض سے کم، بعض سے گو دوسروں کو نفع نہیں پہنچتا؛ لیکن ان میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ سراپا سنگ ہو کر بھی خدا کے خوف سے لرز جاتا ہے، مگر تم اتنے بے توفیق ہو کہ نہ خود ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو، نہ دوسروں تک ہدایت کو پہنچانے کی — رہ گیا پتھروں کا اللہ سے ڈرنا تو یہ کچھ باعث تعجب نہیں، ''نباتات'' میں تو احساس پائے جانے کو آج کی سائنس نے دریافت کرلیا ہے، عجیب نہیں کہ آئندہ جمادات میں بھی احساسات کے پائے جانے کو خود انسان دریافت کرلے اور اگر نہ دریافت کرسکے، تب بھی قرآن مجید کے بیان پر اعتراض کی گنجائش نہیں؛ کیوں کہ عقل کا کسی شئ کے ادراک اور اس کے سمجھنے سے قاصر ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔

﴿۳﴾ تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آج خود یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی اس کا اعتراف ہے، دوسرے مذاہب کے پیروی کرنے والوں اور ان کی مذہبی کتابوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے، نہ قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب ہے جو محفوظ ہو اور نہ مسلمانوں کے سوا کوئی اُمت ہے جو اپنی آسمانی کتاب کے محفوظ ہونے کی دعویدار ہو۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا
فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ
اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ النصف
اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا
يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاچکے ہیں اور جب ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ’’کیا تم مسلمانوں سے وہ باتیں بتادیتے ہو جس کو اللہ نے تم پر منکشف کیا ہے؛ تاکہ وہ اس کو تمہارے پروردگار کے سامنے تمہارے خلاف حجت بنائیں؟ کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟؟‘‘ ﴿۱﴾ ﴿۷۶﴾ کیا ان کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ اللہ کو ان باتوں کا بھی علم ہے، جن کو وہ چھپاتے ہیں اور ان باتوں کا بھی جن کو ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۷﴾ ان میں کچھ اَن پڑھ لوگ بھی ہیں، جو کتاب الٰہی کا علم نہیں رکھتے، (ان کے پاس) جھوٹی آرزوئیں ہیں اور وہ محض خیالی باتوں میں گرفتار ہیں ﴿۲﴾ ﴿۷۸﴾ تو جو لوگ خود اپنے ہاتھوں کتاب لکھ لیتے ہیں، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؛ تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرلیں، ان کے لئے تباہی و بربادی ہے، جو ان کے ہاتھوں نے لکھا ہے، وہ بھی باعث تباہی ہے، اور جو کچھ وہ اس کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، وہ بھی ان کے لئے سامانِ خرابی ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۷۹﴾

﴿۱﴾ بعض بھولے بھالے یہود اور ان سے متاثر منافقین ’تورات‘ میں حضور ﷺ کے بارے میں وارد ہونے والی پیشین گوئیوں اور یہودیوں کے اسلاف پر اللہ کی طرف سے ہونے والے غیظ و غضب کا مسلمانوں سے ذکر کردیتے تھے، اس پر یہودی علماء اور خواص برہم ہوتے کہ تم خود ہی مسلمانوں کے ہاتھ میں دلیل و برہان کا ہتھیار دیئے جارہے ہو!

﴿۲﴾ علماء یہود اپنی عوام کو یقین دلاتے تھے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے اور چوں کہ ہمارے آباء واجداد اللہ کے پیغمبر تھے؛ اس لئے وہ بہرحال ہماری مغفرت کرالیں گے، اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کرکے ان کو اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے، قرآن نے اسی خوش خیالی اور خود فریبی کی تردید کی ہے۔

﴿۳﴾ گذشتہ آیت میں عوام کا ذکر تھا اور اس آیت میں علماء یہود کا ذکر ہے، جو معمولی پیسے لے کر تورات کے احکام ردوبدل کے ساتھ بتایا کرتے تھے۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۲ۧ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۠ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۸۳

ع ۹ / ۱۱

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو چند گنے چنے دنوں کے سوا دوزخ چھوئے گی بھی نہیں، ﴿۱﴾ آپ کہہ دیں کہ کیا تم اللہ سے کوئی وعدہ لے چکے ہو کہ اللہ اپنے اس وعدہ کے خلاف نہ کریں گے؟ یا تم اللہ پر ایسی بات گھڑ رہے ہو جس کا خود تم کو علم نہیں ہے؛ ۝۸۰ کیوں نہیں؟ جو لوگ برائی کریں گے اور ان کا گناہ ان کو گھیر لے گا تو وہ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے ﴿۲﴾ ۝۸۱ اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، وہ جنت والے ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے، ﴿۳﴾ ۝۸۲ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ﴿۴﴾ کہ صرف اللہ ہی کی عبادت کرنا، والدین، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کرنا، ﴿۵﴾ نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا، ﴿۶﴾ پھر کچھ لوگوں کے سوا تم لوگ (اس عہد سے) پھر گئے اور تم ہو ہی (وعدے سے) پھرنے والے لوگ! ۝۸۳

﴿۱﴾ یہود کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے آباء واجداد بہر حال ان کو دوزخ سے بچالیں گے، دوزخ میں ڈالے بھی جائیں گے تو چند دنوں کے لئے، یا تو چالیس دن جن میں گوسالہ پرستی کی تھی یا اس سے کچھ کم یا زیادہ۔

﴿۲﴾ ''گناہ کے گھیر لینے'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی کوئی نیکی باقی ہی نہ رہے، ظاہر ہے یہ کیفیت کافروں کی ہوگی؛ کیوں کہ کفر کی وجہ سے ایمان سے محروم رہیں گے، مومن کس قدر بھی گناہ میں مبتلا ہو، کم سے کم ایمانِ قلبی سے محروم نہ ہوگا اور وہی چیز انشاء اللہ اس کو انجام کار دوزخ سے نجات دلائے گی اور جنت میں لے جائے گی۔

﴿۳﴾ یہاں اُصول بتا دیا گیا کہ جنت و دوزخ میں داخل ہونا رنگ ونسب اور نسل وخاندان سے متعلق نہ ہوگا، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسحاق علیہ السلام یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد جنت ہی میں جائے گی، دوزخ میں نہ جائے گی؛ بلکہ اس کا تعلق ایمان وعمل سے ہوگا، جو صاحب ایمان ہو اور عمل صالح کرتا ہو وہ جنتی ہوگا اور جو کفر و نافرمانی کا راستہ اختیار کرے گا، وہ دوزخی ہوگا۔

﴿۴﴾ چنانچہ تورات میں جابجا توحید پر قائم رہنے کی اور لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید موجود ہے۔ ←

وَ اِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَکُمۡ لَا تَسۡفِکُوۡنَ دِمَآءَکُمۡ وَ لَا تُخۡرِجُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ ثُمَّ اَقۡرَرۡتُمۡ وَ اَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ وَ تُخۡرِجُوۡنَ فَرِیۡقًا مِّنۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِهِمۡ ۫ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ ؕ وَ اِنۡ یَّاۡتُوۡکُمۡ اُسٰرٰی تُفٰدُوۡهُمۡ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیۡکُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾

اور یہ بھی یاد کرو کہ جب ہم نے تم سے مضبوط وعدہ لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا، اور ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالنا، پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس پر گواہ بھی ہو،﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾ پھر تم ہی لوگ ہو کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو، اپنے ہی میں سے بعضوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو، گناہ اور ظلم کے ساتھ ان کے مقابلہ میں مخالفین کی مدد کرتے ہو،﴿۲﴾ اور اگر وہی تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو ان کا فدیہ ادا کر کے رہا بھی کراتے ہو؛ حالاں کہ ان کو نکالنا ہی تم پر حرام تھا، تو کیا تم کتابِ (الٰہی) کے کچھ حصہ کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو؟﴿۳﴾ جو شخص ایسا عمل کرے، دنیا میں رسوائی،﴿۴﴾ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب میں مبتلا کئے جانے کے سوا اس کی اور کیا سزا ہو سکتی ہے؟؟ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔ ﴿۸۵﴾

← ﴿۵﴾ اچھی گفتگو اور بات چیت میں نرم خوئی اور خوش خلقی صرف مسلمانوں اور نیک لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر انسان کے ساتھ بہتر اخلاق ہونا چاہئے اور اچھی گفتگو کرنی چاہئے، احادیث میں بھی اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔

﴿۶﴾ یہ ضروری نہیں کہ بنو اسرائیل کو بھی نماز اور زکوٰۃ ہی کے الفاظ سے ان عبادتوں کا حکم دیا گیا ہو؛ کیوں کہ یہ تو شریعتِ محمدی ﷺ کی اصطلاحات ہیں، مقصد یہ ہے کہ ان کو بھی نماز کی طرح بدنی عبادت اور زکوٰۃ کی طرح مالی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ان عبادتوں کے احکام گذشتہ اُمتوں میں بھی اسی طرح کے ہوں، جو شریعتِ محمدی ﷺ میں ہیں۔

﴿۱﴾ یعنی تم کو اپنے اس عہد و پیمان کا اقرار بھی ہے، اگر یہود اپنی زبان سے نہ کہیں تب بھی تورات کے موجودہ نسخوں میں یہ اقرار موجود ہے، (دیکھئے: خروج: ۲۴:۷) یہ گویا زبانِ حال سے اس عہد پر گواہ ہونا اور اس کا اقرار کرنا ہے، عام طور پر اہل علم نے گواہ ہونے کا یہی معنی مراد لیا ہے۔

﴿۲﴾ ''تظاھرون علیھم'' سے ''مخالفین کی مدد کرنا'' مراد ہے، اور قرآن میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: الفرقان: ۵۵، التحریم: ۴)

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؗ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ
يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ع ۱۰
ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى
اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝۸۷

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت بیچ کر دنیوی زندگی خرید کرلی ہے، نہ ان کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۝۸۶ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد بھی یکے بعد دیگرے رسول بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو واضح نشانیاں دیں، ﴿۱﴾ اور روح القدس کے ذریعہ ان کو قوت پہنچائی، ﴿۲﴾ تو کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسا حکم لے کر آتا ہے جو تم کو پسند نہیں، تو تم تکبر کرنے لگتے ہو؟ ﴿۳﴾ بعض کو تو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل ہی کردیا۔ ۝۸۷

← ﴿۳﴾ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے، مشرکین کا بھی دو خاندان اوس اور خزرج آباد تھا، ان دونوں قبیلوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی اور نوبت جنگ تک کی آجاتی تھی، بنو قریظہ اوس کے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے، جب جنگ ہوتی تو یہ دونوں یہودی قبائل بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ برسر پیکار ہوتے اور اپنے ہی ہم مذہب دوسرے قبیلہ کو قتل بھی کرتے اور شہر سے نکال بھی دیتے؛ لیکن جب ان میں سے کوئی قید ہو کر آتا تو فدیہ ادا کر کے اس کو رہا کرالیتے اور کہتے کہ مذہب کی رو سے اپنے یہودی بھائی کو رہا کرانا ہماری ذمہ داری ہے، قرآن مجید نے اس رویہ پر تنقید کی ہے کہ ان کو تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا: آپس میں خونریزی نہ کرنے کا، اپنے ہی بھائیوں کو گھر سے باہر نہ نکالنے کا، اور کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کرنے کا، تو دو احکام کو تم نے نظر انداز کردیا اور پس پشت ڈال دیا، صرف ایک حکم کو یاد رکھا؛ گویا اللہ کے جس حکم پر جی چاہا عمل کرلیا اور جس کو چاہا، چھوڑ دیا، یہودیوں کا یہ طرزِ عمل کچھ ان ہی احکام کے ساتھ نہ تھا؛ بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا تھا کہ تورات کے جس حکم کو چاہتے لے لیتے اور جس کو چاہتے چھوڑ دیتے، پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانا بھی اس کی ایک مثال ہے: حالاں کہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کے بارے میں واضح پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں۔

﴿۴﴾ دنیا میں یہودیوں کی جو رسوائی ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شہر بدر کئے جاتے رہے ہیں، جن لوگوں نے تاریخ پڑھی ہے، وہ اس سے ناواقف نہیں ہیں، آج بھی مغربی ممالک میں اکثر لوگ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں، یہ بھی رسوائی ہی کی ایک صورت ہے۔

﴿۱﴾ 'نشانیوں' سے وہ کھلے ہوئے معجزات مراد ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کو دیئے گئے تھے۔

﴿۲﴾ روح القدس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں، یوں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر نبی کے لئے تائید وتقویت کا باعث تھے؛ کیوں کہ آپ ہی وحی الٰہی لے کر آیا کرتے تھے؛ لیکن اللہ کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ روح القدس کی تائید کا خصوصی معاملہ رہا، ←

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ
كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل محفوظ ہیں ؛ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے کفر کی وجہ سے ان پر اللہ کی طرف سے پھٹکار ہے ؛﴿۱﴾ اس لئے ان میں بہت کم ہی لوگ ایمان لائیں گے ﴿۸۸﴾ اور اس سے پہلے یہ (خود ہی) کافروں کے خلاف فتح کی دُعاء کرتے تھے ،﴿۲﴾ پھر جب ان کے پاس وہ کتاب آگئی ،﴿۳﴾ جس کو وہ پہچان چکے ہیں تو اس کا انکار کر بیٹھے، پس انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہو! ﴿۸۹﴾

← جب حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تو ''مس شیطانی'' (شیطان کے چھونے) سے حفاظت کی ، جو ہر پیدا ہونے والے کو پیش آتا ہے اور آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ آپ علیہ السلام کو اس سے محفوظ رکھا گیا، حضرت مریم علیہا السلام کو دم کیا تو حمل ٹھہرا اور اس سے حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور جب یہودی آپ علیہ السلام کے قتل کے درپئے ہوئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ علیہ السلام کو اُٹھا کر آسمان پر لے گئے، روح القدس سے تائید کا عیسائیوں کے اِس عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں کہ خدا تین اکائیوں کے مجموعہ کے نام ہے، جن میں ایک ''روح القدس'' ہیں۔ (العیاذ باللہ)

﴿۳﴾ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ 'تکبر' تمام گناہوں، نافرمانیوں اور اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ گستاخیوں اور زیادتیوں کی جڑ ہے؛ اس لئے اس برائی سے اپنی خوب حفاظت کرنی چاہئے۔

﴿۱﴾ یہود کہتے تھے کہ ہمارے دل گویا غلاف میں محفوظ ہیں، محمد (ﷺ) کس قدر بھی کوشش کرلیں اور عمدہ سے عمدہ کلام بھی سنائیں، ہمارے دلوں پر ان کا کچھ اثر نہ ہوگا ، اسی پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بات باعث فخر نہیں ؛ بلکہ لائق افسوس ہے اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے محرومی اور بے توفیقی ہے کہ آدمی اس خود فریبی میں پڑ کر دعوتِ حق کو قبول کرنے سے محروم رہ جائے۔

﴿۲﴾ جب تک پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت نہیں ہوئی تھی ، یہودیوں کو مشرکین سے کوئی اذیت پہنچتی تو کہتے تھے کہ عنقریب آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے، ان کی تشریف آوری کے بعد ہم ان کی پیروی کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا ، انصارِ مدینہ چوں کہ بار بار یہودیوں سے یہ سن چکے تھے : اسی لئے انھوں نے بلا تامل آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہوگئے ؛ (سیرت ابن ہشام: ۲/ ۱۸۳) لیکن جب آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہوئی تو یہود مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے ؛ بلکہ مخالفت میں بھی پیش پیش رہے، اسی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ یہاں 'کتاب' یعنی قرآن مجید بھی مراد ہوسکتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی مراد لیا جاسکتا ہے، حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کہ پہلے سے جس چیز یا شخصیت کا انتظار تھا، جب سامنے آگئی تو اب قبول کرنے سے انکار کرنے لگے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَهُوَ
الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾
وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

کیا ہی بری چیز ہے جس کے بدلہ انھوں نے اپنے آپ کو بیچ لیا ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا محض اس ضد میں انکار کئے جارہے ہیں کہ (یہ کتاب بنی اسرائیل کے کسی شخص پر کیوں نہیں اُتاری گئی؟ حالاں کہ) اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندہ پر چاہیں، اپنا کلام نازل فرمائیں؛ ﴿۱﴾ اسی لئے وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ٹھہرے اور کافروں کے لئے رسوا کن عذاب ہے ﴿۹۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی ہے، اس پر ایمان لے آؤ، تو کہتے ہیں کہ ہم اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، جو ہمارے اوپر نازل کی گئی ہے اور اس کے سوا جو کتاب ہے، اس کا انکار کرتے ہیں؛ ﴿۲﴾ حالاں کہ وہ بھی برحق ہے اور اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے، آپ کہئے کہ اگر تم ایمان رکھتے تھے تو اس سے پہلے انبیاء کو کیوں قتل کرتے تھے؟ ﴿۹۱﴾ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے پھر بھی تم نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد بچھڑا بنالیا تھا، ﴿۳﴾ اور تم ہو ہی ظالم لوگ! ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ نسلی وخاندانی تعصب تھا، یہ حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے حضرت مسیح علیہ السلام تک جتنے پیغمبر آئے سب اسی خاندان سے تھے، جب کہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، اس طرح نبوت کے سلسلۃ الذہب کا اختتام ایک ایسے نبی پر ہوا جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھا، اسی خاندانی تعصب اور تنگ نظری کے باعث یہود ایمان سے محروم رہے، قرآن اسی کی تردید کررہا ہے کہ نبوت ایک فضل خداوندی ہے اور یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے اس فضل سے نواز دے۔

﴿۲﴾ یہود کہتے تھے کہ ہم نبوت و وحی کے منکر نہیں ہیں؛ لیکن ہم صرف ان ہی انبیاء پر ایمان لائیں گے، جو ہماری قوم یعنی بنی اسرائیل میں آئیں، یہاں اُن کی فکر کی کوتاہی کو واضح کیا گیا ہے کہ اول تو ایمان لانے میں نسلی وخاندانی تعصب نہ ہونا چاہئے، حق اور سچائی جہاں بھی ہو، اس کو قبول کرنا چاہئے، اور قرآن کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ تورات کی تصدیق وتائید کرتی ہے نہ کہ تکذیب وتردید، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں ایک ہی سرچشمہ سے تعلق رکھتی ہیں، دوسرے: اگر تم اور تمہارے آباء واجداد انبیاء بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے تھے تو پھر تم لوگ اِنہیں انبیاء ورسل میں بعض کے قتل تک کے مرتکب ہوئے، کیا انبیاء پر ایمان رکھنے والا ان کے قتل کا مرتکب ہوسکتا ہے؟

﴿۳﴾ بچھڑا بنانے کا مطلب یہ ہے کہ بچھڑا بنا کر اس کی پرستش کی۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا
سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ٭ وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ
اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ
دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ
الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ
يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱

اور جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو اُٹھا لیا ——— کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں، ان کو مضبوطی سے تھامے رہو اور سنو ——— تو انھوں نے کہا: ہم نے سنا؛ مگر ہم ان کو نہیں مانتے، ﴿۱﴾ اور ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت ان کے دل میں پیوست ہوگئی تھی، آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم (واقعی) مومن ہو، تو کیسی بری بات ہے جس کا تم کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے؟ ﴿۲﴾ ﴿۹۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کے نزدیک دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تمہارے ہی لئے عالم آخرت مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو ﴿۹۴﴾ ان کے ہاتھوں نے جو کچھ گناہ کر رکھے ہیں، ان کی وجہ سے یہ ہرگز موت کی آرزو نہیں کریں گے، ﴿۳﴾ اور اللہ (ان) ظالموں سے خوب واقف ہیں ﴿۹۵﴾ اور (حقیقت یہ ہے کہ) آپ ان کو لوگوں میں سب سے زیادہ زندگی کا حریص پائیں گے، مشرکین سے بھی بڑھ کر، ان میں سے ایک ایک کی خواہش ہے کہ ہزار سال عمر پائے؛ ﴿۴﴾ حالاں کہ اتنی عمر بھی اس کو عذاب سے بچا نہیں سکتی اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کو دیکھ رہے ہیں۔ ﴿۹۶﴾

﴿۱﴾ یا تو صراحتاً ماننے سے انکار کیا، جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ تورات کے بعض احکام میں تبدیلی اور آسانی کے خواہاں تھے، یا زبان سے تو خاموشی اختیار کی؛ لیکن عملاً نافرمانی کا رویہ اختیار کیا اور گویا زبانِ حال سے احکام الٰہی کو ماننے سے انکار کر دیا۔

﴿۲﴾ یعنی ایمان نے تم کو یہی بچھڑے کی پرستش کا سبق دیا تھا؟

﴿۳﴾ یہود کہتے تھے کہ جنت ان ہی کے لئے مخصوص ہے، اسی پر ان کو چیلنج کیا گیا کہ پھر تو موت کی تمنا کر کے دیکھ لو، قرآن مجید کے اس چیلنج کے جواب میں یہود کو کم سے کم ظاہری طور پر بھی موت کی آرزو کرنے کی ہمت نہ ہوئی؛ اس لئے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن مجید کی صداقت کا یقین رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اگر ایسا کیا گیا تو فوراً اللہ کی طرف سے پکڑ ہو سکتی ہے۔

﴿۴﴾ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودیوں میں موت کا غیر معمولی خوف پایا جاتا ہے، اگر چند یہودی بھی مارے جائیں تو پوری قوم بے چین ہو اُٹھتی ہے اور ان کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَهُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا
الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

آپ کہہ دیں کہ جو جبرئیل کا دشمن ہو (اسے جان لینا چاہئے کہ) جبرئیل نے قرآن آپ کے قلب پر اللہ ہی کے حکم سے نازل کیا ہے، جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، سامانِ ہدایت ہے اور مؤمنوں کو خوشخبری سناتا ہے ﴿۹۷﴾ جو شخص اللہ کا، اللہ کے فرشتوں اور رسولوں کا اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو اللہ بھی اُن کافروں کے دشمن ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۸﴾ اور ہم نے آپ کو واضح نشانیاں ﴿۲﴾ عطا کی ہیں اور وہی لوگ اس کا انکار کریں گے، جو عدول حکمی کے عادی ہیں ﴿۹۹﴾ کیا یہ واقعہ نہیں، ﴿۳﴾ کہ جب بھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اس کی خلاف ورزی کی؟ ﴿۴﴾ بلکہ ان کی اکثریت ایمان سے محروم ہی رہے گی۔ ﴿۵﴾ ﴿۱۰۰﴾

﴿۱﴾ یہودی حضرت میکائیل علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے افضل جانتے تھے اور کہتے تھے کہ میکائیل علیہ السلام فرشتۂ رحمت ہیں اور جبرئیل علیہ السلام فرشتۂ عذاب، ان کا خیال تھا کہ بنی اسرائیل پر جو کچھ ابتلائیں اللہ کی طرف سے آئیں، وہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی لے کر آئے، اس لئے بہانہ کرتے کہ اگر محمد ﷺ پر جبرئیل علیہ السلام کے بجائے میکائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے تو ہم ایمان لانے کے بارے میں غور کرتے، یہاں اسی باطل خیال کی تردید ہے کہ فرشتہ کوئی بھی ہو اور وہ رحمت لے کر آیا ہو یا عذاب، جب وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے اور جو کچھ لایا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے لایا ہے، تو اس پر اعتراض بے معنی ہے، پھر قرآن مجید نے ایک اُصول بتایا کہ اللہ، اس کے رسول، اس کے ملائکہ —— جن میں جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں، میکائیل علیہ السلام بھی —— سے محبت وعداوت ایک دوسرے سے مربوط ہے، یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ایک سے نفرت وعداوت ہو اور دوسرے سے محبت و دوستی؛ اس لئے کسی فرشتہ یا رسول کے دشمن دراصل خود اللہ کے دشمن ہیں اور اس لئے اللہ بھی ان کا دشمن ہے۔

﴿۲﴾ واضح نشانیوں میں قرآن مجید بھی ہے، قرآن کی فطرتِ انسانی سے مطابقت اور عقل و دانش سے ہم آہنگ تعلیمات بھی، اور وہ بہت سے معجزات بھی جو آپ ﷺ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔

﴿۳﴾ عربی زبان کے قواعد کے مطابق اس فقرہ میں ''استفہام انکاری'' ہے، اسی مناسبت سے ترجمہ ''یہ واقعہ نہیں؟'' سے کیا گیا ہے۔

﴿۴﴾ عہد سے عام باتوں کے علاوہ خاص طور پر وہ عہد بھی مراد ہے، جو آئندہ پیغمبر پر ایمان لانے سے متعلق لیا جاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام اور پھر پیغمبر اسلام ﷺ کا انکار کر کے یہود نے اس عہد کی خلاف ورزی کی تھی —— ایک گروہ کی قید اس لئے ہے کہ ان میں نیک اور حقیقت پسند لوگ بھی تھے، جو اس عہد کو پورا کرتے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور بعض اور یہود نے آپ ﷺ پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل کی۔

←

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠١ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى
مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَآ
اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ
فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ
بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ
اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝١٠٢

اور جب بھی ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول آتے ، جو اس کتاب کی بھی تصدیق کرتے تھے جو پہلے سے ان کے پاس تھی تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈال دیا کرتا کہ گویا وہ جانتے ہی نہ ہوں ﴿۱﴾ ۝۱۰۱ اور (اس کی بجائے) انھوں نے اس علم کی پیروی کی ، جس کی سلیمان کے عہد میں شیاطین تعلیم دیا کرتے تھے ،﴿۲﴾ اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا ؛﴿۳﴾ لیکن کفر شیاطین نے کیا تھا ، جو لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے ، نیز ان لوگوں نے اس جادو کی بھی پیروی کی ، جس کا علم بابل کے دو فرشتوں —— ہاروت و ماروت —— کو دیا گیا تھا ؛﴿۴﴾ حالاں کہ وہ دونوں کسی کو (جادو کی) تعلیم اس وقت تک نہ دیتے تھے ، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود (تمہاری) آزمائش کے لئے ہے : اس لئے تم کفر کا راستہ اختیار نہ کرو ،﴿۵﴾ یہ لوگ ان دونوں سے ایسا جادو سیکھتے تھے ، جس کے ذریعہ شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی پیدا کردیں ،﴿۶﴾ اور یہ لوگ جادو کے ذریعہ کسی کو خدا کی مشیت کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے ،﴿۷﴾ یہ ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو ان کے لئے نقصان دہ ہیں نہ کہ فائدہ مند ، اور یہ اچھی طرح واقف ہیں کہ جس نے جادو کو اختیار کیا ، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے ،﴿۸﴾ اور بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلہ انھوں نے اپنے آپ کو بیچ لیا ہے ، کاش ! ان کو عقل ہوتی ۔ ۝۱۰۲

← ﴿۵﴾ یعنی ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کو اس کا بھی یقین نہیں کہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ضروری ہے ، یا یہ کہ ان سے تورات کے ذریعہ جو عہد لیا گیا ، اسی کا یقین نہیں ہے ، تو جو لوگ عہد و پیمان کے معاملہ میں اتنے کمزور ہیں ، ان سے وعدہ پورا کرنے کی کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے ؟

﴿۱﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ اہل کتاب کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں ؛ اس لئے کہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کا انکار اور جان بوجھ کر انجان بن جانا ان کا پرانا وصف ہے اور کتنے ہی پیغمبر ہیں جو ان کی بے توجہی و بے رُخی کا زخم کھا چکے ہیں اور دکھ اُٹھا چکے ہیں —— بعض مفسرین نے اس آیت میں ''رسول'' سے خاص طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی ←

← ذات مراد لی ہے، اس کی بھی گنجائش ہے۔

﴿۲﴾ یہودیوں میں جادو ٹونے کا بڑا ذوق تھا، بائبل میں اسی لئے کثرت سے جادو اور جادوگروں کا ذکر ملتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہودیوں میں یہ فاسد ذوق بہت پروان چڑھ گیا تھا؛ اس لئے خاص طور پر اس عہد کا ذکر کیا گیا، شیاطین سے مراد جنات شیاطین بھی ہو سکتے ہیں، جن کو جادوگر عام طور پر اپنی فاسد اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ''شیاطین انسان'' یعنی بدکار و بدطینت اور فن جادوگری کے ماہر انسان بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

﴿۳﴾ لفظی معنی ہیں ''ہاروت و ماروت پر اتارا گیا'' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے انبیاء پر وحی نازل کی جاتی ہے، اسی طرح ان پر فن جادوگری نازل کیا گیا ہو، مقصد صرف اتنا ہے کہ من جانب اللہ فرشتوں کو اس کا علم دیا گیا، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ''انزال'' کا لفظ محض عطا کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

﴿۴﴾ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی برحق تھے؛ لیکن یہودیوں نے ان کی طرف مختلف بے ہودہ باتیں منسوب کر دی تھیں، انھیں میں سے یہ تھا کہ وہ جادو کا علم بھی ان کی طرف منسوب کرتے؛ حالاں کہ جادوگر عہد سلیمان کے شیاطین تھے نہ کہ خود حضرت سلیمان علیہ السلام، اس سے بھی بڑا بہتان یہ تھا کہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی غیر اسرائیلی بیویوں سے متاثر ہو کر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرنے لگے تھے، بائبل کے صحیفہ سلاطین کے باب نمبر: ۱۱ میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے، قرآن مجید نے ایک نبی معصوم کی حیاتِ طیبہ پر بنی اسرائیل کی طرف سے ڈالے جانے والے اس غبار کو یہاں صاف کر دیا ہے۔

﴿۵﴾ 'بابل' ایک زمانہ میں مشرقی علاقہ کا بڑا متمدن اور ترقی یافتہ شہر رہا ہے، جو دریائے فرات کے ساحل پر واقع تھا، یہیں بنی اسرائیل کی بڑی تعداد قیدی بنائی گئی تھی، ان پر فن جادوگری کا ایسا غلبہ تھا کہ اپنے قید ہونے کے زمانہ میں بھی وہ اس سے باز نہ تھے اور جادو سیکھنے سکھانے میں سرگرم تھے، جادو بعض اوقات پیغمبروں کے معجزات کو بھی مشتبہ کر دیتا ہے؛ کیوں کہ ظاہر بیں نگاہوں میں دونوں صورتیں خلافِ عادت ہوتی ہیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو یہاں انسانی صورت میں بھیجا، ان کو جادو کا علم دیا گیا؛ تاکہ لوگوں کو ایک ماہر فن کی طرح جادو کی حقیقت اور اُصول بتا کر جادو اور معجزہ کا فرق بتائیں، ان فرشتوں کا مقصد تو صرف اِس خاص غرض کے لئے جادو کے بارے میں اُصول و قواعد کا بتلانا تھا؛ لیکن بعض کج فکر لوگ جادو کے اُصول اور طریقے پوچھ کر اس کا استعمال اپنی فاسد اغراض کے لئے کیا کرتے تھے؛ اس لئے یہ فرشتے جادو کی تفصیل بتاتے ہوئے لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے تھے کہ مجھے خدا نے امتحان و آزمائش کے لئے بھیجا ہے، میں بتا تو دوں گا؛ لیکن اگر تم اس کو غلط استعمال کی نیت سے سیکھو گے تو اپنے آپ ہی کو برباد کرو گے، ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں تفسیر کی کتابوں میں بعض اور واقعات بھی ذکر کئے گئے ہیں، وہ سب اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں، غیر معتبر ہیں اور اسلامی تعلیمات سے مناسبت نہیں رکھتے۔

﴿۶﴾ شیطان کو شوہر و بیوی کے درمیان تفریق بہت محبوب ہے؛ اس لئے کہ معاشرہ کا استحکام اور اس کا صحیح خطوط پر قائم رہنا اور چلنا ازدواجی زندگی کے استحکام پر مبنی ہے، حدیث میں بھی آیا ہے کہ شیطان اپنے اُن کارندوں سے بہت خوش ہوتا ہے جو میاں بیوی میں تفریق کرا دیں؛ (مسلم، باب تحریش الشیطان الخ، حدیث نمبر: ۷۱۰۶) اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ←

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ ۱۲ ع ۱۲
اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے ، تو اللہ کے یہاں بہتر اجر پاتے ، کاش وہ سمجھ داری سے کام لیں ! ﴿۱۰۳﴾ اے ایمان والو! ''راعنا'' نہ کہو، ''انظرنا'' کہا کرو، نیز (احترام وتعظیم کے ساتھ) سنا کرو، ﴿۱﴾ اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ جو لوگ کفر پر کمر بستہ ہیں، خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے، نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی ہو؛ حالاں کہ اللہ جسے چاہیں اپنی رحمت کے لئے مخصوص کرلیں، اور اللہ بڑے فضل والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۵﴾

← ﴿۷﴾ جادو بہ ظاہر نفع رساں اور نقصان رساں نظر آتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر متوجہ فرمایا گیا کہ نفع ونقصان کے اس ظاہری سبب کے پیچھے بھی اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کارفرما ہے۔

﴿۸﴾ چنانچہ اگر جادو میں مشرکانہ کلمات کہنے پڑتے ہوں یا مشرکانہ افعال کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ باعثِ کفر ہے، اگر ایسے کلمات اور افعال کا ارتکاب نہ ہو تو کم سے کم دوسروں کو ضرر پہنچانے کا باعث ہے؛ اس لئے ''فسق'' سے کم یہ بھی نہیں۔

﴿۱﴾ ''راعنا'' کے معنی ہیں ''ہماری رعایت کیجئے!'' اس معنی کے اعتبار سے یہ کوئی گستاخانہ لفظ نہیں ؛ لیکن یہود اس لفظ کو ایک خراب معنی میں بھی استعمال کرتے تھے اور جب آپ ﷺ کو درمیانِ گفتگو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا تو اسی بدنیتی کے ساتھ آپ ﷺ کو مخاطب کرتے تھے ، بھولے بھالے مسلمانوں کو ان کی اس بدتمیزی کا علم نہیں تھا؛ اس لئے دیکھا دیکھی ایسے مواقع پر وہ بھی ''راعنا'' کہہ کر آپ ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے ، اسی پس منظر میں قرآن مجید نے یہودیوں کی اس بے ہودہ حرکت کا پردہ فاش کیا اور ہدایت کی کہ اگر حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو تو بجائے ''راعنا'' کے ''انظرنا'' کہیں، اس کے معنی بھی وہی ہیں: ''ہمارا لحاظ فرمایئے!''، مگر اس میں گستاخانہ معنی مراد لینے کی گنجائش نہیں اور فرمایا گیا کہ خوب احترام سے آپ ﷺ کے ارشادات کو سنا کریں، اس سے معلوم ہوا کہ خدا، رسول اور دین وشریعت کے ذکر میں ایسے الفاظ سے بھی احتیاط برتنی چاہئے ، جس کے گو درست معنی بھی ہوں اور نیت بھی بولنے والے کی بری نہ ہو؛ لیکن اس میں خلافِ ادب معنی کی بھی گنجائش نکلتی ہو، اسی طرح ایسے مباح کام سے بھی منع کیا جائے گا، جس کے بارے میں خطرہ ہو کہ دوسرے فاسد فکر وذہن کے لوگ اس کو اپنی غلط کاریوں کے لئے ڈھال بنالیں گے۔

﴿۲﴾ یہودیوں کو اصل حسد اس بات سے تھا کہ نبوت کا شرف بجائے بنو اسحاق کے بنی اسماعیل کو کیوں حاصل ہو رہا ہے؟ اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ نبوت سے سرفراز کیا جانا اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل سے سرفراز فرمائیں۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ
وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ
يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

ہم کوئی بھی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، تو اس سے بہتر ہی یا اسی کے مانند دوسرا حکم عطا کر دیتے ہیں، ﴿۱﴾ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہیں؟ ﴿۱۰۶﴾ تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کی سلطنت ہے اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار؟ ﴿۱۰۷﴾ یا (اے مسلمانو!) تم بھی چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے (اسی طرح کے) سوال کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے؟ ﴿۲﴾ اور جو ایمان کی بجائے کفر کو اختیار کرے وہ یقیناً راہِ راست سے دور ہٹ جائے گا۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۸﴾

﴿۱﴾ قرآن مجید کے احکام اور الفاظ میں نسخ واقع ہوا ہے، نسخ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ پہلے ایک حکم دیا جائے، پھر تجربہ سے حکم دینے والے کو اندازہ ہو کہ یہ حکم صحیح نہیں تھا، اس کے بجائے فلاں حکم ہونا چاہئے، جیسا کہ انسان کو پیش آتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا نسخ پیش نہیں آسکتا؛ کیوں کہ یہ صورت کم علمی کی وجہ سے پیش آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے، کبھی نسخ حکمت و مصلحت کے تقاضے سے ہوتا ہے، جیسے ایک معالج دوائیں تجویز کرتا ہے، اسے معلوم ہے کہ چند دنوں بعد نسخہ تبدیل کرنا ہے؛ لیکن وہ قبل از وقت اس کی اطلاع نہیں کرتا اور وقت پر نسخہ تبدیل کر دیتا ہے، یہ تبدیلی کم علمی کے باعث نہیں کہ یہ تبدیلی پہلے سے اس کے علم میں تھی، نسخ کی یہی صورت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائی جاتی ہے اور عقلی اعتبار سے بھی اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، پھر نسخ کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ الفاظ باقی رکھے جائیں معنی منسوخ ہوں، دوسرے: الفاظ کی تلاوت اور معانی دونوں منسوخ ہو جائیں، پہلی صورت کو قرآن مجید میں ''منسوخ کرنے'' اور دوسری صورت کو ''بھلا دینے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے بہتر یا اسی طرح کا حکم لانے کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم منسوخ ہوتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا حکم لایا جاتا ہے، وہ دوسرا حکم یا تو اس سے آسان ہوتا ہے، تو دنیا کے اعتبار سے بہتر ہوا، یا اس میں مشقت اور احتیاط زیادہ ہوگی تو اجر و ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوا۔

﴿۲﴾ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بے ہودہ سوالات بھی کرتے اور نامناسب مطالبات بھی، مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا کہ جیسے تم یہودیوں کا دیکھا دیکھی اپنی سادگی اور سادہ لوحی میں حضور اقدس ﷺ کو ''راعنا'' کہہ کر مخاطب کرنے لگے، ایسا نہ ہو کہ انھیں کی طرح پیغمبر سے سوالات اور مطالبہ بھی شروع کر دو، یہودیوں کو قرآن مجید کے الفاظ و احکام میں ''نسخ'' کے واقع ہونے پر بھی اعتراض تھا، تو ایسا نہ ہو کہ ان کے بے جا اعتراضات و شبہات کا تم بھی شکار ہو جاؤ؛ کیوں کہ وہ چاہتے ہی ہیں کہ تم کو دین کی نعمت سے محروم کر دیں، اس تشریح کے مطابق اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں، زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے۔

﴿۳﴾ یعنی مشرف بہ ایمان ہونے کے بعد رسول کی شان میں کوئی گستاخی یا اعتراض کر گیا، تو یہ راہِ راست پا کر پھر اس سے محروم ہو جانا ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ
اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ الثلثة
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ
اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ۱۳ ع ۹ ۱۳

بہت سے اہل کتاب دل سے خواہاں ہیں کہ تم لوگوں کو مسلمان ہونے کے بعد پھر مرتد کردیں، یہ محض ان کے حسد کی وجہ سے ہے؛ باوجودیکہ حق ان پر واضح ہوچکا ہے، ﴿۱﴾ خیر، عفوودرگذر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دیں، ﴿۲﴾ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، ﴿۱۰۹﴾ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور جو نیکی بھی تم اپنے لئے آگے (عالم آخرت کے لئے) بھیجو گے، اللہ کے پاس اسے موجود پاؤ گے، بے شک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں ﴿۱۱۰﴾ یہ کہتے ہیں: جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے، یہ (محض) ان کی آرزوئیں ہیں، آپ کہہ دیجئے: اگر تم سچے ہو، تو اپنی دلیل پیش کرو؛ ﴿۱۱۱﴾ ہاں، جو کوئی بھی اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کردے اور وہ مخلص بھی ہو، اس کے رب کے پاس اس کا اجر محفوظ ہے، ﴿۳﴾ نہ ان کے لئے اندیشہ ہے اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے۔ ﴿۱۱۲﴾

﴿۱﴾ مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے اور ان کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھونے کی یہ خواہش آپ ﷺ کے عہد میں تو یہودیوں کو تھی ہی، آج تک وہ اسی سازش میں لگے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان کھل کر مرتد نہ ہوں تو کم سے کم ان میں تشکیک اور اپنے دین کی تئیں بے اعتمادی و بے اعتباری پیدا کردی جائے، مستشرقین کی تمام مساعی کا خلاصہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ قرآن مجید نے متنبہ کردیا کہ مسلمان ہمیشہ اس سازش کے بارے میں اپنے کان کھڑے رکھیں اور ان کے مکروفریب سے اپنا دامن بچائے رکھیں۔

﴿۲﴾ اس وقت تک جہاد کا حکم نہ آیا تھا؛ اس لئے مسلمانوں کو فرمایا گیا کہ اشتعال سے بچیں، صبر کا دامن نہ چھوڑیں؛ یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی نیا حکم آجائے۔

﴿۳﴾ یعنی یہود کہتے تھے کہ صرف یہود جنت میں جائیں گے اور عیسائیوں کا خیال تھا کہ صرف عیسائیوں کو جنت میں داخلہ ملے گا، قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ سب دعویٰ بلا دلیل ہے، پھر آگے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اُصول بیان فرمادیا کہ جو بھی اخلاص کے ساتھ اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کردے، وہ جنت میں جائے گا، اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے، یہودی حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے اور عیسائی پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہیں لائے، تو اب اسلام کے آنے کے بعد نہ یہودیت میں نجات باقی رہی نہ عیسائیت میں، نیز ایمان میں ''اخلاص'' ←

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ ۠ وَّ قَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ ۙ
وَّ هُمْ یَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ
بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰی فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ ؕ۬
لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کی کوئی بنیاد نہیں ؛ حالاں کہ یہ سب (ایک ہی) کتاب پڑھتے ہیں، ﴿۱﴾ اسی طرح جو لوگ (آسمانی کتاب کا) علم نہیں رکھتے ، (یعنی: مشرکین) وہ بھی ان ہی کی سی بات کہتے ہیں، ﴿۲﴾ تو جس بات میں وہ جھگڑ رہے ہیں، اللہ ان کے درمیان اس کے بارے میں قیامت کے دن فیصلہ کردیں گے ﴿۳﴾ ﴿۱۱۳﴾ اور اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکے اور اس کو ویران کرنے کے درپے ہو، وہ تو اس لائق بھی نہیں کہ بے خوف ہو کر مسجدوں میں داخل ہوں، ﴿۴﴾ ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ ﴿۱۱۴﴾

← بھی ضروری ہے؛ اس لئے منافقین کا ایمان بھی معتبر نہیں کہ یہ اخلاص سے خالی اور محض دیکھاوے کے طور پر ہے، گویا اب اخلاص کے ساتھ مسلمان ہونا ہی جنت میں جانے کی کلید اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے۔

﴿۱﴾ یعنی یہود تورات پڑھتے ہیں، جس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تشریف آوری کے بارے میں پیشین گوئی موجود ہے، پھر بھی یہود عیسائیوں کو بے بنیاد کہتے ہیں، عیسائی حالاں کہ تورات کے قائل ہیں؛ لیکن ضد میں انھوں نے بھی یہودیت کو بے اصل قرار دے رکھا ہے، پس، تورات پر ایمان رکھنے اور اس کو پڑھنے کے باوجود دونوں کا ایک دوسرے کو بے بنیاد قرار دینا حیرت انگیز ہے!

﴿۲﴾ اس سے مشرکین عرب اور عام کفار مراد ہیں، جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی۔

﴿۳﴾ آخرت کے فیصلہ سے مراد ثواب و عذاب ہے، ورنہ حق و باطل کا فیصلہ تو دنیا میں ہو چکا ہے، اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبروں کو بھیجا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔

﴿۴﴾ اس سے اہل مکہ مراد ہیں، جنھوں نے ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ میں داخل ہونے سے اور ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کو عمرہ کرنے سے منع کیا تھا، اسی کے نتیجہ میں ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی، قرآن نے کہا کہ جب اللہ کی توحید پر ان کا ایمان ہی نہیں ہے تو وہ تو اس لائق بھی نہیں ہیں کہ خود اللہ کے گھر میں داخل ہوں؛ چہ جائیکہ دوسروں کو اس سے روکیں! — بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس آیت میں عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے، جو یہودیوں سے عداوت کے جوش میں تورات ←

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور مشرق ومغرب اللہ ہی کا ہے، تم جس طرف بھی منھ کرو، ادھر ہی اللہ کا رُخ ہے،﴿۱﴾ بے شک اللہ بڑی ہی وسعت﴿۲﴾ والے (اور سب کچھ) جاننے والے ہیں۔﴿۱۱۵﴾

← اور بیت المقدس کی بے حرمتی سے بھی باز نہ رہے؛ حالاں کہ خود تورات پر ایمان رکھتے تھے اور بیت المقدس کو قابل احترام جانتے تھے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی جگہ کے مسجد قرار پانے کے لئے ''اذن عام'' ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو اس میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہو، کسی کے لئے رکاوٹ نہ ہو؛ البتہ مسجد کی حفاظت وصیانت یا کسی خاص ضرورت ومصلحت کے تحت کچھ اوقات کے لئے مسجدیں بند رکھی جائیں، تو اس میں حرج نہیں، کہ اس کا مقصد اللہ کے ذکر سے منع کرنا نہیں ہے، بلکہ مسجد کی حفاظت وصیانت ہے۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کسی ایک سمت میں محدود نہیں کہ اس طرف خدا ہو، دوسری طرف نہ ہو، اس لئے ایک ہی رُخ پر اصرار کے کوئی معنی نہیں، قبلہ مقرر کرنے کا مقصود یکسوئی، ذہنی ارتکاز اور اجتماعیت ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ جس سمت میں عبادت کا حکم دیں، ادھر رُخ کرنا کافی ہے اور قبلہ کا مقصد اس سے حاصل ہوجاتا ہے، مشرق ہو یا مغرب اور شمال ہو یا جنوب، اسلام کی آمد کے وقت عرب کے گردوپیش جو قومیں آباد تھیں، وہ عبادت میں مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کرتی تھیں؛ اس لئے خاص طور پر ان سمتوں کا ذکر کیا گیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مدینہ تشریف لانے کے بعد جب آپ ﷺ نے نماز میں کعبۃ اللہ کی بجائے بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا شروع کیا، اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی؛ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے ہے کہ یہ قرآن مجید کی پہلی آیت ہے جو کسی حکم شرعی کو منسوخ کرنے کے لئے نازل کی گئی، (مستدرک حاکم: ۲/۲۹۴، کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۳۰۶۰، حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا معمولِ مبارک سواری جس رُخ پر چل رہی ہو، اسی رُخ پر نفل نمازیں ادا کرنے کا تھا، اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، (مسلم: ۱/۲۴۴، باب جواز الصلوٰۃ النافلہ الخ، حدیث نمبر: ۱۶۱۱) ایسا ممکن ہے کہ کسی نے سفر میں استقبالِ قبلہ کے بغیر نفل نماز کا مسئلہ دریافت کیا ہو، آپ ﷺ نے اس کے جواب میں یہ آیت تلاوت کی ہو، اس سے انھوں نے سمجھا ہو کہ یہ آیت خاص اسی موقع کے لئے نازل ہوئی ہے، بہر حال فقہا اس پر متفق ہیں کہ حالتِ سفر میں جب آدمی سواری پر ہو، تو نفل نماز میں استقبالِ قبلہ ضروری نہیں۔(ردالمحتار: ۲/۴۸۶)

﴿۲﴾ مفسرین نے یہاں ''واسع'' کے مختلف معنی مراد لئے ہیں: رحمت خداوندی کی وسعت، علم الٰہی کی وسعت، کائنات کا احاطہ، اُردو مترجمین میں مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے ''بے انتہا بخشش والا'' مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے ''محیط'' اور مولانا دریابادی رحمہ اللہ نے ''وسعت والا'' سے کیا ہے، یہ تیسرا ترجمہ آیت کے سیاق سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یعنی ایک ہی سمت کے قبلہ ہونے پر اصرار درست نہیں؛ کیوں کہ اللہ کی ذات ایک ہی سمت میں مرکوز نہیں، بلکہ ہر چہار طرف کو شامل ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾
بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ
لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ
تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ بَشِیۡرًا
وَّ نَذِیۡرًا ۙ وَّ لَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۹﴾

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتے ہیں،﴿۱﴾ اللہ کی ذات (ان باتوں سے) پاک ہے؛ بلکہ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے، وہ ان ہی کی ملکیت ہے،﴿۲﴾ سب کے سب ان ہی کے فرمانبردار ہیں، ﴿۱۱۶﴾ وہ آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والے ہیں،﴿۳﴾ اور اللہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتے ہیں، تو صرف اتنا فرماتے ہیں: ''ہوجا'' اور وہ ہوجاتا ہے ﴿۴﴾ ﴿۱۱۷﴾ جو لوگ علم سے بے بہرہ ہیں، وہ کہتے ہیں: ''اللہ ہم سے گفتگو کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آجاتی؟'' انھیں کی سی بات پہلے لوگ بھی کہہ چکے ہیں، ان کے دل ایک جیسے ہیں، یقین کرنے والوں کے لئے ہم نے اچھی طرح دلیلیں واضح کردی ہیں،﴿۵﴾ ﴿۱۱۸﴾ ہم نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ آپ (صرف ایمان لانے والوں کو) خوشخبری سنائیں اور (ایمان نہ لانے والوں کو) ڈرائیں اور (رہ گئے دوزخ میں جانے والے تو) دوزخیوں کے متعلق آپ سے پوچھ نہ ہوگی۔ ﴿۱۱۹﴾

﴿۱﴾ عام طور پر اہل علم نے ''ولد'' کو عربی گرامر کی گنجائش کے مطابق اسم جنس مان کر ''اولاد'' سے ترجمہ کیا ہے —— مولانا دریابادی نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنالیا ہے''، مولانا مرحوم کی رائے میں عیسائیوں میں ایک فرقہ ''اتخاذیوں'' کا گذرا ہے، جن کا عقیدہ تھا کہ اللہ نے تین میں سے ایک ''اقنوم'' (مسیح) کو اپنا متبنّیٰ بنالیا ہے، گویا وہ حقیقت میں بیٹا نہیں؛ بلکہ منھ بولا بیٹا ہے، اس آیت میں انھیں کی تردید ہے۔

﴿۲﴾ یعنی خدا کا رشتہ کسی سے ''والد''، ''مولود'' اور ''باپ بیٹے'' کا نہیں؛ بلکہ مالک اور مملوک کا ہے، خدا پوری کائنات اور کائنات میں پیدا ہونے والی اشیاء اور شخصیتوں کا مالک ہے اور یہ سب خدا کے مملوک ہیں۔

﴿۳﴾ ''بدیع'' کے معنی پہلے سے موجود نمونہ کے بغیر کسی شئ کو وجود میں لانے والے کے ہیں۔

﴿۴﴾ یہ محض سمجھانے کا طریقہ ہے، ورنہ اللہ کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے کسی کلمہ کے کہنے کے بھی محتاج نہیں، جس چیز کا ارادہ فرماتے ہیں، وہ وجود میں آجاتی ہے۔

﴿۵﴾ آیات کے معنی ''دلائل'' بھی ہیں اور ''نشانیاں'' بھی، دونوں طرح ترجمہ کیا گیا ہے، ''دلائل'' کا لفظ علمی دلائل اور حسی معجزات دونوں کو شامل ہے۔

وَ لَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ
الۡہُدٰی ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ
وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ
یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ۧ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ ع ۱۴ ۹ ۱۴
عَلَیۡکُمۡ وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا
وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

یہود و نصاریٰ آپ سے اس وقت تک خوش نہیں ہوں گے، جب تک آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں، ﴿۱﴾ آپ کہہ دیجئے: ''حقیقت میں جو راہ اللہ نے بتائی ہے، وہی درست راستہ ہے!'' جس علم (وحی) سے آپ کو سرفراز کیا گیا ہے، اگر اس کے حاصل ہونے کے بعد بھی آپ ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں، تو اللہ کے مقابلہ آپ کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا، ﴿۱۲۰﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، اگر وہ اس کی اس طرح تلاوت کریں، جو اس کی تلاوت کا حق ہے، ﴿۲﴾ تو وہ اس (قرآن) پر ایمان لے آئیں گے، اور جو اس کا انکار کریں گے، وہ (خود ہی) نقصان اُٹھائیں گے ﴿۱۲۱﴾ اے بنی اسرائیل! میں نے تم کو جو نعمتیں بخشی تھیں اور دنیا بھر پر تم کو فضیلت عطا کی تھی، ﴿۳﴾ اس کو یاد کرو ﴿۱۲۲﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا، نہ کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا، نہ سفارش کام آئے گی اور نہ انھیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ ﴿۱۲۳﴾

﴿۱﴾ یعنی اہل کتاب ہونے کے باوجود یہودیوں اور نصرانیوں کا قبولِ اسلام سے انکار کرنا کسی دلیل اور علم کی بنیاد پر نہیں، محض ضد کی وجہ سے ہے، ایسے لوگوں کا دل کسی بھی طرح پگھلنے والا نہیں ہے؛ اس لئے آپ ان کی فکر میں اپنے آپ ﷺ کو نہ گھلائیں۔

﴿۲﴾ 'تلاوت کا حق' تعصب کی عینک اتار کر اس کے مضمون میں غور کرنا اور پھر اس پر عمل کرنا ہے، اگر یہود و نصاریٰ ایسا کرتے تو تورات وانجیل میں آپ ﷺ کی نبوت کی پیشین گوئی اس قدر واضح ہے کہ ضرور ایمان لے آتے اور جن لوگوں نے ایسا کیا، وہ ایمان سے مشرف بھی ہوئے۔

﴿۳﴾ گذر چکا ہے کہ اس فضیلت کا تعلق اُمت ِمحمدیہ ﷺ کے ظہور سے پہلے کے دور سے ہے، اس وقت صرف بنو اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور پوری دنیا شرک کی آماج گاہ تھی؛ اس لئے بنو اسرائیل دوسری قوموں سے افضل تھے۔

وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

جب ابراہیم کا اس کے رب نے چند باتوں میں امتحان لیا،﴿۱﴾ تو وہ اسے بجالائے، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بناؤں گا،﴿۲﴾ ابراہیم نے کہا: میری اولاد میں سے بھی؟ ارشاد ہوا: میرا وعدہ نافرمانوں سے متعلق نہیں،﴿۳﴾ ﴿۱۲۴﴾ اور وہ وقت بھی یاد کرو جب ہم نے خانۂ کعبہ کو لوگوں کے جمع ہونے کی اور امن کی جگہ بنادیا،﴿۴﴾ (اور ہم نے حکم دیا) تم ''مقام ابراہیم'' کو نماز کی جگہ بنالو،﴿۵﴾ اور ہم نے ابراہیم واسماعیل سے وعدہ لیا تھا کہ میرے گھر کو طواف، اعتکاف اور رُکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے خوب پاک رکھا کرو۔﴿۶﴾ ﴿۱۲۵﴾

﴿۱﴾ یہ چند باتیں کیا تھیں؟ بظاہر اس سے وہ آزمائشیں مراد ہیں، جن سے آپ کو گذارا گیا، یعنی عراق میں حکومت وقت اور عوام کی مخالفت اور اس کے نتیجہ میں نذر آتش کیا جانا، حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی بے آب وگیاہ سرزمین میں چھوڑ جانا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرنا، بعض حضرات نے اس سے وہ احکام شرعیہ مراد لئے ہیں جن کا اللہ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا تھا، اور آپ ان کو بجالائے، یہ احکام کیا تھے؟ —— اس میں بہت سے اقوال ہیں، ابتلاء وامتحان کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تکلیف دہ باتیں تھیں، جن سے آپ صبر ورضا کے ساتھ گذرے، اور یہ باتیں وہی ہوسکتی ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا، ورنہ احکامِ شرع کی پابندی تو ہر صالح اور نیک آدمی اپنی صلاحیت کے بقدر کرتا ہی ہے۔

﴿۲﴾ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آپ ﷺ تک جتنے انبیاء ورسل کا ذکر ملتا ہے، وہ سب آپ ﷺ ہی کے خاندان سے تھے اور دنیا کے تینوں آسمانی مذاہب —— اسلام، عیسائیت اور یہودیت —— حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت اور جلالت شان پر متفق ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا۔

﴿۳﴾ یہود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور انبیاء کی اولاد ہونے پر بڑا فخر کرتے تھے اور اسی نسبی رشتہ کو اپنی عزت وسیادت کے لئے کافی سمجھتے تھے، قرآن نے اس باطل خیال کی تردید فرمائی کہ ایمان وعمل صالح کے بغیر محض خاندانی نسبت کام نہیں آئے گی، خدا کا وعدہ حضرت ابراہیم کی صالح اولاد سے ہے نہ کہ کافروں اور فاسقوں سے۔

﴿۴﴾ کعبہ کی تعمیر بھی چوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی؛ اس لئے آپ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ کعبہ کا ذکر فرمایا گیا، جس وقت کعبہ تعمیر کیا گیا تھا، اس وقت مکہ ایک ویرانہ تھا، ظاہر ہے کہ ایسی جگہ پر لوگ آمد ورفت نہیں رکھتے اور جہاں انسانی آبادی نہیں ہوتی اور لوگوں کی آمد ورفت سے جو علاقہ محروم رہتا ہے، وہاں ''امن'' بھی نہیں ہوتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اجتماع کی ایسی جگہ بنادیا کہ آج دنیا کے کونہ کونہ سے لوگ وہاں جمع ہوتے ہیں اور اس جگہ کو ایسا مامون فرمادیا کہ جب عربوں کی وحشت ولاقانونیت شباب پر تھی ←

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾
وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

اور جب ابراہیم نے عرض کیا: ''میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا دیجئے اور اس شہر کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کو پھلوں سے روزی دیجئے'' اللہ نے ارشاد فرمایا: ''جو کافر ہوگا، اسے بھی کچھ دنوں (دنیا سے) نفع اُٹھانے کا موقع دوں گا، ﴿۱﴾ پھر اسے دوزخ کے عذاب کی طرف کھینچوں گا اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے! ﴿۱۲۶﴾ اور وہ وقت بھی یاد رکھنے کے لائق ہے جب ابراہیم و اسماعیل کعبۃ اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (اور اللہ سے التجا کرتے جاتے تھے): ''ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ گھر) قبول فرما لیجئے! یقیناً آپ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں''۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۲۷﴾

← اور قافلے لُٹ جاتے تھے، اس وقت بھی حرم میں لوگ اپنے باپ کے قاتل تک کو دیکھ کر اپنی نگاہ جھکا لیا کرتے تھے، قرآن نے یہاں اسی کا ذکر کیا ہے۔

﴿۵﴾ 'مقام ابراہیم' سے وہ پتھر مراد ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی تعمیر فرماتے تھے، وہ پتھر اب بھی موجود ہے اور اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدمِ مبارک کے نقش ثبت ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد اس مقام کے قریب طواف کی دو رکعتیں ادا کی ہیں، (بخاری، عن ابن عمر، باب من صلی رکعتی الطواف الخ، حدیث نمبر: ۱۶۲۷) چنانچہ طواف کرنے والوں کے لئے مستحب ہے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچائے بغیر مقام ابراہیم کے قریب ہی طواف کی دو رکعتیں ادا کریں۔ (ردالمحتار: ۳/ ۵۱۲)

﴿۶﴾ آیت میں چار عبادتوں کا ذکر کیا گیا ہے: طواف، اعتکاف، رُکوع اور سجدہ — طواف اور اعتکاف مستقل عبادت ہے، طواف کعبۃ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، کعبۃ اللہ کے علاوہ کسی مسجد یا مقام کا پھیرا لگانا سخت گناہ اور بدترین بدعت ہے، (دیکھئے: فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۳۳۶، بہار شریعت: ۴/ ۱۵۷) اور اعتکاف مرد کسی مسجد ہی میں کرسکتے ہیں، عورتیں گھر میں اعتکاف کریں گی، رُکوع وسجدہ سے نماز کی ادائیگی مراد ہے، نماز میں عجز و فروتنی کا سب سے بڑھ کر اظہار رکوع اور سجدہ ہی سے ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر ان کا ذکر کیا گیا، اس ارشادِ ربانی سے معلوم ہوا کہ نماز کی جگہ کا پاک ہونا شرط ہے اور نماز کی جگہ سے مراد یہ ہے کہ رکوع وسجدہ میں جو اعضاء زمین سے لگتے ہیں، ان جگہوں کو پاک ہونا چاہئے۔

﴿۱﴾ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رزق کی دُعاء کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص فرمایا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں احترام کا تقاضا یہی تھا کہ خدا کے باغیوں اور دشمنوں کے لئے دُعاء نہ کی جائے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ رحمت کے مطابق فیصلہ فرمایا کہ کفار بھی اِس چند روزہ دنیا میں خدا کی دی ہوئی رزق سے نفع اٹھائیں گے، یہاں ان پر بھی روزی کا دروازہ بند نہیں ہوگا، ورنہ دنیا ←

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ۱۵ ع ۸ ۱۵

اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھئے، ﴿۱﴾ ہماری نسل میں سے بھی اپنی ایک فرماں بردار جماعت پیدا فرمایئے، ہمیں عبادت کے طریقے بتلا دیجئے ﴿۲﴾ اور ہماری توبہ قبول فرمایئے، بے شک آپ ہی توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہیں ﴿۱۲۸﴾ پروردگار ہمارے! اِن میں اِن ہی میں سے ایک پیغمبر بھیج دیجئے، ﴿۳﴾ جو ان کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں، کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور انھیں پاک وصاف کردیں، ﴿۴﴾ بے شک آپ بڑی قدرت والے اور بڑے دانا ہیں۔ ﴿۱۲۹﴾

← امتحان گاہ کی بجائے جزاء کی جگہ ہوجائے گی؛ البتہ آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

﴿۲﴾ یعنی یہ معمولی پتھروں کی عمارت تیری شان کے اعتبار سے کس لائق ہے؟ لیکن اِن عاجز بندوں کے جذبۂ اخلاص کو دیکھتے اور ان کی التجا کو سنتے ہوئے اپنی شانِ کریمی سے اس کو قبول فرمالیجئے، کہ آپ بندوں کی دعا سنتے ہیں اور دلوں کے حال سے واقف ہیں۔

﴿۱﴾ اصل معنی ہیں: ''فرمانبردار بنایئے''، مگر ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام انبیاء تھے، اور پہلے سے پیکرِ اطاعت تھے؛ اس لئے ترجمہ کیا گیا ہے: ''فرمانبردار بنائے رہئے''، یعنی اطاعت وفرمانبرداری پر ثابت قدم رکھئے۔

﴿۲﴾ ''مناسک'' کے دو معنی بتائے گئے ہیں، ایک: مطلقاً عبادت اور بندگی کے طریقے، دوسرے: خاص کر حج کے احکام —— بعض مفسرین نے پہلا اور بعض نے دوسرا معنی مراد لیا ہے، پہلا معنی عام ہے، جس میں حج بھی داخل ہے اور دوسری عبادتیں بھی؛ اس لئے یہی معنی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام واسماعیل علیہ السلام کی دُعا میں جس ''فرمانبردار اُمت'' کا ذکر آیا ہے، اس سے اُمتِ محمد یہ اور جس ''پیغمبر'' کا ذکر آیا ہے، اس سے پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہے؛ اس لئے کہ دُعاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں شامل ہیں، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے صرف آپ ہی نبوت سے سرفراز کئے گئے اور یہی اُمت کتابِ الٰہی کی حامل ہوئی۔

﴿۴﴾ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے چار کام ذکر کئے ہیں، اول: تلاوت آیات، اس سے الفاظِ قرآنی کا سنانا مراد ہے، اسلام میں کتابِ الٰہی کی تلاوت کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی وجہ سے قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے اور زبانی یاد کرنے کا جو ذوق اس اُمت میں ہے، اس کی کوئی مثال کسی اور قوم میں نہیں ملتی، دوسرے: تعلیم کتاب، یعنی قرآن میں جو مضامین واحکام منقول ہیں، ان کی تفسیر وتوضیح، قرآن مجید کی تفسیر کا جو کام ہوا ہے، وہ اسی ''تعلیم کتاب'' کی تفصیلات ہیں، تیسرے: تعلیم حکمت، حکمت کے معنی دانائی کی بات کے ہیں؛ اس لئے بعض حضرات نے اس سے حکمت کی باتیں اور تفقہ مراد لیا ہے، قتادہ کے نزدیک اس سے ''سنت'' ←

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ وَصّٰى
بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ
بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور ابراہیم کے مذہب سے وہی بے رغبت ہوسکتا ہے، جو محض بے وقوف ہو، ہم نے تو اس کو دنیا میں بھی چن لیا تھا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں شمار ہوگا ﴿۱۳۰﴾ جب اس کو اس کے رب نے کہا: تم فرمانبردار ہوجاؤ، ابراہیم نے کہا: میں ربِ کائنات کا فرماں بردار ہوا ﴿۱۳۱﴾ ابراہیم بھی اپنے بیٹوں کو اسی کی وصیت کر گئے ہیں اور یعقوب بھی (کہ) ''میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لئے دین کو پسند فرمالیا ہے؛ اس لئے اسلام ہی کی حالت میں تمہیں موت آنی چاہئے'' ﴿۱﴾ ﴿۱۳۲﴾ؕ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کا آخری وقت آیا، اس وقت یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا: تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ انھوں نے جواب دیا: ہم آپ کے خدا، آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے خدا یعنی ایک ہی خدا کی عبادت کریں گے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۳۳﴾

← مراد ہے (قرطبی: ۱۳۱/۲) یہی تفسیر راجح ہے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ ''حکمت'' سے ''تشریعی حکمت'' مراد ہے کہ آپ کا مقصد احکامِ شریعت ہی کو بیان کرنا ہے اور قرآن کے علاوہ احکامِ شریعت سے متعلق جو کچھ آپ سے منقول ہے، وہ حدیث ہی ہے، چوتھے: تزکیہ، اس کے معنی پاک کرنے کے ہیں، بعض نے شرک سے پاک کرنا مراد لیا ہے اور بعض نے مطلقاً گناہوں سے؛ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اُمت کو کتاب وسنت کے سانچہ میں ڈھال دینا کہ وہ شریعت کی تمام ممنوعات سے پاک صاف ہوجائے، تزکیہ ہے اور یہ قلب کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔

﴿۱﴾ یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب تینوں اس کے مخاطب ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تینوں ہی اپنا پیشوا بھی مانتے تھے اور ان سے نسبی تعلق بھی رکھتے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس دین کو اپنی اولاد کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ یہی اسلام ہے جو توحید خالص پر مبنی اور ہر طرح کے شرک سے محفوظ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا کہ یہود ونصاریٰ حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کے نسل سے تھے اور اس نسبت کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

﴿۲﴾ یہود کہا کرتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہودیت کے بجائے کسی اور مذہب کے اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے؛ اس لئے ہم معذور ہیں، اگر ان کی طرف سے یہ ممانعت نہ ہوتی، تو ہم ضرور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ←

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

یہ لوگ گذر چکے، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھ نہ ہوگی، ﴿۱﴾ ﴿۱۳۴﴾ اور (یہ) کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی ہوجاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے، ﴿۲﴾ آپ کہہ دیجئے: نہیں؛ بلکہ ہم نے یکسو ہوکر ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، ﴿۳﴾ اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے ﴿۱۳۵﴾ (مسلمانو!) کہو: ''ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اس کتاب پر بھی جو ہماری طرف نازل کی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوئیں، ﴿۴﴾ نیز ان کتابوں پر بھی جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے عطا فرمائی گئیں، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ﴿۵﴾ اور ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں''۔ ﴿۱۳۶﴾

← شریعت پر ایمان لے آتے، قرآن مجید نے یہاں اسی پر تنقید کی ہے کہ کیا یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کے وقت وہاں موجود تھے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نصیحت تو صرف اس قدر تھی کہ ہمیشہ شرک سے بچنا اور توحید پر قائم رہنا، نہ یہ کہ بعد میں آنے والے انبیاء پر ایمان لانے سے انکار کر جانا، —— اس آیت میں بڑی عبرت ہے کہ پیغمبروں کو آخری آخری دم تک اپنی اولاد کے دین وایمان کی فکر دامن گیر رہتی تھی، نہ کہ زمین جائیداد اور دنیا کے سامان واسباب کی۔

﴿۱﴾ یہود ہمیشہ اپنے آباء واجداد کے مقام ومرتبہ اور اعمال کو اپنے لئے کافی جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال میں وہ بھی حصہ دار ہوں گے، اسی کی تردید ہے کہ ہر شخص کو خود اسی کا عمل کام آئے گا، تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا، نہ کہ اپنے سلف اور آباء واجداد کے اعمال کے بارے میں۔

﴿۲﴾ یعنی یہود کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ تو ہدایت پاؤ گے اور نصرانی کہتے ہیں کہ نصرانی ہوجاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

﴿۳﴾ عربی قواعد کی رو سے ''حنیفا'' کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں وہی ترجمہ ہوگا جو اوپر کیا گیا —— اور اس لفظ کا تعلق ''ملة ابراهيم'' سے بھی ہوسکتا ہے، ایسی صورت میں ''حنیف'' کے معنی ''مستقیم'' (درست) کے ہوں گے اور ترجمہ یوں ہوگا ''ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، جو درست مذہب ہے'' (دیکھئے: قرطبی: ۱۴۰/۲) اُردو میں ترجمہ کرنے والے حضرات نے دونوں طرح اس کا ترجمہ کیا ہے۔

﴿۴﴾ ''اسباط'' کے معنی اولاد اور سلسلۂ اولاد کے ہیں؛ چوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں بہ کثرت نبی آئے ہیں؛ ←

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ
فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫
وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ
اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

پھر جس طرح تم ایمان لائے ہو، اسی طرح وہ بھی ایمان لے آئیں، تو انھوں نے ہدایت پالی، اور اگر اس سے منھ موڑیں تو ان کا مقصد محض اختلاف ہے؛ لہٰذا ان کے مقابلہ میں آپ کے لئے اللہ کافی ہیں اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۱۳۷﴾ (آپ کہہ دیں) ہم نے اللہ کا رنگ قبول کرلیا ہے اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے؟ ﴿۱﴾ نیز ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں ﴿۱۳۸﴾ آپ کہیے کہ تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو؛ حالاں کہ وہی ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، اور ہم نے تو اپنے کو اللہ ہی کے لئے خالص کرلیا ہے۔ ﴿۱۳۹﴾

← اس لئے خاص طور پر ان کی ''اسباط'' کا ذکر کیا گیا۔

﴿۵﴾ یعنی ہم تمام ہی پیغمبروں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں، جیسا کہ یہودیوں نے کیا؛ چنانچہ مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھے، کوئی بھی پیغمبر (جس کے پیغمبر ہونے کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہو) کا انکار یا ان کی بے احترامی کفر کا باعث ہے؛ البتہ احکام میں ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے پابند ہیں؛ کیوں کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں۔

﴿۱﴾ عیسائیوں کے یہاں ایک مذہبی رسم ''بپتسمہ'' کی چلی آتی ہے، جس کو عربی میں ''اصطباغ'' کہتے ہیں، جب کوئی شخص عیسائیت کو قبول کرتا ہے تو اس کو مغرب کے رُخ پر لٹا کر اس سے شیطان سے براءت کا اعلان کرایا جاتا ہے، پھر مشرق کی طرف رُخ کرکے وہ عیسائی عقائد کا اقرار کرتا ہے، پھر کپڑے اُتار کر سر تا پاؤں دم کئے ہوئے تیل سے اس کی مالش کی جاتی ہے، اب بپتسمہ کے حوض میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں وہ غسل کرتا ہے، اسی درمیان اس سے باپ، بیٹے اور روح القدس پر ایمان کا اقرار لیا جاتا ہے، غسل کے بعد پیشانی اور سینہ پر دوبارہ دم کیا ہوا تیل مَلا جاتا ہے اور سفید کپڑا پہنا دیا جاتا ہے، یہ ایک علامتی کپڑا ہے کہ اب وہ گناہ سے پاک وصاف ہوچکا ہے، قرآن نے یہاں اس مصنوعی عمل کا رد فرمایا ہے کہ پانی میں جسم کو دھونے اور سفید رنگ اختیار کرنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ محض دل کے بہلاوے ہیں، اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی مرضیات کے رنگ میں رنگ لے اور اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہوسکتا، اللہ کے رنگ سے یہاں یہی مراد ہے، رنگ کپڑے سے اس طرح پیوست ہوجاتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا، دین سے ایک مسلمان کا تعلق بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ
قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا
تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶/۱۶

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ ﴿۱﴾ آپ پوچھئے کہ تم زیادہ واقف ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو ایسی گواہی کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے آچکی ہے؟ ﴿۲﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں ﴿۱۴۰﴾ یہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ ﴿۱۴۱﴾

﴿۱﴾ یہودیوں کی ایک کھلی ہوئی نامعقولیت یہ تھی کہ وہ تمام انبیاء کو یہودی قرار دیتے تھے، یہی بات ضد میں عیسائی بھی کہہ جاتے تھے؛ حالاں کہ یہودیت کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا اور عیسائیت کا آغاز حضرت مسیح علیہ السلام سے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مذکورہ دوسرے انبیاء کے مدتوں بعد مبعوث ہوئے، اصل دین تو اسلام اور توحید خالص ہے، جو پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک چلا آرہا ہے، یہودیت اور عیسائیت اسی کا ایک حصہ ہے، یہ نام محض انبیاء کی اُمتوں کی شناخت کے لئے ہے، نہ انبیاء نے اپنی اُمت کو اس نام سے موسوم کیا ہے اور نہ آئندہ نئے نبی کے آجانے کے باوجود اسی پر اصرار کرنے اور نبی پر ایمان نہ لانے کا حکم دیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ کے بحیثیت آخری نبی تشریف آوری کی گواہی، جو تورات وانجیل میں موجود ہے اور جسے یہود ونصاریٰ چھپاتے ہیں۔

○ ○ ○

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ
وَالْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ
اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى
الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾

عنقریب (کچھ) ناسمجھ کہیں گے کہ ’’مسلمان پہلے سے جس قبلہ پر تھے، اس کا رُخ کس نے موڑ دیا؟‘‘ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب اللہ ہی کا ہے، ﴿۱﴾ اللہ جسے چاہتے ہیں، درست راستہ کی ہدایت سے نواز دیتے ہیں ﴿۱۴۲﴾ اسی طرح ہم نے تم کو ’’اُمت وسط‘‘ بنایا؛ تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں، ﴿۲﴾ اے رسول! آپ پہلے جس قبلہ پر تھے، اس کو ہم نے اسی لئے قبلہ بنایا تھا کہ ہم اُلٹے پاؤں واپس ہونے والوں کے مقابلہ ان لوگوں کو دیکھ لیں، ﴿۳﴾ جو (ثابت قدمی کے ساتھ) رسول کی پیروی کرنے والے ہیں، ﴿۴﴾ اور یہ بات واقعی گراں گذرتی ہے؛ مگر ان لوگوں پر نہیں، جن کو اللہ نے ہدایت عطا فرمائی اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو برباد کرنے والے نہیں ہیں، ﴿۵﴾ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ بہت شفیق اور مہربان ہیں۔ ﴿۱۴۳﴾

﴿۱﴾ جب آپ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سولہ ماہ سے کچھ زیادہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے، شاید ایسا اس لئے ہوا کہ جن اُمور میں آپ کو کسی متعین بات کا پابند نہ کیا جاتا تھا، ان میں آپ ﷺ اہل کتاب کے طریقہ کو قابل ترجیح تصور کرتے تھے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو باضابطہ اس کا حکم فرمایا گیا ہو؛ لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر نہ آیا ہو، بہر حال اس کے بعد کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا، اس پر یہود کو تو اعتراض تھا ہی؛ اس لئے کہ بیت المقدس ان کا قبلہ بھی تھا، وہ آپ ﷺ کے اس عمل کو یہود دشمنی سے تعبیر کر رہے تھے، مشرکین عرب بھی معترض تھے اور کہہ رہے تھے کہ لگتا ہے کہ محمد ﷺ کو اپنے دین ومذہب کے بارے میں تردد ہے، منافقین کو بھی اس پر اعتراض تھا، قرآن نے ان ہی شبہات کا جواب دیا ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے نہ کہ سمت اور رُخ؛ کیوں کہ سمتیں تو سب اللہ ہی کی ہیں اور خود اللہ کی ذات کسی سمت میں مقید نہیں ہے؛ اس لئے اگر اللہ کی طرف سے قبلہ میں تبدیلی ہو تو اس پر اعتراض کرنا بے وقوفی اور ناسمجھی کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت ہی اس فتنہ سے آگاہ کر دیا؛ تاکہ آپ ﷺ ان کے اعتراضات کا معقول جواب دے سکیں۔

﴿۲﴾ ’’وسط‘‘ کے معنی ’درمیانہ‘ کے ہیں؛ اسی لئے ’’وسط‘‘ اس گروہ کو کہا جاتا ہے جو افراط وتفریط سے دور اور راہِ اعتدال پر قائم ہو؛ اسی لئے بعض بزرگوں نے اس کا ترجمہ ’’معتدل‘‘ سے کیا ہے اور یہی اعتدال عدل کا راستہ ہوتا ہے؛ چنانچہ حدیث میں ’’اُمۃ وسطاً‘‘ کی تفسیر ’’اُمت عدل‘‘ سے کی گئی ہے، گویا اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کو ایک ایسی اُمت ہونے کی سند عطا فرمائی گئی ہے، جو جادۂ عدل واعتدال پر قائم ہے؛ اسی لئے اس اُمت کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے بھی اور عمل سے بھی لوگوں کے سامنے اظہارِ حق کا ←

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ہم بار بار آسمان کی طرف چہرہ اُٹھتے دیکھ رہے ہیں، تو ہم آپ کو اسی قبلہ کی جانب متوجہ کردیں گے جو آپ کو پسند ہے، (اب) آپ اپنا رُخ مسجد حرام، ﴿۱﴾ کی طرف کرلیں، ﴿۲﴾ اور مسلمانو! تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو، اپنے رُخ مسجد حرام ہی کی طرف رکھو اور بلاشبہ اہل کتاب کو معلوم ہے کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، ﴿۳﴾ اور اللہ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں۔ ﴿۱۴۴﴾

← فریضہ انجام دے، معروف اور سچائی کی گواہ بنی رہے اور پوری انسانیت کے لئے نمونہ کا کام کرے، نیز رسول کے اِس اُمت پر گواہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ رسول کی ذات اس اُمت کے لئے نمونہ ہے، گویا رسول کی زندگی اللہ کی مرضیات کی عملی گواہی ہے، — اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کا اعزاز بھی ہے اور اس کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا گیا ہے کہ اس کی حیثیت پوری انسانیت کے لئے داعی و رہبر اور اسوہ و نمونہ کی ہے۔

﴿۳﴾ عربی زبان میں ''علم'' دیکھنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں یہی مراد ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ان کی حقیقت پہلے سے تھی۔

﴿۴﴾ کعبہ سے بیت المقدس اور بیت المقدس سے پھر کعبہ کی طرف تحویل قبلہ کرکے اللہ تعالیٰ نے مشرکین اور یہود دونوں کا امتحان لے لیا، بناءِ اسماعیل ہونے کی وجہ سے عربوں کو کعبہ سے جذباتی لگاؤ تھا اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب تھی، جو ایک اسرائیلی پیغمبر تھے، اس لئے اس سے یہودیوں کا جذباتی تعلق تھا، بیت المقدس کو قبلہ بنانے میں عربوں کا اور کعبہ کو قبلہ بنانے میں یہودیوں کا امتحان تھا کہ یہ رنگ ونسل کے رشتہ کو ترجیح دیتے ہیں یا حکم خداوندی کو؟ نسلی وخاندانی تعصب کی ان پر حکمرانی ہے یا خدا کی محبت اور اس کی اطاعت کا جذبہ ان پر غالب ہے؟ یہ امتحان ضروری تھا؛ تاکہ مخلص اور غیر مخلص کی پہچان ہوجائے اور مدنی زندگی میں آئندہ مسلمانوں کو جس طرح صبر و برداشت اور جنگ ومزاحمت کی راہ سے گذرنا تھا، اس میں اپنے اور بے گانے کی شناخت آسان ہو۔

﴿۵﴾ قبلہ کی تبدیلی پر یہودیوں نے ایک موشگافی یہ بھی کی کہ اتنے عرصہ تک جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز ادا کی، ان کی عبادت تو یوں ہی اکارت گئی، خاص کر جو لوگ اس درمیان گذر گئے، ان کے لئے تو تلافی کی بھی کوئی صورت نہیں، قرآن نے اسی کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عمل کو ضائع نہیں فرمائے گا؛ اس لئے کہ اصل مقصود حکم خداوندی کا بجالانا ہے، نہ کہ کسی خاص رُخ پر عبادت کرنا، اور ظاہر ہے کہ بیت المقدس کی طرف ان کا رُخ کرنا بھی اللہ ہی کی فرمانبرداری میں تھا۔

﴿۱﴾ ''حرام'' کے معنی قابل احترام کے ہیں، اس سے وہ مسجد مراد ہے جو کعبۃ اللہ کے چاروں طرف ہے، مسجد حرام کے استقبال کا ←

وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ
اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

وقف لازم

ربع منزل

اگر اہل کتاب کے سامنے آپ تمام نشانیاں پیش کردیں، جب بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرسکتے ہیں، خود ان میں سے بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو تسلیم نہیں کرتا ہے، ﴿۱﴾ اور اگر معلوم ہوجانے کے باوجود آپ ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو یقیناً اُس وقت آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا ﴿۱۴۵﴾ جو اہل کتاب ہیں، وہ آپ کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے اپنی اولاد کو؛ (البتہ) ان میں کا ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے پر کمر بستہ ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۴۶﴾

← حکم دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ دور کے لوگوں کے لئے بعینہٖ کعبہ کا استقبال ضروری نہیں؛ کہ ایسا حکم دینے میں سخت دشواری ہے؛ بلکہ کعبہ کے چاروں طرف نسبتاً وسیع دائرہ میں جو مسجد ہو، اس کا استقبال کافی ہے، گویا عین کعبہ کا استقبال کرنا ضروری نہیں، سمتِ کعبہ کا استقبال کرلے تو کافی ہے۔

﴿۲﴾ رسول اللہ ﷺ کی خواہش یہی تھی کہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا جائے؛ کیوں کہ یہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر تھی، عربوں کا اس سے محبت واحترام کا جو رشتہ تھا، اس کی وجہ سے کعبہ قبلہ ہو تو ان کے اسلام کی طرف راغب ہونے کی زیادہ توقع تھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ ﷺ کی خواہش رہتی تھی کہ اُمتِ محمدیہ ﷺ اپنے افعال واطوار میں دوسری اُمتوں سے ممتاز و متشخص رہے؛ اس لئے آپ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا ایک علاحدہ قبلہ ہو، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، مسجد بنو حارثہ میں صحابہ ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے، نماز کے درمیان ہی حکم نازل ہوا اور آپ ﷺ اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے درمیانِ نماز ہی قبلہ تبدیل فرمالیا، آج کل یہ مسجد ''مسجد القبلتین'' کہلاتی ہے، عصر کی نماز پہلی نماز ہے جو مسجد نبوی میں مکمل کعبہ رُخ ادا کی گئی اور ''قبا'' تک اطلاع پہنچتے پہنچتے دیر ہوگئی؛ اس لئے اگلے دن نماز فجر وہاں کعبہ کی طرف رُخ کرکے ادا کی گئی۔ (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۱؍۴۰، ۱۳۹)

﴿۳﴾ یعنی یہود کو یہ بات اپنی مذہبی روایات کی بنا پر معلوم تھی کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) کا قبلہ الگ اور مستقل ہوگا اور یہ کہ نئی شریعت میں نئے قبلہ کا ہونا قابل تعجب نہیں؛ کیوں کہ شریعت کے احکام میں نسخ ہوتا رہا ہے۔

﴿۱﴾ اس لئے کہ یہود بیت المقدس کے ''ہیکل سلیمانی'' کو قبلہ مانتے ہیں اور عیسائی آفتاب کے طلوع ہونے کی سمت کو، تو باوجودیکہ عیسائی تورات کی شریعت پر ایمان رکھتے ہیں، پھر بھی اس کے قبلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کررہے ہیں، تو ایسوں سے کیا اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ جاہلانہ تنگ نظری سے آزاد ہوکر کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرلیں گے؟

﴿۲﴾ تورات وانجیل میں بہت سی تحریفات اور آمیزشوں کے باوجود اب بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے نبی ہونے کی شہادتیں ←

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ مِنْ
حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

ع ۱۷/۲ — وقف النبی ﷺ

حق وہی ہے جو آپ کے رب فرمائیں ؛اس لئے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہوجائیں!﴿۱﴾ ﴿۱۴۷﴾ ہر ایک کے لئے ایک قبلہ ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) رُخ کیا کرتا ہے، تو نیکیوں میں سبقت کرو،﴿۲﴾ تم جہاں کہیں بھی رہو، اللہ تم سب کو لے آئیں گے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۱۴۸﴾ (اے رسول!) آپ جہاں بھی جائیں (نماز میں) اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف رکھیں، یقیناً یہی حق ہے جو آپ کے رب کی طرف سے ہے،﴿۳﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں ﴿۱۴۹﴾ (مزید تاکید جانیں کہ) جہاں بھی جائیں (نماز میں) اپنا رُخ مسجد حرام ہی کی طرف رکھیں اور (مسلمانو!) تم (بھی) جہاں کہیں رہو، (نماز میں) اپنا رُخ مسجد حرام ہی کی طرف رکھو؛﴿۴﴾ تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف دلیل فراہم نہ ہوجائے ،﴿۵﴾ سوائے ان میں سے کچھ لوگوں کے جو انصاف نہیں کرتے ،تو ان (کے اعتراضات) سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو، (یہ حکم اس لئے ہے کہ) میں تم پر اپنی نعمت پوری کردوں ،﴿۶﴾ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ ﴿۱۵۰﴾

← کثرت سے موجود ہیں ؛اس لئے تورات یا انجیل کا کوئی حقیقت پسند عالم آپ ﷺ کی نبوت کا انکار نہیں کرسکتا، (دیکھئے: اظہار الحق کا ترجمہ ''بائبل سے قرآن تک: ۳/ ۹۷'') یہی تفسیر عبارت سے قریب تر ہے —— بعض حضرات نے اس سے یہ مراد لیا ہے کہ یہود کو ''بیت اللہ کا قبلہ ہونا'' ایسا ہی معلوم ہے، جیسے اپنے بیٹے کی پہچان ،یعنی حضور ﷺ کی بجائے 'قبلہ' کی پہچان مراد لی ہے، متعدد اہل علم سے یہ تفسیر بھی منقول ہے۔ (فتح القدیر للشوکانی: ۱/ ۲۲۰)

﴿۱﴾ بہ ظاہر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے ؛لیکن اصل مقصود آپ ﷺ کے واسطہ سے اُمت کو مخاطب کرنا ہے، کہ قرآن مجید اور معتبر احادیث سے جو بات ثابت ہے، اس میں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہئے۔

﴿۲﴾ ''ہر ایک کے لئے ایک رُخ ہے'' سے یہ مراد ہے کہ ہر قوم اور ہر اُمت کا ایک قبلہ ہے ؛اس لئے اگر اُمتِ محمدیہ ﷺ کے تشخص اور ان کی الگ پہچان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک علاحدہ قبلہ متعین فرما دیا تو اس میں کونسی بات قابل اعتراض ہے؟ —— نیکی میں سبقت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قبلہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو حکم فرمایا ہے، کسی تردد اور پس و پیش کے بغیر اس کو دل و جان سے قبول کرلو۔

←

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ۛ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا
ع ۱۸ / ۵ / ۲ تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ؑ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

معانقة ۳ عند المتاخرین ۱۲

جیسا کہ (ہم نے تم پر یہ انعام کیا کہ) تمہارے درمیان تمہیں میں سے رسول بھیجا، جو تم پر ہمارے احکام کی تلاوت کرتے ہیں، تم کو (گناہوں سے) پاک کرتے ہیں اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں، نیز جن باتوں کا تم کو علم نہیں تھا، تم کو اُن کی تعلیم دیتے ہیں ﴿۱۵۱﴾ۛ پس مجھے یاد رکھو، میں بھی تم کو یاد رکھوں گا، ﴿۱﴾ اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کروؑ ﴿۱۵۲﴾ اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں!! ﴿۱۵۳﴾ اور جو لوگ اللہ کے راستہ میں کام آجائیں، انھیں مردہ نہ کہو؛ بلکہ (وہ) زندہ ہیں؛ لیکن تم (اس کو) محسوس نہیں کرسکتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۵۴﴾

← ﴿۳﴾ یعنی 'کعبہ' کا قبلہ ہونا اللہ کی طرف سے فیصل شدہ امر ہے۔

﴿۴﴾ ان آیات میں بار بار قبلہ کے استقبال کا حکم فرمایا گیا ہے اور تکرار سا محسوس ہوتا ہے؛ لیکن یہ تکرار بے فائدہ نہیں، کہیں خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے، کہیں تمام مسلمانوں سے، کہیں اپنے وطن کے زمانۂ قیام کا حکم ہے اور کہیں حالت سفر کا اور کہیں مزید تاکید مقصود ہے؛ اس لئے کہ جس شدت سے تبدیلیٔ قبلہ پر اعتراض کیا جارہا تھا اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بونے کی کوشش کی جارہی تھی، اسی تاکید اور اہتمام کے ساتھ اس کا حکم دیا جانا بھی ضروری تھا۔

﴿۵﴾ یعنی یہودیوں کو کہنے کا موقع ملے گا کہ آخری نبی کے لئے تو الگ قبلہ کی پیشین گوئی ہے اور مسلمانوں کا الگ قبلہ نہیں ہے، اسی طرح عرب کہیں گے کہ دعویٰ دین ابراہیمی کا ہے اور قبلہ کعبہ ابراہیمی کے بجائے دوسری عمارت ہے۔

﴿۶﴾ یہاں ''نعمت پورا کرنے'' سے مراد مسلمانوں کو مستقل قبلہ سے سرفراز کیا جانا ہے؛ اس لئے کہ کسی اُمت کا صاحبِ قبلہ ہونا بھی اس پر اللہ کی ایک نعمت ہے، کہ اس سے اس کی علاحدہ شناخت قائم ہوتی ہے۔

﴿۱﴾ ''ذکر'' زبان سے بھی ہوتا ہے کہ زبان اللہ کے نام سے اور اس کی تسبیح وتقدیس سے تر رہے، دل سے بھی ہوتا ہے کہ دل کے اندر خدا کا استحضار ہو اور خدا کی خوشنودی ہمہ دم پیش نظر رہے، اور عمل سے بھی ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی کام کرے اس کا خیال رکھے کہ حکم خداوندی کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ ہو —— نیز اللہ کی طرف سے بندہ کو یاد کرنا یہ ہے کہ وہ اپنے لطف وفضل سے بندوں کو نوازتا رہے۔

﴿۲﴾ غزوۂ بدر میں جو صحابہ شہید ہوئے، ان کے بارے میں منافقین اور بعض مشرکین کہنے لگے کہ ان لوگوں نے بے فائدہ اپنی جان گنوائی اور زندگی کے لطف وآرام سے محروم ہوئے، یہ آیت اسی کا جواب ہے، کہ شہداء کو اللہ تعالیٰ نے برزخی زندگی میں اس سے بڑی لذتوں اور راحتوں سے سرفراز کر رکھا ہے، تمہاری نگاہ ظاہر بیں جن کا ادراک نہیں کرسکتی؛ اسی لئے ان کو عام مُردوں کی ←

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ؕ
اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا
وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ
وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۵۸﴾

اور ہم تم لوگوں کو خوف، بھوک، مال، جان اور پھلوں کے نقصان سے کچھ ضرور آزمائیں گے، (اس سلسلہ میں) آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں ﴿۱۵۵﴾ (جن کا حال یہ ہے کہ) جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ''ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف واپس ہونا ہے'' ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے نوازشیں اور رحمتیں ہوں گی، اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ﴿۱۵۷﴾ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، ﴿۱﴾ اس لئے جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس پر ان دونوں کی سعی کرنے میں مضائقہ نہیں، ﴿۲﴾ اور جو اپنی خوشی سے (مزید) نیکی کرے تو اللہ (نیکی کے) قدرداں (اور اس سے) خوب واقف ہیں۔ ﴿۱۵۸﴾

← طرح مُردہ تصور نہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو ایک طرح کی زندگی حاصل ہے، یہ حیات دنیوی نہیں؛ بلکہ حیاتِ برزخی ہے، یوں تو حیاتِ برزخی کچھ نہ کچھ ہر مرنے والے کو حاصل ہوتی ہے اور اسی کی بنا پر وہ عذاب وثواب کو محسوس کرتا ہے؛ لیکن شہداء میں یہ حیات نسبتاً زیادہ قوی ہوتی ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کا جسم بھی محفوظ رہتا ہے اور انبیاء میں بھی وفات کے بعد یہی حیات ہوتی ہے؛ لیکن بہت قوی اور اعلیٰ۔

﴿۱﴾ صفا اور مروہ کعبۃ اللہ کے دائیں بائیں دو پہاڑیاں ہیں، حج میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کی جاتی ہے، یہ اصل میں اِس واقعہ کی یادگار ہے کہ جب اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں چھوڑا تو اس وقت یہاں پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا، مشکیزہ میں تھوڑا سا پانی تھا، جو جلد ہی ختم ہوگیا، جب حضرت اسماعیل علیہ السلام (جو ابھی دودھ پیتے بچہ تھے) کو پیاس لگی تو حضرت ہاجرہ علیہا السلام بے تابانہ 'صفا' سے 'مروہ' اور 'مروہ' سے 'صفا' کی طرف دوڑتیں، کہ کہیں کوئی قافلہ یا انسان نظر آجائے اور اس سے کچھ پانی مل جائے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اِس نیک بندی کی ممتا اور بے قراری پر رحم آیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں کے نیچے سے زمزم کا چشمہ جاری ہوگیا، جو آج ایک عالم کو سیراب کر رہا ہے اور دنیا کے کونہ کونہ تک ہر حاجی اس تحفہ کو لے کر پہنچتا ہے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی اسی واقعہ کی یادگار ہے؛ چوں کہ ان پہاڑیوں سے ایک عبادت متعلق ہوگئی ہے اور یہ پہاڑیاں اطاعت خداوندی کی علامت بن گئی ہیں؛ اسی لئے ان کو ''شعائر اللہ''، یعنی ''اللہ کے دین کی علامتیں'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

﴿۲﴾ زمانۂ جاہلیت میں ان دونوں پہاڑیوں پر اہل مکہ نے بت نصب کر لئے تھے، جن کی پرستش کی جاتی تھی اور سعی کے درمیان ←

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي
الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ
اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

بے شک جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو —— باوجودیکہ ہم اس کو لوگوں کے لئے (آسمانی) کتاب میں واضح کر چکے ہیں —— چھپاتے ہیں، ﴿۱﴾ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور تمام ہی لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے رہتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۵۹﴾ سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کر لی، درست عمل کرنے لگے اور حق بات کو ظاہر کر دیا، یہی لوگ ہیں کہ میں ان کی توبہ قبول کروں گا اور میں خوب توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان ہوں، ﴿۱۶۰﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور کفر ہی پر مر گئے، ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانیت کی لعنت ہے ﴿۳﴾ ﴿۱۶۱﴾ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، ﴿۴﴾ نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ﴿۱۶۲﴾

← لوگ ان کو چھوتے تھے؛ اس لئے مسلمانوں کو ان پہاڑیوں کی سعی سے کراہت محسوس ہوئی؛ حالاں کہ سعی کا مقصد حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی سنت کو زندہ کرنا تھا، اور یہ شعائرِ توحید میں تھا نہ کہ شعائرِ شرک میں، اسی پس منظر میں قرآن نے کہا کہ چوں کہ یہ ایک ایمان افروز واقعہ کی یادگار ہے نہ کہ مشرکانہ عمل کی؛ اسی لئے سعی کرنے میں کوئی کراہت محسوس نہ کرنی چاہئے؛ (مستدرک حاکم، عن عائشہؓ: ۲/۲۹۸، حدیث نمبر: ۳۰۶۹) چنانچہ ''صفا اور مروہ'' کے درمیان سعی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب، مالکیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک رکن ہے۔ (ردالمحتار: ۲/۴۶۹، الفقه الاسلامی وأدلته: ۳/۱۷۰)

﴿۱﴾ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسی حکم شرعی سے واقف ہوں اور وہ موقع اس کی تعلیم و تفہیم کا ہو، تو ایسے لوگوں کا خاموشی اختیار کر لینا جائز نہیں، ان کی خاموشی بھی گناہ ہے۔

﴿۲﴾ یعنی فرشتے اور انسان —— اللہ کی لعنت رحمت خداوندی سے محروم ہونا ہے اور مخلوق کی لعنت اُن کے لئے محرومی کی بددُعاء کرنا ہے۔

﴿۳﴾ کسی متعین شخص پر اسی وقت لعنت جائز ہے؛ جب کہ کفر پر اس کی موت ہوئی ہو، زندہ اور متعین آدمی پر مسلمان ہو تو کیا معنی، کافر ہو جب بھی لعنت نہ کرنی چاہئے؛ اس لئے کہ ممکن ہے کہ اس کا خاتمہ اسلام پر ہو جائے؛ البتہ وصفِ گناہ کے ساتھ کسی شخص کو متعین کئے بغیر لعنت کرنا جائز ہے، جیسے جھوٹے پر اللہ کی لعنت، شرابی پر اللہ کی لعنت وغیرہ، اس آیت میں اسی طرح لعنت فرمائی گئی ہے۔

﴿۴﴾ ''اسی میں رہیں گے''، میں ''اسی'' سے دوزخ بھی مراد ہو سکتی ہے اور لعنت کی حالت بھی، کہ وہ ہمیشہ لعنت ہی میں رہیں گے، بعض مفسرین نے پہلا اور بعض نے دوسرا معنی مراد لیا ہے، گنجائش دونوں ہی کی ہے۔

١٩ ع ١١ ٢ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾ وَ مِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ
وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾

اور تمہارا معبود خدائے واحد ہی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے ﴿١٦٣﴾ بے شک آسمان وزمین کی پیدائش میں، شب و روز کی تبدیلی میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی رہتی ہیں، اس بات میں کہ اللہ نے بادل سے پانی برسائے، پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی بخشی اور زمین میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیئے، ہواؤں اور ان بادلوں میں جو زمین و آسمان کے درمیان حکم خداوندی کے تابع ہیں، سمجھ رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں ﴿١﴾ ﴿١٦٤﴾ بعض لوگ وہ ہیں جو اوروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، جیسے اللہ سے محبت رکھنی چاہئے، ویسی ہی ان سے محبت رکھتے ہیں، اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، اللہ سے ان کی محبت اس سے بھی بڑھ کر ہے، کاش! یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں، جب یہ عذاب دیکھیں گے، (ان کو پتہ چل جائے گا) کہ تمام طاقت اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں۔ ﴿١٦٥﴾

﴿١﴾ قرآن مجید کا طریقۂ استدلال عام طور پر انسانی فطرت کو چھوتا ہوا ہوتا ہے، وہ دقیق معقولی موشگافیوں کے بجائے دن رات کے مشاہدات سے انسان کو قائل کرتا ہے اور عام طور پر اس کے لئے انسان کے اپنے وجود میں بکھری ہوئی دلیلوں اور انسان سے باہر کائنات میں موجود اللہ کی نشانیوں کو پیش کرتا ہے، یہاں بھی قرآن نے یہی کیا ہے، آسمان وزمین کی ایک قادرِ مطلق کے ہاتھوں تخلیق، سورج و چاند کی حرکت اور اس سے شب و روز کا تسلسل، سمندر پر وزنی کشتیوں کا بغیر ڈوبے گذرنا، بارش کے ذریعہ زمین کو نئی زندگی بخشنا اور بادلوں کا سمندر سے ڈول بھر بھر کر منوں اور ٹنوں بوجھ اُٹھائے فضا میں معلق رہنا ایک طرف کائنات کے نہایت با تدبیر منتظم کے وجود کی دلیل ہے اور دوسری طرف اس نظام کا بلا وقفہ مسلسل قائم رہنا اور فساد و تضاد سے خالی رہنا اس مدبر کے ایک اور یکتا ہونے کا ثبوت ہے، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مخلوقات کتنی بھی وسیع و عریض اور روشن و بلند ہوں؛ لیکن وہ ہیں عاجز و محکوم؛ اس لئے یہ خود معبود نہیں ہو سکتے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ
ع ٢٠ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي
الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٦٨﴾ اِنَّمَا
يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾

(وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب قوم کے پیشوا اپنی پیروی کرنے والوں سے بیزاری ظاہر کریں گے، وہ (خود) عذاب کا سامنا کریں گے اور ان کے تمام سہارے ٹوٹ چکے ہوں گے، ﴿١﴾ ﴿١٦٦﴾ تو پیروی کرنے والے کہیں گے کہ اگر ہمیں ایک موقع اور ملے تو جیسے وہ ہم سے بے تعلقی برت رہے ہیں، ہم بھی ان سے بے تعلقی کا برتاؤ کریں، اللہ اسی طرح ان کو ان کے اعمال دکھائیں گے، جو ان کے لئے سامانِ حسرت ہوگا اور وہ دوزخ سے ہرگز نہ نکل سکیں گے ﴿١٦٧﴾ اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے، اس میں سے کھاؤ؛ بشرطیکہ حلال و پاک ہو، ﴿٢﴾ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو؛ کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿١٦٨﴾ بے شک شیطان تم کو محض برائی، بے حیائی اور اللہ پر ایسی باتیں گھڑنے کا حکم دیتا ہے، جسے تم جانتے تک نہیں۔ ﴿٣﴾ ﴿١٦٩﴾

﴿١﴾ یعنی عالم آخرت میں کافروں کو جو جسمانی عذاب ہوگا، وہ تو ہوگا ہی، وہ ذہنی تکلیف سے بھی دوچار ہوں گے، کہ اپنے جن اسلام دشمن سرداروں اور رہنماؤں کی پیروی انھوں نے دنیا میں کی ہوگی، دیکھیں گے کہ وہ بھی اسی دوزخ کی آگ کا ایندھن ہیں، یہ صورتِ حال دیکھ کر جب عوام خدا سے کہیں گے کہ انھیں کی پیروی نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے، تو وہ بجائے اعتراف و پشیمانی کے ایسا صاف انکار کر جائیں گے کہ گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہ ہو، اس سے ان کی ذہنی و قلبی تکلیف میں اور اضافہ ہوگا۔

﴿٢﴾ ''طیب'' کے معنی پاک کے ہیں، پاکی ظاہری نجاست سے بھی ہوتی ہے اور معنوی نجاست یعنی حرمت سے بھی : (قرطبی : ٢٠٨/٢) اس لئے دونوں معنوں کی گنجائش ہے، پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ حلال ہونا کافی نہیں، اسے ناپاک اور نجاست سے آلودہ بھی نہ ہونا چاہئے، ناپاک چیز کا کھانا بھی حرام ہے، —— دوسرا معنی مراد لیں، تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ شئ اصلاً حلال ہو، جیسے : حلال جانوروں کا گوشت، اور اسے حاصل بھی حلال طریقہ سے کیا گیا ہو، چوری، غصب اور سود و رشوت وغیرہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

﴿٣﴾ عرب بعض جانوروں کو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور باور کرتے تھے کہ اب وہ حرام ہو گئے ہیں، ان کی اس حرکت کی مذمت ہے کہ حرام و حلال کرنا اللہ کا کام ہے، نہ کہ انسانوں کا، انسان جیسے کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا، اسی طرح وہ کسی حلال کو حرام کرنے کا بھی اختیار نہیں رکھتا، یہ گویا خدا کے اختیار کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے، جو ہرگز درست نہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ
اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا
لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٧١﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ
اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو کہتے ہیں : بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، چاہے ان کے باپ دادا ناسمجھ اور ہدایت سے محروم ہی کیوں نہ ہوں ؟ ﴿۱﴾ ﴿١٧٠﴾ اور کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایسے (جانور) کو پکارے ، جو سوائے پکارنے اور چلانے کے کچھ نہ سنتے ہوں ، یہ بہرے ، گونگے ، اندھے ہیں ؛ ﴿۲﴾ اس لئے کچھ نہیں سمجھتے ﴿١٧١﴾ اے ایمان والو! اگر (واقعی) تم اللہ ہی کی بندگی کرتے ہو تو جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا ہے ، اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ ، ﴿۳﴾ اور اللہ کا شکر ادا کرو ﴿١٧٢﴾ بے شک اللہ نے تم پر مردار ، ﴿۴﴾ خون ، ﴿۵﴾ سور کا گوشت ، ﴿۶﴾ اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو ، ﴿۷﴾ حرام کیا ہے ، ہاں ، جو شخص مجبور ہو جائے (اور ان میں سے کچھ کھالے) نہ نافرمانی مقصود ہو اور نہ حد سے تجاوز کرے ، ﴿۸﴾ تو اس پر کچھ گناہ نہیں ، بے شک اللہ بہت درگذر کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ۔ ﴿١٧٣﴾

﴿۱﴾ گمراہ اور ناواقف باپ دادا کی پیروی انسان کو گمراہی کی طرف لے جائے گی ؛ اس لئے اس سے بچنا چاہئے ؛ البتہ اگر آباء واجداد ہدایت یافتہ اور اصحابِ علم ہوں ، جیسا کہ صحابہ ، اجلۂ تابعین اور ائمۂ مجتہدین وغیرہ تھے ، تو اس حسن ظن پر ان کی اتباع کرنا کہ انھوں نے کتاب وسنت کو صحیح طریقہ پر سمجھا ہے ، مذموم نہیں ، کہ یہ ناواقف اور گمراہ لوگوں کی اتباع نہیں ؛ بلکہ دین سے واقف اور ہدایت یافتہ لوگوں کی اتباع ہے ۔

﴿۲﴾ مثال بہ ظاہر کافروں کی دی گئی ہے ؛ مگر مقصود ان کو دعوت دینے والے کی مثال دینا ہے کہ داعی کی حیثیت چرواہے کی اور کفر پر بضد کافروں کی مثال جانوروں کی ہے ، جن کے لئے ہر بول محض ایک چیخ و پکار ہے اور وہ اس کا منشاء و مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ، جیسے جانوروں سے کسی بات کو سمجھنے اور قبول کرنے کی اُمید نہیں ، وہی حال اِن کا ہے ، گویا حق اور ہدایت کے معاملہ میں ان کے کان ، ان کی زبان اور ان کی آنکھیں معطل اور اپنی صلاحیت سے محروم ہیں ۔

﴿۳﴾ یعنی کافروں کا طریقہ اختیار کر کے اپنی طرف سے کسی چیز کو حرام نہ کرلو ۔

﴿۴﴾ یعنی جو جانور ذبح نہ کیا گیا ہو ، اپنی موت آپ مر گیا ہو ، یا ذبح کیا گیا ہو ؛ لیکن شرعی طریقہ کی رعایت کے بغیر ؛ البتہ اس سے حدیث کی بنا پر دو جانور مستثنیٰ ہیں ، ایک : مچھلی ، دوسرے : ٹڈے (سنن ابن ماجہ ، باب صید الحیتان والجراد ، حدیث نمبر : ۳۲۱۸) کہ ان کو ←

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾

اللہ نے کتاب میں جو مضمون نازل کیا ہے، جو لوگ اسے چھپاتے ہیں اور اس کے بدلہ تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیتے ہیں، وہ یقیناً اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، قیامت کے دن اللہ ان سے نہ بات کریں گے، ﴿۱﴾ اور نہ ان کو پاک فرمائیں گے، ﴿۲﴾ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ﴿١٧٤﴾

← ذبح کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں، مردار کا چمڑا دباغت سے پاک ہوجاتا ہے، کہ احادیث نبوی ﷺ سے اس کا جائز ہونا ثابت ہے۔ (سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۱۷۲۸، باب ماجاء فی جلود المیتۃ الخ)

﴿۵﴾ خون سے بہتا ہوا خون مراد ہے، جو رگوں میں ہوتا ہے، خود قرآن میں ہی دوسرے موقع پر ’’بہتے ہوئے خون‘‘ (دمِ مسفوح) کی قید کے ساتھ اس کا ذکر موجود ہے۔ (الانعام: ۱۴۵)

﴿۶﴾ چوں کہ جانوروں سے غذا میں اصلاً گوشت ہی مطلوب ہوتا ہے؛ اس لئے گوشت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اس بات پر اجماع ہے کہ سوّر اپنے جسم کے تمام اجزاء — ہڈی چمڑا، چربی وغیرہ — کے ساتھ حرام ہے۔ (ردالمحتار: ۱/۳۷۵، باب المیاہ)

﴿۷﴾ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کے حرام ہونے پر اجماع ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ جانور کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا گیا اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لے لیا گیا، صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں بھی وہ جانور حرام ہی ہوگا، سوائے اس کے کہ ذبح کرنے سے پہلے اس شخص نے توبہ کرلی ہو؛ کیوں کہ جانور پر غیر اللہ کا نام لینا ہر دو صورت میں پایا گیا، بدقسمتی سے آج کل بعض مسلمان بھی بزرگوں کے نام سے منسوب کرکے جانور کی پرورش کرتے ہیں، یہ کھلا ہوا مشرکانہ عمل ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

﴿۸﴾ یعنی اگر انسان جان بچانے کے لئے مجبور ہوجائے، تو ان حرام غذاؤں کو بھی کھا کر اپنی جان بچا سکتا ہے، اس مجبوری کی ایک صورت تو جان لیوا بھوک اور حلال غذا کی عدمِ موجودگی ہے، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو ان حرام چیزوں کے کھانے پر مجبور کردیا جائے اور نہ کھانے کی صورت میں شدید نقصان میں مبتلا کئے جانے کا اندیشہ ہو، اس کو ’’اکراہ‘‘ کہتے ہیں، زیادہ تر اہل علم نے اس صورت کو بھی اضطرار ہی قرار دیا ہے، (احکام القرآن لابن العربی: ۱/۵۶، بدائع الصنائع: ۱۸۵) ’’غیر باغ‘‘ کے معنی ہیں کہ وہ اپنے اس عمل میں حکم شرعی سے بغاوت کرنے والا نہ ہو، یعنی شدید مجبوری کے بغیر ان حرام چیزوں کو ہاتھ نہ لگائے، ’’لا عاد‘‘ کے معنی یہ ہیں کہ حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، یعنی بس اتنی ہی مقدار حرام کا استعمال اس کے لئے جائز ہے، جس سے اس کی جان بچ جائے، اس سے زیادہ مقدار نہ کھائے۔

﴿۱﴾ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ ان سے بات کریں، مگر لطف و محبت کا کلام نہ ہو؛ بلکہ غضب و عتاب کا کلام ہو۔

﴿۲﴾ یعنی معاف کرکے گناہوں سے ان کو پاک نہ کریں گے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱ / ۵
لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى
وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی اور مغفرت کی بجائے عذاب کو خرید کرلیا ہے، یہ دوزخ پر کس قدر صابر ہیں! ﴿۱۷۵﴾ یہ سزا اس لئے ہوگی کہ اللہ نے حق کی حامل کتاب نازل فرمائی اور جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا ہے، وہ محض ضد میں دور جا پڑے ہیں ﴿۱۷۶﴾ محض اپنا رخ پورب یا پچھم کی طرف کرلینا نیکی نہیں ہے؛ بلکہ نیک وہ ہے جو اللہ پر، آخرت پر، فرشتوں پر، (آسمانی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان رکھے، اپنا محبوب مال، ﴿۱﴾ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں پر، نیز غلاموں کے آزاد کرانے میں خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے، جب وعدہ کرے تو وعدہ پورا کرے، تنگدستی، بیماری اور جنگ کے موقع پر صبر سے کام لے، ﴿۲﴾ یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۷۷﴾

﴿۱﴾ عربی قواعد کے لحاظ سے ''حُبِّهٖ'' کی ضمیر کا تعلق ''مال'' سے بھی ہوسکتا ہے اور ''اللہ'' سے بھی، اگر مال سے ہو تو معنی ہوں گے، کہ ''مال کی چاہت رکھنے کے باوجود'' یعنی اپنا محبوب مال خرچ کرے، اس میں دو باتیں آگئیں: اول یہ کہ جو مال محبوب ہو، وہ خرچ کرے، دوسرے ابھی عمر طبعی اور صحت کے لحاظ سے بہ ظاہر موت سے قریب اور زندگی سے مایوس نہیں اور اسے خود مال و جائداد کی ضرورت پیش آسکتی ہے، پھر بھی خرچ کرے، جب آدمی زندگی سے مایوس ہوجائے اور خود اس کو مال کی ضرورت نہ رہے، اس وقت جو خرچ کرے گا، ثواب اس پر بھی ہوگا، مگر کم؛ کیوں کہ اب مال کی ضرورت اور رغبت کم ہوچکی ہے، —— اور اگر ضمیر کا تعلق ''اللہ'' سے ہو، تو اب معنی اس طرح ہوں گے: ''اللہ کی محبت میں خرچ کرے'' یعنی خرچ کرنے کا مقصد ناموری، دکھاوا یا کسی شخص سے تعلق اور محبت نہ ہو؛ بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔

﴿۲﴾ آیت میں ''بأساء'' اور ''ضراء'' دو الفاظ آئے ہیں، ''بأساء'' سے مالی تنگدستی اور ''ضراء'' سے جسمانی مضرت مراد ہے۔

﴿۳﴾ یہ قرآن مجید کی اہم ترین اور نہایت جامع آیتوں میں ہے، جس میں ایمانیات کا بھی ذکر آگیا، معاملات کی اصلاح بھی آگئی، جانی و مالی عبادت کا بھی تذکرہ ہوگیا اور اخلاق کی تعلیم بھی آگئی، اہل علم نے لکھا ہے کہ اس میں سولہ اُصولی تعلیمات آگئی ہیں، ←

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ
وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ
ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے بارے میں ''قصاص'' فرض کیا گیا ہے، ﴿۱﴾ آزاد نے قتل کیا ہو تو اس آزاد سے، غلام نے قتل کیا ہو تو اس غلام سے اور عورت نے قتل کیا ہو تو اس عورت سے بدلہ لیا جائے، ﴿۲﴾ پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو مناسب طریقہ پر (مقتول کے ورثہ کو خوں بہا کا) مطالبہ کرنا چاہئے اور (قاتل کو بھی) بہتر طریقہ پر ادا کر دینا چاہئے، ﴿۳﴾ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے؛ لہٰذا جو اس کے بعد زیادتی کرے گا، ﴿۴﴾ تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ ﴿۱۷۸﴾

← اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ نیکی محض کچھ ظاہری افعال کے کرنے اور رسموں کے بجالانے کا نام نہیں ہے، جو یہودیوں کا طرزِ عمل تھا، کہ ان کا پورا زور محض قبلہ کے مسئلہ پر تھا اور وہ اسی کو نیکی و بدی کا معیار بنائے ہوئے تھے؛ بلکہ اصل میں نیکی ایمان وعقیدہ، معاملات، عبادات اور اخلاق کی اصلاح کا نام ہے۔

﴿۱﴾ ''قتل عمد'' یعنی جان بوجھ کر قتل میں قصاص واجب ہے، قصاص کے اصل معنی برابری کے ہیں، یعنی ''قتل کے بدلہ قتل'' —— قتل عمد سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص پر قتل کے ارادہ سے دھار دار ہتھیار سے حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا جائے، (**البحر الرائق: ۹/۶**) ایسی صورت میں جہاں اسلامی حکومت ہو، وہاں مقتول کو حق ہے کہ عدالت کی وساطت سے قاتل کو قتل کر دے، قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں، (**الفقه الاسلامی وأدلته: ۷/۲۶۴**) اسلام سے پہلے بھی آسمانی کتابوں میں قتل کی یہی سزا مقرر کی گئی تھی، بائبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے، (دیکھئے: احبار: ۲۴/۱۷) اگر جسم کو جزوی نقصان پہنچا، یا کسی عضو کو کاٹ دیا یا چوٹ لگائی اور یہ جسم کا ایسا حصہ ہے اور ایسا زخم ہے کہ قصاص لیتے ہوئے بھی اسی حد تک قائم رہنا ممکن ہو تو اعضاء میں بھی قصاص واجب ہوگا، قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کا ذکر آیا ہے، (**المائدة: ۴۵**) جن صورتوں میں قصاص کا حکم نہیں، یا قصاص میں مساوات کو باقی رکھنا ممکن نہیں، وہاں بجائے قصاص کے دیت واجب ہوگی۔ (**البحر الرائق: ۹/۳۳**)

﴿۲﴾ عربوں میں ایک جاہلانہ طریقہ یہ تھا کہ مقتول جس سطح کا ہوتا، قاتل کے خاندان سے اس سے اعلیٰ درجہ کے آدمی کو قتل کا نشانہ بنایا جاتا، غلام کے مقابلہ آزاد کو اور عورت کے مقابلہ مرد کو، قرآن کا منشاء ہے کہ یہ مناسب نہیں ہے اور اس سے بے قصور لوگوں کی جان جائے گی، جو قاتل ہو، اسے قتل کرو، آزاد ہو یا غلام اور مرد ہو یا عورت، قاتل چاہے غلام ہو لیکن قتل کرنا آزاد کو ظلم و ناانصافی کی بات ہے، یہی مساوات شریعت نے مسلمان اور غیر مسلم میں بھی رکھی ہے کہ اگر کسی مسلمان نے اسلامی مملکت کے کسی غیر مسلم شہری کو قتل کر دیا تو وہ مسلمان بھی قصاص میں قتل کیا جائے گا؛ چنانچہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ ایک نفس انسانی کے بدلہ اس کے قاتل انسان کے قتل کا حکم دیا گیا ہے (**النساء: ۹۲**) اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق نہیں کیا گیا۔ ←

وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚۖ اِلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

اور اے اصحابِ دانش! قصاص میں (درحقیقت) تمہارے لئے زندگی ہے؛«۱» تا کہ تم (دنیا میں قتل اور آخرت میں عذاب سے) بچ سکو ﴿۱۷۹﴾ جب تم میں سے کسی پر موت (کا وقت قریب) آجائے اور وہ کچھ مال«۲» چھوڑ رہا ہو تو تم پر والدین اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طریقہ پر وصیت کرنا فرض ہے،«۳» یہ تقویٰ والوں پر لازم ہے۔«۴» ﴿۱۸۰﴾

← «۳» یعنی اگر مقتول کے ورثہ قصاص سے دستبردار اور خون بہا لینے پر راضی ہوجائیں تو اب بجائے قصاص کے دیت کا حکم ہوگا —''کچھ بھی معاف کردیا جائے'' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر مقتول کے متعدد ورثہ ہوں، اکثر ورثہ قصاص پر بہ ضد ہوں اور ایک وارث بھی دیت لینے پر رضامند ہوجائے تو اب دیت ہی واجب ہوگی نہ کہ قصاص، اب مقتول کے ورثہ کو حق ہوگا کہ قاتل سے مناسب طریقہ پر دیت کا مطالبہ کرے، اور قاتل کو بھی چاہئے کہ ٹال مٹول کئے بغیر دیت ادا کردے، اس آیت میں قاتل کو ''بھائی'' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گو وقتی اشتعال اور غلبۂ شیطان کی وجہ سے وہ قتل کا ارتکاب کر بیٹھا ہے؛ لیکن بہر حال وہ تمہارا دینی بھائی ہے؛ اس لئے درگذر سے کام لو، یہ گویا مقتول کے ورثہ سے قاتل کے لئے رحم کی اپیل ہے!

«۴» یعنی اس قانونِ قصاص کے آنے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کرے، جیسے قاتل کوئی اور ہو، قتل کسی اور کو کردے، یا مقتول کو معاف کردینے کے باوجود پھر اسے قتل کردے، وغیرہ۔

«۱» بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ قصاص ایک قتل کے بعد دوسرا قتل ہے؛ لیکن غور کیا جائے تو اپنے نتائج اور اثرات کے اعتبار سے اس میں زندگی کا تحفظ ہے، اول تو قانونِ قصاص کے خوف سے کسی کو جلدی ارتکابِ قتل کی ہمت ہی نہ ہوگی اور اگر کسی نے اس کا ارتکاب کرلیا اور مقتول کے ورثہ کو بدلہ لینے کا موقع دے دیا گیا تو آتشِ انتقام بجھ جائے گی، ممکن ہے معاف ہی کردے اور قصاص لے بھی لے، تو اب یکے بعد دیگرے انتقام لینے کا سلسلہ قائم نہ ہوگا اور بے قصوروں کی جان نہ جائے گی، معاملہ یہیں رفع دفع ہوجائے گا، اس طرح قانونِ قصاص میں انسانی سماج کا تحفظ ہے۔

«۲» قرآن نے مال کو ''خیر'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، خیر کے اصل معنی نیکی اور بھلائی کے ہیں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مال کا حاصل کرنا اور مال دار ہونا بذاتِ خود بری بات نہیں اور نہ یہ اللہ کی قربت میں رکاوٹ ہے، جیسا کہ بعض مذاہب میں خیال کیا جاتا تھا؛ بلکہ اگر صحیح طریقہ پر حاصل کیا جائے اور اچھے مصارف میں خرچ کیا جائے تو عین باعثِ اجر وثواب ہے؛ البتہ مال کو ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا اور ناجائز راستہ میں خرچ کرنا گناہ ہے۔

«۳» ابتدائی دور میں قانونِ میراث نہیں آیا تھا، اس وقت یہی قانون تھا کہ مرنے والا جس رشتہ دار کے لئے جو وصیت کر جائے، اس کے مطابق اس کا ترکہ تقسیم ہوگا، جب میراث کا قانون آگیا، جس کا تفصیلی ذکر (النساء:۱۱-۱۲) میں ہے تو اب یہ حکم باقی نہیں رہا؛ ←

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ
خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

۲۲ ع ۲

پھر کوئی شخص وصیت سننے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو بدلنے والوں کو اس کا گناہ ہوگا، بے شک اللہ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں؛ ﴿۱﴾ ﴿۱۸۱﴾ البتہ جس شخص کو وصیت کرنے والے سے غلطی یا گناہ کا اندیشہ ہو اور وہ ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں، ﴿۲﴾ بے شک اللہ بڑے بخشنے والے نہایت مہربان ہیں ﴿۱۸۲﴾ اے ایمان والو! جیسے تم سے پہلی اُمتوں پر روزے فرض کئے گئے تھے، تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں؛ ﴿۳﴾ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہوجائے۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۸۳﴾

← بلکہ اب وارث کے لئے وصیت کر بھی جائے تو اس کا اعتبار نہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وارث کے لئے وصیت نہیں، لا وصیة لوارث، (سنن ترمذی، باب ماجاء لا وصیة لوارث، حدیث نمبر: ۲۱۲۱) اور جو وارث نہ ہو، اس کے لئے بھی ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت معتبر نہیں، یہ تحدید بھی حدیث میں منقول ہے۔ (سنن ترمذی، باب ماجاء فی الوصیة بالثلث، حدیث نمبر: ۲۱۱۶)

﴿۴﴾ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں ''متقیوں'' سے تمام ہی مسلمان مراد ہیں؛ اس لئے کہ ''تقویٰ'' کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی کفر وشرک سے بچتا ہو اور یہ بات ہر مسلمان کو حاصل ہے۔

﴿۱﴾ یعنی مرنے والے نے جو وصیت کی ہے، خدا نے اسے سن رکھا ہے اور وصیت کے گواہ وصیت میں جو اُلٹ پھیر کر رہے ہیں، خدا اس سے بھی خوب واقف ہیں۔

﴿۲﴾ وصیت میں بھی عدل چاہئے، ایسا نہ ہو کہ کسی رشتہ دار کی طرف جھک جائے اور کسی سے کھینچ جائے، اگر کسی سے اس کا اندیشہ ہو اور اس کو انصاف کی صلاح دے کر عدل پر قائم رکھا جائے تو یہ بہتر کام ہے، اس کا شمار وصیت تبدیل کرنے میں نہیں ہے، —— مفسرین نے ''جنفاً'' سے ''نادانستہ غلطی'' اور ''اثم'' سے جان بوجھ کر غلطی مراد لی ہے۔

﴿۳﴾ روزہ اسلام سے پہلے بھی بعض اُمتوں پر فرض رہا ہے اور یہودیوں کا روزہ تو مشہور ہی ہے، اسلام میں روزہ مرحلہ وار فرض ہوا، پہلے صرف یوم عاشوراء کا روزہ فرض تھا، (بخاری، باب وجوب صوم رمضان، حدیث نمبر: ۱۸۹۲) بعد کو پورے ماہِ رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو یومِ عاشوراء کے روزہ کی فرضیت باقی نہ رہی، اس آیت میں رمضان المبارک کے روزوں کا ذکر ہے، جو ہجرت کے دوسرے سال فرض کیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری: ۱/۱۸۹)

﴿۴﴾ یعنی روزہ کا مقصد نفس کی تربیت ہے کہ آدمی کے اندر ضبط کی صلاحیت پیدا ہو اور وہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکے۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى
الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

گنتی کے چند دنوں (ہی کے روزے فرض ہیں)، ﴿۱﴾ پھر تم میں سے جو بیمار ہو، ﴿۲﴾ یا سفر پر ہو ﴿۳﴾ تو دوسرے دنوں میں اتنے ہی دن روزے رکھ لے ﴿۴﴾ اور جو لوگ بہ مشقت ہی روزے رکھ سکتے ہوں، ﴿۵﴾ ان پر فدیہ —— ایک محتاج کا کھانا —— ﴿۶﴾ ہے، پھر جو اپنی خوشی سے (مزید) نیکی کرے، تو یہ اس کے لئے (ہی) بہتر ہے، اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ روزے رکھ لو۔ ﴿۷﴾ ﴿۱۸۴﴾

﴿۱﴾ یعنی روزہ کے دن مقرر ہیں، ایک ماہ، آپ ﷺ نے انگلیوں کے اشارہ سے بھی فرمایا: ۲۹ یا ۳۰ دن، (بخاری، باب قول النبی لانکتب الخ، حدیث نمبر: ۱۹۱۳) اس میں روزہ کی ترغیب بھی ہے کہ محض چند دنوں کا تو روزہ ہے؛ اس لئے پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔

﴿۲﴾ بیماری اور سفر ایسا عذر ہے، جس کی وجہ سے وقتی طور پر روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، بیماری سے ایسی بیماری مراد ہے کہ جس میں روزہ سے نقصان کا اندیشہ ہو، یعنی اگر روزہ رکھے، تو بیماری بڑھ جائے گی یا طول پکڑ لے گی یا مریض کے اندر بھوک کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہ ہو، جس کا فیصلہ ماہر معتبر معالج کے مشورہ سے اور خود مومن کے ضمیر کی آواز پر ہوگا، کوئی ایک ہی حد ہر مریض کے لئے متعین و مقرر نہیں؛ کیوں کہ قویٰ، عمر، موسم اور ہمت و حوصلہ کے فرق کے اعتبار سے ہر انسان کے اندر قوتِ برداشت مختلف ہوتی ہے۔

﴿۳﴾ سفر سے مراد 'سفر شرعی' ہے، جس کی مسافت کم سے کم ۴۸ میل (۷۷ کیلومیٹر) ہو، اس سے کم کے سفر میں روزہ چھوڑ دینا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے جن اسفار میں روزہ چھوڑنا ثابت ہے، وہ طویل اسفار ہی ہیں، چند میل کے سفر پر روزہ توڑ لینا ثابت نہیں، ائمۂ مجتہدین اور سلف صالحین قریب قریب اس پر متفق ہیں، (بدائع الصنائع: ۲/۲۴۵) —— یہ بھی ذہن میں رہے کہ حالت سفر میں ہی قرآن نے روزہ توڑنے کی اجازت دی ہے؛ اس لئے اگر کسی کی صبح گھر پر ہو تو روزہ توڑ کر سفر شروع کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ سفر سے پہلے ہی روزہ توڑنا ہوا، اگر روزہ رکھ کر سفر شروع کرے اور سفر شروع کرنے کے بعد روزہ رکھنے میں ناقابل برداشت مشقت نہ ہو تو اس کو روزہ کو پورا کرنا چاہئے؛ (ھندیہ: ۱/۲۰۶) کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے کام کو شروع کرنے کے بعد توڑنے سے منع فرمایا ہے، "لا تبطلوا اعمالکم "۔ (البقرۃ: ۲۶۴)

﴿۴﴾ یعنی وقتی بیماری اور سفر کی وجہ سے جو روزے فوت ہو جائیں، ان کی قضاء واجب ہوگی۔

﴿۵﴾ "طاقت" کے معنی مشقت کے ساتھ کسی چیز پر قادر ہونے کے ہیں، اس لئے معنی یہ ہوئے: "جو لوگ بہ مشقت ہی روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ فدیہ ادا کر سکتے ہیں" (روائع البیان: ۱/۲۰۸) —— حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق اس سے بوڑھے ←

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ
فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَ لِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

ماہِ رمضان ہی ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لئے ذریعۂ ہدایت، ہدایت کی واضح دلیلوں پر مشتمل اور حق و باطل میں فرق کرنے والا، ﴿۱﴾ پس تم میں سے جو رمضان کا مہینہ پائے، وہ اس ماہ کا روزہ ضرور ہی رکھے اور جو مریض یا مسافر ہو، وہ دوسرے دنوں میں اتنے ہی دنوں روزہ رہے، اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں نہ کہ دشواری، اور چاہتے ہیں کہ (روزہ کی) مقررہ تعداد پوری کرلو، ﴿۲﴾ نیز اللہ نے تم کو ہدایت عطا فرمائی ہے، اِس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ ﴿۱۸۵﴾

← اور بوڑھیاں مراد ہیں، یعنی ان کے لئے روزہ کے بدلہ فدیہ ادا کردینے کی اجازت ہے، اسی طرح جو لوگ مستقل بیمار ہوں اور مرض کے باعث روزہ رکھنے سے قاصر ہوں؛ ان کے لئے بھی روزوں کے بدلہ فدیہ ادا کرلینا درست ہے، (روائع البیان: ۱/ ۲۰۸) —— اس تفسیر کے مطابق اس آیت کو منسوخ نہیں ماننا پڑے گا؛ تاہم اکثر اہل علم نے اس آیت سے مراد یہ لیا ہے کہ: ''جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے'' ایسی صورت میں یہ حکم منسوخ ہے، ابتداءً چوں کہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے؛ اس لئے سہولت دی گئی تھی کہ روزہ رکھیں یا فدیہ ادا کردیں، بعد کو روزہ ہی لازم کردیا گیا، صرف معذوروں کے حق میں فدیہ کا حکم باقی رکھا گیا۔

﴿۶﴾ فدیہ یہ ہے کہ ایک مسکین کو دوپہر اور رات کا کھانا آسودگی کے ساتھ کھلا دیا جائے، (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۵۲) رمضان المبارک ہو تو افطار کے بعد کا اور سحری کا کھانا کھلا دینا کافی ہے، اگر کھانا کھلانے کے بجائے غلہ دینا چاہے تو ایک روزہ کے بدلہ ایک ہی مسکین کو ''نصف صاع گیہوں'' جدید اوزان کے مطابق ایک کلو چھ سو اکانوے (۶۹۱) گرام دیدے (تفسیر آیات الاحکام: ۱/ ۱۵۷، فتاویٰ خانیہ: ۱/ ۲۰۳) یا متوسط قسم کا کھلے بازار میں دستیاب گیہوں کی قیمت ادا کردے؛ لیکن آج کل چوں کہ اتنے گیہوں کی قیمت سے دو وقت کا کھانا پورا ہونا دشوار ہے؛ اس لئے احتیاطاً دو وقت کے کھانے کے بہ قدر پیسے ادا کردینا چاہئے۔

﴿۷﴾ یعنی جہاں تک ممکن ہو روزہ رکھ لینا بہتر ہے؛ اس لئے سفر کی حالت میں اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے شدید مشقت نہ ہو تو روزہ رکھ لینا افضل ہے۔ (بدائع الصنائع: ۲/ ۲۴۸)

﴿۱﴾ ''فرقان'' وہ چیز ہے جو حق و باطل کے درمیان اچھی طرح فرق کردے، دنیا میں جتنی مذہبی کتابیں ہیں، خواہ قرآن مجید نے ان کی تصدیق کی ہو یا نہ کی ہو، وہ انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں کی وجہ سے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہیں، یہ صرف قرآن ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے محافظ ہیں اور وہ قیامت تک کھرے کھوٹے اور حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت کا حامل رہے گا۔

﴿۲﴾ یعنی جو روزے چھوٹ گئے ہوں، ان کی قضاء کرلو۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ
وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآىِٕكُمْ ؕ هُنَّ
لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَیْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ
اِلَی الَّیْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ
كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دیجئے) کہ میں قریب ہی ہوں، جب کوئی مجھ سے دُعاء کرتا ہے تو دُعاء کرنے والوں کی دُعاء قبول کرتا ہوں، ﴿۱﴾ تو لوگوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں؛ تاکہ وہ ہدایت سے سرفراز ہوں ﴿۱۸۶﴾ روزہ کی رات میں تمہارے لئے اپنی بیوی سے ہم بستری حلال کی جاتی ہے، ﴿۲﴾ وہ تمہارے لئے اور تم ان کے لئے لباس ہو، ﴿۳﴾ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کیا کرتے تھے، ﴿۴﴾ تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کرلی اور تم سے درگذر فرمادیا؛ لہٰذا اب اپنی بیویوں سے ہم بستری کرو اور تمہارے لئے اللہ نے جو مقدر فرمایا ہے، اسے تلاش کرو، ﴿۵﴾ نیز جب تک صبح کی سپیدی (رات) کی سیاہی سے نمایاں نہ ہوجائے کھاؤ پیو، ﴿۶﴾ اور (ہاں) جب تم مسجد میں معتکف رہو تو بیوی سے صحبت نہ کرنا، ﴿۷﴾ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، ان کے قریب بھی نہ جانا، ﴿۸﴾ اللہ اسی طرح لوگوں کے لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں؛ تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ﴿۱۸۷﴾

﴿۱﴾ رمضان المبارک کا مہینہ اور روزہ کی حالت دُعاء کی قبولیت کا زمانہ ہے اور اس میں دُعاء کا خصوصی اہتمام مطلوب ہے، غالباً اسی لئے روزہ کے احکام کے ساتھ دُعاء کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور دُعاء قبول کرنے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

﴿۲﴾ روزہ فرض ہونے کے بعد شروع میں بعض احکام میں سختی تھی، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ رات میں بھی میاں بیوی کا ازدواجی تعلق ممنوع تھا، پھر اس آیت کے ذریعہ شب میں کھانے پینے کی طرح بیوی سے ہم بستری کی اجازت بھی دے دی گئی، (بخاری، باب أحل لکم الخ، حدیث نمبر: ۴۵۰۸) اس سے اسلام کا اعتدال و توازن بھی نمایاں ہے، بعض مذاہب میں مرد و عورت کے صنفی تعلق کو اللہ کی قربت اور دینداری و پاکیزگی کے منافی سمجھا گیا ہے، عیسائی دنیا میں رہبانیت کے غلبہ نے کیسے فتنے جگائے ہیں، اس کی پوری تاریخ ہے؛ اسلام نے صرف ناجائز تعلق کو منع کیا، جائز اور قانونی تعلق کی نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ حوصلہ افزائی کی؛ کیوں کہ قدرت نے اس سے نسل انسانی کی افزائش کو متعلق رکھا ہے۔

﴿۳﴾ لباس سے بڑھ کر انسان کا کوئی رازدار نہیں ہوتا، انسان کا پورا وجود لباس کے سامنے بے لباس ہوتا ہے اور یہی لباس ہے ←

وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳

اور ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ اور نہ (رشوت کے طور پر) مال حاکموں تک پہنچاؤ؛ تاکہ جانتے بوجھتے لوگوں کا کچھ مال ظلم کے ساتھ کھا جاؤ۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۸۸﴾

← جو سردی وگرمی سے انسان کی حفاظت کرتا ہے، میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لئے لباس کہہ کر اس طرف اشارہ ہے کہ ان کو ایک دوسرے کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے راز کا امین اور مشکل وقتوں میں ایک دوسرے کا محافظ و مددگار رہونا چاہئے۔

﴿۴﴾ یعنی رات میں بیوی سے صحبت کی ممانعت والا حکم تم سے ادا نہ ہو پاتا تھا اور بعض اوقات اس کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی — قرآن کی یہ تعبیر کتنی بامعنی ہے کہ حکم شرعی کی خلاف ورزی کرنے کو خود اپنی ذات کے ساتھ خیانت قرار دیا گیا کہ جسم اللہ کی امانت ہے، حکم خداوندی کے مطابق اعضاء جسم سے کام لینا حقِ امانت کا ادا کرنا ہے اور خود اپنے ہی اعضاء سے گناہ کا ارتکاب اس امانت میں خیانت ہے۔

﴿۵﴾ یعنی بیوی سے تمہارا تعلق محض شہوت پوری کرنے کے لئے نہ ہو، کہ یہ تو حیوانات بھی کرتے ہیں؛ بلکہ نیت اولاد کے حصول کی ہونی چاہئے؛ کیوں کہ قدرت نے انسان کے اندر جو جنسی داعیہ رکھا ہے، اس کا مقصود ہی نسل انسانی کی افزائش ہے۔

﴿۶﴾ یعنی صبح صادق تک کھانے پینے اور میاں بیوی کے مخصوص تعلق کی اجازت ہے، صبح ہوتے ہی روزہ شروع کر دینا ہے، احتیاط یہ ہے کہ چند منٹ پہلے ہی آدمی ان باتوں سے رُک جائے؛ تاکہ روزہ کا ادا ہونا مشکوک نہ ہو جائے، صبح ہونے کے بعد جان بوجھ کر ایک لقمہ بھی کھالے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور کفارہ واجب ہو جائے گا، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے؛ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۲/۲۱۴) کیوں کہ خود قرآن مجید نے ابتداءِ روزہ کا وقت مقرر کر دیا ہے اور آگے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی سرحدیں ہیں، ان کے آگے بڑھنا درست نہیں۔

﴿۷﴾ اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کسی بھی مسجد میں کیا جا سکتا ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ یا جامع مسجد کی تخصیص نہیں؛ کیوں کہ قرآن مجید نے کسی خاص مسجد کی تخصیص نہیں کی ہے؛ بلکہ اس کو عام رکھا ہے، اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ اعتکاف کی حالت میں رات میں بھی بیوی سے ہم بستر ہونا یا کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرنا جو جنسی نوعیت کا ہو، جیسے بوسہ، شہوت کے ساتھ مساس وغیرہ جائز نہیں، اس سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے؛ (الفقه الإسلامي وأدلته: ۲/۷۲۰) البتہ بیوی سے ملاقات میں حرج نہیں، آپ ﷺ معتکف تھے، اسی حال میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ سے ملاقات کے لئے مسجد تشریف لے گئیں، صحیح احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ (بخاری، باب زیارة المرأة، حدیث نمبر: ۲۰۳۸)

﴿۸﴾ ایسے ہی احکام سے فقہاء نے یہ اُصول اخذ کیا ہے کہ جیسے گناہ سے بچنا واجب ہے؛ اسی طرح ان کاموں سے بھی اجتناب واجب ہے جو خود جائز ہوں؛ لیکن وہ گناہ تک لے جانے کا ذریعہ بن سکتے ہوں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کو حرام کیا ہے، ان کے قریب بھی جانے کو منع فرما دیا ہے۔

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ انسان رشوت دے کر یا اپنی چرب زبانی سے متاثر کر کے عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کرالے اور کوئی مال ←

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ
ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾
وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

لوگ آپ سے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ یہ لوگوں کے لئے اوقات کو جاننے اور (خاص کر) حج (کے ایام) کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں، ﴿۱﴾ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو؛ بلکہ نیک وہ ہے جو اللہ کا ڈر رکھتا ہو، گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو، ﴿۲﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو؛ تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۱۸۹﴾ اور جو لوگ تم سے برسر پیکار ہیں، ان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اور زیادتی نہ کرو، کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۹۰﴾

← حاصل کرلے، تو محض عدالت کے فیصلہ کی وجہ سے وہ مال اس کے حق میں حلال نہ ہوگا؛ بلکہ حرام ہی رہے گا؛ اسی کو فقہاء نے اپنی زبان میں لکھا ہے کہ ''قاضی کا فیصلہ ظاہراً نافذ ہوگا، باطناً نافذ نہ ہوگا''۔ (دیکھئے: البحر الرائق: ۶/ ۴۴۵، ردالمحتار: ۸/ ۳۹)

﴿۱﴾ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ چاند کیوں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ سورج کا حجم ہمیشہ یکساں نظر آتا ہے؛ اس لئے تم سورج سے تاریخ معلوم نہیں کر سکتے، چاند کے حجم میں ہر رات فرق واقع ہوتا رہتا ہے، اس سے تم کو مہینوں کے آنے جانے کا اور تاریخوں کا علم ہوتا ہے، زمانۂ قدیم میں تاریخوں کے جاننے کا یہی ایک ذریعہ تھا، حج کا خاص طور پر ذکر فرما دیا گیا، کہ ایک تو عرب میں حج کی دینی ومعاشی ہر دو اعتبار سے بڑی اہمیت تھی، دوسرے: اس جانب متوجہ فرمایا گیا کہ کسی بھی مسئلہ پر صرف دنیوی مفاد کی نسبت سے غور کرنے کا ذہن نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ اس کے دینی مفادات اور نقصانات پر بھی نظر ہونی چاہئے۔

﴿۲﴾ اسلام سے پہلے عربوں میں ایک عجیب رواج یہ تھا کہ احرام باندھنے کے بعد اگر گھر میں داخل ہونا ہوتا، تو دروازہ سے داخل نہ ہوتے؛ بلکہ پشت کی جانب سے دیوار اور چھت پھاند کر یا دیوار میں نقب لگا کر داخل ہوتے، اسلام ایسی نامعقول رسمی باتوں کا قائل نہیں، اس آیت میں اسی طرز عمل سے منع فرمایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ گھر کے ''دروازے'' سے بچنا کوئی نیکی نہیں؛ بلکہ اصل نیکی گناہوں سے بچنا اور تقویٰ اختیار کرنا ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت میں جنگ سے متعلق تین احکام دیئے گئے ہیں: اول یہ کہ جنگ ان لوگوں سے کی جائے جو خود آمادۂ جنگ ہوں، جو صلح چاہتے ہوں یا جن سے صلح ہو چکی ہے، ان سے جنگ کا حکم نہیں، دوسرے: جنگ اللہ کے لئے ہو اور دین کی سربلندی مقصود ہو، مال و دولت، عزت و جاہ اور محض ملک و زمین کا حاصل کرنا مقصود نہ ہو، تیسرے: جنگ میں اُصولِ جنگ کی خلاف ورزی اور زیادتی روا نہیں، یعنی عورتوں، بچوں، سن رسیدہ بوڑھوں، اپاہجوں اور معذوروں وغیرہ کو قتل نہ کیا جائے، احادیث میں بھی اس کا ذکر ہے، (سنن ابی داؤد عن عبد اللہ بن عمر، باب فی قتل النساء، حدیث نمبر: ۲۶۶۸، بخاری، باب قتل الصبیان، حدیث نمبر: ۳۰۱۴، مسلم: باب تحریم قتل النساء الخ، حدیث نمبر: ۴۵۴۷) ←

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ
الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ
فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ
حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾
اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا
عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

اور ان کو جہاں پاؤ مار ڈالو اور جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے، تم بھی انھیں نکال باہر کرو؛ کیوں کہ فتنہ انگیزی قتل سے بڑھ کر ہے، ﴿۱﴾ اور جب تک وہ خود تم سے جنگ نہ کریں، مسجد حرام کے پاس تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، ہاں اگر وہ خود تم سے جنگ کریں، تو تم بھی ان کو قتل کرو، ﴿۲﴾ ایمان نہ لانے والوں کی سزا یہی ہے ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں تو اللہ معاف کرنے والے نہایت مہربان ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور جب تک فتنہ ختم نہ ہوجائے اور دین اللہ ہی کے لئے نہ ہوجائے، ان سے جنگ کرتے رہو، ہاں، اگر وہ باز آجائیں، تو سوائے ظالموں کے کسی پر زیادتی نہ کی جائے ﴿۱۹۳﴾ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ ہے اور ادب و حرمت کا پاس رکھنے میں بھی برابری ہے، تو جو تم پر (حرام مہینہ میں) زیادتی کرے، اس کی زیادتی کے مطابق تم بھی بدلہ لو، ﴿۳﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ ﴿۱۹۴﴾

← خاص کر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایات میں اس کی صراحت موجود ہے (موسوعہ آثار الصحابہ: ۴۴/۱) اور فقہاء نے بھی تفصیل سے اس پر گفتگو کی ہے — "لا تعتدوا" کا منشاء مفسرین کے نزدیک یہی ہے۔

﴿۱﴾ یہ حکم مشرکین مکہ کے بارے میں ہے کہ ایک تو انھوں نے مسلمانوں کو بے گھر کر دیا ہے، دوسرے مسلمانوں کے خلاف مسلسل جنگ کی تدبیریں کر رہے ہیں، بدر، اُحد اور احزاب تینوں جنگوں میں جارحیت انھیں کی طرف سے ہوئی، اس لئے تم بھی ان سے جنگ کرو اور جیسے انھوں نے تم کو مکہ سے نکال دیا ہے، تم بھی ان کو مکہ سے بے دخل کر دو، اسلام کی مسلسل مخالفت اور رکاوٹ مکہ والوں کی فتنہ انگیزی تھی، نیز جبر و دباؤ اور لوگوں سے ان کی آزادی کو سلب کر لینا ایسا جرم ہے کہ ایسے مجرمین لائق قتل ہیں، اس سے اگر چہ چند اشخاص کی جان جائے گی، مگر فتنہ کا استیصال ہوجائے گا اور پورے سماج کو راحت حاصل ہوگی۔

﴿۲﴾ 'حرم' کا احترام عرب بھی کرتے تھے اور اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا؛ اس لئے فرمایا گیا کہ حرم میں تمہاری طرف سے جنگ کی ابتداء نہ ہونی چاہئے، ہاں، اگر وہ حملہ کریں، تو پھر مدافعانہ جنگ میں کوئی قباحت نہیں؛ کیوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں۔

﴿۳﴾ شوال، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور رجب حرام مہینے ہیں، عرب ان مہینوں کا احترام کرتے تھے اور ان میں قتل وقتال سے باز رہتے تھے، ←

عند المتقدمین

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَ اَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ
الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى یَبْلُغَ الْهَدْیُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى
مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْیَةٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۗ قفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى
الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ یَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع ۲۴ ۸ ۸

اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو،﴿۱﴾ اور اچھے کام کرتے رہو، بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں ﴿۱۹۵﴾ حج و عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو، پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو (پیش کرو)، اور جب تک قربانی اپنے ٹھکانہ پر نہ پہنچ جائے، بال نہ مونڈاؤ، ہاں! تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کو سر میں کچھ تکلیف ہو، تو (بال مونڈا لے اور) روزہ یا صدقہ یا قربانی کے ذریعہ فدیہ ادا کردے، پھر جب تم اطمینان کی حالت میں ہو،﴿۲﴾ تو جو حج کے ساتھ عمرہ کا فائدہ اُٹھائے، اس کو چاہئے کہ جو قربانی میسر ہو، کرے، جس کو قربانی (کا جانور) میسر نہ ہو، وہ تین دنوں حج کے دنوں میں روزہ رکھے اور سات روزے تمہارے واپس آجانے کے بعد، یہ پورے دس روزے ہوئے، یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے، جن کے گھر والے ''مسجد حرام'' کے پاس نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔﴿۳﴾ ﴿۱۹۶﴾

← اسلام نے بھی اس حکم کو باقی رکھا، لیکن ظاہر ہے کہ اگر دوسرا فریق ان کے احترام کی پروا کئے بغیر حملہ آور ہو جائے، تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دفاع نہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا؛ اس لئے فرمایا گیا کہ ان مہینوں کا احترام باہمی رویہ پر منحصر ہے، اگر اہل مکہ اس کا لحاظ کریں تو تم بھی جنگ سے اجتناب کرو، اور وہ جنگ کریں تو تم بھی جنگ کرو اور برابر کا معاملہ رکھو، اس ارشاد کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ رجب ۶ ہجری میں جب آپ ﷺ مسلمانوں کے ساتھ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے، تو اہل مکہ جنگ کے لئے تیار ہوگئے اور بالآخر صلح حدیبیہ ہوئی، صلح کے مطابق پھر جب ۷ ہجری میں آپ ﷺ عمرہ کے لئے تشریف لئے گئے، جسے ''عمرۃ القضاء'' کہتے ہیں تو صحابہ کو اندیشہ تھا کہ یہ حرام مہینہ ہے، اگر اہل مکہ جنگ پر اتر آئے، تو ہم کیا کریں؟ جنگ نہ کریں، تو ناحق جان جاتی ہے، جنگ کریں تو حرام مہینہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے؟ ؟ اسی کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے، —— حرام مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا یہ حکم اب بھی باقی ہے یا منسوخ ہو گیا؟ اس میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، راجح یہ ہے کہ اب بھی ان مہینوں میں اقدامی حملہ درست نہیں اور دفاعی جنگ میں مضائقہ نہیں۔ (دیکھئے: احکام القرآن للجصاص: ۱/۳۸۹-۳۹۰) ←

←﴿۱﴾ جہاد میں جہاں جان کی قربانی مطلوب ہوتی ہیں ، وہیں مال کی بھی ضرورت پڑتی ہے ،ہتھیاروں کی فراہمی ،سواری اور ذرائع حمل ونقل کا انتظام ،دشمنوں میں جاسوسوں کو بھیجنا اوران کے راز سے آگاہ ہونا وغیرہ ؛اس لئے جہاد کے ساتھ ہی اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین فرمائی گئی اور فرمایا گیا کہ ایسا نہ کروگے اور جہاد رک جائے گا ،توتم کمزور ہو جاؤ گے ،دشمن کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور بالآخر اس کا انجام دنیا وآخرت دونوں جگہ تمہاری ہلاکت ہوگی ۔

﴿۲﴾ یعنی دشمن یا کسی اور وجہ سے حج میں رکاوٹ نہ ہو۔

﴿۳﴾ اس آیت میں حج وعمرہ سے متعلق متعدد احکام دیئے گئے ہیں ،جن کا خلاصہ اس طرح ہے :

(الف) حج یا عمرہ گو نفل ہو ،شروع کرنے کے بعد ان کی تکمیل واجب ہوجاتی ہے ۔(احکام القرآن للجصاص :۱/۳۲۰)

(ب) اگر کسی کو احرام باندھنے کے بعد رکاوٹ پیدا ہوجائے ،خواہ یہ رکاوٹ دشمن سے ہو یا بیماری کی وجہ سے ، یا کسی قانونی مشکل سے ،تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ جہاں روکا جائے وہیں حلال ہوجائے ؛لیکن یہ ضروری ہے کہ قربانی کا ایک جانور حرم کو بھیج دے اور لے جانے والے سے قربانی کا وقت اور دن متعین کرلے اور متعینہ دن اور وقت پر قربانی کے بعد رکاوٹ کی جگہ ہی پر بال مونڈا کر یا ترشوا کر حلال ہوجائے ،قربانی بکرے کی بھی کافی ہے ۔(دیکھئے :اعلاء السنن :۱۰/۴۲۱،حدیث نمبر :۲۹۸۰،۲۹۸۶،۲۹۸۸)

(ج) احرام کی حالت میں بال کٹانا جائز نہیں ؛البتہ اگر بیماری یا سر میں جوں کی کثرت یا کسی اور تکلیف کی وجہ سے بال مونڈانا پڑے ،تو بال مونڈالے اور روزہ یا صدقہ یا قربانی کے ذریعہ اس کا کفارہ ادا کرے ، روزہ سے تین روزے مراد ہیں (دارقطنی ، عن کعب بن عجرۃ ﷛: نیز دیکھئے :أحکام القرآن للجصاص :۱/۳۴۱) صدقہ سے چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کی مقدار دینا مراد ہے اور قربانی سے کم سے کم بکرے کی قربانی ، گائے اِس سے بہتر اور اونٹ اُس سے بہتر ہے (أحکام القرآن للجصاص :۱/۳۴۱) ——غرض عذر کی وجہ سے بال مونڈانا باعث گناہ تو نہ ہوگا ؛لیکن جو بلا عذر بال مونڈانے کی صورت میں واجب ہوتا ہے ،وہی اب بھی واجب ہوگا۔

(د) جو لوگ حج کے ساتھ عمرہ بھی کریں ،خواہ ایک ہی احرام میں کریں ،جس کو ’’حج قران‘‘ کہتے ہیں ، یا الگ الگ احرام کے ساتھ ،جس کو ’’تمتع‘‘ کہا جاتا ہے ،تو اس پر شکرانہ کے طور پر قربانی واجب ہے ،قربانی سے مراد کم سے کم بکرے کی قربانی کرنا یا بڑے جانور میں ایک حصہ لینا ہے ۔

(ہ) اگر تمتع یا قران کریں ؛لیکن قربانی کرنے کی استطاعت نہ ہو ،تو دس روزے رکھنے ہوں گے ،تین روزے ۱۰/ذوالحجہ سے پہلے اور سات حج سے فراغت کے بعد کبھی بھی ، اگر ۹/ذوالحجہ تک تین روزے نہیں رکھ سکا ،تو امام ابوحنیفہ ﷫ کے نزدیک اب قربانی ہی کرنا ضروری ہے ، (أحکام القرآن للجصاص :۱/۳۵۷) تمتع اور قِران اُن حجاج کے لئے ہے جو حدودِ میقات سے باہر رہتے ہوں ، جو لوگ حدودِ میقات کے اندر رہتے ہوں ،ان کے لئے صرف ’’حجِ اِفراد‘‘ ہے ،پس اس آیت میں ’’مسجد حرام کے پاس‘‘ سے حدودِ میقات کے اندر رہنے والے لوگ مراد ہیں ۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

وقف النبی ﷺ

حج کے چند متعین مہینے ہیں، ﴿۱﴾ جو اِن میں (احرام باندھ کر اپنے آپ پر) حج لازم کرلے، ﴿۲﴾ تو پھر وہ حج میں نہ کوئی فحش ﴿۳﴾ بات کرے، نہ گناہ ﴿۴﴾ اور نہ جھگڑا، ﴿۵﴾ اور تم جو بھی اچھے کام کرتے ہو، اللہ اس کو جانتے ہیں اور (ہاں) راستہ کا توشہ لے لیا کرو، ﴿۶﴾ بہترین توشہ تقویٰ ہے، ﴿۷﴾ اور اے اصحابِ عقل و دانش! مجھ ہی سے ڈرتے رہا کرو۔ ﴿۱۹۷﴾

﴿۱﴾ یعنی شوال، ذوقعدہ اور یکم تا ۱۰؍ذوالحجہ — ان کو حج کا مہینہ اس لئے کہا گیا کہ ان ہی دنوں میں بلا کراہت حج کا احرام باندھا جاسکتا ہے، حنفیہ کے یہاں گو شوال سے پہلے بھی احرام باندھنے کی گنجائش ہے؛ لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔ (البحر الرائق: ۲؍۵۵۹)

﴿۲﴾ حج لازم کرنے سے مراد حج کا احرام باندھنا ہے؛ کیوں کہ احرام باندھنے کے بعد حج لازم ہوجاتا ہے۔

﴿۳﴾ ''رفث'' سے ہر وہ شہوانی عمل مراد ہے جو مرد کسی عورت سے کرسکتا ہے، خواہ زبان سے ہو جیسے فحش مذاق، ہاتھ اور اعضاء سے ہو، جیسے بوس و کنار، یا ہم بستری، (احکام القرآن لابن العربی: ۱؍۱۳۲، البحر الرائق: ۲؍۵۶۶) ہم بستری تو حج ہی فاسد کردے گا، باقی افعال بھی حد درجہ مکروہ ہیں، یہاں یہی افعال مراد ہیں۔

﴿۴﴾ فسق میں ہر طرح کا گناہ داخل ہے، چھوٹا ہو یا بڑا، حقوق اللہ سے متعلق ہو یا حقوق العباد سے۔

﴿۵﴾ حج مشقت کی عبادت ہے، مسلسل دوڑ دھوپ اور ازدحام کے باعث بڑے بڑے صابر بھی بے برداشت ہوجاتے ہیں، اس لئے خاص طور پر اس کی تلقین فرمائی گئی، جن حضرات کو حج کی سعادت حاصل ہوچکی ہے، ان کو اس حکم کی اہمیت کا خوب اندازہ ہے!

﴿۶﴾ اسلام سے پہلے بعض عرب خاص کر اہل یمن جب حج کو جاتے، تو توشۂ سفر ساتھ رکھنا خلافِ ادب اور خلافِ توکل سمجھتے اور مکہ آکر لوگوں سے بھیک مانگا کرتے، اسلام ایسے ''توکل'' کا قائل نہیں، توکل یہ ہے کہ دنیا کے اسباب کو اختیار کیا جائے، اس کے بعد اللہ کے فیصلہ پر راضی رہا جائے؛ اسی لئے قرآن مجید نے اس کو منع کیا ہے، ہندوستان میں بھی بعض مذہبی پیشوا کھانے پینے کی چیز ساتھ لے کر چلنے کو دینداری کے خلاف سمجھتے ہیں اور لوگوں سے ''دکھشنا'' (نذرانہ) لے کر اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں، اسلام ایسی نامعقول باتوں کا قائل نہیں۔

﴿۷﴾ یعنی کھانے کے توشہ کے ساتھ 'عمل کا توشہ' بھی ساتھ رہے، — بعض مفسرین کے نزدیک یہاں تقویٰ کے معنی بچنے کے ہیں کہ دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچو۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَ اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَ اِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

تم پر (حج کے موقع سے) اپنے رب کی روزی تلاش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، ﴿۱﴾ پھر جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو ''مشعرِ حرام'' کے پاس اللہ کا ذکر کیا کرو، ﴿۲﴾ اور ذکر بھی اس طرح کرو، جس طرح اللہ نے بتایا ہے، ﴿۳﴾ اور یقیناً اس سے پہلے تم (اس سلسلہ میں) صحیح راستہ سے ہٹے ہوئے تھے ﴿۱۹۸﴾ پھر جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں تم بھی (وہاں جاکر) وہیں سے واپس آؤ، ﴿۴﴾ اور اللہ سے مغفرت چاہتے رہو، بے شک اللہ درگذر کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔ ﴿۱۹۹﴾

﴿۱﴾ حج جہاں ایک عبادت ہے، وہیں قدیم زمانہ میں عربوں کے لئے یہ تجارت اور کاروبار کا بھی سنہرا موقع ہوتا تھا اور اہل مکہ کی معیشت تو بہت کچھ اسی سے متعلق تھی، اسلام کے آنے کے بعد حج کے موقع سے تجارت کرنے میں مسلمانوں کو تامل تھا، کہ کہیں یہ اخلاص کے خلاف نہ ہو اور دین کے ساتھ دنیا کی آمیزش نہ شمار کی جائے، قرآن مجید واضح کر رہا ہے کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور ضمناً تجارت بھی کرلی جائے، تو اس میں حرج نہیں، اسلام کا اعتدال و توازن دیکھئے کہ یہاں مال کو ''فضل'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، فضل کے معنی اللہ کے انعام کے ہیں، گویا حلال طریقہ سے مال حاصل کرنا انعامِ خداوندی کو حاصل کرنا ہے، نہ گناہ ہے اور نہ خدا کے پاس درجہ و مقام کو گھٹانے والا۔

﴿۲﴾ ''مشعرِ حرام'' مزدلفہ کا ایک پہاڑ ہے، رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں اسی جگہ وقوف فرمایا تھا؛ (بخاری، باب من قدم ضعفة بلیل الخ، حدیث نمبر: ۱۶۷۶) اس لئے یوں تو مزدلفہ میں سوائے 'وادئ محسر' کے کہیں بھی وقوف کرلیا جائے کافی ہے؛ لیکن اس جگہ وقوف کرنا اور ذکر و دُعاء کا اہتمام رکھنا افضل ہے۔

﴿۳﴾ یعنی ذکر تو مشرکین بھی کیا کرتے تھے؛ مگر شرک کے ساتھ، تم ہدایت ربانی کے مطابق توحید کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔

﴿۴﴾ 'مزدلفہ' تک کا حصہ حدودِ حرم کے اندر ہے اور 'عرفات' حرم سے باہر واقع ہے، قریش چوں کہ حرم میں سکونت پذیر تھے؛ اس لئے اسلام سے پہلے انھوں نے اپنے لئے یہ امتیاز اختیار کرلیا تھا کہ تمام حاجی تو عرفات جاتے تھے، یہ مزدلفہ میں رہ جاتے تھے، حدودِ حرم سے باہر نہ جاتے تھے اور عرفات جانے کو اپنے لئے کسرِ شان تصور کرتے تھے، (بخاری عن عائشہ، باب: ثم أفیضوا الخ، حدیث نمبر: ۴۵۲۰) اسلام نے اس تکبر اور امتیاز پر مبنی عمل کی مذمت کی، اس کو صحیح راستہ سے ہٹا ہوا طریقہ قرار دیا، یہاں تک کہ عرفات میں 'وقوف' کو حج کا رکن اعظم بنا دیا، جہاں جائے بغیر حج ہی نہیں ہوسکتا، آیت میں یہی حکم دیا جا رہا ہے کہ جیسے دوسرے حجاج عرفات جاکر پھر طوافِ زیارت کے لئے مکہ کی طرف واپس آتے ہیں، قریش کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ
مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ
اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا
كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ
يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا
اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

نیز جب حج کے افعال ادا کرلو، تو جیسے (اسلام سے پہلے) اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر تم اللہ کو یاد کرو﴿۱﴾ پھر کچھ لوگ تو وہ ہیں جو کہتے ہیں: ''اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں دے دیجئے'' اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے ﴿۲۰۰﴾ اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں: ''ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا کی بھی بھلائی عطا فرمایئے اور آخرت کی بھی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے!!''﴿۲﴾ ﴿۲۰۱﴾ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے اعمال کی وجہ سے ﴿۳﴾ (آخرت میں) حصہ ملے گا اور اللہ جلد حساب لے لیں گے ﴿۴﴾ ﴿۲۰۲﴾ اور گنتی کے (اِن) چند دنوں میں اللہ کا ذکر کرتے رہو، پھر اگر کوئی شخص جلد 'دو ہی دنوں' میں چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو (تیسرے دن بھی) رہ جائے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں؛﴿۵﴾ یہ اس کے لئے ہے جو ڈرتا رہے، ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم سب اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے۔ ﴿۲۰۳﴾

﴿۱﴾ افعالِ حج ادا کرنے سے مراد حج کے اہم افعال وقوفِ عرفہ، وقوفِ مزدلفہ، قربانی اور حلق یا قصر، نیز طوافِ زیارت ہیں کہ ۱۰/ذوالحجہ کو حجاج ان کاموں سے فارغ ہوجاتے ہیں، اب ۱۲ یا ۱۳/ذوالحجہ تک جو منیٰ کا قیام ہے، اسلام سے پہلے عرب ان دنوں میں اپنے قبیلہ و خاندان اور آباء واجداد کی تعریف میں خطبے دیتے اور اشعار پڑھا کرتے تھے، ایسا نسلی و خاندانی فخر ومباہات اور عُجب وتکبر ظاہر ہے کہ دینِ حق کے مزاج کے بالکل ہی مغائر ہے؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ اب ان دنوں میں ان نامناسب باتوں کی بجائے اللہ کا ذکر کرو اور اسی کی بڑائی بیان کرو۔

﴿۲﴾ گویا مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خدا سے دین و دنیا دونوں کی بھلائی کے طالب ہوتے ہیں، صرف دنیا کے لئے دُعاء کرنا، آخرت پر ایمان سے محرومی کی دلیل ہے اور صرف آخرت طلب کرنا اور دنیا کے بارے میں خدا سے سوال نہ کرنا اللہ سے ایک گونہ بے نیازی ہے؛ اس لئے یہ دونوں ہی باتیں مذموم ہیں، انبیاء اور اللہ کے نیک بندوں نے دونوں چیزیں اللہ ہی سے مانگی ہیں۔

﴿۳﴾ عربی زبان کی رو سے یہاں ''مِنْ'' سبب کے معنی میں ہے، اکثر مفسرین نے یہی لکھا ہے۔

﴿۴﴾ اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ حساب لیں گے تو حساب لینے میں زیادہ وقت نہ لگے گا، بہت جلد حساب ہوجائے گا، دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کو دور نہ سمجھو، جلد ہی آئے گی اور جلد ہی حساب وکتاب ہوجائے گا۔ ←

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

بعض لوگ وہ ہیں کہ دنیوی زندگی میں آپ کو اُن کی بات بھلی لگتی ہے، وہ اپنے دل کے حال پر اللہ کو گواہ بھی بناتے ہیں؛ حالاں کہ وہ سخت ترین دشمن ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۰۴﴾ جب وہ حکومت پالیتے ہیں ﴿۲﴾ تو زمین میں اس بات کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں اور کھیتوں اور جانوروں کو ہلاک و برباد کردیں ﴿۳﴾ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتے ۔ ﴿۲۰۵﴾

← ﴿۵﴾ اس فقرہ میں تین باتیں بتائی گئیں، اول یہ کہ ۱۱، ۱۲ / ذوالحجہ کو قیامِ 'منیٰ' کے ایام میں حجاج کا خاص عمل ذکر اور تکبیر تشریق کا اہتمام ہے، ''ایام معدودات'' سے ایام تشریق ہی مراد ہیں، دوسرے: منیٰ میں صرف ۱۱-۱۲ / کا قیام بھی کافی ہے، اگر ۱۲ / کو نکلنا ہو تو غروبِ آفتاب سے پہلے نکل جانا بہتر ہے، اگر ۱۳ / کی صبح منیٰ میں ہوگئی، تو پھر ۱۳ / کو بھی منیٰ میں رمی واجب ہوجائے گی، یہ حنفیہ کی رائے ہے، دوسرے فقہاء کے نزدیک اگر ۱۲ / کا آفتاب منیٰ میں غروب ہوگیا، تو اب ۱۳ / کا وقوف اور اس میں رمی کرنا لازم ہوجائے گا (**تحفة الفقهاء**: ۱/ ۴۰۹)، تیسرے: اگر ۱۳ / ذوالحجہ کو منیٰ میں ٹھہر کر رمی کرکے آنا چاہے تو یہ بھی درست ہے؛ بلکہ افضل ہے، بدعت اور دین میں اضافہ نہیں ہے۔

﴿۱﴾ یعنی دنیا میں ان کی چکنی چپڑی بات اچھی لگتی ہے، ہر بات پر خدا کی قسم کھا کر اور خدا کو گواہ بنا کر وہ اپنی بات کو اور بھی تقویت پہنچاتے اور متاثر کرتے ہیں اور آپ فطری طور پر اس سے متاثر ہوجاتے ہیں، بہر حال آیت سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اس شخص کے اندرونی احوال سے واقف نہ تھے، اس سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ غیب کا علم نہیں رکھتے تھے، ورنہ یہ غلط فہمی نہیں ہوتی —— ''الد الخصام'' کے معنیٰ ''سخت جھگڑالو'' کے بھی ہیں۔

﴿۲﴾ ''تولی'' کے معنی پیٹھ پھیرنے کے بھی ہوسکتے ہیں، کہ آپ کے پاس سے پیٹھ پھیرتے یعنی واپس ہوجاتے ہیں، تو مفسدانہ کارروائی میں لگ جاتے ہیں اور اگر عربی گرامر کی رُو سے یہ لفظ ''ولایت'' سے ہو تو حکومت پانے اور حکمراں بن جانے کا معنی ہوگا، شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ اور شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ وغیرہ نے یہی معنی مراد لیا ہے، سلف سے بھی دونوں تفسیریں منقول ہیں، اخنس بن شریق نے بنوثقیف پر شب خوں مار کر بڑی لوٹ مار مچائی تھی، کھیتیاں جلادی تھیں، جانور ہلاک کردیئے تھے اور انسان کو بھی نہیں چھوڑا تھا، آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

﴿۳﴾ یہ ترجمہ اکثر مفسرین کی رائے پر ہے، بعض اہل علم نے ''حرث'' (کھیتی) سے ''عورت'' اور ''نسل'' سے ''انسان'' مراد لئے ہیں۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ۝۲۰۶ وَمِنَ
النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ۝۲۰۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ
اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ کَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَـكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ۝۲۰۸
فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۰۹

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو غرور ان کو گناہ پر کمربستہ رکھتا ہے، ﴿۱﴾ ان کے لئے دوزخ ہی کافی ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے! ۝۲۰۶ اور بعض وہ لوگ (بھی) ہیں جو اپنی جان تک اللہ کی خوشنودی کی نذر کردیتے ہیں ﴿۲﴾ اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہیں ۝۲۰۷ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿۳﴾ ۝۲۰۸ پھر اگر کھلی ہوئی دلیلیں آجانے کے بعد بھی تم پھسل گئے تو جان لو کہ اللہ بہت زبردست اور حکمت والے ہیں۔ ۝۲۰۹

﴿۱﴾ قبیلۂ بنوثقیف کا ایک بااثر آدمی ''اخنس بن شریق'' تھا، بدباطن تھا؛ لیکن اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا تھا اور گفتگو اتنی میٹھی کرتا تھا کہ آپ ﷺ اس کو مخلص سمجھتے تھے، دراصل اسی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؛ (الجامع لأحکام القرآن: ۱/۱۸۰) لیکن مقصود محض ایک شخص کے حال کا بیان کرنا نہیں؛ بلکہ ایسے تمام بدباطن اور غیر مخلص لوگ اس کے مصداق ہیں، جو ابتداءِ اسلام میں بھی تھے اور ہر زمانہ میں اور ہر جگہ ایسے لوگ موجود رہا کئے ہیں۔

﴿۲﴾ اصل معنی ہے ''خوشنودی کے بدلہ بیچ لیتے'' ہیں؛ لیکن مقصود اللہ کی خوشنودی کے بدلہ جان تک سپرد کردینا ہے؛ کیوں کہ جب آدمی کوئی چیز بیچ دے تو خود اس کا مالک نہیں رہتا اور جلد سے جلد وہ چیز مالک کو سونپ دیتا ہے، اس میں منافقین کے مقابلہ میں مخلص مسلمانوں کا کردار پیش کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ بعض یہود مسلمان ہوئے؛ لیکن وہ چاہتے تھے کہ شریعت اسلامی کے ساتھ تورات کے احکام کو بھی ساتھ لے کر چلیں، جیسے ہفتہ کے دن کی تعظیم کریں اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے اجتناب کریں، یہاں اس کو منع فرمایا گیا ہے کہ جب اسلام لاؤ تو مکمل طور پر اسلام کے احکام کو قبول کرو، اسلام محض ایک طریقۂ عبادت نہیں؛ بلکہ پورا نظامِ حیات ہے، اعتقادات، عبادات، معاشرت اور شخصی زندگی، معاشی واقتصادی نظام، سیاست اور طریقۂ حکومت، بین ملکی تعلقات اور اخلاقی تعلیمات، انسانی زندگی کا کوئی شعبہ نہیں، جس میں اسلام نے رہنمائی نہ کی ہو، ان سب میں شریعت اسلامی کو بے کم وکاست ماننا، نہ حرام کو حلال کرنا اور نہ حلال کو حرام، یہ اسلام میں پورا پورا داخل ہونا ہے اور اسلام کو جزوی طور پر ماننا اور بعض شعبہ ہائے زندگی میں دوسرے مذہب یا نظام حیات کی افادیت کا قائل ہونا اور اسے تسلیم کرنا شیطان کی پیروی ہے؛ کیوں کہ شیطان نے بھی اللہ کے تمام احکام کا انکار نہیں کیا تھا؛ بلکہ اس نے صرف حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے ہی پر اعتراض کیا تھا۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَ اِلَى اللّٰهِ
تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝٢١٠ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَ مَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ ع ٢٥ ١٤ ٩
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢١١ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا
وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ وقف لازم
يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٢١٢

کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس اللہ اور فرشتے ابر کے سائبانوں میں آجائیں اور قصہ (ہی) طے ہوجائے ؟ ﴿١﴾ اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور رُجوع کئے جائیں گے ﴿٢١٠﴾ (اے رسول !) آپ بنی اسرائیل سے پوچھئے کہ ہم نے ان کو کس قدر کھلی ہوئی نشانیاں دی تھیں، ﴿٢﴾ اور جو کوئی اللہ کی نعمت حاصل ہونے کے بعد اس کو بدل ڈالے، ﴿٣﴾ تو (جان لو کہ) اللہ کا عذاب بہت سخت ہے ﴿٢١١﴾ کافروں کے لئے دنیوی زندگی بڑی خوشنما بنادی گئی ہے، اور یہ لوگ اہل ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں ؛ حالاں کہ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، وہ قیامت کے دن ان سے بلند درجہ پر ہوں گے اور (دنیا میں) اللہ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دے دیتے ہیں ۔ ﴿٤﴾ ﴿٢١٢﴾

﴿١﴾ یعنی کیا اس بات کا انتظار ہے کہ خدا اور فرشتے آئیں اور ابھی سے حساب و کتاب کر کے سارے قصے قضا یا چکا دیں؟ اس آیت میں خاص طور پر یہودیوں سے خطاب ہے، یہود اللہ کے لئے جسم کے قائل ہیں اور بائبل کے عہد عتیق میں جا بجا خدا کو بادل پر سوار دیکھا یا گیا ہے (دیکھئے: زبور: ١٠٤: ٣، یسعیاہ: ١٩: ١) قرآن نے یہاں اُن کے اس عقیدہ کی تردید پر توجہ کئے بغیر ان کے خیالات کے مطابق دریافت کیا ہے کہ کیا تم خود اللہ کی آمد اور اس کے عذاب کے منتظر ہو؟

﴿٢﴾ یعنی تورات، بنی اسرائیل میں مسلسل انبیاء کی بعثت اور ان کے ہاتھوں معجزات کا ظہور وغیرہ۔

﴿٣﴾ کسی قوم کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت اس کا کتاب اللہ کا حامل ہونا ہے، بنی اسرائیل کو بار بار اس کا شرف بخشا گیا؛ لیکن وہ ملاوٹ کر کے اس عظیم نعمت میں تبدیلی کر لیتے اور کتاب اللہ کی حفاظت کرنے کی بجائے اس کو ضائع کرنے کے درپے ہوتے۔

﴿٤﴾ مکہ میں وہاں کے سردار اور مدینہ میں یہودیوں اور منافقین کے سردار و سرمایہ دار غریب مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنی دولت و ثروت پر نازاں تھے، قرآن مجید نے یہاں ان ہی کے طرزِ عمل پر گفتگو کی ہے کہ دنیا میں ان کو جو کچھ سامانِ عیش حاصل ہے، وہ محض اللہ کی طرف سے ڈھیل ہے، یہ خدا کے پاس مقبولیت کی دلیل نہیں ؛ کیوں کہ دنیا میں اللہ کی سنت یہی ہے کہ نافرمانوں کو بھی وسیع رزق عطا فرما دیتے ہیں، اصل منزل آخرت ہے اور وہاں یہی غریب و مفلس اور فقیر و قلاش مسلمان بلند درجات پر فائز ہوں گے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ
اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ
تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ
وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ
قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

(ایک زمانہ میں) تمام لوگ ایک ہی دین پر تھے ،﴿۱﴾ پھر (جب لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبروں کو بھیجا اور ان کے ساتھ حق کی حامل رہنما کتاب نازل فرمائی ؛ تا کہ جن باتوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان اختلاف تھا، ان میں اللہ فیصلہ کر دیں ،﴿۲﴾ اور یہ اختلاف محض باہمی ضد کی وجہ سے کھلی ہوئی دلیلیں آجانے کے بعد خود ان لوگوں نے کیا جن کو کتاب عطا کی گئی تھی ،﴿۳﴾ تو جن باتوں کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے تھے ، اللہ نے اپنی مرضی سے ان کے سلسلہ میں مومنوں کو حق کی رہنمائی فرمائی اور اللہ جسے چاہتے ہیں راہِ راست بتا دیتے ہیں ﴿۲۱۳﴾ (مسلمانو!) کیا تمہارا خیال ہے کہ تم ان آزمائشوں سے گذرے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤ گے ، جن سے تم سے پہلے کی اُمتیں گذر چکی ہیں ؟ ان کو تنگی اور سختی پیش آئی اور وہ ہلا ڈالے گئے ؛ یہاں تک کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے بول اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی ؟﴿۴﴾ (ان سے کہا گیا) سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے ۔ ﴿۲۱۴﴾

﴿۱﴾ یعنی ابتداءً تمام انسانیت توحید اور شریعت الٰہی پر قائم تھی ؛ کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام خود نبی برحق تھے، حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ آتے آتے لوگوں میں شرک کی بیماری پیدا ہوئی ؛ گویا مذہبی تاریخ کی رو سے انسانیت کا اصل مذہب توحید ہے نہ کہ شرک ۔

﴿۲﴾ بعض مفسرین نے ''آنے والا رسول فیصلہ کر دے'' اور بعض نے ''نازل ہونے والی کتاب فیصلہ کر دے'' مراد لیا ہے اور اس کی بھی گنجائش ہے، حاصل سب کا ایک ہی ہے ؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ دونوں احکام ربانی ہی کے ترجمان ہوتے ہیں ۔

﴿۳﴾ یعنی یہودی وعیسائی علماء ومشائخ جو کتابِ آسمانی کا علم رکھتے تھے ،—— حق کا انکار تو یہودی وعیسائی عوام نے بھی کیا تھا ؛ لیکن خاص طور پر علماء ومشائخ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ دعوتِ حق کا انکار پہلے یہی کرتے ہیں ، پھر ان کا دیکھا دیکھی اور سُنا سُنی عوام بھی انکار پر اتر آتے ہیں ۔

﴿۴﴾ مدینہ میں مسلمان سہ رُخی مخالفت سے دو چار تھے، مشرکین مکہ، یہود اور منافقین، غزوۂ احزاب نے ان تمام مخالفین کو ایک ←

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا
وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ ع ۲۶ ۱۰
فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ق
وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ
حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ
كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے کہ ''جو کچھ بھی تم مال خرچ کرو، وہ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے'' ﴿۱﴾ اور تم جو بھی نیکی کرو گے اللہ اس سے خوب واقف ہیں ﴿۲۱۵﴾ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے جو تم پر گراں ہے، ممکن ہے کہ ایک چیز تم کو بری لگے؛ حالاں کہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند ہو؛ حالاں کہ وہ تمہارے حق میں بہتر نہ ہو، اور اللہ جانتے ہیں، تم نہیں جانتے ﴿۲﴾ ﴿۲۱۶﴾ لوگ آپ سے حرام مہینوں میں جہاد کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ: ''اس میں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کے راستہ سے روکنا، اللہ کو نہ ماننا، مسجد حرام سے روکنا اور یہاں رہنے والوں کو یہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے بھی بڑا جرم ہے، ﴿۳﴾ یہ لوگ تم لوگوں سے لڑتے ہی رہیں گے، یہاں تک کہ اگر قابو پا جائیں تو تم کو تمہارے دین ہی سے پھیر دیں اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جو شخص دین سے مرتد ہو جائے اور کفر کی حالت میں مرے، تو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اس کے (نیک) اعمال غارت ہو جائیں گے، ﴿۴﴾ ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ ﴿۲۱۷﴾

← پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا اور مسلمان نہایت سخت حالات سے دوچار تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، (الجامع لأحکام القرآن: ۱/۱۸۰) بہر حال اس میں مسلمانوں کو تسلی اور ان کی دلداری ہے کہ یہ ابتلائیں ایک وقتی طوفان ہیں جو گذر جائے گا اور پہلی اُمتیں بھی اس سے دوچار ہو چکی ہیں، انجامِ کار فتح اہل حق ہی کی ہوگی، —— رسول اور مومنوں کا یہ کہنا کہ کب اللہ کی مدد آئے گی؟ بطورِ شکوہ وگلہ کے نہ تھا؛ بلکہ الحاح والتجاء کے طور پر تھا، جو نبی کی شان کے عین مطابق ہے۔ ←

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

بے شک جو ایمان لائے ، جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ، یہی رحمت خداوندی کے (سچے) اُمیدوار ہیں اور اللہ بڑے بخشنے والے اور نہایت مہربان ہیں ۔ ﴿۲۱۸﴾

←﴿۱﴾ عمرو بن جموح نامی شخص نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے مال میں سے کتنا خرچ کریں اور کس مصرف میں؟ یہ آیت اسی موقع سے نازل ہوئی ، (**الجامع لأحكام القرآن**: ۱/۱۸۱) —— انفاق کی مقدار کو قرآن نے بیان نہیں کیا کہ یہ ہر شخص کے حوصلہ وہمت پر موقوف ہے ؛ البتہ مصارف کی رہنمائی کردی گئی ؛ اس لئے کہ انفاق میں اصل اہمیت اخلاص نیت اور صحیح مصرف کے انتخاب کی ہے ۔

﴿۲﴾ اس میں ایک اہم اُصولی بات بتادی گئی ہے کہ احکام شرعیہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کا سمجھ میں آجانا ضروری نہیں ، شریعت کا ہر حکم کسی مصلحت اور حکمت ہی پر مبنی ہے ؛ لیکن بعض اوقات انسانی عقل اس کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے ، شریعت کا کوئی حکم '' خلافِ عقل '' تو نہیں ہوسکتا ؛ البتہ '' ماوراء عقل '' ہوسکتا ہے ؛ اس لئے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو کسی بحث اور چون و چرا کے بغیر تسلیم کر لینا چاہئے ۔

﴿۳﴾ رسول اللہ ﷺ نے مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک دستہ روانہ فرمایا ، جمادی الاخریٰ کے آخری دن اس کا مقابلہ مکہ کے ایک مشرک عمرو بن حضرمی سے ہوگیا ، وہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا ، بعد کو معلوم ہوا کہ جس دن قتل وقتال کا یہ واقعہ پیش آیا ، وہ پہلی رجب تھی ، نہ کہ ۳۰/ جمادی الاخریٰ ، یعنی حرام مہینہ شروع ہوچکا تھا ، اس کو لے کر اہل مکہ نے مسلمانوں پر طنز وتعریض شروع کردیا ، کہ مسلمان حرام مہینوں کا بھی احترام نہیں کرتے ، آیت میں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ قصداً حرام مہینہ میں جنگ کرنا گناہ ہے ؛ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا ، کفر کرنا ، مسجد حرام سے روکنا اور مسلمانوں کو ان کے شہر سے نکال دینا اس سے بھی بڑا گناہ ہے ، جس کا ارتکاب تم لوگوں نے کیا ہے ۔

(**جامع المسانيد والسنن**: ۳۰/۳۰، حدیث نمبر: ۲۴۲۷ ، ابن کثیر: ۱/۴۵۲)

﴿۴﴾ معلوم ہوا کہ ارتداد کی وجہ سے زمانۂ اسلام کی نیکیاں اکارت ہوجاتی ہیں ، اب اِن نیکیوں کا بھی کوئی اجر نہیں ہوگا ؛ اس لئے آخرت میں ہمیشہ کے لئے دوزخ ہی ایسے بدتوفیقوں کی جگہ ہے ، یہ تو اخروی سزا ہے ، دنیا کے اعتبار سے اسلامی حکومت میں مردوں کے لئے ارتداد کی سزا قتل ہے اور عورتوں کے لئے قید ، جو حدیث صحیح سے ثابت ہے ، (**مسند أحمد**: ۱/۳۲۲) نیز یہ مختلف سندوں سے مروی ہونے کے اعتبار سے قریب قریب تواتر کے درجہ میں ہے اور یہ سزا صرف اسلام ہی نے مقرر نہیں کی ہے ، پہلی آسمانی کتابوں میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہی مقرر کی گئی تھی ۔ (ملاحظہ ہو: **استثناء**: ۱۳/۶-۱۰)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ

لوگ آپ سے شراب اور جوا﴿۱﴾ کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیں کہ: ''ان دونوں میں بڑا گناہ ہے،﴿۲﴾ اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں؛ لیکن ان کا گناہ ان کے فائدوں سے بڑھ کر ہے''﴿۳﴾ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (نیکی کے کاموں میں) کتنا خرچ کریں؟ آپ فرمادیں: جو اپنے خرچ سے بچ رہے!﴿۴﴾ اللہ تم پر کھول کھول کر احکام بیان کرتے ہیں﴿۲۱۹﴾؛ تاکہ تم دنیا و آخرت کے بارے میں سوچ لیا کرو۔

﴿۱﴾ مال کے مالک بننے کو ایسی شرط سے متعلق کیا جائے جس کے پائے جانے اور نہ پائے جانے کا یکساں احتمال ہو، یہ ''قمار'' یا ''میسر'' ہے، گویا ''جوا'' میں کسی معقول سبب کے بغیر محض بخت و اتفاق کی بنا پر یا تو غیر معمولی نفع حاصل ہوجاتا ہے یا آدمی اصل سرمایہ سے بھی محروم ہوجاتا ہے، اسی طرح کھیل میں دونوں فریق کا جیت ہار پر شرط باندھ کر کھیلنا بھی جوا ہے، ''جوا'' سے فائدہ یہ ہے کہ جیتنے والے کو بلا محنت ڈھیر سارا مال حاصل ہوجاتا ہے اور نقصان یہ ہے کہ تن آسانی پیدا ہوجاتی ہے اور یہ باہمی عداوت اور دشمنی کا باعث بنتا ہے۔

﴿۲﴾ یہاں گو قرآن نے صراحتاً ''حرام'' نہیں کہا ہے؛ لیکن جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ''حرام'' کے لفظ سے بھی زیادہ تاکیدی ہے، ایک تو ''اِثم'' کہا، جس کے معنی گناہ کے ہیں اور قرآن میں ''شرک'' تک کو اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، (النساء:۴۸) پھر اس کی صفت ''کبیر'' لائی گئی، یعنی ''بڑا گناہ'' گویا یہ حرام چیزوں میں بھی شدید درجہ کا حرام فعل ہے۔

﴿۳﴾ اس سے ایک شرعی اُصول معلوم ہوا کہ کسی شئ کے حلال و حرام اور جائز و ناجائز ہونے میں اس بات کا اعتبار ہے کہ اس کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصانات اور وہ زیادہ تر خیر اور نیکی کا ذریعہ بنتا ہے یا شر اور برائی کا؟ جس چیز کے فوائد زیادہ ہوں، شریعت نے ان کو حلال کیا ہے، تمام حلال غذاؤں کا یہی معاملہ ہے، یہ اور بات ہے کہ انسان کی بیماری اور کھانے میں بے اعتدالی کی وجہ سے نقصاندہ ہوجائے، اور جو چیز فی الجملہ مفید بھی ہوں؛ لیکن زیادہ نقصاندہ، وہ حرام ہیں، جیسے: خود شراب ہے، کہ شراب میں وقتی لذت و سرور کا فائدہ موجود ہے؛ لیکن صحت جسمانی کے لحاظ سے بھی اور اخلاق کے لحاظ سے بھی نقصان زیادہ ہے، اسی طرح جو چیز زیادہ تر گناہ کی طرف لے جاتی ہو، خواہ اس سے بعض اخلاقی یا علمی فوائد بھی ہوں، وہ بھی ناجائز ہیں۔

﴿۴﴾ مفسرین نے ''عفو'' کے دو معنی بتایا ہے: ایک اتنا خرچ کرنا جو مشقت و دشواری کا باعث نہ ہو ''مالا یجھد'' دوسرے: جو مقدارِ حاجت سے زیادہ ہو ''ما فضل عن قدر الحاجة'' — حاصل دونوں کا ایک ہی ہے؛ البتہ مفسرین کے الفاظ کی رعایت کرتے ہوئے اُردو ترجمہ کرنے والوں میں بعض نے ''جو آسان ہو'' سے ترجمہ کیا ہے اور بعض نے ''جو بچ رہے'' سے۔

وَ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡيَتٰمٰى ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّهُمۡ خَيۡرٌ ؕ وَ اِنۡ تُخَالِطُوۡهُمۡ فَاِخۡوَانُكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ
يَعۡلَمُ الۡمُفۡسِدَ مِنَ الۡمُصۡلِحِ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعۡنَتَكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَ لَا
تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَ لَا
تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ
اُولٰٓـئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلَى الۡجَنَّةِ وَ الۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ
لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷ ۵ ۱۱

اور یتیموں کے بارے میں (بھی) دریافت کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت کرنا بہتر ہے، اگر تم ان کو (خرچ) میں شامل رکھو تو وہ تمہارے (دینی) بھائی (ہی) ہیں اور اللہ (یتیموں کے ساتھ) خیر خواہی کا جذبہ اور بدخواہی کا ارادہ رکھنے والے سے واقف ہیں، ﴿۱﴾ اگر اللہ چاہتے تو تم کو مشقت میں ڈال دیتے؛ ﴿۲﴾ (لیکن) یقیناً اللہ زبردست بھی ہیں اور حکمت والے بھی ﴿۲۲۰﴾ اور مشرک عورتیں جب تک مسلمان نہ ہوجائیں، ان سے نکاح نہ کرو اور ایک مسلمان باندی بھی (آزاد) مشرک خاتون سے بہتر ہے، گو وہ تم کو پسند ہو، اور (مسلمان عورتوں کا) مشرک مردوں سے جب تک وہ مسلمان نہ ہوجائیں، نکاح نہ کرو گو وہ تم کو پسند ہوں؛ ﴿۳﴾ کیوں کہ یہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی توفیق دے کر جنت اور مغفرت کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ لوگوں کے لئے اپنے احکام کھول کھول کر بیان فرماتے ہیں؛ تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ ﴿۲۲۱﴾

﴿۱﴾ سورۂ نساء کی آیت نمبر: ۱۰ میں یتیموں کا مال کھا جانے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہے، صحابہ جن کے رگ و ریشہ میں خدا کا خوف رچا بسا ہوا تھا، اس حکم سے لرز اُٹھے اور یتیموں کا کھانے پکانے کا نظم بھی الگ کردیا، کہ اگر ساتھ ہی ان کا کھانا پکایا جائے، تو کیا عجیب کہ کبھی دو چار لقمہ ان کے حصہ کا کھانے میں آجائے؛ لیکن اس سے ایک تو دشواری بڑھ گئی کہ کھانا دو دو بار پکانا پڑتا، دوسرے اس میں یتیموں کا بھی نقصان تھا کہ اجتماعی کھانے میں خرچ کم آتا اور کھانا ضائع نہیں ہوتا اور الگ الگ کھانا پکے تو اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں اور بچ رہے تو ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی پس منظر میں صحابہ نے آپ ﷺ سے سوال کیا، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اصل مقصود یتیموں کے ساتھ خیر خواہی ہے، اگر ان کا بھلا ساتھ کھانے پکانے میں ہے، تو ساتھ ہی کھانا پکانا رکھنے میں کچھ حرج نہیں، پھر اگر تم ان کا کھالو اور وہ تمہارا کھالیں تو آخر تم ایک دوسرے کے دینی بھائی ہی تو ہو۔

﴿۲﴾ یعنی کھانے پکانے کا الگ الگ انتظام ضروری قرار دیدیتے۔

﴿۳﴾ اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں مختلف روایات ہیں، ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے مکہ کی ایک مشرک خاتون ''عناق'' سے نکاح کرنا چاہا، اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، (سنن ترمذی: باب ومن سورۃ النور، حدیث نمبر: ۳۱۴۷) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ یا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ایک سیاہ باندی تھی، انھوں نے اس کو ←

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، لہٰذا زمانۂ حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک عورتیں پاک نہ ہوجائیں، ان سے الگ ہی رہو (یعنی) پاک ہونے تک ان سے صحبت نہ کرو، ﴿۱﴾ پھر جب پاک ہوجائیں تو جس مقام سے اللہ نے تم کو اجازت دی ہے، اسی راستہ سے ان سے صحبت کر سکتے ہو، ﴿۲﴾ بے شک اللہ خوب توبہ کرنے والوں اور خوب پاک رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ ﴿۲۲۲﴾

← آزاد کرکے اس سے نکاح کرلیا، ان کے بعض دوستوں نے بجائے اس سیاہ فام کے کسی خوش شکل مشرک عورت سے نکاح کا مشورہ دیا، اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی؛ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۴۴، قرطبی: ۱/۱۸۹) ممکن ہے یہ دونوں واقعات اس آیت کے نازل ہونے کا سبب ہوں، بہر حال اس پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہے کہ مشرک قوموں کے نہ مردوں سے نکاح ہوسکتا ہے اور نہ عورتوں سے، البتہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح درست ہے، جس کا ذکر (المائدۃ: ۵) میں ہے — اس طرح کا حکم اسلام کی تنگ نظری نہیں ؛ بلکہ ایک مسلمان خاندان کے ایمان اور ان کی تہذیب کی حفاظت مقصود ہے ؛ کیوں کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اکثر عورتوں ہی کی راہ سے بے دینی کے فتنے سماج میں لائے گئے ہیں، اسلام سے پہلے بھی دوسرے مذاہب میں اس طرح کے احکام موجود تھے، یہودی شریعت میں اسرائیلی کا غیر اسرائیلی سے نکاح جائز نہیں، (خروج: ۳۴/۳۱) عیسائی مذہب میں غیر عیسائی سے نکاح درست نہیں، (کرنتھیوں: ۶/ ۱۴-۱۵) اور ہندو مذہب میں تو ایک ذات کے لوگوں کے لئے دوسری ذات میں بھی نکاح کی اجازت نہیں ؛ چہ جائے کہ دوسرے مذہب والوں سے۔

﴿۱﴾ عورتوں کے قریب نہ آنے کے معنی ہم بستری نہ کرنے کے ہیں، حالتِ حیض میں گویا صرف ہم بستری کی ممانعت ہے، ساتھ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، سونے اور ہم بستری کے علاوہ جنسی لذت اٹھانے کی بھی ممانعت نہیں، یہ عورتوں پر اسلام کا احسان ہے، اسلام سے پہلے عورتیں حیض کی حالت میں اچھوت بنادی جاتی تھیں، نہ کوئی ان کو ہاتھ لگاتا تھا، نہ وہ کسی کو ہاتھ لگاسکتی تھیں، تورات تو حائضہ عورت کے چھونے ؛ بلکہ اس کے بستر چھونے والے کو بھی صبح سے شام تک ناپاک قرار دیتا ہے اور اس پر بھی غسل واجب قرار دیتا ہے، (احبار: ۱۵/ ۱۹-۲۰) ہندوؤں کے یہاں اس ترقی یافتہ عہد میں بھی حائضہ کمرے سے باہر کردی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ اس فقرہ میں دو باتیں بتائی گئی ہیں: اول یہ کہ جب عورتیں حیض سے پاک ہوجائیں، تو ان سے جنسی تعلق قائم کرسکتے ہو، ''حیض'' ختم ہونے کے بعد عورت پر غسل کرنا واجب ہے ؛ تاکہ وہ نماز ادا کرسکے ؛ لیکن یہاں ''پاک ہونے'' سے حیض کا ختم ہوجانا مراد ہے، اس لئے اگر حیض ختم ہوجانے کا اطمینان ہوجائے تو گو عورت نے ابھی غسل نہ کیا ہو پھر بھی اس کے ساتھ ہم بستری کرنا جائز ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ اطمینان دو طریقوں سے حاصل ہوسکتا ہے، یا تو خون رُک جانے کے بعد عورت غسل کرلے اور غسل ←

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، تو اپنی کھیتی پر جس طرح چاہو آؤ، ﴿۱﴾ اور آئندہ کے واسطے بھی عمل کرتے رہو، اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تم لوگوں کو یقیناً اللہ سے ملنا ہے نیز ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ﴿۲۲۳﴾ اور اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں کے ذریعہ نیکی، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں رکاوٹ نہ بناؤ، ﴿۲﴾ اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۲۲۴﴾ اللہ "یمین لغو" میں تمہاری پکڑ نہیں فرمائیں گے؛ لیکن تمہارے دلوں نے جس کا ارادہ کیا ہو، اس میں گرفت فرمائیں گے، ﴿۳﴾ اور اللہ بہت درگذر کرنے والے اور بردبار ہیں۔ ﴿۲۲۵﴾

← نہ کر سکتی ہو تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے، یا ایک نماز کا وقت گذر جائے اور اس درمیان پھر خون نہ آئے، (ردالمحتار: ۱/۴۹۰) دوسرا حکم یہ ہے کہ ہم بستری فطری راستہ سے درست ہے، غیر فطری راستہ اختیار کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ "مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (جس جگہ سے اللہ نے حکم دیا ہے) کے خلاف ہے۔

﴿۱﴾ 'جس طرح چاہو' کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی کے ملاپ کے لئے کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں ہے، یہود اور بعض عرب عورت کو پیٹ کے بل لٹا کر پشت کی طرف سے ہم آغوش ہونے کو درست نہ سمجھتے تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ اس سے بھینگا بچہ پیدا ہوگا، اس کی تردید بھی مقصود ہے؛ البتہ عورت کو کھیتی کہہ کر واضح فرما دیا گیا کہ ہم بستری بہر حال آگے کے راستہ میں ہونی چاہئے، پیچھے کی راہ سے نہیں، کہ توالد و تناسل آگے کی طرف سے صحبت کرنے ہی پر موقوف ہے۔

﴿۲﴾ عربوں کا حال یہ تھا کہ کسی نیکی کے نہ کرنے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھا لیتے اور پھر کہتے کہ چوں کہ وہ ان کاموں کے نہ کرنے کی قسم کھا چکے ہیں؛ اس لئے ان کاموں میں حصہ نہیں لے سکتے؛ گویا ایک تو نیکی سے محروم رہتے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے لئے بھی اللہ تعالیٰ ہی کا نام استعمال کرتے، قرآن نے اسی کی مذمت کی ہے۔

﴿۳﴾ "لغو" اصل میں بے معنی اور بے اثر بات یا کام کو کہتے ہیں، فقہ کی اصطلاح میں قسم کی تین قسمیں ہیں: لغو، مُنعقِدہ، غُموس، (فتح القدیر: ۵/۵۴) کسی گذری ہوئی بات پر بلا ارادہ جھوٹی قسم زبان سے نکل گئی یا آئندہ کی بات پر اس طرح قسم کھا بیٹھا کہ کہنا کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ پڑا کچھ اور، یا گذری ہوئی بات کو سچ جانتے ہوئے بالا رادہ اس کے بارے میں قسم کھائی؛ لیکن حقیقت میں وہ بات خلافِ واقعہ تھی، یہ صورتیں "یمین لغو" کی ہیں، ان صورتوں میں نہ دنیا میں کفارہ واجب ہے اور نہ آخرت میں گناہ ہے، چوں کہ اس قسم پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا؛ اس لئے اس کو "لغو" کہتے ہیں، (دیکھئے: بدائع الصنائع: ۳/۸) — مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم بالا رادہ کھائی جائے، اس کو "یمین منعقدہ" کہتے ہیں، اگر قسم پوری کرے تو کچھ واجب نہیں، قسم کی ←

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

جو لوگ اپنی بیویوں سے ایلا کریں ، ان کے لئے چار ماہ رُ کے رہنا ہے؛ چنانچہ اگر انھوں نے لوٹا لیا، تو بے شک اللہ معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۲۲۶﴾ اور اگر طلاق کا ہی ارادہ کرلیا ہے تو یقیناً اللہ خوب سننے اور جاننے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۲۷﴾

← خلاف ورزی کرے تو کفارہ واجب ہوگا —— گذری ہوئی بات کے بارے میں جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا ''یمین غموس'' ہے، حنفیہ کے نزدیک اس میں کفارہ واجب نہیں؛ البتہ آخرت میں اس کا گناہ ہوگا ''مَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ '' میں قسم کی یہ دونوں صورتیں داخل ہیں۔ (بدائع الصنائع: ۸/۳)

﴿۱﴾ ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں، اسلام سے پہلے عربوں میں طلاق کا ایک طریقہ ''ایلاء'' بھی تھا، اسلام نے اس کی اصلاح کی کہ ایک تو ایلاء کو ابتداءً طلاق قرار نہ دیا؛ بلکہ ایک مدت کے بعد ہی اس سے طلاق واقع ہوتی ہے، دوسرے: اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چار ماہ مقرر کردی، چار ماہ غور وخوض اور فکر وتامل کے لئے کافی مدت ہے، اگر اس مدت کے گذرنے تک بھی شوہر نے بیوی سے رجوع نہ کیا تو علاحدگی واقع ہوجائے گی؛ تا کہ عورت اس مرد سے آزاد ہوجائے اور از سرنو اپنی زندگی شروع کرسکے، ایلاء سے متعلق جن احکام کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :

- ایلاء یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ یا کم سے کم چار ماہ، یا مطلق بلا تعیینِ مدت بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھالے، اگر چار ماہ سے کم کی قسم کھائی یا صحبت نہ کرنے کی قسم نہ کھائی؛ لیکن سفر یا کسی اور عذر کی وجہ سے چار ماہ سے زیادہ مدت تک صحبت کرنے کا موقع نہ ہوا تو یہ ''ایلاء'' نہیں ہے۔
- ایلاء میں چار ماہ کی مہلت ہے، اگر اس مہلت کے اندر لوٹا لیا (جس کو قرآن نے ''فَئ'' سے تعبیر کیا ہے) تو رشتۂ نکاح برقرار رہے گا؛ البتہ قسم کی خلاف ورزی کی وجہ سے کفارۂ قسم ادا کرنا واجب ہوگا —— ''لوٹانے'' سے مراد جماع کرنا ہے، صرف زبان سے کہہ دینا کہ ''میں نے لوٹا لیا'' کافی نہیں۔ (ردالمحتار: ۶۱/۵)
- اگر چار ماہ گذر گئے اور شوہر نے اس سے صحبت نہ کی تو چار ماہ جونہی پورے ہوئے، اس پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی، اب مرد کو اختیار نہیں کہ اس عورت کو لوٹالے؛ البتہ دوبارہ باہمی رضامندی سے نئے مہر پر نکاح کرسکتے ہیں، (ردالمحتار: ۶۰/۵) یہ تفصیل حنفیہ کی رائے پر ہے، شوافع اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک چار ماہ کی مدت گذرنے کے بعد شوہر کو لوٹانے یا طلاق دینے کا حق حاصل ہے، اس میں اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک ''فإن فاءوا'' میں ''ف'' تفسیر کے لئے ہے اور شوافع وغیرہ کے نزدیک ''تعلیق'' کے لئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۳۶۸/۳)

وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْۤ
اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ
اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ
عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ ع ۲۸ ۱۲
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ
وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

اور جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہے، وہ تین حیض تک (دوسرے نکاح سے) رکی رہیں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہوں تو ان کے لئے روا نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہے، وہ اسے چھپائیں، نیز اس مدت میں ان کے شوہر ان کو لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں؛ بشرطیکہ اصلاح مقصود ہو، ﴿۱﴾ اور جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں، ایسے ہی مردوں پر عورتوں کے حقوق بھی ہیں، ہاں؛ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے، ﴿۲﴾ اور اللہ غالب اور حکمت والے ہیں ﴿۲۲۸﴾ یہ طلاق دو بار تک ہے، اس کے بعد یا تو بھلے طریقے پر روک رکھنا ہے یا اچھے سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے، ﴿۳﴾ اور جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو، تمہارے لئے اس میں سے کچھ بھی واپس لے لینا درست نہیں، سوائے اس کے کہ تم دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدوں کو قائم نہ رکھ سکو گے، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر عورت اپنی رہائی کے لئے کچھ دے دے تو زوجین پر (اس طرح معاملہ طے کرنے میں) کچھ مضائقہ نہیں، ﴿۴﴾ یہ اللہ کی (قائم کی ہوئی) حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرنا، اور جو لوگ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدوں سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔ ﴿۲۲۹﴾

﴿۱﴾ اس فقرہ میں چار احکام دیئے گئے ہیں: اول یہ کہ طلاق کے بعد عدت واجب ہے، جو تین حیض ہے، عدت کا مقصد نسب کی حفاظت ہے، البتہ یہ تین حیض ایسی جوان عورتوں کی عدت ہے، جو حاملہ نہ ہوں، حاملہ عورتوں کی عدت بچہ پیدا ہونے تک ہے، **(الطلاق: ۴)** اور نابالغہ اور سن رسیدہ خواتین کی تین ماہ **(الطلاق: ۴)**، دوسرے: عدت کے درمیان عورت کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے نکاح سے باز رہے، تیسرے: اگر طلاق کے وقت عورت حاملہ رہی ہو تو عورت کو اس کا اظہار کر دینا چاہئے اور اپنی کیفیت کو چھپانا نہ چاہئے، چوتھے: اگر عورت کو طلاقِ رجعی دی گئی ہو، تو عدت کے درمیان شوہر یک طرفہ طور پر رجعت کرنے اور بیوی کو لوٹانے کا حق رکھتا ہے؛ لیکن شوہر پر واجب ہے کہ واقعی بہتر سلوک کے ساتھ رکھنے کا ارادہ ہے تو بیوی کو لوٹائے ورنہ رجعت نہ کرے؛ تاکہ عدت گذرنے کے ساتھ ہی عورت بائنہ ہو جائے، محض تکلیف پہنچانے کی غرض سے بیوی کو لوٹانا سخت گناہ ہے۔

﴿۲﴾ یعنی عام انسانی حقوق میں شوہر و بیوی دونوں برابر ہیں، جیسے جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ، عزت و احترام، ایک دوسرے کے ←

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

پھر اگر شوہر بیوی کو (تیسری) طلاق دے دے، تو اب وہ عورت اس مرد کے لئے حلال نہ ہوگی، جب تک کہ وہ دوسرے مرد کے نکاح میں نہ جائے، پھر اگر دوسرے شوہر نے بھی اسے طلاق دے دی اور دونوں کو اعتماد ہو کہ وہ (اب) اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے، تو باہم رجوع کر لینے (یعنی نیا نکاح کرنے) میں کچھ حرج نہیں ﴿۱﴾ اور یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں، جن کو اللہ ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو سمجھ دار ہیں۔ ﴿۲۳۰﴾

← جذبات کا لحاظ وغیرہ؛ البتہ شوہر و بیوی کے کچھ مخصوص حقوق ان کی ضروریات کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں، ان حقوق میں مرد کی حیثیت صدر خاندان کی ہے اور اس میں مرد کو ایک گونہ فوقیت حاصل ہے، گویا مساوات بنیادی انسانی حقوق اور حقوق کی ادائیگی میں ہے، نہ کہ تمام اُمور میں؛ کیوں کہ دونوں کی فطری صلاحیتیں اور فطری ضرورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

﴿۳﴾ طلاق اچھی بات نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کو تمام جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے، (مستدرک حاکم، کتاب الطلاق، حدیث نمبر: ۲۷۹۴) لیکن یہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے، اگر زوجین میں ناچاقی اس درجہ تک پہنچ گئی کہ نباہ دشوار ہو جائے، تو اب نکاح کو باقی رکھنا طرفین کے لئے ایک مصیبت ہے، اسلام سے پہلے طلاق کے معاملہ میں بھی افراط و تفریط تھی، یہودی شریعت میں مرد جب چاہتا طلاق نامہ لکھ کر بیوی کے حوالہ کر سکتا تھا اور بیوی بھی اسی وقت دوسرا نکاح کر سکتی تھی (استثناء: ۲۴/۱-۲) اور عیسائیوں کے یہاں طلاق بالکل ہی ممنوع تھی اور عقد ثانی زنا (مرقس: ۱/۷-۱۲)، اسلام نے ان دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی، طلاق کی گنجائش رکھی گئی؛ لیکن اس کے بعد عدت ضروری قرار دی گئی؛ تا کہ انسانی نسب کی حفاظت ہو، آیت کے اس ٹکڑے میں دو باتیں بتائی گئی ہیں: اول یہ کہ اگر طلاق دینا ہی ہو تو ابتداءً ایک یا دو طلاق دینی چاہئے؛ تا کہ غور و فکر کا موقع باقی رہے اور پشیمانی ہو تو رُجوع کی گنجائش رہے، دوسرے: ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت گذرنے تک بیوی کو لوٹانے کی گنجائش ہے، اب اگر بھلے طریقہ پر عورت کے ساتھ زندگی گذارنے کا ارادہ ہو تو اس کو لوٹا لے، یہ ''امساک بالمعروف'' ہے، یا خوشگوار طریقہ پر اس کو چھوڑ دے یعنی عدت گذر جانے دے، وہ خود بخود علاحدہ ہو جائے گی اور رخصت کرتے ہوئے کچھ حسن سلوک بھی کر دے، یہ ''تسریح بالاحسان'' ہے۔

﴿۴﴾ اس میں خلع کا ذکر ہے، یعنی اگر کسی وجہ سے زوجین میں موافقت نہ ہو اور وہ محسوس کریں کہ اس ناموافقت کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کر سکیں گے، تو اس بات کی گنجائش ہے کہ عورت کچھ دے کر شوہر کو طلاق پر آمادہ کر لے، اگر شوہر نے مہر ادا کر دیا ہو تو مہر کی رقم واپس کر دے، اس میں کچھ حرج نہیں، اگر شوہر نے مہر ادا نہ کیا ہو، تو خلع کی صورت میں عورت سے مہر معاف کرایا جا سکتا ہے، یہ بہر حال مناسب نہیں کہ مرد نے جو دیا ہے، اس سے زیادہ وصول کر لے، اور نہ یہ مناسب ہے کہ خلع کی صورت کے سوا مرد اپنا دیا ہوا مال عورت سے طلب کرے، اس تفصیل سے واضح ہے کہ ''خلع'' بھی طلاق ہی کی ایک صورت ہے، جس میں مرد عورت سے طلاق دینے کا معاوضہ حاصل کرتا ہے، فقہاء کے یہاں یہ ''طلاقِ بائن'' ہے، یعنی عدت میں مرد کو لوٹانے کا حق نہیں ہوتا؛ لیکن فریقین کی رضامندی سے نئے مہر پر دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے؛ البتہ طلاق ہی کی طرح عدت خلع میں بھی واجب ہوتی ہے۔

﴿۱﴾ یعنی اگر شوہر تین طلاقیں دے دے تو اب وہ عورت اس مرد پر مکمل طور پر حرام ہوگئی؛ البتہ اگر کسی اور مرد سے اس کا نکاح ہوا پھر ←

← اس دوسرے مرد نے اس سے صحبت کی اور اس نے بھی بہ طورِ خود طلاق دے دی تو عدت گذرنے کے بعد یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی اور دوبارہ اس سے نکاح درست ہوگا ، دوسرے مرد سے اس عورت کے نکاح کا ضروری ہونا تو اسی آیت سے ثابت ہے اور دوسرے شوہر کا اس سے ہم بستر ہونا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں مذکور ہے۔
(بخاری ، باب من قال لإمرأته : أنت علی حرام ، حدیث نمبر : ۵۲۶۵)

○ اس آیت سے متعلق احکام میں دو باتیں قابل وضاحت ہیں : اول یہ کہ تین طلاقیں ایک ساتھ نہیں دینی چاہئیں ؛ بلکہ ہر طلاق کے بعد ایک حیض کا وقفہ رکھنا چاہئے ؛ تاکہ اچھی طرح غور وخوض کرنے کا موقع مل جائے ، یہی طلاق کا بہتر طریقہ ہے ؛ لیکن اگر کوئی شخص اس کی رعایت نہ کرے اور ایک ہی دفعہ میں تینوں طلاقیں دے دے تو تینوں طلاقیں واقع ہوجائیں گی ، علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ، روافض اور غیر مقلد حضرات کے سوا پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے ، (شرح نووی علی مسلم : ۴۷۸ ، باب طلاق الثلاث) ان حضرات کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاق ایک ہی طلاق تصور کی جائے گی ، تین الگ الگ مجلسوں کی طلاقیں واقع ہوں گی ، مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ قرآن مجید سے اس نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے ، نہ حدیث سے اور نہ سلف صالحین کے اقوال سے ، قرآن کی اس آیت ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ... فَإِنْ طَلَّقَهَا'' سے ظاہر ہے کہ طلاق کی تعداد کا تعلق مجلس سے نہیں ہے کہ کتنی مجلسوں میں دی ہے ؛ بلکہ اس بات سے ہے کہ کتنی بار طلاق دی ہے ؟ دو بار دی تو دو واقع ہوگی اور تین بار دی تو تین ، جیسے قرآن نے گھر میں داخل ہونے کے لئے تین بار اجازت لینے کی تلقین کی ہے ، ''ثلاث مرات'' (النور : ۵۸) ظاہر ہے اس کی مراد یہ نہیں ہوسکتی کہ تین الگ الگ مجلسوں میں اجازت لی جائے ، تو یہی حکم طلاق کا بھی ہوگا ، رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حضرت حفص بن مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ایک ہی کلمہ میں تین طلاق دے دی تھی ، آپ ﷺ نے ان کو واقع قرار دیا ''طلق إمرأته فاطمة بنت قيس ثلاث تطليقات فی كلمة واحدة'' (دار قطنی : ۱۲/۴) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے انھوں نے اپنے دادا کے بارے میں دریافت کیا ، جنھوں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی تھی ، آپ ﷺ نے فرمایا : تین واقع ہوگئی ، باقی ۹۹۷ ظلم وعدوان ہیں (مصنف عبد الرزاق : ۳۹۴/۶) اس طرح کی متعدد احادیث اور صحابہ کے فتاویٰ موجود ہیں ، جن کا ذکر یہاں باعث طوالت ہوگا ؛ اس لئے صحیح نقطۂ نظر وہی ہے جو عام طور پر اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی واقع ہوجاتی ہیں۔

○ دوسرا مسئلہ اس آیت میں حلالہ کا ہے ، کسی مرد کا مطلّقہ سے خاص اس نیت سے نکاح کرنا کہ وہ اس کو اس کے شوہر اول کے لئے حلال کرکے طلاق دیدے گا ، گناہ اور سخت مذموم ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص پر لعنت کی ہے ؛ (سنن ترمذی ، باب ماجاء فی المحلل له ، حدیث نمبر : ۱۱۱۹) لیکن اگر کسی نے یہ بات اپنے دل میں چھپا کر رکھی ، نکاح کے وقت ایجاب وقبول میں اس کا ذکر نہیں کیا اور ہم بستری کے بعد اس عورت کو طلاق دے دی اور اس کی عدت گذر گئی ، تو کیا اب وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی ؟ بعض فقہاء کے نزدیک حلال نہیں ہوئی ، یہی رائے حنفیہ میں قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کی ہے ؛ لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی ، اس لئے کہ عقود ومعاملات میں حکم معاملہ کی ظاہری صورت پر لگتا ہے نہ کہ دلوں میں چھپے ہوئے ارادہ پر ، یہی رائے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی بھی ہے ، جس حدیث میں اس شنیع فعل کی مذمت کی گئی ہے یعنی ''لعن الله المحلل والمحلل له'' خود اس میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے ، اس لئے کہ اس میں دوسرے شوہر کو ''محلل'' (حلال کرنے والا) اور شوہر اول کو ''محلل لہ'' (جس کے لئے عورت حلال کی گئی) سے تعبیر کیا گیا ہے ، معلوم ہوا کہ یہ فعل گو بُرا ہے ؛ لیکن حِلت اس سے حاصل ہوجاتی ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠
وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ
اللّٰهِ هُزُوًا ۡ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ
الثلثة　يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ　۲۹ ع ۳ ۱۳
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ
ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ
وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم بیویوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت (کی تکمیل کے قریب) پہنچ جائیں تو یا تو بہتر طریقہ پر ان کو روک رکھو یا بھلے طریقہ پر چھوڑ دو، محض ان کو نقصان پہنچانے کے ارادہ سے — کہ تم زیادتی کرتے رہو — ان کو نہ روکو، ﴿۱﴾ جو ایسا کرتا ہے، وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتا ہے، نیز اللہ کے احکام کو مذاق نہ بنالو اور اپنے آپ پر اللہ کے انعام کو اور اس بات کو کہ اللہ نے تمہاری نصیحت کے لئے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے، یاد رکھو، اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہیں ﴿۲۳۱﴾ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی عدت پوری کرلیں، تو اب ان کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے (سابق) شوہر سے باہمی رضامندی کے ساتھ بھلے طریقہ پر نکاح کرلیں، ﴿۲﴾ تم میں سے جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کو اس کی نصیحت کی جاتی ہے، یہ بات تمہیں پاکباز اور صاف ستھرا رکھے گی، ﴿۳﴾ اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔ ﴿۲۳۲﴾

﴿۱﴾ یعنی اگر اس عورت کی طرف رغبت نہ ہو تو محض تکلیف پہنچانے کے لئے اس کو لوٹانا درست نہیں، غرض بیوی کو رکھنا ہو یا چھوڑنا ہو، حسن سلوک اور خوشگوار رویہ ہر دو صورت میں ضروری ہے۔

﴿۲﴾ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کو ایک مسلمان کے نکاح میں دیا، انھوں نے طلاقِ رجعی دی اور عدت گذرنے تک رجعت بھی نہیں کی، عدت گذرنے کے بعد پھر اپنی سابقہ بیوی کو نکاح کا پیغام دیا، حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن بھی اپنے سابق شوہر کی طرف راغب تھیں، حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اپنے بہنوئی کا رویہ دیکھ کر قسم کھالی تھی کہ اب کبھی ان کی بہن اس شخص کے نکاح میں نہیں جائیں گی، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے سنا تو فوراً حکم ربانی کو قبول کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ جیسا مناسب سمجھیں، کریں، (بخاری، باب من قال: لا نکاح إلا بولی، حدیث نمبر: ۵۱۳۰) — اس کے علاوہ عربوں کا ایک نامنصفانہ طریقہ یہ تھا کہ طلاق دینے کے بعد بھی مطلّقہ عورتوں کو دوسرے مرد سے نکاح کی اجازت نہ دیتے تھے، اس میں رکاوٹ ←

وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ
لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا
وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا
وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا
سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں ، یہ حکم اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہے ، اور (اس مدت میں) دودھ پیتے بچہ کے باپ پر اُن عورتوں کا مروج طریقہ کے مطابق کھانا اور کپڑا واجب ہے ،﴿۱﴾ کسی بھی شخص کو اس کی طاقت کے لحاظ سے ہی تکلیف دی جائے ، نہ کسی ماں کو اس کی اولاد کے ذریعہ تکلیف پہنچائی جائے اور نہ کسی باپ کو ،﴿۲﴾ اور باپ کا انتقال ہو چکا ہو، تو (بچہ کے) وارث پر ایسا ہی واجب ہے ،﴿۳﴾ اگر وہ دونوں (ماں باپ) باہمی رضامندی سے اور مشورہ سے دودھ چھڑانا چاہیں تو کوئی حرج نہیں ، اور اگر تم بچوں کو (کسی دایہ سے) دودھ پلانا چاہو تب بھی تم پر حرج نہیں ؛ بشرطیکہ مروج طریقہ کے مطابق تم جو اُجرت دے رہے ہو، وہ حوالہ کردو ،﴿۴﴾ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ دیکھ رہے ہیں ۔ ﴿۲۳۳﴾

← بنتے تھے اور اس کو اپنی غیرت کے خلاف تصور کرتے تھے ؛ اسی لئے مفسرین کے نزدیک اس آیت کے مخاطب مطلّقہ خواتین کے اولیاء بھی ہیں اور ان کے سابق شوہر بھی ۔

﴿۳﴾ یعنی چوں کہ جب وہ مرد و عورت پہلے شوہر و بیوی رہ چکے ہیں ؛ اس لئے باہم حجاب و تکلف نہیں ہے ، اور ایک دوسرے کی طرف راغب بھی ہیں ، تو اب کردار و عمل کی طہارت اور پاکیزگی اسی میں ہے کہ پھر سے ازدواجی رشتہ میں بندھ جائیں ۔

﴿۱﴾ اس فقرہ میں بچوں کو دودھ پلانے سے متعلق متعدد احکام ذکر کئے گئے ہیں : اول یہ کہ ماؤں پر نومولود بچوں کا اخلاقی حق ہے کہ وہ ان کو دودھ پلائیں ، کسی میڈیکل عذر کے بغیر خواہ مخواہ دودھ پلانے سے گریز یا انکار مناسب نہیں ، دوسرے : دودھ پلانے کی مدت دو سال تک ہے ، جو ماں باپ پوری مدت دودھ پلانا چاہتے ہوں ، وہ پیدائش کے بعد دو سال تک دودھ پلا سکتے ہیں ، جمہور فقہاء اور حنفیہ میں امام ابو یوسف اور امام محمد کی یہی رائے ہے ، (**بدایۃ المجتهد : ۳/ ۷۲**) تیسرے : اگر دودھ پلانے کے وقت نومولود کی ماں اس کے باپ کے نکاح میں باقی نہ رہی تو اب اس مرد پر دودھ پلانے والی عورت کی اجرت واجب ہوگی ، اگر باہم اُجرت طے کر لی تھی تو وہی اجرت واجب ہوگی ، اگر اُجرت طے نہیں کی تھی تو اس مدت میں دودھ پلانے والی عورت کا کھانا اور کپڑا واجب ہوگا ، اگر کھانے اور کپڑے کی نوعیت واضح نہ کی ہو تو مروجہ طریقہ کے مطابق اُجرت ادا کرنی ہوگی —— '' بالمعروف '' سے اسی طرف اشارہ ہے ۔

←

وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۳۴﴾

اورتم میں سے جن لوگوں کی وفات ہوجائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں ، وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دنوں روکے رکھیں ، پھر جب یہ اپنی عدت پوری کرلیں ،تو وہ اپنی ذات کے بارے میں درست طریقہ پر جوبھی قدم اُٹھائیں (اے بیوہ عورتوں کے اولیاء!) تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں ،﴿۱﴾ اورتم جوبھی عمل کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہیں ۔﴿۲۳۴﴾

← ﴿۲﴾ ماں کوتکلیف پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ماں دودھ پلانے سے معذور ہواور اصرار کیا جائے کہ وہی دودھ پلائے ، یاماں دودھ پلانے کو تیار ہواور بچہ کا باپ کسی اور سے دودھ پلانا چاہے ، باپ کوتکلیف دینے کا مطلب یہ ہے کہ باپ مفلس ہے، کسی اور سے دودھ پلوانے کی استطاعت نہیں رکھتا اور ماں خواہ مخواہ دودھ پلانے سے انکار کرتی ہو، یاماں مطلقہ ہواور مروجہ اجرت سے زیادہ کی طلب گار ہو۔

﴿۳﴾ یعنی باپ کا انتقال ہوجائے اور نومولود خود صاحب جائداد ہوتو اسی جائداد سے دودھ پلانے کی اُجرت ادا کی جائے گی ، اگر خود وہ مال کا مالک نہ ہوتو نومولود کے جو محرم رشتہ دار اس سے میراث کے حقدار ہوں ، ان پر بچہ کا نفقہ اور دودھ پلانے کی اُجرت واجب ہوگی ، اگر ایک سے زیادہ وارث ہوتے ہوں تو ان سب کو اپنے حصۂ میراث کے تناسب سے دودھ پلانے کی اُجرت ادا کرنی ہوگی ۔

﴿۴﴾ یعنی دوسال کی مدت سے پہلے بھی باہمی رضامندی سے دودھ چھڑایا جاسکتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ زوجین باہمی مشورے سے کسی دایہ سے دودھ پلوائیں اور اسے مناسب اجرت ادا کردیں ؛ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب اس صورت میں ہے جب کہ خود بچہ کو اس سے غیر معمولی ضرر نہ پہنچے ، اگر مستند ومعتبر معالج کی رائے میں قبل از وقت بچہ کو ماں کے دودھ سے محروم کردینا قابل لحاظ نقصان کا باعث ہو، تو پھر ماں کے لئے بلا عذر قبل از وقت دودھ کا چھڑانا یا کسی اور سے دودھ پلوانا درست نہیں ۔

﴿۱﴾ اس آیت میں چار باتیں ارشاد فرمائی گئیں : اول یہ کہ شوہر کی وفات ہوجائے تو بیوی کو عدتِ وفات گذارنی ہوگی ، نکاح کے بعد شوہر کے ساتھ یکجائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہوں ، ہر دوصورت میں عدتِ وفات واجب ہوتی ہے ، دوسرے : عدتِ وفات چار ماہ دس دن ہے ، یہ عدت ان عورتوں کے لئے ہے جو حاملہ نہ ہوں ، حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ بچوں کی ولادت ہوجائے ، سورۂ طلاق (آیت نمبر : ۴) میں اس کا ذکر موجود ہے ، تیسرے : عدت کے درمیان عورت اپنے آپ کو دوسرے نکاح اور زیبائش وآرائش کے اسباب ، جیسے خوشبو ، مہندی ، سرمہ ، کاجل اور رنگین کپڑے وزیورات وغیرہ سے باز رکھے ، چوتھے : عدت گذرنے کے بعد عورت کو اپنا دوسرا نکاح کرنے کا حق ہے ، اگر شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اُٹھائے تو اولیاء کو اس میں رکاوٹ پیدا کرنا جائز نہیں ۔

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ
اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا
عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ ع ۳۰ ۱۴
تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ
لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ
تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

نیز (اُن) عورتوں کو پیامِ نکاح کے متعلق اشارۃً کوئی بات کہنے یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھنے میں تم پر گناہ نہیں، ﴿۱﴾ اللہ جانتے ہیں کہ تم ان کا ذکر ضرور کروگے؛ ﴿۲﴾ لیکن ان سے خفیہ عہد و قرار نہ کرلینا، ہاں، بھلی بات کہہ سکتے ہو، ﴿۳﴾ اور جب تک مقررہ عدت نہ گذر جائے، نکاح کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرلو اور آگاہ رہو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، یقیناً اللہ اسے بھی جانتے ہیں اور جان لو کہ اللہ بخشنے والے اور بردبار ہیں ﴿۲۳۵﴾ اگر تم عورتوں کو ہاتھ لگانے یا ان کا مہر مقرر کرنے سے پہلے ہی طلاق دے دو، تو تم پر گناہ نہیں اور ان کو رخصتانہ ادا کردو، خوش حال پر اس کی حیثیت کے مطابق رخصتانہ ہے اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے بہ قدر، بھلے طریقہ پر رخصتانہ ادا کردینا چاہئے، یہ نیکی کرنے والوں پر لازم ہے ﴿۲۳۶﴾ اور اگر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی اور تم ان کے لئے مہر بھی مقرر کرچکے تھے تو مقررہ مہر کا آدھا واجب ہے، ﴿۴﴾ سوائے اس کے کہ عورتیں خود معاف کردیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، وہ معاف کردے، ﴿۵﴾ اور یہ بات کہ تم درگذر سے کام لو (اور پورا مہر چھوڑ دو) تقویٰ سے قریب تر ہے، ﴿۶﴾ اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا نہ بھولو، تم جو کچھ کرتے ہو، یقیناً اللہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ ﴿۲۳۷﴾

﴿۱﴾ یعنی جب عورت عدت کی حالت میں ہو تو صراحتاً اس کو نکاح کا پیغام دینا یا نکاح کے سلسلہ میں قول و قرار کرلینا جائز نہیں؛ البتہ اس کا اشارہ و کنایہ کیا جاسکتا ہے، جیسے اس عورت میں جو اوصاف ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے کہے کہ ''میں ان اوصاف کی حامل خاتون سے نکاح کرنا چاہتا ہوں'' —— اسی طرح زبان سے تو اظہار نہ کرے؛ لیکن دل میں ہو کہ فلاں خاتون سے نکاح کرنا ہے، اس میں بھی حرج نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی عورت سے نکاح کا خواہش مند ہو تو ذکر کئے بغیر نہیں رہتا۔

﴿۳﴾ اس سے وہی اشارہ و کنایہ میں نکاح کی بات کہنا مراد ہے۔

←

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸

تمام نمازوں اور (خاص کر) درمیانی نماز ﴿۱﴾ کی پابندی کرو اور اللہ کے سامنے خاموش کھڑے ہوا کرو۔ ﴿۲﴾ ۝۲۳۸

← ﴿۴﴾ مہر کے اعتبار سے مطلقہ عورت کی چار صورتیں ہیں: اول: وہ جن کا مہر مقرر ہو چکا تھا اور شوہر کی ان کے ساتھ یکجائی ہو چکی تھی، اس کا پورا مہر مقررہ واجب ہوگا، دوسرے: وہ جن کا مہر مقرر نہ ہوا تھا؛ لیکن شوہر بیوی کی یکجائی ہو چکی تھی، ان کو مہر مثل یعنی اس کی ہم عمر خاندان کی دوسری خواتین کا جو مہر تھا، وہی ادا کرنا ہوگا، تیسرے: جس سے یکجائی نہیں ہوئی، البتہ مہر مقرر ہو چکا تھا، اس کا آدھا مہر واجب ہوگا، آیت: ۲۳۷ میں اس کا ذکر ہے، چوتھے: جس سے یکجائی نہیں ہوئی تھی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا تھا تو اس کے لئے ''متاع (رخصتانہ)'' واجب ہے، (أحکام القرآن للجصاص: ۱/۵۱۹) متاع ہر آدمی پر اس کی صلاحیت کے مطابق ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم بہ طور متاع ادا کیا ہے؛ (حاشیہ صابونی علی تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۲۳) البتہ متاع کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ عورت جس معیار کا کپڑا پہنتی ہو، اس کی رعایت کرتے ہوئے ایک جوڑا کپڑا دے دیا جائے، (ھدایہ: ۲/۳۴۶) آیت: ۲۳۶ میں اسی کا ذکر ہے۔

﴿۵﴾ ''جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے'' سے مراد شوہر ہے، خود رسول اللہ ﷺ سے یہ تفسیر منقول ہے، (قرطبی: ۳/۱۳۶، نیز دیکھئے: ابن کثیر: ۱/۲۲۴) چوں کہ عرب عام طور پر نکاح کے وقت ہی پورا مہر ادا کر دیا کرتے تھے، تو اب خلوت و یکجائی سے پہلے ہی طلاق دے دینے کی صورت میں وہ نصف مہر واپس لینے کے حقدار تھے؛ اس لئے مقصود یہ ہے کہ اس آدھے کو واپس لینے کے بجائے وہ معاف کر دیں۔

﴿۶﴾ حاصل ان تمام احکام کا یہی ہے کہ جدائی اور فرقت کے وقت بھی فراخدلی اور کشادہ قلبی سے کام لے اور اچھے سلوک کے ساتھ دوسرے فریق کو رخصت کرے۔

﴿۱﴾ ''صلوٰۃ وسطیٰ'' (بیچ والی نماز) سے کونسی نماز مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے، راجح یہ ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے، بعض حدیثوں میں اس کی صراحت ہے، (سنن ترمذی، باب ماجاء فی الصلوٰۃ الوسطیٰ الخ، حدیث نمبر: ۱۸۱) کیوں کہ اس کی ایک جانب دن کی دو نمازیں فجر و ظہر اور دوسری جانب رات کی دو نمازیں مغرب و عشاء ہیں، اس میں یوں تو تمام ہی نمازوں کی تاکید ہے؛ لیکن نمازِ عصر کے خصوصی اہتمام کی ترغیب ہے، یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ نمازیں پانچ ہیں؛ کیوں کہ ''صلوٰۃ وسطیٰ'' کا عطف ''صلوات'' پر ہے، عربی قواعد کی رو سے یہ بات ضروری ہے کہ ''صلوٰۃ وسطیٰ'' صلوات میں شامل نہ ہو؛ کیوں کہ عطف مغایرت یعنی دونوں کے الگ الگ ہونے کو ظاہر کرتا ہے، ''صلوات'' کا اطلاق جمع ہونے کی وجہ سے کم سے کم تین پر ہوگا؛ لیکن اگر اس سے تین نمازیں مراد ہوں تو ''صلوٰۃ وسطیٰ'' چوتھی نماز ہوگی اور چار نمازوں میں کوئی نماز بیچ کی نماز نہیں ہوسکتی، بیچ کی نماز اسی وقت ہوسکتی ہے جب طاق عدد ہو؛ اس لئے ماننا پڑے گا کہ ''صلوات'' سے چار نمازیں اور ''صلوٰۃ وسطیٰ'' سے پانچویں نماز مراد ہے؛ لہٰذا پانچ نمازوں کا ثبوت خود قرآن مجید سے ہے، منکرین حدیث — جو اپنے آپ کو ''اہل قرآن'' کہتے ہیں — پانچ نمازوں کے قائل نہیں، تین کے قائل ہیں، وہ دراصل حدیث ہی کے نہیں، قرآن کے بھی منکر ہیں۔ واللہ ھو الھادی۔ ←

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى
الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ
مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

پس اگر دشمن یا کسی کا خوف ہو تو پیدل یا سوار (جیسے بَن پڑے) نماز ادا کرلو، پھر جب خوف نہ رہے تو اللہ جس طرح تم کو (نماز کا طریقہ) سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے، اسی طرح اللہ کو یاد کیا کرو ﴿۱﴾ ﴿۲۳۹﴾ اور تم میں جن لوگوں کی وفات ہوجائے اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے لئے ایک سال تک خرچ اور (گھر سے) نہ نکالے جانے کی وصیت کر جائیں، پھر اگر وہ (عدت گذرنے کے بعد خود ہی) نکل جائیں، تو وہ اپنے بارے میں جو بھی کریں، تم پر کچھ حرج نہیں، ﴿۲﴾ اور اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۲۴۰﴾

← ﴿۲﴾ عربی زبان میں ''قنوت'' کے متعدد معانی آتے ہیں: اطاعت وفرمانبرداری، دُعاء، ادب وتواضع، طویل قیام، خاموشی —— یہاں بھی مفسرین نے مختلف معانی مراد لئے ہیں اور ان سبھوں کی گنجائش ہیں، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ حسبِ ضرورت نماز میں گفتگو کیا کرتے تھے، جب یہ آیت ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ'' نازل ہوئی تو ہم لوگوں کو نماز میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا، (بخاری، باب قوموا للہ قانتین، حدیث نمبر: ۴۵۳۴) اس حدیث کے مطابق یہاں ''قنوت'' کے معنی ''چپ رہنے'' کے ہیں —— اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں ہر طرح کی گفتگو کی ممانعت ہے؛ اسی لئے حنفیہ کے نزدیک جان بوجھ کر گفتگو کی جائے یا بھول کر، گفتگو سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

﴿۱﴾ یعنی حالت امن میں تو نیچے اتر کر رکوع وسجدہ کے ساتھ قبلہ رُخ ہوکر نماز ادا کی جائے؛ لیکن خوف وخطرہ کی حالت میں جس طرح ممکن ہو نماز ادا کرلے، کھڑے ہوکر، بیٹھ کر، رکوع وسجدہ کے ساتھ، اشارہ سے، نیچے اتر کر یا سواری پر، قبلہ کی طرف رُخ کرکے یا جدھر رُخ کرسکے، پھر جب خوف جاتا رہے تو معمول کے مطابق نماز ادا کی جائے۔

﴿۲﴾ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو عدتِ وفات ایک سال گذارنی ہوتی تھی، اسلام نے عدتِ وفات حاملہ عورتوں کے لئے ولادت اور دوسری خواتین کے لئے چار ماہ دس دنوں مقرر کی؛ البتہ چوں کہ میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا؛ اس لئے بیوہ عورتوں کو ایک سال کے لئے نفقہ اور رہائش کی سہولت دی گئی اور فرمایا گیا کہ اگر عدت گذرنے کے بعد وہ خود ہی جانا چاہیں، تو جاسکتی ہیں اور نکاح کرنا چاہیں تو نکاح بھی کرسکتی ہیں، میراث کا حکم نازل ہونے کے بعد اب ایک سال تک متوفی کے ورثہ پر بیوہ کے نفقہ کی اور عدت گذر جانے کے بعد رہائش کی ذمہ داری کا حکم منسوخ ہوگیا۔

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
ع ۳۱/۷ ۱۵ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ
لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

مطلّقہ عورتوں کے لئے رواج کے مطابق متاع (رخصتانہ) ہے، یہ (حق تلفی سے) بچنے والوں پر مقرر ہے ﴿۱﴾ ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام بیان کرتے ہیں؛ تاکہ تم سمجھ داری سے کام لو ﴿۲۴۲﴾ آپ کو ان لوگوں کے بارے میں علم ہے، جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے؟ حالاں کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، اللہ نے ان سے فرمایا کہ مرجاؤ (وہ سب مر گئے)، پھر اللہ نے ان کو (دوبارہ) زندہ فرمادیا، ﴿۲﴾ بے شک اللہ تو انسان پر مہربان ہیں؛ لیکن اکثر لوگ شکرادا نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اور جان لو کہ اللہ خوب سنتے اور جانتے ہیں۔ ﴿۲۴۴﴾

﴿۱﴾ یعنی جس مطلّقہ کا مہر مقرر نہ ہوا تھا اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آگئی، اس کے لئے تو ''متاع'' (رخصتانہ) واجب ہے، جس کا ذکر آیت: ۲۳۶ میں آچکا ہے، باقی تینوں مطلقہ عورتوں کے لئے متاع مستحب ہے، یہ گویا عورت کے ساتھ اس حسن سلوک کی ایک صورت ہے جس کا حکم دیا گیا ہے، اس تشریح کے مطابق ''حقا'' کے معنی ''مقرر'' کا ہوگا — بعض اہل علم نے ''حقا'' سے واجب کا معنی مراد لیا ہے، ایسی صورت میں یا تو ''متاع'' کے معنی مطلق نفع پہنچانے کے ہوں گے، دوسری مطلقہ عورتوں کو جو پورا یا نصف مہر ملتا ہے، یہ بھی اس مفہوم کے اعتبار سے ''متاع'' میں شامل ہے، یا ''مطلّقات'' سے تمام مطلقہ عورتیں مراد نہ ہوں گی؛ بلکہ خاص وہی عورتیں مراد ہوں گی، جن کا مہر مقرر ہوا اور خلوت سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آجائے، ایسی صورت میں جو حکم آیت: ۲۳۶ میں آچکا ہے، یہ اسی کی تاکید ہوگی۔

﴿۲﴾ قرآن مجید کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ واقعہ معروف تھا؛ لیکن احادیث میں اس کی تفصیل نہیں ملتی، جو کچھ روایات تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، ان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا کوئی گروہ تھا، ان کے علاقہ میں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی، اس سے بچنے کے لئے یہ ہزاروں کی تعداد میں آبادی سے بھاگ کھڑے ہوئے اور کسی اور جگہ مقیم ہوگئے، اس فرار کی سزا کے بہ طور ان سب پر موت طاری کردی گئی، پھر ایک نبی کی دُعاء سے دوبارہ زندہ کئے گئے (تفسیر طبری: ۲/ ۳۶۵) — اس واقعہ کا ذکر کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ جہاد سے دل چرا کر جان بچائی نہیں جاسکتی، موت جب آنی ہے آکر رہے گی، اس سے معلوم ہوا کہ جہاں طاعون یا کوئی وبائی بیماری پھیل گئی ہو، وہاں سے جان جانے کے خوف سے راہ فرار اختیار کرنا درست نہیں؛ البتہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اس طرح کی بیماری پھیل جائے تو جو لوگ اس آبادی سے باہر ہوں، ان کو وہاں جانے سے بھی اجتناب کرنا چاہئے۔ (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۵۷۲۹)

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ
وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ
لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ
اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَا ؕ
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ لَهُمْ
نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی
الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾

وقف لازم

کون ہے جو اللہ کو بہتر قرض پیش کرے، ﴿۱﴾ کہ اللہ اس کے لئے اس کو کئی چند فرما دیں؟ اللہ ہی تنگی اور فراخی پیدا کرتے ہیں اور اسی کی طرف تم لوگوں کو لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۴۵﴾ کیا آپ کو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے اس گروہ کا حال معلوم ہے کہ جب ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیں کہ ہم (اس کے تحت) اللہ کے راستہ میں جہاد کریں، نبی ﴿۲﴾ نے کہا: ایسا تو نہ کروگے کہ جب تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو جہاد نہ کرو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں؛ حالاں کہ ہمیں ہمارے گھر بار اور بال بچوں سے محروم کر دیا گیا ہے؟ پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان میں سے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر سب نے پشت پھیر لی اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہیں ﴿۲۴۶﴾ اور ان سے ان کے نبی نے کہا: اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، کہنے لگے: بھلا اِس کو ہم پر کیسے حکومت حاصل ہوسکتی ہے؟ اِس سے زیادہ بادشاہت کے حقدار تو ہم ہیں، اس کو تو (ہم سے زیادہ) دولت نہیں دی گئی ہے؟؟ نبی نے کہا: اللہ نے اس کو تم پر بادشاہت کے لئے منتخب کرلیا ہے اور علمی وجسمانی اعتبار سے اس کو فوقیت عطا کی ہے، ﴿۳﴾ نیز اللہ جسے چاہیں اپنا ملک عطا فرما دیں اور اللہ کشادگی والے اور علم والے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۴۷﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ کی راستہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرے۔

﴿۲﴾ مفسرین کا خیال ہے کہ ان نبی کا نام: شمویل علیہ السلام یا ''شمعون تھا'' بائبل میں ''شمویل'' کا ذکر ملتا ہے۔

﴿۳﴾ اور حکمرانی کے لئے یہی دو چیزیں مطلوب ہیں: علم، تدبیر وانتظام کے لئے، اور جسامت، رعب ووقار کے لئے۔

﴿۴﴾ بنی اسرائیل میں خاندانی تفاخر کا جذبہ بہت زیادہ تھا اور بنی اسرائیل میں عرصہ سے لاوی کی نسل میں نبوت اور یہودا کی نسل میں بادشاہت چلی آرہی تھی، یہ ان دونوں میں سے کسی خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی اہل ثروت میں شمار نہ ہوتا تھا؛ اس لئے بنی اسرائیل ان کی فرمانروائی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ
مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ ٣٢ ع ٦ ١٦
فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ
وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

اوران سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کے حکمراں ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ تابوت واپس آجائے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامانِ سکینت اور آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے (آثار وتبرکات) کا بچا کھچا ہے، جسے فرشتے اُٹھا کر لائیں گے،﴿۱﴾ اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو تو یقیناً اس میں تمہارے لئے کھلی نشانی ہے ﴿۲۴۸﴾ پھر جب طالوت فوج لے کر چلے تو کہا: اللہ ضرور ایک نہر سے تمہارا امتحان لیں گے، جو نہر میں سے (آسودہ ہوکر) پی لے، وہ میرا نہیں ہے، اور جو اس سے نہ پیئے، وہ میرے رفقاء میں ہوگا، سوائے اس کے کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے لے (کہ اس قدر پینے کی اجازت ہے)؛ مگر ان میں سے کچھ لوگوں کے سوا سب پانی پی کر ہی رہے، ﴿۲﴾ جب طالوت اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے نہر سے آگے بڑھے، تو کہنے لگے: آج ہمارے اندر جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ کی طاقت نہیں؛ (البتہ) جو لوگ خدا سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے، انھوں نے کہا: بہت سے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہوں پر غالب آچکے ہیں اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ ﴿۲۴۹﴾

﴿۱﴾ یہ تابوت جسے یہود ''تابوتِ سکینہ'' کہا کرتے تھے، بنی اسرائیل کے یہاں بڑا مقدس اور مبارک تصور کیا جاتا تھا، اس میں تورات کے کچھ نسخے اور انبیاء کے آثار وتبرکات تھے، جہاد میں بھی یہود اسے آگے رکھتے تھے، ایک مشرک قوم عَمالِقہ سے بنی اسرائیل نے ایسی شکست کھائی کہ عَمالِقہ نے ''تابوتِ سکینہ'' پر بھی قبضہ کرلیا، جب اللہ تعالیٰ کو اس کی واپسی منظور ہوئی تو ایسا ہوا کہ جہاں کہیں تابوت رکھتے، وبا پھوٹ پڑتی، مجبوراً خود انھوں نے تابوت کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر بنی اسرائیل کی طرف ہنکا دیا؛ چنانچہ کسی جنگ کے بغیر تابوت دوبارہ بنی اسرائیل کی طرف واپس آ گیا۔ (مفاتیح الغیب: ۴۹۲/۳، ودیگر کتب تفسیر)

﴿۲﴾ طالوت کا مقصد یہ تھا کہ اس امتحان کے ذریعہ کم حوصلہ لوگ پہلے ہی چھٹ جائیں کہ ایسے لوگوں کا ساتھ جنگ میں نقصان دہ ہوتا ہے، مفسرین کا خیال ہے کہ اس نہر سے مراد 'دریائے اُردن' ہے، جو تھوڑے سے لوگ ان کے ساتھ رہ گئے، تورات میں ←

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اور جب انھوں نے جالوت اور اس کے لشکر کا سامنا کیا تو کہا: ہمارے پروردگار! ہم پر صبر نازل فرمایئے! ہمارے قدم جما دیجئے اور کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرمایئے! ﴿۲۵۰﴾ چنانچہ طالوت کے لشکر نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے شکست دی، نیز داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا، اللہ نے داؤد کو حکومت اور تدبیر سے نوازا تھا، ﴿۱﴾ اور جو کچھ اللہ کو منظور تھا، داؤد کو اس کا علم عطا فرمایا تھا، اگر اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے ذریعہ مدافعت نہ کرتے رہیں تو زمین میں فساد پھیل جائے؛ ﴿۲﴾ لیکن اللہ دنیا والوں پر بہت فضل کرنے والے ہیں ﴿۲۵۱﴾ یہ اللہ کے احکام ہیں جو ہم آپ پر ٹھیک ٹھیک تلاوت کر رہے ہیں اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۵۲﴾

← ان کی تعداد چھ سو بتائی گئی ہے؛ (سموئیل: ۱/ ۱۲-۱۵) لیکن حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصحاب بدر کی تعداد کے برابر یعنی ۳۱۳ تھے۔ (بخاری، باب عدة أصحاب بدر، حدیث نمبر: ۳۹۵۷)

﴿۱﴾ طالوت کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے، حضرت داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا، چنانچہ طالوت نے اپنی بیٹی حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دے دی، اس طرح آئندہ حضرت داؤد علیہ السلام حکمراں ہوئے، ''بادشاہت'' عطا کرنے سے اسی طرف اشارہ ہے اور ''حکمت'' سے نبوت مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد میں بادشاہت اور نبوت دونوں کو جمع فرما دیا، معلوم ہوا کہ جہاد ہمیشہ سے انبیاء کی سنت رہی ہے، یہ صحیح نہیں ہے کہ جہاد انبیاء و رسل کا طریقہ نہیں ہے۔

﴿۲﴾ یعنی جہاد انسانیت کے لئے تباہی نہیں؛ بلکہ ان کے تحفظ اور امن و امان کا ذریعہ ہے، اگر ظالموں کی سرکوبی نہ ہو اور ان کے مقابلہ میں کوئی طاقت باقی نہ رہے تو انسانیت کے لئے جینا دوبھر ہو جائے۔

﴿۳﴾ مطلب یہ ہے کہ نہ ان واقعات کے پیش آنے کے وقت آپ موجود تھے، نہ پچھلی آسمانی کتابوں کا علم آپ نے حاصل کیا، اس کے باوجود قصص و واقعات کو قرآن کے ذریعہ بیان کرنا آپ کے اللہ کی طرف سے رسول ہونے کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

الجزء ٣

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وقف لازم
وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ
وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿٢٥٣﴾ ع ٥ / ٣٣

ہم نے ان پیغمبروں میں بھی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے گفتگو فرمائی ہے، ﴿١﴾ بعض کے درجات بلند کئے ہیں، ﴿٢﴾ اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی ہوئی دلیلیں عطا کیں اور روح القدس ﴿٣﴾ سے ان کی مدد کی، اگر اللہ چاہتے تو کھلی ہوئی دلیلیں آجانے کے باوجود ان رسولوں کے بعد آنے والے آپس میں قتل وقتال نہ کرتے؛ لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، بعض ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتے تو یہ آپس میں نہ لڑتے؛ لیکن اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ ﴿٤﴾ ﴿٢٥٣﴾

﴿١﴾ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے واسطہ کے بغیر گفتگو فرمائی ہے۔

﴿٢﴾ یوں تو انبیاء سبھی برگزیدہ اور اللہ کے مقبول ترین بندے ہیں، ان سب کا احترام مومن ہونے کے لئے ضروری ہے اور ان میں سے کسی کی بھی ادنیٰ اہانت ایمان سے محرومی کا باعث ہے؛ لیکن ان میں بھی درجات ہیں، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء پر افضل ہیں، آپ ﷺ پر ختم نبوت اور آپ ﷺ کی اُمت کو سب سے بہتر اُمت (خیر امۃ) قرار دینے میں اس کا اشارہ موجود ہے، حدیثیں کثرت سے اس پر شاہد ہیں اور اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع واتفاق ہے، (نبراس: ٢٨٦) آپ ﷺ نے جو دوسرے انبیاء پر آپ ﷺ کو ترجیح دینے سے منع فرمایا ہے، جیسے ارشاد ہوا: لا تخیروني علی موسیٰ، (بخاری، باب وفاۃ موسی الخ، حدیث نمبر: ٣٤٠٨) اس کا مقصد یہ ہے کہ جب لوگ انبیاء کے درمیان ترجیح دینا شروع کریں گے اور دوسرے انبیاء کرام پر آپ ﷺ کی فضیلت بیان کریں گے، تو اندیشہ ہے کہ حد سے گذر جائیں اور کوئی ایسی بات کہہ دیں، جو دوسرے انبیاء کی اہانت کا باعث ہو؛ اس لئے لوگوں کو ایسی گفتگو سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

﴿٣﴾ روح القدس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں۔

﴿٤﴾ اس میں آپ ﷺ کی دلداری اور تسلی ہے کہ لوگوں کی مخالفت سے رنجیدہ نہ ہوں، پہلے انبیاء کی بھی —— خواہ وہ کتنے ہی بلند درجہ پر فائز رہے ہوں —— مخالفت ہوتی رہی ہے؛ چوں کہ دنیا امتحان وآزمائش کے لئے ہے، جس میں نیکی اور برائی دونوں کی چھوٹ ہے، اسی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا قائم ہوگی؛ اس لئے اس اختلاف کے پیچھے مشیتِ الٰہی کارفرما ہے، اللہ چاہتے تو غیب کو شہود بنادیتے اور جو باتیں غیب کے پردہ میں چھپی ہیں، انسان ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا اور ہر شخص ایمان لے آتا، نہ کفر ہوتا نہ مخالفت ہوتی۔

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّلَا
شَفَاعَةٌ ؕ وَ الۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ
وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ يَعۡلَمُ
مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَ لَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ
كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ وَلَا يَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ﴿۲۵۵﴾

اے ایمان والو! اس دن کے آنے سے پہلے جب نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی اور سفارش کام آئے گی، ہم نے تم کو جو کچھ عطا کیا ہے، اس میں سے خرچ کرو اور جو لوگ کفر کرتے ہیں، وہی (اصل میں) ظالم ہیں ﴿۲۵۴﴾ اللہ جو زندۂ جاوید ہے، ﴿۱﴾ جو کائنات کے نظم کو تھامے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، ﴿۲﴾ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے، کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟ ﴿۳﴾ وہ اسے بھی جانتا ہے جو مخلوقات کے سامنے ہے اور اسے بھی جو اُن سے اوجھل ہے، بندے اس کے علم کا ذرا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، سوائے ان باتوں کے علم کے جو خود اللہ دینا چاہے، اس (کے اقتدار) کی کرسی آسمانوں کو اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے، زمین وآسمان کی حفاظت اس پر دشوار نہیں ہے اور وہ بلند وعظیم ذات ہے۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۵۵﴾

﴿۱﴾ ابن کثیر نے ''حی'' کی تفسیر ''الذی لا یموت ابداً'' (جس کو کبھی موت نہیں آئے گی) سے کی ہے، اس رعایت سے اس کا ترجمہ ''زندۂ جاوید'' کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ بائبل میں اللہ کے تھک جانے اور تھک کر آرام کرنے اور سستانے کا ذکر ہے، غالباً قرآن نے اسی باطل خیال کی تردید کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو نیند اور اونگھ آتی ہو اور جو تکان سے دوچار ہوتا ہو، وہ انسان کا معبود نہیں ہوسکتا۔

﴿۳﴾ یعنی قیامت میں انبیاء، شہداء اور بعض صالحین کو شفاعت کا حق دیا جائے گا؛ لیکن یہ شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے تابع ہوگی، اللہ جس کی شفاعت کی اجازت دیں گے، ان ہی کے لئے یہ حضرات شفاعت کریں گے اور اس کے لئے اولین شرط ایمان کی ہے، جن لوگوں کی موت کفر وشرک پر ہوگی؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُصول مقرر کردیا ہے کہ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے: ''إِنَّ اللهَ لاَ يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ'' اس لئے ان کے لئے شفاعت کی اجازت بھی نہ ہوگی، اس میں مشرکین کے علاوہ ان مسلمانوں کے لئے بھی سخت تنبیہ ہے جو قبروں کو سجدہ کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یا اولیاء اللہ کو کائنات میں متصرف کہتے ہیں کہ یہ سب مشرکانہ افعال ہیں، اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔

﴿۴﴾ یہ آیت نمبر: ۲۵۵ آیت الکرسی کہلاتی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو واضح طور پر بتایا گیا ہے اور شرک کی صاف طور پر ←

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙۥ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ
۳۴ ع ۲ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

دین میں زبردستی کی گنجائش نہیں، گمراہی کے مقابلہ ہدایت آشکارا ہوچکی ہے، توجس نے ''طاغوت''﴿۱﴾ کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے مضبوط ڈوری تھام لی جوٹوٹ نہیں سکتی اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں﴿۲﴾ ﴿۲۵۶﴾ اللہ مومنوں کے ناصر ومددگار ہیں، ان کو (گمراہی کی) تاریکیوں سے (ایمان وہدایت کی) روشنی کی طرف لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا، ''طاغوت'' ان کے دوست ہیں، جو ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں،﴿۳﴾ یہی ہیں دوزخ کے حقدار، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۲۵۷﴾

← تردید کی گئی ہے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے اس کو قرآن کی سب سے عظیم آیت قرار دیا، (ابوداؤد عن ابی بن کعب، باب ماجاء فی آیة الکرسی، حدیث نمبر: ۱۴۶۰) ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو قرآن کی تمام آیتوں سردار قرار دیا ہے: ''سیدة أی القرآن آیة الکرسی'' (مستدرک حاکم، باب اخبار فی فضل سورة البقرة، حدیث نمبر: ۲۰۵۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص رات میں سوتے وقت اس آیت کو پڑھ لے، صبح تک شیطان سے اس کی حفاظت ہوگی، (بخاری، باب صفة ابلیس وجنوده، حدیث نمبر: ۳۲۷۵) اس کے علاوہ نمازوں کے بعد بھی اس کے پڑھنے کی فضیلت منقول ہے۔

﴿۱﴾ خدا کے سوا جن کی پرستش کی جائے، جیسے: بت، یا جو انسان کے خدا سے سرتابی اور نافرمانی کا سبب ہو، جیسے: شیطان اور سردارانِ کفار، یہ سب ''طاغوت'' میں داخل ہیں۔

﴿۲﴾ انصار میں جن خواتین کو اولاد نہ ہوتی یا ہوتی مگر زندہ نہ رہتی، وہ نذر مانتیں کہ اگر ان کو اولاد ہوئی اور زندہ رہی تو وہ ان کو یہودی بنادیں گی؛ چنانچہ ایسے متعدد لڑکے یہودیوں کے قبیلہ بنونضیر کے ساتھ تھے، جب بنونضیر جلاوطن کئے گئے تو انصار نے کہا کہ اپنی اولاد کو جانے نہ دیں گے اور جبراً ان کو مسلمان کرنے کے درپئے ہوئے، اس موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، (أبوداؤد، باب فی الأسیر یکره علی الإسلام، حدیث نمبر: ۲۶۸۲) اس سے اسلام کا ایک اہم اُصول معلوم ہوا کہ کسی کو مجبور کرکے اس کا مذہب تبدیل کرانا درست نہیں؛ کیوں کہ مذہب کا تعلق دل کے اعتقاد ویقین سے ہے، جبر کے ذریعہ زبان سے تو اقرار کرایا جاسکتا ہے، دل کی دنیا نہیں بدلی جاسکتی، اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے، محض پروپیگنڈہ ہے، اسلام جب دنیا میں آیا تو ایک ہی شخص تھا، جو مسلمان تھا، وہی اسلام کا داعی اور خدا کا پیغمبر تھا، مکہ کا چپہ چپہ اس کا مخالف تھا، پھر تیرہ سال تک مسلمان ان چند کمزور، نہتے اور مظلوم لوگوں کا مذہب تھا، جن پر کوئی ظلم وستم نہیں تھا جو روانہ رکھا گیا ہو، اُس وقت اسلام کے پاس نہ تلوار تھی، نہ فوج، نہ سپاہ، آخر کونسی طاقت تھی جس کے ذریعہ اسلام نے چند ہی سال میں پورے ←

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸

(اے رسول !) آپ نے اس شخص ﴿۱﴾ کے حال پر نظر نہیں کی کہ چوں کہ اللہ نے اس کو حکومت عطا کی تھی ، ﴿۲﴾ اس نے ابراہیم سے اس کے رب کے سلسلہ میں بحث کی ، جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے، اس نے کہا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں ، ﴿۳﴾ ابراہیم نے کہا کہ اللہ مشرق سے سورج نکالتا ہے تم مغرب سے سورج نکال کر دیکھاؤ ، پس یہ کافر ہکا بکا رہ گیا ، ﴿۴﴾ اور اللہ تعالیٰ ناانصافی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے ۔ ۝۲۵۸

← جزیرۂ عرب کو مسخر کرلیا؟ یہ یقیناً اس کی عدل وانصاف پر مبنی ، فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور عقل و دانش سے مطابقت رکھنے والی تعلیمات تھیں نہ کہ تلوار!

﴿۳﴾ ایمان اور ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام ، کفر وشرک کے ہزار راستے ہیں ، خدا کا انکار ، خدا کو ماننا؛ لیکن ایک سے زیادہ ، خدا کے لئے خاندان اور کنبہ کا ماننا ، خدا کو ذات کے اعتبار سے ایک ماننا؛ لیکن خدا کی صفات اور اختیارات میں دوسروں کو شریک سمجھنا ، خدا کی ذات وصفات میں اس کو یکتا ماننا؛ لیکن اللہ کے حقوق میں دوسروں کو شریک کرنا ، جیسے: غیر اللہ کو سجدہ کرنا ، غیر اللہ کی نذر و نیاز ماننا ، دین کے کسی یقینی حکم کا انکار کر جانا ، غرض کفر کے کتنے ہی راستے ہیں ، اسی لئے قرآن نے تاریکی کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا اور ''ظلمات'' (تاریکیاں) کہا اور ہدایت کے لئے واحد کا صیغہ آیا اور ''نور'' (روشنی) فرمایا گیا۔

﴿۱﴾ یعنی نمرود جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں عراق کا حکمران تھا۔ (قصص الانبیاء لابن کثیر:۹۶)

﴿۲﴾ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر حکومت اور منصب و جاہ انسان کو سرکش و مغرور بنا دیتا ہے؛ اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اقتدار اور اعلیٰ مناصب سے سرفراز کریں ، ان کو اپنے حال پر خوب نظر رکھنی چاہئے۔

﴿۳﴾ نمرود کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنی رعایا میں سے جسے چاہوں قتل کر دوں اور جو مجرم قتل کا مستحق ہو ، اس کی سزا معاف کر دوں ، اسی کو اس نے زندہ کرنے اور مارنے سے تعبیر کیا۔

﴿۴﴾ حالاں کہ نمرود کہہ سکتا تھا کہ میں مشرق سے سورج نکالتا ہوں ، تم اپنے خدا سے کہو کہ مغرب سے نکالے؛ لیکن یا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی عقل کو ماؤف کر دیا تھا ، یا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت کو جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر وہ ایسا کہے تو مغرب سے آفتاب نکلنے کا معجزہ بھی ظاہر ہو سکتا ہے ، پھر تو اپنی رعایا کو ایمان سے باز رکھنا دشوار ہوگا؛ اس لئے خاموش ہو جانے میں ہی خیر ہے!

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ
فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ
بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ
وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ
لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ
قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ
اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع ۳۵ ۳

(اے رسول!) یا آپ نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں فرمائی، جس کا ایک بستی پر گذر ہوا، جو اپنے چھپروں پر گری ہوئی تھی، اس نے کہا: اللہ اس کو مر جانے کے بعد کس طرح زندہ کریں گے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے موت دی اور سو سال اسی حال میں رکھا، پھر اسے زندہ کیا (اور) دریافت فرمایا: تو کتنے دن (اس حال میں) رہا ہوگا؟ اس نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ نے کہا: بلکہ تو سو سال (اس حال میں) رہا ہے، (ذرا) اپنے کھانے پینے کا سامان تو دیکھ، جو اَب تک خراب نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ، ﴿۱﴾ ایسا ہم نے اس لئے کیا کہ تجھ کو لوگوں کے لئے نشانی بنادیں، اور ان ہڈیوں کی طرف تو دیکھنا کہ ہم کس طرح ان ہڈیوں کو جوڑتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، جب اس پر (دوبارہ زندہ کرنے کی) کیفیت واضح ہوگئی تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۲۵۹﴾ اور (وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ) جب ابراہیم نے عرض کیا: میرے پروردگار! مجھے دکھا دیجئے کہ آپ کس طرح مُردوں کو زندہ کرتے ہیں؟ اللہ نے دریافت فرمایا: کیا تجھے یقین نہیں ہے؟ ابراہیم نے عرض کیا: کیوں نہیں؛ لیکن (دیکھنا چاہتا ہوں کہ) دل کی تسلی ہوجائے، اللہ کا ارشاد ہوا: چار پرندے لے لو، ان کو اپنے آپ سے مانوس کرلو، پھر ہر پہاڑ پر ان پرندوں میں سے ایک ٹکڑا رکھ دو، اس کے بعد ان کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان لو کہ اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۶۰﴾

﴿۱﴾ جس کی صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا، گوشت اور چمڑے وغیرہ کا نام ونشان بھی ختم ہو چکا تھا۔

﴿۲﴾ یہ واقعہ کن بزرگ کا ہے؟ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے، (مستدرک حاکم، عن علی، کتاب التفسیر، من سورۃ البقرۃ: ۲/۳۱۰) اور یہی اکثر سلف صالحین کا قول ہے۔ ←

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس دانہ کی سی ہے جو سات بالیاں اگائے، ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لئے چاہیں (اس سے بھی) بڑھا دیں، اور اللہ کشادگی والے اور خوب جاننے والے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۲۶۱﴾ جو لوگ اللہ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذاء پہنچاتے ہیں، ﴿۲﴾ ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر (محفوظ) ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ بھلی بات اور درگذر اُس صدقہ سے بہتر ہے، جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے، ﴿۳﴾ اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہیں۔ ﴿۲۶۳﴾

← ﴿۳﴾ انبیاء کرام انسانیت کو اللہ کے نظامِ غیبی پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں، خود انبیاء کا ایمان سب سے قوی ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ غیب کی بعض چیزیں اپنے اِن نمائندوں کو دیکھا دیتے ہیں؛ تاکہ ان کو مزید قلبی طمانینت حاصل ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلامی اور جلوۂ الٰہی کا ظہور، حضرت عزیر علیہ السلام کا گدھے کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا مشاہدہ، حضرت مسیح علیہ السلام کا جسم سمیت آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معراج کا واقعہ، اسی قبیل سے ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کیفیت کو سرکی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ واقعہ بھی اسی نوعیت کا ہے، توحید اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی یہ دونوں باتیں اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے واقعہ سے عقیدۂ توحید کو ثابت کیا گیا اور حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس دوسرے واقعہ سے آخرت کی زندگی کو۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کم سے کم اجر سات سو گنا ہے اور اللہ اپنے فضل و کرم سے اس میں بھی اضافہ فرما دیتے ہیں؛ کیوں کہ اللہ فراخ دل اور کشادگی والے ہیں اور چوں کہ خوب جاننے والے بھی ہیں؛ اس لئے لوگوں کے اخلاص کے لحاظ سے ان کو ثواب عطا فرماتے ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی نہ طعنہ دیتے ہیں، نہ ان کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی نرمی سے معذرت کر دینا اور اگر وہ تنگ کریں اور الحاح سے کام لیں تو اسے برداشت کرنا اور درگذر سے کام لینا ایسے صدقہ سے بہتر ہے، جس کے بعد احسان جتایا جائے یا اذیت پہنچائی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ
النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ
فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ
اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾
ع ۳۶ ۴

اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اپنے صدقہ کو اس شخص کی طرح ضائع نہ کرلو، جو اپنا مال لوگوں کے دیکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا، اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر (تھوڑی سی) مٹی ہو، پھر زور کی بارش ہو اور اسے بالکل صاف کردے، ان کو اپنی کمائی میں سے بھی کچھ ہاتھ نہ لگے گا،《۱》اور اللہ کفر پر بہ ضد رہنے والوں کو ہدایت سے سرفراز نہیں کرتے ﴿۲۶۴﴾ اور جو لوگ اپنا مال اللہ کی خوشنودی کے لئے اور دلوں کی آمادگی《۲》کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ کی ہے جو بلندی پر ہو، زور کی بارش ہو تو دوگنا پھل آجائے، اگر زور کی بارش نہ ہو تو پھوار بھی کافی ہوجائے،《۳》اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہے ہیں ﴿۲۶۵﴾ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہوگی کہ اس کے پاس کھجور اور انگوروں کے باغ ہوں، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس میں ہر طرح کے پھل ہوں اور اس کا بوڑھاپا آجائے، ناتواں بچوں کا ساتھ ہو، کہ باغ کو آگ کا شعلہ آلگے اور باغ جل کر رہ جائے، اللہ اسی طرح کھول کھول کر تمہارے لئے احکام بیان کرتے ہیں؛ تاکہ تم غور وفکر سے کام لو۔《۴》﴿۲۶۶﴾

《۱》 یعنی جیسے پتھر پر بارش ہو تو اس سے غلہ حاصل نہیں ہوسکتا، اسی طرح اگر اخلاص کے بغیر صدقہ کیا جائے تو اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

《۲》 امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے ''تثبیتاً'' کے معنی ''تصدیق ویقین'' اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے ''نیت'' کے نقل کئے گئے ہیں، (تفسیر ابن کثیر: ۱/۶۹۴) اسی لئے اس کا ترجمہ ''آمادگی'' سے کیا گیا ہے کہ دلوں کی آمادگی ہی کا نام یقین اور اخلاصِ نیت ہے۔

《۳》 یعنی اخلاص کے ساتھ زیادہ مال خرچ کیا جائے یا کم، بہر حال اس پر اجر وثواب حاصل ہوگا۔

《۴》 جو شخص خرچ کرتا ہے؛ لیکن بغیر اخلاص کے، اس نے اپنے اسی عمل پر بھروسہ کر رکھا ہے؛ لیکن جب قیامت میں نامۂ اعمال ←

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا
تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً
مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۸

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کیا ہے، اس میں سے بہتر حصہ خرچ کرو اور تم خرچ کرتے ہوئے مال میں سے ایسی خراب چیز دینے کا ارادہ نہ کرو کہ تم خود اس کو قبول کرنے کو تیار نہ ہو، سوائے اس کے کہ چشم پوشی سے کام لو، ﴿۱﴾ اور جان لو کہ اللہ (تمہارے خرچ کرنے سے) بے نیاز اور خوبیوں والے ہیں ۝۲۶۷ شیطان تم کو محتاجی کا خوف دلاتا ہے اور بخل پر اُکساتا ہے ﴿۲﴾ اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتے ہیں اور اللہ کشادگی والے اور خوب جاننے والے ہیں۔ ۝۲۶۸

← کھلے گا تو معلوم ہوگا کہ احسان جتانے، ایذاء پہنچانے اور اخلاص کی بجائے ریاء ونمائش کی وجہ سے اس کا یہ عمل مقبول نہیں، اس وقت اس کی مثال ایسے کم نصیب باغباں کی ہوگی، جس نے اپنے سرسبز وشاداب اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات پر بھروسہ کر رکھا تھا؛ لیکن عین اس وقت جب بوڑھا ہو چکا ہے، خود محنت کی طاقت نہیں اور بچے بھی اس لائق نہیں کہ اجڑے ہوئے باغ کو دوبارہ آباد کرسکیں، پورا باغ جل کر خاکستر ہو جائے۔

﴿۱﴾ طیب کے معنی عمدہ کے ہیں، ظاہری عمدگی یہ ہے کہ چیز اچھی ہو، خراب نہ ہو، معنوی عمدگی یہ ہے کہ حلال ہو اور مشتبہ نہ ہو، مفسرین نے یہاں ''طیب'' سے حلال مراد لیا ہے کہ ایسا ہی مال صدقہ کیا جائے جو حلال ہو؛ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مالِ حلال ہی قبول فرماتے ہیں (سنن ترمذی، باب لا تقبل صلوٰۃ بغیر طھور، حدیث نمبر:۱)؛ اسی لئے علماء کی رائے ہے کہ اگر کسی کے پاس کسی طرح حرام مال آگیا تو اس کے مالک کو واپس کر دینا چاہئے، مالک کا پتہ نہ چلے تو غرباء پر بلا نیت ثواب خرچ کردے، رشوت، بینک انٹرسٹ وغیرہ کی رقوم کا یہی حکم ہے — دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مادی اعتبار سے 'اچھا مال' مراد ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم جماعتِ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، انصار کا معمول تھا کہ جب ان کے باغ میں کھجور کا پھل آتا تو ایک دو خوشے 'صُفہ' (وہ سائبان جو مسجد نبوی سے متصل طالبانِ علم اور مہمانوں وغیرہ کے لئے بنایا گیا تھا) میں چھپر سے لٹکا دیتے؛ تاکہ اہل ضرورت کھائیں، بعض لوگ 'جن کو خیرات کی رغبت نہ ہوتی' وہ خراب کھجوریں یہاں لٹکا دیتے، اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، (ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر:۲۹۸۷) اس روایت سے اس دوسرے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے — قرآن کا لفظ ''طیب'' دونوں معنوں کو شامل ہے۔

﴿۲﴾ ''فحشاء'' کے معنی بے حیائی کے بھی ہیں اور بخل کے بھی؛ اسی لئے عربی میں ''بخیل'' کو ''فاحش'' بھی کہتے ہیں، (أحکام القرآن للجصاص:۱/۵۵۷، باب المکاسبہ) یہاں ''بخل'' ہی کا معنی زیادہ واضح ہے۔

يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا
الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا
ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

اللہ جسے چاہتے ہیں دین کی سمجھ عطا کرتے ہیں اور جس کو دین کی سمجھ دے دی گئی، اسے بڑی نعمت سے نواز دیا گیا
اور عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ﴿۲۶۹﴾ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا نذر مانتے ہو، اللہ اس سے واقف ہیں
اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ﴿۲۷۰﴾ اگر تم صدقہ ظاہر کر کے دو تب بھی اچھی بات ہے اور چھپا کر دو اور دو محتاجوں کو، تو
یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، نیز اللہ (اس کو) تمہارے کچھ گناہوں کے لئے کفارہ بھی بنادیں گے، اور اللہ
تمہارے کاموں سے باخبر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۷۱﴾ ان کو راہِ ہدایت پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں؛ لیکن اللہ ہی جسے چاہتے ہیں،
ہدایت دیتے ہیں اور جو مال تم خرچ کروگے، وہ اپنے ہی لئے خرچ کروگے، نیز اللہ کی خوشنودی ہی کے لئے خرچ
کیا کرو، تم جو بھی خرچ کرتے ہو تم کو پورا پورا مل جائے گا ﴿۲﴾ اور تمہارے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ﴿۲۷۲﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں تین باتیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں: اول یہ کہ اگر دکھاوا مقصود نہ ہو تو دکھا کر بھی صدقہ کرنے میں حرج نہیں، دوسرے یہ کہ عام حالات میں چھپا کر دینے میں اجر زیادہ ہے، علماء نے لکھا ہے کہ اگر سائل خود اپنے سوال کو نہ چھپائے اور علانیہ دینے میں دوسروں کو ترغیب دینا مقصود ہو تو دکھا کر دینا بہتر ہے، اسی طرح بیت المال کو ادا کرے تو علانیہ دینے میں حرج نہیں، نفل صدقہ ہو یا صدقہ واجبہ ہو؛ لیکن افراد و اشخاص کو دے رہا ہو تو چھپا کر دینا چاہئے، تیسرے: صدقہ بعض گناہوں کے لئے کفارہ کا کام کرتے ہیں، یوں تو مختلف نیکیاں گناہوں کے لئے کفارہ ہوتی ہیں؛ لیکن صدقہ میں کفارہ ہونے کی خاص صلاحیت ہے؛ اسی لئے روزہ، قسم، قتل اور ظہار وغیرہ کے کفارات میں غلام آزاد کرنا اور محتاجوں کو کھانا کھلانا شامل ہے۔

﴿۲﴾ یعنی اس کا بھرپور اجر ملے گا، انصار میں سے کچھ لوگ اپنے مشرک رشتہ داروں کی مدد سے گریز کرتے تھے؛ تاکہ یہ ان کے ایمان لانے کا باعث ہو جائے، اس پر تنبیہ کی گئی کہ ہدایت تمہارے ہاتھ میں نہیں، تم جو بھی خرچ کروگے، خواہ مشرکین پر خرچ کرو، اگر مقصد اللہ کی خوشنودی ہے تو ضرور اس کا اجر ملے گا (روح المعانی: ۳/ ۴۷) اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے رہنا چاہئے، اس سے آخرت میں اجر و ثواب تو ہوگا ہی، دنیا میں بھی تالیفِ قلب ہوگی اور ممکن ہے ان کو اسلام قبول کرنے کی توفیق ہو جائے یا کم سے کم اسلام کے بارے میں ان کے دل میں نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا
الربع تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا ع ۳۷/۵
وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ
يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ
وقف لازم بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ
مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اصل حق ان ضرورت مندوں کا ہے جو اللہ کے راستہ میں گھرے ہوئے ہیں، وہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے، دستِ سوال نہ پھیلانے کی وجہ سے ناواقف لوگ ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچان سکتے ہو، تم جو بھی مال خرچ کروگے، اللہ اس سے واقف ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۷۳﴾ جو لوگ اپنے مال دن و رات چھپا کر بھی اور علانیہ بھی خرچ کرتے ہیں، ﴿۲﴾ ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر (محفوظ) ہے، نہ ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۴﴾ سود ﴿۳﴾ کھانے والے (قیامت میں) آسیب زدہ شخص ﴿۴﴾ کی طرح کھڑے ہوں گے، ایسا اس لئے ہوگا کہ انھوں نے کہا تھا: یقیناً تجارت بھی سود ہی کی طرح ہے؛ حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، ﴿۵﴾ تو جس کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ رک گیا، تو جو پہلے لے چکا ہے، ﴿۶﴾ وہ اس کے لئے ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے اور جو اَب بھی سود لیں، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ ﴿۲۷۵﴾

﴿۱﴾ اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا بہترین مصرف وہ لوگ ہیں جو دین اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہوں، جیسے علماء، طلبہ اور دعوتِ دین کا کام کرنے والے، دوسرے: کھلے عام مانگنے والوں کے مقابلہ ایسے لوگوں کو دینا بہتر ہے، جن میں خودداری ہو اور وہ سوال کرنے سے بچتے ہوں۔

﴿۲﴾ بعض روایات سے معلوم ہوتا کہ یہ آیت حضرت علی، حضرت عثمان یا حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ (اسباب النزول للواحدی: ۸۷) تاہم قرآن کا حکم عام ہے، کسی شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص نہیں۔

﴿۳﴾ کفر و شرک کے بعد سب سے زیادہ جس گناہ کی اسلام میں مذمت کی گئی ہے، وہ سود ہی ہے، قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کی چار آیات: ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹ سود کی حرمت و شناعت میں آئی ہیں، اس کے علاوہ آل عمران: ۱۳۰، اور نساء: ۱۶۰-۱۶۱ میں بھی ←

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

اللہ سود کو مٹاتے اور صدقات کو بڑھاتے ہیں، ﴿۱﴾ اور اللہ ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں فرماتے ﴿۲۷۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے، عمل صالح کیا، نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے ان کا اجر اُن کے رب کے پاس محفوظ ہے، نہ ان کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۲۷۷﴾

← اس کا ذکر موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے سود لینے والے، دینے والے، سودی لین دین کے معاملہ میں گواہ بننے والے اور سودی معاملہ کو لکھنے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے، (ابوداؤد، باب فی آکل الربوا و موکلہ، حدیث نمبر: ۳۳۳۳) مالی لین دین کے معاملہ میں ایک فریق کی طرف سے ایسا اضافہ جس کا دوسرے فریق کی طرف سے کوئی عوض نہ ہو، ربا ہے، (ھندیہ: ۳/ ۱۱۷) جس کو اُردو میں ''سود'' کہتے ہیں؛ اسی لئے قرض پر کسی طرح کا نفع اُٹھانا سود میں داخل ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کل قرض جر نفعا فھو ربا'' (سنن کبریٰ للبیہقی: ۵/ ۵۷۳، باب کل قرض الخ) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی کہ آپ نے فرمایا کہ مقروض اگر تم کو اپنی سواری پر سوار کرے، تو یہ بھی قبول نہ کرو، سوائے اس کے کہ پہلے بھی وہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کرتا رہا ہو، (ابن ماجہ، باب القرض: ۲/ ۶۱) اس لئے بینک انٹرسٹ، انشورنس میں ملنے والا نفع، باؤنڈز پر ملنے والی زیادہ رقم، آج کل رہن کے طور پر مقروض سے مکان اور کھیت حاصل کر کے اس سے نفع اُٹھانے کا جو رواج ہے، یہ سب سود کی صورتیں ہیں۔

﴿۴﴾ لغوی معنی ہے ''جسے شیطان چھو کر خبطی بنادے،'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات انسان پر جنات کا سوار ہوجانا ممکن ہے، یہ محض واہمہ نہیں؛ چوں کہ سود خوار مال و دولت کی حرص میں گویا حواس باختہ سا ہوتا ہے اور غریبوں اور مفلسوں کی کوئی فکر نہیں کرتا؛ اس لئے اس کو اسی کے مناسب سزا دی جائے گی، جس سے وہ لوگوں کے درمیان کھلے عام پہچانے جائیں گے۔

﴿۵﴾ سب سے اہم فرق تو سود اور تجارت کا یہی ہے کہ ایک کو اللہ نے حرام کیا ہے اور دوسرے کو جائز، دوسرے: تجارت میں نفع کی اُمید بھی ہوتی ہے اور نقصان کا اندیشہ بھی؛ لیکن سود میں ''نفع'' متعین ہوتا ہے، تاجر نفع و نقصان میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہے؛ اسی لئے تجارت کی بڑی فضیلت ہے اور سود خوار نقصان کا خطرہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا؛ اس لئے سود اُسی درجہ مذموم ہے۔

﴿۶﴾ یعنی سود حرام ہونے سے پہلے جو سود لے چکا ہے، وہ اب اس کی ملکیت ہے، اس پر کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔

﴿۱﴾ بہ ظاہر سود سے مال بڑھتا ہے اور صدقہ سے کم ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ صدقہ سے برکت دیتے ہیں، آفتوں سے حفاظت ہوتی ہے، سود خوار کے یہاں بے برکتی ہوتی اور طرح طرح کی آفتیں من جانب اللہ آتی ہیں؛ اس لئے جتنا مال بڑھتا ہے، اس سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا
تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا
كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ۳۸ ع ۶

اے ایمان والو! اگر تم واقعی مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود ابھی باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، ﴿۱﴾ ﴿۲۷۸﴾ اگر ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، پھر اگر تم توبہ کر لیتے ہو تو تمہارا اصل مال تمہارے لئے (حلال) ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے، ﴿۲﴾ ﴿۲۷۹﴾ اور اگر کوئی (مقروض) تنگ دست ہے تو آسانی پیدا ہونے تک مہلت دینی چاہئے اور یہ بات کہ (قرض) معاف ہی کر دو، تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو ﴿۳﴾ ﴿۲۸۰﴾ اور اس دن سے ڈرتے رہو، جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا عمل (یعنی عمل کا بدلہ) پورا پورا دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ ﴿۲۸۱﴾

﴿۱﴾ اسلام میں سود کس درجہ سخت گناہ ہے، وہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کسی اور گناہ کے بارے میں اس درجہ سخت لب ولہجہ اختیار نہیں کیا گیا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی گروہ سود لینے پر مصر ہو تو اس پر فوج کشی بھی کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ اگر وہ سود کو حرام ہی نہیں سمجھتا تو مرتد ہے، حرام سمجھ کر عمل سے انکار کرتا ہے تو ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم ہے، جیسا کہ فقہاء نے ان لوگوں سے جہاد کا حکم دیا ہے جو اذان یا جماعت کے ترک کرنے پر اتفاق کر لیں، (ردالمحتار: ۴۹/۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حربیوں سے بھی سود لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ جن لوگوں پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کا سود باقی تھا، وہ فتح مکہ سے پہلے کے معاملہ پر مبنی تھا اور وہ اس وقت یقیناً حربی تھے، جمہور کا مسلک یہی ہے کہ نہ دار الاسلام میں سود جائز ہے نہ دار الحرب میں، نہ مسلمانوں سے جائز ہے نہ غیر مسلموں سے، ہندوستان اور اس جیسے ممالک اولاً تو دار الحرب ہیں ہی نہیں اور یہاں کے غیر مسلم معاہد ہیں نہ کہ حربی، اور اگر دار الحرب مان بھی لیا جائے جب بھی سودی کاروبار جائز نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی نہ تم سود لے کر دوسرے پر ظلم کرو اور نہ اصل مال کی ادائیگی سے بھی انکار کر کے تم پر ظلم کیا جائے۔

﴿۳﴾ سود کا لین دین اسی لئے رواج پاتا ہے کہ اہل دولت غیر سودی قرض دینے کو تیار نہیں ہوتے، اگر لوگ قرض دینے لگیں تو خود بخود سماج سے سود ختم ہو جائے؛ اسی لئے قرض دینے کی تاکید کی گئی اور تنگدست مقروض کو مہلت دینے کی ہدایت فرمائی گئی؛ چوں کہ سود خوار ایسے ہی لوگوں کی تنگدستی سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور سود در سود لگاتا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اے ایمان والو! ﴿۱﴾ جب تم ایک مقررہ مدت کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور چاہئے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے، نیز جس کو لکھنا آتا ہے، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہئے، جیسا کہ اللہ نے اس کو (لکھنا) سکھا دیا ہے، اس کو (بھی) چاہئے کہ لکھ دے اور جس کے ذمہ حق ہے، وہ لکھائے، اللہ سے — جو اس کا پروردگار ہے — ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کمی نہ کرے، اگر وہ کم عقل یا کمزور ہو یا وہ خود لکھانے پر قادر نہ ہو تو اس کا ''ولی'' ﴿۲﴾ انصاف کے ساتھ لکھا دے اور اپنے مردوں میں سے دو شخص کو گواہ بنالو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو، گواہان ایسے لوگوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرتے ہو، (دو عورتیں اس لئے کہ) اِن دو میں سے ایک بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے، ﴿۳﴾ اور گواہان جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں اور ادھار معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، لکھنے میں سستی نہ کرو، اس طرح لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف، گواہی کو درست رکھنے کا باعث اور شک وشبہ سے بچانے والا ہے، ﴿۴﴾ ہاں، اگر کوئی دست بدست خرید وفروخت کا معاملہ ہو — جو تم آپس میں کیا کرتے ہو — تو اس کے نہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور خرید وفروخت کے وقت گواہ بنالیا کرو، کسی کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دی جائے، اگر ایسا کروگے تو تم کو گناہ ہوگا، نیز اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ تم کو علم سے نوازتے ہیں اور ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔ ﴿۲۸۲﴾

﴿۱﴾ یہ آیت ''آیت مداینت'' کہلاتی ہے، یہ قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت ہے اور معاملات سے متعلق بہت سے احکام اس میں آگئے ہیں، کم سے کم بارہ احکام اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیئے ہیں: ←

←(۱) اُدھار معاملہ کو لکھ لینا چاہئے؛ یہ مستحب ہے۔
(۲) کاتب کا عادل یعنی سچا اور قابل بھروسہ ہونا ضروری ہے؛ تاکہ دستاویز میں دھوکہ دہی نہ ہو۔
(۳) جو شخص دستاویز بنانے پر قادر ہو، اس کو اس خدمت سے انکار نہ کرنا چاہئے۔
(۴) جس شخص پر حق ہو یعنی جس کے ذمہ دین اور قرض ہو، اسی کو بے کم و کاست دستاویز لکھانی چاہئے؛ تاکہ اس کے لئے کوئی عذر نہ رہے۔
(۵) جس کے ذمہ دین ہو اگر وہ خود دین کی دستاویز لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، جیسے: پاگل، کم عقل، ضعیف، نابالغ یا بہت بوڑھا، یا کسی اور وجہ سے لکھانے پر قادر نہ ہو، جیسے گونگا ہو، یا دوسرے فریق کی زبان سے واقف نہ ہو تو جو اس کا ذمہ دار ہو، جیسے: ولی یا وصی یا قاضی، وہ دستاویز لکھائے گا۔
(۶) بہتر ہے کہ معاملہ پر گواہ بھی بنالیا جائے۔
(۷) ایسے معاملات کے لئے گواہی کا نصاب یہ ہے کہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں۔
(۸) گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ عادل و معتبر ہوں، ''ممن ترضون من الشھداء'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔
(۹) جن کو فریقین گواہ بنانا چاہیں، مستحب ہے کہ وہ بھی گواہ بننے اور گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔
(۱۰) دست بدست لین دین کے لکھنے کی حاجت نہیں؛ کیوں کہ اس میں نزاع کا امکان یا تو نہیں ہے یا بہت کم، تاہم اس کو بھی لکھ لیا جائے تو حرج نہیں۔
(۱۱) کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے، مثلاً: کاتب اجرتِ کتابت چاہتا ہو اور اس کو مفت کتابت پر مجبور کیا جائے، یا گواہان کو وہاں تک آمد و رفت کے خرچ کی ضرورت ہو؛ لیکن ان کو مفت آمد و رفت کے لئے کہا جائے، یا ان کے اوقات کی مصلحت کا خیال نہ رکھا جائے ـــــ یہ احکام تو صراحتاً موجود ہیں، ان کے علاوہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معاملات کے ثبوت میں فی الجملہ تحریر کا اعتبار ہے؛ لیکن اس میں تفصیل ہے کہ کونسی تحریر مقبول ہوگی؟ وہ تحریر جو قاضی کے پاس ہو یا وہ بھی جو اصحابِ معاملہ کے پاس ہو، کتبِ فقہ اور خاص کر ''قضاء'' سے متعلق کتابوں میں اس کی تفصیلی بحث ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر سودی قرض کے سلسلہ میں جو ادارے قائم ہیں، وہ مقروض سے حساب و کتاب کے عملہ کی اجرت حاصل کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ قرض لکھانا اصل میں اسی کی ذمہ داری ہے؛ البتہ حقیقی اخراجات سے زیادہ لینا جائز نہیں۔

﴿۲﴾ ''ولی'' سے مراد وہ شخص ہے جو اس کے معاملات کا ذمہ دار ہو، نابالغ یا پاگل ہو تو اس کا ولی، یا ولی کا وصی جس کو اس نے اپنی وفات کے بعد ذمہ دار بنایا ہو، یا قاضی، یا اس کا وکیل، زبان نہ جانتا ہو تو ترجمان، وغیرہ۔

﴿۳﴾ گواہی میں دو عورت کو ایک مرد کے برابر اس لئے رکھا گیا ہے کہ عورتوں میں جذبات کا عنصر زیادہ ہے، یہ ان کے منصب مادری کے لئے مناسب بھی ہے، جذبات کی فراوانی قوتِ حافظہ کو بھی متاثر کرتی ہے اور کسی واقعہ کو سمجھنے اور اخذ کرنے کی قوت کو بھی، خود مرد اگر سخت غصہ میں ہو یا خوشی سے سرشار ہو تو اس حالت میں اس کے قویٰ فکری کم کام کر پاتے ہیں، اس کے علاوہ عورتوں کے دماغ کا حجم بہ نسبت مردوں کے کم ہوتا ہے، مرد کے بھیجہ کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا ہوتا ہے اور عورت کا ایک اور چوالیس کا، ظاہر ہے کہ اس کا اثر کسی بات کو سمجھنے اور اس کو یاد رکھنے پر بھی پڑتا ہوگا۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا
فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ
اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا ع ۳۹ ۲ ۷
فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن کی چیزیں ہوں، جو قبضہ میں دے دی جائیں ﴿۱﴾ اور اگر ایک دوسرے پر اعتماد کریں تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہئے کہ اپنی امانت ادا کرے، ﴿۲﴾ اور اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے، ڈرے، اور تم لوگ گواہی چھپایا مت کرو، جو گواہی کو چھپائے اس کا دل گنہگار ہے ﴿۳﴾ اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں ﴿۲۸۳﴾ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے، تمہارے دل میں جو باتیں ہیں، ان کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لیں گے، پھر جس کو چاہیں گے معاف کردیں گے اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں گے، ﴿۴﴾ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ﴿۲۸۴﴾

﴿۱﴾ ''ادنیٰ'' کا ترجمہ بعض مفسرین نے ''احریٰ'' سے کیا ہے، یعنی زیادہ اس لائق ہے کہ شبہ میں نہ پڑو۔ (تفسیر خازن: ۱/ ۲۱۶)

﴿۲﴾ یعنی اگر معاملہ کو لکھنا دشوار ہو تو اطمینان و اعتماد کی دوسری صورت رہن کی ہے کہ جس کے ذمہ حق ہے، وہ کوئی شئ دوسرے فریق کے پاس یا ان دونوں کی رضامندی سے کسی تیسرے شخص کے پاس رکھ دے، ''سفر'' کی قید محض اتفاقی ہے، گھر پر رہتے ہوئے بھی رہن رکھا جاسکتا ہے اور خود رسول اللہ ﷺ سے اس طرح رہن رکھنا ثابت ہے۔ (مسند أحمد عن أنس: ۳/ ۱۶۸، حدیث نمبر: ۱۲۳۴۵)

﴿۳﴾ اگر کوئی شخص کسی بات کا گواہ ہو اور کوئی دوسرا گواہ نہ ہو، اگر وہ گواہی نہ دے تو صاحبِ حق حق سے محروم ہوجائے یا دوسرے فریق کے غلط دعویٰ کی وجہ سے ناحق اس پر کوئی حق عائد ہوجائے تو گواہی دینا واجب اور گواہی سے انکار کرنا حرام ہے اور اگر متعدد گواہ موجود ہوں تو گواہی دینا ''واجب علی الکفایہ'' ہے، یعنی کوئی گواہی نہ دے تو سب گنہگار ہوں گے اور کوئی بھی دو اشخاص گواہی دے دیں تو دوسروں سے بھی بارِ گناہ ختم ہوجائے گا۔ (تفسیر خازن: ۱/ ۲۱۴)

﴿۴﴾ دل میں جو باتیں ہوتی ہیں، وہ دو طرح کی ہیں، ایک وہ ہیں جن میں قصد و ارادہ کو دخل نہیں، بلا قصد و ارادہ خیالات کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے، اس پر مؤاخذہ نہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس بات کا دل میں خیال آئے، جب تک انسان اسے نہ بولے یا اس پر عمل نہ کرے، اللہ نے اس کو میری اُمت سے معاف کردیا ہے، (بخاری عن ابی ہریرۃ، باب إذا حنث ناسیا في الأیمان، حدیث نمبر: ۶۶۶۴) دوسرے ایسے خیالات ہیں جن کو دل میں جمایا جائے یا کسی برائی کا عزمِ مصمم اور پختہ ارادہ کرلیا جائے، یہ اختیاری خیالات اور ارادے ہیں، ان پر پکڑ ہوسکتی ہے، یہاں ایسے ہی خیالات کا ذکر ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ
وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ٭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ
الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ٝ وَاغْفِرْ لَنَا ٝ وَارْحَمْنَا ٝ اَنْتَ
مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع ۴۰ ۸

رسول اور ایمان والے اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، جو اُن پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی ہے، (یہ) سبھی اللہ، اللہ کے فرشتوں، اللہ کی کتابوں اور اللہ کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، ﴿۱﴾ (اور کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے (کہ کسی کو نبی مانیں اور کسی کی نبوت کا انکار کرجائیں)، یہ سب بول اٹھے: ہم نے سنا اور قبول کیا، اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اور (ہمیں) آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے ﴿۲۸۵﴾ اللہ کسی بھی شخص کو اس کی طاقت کے بہ قدر ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، ﴿۲﴾ ہر شخص کو ثواب بھی اسی کا ہے جو اس نے کیا، اور گناہ بھی اسی کا جو اس نے کیا، اے ہمارے پروردگار! ﴿۳﴾ اگر ہم سے بھول چوک ہوجائے تو ہماری پکڑ نہ فرمایئے، ﴿۴﴾ ہمارے رب! اور ہم پر (سخت احکام کا) بوجھ نہ رکھئے، جیسا کہ آپ نے ہم سے پہلی اُمتوں پر رکھا تھا، ﴿۵﴾ ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بار نہ ڈالئے کہ جس کی ہم میں طاقت نہیں اور ہم سے درگذر کیجئے، ہمیں بخش دیجئے اور ہم پر رحم فرمایئے، آپ ہی ہمارے کارساز ہیں، پس آپ کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرمایئے!! ﴿۶﴾ ﴿۲۸۶﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں اسلام کے تمام عقائد کا اجمالی تذکرہ ہے، ان میں سے کسی کا بھی انکار کفر ہے۔

﴿۲﴾ اس سے شریعت کا ایک عام اُصول معلوم ہوا کہ جو شخص کسی حکم شرعی کے بجالانے پر قادر ہی نہ ہو، وہ اس کا مکلف نہیں؛ اسی لئے نابالغ، پاگل، سوئے ہوئے شخص، بے ہوش، کسی عبادت کی ادائیگی سے عاجز، جبر واکراہ کے تحت کسی ناجائز فعل کے مرتکب وغیرہ کو شرعاً معذور سمجھا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ یہاں سے آخر تک دُعائیں ہیں، عطاؒ سے منقول ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان آیتوں کو آپ ﷺ پر تلاوت فرمایا، تو آپ ﷺ ہر دُعاء پر ''آمین یارب العالمین'' کہتے جاتے تھے، (فتح القدیر للشوکانی: ۱/۳۸۶) اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب اس سورہ کی تلاوت سے فارغ ہوتے تو ''آمین'' کہا کرتے، (تفسیر طبری: ۳/۱۰۷) لہٰذا نماز سے باہر اور نفل نمازوں میں ان دُعائیہ آیتوں کے بعد ''آمین'' کہنا چاہئے۔

←

← ﴿۴﴾ بھول (نسیان) اور غلطی (خطاء) سے جس بات کا صدور ہو جائے ، آخرت میں اس پر پکڑ نہیں ، یہی اس دُعاء کا مدعا ہے ، دنیوی احکام میں بعض مواقع پر بھول چوک بالاتفاق معاف ہے ، جیسے : روزہ میں بھول کر کھا لینا ، بعض صورتوں میں بالاتفاق اس کا اعتبار نہیں ، جیسے بھول کر یا غلطی سے کسی کا مال ضائع کر دے تب بھی تاوان واجب ہوگا ، بعض صورتوں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے ، جیسے نماز میں بھول کر گفتگو ، فقہ کی کتابوں میں اس سلسلہ کی تفصیلات موجود ہیں ۔

﴿۵﴾ جیسا کہ بنی اسرائیل کو توبہ کے طور پر قتل کا حکم دیا گیا تھا ۔

﴿۶﴾ یوں تو پوری سورۂ بقرہ ہی کی بڑی فضیلت منقول ہے ؛ لیکن آخری دو آیتوں کی خصوصی فضیلت ہے ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا : جس نے رات میں سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھیں تو یہ آیتیں اس کے لئے کافی ہو جائیں گی ، (بخاری ، باب فضل سورة البقرة ، حدیث نمبر : ۵۰۰۹) اس طرح کی اور بھی احادیث ہیں ، جو ان آیتوں کی فضیلت میں منقول ہیں ۔

سُورَۃ آلِ عِمرَان

- سورہ نمبر : (۳)
- رکوع : (۲۰)
- آیتیں : (۲۰۰)
- نوعیت : مدنی

یہ قرآن مجید کی تیسری سورت ہے اور پوری سورت مدنی ہے، بالاتفاق اس میں دوسو آیتیں ہیں ؛ اگرچہ ترتیب کے اعتبار سے یہ سورت پہلے ہے ؛ لیکن کہا جاتا ہے کہ نازل ہونے کے اعتبار سے یہ سورۂ انفال کے بعد ہے، اس کی ابتدائی ۸۳ آیتیں نجران کے عیسائی وفد کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بعض حصہ مدنی زندگی کے اخیر میں نازل ہوا ہے ؛ کیوں کہ یہ وفد آپ ﷺ کی خدمت میں ۹ ؍ ہجری میں آیا تھا، اس سورت میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، حضرت مریم علیہا السلام عمران کی بیٹی تھیں، اسی مناسبت سے اس سورت کا نام 'آلِ عمران' ہے، اس سے قرآن مجید کی بے تعصبی بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے قرآن سے بغض رکھنے کے باوجود قرآن کی متعدد سورتیں بنی اسرائیل کی شخصیتوں سے منسوب ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے۔

سورۂ بقرہ اور اس سورہ کے درمیان کئی مناسبتیں ہیں، جیسے سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی غیر معمولی طریقہ پر تخلیق کا ذکر ہے، اس سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کا تذکرہ ہے، سورۂ بقرہ میں یہود کی فکری اور عملی کمزوریوں پر گفتگو کی گئی ہے اور سورۂ آلِ عمران میں عیسائیوں سے مباحثہ ہے، غالباً اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی فضیلت ایک ساتھ بیان فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا '' زہراوین '' یعنی بقرہ و آلِ عمران کو پڑھا کرو، یہ دونوں قیامت کے دن بادل کے ٹکڑوں یا صف بستہ پرندوں کے گروہوں کی شکل میں اپنے قاریوں پر سایہ فگن ہوں گی (مسلم ، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ، حدیث نمبر : ۱۸۷۴) '' زہراوین '' کے معنی 'دو روشن چیزوں' کے ہیں، یعنی ان دونوں سورتوں میں ہدایت کی بھرپور روشنی موجود ہے۔

اس سورت میں زیادہ تر اعتقادات یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید، نبوت، قرآن مجید کی صداقت، محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور حضرت مسیح علیہ السلام کی عبدیت و بندگی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے کائنات میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس کے علاوہ حج و جہاد کی فرضیت اور سود کی حرمت وغیرہ کے احکام بھی آئے ہیں، اس سورت کے اور نام بھی مفسرین نے ذکر کئے، جن میں 'زہرا، استغفار اور طیبہ' بھی ہے۔ (البحر المحیط : ۲ ؍ ۳۷۳)

○ ○ ○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

الٓـمّٓ ۝۱ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ۝۲ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ
یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۝۳ مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ۬ؕ اِنَّ
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ ؕ۝۴ اِنَّ اللّٰہَ لَا
یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؕ۝۵ ہُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ
یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝۶ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ
مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا
تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ ۚ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘؔ وَ الرّٰسِخُوۡنَ وقف لازم وقف النبی ﷺ
فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۷

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف، لام، میم ۝۱ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندۂ جاوید ہے اور کائنات کے نظم کو تھامے ہوئے ہے ﴿۱﴾ ۝۲ اللہ ہی نے آپ پر سچی کتاب نازل فرمائی ہے، جو پہلے کی نازل شدہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، اسی نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کی تھی اور اسی نے حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی یہ کتاب بھی اُتاری ہے، بے شک جن لوگوں نے احکامِ الٰہی کا انکار کیا، ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست اور انتقام لینے والے ہیں، ۝۳ ۝۴ بے شک اللہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، ۝۵ وہ اللہ ہی ہیں کہ جیسے چاہتے ہیں ماں کے رحم کے میں تمہاری صورت بناتے ہیں، ﴿۲﴾ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب بھی ہیں اور حکمت والے بھی، ۝۶ وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جس میں بعض آیتیں بالکل واضح ہیں، یہی کتاب کی اصل بنیاد ہیں، ﴿۳﴾ اور کچھ دوسری کئی معنی دینے والی آیتیں بھی ہیں، ﴿۴﴾ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فساد پیدا کرنے کے ارادہ سے اور اس کے (من چاہے) مطلب ﴿۵﴾ کی تلاش میں مبہم آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں؛ ﴿۶﴾ حالاں کہ اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، اور جو لوگ علم میں گہرائی رکھنے والے ہیں، وہ کہتے ہیں: ہمارا تو اس پر ایمان ہے کہ (یہ) سب ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے ہے ﴿۷﴾ اور نصیحت تو سمجھ دار لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ ۝۷

﴿۱﴾ سن نو ہجری میں قبیلۂ بنونجران کے عیسائیوں کا ایک وفد خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا، اس وفد میں ساٹھ اشخاص تھے، جن میں چودہ معززین تھے، عبدالمسیح، ایہم اور ابوحارثہ اس وفد کے امیر، نگراں اور عالم و ترجمان تھے، اس وفد نے کئی دنوں ←

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹ ع ۹

اے ہمارے پروردگار! آپ ہدایت سے سرفراز فرمانے کے بعد ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجئے اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائیے ، بے شک آپ بڑے داتا ہیں ۝۸ ہمارے پروردگار! بے شک آپ اُس دن ـــــ جس کے واقع ہونے میں ذرا بھی شک نہیں ـــــ لوگوں کو جمع فرمائیں گے، یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں فرماتے ۔ ۝۹

← رسول اللہ ﷺ کے پاس قیام کیا، توحید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت کے مسئلہ پر کئی دنوں یہ لوگ آپ سے بحث کرتے رہے، آپ دلائل کے ذریعہ ان کی تردید فرماتے ؛ لیکن یہ کسی طرح اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے ، بالآخر آپ ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی ـــــ جس کا ذکر آگے آئے گا ـــــ اس سورہ کی ابتدائی تراسی آیتیں اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں ۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۴)

﴿۲﴾ چوں کہ اس آیت میں عیسائیوں سے خطاب ہے، اس لئے خاص طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت بھی ماں کے رحم میں اللہ تعالیٰ ہی نے بنائی تھی ، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اپنے آپ پیدا ہو گئے ۔

﴿۳﴾ ''محکمات'' سے قرآن مجید کی وہ آیات مراد ہیں، جن کا معنی ومقصود بالکل واضح ہے، اس کی مراد میں کوئی ابہام اور اشتباہ نہیں ہے، ان کے اصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی احکام خداوندی کے جاننے کا مدار اور ہدایت کے لئے کافی وشافی ہیں ۔

﴿۴﴾ ''متشابہ'' ایسے کلام کو کہتے ہیں، جس کی مراد واضح نہ ہو، یا تو اس لفظ کا معنی ہی معلوم نہ ہو جیسے: ''الم ، الر'' اور دوسرے حروف مقطعات، یا اصل معنی تو معلوم ہو؛ لیکن اس کا مصداق اور اس کی کیفیت معلوم نہ ہو، جیسے: ید اللہ فوق أیدیھم (الفتح:۱۰) ''اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے'' یہاں ''ید اللہ'' کا معنی معلوم ہے؛ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سے اللہ کی قوت ونصرت مراد ہے یا واقعی اللہ کا ہاتھ مراد ہے؟ اور ہاتھ ہی مراد ہو تو اس کی کیفیت کیا ہے؟ اسی لئے متشابہات کے بارے میں سلف صالحین کی رائے ہے کہ ان پر اجمالی ایمان لانا کافی ہے اور اس کی کھوج ، کرید میں پڑنا نامناسب ہے۔

﴿۵﴾ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ''أی تحریفه علی ما یریدون'' اسی سے استفادہ کرتے ہوئے ''من چاہے مطلب کی تلاش'' سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۶﴾ یعنی جو صاف اور صریح آیتیں ہیں، ان کے احکام پر تو عمل نہیں کرتے اور جن آیتوں پر صرف ایمان لانے کا حکم ہے، اُن سے عمل کا تعلق نہیں، محض اپنی کج ذہنی کی وجہ سے اُن کے معانی کی بے جا جستجو میں پڑے ہوئے ہیں۔

﴿۷﴾ یہ ترجمہ اکثر مفسرین کی رائے پر ہے کہ ''ما یعلم تأویله إلا اللہ'' پر وقف ہے ، بعض حضرات کے نزدیک ''والراسخون فی العلم'' پر وقف ہے، ایسی صورت میں یہ مراد ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اور پختہ علم والے متشابہات کے صحیح معنی سے واقف ہیں ۔ (التفسیر الکبیر للرازی: ۴/۹۵)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ
وَقُوْدُ النَّارِ ۟ۙ۝۱۰ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ
بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى
جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اللہ کے مقابلہ میں نہ ان کو ان کا مال کچھ کام آئے گا اور نہ ان کی اولاد، اور وہی دوزخ کے ایندھن ہیں ۝۱۰ جیسے فرعون کے لوگ اور ان سے پہلے کے لوگوں کا معاملہ ہوا، (کہ) ان لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، تو ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ نے ان کی پکڑ فرمالی ﴿۱﴾ اور اللہ سخت سزا دینے والے ہیں ۝۱۱ (اے رسول!) آپ کفر کرنے والوں سے کہہ دیں کہ عنقریب تم لوگ مغلوب ہوگے ﴿۲﴾ اور دوزخ کی طرف جمع کرکے لے جائے جاؤ گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۝۱۲ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے، نشانی ہے، ایک گروہ تو اللہ کے راستہ میں جہاد کررہا تھا، اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا، جو کھلی آنکھوں دیکھ رہا تھا کہ وہ مسلمانوں سے کئی گنا ہیں ﴿۳﴾ اور اللہ جسے چاہتے ہیں، اپنی مدد سے تقویت پہنچاتے ہیں، بے شک اس میں اہل نظر کے لئے بڑی عبرت ہے۔ ﴿۴﴾ ۝۱۳

﴿۱﴾ فرعون اور اس کے لشکر پر عذابِ خداوندی کا عیسائیوں کو بھی اعتراف تھا اور ان آیات میں عیسائی ہی اولین مخاطب ہیں، اس لئے خاص طور پر فرعون کا ذکر فرمایا گیا۔

﴿۲﴾ اس آیت میں کن لوگوں کے مغلوب ہونے اور شکست کھانے کی پیشین گوئی ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے مکہ کے مشرکین کا بھی ذکر کیا ہے اور مدینہ کے یہود کا بھی، حقیقت یہ ہے کہ اس میں دونوں ہی گروہوں کا ذکر ہے، مشرکین مکہ پر غزوۂ بدر اور پھر فتح مکہ کے موقع سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور یہودیوں پر غزوۂ بنوقریظہ اور غزوۂ خیبر کے موقع سے۔

﴿۳﴾ مفسرین نے اس فقرہ کا دو مطلب بیان کیا ہے اور دونوں ہی معنوں کی گنجائش بھی ہے، ایک یہ کہ کفار اپنے آپ کو دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ کفار مکہ کو ایسا نظر آرہا تھا کہ مسلمان ان سے کئی گنا ہیں؛ حالاں کہ حقیقت معنوں میں مسلمانوں کی تعداد ان سے کم تھی۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۴/۲۵-۲۶)

﴿۴﴾ اس میں غزوۂ بدر کی طرف اشارہ ہے جس میں مسلمان تعداد کے اعتبار سے بھی کم تھے، اسلحہ اور سواری بھی ان کے پاس کم تھی اور کفار مکہ ایک ہزار کے قریب تھے، اسلحہ اور سواری کی کوئی کمی نہ تھی اور غذائی سامان بھی وافر مقدار میں تھا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان پر فتح عطا فرمائی۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ
وَالْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ
عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿ۚ۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿ۚ۱۶﴾
اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾ شَهِدَ اللّٰهُ
اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿ؕ۱۸﴾

النصف

لوگوں کو اپنی مرغوب چیزیں یعنی عورتیں، ﴿۱﴾ لڑکے، سونے، چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، ﴿۲﴾ مویشی اور کھیتی خوشنما معلوم ہوتی ہیں (حالاں کہ) یہ دنیوی زندگی کا (کچھ) سامان ہے اور اچھا ٹھکانہ تو اللہ ہی کے پاس ہے ﴿۱۴﴾ (اے رسول!) آپ کہئے کیا میں تم کو اِن سے بہتر چیز نہ بتاؤں؟ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، ان کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس ایسی بہشتیں ہیں — جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، یہ لوگ ہمیشہ اسی میں رہیں گے — پاک بیویاں ہیں، ﴿۳﴾ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی ہے! اور اللہ بندوں پر خوب نگاہ رکھے ہوئے ہیں ﴿۱۵﴾ جو لوگ کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بے شک ہم آپ پر ایمان لائے؛ اس لئے آپ ہمارے گناہوں کو معاف فرما دیجئے اور دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے ﴿۱۶﴾ (یہ) صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، فرماں بردار خرچ کرنے والے اور اخیر شب میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں ﴿۱۷﴾ اللہ گواہ ہیں کہ ان کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور فرشتے اور اہل علم بھی اس پر گواہ ہیں، وہ اللہ جو انصاف کے ساتھ (کائنات کی) تدبیر کر رہے ہیں، ﴿۴﴾ ان کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی غالب اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۱۸﴾

﴿۱﴾ انسان کو جو چیزیں اپنی طرف راغب کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ آدمی جن سے متاثر ہوتا ہے؛ وہ عورتیں ہیں، پھر اولاد، اس کے بعد مال واسباب، قرآن نے اسی ترتیب سے ان تینوں چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

﴿۲﴾ عرب ان گھوڑوں پر نشان لگا کر رکھا کرتے تھے جو بہت تیز رفتار ہوتے اور گھوڑ دوڑ کے کام آتے، یہاں ایسے ہی گھوڑوں کا ذکر ہے، یہ بہت قیمتی سمجھے جاتے تھے۔

﴿۳﴾ یعنی جنت میں جو بیویاں عطا کی جائیں گی، وہ اخلاقی گراوٹوں سے تو پاک ہوں گی ہی، جسمانی گندگی اور حیض ونفاس کی نجاست وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی۔

←

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع ۱۰/۱۱

بے شک اللہ کے نزدیک (مقبول) دین تو ''اسلام'' ہی ہے ﴿۱﴾ اور اہل کتاب نے جانتے بوجھتے محض باہمی حسد کی بنا پر اختلاف کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے احکام کے ساتھ کفر کریں گے تو بے شک اللہ جلد (ہی ان کا) حساب لینے والے ہیں، ﴿۱۹﴾ پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں نے بھی اور میری پیروی کرنے والوں نے بھی اپنا رُخ اللہ کی طرف کرلیا ہے، نیز آپ اہل کتاب سے اور (عرب کے) اَن پڑھ لوگوں سے بھی دریافت کرلیجئے کہ کیا تم اسلام لا رہے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت سے سرفراز ہوئے اور اگر روگردانی کا راستہ اختیار کریں تو یقیناً آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۰﴾

← ﴿۴﴾ بعض مذاہب اور فلاسفہ کا خیال تھا کہ خدا کا وجود تو ہے؛ لیکن کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اب وہ معطل اور بیکار ہے، کائنات کا نظام قانونِ فطرت کے تحت خود بخود چل رہا ہے، اسی کی تردید مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن کائنات کی تدبیر بہ نفس نفیس فرما رہے ہیں، کوئی پتہ نہیں جو حکم خداوندی کے بغیر ہلے اور کوئی مخلوق نہیں جو مشیتِ خداوندی کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی کرسکے۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں جو دین مقبول ہے، وہ صرف اسلام ہے، کوئی اور دین خدا کے یہاں مقبول نہیں، بعض حضرات جو کہتے ہیں کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل سب کی ایک ہے، یہ صحیح نہیں ہے، یہ نہ صرف قرآن کا دعویٰ ہے؛ بلکہ عقل کا تقاضہ بھی ہے، وہ مذہب جو کامل توحید کی دعوت دیتا ہو اور بال برابر بھی شرک کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتا ہو اور وہ مذاہب جن کے یہاں شرک ہی اصل طریقۂ حیات ہو، ان دونوں کی منزل ایک کیوں کر ہوسکتی ہے، جیسے روشنی اور تاریکی کا مقصد ایک نہیں ہوسکتا، اسی طرح متضاد فکر و نظر کے حامل مذاہب بھی ایک نہیں ہوسکتے، پس اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا۔

پھر ایک ہی خدا ہے جو پوری انسانیت کا خالق ہے، ایک ہی باپ کے نطفہ اور ایک ہی ماں کی کوکھ سے تمام انسان پیدا کئے گئے ہیں، ایک ہی سورج ہے جو تمام انسانوں کو حرارت پہنچاتا ہے، ایک ہی چاند ہے جو اپنی خنکی سے ہر شخص کو سرشار کرتا ہے، ایک ہی نظام تولید ہے جس سے ہر آدمی کی پیدائش ہوتی ہے، غذا اور اس کے ہضم کا نظام بھی ایک ہے، تو ضرور ہے کہ خدا نے اس پوری مخلوق کے لئے قانون اور نظام حیات بھی ایک ہی رکھا ہو؛ اس لئے ''دین'' ایک ہی حق ہوسکتا ہے نہ کہ کئی۔

﴿۲﴾ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دعوتِ دین کا کام ایک سرکاری ڈیوٹی کی طرح ہے کہ بے دلی اور نیم دلی کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دے دی اور کافی ہوگیا، مزید سعی و کاوش کی ضرورت نہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ داعی پوری دردمندی اور جذبۂ دروں کے ساتھ دعوت دیتا رہے اور بار بار راہِ حق کی طرف بلاتا رہے؛ لیکن مدعو اتنا سخت دل ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تو تنگ دل نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا کردی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢١﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ
يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَّ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ
لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾

بے شک جولوگ اللہ کے احکام کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ناحق انبیاء کو قتل کرتے ہیں؛ ﴿۱﴾ (بلکہ) جولوگ انصاف
کرنے کا حکم دیتے ہیں، ان کے بھی قتل کے مرتکب ہوتے ہیں، آپ ان کو دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنا دیجئے ﴿۲۱﴾
یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا میں بھی ضائع ہوئے اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا، ﴿۲۲﴾ آپ نے
ان لوگوں کو دیکھا نہیں، جن کو کتاب (الٰہی) کا ایک حصہ عطا کیا گیا ہے، ان کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ
وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے پھر بھی ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتے ہوئے بے رُخی اختیار کرتا ہے، ﴿۲۳﴾
یہ اس لئے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ آگ تو ہمیں محض چند دنوں چھوئے گی اور (درحقیقت) ان کی من گھڑت باتوں نے
ان کو ان کے دین سے متعلق دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ﴿۲۴﴾ پھر جس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں، اس دن جب ہم
انھیں جمع کریں گے تو کیا حال ہوگا؟ اس دن ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان کے ساتھ (ذرا بھی)
ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۵﴾ آپ کہہ دیجئے: ''اے اللہ! پوری سلطنت کے مالک! آپ جسے چاہیں حکومت عطا
فرمائیں اور جس سے چاہیں چھین لیں، ﴿۲﴾ جسے چاہیں عزت سے ہمکنار کریں اور جسے چاہیں ذلت سے دوچار،
آپ ہی کے ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ﴿۲۶﴾

﴿۱﴾ انبیاء کا قتل تو بہرحال ناحق ہی ہے، مراد یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے طور پر کسی مجرم کے سزائے قتل کے مستحق ہونے کے لئے
جو اُصول و قوانین مقرر کر رکھے تھے، اس اعتبار سے بھی ان کا قتل ناواجبی اور غیر قانونی تھا۔

﴿۲﴾ دنیا کی بہت سی قوموں میں بادشاہ پرستی کا طریقہ مروج رہا ہے، لوگ بادشاہ کو خدا یا خدا کے کنبہ کا ایک فرد تصور کرتے تھے، مصر
میں فرعون اور عراق میں نمرود کی پرستش ہوا کرتی تھی، اسلام کی آمد کے وقت ایرانی بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ بادشاہ خدا کے کنبہ کا
ایک فرد ہوتا ہے، جاپان و ہندوستان میں بھی اس قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے، قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لئے غالباً ←

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ
مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ
وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ
يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

آپ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتے ہیں ، بے جان سے جاندار کو نکالتے ہیں اور جاندار سے بے جان کو ، اور جسے چاہتے ہیں بے حساب روزی عطا فرماتے ہیں'' ﴿۱﴾ ﴿۲۷﴾ ایمان والوں کو چاہئے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں ، ﴿۲﴾ اور جو ایسا کرے اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ، مگر سوائے ایسی صورت کے ، کہ ان کے شر سے بچاؤ مقصود ہو ﴿۳﴾ ، اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتے ہیں اور اللہ ہی کی طرف واپس آنا ہے ﴿۲۸﴾ آپ کہہ دیں کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے ، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو ، اللہ اس سے واقف ہیں (بلکہ) آسمان وزمین میں جو کچھ ہے اللہ کو سب معلوم ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ۔ ﴿۲۹﴾

← یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ حکومت واقتدار کی کنجی اصل میں خدا کے ہاتھ میں ہے ، جن بادشاہوں اور حکمرانوں کو تم خدا سمجھتے ہو ، وہ حکومت واقتدار اور عزت وذلت کے سلسلے میں عاجزِ محض ہیں ۔

﴿۱﴾ دن کو رات اور رات کو دن میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی دن کے اوقات بڑھا دیتے اور رات کے گھٹا دیتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس ، بے جان سے جاندار کو پیدا کرنے کی مثال انڈے سے پرندہ کی پیدائش اور جاندار سے بے جان کو وجود عطا کرنے کی مثال پرندہ سے انڈے کی پیدائش ہے ۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی : ۵۶/۴ ، فتح القدیر للشوکانی : ۴۰۸/۱)

﴿۲﴾ تعلقات وسلوک کے تین درجات ہیں : '' مواسات '' یعنی غمگساری اور نفع رسانی ، یہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے ، غیر مسلموں کے لئے بھی ، خود رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا ہے اور جانی دشمنوں کی حاجت روائی فرمائی ہے ، دوسرا درجہ '' مدارات '' یعنی ظاہری خوش اخلاقی کا ہے ، یہ صورت ان غیر مسلموں کے لئے جائز بلکہ مطلوب ہے جو مسلمانوں کے ساتھ امن وامان سے رہتے ہیں ، جو لوگ مسلمانوں سے برسر جنگ ہیں جن کو '' حربی '' کہا جاتا ہے ، ان کے ساتھ درست نہیں ، سوائے اس کے کہ اپنے آپ سے نقصان دور کرنا یا خود اس کافر کی دینی مصلحت کو پورا کرنا مقصود ہو یا وہ غیر مسلم مسلمان ہو جائے ، تیسرا درجہ '' موالات '' یعنی قلبی دوستی کا ہے ، جو آدمی کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونے لگے ، یہ غیر مسلموں سے جائز نہیں ۔

﴿۳﴾ یعنی اگر کسی غیر مسلم سے جان ومال یا عزت وآبرو یا دینی اعمال کی انجام دہی میں خطرہ ہو تو ظاہری طور پر اس سے تعلقات کا اُستوار رکھنا درست ہے ۔ (التفسیر الکبیر : ۱۶۷/۴)

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ
بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗۤ اَمَدًا ۢ بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ ع ۱۰ ۳ ۱۱
كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ۙ

جس دن ہر شخص اپنے اچھے اور برے عمل کو اپنے سامنے پائے گا، (اس دن) وہ اس بات کی تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اِس دن کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا!﴿۱﴾ اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتے ہیں اور اللہ بندوں پر بہت مہربان (بھی) ہیں ﴿۳۰﴾ آپ کہہ دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو،﴿۲﴾ اللہ بھی تم سے محبت کریں گے اور تمہارے گناہ معاف کردیں گے، اللہ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں ﴿۳۱﴾ آپ کہہ دیجئے: اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرو، پھر بھی اگر وہ نہ مانیں تو یقیناً اللہ (بھی) کافروں سے محبت نہیں رکھتے ﴿۳﴾ ﴿۳۲﴾ بے شک اللہ ہی نے آدم، نوح، اولادِ ابراہیم اور اولادِ عمران کو ساری دنیا پر منتخب کیا تھا۔﴿۴﴾ ﴿۳۳﴾

﴿۱﴾ یہ تو ان لوگوں کا حال ہوگا جن کے پاس نیکیاں بھی ہوں گی اور برائیاں بھی، جن کم نصیبوں کے پاس صرف برائیاں ہی ہوں ان کے حسرت وافسوس اور پشیمانی کا کیا عالم ہوگا؟

﴿۲﴾ یعنی محبت صرف زبان سے اظہارِ محبت کا نام نہیں؛ بلکہ اس کو عمل سے ظاہر ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی بھی ہو، جو شخص آپ ﷺ کی اتباع تو نہ کرتا ہو؛ مگر زبان سے اللہ اور اس کے رسول سے محبت کے بلند بانگ دعوے کرتا ہو، وہ اس محبت سے محروم ہے، جو دین میں مطلوب ہے۔

﴿۳﴾ ان دونوں آیتوں میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرماں برداری ایک اکائی ہے، جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، نہ رسول کی نافرمانی اور ان کے احکام کا انکار کرکے اللہ کی اطاعت کی جاسکتی ہے اور نہ اللہ کی نافرمانی کرکے رسول کی اطاعت؛ کیوں کہ اصل مقصود اللہ کی اطاعت ہے، رسول بھی منشائے ربانی اور حکم خداوندی ہی کا ترجمان ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی اطاعت بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی بھی اللہ ہی کی نافرمانی، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح حدیث نبوی بھی حجت ہے اور جو شخص قرآن مجید کو تسلیم کرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حدیث کے دلیل وحجت ہونے کا انکار کرجائے، پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں اطاعت کا، ’اتباع‘ افعال کی نقل کرنے کا نام ہے اور ’اطاعت‘ جس بات کا حکم دیا جائے اس کی تعمیل کا، گویا پہلی آیت میں آپ ﷺ کے افعال یعنی فعلی احادیث کا حجت ہونا بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں آپ ﷺ کے ارشادات یعنی قولی احادیث کا حجت ہونا۔

﴿۴﴾ یہ انتخاب نبوت اور ہدایت کے لئے ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں بہت سے انبیاء گذرے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ ←

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ
لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ
رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۗ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَ اِنِّيْ سَمَّيْتُهَا
مَرْيَمَ وَ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾

یہ آپس میں ایک دوسرے کی نسل سے ہیں، ﴿۱﴾ اور اللہ خوب سننے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۳۴﴾ (وہ وقت بھی یاد رکھے جانے کے لائق ہے) جب عمران کی بیوی نے دُعاء کی: ''میرے پروردگار! میں نے آپ کے لئے منت مانی ہے کہ جو بچہ میرے پیٹ میں ہے وہ (آپ کی عبادت اور آپ کے گھر کی خدمت کے لئے) فارغ ہوگا، آپ میری طرف سے (اس کو) قبول فرما لیجئے، بے شک آپ خوب سننے اور خوب جاننے والے ہیں'' ﴿۲﴾ ﴿۳۵﴾ پھر جب اس نے لڑکی کو جنا تو کہنے لگی: ''اے میرے پروردگار! مجھے تو لڑکی پیدا ہوئی ہے —— اور جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ اس سے خوب واقف تھے اور لڑکا (بھی اس) لڑکی جیسا نہیں ہوسکتا، ﴿۳﴾ —— میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں''۔ ﴿۴﴾ ﴿۳۶﴾

← اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء آپ ہی کے خاندان سے ہیں؛ اسی لئے ''آلِ ابراہیم'' فرمایا گیا؛ تا کہ ان تمام پیغمبروں کو شامل ہوجائے، عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا بھی نام تھا اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی، یہاں دونوں کا امکان ہے، بعض مفسرین نے پہلے کو ترجیح دی ہے اور آلِ عمران سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرے کو ترجیح دی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات مراد لی ہے، جو حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے۔ (فتح القدیر للشوکانی: ۱/۴۱۲، الجامع لأحکام القرآن: ۴/۶۲)

﴿۱﴾ یعنی جن انبیاء کا ذکر آیا، ان میں ایسی قرابت ہے کہ ایک دوسرے کے آباء واجداد یا ابناء واولاد میں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں اور عمران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں۔

﴿۲﴾ یہودیوں کے یہاں بیت المقدس کی خدمت کے لئے اپنی اولاد کو وقف کرنے کا سلسلہ بہت پہلے سے آرہا تھا، حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے منت ماننے کا منشا بھی یہی تھا۔

﴿۳﴾ والدۂ مریم کی دُعاء کے درمیان یہ فقرہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا یہ کہنا کہ میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے، بطور بیانِ واقعہ کے تھا؛ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف تھے، اور اس نومولود لڑکی سے اللہ تعالیٰ کو وہ کام لینا منظور تھا، جو ایک عورت ہی کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا تھا نہ کہ مرد کے ذریعہ، یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا؛ اس لئے فرمایا گیا کہ لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں ہوسکتا تھا —— ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ فقرہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کا ہے، کہ مجھے بیٹی ہوئی ہے اور بیٹی بیٹے کی طرح دین کی خدمت نہیں کرسکتی۔

﴿۴﴾ ایک نیک ماں اور خدا ترس خاتون کی اپنی اولاد کے بارے میں کیا آرزو ہونی چاہئے؟ وہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کے اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ اس کی اولاد خدا کی مطیع وفرمانبردار اور شیطان سے نفرت کرنے والی اور بیزار رہو۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا
زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ
لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

چنانچہ اس کے پروردگار نے اس کو بہتر طور پر قبول کرلیا، اس کی اچھی نشو ونما کی ﴿۱﴾ اور اس کو زکریا کی کفالت میں دے دیا، ﴿۲﴾ جب بھی زکریا کمرہ میں مریم کے پاس آتے تو اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز پاتے، زکریا نے کہا: اے مریم! تجھے یہ چیز کہاں سے مل جاتی ہے؟ مریم بولی: اللہ کی طرف سے! بے شک اللہ جسے چاہتے ہیں بے حساب روزی عطا فرماتے ہیں ﴿۳﴾ ﴿۳۷﴾ (یہ ماجرا سن کر) وہیں زکریا اپنے رب سے دُعاء کرنے لگے، اس نے عرض کیا: ”اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے نیک اولاد عطا فرما دیجئے، بے شک آپ ہی دُعاء کے سننے والے ہیں“۔ ﴿۴﴾ ﴿۳۸﴾

﴿۱﴾ ”اچھی نشوونما“ جسمانی اعتبار سے بھی ہوسکتی ہے کہ بچوں میں بڑھنے اور پروان چڑھنے کی جو عام رفتار ہے، حضرت مریم علیہا السلام کی جسمانی نشوونما کی رفتار اس سے تیز تھی، اور روحانی نشوونما بھی مراد ہوسکتی ہے، یعنی بتقاضائے عمر بچپن میں عبادت اور انابت الی اللہ کی کیفیت نسبتاً کم ہوتی ہے؛ لیکن حضرت مریم علیہا السلام کے اندر بچپن ہی سے یہ کیفیت نمایاں طور پر زیادہ تھی۔

﴿۲﴾ حضرت زکریا علیہ السلام جو خود پیغمبر تھے، ہیکل سلیمانی کے ذمہ دار بھی تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے خالو بھی؛ چنانچہ والدہ مریم علیہا السلام کی نذر پوری کی گئی اور حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت زکریا علیہ السلام کی سرپرستی میں ہیکل سلیمانی میں رکھ دیا گیا۔

﴿۳﴾ یعنی حضرت مریم علیہا السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے انواع واقسام کے اور موسمی اور غیر موسمی پھل موجود رہتے تھے، جو حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے باعث حیرت ہوتا، اس سے معلوم ہوا کہ جیسے انبیاء کے لئے بعض خلاف عادت واقعات ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح اولیاء سے بھی بعض خلاف عادت اُمور ظاہر ہوتے ہیں، (التفسیر الکبیر للرازی: ۱۸۹/۴) انبیاء کے ہاتھوں اس طرح کی کوئی بات ظاہر ہو تو اس کو ”معجزہ“ کہا جاتا ہے اور اولیاء سے متعلق ایسے واقعات کو ”کرامت“ —— بعض حضرات نے ”رزق“ سے روحانی فیض مراد لیا ہے، جو نہ قرآن کی عبارت اور اس کے سیاق و سباق سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ احادیث و آثار سے؛ کیوں کہ اگر روحانی رزق مراد ہوتا تو یہ کوئی باعث تعجب بات نہ ہوتی اور اس کو بنیاد بنا کر حضرت زکریا علیہ السلام اولاد کی دُعاء نہ فرماتے۔

﴿۴﴾ حضرت زکریا علیہ السلام خود بوڑھے تھے اور بیوی بانجھ تھیں، بہ ظاہر اولاد کی کوئی توقع نہ تھی؛ لیکن حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم کا پھل دیکھ حضرت زکریا علیہ السلام کے دل کی دیرینہ آرزو نے پھر کروٹ لی کہ کاش! اسی طرح اللہ تعالیٰ مجھے بھی بے موسم اولاد عطا فرما دیتا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے اولاد کے طلب گار ہوئے، بائبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد دینا اور اولاد سے محروم رکھنا اللہ ہی کی قدرت میں ہے، کوئی انسان خواہ وہ مقام نبوت پر فائز ہو، دوسرے کو صاحبِ اولاد بنانا کیا معنی، اپنے آپ کے لئے بھی اولاد کی قدرت نہیں رکھتا، یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی بچوں کی خواہش رکھنا زہد و تقویٰ کے خلاف نہیں، اور حضرت زکریا علیہ السلام نے صالح اولاد کی دُعاء فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ مومن کو اپنی اولاد کی آخرت اور دین داری کی طرف متوجہ رہنا چاہئے اور کبھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ
وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا
تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَ اِذْ ع ۱۱/۱۲
قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

چنانچہ زکریا حجرہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے ان کو آواز دی: ''بے شک اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں، جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والا، مقتدا و پیشوا، بہت ضبطِ نفس کرنے والا، نبی اور نیکوکار لوگوں میں سے ہوگا'' ﴿۱﴾ ﴿۳۹﴾ زکریا نے کہا: میرے پروردگار! مجھے کس طرح بیٹا ہوگا؛ حالاں کہ مجھ پر بوڑھاپا آچکا ہے اور میری بیوی (بھی) بانجھ ہے؟ ارشاد ہوا: اسی طرح کہ اللہ جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں ﴿۴۰﴾ زکریا نے عرض کیا: میرے پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دیجئے، اللہ نے فرمایا: تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم تین دنوں تک سوائے اشارہ کے کوئی بات نہ کرسکو گے اور اپنے پروردگار کو خوب یاد کرنا اور صبح و شام تسبیح کرتے رہنا ﴿۲﴾ ﴿۴۱﴾ اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تم کو چن لیا ہے، پاک وصاف رکھا ہے اور تم کو ساری دنیا کی عورتوں پر عزت دی ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۴۲﴾

﴿۱﴾ ''حصور'' کے معنی نامرد کے بھی ہیں، عورت سے بے رغبت شخص کے بھی اور ضبطِ نفس کرنے والے کے بھی؛ لیکن یہاں یہی آخری معنی مراد ہے؛ کیوں کہ پیغمبر اپنی صفات کی طرح ذاتی خوبیوں کے اعتبار سے بھی اوجِ کمال پر ہوتا ہے اور منجانب اللہ نقائص و عیوب سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، جب کہ کسی مرد کا عورت کی طرف رغبت سے محروم ہونا یا نامرد ہونا ایک جسمانی نقص ہے۔

﴿۲﴾ یعنی اس کی علامت یہ ہوگی کہ آپ ذکر و تسبیح پر تو قادر رہیں گے؛ لیکن تین دنوں لوگوں سے بات چیت کرنے کی قدرت باقی نہیں رہے گی، بائبل کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حضرت زکریا کی سرزنش تھی، (لوقا: ۱: ۲۰-۲۲) لیکن قرآن کے لب و لہجہ سے ظاہر ہے کہ یہ بہ طور سرزنش اور عذاب کے نہ تھا؛ بلکہ محض ایک علامت اور نشانی کے طور پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی، قرآن مجید نے اسی طرح جا بجا اُس غبار کو دھونے کی کوشش کی ہے، جو یہودیوں نے انبیاء کرام کی پاک زندگی پر ڈال دیا تھا، —— ''اشارہ سے گفتگو'' سے یہ فقہی مسئلہ بھی نکل آیا کہ اشارہ بھی کلام کے قائم مقام ہے، بعض صورتوں میں اشارہ مطلقاً بولنے کے حکم میں ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں بہ وقت ضرورت؛ البتہ حنفیہ کے نزدیک حدود یعنی شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں میں صرف اشارہ سے اقرار کرنا معتبر نہیں۔

←

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۝۴۳ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۝۴۴

اے مریم! اپنے رب کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو ﴿۱﴾ ۝۴۳ یہ غیب کی خبریں ہیں، جن سے ہم آپ کو باخبر کررہے ہیں؛ حالاں کہ آپ تو ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے، جب وہ (قرعہ نکالنے کے لئے) اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں کون مریم کی پرورش کرے گا؟ ﴿۲﴾ اور جب وہ (مریم کے حق پرورش کے سلسلے میں) جھگڑ رہے تھے، اس وقت بھی آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ ﴿۳﴾ ۝۴۴

← ﴿۳﴾ یعنی حضرت مریم علیہا السلام کے عہد میں وہ اللہ کی طرف سے سب سے منتخب خاتون تھیں، بہ حیثیت مجموعی خواتین عالم میں پانچ خواتین کی خصوصی فضیلت احادیث میں منقول ہے، دو کا تعلق پہلی اُمتوں سے ہے، ایک حضرت مریم علیہا السلام، دوسری فرعون کی بیوی حضرت آسیہ، اور تین کا تعلق اس اُمت سے ہے، حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن، ان پانچوں میں سب سے افضل کون ہیں؟ اس سلسلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے؛ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ پانچوں خواتین تمام عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔

﴿۱﴾ یا تو اس سے واقعی رکوع وسجدہ مراد ہے، یا اللہ کی بندگی اور احکام خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا؛ کیوں کہ رکوع اور سجدہ کی کیفیت آخری درجہ کے جھکاؤ اور خود سپردگی کو ظاہر کرتی ہے، اس میں جہاں حضرت مریم علیہا السلام کی پاک بازی اور پارسائی کو ظاہر کیا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی بتا دی گئی کہ حضرت مریم علیہا السلام خدا کی ایک بندی تھیں، نہ کہ نعوذ باللہ خدا کی بیوی یا خدا کی ماں، اس طرح یہودیوں کی بھی تردید ہوگئی اور عیسائیوں کی بھی۔

﴿۲﴾ جب حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے اپنی نذر پوری کرتے ہوئے ان کو بیت المقدس کے حوالہ کیا، تو سوال پیدا ہوا کہ بیت المقدس کے متولیوں میں سے کون ان کی پرورش کرے گا؛ چنانچہ اس کے لئے قرعہ اندازی کی گئی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ پرورش کے خواہش مندوں نے بہتے ہوئے پانی میں اپنے اپنے قلم ڈالے کہ جس کا قلم ٹھہر جائے، وہ حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کا حقدار ہوگا؛ چنانچہ حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا، جن کے نکاح میں حضرت مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں اور اس طرح وہ اپنی خالہ اور خالو کی پرورش میں آگئیں۔ (قرطبی: ۴/۵۵)

﴿۳﴾ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے؛ بلکہ غیب کی جو باتیں اللہ کی طرف سے بتائی جاتی تھیں، آپ صرف ان ہی سے آگاہ ہوتے تھے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝۴۵ وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۴۶

(وہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ آپ کو اپنی طرف سے ایک فرمان ﴿۱﴾ (یعنی اللہ کے خصوصی حکم سے بیٹے) کی خوشخبری دے رہے ہیں، جس کا نام ''مسیح عیسیٰ بن مریم'' ہوگا، ﴿۲﴾ وہ دنیا میں بھی معزز ہوگا اور آخرت میں بھی اور مقرب بندوں میں سے ہوگا ۝۴۵ وہ لوگوں سے جھولے میں بھی گفتگو کرے گا ﴿۳﴾ اور ادھیڑ عمر میں بھی، ﴿۴﴾ اور صالح لوگوں میں ہوگا۔ ۝۴۶

﴿۱﴾ چوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی باپ کے واسطہ کے بغیر محض حکم الٰہی سے پیدا ہوئے تھے؛ اس لئے آپ کو ''کلمۃ اللہ'' کہا گیا اور اس کا ترجمہ ''فرمان'' سے کیا گیا ہے، یعنی یوں تو ہر شخص فرمانِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے؛ لیکن ان میں والدین کا واسطہ بھی ہوتا ہے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام براہ راست اور بلا واسطہ فرمانِ الٰہی سے پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ مسیح سے مراد عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی نے جو اپنے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام (مریم کے بیٹے عیسیٰ) کی صراحت اس دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید ہے؛ کیوں کہ مرزا صاحب کی والدہ کا نام ''چراغ بی بی'' تھا نہ کہ مریم۔

﴿۳﴾ جب حضرت مریم علیہا السلام کو لوگوں نے تہمت لگائی تو دودھ پیتے ہونے کے باوجود اللہ کے حکم سے آپ نے گفتگو فرمائی، بچپن میں اور بھی متعدد لوگوں نے گفتگو کی ہے، احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، ان میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو خود قرآن میں ہے، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے سات بچوں کا تذکرہ کیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جریج راہب کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جس کا ذکر بخاری میں بھی آیا ہے، (بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، حدیث نمبر: ۳۴۳۶) ایک بچہ جو اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا، ایک ظالم صاحبِ اثر شخص کا گذر ہوا، اس نے کہا: اے اللہ! میرے بچے کو اسی طرح بنادے، بچہ بول اٹھا: اے اللہ! مجھے اس طرح نہ بنانا، مسلم میں یہ روایت آئی ہے، اور اصحابِ اخدود کے واقعہ میں مسلم ہی نے روایت نقل کی ہے کہ جب ایک خاتون کو آگ میں ڈالا جانے لگا، تو بچہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ گھبرائے نہیں کہ وہ حق پر ہے، (مسلم باب قصة أصحاب الأخدود الخ، حدیث نمبر: ۷۵۱۱) اس کے علاوہ بیہقی نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دختر فرعون کی مشاطہ کی بیٹی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ماں کے ہاتھ سے کنگھی گر پڑی، اس نے کہا: بسم اللہ، شیر خوار بیٹی نے کہا: اس اللہ کے نام سے جو میرا بھی رب ہے، تیرا بھی اور تیرے باپ کا بھی، بالآخر فرعون نے ماں بیٹی دونوں ہی کو نذرِ آتش کر دیا۔ (تفسیر قرطبی: ۹۱/۴-۹۲)

﴿۴﴾ عمر کہولت چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے، (قرطبی: ۹۱/۴) حضرت مسیح علیہ السلام تیس سال کی عمر میں ہی آسمان پر اٹھالئے گئے تھے، اب عمر کہولت میں گفتگو کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ آپ دوبارہ زمین پر نازل کئے جائیں، اس کی صراحت احادیث میں آئی ہے؛ گویا اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ کہنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول نہ ہوگا؛ کیوں کہ آپ کی وفات ہوچکی اور اپنے آپ کو حضرت مسیح علیہ السلام کا مثیل قرار دینا اس آیت کی رو سے قطعاً غلط ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا
قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ
لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ
وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

مریم کہنے لگیں: اے میرے پروردگار! مجھے کیوں کر بچہ ہوگا؛ حالاں کہ کسی انسان نے مجھے چھوا تک نہیں؟ اللہ نے فرمایا: اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتے ہیں، پیدا کردیتے ہیں، جب اللہ کسی بات کا فیصلہ کرتے ہیں تو صرف اس سے کہتے ہیں کہ 'ہو جا' اور وہ 'ہو جاتا' ہے ﴿۱﴾ ﴿۴۷﴾ اللہ عیسیٰ کو کتاب کا ﴿۲﴾ دانائی کی باتوں کا اور تورات وانجیل کا علم عطا کریں گے ﴿۴۸﴾ وہ بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر ہوگا، ﴿۳﴾ (اور کہے گا) ''میں تم لوگوں کے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی صورت بنادوں گا، پھر میں اس میں دم کردوں گا تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا، نیز میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کردوں گا، مُردوں کو زندہ کروں گا، اور تم جو کھا کر آؤ گے اور جو گھروں میں ذخیرہ کرکے رکھو گے، اس کے بارے میں تم کو بتادوں گا، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یقیناً اس میں تمہارے لئے نشانی ہے''۔ ﴿۴﴾ ﴿۴۹﴾

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے محض حکم الٰہی کے نتیجہ میں ہوئی تھی، نہ کہ اپنے منگیتر سے ہم بستری کی بنیاد پر، جیسا کہ قادیانی حضرات کہتے ہیں۔

﴿۲﴾ ''کتاب'' سے دوسری آسمانی کتابیں بھی مراد ہوسکتی ہیں اور تحریر وکتابت کا فن بھی، مفسرین نے دونوں ہی معنی مراد لئے ہیں۔

﴿۳﴾ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت صرف قوم بنی اسرائیل کی طرف تھی، آپ عالمگیر نبی نہیں تھے؛ جیسا کہ آج کل عیسائی حضرات دعویٰ کرتے ہیں، چنانچہ خود بائبل میں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی صراحت موجود ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے گھرانہ کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کی طرف نہیں بھیجے گئے۔ (دیکھئے: متی ۱۶:۲۴)

﴿۴﴾ قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ ''باذن اللہ'' (اللہ کے حکم سے) کا لفظ استعمال کیا ہے؛ تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کچھ خدائی اختیارات رکھتے تھے اور اپنی مرضی سے پرندوں میں روح پھونکتے تھے، مریضوں کو صحت مند اور مردوں کو زندہ کرتے تھے، یا غیب کی بات جانتے تھے۔

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ
وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ
اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ
الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ع ۵ ۱۳ ۱۳ الثلثة
وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

میں اپنے پہلے آئی ہوئی ''تورات'' کی تصدیق کرتا ہوں اور (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ) بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں، حلال کردوں، ﴿۱﴾ اور میں تمہارے پاس اپنے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں: ﴿۲﴾ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو ﴿۵۰﴾ بے شک اللہ ہی میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی؛ اس لئے اسی کی عبادت کیا کرو، یہی درست راستہ ہے ﴿۵۱﴾ پھر جب عیسیٰ نے یہودیوں کی طرف سے انکار دیکھا تو کہنے لگے: اللہ کے راستہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، اور آپ گواہ رہیں کہ ہم (احکام الٰہی کو) قبول کرتے ہیں ﴿۵۲﴾ اے ہمارے رب! جو کچھ آپ نے نازل فرمایا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کی پیروی کی؛ اس لئے ہمیں بھی (حق کی) گواہی دینے والوں میں لکھ لیجئے، ﴿۵۳﴾ ان لوگوں نے سازش کی اور اللہ نے بھی تدبیر فرمائی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بڑھ کر ہیں ﴿۳﴾ ﴿۵۴﴾ (وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ نے فرمایا: ''اے عیسیٰ! میں تجھے پورا پورا لے لوں گا، ﴿۴﴾ میں تجھے اپنی طرف اُٹھا لوں گا، تجھے کافروں (کی تہمت) سے پاک کردوں گا، ﴿۵﴾ اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، قیامت تک ان کو تمہارا انکار کرنے والوں پر غالب رکھوں گا، ﴿۶﴾ پھر میری ہی طرف تم سبھوں کی واپسی ہوگی تو جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے، ان کا فیصلہ کردوں گا''۔ ﴿۵۵﴾

﴿۱﴾ بعض حرام کو حلال کرنے سے یا تو یہ مراد ہے کہ بعض چیزیں از راہِ سزا بنی اسرائیل پر حرام کردی گئی تھیں، ان کو آپ کے ذریعہ حلال کیا گیا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض چیزیں یہودی علماء اور مذہبی پیشواؤں نے بہ طورِ خود حرام کرلی ہوں، اس بوجھ کو حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعہ ہلکا کیا گیا ہو۔

﴿۲﴾ ''آیت'' سے مراد یا تو معجزات ہیں یا اللہ تعالیٰ کے احکام، یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

←

← ﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو ناکام فرمادیا کہ یہودی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہتے تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے ایک شخص کو حضرت مسیح علیہ السلام کا ہم شکل بنادیا اور ان لوگوں نے اس کو مسیح سمجھ کر سولی دے دی۔

﴿۴﴾ ''توفی'' کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو وصول کرنے اور لے لینے کے ہیں، چوں کہ موت میں بھی اللہ تعالیٰ روح کو واپس لے لیتے ہیں؛ اس لئے اسے وفات کہا جاتا ہے، اس لئے بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں ''متوفیک'' موت کے معنی میں نہیں؛ بلکہ مراد ہے کہ میں آپ کو جسم اور روح سمیت لے لوں گا اور آسمان پر اٹھالوں گا، اگلا فقرہ ''ورافعک إليّ'' (میں آپ کو اپنی طرف اٹھاؤں گا) گویا اسی کی تفسیر ہے، دوسری تفسیر وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ''متوفیک'' وفات دینے ہی کے معنی میں ہے اور مقصد یہ ہے کہ سولی پر پھانسی کے ذریعہ تمہاری موت نہیں ہوگی، جیسا کہ تمہارے دشمن چاہتے ہیں؛ بلکہ مستقبل میں طبعی موت کے ذریعہ آپ کی وفات ہوگی، اِس وقت میں آپ کو آسمان کی طرف اُٹھارہا ہوں، آپ دوبارہ زمین پر اُتارے جائیں گے، پھر کچھ سال دنیا میں آپ رہیں گے، اُس وقت آپ پر طبعی موت طاری ہوگی، غرض ہر دو تفسیر کے مطابق اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن آپ کو پھانسی دینے سے عاجز رہے، آپ آسمان پر اٹھالئے گئے، قربِ قیامت میں آپ کا نزول ہوگا، اس وقت آپ پوری دنیا میں اسلام کو غالب فرمائیں گے، (تفسیر قرطبی: ۱۰۰/۴) یہ وہ عقیدہ ہے جو بہت سی صریح اور صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے ان احادیث کو ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' کے نام سے جمع فرمایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان حدیثوں کا مجموعہ اپنے مشترک مضمون کے اعتبار سے متواتر کے درجہ میں ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اُٹھائے جانے اور دوبارہ نازل ہونے کی بابت حیرت نہ ہونی چاہئے؛ کیوں کہ آپ کے ساتھ کتنے ہی واقعات خلافِ عادت اور معجزانہ پیش آئے ہیں، پیدا ہوئے بغیر باپ کے، پیدا ہوتے ہی بولنے لگے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی ہاتھ پھیرتے ہی بینا اور صحت مند ہوجاتے، مُردے جی اٹھتے، اور مٹی کے مصنوعی پرندوں میں پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو اٹھتا، خود آپ کی والدہ کا حال یہ تھا کہ بے موسم کا پھل آپ کے پاس موجود ہوتا اور بہ مقابلہ عام بچوں کے جسمانی اور ذہنی نشوونما بھی آپ کی نہایت تیز رفتاری سے ہوتی، تو جس شخص کی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ بنایا ہو، اگر اس کے ساتھ اس طرح آسمان کی طرف اٹھانے اور زمین پر اُتارنے کا واقعہ پیش آئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

قادیانی حضرات دھوکہ دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر موت واقع ہوچکی ہے اور ''ورافعک إليّ'' سے مراد یہ ہے کہ میں آپ کا درجہ بلند کروں گا؛ حالاں کہ یہ ایسا معنی ہے جو عربی زبان کے قواعد سے قطعاً ہم آہنگ نہیں، ''رفع'' کا لفظ جب بغیر کسی حرف کے واسطہ کے کسی سے متعلق ہو، تو جسمانی اور مادی طور پر کسی چیز کو اُٹھانا مراد ہوتا ہے، نہ کہ درجہ و مقام کی بلندی، جیسے خود قرآن نے کہا: وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (البقرة: ۱۲۷) ''جب ابراہیم بیت اللہ کی دیواریں اوپر اٹھا رہے تھے'' جہاں درجہ و مقام کی بلندی کا معنی مراد ہوتا ہے، وہاں اس کے اظہار کے لئے رابطہ کے طور پر کوئی حرف لایا جاتا ہے، جیسے: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، (الم نشرح: ۳) ''ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو بلند کیا'' —— اس لئے یہ محض مغالطہ اور فریب ہے، جو متواتر اور صریح حدیثوں، نیز اجماع اُمت کے خلاف ہے۔

﴿۵﴾ یعنی یہودیوں نے آپ کے نسب کے بارے میں جو تہمت لگائی ہے، اس سے آپ کی براءت کو ظاہر کردوں گا؛ چنانچہ ←

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ۝۵۶ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۷ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝۵۸ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ
كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْمُمْتَرِيْنَ ۝۶۰

پھر جن لوگوں نے کفر کیا، ان کو دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار بھی نہ ہوگا ۝۵۶ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ انھیں بھرپور اجر عطا کریں گے اور اللہ نافرمانی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ۝۵۷ یہ جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، (آپ کے نبی ہونے کی) دلیلیں ہیں اور حکمت بھرا مضمون ہے، ﴿۱﴾ ۝۵۸ اللہ کے نزدیک عیسیٰ (کی پیدائش) کی کیفیت (آدم کی پیدائش) کی طرح ہے، کہ اللہ نے اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس سے کہا: ہو جا! تو وہ ہو گئے ﴿۲﴾ ۝۵۹ یہی آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے؛ لہٰذا آپ ہرگز شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیں۔ ۝۶۰

← رسول اللہ ﷺ نے حضرت مریم علیہا السلام کی عفت و پاک دامنی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو خوب واضح فرما دیا۔

﴿۶﴾ موجودہ عیسائی بہ ظاہر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں اور مسلمان حقیقی معنوں میں ان کی پیروی کرتے ہیں؛ کیوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے پیغمبر اسلام ﷺ کی پیشین گوئی فرمائی تھی اور ان پر ایمان لانے کا حکم دیا تھا، مسلمانوں ہی نے اس حکم کی تعمیل کی ہے —— آج پوری دنیا میں مسلمان اور عیسائی یہی دو قومیں غالب ہیں، جو حقیقت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی اتباع کرنے والے ہیں یا اس کا دعویٰ کرتے ہیں، اس طرح اس پیشین گوئی کو کھلی آنکھوں دیکھا جا سکتا ہے۔

﴿۱﴾ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کی یہ تفصیل آپ کے اللہ کی طرف سے نبی ہونے کی نشانی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا، جس کے ذریعہ آپ کو ایک ایسے واقعہ کی تفصیل معلوم ہوتی، جس میں عیسائیوں کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس معجزانہ واقعہ کی وجہ سے خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے، جب کہ یہودی نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ولد الزنا قرار دیتے تھے —— ''ذکر حکیم'' ہونے سے مراد یہ ہے کہ نشانی ہونے کے علاوہ بھی یہ ایک حکیمانہ کلام اور دانائی سے معمور نصیحت ہے۔

﴿۲﴾ عیسائی کہا کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عام بشری طریقہ پر نہیں ہوئی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی ذات مافوق البشر ہے اور آپ نعوذ باللہ خدا کے بیٹے ہیں، قرآن مجید اسی سوال کا جواب دے رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں تو کم سے کم ماں کا واسطہ ہے، جو عام طریقۂ پیدائش کا ایک عنصر ہے؛ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش تو بغیر ماں باپ کے ہوئی، مٹی کے ایک بے جان پتلے میں اللہ کے حکم سے روح پڑ گئی، پس حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش تو عام عادت کے لحاظ سے اور بھی عجیب تر ہے؛ لیکن اس کے باوجود تم ان کو انسان ہی کہتے ہو، تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشر ہونے میں کیا کلام ہے؟

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ
وَنِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۱ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
ع ۶ الْحَكِيْمُ ۝۶۲ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۳ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ
۱۴ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴

پھر (یہ درست بات) معلوم ہوجانے کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی شخص آپ سے حجت کرے تو آپ کہہ دیں: ''آؤ! کہ ہم سب اپنے بیٹوں کو بھی بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی، اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی، اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر ہم مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں ۝۶۱ یقیناً یہی سچا واقعہ ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، بے شک اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں'' ۝۶۲ اگر پھر بھی قبول نہ کریں تو بے شک اللہ فساد مچانے والوں سے خوب واقف ہیں ﴿۱﴾ ۝۶۳ آپ کہہ دیجئے: ''اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے: کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے گا'' ﴿۲﴾ پھر اگر وہ منھ موڑ لیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو فرمانبرداری پر قائم ہیں۔ ۝۶۴

﴿۱﴾ ''ابتہال'' کے معنی الحاح وزاری کے ساتھ بددُعاء کرنے کے ہیں، اسی سے ''مباہلہ'' کا لفظ ہے، اس طرح مباہلہ کے معنی ایک دوسرے کے حق میں بددُعاء کرنے کے ہوئے، یہ واقعہ جیسا کہ سورہ کے آغاز میں مذکور ہوا، بنو نجران کے عیسائی وفد سے متعلق ہے، جب ہر طرح کی عقلی و نقلی دلیلیں پیش کرنے کے باوجود یہ عیسائی تثلیث یعنی تین خداؤں کے عقیدہ پر قائم رہے اور اپنی بات پر بہ ضد رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام (نعوذ باللہ) خدا کے بیٹے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ہم اپنی خواتین اور اولاد کو بلاتے ہیں اور تم اپنے اہل وعیال کو بلاؤ اور دونوں مل کر جھوٹ بولنے والے پر اللہ کی لعنت بھیجیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور کہا کہ اے اللہ! یہی میری اولاد ہیں، (مسلم، فضائل الصحابہ، حدیث نمبر: ۲۴۰۴) آپ ﷺ مباہلہ کے لئے پوری تیاری کرچکے تھے، عیسائی علماء آپ ﷺ کی حقانیت اور صداقت سے پوری طرح آگاہ تھے: اس لئے وہ پیچھے ہٹ گئے اور جزیہ ادا کرنا منظور کرلیا۔

﴿۲﴾ اس سے دعوتِ حق کا اُسلوب اور طریقہ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم کو اسلام کی طرف بلایا جائے تو پہلے ان باتوں کی طرف بلایا جائے جو دونوں کو تسلیم اور دونوں میں مشترک ہوں؛ تاکہ مفاہمت کی فضا میں دعوت کا آغاز ہو، یہاں یہودیوں اور عیسائیوں کو قرآن نے پہلے توحید کی طرف بلایا، جو ان تینوں کتابوں کی مشترکہ تعلیم؛ بلکہ ان کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے، قرآن مجید میں تو ہر آیت اور مضمون کا حاصل کسی نہ کسی طرح توحید ہی ہے، تورات میں بھی توحید کے اثبات اور شرک کی مذمت ونفی کے مضامین بہ کثرت موجود ہیں، انجیل میں اس سے کم ہیں؛ لیکن وہ بھی ان تعلیمات سے خالی نہیں۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٦٥ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ
لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٦٦ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا
وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝٦٧ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ
لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝٦٨ وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۝٦٩ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ
لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝٧٠

اے کتاب والو! تم لوگ ابراہیم کے (یہودی یا عیسائی ہونے کے) بارے میں کیوں جھگڑ رہے ہو؛ حالاں کہ
تورات وانجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہے؟ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟؟ ۝٦٥ ہاں! تم لوگ ایسی باتوں کے
متعلق تو جھگڑ (ہی) چکے ہو، جن کے بارے میں تم کو کسی درجہ میں علم تھا، تو اب ایسی باتوں کے متعلق کیوں جھگڑتے
ہو جن کی بابت تم کو کوئی واقفیت نہیں؟ اور اللہ واقف ہیں تم واقف نہیں ہو ۝٦٦ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی؛ بلکہ
شرک سے بیزار اللہ کے فرمانبردار تھے، اور مشرکوں میں سے نہیں تھے «۱» ۝٦٧ لوگوں میں ابراہیم سے سب سے
زیادہ قریب ابراہیم کی پیروی کرنے والے یہ نبی (محمد رسول اللہ ﷺ) اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ہیں،
اور اللہ ایمان والوں کے دوست ہیں ۝٦٨ اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی خواہش ہے کہ کسی طرح تم کو گمراہ کر
دے؛ حالاں کہ وہ اپنے آپ ہی کو گمراہ کررہے ہیں اور سمجھ نہیں رہے ہیں «۲» ۝٦٩ اے کتاب والو! تم احکام الٰہی کا
کیوں انکار کئے جاتے ہو؛ حالاں کہ تم (خود ان کے منجانب اللہ ہونے پر) گواہ ہو۔ ۝٧٠

«۱» یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے؛ اس لئے ہم یہودیت کو نہیں چھوڑ سکتے، عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عیسائی قرار دیتے تھے، یہ دونوں ہی باتیں صریحاً عقل کے اور مسلّمہ تاریخی حقائق کے خلاف تھیں؛ کیوں کہ یہودیت اور عیسائیت کا تو وجود ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صدیوں بعد ہوا ہے، قرآن نے یہاں اسی نادانی پر متنبہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اُصولی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کے علمبردار اور شرک سے متنفر اور بیزار تھے، اگر تم واقعی اسوۂ ابراہیمی کو اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس دین توحید کا دامن تھام لو، جس کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ دے رہے ہیں۔

«۲» عہد نبوی ہی سے یہودیوں اور عیسائیوں کی نامسعود کوشش رہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے مذہب میں نہ آئیں تو کم سے کم ایمان کی دولت سے محروم ہوجائیں اور شکوک وشبہات کے کانٹے ان کے دلوں میں بھی چبھ جائیں، آج بھی اسلام کے بارے میں مغربی مصنفین کی اکثر تحریروں کا مقصد ومنشاء یہی ہے، اس آیت میں غالباً اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَـقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَـقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٧١﴾ وَقَالَتۡ ع ٨ ١٥
طَّآٮِٕفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَاكۡفُرُوۡۤا
اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۖۚ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ
اَنۡ يُّؤۡتٰٓى اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ اَوۡ يُحَآجُّوۡكُمۡ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ
يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۚۙ ﴿٧٣﴾ يَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ
الۡعَظِيۡمِ ﴿٧٤﴾ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ ۚ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ
بِدِيۡنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآٮِٕمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ
سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿٧٥﴾

اے کتاب والو! تم کیوں جانتے بوجھتے حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو ﴿٧١﴾ اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا: جو کتاب اہل ایمان پر اُتاری گئی ہے، اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام میں اس کا انکار کر بیٹھو، کہ شاید مسلمان بھی (دینِ حق سے) پھر جائیں ﴿٧٢﴾ اور صرف اسی پر یقین کرو جو تمہارے دین پر چلتا ہو، آپ کہہ دیجئے: ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے، یہ سب اس لئے کہہ رہے ہو کہ جو چیز (یعنی: کتاب الٰہی) تم کو عطا کی گئی تھی، وہ کسی اور کو بھی کیوں مل گئی؟ یا اس لئے کہ وہ لوگ تم پر تمہارے رب کے پاس غالب آجائیں گے، ﴿١﴾ آپ کہہ دیجئے کہ عزت و بزرگی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتے ہیں، عطا کرتے ہیں، اور اللہ بڑی وسعت والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿٧٣﴾ اللہ جسے چاہیں اپنی رحمت کے لئے خاص کرلیں اور اللہ بڑے ہی کرم والے ہیں ﴿٧٤﴾ اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر تم ان کے پاس مال کا ایک ڈھیر بھی امانت رکھ دو تو وہ تم کو ادا کردیں گے، ﴿٢﴾ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کے پاس ایک دینار بھی رکھو تو واپس نہ کریں گے، سوائے اس کے کہ ان کے سر پر کھڑے رہو، ﴿٣﴾ یہ اس لئے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ غیر اہل کتاب کے مال کے سلسلہ میں ہم پر کوئی گناہ نہیں اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ گھڑ رہے ہیں۔ ﴿٤﴾ ﴿٧٥﴾

﴿١﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اسلام سے عداوت وعناد رکھنے کے ایک تاریخی اور حقیقی سبب سے پردہ اٹھایا ہے، اور وہ یہ کہ نبوت کا جو تاج حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد مسلسل اولادِ اسحاق علیہ السلام کے سر پر رکھا جا رہا تھا، اب یہ شرف واعزاز؛ بلکہ اس سعادت وخوش بختی کا حسن اختتام بنو اسماعیل پر کیوں ہو رہا ہے؟ —— یہ حسد ان کو نہایت رذیل اور پست حرکتوں پر آمادہ رکھتا تھا، ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ پیشگی تیاری کے ساتھ کچھ لوگوں کو بہ ظاہر نام نہاد مسلمان بنا دیا جائے اور پھر وہ مرتد ہوجائیں، اس طرح مخلص مسلمانوں کا یقین بھی متزلزل ہوجائے گا، آج بھی یہ حضرات اپنی اس حرکت سے باز نہیں ہیں، ←

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷۶ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۷ وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ
اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۸

کیوں نہیں؟ جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور اللہ کا خوف رکھے تو یقیناً اللہ پرہیزگار لوگوں کو دوست رکھتے ہیں ۝۷۶
جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو معمولی قیمت کے بدلہ بیچ ڈالتے ہیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا،
نہ اللہ قیامت کے دن ان سے بات کریں گے، نہ ان کی طرف نگاہِ (رحمت) فرمائیں گے اور نہ ان کو (گناہوں سے)
پاک کریں گے، نیز ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۝۷۷ اور انھیں میں کچھ لوگ ہیں جو کتاب پڑھتے وقت
اُلٹ پھیر کردیتے ہیں؛ تاکہ جو بات کتاب میں نہیں ہے، تم اس کو بھی کتاب کا حصہ سمجھنے لگو، وہ کہتے ہیں کہ یہ
اللہ کی طرف سے ہے؛ حالاں کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ گھڑتے
ہیں۔ ﴿۱﴾ ۝۷۸

← یہ جو مستشرقین اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر قلم اٹھاتے ہیں، کچھ تعریف و اعتراف کرکے اپنی غیر جانبداری اور فراخ دلی کا سکہ اہل علم و دانش پر بٹھاتے ہیں اور پھر اپنی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے بالکل ہی بدگمان ہوجائے، یہ اسی حاسدانہ جذبہ کا عکاس ہے۔

﴿۲﴾ یہی وہ نیک دل لوگ ہیں جو بعد کو رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر ایمان لے آئے۔

﴿۳﴾ یعنی یہودیوں میں مال کی طمع اور حرص بہت زیادہ ہے، یہ صورت حال آج تک قائم ہے اور یہی حرص ہے جس نے ان کو دنیا کی سب سے بڑی سودخوار قوم بنا رکھا ہے؛ حالاں کہ خود تورات میں بھی سود کی مذمت موجود ہے۔

﴿۴﴾ ''اُمیین'' سے مشرکین مراد ہیں، یعنی یہ بے جا طریقہ پر مشرکین عرب کا مال ہڑپ لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

﴿۱﴾ تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں؛ لیکن یہود و نصاریٰ ان میں عبارت و الفاظ کی آمیزش بھی کرتے اور معانی کے بیان کرنے میں بھی خود ساختہ باتیں داخل کردیتے؛ گویا لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف کے مرتکب ہوتے — ''یلوٗن السنتھم'' کے معنی ہیں: ''وہ اپنی زبان کو کج کرتے ہیں'' عربی زبان میں اس سے جھوٹ بولنا اور کسی بات کو اس کے اصل مقصد و مراد سے ہٹا دینا مراد ہوتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾
وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ ع ۸/۹ ۱۶
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ
اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

اللہ ایک شخص کو کتاب، دانائی اور پیغمبری عطا کرے، پھر وہ لوگوں کو کہے کہ اللہ کی بجائے میرے بندے بن جاؤ، یہ ممکن نہیں؛ لیکن (وہ یہی کہے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ؛ کیوں کہ تم کتاب کی تعلیم بھی دیتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو ﴿۷۹﴾ وہ تمہیں یہ حکم بھی نہیں دے سکتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو، کیا وہ تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟ ﴿۱﴾ ﴿۸۰﴾ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور علم عطا کروں، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے، جو اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو، جو تمہارے پاس ہے، تو تم اس پر ضرور ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا! اللہ نے فرمایا: تم اقرار کرتے ہو اور اس سلسلہ میں میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے: ہم نے اقرار کیا، ارشاد ہوا: تو گواہ رہنا، تمہارے ساتھ میں بھی گواہ ہوں! ﴿۲﴾ ﴿۸۱﴾ پھر اس کے بعد جو لوگ اپنی بات سے پھر جائیں، وہی نافرمان ہیں۔ ﴿۸۲﴾

﴿۱﴾ یہ عیسائیوں سے خطاب ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول برحق اور کتابِ الٰہی کے حامل ہے، پھر کیوں کر ممکن ہے کہ وہ خدا پرستی کی دعوت دینے کے بجائے اپنی پرستش یا خدائے واحد کے سوا کسی اور مثلاً ''روح القدس'' کی پرستش کی دعوت دیں، جیسا کہ تم خیال کرتے ہو؟

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے جیسے عالم ارواح میں قیامت تک پیدا ہونے والے انسان سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا، اسی طرح انبیاء سے ایک خصوصی عہد لیا گیا کہ اگر تمہارے بعد کوئی نبی بھیجا جائے تو اس کی تصدیق وتائید کرنا، یہ عہد انبیاء کے واسطہ سے ان کی اُمتوں سے بھی تھا؛ اسی لئے ہر پیغمبر اپنے بعد آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی فرماتے تھے، رسول اللہ ﷺ چوں کہ آخری نبی تھے؛ اس لئے آپ ﷺ نے گذشتہ انبیاء کی تصدیق فرمائی اور آئندہ کے لئے اعلان فرمادیا کہ میرے بعد نبی نہیں آئے گا؛ چنانچہ آپ ﷺ کے بعد جو کوئی بھی اور جس قسم کی بھی نبوت کا دعویٰ کرے وہ کافر اور گمراہ ہے۔

(تفصیل کے لئے علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی ''اکفار الملحدین'' دیکھی جاسکتی ہے)

اَفَغَيۡرَ دِيۡنِ اللّٰهِ يَبۡغُوۡنَ وَ لَهٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّ كَرۡهًا وَّ اِلَيۡهِ
يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾ قُلۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ
وَ يَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَ عِيۡسٰى وَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ
مِّنۡهُمۡ ۚ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۴﴾ وَ مَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَ هُوَ فِى
الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾

کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالاں کہ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے، خواہی نہ خواہی اللہ ہی کے سامنے سرِ تسلیم جھکائے ہوئے ہیں، ﴿۱﴾ اور سب اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۸۳﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر، اس کتاب پر جو ہم پر نازل کی گئی، ان کتابوں پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر اتاری گئیں، اور جو کتابیں موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا فرمائی گئیں، ان سب پر ایمان لائے، ہم (ایمان لانے میں) ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ﴿۲﴾ اور ہم تو اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں ﴿۸۴﴾ اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں بھی نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ ﴿۳﴾ ﴿۸۵﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ''انسان'' اور ''جن'' کو شرعی احکام کا مکلف بنایا ہے اور ان کو ارادہ واختیار کی قوت دی ہے؛ اس لئے دنیا میں وہ اللہ کی فرمانبرداری بھی کرسکتے ہیں اور نافرمانی بھی، اور اس ''ارادہ واختیار'' کی قدرت کی وجہ سے آخرت میں ان سے ثواب وعذاب متعلق ہوگا، باقی دوسری مخلوقات اس قدرت سے محروم ہیں، وہ تکوینی طور پر خدا کی مطیع وفرمانبردار ہیں، چاہے رغبت وشوق کے ساتھ خدا کا حکم بجالائیں، جیسے: فرشتے، یا اس پر مجبور ہوں، جیسے: سورج، چاند، نباتات اور عقل وشعور سے محروم حیوانات، یہ سب خدا کی مرضیات کو پورا کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں، اگر انسان اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کا راستہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو خدا کی بسائی ہوئی اس بستی سے ہم آہنگ رکھتا ہے، اور اگر خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو گویا نظام کائنات سے بغاوت کی راہ اپناتا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی ہمارا ایمان ان تمام نبیوں پر ہے اور ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں؛ البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ عمل اس نبی کی لائی ہوئی شریعت پر کرنا ہے، جو بعد کو مبعوث ہوا ہے؛ کیوں کہ اب خدا کی مرضی یہ ہے کہ اسی پر عمل کیا جائے؛ اس لئے پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے، جیسے کوئی حکومت جب ایک سکہ منسوخ کرکے دوسرا سکہ جاری کرتی ہے تو جو سکہ منسوخ ہوچکا ہو، اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، نیا سکہ ہی مقبول ہوتا ہے؛ حالاں کہ جو سکہ منسوخ ہوچکا ہے، وہی اپنے زمانہ میں مقبول اور معتبر تھا، اسی طرح جو شریعتیں منسوخ ہوچکیں، گو اپنے عہد میں وہی مقبول اور ہدایت کا ←

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ
يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾

اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے سکتے ہیں، جو ایمان لانے، رسول کے برحق ہونے کی گواہی دینے اور رسول کے کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آنے کے بعد بھی کفر کو اختیار کرلیں؟ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتے ﴿۱﴾ ﴿۸۶﴾ ان کی یہی سزا ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور انسانوں کی، سبھوں کی لعنت ہوگی ﴿۸۷﴾ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی؛ ﴿۸۸﴾ البتہ جو لوگ اس کے بعد بھی توبہ کرلیں اور نیک بن جائیں تو یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۸۹﴾ بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور کفر میں بڑھتے رہے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی، ﴿۲﴾ اور یہی لوگ پکے گمراہ ہیں۔ ﴿۹۰﴾

← مدار تھیں؛ لیکن اب ان کا یہ مقام نہیں رہا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلی شریعتیں ناقص تھیں؛ بلکہ بہ تقاضاء مصلحت یہ اسی زمانہ کے لئے موزوں تھیں۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ تمام دین برحق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہے، درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو دین مقبول ہے، وہ صرف اسلام اور شریعت محمدی ﷺ ہے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد اب کسی اور دین یا شریعت سے انسانیت کی فلاح ونجات کا تعلق باقی نہیں رہا۔

﴿۱﴾ جس شخص کو اپنی بیماری کا پتہ نہ ہو اس کو تو دوا بتائی جاسکتی ہے؛ لیکن جو اپنے بیمار ہونے سے واقف ہو، پھر بھی بہ ضد ہو کہ اپنا علاج نہیں کرائے گا، اس کو دوا بتانے کا کیا فائدہ؟

﴿۲﴾ یعنی جو آخر تک کفر پر قائم رہا، اور جب روح قبض کرنے والے فرشتے سامنے آگئے تو اب کفر سے توبہ کرتا ہے، ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں؛ کیوں کہ ایمان ''غیب'' پر لانا ہے اور یقین ان دیکھی سچائیوں پر کرنا ہے، جب فرشتۂ موت آچکا تو گویا عالم بالا کی کاروائیاں شروع ہوگئیں اور غیب کے پردے اٹھنے لگے، اب ایمان لانا معتبر نہیں، موت کے قریب توبہ قبول نہ ہونے کا صریح ذکر (النساء:۱۸) میں بھی آیا ہے اور حدیث میں بھی آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جان کنی کے وقت کی توبہ مقبول نہیں: ''إن اللہ یقبل توبة العبد مالم یغرغر''۔

(سنن الترمذي، کتاب الدعوات، باب قبول توبة العبد مالم یغرغر، حدیث نمبر: ۳۸۸۰، سنن ابن ماجة، کتاب الزھد، باب ذکر التوبة، حدیث نمبر: ۴۳۹۴)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

ع ۱۷/۱۱

بے شک جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں ان کی موت واقع ہوگئی، اگر ان میں سے کوئی زمین کے برابر سونا بھی معاوضہ میں دینا چاہے تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، ﴿۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور کوئی ان کا مددگار بھی نہ ہوگا۔ ﴿۹۱﴾

﴿۱﴾ اولاً تو آخرت میں ہر شخص خالی ہاتھ ہوگا، سونا چاندی تو درکنار، تن پر کپڑے تک نہ ہوں گے، اور اگر بالفرض انسان کے پاس دولت دنیا بھی ہو، تو وہاں اس کی کوئی قیمت نہیں؛ کیوں کہ وہاں صرف ایمان اور عمل صالح کی دولت کام آئے گی، اس کے سوا کوئی اور سکہ نہ چلے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ
تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز (اللہ کے راستہ میں) خرچ نہ کرو، ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے اور تم جو بھی خرچ کروگے، اللہ اس سے خوب واقف ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۲﴾ تورات نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے اپنے اوپر جو چیز حرام کرلی تھی، اس کے سوا کھانے کی تمام چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں، آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو تورات لاؤ اور اسے پڑھ کر سناؤ ﴿۲﴾ ﴿۹۳﴾ پھر اس کے بعد بھی جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑیں، وہی ظالم ہیں۔ ﴿۹۴﴾

﴿۱﴾ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں مومن کو اپنی محبوب چیز خرچ کرنی چاہئے، یہ نہ ہو کہ جس چیز کی طرف طبیعت کی رغبت نہ ہو، وہ تو اللہ کی راہ میں دے دے اور جو چیز اسے محبوب اور پسند ہو، اس کو خدا کے راستہ میں قربان کرنے کے لئے تیار نہ ہو، علماءِ یہود جو ایمان لانے سے انکار کر رہے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ ان کو اپنی سرداری اور قیادت محبوب تھی اور وہ اس کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے؛ گویا ان کو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ تم نیکی کے کمال کو اس قربانی کے بغیر نہیں پا سکتے — اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بہت سے صحابہ نے اپنی محبوب ترین چیزیں اللہ کے راستہ میں صدقہ کردیں، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو تو امام بخاری اور مسلم نے بھی نقل کیا ہے کہ ان کی ایک قیمتی زمین ''بَیرحاء'' تھی، جسے انھوں نے یہ کہہ کر صدقہ کردیا کہ میرا سب سے محبوب مال یہی ہے۔ (بخاری: کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۳۳۴، مسلم، حدیث نمبر: ۳۸۰۵)

﴿۲﴾ یہود نے مسلمانوں پر اعتراض کیا کہ تم اپنے آپ کو 'دینِ ابراہیمی' پر کہتے ہو؛ حالاں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ حرام تھا اور تم اسے جائز سمجھتے ہو اور کھاتے ہو، قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ سب چیزیں شریعت ابراہیمی میں جائز تھیں؛ البتہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ''عِرق النساء'' کی تکلیف تھی، انھوں نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ صحت مند ہو جائیں تو اللہ کے لئے اسے چھوڑ دیں گے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی اور انھوں نے نذر کو پوری کیا، بنی اسرائیل نے اس کو اپنے اوپر بھی حرام کرلیا، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۱۳۴) پہلی اُمتوں میں اس طرح کی نذر جائز تھی، اس اُمت میں ایسی نذر جائز نہیں، جو کسی حلال کو حرام کرتی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے، (التحریم: ۱) یہ واقعہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اور تورات کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اس کے باوجود تورات میں اونٹ کے حرام ہونے کا ذکر نہیں، معلوم ہوا کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں اونٹ کا گوشت اور اس کا دودھ حرام تھا، صحیح نہیں ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ
بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ
اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ
وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کا فرمایا ہوا سچ ہے؛ اس لئے تم لوگ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو، جو خدا کی طرف یکسو تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے ﴿۱﴾ ﴿۹۵﴾ بے شک پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت کرنے) کے لئے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، ﴿۲﴾ وہ بابرکت بھی ہے اور تمام عالم کے لئے ہدایت کا ذریعہ بھی ﴿۹۶﴾ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ﴿۳﴾ مقام ابراہیم ہے، جو بھی اس میں آجائے وہ امن یافتہ ہے، ﴿۴﴾ جو لوگ اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن پر اِس کا حج فرض ہے، ﴿۵﴾ اور جو انکار کرے تو یقیناً اللہ پوری دنیا سے بے نیاز ہیں۔ ﴿۹۷﴾

﴿۱﴾ یعنی اصل دین ابراہیمی یہ ہے کہ شرک سے باز رہو اور توحید پر کوئی آنچ نہ آنے دو، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا لب لباب تھا، بعض یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو (تفسیر ماجدی: ۳۴۶/۲) اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر دین ابراہیمی کی صریحاً خلاف ورزی کر رہے تھے۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ سب سے پہلی عبادت گاہ ''کعبہ'' ہے، جو مکہ مکرمہ میں واقع ہے اور یہ بیت المقدس سے بھی قدیم ہے، گو اکثر مستشرقین اور مغربی مصنفین مکہ کی قدامت کے قائل نہیں ہیں؛ لیکن منصف مزاج مغربی اہل علم نے بھی مکہ کے قدیم ترین مقام ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ (دیکھئے: تفسیر ماجدی: ۶۰۹/۱)

﴿۳﴾ مقام ابراہیم، زمزم، حجر اسود تو اللہ کی نشانیاں ہیں ہی، کعبۃ اللہ سراپا اللہ کی نشانی ہے، غور کیجئے کہ ایک چھوٹی سی چوکور عمارت، معمولی پتھروں سے بنی ہوئی، نہ نقش و نگار ہے اور نہ ظاہری حسن و جمال، ایک ایسے خطہ میں جہاں نہ کوئی درخت اُگتا ہے اور نہ کوئی پودا، نہ پھل ہے اور نہ پھول، موسم کی ناہمواری اس کے علاوہ، نہ مادی اعتبار سے کوئی سامانِ کشش ہے اور نہ سیاحوں کے لئے کوئی سامانِ دلچسپی؛ لیکن دنیا کے کونہ کونہ سے اللہ کے بندے سردی و گرمی اور بارش کی پرواہ کئے بغیر دن رات اور صبح و شام اس گھر کی طرف رواں دواں ہیں اور اس کے پھیرے لگا رہے ہیں، اس سے بڑھ کر نشانی اور کیا ہوگی؟

﴿۴﴾ یعنی اللہ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ مکہ کو اللہ تعالیٰ نے امن و امان کی جگہ بنا دیا ہے، جو حرم میں داخل ہوجائے، اسے امن حاصل ہوجاتا ہے؛ یہاں تک کہ حدودِ حرم میں شکار بھی جائز نہیں اور خودرَو پودوں کو اکھاڑنا بھی منع ہے، (مجمع الزوائد: ۲۸۳/۳) اسلام کے آنے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں ہزار لاقانونیت کے باوجود عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ مکہ میں ہر طرح کی دست درازی سے بچتے تھے اور اگر اپنے باپ کا قاتل بھی نظر آجائے تو نگاہ جھکا لیتے تھے، یہ بھی گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بڑی نشانی تھی۔ ←

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

آپ کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کے احکام کا انکار کرتے ہو اور تم جو کچھ کرر ہے ہو، اللہ اس پر گواہ ہیں ﴿۹۸﴾ آپ کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، تم ان کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو؟ اس لئے کہ تم اس میں کجی تلاش کرتے ہو؛ حالاں کہ تم خود واقف ہو؟ ؟﴿۱﴾ اور اللہ تمہارے اِن کاموں سے بے خبر نہیں ہیں ﴿۹۹﴾ اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی باتیں ماننے لگو، تو وہ تو تم کو ایمان سے سرفراز ہونے کے بعد کفر کی طرف لوٹا دیں گے ﴿۲﴾ ﴿۱۰۰﴾

← ﴿۵﴾ حج اسلام کے پانچ اہم ارکان میں سے ایک ہے، جس کے فرض ہونے پر اُمت کا اجماع واتفاق ہے، (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۱۴۲/۴) حج کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص قدرت کے باوجود حج نہ کرے، مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ یہودی بن کر مرے یا عیسائی، (شعب الإیمان للبیہقی، باب فی المناسک، حدیث نمبر: ۳۹۷۹) —— حج کی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کی پرورش کسی شخص کے ذمہ واجب ہے، سفر حج کے دوران ان کے نفقہ کے علاوہ سفر اور سفر کی حالت میں پیش آنے والی ضروریات کے بقدر پیسے اس کے پاس موجود ہوں اور مقامات حج تک پہنچنے میں کوئی قوی خطرہ درپیش نہ ہو، صحت مند ہو، چلنے پھرنے سے معذور نہ ہو، عورت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی محرم یا شوہر ساتھ ہو، یا خود عورت کے اندر اتنی مالی استطاعت ہو کہ وہ اپنے علاوہ اپنے شوہر یا محرم کے اخراجات سفر بھی برداشت کر سکے۔ (ھدایہ: کتاب الحج: ۳۰۳)

﴿۱﴾ یعنی ایک تو تم اپنی بے توفیقی سے ایمان نہیں لاتے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، ان کو بھی دین حق میں فرضی عیب بتا کر شک وشبہ میں مبتلا کرنا اور ایمان سے محروم کرنا چاہتے ہو؛ حالاں کہ تم خود اپنے شبہات واعتراضات کے غلط ہونے سے آگاہ ہو۔

﴿۲﴾ کھلا ہوا ارتداد تو کفر ہے ہی، اسلام کے بتائے ہوئے عقائد واعمال کے بارے میں شک وشبہ میں پڑ جانا بھی کفر ہے اور کافروں کے سے اعمال کرنا بھی ایک طرح کا عملی ارتداد ہی ہے، پس! جیسے اسلام کے عہد اول میں اہل کتاب چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو راہِ حق سے منحرف کر دیں، اسی طرح آج بھی یہودی اور عیسائی اہل علم اور اہل قلم مسلمانوں کو فکری اور عملی ارتداد میں مبتلا کرنے کے لئے دن رات کوشاں ہیں۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ
فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ ع ۱۰
اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى
شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اورتم کفر کیسے کر سکتے ہو؛ حالاں کہ تم پر اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے، ﴿۱﴾ اور جو شخص اللہ (کے دین) کو مضبوطی سے تھام لے یقیناً اسے سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرمائی گئی ﴿۱۰۱﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، ﴿۲﴾ اور مرتے دم تک اسلام پر قائم رہو ﴿۱۰۲﴾ نیز سب مل کر مضبوطی کے ساتھ اللہ کی ڈوری کو تھام لو اور پھوٹ کا شکار نہ ہو جاؤ، اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے، تو اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا، ﴿۳﴾ اللہ اسی طرح تمہارے لئے اپنے احکام کو بیان کرتے ہیں؛ تا کہ تم ہدایت پر قائم رہو۔ ﴿۱۰۳﴾

﴿۱﴾ صحابہ کے زمانہ میں تو رسول اللہ ﷺ ظاہری طور پر موجود تھے ہی، وفات کے بعد بھی چوں کہ آپ کی تعلیمات اور سیرتِ طیبہ موجود و محفوظ ہیں؛ اس لئے گویا معنوی وجود آپ کا اب بھی ہے؛ لہٰذا جیسے اُس وقت کسی صاحب ایمان سے کفر کو اختیار کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، آج بھی اُن سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، ان پر عمل کرو اور جن باتوں سے منع فرمایا ہے، ان سے اجتناب کرو اور جہاں تک ہوسکے تقویٰ اختیار کرو، چنانچہ ایک اور موقع پر ارشاد ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، (تغابن:۱۶) ''طاقت بھر اللہ سے ڈرو''۔

﴿۳﴾ قرآن مجید کی یہ آیات خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہیں، انصار مدینہ کے دو خاندان تھے، اَوس اور خزرج، ان دونوں میں ہمیشہ جنگ رہتی تھی، ہجرت سے کچھ پہلے بھی ان کے درمیان ایک جنگ ہو چکی تھی، جو ''جنگ بُعاث'' کہلاتی تھی، رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری اور انصار کے مشرف بہ اسلام ہونے کی برکت سے یہ نفرت محبت میں، اختلاف اتحاد میں اور جذبۂ انتقام جذبۂ ایثار میں تبدیل ہو چکا تھا، (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۴/ ۱۶۴) یہود جو ہمیشہ ان کے اختلاف سے فائدہ اُٹھاتے تھے، ان کو انصار کا یہ اتحاد و اتفاق ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ابن قیس نامی ایک سن رسیدہ بوڑھا یہودی اوس و خزرج کے لوگوں کے پاس سے گذرا تو دیکھا کہ وہ باہم خوب اُلفت و محبت سے باتیں کر رہے ہیں، یہ کیفیت اس سے برداشت نہ ہو سکی اور ایک نوجوان کو بھیجا کہ جا کر ان کے درمیان کسی طرح جنگ بُعاث کا ذکر چھیڑ دے، اس نے یہ ذکر کچھ اس طرح چھیڑا کہ آگ سی لگ گئی اور دونوں قبائل میں اتنا اختلاف بڑھا کہ ہتھیار تک نکل آیا، آپ ﷺ کو اطلاع ملی تو کچھ مہاجرین کے ساتھ آپ ﷺ تشریف لائے، ←

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝١٠٤ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ
الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠٥ۙ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝١٠٦

تم میں ایک ایسی جماعت (بھی) ہونی چاہئے، جو نیکی کی طرف بلاتی رہے، بھلائی کا حکم دیا کرے اور برائی سے
روکتی رہے، «۱» اور وہی لوگ کامیاب ہیں ۝١٠٤ تم لوگ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جو ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور اس
کے باوجود کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے تھے، اختلاف کرنے لگے، «۲» اور اِن ہی لوگوں کے لئے بڑا عذاب
ہے ۝١٠٥ جس دن بعض چہرے روشن ہوں گے اور بعض سیاہ، تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، (ان سے کہا جائے گا)
کیا تم ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہوگئے؟ تو اب اپنے کفر کے بدلہ عذاب چکھو! ۝١٠٦

← آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور ابھی سے یہ جاہلیت کے نعرے؟ اللہ نے تم کو اسلام سے مشرف کیا، جاہلیت کی باتوں کو تم سے دور کیا، کفر سے نکالا اور تمہارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا اور پھر تم کفر کی طرف لوٹ رہے ہو؟ —— یہ سننا تھا کہ انصار کو تنبہ ہوا اور سمجھ گئے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے، ہتھیار پھینک دیئے، روئے اور باہم بغل گیر ہوئے، (دیکھئے: مختصر تفسیر ابن کثیر: ۱/۳۰۵ و دیگر کتب) —— اسی موقع سے یہ آیات نازل ہوئیں۔

«۱» ''معروف'' کے اصل معنی مشہور اور جانی پہچانی بات کے ہیں، یعنی وہ بات جو عام رواج اور چلن کی وجہ سے جانی پہچانی ہوئی ہوں، ''منکر'' کا لفظ اس کے مقابلہ میں ہے، یعنی ایسی بات جو خلاف عادت اور اَن پہچانی ہو، بھلائی کو ''معروف'' سے اور برائی کو ''منکر'' سے تعبیر کر کے قرآن مجید نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ نیکیوں کا سماج میں عام چلن ہونا چاہئے اور برائیوں کا وقوع اس طرح ہو کہ گویا خلاف عادت اور خلافِ معمول ایک بات پیش آگئی ہے۔

«۲» یعنی یہود و نصاریٰ جو حامل کتاب اور حق و سچائی سے آگاہ ہونے کے باوجود اختلاف پر کمر بستہ تھے اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے —— مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا گیا کہ کتاب و سنت اور آثار صحابہ کے موجود ہوتے ہوئے اُصولِ دین میں باہم اختلاف نہ کرو اور فرقہ بندی سے بچو، رہ گئے فقہی اور فروعی مسائل میں اختلافات، تو یہاں ان کی مذمت مقصود نہیں؛ کیوں کہ یہ خطا اور صواب کا اختلاف ہے نہ کہ حق و ضلال اور ہدایت و گمراہی کا، اس اجتہادی خطا کے بارے میں تو آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا کہ جو صواب اور درستگی پر ہو، اس کے لئے دوہرا اجر ہے اور جس سے خطا اور لغزش ہو، اس کو بھی ایک اجر ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۷۳۵۲) یہ اختلاف تو خلفاء راشدین، صحابہ اور سلف صالحین کے عہد میں بھی رہا ہے، نہ اس سے کبھی فرقہ بندی پیدا ہوئی ہے اور نہ یہ اختلاف کبھی اُمت کے سمجھ دار لوگوں میں نزاع و جدال کا سبب بنا ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِیۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلۡكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ
نَتۡلُوۡهَا عَلَیۡكَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیۡدُ ظُلۡمًا لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی
الۡاَرۡضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۱۰۹﴾ كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ ع ۸/۲
بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوۡ اٰمَنَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ لَكَانَ خَیۡرًا
لَّهُمۡ ؕ مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

اور جن لوگوں کے چہرے روشن ہوں گے، ﴿۱﴾ وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور ہمیشہ اسی میں رہا کریں گے ﴿۱۰۷﴾
یہ اللہ کے احکام ہیں، جو ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک سنا رہے ہیں اور اللہ دنیا جہان (میں سے کسی) پر ظلم کرنا نہیں چاہتے ﴿۱۰۸﴾
(اے مسلمانو!) جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام چیزیں لوٹائی جائیں گی ﴿۱۰۹﴾ تم وہ بہترین اُمت ہو، جو پوری انسانیت کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، اور اللہ پر ایمان رکھو، ﴿۲﴾ اگر اہل کتاب ایمان لے آئے ہوتے تو ان ہی کے حق میں بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو ایمان والے ہیں اور زیادہ تر نافرمان۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۱۰﴾

﴿۱﴾ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ستاری کے پردہ میں کیسے کیسوں کو ڈھانپ رکھا ہے، اگر یہ پردہ ہٹ جائے، تو بڑے بڑوں کے لئے آبرو بچانی مشکل ہو جائے؛ اسی لئے دنیا میں عام طور پر انسان کی صورت سے اس کے نیک و بد اور شریف و رذیل ہونے کا اندازہ کرنا دشوار ہوتا ہے؛ لیکن آخرت میں انسان کا چہرہ بھی اس کے اعمال کی گواہی دے گا، جو نیک اور متقی ہوں گے، ان کے چہرے نورانی اور روشن ہوں گے اور جو بدکار ہوں گے، ان کے چہرے بے نور اور تیرہ و تاریک، یہ بجائے خود اعزاز اور تذلیل کی ایک صورت ہوگی۔

﴿۲﴾ اس آیت میں اُمتِ محمدیہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف داعی و مصلح بنا کر بھیجی گئی ہے اور عالمگیر دعوت و تبلیغ کے منصب پر فائز کی گئی ہے، جس کا کام لوگوں کو حق کی طرف بلانا اور باطل سے روکنا ہے، بعض اہل علم کے نزدیک دعوت و تبلیغ اُمت پر فرض عین ہے، یعنی ہر مسلمان پر اپنی صلاحیت کے لحاظ سے دعوت دینا فرض ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک یہ فرض کفایہ ہے، یعنی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دعوت حق کا کام کرتی رہے اور انسانیت کو اسلام کی طرف بلاتی رہے، اگر کچھ لوگ اس فریضہ کو ادا کرتے رہیں تو اجر تو ان ہی کو ہوگا؛ لیکن پوری اُمت گناہ سے بچ جائے گی اور اگر کوئی نہ کرے تو پوری اُمت گنہگار ہوگی —— معروف میں تمام نیکیاں داخل ہیں، غیر مسلموں کو دعوت اسلام، مسلمانوں کی اصلاح، منکر میں تمام برائیاں شامل ہیں، کفر، فسق، حرام اور مکروہات کا ارتکاب وغیرہ، نیز نیکی کی طرف بلانے اور برائی سے روکنے کا کوئی ایک طریقہ متعین نہیں، زبان سے، قلم سے، طاقت وقوت کے استعمال سے اور اثر و رسوخ سے، انفرادی طور پر یا جماعتی صورت میں، یہ تمام ہی صورتیں معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کی ہو سکتی ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دوسرے اہل کتاب صحابہ جن کی تعداد ایمان نہ لانے والے یہود و نصاریٰ کے مقابلہ بہت کم تھی۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ
الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(اے مسلمانو!) وہ سوائے تھوڑی سی اذیت پہنچانے کے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، اور اگر تم سے جنگ کریں گے تو تم کو پیٹھ دیکھا کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد بھی نہیں ہوگی ﴿۱﴾ ﴿۱۱۱﴾ جہاں کہیں بھی رہیں گے، ذلت ہی سے دوچار رہیں گے، سوائے اس کے کہ اللہ کے سہارے اور لوگوں کے سہارے اس سے بچ جائیں، ﴿۲﴾ وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو چکے ہیں اور ان پر پستی مسلط کردی گئی ہے، یہ اس لئے کہ وہ اللہ کے احکام کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء کا قتل ناحق کرتے تھے، نیز یہ ان کی نافرمانیوں اور مسلسل زیادتیوں کا نتیجہ ہے ﴿۳﴾ ﴿۱۱۲﴾ تمام اہل کتاب یکساں نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو (دین حق پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے اور سجدے کرتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۱۳﴾

﴿۱﴾ یعنی کچھ زبانی اذیت رسانی، طعن وتشنیع اور بہتان تراشی کے سوا کوئی بڑا نقصان مسلمانوں کو نہیں پہنچا سکیں گے اور میدان جنگ میں شکست وہزیمت ہی سے دوچار ہوں گے؛ چنانچہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ یہودیوں کو بالآخر مدینہ خالی کرنا پڑا۔

﴿۲﴾ مفسرین نے اللہ کے سہارے سے ان کا اسلام قبول کرنا یا قانونِ اسلامی کے اعتبار سے ان کی عورتوں اور بچوں کا محفوظ و مامون ہونا مراد لیا ہے، اور لوگوں کے سہارے سے مراد یہ ہے کہ مسلمان انہیں امان دے دیں یا کوئی غیر مسلم گروہ یا ملک ان کے لئے سہارا بن جائے؛ جیسا کہ آج کل 'اسرائیل' امریکہ اور بعض مغربی ملکوں کے سہارے دنیا کے نقشہ پر موجود ہے، یہودیوں کی ذلت ونکبت اور پستی کی جو پیشین گوئی قرآن مجید نے کی ہے، وہ ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے، جس پر کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں، گذشتہ ادوار میں رومن حکومت نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تو اپنی جگہ، ماضی قریب میں بھی جرمنی اور چیکوسلواکیہ وغیرہ میں ان کے ساتھ جیسے جیسے انسانیت سوز سلوک روا رکھے گئے اور جگہ جگہ ان کا قتل عام ہوا، وہ گویا کل کی بات ہے۔

﴿۳﴾ ''کانوا یعتدون'' عربی قاعدہ کے لحاظ سے ماضی استمراری کا صیغہ ہے، جس میں دوام واستمرار کا معنی پایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ ''مسلسل زیادتی'' سے کیا گیا ہے۔

﴿۴﴾ یعنی اہل کتاب میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے، جو اسلام پر ایمان لایا ہے اور احکامِ الٰہی کا پابند ہے، ''یَسْجُدُوْنَ'' کے اصل معنی تو ''سجدہ کرتے ہیں'' کے ہیں؛ لیکن بعض مفسرین نے اس سے نماز پڑھنا بھی مراد لیا ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۱۷۶)

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ
فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ
وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ
وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا
يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ
صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

یہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نیکیوں کی طرف لپکتے ہیں اور یہی نیک لوگوں میں ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۱۴﴾ اور یہ جو بھی نیکی کریں، اس (کے اجر) سے ہرگز محروم نہیں ہوں گے اور اللہ تقویٰ والوں سے خوب آگاہ ہیں ﴿۱۱۵﴾ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا ہے، اللہ کے مقابلہ میں نہ ان کو ان کا مال کام آئے گا اور نہ ان کی اولاد، اور یہی لوگ تو دوزخی ہیں، یہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے ﴿۱۱۶﴾ یہ لوگ اس دنیوی زندگی میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے، جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی کو جا لگے، جنھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کر رکھا ہے، پھر وہ اس کھیتی کو برباد کر کے رکھ دے، ﴿۲﴾ اور اُن پر اللہ نے ظلم نہیں کیا ہے؛ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں ﴿۱۱۷﴾ اے ایمان والو! اپنے لوگوں کے سوا کسی اور کو راز دار نہ بناؤ، کہ وہ تم لوگوں کے ساتھ فساد پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، ان کی خواہش ہے کہ تم کو نقصان پہنچے، دشمنی ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے، ﴿۳﴾ اور ان کے دل میں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں، اگر تمہیں عقل ہے تو ہم نے تمہارے لئے احکام ﴿۴﴾ کھول کر بیان کر دئے ہیں۔ ﴿۱۱۸﴾

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ صالحین کے اوصاف یہ ہیں کہ ان کے اندر ایمان بھی ہو، نیکی کی طرف دعوت اور برائی سے روکنے کا اہتمام بھی ہو اور نیک کام میں سبقت اور پہل کا جذبہ بھی۔

﴿۲﴾ یعنی جو لوگ ایمان سے محروم ہیں اور محض ظاہری جذبہ کے تحت کچھ رفاہی اور خدمتِ خلق کا کام کر لیتے ہیں، ان کی نیکیاں آخرت میں کچھ کام نہیں آئیں گی، گویا یہ ایسی کھیتی ہے جس کی محنت سے نشوونما کی گئی اور سرد ہواؤں نے اس کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

﴿۳﴾ بعض انصار جو زمانۂ کفر میں یہودیوں سے دوستی رکھتے تھے، اسلام قبول کرنے کے بعد بھی انسانی اور سماجی نقطۂ نظر سے ←

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا
اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۘ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ
اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع ۱۲/۱۱/۳ وَ اِذْ
غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

تم وہ لوگ ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو؛ حالاں کہ وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم تو تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور جب تم سے علاحدہ ہوتے ہیں تو مارے غصہ کے انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ تم لوگ آپ اپنے غصہ میں مرجاؤ، بے شک اللہ دلوں کی باتوں سے بھی خوب واقف ہیں ﴿۱۱۹﴾ اگر تم لوگوں کو کوئی بھلائی حاصل ہو تو ان کو ناگوار گذرتی ہے اور تم کسی تکلیف دہ بات سے دوچار ہو تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں، اگر تم لوگ صبر اور تقویٰ سے کام لیتے رہو، ﴿۱﴾ تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچاسکے گی؛ (کیوں کہ) ان کے سارے کرتوت کو اللہ اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں ﴿۱۲۰﴾ اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ صبح کے وقت اپنے گھر والوں کے پاس سے نکلے کہ مسلمانوں کو جنگ کے لئے مورچوں پر مقرر کردیں، اور اللہ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۲۱﴾

← ان کے ساتھ خوب اُٹھنا بیٹھنا رکھتے تھے، قرآن مجید نے ان کو متنبہ کیا اور اس تنبیہ کے ذریعہ مسلمانوں کو ایک اُصولی بات بتادی کہ انسانی حسن سلوک اپنی جگہ؛ لیکن مذہبی اور قومی معاملات میں غیر مسلموں کو اپنا راز دار بنانا اور راز کی باتوں میں شریک کرنا کسی طور درست نہیں؛ اس لئے کہ 'راز دار' دوست اور خیر خواہ کو بنایا جاتا ہے اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے سینے بغض وکدورت سے بھرے ہوئے ہیں، جو مضطربانہ زبان تک بھی آجاتے ہیں اور فتنہ وفساد میں یہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے، مسلمانوں کو اِس دور میں بعض ہزیمتیں محض اس وجہ سے اٹھانی پڑیں کہ انھوں نے قرآن کی اس ہدایت کو ملحوظ نہیں رکھا۔

﴿۴﴾ یا تو اس سے یہ مراد ہے کہ ان کی دشمنی اور عداوت کی علامتیں میں نے تمہارے لئے وضاحت کے ساتھ بیان کردی ہیں، یا یہ مراد ہے کہ ان سے راز دارانہ دوستی کی ممانعت کا حکم اور اس کی مصلحت تم سے ذکر کردی ہے، مفسرین نے دونوں طریقہ پر اس کی تشریح کی ہے۔

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ 'صبر اور تقویٰ' دشمنوں کی سازشوں کو بے اثر اور نامراد کرنے کے لئے کلید کا درجہ رکھتا ہے، صبر اور تقویٰ ایسا جامع لفظ ہے کہ اس میں اللہ سے تعلق اور ظاہری تدابیر دونوں شامل ہیں۔

﴿۲﴾ اس آیت میں غزوۂ اُحُد کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے، یہ غزوہ شوال ۳ھ میں پیش آیا، رمضان ۲ھ میں مسلمانوں اور مکہ کے مشرکوں کے درمیان بدر کے میدان میں پہلا باضابطہ معرکہ ہوا تھا، جس میں مسلمان اسباب اور وسائل کی کمی کے باوجود فتح یاب ہوئے ←

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(وہ وقت بھی یادرکھے جانے کے لائق ہے) جب تم میں سے دوگروہوں نے چاہا تھا کہ ہمت ہاردیں؛ حالاں کہ اللہ ہی ان دونوں کا بھی مددگار تھا اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے ﴿۱﴾ ﴿۱۲۲﴾ یقیناً اللہ ہی نے بدر میں تمہاری مدد کی تھی؛ حالاں کہ تم کمزور تھے؛ اس لئے (اپنے دل میں) اللہ ہی سے ڈرو، اُمید کہ تم اللہ کا شکر ادا کروگے۔ ﴿۱۲۳﴾

← اور ستر (۷۰) کفارِ مکہ مارے گئے، جن میں کئی ان کی سربرآوردہ شخصیتیں تھیں، اور ستر (۷۰) قید کئے گئے، اس شکست فاش نے اہل مکہ میں صفِ ماتم بچھادی اور وہ بھرپور تیاری کے ساتھ شوال ۳ ہجری میں دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہونے کی غرض سے ظاہری اسباب ووسائل سے لیس ہوکر مدینہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے احد کے دامن میں آکر رُک گئے، مسلمانوں کے لئے مقابلہ کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا؛ لیکن مقابلہ کی حکمت عملی کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف رائے تھا، رسول اللہ ﷺ اور بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے خواہاں تھے، یہی رائے منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کی بھی تھی، نوجوانوں کا خیال تھا کہ اس سے وہ مسلمانوں کو کم ہمت سمجھیں گے؛ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے، آپ ﷺ نے ان کی رائے کو قبول کرلیا اور زرہ پہن کر اُحد کے ارادہ سے باہر آگئے، یہ ۷ رشوال، ہفتہ کا دن اور صبح کا وقت تھا، جس کا قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے، اب نوجوان صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی پشیمانی ہوئی کہ گویا انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی رائے کو تبدیل کیا اور اِن حضرات نے درخواست کی کہ ہم لوگ آپ ﷺ ہی کی رائے کے مطابق مدینہ میں رہ کر مقابلہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب پیغمبر زرہ پہن لے اور ہتھیار لگالے، تو اسے زیبا نہیں کہ بغیر جنگ کے زرہ اتاردے، ایک ہزار افراد آپ ﷺ کے ساتھ تھے، ان میں بھی زرہ پوش صرف سو سپاہی تھے، رسول اللہ ﷺ کے علاوہ پوری فوج میں صرف ایک گھوڑا تھا، اہل مکہ تین ہزار تھے، ان میں سات سو زرہ پوش، دوسو گھوڑسوار اور باقی اونٹ سوار تھے اور عورتیں بھی جوش دلانے اور رجزیہ نظمیں گانے کے لئے ساتھ ساتھ تھیں، مزید ستم یہ ہوا کہ عبداللہ ابن ابی یہ بہانہ کرکے الگ ہوگیا کہ اس کی بات نہیں مانی گئی، کچھ بھولے بھالے مسلمان بھی ناسمجھی میں اس کے ساتھ ہولئے، اس طرح عین وقت پر تین سو فوجی کم ہوگئے اور اب لشکر اسلام صرف سات سو سپاہی پر مشتمل رہ گیا، رسول اللہ ﷺ نے پوری جنگی حکمت عملی کی رعایت کرتے ہوئے فوجی دستے بنائے اور ان کی صفیں ترتیب دیں، لشکر اسلام کے پشت پر آپ نے تیراندازوں کا جو دستہ مقرر فرمایا تھا اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہتا تو غزوۂ احد کا آخری انجام بھی غزوۂ بدر سے مختلف نہ ہوتا؛ لیکن تیرانداز دستے کی ایک اجتہادی لغزش اور غلط فہمی کی وجہ سے بہ ظاہر یہ جنگ مسلمانوں کے نقصان پر ختم ہوئی۔ وکان أمر الله قدرًا مقدورا۔

﴿۱﴾ یہاں انصار کے دو قبائل بنوحارثہ اور بنوسلمہ کا ذکر ہے، عبداللہ ابن ابی کو دیکھ کر تعداد اور ظاہری اسباب کی کمی کے باعث ان قبائل کو بھی خیال ہوا کہ وہ واپس ہوجائیں، گو یہ ایمان میں مخلص تھے، منافق نہ تھے، (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ۱۸۵/۴) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کی کم ہمتی کو دور کردیا۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ
قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

(اے رسول! وہ بات بھی قابل ذکر ہے) جب آپ مومنوں سے فرمارہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب آسمان سے اُتارے ہوئے تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے؟ ﴿۱۲۴﴾ بلکہ اگر تم صبر سے کام لو، تقویٰ اختیار کرو اور وہ لوگ تم پر یکبارگی حملہ آور ہو جائیں تو تمہارے پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے، جن پر امتیازی نشان رہے گا ﴿۱﴾ ﴿۱۲۵﴾ اور اللہ نے ایسا محض اس لئے فرمایا کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد تو صرف اللہ ہی کی ہے جو غالب بھی ہیں اور حکمت والے بھی ﴿۲﴾ ﴿۱۲۶﴾ (اور یہ نصرت خداوندی اس لئے کی گئی) کہ اللہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک یا ان کو ذلیل و رسوا کردیں کہ وہ محروم ہو کر واپس ہوں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۲۷﴾

﴿۱﴾ اکثر مفسرین کے نزدیک فرشتوں کے ذریعہ مدد کا یہ وعدہ غزوۂ بدر سے متعلق ہے، سورۂ انفال میں ایک ہزار فرشتوں سے مدد کا ذکر آیا ہے، اور یہاں تین ہزار اور پانچ ہزار کا تذکرہ ہے، گویا ابتداءً ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ مدد کا وعدہ کیا گیا؛ کیوں کہ مشرکین مکہ کا لشکر بھی قریب قریب ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا، پھر مسلمانوں کے اضطراب کو دیکھتے ہوئے ان کی تعداد تین گنی کر دی گئی (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۴/۱۹۴) اور اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بہ مقابلہ مسلمانوں کے مشرکین کی تعداد تین گنی تھی، پھر بعض روایتوں کے مطابق مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ کُرز بن جابر مشرکین کی مدد کے لئے ایک بڑی کمک کے ساتھ آرہا ہے، اس موقعہ پر پانچ ہزار سے مدد کا وعدہ کیا گیا کہ مسلمان پوری طرح اپنے خاطر جمع رکھیں اور پست ہمت نہ ہوں؛ چوں کہ دشمنوں تک یہ کمک نہیں پہنچی؛ اس لئے اس پر قریب قریب اتفاق ہے کہ یہ پانچ ہزار فرشتے نہیں آئے —— ''مُسوّمین'' یعنی نشان زد فرشتوں سے مراد یہ ہے کہ ان فرشتوں پر ایک خاص علامت ہوگی، (الجامع لأحكام القرآن للقرطبی: ۴/۹۵-۱۹۴) گویا وہ ایک طرح کے جنگی یونیفارم میں ہوں گے؛ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ تین ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کے لئے مدد آئی، مگر ان فرشتوں نے قتال میں بھی حصہ لیا، یا یہ صرف تسکین خاطر کا سامان تھے؟ اس میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں۔ (قرطبی: ۴/۱۹۴-۱۹۵)

﴿۲﴾ یہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ ان کا بھروسہ تعداد اور ظاہری اسباب پر نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ اصل بھروسہ اللہ کی ذات اور اس کی نصرت پر ہونا چاہئے۔

﴿۳﴾ چنانچہ غزوۂ بدر میں یہی ہوا کہ ستر (۷۰) تو تہ تیغ ہوئے، ستر قید ہوئے اور باقی ذلت و رسوائی کے ساتھ واپس ہوئے۔

لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ يَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۳/۹
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾

(اے رسول!) آپ کو کچھ اختیار نہیں، خواہ اللہ ان کی توبہ قبول کرلیں یا انھیں عذاب دیں؛ اس لئے کہ وہ ناحق پر ہیں، ﴿۱۲۸﴾ آسمان وزمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے، اللہ جسے چاہیں بخش دیں اور جسے چاہیں عذاب دیں اور اللہ بہت درگذر کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۲۹﴾ اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ، جس کو (سود درسود کے ذریعہ) کئی گنا کردیتے ہو ﴿۲﴾ اللہ سے ڈرتے رہو؛ تاکہ تم کامیاب ہو ﴿۱۳۰﴾ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیاری کی گئی ہے ﴿۳﴾ ﴿۱۳۱﴾ نیز (ہمیشہ) اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرتے رہو؛ تاکہ تم پر (اللہ کی طرف سے) کرم ومہربانی کا معاملہ کیا جائے۔ ﴿۱۳۲﴾

﴿۱﴾ غزوۂ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کردیئے گئے، خود رسول اللہ ﷺ لہولہان ہوگئے، دندانِ مبارک شہید ہوا، خَود کی کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں، اس موقعہ سے کچھ سردارانِ قریش ابوسفیان، حارث ابن ہشام، سہیل بن عمرو اور صفوان ابن امیہ وغیرہ کے بارے میں آپ ﷺ نے بددُعاء فرمائی، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، (بخاری، کتاب التفسیر، حدیث نمبر ۴۵۵۹) —— یہ گویا آپ ﷺ کے لئے اور آپ کے واسطہ سے تمام اُمت کے لئے تنبیہ ہے کہ دشمن گو بددُعاء کے مستحق ہیں؛ لیکن پیغمبر اور داعیان دین کے لئے یہ بات زیبا نہیں کہ وہ ایسے نازک وقت میں بھی بددُعاء کے لئے ہاتھ اُٹھائیں؛ کیوں کہ ہدایت دینا اور ہدایت سے محروم رکھنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، ممکن ہے اللہ ان کو ہدایت دے دیں —— اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ نظام قدرت میں اللہ کے پیغمبروں اور رسولوں کو بھی کوئی دخل نہیں اور ہدایت وگمراہی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

﴿۲﴾ عربوں کا طریقہ یہ تھا —— جو اَب بھی سودخواروں کے یہاں مروج ہے —— کہ وہ اصل رقم پر تو سود لیتے ہی تھے؛ لیکن اگر وقت پر رقم ادا نہ ہو پائی تو اصل رقم کے علاوہ بقایا سود پر بھی سود لیا کرتے تھے، مہلت دیتے جاتے اور سود درسود کا معاملہ کرتے جاتے، اس طرح سود اصل رقم سے بھی کئی گنا زیادہ ہوجاتا؛ چنانچہ اس وقت سود درسود کی جو صورت مروج تھی، قرآن نے یہاں اس کا ذکر کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر سود پر سود نہ لیا جائے اور اصل بقایا پر اکہرا سود لیا جائے تو یہ جائز ہے، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۰۲/۴) مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کہا جائے کہ مسجد میں گالیاں مت بکو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد سے باہر گالی بکنے کی اجازت ہے، قرآن نے دوسری جگہ مطلق سود کی حرمت کا اعلان کیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے کہ اللہ نے تجارت کو حلال رکھا ہے اور سود کو حرام، احل اللہ البیع وحرم الربوٰ۔ (البقرۃ: ۲۷۵)

﴿۳﴾ گویا سود کے حرام اور ناجائز ہونے کا انکار اور اس کو جائز ٹھہرانا بھی کفر ہے۔

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓىِٕكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو نافرمانی سے بچنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۳﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو خوشحالی میں بھی (اللہ کے راستہ میں) خرچ کرتے ہیں اور تنگدستی میں بھی، ﴿۱﴾ غصہ پی جاتے ہیں، لوگوں سے درگذر کرتے ہیں اور اللہ بھلائی کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۳۴﴾ اور وہ لوگ کہ جب کوئی گناہ کر گذریں یا اپنے حق میں زیادتی کر جائیں، ﴿۳﴾ تو اللہ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی معافی کے طلب گار ہوں —— اور اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کو بخشے؟ —— نیز جو گناہ (ایک انسان کی ہونے کی حیثیت سے) کر بیٹھتے ہیں، اور اس پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے ﴿۴﴾ ﴿۱۳۵﴾ ان ہی لوگوں کی جزاء ان کے پروردگار کی جانب سے مغفرت اور ایسی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ہمیش اسی میں رہیں گے اور (اچھے) کام کرنے والوں کا کیا ہی خوب اجر ہے! ﴿۱۳۶﴾

﴿۱﴾ بہت خوش حالی بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور بہت تنگ دستی بھی، تنگ دستی کی وجہ سے خرچ نہ کرنا تو ظاہر ہے، اور خوش حالی اس لئے کہ انسان پر جب معاشی وسعت آتی ہے تو عیش وعشرت میں مبتلا ہوجاتا ہے، یہی عیش کوشی اس کو خدا سے غافل کردیتی ہے اور جو شخص خدا سے غافل ہو اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی کیوں کر توفیق ہوسکتی ہے؟ سچے اور پکے مومن کی شان یہ ہے کہ نہ دولت اسے اللہ سے غافل کردے اور نہ تنگی اس کو بخل میں مبتلا کردے۔

﴿۲﴾ اخلاق کے اعتبار سے اس آیت میں تین درجات کا ذکر آیا ہے، اول: ''کاظمین'' جو غصہ پی جائیں، گویا غصہ تو ہو؛ لیکن وہ اس کی بردباری پر غالب نہ ہونے پائے، دوسرے: ''عافین'' یعنی درگذر کرنے والے، جو زیادتی کرنے والوں اور غصہ کا سبب بننے والوں کو بالکل ہی معاف کردیں، غصہ نہ ظاہر ہو، نہ دل میں چھپا ہوا ہو، تیسرے: ''محسنین'' یعنی احسان وبھلائی کرنے والے، جو زیادتی کرنے والوں کے ساتھ مزید اچھا سلوک کرنے والے ہوں، گالیاں دینے والوں کو دُعائیں دیں اور کانٹے بچھانے والوں پر پھول برسائیں۔

﴿۳﴾ بعضوں نے: ''فاحشہ'' سے گناہ کبیرہ اور ''ظلموا انفسھم'' سے ہر طرح کا گناہ مراد لیا ہے، بعض مفسرین کی رائے اس کے برعکس ہے، تیسری رائے ہے کہ: فاحشہ'' سے لوگوں کے حقوق میں اور ''ظلموا انفسھم'' میں اللہ کے حقوق میں کوتاہی مراد ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۴/۴۶۰)

﴿۴﴾ یعنی جب اپنی غلطی واضح ہوجاتی ہے، تو ضد نہیں کرتے اور اسی عمل کے جاری رکھنے پر مُصر نہیں ہوتے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾
هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَ تِلْكَ
الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ
لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ ۙ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

تم سے پہلے بھی بہت سے واقعات پیش آچکے ہیں ﴿۱﴾؛ لہٰذا تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا
انجام ہوا؟ ﴿۱۳۷﴾ یہ تمام انسانوں کے لئے (حق اور سچائی کی) وضاحت اور خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت
اور نصیحت ہے ﴿۲﴾ ﴿۱۳۸﴾ (اے مسلمانو!) تم نہ ہمت ہارو اور نہ غم کھاؤ، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو تم ہی غالب رہو گے ﴿۱۳۹﴾
اگر تم کو زخم لگا ہے، تو ان لوگوں کو بھی ایسا ہی زخم لگ چکا ہے اور ہم لوگوں کے درمیان دنوں کو ادلتے بدلتے رہتے
ہیں، ﴿۳﴾ اور (یہ صدمہ اس لئے بھی پہنچایا گیا ہے کہ) اللہ تعالیٰ (سچے) ایمان والوں کو جان لیں اور تم میں سے کچھ
لوگوں کو شہید کا درجہ عطا فرمائیں، اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ﴿۱۴۰﴾ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دیں
اور کافروں کو ملیا میٹ کر دیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۴۱﴾

﴿۱﴾ ''سنن'' کا ترجمہ ''واقعات'' سے بھی کیا گیا ہے اور گذشتہ اقوام کے ''طریقوں'' سے بھی، (فتح القدیر للشوکانی: ۱/۴٦٦) حاصل دونوں کا یہی ہے کہ دین حق کے جھٹلانے والوں کا انجام اب بھی دیکھ سکتے ہو، اسے چل پھر کر نگاہِ عبرت سے دیکھو اور سبق حاصل کرو۔

﴿۲﴾ یعنی قرآن پوری انسانیت کے لئے حق وسچائی کا بیان ہے؛ لیکن اس سے ہدایت اور نصیحت وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو خدا کا خوف بھی رکھتے ہوں؛ ورنہ جیسے نابینا کے لئے سورج کی روشنی بھی بے فائدہ ہے، اسی طرح خدا ناترسوں کو کلام ربانی سے بھی نفع نہیں ہوسکتا۔

﴿۳﴾ مسلمانوں کو خطاب ہے کہ غزوۂ احد میں جو چوٹ تم کو پہنچی ہے، اس سے پست ہمت نہ ہو کہ یہ تو اللہ کی طرف سے زمانہ اور احوال کی الٹ پھیر ہے، ابھی گذشتہ سال کی بات ہے کہ غزوۂ بدر میں اس سے بڑھ کر شکست اُن کو ہو چکی ہے، تو جب باطل شکست کھا کر پھر عارضی فتح حاصل کر سکتا ہے تو اہل حق کیوں گھبرائیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ انجام کار اہل ایمان ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

﴿۴﴾ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی پانچ حکمتیں ذکر فرمائی ہیں، اول یہ کہ خدا کا نظام ہی فتح وشکست سے دوچار کرنا ہے؛ ورنہ اگر ایک قوم ہمیشہ غالب ہی رہے تو فرعون بن جائے، اسی کو قرآن مجید نے ''تداول أیام'' سے تعبیر کیا ہے، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۲۱۸) دوسرے: اس سے مخلص اور پکے مومن کا امتحان بھی مقصود تھا، تیسری مصلحت یہ تھی کہ کچھ مسلمان مقام شہادت پر فائز ہوں، چوتھے: مسلمانوں کا تزکیہ مقصود تھا؛ کیوں کہ مصیبت وآزمائش کی بھٹی سے گذر کر ←

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ
الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ ع ١٤/١٤ ٥
انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ
الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٥﴾

کیا تم سمجھتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہوجاؤ گے؛ حالاں کہ اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور ثابت قدمی اختیار کرنے والوں کو جانچا ہی نہیں ؟ ﴿١٤٢﴾ اور تم تو موت کا سامنا کرنے سے پہلے شہادت کی تمنا کرتے تھے، تو اب تم نے اسی کو تو کھلی آنکھوں دیکھا ہے! ﴿١٤٣﴾ محمد صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، تو کیا اگر ان کا انتقال ہوجائے یا وہ قتل کردیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں واپس ہوجاؤ گے؟ اور جو الٹے پاؤں واپس ہوجائے تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا اور جلد ہی اللہ شکر گذار بندوں کو بدلہ عطا فرمائیں گے ﴿١﴾ ﴿١٤٤﴾ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی جاندار مر نہیں سکتا، مقررہ عمر لکھی ہوئی ہے، ﴿٢﴾ اور جو دنیا ہی میں بدلہ چاہتا ہے اس کو ہم دنیا میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا اجر چاہتا ہے، اس کو ہم آخرت میں سے (بھی) عطا کریں گے اور ہم عنقریب شکر گزار بندوں کو بدلہ عطا فرمائیں گے۔ ﴿٣﴾ ﴿١٤٥﴾

← انسان کا تزکیہ ہوتا ہے، پانچویں مصلحت کافروں کو مٹانا تھا؛ کیوں کہ غزوۂ اُحد کے وقتی غلبہ نے ان کی ہمت بڑھادی؛ اس لئے وہ پھر مقابلہ پر آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو مٹا کر رکھ دیں گے، جیسا کہ بعد میں ہوا۔

﴿١﴾ غزوۂ اُحد میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ آپ ﷺ شہید کردیئے گئے، اس خبر نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بے قرار کردیا، بعض ہتھیار پھینک کر بیٹھ رہے کہ اب مقابلہ کا کیا فائدہ؟ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۲۱/۴) اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ محمد رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے انبیاء ورسل کی طرح ایک پیغمبر ہی ہیں، جیسے دوسرے انبیاء ورسل نے وفات پائی، آپ ﷺ پر بھی موت طاری ہوگی، جیسے بعض انبیاء اعداءِ حق کے ہاتھوں شہید کردیئے گئے، اسی طرح شہادت آپ کے مقام نبوت کے بھی خلاف نہیں، تو کیا اس کی وجہ سے تم لوگ دینِ حق کو چھوڑ دوگے اور اسلام کی نصرت وحمایت ترک کردوگے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو اس میں نقصان خود تمہارا ہی ہے، اللہ کا کوئی نقصان نہیں اور اگر استقامت کا ثبوت دوگے تو اس کا اجر وثواب پاؤ گے، یہ گویا اس بات کی تعلیم ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایک بشر اور انسان ہی ہیں اور ایک انسان جن حالات سے دوچار ہوتا ہے، آپ پر بھی وہ حالات آسکتے ہیں، آپ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ شدتِ غم میں ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ آپ ﷺ پر موت طاری ہوچکی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع سے یہی آیت تلاوت کی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو محسوس ہوا کہ گویا آج ہی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ (سنن ابن ماجہ، باب ذکر وفاتہ ودفنہ صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر: ۱۶۲۷) ←

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَ هَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا
ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ يٰۤاَيُّهَا ع ۱۵
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کتنے ہی نبیوں کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے؛«۱» چنانچہ اللہ کے راستہ میں ان کو جو کچھ پیش آیا، اس کی وجہ سے نہ وہ کم ہمت ہوئے نہ کمزور اور نہ مرعوب، اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں ﴿۱۴۶﴾ وہ بس یہی کہتے رہتے تھے: اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں میں ہماری زیادتیوں کو معاف کردیجئے، ہمارے قدم کو مضبوط رکھئے اور کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرمایئے!! ﴿۱۴۷﴾ اللہ نے ان کو دنیا کا بھی اجر دیا اور آخرت میں بھی بہترین اجر (ملے گا)، «۲» اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں، ﴿۱۴۸﴾ اے ایمان والو! اگر تم لوگوں نے کافروں کی بات مانی تو وہ تم کو اُلٹے پیروں واپس کرکے رہیں گے، پھر تم گھاٹے کے ساتھ واپس ہوجاؤ گے۔«۳» ﴿۱۴۹﴾

← «۲» غزوۂ احد کے موقع سے جو بعض حضرات کی ہمت ٹوٹ گئی، ان سے خطاب ہے کہ جتنی زندگی جس کے لئے مقدر ہے، وہ پوری ہوکر رہے گی اور جب جس کی موت لکھی ہوئی ہے آکر رہے گی، تو پھر موت سے گھبرانے اور جہاد سے دل چرانے کے کیا معنی؟

«۳» بہت سے لوگ ایمان سے محروم ہیں؛ لیکن خدمت خلق اور سماجی اصلاح کے بڑے بڑے کام کرتے ہیں، ان کو ان کے اس عمل کا بدلہ دنیا ہی میں عزت ونا موری اور شہرت وقدر دانی کی صورت میں مل جاتا ہے، آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں؛ کیوں کہ وہ خود آخرت میں اجر کے خواستگار نہیں، اگر آخرت میں اجر کے طلب گار ہوتے تو یقیناً ایمان لائے ہوتے۔

«۱» معلوم ہوا کہ جہاد صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی اُمت ہی پر فرض نہیں ہے؛ بلکہ پچھلی اُمتوں پر بھی فرض تھا اور انھوں نے اپنے اپنے عہد میں حق وسچائی کے دشمنوں کے ساتھ جہاد فرمایا ہے، بائبل تو جنگ کے واقعات سے پُر ہے ہی، دوسری مذہبی کتابوں میں بھی جنگ کے واقعات بہ کثرت موجود ہیں، ہندو بھائی خود کو ''اہنسا'' اور ''عدم تشدد'' کا علمبردار قرار دیتے ہیں؛ لیکن رامائن اور مہابھارت جنگی قصوں اور داستانوں کے سوا اور کیا ہے؟ دراصل حق کی حمایت اور ناحق کی مخالفت میں اٹھ کھڑا ہونا اور اس کے لئے ضرورت کے مطابق طاقت کا استعمال کرنا ایک پسندیدہ امر ہے نہ کہ مذموم ونا پسندیدہ، ظلم سے پنجہ آزمانہ ہونا اور ظالم ومظلوم کے ساتھ ایک ہی سلوک روا رکھنا یقینا مظلوم کے ساتھ زیادتی اور انصاف کا خون کرنے کے مترادف ہے، اس لئے جہاد ـــــ اگر صحیح جذبہ سے ہو اور قانونِ شریعت کے دائرہ میں ہو ـــــ تو ایک منصفانہ عمل ہے۔

«۲» آخرت میں جو اجر ملنے والا ہے وہ ظاہر ہے اور دنیا کا اجر اللہ کی طرف سے فتح ونصرت سے ہمکنار ہونا ہے۔

«۳» یعنی کافروں کی بات ماننے لگو تو وہ بالآخر تم کو ہدایت کی روشنی ہی سے محروم کردیں گے اور کفر کی تاریکی میں ڈھکیل کر رہیں گے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

بلکہ اللہ ہی تمہارے دوست ہیں اور وہی بہترین مددگار ہیں ﴿۱۵۰﴾ ہم ابھی کافروں کے دلوں پر رعب طاری کردیں گے؛ کیوں کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا؛ باوجودیکہ اللہ نے اس پر کوئی دلیل نہیں اتاری، ﴿۱﴾ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا ٹھکانہ کیا ہی برا ہے! ﴿۱۵۱﴾ اللہ نے اس وقت تم سے اپنا وعدہ سچ کر دیکھایا جب تم ان کو اللہ کے حکم سے قتل کررہے تھے؛ یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہوگئے، حکم (نبوی) کے بارے میں جھگڑنے لگے اور تم نے حکم کی خلاف ورزی کی، اس کے باوجود کہ اللہ تم کو تمہاری پسند کی چیز دکھا چکے تھے، ﴿۲﴾ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور بعض آخرت، (تو) پھر تم کو اللہ نے ان سے ہٹا لیا کہ تمہاری آزمائش کریں اور یقیناً اللہ نے تم سے درگذر فرمادیا، ﴿۳﴾ اور ایمان والوں پر اللہ کے بڑے کرم ہیں۔ ﴿۱۵۲﴾

﴿۱﴾ یعنی اگر اللہ کے کاموں میں کوئی ساجھی اور شریک ہوتا تو وہی اس سے باخبر بھی ہوتا اور اس کے بارے میں اپنی کتابوں کے ذریعہ اپنی مخلوق کو آگاہ کرتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی؛ بلکہ شد و مد کے ساتھ اس کی تردید فرمائی تو معلوم ہوا کہ شرک ایک بے دلیل اور نامعقول طریقہ ہے۔

﴿۲﴾ یہ آیت بھی غزوۂ احد ہی سے متعلق ہے کہ اللہ نے اپنی فتح و نصرت کا وعدہ اس غزوہ میں بھی پورا کردیا تھا اور ابتدائی مرحلہ میں مسلمان ہی فتح مند ہوئے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے تیراندازوں کو اپنی جگہ جمے رہنے کا جو حکم فرمایا تھا، تیرانداز دستہ کے لوگ اختلاف کرنے لگے، بعض کا خیال تھا کہ ابھی یہ حکم باقی ہے اور بعض حضرات کی رائے تھی کہ جہاد ختم ہو چکا اور مسلمان فتح مند ہو چکے؛ اس لئے اب یہ حکم باقی نہیں رہا، (قرطبی: ۲۳۳/۴) اس اجتہادی غلطی اور نادانستہ لغزش پر اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا گیا، یہ ایک طرف مسلمانوں کی سرزنش تھی اور دوسری طرف اس میں یہ مصلحت تھی کہ مخلص اور منافق کی اچھی طرح پہچان ہوجائے —— ''ماتحبون'' (تمہاری پسند کی چیز) سے وہی ابتدائی فتح مراد ہے۔

﴿۳﴾ قرآن میں جا بجا ایسی آیات آئی ہیں جن میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی پکڑ فرمائی گئی ہے اور ان کی کسی لغزش کا ذکر آیا ہے، قرآن مجید میں ان آیات کا باقی رہنا صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدالت اور ان کے سچے ہونے کی بھی دلیل ہے اور قرآن کے محفوظ اور تحریف سے پاک ہونے کی بھی، صحابہ رضی اللہ عنہم اگر معتبر اور صادق القول نہ ہوتے تو ایسی آیات کو حذف کردیئے ہوتے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو لغزشیں ہوئی ہیں، اللہ نے ان کو معاف کردیا ہے اور خدا کے دامنِ عفو میں وہ جگہ پا چکے ہیں، اب ہمارے لئے نہ درست ہے اور نہ زیبا؛ کہ ہم ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو موضوع بحث بنائیں، رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَ لَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغۡشٰی طَآئِفَۃً مِّنۡکُمۡ ۙ وَ طَآئِفَۃٌ قَدۡ اَہَمَّتۡہُمۡ اَنۡفُسُہُمۡ یَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ غَیۡرَ الۡحَقِّ ظَنَّ الۡجَاہِلِیَّۃِ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ؕ یُخۡفُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ مَّا لَا یُبۡدُوۡنَ لَکَ ؕ یَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ کَانَ لَنَا مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ مَّا قُتِلۡنَا ہٰہُنَا ؕ قُلۡ لَّوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ لَبَرَزَ الَّذِیۡنَ کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقَتۡلُ اِلٰی مَضَاجِعِہِمۡ ۚ وَ لِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۵۴﴾

(اے مسلمانو! وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے چلے جارہے تھے، کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور رسول تم کو پچھلی صف سے پکار رہے تھے؛ چنانچہ اللہ نے تم کو اس رنج کے بدلہ رنج سے دو چار کیا؛﴿۱﴾ تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور جو مصیبت تم کو پہنچے، اس سے تم رنجیدہ خاطر نہ ہوا کرو،﴿۲﴾ اور اللہ تمہارے تمام کاموں سے باخبر ہیں ﴿۱۵۳﴾ پھر اللہ نے رنج سے دو چار کرنے کے بعد تم پر راحت یعنی اونگھ نازل فرمائی، جو تمہارے ایک گروہ پر چھائی جارہی تھی،﴿۳﴾ اور ایک گروہ وہ تھا، جن کو اپنی جان ہی کی فکر پڑی تھی،﴿۴﴾ وہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت جاہلانہ خیالات قائم کر رہے تھے،﴿۵﴾ یہ کہہ رہے تھے: ہمیں بھی کچھ اختیار ہے؟﴿۶﴾ آپ فرما دیجئے: سارا اختیار اللہ ہی کے لئے ہے، یہ اپنے دلوں میں وہ باتیں چھپائے ہوئے ہیں جو آپ سے ظاہر نہیں کرتے، یہ کہتے ہیں: اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا، تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، آپ کہہ دیجئے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے، تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل کر ہی رہتے، اور (یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ) اللہ تمہارے دلوں کو آزماتے ہیں، نیز جو خیالات تمہارے دلوں میں ہیں، انھیں پاک صاف کردیں،﴿۷﴾ اور اللہ دلوں کے حال سے خوب واقف ہیں۔ ﴿۱۵۴﴾

﴿۱﴾ غزوۂ اُحد ہی کا بیان چل رہا ہے، کہ فوج میں ایسی بھگدڑ مچی کہ رسول اللہ ﷺ کے آواز دینے کے باوجود لوگوں کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی، ظاہر ہے کہ اس عمل سے آپ کو تکلیف پہنچی، صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس تکلیف کی پاداش میں غزوۂ احد کی شکست اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی غلط اطلاع کے رنج وغم سے دو چار کیا گیا، یہ گویا اسی غم کی پاداش تھی، جس سے رسول اللہ ﷺ دو چار ہوئے تھے۔

﴿۲﴾ تربیت کا ایک ضروری حصہ یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر ناپسندیدہ حالات کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، تو ارشاد باری ہے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ایک گونہ شکست وہزیمت بھی مصلحت سے خالی نہیں، کہ اس پہلو سے ان کی تربیت کا مقصد پورا ہوا۔ ←

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّیْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع ۱۶

بے شک تم میں سے جن لوگوں نے دونوں جماعتوں کے برسرِ پیکار ہونے کے دن پیٹھ پھیرا تھا، ان کو شیطان نے ان کی شامت اعمال کی وجہ سے بہکا دیا تھا، ﴿۱﴾ اور اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے، ﴿۲﴾ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والے اور بہت بردبار ہیں۔ ﴿۱۵۵﴾

← ﴿۳﴾ جنگ کا موقعہ بدحواسی اور خوف وگھبراہٹ کا ہوتا ہے اور اس حالت میں انسان کے اندر فیصلہ اور اقدام کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے؛ لیکن یہ خدا کی رحمت اور قدرت تھی کہ عین اس وقت جب جنگ شباب پر تھی اور کتنے ہی مجاہدین خاک وخون میں تڑپ رہے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم پر نیند کا جھونکا آیا، نیند انسان کو ایک نئی توانائی عطا کرتی ہے؛ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم ایک نئے عزم وولولہ کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے، اسی نعمت خداوندی کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

﴿۴﴾ اس سے مراد منافقین ہیں، جن کو محض اپنی جان کی فکر تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ تھا، نہ اسلام کی سربلندی کے لئے کوئی فکرمندی۔

﴿۵﴾ یعنی ان کا یہ خیال کہ اگر مسلمان معرکۂ احد میں نہ آئے ہوتے تو شہید نہ ہوتے، یہ گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت پر حملہ کرنے اور یہ عقیدہ رکھنے کے مترادف تھا کہ ان کا قتل ہونا حکم خداوندی کے تحت نہیں تھا؛ بلکہ خود ان کے عمل سے اس کا تعلق ہے۔

﴿۶﴾ یعنی منافقین کہہ رہے تھے کہ ہماری یہ رائے کہ لڑائی مدینہ میں رہ کر لڑی جائے نہ کہ باہر نکل کر، اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی؛ ورنہ اِس شکست کی نوبت نہیں آتی، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۴۲/۴) قرآن نے آگے منافقین کے اسی قول کی تردید کی کہ فتح وشکست کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں اور انسان کے کسی بھی عمل کا آخری انجام تدبیرِ انسانی کے نہیں، تقدیرِ خداوندی کے تابع ہوا کرتا ہے؛ اس لئے اس طرح کے اعتراضات بے معنی ہیں۔

﴿۷﴾ یعنی احد کی یہ ابتلاء بھی فائدہ سے خالی نہ تھی، اس کا مقصد دلوں کا امتحان تھا، کہ کس کے دل میں واقعی ایمان کا پودا لگا ہے اور کون لوگ ہیں جو نفاق کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں؟ اس طرح مسلمان منافقین کو پہچان لیں اور آئندہ ان کے قلوب وساوس سے محفوظ اور راہِ حق کی مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ رہیں۔

﴿۱﴾ اس میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو تنبیہ ہے کہ یہ جو ایک گونہ شکست ہوئی ہے، اس میں بھی تمہاری ہی لغزشوں کا دخل ہے اور بقول مفسرین یہ لغزش ہے: مالِ غنیمت کی خواہش، اپنی زندگی بچانے کی فکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نادانستہ عدول حکمی۔ (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۲۴۴/۴)

﴿۲﴾ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو لغزشیں ہوئی ہیں، خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی معافی کا مکرر اعلان ہو رہا ہے، یہ گویا اس بات کی تنبیہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اپنے دل کو ہر طرح کے میل سے پاک وصاف رکھا جائے اور ان کی لغزشوں کے ذکر سے اپنی زبان اور اپنے قلم کو آلودہ کرنے سے بچا جائے، اس سے زیادہ بری کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ جسے خدا معاف کر چکا ہو، انسان کی زبان اور قلم اسے معاف کرنے کو تیار نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ
اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ
لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَ لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا، جو کفر کو اختیار کئے ہوئے ہیں، اور جب ان کے بھائی زمین میں سفر کو نکلتے ہیں، یا جہاد کو جاتے ہیں تو ان کی نسبت سے کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، (یہ بات ان کی زبان پر اس لئے آتی ہے) کہ اللہ اس بات کو ان کے دل کے لئے سامان حسرت بنادے، ﴿۱﴾
اور اللہ ہی زندگی اور موت دیتے ہیں اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہے ہیں ﴿۱۵۶﴾ اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ یا مرجاؤ، تو اللہ کی بخشش اور رحمت حاصل ہوگی، جو اس سے کہیں بہتر ہے جس کو تم جمع کر رہے ہو ﴿۲﴾ ﴿۱۵۷﴾
اور چاہے تم لوگ مرو یا مارے جاؤ، اللہ ہی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ﴿۱۵۸﴾ پھر یہ اللہ ہی کی رحمت ہے، کہ آپ ان کے لئے نرم خو ہیں، اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے بھاگ لئے ہوتے، ﴿۳﴾ لہٰذا آپ انھیں معاف کردیں، ان کے لئے مغفرت کی دُعاء کریں اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیا کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کرلیں، تو اللہ پر بھروسہ رکھیں، ﴿۴﴾ بے شک اللہ اس پر بھروسہ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ ﴿۱۵۹﴾

﴿۱﴾ یعنی موت تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے وقت ہی پر آئے گی؛ لیکن دل میں یہ حسرت قدرت خداوندی پر بے اعتباری کہ اگر فلاں شخص نہ نکلا ہوتا تو بچ گیا ہوتا، یہ خود ایک نفسیاتی عذاب ہے، اس سے دل کی کسک اور کڑھن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیفیت ان کے دل میں ان کی ضعیف الاعتقادی کی سزا کے طور پر رکھ دی ہے۔

﴿۲﴾ یعنی موت تو آنی ہی آنی ہے؛ لیکن اگر ایک نیک مقصد کے لئے اور خدا کی خوشنودی کی حالت میں موت آئے تو یہ سانحہ بھی ایک خوشگوار واقعہ ہے اور یہ موت زندگی سے بہتر اور زندگی کی ان آسائشوں سے بھی زیادہ قابل رشک ہے، جن کے لئے انسان دن رات سرگرداں رہتا ہے، کہ مومن کی کامیابی یہی ہے کہ زندگی کی طرح اس کی موت بھی اللہ ہی کے لئے ہو، إن صلاتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین۔

﴿۳﴾ یعنی پیغمبر اسلام ﷺ میں نرم خوئی، نرم گفتاری اور نرم روی کا جو خاص وصف ہے اور جس کا یہ اثر ہے کہ آپ ﷺ نہ صرف دشمنوں؛ بلکہ ناتربیت یافتہ رفقاء کی غلطیوں کو بھی برداشت کرجاتے ہیں، اور اپنے ذاتی معاملہ میں کتنی ہی ناگوار خاطر بات ہوجائے ←

اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ ۚ وَ اِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ
وَ عَلَى اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّغُلَّ ؕ وَ مَنۡ یَّغۡلُلۡ یَاۡتِ بِمَا غَلَّ یَوۡمَ
الۡقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَ اللّٰهِ
كَمَنۡۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۶۲﴾

اگر اللہ تمہاری مدد کریں، تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر اللہ ہی تمہیں چھوڑ دیں، تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے؟ پس ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے ﴿۱۶۰﴾ اور کسی نبی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو شخص بھی خیانت کرے گا، وہ قیامت کے دن خیانت کی ہوئی چیز لے کر حاضر ہوگا، پھر ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں ہوگی ﴿۱﴾ ﴿۱۶۱﴾ کیا جو شخص اللہ کی خوشنودی کا راستہ اختیار کرے وہ بھلا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی ناراضگی لے کر آئے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو؟ اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے! ﴿۱۶۲﴾

← نہ پیشانی پر شکن آتی ہے اور نہ دل پر کوئی میل آتا ہے، یہ بھی خدا کی ایک بہت بڑی رحمت ہے؛ کیوں کہ پیغمبر کا کسی سے رنجیدہ خاطر ہو جانا دنیا ہی کا نہیں، آخرت کا بھی نقصان ہے اور تمام نیکیوں کو ضائع کرنے کے لئے کافی ہے — یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کے لئے نرم گفتار اور نرم خو ہونا ضروری ہے، ورنہ بجائے اس کے کہ لوگوں میں اُس کی دعوت کے تئیں محبت پیدا ہو، نفرت پیدا ہو جائے گی۔

﴿۴﴾ اب صحابہ رضی اللہ عنہم کی دل جوئی فرمائی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے درگذر بھی کریں، ان کے حق میں دُعاءِ مغفرت بھی کریں اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی — نبی کو وحی کے ذریعہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہوتا ہے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں مشورہ کی کیا کچھ اہمیت ہے؟ اور مشورہ کے آداب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ مشورہ اہم اُمور میں ہے، یعنی جو باتیں نہ واجب ہوں نہ صراحتاً ان سے منع کیا گیا ہو، دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہو، ان کے بارے میں ان لوگوں سے مشورہ کرنا چاہئے، جو اس مسئلہ میں مشورہ دینے کے اہل ہوں؛ تاہم امیر اس کا پابند نہیں کہ وہ اپنے رفقاء کے مشورہ ہی پر عمل کرے؛ بلکہ اس کی نگاہ اللہ پر ہو، رفقاء کے مشورہ کی روشنی میں اللہ تعالیٰ جو بات اس کے دل میں ڈالیں، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہو جائے، گویا لوگوں کا اعتماد امیر پر ہو اور امیر کی نظر اللہ پر ہو۔

﴿۱﴾ اہل علم نے اس کی تفسیر میں مختلف باتیں کہی ہیں، زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے غزوۂ اُحد میں جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی سمجھ لیا کہ جنگ اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے، ان کو تنبیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت میں خیانت تو کر نہیں سکتے تھے کہ خود لے لیتے اور تم کو محروم کر دیتے؛ اس لئے تیر اندازوں کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو جانے کا کوئی معنی نہ تھا — شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ اس آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی دل داری ہے، کہ یہ نہ سمجھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاف کرنا صرف ظاہری دلداری ہے، (نعوذ باللہ) اور دل میں کینہ موجود ہے؛ کیوں کہ رسول کی یہ شان نہیں کہ ظاہر میں کچھ اور کرے اور دل میں کوئی اور بات چھپی ہوئی ہو۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ
وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ النصف
قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۖۚ وَ قِيْلَ
لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ
لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

اللہ کے نزدیک ان کے الگ الگ درجے ہیں، ﴿۱﴾ اور اللہ اُن کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں ﴿۱۶۳﴾ اللہ نے یقیناً مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے رسول بھیجا، ﴿۲﴾ جو ان کو آیاتِ الٰہی پڑھ کر سنائیں، ان کو پاک صاف کریں اور انھیں کتاب (یعنی قرآن مجید) اور عقل کی باتیں سکھائیں؛ حالاں کہ یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے ﴿۱۶۴﴾ (اے مسلمانو!) جب تم اس مصیبت سے دوچار ہوئے، جس کا دوگنا تم خود پہنچا چکے تھے، تو تم کہتے ہو کہ یہ کیوں کر ہوا؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ تمہاری ہی طرف سے ہوا ہے، ﴿۳﴾ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۱۶۵﴾ دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن تم کو جو مصیبت پہنچی، وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچی؛ تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو بھی جان لیں ﴿۱۶۶﴾ اور منافقین کو بھی، ﴿۴﴾ جب ان منافقین سے کہا گیا: آؤ، اللہ کے راستہ میں جہاد کرو یا دفاع کرو، ﴿۵﴾ تو وہ کہنے لگے: اگر ہم (ڈھنگ کی) لڑائی دیکھتے تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہولیتے، ﴿۶﴾ اس دن وہ بہ مقابلہ ایمان کے کفر سے زیادہ قریب تھے، ﴿۷﴾ وہ اپنی زبان سے جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کے دلوں میں نہیں ہے، اور وہ جو کچھ چھپا رہے ہیں، اللہ اسے خوب جانتے ہیں۔ ﴿۱۶۷﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے والوں کا مقام اور ہے اور غضبِ الٰہی کے حاملین کا اور۔

﴿۲﴾ یوں تو آپ ﷺ کی بعثت پوری انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہے؛ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ دوہری نعمت ہے؛ کیوں کہ کوئی بھی شئ اصل میں نعمت اسی شخص کے حق میں ہوتی ہے، جس کو اس سے نفع اُٹھانے کی توفیق میسر آتی ہو اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مسلمانوں کو حاصل ہوئی —— من أنفسهم (ان ہی میں سے) کہہ کر یہ بتادیا گیا کہ رسول بھی انسان ہی ہوتے ہیں، فرشتہ یا کوئی اور مخلوق نہیں ہوتے؛ کیوں کہ انسان کے لئے انسانی نمونہ ہی موزوں ہوسکتا ہے۔

﴿۳﴾ یعنی غزوۂ احد میں شکست پر انھیں بہت رنج ہے؛ کیوں کہ اس میں ستر مسلمان شہید ہوئے؛ حالاں کہ غزوۂ بدر میں تم اس کا ←

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۱۶۸ وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ
اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۝۱۶۹ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝۱۷۰

وقف لازم

یہ لوگ جو خود بیٹھے رہے، اپنے بھائیوں ﴿۱﴾ کی نسبت سے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے، آپ فرمادیں کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ کو موت سے بچالو۝۱۶۸ جو لوگ اللہ کے راستہ میں کام آئے ہیں، انھیں ہرگز مردہ خیال نہ کرو؛ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی دی جاتی ہے ﴿۲﴾۝۱۶۹ اللہ نے ان کو جو اپنا فضل عطا فرمایا ہے، وہ اس سے شاداں وفرحاں ہیں اور ان کے بعد والے جو ابھی ان کے پاس نہیں پہنچے، ان کے بارے میں بھی وہ خوشیاں مناتے ہیں؛ اس لئے کہ نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۳﴾۝۱۷۰

← دوہرا نقصان پہنچا چکے ہو کہ مشرکین میں سے ستر قتل بھی ہوئے اور اتنے ہی گرفتار بھی، اور یہ شکست بھی تمہاری ہی بھول چوک اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے؛ اس لئے نہ اس پر تعجب ہونا چاہئے اور نہ رنج۔

﴿۴﴾ مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ احد کی یہ شکست بھی حکم خداوندی سے ہوئی ہے اور یہ وقتی شکست بھی مصلحت سے خالی نہیں کہ اس سے تم کو مخلص مسلمانوں اور منافقوں کی پہچان ہوگئی، جس سے آئندہ تم کو اپنی حفاظت اور منصوبہ بندی میں سہولت ہوگی۔

﴿۵﴾ دفاع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر جنگ میں عملی طور پر شرکت منظور نہیں تو کم سے کم لشکر اسلام کے ساتھ شامل رہو؛ تاکہ فوجیوں کی کثرت دشمن کو مرعوب کرے اور ان کو دفع کرنے میں سہولت ہو۔

﴿۶﴾ منافقین کہتے تھے کہ جنگ تو مقابلہ کی ہوتی ہے، یہ بھی کوئی جنگ ہے کہ دشمن کی تعداد تم سے کئی گنا بڑھ کر ہے، ان کے پاس ہتھیار بھی تمہارے مقابلہ زیادہ ہیں، اور پھر اپنے شہر سے باہر نکل کر تم نے اپنے آپ کو اور بھی کمزور موقف میں ڈال لیا ہے، یہ تو جنگ کے نام پر خودکشی ہے، اگر سچ مچ کی جنگ ہوتی اور ڈھنگ کا مقابلہ ہوتا، تب ہم اس میں شریک ہوتے۔

﴿۷﴾ یعنی کافر تو پہلے سے تھے، مگر کم سے کم زبان سے ایمان کی باتیں کرتے تھے؛ لیکن ایسی باتیں کہتے وقت وہ علانیہ کفر سے قریب ہو چکے تھے۔

﴿۱﴾ بھائیوں سے وہ انصار مراد ہیں جو شہید ہوئے، یہ ایمانی رشتہ سے تو منافقین کے بھائی نہیں تھے؛ لیکن چوں کہ ہم وطن تھے اور باہم خاندانی رشتہ داری تھی، اس لحاظ سے ان کو بھائی فرمایا گیا۔

﴿۲﴾ شہداء کو عالم برزخ میں ایک خاص زندگی برزخ کی شان کے مطابق عطا ہوتی ہے؛ اسی لئے ارشاد ہے کہ ان کو مردۂ محض تصور نہ کرو۔

﴿۳﴾ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے متعلقین کو بھی بہتر حال میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ خوشی ادھوری اور نا تمام ہے جس کا چراغ خود اس کے گھر میں جلے اور اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اس کی کوئی کرن نہ پہنچے، شہداء کو دوہری مسرت حاصل ہوگی، ←

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ ع ۱۷ / ۸
اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا
اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ
اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ
يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

عند المتقدمین

وہ اللہ کی نعمت اور فضل پر خوش ہو رہے ہیں، اور بے شک اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۱۷۱﴾ جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کا کہا مانا، ﴿۱﴾ ان میں جو نیک اور متقی ہیں، ان کے لئے بڑا اجر ہے ﴿۱۷۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کفار تمہارے مقابلہ میں اکٹھے ہو گئے ہیں؛ اس لئے تم ان سے ڈر کر رہو، تو اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور ان لوگوں نے کہا: ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہیں اور وہی بہترین کارساز ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۷۳﴾ چنانچہ یہ لوگ اللہ کے انعام اور کرم کے ساتھ واپس لوٹے، ان کو کوئی ناگوار بات پیش نہیں آئی اور یہ لوگ اللہ کی مرضی کے تابع رہے اور اللہ بڑے فضل والے ہیں۔ ﴿۱۷۴﴾

← اولاً وہ خود اللہ کی نعمتوں میں ہوں گے، دوسرے اپنے ان مومن بھائیوں کے تئیں بھی خوش ہوں گے، جو ان سے آئندہ آملنے والے ہیں، کہ یہ ایمان والے غم سے بھی محفوظ رہیں گے اور خوف سے بھی مامون۔

﴿۱﴾ غزوۂ احد ختم ہو چکی تھی، ابوسفیان کی قیادت میں اہل مکہ واپس جا رہے تھے، صحابہ رضی اللہ عنہم زخموں سے چور تھے، ان حالات میں کوئی نئی مہم جوئی سخت دشوار ہوتی ہے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے مصلحت کا تقاضہ سمجھا کہ کچھ دُور اہل مکہ کا تعاقب کیا جائے؛ تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور اور پست ہمت نہ سمجھیں اور ان کی جرأت بڑھ نہ جائے، جب آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا حکم دیا تو باوجود زخم سے چور ہونے کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس دعوت پر لبیک کہا اور مدینہ سے آٹھ میل دور 'حمراء الاسد' تک کفار مکہ کا تعاقب کیا، ابوسفیان کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس پر سخت رعب طاری ہوا اور اسے احساس ہوا کہ گو اس نے مسلمانوں کو وقتی اور اتفاقی طور پر شکست سے دوچار کیا ہے؛ لیکن مسلمانوں کے حوصلے ابھی بھی بلند ہیں، (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۲۷۷) —— ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمانوں کی ستر لاشیں خاک وخون میں پڑی تھیں، اور کتنے ہی مجاہدین زخموں سے چور تھے، اس کے باوجود صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ ﷺ کی اس آواز پر لبیک کہنا کوئی معمولی قربانی نہیں تھی؛ اسی لئے قرآن نے خاص طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔

﴿۲﴾ اُحد سے واپس ہوتے ہوئے اہل مکہ کو خیال ہوا کہ وہ فتح یاب ہونے کے باوجود یوں ہی واپس لوٹ آئے، اگر ہم ایک اور ہلہ بولتے تو مسلمانوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑ سکتے تھے، وہ مدینہ واپسی کا ارادہ کرنے لگے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف پیدا کر دیا، ان کو پلٹ کر حملہ کرنے کی ہمت تو نہ ہوئی؛ لیکن جاتے جاتے فوجی تدبیر یہ کی کہ نعیم بن مسعود کو سکھا دیا کہ وہ مسلمانوں کو خوف زدہ کریں کہ اہل مکہ اور بڑی تیاری کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے لوگوں کو جمع کر رہے ہیں، حالات کا ←

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيۡطٰنُ يُخَوِّفُ اَوۡلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَ خَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۵﴾
وَلَا يَحۡزُنۡكَ الَّذِيۡنَ يُسَارِعُوۡنَ فِى الۡكُفۡرِ ۚ اِنَّهُمۡ لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـئًا ؕ يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَلَّا
يَجۡعَلَ لَهُمۡ حَظًّا فِى الۡاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الۡكُفۡرَ بِالۡاِيۡمَانِ
لَنۡ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيۡـئًا ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَ لَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ
خَيۡرٌ لِّاَنۡفُسِهِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۷۸﴾

یہ تو شیطان ہے جو تم کو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، اگر تم ایمان والے ہو تو ان سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو ﴿۱﴾ ﴿۱۷۵﴾ جو لوگ کفر کی طرف لپکتے ہیں، وہ آپ کے لئے رنج کا باعث نہ بنیں، یقیناً یہ اللہ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ چاہتے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہ رکھیں، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۱۷۶﴾ جن لوگوں نے ایمان کی جگہ کفر کو اختیار کیا ہے، وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور ان ہی کے لئے دردناک عذاب ہے، ﴿۱۷۷﴾ جو لوگ کفر کر رہے ہیں، وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ ہم جو اُن کو مہلت دے رہے ہیں، یہ ان کے حق میں بہتر ہے، ہم تو ان کو محض اس لئے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھتے رہیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۷۸﴾

← تقاضہ تھا کہ مسلمان اس خبر سے لرز اُٹھتے اور گھبرا جاتے؛ لیکن صورت حال اس کے برعکس ہوئی اور مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہیں۔ (مفاتیح الغیب: ۴/۵۷۰)

﴿۱﴾ اہل باطل کی نفسیات یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اہل حق کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ وقتی حالات سے گھبرائیں نہیں؛ بلکہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور خدا کے سوا کسی کا خوف اپنے دل میں نہ آنے دیں؛ کہ جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ پوری کائنات سے ڈرتا ہے، اور جس میں خدا کا خوف ہو، کائنات کی ہر شئ اس سے ڈرتی ہے، اور قوموں کے دلوں میں اللہ کی طرف سے اس کا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ اکثر اسلام کے دشمنوں اور جفا شعار لوگوں کو ظاہری ترقی اور عیش و آسائش کے نقشوں کو دیکھ کر یہ خیال گذرتا ہے کہ شاید ان پر خدا کا انعام ہے، اگر خدا ان سے ناراض ہوتا تو کس طرح وہ ایسی راحتوں کے نقشے میں ہوتے؟ قرآن نے اسی گتھی کو کھولا ہے، کہ دنیا میں اللہ کی نعمتیں کبھی بہ طور انعام کے دی جاتی ہیں اور کبھی بہ طور امہال کے، امہال سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ڈھیل دی جاتی ہے؛ تاکہ وہ اپنے گناہوں میں پختہ کار ہو جائیں، اپنے آپ کو سخت ترین عذاب کے مقام تک پہنچا دیں، اور پھر اکٹھے اپنے گناہوں کی سزا چکھیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے شکار کرنے والا شکار کے لئے ابتداءً اس کی مرغوب چیز فراہم کرتا ہے اور جال میں آنے کے بعد بھی شروع میں ڈھیل دیتا رہتا ہے، جب وہ پوری طرح پھنس جاتا ہے اور قابو میں آجاتا ہے تو اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ
وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ ع ۱۸/۹
قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وقف لازم
وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

اللہ مومنوں کو تمہاری موجودہ حالت پر نہیں چھوڑیں گے؛ جب تک کہ بُرے کو اچھے سے ممتاز نہ کر دیں، ﴿۱﴾ اور نہ اللہ تم کو غیب کی خبر دیں گے؛ ﴿۲﴾ لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہیں منتخب کر لیتے ہیں؛ لٰہذا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان پر رہو اور تقویٰ اختیار کرو، تو تمہارے لئے بڑا اجر ہے ﴿۱۷۹﴾ اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں، وہ نہ خیال کریں کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے؛ بلکہ وہ ان کے حق میں نہایت ہی بُرا ہے، جس مال میں انھوں نے بخل کیا ہے، قیامت کے دن اُن کو اِسی کا طوق پہنایا جائے گا، ﴿۳﴾ اور اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کی میراث ہے، ﴿۴﴾ اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہیں ﴿۱۸۰﴾ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہیں اور ہم مالدار، یقیناً اللہ نے ان کی بات سن لی ہے، ﴿۵﴾ ہم ان کی بات اور پیغمبروں کے ناحق قتل کرنے کو لکھ رکھیں گے، اور کہیں گے کہ جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھو۔ ﴿۱۸۱﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ کو یہ بات منظور ہے کہ حقیقی معنوں میں ایمان لانے والوں اور منافقوں کی شناخت ہو جائے، اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں تھی کہ مسلمانوں کو آزمائش کی بھٹی سے گذارا جائے۔

﴿۲﴾ منافقین مخلص مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر واقعی کچھ لوگ منافق ہیں تو متعین کر کے بتا دو کہ کون لوگ منافق ہیں؟ —— اللہ تعالیٰ نے اسی کا جواب دیا ہے کہ اللہ کو یہ منظور نہیں کہ غیب سے پردہ اُٹھا دیں؛ البتہ غیب کی بعض باتوں سے مطلع کرنے کے لئے اللہ اپنے رسولوں کا انتخاب کرتے ہیں، یہ بھی غیب کی تمام باتوں سے باخبر نہیں ہوتے، غیب کی تمام باتوں سے واقف ہونا صرف اللہ کی شان ہے؛ لیکن بعض غیبی اُمور سے ان کو مطلع کر دیا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ عالم آخرت میں انسان کے بعض اعمال بھی اجسام کی صورت اختیار کر لیں گے، ان ہی میں سے یہ ہے کہ انسان جس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا، وہ سانپ کی صورت اختیار کر کے انسان کے گلے کا طوق بن جائے گا، (صحيح البخاري، كتاب الزكوة، باب إثم مانع الزكوة، حدیث نمبر: ۱۴۰۳) اعاذنا الله منه۔

﴿۴﴾ یعنی انسان دنیا کی ساری نعمتوں کو چھوڑ کر قبر کے حوالہ ہو جائے گا اور اللہ ہی کی ملکیت تمام چیزوں پر باقی رہ جائے گی، ←

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ
اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ
كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ
فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

یہ اسی عمل کا بدلہ ہے جس کا تمہارے ہاتھ پہلے ارتکاب کر چکے ہیں اور یقیناً اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتے ﴿۱۸۲﴾ جو لوگ
کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے اس بات کا وعدہ لے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں، جب
تک وہ ہمیں ایسی نیاز نہ دکھا دیں، جس کو آگ کھا جائے، آپ (ان سے) کہہ دیں کہ تمہارے پاس تو مجھ سے پہلے
کھلی ہوئی نشانیاں لے کر اور (خود) تمہارا یہ مطالبہ لے کر بھی بہت سے پیغمبر آئے، تو اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کو
کیوں مار ڈالا تھا؟ ﴿۱﴾ ﴿۱۸۳﴾ پھر اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو (اس سے غمگین نہ ہوں کہ) آپ سے پہلے بھی
بہت سے رسول جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے، جھٹلائے جا چکے ہیں ﴿۱۸۴﴾ ہر جان کو موت کا مزہ
چکھنا ہے، ﴿۲﴾ اور تم لوگوں کو قیامت کے دن تمہارا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، تو (اس دن) جو دوزخ سے بچا لیا گیا
اور جنت میں داخل کر دیا گیا، اس کا تو کام بن گیا، اور (رہ گئی) دنیا کی زندگی تو (یہ) محض دھوکہ کا سامان ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۸۵﴾

← تو انسان کا بخل کس قدر قابل تعجب ہے کہ وہ ایک ایسی چیز میں بخل کر رہا ہے جس کا خود مالک نہیں؟

﴿۵﴾ قرآن مجید نے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ایک نہایت ہی ایمان افروز تعبیر اختیار کی ہے، کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اللہ کو قرض دینا ہے، جو اس کو زیادہ بہتر صورت میں قیامت کے دن واپس ملے گا، من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حسناً، (الحدید: ۱۱) یہ ایسا وجد انگیز ترغیبی کلام ہے کہ نہ دینے والے ہاتھ بھی دینے کو بے قرار ہو جائیں اور بخیل سے بخیل شخص بھی اس کو سن کر اپنے قلب کو کشادہ پائے؛ لیکن ''مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر'' کے مصداق یہودیوں نے اسے اُلٹے تمسخر کا ذریعہ بنا لیا اور کہنے لگے کہ لیجئے، گویا ہم مالدار ہیں اور اللہ محتاج ہیں کہ قرض طلب کر رہے ہیں، یہاں ان کی اسی جسارت انگیز بات پر نکیر فرمائی جا رہی ہے۔

﴿۱﴾ یہ بھی یہودیوں ہی کا ادعاء تھا کہ نبی کے لئے یہ دکھانا ضروری ہے کہ اس کی قربانی کو آگ کھا جائے (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی: ۴/۲۹۵)؛ حالاں کہ نبی پر ایمان لانے کے لئے ایسی کوئی شرط بائبل میں کہیں مذکور نہیں، خود بائبل میں حضرت الیاس علیہ السلام (ایلیا) کی (۱-سلاطین، ۱۸، ۳۷، ۳۸) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی (۲-تواریخ، ۷:۱) سوختنی قربانی کا ذکر آیا ہے؛ لیکن ان انبیاء کرام کے ←

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾
وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ
ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

تم لوگوں کی مال اور جان کے سلسلہ میں ضرور آزمائش ہوگی اورتم ان لوگوں سے جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی اورمشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے، ﴿۱﴾ اور اگرتم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے ﴿۲﴾ ﴿۱۸۶﴾ اور اللہ نے کتاب والوں سے عہد لیا تھا کہ تم لوگوں کے سامنے اسے ضرور بیان کروگے اور چھپاؤ گے نہیں، پھر بھی انھوں نے اس عہد کو پس پشت ہی پھینک دیا اور معمولی قیمت کے عوض اس کو بیچ ڈالا، تو کیا ہی بری چیز ہے جو وہ خرید رہے ہیں؟ ﴿۳﴾ ﴿۱۸۷﴾

← ساتھ بنی اسرائیل نے جو بدسلوکی روا رکھی، اس پر خود بائبل گواہ ہے، اگر ان کے ماننے کا یہی معیار ہوتا تو ان انبیاء کو تکلیفیں نہ پہنچاتے، غرض کہ یہ محض سرکشی اور روگردانی کے بہانے ہیں؛ ورنہ اللہ تعالیٰ نے ہرگز ان سے یہ عہد نہیں لیا کہ جو پیغمبر فلاں متعین معجزہ دکھائے اس پر ایمان لاؤ ورنہ نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی موت زندگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے، اس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس تصور کا رد ہے کہ موت گناہ اور پاپ کی سزا ہے، اگر ایسا ہوتا تو جنتیوں کو دنیا میں موت سے گذارا نہ جاتا، انبیاء کو موت آئی ہے، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کو سولی پر چڑھا دیا گیا، اگر موت گناہ کی سزا ہوتی تو ایسی برگزیدہ ہستیوں کو کیوں کر موت آتی؟

﴿۳﴾ یعنی دنیا کی ساری آسائشیں سُراب سے زیادہ نہیں ہیں، یہ سب کی سب عارضی اور بے ثبات ہیں۔

﴿۱﴾ مسلمانوں نے اہل کفر سے جان و مال کی کیا کچھ تکلیفیں نہ اٹھائی ہیں، اور اہل کتاب اور مشرکین کی کیسی کیسی باتیں برداشت نہیں کی ہیں، یہ گویا ان ہی واقعات کی پیشین گوئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ کبھی بھی مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز نہیں ہونا چاہئے اور نہ تقویٰ کا دامن ہاتھوں سے چھوٹنا چاہئے۔

﴿۲﴾ شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے ''عزم الامور'' کا ترجمہ ''کار مقصود'' سے کیا ہے، فرماتے ہیں: ''از کارہائے مقصود است'' اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمہ اللہ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''تاکیدی احکام'' سے۔

﴿۳﴾ چنانچہ یہود و نصاریٰ نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت کی پیشین گوئی کو چھپا رکھا تھا، اور یہ سب محض دنیا کے کچھ حقیر مفادات کے لئے وہ کر رہے تھے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ع ۱۹/۱۰
لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ
فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہو رہے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے نہیں کیا ہے، اس پر بھی ان کی تعریف ہو، تو آپ ہرگز ہرگز ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ خیال نہ کریں، ﴿۱﴾ اور ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾ اللہ ہی کے لئے آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۱۸۹﴾ بے شک آسمان و زمین کی بناوٹ اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۹۰﴾ جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے ہوئے بھی، بیٹھے ہوئے بھی اور لیٹے ہوئے بھی، نیز آسمان و زمین کی بناوٹ میں غور کرتے رہتے ہیں، ﴿۳﴾ (وہ کہتے ہیں) اے ہمارے رب! آپ نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں فرمایا، آپ کی ذات تمام خامیوں سے پاک ہے، پس آپ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔ ﴿۱۹۱﴾

﴿۱﴾ اس میں خاص طور پر یہودیوں کی بداعمالیوں کا ذکر ہے، کہ اول تو اللہ کے دین میں تحریف و آمیزش جیسے سخت گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، مزید اس پر خوش ہوتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ تعریف کے طلب گار بھی رہتے ہیں، قرآن مجید نے ان کے بارے میں پیشین گوئی کی کہ ان کو عذاب سے محفوظ خیال نہ کیا جائے، مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں عذاب سے دنیوی عذاب مراد ہے کہ دنیا میں بھی عنقریب وہ خدا کی پکڑ میں آنے والے ہیں؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہودیوں کو مدینہ میں شکست فاش ہوئی اور ان کو رسوائی کے ساتھ جزیرۃ العرب چھوڑنا پڑا، اگلے فقرہ میں جس دردناک عذاب کا ذکر ہے، وہ یقیناً اس سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔

﴿۲﴾ زمین و آسمان کی تخلیق اور اس کو ایک نظام کا پابند رکھنا، قوتِ کشش کے ذریعہ زمین میں تھامنے کی صلاحیت اور اسی نظام کشش کے تحت سیاروں کے درمیان ہمیشہ مناسب فاصلہ کا برقرار رہنا، سورج کی گردش کا نظام، جس سے دن و رات کی آمد و رفت متعلق ہے، دن اور رات کے اوقات میں ایک متعین نظام کے مطابق کبھی اضافہ اور کبھی کمی، پھر زمین کے سینہ میں ہزاروں معدنیات کی موجودگی اور زمین کی فضاء میں آلودگی کو جذب کرنے کی اَن دیکھی صلاحیت اور نہ جانے قدرت خداوندی کے کیا کیا کرشمے ہیں، جن سے سائنس دانوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور جوں جوں کائنات کی مخفی حقیقتوں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے، لگتا ہے کہ ابھی تحقیق کا روزِ اول ہے، یہ ساری چیزیں خدا کے وجود، اس کی بے پناہ قدرت و حکمت اور اس کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں؛ بشرطیکہ انسان عقل و خرد سے کام لے۔ ←

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا
مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا
سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

اے ہمارے رب ! بے شک آپ نے جس کو دوزخ میں ڈال دیا یقیناً اسے رسوا کر دیا ، اور گنہگاروں کا کوئی بھی مددگار نہیں ﴿۱۹۲﴾ ہمارے پروردگار ! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ، جو ایمان کی دعوت دے رہا تھا کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ ؛ چنانچہ ہم ایمان لے آئے ، رب ہمارے ! تو آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیجئے اور ہماری برائیوں کو مٹا دیجئے ، ﴿۱﴾ اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمیں موت دیجئے ﴿۲﴾ ﴿۱۹۳﴾ پروردگارا ! اور آپ نے ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت جو وعدہ فرمایا ہے ، وہ ہمیں عطا فرمائیے اور قیامت کے دن ہم کو رسوا نہ کیجئے ، بے شک آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے ﴿۱۹۴﴾ تو ان کے رب نے ان کی دُعائیں قبول کرلیں ؛ کیوں کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو خواہ مرد ہو یا عورت ، ضائع نہیں کرتا ، تم ایک دوسرے کا حصہ ہو ، ﴿۳﴾ پھر جن لوگوں نے ہجرت کی ، اپنے گھروں سے نکالے گئے ، میری راہ میں ستائے گئے اور انھوں نے جہاد کیا اور مارے گئے ، میں ضرور ان کے گناہوں کو معاف کردوں گا ، ﴿۴﴾ اور یقیناً ان کو ایسی بہشتوں میں داخل کروں گا ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ، یہ اللہ کے پاس سے ان کو بدلہ ملے گا ، اور اللہ ہی کے یہاں بہترین بدلہ ہے ۔ ﴿۱۹۵﴾

← ﴿۳﴾ یعنی عقل مند وہ نہیں ہے ، جو دنیا کے اسباب و وسائل زیادہ سے زیادہ حاصل کرلے اور سونے چاندی کا خزانہ اپنے پاس جمع کرلے ؛ بلکہ عقل مند وہ ہے جس کا دل کبھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو ، اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے سوتے اللہ ہی کی یاد سے اس کا دل آباد ہو ، وہ دنیا کی چیزوں اور زمین و آسمان پر فکر و تدبر کی نگاہ ڈالے ، تو وہ بھی اسی نقطۂ نظر سے کہ مخلوق سے اس کے خالق کو اور موجود سے اس کے موجِد کو پہچانا جاسکے ـــــ اس آیت میں اس فقہی مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ محض ذکر کے لئے پاکی شرط نہیں ہے ، جس آدمی کو غسل کی حاجت ہو ، وہ قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرسکتا ؛ لیکن دوسرے اذکار اور دُعاؤں کے پڑھنے میں کچھ حرج نہیں ۔ (مراقی الفلاح ، باب الحیض : ۷۷) ←

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۱۹۶ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۱۹۷ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۱۹۸

کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو غلط فہمی میں نہ ڈال دے، ۱۹۶ یہ چند روزہ بہار ہے، ﴿۱﴾ پھر ان کا ٹھکانہ دوزخ ہی ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے! ۱۹۷ البتہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈریں، ﴿۲﴾ ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لئے بہتر ہے۔ ۱۹۸

← ﴿۱﴾ گناہوں کی مغفرت کے سلسلہ میں یہاں دو الفاظ آئے ہیں: ''ذنوب'' اور ''سیئات''، مفسرین کا خیال ہے کہ یا تو ذنوب سے کبائر اور سیئات سے صغائر مراد ہیں، یا ذنوب وہ گناہ ہیں جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور سیئات وہ جو بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں۔ (فتح القدیر للشوکانی: ۱/ ۴۹۴)

﴿۲﴾ یعنی آخرت میں صالحین اور نیکوں کی رفاقت عطا فرمایئے۔

﴿۳﴾ اسلام سے پہلے جاہلوں کا تو کیا کہنا، اچھے اچھے فلاسفہ اور دانش وربھی مرد و عورت کو الگ الگ مخلوق سمجھتے تھے، عورتوں کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں حیوانات سے بہتر اور مردوں سے کمتر درمیانی درجہ کی روح پائی جاتی ہے، قرآن نے اسی کی تردید کی ہے کہ ایسا نہیں ہے، مرد و عورت ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔

﴿۴﴾ یہ رسول اللہ ﷺ کے رفقاء گرامی یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر ہے، خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس گروہ کی جو مدح وستائش ہو رہی ہے، اس سے ان کے درجہ و مقام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس میں اس جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ انبیاء کے علاوہ خواہ کوئی کتنا بھی دیندار اور متقی و پرہیزگار ہو، خطاؤں اور کوتاہ کاریوں سے کوئی مبرا نہیں، آج کل جو پیرانِ زُور اور ان کے ناسمجھ متبعین اس قسم کے دعوے کرتے ہیں، وہ کھلے ہوئے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو لغزشیں ہوئیں، اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے، وہ مغفور ہیں، اور ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان کے بارے میں اپنی زبان کو حد درجہ محتاط رکھے۔

﴿۱﴾ یعنی کافروں کے وقتی غلبہ سے مسلمان متاثر نہ ہوں اور اس کو عند اللہ مقبولیت کی علامت اور کامیابی نہ سمجھیں۔

﴿۲﴾ یعنی جن کافروں کو اللہ کا خوف پیدا ہو جائے اور ایمان کی توفیق میسر ہو، ان کے ساتھ بھی انعام کا معاملہ ہوگا اور وہ بھی جنت میں داخل ہوں گے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ
لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ ۲۰ ع ۱۱
تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

اور کتاب والوں میں سے بعض وہ بھی ہیں، جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اس کتاب پر بھی جو تم لوگوں کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو خود ان کی طرف اتاری گئی، وہ اللہ سے ڈرنے والے ہیں، وہ حقیر قیمتوں پر اللہ کی آیتوں کا سودا نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں جن کو ان کے رب کے پاس اجر حاصل ہوگا، بے شک اللہ بہت جلد حساب کردیں گے ﴿۱۹۹﴾ اے ایمان والو! صبر کرو، ثابت قدمی اختیار کرو، تیار رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو؛ تاکہ تم فلاح پاؤ۔﴿۱﴾ ﴿۲۰۰﴾

﴿۱﴾ ''صبر'' سے مراد دین کے راستہ میں پیش آنے والی مشقتوں اور صعوبتوں کو برداشت کرنا ہے، ''صَابِرُوْا'' سے مراد دشمن کے مقابلہ میں صبر واستقامت اختیار کرنا ہے، دشمن سے مقابلہ کی تیاری کو ''مرابطہ'' کہتے ہیں، اسی سے ہے: ''رَابِطُوْا'' یعنی دشمنانِ اسلام سے مقابلہ کے لئے ہمیشہ تیار اور مستعد رہو۔

سُورَةُ النِّسَاءِ

- سورہ نمبر : (۴)
- رکوع : (۲۴)
- آیتیں : (۱۷۷)
- نوعیت : مدنی

یہ قرآن مجید کی چوتھی سورت ہے، اس میں ۱۷۶ آیتیں ہیں، ''نساء'' کے معنی ''عورتوں'' کے ہیں، اس سورت میں خواتین سے متعلق بہت سے احکام ذکر کئے گئے ہیں، اسی مناسبت سے اس کا نام ''نساء'' ہے، خواتین سے متعلق کچھ مسائل سورۂ طلاق میں بھی آئے ہیں، اس لئے اِس سورہ کو ''سورۃ النساء الکبریٰ'' (بڑی سورۂ نساء) اور سورۂ طلاق کو ''سورۃ النساء الصغریٰ'' (چھوٹی سورۂ نساء) بھی کہا جاتا ہے، جہاں دوسری مذہبی آسمانی کتابیں عورتوں کو گناہ کا دروازہ اور منحوس قرار دے رہی تھیں اور عرب وعجم کے معاشرہ میں خواتین کو کم تر نظر سے دیکھا جاتا تھا، قرآن مجید نے عورتوں کو یہ اعزاز عطا کیا کہ اس بڑی سورت کو خاص طور پر عورتوں ہی سے منسوب کیا گیا، جب کہ مردوں سے منسوب ''رجال'' نام کی کوئی سورت قرآن مجید میں نہیں رکھی گئی۔

یہ سورت پوری کی پوری مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے، اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ پوری سورۂ نساء میری موجودگی میں نازل ہوئی ہے: ''ما نزلت سورۃ النساء إلا وأنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' (قرطبی: ۵/۱، بحوالہ: بخاری) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ۱ ہجری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں رخصت ہوکر آئیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سورۂ نساء میں پانچ آیتیں وہ ہیں، جو مجھے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان پانچ آیات کا ذکر فرمایا: ۴، ۳۱ کا ابتدائی حصہ، ۴۸، ۴۰، ۳۱ کا آخری حصہ، (مستدرک حاکم: ۳۳۵/۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت منقول ہے؛ مگر اس میں تین آیتوں کا اضافہ ہے: ۲۶، ۲۷، ۲۸۔ (حوالۂ سابق)

اس سورت کا آغاز انسانی وحدت کے تصور سے ہوتا ہے، اس میں انسانیت کے آفاقی سماج کے باہمی روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے، خاندانی نظام اور عورتوں کے حقوق اس سورت کا خاص موضوع ہے، بہ حیثیت بیوی اور بہ حیثیت بیٹی عورتوں کے حقوق واضح کئے گئے ہیں، قانونِ میراث کا تفصیل سے ذکر فرمایا گیا ہے اور اس میں بھی خاص طور پر عورتوں کے حقوق کو بیان کرنا مقصود ہے، اس کے علاوہ مہر، نفقہ، حسن معاشرت، نسبی اور سسرالی تعلق کے لحاظ سے حرام رشتے، ازدواجی نزاعات کو حل کرنے کے طریقہ وغیرہ کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عملی زندگی سے متعلق جس قدر احکام اس سورت میں ذکر کئے گئے ہیں، شاید ہی کسی اور سورت میں آئے ہوں۔

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا
اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے
تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، ﴿۱﴾ اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، ﴿۲﴾ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت
پھیلا دیئے، ﴿۳﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو، جن کا واسطہ دے کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور قرابتوں کے
بارے میں بھی اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تم لوگوں پر نگراں ہیں ۝۱ یتیموں کو ان کا مال دے دو، (ان کی) اچھی
چیز کو (اپنی) بری چیز سے نہ بدل ڈالو اور اپنے مال کے ساتھ ان کا مال نہ کھا جاؤ، ﴿۴﴾ یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ ۝۲

﴿۱﴾ یہ اسلام کا ایک انقلابی نظریہ ہے کہ جیسے خدا ایک ہے، ویسے ہی پوری انسانیت ایک ہی باپ سے پیدا ہوئی ہے، یہ وہ عقیدہ ہے جو انسانیت کی طبقاتی تقسیم اور رنگ و نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ کے تصور کا قلع قمع کرتی ہے، ہندو مذہب میں یہ تصور تھا کہ کچھ لوگ خدا کے منھ سے، کچھ لوگ اس کے بازوؤں سے، کچھ لوگ اس کی رانوں سے اور کچھ لوگ اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں؛ اس لئے پیدائشی طور پر انسانیت کا ایک طبقہ معزز اور دوسرا ذلیل ہے، اس طرح کی طبقاتی تقسیم کم و بیش اکثر مذاہب اور نظام ہائے حیات میں موجود رہی ہے؛ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمام انسان کی پیدائش انسان اول سے ہوئی ہے؛ اس لئے وہ سب بحیثیت انسان برابر ہیں، محض رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کی بنیاد پر ان میں تفریق کی گنجائش نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام ہی سے ان کا جوڑا حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا، اس میں ایک بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عورت مرد کا ایک حصہ اور اس کی تکمیل ہے، آج عورتوں کی آزادی کے نام سے جو تحریکیں چل رہی ہیں، انھوں نے مردوں اور عورتوں کو دو فریق بنا دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان اپنے فریق کے تئیں مخاصمت کا جذبہ زیادہ رکھتا ہے محبت کا کم، قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ مرد عورتوں کو اپنا حصہ اور جزء تصور کریں اور ظاہر ہے کہ اپنے جزء کے تئیں محبت اور ایثار کا جذبہ ہوا کرتا ہے، نہ کہ مقابلہ اور مخاصمت کا۔

﴿۳﴾ قرآن نے انسانی تخلیق کا جو نظام یہاں ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے پہلے انسان کو پیدا کرنے کے بعد خود انسان کو انسان سے پیدا فرمایا، ایسا نہیں ہے کہ کسی حیوانی قالب سے ترقی کرتے ہوئے انسان اپنے انسانی قالب تک پہنچا ہو، جیسا کہ ڈارون کا نظریہ ہے۔

﴿۴﴾ یتیم اس نابالغ بچے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، یتیموں کے سلسلہ میں یہاں تین احکام دیئے گئے ہیں: ←

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ﴿۳﴾

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف نہیں کرسکو گے تو جو عورتیں پسند ہوں، ان سے نکاح کرلو، دودو، تین تین، چار چار، ﴿۱﴾ پس! اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو، یا جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں ہوں، (ان سے نفع اُٹھاؤ) اس میں اُمید ہے کہ ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ گے۔ ﴿۲﴾ ؕ﴿۳﴾

← اول یہ کہ یتیموں کا مال بالغ ہونے کے بعد ان کے حوالہ کردیا جائے، دوسرے: یتیموں سے اپنے مال کا ایسا تبادلہ نہ کیا جائے کہ اس کی اچھی چیز لے لی جائے اور معمولی چیز اس کے بدلہ ان کو دے دی جائے، تیسرے: ان کا مال اپنے مال کے ساتھ اس طرح ملا جلا کر خرچ نہ کیا جائے کہ جس سے یتیموں کا نقصان ہو، غرض جو جو صورت یتیموں کے مال میں زیادتی کی ہوسکتی ہے، قرآن نے ان سب کو منع کردیا ہے۔

﴿۱﴾ اسلام سے پہلے عرب میں یتیموں کے ساتھ مختلف طرح کی زیادتی روا رکھی جاتی تھی؛ ان میں ایک یہ تھی کہ اگر کوئی صاحب جائداد یتیم لڑکی کسی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ خود ہی اسے اپنے نکاح میں لے آتا، کہ اس میں دوہرا فائدہ تھا، ایک تو بیٹھے بیٹھائے اس کی جائداد حاصل ہوجاتی، دوسرے کوئی مہر وغیرہ کا مطالبہ کرنے والا بھی نہیں ہوتا، قرآن مجید نے یہاں اسی پر نکیر کی ہے، کہ جب تم کو چار تک نکاح کی اجازت ہے تو پھر اپنی پسند کے نکاح کرلو، کیا ضرور ہے کہ یتیم لڑکیوں کو اپنے نکاح میں لاکر ان کے ساتھ ناانصافی اور بدسلوکی کرو۔

اسلام نے چار تک نکاح کی اجازت دی ہے اور دنیا کے تمام ہی مذاہب میں تعدد ازدواج کی اجازت منقول ہے، بائبل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور متعدد پیغمبروں کی ایک سے زیادہ بیویوں کا ذکر موجود ہے، ہندو مذہب میں شری رام جی کے والد کی ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر ملتا ہے اور شری کرشن جی کی تو سینکڑوں بیویوں کا ذکر ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جہاں کہیں قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح کی ممانعت کی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج کا ایسا طوفان اٹھا ہے کہ شاید شیطان بھی ان کو دیکھ کر شرماتا ہوگا، موجودہ دور کا مغربی سماج اس کی کھلی ہوئی مثال ہے؛ اس لئے اسلام نے مردانہ فطرت کی رعایت کرتے ہوئے اس کی گنجائش رکھی ہے؛ لیکن اس کو نہ واجب وضروری قرار دیا ہے، نہ مستحب ومرغوب، اور اس میں بھی یہ شرط عائد کی ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح سنجیدہ جذبہ کے تحت کیا جائے، پہلی بیوی کو ضرر پہنچانا مقصود نہ ہو۔

﴿۲﴾ یعنی اگر اندیشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرسکے گا، تو پھر اس کے لئے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرلینا واجب ہے، یا پھر کنیزیں ہیں، کہ ان کا معاملہ بیوی سے کمتر تھا اور بیوی سے ان کے حقوق کم ہوتے تھے، اگر عدل کرنے پر قادر ہو تب بھی فقہاء نے اس کی حدود وشرائط قائم رکھنے کی دشواری کو دیکھتے ہوئے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہ کرنے کو بہتر قرار دیا ہے، (مختارات النوازل، کتاب النکاح، باب القسم: ۸۴/۲) عدل سے مراد سلوک وبرتاؤ میں عدل ہے، دل کا جھکاؤ اگر کسی کی طرف ←

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـئًا
مَّرِیۡٓـئًا ﴿۴﴾ وَلَا تُؤۡتُوا السُّفَهَآءَ اَمۡوَالَـكُمُ الَّتِیۡ جَعَلَ اللّٰهُ لَـكُمۡ قِیٰمًا وَّارۡزُقُوۡهُمۡ فِیۡهَا
وَاكۡسُوۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ﴿۵﴾ وَابۡتَلُوا الۡیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنۡ
اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا فَادۡفَعُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اَمۡوَالَهُمۡ ۚ وَلَا تَاۡكُلُوۡهَاۤ اِسۡرَافًا وَّبِدَارًا اَنۡ یَّكۡبَرُوۡا ؕ
وَمَنۡ كَانَ غَنِیًّا فَلۡیَسۡتَعۡفِفۡ ۚ وَمَنۡ كَانَ فَقِیۡرًا فَلۡیَاۡكُلۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ فَاِذَا دَفَعۡتُمۡ اِلَیۡهِمۡ
اَمۡوَالَهُمۡ فَاَشۡهِدُوۡا عَلَیۡهِمۡ ؕ وَكَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیۡبًا ﴿۶﴾

اور بیویوں کو خوش دلی کے ساتھ ان کا مہر ادا کردو، پھر اگر وہ خوش دلی سے اپنے مہر میں سے کچھ تمہارے لئے چھوڑ دیں، تو اس کو ہنسی خوشی کھا سکتے ہو، ﴿۱﴾ ﴿۴﴾ اور ناسمجھوں کو اپنے مال حوالہ نہ کرو، جس کو اللہ نے تمہارے لئے گذر اوقات کا ذریعہ بنایا ہے، ہاں! ان کو اس مال میں سے کھلاتے، پہناتے رہو اور ان سے بھلی بات کرتے رہو، ﴿۲﴾ ﴿۵﴾ اور یتیموں کو آزماتے رہو؛ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر تم ان میں ہوشمندی دیکھو تو ان کو ان کے مال حوالہ کردو، ﴿۳﴾ اور اس کو اس خوف سے فضول خرچی کر کے جلدی جلدی نہ کھا جاؤ کہ یہ بڑے ہوجائیں گے، اور جو ضرورت مند نہ ہو، اسے تو بچنا ہی چاہئے، ہاں، جو محتاج ہو وہ مناسب طریقہ پر کھا سکتا ہے، ﴿۴﴾ پھر جب تم ان کو ان کا مال حوالہ کرو، تو گواہ بھی بنالو اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔ ﴿۵﴾ ﴿۶﴾

← بڑھ جائے؛ لیکن عملی رویہ اس سے متاثر نہ ہو، تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ دل کی رغبت اور میلان انسان کے دائرۂ اختیار میں نہیں، خود رسول اللہ ﷺ کے ایک ارشاد میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: خداوندا! میرا یہ فعل (عدل وانصاف) ان چیزوں میں ہے، جن کا میں مالک ہوں؛ لہٰذا ایسی باتوں کے بارے میں میری پکڑ نہ فرمائیے، جس پر آپ کا اختیار ہے، میرا اختیار نہیں۔ (نسائی، باب عدل الرجل الی بعض نساء دون بعض، حدیث نمبر: ۳۲۹۵)

﴿۱﴾ یتیم لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے، اسی مناسبت سے یہاں مہر سے متعلق تاکید فرمائی گئی، اسلام سے پہلے عربوں کا حال یہ تھا کہ اول تو عورت کا مہر اس کا ولی وصول کرلیتا اور خود عورت مہر سے محروم رہتی، مہر دیتے بھی تو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے، خوش دلی سے ادا نہ کرتے، اور بعض اوقات عورت سے جبراً مہر معاف کرالیتے، قرآن نے اس ایک ہی آیت میں تمام زیادتیوں کی طرف متوجہ کردیا کہ ایک تو عورت کا مہر خود اس کو ملنا چاہئے، دوسرے: اس کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، تیسرے: اگر عورتیں بہ طیب خاطر پورا مہر یا مہر کا کچھ حصہ معاف کردیں تو حرج نہیں؛ لیکن ایسا رویہ نہ اختیار کرنا چاہئے کہ وہ دباؤ کے تحت مہر معاف کردیں۔

﴿۲﴾ یعنی یتیم بچوں میں جب تک شعور وآگہی نہ پیدا ہوجائے، اس وقت تک مال جیسی قیمتی چیز —— جو انسان کے لئے گذر بسر کا ←

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا۝۷

والدین اور قرابت داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے، اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے، اور والدین اور قرابت داروں کے متروکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔ ﴿۱﴾ ۝۷

← ذریعہ ہے —— ان کے حوالہ نہ کی جائے؛ بلکہ اسی میں سے اس کی ضروریات پوری کی جائیں، بھلی بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مال تمہارا ہی ہے، جب تم سمجھ دار ہو جاؤ گے تو مال تمہارے حوالہ کر دیا جائے گا۔

﴿۳﴾ نکاح کی عمر کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کو ان کا مال حوالہ کر دیا جائے، اس سے پہلے ان کو وقتاً فوقتاً خرید و فروخت وغیرہ کے معاملات سپرد کر کے آزماتا رہے؛ تاکہ ان میں شعور پیدا ہو، اور ان کے شعور کا اندازہ بھی ہو جائے، بالغ ہونے کے بعد بھی اگر ان میں خفت عقل محسوس کی جائے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پچیس سال تک اور صاحبین اور دوسرے فقہاء کے نزدیک جب تک کہ اس میں شعور پیدا نہ ہو جائے، پیسے اس کے حوالہ نہ کئے جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی شخص بالغ تو معتدل حالت میں ہوا؛ لیکن بعد کو اس میں سفاہت اور بے عقلی کی کیفیت پیدا ہوگئی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا مال اسی کے اختیار میں رہے گا، لیکن صاحبین اور دوسرے فقہاء کے نزدیک اس کا مال اس کے ولی کی تحویل میں رہے گا اور یہ حسب ضرورت اس پر خرچ کرے گا، اگر ایسا کم عقل آدمی خود اپنے مال میں تصرف کرے، تو اس کا اعتبار نہیں، اس کے احکام وہی ہوں گے جو نابالغ بچوں کے ہیں، تاہم حنفیہ کے نزدیک بھی فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے، (دیکھئے: الدر المختار مع الرد: ۹/۲۱۵) —— بچوں کا بالغ ہونا دو طریقوں سے جانا جاتا ہے: یا تو بلوغ کی جسمانی علامات ظاہر ہو جائیں، جیسے لڑکوں کے لئے احتلام اور لڑکیوں کے لئے ماہواری کا آنا، یا عمر کم سے کم پندرہ سال ہو جائے۔ (در مختار مع الرد: ۹/۲۲۶)

﴿۴﴾ یہ احکام یتیموں کے اولیاء سے متعلق ہیں کہ جو خود کھاتے پیتے ہوں اور ضرورت مند نہ ہوں، ان کو تو یتیموں کے مال میں سے کچھ بھی نہیں لینا چاہئے، ہاں، جو محتاج ہوں وہ اپنا حق الخدمت لے لیں؛ لیکن وہ بھی پوری احتیاط کے ساتھ، ایسا نہ ہو کہ بدنیتی کے ساتھ حق الخدمت کے نام پر یتیموں کے پیسے بے دریغ خرچ کر دیئے جائیں؛ تاکہ ان کے بالغ ہونے سے پہلے پہلے حساب کتاب برابر ہو جائے۔

﴿۵﴾ گواہ بنانے کا حکم بہ طور استحباب کے ہے تاکہ آگے چل کر کوئی نزاع نہ پیدا ہو (دیکھئے: تفسیر بغوی: ۱/۴۸۱، قرطبی: ۱/۴۰۳) —— یتیموں سے متعلق ان تمام احکام کے بعد فرمایا گیا کہ اصل حساب لینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں انسان کچھ ہیرا پھیری کر سکتا ہے؛ لیکن خدا کے حساب سے نہیں بچ سکتا۔

﴿۱﴾ اسلام سے پہلے عربوں کا دستور یہ تھا کہ صرف بالغ لڑکوں ہی کو میراث ملتی تھی، عورتیں تو محروم رہتی ہی تھیں، نابالغ لڑکوں کو بھی میراث سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، عربوں کا خیال تھا کہ جو تلوار چلا سکے اور خاندان کی حفاظت کر سکے، وہی میراث کے حق دار ←

وَ اِذَا حَضَرَ الۡقِسۡمَةَ اُولُوا الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنُ فَارۡزُقُوۡهُمۡ مِّنۡهُ وَ قُوۡلُوۡا لَهُمۡ قَوۡلًا
مَّعۡرُوۡفًا ﴿۸﴾ وَ لۡیَخۡشَ الَّذِیۡنَ لَوۡ تَرَکُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّیَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَیۡهِمۡ ۪ فَلۡیَتَّقُوا
اللّٰهَ وَ لۡیَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِیۡدًا ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ
ع ۱۲ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ﴿۱۰﴾ ع

اور جب تقسیم کے وقت خویش و اقارب، یتیم اور محتاج بھی موجود ہوں تو اِس میں سے کچھ اُن کو بھی دے دو، اور (نہ دے سکو تو) ان سے بھلی بات کہو ﴿۱﴾ ﴿۸﴾ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے ننھے ننھے بچوں کو چھوڑ جائیں تو انھیں ان کی (کیسی) فکر ہوگی؛ لہٰذا ان کو بھی چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور درست بات کہیں، ﴿۲﴾ ﴿۹﴾ بے شک جو لوگ ناحق طریقہ پر یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور عنقریب وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔ ﴿۱۰﴾ ع

← ہیں، حضرت اَوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، انھوں نے بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا، اس اُصول کے مطابق ان میں سے کوئی میراث کا مستحق نہیں تھا؛ چنانچہ دو چچازاد بھائیوں نے ان کے پورے متروکہ پر قبضہ کرلیا، ان کی بیوہ نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں فریاد کی، اسی موقعہ سے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی، (طبری: ۱۷۶/۴) اس آیت سے میراث کے چند اُصول معلوم ہوئے، اول: یہ کہ متروکہ تھوڑا ہو یا زیادہ، ورثہ کے درمیان سب کی تقسیم عمل میں آئے گی، دوسرے: میراث میں مردوں کی طرح عورتوں کو بھی حصہ ملے گا، عورتوں کو میراث سے محروم رکھنا درست نہیں، تیسرے: مردوں میں بالغ اور نابالغ کی تفریق نہیں، بالغ ہو یا نابالغ، دونوں برابر کے حقدار ہیں، چوتھے: میراث کے حق دار ''اقرب'' یعنی قریب ترین رشتہ دار ہوں گے، قریب ترین رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم ہوں گے، بیٹے موجود ہوں تو پوتے پوتیاں، بیٹیاں موجود ہو تو نواسے نواسیاں حقدار نہیں ہوں گے، پانچویں: میراث کے حقدار ہونے کا تعلق قرابت داری سے ہے، نہ کہ مالدار اور غریب ہونے سے؛ اس لئے 'قریب ترین رشتہ دار' چاہے مالدار ہوں، دور کے رشتہ دار کو چاہے وہ زیادہ غریب اور محتاج ہوں، محروم کردیں گے۔

﴿۱﴾ یہ حکم بہ طور استحباب کے ہے، کہ جو لوگ وارث نہ ہوں، اگر تقسیم کے موقعہ پر کچھ ان کو بھی دے دیا جائے تو بہتر ہے اور بھلی بات کہنے سے مراد یہ ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو خوش اُسلوبی سے معذرت کردی جائے، یا وہ زیادہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو ان کو محبت سے سمجھا دیا جائے، بدکلامی بہرحال نہ کی جائے۔

﴿۲﴾ اس آیت میں یتیموں کے حقوق کی طرف نہایت اثر انگیز انداز میں متوجہ کیا گیا ہے، کہ اگر تم اپنے بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے گذرتے تو اس وقت ان بچوں کے بارے میں تمہارے جو جذبات ہوتے، ہر یتیم بچہ کے بارے میں تمہارے اندر وہی جذبۂ ترحم ہونا چاہئے، —— ''درست بات کہنے'' میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر متوفی اپنے مرنے کے وقت کوئی ایسی وصیت کرنا چاہے، جو ان بچوں کے لئے نقصان دہ ہو، تو اس کو صحیح مشورہ دیا جائے اور ایسے ارادہ سے اس کو باز رکھا جائے۔

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ ۖ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ‌ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ‌ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ‌ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ‌ ؕ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَـكُمۡ نَفۡعًا‌ ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝۱۱

اللہ تم لوگوں کو تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتے ہیں کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا، پھر اگر صرف عورتیں ہی دو سے زیادہ ہوں، تو متروکہ کا دو تہائی ان کا حق ہے، اور اگر ایک ہی ہوں تو متروکہ کا آدھا، ﴿۱﴾ اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کے لئے متروکہ کا چھٹا حصہ ہے؛ بشرطیکہ میت کی اولاد ہو، اگر اس کی اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی ہے، پھر اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کا حق چھٹا حصہ ہے، ﴿۲﴾ اس نے جو وصیت کی ہو اس کو پورا کرنے یا قرض ادا کرنے کے بعد یہ حصے ہیں، ﴿۳﴾ تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے میں سے کن سے تم کو زیادہ نفع پہنچے گا؟ (یہ حصے) اللہ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ہیں، بے شک اللہ خوب جاننے والے اور خوب دانا ہیں۔ ۝۱۱

﴿۱﴾ اس آیت میں تفصیل سے مختلف رشتہ داروں کی میراث کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اولاد کے حق میراث کے سلسلہ میں تین حالتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک یہ کہ مرنے والے کے لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی، اس صورت میں لڑکوں کا حصہ بہ مقابلہ لڑکیوں کے دوگنا اور لڑکیوں کا لڑکوں کے مقابلہ آدھا ہوگا، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ شریعت نے ماں باپ، اولاد اور بیوی کے نفقہ وکفالت کی ذمہ داری مردوں پر رکھی ہے نہ کہ عورتوں پر، پس چوں کہ ان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں؛ اس لئے ان کا حق بھی زیادہ رکھا گیا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ صرف بیٹیاں ہوں، اور بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں، تو متروکہ کا دو تہائی دونوں بیٹیوں کو مل جائے گا، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر بیٹیاں صرف دو ہوں تو ان کا بھی یہی حکم ہے، (ابوداؤد: عن جابر بن عبد اللہ، کتاب الفرائض) تیسری صورت یہ ہے کہ ایک بیٹی ہو، تو وہ کل متروکہ کے آدھے کی حقدار ہوگی —— چوتھی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ صرف لڑکے ہوں، ایک یا ایک سے زیادہ، ایسی صورت میں وہ دوسرے حصہ داروں کا حق دینے کے بعد کل متروکہ کے حقدار ہوں گے۔

﴿۲﴾ یہاں والدین کے حصوں کا ذکر ہے، اس میں تین صورتیں بیان کی گئی ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ مرنے والا صاحبِ اولاد ہو، ایسی صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو اس کے متروکہ کا چھٹا حصہ ملے گا، یعنی متروکہ کا ایک تہائی ماں باپ دونوں میں مساوی تقسیم ہوگا، دوسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد نہ ہو اور کوئی بھائی بھی نہ ہو یا صرف ایک بھائی ہو تو متروکہ کا ایک تہائی حصہ ماں کو ملے گا اور ورثہ میں تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ باپ کو، تیسری صورت یہ ہے کہ مرنے والے کو اولاد تو نہ ہو؛ لیکن ایک سے زیادہ بھائی ہوں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، اور تقسیم کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ باپ کو —— واضح ہو کہ اگر مرنے والے نے ماں باپ کو بھی چھوڑا ہو اور بیوی کو بھی، تو بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ کا ایک تہائی ماں کو اور باقی باپ کو ملے گا، کتبِ فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

←

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ
الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ
يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ
بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ
اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ﴿۱۲﴾

اور تمہاری بیویوں نے جو چھوڑا ہو — اگر وہ صاحب اولاد نہ ہوں — تو تمہارے لئے اس کا آدھا ہے اور اگر صاحب اولاد ہوں تو تمہارے لئے ان کے متروکہ کا چوتھائی حصہ ہے، (ہاں، اگر) انھوں نے وصیت کی ہو یا (ان پر) دین ہو، تو اس کی ادائیگی کے بعد (یہ حصہ) ہے، اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو عورتوں کے لئے تمہارے متروکہ کا چوتھائی حصہ ہے، اور اگر تم صاحب اولاد ہو، تو وہ تمہارے متروکہ کے آٹھویں حصہ کی حقدار ہیں، (اور اگر) تم کوئی وصیت کر جاؤ، یا (تمہارے اوپر) دین ہو، تو اس کی ادائیگی کے بعد (یہ حصہ) ہے، ﴿۱﴾ اور اگر کسی مرد یا عورت کا نہ بیٹا ہو اور نہ باپ، اور اس کو ایک بھائی یا ایک بہن ہو، تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے، اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں وہ سب شریک ہیں، (ہاں، اگر) وصیت کی گئی ہو، یا (میت کے ذمہ) دین ہو تو اس کی ادائیگی کے بعد (یہ حصہ) ہے؛ ﴿۲﴾ (البتہ چاہئے کہ) وصیت کرنے والا یا دین کا اقرار کرنے والا (ورثہ کو) نقصان نہ پہنچائے، ﴿۳﴾ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب آگاہ بھی ہیں اور بردبار بھی۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۲﴾

← ﴿۳﴾ یعنی حصۂ میراث کی تقسیم دین کی ادائیگی اور وصیت کی تکمیل کے بعد ہے، دین کی ادائیگی وصیت پر بھی مقدم ہے؛ چوں کہ دین کے تقاضا کرنے والے خود موجود ہوتے ہیں، ورثہ کے لئے اس میں کوتاہی برتنا دشوار ہوتا ہے، وصیت جس کے حق میں کی گئی ہو، تبرع ہونے کی وجہ سے اس کے مطالبہ میں شدت بھی نہیں ہوتی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے، وہ اس سے واقف بھی ہو؛ اس لئے وصیت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، وصیت کے سلسلہ میں حدیث میں دو اہم اُصول بتائے گئے ہیں: ایک یہ کہ وارث کے حق میں وصیت کا اعتبار نہ ہوگا، (سنن ترمذی، باب لا وصیة لوارث، حدیث نمبر: ۲۲۰، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۷۱۳) دوسرے: وصیت زیادہ سے زیادہ ترکہ کے ایک تہائی ہی میں جاری ہو سکتی ہے، (مسلم، باب الوصیة بالثلث، حدیث نمبر: ۴۲۱۴) میت اگر اس سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو ایک تہائی مال ہی میں وصیت جاری ہوگی، اس سے زیادہ میں جاری نہیں ہوگی، سوائے اس کے کہ تمام ورثہ اس کے جاری کئے جانے پر رضامند ہوں، — اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو وہ بھی دین میں داخل ہے اور میراث کی تقسیم سے پہلے میّت کی بیوہ کا مہر نکال دینا ضروری ہے۔ ←

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ ع ٢ ١٣

یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے ایسی بہشتوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے، اور یہی بڑی کامیابی ہے ﴿۱۳﴾ جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا، اللہ اس کو دوزخ میں ڈال دیں گے، وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا، اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۴﴾

←﴿۱﴾ اس آیت میں شوہر اور بیوی کے حصۂ میراث کا ذکر ہے، شوہر و بیوی دونوں کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں، ایک حالت صاحبِ اولاد ہونے کی ہے اور دوسری حالت لا ولد ہونے کی، اگر بیوی لا ولد ہو تو شوہر کو اس کے متروکہ کا آدھا ملے گا، بیوی صاحبِ اولاد ہو، خواہ اسی شوہر سے یا دوسرے شوہر سے تو چوتھائی ملے گا، شوہر لا ولد تھا تو بیوی کو اس کے ترکہ سے چوتھائی ملے گا اور صاحبِ اولاد ہو خواہ اس بیوی سے یا دوسری بیوی سے، تو بیوی کو اس کا آٹھواں حصہ ملے گا اور شوہر و بیوی کا حق بھی وصیت کی تکمیل اور دین کی ادائیگی کے بعد ہی ملے گا۔

﴿۲﴾ جس میت نے نہ باپ دادا کو چھوڑا ہو اور نہ اولاد کو، اس کو ''کلالہ'' کہتے ہیں، ایسے شخص کی میراث کا حکم یہاں بیان کیا گیا ہے کہ اگر ایک ماں شریک بھائی یا ایک ماں شریک بہن اس کی وارث ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی متروکہ ان سب کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، قرآن میں مطلق بہن کا ذکر ہے؛ لیکن فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہاں بہن سے اخیافی یعنی ماں شریک بہن مراد ہے، عینی یعنی ماں باپ شریک بہن بھائی اور علاتی یعنی باپ شریک بھائی بہن کا ذکر سورۂ نساء کے اخیر میں آرہا ہے —— یہاں بھی تنبیہ فرما دی گئی کہ تقسیم میراث سے پہلے وصیت کی تکمیل اور دین کی ادائیگی ضروری ہے۔

﴿۳﴾ یعنی مرنے والے کے لئے جائز نہیں کہ وہ محض ورثہ کو نقصان پہنچانے کی نیت سے کسی کے لئے وصیت کر جائے، یا کسی کا دَین باقی ہونے کا جھوٹا اقرار کرے؛ تاکہ ورثہ کو کم ملے اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا جاسکے، ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔

﴿۴﴾ میراث اور وصیت کے احکام ذکر کرنے کے بعد اخیر میں خاص طور پر متنبہ فرمایا گیا کہ یہ احکام من جانب اللہ ہیں، طبیعت قبول کرے یا نہ کرے، اس پر عمل کرنا واجب ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف اور آگاہ ہیں کہ کس کا کیا حصہ ہونا چاہئے؟

﴿۱﴾ قانون میراث کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد قرآن مجید نے اس طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ قوانین اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز کرنا جہنم کو دعوت دینا ہے؛ اس لئے اس میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہئے، آج کل بعض حضرات لڑکیوں کو اور بیوہ ماں کو میراث کا حق نہیں دیتے، یہ صریحاً زیادتی اور سخت گناہ کا باعث ہے۔

وَ الّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ وَ الَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا وَ اَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں، ان پر اپنے میں سے چار مردوں کو گواہ بناؤ، پھر اگر وہ (ان کے بدکاری کرنے کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھر میں روکے رکھو؛ یہاں تک کہ ان کو موت آجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ مقرر کردے ﴿۱﴾ ﴿۱۵﴾ اور تم میں سے جو دو شخص بھی بدکاری کریں تو ان کو تکلیف دو، ﴿۲﴾ اگر وہ توبہ اور اپنی اصلاح کرلیں، تو ان کو نظر انداز کردو، ﴿۳﴾ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں۔ ﴿۱۶﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں منکوحہ عورتوں کے ارتکاب زنا سے متعلق تین احکام دیئے گئے ہیں، اول: یہ کہ زنا کے ثبوت کے لئے کم سے کم چار گواہوں کا ہونا ضروری ہے، دوسرے: یہ چاروں مرد گواہ ہونے چاہئیں، عورتوں کی گواہی اس جرم میں معتبر نہیں ہے، تیسرے: اگر ان گواہوں کی گواہی سے ان کا زنا کرنا ثابت ہوجائے تو فی الحال ان کی سزا یہ ہے کہ اس عورت کو مرنے تک گھر میں قید رکھا جائے، اس کے ساتھ قرآن نے کہا ہے کہ ''یا اللہ تعالیٰ! ان کے لئے کوئی راستہ متعین کردے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بدکاری پر قید کی یہ سزا ابھی عارضی طور پر مقرر کی گئی ہے، جب اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی مستقل سزا مقرر کردیں، تو پھر اس کے مطابق ان پر سزا جاری کی جائے گی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مستقل سزا بھی مقرر فرمادی اور وہ یہ کہ اگر زنا کار غیر شادی شدہ ہو، چاہے مرد ہو یا عورت، تو اسے سو کوڑے مارے جائیں، (النور: ۲) اور شادی شدہ مرد و عورت کے زنا کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کردیا جائے، بکثرت حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اور عہد نبوی و خلافت راشدہ میں بھی اور اس کے بعد بھی اسلامی حکومتوں میں شادی شدہ زانی کے حق میں اس سزا کا تعامل رہا ہے۔ (دیکھئے: مسلم، باب حد الزنا، حدیث نمبر: ۴۴۱۴)

﴿۲﴾ مقصد یہ ہے کہ زنا کی سزا کچھ شادی شدہ عورتوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں؛ بلکہ اگر دوسرے مرد یا عورت بدکاری کے مرتکب ہوں تو وہ بھی مستحقِ سزا ہیں؛ البتہ چوں کہ اس وقت تک زنا کی باضابطہ سزا مقرر نہیں ہوئی تھی؛ اس لئے ارشاد ہوا کہ ایسے لوگوں کو ایذا پہنچائیں؛ تاکہ عبرت ہو، ظاہر ہے اس زمانہ میں یہ ایذاء قاضی کی صواب دید پر تھی، اب زنا کی جو مستقل سزا مقرر ہوچکی ہے، وہی بدکار لوگوں پر جاری ہوگی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ''والذان یاتینھا منکم'' سے دو مردوں کا آپس میں بدکاری کرنا مراد ہے، (تفسیر مظہری: ۴۶/۲) یہ شدید گناہ ہے، عہد صدیقی میں تو اس کے بعض مجرموں کو جلانے تک کی سزا دی گئی (سنن کبریٰ للبیہقی، باب ماجاء فی حد اللوط، حدیث نمبر: ۱۷۰۲۸) اور قرآن مجید کے بیان کے مطابق قوم لوط پر خاص اسی وجہ سے عبرت ناک عذاب الٰہی مسلط کیا گیا تھا۔

﴿۳﴾ یعنی اگر وہ توبہ کرلیں اور اس برائی سے پرہیز کریں تو اب ان سے تعرض نہ کیا جائے، اور ان پر طعن و تشنیع وغیرہ سے گریز کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ حکم زنا کی سزا نازل ہونے سے پہلے کا ہے، اب قاضی کے سامنے اگر کسی کا یہ جرم ثابت ہوجائے تو محض توبہ کرلینا کافی نہیں؛ بلکہ اس پر زنا کی سزا جاری کی جائے گی۔

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ
يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ
حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ
اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

اللہ تعالیٰ کے ذمہ ان لوگوں کی توبہ قبول کرنا ہے، جو نادانی سے برائی کر گذرتے ہیں، ﴿۱﴾ پھر جلد ہی توبہ بھی کر لیتے ہیں ،تو اللہ ان کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں ، ﴿۲﴾ اور اللہ جاننے والے اور حکمت والے ہیں ، ﴿۱۷﴾ ان لوگوں کی توبہ (مقبول)نہیں ، جو برائیاں کرتے جاتے ہیں ؛ یہاں تک کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، ﴿۳﴾ تو کہتے ہیں : میں اب توبہ کرتا ہوں ، اور ان لوگوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی ،جن کی موت کفر کی حالت میں ہوگی ، ﴿۴﴾ ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ۔ ﴿۱۸﴾

﴿۱﴾ کوئی بھی شخص جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہو، وہ نادانی ہی میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اس سے بڑھ کر نادانی کیا ہوگی کہ ایک شخص کو کسی چیز کا زہر ہونا معلوم ہو، پھر بھی غلبۂ نفس میں اسی زہر کو کھا جائے ؛ اسی لئے ہر گناہ توبہ سے معاف ہوسکتا ہے ؛ یہاں تک کہ شرک و کفر بھی ،سوائے اس کے کہ بندوں سے متعلق گناہ ہو، یہ حق ادا کرنے یا صاحب حق سے حق معاف کرانے ہی سے معاف ہوگا۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ اختیار عطا فرمائی ہے، وہ نیکی بھی کرسکتا ہے اور برائی بھی ، گناہ کے کام کرنے پر بھی قادر ہے اور اللہ کی رضاء وخوشنودی کے کام کرنے سے بھی عاجز نہیں ؛ اس لئے گناہ کا ارتکاب گویا اس کی سرشت اور فطرت میں ہے، انسان سے یہ کہنا کہ وہ فرشتہ بن جائے ، اس کی فطرت کے مغائر تھا ؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ، کہ انسان سے جب کوئی غلطی ہوجائے تو وہ اللہ کے سامنے نادم وشرمسار ہو، آئندہ اس برائی سے بچنے کا عزم مصمم ہو اور برائی سے اجتناب بھی ہو تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں ،صرف زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں۔

﴿۳﴾ موت کے آکھڑے ہونے سے مراد 'غرغرہ' کی کیفیت ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے، (سنن ترمذی، باب ان اللہ الخ، حدیث نمبر: ۳۵۳۷) کہ اس وقت کی توبہ قبول نہ ہوگی ؛ کیوں کہ اب غیب کی حقیقتیں بندہ کی نظر کے سامنے آجاتی ہیں اور توبہ تو اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام پر یقین رکھنے کے ساتھ نادم وشرمسار ہونے کا نام ہے۔

﴿۴﴾ حالتِ کفر میں مرنے سے مراد یہ ہے کہ جو موت کے بالکل قریب ہوں، اس کافر کا عین موت کے وقت توبہ کرنا معتبر نہیں، یا یہ مراد ہے کہ کافر اگر آخرت میں کفر سے توبہ کرے تو اللہ ایسی توبہ قبول نہ فرمائیں گے ؛ کیوں کہ آخرت عمل کی دنیا نہیں ہے، جزاء وسزا کی دنیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرۡهًا ‌ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ‌ ۚ وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ ۚ فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡــًٔـا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ۞ ۱۹ وَاِنۡ اَرَدْتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا‌ ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۞ ۲۰

اے ایمان والو! تمہارے لئے حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے مالک بن بیٹھو، ﴿۱﴾ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کو روکے رکھو؛ تاکہ اپنے دیئے ہوئے مال میں سے کچھ وصول کرلو، ﴿۲﴾ سوائے اس کے کہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی کا ارتکاب کریں، ﴿۳﴾ اور ان کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو، اگر وہ تم کو نہیں بھاتی ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ نے اسی میں بہت سی خوبیاں رکھی ہوں ﴿۴﴾ ۞۱۹ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو اور تم ان میں سے ایک کو ڈھیر سارا مال دے چکے ہو تب بھی اس میں سے کچھ واپس نہ لو، کیا تم بہتان رکھ کر اور کھلا ہوا گناہ کرکے اسے واپس لے لینا چاہتے ہو؟ ﴿۵﴾ ۞۲۰

﴿۱﴾ اسلام سے پہلے عرب جن برائیوں میں مبتلا تھے اور عورتوں پر جو ظلم و جور روا رکھا جاتا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جب کوئی عورت بیوہ ہوجاتی تو وہ سوتیلے لڑکے کی ملکیت سمجھی جاتی؛ تاکہ وہ کہیں اور شادی نہ کرسکیں اور ان کی جائداد بھی ہاتھ سے نہ جائے، اللہ تعالیٰ نے اسی حرص اور ظالمانہ روش کی مذمت فرمائی ہے۔ (دیکھئے: تفسیر بغوی: ۱/۴۹۷، المنار: ۴/۳۷۰)

﴿۲﴾ ایسا بھی کیا جاتا تھا کہ کسی عورت کو رکھنا منظور نہ ہوتا؛ لیکن شوہر اسے اپنی زندگی سے آزاد بھی نہیں کرتا؛ تاکہ وہ مہر واپس کرنے پر مجبور ہو اور مرد اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا، قرآن نے یہاں اسی پست حرکت سے منع کیا ہے۔

﴿۳﴾ ''فاحشة مبيّنة'' (کھلی ہوئی بے حیائی) کی دو تفسیریں منقول ہیں، اول: عورت کی بدزبانی اور بدکلامی، اس تفسیر کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر خود عورت بدزبان اور بدمزاج ہو اور اس کی وجہ سے شوہر مہر کا کچھ حصہ واپس لے کر طلاق دے تو اس کی گنجائش ہے، دوسری تفسیر زنا سے کی گئی ہے، اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ اگر بیوی زنا میں پکڑی جائے تو یہ بات درست ہے کہ مہر واپس لے کر اسے گھر سے نکال دیا جائے، یہ حکم اس زمانے کا ہے جب تک کہ زنا کی سزا مقرر نہیں ہوئی تھی، اب زنا کی وجہ سے کسی عورت کو مہر سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

﴿۴﴾ اللہ تعالیٰ نے اس میں ازدواجی زندگی کو معتدل بنانے کا ایک زریں نسخہ عطا فرمایا ہے، کہ اگر تمہیں کوئی عورت پسند نہ ہو اور وہ تمہارے نکاح میں آچکی ہو، تو یہ سوچ کر اسے نباہنے کی کوشش کرو کہ ممکن ہے کہ اللہ نے اسی میں خیر رکھا ہو۔

﴿۵﴾ عام طور پر جب کوئی مرد کسی عورت کے دام فریب میں آکر پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو تو پہلی بیوی کو اس نے جو کچھ دیا ہو، اس کو وصول کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈتا ہے، اس کے کردار پر یا مزاج و سلوک کے بارے میں تہمتیں لگاتا اور ظلم کا ←

وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَ لَا
تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ
سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ ع ۳ ۸ ۱۴
الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْۤ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ
نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ
تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ
وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

اور تم کیسے اس کو واپس لوگے؛ حالاں کہ تم ایک دوسرے سے ہم بستری کر چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۱﴾ اور جن عورتوں کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے، تم ان کو نکاح میں نہ لاؤ، مگر جو کچھ ہو چکا (وہ ہو چکا)، ﴿۲﴾ بے شک یہ بے حیائی اور نہایت قابل نفرت بات تھی، اور بہت ہی برا طریقہ تھا ﴿۲۲﴾ تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، بھتیجیاں، بھانجیاں، تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا ہے، تمہاری بیویوں کی مائیں حرام کی گئی ہیں، اور تمہاری وہ سوتیلی بیٹیاں بھی جو تمہاری پرورش میں ہیں ﴿۳﴾ اور جو تمہاری اُن بیویوں سے ہیں، جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پس! اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر (ان سے نکاح کرنے میں) کچھ گناہ نہیں، ﴿۴﴾ اور تمہارے بیٹے جو تمہاری نسل سے ہیں ان کی بیویاں بھی حرام ہیں، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو، ﴿۵﴾ سوائے اس کے جو پہلے ہو چکا، ﴿۶﴾ بے شک اللہ بہت بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔ ﴿۲۳﴾

← راستہ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس غیر شریفانہ طرزِ عمل کی مذمت فرمائی ہے — اس آیت میں مہر کے لئے ''قنطار'' یعنی ''بہت سارا مال'' کا لفظ فرمایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے؛ اگرچہ استطاعت سے زیادہ مہر مقرر کرنا بہتر نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر کرنی چاہی، تو ایک خاتون نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا اور آپ رضی اللہ عنہ نے رُجوع فرما لیا۔ (السنن الکبری للبیہقي، حدیث نمبر: ۱۴۱۱۴)

﴿۱﴾ یعنی جس عورت کی عصمت سے تم فائدہ اٹھا چکے ہو اور عقد نکاح کے ذریعہ جس سے حسن سلوک کا مضبوط عہد کر چکے ہو، کسی شریف انسان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنا دیا ہوا مہر اس سے واپس لے۔

﴿۲﴾ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے کوئی سوتیلی ماں سے نکاح کر چکا ہو، تو اب بھی وہ نکاح باقی رہے گا؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا، اس کی پکڑ نہ ہوگی۔ (دیکھئے: تفسیر بغوی: ۱/۴۹۹)

﴿۳﴾ یہ مقصد نہیں ہے کہ سوتیلی بیٹی زیر پرورش نہ ہو تو اس سے نکاح حلال ہے؛ بلکہ زیر پرورش کہہ کر ترغیب دینا مقصود ہے کہ ←

← جب کسی مطلّقہ یا بیوہ سے نکاح کرو تو ایسا نہ ہو کہ اس عورت کو تو لے آؤ اور اس کے بے سہارا بچوں کو بوجھ سمجھ کر چھوڑ دو، بہر حال وہ لڑکیاں زیر پرورش ہوں یا نہ ہوں، جب ان کی ماں سے نکاح اور نکاح کے بعد صحبت ہو چکی ہے تو اب وہ اس مرد پر حرام ہیں، اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ (قرطبی: ۱/ ۴۲۲)

﴿۴﴾ گویا بیوی کی ماں —— اور ماں ہی کے حکم میں دادی اور نانی بھی ہیں، —— صرف عقدِ نکاح کی وجہ سے ہی حرام ہو جائیں گی، چاہے صحبت کی نوبت نہ آئی ہو؛ لیکن منکوحہ کی بیٹی اس وقت حرام ہوگی، جب نکاح کے بعد اس سے صحبت بھی ہوگئی ہو، اگر صحبت سے پہلے ہی طلاق کی نوبت آگئی، تو اس کی بیٹی سے نکاح کرنا درست ہوگا، حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔
(دیکھئے: سنن کبریٰ للبیھقی، باب... وامھات نسائکم، حدیث نمبر: ۱۳۹۱۰)

﴿۵﴾ جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے، ان کی حرمت دو قسم کی ہے، عارضی اور دائمی، عارضی حرمت سے مراد یہ ہے کہ فی نفسہٖ اس عورت سے نکاح جائز ہو؛ لیکن کسی وقتی رکاوٹ کی وجہ سے نکاح درست نہ ہو، قرآن نے اس میں سے دو بہنوں کے جمع کرنے کا ذکر کیا ہے، کہ ایک مرد بیک وقت دو بہنوں کو اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا، یہی حکم دو محرم رشتہ دار خواتین کو جمع کرنے کا ہے، جیسے: پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی، حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے، (صحیح البخاري، کتاب النکاح، باب لا تنکح المرأۃ علی عمتھا، حدیث نمبر: ۴۷۱۷) —— جو رشتے دائمی طور پر حرام ہیں، وہ تین طرح کے ہیں: وہ عورتیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہیں، جیسے: ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، اور باپ کی بیوی، ماں ہی کے حکم میں دادی، نانی، اور پورا مادری سلسلہ ہے، بیٹی ہی کے حکم میں نواسی، نواسے اور ان کا سلسلہ ہے، باپ ہی کی طرح دادا، نانا کی منکوحہ بھی حرام ہے —— دوسرے: وہ لوگ ہیں جو "صہر" یعنی سسرالی رشتہ کی وجہ سے حرام ہیں، ان میں بیوی کی ماں، اس کی بیٹی، بہو وغیرہ شامل ہیں، جیسے بیوی کی بیٹی حرام ہے، بیوی کی پوتی اور نواسی کا بھی یہی حکم ہے، اور قرآن نے جو بیٹے کے ساتھ نسبی بیٹے کی قید لگائی ہے، اس سے اشارہ لے پالک کی طرف ہے، اسلام میں لے پالک لینے کا اعتبار نہیں؛ اس لئے لے پالک کی بیوی حرام نہیں ہے، تیسرے: وہ لوگ ہیں جو رضاعت اور دودھ کے رشتہ سے حرام قرار پاتے ہیں، قرآن نے ان میں سے رضاعی ماں اور رضاعی بہنوں کا ذکر کیا ہے، حدیث میں ہے کہ جو رشتے نسب کی وجہ سے حرام قرار پاتے ہیں، رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہیں، یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب، (مسلم، کتاب الرضاعۃ، حدیث نمبر: ۳۵۷۹) اس سے بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں، جن کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

﴿۶﴾ مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے اگر کسی شخص نے محرمات سے نکاح کیا ہو تو چوں کہ اس وقت تک حکم شرعی نازل نہیں ہوا تھا؛ اس لئے وہ معاف ہے؛ مگر جو عورتیں حرام ہیں، ان سے نکاح باقی نہیں رہے گا۔

○ ○ ○

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا تَرٰضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۲۴﴾

اور منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں، سوائے ان عورتوں کے جو تمہاری ملکیت میں آجائیں، ﴿۱﴾ اللہ نے تم پر یہ فرض کیا ہے، اور ان کے سوا تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں؛ بشرطیکہ تم (انھیں) اپنے مال کے ذریعہ نکاح میں لاتے ہوئے حاصل کرو، ﴿۲﴾ نہ کہ بدکاری کرو، پھر تم ان (بیویوں) میں سے جس سے نفع اُٹھاؤ، ﴿۳﴾ تو ان کو ان کا طے شدہ مہر دے دو اور تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ مہر طے ہونے کے بعد تم آپس میں (مہر میں اضافہ یا کمی کی) کسی بات پر رضامند ہو جاؤ، ﴿۴﴾ بے شک اللہ علم والے اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۲۴﴾

﴿۱﴾ یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں، وہ جب تک قانونی طریقہ پر اس کے نکاح سے باہر نہ نکل جائیں اور عدت نہ گذر جائے، کسی دوسرے مرد کے نکاح میں نہیں جاسکتیں، دنیا کی بعض قوموں میں چند شوہری کا تصور پایا جاتا تھا، یعنی ایک عورت بہ یک وقت کئی مردوں کے نکاح میں رہ سکتی تھی، خود عربوں میں بھی اس طرح کے شرم ناک طریقے مروج تھے، جن کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر فرمایا ہے، (بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر: ۵۱۲۷) اسلام کی پاکیزگی اور اس کی لطافت اس غلاظت کو کیوں کر قبول کرسکتی تھی؟ اس لئے اسلام نے نہ صرف منکوحہ عورت سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے؛ بلکہ پہلے شوہر سے علاحدگی کے بعد بھی ایک احتیاطی مدت مقرر کردی ہے کہ اس میں وہ عورت دوسرے مرد کے نکاح میں نہیں جاسکتی، اسی کو ''عدت'' کہتے ہیں، جو منکوحہ عورتوں کے لئے جوان ہو تو تین حیض اور حیض آنا بند ہو گیا ہو یا ابھی شروع ہی نہ ہوا ہو تو تین مہینے ہے اور دوسرے ملک سے گرفتار ہو کر آنے والی باندیوں کے لئے ایک حیض ہے؛ تاکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ وہ اپنے سابق شوہر سے حاملہ نہیں ہیں، اگر کسی دشمن ملک سے جنگ ہو، وہاں عورتیں گرفتار کی جائیں اور باندی بنالی جائیں، تو گو ان کے شوہر دارالحرب میں موجود ہوں؛ لیکن اسلامی مملکت میں ایسی عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے، اسی کو قرآن نے ''اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ'' سے ذکر کیا ہے۔

باندی کے لفظ سے غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے، اگر اسلامی مملکت اور دشمن ملک کے درمیان جنگ چھڑ جائے اور مرد و عورت گرفتار کئے جائیں تو تین صورتیں ہوسکتی ہیں: یا تو قیدیوں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے، یہ صورت سب سے بہتر ہے، اور اس صورت میں غلام و باندی بنانے کا کوئی سوال ہی نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں فریق اسیران جنگ کو تہ تیغ کر دیں، ظاہر ہے کہ یہ بدترین بات ہوگی کہ پُر امن شہریوں کا قتل عام ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ اگر دشمن قیدیوں کے تبادلہ پر آمادہ نہ ہوں تو ان قیدیوں کو قانونی طریقہ پر اپنے ملک میں جذب کر لیا جائے، اسی مقصد کے لئے اسلام نے غلام اور باندی بنانے کی اجازت دی، جو دوسرے مذاہب اور روم و ایران کی حکومتوں میں پہلے سے مروج طریقہ تھا؛ البتہ دوسری قوموں میں غلاموں اور باندیوں ←

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ
مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ
اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ
فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ
لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع ۴

تم میں سے جو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو اُن عورتوں سے نکاح کرلے، جو تمہاری ملکیت میں ہیں، یعنی تمہاری مومن باندیاں، ﴿۱﴾ اور اللہ تمہاری ایمانی حالت سے خوب واقف ہیں، تم آپس میں ایک ہی تو ہو؛ ﴿۲﴾ لہٰذا ان باندیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرلو، اور بھلے طریقے پر اُن کو اُن کا مہر ادا کردو، ہاں وہ پاک دامن ہوں، ﴿۳﴾ نہ علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والیاں، پس اگر وہ قیدِ نکاح میں آجائیں پھر بے حیائی کی مرتکب ہوں تو ان کی بہ مقابلہ آزاد عورتوں کے آدھی سزا ہے، ﴿۴﴾ یہ (باندی سے نکاح کی اجازت) تم میں سے اس شخص کے لئے ہے جو برائی میں پڑنے کا اندیشہ رکھتا ہو، اور تمہارا صبر کرنا تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، ﴿۵﴾ اور اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ ﴿۲۵﴾

← کے کچھ حقوق نہیں ہوتے تھے، اسلام نے ان کے لئے حقوق متعین کئے، مالکان کے اختیارات کو محدود کیا، انھیں بنیادی انسانی حقوق عطا کئے اور حیثیت دی؛ چنانچہ اسلامی تاریخ میں غلام اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے ہیں، علوم وفنون میں انھوں نے بڑا اونچا مقام حاصل کیا اور بعض اوقات حکومتیں تک کیں، جیسے ایجاب وقبول کے ذریعہ مرد وعورت قانونی طور پر رشتۂ نکاح سے منسلک ہوتے ہیں، اسی طرح ایجاب وقبول کے ذریعہ باندیاں خرید کی جاتی تھیں، اور خرید وفروخت کے قانونی طریقۂ کار کے ذریعہ ایک عورت کسی کے حرم میں آتی تھی، اس کے بھی قریب قریب وہی حقوق ہوتے تھے، جو بیویوں کے ہیں، اور اس سے ہونے والی اولاد کے لئے بھی وہی حقوق واحکام ہیں، جو منکوحہ کے ذریعہ ہونے والی اولاد کے لئے ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ مال کے ذریعہ تلاش کرنے سے مراد مہر کے ساتھ نکاح کرنے کے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی نکاح کرکے حلال طریقہ پر نفع اُٹھاؤ۔

﴿۴﴾ یعنی مہر ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے اور پورا مہر ادا کیا جائے، ہاں! اگر دونوں میاں بیوی باہمی رضامندی سے مہر میں کمی، یا اضافہ پر متفق ہوجائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

﴿۱﴾ آزاد عورتوں کے مقابلہ باندیوں کا مہر کم ہوتا تھا، اور رہن سہن کا معیار بھی نسبتاً کمتر ہی رہتا تھا؛ اس لئے فرمایا گیا کہ اگر آزاد عورتوں سے نکاح کی طاقت نہ ہو تو مسلمان باندیوں ہی سے نکاح کرلو۔

﴿۲﴾ مطلب یہ ہے کہ بوقت ضرورت باندیوں سے نکاح میں عار نہ کرنی چاہئے؛ کیوں کہ تم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہو، ←

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ
تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ
مِّنْكُمْ ۫ وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾

اللہ چاہتے ہیں کہ تمہارے لئے کھول کر بیان کر دیں، تم کو تم سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کے طریقہ کی رہنمائی کر دیں، ﴿۱﴾ اور تمہاری توبہ قبول فرمائیں اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں، ﴿٢٦﴾ اللہ چاہتے ہیں کہ تم پر توجہ فرمائیں اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم درست راستہ سے بالکل ہی دور ہو جاؤ ﴿۲﴾ ﴿٢٧﴾ اللہ چاہتے ہیں کہ تم سے بوجھ کو ہلکا کر دیں اور انسان تو کمزور پیدا ہی کیا گیا ہے ﴿۳﴾ ﴿٢٨﴾ اے ایمان والو! آپس میں ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، ﴿۴﴾ سوائے اس کے کہ آپسی رضامندی سے تجارت ہو، ﴿۵﴾ (تو مضائقہ نہیں) نیز اپنا خون نہ کرو، ﴿۶﴾ بے شک اللہ تمہارے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔ ﴿٢٩﴾

← اصل وجہ فضیلت اور باعث عزت دولتِ ایمان ہے، اور ایمان میں کس کا کیا مقام ہے؟ یہ خدا ہی کو معلوم ہے۔

﴿۳﴾ قرآن میں ''محصنٰت'' کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے: منکوحہ عورتیں، آزاد عورتیں اور پاک دامن عورتیں، یہاں یہ تیسرا معنی مناسب حال ہے، بعض حضرات نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور گنجائش اس کی بھی ہے۔

﴿۴﴾ بے حیائی سے زنا مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ باندی اگر زنا کی مرتکب ہو تو جو سزا غیر شادی شدہ آزاد عورت کی ہے، یعنی سو کوڑے، باندی کی سزا اس کا نصف ہوگی، اور اسے پچاس کوڑے لگائے جائیں گے، غلام اور باندی شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، دونوں کی سزا ایک ہی ہے۔

﴿۵﴾ باندی سے نکاح کرنے میں یہ نقصان ہے کہ جو بچے پیدا ہوں گے، غلام ہوں گے، اور جو شخص اس باندی کا مالک ہوگا، وہی ان بچوں کا بھی مالک قرار پائے گا؛ اس لئے جہاں تک ممکن ہو بہتر ہے کہ باندی کو نکاح میں لانے سے بچا جائے۔

﴿۱﴾ یعنی نکاح سے متعلق حرام وحلال کے جو احکام بتائے گئے ہیں، ان کو بوجھ نہ سمجھنا چاہئے کہ تم سے پہلے بھی اللہ کے نیک اور صالح بندے ان ہی اُصولوں پر اپنی زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔

﴿۲﴾ مقصد یہ ہے کہ شہوت پرست اور بندگانِ ہوس اخلاق اور قانون کے دائرہ میں رہنا نہیں چاہتے؛ بلکہ چاہتے ہیں کہ انسان تمام حدوں کو توڑ کر آزاد ہو جائے۔

﴿۳﴾ گویا قانونِ شریعت بوجھ نہیں؛ بلکہ اس میں انسان کی فطری کمزوریوں کی بھرپور رعایت ہے، جب ہی تو نکاح کی نہ صرف اجازت دی گئی؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ ←

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ
تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾
وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ
وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور جو کوئی زیادتی اور ظلم سے ایسا کرے گا، ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈال دیں گے، اور اللہ پر یہ آسان ہے ﴿۳۰﴾ جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے، اگر ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو، تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو معاف کردیں گے،﴿۱﴾ اور تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کریں گے ﴿۳۱﴾ اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کے بارے میں ہوس مت کرو، مردوں نے جو عمل کئے ہیں، وہ ان کا حصہ ہے، اور عورتوں نے جو عمل کئے، وہ ان کا حصہ ہے، ہاں! اللہ سے اس کے فضل و کرم کی التجا کرتے رہو، بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہیں۔﴿۲﴾ ﴿۳۲﴾

← ﴿۴﴾ 'ناحق طریقہ' ایک جامع لفظ ہے، جس میں کسبِ معاش اور حصولِ زر کی وہ تمام صورتیں آگئیں، جن کو قرآن وحدیث میں منع کیا گیا ہے اور فقہاء اُمت نے جن کو تفصیل سے مرتب فرمادیا ہے۔

﴿۵﴾ تجارت کے علاوہ لین دین کی اور بھی جائز صورتیں ہیں، جیسے: عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث وغیرہ؛ لیکن چوں کہ تبادلۂ مال کی سب سے بنیادی اور ہر وقت پیش آنے والی صورت تجارت اور خرید وفروخت کی ہے؛ اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا —— اللہ تعالیٰ کے ارشاد نے واضح کردیا کہ خرید وفروخت میں دونوں فریق کی رضامندی ضروری ہے، کسی فریق کو مجبور کرکے معاملہ طے کرنا درست نہیں؛ چنانچہ فقہاء نے خرید وفروخت اور تمام مالی معاملات کے لئے ایجاب وقبول کو ضروری قرار دیا ہے، جس سے فریقین کی رضامندی کا اظہار ہوتا ہے اور جبر واکراہ کے ساتھ ہونے والی خرید وفروخت کو نامعتبر قرار دیا ہے۔ (الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۴/۳۶۰)

﴿۶﴾ ''لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' میں دو حکم داخل ہیں، ایک: یہ کہ ایک دوسرے کو ناحق قتل نہ کیا جائے کہ اپنے لوگوں کا قتل اپنا ہی قتل ہے، اور دوسرے: خودکشی نہ کی جائے، یہ دونوں ہی صورتیں حرام اور شدید گناہ ہیں۔

﴿۱﴾ یوں تو اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی اللہ کی شان اور اس کے احسانات کے اعتبار سے معمولی نہیں؛ لیکن بعض باتوں سے زیادہ سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، اور بعض باتوں سے منع کرتے ہوئے قرآن وحدیث کا لب ولہجہ اتنا سخت نہیں، اس لحاظ سے گناہ کی دو قسمیں کی گئی ہیں: کبیرہ اور صغیرہ، کبیرہ —— یعنی بڑے گناہ —— وہ ہیں، جن پر کوئی حد مقرر کی گئی ہو یا ان کے بارے میں لعنت منقول ہو، یا جہنم کی وعید آئی ہو، اور جس گناہ میں یہ کیفیت نہ پائی جاتی ہو، وہ صغیرہ یعنی نسبتاً چھوٹا گناہ ہے، تاہم چھوٹے گناہ پر اصرار و دوام کیا جائے، تو وہ بھی کبیرہ ہی کے حکم میں ہے، (دیکھئے: روح المعانی: ۵/۲۷، ودیگر کتب تفسیر وشروح حدیث) اہل علم نے کبیرہ گناہوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کی ہے، اس سلسلہ میں حافظ ابن قیم کی ''کتاب الکبائر'' نہایت اہم ہے، جس کا اُردو ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ ←

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ
نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿٣٣﴾ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ ع ٥ ٨ ٢
اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ
بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ
وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿٣٤﴾

والدین اور قرابت دار جو کچھ چھوڑ جائیں، ان میں سے ہم نے ہر کسی کے لئے وارث مقرر کردیئے ہیں، ﴿١﴾ اور ان لوگوں کے لئے جن سے تمہارا معاہدہ ہوا ہو؛ لہٰذا ان (سب) کو ان کا حصہ دے دو، ﴿٢﴾ بے شک ہر چیز اللہ کے سامنے ہے ﴿٣٣﴾ مرد عورتوں پر نگراں ہیں؛ اس لئے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لئے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ﴿٣﴾ پس! نیک عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار ہیں اور اللہ کی حفاظت سے ﴿٤﴾ مرد کی عدم موجودگی میں (اپنی عزت وآبرو اور مال واولاد کی) حفاظت کرتی ہیں، ﴿٥﴾ اور تم کو جن عورتوں سے نافرمانی کا اندیشہ ہو، ان کو سمجھاؤ، خوابگاہ میں ان سے بے تعلقی برتو، اور ان کو (ہلکے طریقہ پر) مارو، اگر وہ تمہاری فرماں برداری کرنے لگیں تو پھر ان پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش مت کرو، ﴿٦﴾ بے شک اللہ بڑی بلندی اور عظمت والے ہیں۔ ﴿٣٤﴾

← ﴿٢﴾ بعض خواتین کو رشک ہوا کہ مرد جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور ہم عورتیں اس فضیلت سے محروم ہیں، میراث میں بھی مردوں کا حصہ بہ مقابلہ عورتوں کے زیادہ ہے، اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، (ابن کثیرؒ: ١/٥٩٧) مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف ہیں کہ کس میں کیا صلاحیت ہے؟ کس سے کیا ذمہ داریاں متعلق ہونی چاہئیں؟ اور ذمہ داریوں کی نسبت سے کن کے کیا حقوق ہوں گے؟ اس لئے ایسی چیزوں پر حسد نہ ہونا چاہئے، آج پوری دنیا میں عورتوں کی آزادی کے نام پر جو تحریک چلائی جارہی ہے اور عورتوں اور مردوں کو ایک صف میں کھڑا کردینے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ اسی ناسمجھی کا نتیجہ ہے، جب انسان کی تخلیق اللہ نے کی ہے، تو یقیناً اللہ اس بات سے واقف ہیں کہ کس کے کیا فرائض ہونے چاہئیں؟ اس کی رعایت کئے بغیر غیر فطری مساوات پیدا کرنے کی کوشش سے مساوات تو پیدا نہ ہوسکے گا؛ لیکن فطرت سے بغاوت کی سزا انسان کو ضرور ملے گی، مغرب میں خاندانی نظام کا بکھراؤ، ازدواجی زندگی کی بے ثباتی اور قلبی سکون سے محرومی کی جو کیفیت ہے، وہ اسی بغاوت کی سزا ہے۔

﴿١﴾ عربی زبان میں ''مولیٰ'' کا لفظ مختلف معنوں میں آتا ہے، یہاں وارث کا معنی مراد ہے۔

﴿٢﴾ ابتداء اسلام میں ایک طریقہ موالات کا تھا، کہ دو شخص ایک دوسرے سے 'عقد موالات' کرتے، جو ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ایک دوسرے کے وارث بننے کا معاہدہ ہوتا، اسلام میں بھی ابتداءً اس حکم کو باقی رکھا گیا، اور اسی اُصول پر آپ نے ہجرت کے بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان ''بھائی چارہ'' (مواخات) کا رشتہ قائم فرمادیا، اسی سے متعلق یہ حکم ہے، پھر جب میراث کا پورا قانون نازل فرمایا گیا، اور یہ بات متعین کردی گئی کہ میراث کا استحقاق قرابت داری سے متعلق ہوگا تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ ←

← ﴿۳﴾ اس آیت میں قانونِ معاشرت کا ایک بنیادی اُصول بتایا گیا ہے کہ خاندانی نظام کی اساس اس امر پر ہوگی کہ مرد صدرِ خاندان ہوگا، اسی حیثیت سے اس کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی اور اس کے اختیارات بھی ہوں گے، بہ ظاہر اس میں مرد کا اعزاز ہے؛ لیکن درحقیقت یہ مرد کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے، خاندان کی حفاظت، اس کی نگہداشت، اس کی تعلیم و تربیت اور اس کی ضروریات کی کفالت، گویا ساری ذمہ داریاں مرد کے سر ہوں گی، پھر مرد کو صدر خاندان بنانے کی قرآن نے دو وجہ بیان کی ہے، ایک وجہ طبعی ہے، کہ مرد کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی قویٰ، دل و دماغ کی برتر صلاحیت اور قوت فیصلہ کے اعتبار سے عورتوں پر فضیلت دی ہے، اور صدر خاندان وہی ہوسکتا ہے جو قوتِ جسمانی کے اعتبار سے خاندان کے تمام لوگوں کی حفاظت وصیانت پر قادر ہو اور اپنی قوت فیصلہ کے اعتبار سے اہم اُمور میں صحیح رائے قائم کرسکتا ہو، یہ صرف قرآن ہی کی تعلیم نہیں ہے؛ بلکہ پہلی آسمانی کتابوں میں بھی مرد کی اِس حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے، خود بائبل نے مرد کو عورت پر حاکم (پیدائش: ۱۶/۳) قرار دیا ہے، اور بیویوں کو خدا کی طرح شوہروں کی تابع دار رہنے کی تلقین کی ہے، (افسیوں: ۵: ۲۲: ۲۴) دوسری وجہ مالی ہے، کہ تمام مالی ذمہ داریاں مرد کو ادا کرنی پڑتی ہیں، —— موجودہ مغربی تصور مساوات کہ کوئی صدر خاندان نہ ہو، اور مرد و عورت دونوں برابر ہوں، خاندانی نظام کو برباد کردینے والی فکر ہے، اور سماج کے لئے سخت نقصان دہ ہے، مغرب کا موجودہ معاشرہ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔

﴿۴﴾ ''اللہ کی حفاظت'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی توفیق ہی سے وہ اپنی حفاظت کرتی ہیں۔

﴿۵﴾ یہاں نیک بیوی کے لئے بنیادی طور پر دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں، اول: جائز اُمور میں شوہر کی اطاعت وفرماں برداری، دوسرے: حفاظت ونگہداشت، حفاظت میں شوہر کے مال اور اس کی اولاد کی حفاظت وصیانت بھی داخل ہے اور شوہر کے لئے اپنی عزت وآبرو کی حفاظت بھی۔

﴿۶﴾ اگر بیوی واقعی نافرمانی پر آمادہ ہو اور ایسی باتوں میں شوہر کی عدول حکمی کرتی ہو، جن میں شرعاً شوہر کی اطاعت واجب ہے، تو یہ درست نہیں کہ پہلے ہی مرحلہ میں طلاق کی راہ اختیار کی جائے؛ بلکہ ضروری ہے کہ پہلے اصلاح و مفاہمت کے ذرائع استعمال کئے جائیں؛ لیکن اگر کوئی شخص مفاہمت واصلاح کی کوششوں کے بغیر طلاق دے ہی دے، تو طلاق پڑ جائے گی، ان مرحلوں سے گذرنا طلاق کے لئے شرط کے درجہ میں نہیں ہے، اصلاح ومفاہمت کے بنیادی ذرائع تین ہیں :

اول: محبت اور نرمی سے پند ونصیحت، یہ کافی نہ ہو اور زبان سے کام نہ چلے تو چند دنوں ہم بستری ترک کردی جائے، اسی کو قرآن میں 'هجر فى المضاجع' کہا گیا ہے، ''ہجر'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو اس کے میکہ پہنچا دیا جائے، یا گھر سے باہر کردیا جائے؛ بلکہ اپنے گھر اور اپنے کمرہ میں رکھتے ہوئے صرف چند دنوں میاں بیوی کا مخصوص تعلق نہ رکھنا مراد ہے، اگر اس سے بھی اصلاح نہ ہو پائے تو اللہ تعالیٰ نے معمولی مار پیٹ کی بھی اجازت دی ہے، گو بیوی پر ہاتھ اٹھانا اچھی بات نہیں ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو بہت ہی مذموم عمل قرار دیا ہے؛ لیکن تعلقات کے ابتر ہوجانے اور طلاق کی نوبت آنے سے بہتر ہے کہ معمولی سرزنش سے کام چل جائے؛ البتہ اس سرزنش میں بھی دو باتوں کی رعایت ضروری ہے، اول یہ کہ عورت سے واقعی کوئی قابل سرزنش فعل واقع ہوا ہو، دوسرے: سرزنش بہت ہی معمولی ہو، تکلیف دِہ نہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے (سنن ترمذی، ابواب الرضاع، حدیث نمبر: ۱۱۶۳) یعنی جسم پر ورم نہ آئے، نشان نہ پڑے، اہانت آمیز انداز نہ ہو؛ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مسواک اور اس جیسی چیز سے معمولی طریقہ پر مار سکتا ہے، (تفسیر قرطبی: ۴۳۸/۱) گویا مقصود مارنا نہیں ہے؛ بلکہ احساس دلانا ہے کہ اس کی سرزنش کی گئی ہے —— اگر ان تدابیر سے بیوی کے رویہ میں تبدیلی آجائے، تو پھر خواہ مخواہ اس کے پیچھے بھی نہیں پڑ جانا چاہئے۔

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِہِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ
اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا ﴿۳۵﴾ وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ
شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی
وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا
یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ﴿۳۶﴾ۙ

اور اگر تم کو آپس میں نزاع کا اندیشہ ہو، تو مرد کے لوگوں میں سے ایک پنچ اور عورت کے لوگوں میں سے ایک پنچ مقرر کردو، اگر یہ دونوں صلح کرانا چاہیں گے، تو اللہ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کردیں گے، بے شک اللہ خوب جاننے والے اور باخبر ہیں ﴿۱﴾﴿۳۵﴾ اور اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں باپ، ﴿۲﴾ رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، ﴿۳﴾ پاس بیٹھنے والے، ﴿۴﴾ مسافر اور غلام باندیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، بے شک اللہ اِترانے والوں اور شیخی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۵﴾﴿۳۶﴾

﴿۱﴾ اگر ان تدبیروں سے کام نہ چلے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب معاملہ اس حد میں پہنچ چکا ہے کہ خود زوجین آپس میں اس کو حل کرنے سے قاصر ہیں، اور خاندان اور سماج کے بزرگوں کی مداخلت ضروری ہوگئی ہے؛ لہٰذا اس آیت میں دونوں خاندان کے بزرگوں کو خطاب ہے کہ اگر اختلاف شدید ہوجائے اور آپس میں نزاع کا حل ہونا دشوار ہو تو دونوں طرف سے ایک ایک سمجھ دار اور مخلص حَکَم متعین ہوں، جو حتی المقدور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اگر وہ نیک نیتی کے ساتھ ایسی کوشش کریں گے تو ضرور اللہ تعالیٰ دونوں میں ہم آہنگی کی صورت پیدا کردیں گے، اکثر فقہاء کے نزدیک حَکَم بہ طورِ خود میاں بیوی میں علاحدگی کا فیصلہ نہیں کرسکتے؛ لیکن مالکیہ کے نزدیک اگر زوجین کے درمیان ایسی نفرت ہو کہ باہم خوشگواری کے ساتھ زندگی بسر کرنا دشوار ہو تو حَکَم ان کے درمیان خلع کا فیصلہ کرسکتے ہیں کہ بیوی کی طرف سے واجبات معاف کردیئے جائیں اور شوہر کی طرف سے طلاق دے دی جائے۔

﴿۲﴾ 'توحید' کے ساتھ ہی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کرکے والدین کے حقوق کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

﴿۳﴾ پڑوسی اور ہمسایہ کی قرآن نے دو قسمیں ذکر کی ہیں، ایک ''جارِ ذی القربیٰ'' دوسرے ''جارِ جنب'' —— 'جارِ ذی القربیٰ' سے یا تو وہ پڑوسی مراد ہے جو مکان سے متصل ہو، اور اس کے مقابلہ 'جارِ جنب' سے وہ پڑوسی، جو کچھ فاصلہ پر رہتا ہو، یا 'جارِ ذی القربیٰ' سے ایسا پڑوسی مراد ہے جو رشتہ دار بھی ہو، اور 'جارِ جنب' سے وہ پڑوسی جو رشتہ دار نہ ہو، بہر حال پڑوسی جس نوعیت کا بھی ہو، رشتہ دار یا اجنبی، قریب یا دور، مسلمان یا غیر مسلم، حسن سلوک کا مستحق ہے۔

﴿۴﴾ یعنی وہ لوگ جن کا وقتی طور پر ساتھ ہوگیا ہو، جیسے: دفاتر اور آفسوں میں، بسوں، ٹرینوں اور جہاز وغیرہ میں، یا کسی جلسہ یا اجتماع میں، ان کی رعایت بھی ضروری ہے۔

﴿۵﴾ ''مختال'' اور ''فخور'' دونوں کے معنی تکبر کرنے والے کے ہیں، دوسروں کے حقوق سے بے اعتنائی کا بنیادی سبب یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی بڑائی کے احساس میں دوسروں کی پرواہ نہیں کرتا؛ اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ
وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۳۷ وَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ۳۸ وَ مَا
ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ۳۹ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا
عَظِيْمًا ۴۰ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۴۱ وقف النبی ﷺ

(یہ وہ لوگ ہیں) جو خود بخل کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہیں، نیز اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ اُن کو عطا فرمایا ہے، اسے چُھپا کر رکھتے ہیں اور ہم نے (ایسے) کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ۳۷ اور ان لوگوں کے لئے بھی جو اپنے مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں، ﴿۱﴾ اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور شیطان جس کا ساتھی ہے، تو وہ بدترین ہم نشیں ہے ۳۸ اگر وہ اللہ پر اور آخرت پر ایمان لے آتے، اور اللہ نے ان کو جو کچھ عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے تو ان کا کیا نقصان ہو جاتا؟ اور اللہ ان سے خوب واقف ہیں ۳۹ بے شک اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتے، اگر ایک نیکی ہو تو اس کو کئی گنا کر دیتے ہیں، اور (مزید) اور اپنے پاس سے بڑا ثواب عطا فرماتے ہیں ۴۰ پھر جب ہم ہر اُمت میں سے گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے لائیں گے، تو ان کا کیا حال ہوگا؟ ﴿۲﴾ ۴۱ ؕ

﴿۱﴾ تنگ دل لوگوں میں نفسیاتی طور پر دو کمزوریاں خصوصیت سے پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ بخل خرچ کرنے میں مانع ہو جاتا ہے، دوسرے: اگر کبھی خرچ کرے تو اللہ کو راضی کرنے اور اپنے غریب بھائی کی مدد کرنے کی بجائے نمائش اور دکھاوے کے جذبہ سے خرچ کرتا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی ہر اُمت پر ان کے نبی بہ طور گواہ پیش ہوں گے، اور ان پیغمبروں پر رسول اللہ ﷺ گواہ بنائے جائیں گے، پھر مجرمین کی بابت سزا کا فیصلہ ہوگا، گویا آپ ﷺ کو آخری گواہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے گا، اس میں آپ ﷺ کے آخری نبی ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے، اگر آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی اور اس اُمت کے بعد کوئی اور اُمت کا وجود متوقع ہوتا تو ضرور تھا کہ قرآن نے اس کا بھی ذکر کیا ہوتا، —— آپ ﷺ کا اُمت کے اعمال پر گواہی دینا اس بنیاد پر ہوگا کہ اُمت کے اعمال آپ ﷺ پر پیش کئے جائیں گے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، کہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا صرف اللہ کی صفت ہے، فقہاء نے بھی اس صفت میں اللہ کے ساتھ رسول کے شریک کرنے کو شرک قرار دیا ہے۔ (خلاصۃ الفتاویٰ: ۴/۱۵)

يَوۡمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَعَصَوُا الرَّسُوۡلَ لَوۡ تُسَوّٰى بِهِمُ الۡاَرۡضُؕ وَلَا يَكۡتُمُوۡنَ اللّٰهَ
ع ۶ حَدِيۡثًا ﴿۴۲﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡتُمۡ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىۡ سَبِيۡلٍ حَتّٰى تَغۡتَسِلُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ
مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا
فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۴۳﴾

جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور رسول کی نافرمانی کی ہوگی، وہ اس دن آرزو کریں گے کہ کاش ان پر زمین کو برابر کردیا جاتا اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے ﴿۱﴾ ﴿۴۲﴾ اے ایمان والو! جب تک نشہ کی حالت میں رہو، نماز کے قریب بھی نہ جاؤ؛ یہاں تک کہ جو منھ سے کہتے ہو، اُسے سمجھنے لگو، ﴿۲﴾ اور حالت جنابت میں بھی نہیں، یہاں تک کہ غسل کرلو، سوائے اس کے کہ مسافر ہو، ﴿۳﴾ اور اگر تم مریض یا مسافر ہو، یا تم میں سے کوئی شخص قضاء حاجت کر کے آیا ہو، یا تم نے بیویوں سے ہم بستری کی ہو، پھر پانی میسر نہ ہو تو پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو، اس طرح کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرلو، ﴿۴﴾ بے شک اللہ بڑے معاف کرنے والے اور بہت بخشنے والے ہیں۔ ﴿۴۳﴾

﴿۱﴾ کیوں کہ اس دن انسان کے تمام اعضاء خود بولنے لگیں گے اور جسم کا ایک ایک عضو گواہی دے گا کہ اس شخص نے اس کا کس کس طرح غلط اور ناروا استعمال کیا ہے؟ قرآن نے ایک اور موقع پر نقل کیا ہے کہ کفار وہاں بھی جھوٹ بولنے سے گریز نہ کریں گے اور کہیں گے: واللہ ربنا ما کنا مشرکین، (الانعام: ۲۳) ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ابتداءً کفار ومشرکین وہاں بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کریں گے؛ لیکن جب اعضاء انسانی خود اُن کا حال بیان کرنے لگیں گے، تو پھر وہ سچائی کے اعتراف کے سوا چارہ نہ پائیں گے۔ (یٰسین: ۶۵)

﴿۲﴾ یعنی نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے، جب نشہ اتر جائے اور انسان خود اپنی گفتگو کا معنی ومقصود سمجھنے لگے، تب نماز میں شریک ہو، دراصل یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما نے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو مدعو کیا؛ چوں کہ شراب حلال تھی، اس لئے شراب کا بھی انتظام تھا، لوگ کھا پی کر فارغ ہوئے تو مغرب کا وقت ہوگیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا، انھوں نے نماز میں 'قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ' کی تلاوت کی اور ایسی غلطی ہوگئی کہ معنی بالکل ہی بدل گیا، اسی موقعہ سے یہ آیت نازل ہوئی، (سنن ابی داؤد، باب تحریم الخمر، حدیث نمبر: ۳۶۷۱) اس وقت تک صرف نماز کے وقت شراب کی ممانعت تھی، بعد کو سورۂ مائدہ کی آیت نمبر: ۹۰ نازل ہوئی، جس کے بعد مکمل طور پر شراب حرام کردی گئی، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی اور وجہ سے مثلاً نیند وغیرہ کے سبب ایسی صورت پیدا ہوجائے کہ آدمی کو اپنی زبان پر قابو نہ رہے، تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنے سے گریز کرنا چاہئے۔

﴿۳﴾ یعنی جب آدمی کو غسل کی ضرورت ہو تو جب تک غسل نہ کرلے نماز نہ پڑھے؛ البتہ اس سے مسافر کو مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ ←

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يَشۡتَرُوۡنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَضِلُّوا
السَّبِيۡلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاَعۡدَآئِكُمۡ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيۡرًا ﴿۴۵﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن کو کتاب (الٰہی) کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ ﴿۱﴾ (پھر بھی) وہ گمراہی اختیار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ تم لوگ بھی گمراہ ہوجاؤ ﴿۴۴﴾ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہیں، اللہ کی حمایت کافی ہے اور اللہ ہی کا مددگار رہونا بس ہے۔ ﴿۴۵﴾

← اگر مسافر کو پانی میسر نہ ہو تو اس پر غسل ضروری نہیں، تیمم کافی ہے، جیسا کہ آیت کے اگلے فقرہ سے واضح ہے۔

﴿۴﴾ اس جملہ میں پاکی سے متعلق چھ احکام کی ہدایت فرمائی گئی ہے، اول یہ کہ اگر کوئی شخص بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال نہیں کرسکتا ہو، خواہ اس لئے کہ پانی کے استعمال سے اس کا مرض بڑھ جائے گا، یا صحت میں تاخیر ہوجائے گی، یا اس لئے کہ پانی کے استعمال ہی سے وہ عاجز ہو، جیسے مفلوج ہو اور کوئی پانی دینے اور غسل کرانے والا موجود نہ ہو، تو اس کے لئے تیمم کرنا درست ہے، (بدائع الصنائع: ۱/۱۷۱) دوسرے: مسافر ہونے کی وجہ سے پانی میسر نہ ہو، گو صحت مند ہو، اس کے لئے بھی تیمم جائز ہے، تیسرے: تیمم وضو کا نائب ہے، اگر کوئی شخص پیشاب پائخانہ سے آیا ہو، یا کسی اور وجہ سے وضو ٹوٹ گیا ہو اور پانی موجود نہ ہو یا اس کے استعمال پر قادر نہ ہو تو وضوء کی جگہ تیمم کافی ہے، چوتھے: ان ہی اعذار کی بنا پر غسل کی جگہ بھی تیمم کافی ہوجاتا ہے، پس اگر کسی شخص نے ہم بستری کی، یا کسی مرد یا عورت کو غسل کا کوئی اور سبب پیش آگیا، تو وہ بھی تیمم کرسکتا ہے، پانچویں: تیمم پاک زمین پر کیا جائے گا، زمین (ارض) میں وہ تمام اجزاء شامل ہیں، جو سطح زمین پر پائے جاتے ہیں، جیسے مٹی، پتھر، ریت وغیرہ، فقہاء نے اس کی علامت یہ بتائی ہے کہ اگر اسے جلایا جائے تو نہ راکھ ہوجائے، جیسے لکڑی، اور نہ پگھل جائے، جیسے سونا اور لوہا، (بدائع الصنائع: ۱/۱۸۱) چھٹے: تیمم کا طریقہ بتایا گیا کہ تیمم میں چہرے اور ہاتھوں کا مسح کیا جائے گا، ''چہرے'' سے مراد پیشانی کی جڑ سے ٹھوڑی سے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک کا حصہ ہے، اور ہاتھوں سے کہنیوں سمیت ہاتھوں کا مسح مراد ہے، (بدائع الصنائع: ۱/۱۶۸) اور اس سلسلہ میں صریح اور صحیح حدیثیں وارد ہیں؛ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک ضرب چہرہ کے لئے لگائی جائے گی اور ایک ضرب کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کے لئے، (دار قطنی: ۱/۱۸۱، حدیث نمبر: ۲۲، باب التیمم) نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تیمم کے لئے دو ضرب ہے، ایک چہرہ کے لئے اور ایک کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کے لئے، (مستدرک حاکم: ۱/۱۷۹، دار قطنی: ۱/۱۸۰) —— اس اُمت پر اللہ کے احسانات میں سے یہ بھی عظیم احسان ہے کہ پانی میسر نہ ہو تو مٹی کو کافی قرار دیا گیا؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اُمتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے یہ بھی شمار کرایا کہ ہمارے لئے پورے روئے ارض کو طہارت کا ذریعہ اور نماز کی جگہ بنادیا گیا ہے۔ (بخاری، عن جابر، کتاب التیمم، حدیث نمبر: ۳۲۸)

﴿۱﴾ کچھ حصہ سے تورات یا تورات کا بعض حصہ مراد ہے؛ کیوں کہ تورات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا جو ذکر ہے وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

بعض یہودی الفاظ کو اپنے موقع ومحل سے ہٹادیتے ہیں،﴿۱﴾ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے (آپ کی بات) سنی؛ (لیکن) مانیں گے نہیں، اور کہتے ہیں کہ (بری بات) سنو، (تم کو اچھی بات) نہ سنائی جائے، اپنی زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین میں عیب لگانے کی غرض سے ''راعنا'' کہتے ہیں،﴿۲﴾ اگر وہ کہتے: ''ہم نے سنا اور مانا'' اور کہتے: ''سنئے'' نیز کہتے: ''انظرنا'' (ہم پر توجہ فرمائیے) تو ان کے لئے بہتر اور درست ہوتا؛﴿۳﴾ لیکن اُن پر اُن کے کفر کی وجہ سے اللہ کی لعنت ہے، چند لوگوں کے ماسوا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔﴿۴۶﴾

﴿۱﴾ یہاں یہودیوں کی ایک اور برائی کا ذکر ہے کہ وہ اللہ کے کلام میں تحریف کردیتے ہیں، بعض مفسرین نے اس میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف مراد لی ہے، لفظی تحریف سے مراد یہ ہے کہ کتابِ الٰہی کے الفاظ ہی بدل دیئے جائیں، اور تحریف معنوی یہ ہے کہ لفظ کو باقی رکھتے ہوئے منشاء ومراد کو بدل دیا جائے، امام طبری وقرطبی وغیرہ کا خیال ہے کہ یہاں معنوی تحریف مراد ہے، (تفسیر طبری: ۲/۷۵،۴ قرطبی: ۱/۵۲،۴) اور سورۂ مائدہ آیت نمبر: ۴۵ میں لفظی تحریف، بہرحال یہود دونوں ہی طرح کی تحریف کرتے تھے، قرآن میں لفظی تحریف کی تو گنجائش نہیں رہی؛ مگر ملحدین، معجزات کے منکرین اور بدعات کے مؤیدین نے معنوی تحریف کی کوشش کی ہے اور کررہے ہیں، لیکن اللہ ہر دور میں اہل علم کی ایک ایسی جماعت کو پیدا فرماتے رہے ہیں، جو ان گمراہیوں کا پردہ چاک کرکے حق اور سچائی کو بے غبار طریقہ پر انسانیت کے سامنے پیش کرتے رہیں۔

﴿۲﴾ اس آیت میں یہودیوں کی بعض خسیس حرکتوں کا ذکر ہے، یہ مسلمانوں کے خوف سے کھل کر تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں بدزبانی کی ہمت نہ کرتے تھے؛ لیکن دل میں چھپا ہوا عناد مختلف صورتوں میں زبان پر آجاتا تھا، ان ہی میں سے یہ ہے کہ جب آپ کوئی بات فرماتے تو کہتے ''سمعنا و عصینا''، یعنی ہم نے آپ کی بات قبول کی اور آپ کے مخالفین کا قول نہیں مانا'؛ لیکن مراد لیتے کہ ہم نے آپ کی بات سنی مگر نہ مانی، اسی طرح آپ سے کہتے ''إسمع غیر مسمع'' اس کے لغوی معنی ہیں کہ آپ سنیں؛ لیکن آپ کو سنایا نہ جائے، عربی زبان میں یہ دُعائیہ لفظ تھا، جس کا معنی یہ ہوتا تھا کہ اچھی خبر سنیں، کوئی بری خبر آپ کو سنائی نہ جائے؛ لیکن یہود اس لفظ سے خراب معنی مراد لیتے، کہ آپ کو کوئی اچھی بات سنائی نہ دے، اسی طرح آپ کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے ''راعنا'' کہتے، ''راعنا'' کے اصل معنی ہیں: ہمارا خیال کیجئے؛ لیکن اگر 'ع' کو ذرا کھینچ کر کہا جائے، تو یہ یہودیوں کے یہاں ایک گستاخ لفظ سمجھا جاتا تھا اور خود عربوں میں اس کے معنی ''اے ہمارے چرواہے!'' کے ہوتے تھے، گویا یہ تحقیر آمیز لفظ بن جاتا تھا —— یعنی بظاہر الفاظ اچھے ہیں؛ لیکن معنی غلط مراد لیتے ہیں اور اس سے ان کا مقصود دین پر اعتراض کرنا ہے کہ پیغمبر اسلام نبی برحق ہوتے تو ضرور ہماری ان حرکتوں سے باخبر ہوجاتے۔

﴿۳﴾ مسلمانوں کو متوجہ فرمایا گیا کہ ایسے مشکوک اور دو معنی رکھنے والے الفاظ استعمال نہ کرنا چاہئے؛ بلکہ ''سمعنا و عصینا'' ←

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ
وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ
مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّشْرِكْ
بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ
مَنْ يَّشَآءُ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

اے وہ لوگو! جنھیں کتاب دی گئی ہے، اِس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کی ہے، یہ اُس کتاب کی تصدیق کرتی ہے، جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم تمہارے چہروں کو مٹا ڈالیں اور اُنھیں اُن کی اُلٹی جانب کی طرح بنادیں، یا ہم اُن پر ویسی ہی لعنت کریں جیسی ہفتے والوں پر کی تھی، ﴿۱﴾ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے ﴿۴۷﴾ بے شک اللہ اپنے ساتھ شرک کو معاف نہیں کریں گے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہیں معاف کردیں گے، ﴿۲﴾ اور جس شخص نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا، اُس نے بڑا بہتان باندھا ﴿۴۸﴾ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مقدس قرار دیتے ہیں؛ بلکہ اللہ جسے چاہیں مقدس بنادیں اور اُن پر ایک دھاگہ کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ ﴿۳﴾ ﴿۴۹﴾

← کی جگہ ''سمعنا و اطعنا'' (ہم نے سنا اور مانا)، ''إسمع غير مسمع'' کی جگہ صرف ''إسمع'' (سنئے) اور ''راعنا'' کی بجائے ''انظرنا'' (ہماری رعایت فرمائیے) کہنا بہتر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دوسری قومیں اگر ایسے الفاظ استعمال کریں، جن کے گو درست معنی بھی ہوں؛ لیکن وہ اسے کسی غیر اسلامی فکر کی ترجمانی کے لئے بھی کہا کرتے ہوں، تو ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہئے۔

﴿۱﴾ یعنی جیسے کچھ یہودیوں نے ''ہفتہ'' کے دن کے احترام سے متعلق حکم الٰہی کی نافرمانی کی اور حیلہ بہانہ سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتیں مسخ کردیں اور وہ بندر بنادیئے گئے، اسی طرح اگر تم قرآن پر ایمان نہ لاؤ تو ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری بھی صورتیں مسخ کردیں کہ تمہارے چہرے سے آنکھ ناک وغیرہ مٹادیئے جائیں اور سر کے پچھلے حصہ کی طرح سپاٹ بنادیا جائے، اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ چہرہ کو پیچھے کی طرف کردیا جائے اور پیچھے کا حصہ آگے کی طرف، دونوں مطلب اہل علم نے لئے ہیں اور دونوں طریقہ پر ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی شرک ناقابل عفو گناہ ہے، باقی دوسرے گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے معاف فرمادیں۔

﴿۳﴾ یہودی اپنے آپ کو اللہ کا مقبول اور خاص بندہ قرار دیتے تھے، یہاں اسی کی تردید ہے اور یہ بات بھی واضح فرمادی گئی ہے کہ یہودیوں پر جو عذاب ہوگا، اس میں ناانصافی کا کوئی دخل نہ ہوگا؛ بلکہ یہ ان ہی کی بداعمالیوں کی سزا ہوگی۔

ع ۸
اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا
نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ
اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿ؕ۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿ۙ۵۳﴾ اَمْ
يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ
وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى
بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

دیکھئے کہ کس طرح وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور یہی کافی ہے کھلے ہوئے گناہ کے لئے ! ﴿۱﴾ ﴿۵۰﴾ آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جن کو کتاب (الٰہی) کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ بتوں پر اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ زیادہ راہ راست پر ہیں ﴿۵۱﴾ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو، ممکن نہیں کہ آپ اس کے لئے کوئی مددگار پائیں ﴿۵۲﴾ کیا ان کے لئے سلطنت میں کچھ حصہ ہے؟ پھر تو وہ لوگوں کو ایک تِل ﴿۲﴾ برابر بھی نہ دیں ﴿۵۳﴾ یا وہ لوگوں پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے حصہ عطا فرمایا ہے؟ تو ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب وحکمت سے نوازا ہی تھا، اور ہم نے ان کو بڑی حکومت بھی دی تھی ﴿۳﴾ ﴿۵۴﴾ پھر ان میں سے کچھ لوگ تو ایمان لائے اور کچھ لوگ ایمان لانے سے رُکے رہے اور (ان کے لئے) دہکتی ہوئی دوزخ کافی ہے۔ ﴿۵۵﴾

﴿۱﴾ یعنی وہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک وصاف سمجھتے ہیں؛ لیکن یہ دروغ گوئی ہی اتنا بڑا گناہ ہے کہ ان کے اس دعویٰ کی تکذیب وتردید کے لئے کافی ہے۔

﴿۲﴾ کھجور کی گٹھلی میں جو شگاف ہوتا ہے، عربی زبان میں اس کو ''نقیر'' کہتے ہیں، عربی زبان میں یہ لفظ معمولی اور حقیر مقدار کو بتانے کے لئے بولا جاتا ہے، اُردو زبان میں چوں کہ معمولی مقدار کے لئے ''تِل'' اور ''رائی'' وغیرہ کا لفظ بولا جاتا ہے، اس لئے شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تل برابر سے ترجمہ فرمایا ہے، یہی ترجمہ لیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ یہودیوں کو جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کا پورا پورا یقین تھا؛ لیکن عرب جو بنو اسماعیل تھے، ان کے بارے میں وہ حسد میں مبتلا تھے کہ نبوت اس خاندان میں کیوں چلی گئی؟ —— قرآن مجید نے اسی کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور حکومت کا وعدہ ابراہیم کی اولاد کے لئے فرمایا تھا اور اولاد ابراہیم میں بنو اسحاق بھی ہیں اور بنو اسماعیل بھی؛ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں، آیت میں ''فضل'' سے شرفِ نبوت ہی مراد ہے، (تفسیر طبری: ۲/ ۴۸۴) قرآن مجید نے دوسرے موقع پر بھی نبوت کو اللہ تعالیٰ کا فضل خاص قرار دیا ہے۔ (آلِ عمران: ۷۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا
غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ
اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا
وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع ۸ ۵

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا یقیناً، عنقریب ہم ان کو (دوزخ کی) آگ میں ڈال دیں گے، جب جب ان کے چمڑے گل جائیں گے، ہم اُن کے بدلہ اُن پر دوسرے چمڑے پیدا کردیں گے؛ تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں، ﴿۱﴾ بے شک اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے، عنقریب ہم ان کو ایسی بہشتوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی بہشت میں رہیں گے، اس میں ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی، ﴿۲﴾ اور ہم ان کو گھنے سایہ میں داخل کریں گے ﴿۵۷﴾ بے شک اللہ تم کو حکم دیتے ہیں کہ امانتیں امانت والوں کو حوالہ کردو، ﴿۳﴾ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کرو، بے شک اللہ تم کو بڑی ہی اچھی بات کی نصیحت کرتے ہیں، یقیناً اللہ خوب سننے اور خوب دیکھنے والے ہیں ﴿۵۸﴾ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے ذمہ داروں کی بھی، پھر اگر کسی بات میں تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہوجائے تو اگر تم (واقعی) اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹادو، ﴿۴﴾ یہ بہتر اور انجام کے اعتبار سے اچھا ہے۔ ﴿۵﴾ ﴿۵۹﴾

﴿۱﴾ جدید میڈیکل تحقیق یہ ہے کہ انسان کے جسم کو جو تکلیف پہنچتی ہے، اس کو محسوس کرنے کی صلاحیت اصل میں جسم کے چمڑوں میں ہوتی ہے نہ کہ گوشت میں، اس پس منظر میں قرآن کریم کی یہ آیت ایمان کو تازہ کرتی ہے کہ یہاں عذاب کو چکھنے اور تکلیف کو محسوس کرنے کی نسبت چمڑوں ہی کی طرف کی گئی ہے؛ اگرچہ قرآن کا اصل موضوع انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی ہے؛ لیکن جہاں کہیں اس نے کائنات کی کسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، حیرت انگیز طور پر وہ اس کے مطابق ہے، جہاں سائنسداں علم وتحقیق کا طویل سفر کرکے پہنچے ہیں۔

﴿۲﴾ وہ حیض ونفاس، پیشاب و پائخانہ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔

←

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ
يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝۶۰ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ
الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ آپ پر اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں؛ (لیکن) چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمات غیر اللہ ﴿۱﴾ کے پاس لے جائیں؛ حالاں کہ انھیں حکم دیا گیا تھا کہ اس (طاغوت) کے مقابلہ انکار کا رویہ اختیار کریں اور شیطان چاہتا ہی ہے کہ ان کو راہِ راست سے خوب دور ہٹادے ۝۶۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے اتارے ہوئے حکم کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو آپ منافقین کو دیکھیں گے کہ وہ آپ سے بہت ہی گریز اختیار کریں گے۔ ﴿۲﴾ ۝۶۱

← ﴿۳﴾ مشہور مفسر علامہ قرطبی کے بہ قول یہ قرآن مجید کے جامع ترین احکام میں سے ہے، اور پورے دین اور پوری شریعت کو شامل ہے، (۵/ ۲۵۵) امانت کی ادائیگی میں تمام واجبات کی ادائیگی شامل ہے، مالی ہوں یا غیر مالی، اللہ کے حقوق ہوں یا بندوں کے، دوستوں کے یا دشمنوں کے، مسلمانوں کے یا غیر مسلموں کے، یہاں تک کہ حیوانات اور اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات کے۔

﴿۴﴾ اللہ کی طرف لوٹانا کتاب اللہ کی طرف لوٹانا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد رسول کی طرف لوٹانے سے مراد سنت رسول ﷺ کی طرف لوٹانا ہے، گویا اصل کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت اور دلیل ہے، اسی طرح حدیثِ رسول ﷺ بھی حجت اور دلیل ہے۔

﴿۵﴾ ''تاویل'' کے معنی تحقیق وتوجیہ کے بھی ہیں اور انجام وعاقبت کے بھی، ترجمہ کرنے والوں نے دونوں طرح ترجمہ کیا ہے، شاہ عبدالقادر صاحب نے پہلا معنی ملحوظ رکھا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے ''عاقبت'' سے ترجمہ کیا ہے، اسی ترجمہ کو راقم نے لیا ہے۔

﴿۱﴾ خدا کے سوا جس کی بھی عبادت کی جائے، خواہ وہ انسان ہو یا جنات یا کوئی اور چیز، طاغوت ہے، حلال وحرام کرنا اور جائز وناجائز قرار دینا اللہ ہی کا حق ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کو حلال وحرام کرنے کا حقدار سمجھتا ہے اور قانون کی لگام اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے تو وہ طاغوت ہے، اس طرح مسلمانوں کے لئے کسی بھی ملک میں اختیار ورضامندی سے غیر شرعی قوانین کو رغبت کے ساتھ قبول کرلینا طاغوت کی اطاعت ہے۔

﴿۲﴾ ان آیات میں منافقین کے رویہ کا ذکر ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں ایمان کا؛ لیکن جب اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم ان کے مفادات اور خواہشات کے خلاف پڑتا ہے تو اللہ رسول کو چھوڑ، دوسروں کے پاس اپنے مسائل لے کر پہنچتے ہیں، اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں مختلف روایات ہیں، اسود رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ دو شخص آپ ﷺ کے پاس مقدمہ لے کر آئے، آپ ﷺ نے فیصلہ فرمادیا، فیصلہ جس کے خلاف ہوا، اس نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کرانا چاہئے؛ چنانچہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ←

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ
اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا
اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

پھر کیا حال ہوگا ، جب اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آپڑے گی ؟ اُس وقت آپ کے پاس اللہ کی قسم کھاتے ہوئے آئیں گے کہ ہمارا ارادہ تو محض بھلائی اور میل ملاپ کا تھا «۱» ﴿۶۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، اللہ اسے خوب جانتے ہیں، آپ ان سے چشم پوشی کیجئے ، ان کو نصیحت کیجئے اور آپ ان سے ان کے بارے میں مؤثر بات کہئے «۲» ﴿۶۳﴾ اور ہم نے ہر رسول کو بھیجا ہی اسی لئے ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے «۳» اور جب ان لوگوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آجاتے ، پھر وہ بھی اللہ سے مغفرت چاہتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش کی دُعاء کرتے تو وہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت ہی مہربان پاتے ۔ ﴿۶۴﴾

← پاس پہنچے، جب آپ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو اس کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو، اس کے لئے یہی فیصلہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی خوں بہا بھی نہیں دلوایا، (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۹۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ برزہ اسلمی کاہن تھا، جو یہودیوں کے درمیان فیصلے کرتا تھا، کچھ مسلمان بھی اپنا معاملہ ان کے پاس لے گئے، اسی سلسلہ میں آیت نازل ہوئی، (مجمع الزوائد: ۷/ ۹، حدیث نمبر: ۱۰۹۳۴) اس طرح کے بعض اور واقعات بھی اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں ملتے ہیں، عجب نہیں کہ متعدد واقعات پیش آئے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات پر حسبِ موقع تنبیہ کے لئے یہ آیت پڑھی ہو؛ اس لئے ان میں سے ہر ایک کو اس آیت کا شانِ نزول سمجھا گیا ہو۔

«۱» یعنی جب ان کی یہ منافقانہ روش طشت از بام ہو جاتی ہے تو حیلہ بہانہ کرتے ہیں کہ میرا مقصد یہ تھا اور یہ نہیں تھا، وغیرہ۔

«۲» منافقین کی شرارتوں کا اللہ خود ذکر فرماتے ہیں، اس کے باوجود حکم دیا جاتا ہے کہ عفو و درگذر کا دامن نہ چھوڑیں اور نصح وموعظت سے کام لیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ داعی کو کس قدر فراخ قلب اور بردبار ہونا چاہئے !

«۳» غرض رسول کی حیثیت محض قاصد اور ڈاکیہ کی نہیں ؛ بلکہ اس کا قول و فعل اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا ترجمان ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی اطاعت واتباع بھی ضروری ہے، اس آیت میں ان لوگوں کے غلط استدلال کا جواب بھی موجود ہے، جو کہتے ہیں کہ حکم تو صرف اللہ کے لئے ہے ''ان الحکم الا للہ'' (یوسف: ۴۰) اور ''ألا لہ الخلق والامر'' (الاعراف: ۵۴) اس لئے صرف قرآن حجت ہے نہ کہ حدیث؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ رسول کی اطاعت بھی دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے؛ اس لئے کہ اللہ ہی نے اس کا حکم دیا ہے۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ
اَوِاخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿۶۶﴾ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾ وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

پس، آپ کے پروردگار کی قسم! وہ تو مومن ہو ہی نہیں سکتے، جب تک اپنے آپسی جھگڑوں میں آپ کو حَکَم نہ بنائیں، نیز آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کردیں ﴿۱﴾ ﴿۶۵﴾ اگر ہم نے ان پر یہ بات فرض کی ہوتی کہ اپنے آپ کو قتل کر ڈالو یا یہ کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ، تو ان میں سے کچھ ہی لوگ ایسا کرتے، ﴿۲﴾ اور اگر وہ اس کام کو کر گذرتے، جس کی ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان ہی کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدم رہنے کا باعث ہوتا ﴿۳﴾ ﴿۶۶﴾ اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا اجر بھی دیتے ﴿۶۷﴾ اور ان کو سیدھے راستہ کی ہدایت سے بھی نوازتے۔ ﴿۶۸﴾

﴿۱﴾ گویا شریعت کے حکم کو جبراً قہراً مان لینا کافی نہیں؛ بلکہ دل بھی اس کے قبول کرنے پر آمادہ و تیار ہو، یہ مومن ہونے کے لئے ضروری ہے، اب رہا کسی حکم شریعت کا اپنے خلاف ہونے کی وجہ سے نفس پر اس کا شاق گذرنا تو چوں کہ اس میں ارادہ و اختیار کو دخل نہیں؛ بلکہ یہ ایک اضطراری شئ ہے؛ اس لئے انشاء اللہ اس پر پکڑ نہیں —— اس ارشاد ربانی سے معلوم ہوا کہ جس بات کا حدیث نبوی سے ثابت ہونا یقینی طور پر معلوم ہو، اس کا انکار بھی موجب کفر ہے اور انسان کو دائرہ ایمان سے باہر نکال دیتا ہے، اس لئے کہ رسول کے حکم کو بھی ماننا ضروری ہے، جیسا کہ قادیانی حضرات محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت اور حضرت مسیح علیہ السلام کی قیامت کے قریب دوبارہ آسمان سے زمین پر تشریف آوری سے انکار کرتے ہیں؛ اس لئے وہ کافر ہیں، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان خواہ کسی علاقہ میں آباد ہوں، ان پر یہ بات واجب ہے کہ قضاء شرعی کا نظام قائم کریں، کہ اس کے بغیر اپنے نزاعی معاملات میں اللہ اور رسول کے فیصلہ کی طرف رجوع کرنا ممکن نہیں، مختلف فقہاء نے خاص کر فقہاء احناف نے اس کی صراحت کی ہے۔

(فتح القدير: ۶/ ۳۶۵، بزازیہ علی ہامش الهندیہ: ۶/ ۳۱۱)

﴿۲﴾ ان آیات میں بھی خطاب منافقین ہی سے ہے، ''اور کچھ لوگ'' جن کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ ان دشوار احکام کی بھی اطاعت کرتے ہیں، سے صحابہ اور مخلص مسلمان مراد ہیں، بعض اہل علم کی رائے ہے کہ اپنے آپ کے قتل سے جہاد مراد ہے، جس میں شہادت کا امکان رہتا ہے اور گھروں سے نکل جانے سے مراد ''ہجرت'' ہے، جو دین و ایمان کو بچانے کے لئے واجب ہے۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ کے ایک حکم پر عمل کرنے سے دوسرے احکام پر بھی عمل کرنے اور ثابت قدم رہنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے، جیسے مال مال کو کھینچتا ہے اور پیسہ سے پیسہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح ایک نیکی دوسری نیکی کو وجود میں لاتی ہے اور ایک برائی دوسری برائی تک انسان کو لے جاتی ہے۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ
وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ
عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ ع ۹/۱۱

اور جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرے گا، وہ ان لوگوں کے ساتھ رہے گا، جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی: انبیاء، صدیقین، شہید ہونے والے اور نیک کام کرنے والے، اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں! ﴿۱﴾ ﴿۶۹﴾ یہ اللہ کا کرم ہے اور اللہ ہی کا علم کافی ہے ﴿۲﴾ ﴿۷۰﴾ اے ایمان والو! اپنی حفاظت کا سامان کرلو، ﴿۳﴾ پھر گروہ درگروہ نکلو یا سب ایک ساتھ نکل کھڑے ہو۔ ﴿۴﴾ ﴿۷۱﴾

﴿۱﴾ انسان کو اچھا کھانا پینا، بہتر لباس و پوشاک اور عمدہ رہائش گاہ میسر ہو؛ لیکن ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے والے لوگ اچھے اور مزاج کے موافق نہ ہوں تو طبیعت بدمزہ ہوجاتی ہے اور سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے، جنت میں جہاں راحت و آرام اور عیش ونشاط کے تمام سامان ہوں گے، ہم نشیں اور رفقاء بھی اچھے ملیں گے؛ تاکہ ان نعمتوں کا لطف دوبالا ہوجائے؛ چنانچہ اہل جنت کو نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور نیک وصالح لوگوں کی رفاقت حاصل ہوگی، صدیق کے معنی بہت سچے اور دین کی ہر بات کو سچا جاننے اور ماننے والے کے ہیں، انبیاء کے بعد فضل وتقویٰ میں ایسے ہی خوش نصیب بندوں کا درجہ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ﷺ مجھے میری جان واولاد سے بڑھ کر عزیز ہیں، گھر میں ہوتا ہوں تو آپ ﷺ کی یاد آتی ہے، پھر جب تک دیدار نہ کرلوں صبر نہیں آتا، مجھے خیال ہوتا ہے کہ جب آپ ﷺ جنت میں جائیں گے تو آپ ﷺ کا مقام بلندتر اور انبیاء کے ساتھ ہوگا اور ہم لوگ کم تر درجہ میں ہوں گے؛ اس لئے آپ ﷺ کے دیدار سے محروم رہیں گے، آپ ﷺ خاموش رہے، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اہل ایمان وہاں بھی انبیاء کی رفاقت سے محروم نہ ہوں گے (مجمع الزوائد: ۱۰/۷، بہ سند صحیح) —— آیت اور روایت دونوں سے واضح ہے کہ اس رفاقت کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ دنیا سے، مگر افسوس کہ قادیانی حضرات اس آیت سے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ انبیاء کی رفاقت کا وعدہ کیا گیا ہے: لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی (نعوذ باللہ) نبی آسکتے ہیں، جب ہی تو نبی کی رفاقت حاصل ہوسکتی ہے، جواب ظاہر ہے کہ آیت میں آخرت کی رفاقت مراد ہے نہ کہ دنیا کی، اگر دنیا کی رفاقت مراد ہوتی تو پھر کوئی زمانہ نبی سے خالی نہ ہونا چاہئے تھا، اور ہر زمانہ میں نبیوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے تھی، کیوں کہ ''نبیین'' عربی قواعد کے لحاظ سے جمع کا صیغہ ہے۔

﴿۲﴾ کہ اللہ نیت سے بھی باخبر ہیں، عمل سے بھی اور نیت وعمل کے اچھے برے انجام سے بھی۔

﴿۳﴾ ''حذر'' کے معنی بچاؤ اور حفاظت کے اسباب کے ہیں، خواہ ہتھیاروں کے ذریعہ ہو یا مناسب تدبیر کے ذریعہ۔

﴿۴﴾ مسلمانوں کو جہاد کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، قرآن کے اس حکم سے معلوم ہوا کہ جہاد میں اللہ پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ حفاظت اور مدافعت کے ظاہری اسباب ووسائل بھی اختیار کرنے چاہئیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ اسباب کی فراہمی کے اعتبار سے کب جہاد میں اقدام درست ہے اور کب نہیں؟ —— جہاں تک دشمن کے حملہ کی مدافعت کی بات ہے ←

وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ
مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ
مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ
وَالنِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ
وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

اور تم میں سے بعض وہ بھی ہیں جو ضرور دیر لگائیں گے، پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہیں گے کہ اللہ نے مجھ پر کرم کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ شریک نہ تھا ﴿۷۲﴾ اور اگر تم کو اللہ کا فضل حاصل ہوا تو کہے گا: — گویا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی تعلق ہی نہ ہو — ''کاش! کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو مجھے بھی بڑی کامیابی ہاتھ آتی'' ﴿۱﴾ ﴿۷۳﴾ (اگر وہ واقعی کامیابی کے خواہاں ہیں) تو ان کو چاہئے کہ اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جہاد کریں، جنھوں نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کو چن لیا ہے، ﴿۲﴾ اور جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرے گا تو وہ قتل کیا جائے یا وہ غلبہ پائے، ہم اسے بڑا اجر عطا کریں گے ﴿۳﴾ ﴿۷۴﴾ اور تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے سہارا مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جہاد نہیں کرتے، جو کہتے ہیں: ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال لیجئے، جس کے باشندے ظالم ہیں، ہمیں اپنے پاس سے کوئی نگہبان عطا فرمایئے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی مددگار کھڑا کر دیجئے؟؟'' ﴿۴﴾ ﴿۷۵﴾

← تو اس میں تو انسان مجبور ہے اور یہ بہر حال کرنا ہی ہے — گروہ در گروہ اور اکٹھے مل کر سبھوں کو معرکۂ جہاد میں جانے کا حکم مواقع و حالات کے اعتبار سے ہے کہ حسن تدبیر کا جو تقاضا ہو، وہ کیا جائے۔

﴿۱﴾ یہ کچھ اس عہد کے منافقین ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا؛ بلکہ ہر زمانہ میں جو لوگ اپنے دلوں میں بے یقینی اور خدا کے غیبی نظام کے بارے میں شکوک و شبہات چھپائے رہتے ہیں، وہ کامیابی اور ناکامی کو محض مادی پیمانوں سے ناپتے ہیں، مخلص مسلمانوں کی عارضی اور ظاہری ناکامی پر طعنے دیتے ہیں اور مادی کامیابی کی صورت میں اپنی محرومی پر حسرت کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی کامیابی مالِ غنیمت اور دنیا کی متاعِ حقیر کا حاصل ہوجانا نہیں ہے؛ بلکہ حکم خداوندی کو بجالانا اصل کامیابی ہے۔

﴿۳﴾ اس فقرہ میں ایک اہم حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، مادہ پرست ذہن ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ جو قدم ظاہر کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو وہی کامیابی و کامرانی ہے، فتح ہو تو کامیابی، شکست ہو تو ناکامی، انسان غالب ہوجائے تو کامران، مغلوب و مظلوم ہوجائے تو ناکام، اسباب دنیا کو پائے تو کامیاب، نہ پائے تو محروم، قرآن نے بتایا کہ یہ تصور غلط ہے، انسان کی کامیابی یہ ہے کہ ←

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ
فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا ﴿۷۶﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ قِیۡلَ لَہُمۡ ع ۱۰/۶
کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ۚ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیۡہِمُ الۡقِتَالُ اِذَا فَرِیۡقٌ
مِّنۡہُمۡ یَخۡشَوۡنَ النَّاسَ کَخَشۡیَۃِ اللّٰہِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡیَۃً ۚ وَ قَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ کَتَبۡتَ عَلَیۡنَا
الۡقِتَالَ ۚ لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ؕ قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡیَا قَلِیۡلٌ ۚ وَ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّمَنِ
اتَّقٰی ۟ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا ﴿۷۷﴾

جولوگ ایمان والے ہیں، وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں اور جولوگ کافر ہیں، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے پرستاروں سے جہاد کرو، کہ شیطان کی چال کمزور ہے ﴿۷۶﴾ کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی، جن کو کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رہو، نماز قائم کرواور زکوۃ دیتے رہو، پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اللہ کی طرح ؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ڈرتا ہے، اِن لوگوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم پر آپ نے جہاد کیوں فرض کر دیا؟ کیوں نہ ہم کو قریبی مدت تک مہلت دی؟؟ آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان تھوڑا ہے اور تقویٰ اختیار کرنے والے کے لئے آخرت (کہیں) بہتر ہے! اور تم سے ایک دھاگہ کے برابر بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ ﴿۱﴾ ﴿۷۷﴾

← اسے اللہ کی اطاعت کی توفیق میسر آجائے، خواہ ظاہری نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ غالب ہو یا مغلوب، وہ قاتل ہو یا مقتول، اور اسے نعمت دنیا حاصل ہو یا نہ ہو؛ کیوں کہ اصل مقصود اجر آخرت ہے اور وہ اسے بہر حال حاصل ہوگا۔

﴿۴﴾ یہ آیت مدینہ ہجرت کرنے کے بعد اس ابتدائی دور میں نازل ہوئی جب بہت سے مخلص اور بے سہارا مسلمان کفار مکہ کے ظلم و جبر کے تحت مجبوری و مقہوری کی زندگی گذار رہے تھے، انھیں کو ''مستضعفین'' کہا گیا، یعنی دبے کچلے لوگ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں اور میری والدہ بھی ان ہی مظلوم لوگوں میں تھے، (بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث نمبر: ۱۳۵۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مظلوم مسلمانوں کی نجات کے لئے دُعاء کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دُعاء فرماتے: خداوندا! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہم اور مظلوم مسلمانوں کو نجات عطا فرما، بخاری میں متعدد جگہ یہ روایت آئی ہے، (دیکھئے: بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث نمبر: ۲۹۳۲، ۴۵۶۰، ۶۳۹۳، وغیرہ) —— لیکن جہاد کا یہ حکم ظاہر ہے کہ صرف انھیں مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ تھا؛ بلکہ ہر دور میں جو مسلمان اپنی مجبوری کی وجہ سے کافروں کے درمیان پھنسے ہوئے ہوں اور ان پر جور و ظلم روا رکھا جاتا ہو، دوسرے مسلمانوں پر ان کی حفاظت و نصرت، اس کے لئے مناسب تدبیر و اقدام اور آخری چارۂ کار کے طور پر جہاد واجب ہے۔

﴿۱﴾ مسلمان جب مکہ میں تھے اور اہل مکہ کے ظلم و جبر سے عاجز تھے تو جہاد کی اجازت چاہتے تھے؛ لیکن اسباب و وسائل سے ←

اَیۡنَ مَا تَکُوۡنُوۡا یُدۡرِکۡکُّمُ الۡمَوۡتُ وَ لَوۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ بُرُوۡجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ؕ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ حَسَنَۃٌ
یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا ہٰذِہٖ مِنۡ عِنۡدِکَ ؕ قُلۡ کُلٌّ مِّنۡ
عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ فَمَالِ ہٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ لَا یَکَادُوۡنَ یَفۡقَہُوۡنَ حَدِیۡثًا ﴿۷۸﴾ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَۃٍ
فَمِنَ اللّٰہِ ۫ وَ مَاۤ اَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَۃٍ فَمِنۡ نَّفۡسِکَ ؕ وَ اَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ
شَہِیۡدًا ﴿۷۹﴾ مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَ مَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ﴿ؕ۸۰﴾

تم جہاں کہیں بھی رہو، موت تو تم کو آ پکڑ کر رہے گی، گو مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو! اگر ان کو کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور تکلیف دہ بات پیش آتی ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی طرف سے ہے، آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے، تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ لگتا ہی نہیں ہے کہ یہ بات سمجھیں گے ﴿۷۸﴾ تجھ کو جو بھلائی حاصل ہوتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پیش آتی ہے، وہ تیری ذات کے سبب سے ہے، اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ﴿۱﴾ ﴿۷۹﴾ جو رسول کی فرمانبرداری کرے، اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی ﴿۲﴾ اور جو روگردانی کرے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ ﴿ؕ۸۰﴾

← محرومی ٔافراد کی کمی ٔدعوت دین کی مصلحت اور صحابہ کی تربیت ابھی ناتمام ہونے کی وجہ سے اجازت نہ دی گئی اور صرف نماز وزکوٰۃ پر اکتفاء کرنے کو کہا گیا، مدینہ آنے کے بعد جب جہاد کا حکم ہوا تو امن و عافیت کی اس فضا میں حکمِ جہاد سے بعض مخلص مسلمانوں کو بھی بشری مزاج کے تحت یہ خیال ہوا کہ مکہ کے ظلم وستم سے ابھی چھٹکارا ملا ہے، اگر کچھ دن عافیت کے اور مل جاتے تو بہتر ہوتا، یہ کوئی اعتراض واحتجاج نہ تھا، بلکہ ایک تمنا اور خواہش تھی، جو گناہ نہیں، اس پر تنبیہ فرمائی گئی کہ اہل ایمان کے لئے سکون وعافیت کی جگہ آخرت ہے نہ کہ دنیا، دنیا کی متاعِ حقیر کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اس لئے نہ جان کی پروا کرو نہ دشمن کا خوف؛ بلکہ صرف خدا کا خوف ہو اور آخرت کی طلب۔ (دیکھئے: قرطبی: ۱/۴۶۷، بغوی: ۱/۵۶۳)

﴿۱﴾ آیت ۷۸ سے منافقین کا ذکر ہے، کہ موت کا خوف انھیں کھائے جاتا ہے؛ حالاں کہ میدان کارزار میں ہوں یا محلاتِ عشرت اور فصیل بند قلعوں میں، موت اپنے وقت پر آ کر رہے گی، ان کا حال یہ تھا کہ جب کوئی ظاہری کامیابی اور خوشی کی بات پیش آتی تو اس کی نسبت اللہ کی طرف کرتے اور جب کوئی آزمائش آتی تو پیغمبر اسلام ﷺ کو اس کا قصوروار ٹھہراتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بیمار ذہنیت کی علامت ہے، سوچ یہ ہونی چاہئے کہ جو سکھ پہنچے وہ اللہ کا فضل ہے اور جو دکھ پہنچے وہ اپنی شامت اعمال اور بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔

←

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۚ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِیْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

اور کہتے ہیں کہ (ہمیں آپ کا حکم) قبول ہے، پھر جب آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کی بات کے برخلاف رات میں مشورہ کرتا ہے، اور اللہ ان کے رات کے مشوروں کو لکھ رہے ہیں؛ لہٰذا آپ ان سے پہلوتہی برتئے، اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ ہی کام بنانے کے لئے کافی ہیں ﴿۱﴾ ﴿۸۱﴾ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کے پاس سے ہوتا تو اس میں بہت سارا اختلاف پاتے ۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۲﴾

← ﴿۲﴾ اس سے صاف معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح حدیث رسول بھی حجت ہے اور حدیث پر عمل کرنا بھی ارشاد خداوندی ہی پر عمل کرنا ہے، خدا اور رسول کی اطاعت ایک '' وحدت '' ہے، جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص احکام رسول کی نافرمانی اور اس کا انکار کر کے بھی اللہ کا فرمانبردار کہلائے ۔

﴿۱﴾ اس آیت میں منافقین کے رویہ کا ذکر ہے کہ آپ کے سامنے تو فرمانبرداری کا دم بھرتے ہیں اور بعد میں مخالفانہ مشورے اور سازشیں کرتے ہیں —— عربی زبان میں '' بیّت '' کے معنی '' بدل دیتے ہیں '' کے بھی ہو سکتے ہیں اور '' رات میں مشورہ کرتے ہیں '' کے بھی ، ترجمہ بھی دونوں طرح کیا گیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے رات میں مشورہ کرنے کا ترجمہ فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی، کبھی خوشی کی کیفیت ہے، کبھی غضب کی، کبھی محبت کا غلبہ ہے، کبھی نفرت کا، کبھی توجہ دنیا کی طرف ہے اور کبھی آخرت کی طرف، اللہ کا کلام اس ناہمواری سے خالی ہے؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات و کیفیات ہر وقت قائم رہتی ہیں، اختلاف کے معنی تضاد و تناقض کے بھی ہو سکتے ہیں، انسان اگر کسی کتاب کو دو تین سال میں لکھے، وہ مختلف طرح کے مضامین پر مشتمل ہو اور ایک مضمون متعدد جگہ آتا ہو تو کہیں نہ کہیں تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے، قرآن مجید ۲۳ سال میں نازل ہوا، تھوڑی تھوڑی آیات اُتریں اور ایک ہی مضمون الگ الگ مناسبتوں سے مختلف جگہ ذکر فرمایا گیا، اس کے باوجود حقیقی معنوں میں کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں، اب اگر انسان غلط فہمی یا لاعلمی کی وجہ سے دو آیتوں میں ٹکراؤ محسوس کرے تو ظاہر ہے کہ یہ انسان کا قصورِ فہم اور اس کے ذہن کی نارسائی ہے نہ کہ کلام الٰہی میں نقص ، قرآن کے اس دعویٰ کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوگا جب دوسری مذہبی کتابوں کا قرآن سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ کس قدر تضادات کا مجموعہ ہیں ، مثلاً مذہبی کتابوں میں قرآن سے قریب ترین کتاب بائبل ہے، اس میں ڈھیر سارا اختلاف ہے، (دیکھئے: **اظہار الحق: ۱/ ۲۴۲**) اسی طرح ان لوگوں کے کلام میں تضادات دیکھئے جو نبوت کے جھوٹے دعویدار اور ایک باطل مذہب کے مؤسس و بانی ہیں، مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی۔

وَ اِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَ لَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤى اُولِى
الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَتُهٗ
لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾ فَقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ وَ حَرِّضِ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّكُفَّ بَاۡسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاۡسًا وَّ اَشَدُّ تَنۡكِيۡلًا ﴿۸۴﴾
مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا ۚ وَ مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ
كِفۡلٌ مِّنۡهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقِيۡتًا ﴿۸۵﴾

جب ان کو امن یا خوف کی کوئی خبر ملتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے میں سے ذمہ داروں تک پہنچا دیتے تو ان میں سے جو تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی تحقیق کر لیتے ، اور اگر تم پر اللہ کا کرم اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو — کچھ لوگوں کے سوا — تم تو شیطان کی پیروی کر لئے ہوتے ﴿۱﴾ ﴿۸۳﴾ پس! اللہ کے راستہ میں جہاد کیجئے — آپ صرف اپنی ہی ذات کے ذمہ دار ہیں — اور مسلمانوں کو (جہاد کرنے کی) تاکید کیجئے ،قریب ہے کہ اللہ کافروں کی یلغار کو روک دیں، اور اللہ لڑائی میں بہت سخت اور سخت ترین سزا دینے والے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۸۴﴾ جو اچھی بات کی سفارش کرے، اس کے لئے اس (نیکی کے اجر) میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو بری بات کی سفارش کرے، اس کے لئے بھی اس (کے گناہ) کا کچھ بوجھ ہوگا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔ ﴿۸۵﴾

﴿۱﴾ یہ منافقین اور کمزور ایمان والوں کا بیان ہے کہ اگر ان کو مسلمانوں کی فتح یا شکست کی کوئی خبر مل جائے تو بلا تحقیق اس کو عام کر دیتے ہیں؛ حالاں کہ یہ کسی بھی قوم کے لئے حفاظتی نقطۂ نظر سے نامناسب بات ہے، اس سے اجتماعی نقصان کا اور قوم میں کم ہمتی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے: اس لئے چاہئے کہ ایسی باتوں کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خاص معتمد صحابہ تک پہنچا دیں، — اس آیت سے معلوم ہوا کہ نئے مسائل میں علماء اُمت کو استنباط و اجتہاد کا فریضہ انجام دینا ہوگا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُمت میں تمام لوگ اجتہاد کرنے کے اہل نہ ہوں گے، یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جو لوگ اجتہاد کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، ان پر اجتہاد کی صلاحیت رکھنے والوں کی تقلید و اتباع واجب ہے۔

﴿۲﴾ شوال ۳ ہجری میں اُحد کا معرکہ ہو چکا تھا، جس میں بہ ظاہر مسلمانوں کو کافی نقصان ہوا تھا، اس موقع سے کفار مکہ کی طرف سے بدر میں دوبارہ معرکہ کا چیلنج دیا گیا، آپ ﷺ نے پوری قوت سے اس کو قبول فرمایا، ذوقعدہ میں آپ ﷺ دوبارہ بدر کی طرف اسی ارادہ سے کوچ کرنے کو تیار ہوئے ؛ چوں کہ ابھی اُحد کا زخم تازہ تازہ تھا؛ اس لئے منافقین کے علاوہ کچھ مسلمانوں کو بھی خیال ہوا کہ ابھی اس نئے معرکہ سے گریز کرنا چاہئے ،مگر رسول اللہ ﷺ پوری طرح اس کے لئے تیار تھے، ان ہی حضرات کی تنبیہ کے لئے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کوئی اور نہ نکلے تو آپ ﷺ تنہا اُٹھ کھڑے ہوں ؛ کیوں کہ آپ ﷺ دوسروں کے عمل کے ذمہ دار نہیں ہیں ؛ چنانچہ پھر آپ اپنے رفقاء کے ساتھ شعبان ۴ھ میں بدر تشریف لے گئے اور آٹھ دنوں قیام فرمایا، (البدایہ والنہایہ: ۸۹/۴) اہل مکہ نہیں آئے اور جنگ نہ ہوئی ؛ لیکن اہل مکہ پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ احد کے واقعہ نے مسلمانوں کے حوصلہ و ہمت کو کم نہیں کیا ہے۔

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ
مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ
اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

النصف ۸ع۱۱

اور جب تم کو سلام کیا جائے تو تم سلام کا اس سے بہتر جواب دو یا وہی لوٹا دو، ﴿۱﴾ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں ﴿۸۶﴾ اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، اللہ بے شک تمہیں قیامت کے دن جمع فرمائیں گے، اس میں ذرا بھی شک نہیں، اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟ ﴿۸۷﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے ہو؛ حالاں کہ اللہ نے ان کو ان ہی کی شامتِ اعمال کی وجہ سے اُلٹا پھیر دیا ہے، کیا تم ان کو ہدایت دینا چاہتے ہو، جن کے لئے اللہ نے گمراہی مقدر کر دی ہے؟ اور جس کو اللہ ہی ہدایت سے محروم کر دے تم ہرگز اس کے لئے کوئی راستہ نہ پاؤ گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۸﴾

﴿۱﴾ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور کہا: ''السلام علیک''، آپ ﷺ نے فرمایا: السلام علیک ورحمۃ اللہ، پھر ایک اور صاحب آئے اور ''السلام علیک ورحمۃ اللہ'' کہا، آپ ﷺ نے جواب میں ''وبرکاتہ'' کے الفاظ بڑھا دیئے، ایک اور صاحب نے ''السلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہا، تو آپ ﷺ نے یہی فقرہ لوٹا دیا، (مجمع الزوائد، باب حد السلام والرد: ۳۶/۸، حدیث نمبر: ۱۲۷۴۹) سلام کے بہتر جواب سے یہی مراد ہے کہ دُعائیہ کلمات بڑھا دیئے جائیں، حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑھانے کی حد ''وبرکاتہ'' تک ہے، اس سے زیادہ نہیں، اگر بڑھا کر جواب نہ دے، یا سلام کرنے والے نے اس کی گنجائش ہی نہ رکھی ہو تو جواب میں بھی اتنا ہی کہے، سلام کرنا مسنون ہے اور جواب دینا واجب اور سلام میں پہل کرنا افضل، قرآن مجید میں خاص طور پر سلام کا حکم فرمایا گیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں سلام کی کس قدر اہمیت ہے!

﴿۲﴾ یہ آیت کس واقعہ کے پس منظر میں نازل ہوئی؟ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں آئی ہیں، بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ غزوۂ اُحد میں عبداللہ بن ابی کے ساتھ جو منافقین عین میدان جنگ میں رسول اللہ ﷺ اور مخلص مسلمانوں کو چھوڑ کر واپس ہو گئے، ان کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف ہو گیا، ایک جماعت کی رائے تھی کہ وہ مسلمان نہیں ہیں؛ اس لئے ہم ان سے جنگ کریں گے، دوسری جماعت کا خیال تھا کہ وہ مسلمان ہیں؛ اس لئے ان سے جنگ کی گنجائش نہیں، (بخاری، باب غزوۂ اُحد، حدیث نمبر: ۴۰۵۰) اللہ تعالیٰ نے اسی پر تنبیہ فرمائی کہ منافقین کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کے لئے کفر مقدر ہو چکا ہے، پھر ان کے بارے میں تم کیوں نرم رویہ رکھتے ہو؟

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ
وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿٨٩﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ
حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ
فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿٩٠﴾

وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر اختیار کر لیتے، جیسے انھوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے؛ تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ، ﴿۱﴾ لہٰذا ان میں سے دوست نہ بناؤ؛ جب تک وہ اللہ کے راستہ میں ہجرت نہ کر جائیں، ﴿۲﴾ پھر اگر وہ اس سے رُوگردانی کریں تو انھیں پکڑو، جہاں پاؤ انھیں قتل کر دو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ، ﴿۸۹﴾ سوائے ان لوگوں کے جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ تم سے جنگ کا حوصلہ نہ پاتے ہوں، ان کے دل تم سے یا خود اپنی قوم سے جنگ کرنے سے تنگ ہوں اور اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کر دیتے؛ چنانچہ وہ تم سے جنگ کرتے؛ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی پیشکش کریں تو اللہ نے ان کے خلاف تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۹۰﴾

﴿۱﴾ کافرانہ تہذیب ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر لے، جیسا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ''بھارتیہ کرن'' کا نعرہ لگایا جاتا ہے، یا مغرب میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانے کی تلقین کی جاتی ہے، اسی پر توجہ دلائی گئی کہ تم تو ان کے مسلمان ہونے کا خیال رکھتے ہو اور وہ آرزومند ہیں کہ تم کفر کو اختیار کر لو۔

﴿۲﴾ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مکہ سے آکر آپ ﷺ کے ہاتھوں پر مسلمان ہوا اور پھر مکہ واپس جا کر مشرکین کے ساتھ رہنے لگا، یہ انھیں کا ذکر ہے، اور ہجرت کی یہ تاکید اس لئے فرمائی گئی کہ اُس زمانہ میں جیسے اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار ایمان کے لئے شرط تھا، اسی طرح مدینہ کی طرف ہجرت بھی بہ درجۂ شرط تھی۔

﴿۳﴾ یعنی دو قسم کے غیر مسلموں سے جنگ کرنے سے منع فرمایا گیا، ایک: وہ جو کسی ایسی قوم کے حلیف ہوں، جن سے تمہارا معاہدۂ امن ہو، جیسے صلح حدیبیہ کے موقع سے مسلمانوں کا قریش سے معاہدہ ہوا، اس معاہدہ میں بنوخُزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنومُدلج اور بنوبکرؓ وغیرہ قریش مکہ کے حلیف تھے —— دوسرے: وہ جو خود تم سے براہ راست صلح کی پیشکش کریں، غرض کہ اسلام نے ان غیر مسلموں سے جہاد کا حکم نہیں دیا ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ پُرامن طور پر رہنے کو تیار ہوں۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ
اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ وَ مَا كَانَ ع ۱۴ ۹
لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ
مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ
رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ
وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

اب تم کچھ اور لوگوں کو دیکھو گے، جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، (لیکن) جب بھی ان کو فساد کی طرف بلایا جاتا ہے تو اُلٹے منہ اس میں پلٹ پڑتے ہیں، تو اگر وہ تم سے (جنگ کرنے سے) باز نہ رہیں، تم سے صلح کی پیشکش نہ کریں اور اپنے ہاتھ روکے نہ رکھیں تو تم بھی ان کو پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کردو، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہارے لئے کھلی ہوئی دلیل فراہم کردی ہے ﴿۱﴾ ﴿۹۱﴾ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کردے، سوائے اس کے کہ اَنجانے میں ہوجائے، اور جو کسی مسلمان کو انجانے میں قتل کردے، وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے اور مقتول کے لوگوں کو خون بہا ادا کرے، ﴿۲﴾ سوائے اس کے کہ وہ لوگ خود ہی معاف کردیں، ﴿۳﴾ پھر اگر وہ تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو اور خود مسلمان ہو تو صرف ایک مسلمان غلام کو آزاد کردے، اور اگر ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو کہ ان کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو تو ان کے لوگوں کو خوں بہا بھی ادا کیا جائے اور ایک مسلمان غلام بھی آزاد کیا جائے، ﴿۴﴾ پھر جس کو غلام میسر نہ ہو، وہ مسلسل دو ماہ کے روزے رکھے، ﴿۵﴾ یہ اللہ کی طرف سے توبہ قبول ہونے کا طریقہ ہے، اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں۔ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ اس سے قبیلہ بنوغطفان وغیرہ مراد ہیں، جو غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے خلاف میدان میں آگئے تھے، ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم ہے کہ جب تک یہ معاہدہ کا پاس رکھیں، ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا جائے اور جب یہ معاہدہ کا لحاظ نہ کریں اور عہد شکنی کے مرتکب ہوں تو ان سے جنگ کی جائے —— ''کھلی ہوئی حجت'' سے مراد ان کی عہد شکنی اور دغابازی کا واضح طور پر سامنے آجانا ہے —— اس سے معلوم ہوا کہ جو غیر مسلم غیر جانبدار ہوں، ان سے جنگ نہ کی جائے گی، اس کے باوجود اسلام پر تشدد کا الزام لگانا کس قدر بے جا ہے؟

﴿۲﴾ قتل کی تین قسمیں ہیں: آلۂ قتل سے حملہ کیا جائے اور مقتول پر وار کرنا مقصود ہو، اس کو ''قتل عمد'' کہتے ہیں، مقتول پر وار کرنا مقصود ہو لیکن حملہ ایسی چیز سے کیا گیا جو عام طور پر قتل کا سبب نہیں ہوتا، یہ ''شبہ عمد'' ہے، تیسری صورت ''قتل خطاء'' ہے، کہ غلطی سے ←

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کردے، اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اس پر اللہ کا غضب ہوگا اور اس کی لعنت ہوگی، اور اللہ نے ان کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۳﴾

← مقتول کی جان چلی جائے، ورنہ مقتول کی جان لینا مقصود نہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ سمجھنے میں غلطی ہوجائے، جیسے دور سے جانور سمجھا اور گولی چلادی، قریب آئے تو معلوم ہوا کہ وہ آدمی تھا، دوسرے یہ کہ نشانہ لگانے میں غلطی ہوجائے، مثلاً نشانہ لیا شیر کا اور لگ گیا کسی انسان کو، (الفقه الاسلامی وأدلته: ۲۲۲/۶) قتل عمد میں قصاص یا دیت واجب ہوتی ہے، شبہ عمد میں دیت؛ لیکن قتل عمد اور شبہ عمد کی دیت اونٹوں کی عمر کے لحاظ سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور قتل خطاء کی دیت عمر کے لحاظ سے نسبتاً ہلکی، (البحر الرائق: ۳۲۷/۸) رسول اللہ ﷺ نے قتل خطاء کی دیت سو اونٹ مقرر کی ہے، (سنن ابی داؤد، باب الدية كم هی؟ حدیث نمبر: ۴۵۴) دیت میں اصل معیار اونٹنیاں ہیں؛ البتہ فقہاء نے اپنے اپنے عہد میں اونٹنی کی قیمت کے اعتبار سے مروجہ سکوں میں قیمت مقرر فرمائی ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم کا فتویٰ اسی لحاظ سے دیا ہے، (بداية المجتهد: ۲۴۳/۴، احکام القرآن للعثمانی: ۳۱۷/۲) ہمارے عہد میں موجودہ نرخ کے لحاظ سے سو اونٹنیوں کی قیمت کا اعتبار ہے — دیت مقتول کے ورثہ کو ادا کی جائے گی، ''پس مقتول کے لوگوں'' سے اس کے ورثہ مراد ہیں، یہ تو دیت ہے، جس کا مقصد متاثرین کی اشک شوئی اور دلداری ہے، کفارہ جس سے بارِ گناہ اترنے کی اُمید ہے، ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہے۔

﴿۳﴾ اصل معنی صدقہ کرنے کے ہیں، گویا اشارہ اس طرف ہے کہ پوری یا کچھ دیت معاف کردے تو باعث ثواب ہے اور صدقہ کے حکم میں ہے۔

﴿۴﴾ یعنی مسلمان ہو؛ لیکن حربیوں (مسلمانوں سے برسر پیکار کافروں) کے درمیان رہتا ہو، تو چوں کہ کفار مسلمان کے وارث نہیں ہوسکتے؛ اس لئے دیت ادا نہ کی جائے گی؛ البتہ قاتل کفارہ ادا کرے گا، اور اگر مقتول غیر مسلم ہو؛ لیکن ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، جن سے امن کا معاہدہ ہو، تو ان کے اعزہ کو خوں بہا ادا کیا جائے گا اور کفارہ بھی واجب ہوگا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں غیر مسلموں کی جان کی بھی کتنی اہمیت ہے کہ ان کے قتل پر نہ صرف خوں بہا بلکہ کفارہ بھی واجب ہے، گویا ان کا قتل بھی قتل مومن کی طرح باعث گناہ ہے، ہندوستان اور ایسے ممالک جہاں مسلمان بقاء باہم کے دستوری معاہدہ کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں، وہاں کے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے، آیت میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ مقتول مسلمان ہو یا غیر مسلم، ان کا خوں بہا برابر ہے، جیسا کہ حنفیہ کا نقطۂ نظر ہے۔ (الفقه الاسلامی وأدلته: ۳۱۱/۶)

﴿۵﴾ موجودہ دور میں چوں کہ غلام میسر نہیں ہیں؛ اس لئے یہی صورت متعین ہے۔

﴿۱﴾ قتل عمد کی دنیوی سزا کا ذکر (المائدۃ: ۴۵) میں آیا ہے، یہ آخرت کی سزا کا بیان ہے، اس قدر تاکید اور شدت کے ساتھ شاید ہی کسی جرم کی سزا بیان کی گئی ہو، اول تو جہنم، پھر اس میں ہمیشہ کا قیام، اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا غضب اور اللہ کی لعنت، اور مزید ←

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ
السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾ لَا
يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ
دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

اے مسلمانو! جب تم اللہ کے راستہ میں سفر کرو تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، اور جو تم کو سلام کرے، ان کو یہ نہ کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو، تم دنیوی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں (یعنی: مال واسباب) ہیں، تم بھی تو پہلے ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر (ایمان کی توفیق دے کر) احسان فرمایا؛ لہٰذا تحقیق سے کام لو، تم جو کچھ کرتے ہو، بے شک اللہ اس سے باخبر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۴﴾ جو مسلمان معذور نہیں ہیں، ان میں سے بیٹھ رہنے والے اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والے برابر نہیں، اللہ نے بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں مال اور جان کے ذریعہ جہاد کرنے والوں کو درجہ کے اعتبار سے فضیلت عطا فرمائی ہے، ﴿۲﴾ اللہ نے سبھوں سے بھلائی کا وعدہ فرمایا ہے، اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت سے نوازا ہے۔ ﴿۹۵﴾

← یہ کہ اللہ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے؛ اسی لئے فقہاء کے نزدیک کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ یہی ہے اور بعض علماء کے نزدیک تو قاتل کے لئے توبہ ہی نہیں ہے، ویسے جمہور اہل سنت کے نزدیک قاتل کی توبہ بھی —— اللہ چاہیں —— تو قبول ہوسکتی ہے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ رہیں گے؛ بلکہ اپنے گناہ کی سزا پانے کے بعد دوزخ سے نکالے جائیں گے، جیسا کہ احادیث اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے —— یا اس آیت میں ایسے قاتل مراد ہیں جن کو پشیمانی تک نہ ہوا اور توبہ بھی نہ کریں، گویا وہ قتلِ مومن کو گناہ ہی نہیں سمجھتے، ایسا سمجھنے والے دائرہ ایمان سے خارج ہیں؛ لہٰذا ان کے لئے ہمیشہ کی سزا ہے —— اللہ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔

﴿۱﴾ یعنی اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے اور کسی ایسے عقیدہ کا اظہار نہ کرے جو باعث کفر ہے، تو اسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا، اس کا قتل جائز نہ ہوگا اور قاتل پر قتل کی سزا جاری ہوگی، —— اس آیت کے سلسلہ میں کئی واقعات نقل کئے گئے ہیں، حاصل سب کا یہی ہے کہ دورانِ سفر بعض لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سلام کیا، صحابہ رضی اللہ عنہم کو خیال ہوا کہ شاید جان بچانے کے لئے سلام کر رہا ہے؛ چنانچہ قتل کر دیا، اس پر مؤاخذہ ہوا؛ البتہ چوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم پہلے سے اس تفصیل سے واقف نہ تھے، اس لئے تنبیہ پر اکتفا فرمایا گیا، (دیکھئے: بخاری، حدیث نمبر: ۴۵۹۱) علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ان احادیث وواقعات کو تفصیل سے نقل فرمایا ہے۔

(دیکھئے: فتح القدیر، تفسیر آیت مذکورہ وتفسیر ابن کثیر: ۱/۷۴۳) ←

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ع ۱۳/۵/۱۰
ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ
اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

یعنی: اللہ کی طرف سے (بلند) درجات، بخشش اور رحمت حاصل ہوگی، ﴿۱﴾ اور اللہ بہت بخشنے والے اور مہربان ہیں ﴿۲﴾ ﴿۹۶﴾ بے شک فرشتے جن لوگوں کی روح قبض کرتے ہیں، اس حال میں کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، فرشتے ان سے کہتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ لوگ کہتے ہیں: ہم لوگ اس ملک میں بے سہارا تھے، فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ﴿۳﴾ پس! ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔ ﴿۹۷﴾

← ﴿۲﴾ 'مال' سے جہاد اللہ کی راہ میں مال کی قربانی ہے اور 'جان' سے جہاد اللہ کے راستہ میں جان وتن کے ذریعہ کوشش ہیں، جس کی ایک صورت قتال بھی ہے، علم دین کے حصول، نیکی کی دعوت اور برائی سے روکنے کی کوشش 'جہاد بالنفس' میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرات شیخین سے افضل ہیں؛ کیوں کہ انھوں نے بہ مقابلہ ان حضرات کے جہاد زیادہ کیا ہے، درست نہیں ہے؛ کیوں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر جتنے لوگوں نے اور خاص کر رؤساء عرب نے اسلام قبول کیا، شاید ہی کسی اور صحابی کی دعوت پر اتنے اور ایسے لوگ مسلمان ہوئے ہوں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام کو جو قوت وسربلندی حاصل ہوئی، وہ وضاحت کی محتاج نہیں، پھر اگر محض جہاد ہی معیار فضیلت ہو تو جہاد تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ کیا ہے تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں؟

﴿۱﴾ یعنی جنت اور جنت کی نعمتیں۔

﴿۲﴾ یہ بڑے اجر (اجر عظیم) کی وضاحت ہے کہ درجات بھی بلند ہوں گے، گناہ بھی معاف کئے جائیں گے اور اللہ کی رحمتِ خاص بھی شریک حال رہے گی۔

﴿۳﴾ چوں کہ اس زمانہ میں مدینہ ہجرت کئے بغیر دین کے احکام پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا؛ اس لئے ہجرت فرض تھی، بعض لوگ جنھوں نے شروع میں اسلام قبول کیا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ ہجرت نہیں کی، بعد کو کفار مکہ سے جا ملے، انھیں کا تذکرہ ہے، پھر جب مکہ فتح ہوا اور اسلام کو ایسا غلبہ حاصل ہوا کہ احکام دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ اب ہجرت فرض نہیں ہے، (بخاری، باب لا ھجرۃ بعد الفتح، حدیث نمبر: ۳۰۷۸) تاہم اگر پھر کبھی کسی خطہ میں ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ وہاں اسلام پر قائم رہنا دشوار ہوجائے تو ہجرت فرض ہوگی۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ
سَبِیْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَ مَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّ سَعَةً ؕ وَ مَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ
وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَ قَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۰۰﴾ وَ اِذَا ع ۱۴ / ۱۱
ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ
یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾

سوائے ان بے سہارا مردوں، عورتوں اور بچوں کے، جو نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ کوئی راستہ پاتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۹۸﴾ تو اُمید ہے کہ اللہ ان لوگوں کو معاف کردیں گے اور اللہ بہت معاف کرنے والے خوب بخشنے والے ہیں ﴿۹۹﴾ اور جو اللہ کے راستہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں رہنے کی بہت سی جگہیں اور گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتا ہوا نکلے، پھر اسے موت آ پکڑے تو اس کا اجر تو اللہ پر ثابت ہو چکا، اور اللہ بہت بخشنے والے اور مہربان ہیں ﴿۱۰۰﴾ اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کرو، ﴿۲﴾ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کفار تم کو ستائیں گے، ﴿۳﴾ بے شک کفر کرنے والے تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ﴿۱۰۱﴾

﴿۱﴾ جیسے عیاش بن ربیعہ اور سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہما وغیرہ، جن کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار مکہ سے نجات کی دُعائیں فرمایا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۴۰)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے سفر کی وجہ سے کچھ سہولتیں اور رعایتیں رکھی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر مسافت شرعی کا سفر ہو تو چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی، مسافت شرعی سے مراد قدیم پیمائش میں ''چار برید'' ہے جیسا کہ روایات میں آیا ہے، (بخاری تعلیقاً، باب کم یقصر الصلوٰۃ؟) یہ چار برید ۴۸ میل شرعی اور موجودہ مروجہ پیمائش میں مشہور قول کے مطابق تقریباً ۷۷ کیلومیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے، یہ اکثر فقہاء کی رائے ہے، حنفیہ کے یہاں کوئی مخصوص مقدار متعین نہیں، اوسط رفتار سے استراحت کرتے ہوئے تین دن و رات میں طے کی جانے والی مسافت 'سفر شرعی' کی مقدار ہے؛ (بدائع الصنائع: ۱/۲۶۱) لیکن ہمارے زمانہ میں علماء احناف کا فتویٰ بھی وہی چار برید والے قول پر ہے —— پھر حنفیہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے نہ کہ محض جائز؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نماز دو دو رکعت فرض کی گئی تھی، پھر سفر میں یہی برقرار رہی اور حضر یعنی وطن میں رہنے کی حالت میں اس میں اضافہ کردیا گیا، (بخاری، باب التاریخ من أین ارخوا التاریخ؟ حدیث نمبر: ۳۹۳۵) گویا سفر میں نماز فرض ہی ہوئی ہے دو رکعت، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ تم پر اللہ کا صدقہ ہے، پس اللہ کے صدقہ کو قبول کرو، (ابوداؤد، باب صلوٰۃ المسافر، حدیث نمبر: ۱۱۹۹) اس سے بھی قصر کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ←

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۚ
فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۠ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ
وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ
وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ
مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲

اور جب آپ خود ان میں ہوں، پھر آپ ان کے لئے نماز قائم کریں، تو ان میں ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار بھی لئے رہیں، ﴿۱﴾ جب یہ سجدہ کرلیں تو تمہارے پیچھے ہو جائیں، ﴿۲﴾ اور دوسری جماعت جس نے نماز ادا نہیں کی ہے، آجائے، پھر وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کریں اور اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار بھی لئے رہیں، ﴿۳﴾ ایمان نہ لانے والے چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیار اور اسباب سے غافل ہو جاؤ کہ وہ یکبارگی تم پر حملہ کردیں، اور تم پر اس میں کچھ حرج نہیں کہ اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا بیمار ہو تو اپنے ہتھیار تو رکھ دو اور بچاؤ کا سامان لئے رہو، بے شک اللہ نے ایمان نہ لانے والوں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۝۱۰۲

← ﴿۳﴾ اس سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جب دشمن کا خوف ہو تبھی قصر کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اصل میں یہ فقرہ محض بیانِ واقعہ کے طور پر ہے؛ کیوں کہ اس زمانہ میں عام طور پر سفر دشمن کے خطرات سے خالی نہ ہوتا تھا، ورنہ تو رسول اللہ ﷺ کا پوری طرح پُر امن سفر میں بھی قصر کرنا ثابت ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ ومدینہ کے درمیان دو رکعتیں پڑھی ہیں، جب کہ ہم مامون تھے اور کوئی خوف نہ تھا، (ترمذی، باب ماجاء فی التفسیر فی السفر، حدیث نمبر: ۵۴۷) اسی مضمون کی روایت بخاری نے حضرت حارثہ بن وہب خزاعی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے: (بخاری، باب الصلوٰة بمنٰی، حدیث نمبر: ۱۰۸۳) اس لئے ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء ومحدثین کی رائے یہی ہے کہ قصر مطلقاً سفر کی وجہ سے درست ہے، سفر پُرخطر ہو یا پُرامن۔

﴿۱﴾ ہتھیار لینے سے مراد ہاتھوں میں ہتھیار لئے رہنا نہیں ہے؛ بلکہ ہتھیار کا پہنے رہنا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی دشمن کے مقابل چلے جائیں۔

﴿۳﴾ نماز کی اس کیفیت کو ''صلوٰة خوف'' کہتے ہیں، حدیث میں اس نماز کی مختلف کیفیتیں منقول ہیں، امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں نماز خوف سے متعلق روایات کا نسبتاً زیادہ احاطہ کیا ہے، (دیکھئے: باب صلوٰة الخوف، حدیث نمبر: ۱۲۳۶-۱۲۳۹) فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں ـــــ اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ میں کھڑے ہیں، دشمن مقابلہ پر ہے اور خطرات کی گھٹائیں ہر سو چھائی ہوئی ہیں، اس وقت شمشیر کے سایہ میں بھی مومن کو نماز ادا کرنی ہے!

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ
فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ
الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا
ع ۱۵/۱۲ يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ
النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾

پس! جب تم نماز ادا کرلو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے یاد کرو، ﴿۱﴾ پھر جب تمہیں اطمینان ہو جائے تو (تمام آداب کی رعایت کرتے ہوئے) نماز قائم کرو، بے شک نماز مسلمانوں پر بروقت مقررہ کی پابندی کے ساتھ فرض ہے ﴿۱۰۳﴾ اور کافروں کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تم تکلیف سے دوچار ہوئے ہو تو وہ بھی تو تمہارے تکلیف اُٹھانے کی طرح تکلیف اُٹھا چکے ہیں؛ حالاں کہ جس چیز کی اُمید اللہ سے تم رکھتے ہو، وہ نہیں رکھتے، ﴿۲﴾ اور اللہ خوب جاننے والے اور حکمت والے ہیں ﴿۱۰۴﴾ بے شک ہم نے آپ کی طرف برحق کتاب اُتاری ہے؛ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق جو اللہ آپ کو سمجھائے فیصلہ کریں، نیز آپ خیانت کرنے والوں کے طرفدار نہ ہو جائیے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۵﴾

﴿۱﴾ یعنی نماز کے لئے تو مخصوص ہیئت کی رعایت ضروری ہے؛ لیکن اللہ کا ذکر دل سے ہو یا زبان سے، اس کے لئے کوئی ہیئت وکیفیت مقرر نہیں ہے، کھڑے ہو، بیٹھے ہو، لیٹے ہو، جس حال میں ہو، اللہ کے ذکر میں مشغول رہو۔

﴿۲﴾ غزوۂ اُحد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کچھ دور تک کفار مکہ کا تعاقب کرنے کا حکم دیا تھا؛ تاکہ دشمنوں پر مسلمانوں کی ہیبت قائم رہے اور ان کو پلٹ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو، اس وقت مجاہدین زخم سے چور تھے، ان سے فرمایا گیا کہ اس موقع پر حوصلہ نہ ہاریں، اور جہاں تک دکھ اُٹھانے اور زخم کھانے کی بات ہے تو اس سے تو دشمن بھی دوچار ہوئے ہیں، پھر مسلمانوں کو تو اسی دکھ اور آزمائش پر جنت اور آخرت کی نعمتوں کی اُمید ہے، کافروں کو تو یہ اُمید بھی نہیں۔

﴿۳﴾ یہ اور آئندہ آیات ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، مدینہ میں ایک خاندان ''بنواُبیرق'' تھا، ان میں 'بُشر' نامی ایک شخص منافق تھا، اشعار کے ذریعہ مسلمانوں کی مذمت کرتا اور دوسروں کی طرف منسوب کرکے ان بے ہودہ اشعار کو نقل کرتا اور پھیلاتا، اخلاق واطوار بھی اس کے بہتر نہ تھے؛ چنانچہ شام سے ایک تجارتی قافلہ آیا، حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے چچا رِفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے قافلہ سے سفید اچھا آٹا خرید کیا اور اسے بالا خانہ میں رکھ دیا، جس میں ان کے ہتھیار بھی تھے، رات میں بشر نے مکان میں نقب لگائی اور سامان وہتھیار دونوں لے بھاگا، صبح تلاش ہوئی تو لوگوں نے بعض قرائن وعلامات کی وجہ سے بشر پر شبہ ظاہر کیا، تفتیش کے دوران خود بنوابیرق نے ایک مخلص مسلمان حضرت لبید بن سہل رضی اللہ عنہ پر اس چوری کا الزام لگا دیا، چچا کی خواہش پر حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں مقدمہ پیش کیا اور بشر کو ملزم ٹھہرایا اور کہا کہ کم سے کم ہتھیار واپس مل جائے، ادھر بشر کے ←

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِیْمًا ۙ﴿۱۰۷﴾ یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا
یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا
یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ
عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ
ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ مَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰى
نَفْسِهٖ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۱۱﴾

اور اللہ سے مغفرت کی دُعاء کیجئے، بے شک اللہ معاف کرنے والے اور بہت مہربان ہیں ﴿۱۰۶﴾ آپ ان کے طرفدار نہ ہوجائیں، جو اپنے آپ سے خیانت کرتے رہے، ﴿۱﴾ یقیناً اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتے جو خیانت کرنے والا اور گنہگار ہو ﴿۱۰۷﴾ وہ لوگوں سے چُھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے؛ حالاں کہ اللہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں، جب وہ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ بات کا رات میں مشورہ کرتے رہتے ہیں، اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، سب اللہ کے قابو میں ہے ﴿۱۰۸﴾ دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے تم نے مدافعت کرلی تو قیامت کے دن اُن کی طرف سے اللہ کے سامنے کون مدافعت کرے گا یا کون اُن کا کارساز ہوگا؟؟ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۹﴾ اور جو برا عمل کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر اللہ سے مغفرت کا طلب گار ہو، تو اللہ کو خوب بخشنے والا اور مہربان پائے گا ﴿۱۱۰﴾ اور جو گناہ کرتا ہے، وہ اپنے آپ ہی کے حق میں گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، ﴿۳﴾ اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں۔ ﴿۱۱۱﴾

← ہمنواؤں نے اُسَیر بن عُروہ رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنایا، اسیر نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ قتادہ نے بلاثبوت ہم میں سے ایک مخلص مسلمان پر چوری کی تہمت لگائی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم نے بلاثبوت وشہادت ایک مسلمان کو متہم کیا، رِفاعہ نے بھی صبر کیا، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی اور بشر کی خیانت کا پردہ فاش کردیا گیا، پھر بشر نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا، ہتھیار واپس کیا اور مشرکین مکہ سے جاملا۔ (ترمذی، باب ومن سورۃ النساء، حدیث نمبر ۳۰۳۶)

﴿۱﴾ کیوں کہ خیانت کا عذاب خود اسی کی ذات کو جھیلنا ہے؛ اس لئے دوسروں کے ساتھ خیانت انجام کے اعتبار سے خود اپنی ذات کے ساتھ خیانت ہے۔

﴿۲﴾ جن مخلص مسلمانوں نے ناواقفیت کی وجہ سے بشر کی تائید کی تھی، ان سے خطاب ہے۔

﴿۳﴾ چوں کہ گناہ کی سزا اسی کو برداشت کرنی ہے؛ اس لئے یہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

وَ مَنۡ یَّکۡسِبۡ خَطِیۡٓئَۃً اَوۡ اِثۡمًا ثُمَّ یَرۡمِ بِہٖ بَرِیۡٓـئًا فَقَدِ احۡتَمَلَ بُہۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۱۱۲﴾ ع ۲۶ ۸ ۱۳
وَلَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ وَ رَحۡمَتُہٗ لَہَمَّتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ اَنۡ یُّضِلُّوۡکَ ؕ وَ مَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ
اَنۡفُسَہُمۡ وَ مَا یَضُرُّوۡنَکَ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ
تَکُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَ کَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَیۡرَ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰىہُمۡ اِلَّا مَنۡ اَمَرَ الثلثة
بِصَدَقَۃٍ اَوۡ مَعۡرُوۡفٍ اَوۡ اِصۡلَاحٍۭ بَیۡنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ
فَسَوۡفَ نُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۱۴﴾ وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی
وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۷ ۳ ۱۴

اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرے، پھر اس کو کسی بے قصور پر تھوپ دے تو اس نے بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا ﴿۱۱۲﴾ اور اگر آپ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک جماعت نے تو طے ہی کر لیا تھا کہ آپ کو بھٹکا دے اور وہ اپنے آپ ہی کو بھٹکا رہے ہیں، ﴿۱﴾ وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، آپ پر تو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت اُتاری ہے، اور جو باتیں نہیں جانتے تھے، آپ کو ان کے علم سے نوازا ہے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہے ﴿۱۱۳﴾ لوگوں کی بہت سی سرگوشیوں میں خیر نہیں ہے، سوائے اس کے جو صدقہ کا یا بھلائی کا یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے، اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے جو ایسا کرے گا، ہم عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائیں گے ﴿۱۱۴﴾ اور جو اپنے آپ پر ہدایت واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کے راستہ کے بجائے دوسرے راستہ کی پیروی کرے، ﴿۲﴾ تو ہم اس کو 'جو کر رہا ہے' کرنے دیں گے اور اس کو دوزخ میں ڈال دیں گے، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے! ﴿۱۱۵﴾

﴿۱﴾ یعنی بِشر کے مقدمہ میں آپ کو غلط باور کرانا چاہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حقیقتِ حال سے آگاہ فرما دیا، پس! اس کا نقصان انھوں نے اپنے آپ ہی کو پہنچایا۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ مومنوں کا جو متفقہ طریقہ ہے، اس کی پیروی واجب ہے اور اس کی مخالفت گناہ و گمراہی ہے، اسی سے قانون اسلامی کے ماہرین نے اجماعِ اُمت کے حجت و دلیل ہونے کو ثابت کیا ہے اور غالباً سب سے پہلے امام شافعی رحمہ اللہ نے اس آیت سے اجماع پر استدلال کیا ہے، قرآن میں اُمت کے اجماع و اتفاق کے دلیل ہونے پر اس سے زیادہ واضح شاید کوئی اور آیت نہیں ہے، حدیث سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ اس اُمت کو کبھی بھی غلطی (ضلالت) پر جمع نہیں فرمائے گا؛ نیز ارشاد فرمایا: جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہے، جو جماعت سے کٹا، وہ کٹ کر داخلِ دوزخ ہوا۔
(ترمذی، باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ، حدیث نمبر: ۲۱۶۷)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اِنٰثًا ۚ وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾
لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ
وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ
الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

وقف لازم

یقیناً اللہ اِس بات کو معاف نہیں کریں گے کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہیں، معاف فرما دیں گے، اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے، وہ حق سے دور جا پڑا ﴿۱۱۶﴾ وہ اللہ کو چھوڑ کر صرف دیویوں کی پوجا کرتے ہیں، اور (اصل میں) وہ سرکش شیطان کی پوجا کر رہے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۱۷﴾ جس پر اللہ کی لعنت ہے، جس نے کہا تھا: ''میں تمہارے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا ﴿۱۱۸﴾ میں ضرور انھیں گمراہ کروں گا، انھیں آرزوئیں دلاؤں گا، ﴿۲﴾ ان کو سکھاؤں گا کہ جانوروں کے کان کاٹیں، اور ان کو حکم دوں گا کہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کر دیں'' ﴿۴﴾ اور جو اللہ کو چھوڑ شیطان کو دوست بنا لے، اس نے کھلا ہوا نقصان اُٹھایا۔ ﴿۱۱۹﴾

﴿۱﴾ مشرکانہ نفسیات میں سے یہ ہے کہ اکثر مشرک مذاہب میں مؤنث اور مادہ کی پوجا کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے، عربوں میں لات ومَنات اور عُزّیٰ کی پوجا کا ذکر ملتا ہے، یہ سب ان کے عقیدہ کے مطابق عورتیں تھیں، ہندوستان میں سرسوتی، دُرگا اور سیتا وغیرہ کی پوجا اب تک ہوتی ہے، گائے کی پرستش مصر و یونان میں ہوا کرتی تھی اور ہندوستان میں اب تک ہوتی ہے؛ بلکہ ہندوؤں کے بعض فرقوں میں اور بعض علاقوں میں نسوانی اعضاء کی بھی پوجا کی جاتی ہے، یہ ایک متضاد فکر ہے کہ عورتوں کو کمزور بھی سمجھا جائے اور انھیں خدا کا درجہ بھی دیا جائے؛ اسی لئے قرآن نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ اصل میں شیطان کی پرستش ہے؛ کیوں کہ اسی کے حسبِ منشاء یہ حرکت کی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ گمراہی دو راستوں سے آتی ہے، فکر و عقیدہ کی غلطی سے اور خواہشات نفس کی پیروی سے، ''میں انھیں گمراہ کروں گا'' میں فکر و عقیدہ کی راہ سے بھٹکانے کی طرف اشارہ ہے، اور ''آرزوئیں دلاؤں گا'' سے خواہشات نفس کی پیروی کی طرف۔

﴿۳﴾ چنانچہ مشرکین عرب جانوروں کے کان کاٹا کرتے تھے، اور ان کو 'بحیرہ' اور 'سائبہ' کہتے تھے، خود قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ (المائدۃ:۱۰۳)

﴿۴﴾ خلق الٰہی میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ تخلیق کا جو مقصد و منشاء ہو، اسے بدل دیا جائے، جیسے سرجری کے ذریعہ جنس کی تبدیلی، یا نس بندی آپریشن کے ذریعہ افزائش نسل کی راہ مسدود کر دینا، علاج کے طور پر آپریشن وغیرہ اس میں داخل نہیں؛ کیوں کہ ←

يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲۰ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا
يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ۝۱۲۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝۱۲۲
لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۝۱۲۳ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۝۱۲۴

شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اوران کو اُمیدیں دلاتا ہے؛﴿۱﴾ حالاں کہ شیطان ان سے جو کچھ وعدہ کررہا ہے، وہ محض دھوکہ ہے ۝۱۲۰ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے ۝۱۲۱ جولوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، عنقریب ہم ان کو ایسی جنتوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہوسکتی ہے! ۝۱۲۲ نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر؛ (بلکہ) جو بھی برائی کرے گا، اس کی سزا پائے گا﴿۲﴾ اور اللہ کے مقابلہ اسے کوئی دوست اور مددگار حاصل نہ ہوگا ۝۱۲۳ اور جو بھی مرد وعورت نیک عمل کریں گے،﴿۳﴾ —— بہ شرطیکہ وہ مسلمان بھی ہوں —— تو وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں کی جائے گی ۔ ۝۱۲۴

← یہ مقصد تخلیق کو بدلنا نہیں ہے؛ بلکہ اس کو حاصل کرنا ہے، اسی طرح اپنے آپ کو زیادہ خوبصورت ظاہر کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری کرانا بھی اس ممانعت میں داخل ہے؛ البتہ اگر جسم میں کوئی عیب ہوتو اس کو دور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری جائز ہے؛ کیوں کہ یہ علاج ہے اور علاج جائز ہے۔

﴿۱﴾ آرزوئیں دلانے سے مراد یہ ہے کہ گناہوں کو خوبصورت اور پُرکشش بنا کر پیش کرتا ہے اور اس کے عقلی و اخلاقی جواز کی دلیلیں ذہن میں ڈالتا ہے، مثلاً یہ کہ سود معیشت کے لئے ایک ضروری چیز ہے اور مروجہ سود میں غریبوں کا استحصال نہیں، پردہ آنکھوں کا ہے، جسم کے پردہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے ترقی رک جاتی ہے، وغیرہ۔

﴿۲﴾ یعنی آخرت کا فیصلہ صرف تمناؤں اور آرزوؤں پر نہیں ہوگا، بلکہ اعمال پر ہوگا، ایک بار عیسائیوں اور مسلمانوں میں بحث چھڑ گئی، اور دونوں نے دعویٰ کر دیا کہ جنت میں ہم داخل ہوں گے، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی ۔ (تفسیر طبری: ۵/۱۸۵)

﴿۳﴾ مرد وعورت دونوں کی مستقل حیثیت ہے، دونوں اپنے اپنے اعمال پر جزاء وسزا کے مستحق ہیں، قرآن کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ عورت انسانیت کی ایک مستقل اور ذمہ دار صنف ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ
وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي ۱۸ ع ۱۱ ۱۵
الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ
وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور اُس سے بہتر دین کس کا ہوسکتا ہے، جس نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا، وہ نیکی پر کار بند ہے اور ابراہیم کے دینِ توحید کی پیروی کررہا ہے، اور اللہ نے ابراہیم کو دوست بنایا ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۲۵﴾ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ ہی کے لئے ہے، اور ہر چیز اللہ کے قابو میں ہے ﴿۱۲۶﴾ اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں (ان ہی باتوں کا جو پہلے گذر چکی ہیں) حکم دیتے ہیں ﴿۲﴾ اور ان باتوں کا جو تم پر ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں سنائی جاتی ہیں، جن کو تم ان کا مقررہ حق تو نہیں دیتے اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کرلو، ﴿۳﴾ اور ان احکام کا جو بے سہارا بچوں کی بابت نازل ہوئے ہیں، نیز اس بات کا کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور تم جو بھی نیکی کروگے، اللہ اس سے خوب واقف ہیں۔ ﴿۱۲۷﴾

﴿۱﴾ ''خلیل'' خُلّہ سے ہے، ''خلہ'' کے معنی کامل درجہ کی محبت کے ہیں، خلیل کے معنی کامل درجہ محبت کرنے والے کے ہوئے، یہ مقامِ قرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمایا گیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وفات سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح مجھے بھی خلیل بنایا ہے، إن الله اتخذ ني خليلاً كما اتخذ إبراهيم خليلا، (مسلم، باب النبي عن بناء المسجد الخ، حدیث نمبر: ۱۱۸۸، نیز دیکھئے: مستدرک حاکم: ۲/ ۵۵۰) پس! اس مقامِ قرب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شریک ہیں۔

﴿۲﴾ اسلام سے پہلے عورتوں اور بچوں کو میراث نہیں دی جاتی تھی اور خیال یہ تھا کہ چوں کہ یہ لوگ دشمنوں سے لڑ نہیں سکتے، نہ قبیلہ کی حفاظت کرسکتے ہیں، نہ خود اپنی؛ اس لئے میراث میں ان کا کوئی حق نہیں، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، (طبری: ۴/ ۱۹۱) اور اولاً ان احکام میراث کی طرف متوجہ فرمایا گیا، جن کا ذکر اس سورہ کی آیات نمبر: ۱۱، ۱۲ میں آیا ہے، پھر عورتوں اور یتیم بچوں کے بارے میں دوسری ہدایات دی گئیں۔

﴿۳﴾ ''ترغبون'' کا لفظ رغبت سے ہے: ''رغبت'' عربی زبان میں دو متضاد معنوں کے لئے آتا ہے، چاہنا اور نہ چاہنا، عربی گرامر کی رو سے اگر اس کے بعد ''فی'' آئے تو چاہنے اور راغب ہونے کے معنی ہیں اور ''عن'' آئے تو رغبت نہ ہونے اور نہ چاہنے کے معنی ہیں، یہاں یہ لفظ ''فی'' اور ''عن'' کے بغیر آیا ہے، اس لئے دونوں معنوں کی گنجائش ہے، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہم اللہ نے چاہنے کے معنی لئے ہیں، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، اس صورت میں ←

وَ اِنِ امۡرَاَۃٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِہَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَاۤ اَنۡ یُّصۡلِحَا بَیۡنَہُمَا صُلۡحًا ؕ وَ الصُّلۡحُ خَیۡرٌ ؕ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ﴿۱۲۸﴾ وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَ لَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡہَا کَالۡمُعَلَّقَۃِ ؕ وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۲۹﴾ وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر عورت کو اپنے شوہر سے زیادتی یا بے رُخی کا اندیشہ ہو تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپس میں کچھ صلح کرلیں اور صلح (بہرحال) بہتر ہے، اور حرص تو دلوں میں بسا دی گئی ہے، اور اگر تم اچھا برتاؤ کرو اور تقویٰ اختیار کئے رہو، تو اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں ﴿۱۲۸﴾ اور تمہارا کتنا ہی جی چاہے تم بیویوں کے درمیان (پوری طرح) عدل نہیں کرسکتے، تو (ایک ہی کی طرف) پوری طرح جھک نہ جاؤ کہ دوسری کو ایسا چھوڑ دو کہ جیسے وہ لٹکی ہوئی ہے، اور اگر اصلاح کرلو اور احتیاط برتو تو اللہ معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۲۹﴾ اور اگر دونوں علاحدہ ہوجائیں تو اللہ (اپنے خزانہ کی) وسعت سے ہر ایک کی ضرورت پوری کردیں گے، اور اللہ بڑی گنجائش والے اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۳۰﴾

← مطلب یہ ہے کہ تم لڑکیوں کا حق تو ادا نہیں کرتے؛ لیکن نکاح صرف اس لئے کرنا چاہتے ہو کہ ان کی جائداد اپنے قبضہ میں رہے، مولانا تھانوی اور مولانا دریابادی رحمہما اللہ نے دوسرے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کا کسی سے نکاح نہیں کرتے؛ تاکہ دولت ہاتھ سے نہ جائے اور خود شکل وصورت کی وجہ سے ان سے اپنا نکاح کرنا نہیں چاہتے۔

﴿۱﴾ زیادہ تر یہی ترجمہ کیا گیا ہے، شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ صلح کرنے سے کیا ہے، ایسی صورت میں ''اصلاح کرلو'' کی بجائے ترجمہ ہوگا: ''اور اگر تم صلح کرلو''۔

﴿۲﴾ شریعت میں مرد کا طلاق دینا اور عورت کا خلع طلب کرنا دونوں ہی نہایت ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن جب ایک دوسرے کے ساتھ نباہ ممکن نہ رہے تو مجبوری میں دونوں ہی کی اجازت ہے، اسی سلسلہ میں یہاں دو بنیادی ہدایات دی گئی ہیں، اولاً یہ کہ جب شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے توجہی پائی جائے تو میاں بیوی کو آپس میں کوئی بات طے کرلینی چاہئے اور صلح کی صورت نکالنی چاہئے، یا تو عورت اپنا کوئی حق چھوڑ دے، یا مرد طلاق دے دے، یا مرد اپنے رویہ کو بہتر کرے —— دوسری ہدایت یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان برابری کا سلوک واجب ہے؛ لیکن یہ برابری ظاہری افعال نفقہ، لباس، رہائش وغیرہ میں تو کی جاسکتی ہے، محبت اور دل کے رجحان میں انسان مجبور ہے، تو کم سے کم ظاہری حقوق میں برابری کا برتاؤ ضرور کرے، ایسا نہ ہو کہ ایک کی طرف پوری طرح دل پھینک دے —— عام طور پر علاحدگی کی صورت میں جو فریق علاحدگی نہ چاہتا ہو، اس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ اس کی آئندہ زندگی کیوں کر بسر ہوگی؟ تو اللہ تعالیٰ نے اطمینان دلایا کہ اگر علاحدگی ہوئی تو اللہ دونوں کو بے نیاز کردیں گے اور اپنے خزانہ غیب سے دونوں کی ضرورتیں پوری فرمائیں گے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ
غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ
يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ يٰۤاَيُّهَا ع ۱۹ ۸ ۱۶
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ
وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

اور وہ تمام چیزیں اللہ ہی کی ہیں جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، اور ان لوگوں کو بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تم کو بھی ہم نے نصیحت کی ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو، ﴿۱﴾ اور اگر تم بھی ناشکری کرو، تو یاد رکھنا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اللہ ہی کی ہیں اور اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہیں ﴿۱۳۱﴾ آسمانوں کی اور زمین کی ساری چیزیں اللہ ہی کی ملکیت ہیں، اور اللہ کارساز ہونے کے اعتبار سے کافی ہیں ﴿۱۳۲﴾ اے لوگو! اگر اللہ چاہیں تو تمہیں ختم کر دیں اور دوسروں کو لے آئیں، اللہ اس پر پوری طرح قادر ہیں، ﴿۱۳۳﴾ جو دنیا ہی کا انعام چاہتا ہے تو (سمجھ لے کہ) اللہ ہی کے پاس دنیا کا انعام بھی ہے اور آخرت کا بھی، ﴿۲﴾ اور اللہ سننے اور دیکھنے والے ہیں ﴿۱۳۴﴾ اے مسلمانو! تم لوگ انصاف قائم کرنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے بنو، گو اپنے آپ کے یا والدین یا رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ ہو، (جس کے خلاف گواہی دے رہے ہو) وہ مالدار ہو یا غریب؛ کیوں کہ اللہ ہی ان دونوں کے زیادہ خیر خواہ ہیں، ﴿۳﴾ پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ انصاف سے ہٹ جاؤ اور اگر سخن سازی یا پہلو تہی کرو گے تو اللہ تمہارے کاموں سے خوب باخبر ہیں۔ ﴿۱۳۵﴾

﴿۱﴾ قرآن میں تو کتنے ہی مواقع پر؛ بلکہ قدم قدم پر خدا سے ڈرنے کا حکم ہے، آمیزشوں اور ملاوٹوں کے باوجود پہلی آسمانی کتابوں میں بھی اس کا حکم موجود ہے، انجیل میں ہے: ''اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے''۔ (متی ۱۰:۲۸)

﴿۲﴾ یعنی گو تمہارا مقصود آخرت ہونا چاہئے؛ لیکن اگر دنیا کی نعمتیں مقصود و مطلوب ہوں، تو یہ بھی خدا ہی سے ملیں گی۔

﴿۳﴾ یعنی مالدار کے حق میں مروت وجاہ کی وجہ سے اور غریب کے حق میں اس کی ہمدردی و شفقت کی وجہ سے گواہی نہ دینی چاہئے؛ حالاں کہ اللہ کو اپنے بندوں سے خواہ دولت مند ہو یا غریب، جو تعلق ہو سکتا ہے اوروں کو نہیں ہو سکتا، اور خود اللہ نے دولت وغربت کا لحاظ کئے بغیر اظہار حق کا حکم دیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ
الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ
ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا
لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ۭ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ
الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ؕ

اے مسلمانو! اللہ پر، اس کے رسول پر، اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل فرمائی، ایمان لاؤ، جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں اور آخرت کے دن کا انکار کرے وہ ہدایت سے بہت دور جا پڑا ﴿۱﴾ ﴿۱۳۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا اور کفر میں بڑھتے چلے گئے، ﴿۲﴾ اللہ نہ ان کو معاف کریں گے اور نہ درست راستہ کی ہدایت سے سرفراز فرمائیں گے ﴿۳﴾ ﴿۱۳۷﴾ منافقین کو ''خوشخبری'' دے دیجئے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۳۸﴾ جو مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت کے متلاشی ہیں؟ بے شک عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لئے ہے۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۳۹﴾

﴿۱﴾ غرض کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اب جب تک آپ ﷺ پر اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید پر ایمان نہ لائے، ایمان معتبر نہیں، اسی طرح گذشتہ انبیاء پر بھی ایمان ضروری ہے اور ان پر اترنے والی کتابوں پر بھی ''اجمالی'' ایمان لانا ضروری ہے؛ کہ ان پر جو کتابیں اُتری ہیں، ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں، موجودہ تورات و انجیل میں چوں کہ بہت سی تبدیلیاں اور اضافے ہیں؛ اس لئے ان کی مکمل تصدیق نہ درست ہے اور نہ ضروری۔

﴿۲﴾ یعنی موت تک کفر ہی پر قائم رہے — بعض مفسرین نے اس کا مصداق یہودیوں کو قرار دیا ہے، بعض نے مرتدین کو اور بعض نے منافقین کو، اور آیت کے اگلے مضمون سے اس آخری رائے کو تقویت پہنچتی ہے۔

﴿۳﴾ یعنی آخرت میں مغفرت سے محروم رہیں گے اور دنیا میں ہدایت سے۔

﴿۴﴾ کافروں کو دوست بنانے سے مراد ایسی دوستی ہے کہ مسلمان ان کی فکر اور تہذیب سے متاثر ہونے لگیں، جس میں ان کی وضع قطع اور طور وطریق کا اختیار کرنا بھی شامل ہے، حسنِ سلوک اور بہتر اخلاق کی حد تک غیر مسلموں سے دوستی میں کوئی حرج نہیں، اس برتاؤ کا حکم تو شریعت نے ہر انسان؛ بلکہ دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی دیا ہے — اس آیت میں اشارہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے سہارے کبھی عزت ووقار حاصل نہیں ہوسکتا، جیسا کہ آج کل مسلم ممالک مغربی طاقتوں کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا
تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ
مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ
عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۲۰ / ۱۷

اور اللہ کتاب (یعنی قرآن مجید) میں تم پر یہ حکم نازل کر چکے ہیں، ﴿۱﴾ کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے تو جب تک وہ دوسری بات میں نہ لگ جائیں، ان کے ساتھ نہ بیٹھو، (ورنہ) اس وقت یقیناً تم بھی ان ہی کے جیسے ٹھہرو گے، ﴿۲﴾ یقیناً اللہ منافقوں اور کافروں سبھوں کو دوزخ میں جمع کریں گے، ﴿۱۴۰﴾ وہ لوگ جو تمہارے بارے میں مصیبت کے منتظر رہتے ہیں، اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہو تو (مسلمانوں سے) کہتے ہیں: کیا ہم بھی تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو کچھ جیت حاصل ہوگئی تو (کافروں سے) کہتے ہیں: کیا ہم تم پر غالب نہیں آگئے تھے اور ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا نہیں تھا؟ ﴿۳﴾ تو اللہ ہی تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کریں گے اور اللہ کافروں کو مسلمانوں پر حجت عطا نہیں فرمائیں گے۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۴۱﴾

﴿۱﴾ سورۂ انعام، آیت نمبر: ۶۸ کی طرف اشارہ ہے، سورۂ نساء مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور سورۂ انعام مکہ میں، یہاں اللہ تعالیٰ نے اسی کا حوالہ دیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی گو ان کو کفر و انکار کا گناہ ہوگا، تم کو اس درجہ گناہ نہ ہوگا؛ لیکن کلامِ الٰہی کا مذاق اڑانے کے باوجود تمہاری خاموشی اور بے غیرتی کی وجہ سے عملی فسق کے مرتکب تم بھی ہوئے، اور تم کو اس کا گناہ ہوگا، معلوم ہوا کہ جن مجلسوں، جلسوں، مشاعروں وغیرہ میں اسلام کا تمسخر کیا جائے اور دین کو برا بھلا کہا جائے تو یا تو انسان اس پر نکیر کی طاقت پاتا ہو تو شریک ہو کر اس برائی کو روکنے کا فرض ادا کرے؛ ورنہ اپنی شرکت سے ایسی مجلسوں کی رونق نہ بڑھائے، ہاں! جب ایسے آوارہ خیال لوگ اس قسم کی بے ہودہ گفتگو میں مصروف نہ ہوں، اس وقت ان سے بات چیت کی گنجائش ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت میں منافقین کا طرزِ عمل بتایا گیا ہے، جو وقتی نفع کے لئے حسب موقع مسلمانوں سے مسلمانوں کی سی اور کافروں سے ان کی سی باتیں کیا کرتے تھے۔

﴿۴﴾ یعنی دنیا چوں کہ امتحان کی جگہ ہے؛ اس لئے کبھی مسلمانوں کو اور کبھی ان کے مخالفین کو ظاہری غلبہ حاصل ہوتا رہے گا؛ ←

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ
يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ
اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا
مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

بے شک منافقین اللہ سے چالبازی کرتے ہیں اور اللہ خود ان کو چالبازی کی سزا چکھائیں گے،﴿۱﴾ اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بے دلی کے ساتھ، لوگوں کو دکھانے کے لئے،﴿۲﴾ اور اللہ کو وہ بہت ہی کم یاد کرتے ہیں ﴿۱۴۲﴾ دونوں کے درمیان بے یقینی میں مبتلا ہیں، نہ اِدھر نہ اُدھر، اور جسے اللہ ہی ہدایت سے محروم رکھیں تو تم ہرگز اس کے لئے کوئی راستہ نہیں پاسکتے ﴿۱۴۳﴾ اے مسلمانو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنالو، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے ہی خلاف اللہ کی کھلی ہوئی حجت قائم کرلو؟ ﴿۳﴾ ﴿۱۴۴﴾ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں رہیں گے،﴿۴﴾ اور تم ان کے لئے کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ ﴿۱۴۵﴾

← لیکن آخرت میں چوں کہ قطعی فیصلہ ہونا ہے، اور وہاں دلیل و حجت کام آئے گی نہ کہ زور آوری، تو وہاں کافروں کو مسلمانوں پر حجت کے اعتبار سے غلبہ حاصل نہ ہوسکے گا —— ''سبیل'' کا ترجمہ اکثر مفسرین قرطبی بیضاوی وغیرہ نے ''حجۃ'' ہی سے کیا ہے۔

﴿۱﴾ لغوی معنی ہے: اللہ بھی ان کو دھوکہ دے گا، عربی زبان میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک غلطی کے جواب میں جو عمل ہو، اس کو بھی اسی لفظ سے تعبیر کردیتے ہیں، جیسے برائی کے بدلہ کو برائی کہہ دیتے ہیں، جزاء سیئة سیئة مثلها، (الشوریٰ:۴۰) اور دھوکہ کی سزا کو دھوکہ —— یہاں اسی کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی عمل کو ضائع کرنے والے دوہرے اسباب جمع ہیں، اندر سے سستی و کاہلی، باہر سے دکھاوا اور نمائش۔

﴿۳﴾ غیر مسلموں کے ساتھ انسانی ہمدردی حسن سلوک اور غم خواری جائز ہے اور خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؛ لیکن ایسی دوستی جو انسان کے افکار و نظریات، اخلاق و اطوار اور معاشرت پر اثر انداز ہونے لگے جائز نہیں، اور ''موالات'' سے ایسی ہی دوستی مراد ہے، غیر مسلموں سے ایسی گہری دوستی رکھنا اور اپنی زندگی میں اس کا اثر قبول کرنا اللہ کے حکم کی واضح خلاف ورزی ہے، جو قیامت میں اس کے خلاف حجت قرار پائے گی۔

﴿۴﴾ دوزخ کے سات درجے ہوں گے، سب سے نچلا درجہ ''ہاویہ'' نامی ہوگا، جو سب سے تکلیف دہ ہوگا، اسی میں منافقین رہیں گے، (تفسیر ابن کثیر:۶۸۱/۲) —— اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کرلیں، اپنے عمل کو درست کرلیں، اللہ (کے احکام) کو مضبوطی سے تھام لیں، ﴿۱﴾ اور اپنے دین کو اللہ ہی کے لئے خالص کرلیں، تو وہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہوں گے، اور عنقریب اللہ مسلمانوں کو بڑا اجر عطا فرمائیں گے ﴿۱۴۶﴾ اگر تم شکرگذار بنو اور ایمان لے آؤ تو خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کیا کام ہے؟ اور اللہ قدرداں اور خوب جاننے والے ہیں۔ ﴿۱۴۷﴾

﴿۱﴾ یعنی احکام الٰہی کی پوری طرح اطاعت کریں۔

الجزء ۶

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾
اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ
بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ
يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱

اللہ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے ،سوائے اس شخص کے جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۴۸﴾ تم بھلائی کھلم کھلا کرو یا چھپا کر، یا برائی سے درگذر کرو (اللہ تم کو معاف کردیں گے)؛ کیوں کہ اللہ بہت معاف کرنے والے اور بہت قدرت والے ہیں ﴿۱۴۹﴾ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں ، نیز کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں ، اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان ایک راستہ نکال لیں ﴿۲﴾ ﴿۱۵۰﴾ وہی درحقیقت کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۵۱﴾ اور جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا ،ضرور اللہ ان کو ان کا اجر عطا کریں گے اور اللہ بخشنے والے اور مہربان ہیں ۔ ﴿۱۵۲﴾

﴿۱﴾ غرض کہ بری بات کا زبان پر لانا بھی برا ہے؛ البتہ مظلوم کو سچائی کے دائرہ میں رہتے ہوئے ظالم کے خلاف زبان کھولنے کی اجازت ہے ؛ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ مظلوم کے لئے ظالم کی غیبت کرنا جائز ہے ؛ کیوں کہ اس کا مقصد اپنے آپ کو ظلم سے بچانا ہے ، (دیکھئے : احیاء علوم الدین للغزالی : ۳/ ۲۰۴ ، شرح نووی علی مسلم ، : ۲/ ۳۲۲ ، باب تحریم الغیبۃ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بری بات کہنے سے بددُعاء مراد لی ہے ، یعنی کسی مسلمان کے لئے بددُعاء جائز نہیں ، البتہ مظلوم ظالم کے خلاف بددُعاء کرسکتا ہے ۔ (طبری : ۶/ ۳)

﴿۲﴾ ایمان کے لئے اللہ کے ساتھ رسول کو ماننا اور تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ، یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے تھے ، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر — جیسا کچھ سہی — ایمان رکھتے ہیں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے ہیں ، یہاں ان ہی کا ذکر ہے ، صرف مسلمان ہی ایسی اُمت ہیں ، جو تمام انبیاء برحق پر ایمان رکھتے ہیں ۔

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَیْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۱۵۳﴾ وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِیْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِی السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ﴿۱۵۴﴾

اہل کتاب آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اُتار دیں تو (باعثِ تعجب نہیں؛ کیوں کہ) انھوں نے موسیٰ سے تو اس سے بھی بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا، ان لوگوں نے کہا: ہمیں اللہ کو سامنے دیکھا دو؛ چنانچہ ان کی زیادتی کی وجہ سے بجلی نے ان کو آ پکڑا، پھر انھوں نے ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آجانے کے بعد بھی (پوجا کے لئے) بچھڑا بنالیا، پھر بھی ہم نے ان کو معاف کر دیا؛ حالاں کہ ہم نے موسیٰ کو واضح دلیل عطا کی تھی ﴿۱۵۳﴾ اور ہم نے ’طور‘ کو ان کے اوپر ان سے عہد لینے کے لئے اٹھالیا تھا، ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ (بیت المقدس) میں عاجزی کے ساتھ داخل ہو اور ان کو حکم دیا کہ ہفتہ کے دن کے معاملہ میں زیادتی نہ کرو، نیز ہم نے ان سے (ان باتوں کا) مضبوط عہد لیا تھا۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۵۴﴾

﴿۱﴾ انبیاء کی مخالفت، ایذاء رسانی اور طرح طرح کے بہانوں سے انکار وعناد یہودیوں کی قدیم فطرت تھی؛ چنانچہ انھوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے یہ نامعقول مطالبہ شروع کر دیا کہ فرشتہ کے ذریعہ وحی کو ہم نہیں مانتے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی تختیاں حوالہ کی گئی تھیں، اسی طرح آپ کوئی آسمانی نوشتہ لاکر دکھائیں تو ہم ایمان لائیں گے، اللہ نے ان کے اس نامعقول مطالبہ کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کیا کچھ تنگ نہیں کیا ہے اور کیسی کیسی سرتابیاں ان کے ساتھ نہیں کی ہیں؛ اس لئے آپ اس سے متاثر نہ ہوں، یہودیوں کے ان واقعات کا ذکر دوسری جگہ تفصیل سے آیا ہے، یہاں اشارہ فرمایا گیا ہے، جیسے یہودیوں کا مطالبہ، کہ اللہ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے؛ چنانچہ ان پر بجلی گرادی گئی، (النساء: ۱۵۳) بچھڑے کو معبود بنالینا، پھر ایک خاص طریقہ پر ان کی توبہ کا قبول کیا جانا، (الاعراف: ۱۴۸، ۱۵۵) جب انھوں نے تورات کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا تو ان پر کوہ طور کا اٹھایا جانا اور جبراً وقہراً ان کا تسلیم واطاعت کا اقرار کرنا، (الاعراف: ۱۷۱) فتح بیت المقدس کے موقع پر تواضع وفروتنی کے ساتھ دُعاء کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم اور یہود کی طرف سے اس حکم کا تمسخر، (البقرة: ۵۹، الاعراف: ۱۶۲) ہفتہ کے دن شکار وغیرہ کی ممانعت، اس سلسلہ میں یہودیوں کی حیلہ جوئی اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی اور اس کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب، (الاعراف: ۱۶۳) —— پس آنحضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ان کے ایسے بے ہودہ سوالات سے افسردہ ورنجیدہ نہ ہوں؛ کہ یہ ان کی اور ان کے پُرکھوں کی پرانی عادت ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾ وَّ بِكُفْرِهِمْ
وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ
شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾

پس ! (ہم نے جو ان کو سزا میں مبتلا کیا ہے، وہ) اس لئے کہ انھوں نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی ، اللہ کے احکام کا انکار کیا ، ناحق انبیاء کو قتل کیا اور انھوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے ہیں ، ﴿۱﴾ — بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر لگادی ہے ؛ اس لئے کچھ لوگوں کے سوا وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۲﴾ ﴿۱۵۵﴾ — نیز اس لئے بھی (سزا دی گئی ہے) کہ انھوں نے کفر کیا ، مریم پر بدترین تہمت لگائی ﴿۱۵۶﴾ اور انھوں نے کہا کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم — جو اللہ کا رسول تھا ﴿۳﴾ — کو قتل کر دیا ؛ حالاں کہ نہ انھوں نے مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ سولی دی ہے ؛ لیکن ان کو اشتباہ ہوگیا ، اور جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں ، وہ اس کے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں ، سوائے ظن وتخمین کی پیروی کے ان کو اس کا یقینی علم نہیں ہے ، اور انھوں نے یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا ہے ۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۵۷﴾

﴿۱﴾ ’’ دلوں پر پردہ ہیں ‘‘ کے ایک معنی یہ ہیں کہ پردہ کی وجہ سے اب کوئی نئی بات اندر داخل نہیں ہوسکتی ؛ اس لئے ہم آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہیں ، یا یہ کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں ، آپ ہمیں اپنی بات سے متاثر نہیں کر سکتے ۔

﴿۲﴾ ’’ لا یؤمنون الا قلیلا ‘‘ (کچھ لوگوں کے سوا ایمان نہیں لائیں گے) کی مفسرین نے دو تشریحات کی ہیں ، ایک یہ کہ یہودیوں میں کم ہی لوگ ایمان سے مشرف ہوں گے ، دوسرے : ان کے ایمان کی مقدار تھوڑی ہوگی ، یعنی بعض انبیاء پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں ؛ اس لئے اگر ایمان کا حصہ ان کو میسر بھی ہے تو ناقص و نامکمل ، ایسی صورت میں ایمان سے اس کا لغوی معنی مراد ہے ، ورنہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے بغیر ایمان تو بالکل ہی معتبر نہیں — اکثر مفسرین نے پہلے معنی کے لحاظ سے ترجمہ کیا ہے ، اس حقیر کا ترجمہ بھی اسی کے مطابق ہے ؛ کیوں کہ یہود کا بہت کم ایمان لانا ایک تاریخی حقیقت ہے ۔

﴿۳﴾ یہ یہودیوں کا قول نہیں ؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

﴿۴﴾ ان آیات میں یہودیوں کی بے توفیقی اور اللہ کی طرف سے پکڑ کے کچھ اور اسباب کا ذکر ہے ، ان میں سے ایک حضرت مریم علیہا السلام پر برائی کی تہمت ہے ، دوسرے یہ کہ اپنے خیال کے مطابق انھوں نے رسول خدا حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارتکاب کیا ہے ؛ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے ، اصل میں ان کو اشتباہ ہوگیا ہے ، انھوں نے مسیح سمجھ کر بجائے مسیح کے کسی اور کو پھانسی دے دی ہے اور یہ ایسی غلط فہمی ہے کہ اب تک باقی ہے ، اس اشتباہ کی نوعیت کیا ہوئی ؟ — اس سلسلہ میں مفسرین نے ←

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ
قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے،﴿۱﴾ اور اللہ غالب اور حکمت والے ہیں ﴿۱۵۸﴾ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں
مگر وہ اپنی موت سے پہلے ضرور ہی اس پر ایمان لائے گا، اور قیامت کے دن مسیح ان کے خلاف گواہ ہوں گے۔﴿۲﴾ ﴿۱۵۹﴾

← مختلف باتیں لکھی ہیں؛ لیکن سب سے دل لگتی بات وہ ہے جو مولانا عبدالماجد دریا بادی رحمہ اللہ نے لکھی ہے اور بائبل کے حوالوں سے ثابت ہے کہ اصل میں ''شمعون کرینی'' کو پھانسی پر چڑھا یا گیا۔ (دیکھئے: تفسیر ماجدی: ۱/ ۲۲۸، ط: کراچی)

﴿۱﴾ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو جسمانی طور پر آسمان پر اٹھا لیا گیا، قرآن کی جو تعبیر یہاں ہے وہ رفع درجات اور مرتبہ و مقام کی بلندی کے لئے نہیں بولی جاتی؛ بلکہ مادی اور جسمانی طور پر اٹھانے کے لئے، آیت کے پچھلے مضمون کے موافق بھی یہی ہے، کہ قتل کی نفی کی گئی اور بتایا گیا کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام قتل نہیں کئے گئے، تو ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟ یہ کہ آسمان پر اٹھا لیا گیا، یہاں بلند درجات کے ذکر کے کوئی معنی نہیں؛ کیوں کہ درجات کی بلندی کچھ حضرت مسیح علیہ السلام ہی کی خصوصیت نہیں، مرتبہ و مقام کی یہ بلندی تو تمام ہی انبیاء کو حاصل رہی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے جسم سمیت آسمان پر اُٹھائے جانے اور پھر قیامت کے قریب اُتارے جانے پر حدیثیں کثرت سے وارد ہیں اور تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں، (بخاری، باب نزول عیسیٰ بن مریم، حدیث نمبر: ۳۴۴۸، ۳۴۴۹، مسلم، باب فی فتح قسطنطنیه الخ، حدیث نمبر: ۷۲۷۸، وغیرہ) نیز یہی مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے، رہ گئی عقل تو اس کا یہاں کیا ذکر ہے؟ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ تو شروع ہی سے عام فطرت کے خلاف معاملہ ہوا ہے، پیدائش بغیر باپ کے ہوئی، (آلِ عمران: ۴۷) ماں کو بے موسم کا پھل ملا کرتا تھا، (آلِ عمران: ۳۷) گفتگو پیدائش کے ساتھ ہی شروع فرما دی، (مریم: ۲۹-۳۰) اندھے پر ہاتھ پھیرتے تو بینا ہو جاتا، لنگڑا چلنے لگتا، کوڑھی اچھا چنگا ہو جاتا اور مردہ تک آپ کی ندا پر قبر سے اُٹھ کھڑا ہوتا، (آلِ عمران: ۴۹) ایسے معجزات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے، تو اگر قادر مطلق خدا نے آسمان پر اُٹھا لیا، تو اس پر کیا تعجب ہے؟؟ —— غالباً سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جھوٹی نبوت اور مسیحیت کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کے جسمانی طور پر اُٹھائے جانے کا انکار کیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی جب یہودیوں اور عیسائیوں پر آخری وقت ہوتا ہے اور عالم برزخ کے احوال کھلنے لگتے ہیں، تو حضرت مسیح علیہ السلام کی حقیقت ان پر آشکار ہو جاتی ہے؛ لیکن اس وقت کی توبہ مقبول نہیں، قیامت میں حضرت مسیح علیہ السلام ان دونوں گروہوں کے خلاف مدعی ہوں گے، یہودیوں کے خلاف ان کی عداوت و عناد میں غلو کی بنا پر اور عیسائیوں کے خلاف ان کی محبت میں غلو اور ان کو خدا کا بیٹا قرار دینے کی وجہ سے —— آیت کا ترجمہ اس طرح بھی کیا گیا ہے: ''جتنے اہل کتاب ہیں، وہ مسیح علیہ السلام کے مرنے سے پہلے ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے''، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قیامت سے پہلے حضرت مسیح علیہ السلام جب دنیا میں اُتارے جائیں گے اور ان کی طبعی موت واقع ہوگی، تو اس سے پہلے تمام اہل کتاب (جو اس وقت موجود ہوں گے) آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے خدا کے بندہ اور رسول ہونے کا اقرار کریں گے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ
كَثِیْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِیْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ یُؤْمِنُوْنَ
بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ سَنُؤْتِیْهِمْ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۱۶۲﴾ اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ع ۲۲ ۲
كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ
وَیَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ
زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

غرض کہ یہودیوں کی زیادتی کے باعث ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں، جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں، حرام کردیں اور اس لئے بھی کہ وہ اللہ کے راستہ سے بہت روکتے تھے ﴿۱۶۰﴾ وہ سود لیا کرتے تھے؛ حالاں کہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا، ﴿۱﴾ اور وہ ناحق طریقہ پر لوگوں کے مال کھا لیا کرتے تھے، اور ہم نے ان میں سے کفر پر جمے رہنے والوں کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے؛ ﴿۱۶۱﴾ لیکن ان میں سے جو لوگ علم میں پختہ ہیں، ﴿۲﴾ وہ اور مسلمان، اس کتاب پر جو آپ پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اللہ پر اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، عنقریب ہم ایسے ہی لوگوں کو بڑا اجر عطا فرمائیں گے ﴿۱۶۲﴾ بے شک ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسا کہ نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف، اور جیسے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یعقوب کی اولاد، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف کی تھی، اور داؤد کو زبور عطا کیا تھا، ﴿۱۶۳﴾

﴿۱﴾ آج ہی نہیں بلکہ صدیوں سے دنیا میں یہودیوں سے بڑھ کر کوئی سود خور قوم نہیں، اور یہی حال نزول قرآن کے وقت بھی تھا؛ حالاں کہ تورات میں بھی سود کی ممانعت کا صریح حکم موجود ہے، ''سود مت لے'' (خروج: ۲۲: ۲۵) ''......سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ اسے نفع کے لئے کھانا کھلا''۔ (احبار: ۲۵: ۳۷)

﴿۲﴾ مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے ''راسخون فی العلم'' کا ترجمہ ''علم دین میں پختہ'' سے کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب رحمہما اللہ نے ''علم پر ثابت قدم'' ترجمہ کیا ہے، حاصل دونوں کا یہی ہے کہ جو علماء اہلِ کتاب علم میں پختگی کی وجہ سے حق پر قائم ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ، ان کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہیں۔

وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى
تَكۡلِيۡمًا ۚ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَ مُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشۡهَدُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اِلَيۡكَ اَنۡزَلَهٗ بِعِلۡمِهٖ ۚ وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ
يَشۡهَدُوۡنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ﴿۱۶۶﴾ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ قَدۡ ضَلُّوۡا
ضَلٰلًا بَعِيۡدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَ ظَلَمُوۡا لَمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغۡفِرَ لَهُمۡ وَ لَا لِيَهۡدِيَهُمۡ
طَرِيۡقًا ﴿۱۶۸﴾ۙ اِلَّا طَرِيۡقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۱۶۹﴾ يٰۤاَيُّهَا
النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَاٰمِنُوۡا خَيۡرًا لَّكُمۡ ؕ وَاِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ
لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۷۰﴾

نیز ان رسولوں کی طرف (بھی وحی کی ہے) جن کا حال ہم پہلے آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ان رسولوں کی طرف بھی جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا ہے، اور اللہ نے موسیٰ سے تو خاص طور پر گفتگو بھی کی تھی ﴿۱﴾ ﴿۱۶۴﴾ ہم نے پیغمبر اس لئے بھیجے کہ وہ خوشخبری دیں اور ڈرائیں؛ تاکہ لوگوں کے لئے ان پیغمبروں کے بعد اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ غالب اور حکمت والے ہیں ﴿۱۶۵﴾ لیکن اللہ اس بات پر گواہ ہیں کہ جو کتاب اس نے آپ پر اتاری ہے، اسے اپنے علم سے اُتارا ہے، نیز فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ ہی کی گواہی کافی ہے ﴿۱۶۶﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا، وہ ہدایت سے دور جا پڑے ﴿۱۶۷﴾ یقیناً جن لوگوں نے کفر اور ظلم کیا، اللہ نہ ان کو معاف کریں گے اور نہ درست راستہ کی ہدایت سے نوازیں گے ﴿۱۶۸﴾ سوائے دوزخ کے راستہ کے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیش پڑے رہیں گے اور ایسا کرنا اللہ کے لئے معمولی بات ہے ﴿۱۶۹﴾ اے لوگو! تمہارے پاس رسول تمہارے پروردگار کی طرف سے حق بات لے کر آئے ہیں؛ اس لئے ایمان لے آؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر نہ مانو گے تو (یاد رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اللہ ہی کا ہے، (اس لئے تم سے یہ نعمت چھینی بھی جا سکتی ہے) اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں۔ ﴿۱۷۰﴾

﴿۱﴾ یعنی یہ وہ انبیاء ہیں کہ جن کو یہودی وعیسائی بھی نبی تسلیم کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا براہ راست اللہ سے ہم کلام ہونا بھی ان کو تسلیم ہے، تو پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار کے کیا معنی ہیں؟ کیا اللہ اِن انبیاء کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وحی نازل کرنے پر قادر نہیں ہیں؟

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى
ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ
وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ وقف لازم
ع ۲۳ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ
يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الۡمَلٰٓٮِٕكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ يَّسۡتَـنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَ يَسۡتَكۡبِرۡ
فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ
وَيَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡتَـنۡكَفُوۡا وَ اسۡتَكۡبَرُوۡا فَيُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا
اَلِيۡمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيۡرًا ﴿۱۷۳﴾

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، بے شک مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کا رسول اور اس کا فرمان ہے، جس کو اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا، اور اللہ کی طرف سے (پیدا ہونے والی) جان ہے، تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس سے باز رہو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، بے شک اللہ ہی اکیلے عبادت کے لائق ہیں، اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اسی کی ہے اور کارساز ہونے کے اعتبار سے اللہ ہی کافی ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۷۱﴾ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہ ہوگی کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو، اور جو لوگ اللہ کی بندگی سے عار کریں گے اور تکبر کریں گے، عنقریب اللہ ان کو اپنے پاس کھینچ لائیں گے ﴿۱۷۲﴾ پھر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا ان کو تو بھرپور اجر دیں گے اور اپنے فضل سے اور زیادہ عطا فرمائیں گے، اور جن لوگوں نے اللہ کی بندگی کو باعث ننگ خیال کیا اور تکبر کیا، ان کو دردناک عذاب دیں گے اور وہ اپنے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی دوست اور مددگار نہ پائیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۷۳﴾

﴿۱﴾ اوپر کی آیات میں یہود سے خطاب تھا، اس آیت میں عیسائیوں سے خطاب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور تین (باپ، بیٹے، روح القدس) کے مجموعہ کو خدا نہ کہو کہ یہ شرک ہے اور خدا کی کوئی اولاد نہیں؛ بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہی ہیں، بات صرف اتنی سی ہے کہ اللہ تعالیٰ عام انسانوں کو مرد کے نطفہ کے واسطہ سے پیدا فرماتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو براہ راست اپنے حکم سے پیدا فرمایا ہے، اسی حکم کو ''کلمہ'' سے تعبیر فرمایا گیا، دوسرے انسانوں میں روح حاصل ہونے کا ذریعہ بہ ظاہر ماں باپ کا ملاپ ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو بلاواسطہ روح عطا فرمائی گئی ہے، جو ''من اللہ'' ہے، یعنی اللہ ہی کی طرف سے عطا کی ہوئی ہے۔

﴿۲﴾ یعنی عیسائیوں کا معاملہ ''مدعی سست، گواہ چست'' کا سا ہے، خود حضرت مسیح علیہ السلام کو تو بندگی خداوندی پر ناز ہے نہ کہ ننگ و عار؛ مگر عیسائی خدا کی بندگی کو ان کے لئے باعثِ عار سمجھتے ہیں، فرشتوں کو بعض عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے؛ اس لئے ان کا بھی ذکر کر دیا گیا کہ مقرب فرشتوں کو بھی خدا کا بندہ ہونے کا اعتراف ہے اور وہ ہرگز اس کو اپنے لئے باعثِ ننگ و عار خیال نہیں کرتے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا
مُّسْتَقِیْمًا ﴿۱۷۵﴾ یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ
وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ کَانَتَا اثْنَتَیْنِ
فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ کَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ
یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۴

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف کھلی ہوئی روشنی اتاردی ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۷۴﴾ پس جولوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اللہ عنقریب ان کو اپنی رحمت وعنایت میں داخل کریں گے اور ان کو درست راستہ کی ہدایت سے نوازیں گے ﴿۱۷۵﴾ لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیں: اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں بتاتے ہیں، اگر کوئی شخص ہلاک ہوجائے، اس کی اولاد نہ ہو، ہاں! اس کی بہن ہو، تو اس کے لئے متروکہ کا آدھا ہے اور وہ بھائی بہن کا وارث ہوگا؛ بشرطیکہ بہن کو اولاد نہ ہو، پس! اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کے لئے ترکہ کا دوتہائی ہے اور اگر چند بھائی بہن ہوں، مرد اور عورتیں، تو مرد کے لئے دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے، ﴿۲﴾ اللہ تم سے کھول کر بیان فرماتے ہیں کہ کہیں تم غلطی میں نہ پڑ جاؤ، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ ﴿۱۷۶﴾

﴿۱﴾ ''برہان'' (دلیل) سے پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی اور ''نور مبین'' (کھلی ہوئی روشنی) سے قرآن مجید مراد ہے، (تفسیر بغوی: ۱/ ۷۶۲) کہ ان دونوں کے ذریعہ حضرت مسیح علیہ السلام کی صحیح حیثیت پوری طرح واضح ہوچکی ہے، اب اس کے باوجود ایک ایسے عقیدہ پر اصرار جس کی نہ مذہبی کتابوں میں سند ہے اور نہ اس پر عقل کی شہادت ہے، محض گمراہی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایت کے لئے رسول اور کتاب دونوں ضروری ہیں، رسول کو محض ڈاکیہ سمجھنا اور یہ کہنا کہ رسول کی ہدایات وارشادات کی ضرورت نہیں، صرف قرآن مجید کافی ہے، غلط ہے اور جولوگ ایسا کہتے ہیں، وہ گمراہی میں ہیں۔

﴿۲﴾ کلالہ سے مراد وہ شخص ہے جس کا انتقال اس حال میں ہو کہ نہ اس کے والدین ہوں اور نہ اولاد، ان کے ترکہ کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی؟ اس سلسلہ میں درج ذیل احکام بیان کئے گئے ہیں :

(الف) اگر صرف ایک حقیقی یعنی ماں باپ شریک یا علاتی یعنی باپ شریک بہن ہو، تو وہ ایسے شخص کے ترکہ کے نصف کی حقدار ہوگی، ـــــ اگر ماں شریک بہن ہو تو اس کے حصہ کا ذکر اسی سورہ کی آیت: ۱۲ میں آچکا ہے، باقی نصف عصبہ رشتہ داروں ـــــ چچا، چچازاد بھائی ـــــ وغیرہ کو ملے گا، اگر یہ بھی نہ ہوں تو باقی آدھا بھی بہن ہی کے حصہ میں آئے گا۔ ←

← (ب) اگر عورت کلالہ ہو، اس کے والدین اور اولاد نہ ہوں، صرف بھائی ہو، خواہ ایک ہو یا زیادہ، تو وہ اس کے پورے ترکہ کا وارث ہوگا۔

(ج) اگر کلالہ مرد کی دو بہنیں ہوں، تو یہ دونوں دو تہائی ترکہ کی حقدار ہیں، دو سے زیادہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے، باقی ایک تہائی عصبہ رشتہ دار (چچا، چچازاد بھائی وغیرہ) کا ہوگا، اگر کوئی عصبہ موجود نہ ہو تو یہ باقی ایک تہائی بھی بہنوں ہی کو ملے گا۔

(د) اگر کلالہ مرد یا عورت کے بھائی بھی ہوں اور بہن بھی، تو ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ مرد کا حصہ بہ مقابلہ عورت کے دہرا ہوگا۔

سُوْرَةُ الْمَائِدَةِ

- سورہ نمبر : (۵)
- رکوع : (۱۶)
- آیتیں : (۱۲۰)
- نوعیت : مدنی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ ترتیب کے اعتبار سے قرآن مجید کی پانچویں سورت ہے، جو ۱۲۰ آیات پر مشتمل ہے، اگرچہ اس سورت کی بعض آیات مکہ میں حجۃ الوداع کے موقعہ سے نازل ہوئی ہیں؛ لیکن چوں کہ اہل علم کی اصطلاح میں ہجرت کے بعد نازل ہونے والی تمام آیتیں ''مدنی'' کہلاتی ہیں، اس لحاظ سے اس کا شمار بھی مدنی سورتوں میں ہے، آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس سورت کو پڑھتے ہوئے فرمایا کہ ''سورہ مائدہ'' آخر میں نازل ہونے والی سورت ہے؛ لہٰذا اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام: ''إن سورۃ المائدۃ آخر ما نزل ...''۔ (ترمذی: کتاب التفسیر، حدیث نمبر: ۳۰۶۳)

مائدہ کے معنی دسترخوان کے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ — جن کو 'حواریین' کہا جاتا تھا — نے ایک بار اپنی طمانینت قلبی کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کے لئے آسمان سے دسترخوان اُتارا جائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ سے اس خواہش کی تکمیل کے لئے دُعا اور التجاء فرمائی جو قبول کرلی گئی؛ چنانچہ یہ غیبی دسترخوان (مائدہ) اُتارا گیا، اس سورت میں اس واقعہ کا ذکر آیا ہے؛ چنانچہ اسی اہم واقعہ کی نسبت سے اس سورت کا نام ''المائدۃ'' رکھا گیا، یہ سورت اپنے مضامین کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اور زندگی کے بنیادی اُصولوں پر روشنی ڈالتی ہے، اسی سورت کا حصہ یہ آیت ہے :

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدۃ:۳)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کردیا، تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند فرمایا۔

اس آیت میں اس اُمت کے آخری اُمت ہونے، قرآن مجید کے آخری کتاب ہونے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے عالمگیر و جاوداں ہونے کا اعلان ہے، ظاہر ہے کہ کسی دین اور کسی امت کے لئے اس سے بڑھ کر اعزاز نہیں ہوسکتا، اس سورت میں سورۂ نساء کی طرح بہت سے فقہی احکام — معاملات، یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح، وصیت، ذبیحہ اور شکار، حالتِ احرام کا شکار اور اس کی جزاء، وضوء، غسل، تیمم، شراب، جوا، ارتداد، چوری، راہزنی کی سزا، قسم کا کفارہ، مردار کی مختلف صورتوں، حلال و حرام جانوروں کے سلسلہ میں زمانہ جاہلیت کے خودساختہ اُصولوں وغیرہ — پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں تین اہم واقعات کا بھی ذکر آیا ہے، ایک: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کا رویہ، دوسرے: حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل و قابیل کا واقعہ — جس میں اللہ کی زمین پر انسانوں کو بسانے کے بعد پہلی بار گناہ کا ارتکاب کیا گیا — تیسرے: مائدہ کا وہ واقعہ جس کی نسبت سے اس سورت کا نام ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

منزل ٢ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ
غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝١ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ
الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ وقف لازم
شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ رکوع ١
وَالتَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢

شروع اللہ کے نام سے، جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! عہد پورے کیا کرو، ﴿١﴾ تمہارے لئے ان جانوروں کے سوا جن کا تم سے ذکر کیا جائے گا، ﴿٢﴾ چوپائے جانور حلال کئے گئے ہیں ؛ بشرطیکہ تم حالت احرام میں شکار نہ کرو، ﴿٣﴾ بے شک اللہ جو چاہتے ہیں، فیصلہ فرماتے ہیں ﴿٤﴾ ۝١ اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی، ﴿٥﴾ حرام مہینہ کی، ﴿٦﴾ مکہ لے جانے والے قربانی کے جانور کی، ﴿٧﴾ گلے میں پٹے ڈالے ﴿٨﴾ ہوئے قربانی کے جانوروں کی اور بیت حرام ﴿٩﴾ کے ارادہ سے جانے والوں کی —— جو اپنے پروردگار کے فضل اور خوشنودی کے خواستگار ہیں —— بے حرمتی نہ کرو، اور جب احرام کھول لو تو اب شکار کر سکتے ہو، ﴿١٠﴾ اور کسی قوم کی یہ برائی کہ انھوں نے تم کو مسجد حرام سے روک دیا تھا، تمہارے حد سے گذر جانے کا باعث نہ ہو جائے، ﴿١١﴾ اور نیکی اور پرہیز گاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں۔ ﴿١٢﴾ ۝٢

﴿١﴾ عقد کے معنی کسی چیز کو باندھنے کے ہیں، وعدہ بھی انسان کے لئے ایک اخلاقی بندش ہے؛ اسی لئے اس کو بھی عقد کہتے ہیں، اس لئے یہاں جس عہد کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے، وہ شریعت کے تمام احکام کو شامل ہے؛ کیوں کہ مومن نے اللہ تعالیٰ سے پوری شریعت پر عمل کرنے کا عہد کر رکھا ہے، نیز انسان باہم ایک دوسرے سے جو عہد کرتا ہے، اگر وہ کسی ناجائز اور خلاف شرع بات سے متعلق نہ ہو تو وہ بھی اس میں شامل ہے، اور اس کو پورا کرنا بھی واجب ہے۔

﴿٢﴾ آگے آیت نمبر: ٣ میں ان کا ذکر آرہا ہے۔

﴿٣﴾ ''بہیمہ'' چار پاؤں والے جانور کو کہتے ہیں، اور ''انعام'' اونٹ، بکرے کو؛ چنانچہ سورۂ انعام (١٤٢ - ١٤٤) میں 'انعام' کی آٹھ قسموں کا ذکر آیا ہے، مراد یہ ہے کہ جو چوپائے ان جانوروں کی طرح ہوں، جیسے نیل گائے، ہرن وغیرہ، یہ سب ←

← حلال ہیں، ظاہر ہے کہ بعض چوپائے جن کی حرمت حدیث سے صریحاً معلوم ہوتی ہے، وہ حرام ہیں، اور قرآن کے اس عمومی حکم سے مستثنیٰ ہیں، جیسے گدھا، خچر وغیرہ؛ البتہ حالت احرام میں شکار کرنا جائز نہیں؛ اس لئے جو جنگلی جانور حلال ہیں، اگر مُحرِم ان کا شکار کرلے تو وہ بھی حرام ہوں گے اور ان کا حکم بھی مردار کا ہوگا، نہ مُحرِم کے لئے ان کا کھانا جائز ہوگا نہ غیر مُحرِم کے لئے۔ (تفسیر بغوی:۶۳۱/۶)

﴿۴﴾ یعنی اللہ تعالیٰ بلا شرکتِ غیرے اس کائنات کے مالک ہیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اس بارے میں ہر طرح کے فیصلہ کا حق ہے، گو اللہ کا کوئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی نہیں؛ لیکن انسان اس مصلحت کو سمجھے یا نہیں، اس پر احکام خداوندی کی اطاعت واجب ہے۔

﴿۵﴾ ''شعائر'' شعیرہ کی جمع ہے، عربی زبان میں 'شعیرہ' ایسی چیز کو کہتے ہیں، جس سے پہچان و شناخت متعلق ہو؛ اس لئے جو افعال یا اشیاء اسلام کی علامتوں کے درجہ میں ہیں، وہ سب شعائر میں داخل ہیں، جیسے: کعبۃ اللہ، قربانی کا علامت زدہ جانور، مسجدیں، اذاں وغیرہ، بعض مفسرین نے یہاں شعائر سے خاص طور پر حج سے متعلق علامتی اُمور و مقامات مراد لئے ہیں، جیسے: صفا، مروہ اور قربانی کے لئے لے جایا جانے والا جانور، گنجائش دونوں ہی معنوں کی ہے۔

﴿۶﴾ حرام مہینوں سے مراد ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ میں پہل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

﴿۷﴾ 'ہدی' اس جانور کو کہتے ہیں، جسے حج یا عمرہ کرنے والا قربانی کے لئے بیت اللہ شریف لے جائے۔ (تفسیر بغوی:۶۳۲/۶)

﴿۸﴾ 'قلائد' قلادہ کی جمع ہے، قلادہ کے معنی ہار وغیرہ کے ہیں، جو گلے میں لٹکائے جاتے ہیں، عربوں کا ایک طریقہ یہ تھا کہ جو جانور قربانی کے لئے حرم لے جاتے، اُن کے گلے میں درخت کے پتوں یا جوتے وغیرہ کا ہار علامتی طور پر لٹکا دیتے، لوگ اس کا احترام کرتے اور ایسے جانور لے جانے والوں پر حملہ سے اجتناب کرتے، (تفسیر بغوی:۶۳۲/۶) قرآن نے عرب کے اسی قدیم طریقہ کو مزید تقویت پہنچائی کہ ان کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔

﴿۹﴾ ''بیت حرام'' کے معنی حرمت واحترام والے گھر کے ہیں، یعنی کعبۃ اللہ، مراد یہ ہے کہ جو شخص حج، عمرہ یا رہائش کے لئے حرم شریف جانا چاہے، اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنو۔

﴿۱۰﴾ یعنی احرام کھولنے کے بعد اب شکار کرنا جائز ہے۔

﴿۱۱﴾ معلوم ہوا کہ ظلم وزیادتی نہ ابتداءً جائز ہے اور نہ ردعمل میں حد اعتدال اور دائرہ انصاف سے گذر جانے کی گنجائش ہے۔

﴿۱۲﴾ اسی سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو حکم اصل کا ہوتا ہے، وہی اس کے ذرائع کا ہوتا ہے، جو بات دین میں مطلوب ہو اس میں تعاون بھی اسی درجہ مطلوب ہوگا اور جو بات گناہ کی ہو، اس میں تعاون بھی قریب قریب اسی درجہ کا گناہ ہوگا؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے کے ساتھ ساتھ اس میں ہر طرح کا تعاون کرنے والوں (بخاری، باب مؤکل الربا، حدیث نمبر:۲۰۸۶) اور شراب پینے کے ساتھ ساتھ شراب پینے میں تعاون کرنے والوں پر بھی لعنت بھیجی ہے۔ (مسند ابی یعلی عن ابن عمر:۴۴۱/۹)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

تم پر مردار، ﴿۱﴾ خون، ﴿۲﴾ سور کا گوشت، ﴿۳﴾ وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، ﴿۴﴾ اور وہ جانور جو گلا گھونٹ کر، چوٹ کھا کر، اوپر سے گر کر مرجائے، جو سینگ مارنے کی وجہ سے مرا ہو، اور جو درندہ کے پھاڑ کھانے کی وجہ سے مرگیا ہو ـــــ سوائے اس کے کہ تم اس کو ذبح کر ڈالو ـــــ اور جو استھانوں پر بھینٹ چڑھائے گئے ہوں، (یہ سب) ﴿۵﴾ حرام کئے گئے ہیں، نیز یہ بھی کہ تم پانسوں کے ذریعہ قسمت معلوم کرو، ﴿۶﴾ یہ سب گناہ کے کام ہیں، آج کافر تمہارے دین (کو شکست دینے) کی طرف سے نا اُمید ہوچکے ہیں؛ لہٰذا ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو، آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کردیا، ﴿۷﴾ تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لئے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا، ﴿۸﴾ پھر جو شخص بھوک کی شدت کی وجہ سے بے قرار ہوجائے (اور حرام کی ہوئی مذکورہ چیزوں میں سے کچھ کھالے) اس کے بغیر کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو، تو یقیناً اللہ معاف کرنے والے اور مہربان ہیں۔ ۝۳

﴿۱﴾ ''مردار'' سے مراد وہ جانور ہیں جو اپنی موت آپ مرجائیں، یا جنھیں شریعت کے بتائے ہوئے طریقۂ ذبح کے مطابق ذبح نہیں کیا گیا ہو۔

﴿۲﴾ ''خون'' سے بہتا ہوا خون مراد ہے، جو جاندار کی رگوں میں ہوتا ہے؛ چنانچہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ ''بہتے ہوئے خون'' (دمِ مسفوح) کی صراحت موجود ہے، (الانعام: ۱۴۵) ـــــ گوشت میں جو خون ہوتا ہے، وہ ناپاک اور حرام نہیں۔

﴿۳﴾ سور کا گوشت ہی نہیں؛ بلکہ اس کا پورا وجود ہی حرام و ناپاک ہے؛ لیکن چوں کہ کھانے میں عام طور پر گوشت ہی کا استعمال ہوتا ہے؛ اس لئے اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿۴﴾ ''ما أهل به لغير الله'' کا ذکر بقرہ آیت نمبر: ۱۷۳ میں آچکا ہے، آگے مردار کی مختلف صورتوں کا بیان ہے، 'منخنقه' سے مراد وہ مردار ہے جو گلا گھٹ جانے یا گھونٹ دیئے جانے کی وجہ سے مرجائے، 'موقوذہ' سے مراد وہ ہے جو پتھر، لاٹھی یا کسی چیز کی ضرب سے مرجائے، زمانۂ جاہلیت میں لوگ خدا کے نام پر لکڑیوں سے مار مار کر جانور کو ہلاک کردیتے تھے، پھر اسے کھاتے تھے، قرآن نے جانور کو اس ظلم سے بچانے کے لئے چوٹ کی وجہ سے مرے ہوئے جانوروں ہی کو حرام قرار دے دیا؛ تاکہ اس بے رحمی کا راستہ ہی بند ہوجائے، 'متردیہ' وہ جانور ہے جو بلندی سے نیچے گرنے کی وجہ سے مرجائے، جیسے: پہاڑ سے زمین پر، یا زمین سے کنویں میں گر جائے، یا گرا دیا جائے، 'نطیحہ' وہ جانور ہے جسے دوسرا جانور سینگ مار کر ہلاک کردے، اور اسے ذبح ←

← کرنے کا موقع نہ مل پائے —— **وما أکل السبع**، یعنی جس جانور کو کوئی درندہ پھاڑ ڈالے اور اس کی موت واقع ہو جائے، اگر اس میں زندگی باقی ہو اور اسے ذبح کر دیا جائے، تو پھر اس کا کھانا حلال ہوگا، غرض یہ مردار کی مختلف صورتیں ہیں، جن کو قرآن مجید نے وضاحت کے لئے ذکر کر دیا ہے۔

﴿۵﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ جانور پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا؛ لیکن غیر اللہ کی تعظیم میں اسے ذبح کیا جائے، یہ فعل تو کفر وحرام ہے ہی، وہ جانور بھی حرام اور مردار کے حکم میں ہے۔ (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۴۸۰)

﴿٦﴾ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ نے یہی ترجمہ کیا ہے، دوسرے اہل علم نے قرعہ کے تیروں سے تقسیم کرنے کے معنی مراد لئے ہیں، گنجائش دونوں معنوں کی ہے، اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں کچھ پانسے رکھے ہوتے تھے، کسی پر کامیابی، کسی پر ناکامی کے اشارے لکھے ہوتے، لوگ اسی سے قسمت کا حال معلوم کرتے، اور جو تیر نکل آتا، اس کے مطابق عمل کرتے، چیزوں کی تقسیم کے لئے بھی بعض اوقات محنت واستحقاق کی بجائے ان اٹکل کے تیروں پر اعتماد کیا جاتا، حقدار برابر کے ہوتے؛ مگر کسی کے حصہ میں نصف آجاتا، کسی کے حصہ میں چوتھائی، کسی کے حصہ میں اس سے کم اور کسی کے حصہ میں کچھ نہیں، اسی کے مطابق حصوں کی تقسیم عمل میں آتی، پہلی صورت تو ہم پرستی اور مشرکانہ عقیدہ پر مبنی تھی، دوسری صورت جوئے کی تھی، اسلام نے دونوں ہی کو حرام کیا ہے، اگر انسان کسی چیز کے بارے میں تذبذب کا شکار ہو اور خیر وشر کے بارے میں فیصلہ نہ کر پاتا ہو تو اس کے لئے نماز استخارہ پڑھنے کی گنجائش ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جوتشیوں اور نام نہاد عاملوں کے پاس جانا اور ان سے قسمتوں کے حال معلوم کرنا گناہ وحرام ہے؛ بلکہ کفر کا اندیشہ ہے؛ کیوں کہ خدا کے سوا کوئی اور غیب کی باتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

﴿۷﴾ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شریعتِ محمدی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے؛ کیوں کہ دین مکمل ہو چکا ہے، اب شریعت کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم الشان نعمت وحی ہے، وہ نعمت پایۂ اتمام کو پہنچ گئی ہے اور قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس دین حق پر اپنی رضاء وخوشنودی کی مہر لگا دی ہے؛ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کی گنجائش باقی نہیں رہی، جو شخص اب نبوت کا مدعی ہو اور جو اس کی تصدیق کرے، وہ سبھی کافر اور دائرہ ایمان سے باہر ہیں، اسی طرح 'امام مہدی' جو قربِ قیامت میں ظاہر ہوں گے، ان کی حیثیت ایک خلیفۂ راشد کی ہوگی، نہ ان پر وحی آئے گی، نہ وہ شریعت کے کسی حکم میں کوئی ردوبدل کریں گے اور نہ ان پر ایمان لانے کا حکم ہوگا؛ بلکہ ایک خلیفۂ برحق کی حیثیت سے نیکیوں میں ان کی فرمانبرداری اور جہاد میں ان کی نصرت واجب ہوگی، حضرت مسیح علیہ السلام بھی جب زمین پر اُتارے جائیں گے، تو وہ شریعت محمدی ہی کے پیرو ہوں گے۔

﴿۸﴾ شریعت میں اختیار اور مجبوری کے حالات کے احکام الگ الگ ہیں؛ چنانچہ اگر کسی شخص پر بھوک کی شدت ناقابل برداشت ہو، تو وہ حالت اضطرار میں جان بچانے کے لئے ضرورت کے بہ قدر مذکورہ حرام اشیاء میں سے بھی کھا پی سکتا ہے، گناہ پر مائل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کھانا شدید مجبوری کے بغیر نہ ہو، اور بقدر ضرورت سے زائد بھی نہ ہو، آگے فرمایا گیا کہ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مجبوری کی حالت میں بھی ان اشیاء کی حرمت برقرار رہتی ہے؛ البتہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ درگذر فرمائیں گے —— اضطرار میں جو حکم غذا کا ہے، وہی حکم دوا کا بھی ہے، یعنی کوئی دوا حرام جزء سے بنی ہو، کوئی حلال دوا اس کے لئے موجود نہ ہو، یا ہو اور کسی وجہ سے مریض اس کے حاصل کرنے پر قادر نہ ہو، تو ایسی حالت میں حرام شئ سے بھی علاج کیا جا سکتا ہے، یہی رائے امام ابو یوسف کی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۵/ ۲۵۵)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ
تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝٤ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ
وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ۝٥ ع ١/٥

لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لئے کیا چیزیں حلال کی گئی ہیں؟ آپ کہہ دیجئے: تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں، ﴿۱﴾ اور شکار کرنے والے جانور —— جو تمہارے سدھائے ہوئے ہیں اور اللہ نے تم کو جو آگہی دی ہے، اس سے تم ان کی تربیت کرتے ہو —— تمہارے جس شکار کو روک رکھیں، ان میں سے کھاؤ اور اس پر اللہ کا نام بھی لو، ﴿۲﴾ نیز اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ جلد ہی حساب لینے والے ہیں ۝٤ آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کردی گئیں، نیز جو اہل کتاب ہیں، ان کا کھانا تمہارے لئے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے، ﴿۳﴾ اور پاک دامن مومن عورتیں بھی حلال ہیں، نیز ان لوگوں میں سے بھی پاک دامن عورتیں حلال ہیں، جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، ﴿۴﴾ بشرطیکہ تم انھیں ان کے مہر ادا کردو، (ہاں، یہ ضروری ہے کہ) نکاح کیا جائے، نہ کھلے عام زنا کرنے والے ہوں، نہ چھپ کر آشنا بنانے والے، ﴿۵﴾ جو ایمان لانے سے انکار کرے، اس کا عمل اَکارت ہوجائے گا، ﴿۶﴾ اور وہ آخرت میں نقصان اُٹھانے والوں میں ہوگا۔ ۝٥

﴿۱﴾ قرآن نے حلال وحرام کے سلسلہ میں ایک اُصول مقرر کردیا ہے کہ جو چیز پاکیزہ ہو، انسان کی فطرتِ سلیم جس کی طرف مائل ہو، وہ حلال ہے، اور جو چیز گندی اور خبیث ہو اور فطرتِ سلیمہ اس سے گریز کرتی ہو، وہ حرام ہے؛ لیکن کیا کیا جائے کہ انسان بعض اوقات گندی چیزوں کا اپنے آپ کو خوگر بنالیتا ہے، اور اس کی مسخ شدہ فطرت اسی کی طرف پروانہ وار گرنے لگتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کے تفصیلی احکام اُتارے، اب نباتات ہوں یا حیوانات، شریعت نے جن کو حلال قرار دیا ہو، وہ ''طیبات'' ہیں، اور جن کو منع کیا ہو، وہ ''خبائث'' ہیں۔

﴿۲﴾ شکاری جانور کے ذریعہ شکار کئے جانے والے جانور کے حلال ہونے کے لئے چار شرطیں بتائی گئیں، اول: یہ کہ ان کو شکار کی تربیت دی گئی ہو، دوسرے: ان کو شکار پر چھوڑا گیا ہو، نہ یہ کہ وہ از خود شکار پر جھپٹ پڑے ہوں، تیسرے: انھوں نے شکار کو بھیجنے ←

← والے کے لئے روک رکھا ہو، نہ یہ کہ خود کھانے لگیں، چوتھے: ان کو بھیجتے ہوئے ان پر بسم اللہ بھی کہا گیا ہو، یہ چاروں شرطیں اس آیت میں مذکور ہیں، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی یہ چاروں شرطیں آ گئی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم اپنے تربیت یافتہ کتے کو چھوڑو، اور اس پر اللہ کا نام لو، پھر وہ تمہارے لئے شکار کو روک رکھے تو کھاؤ، اگر خود کھانے لگے تو نہ کھاؤ کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے اس کو اپنے لئے روکا ہو'' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۴۸۳، مسند احمد: ۳۷۹/۴) —— جانور کو سدھانے کا طریقہ کیا ہو قرآن نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے، کتے کے بارے میں تو مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار کو خود نہ کھائے، بھیجنے والے کے لئے روک رکھے، پرندوں کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اسے شکار پر چھوڑا جائے تو جھپٹ پڑے اور بیچ راستہ سے بھی واپس بلا لیا جائے تو واپس آ جائے، (ہدایہ آخرین، کتاب الصید: ۵۰۶) —— ''جوارح'' شکار کرنے والے جانور کو کہتے ہیں، کتا ہو یا کوئی اور جانور۔

﴿۳﴾ یہاں ''طعام'' (کھانا) سے مراد 'ذبیحہ' ہے، (تفسیر بغوی: ۱۶/۱۲) یعنی عام غیر مسلموں کا تو ذبیحہ حرام ہے؛ لیکن اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے۔

﴿۴﴾ یعنی عام غیر مسلموں سے تو مسلمانوں کے نکاح کا تعلق نہیں ہو سکتا، نیز اہل کتاب مردوں سے بھی مسلمان عورتوں کا نکاح نہیں ہو سکتا؛ لیکن اہل کتاب عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں، اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، جو واقعی خدا پر، رسالت پر، آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، گو پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کا ایمان نہ ہو، جو محض خاندانی طور پر یہودی یا عیسائی ہوں؛ مگر خدا کے منکر ہوں، نبوت کے قائل نہ ہوں، وہ اہل کتاب میں شامل نہیں ہیں، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے، نہ ان کی عورتوں سے مسلمان مردوں کے لئے نکاح جائز ہے، آج کل امریکہ و یورپ وغیرہ کی اکثریت کا یہی حال ہے —— ''من قبلکم'' (تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی) سے واضح ہو گیا کہ اہل کتاب سے اسلام سے پہلے کے مذاہب (یہودیت و نصرانیت) کے ماننے والے مراد ہیں، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگر کوئی بدبخت نبوت کا دعویٰ کرے اور کچھ کم نصیب لوگ اس دعویٰ پر لبیک کہیں، تو وہ ''اہل کتاب'' کے حکم میں نہیں ہیں، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح درست، وہ عام کفار و مشرکین کی طرح ہیں؛ بلکہ ان سے بھی بدتر، جیسا کہ اس دور میں قادیانیوں کا گروہ ہے، —— مسلمان اور کتابی عورتوں کے ''پاک دامن'' ہونے کی شرط اخلاقی ہے، یعنی کسی مسلمانوں کو زیبا نہیں کہ وہ بدقماش عورت کو اپنے نکاح میں لائے؛ لیکن نکاح کر لے تو منعقد ہو جائے گا۔

﴿۵﴾ زنا کار کا معنی دونوں الفاظ میں ہے؛ لیکن ''مسافحین'' سے علانیہ زنا کرنے والے اور ''متخذی اخذان'' سے چھپ چھپا کر بدکاری کرنے والے مراد لئے گئے ہیں۔ (دیکھئے: فتح القدیر: ۱۸/۲)

﴿۶﴾ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بعض اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے؛ لیکن ایمان سے انکار کرنا اُن اہل کتاب کے لئے بھی اسی قدر نقصان دہ ہے اور ظاہری نیک اعمال اور بعض ایمانیات پر پانی پھیر دینے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ
كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ
تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللهُ
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿٦﴾ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا
وَ اَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللهَ ؕ اِنَّ اللهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿٧﴾

اے مسلمانو ! جب نماز کے لئے کھڑے ہوتو چہرے اور کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھوؤ، اپنے سروں کا مسح کرو اور ٹخنوں سمیت اپنے پاؤں دھوؤ، ﴿۱﴾ اگر تم جنابت کی حالت میں ہوتو غسل کرلو، ﴿۲﴾ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے فارغ ہو یا بیوی سے صحبت کرے، پھر تمہیں پانی میسر نہ ہوتو پاک مٹی سے تیمم کرو، اس طرح کہ پاک مٹی سے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلو، ﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ تم کو تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتے؛ لیکن چاہتے ہیں کہ تمہیں پاک صاف رکھیں اور تم پر اپنی نعمت پوری فرمادیں، شاید تم شکر ادا کرو ﴿۶﴾ اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو، ﴿۴﴾ اور اللہ کے اس عہد کو یاد کرو، جو اس نے تم سے لیا ہے، جب تم نے کہا تھا: ہم نے سنا اور قبول کیا، ﴿۵﴾ نیز اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ دلوں کے اندر جو کچھ ہے، اس سے بھی آگاہ ہیں۔ ﴿۷﴾

﴿۱﴾ پس ! وضوء میں یہ چار باتیں فرض ہیں، اس کے علاوہ احادیث میں وضوء سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے جو فرمودات اور معمولات مروی ہیں، وہ سنت یا مستحب ہیں۔

﴿۲﴾ ''فَاطَّهَّرُوْا'' اصل معنی ہیں ''خوب پاکی حاصل کرو'' یہ ''خوب پاکی حاصل کرنا'' بہ مقابلہ وضوء کے غسل ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے، اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غسل ہی سے ترجمہ کیا ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت میں تیمم سے متعلق متعدد احکام کا ذکر ہے، اول: یہ کہ بیمار کے لئے پانی کا استعمال نقصان دہ ہوتو تیمم کرسکتا ہے، دوسرے: مسافر گو صحت مند ہو؛ لیکن پانی میسر نہ ہوتو وہ بھی تیمم کرسکتا ہے؛ چوں کہ مسافر ہی کو عام طور پر اس کی نوبت آتی ہے، اس لئے مسافر کا ذکر فرمایا گیا، اگر مسافر نہ ہو، اس کے باوجود پانی میسر نہ ہوتو ظاہر ہے کہ اس کے لئے بھی یہی حکم ہوگا، تیسرے: جس کو وضوء کی ضرورت ہو وہ تیمم کرسکتا ہے؛ کیوں کہ قضاء حاجت (جس کا ذکر فرمایا گیا ہے) سے وضوء ہی واجب ہوتا ہے، چوتھے: غسل کی ضرورت ہوتب بھی بیماری یا پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم درست ہے؛ چنانچہ صحبت کرنے والے کو بھی تیمم کی اجازت دی گئی، پانچویں: تیمم پاک زمین پر کیا جائے گا، زمین سے مراد اجزاءِ زمین ہیں، (فتح القدیر: ۱/ ۱۱۲) جیسے: مٹی، ریت، وغیرہ، حنفیہ کے نزدیک جو چیز جلانے سے راکھ نہ ہو اور نہ پگھلے، وہ سب ''زمین'' میں داخل ہے اور ان سے تیمم درست ہے، نیز اس کا پاک ہونا بھی ←

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ٘ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی
اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی٘ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۸ وَعَدَ
اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۹ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۱۰

اے ایمان والو! اللہ کا حق ادا کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے رہو، کسی قوم کی دشمنی تم کو ناانصافی پر آمادہ نہ کردے، یہی تقویٰ سے قریب تر (طریقہ) ہے، «۱» اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں ۸ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کے لئے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی، «۲» ۹ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ دوزخی ہیں۔ ۱۰

← ضروری ہے، چھٹے: تیمم میں دو باتیں فرض ہیں: چہرہ کا مسح، ہاتھوں کا مسح، اکثر فقہاء نیز حنفیہ کے نزدیک کہنیوں سمیت ہاتھوں کا مسح ضروری ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (مستدرک حاکم، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر: ۱۹۲، ۶۳۸)

«۴» زندگی گذارنے کے سلسلہ میں صحیح راستہ کی اور حق وسچائی کی رہنمائی اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے؛ اس لئے زیادہ تر اہل علم نے اس سے نعمتِ اسلام ہی مراد لی ہے۔

«۵» اس سے کون سا عہد مراد ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض حضرات نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے سے متعلق عالم ارواح کا اقرار مراد لیا ہے، اسی اقرار کا اثر ہے کہ ہر انسان کی فطرت میں خدا کی طلب اور اس کے سامنے جھکنے کا جذبہ پایا جاتا ہے، بعض حضرات نے اس کا مخاطب یہودیوں کو قرار دیا ہے اور وہ عہد مراد لیا ہے، جو ان سے تورات میں لیا گیا تھا، بعض نے صحابہ کو اس کا مخاطب سمجھا ہے اور ''بیعتِ عقبہ'' یا دوسرے مواقع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جو عہد لیا تھا، اس کی طرف قرآن مجید کا اشارہ قرار دیا ہے، ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام خود ایک عہد ہے، جو شخص اسلام قبول کرتا ہے وہ زبانِ حال سے تمام احکام الٰہی کو ماننے کا اقرار کرتا ہے، یہی آخری رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے —— اس تفسیر کے مطابق تمام اہل ایمان اس کے مخاطب ہیں۔

«۱» انسان کو انصاف کی راہ سے ہٹانے والی دو چیزیں ہوتی ہیں، کسی سے محبت وتعلق، یا کسی سے نفرت وعداوت، نساء (آیت نمبر: ۱۳۵) میں محبت وتعلق کی بنا پر ناانصافی کو منع فرمایا گیا، اور یہاں عداوت ونفرت کی بنا پر ناانصافی کو، اسلام کا نظام عدل کس قدر صاف ستھرا ہے کہ اس میں نیک و بد، فرماں بردار و نافرمان، مسلمان وغیر مسلم اور اپنے اور بیگانے کا کوئی فرق نہیں، انصاف ہر ایک کے ساتھ ضروری ہے!

«۲» معلوم ہوا کہ اللہ کی مغفرت اور اجر حاصل کرنے کے لئے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے، اور عمل صالح کا خلاصہ ہے اُسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وپیروی، جو لوگ محبت رسول کو کافی سمجھتے ہیں اور عمل کو غیر ضروری، یہ ان کے لئے تنبیہ ہے، اور جو واقعی رسول سے محبت رکھتا ہو، اس کا عمل سے غفلت و بے توجہی برتنا ممکن نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ
اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَ لَقَدْ
اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ
لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ
فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

ع ۲/۶

اے ایمان والو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ ایک گروہ نے تم پر دست درازی کرنی چاہی، تو اللہ نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روک دیا، اللہ سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے، ﴿۱﴾ ﴿۱۱﴾ اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، ﴿۲﴾ اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کردیئے تھے، ﴿۳﴾ اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، ﴿۴﴾ اگر تم نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کو تقویت پہنچائی، نیز اللہ کو بہتر طور پر قرض دیا، ﴿۵﴾ تو میں تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا اور تمہیں ایسی بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، پس! تم میں سے جس نے اس کے بعد بھی انکار کیا، وہ یقیناً سیدھے راستہ سے ہٹ گیا۔ ﴿۱۲﴾

﴿۱﴾ ایسے کئی واقعے ہوئے کہ دشمنانِ اسلام نے رسول اللہ ﷺ کے قتل کی سازشیں کیں، اور یہ سازشیں اللہ کی نصرت و مدد سے ناکام رہیں، اسی طرح کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار آپ ﷺ سفر میں ایک درخت کے نیچے استراحت فرمارہے تھے اور تلوار درخت سے لٹکا رکھی تھی کہ ایک دیہاتی آیا، اس نے اچانک تلوار اپنے قبضہ میں لے لی اور کہنے لگا: تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ! یہ سنتے ہی اس کے ہاتھ سے تلوار گرگئی، اب یہی سوال آپ ﷺ نے فرمایا، اس نے کہا: آپ بہتر گرفتار کرنے والے شخص ہیں، یعنی معاف کرنے کے لئے التجاء کرنے لگا، آپ ﷺ نے معاف فرمادیا، (مستدرک حاکم: ۲۹/۳-۳۰) بعض مفسرین نے اسی واقعہ کو اس آیت کا شانِ نزول بتایا ہے۔ (تفسیر طبری: ۹۴/۶)

﴿۲﴾ وہ عہد مراد ہے، جو بنی اسرائیل نے اپنے نبیوں کے ساتھ کیا تھا۔

﴿۳﴾ کیوں کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے، بائبل میں بھی بارہ قبائل کا ذکر موجود ہے، ''گنتی'' نامی صحیفہ میں قبائل کے بارہ سرداروں کے نام بھی شمار کرائے گئے ہیں، (گنتی: ب:۱) یہ سردار اپنے اپنے قبیلہ پر نگرانی کے لئے تھے —— اس سے اجتماعیت اور امیر کے تحت زندگی گذارنے کا سبق ملتا ہے۔

﴿۴﴾ اللہ کے ساتھ ہونے سے مراد اللہ کی مدد ہے، مومن کے لئے ہر مہم اور ہر کوشش میں یہی سرمایۂ حیات اور سرچشمۂ قوت ہے۔

﴿۵﴾ ''اللہ کو قرض دینے'' کا مطلب اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کرنا ہے، اور ''بہتر قرض'' کہہ کر اخلاص کی طرف اشارہ کیا گیا، کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، ریاء ونمود سے پاک ہو، اور صرف خدا کو راضی کرنے کا جذبہ ہو، صدقہ و انفاق کو قرض کہہ کر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ فرمایا گیا کہ جیسے قرض کو لوٹانا اور واپس کرنا واجب ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اس عمل کا نفع اسی کی طرف واپس فرمائیں گے اور اس کا یہ خرچ کرنا رائیگاں نہیں ہوگا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۪ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

چنانچہ ان کے وعدہ خلافی کرنے کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا اور ان کے دل سخت کردیئے، ﴿۱﴾ یہ بات کو اپنے موقع ومحل سے ہٹادیتے ہیں، ﴿۲﴾ اور انھیں جو نصیحتیں کی گئی تھیں، ان کا ایک بڑا حصہ بھلا بیٹھے ہیں، ان میں سے کچھ کو چھوڑ کر آپ کو ہمیشہ ان لوگوں کی خیانت کی اطلاع ملتی ہی رہے گی، ﴿۳﴾ پھر بھی آپ انھیں معاف کردیجئے اور درگذر سے کام لیجئے، بے شک اللہ بہتر معاملہ کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں ﴿۴﴾ ﴿۱۳﴾ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی وعدہ لیا تھا، انھوں نے بھی —— جو نصیحتیں انھیں کی گئی تھیں، ان کا —— بڑا حصہ بھلا کر رکھ دیا ہے؛ ﴿۵﴾ چنانچہ ہم نے قیامت تک کے لئے ان میں باہم دشمنی اور کینہ ڈال دیا ہے، اور جو کچھ وہ کررہے ہیں، اللہ عنقریب انھیں وہ بتلادیں گے۔ ﴿٦﴾ ﴿۱۴﴾

﴿۱﴾ یعنی دلوں میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی، یہ بے توفیقی بھی اللہ کا ایک عذاب ہے!

﴿۲﴾ یعنی کتاب الٰہی میں تبدیلی وتحریف کردیتے ہیں، یہ تبدیلی الفاظ کی بھی ہوتی تھی، اور معنی ومفہوم میں غلط بیانی کے ذریعہ بھی ہوتی تھی، مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی نے ''اظہار الحق'' میں تورات کی تحریفات کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔

﴿۳﴾ خیانت سے مراد تورات میں ردوبدل اور ہیر پھیر ہے، یہودیوں کی تحریفات کے بعض واقعات حدیث میں مذکور ہیں اور خود قرآن مجید میں بھی ان کی اپنے بارے میں خود فریبی وخوش فہمی اور تورات کی طرف ان کی نسبت کرنے کا ذکر آیا ہے اور اس کی تردید کی گئی ہے۔

﴿۴﴾ گویا خوش معاملگی اور حسن سلوک ہر شخص کے ساتھ مطلوب ہے، مومن ہو یا کافر، اور نیک وصالح ہو یا فاسق وفاجر۔

﴿۵﴾ اسی بھلائے ہوئے حصہ میں توحید اور محمد ﷺ کی رسالت بھی ہے، بہت سی آمیزشوں اور تبدیلیوں کے باوجود خدا کی قدرت ہے کہ بائبل کے 'عہد عتیق' میں بھی اور زیادہ واضح طور پر 'عہد جدید' میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں پیش گوئیاں موجود ہیں، (تفصیل کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی ''اظہار الحق'' دیکھی جاسکتی ہے) اور غالباً 'عہد جدید' میں زیادہ وضاحت سے اس کا ذکر اس لئے ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد ہی نبوت محمدی ﷺ کا اعلانِ عام کرنا تھا۔

﴿٦﴾ یوں تو مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان عقیدہ وعمل کا اختلاف رہا ہے؛ لیکن عیسائیوں میں یہ اختلاف غالباً ←

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡـكِتٰبِ
وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ‏ ﴿۱۵﴾ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ
رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ﴿۱۶﴾

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارے رسول آچکے ہیں، کتاب (الٰہی) کی بہت سی باتیں جنھیں تم چھپاتے ہو، وہ اسے تمہارے لئے بیان کرتے ہیں اور بہت سی باتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں، «۱» یقیناً (اب) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے، «۲» ﴿۱۵﴾ جو اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے، اللہ اس کے ذریعہ اس کو نجات کے راستوں پر چلاتے ہیں، اپنی توفیق سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتے ہیں اور سیدھی راہ پر قائم رکھتے ہیں۔ ﴿۱۶﴾

← سب سے زیادہ ہے اور بنیادی عقائد کے بارے میں بھی اتفاق نہیں، پھر یہ اختلاف عیسائی دنیا میں جس تشدد، جور وظلم اور مردم سوزی کا باعث ہوا ہے، شاید ہی مذاہب عالم کی تاریخ میں اس کی مثال مل سکے۔

«۱» یعنی جن باتوں کا اظہار مناسب ہے، ان کو ظاہر کرتے ہیں، یہ ان کی نبوت کی دلیل ہے؛ کیوں کہ سوائے وحی کے آپ کو اور کوئی ذریعۂ علم حاصل نہیں تھا، اور جن اُمور کو ظاہر کرنے میں دینی فائدہ نہیں؛ بلکہ اس سے تمہاری اہانت ہوتی اور تمہاری خیانت لوگوں کے سامنے ظاہر وآشکار ہوجاتی، انھیں چھوڑ دیتے ہیں، جو آپ ﷺ کا حلم ہے، اور یہ اخلاق کریمانہ بھی آپ ﷺ کی نبوت کو پہچاننے میں معاون ومددگار رہیں۔

«۲» واضح کتاب سے مراد قرآن مجید ہے، ''نور'' (روشنی) سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ ''نور'' سے بھی قرآن ہی مراد ہے، اور ''کتاب مبین'' اسی کی تفسیر وتوضیح ہے، یہی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید میں ایک اور موقع پر بالاتفاق ''نور'' سے قرآن مجید مراد لیا گیا ہے: ''انزلنا الیکم نورا مبیناً'' (النساء: ۱۷۴) دوسرا قول یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں، (تفسیر بغوی: ۶/ ۶۵۴) ہر دو رائے پر یہ لفظ تشبیہ کے طور پر آیا ہے، کہ جیسے روشنی اندھیروں کا قلع قمع کردیتی ہے، اسی طرح قرآن اور حامل قرآن مینارۂ نور رہیں، جن سے کفر کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مادۂ تخلیق نور ہے؛ کیوں کہ خود قرآن مجید نے دوسرے موقع پر آپ ﷺ کو بشر قرار دیا ہے، (الکہف: ۱۱۰) پھر یہ کہ خالق تعالیٰ کے بعد تمام مخلوقات میں انسان افضل ہے اور ملائکہ سے اسے سجدہ کرا کے فرشتوں پر بھی اس کی فضیلت وبرتری واضح کردی گئی ہے، اب اگر کسی نبی کو ''انسان'' نہ مانا جائے، اور کسی اور مادۂ تخلیق سے قرار دیا جائے تو یہ اس کی توہین ہے نہ کہ تعظیم، اور یہ اس کے درجۂ ومقام کو گرانا ہے نہ کہ اونچا اُٹھانا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ
اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ
وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ
مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا
بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ
الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع ۳/۸

جن لوگوں نے کہا مسیح بن مریم خدا ہیں، انھوں نے یقیناً کفر کیا، آپ پوچھئے کہ اگر اللہ مسیح بن مریم، ان کی والدہ اور زمین کے تمام لوگوں کو ہلاک کردینا چاہیں تو اللہ کے مقابلہ کسی کی کچھ چل سکتی ہے؟ آسمانوں پر، زمین پر اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، ان سب پر اللہ ہی کی حکومت ہے، اللہ جو چاہیں پیدا کرتے ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۷﴾ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں'' ﴿۲﴾ آپ ان سے پوچھئے کہ پھر اللہ تم کو تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتے ہیں؟ بلکہ تم بھی اللہ کی مخلوقات میں سے انسان ہی تو ہو، اللہ جسے چاہتے ہیں معاف کرتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں عذاب دیتے ہیں، آسمان، زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزیں اللہ ہی کی ملکیت ہیں، اور سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، ﴿۱۸﴾ اے اہل کتاب! رسولوں کے سلسلہ میں وقفہ کے بعد تمہارے پاس ہمارے رسول آچکے ہیں، ﴿۳﴾ جو تمہیں صاف صاف بتاتے ہیں، کہ کہیں تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس تو کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آیا ہی نہیں؟ تو اب تمہارے پاس خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے آچکے ہیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ﴿۱۹﴾

﴿۱﴾ غرض کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام کے بہ شمول پوری مخلوق خدا کے سامنے عاجز محض ہے، تو ان میں سے کوئی اللہ کا ہمسر و شریک کیوں کر ہوسکتا ہے؟ رہ گئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ کی پیدائش، تو اللہ ہر چیز کی بالواسطہ اور بلاواسطہ تخلیق پر قادر ہیں۔

﴿۲﴾ ''بیٹے'' سے مراد صلبی بیٹے نہیں ہیں؛ بلکہ مقربین مراد ہیں؛ کہ وہ اپنے آپ کے خدا کے محبوب اور قریبی لوگ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، بائبل میں اب بھی ایسے دعوے موجود ہیں، ''خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے''، (خروج: ۴/ ۲۲) اور انجیل میں ہے: ''جتنوں نے اسے قبول کیا، اس نے انھیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا'' (یوحنا: ۱/ ۱۲) اس خوش فہمی ←

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ
وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٠﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ
الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تمہارے اندر نبی پیدا فرمائے، ﴿۱﴾ تمہیں حکمراں بنایا، ﴿۲﴾ اور تم کو وہ عطا فرمایا تھا، جو ساری دنیا میں کسی اور کو نہیں دیا تھا ﴿۳﴾ ﴿۲۰﴾ اے میری قوم! تم اس پاک زمین میں داخل ہو، جس کو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، ﴿۴﴾ اور اپنی پیٹھیں نہ پھیر لو، ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے۔ ﴿۲۱﴾

← کا شکار مختلف قومیں رہا کی ہیں، ہندوستان میں برہمن اور اونچی ذاتیں اس کی مثال ہیں، جو اپنے آپ کو خدا کی، سورج کی اور چاند کی اولاد کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔

﴿۳﴾ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ، حضرت مسیح علیہ السلام کے اور آپ ﷺ کی بعثت کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا وقفہ ہے، جس میں کوئی نبی نہیں آئے، اور کتاب گو موجود تھی؛ لیکن تحریف شدہ، اب چوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے، جس کو سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے؛ اس لئے اب کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

﴿۱﴾ قرآن مجید میں جن انبیاء کا ذکر آیا ہے، ان میں زیادہ تر بنی اسرائیل یعنی حضرت اسحاق علیہ السلام ہی کے نسل سے تھے: حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

﴿۲﴾ جب کسی قوم کا کوئی فرد حکمراں ہوتا ہے، تو اس پورے گروہ کی طرف حکومت منسوب ہوتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا: ''تمہیں حکمراں بنایا'' ورنہ ظاہر ہے کہ پوری قوم حکمراں نہیں تھی۔

﴿۳﴾ اس سے مراد عقیدۂ توحید کا حامل ہونا ہے؛ کہ عہد موسوی میں یہ نعمت سوائے قوم بنی اسرائیل کے کسی اور کو حاصل نہیں تھی، بعض مفسرین نے انبیاء اور باشاہوں کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرتوں —— جیسے: سمندر میں راستہ بن جانا، آسمان سے من وسلویٰ کا اترنا، پتھر سے پانی کا چشمہ جاری ہونا اور بادلوں کا سایہ فگن ہونا، وغیرہ —— کا ظاہر ہونا مراد لیا ہے۔

﴿۴﴾ ''پاک سرزمین'' سے ''شام'' مراد ہے، (تفسیر منار: ۶/۲۷۶) اس وقت موجودہ فلسطین بہ شمول بیت المقدس شام ہی کا حصہ تھا اور یہاں ایک جنگجو اور مشرک قوم ''بنوعمالقہ'' قابض تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل کو تلقین فرمائی کہ ان سے جہاد کر کے اس متبرک مقام کو فتح کریں، تورات کے صحیفہ ''گنتی'' میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے، بنی اسرائیل کے اس رویہ کے مقابلہ رسول اللہ ﷺ کے ان صحابہ کا کردار دیکھئے جو غزوۂ بدر کے موقع سے سامنے آیا، جب صحابہ نے نہتھے اور تعداد میں نہایت کم ہونے کے باوجود اللہ کے سامنے سر جھکا دیا اور رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارہ پر سر کٹانے کو تیار ہو گئے، اس سے آپ ﷺ کے صحابہ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ
يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا
عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾
قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا
قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَ اَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾
قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَىْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا (وقف لازم، ع ۸)
وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ (النصف)

ان لوگوں نے کہا: اے موسیٰ! یہاں تو ایک طاقتور قوم (آباد) ہے، جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، ہم وہاں ہرگز داخل نہ ہوں گے، ہاں! اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے ﴿۲۲﴾ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے دو آدمیوں نے ﴿۱﴾ —— جن پر اللہ کا فضل تھا، —— کہا: تم ان پر دروازہ تک تو آؤ، تم جس وقت دروازہ میں قدم رکھ دو گے، اسی وقت ضرور غالب آجاؤ گے اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو ﴿۲۳﴾ کہنے لگے: اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم ہرگز قدم بھی نہیں رکھیں گے، آپ اور آپ کے پروردگار جائیں اور جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے ﴿۲۴﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے پروردگار! میں تو صرف اپنی ذات اور اپنے بھائی ہی پر اختیار رکھتا ہوں، آپ ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان فیصلہ فرما دیجئے ﴿۲۵﴾ اللہ نے فرمایا: یہ زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام ہے، یہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے: لہٰذا آپ اس نافرمان قوم پر ترس نہ کھایئے ﴿۲﴾ ﴿۲۶﴾ اور ان لوگوں پر آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ بھی ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا دیجئے، جب دونوں نے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی تو قربانی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی، ﴿۳﴾ دوسرے نے کہا: میں تجھ کو قتل کر کے رہوں گا، پہلے نے کہا: اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔ ﴿۲۷﴾

﴿۱﴾ یہ بنی اسرائیل کی دو شاخوں بنو افرائیم اور بنو یہودا کے سردار یوشع بن نون اور کالب بن یوقنا تھے۔

﴿۲﴾ بنی اسرائیل کو ان کی سرتابی کی سزا دی گئی اور وہ چالیس سال تک صحرائے سینا میں بھٹکتے رہے، نیز ان کی تربیت واصلاح کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام بھی ان کے ساتھ رکھے گئے، یہاں تک کہ ۲۰ سال اور اس سے زیادہ عمر کے تمام لوگ مر گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی بھی وفات ہوگئی اور حضرت یُوشع بن نُون علیہ السلام نبی بنائے گئے، اب بنی اسرائیل کی نئی نسل نے حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں شام وفلسطین کو فتح کیا، بائبل کے صحیفہ گنتی کے باب: ۱۴ میں تفصیل سے اس کا ذکر موجود ہے۔ ←

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ۚ

تو اگر تو نے میرے قتل کے لئے مجھ پر ہاتھ اُٹھایا، تب بھی میں تو تیرے قتل کے لئے تجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا،﴿۱﴾ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو تمام عالم کے پروردگار ہیں ﴿۲۸﴾ میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے گناہ کے ساتھ ساتھ میرے گناہ کا بوجھ بھی اُٹھالے اور دوزخیوں میں سے ہوجائے، اور یہی ظلم کرنے والوں کی سزا ہے۔﴿۲﴾ ﴿۲۹﴾

← ﴿۲﴾ دونوں بیٹوں سے مراد ہابیل وقابیل ہیں، قابیل بڑے تھے اور ہابیل چھوٹے، بائبل میں ان کا نام قائن اور ہال آیا ہے، جب حضرت آدم وحوا علیہما السلام اس دنیا میں آباد کئے گئے تو اس وقت سب سے بڑی ضرورت نسل انسانی کی افزائش تھی؛ چنانچہ حضرت حوا علیہا السلام کو مسلسل جڑواں اولاد ہوتی، جن میں سے ایک لڑکا ہوتا اور ایک لڑکی، حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں حکم یہ تھا کہ ایک ہی بطن سے پیدا ہونے والے بھائی بہن ایک دوسرے کے لئے حرام ہیں، دوسرے بطن کی اولاد سے ان کا نکاح ہوتا؛ چنانچہ قابیل وہابیل کا ایک دوسرے کی جڑواں بہن سے نکاح ہوا، قابیل کی بہن کا نام ''اقلیماء'' تھا اور وہ زیادہ خوبصورت تھی، ہابیل کی بہن کا نام ''لیوذا'' تھا اور وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی، قابیل اپنی ہی جڑواں بہن سے نکاح کرنے پر مصر تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے اسے سمجھایا؛ لیکن اس نے مان کر نہیں دیا، پھر آپ نے دونوں کو خدا کے حضور اپنی نذر پیش کرنے کی تلقین کی؛ کہ جس کی نذر قبول ہوجائے، اس کا نکاح اس خوبصورت لڑکی سے ہو، ہابیل کے پاس مویشی تھے، اس نے مینڈھا پیش کیا، قابیل کے پاس کھیتی تھی، اس نے پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا، ہابیل کی قربانی پر آسمانی آگ اُتری، جو قبولیت کی علامت تھی، قابیل کی قربانی پر آگ نہیں اُتری؛ مگر اس کے باوجود قابیل نے نہ مانا اور قتل کی دھمکی دینے لگا، پھر اس دھمکی کے جواب میں جب ہابیل نے واضح کر دیا کہ وہ پھر بھی ہاتھ نہیں اُٹھائے گا تو اب اس کی ہمت اور بڑھ گئی اور آخر اس نے بھائی کا قتل کر کے ہی چھوڑا۔ (ابن کثیر: ۶/ ۶۶۲)

﴿۱﴾ اگر کسی شخص پر حملہ کیا جائے تو بہ قدر طاقت اپنا دفاع کرنا جائز ہے یا واجب؟ اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک صرف جائز ہے، اس قول کے مطابق ہابیل کی خود سپردگی پر کوئی اعتراض نہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ دفاع واجب ہے، زیادہ تر اہل علم کی یہی رائے ہے، ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ دفاع کے واجب ہونے کا حکم شریعتِ محمدی ﷺ میں ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم نہیں تھا۔

﴿۲﴾ ایک شخص پر دوسرے کے گناہ کی ذمہ داری نہیں ہوتی؛ مگر اس سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں: اول یہ کہ قیامت کے دن مظلوم کو ظالم سے اس طرح بدلہ دلوایا جائے گا کہ پہلے ظالم کی نیکیاں مظلوم کے حصہ میں ڈالی جائیں گی، یہاں تک کہ نیکیاں ختم ہوجائیں گی، اور حق تلفیاں باقی رہ جائیں گی، اب مظلوم کے گناہ ظالم کے حصہ میں ڈالے جائیں گے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۲۶۱، ابواب الفتن والملاحم) دوسرے: جو شخص کسی برے طریقہ کو شروع کرے، تو بعد میں جو لوگ بھی اس بری راہ پر چلیں گے، ان کے گناہ میں ←

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۝۳۰ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا
یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ
مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ۝۳۱ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا
عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ
النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا
بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ۝۳۲

غرض اس کے نفس نے اس کی نظر میں اپنے ہی بھائی کے قتل کو آسان کردیا، آخر کار اس نے اسے مار ہی ڈالا اور اس طرح وہ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگیا، ۝۳۰ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کو بھیجا جو زمین کو کھود رہا تھا؛ تا کہ اسے دیکھادے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے؟ کہنے لگا: ہائے افسوس! کیا میں اس کوے سے بھی گیا گذرا ہوگیا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا؛ چنانچہ وہ شرمندہ ہوا《۱》 ۝۳۱ اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ جس نے کسی کو — کسی شخص کے قتل یا زمین میں فساد مچانے کے جرم کے بغیر — قتل کردیا، گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا، اور جس نے ایک جان کی زندگی بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کو بچایا؛《۲》 حالاں کہ ہمارے بہت سے پیغمبر اُن کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آچکے ہیں، پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ روئے زمین پر زیادتی ہی کرتے رہتے ہیں۔ ۝۳۲

← برائی کا یہ بانی اول بھی شریک ہوگا، (ابن ماجه، باب من سن سنة الخ، حدیث نمبر: ۲۰۳) چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر قتل کے گناہ میں قابیل بھی شریک ہوتا ہے، (بخاری، باب خلق آدم و ذریته، حدیث نمبر: ۳۳۳۵) قابیل نے ہابیل پر ظلم تو کیا ہی، خدا کی زمین پر پہلا قتل ناحق بھی اسی کے ہاتھوں نے کیا ہے؛ اس لئے وہ ہابیل کے گناہ کا بوجھ تو اٹھائے گا ہی، اس کے علاوہ ہر قتل ناحق کے گناہ میں بھی شریک رہے گا۔

《۱》 پچھتاوا گناہ پر نہیں تھا؛ بلکہ اپنی لاعلمی اور ناواقفیت پر تھا؛ اس لئے یہ پچھتاوا توبہ نہیں ہے، جو انسان کو آخرت کے نقصان سے بچاتا ہے — آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ شروع ہی سے مردہ کو زمین میں دفن کرنے کا طریقہ رہا ہے، نہ کہ لاش کو جلانے کا، دفن کرنے میں مردہ کا احترام بھی ہے اور ماحولیاتی آلودگی سے حفاظت بھی، جلانے میں انسان کی بے حرمتی بھی ہے، عام طور پر کپڑے پہلے جل جاتے ہیں، اس لئے بے پردگی بھی ہوتی ہے، نیز اس سے فضائی آلودگی پیدا ہوتی ہے، جب کہ مٹی میں آلودگی کو جذب کرنے اور تحلیل کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے؛ اس لئے دفن کرنے سے آلودگی پیدا نہیں ہوتی۔

《۲》 اصل چیز انسانی زندگی کا احترام اور اس کی اہمیت کا احساس ہے، اگر کوئی شخص اس جذبۂ واحساس سے عاری ہوکر ←

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسر پیکار رہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ﴿۱﴾ ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کردیئے جائیں، یا انھیں سولی دے دی جائے، یا اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انھیں جلاوطن کردیا جائے، ﴿۲﴾ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔ ﴿۳۳﴾

← ایک شخص کا قتل کر بیٹھے تو وہ اپنے بے جا مقاصد کے لئے بہت سے انسانوں کا قتل بھی کرسکتا ہے اور جو انسانی زندگی کی اہمیت وحرمت کو سمجھتا ہوگا، وہ ایک گروہ کی جان بچانے کی بھی کوشش کرے گا اور ایک شخص کی بھی، اسی کو قرآن مجید نے اِس بلیغ اور موٴثر فقرہ میں بیان کیا ہے۔

﴿۱﴾ اللہ اور رسول سے جنگ کرنے سے مراد اُن کے احکام وقوانین کی مخالفت کرنا اور ''فساد مچانے'' سے مراد سماج کے امن کو تہ وبالا کرنا ہے، خواہ اس ظلم وغارت گری کا شکار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

﴿۲﴾ یہاں چار سزاؤں کا ذکر آیا ہے، مفسرین اور فقہاء کے نزدیک یہ ڈاکوؤں کے چار الگ الگ گروہوں کے لئے ہیں، (۱) قتل اس کے لئے جو قتل کا مرتکب ہو، (۲) ''سولی'' اس شخص کے لئے جس نے قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا، (۳) ''ہاتھ پاؤں کاٹ دیا جانا'' مال لوٹنے والوں کی سزا، اور اُلٹے کاٹنے سے مراد دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا ہے، (۴) اور جلاوطنی اس ڈاکو کی، جس نے قتل کرنے اور مال لوٹنے کا ارادہ تو کیا؛ لیکن کیا نہیں، یا کرنے پر قادر نہیں ہوا؛ البتہ چند باتیں قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ یہاں ''قتل'' کا حکم ''حد شرعی'' کے طور پر ہے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہوتا ہے، نہ کہ قصاص کے طور پر جو بندوں کا حق ہے؛ اس لئے اگر مقتول کے ورثہ قاتل کو معاف کردیں تو اس کا اعتبار نہ ہوگا اور حد شرعی جاری ہوگی، دوسرے: سولی میں بھی مجرم کی جان ہی لی جاتی ہے، گویا اصل سزا قتل ہی ہوئی؛ البتہ سزا کی تشہیر اور عبرت کے لئے سولی پر چڑھایا جاتا ہے؛ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک سولی پر چڑھانا حاکم کی صوابدید پر ہے؛ کیوں کہ علانیہ قتل سے بھی تشہیر کا مقصد حاصل ہوسکتا ہے؛ لیکن اکثر فقہاء اور خود امام صاحب رحمہ اللہ کے شاگردوں میں امام ابویوسف رحمہ اللہ سولی پر چڑھانے کو بھی لازمی حکم قرار دیتے ہیں، تیسرے: جلاوطن کرنے سے مراد ہے اس کے مقام رہائش سے نکال دینا؛ چنانچہ اکثر اہل علم کے نزدیک ایسے مجرم کو شہر بدر کردیا جائے گا، کہ وہ کسی اور شہر میں جا کر رہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس سے قید کرنا مراد ہے، کہ یہ بھی جلاوطنی میں شامل ہے: کیوں کہ اس جرم پیشہ شخص کو دوسرے شہر میں بھیجنا اس شہر کے لوگوں کو مصیبت میں مبتلا کرنا ہے، یہی نقطۂ نظر حنفیہ کا ہے، اور عرب اس لفظ (نفی من الارض) کو زیادہ تر اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں، چوتھے: اگر کوئی شخص قتل اور مال لوٹنے کا تو مرتکب نہ ہو؛ لیکن اس نے لوگوں کو زخمی کیا ہو، اس کا حکم ذکر نہیں کیا گیا؛ لہٰذا اس پر قصاص کے احکام جاری ہوں گے، جیسا کہ اس سورہ کی آیت نمبر: ۴۵ میں آیا ہے، پانچویں: اگر چند اشخاص نے مل کر جرم کا ارتکاب کیا تو ان سب پر سزا جاری ہوگی؛ کیوں کہ وہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنے ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣٤﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٣٥﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ
وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٣٧﴾ وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا
جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾

سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے ان پر قابو پانے سے پہلے ہی توبہ کرلیں، ﴿۱﴾ تو جان لو کہ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والے اور بڑے ہی مہربان ہیں ﴿٣٤﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اس کی نزدیکی ﴿۲﴾ کے طلب گار رہو اور اس کے راستہ میں جدوجہد کرتے رہو؛ ﴿۳﴾ تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ ﴿٣٥﴾ بے شک جو لوگ ایمان نہیں لائے، اگر ان کے پاس دنیا بھر کی چیزیں ہوں اور اتنی ہی اور بھی ہوں؛ تاکہ وہ انھیں دے کر قیامت کے دن کے عذاب سے بچ جائیں، تب بھی وہ ان سے ہرگز قبول نہیں کی جائیں گی، ﴿۴﴾ اور ان کے لئے بہت ہی دردناک عذاب ہے، ﴿٣٦﴾ وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، اور وہ اس سے نکل نہیں پائیں گے، ان کے لئے تو ہمیشہ کا عذاب ہے، ﴿۵﴾ ﴿٣٧﴾ چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت، ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو، ﴿۶﴾ یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے، (اور) اللہ کی طرف سے عبرت کے لئے ہے، ﴿۷﴾ اور اللہ بڑی قوت والے اور حکمت والے ہیں۔ ﴿٣٨﴾

﴿۱﴾ یعنی اگر ڈاکو گرفتار ہونے سے پہلے ہی تائب ہوجائیں اور ان کا تائب ہونا ثابت ہوجائے، تو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر جو سزا تھی، وہ معاف ہوجائے گی؛ لیکن بندوں کے حق سے متعلق جو سزا ہے، وہ معاف نہیں ہوگی، جیسے: کسی کا قتل کیا ہو تو قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا؛ البتہ مقتول کے ورثہ کو معاف کردینے یا خوں بہا پر راضی ہوجانے کا حق ہوگا، اسی طرح مال لوٹا ہو تو اُلٹے ہاتھ پاؤں تو نہ کاٹے جائیں گے؛ لیکن مال انھیں واپس کرنا ہوگا اور مال باقی نہ ہو تو اس کا بدل ادا کرنا واجب ہوگا۔

﴿۲﴾ ''وسیلہ'' کے معنی قربت اور نزدیکی کے ہیں، یہی بات تمام مفسرین نے لکھی ہے، (تفسیر بغوی: ۲/۶۷۰، و دیگر کتبِ تفسیر) اس سے بزرگوں کو ''وسیلہ بنانا'' مراد نہیں ہے، جیسا کہ بعض ناواقف اور خدا ناترس لوگ کہتے ہیں۔

﴿۳﴾ ''جاھدوا'' سے اصطلاحی جہاد بھی مراد ہوسکتا ہے اور زیادہ تر اہل علم نے یہی ترجمہ کیا ہے، شاہ رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے دین کی ہر محنت کو شامل کرتے ہوئے ترجمہ فرمایا ہے، یہاں اسی لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۴﴾ کیوں کہ دنیا میں ''مال'' کی قیمت ہے اور آخرت میں صرف ''اعمال'' کی قیمت ہوگی۔

﴿۵﴾ معلوم ہوا کہ جیسے جنت ہمیشہ کے لئے ہے، جس میں اہل ایمان کی رہائش ہوگی، ویسے ہی دوزخ بھی ہمیشہ کے لئے ہے، اور جو ایمان نہیں لائیں گے، ان کا ہمیشہ کا ٹھکانہ یہی ہوگا۔

←

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ
تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۰﴾ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ
الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ
لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۙ لَمْ یَاْتُوْكَ ؕ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ
یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ
تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا
خِزْیٌ ۚۖ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۴۱﴾

پھر جو شخص اپنی کوتاہی کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرلے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرلیں گے،﴿۱﴾ بے شک اللہ بہت بخشنے والے اور بڑے ہی مہربان ہیں، ﴿۳۹﴾ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں کی اور زمین کی حکومت ہے، وہ جسے چاہیں عذاب دیں، اور جسے چاہیں معاف کردیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۴۰﴾ اے رسول!﴿۲﴾ جو لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے؛ حالاں کہ ان کے دل ایمان سے محروم ہیں، ﴿۳﴾ ان کا اور یہودیوں کا کفر کی طرف دوڑنا آپ کو رنجیدہ نہ کرے، یہ لوگ (یہودی علماء سے) جھوٹی باتیں ﴿۴﴾ سننے کے عادی ہیں (اور) کچھ لوگ (یعنی یہودی علماء) جو آپ کے پاس نہیں آئے، یہ (آنے والے) ان کے لئے جاسوسی کرتے ہوئے (آپ کی بات) غور سے سنتے ہیں، ﴿۵﴾ وہ باتوں کو اس کے موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں، ﴿۶﴾ وہ کہتے رہتے ہیں: اگر تم کو یہ حکم ملے تو اسے قبول کرلینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو قبول نہ کرنا، ﴿۷﴾ اور اللہ ہی کو جس کا ہدایت سے محروم رہنا منظور ہو، ﴿۸﴾ آپ اس کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی اختیار نہیں رکھتے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ کو ان کے دلوں کا پاک کرنا منظور نہیں، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ ﴿۹﴾ ﴿۴۱﴾

← ﴿۶﴾ چوری کی یہ سزا کسی شخص کے زیر ملکیت حفاظت سے رکھے ہوئے کم سے کم دس درہم (۳۰ گرام ۶۱۸ ملی گرام چاندی) کے بقدر مال چھپا کر لینے والے شخص پر جاری ہوگی، یہ دس درہم کی مقدار حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت میں ذکر کی گئی ہے، (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۴/۷۱/۳، باب من قال: لا تقطع فی الخ) پہلی چوری پر گٹے سے دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا، دوسری چوری پر حدیث کی روشنی میں بایاں پاؤں ٹخنہ سے کاٹنے کا حکم ہے، اس کے بعد بھی چوری کرے تو قید کرلیا جائے گا، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ (سنن بیہقی: ۸/۲۷۷، باب السارق یسرق اولاً الخ)

﴿۷﴾ ''اللہ کی طرف سے'' کہہ کر اشارہ ہے کہ چوری کی سزا اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر ہے؛ اس لئے بندہ کے معاف کردینے سے معاف نہیں ہوگی۔

←

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

یہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور یہ بہت زیادہ حرام کھاتے ہیں، ﴿۱﴾ لہٰذا اگر یہ آپ کے پاس آئیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کردیں یا انھیں ٹال دیں، ﴿۲﴾ اگر آپ ان کو ٹال دیں تو ان کی مجال نہیں کہ آپ کو کچھ نقصان پہنچا سکیں اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں، ﴿۳﴾ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ ﴿۴۲﴾

← ﴿۱﴾ یعنی گناہ معاف ہوجائیں گے؛ مگر دنیا میں مقررہ سزا جاری ہوگی۔

﴿۲﴾ قرآن مجید قیامت تک رہنے والی کتاب ہے، اس میں آپ ﷺ کا ذکر زیادہ تر صرف ''رسول'' یا ''نبی'' کے لفظ سے ہوتا ہے، نہ کہ آپ کے اسم گرامی سے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب آپ ﷺ ہی کی رسالت و نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ ﷺ کے بعد اور کوئی نبی نہیں آسکتا۔

﴿۳﴾ یعنی منافقین، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور حقیقت میں مسلمان نہیں تھے۔

﴿۴﴾ یعنی یہودی علماء کی تحریف شدہ باتیں۔

﴿۵﴾ یعنی علماء یہود خود تو تکبر و پندار میں بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر نہیں ہوتے تھے، اور سکھا سکھا کر عوام کو بھیجتے تھے: تاکہ آپ ﷺ کی مجلسوں میں ہونے والی باتوں اور مشوروں سے آگاہ رہیں۔

﴿۶﴾ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، کبھی تو الفاظ ہی بدل دیتے ہیں، جس کو ''تحریف لفظی'' کہا جاتا ہے، کبھی معنی و مفہوم بدل دیتے ہیں، جس کو ''تحریف معنوی'' کہا جاتا ہے، افسوس کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی آسمانی کتاب میں ان دونوں طرح کی تحریف کی ہے، اس کے علاوہ کبھی احکام شریعت کے مقابلہ ان کے علماء رسم و رواج کے مطابق بھی فتوے دے دیا کرتے تھے، یہ گویا ''تحریفِ عملی'' ہے۔

﴿۷﴾ یعنی ان کے علماء ان کو کہتے تھے کہ اگر محمد ﷺ ہماری رائے کے مطابق فیصلہ کریں تو قبول کرلو، ورنہ نہیں۔

﴿۸﴾ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کے فیصلہ کی وجہ سے وہ ہدایت سے محروم ہیں؛ بلکہ منشاء یہ ہے کہ ان کی بداعمالی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے لئے ہدایت سے محرومی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

﴿۹﴾ یہ آیت بعض واقعات کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، حدیث میں اس سلسلہ میں دو واقعات آئے ہیں، ایک وہ ہے جو سنن ابوداؤد میں منقول ہے کہ آپ ﷺ کے مدینہ تشریف لانے پر پہلے یہود نے طئے کر رکھا تھا کہ فاتح قبیلہ کے کسی بھی شخص کا خوں بہا سو وسق گیہوں ہوگا اور مفتوح کا پچاس وسق، (ابوداؤد، باب النفس بالنفس، حدیث نمبر: ۴۴۹۴)، وسق ۶۰ صاع کا ہوتا ہے اور ایک صاع کا وزن ۳ کلو ۱۴۹ گرام ۲۸۰ ملی گرام ہے، اس حساب سے تقریباً ۱۸۹ کوئنٹل ہوتا ہے اور پچاس وسق اس کا نصف۔

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ
اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٣﴾ ع ٩/١٠

اور وہ آپ سے کیسے فیصلہ کرا رہے ہیں؛ حالاں کہ ان کے پاس تورات ہے، جس میں اللہ کا حکم موجود ہے؟ پھر اس کے بعد بھی وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور وہ ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿٤٣﴾

← ﴿۱﴾ ''جھوٹی باتیں سننا'' یہود کے عوام کا مزاج تھا، وہ ایسی باتیں سننا چاہتے تھے، جن میں عمل صالح کی دعوت نہ ہو، خواہشات نفس پر روک نہ ہو؛ بلکہ بغیر محنت ومشقت کے ثواب ونجات کی خوشخبری ہو، اور ''حرام کھانا'' ان کے علماء کی صفت تھی، وہ نذرانے لے کر لوگوں کے حق میں فتوے دیا کرتے تھے اور رشوتیں لے کر فیصلے کرتے تھے، علماء کا حرص وہوس میں مبتلا ہوجانا اور عوام کا عیش پسند اور نفس پرست بن جانا قوموں کی گمراہی کا بنیادی سبب ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ جو 'غیر مسلم' مسلمان حکومت کی رعایا ہوں، ان کے درمیان فیصلہ کرنا تو مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے؛ لیکن جو مسلمانوں کی حکومت کے تحت نہ ہوں؛ بلکہ خود آزاد ہوں اور باہمی معاہدۂ امن کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوں، مسلمانوں پر ان کا فیصلہ کرنا ضروری نہیں، یہود کی مدینہ میں یہی حیثیت تھی، پہلی قسم کے غیر مسلموں کو ''اہل ذمہ'' کہتے ہیں اور دوسری قسم کے غیر مسلموں کو ''معاہدین''۔

﴿۳﴾ جس عہد میں خدا کی طرف سے جو شریعت نافذ رہی ہو، وہی ''انصاف'' ہے، اس لئے آپ کو حکم ہوا کہ اگر فریقین آپ ﷺ کے پاس اپنا معاملہ پیش کریں تو آپ ﷺ کو شریعت محمدی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے، معلوم ہوا کہ مسلم ملکوں میں اگر غیر مسلم برادرانِ وطن کے لئے الگ عدالت قائم ہو اور اسی مذہب کا جج مقرر ہو تو عائلی زندگی کے احکام میں وہ اسی مذہب کے مطابق فیصلے کرسکتا ہے؛ لیکن اگر فریقین کسی مسلمان جج سے ہی فیصلہ کرانا چاہیں تو اس مسلمان جج کے لئے شریعت محمدی ﷺ ہی کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے، بہر حال معاملہ مسلمان کا ہو یا غیر مسلم کا، مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ کسی صورت ان کے ہاتھ سے انصاف کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔

﴿۱﴾ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ایک معزز شخص نے بدکاری کی، زنا کی سزا تورات میں سنگسار کرنا ہے، جس کا ذکر بائبل کے موجودہ نسخوں میں بھی ہے، (دیکھئے: احبار: ۲/۲۷، یوحنا: ۸/ ۴-۶) یہود آپ ﷺ کی خدمت میں اس لئے آئے کہ کوئی ہلکی سزا اسلام میں ہو تو اس پر فیصلہ ہوجائے، جب آپ ﷺ کے پاس آئے تو تورات کی اس آیت کو چھپا کر پیش کرنے لگے، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے انگلی اٹھوائی، تو ان کی خیانت ظاہر ہوئی، (ابوداؤد، باب فی رجم الیہودین، حدیث نمبر: ۴۴۴۶) اسی پر تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے، کہ وہ ایک طرف تو اپنے آپ کو تورات کا متبع کہہ کر آپ پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں اور دوسری طرف تورات کا حکم چھوڑ کر آپ سے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

بے شک ہم نے ہی تورات اُتاری تھی، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، ﴿۱﴾ اس کے ذریعہ انبیاء — جو پورے فرماں بردار ہوتے تھے — مشائخ اور علماء یہودیوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں؛ کیوں کہ انھیں اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے؛ ﴿۲﴾ لہٰذا لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میرے احکام کو معمولی قیمت کے بدلہ بیچ نہ ڈالو، ﴿۳﴾ اور جو اللہ کے اُتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے، وہی لوگ کفر کرنے والے ہیں ﴿۴﴾ ﴿۴۴﴾ اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر لازم قرار دیا تھا کہ جان کے بدلہ جان ہے، آنکھ کے بدلہ آنکھ، ناک کے بدلہ ناک، کان کے بدلہ کان، دانت کے بدلہ دانت، اور زخموں میں بھی برابر کا بدلہ ہے، پھر جو اس کو معاف کردے تو وہ اس کے لئے گناہوں سے پاک ہونے کا ذریعہ ہوگا، اور جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے، وہی لوگ ظالم ہیں۔ ﴿۵﴾ ﴿۴۵﴾

﴿۱﴾ ہدایت سے مراد ایمانیات ہیں اور نور سے مراد عملی احکام کی وضاحت، کیوں کہ قرآن مجید میں اکثر ہدایت کا لفظ ایمان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور ایمانیات کے بعد جو احکام باقی رہ جاتے ہیں، وہ وہی ہیں جو عملی زندگی سے متعلق ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی انھیں تورات کے الفاظ و معانی کی حفاظت کا بھی ذمہ دار بنایا گیا تھا اور اس بات کا بھی کہ وہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی گواہی دیں؛ چنانچہ ایمان کے لئے جیسے اللہ کی توحید، رسول کی رسالت اور آخرت کے واقع ہونے کی گواہی دینا ضروری ہے، اسی طرح کتاب اللہ کے کتابِ الٰہی ہونے کی گواہی دینا بھی ضروری ہے۔

﴿۳﴾ علماء یہود کی طرف اشارہ ہے، جو معمولی نذر و نیاز کی لالچ میں احکام خداوندی میں تبدیلی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، آج جو لوگ علماء کی وضع اختیار کئے ہوئے ہیں؛ لیکن مریدین کے نذرانے وصول کرنے کے لئے جانتے بوجھتے بہت سی خلافِ شرع باتوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں، ان کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تازیانۂ عبرت ہے۔

﴿۴﴾ جب مسلمانوں میں آپس میں کوئی اختلاف پیدا ہوجائے تو ضروری ہے کہ وہ احکام الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں اور علماء سے رُجوع ہوں، اگر قانون شریعت سے بچنے اور دنیا کا نفع حاصل کرنے کے لئے انھوں نے غیر اسلامی عدالتوں کا رُخ کیا تو یہ بھی اس آیت میں داخل ہے۔

﴿۵﴾ اس آیت میں قصاص کے متعلق دو بنیادی احکام کا ذکر کیا گیا ہے، اول یہ کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو ناحق جان بوجھ کر ←

وَ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَ اٰتَيْنٰهُ
الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ
وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ
جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ
اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم نے اُن (انبیاء بنی اسرائیل) کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، جس نے اس سے پہلے کی کتاب ''تورات'' کی تصدیق کی تھی ﴿۱﴾ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی تھی، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی تھی اور جو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿۴۶﴾ انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ نے اس میں جو حکم اُتارا ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں اور جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کریں، وہی نافرمان ہیں ﴿۲﴾ ﴿۴۷﴾ اور ہم نے آپ کی طرف بھی یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری ہے، جو پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ ہے؛ ﴿۳﴾ اس لئے آپ ان کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق ہی فیصلہ کیجئے اور آپ کے پاس جو سچی کتاب آچکی ہے، اس کے مقابلہ میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے، ﴿۴﴾ ہم نے تم میں سے ہر ایک (اُمت) کے لئے ایک خاص دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے، اور اگر اللہ چاہتے تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتے؛ لیکن (ایسا نہیں کیا) تا کہ تم کو ان احکام کے بارے میں آزمائیں جو تم کو دیتے رہے ہیں؛ ﴿۵﴾ لہٰذا نیکیوں میں پہل کرو، تم سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، پھر جس بات میں تم لوگ اختلاف کرتے رہے ہو، اللہ ان کے بارے میں تمہیں بتا دیں گے۔ ﴿۴۸﴾

← قتل کردے یا آنکھ پھوڑ دے یا ناک یا کان کاٹ لے یا دانت توڑ دے تو مجرم کو اسی کے مطابق سزا دی جائے گی، یعنی قاتل ہو تو قتل کیا جائے گا، آنکھ پھوڑی ہو تو اس کی بھی آنکھ پھوڑی جائے گی، اسی طرح زخمی کیا اور زخم ایسا ہو کہ بدلہ لیتے ہوئے اسی درجہ زخمی کرنا ممکن ہو تو اس میں بھی زخم کا بدلہ زخم سے لیا جائے گا، دوسرا حکم یہ ہے کہ جس شخص پر زیادتی کی گئی ہو، اس کو معاف کرنے کا حق ہوگا، قتل کی صورت میں مقتول کا ولی معاف کر سکتا ہے، اور بقیہ صورتوں میں زخم خوردہ شخص کو معاف کرنے کا حق ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اس معاف کرنے کو صدقہ کرنے سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اس کے لئے کفارہ یعنی گناہ کے معاف ہونے کا سبب ہوگا، اس میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ معاف کرنے کی ترغیب ہے — یہ حکم شریعت اسلامی میں بھی باقی ہے، اور آیت کا آخری ٹکڑا کہ ''جو اللہ کے نازل کئے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے، وہ ظالم ہے'' میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

﴿۱﴾ الہامی کتابوں کی یہی شان ہے کہ ہر کتاب اپنے سے پہلی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، انجیل میں مختلف مقامات پر یہ بات ←

← کہی گئی ہے کہ اس کے متبعین تورات پر عمل کریں ، (دیکھئے : متیٰ ۵ : ۱۷ ، لوقا ۱۶ : ۱۷) اسی طرح قرآن مجید بھی ان آیات میں تورات وانجیل کی تصدیق کر رہا ہے ۔

﴿۲﴾ انجیل کے احکام میں سے ایک اہم اور بنیادی حکم یہ تھا کہ آخری پیغمبر محمد ﷺ کا ظہور ہونے والا ہے ، ان پر ایمان لایا جائے ؛ مگر افسوس کہ عدول حکمی اور نافرمانی کی دیرینہ روش کی وجہ سے زیادہ تر یہود ونصاریٰ اس سعادت سے محروم رہے ہیں ۔

﴿۳﴾ پچھلی کتابوں کی تصدیق سے اجمالی تصدیق مراد ہے ، یعنی اس بات کی تصدیق کہ یہ کتابیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی تھیں ، یہ اور بات ہے کہ بعد میں خود ان کتابوں کی پیروی کرنے والوں نے ان میں لفظی اور معنوی تبدیلیاں کردی تھیں ، اسی پس منظر میں قرآن مجید کو ''مھیمن'' (محافظ) کہا گیا ہے ، یعنی پچھلی کتابیں ملاوٹوں اور آمیزشوں کی وجہ سے محفوظ نہیں رہیں ، قرآن مجید سابقہ کتابوں کی بنیادی تعلیمات اور اس کی روح اور مقصد کا محافظ اور ان کو پرکھنے کے لئے پیمانہ ہے ، اب قرآن موجودہ تورات وانجیل میں سے جس بات کی نفی کرتا ہو ، وہ ناقابل اعتبار ہے اور جس کی تصدیق کرتا ہو ، وہ معتبر ہے ۔

﴿۴﴾ ان آیات میں تورات اور انجیل کے بعد قرآن مجید کا ذکر کیا گیا ، آئندہ کسی اور کتاب کے آنے کا ذکر نہیں کیا گیا ، اس میں اشارہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی آخری کتاب ہے ، اب اس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہیں ہوگی ۔

﴿۵﴾ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ایک حصہ ایمانیات سے متعلق ہے ، جیسے توحید ، رسالت ، آخرت ، جنت و دوزخ وغیرہ ، اس سلسلہ میں تمام انبیاء کی تعلیمات یکساں رہی ہیں ، دوسرا حصہ ان احکام کا ہے ، جو عملی زندگی سے متعلق ہیں ، جیسے : نکاح وطلاق ، لباس اور کھانے پینے وغیرہ سے متعلق حلال وحرام ، یہ مختلف اُمتوں میں ان کی صلاحیت وضرورت کے لحاظ سے من جانب اللہ بدلتے رہے ہیں ، اس دوسرے قسم کے احکام کو ''شرعۃ'' اور ''منہاج'' سے تعبیر کیا گیا ہے ، مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ کے بہ قول : ''شرعۃ'' سے مراد وہ احکام ہیں جو براہ راست کتاب اللہ سے ثابت ہوں ، اور ''منہاج'' سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہونے والے احکام ہیں ، رسول اللہ ﷺ چوں کہ آخری نبی ہیں ؛ اس لئے آپ کی لائی ہوئی شریعت قیامت تک کے لئے ہے ، مختلف شریعتوں میں احکام کا فرق اصل میں انسان کی مصلحتوں پر مبنی ہے ، حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں سگی بہن سے نکاح کی اجازت تھی ، اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو نسل انسانی کی افزائش ممکن نہ ہوتی ؛ کیوں کہ اس وقت سارے لوگ ہی بھائی بہن تھے ، بعض شریعتوں میں مجسمہ سازی کی اجازت تھی ، ممکن ہے کہ پتھر کے دور میں سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہ ایک ضرورت رہی ہو ؛ لیکن اس فرق اور تبدیلی کی ایک اور حکمت کا بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان جب ایک خاص حکم پر عمل کا عادی ہوجاتا ہے اور وہ عمل سماج میں روایت ورواج کا درجہ حاصل کرلیتا ہے ، تو اس کا ترک کرنا طبیعت پر گراں گذرتا ہے ، پس اللہ تعالیٰ مختلف شریعتوں میں بعض احکام کی تبدیلی کے ذریعہ اپنے بندوں کی سمع وطاعت کا امتحان بھی لینا چاہتے تھے ، کہ وہ حکم الٰہی کے سامنے سر جھکاتا ہے یا اپنی طبیعت وخواہش کے تقاضوں پر عمل کرتا ہے ؟

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ
بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ
مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى
اَوْلِيَآءَ ؕ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللهَ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

ع ۱۱ — وقف لازم

اور (اے رسول! ہم حکم دیتے ہیں کہ) آپ ان کے درمیان اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے رہیئے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے اور ان سے بچ کر رہئے کہ کہیں یہ آپ کو آپ کی طرف اتارے گئے بعض احکام الٰہی سے ہٹا نہ دیں، ﴿۱﴾ پھر اگر یہ روگردانی کریں تو جان لیجئے کہ اللہ کو ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا منظور ہے، (آپ اس پر رنج نہ کریں کہ) بہت سے لوگ نافرمان ہی ہوتے ہیں ﴿۴۹﴾ کیا یہ لوگ زمانۂ کفر کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ اور جو لوگ (دینِ حق پر) یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟؟ ﴿۲﴾ ﴿۵۰﴾ اے ایمان والو! (اِن) یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو اُن سے دوستی کرے گا، بے شک وہ بھی اُنھیں میں سے (شمار) ہوگا، ﴿۳﴾ یقیناً اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے۔ ﴿۵۱﴾

﴿۱﴾ روایت میں ہے کہ یہود کے کچھ علماء —— کعب بن اَسَد، عبداللہ بن صُوریا، شَاس بن قَیس —— ایک معاملہ کے سلسلہ میں بارگاہ نبوی ﷺ میں آئے اور کہا کہ اگر ہم آپ ﷺ کی اتباع کے لئے تیار ہوجائیں تو تمام یہود آپ ﷺ کی پیروی کرنے پر آمادہ ہوجائیں گے، صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے اور کچھ لوگوں کے درمیان ایک جھگڑا ہے، ہم ان کو آپ ﷺ کے یہاں فیصلہ کے لئے لاتے ہیں، اگر آپ ﷺ اُن کے خلاف اور ہمارے حق میں فیصلہ کردیں تو ہم آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے، آپ ﷺ نے ان کی بات قبول نہیں کی، اس موقع پر یہ اور اس سے پہلے کی آیات نازل ہوئیں، (تفسیر قرطبی: ۱۲۸/۶) کہ چاہے وہ کچھ بھی لالچ دیں، آپ ﷺ کا فیصلہ اس کتاب کے مطابق ہونا چاہئے جو آپ ﷺ پر اتاری گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہی حکم رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے پوری اُمت کے لئے ہے۔

﴿۲﴾ آج جو مسلمان حکومتیں شریعت اسلامی کی بجائے مغربی قوانین کو اپنائے ہوئی ہیں اور جو مسلمان عوام حقیر مفادات کے لئے قانون شریعت کو چھوڑ کر غیر اسلامی عدالتوں کا رُخ کرتے ہیں، یہ آیت ان کی طرف متوجہ ہے اور ان کے ضمیر سے جواب چاہتی ہے!

﴿۳﴾ یہاں دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں، اول: یہ کہ مطلق یہود و نصاریٰ کو دوست بنانے کی ممانعت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد ابتدائی ایام میں یہود کے ساتھ امن اور مشترکہ دفاع کا معاہدہ فرمایا، نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کیا، ←

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ﴿۵۲﴾ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اس لئے جن لوگوں کے دل میں (نفاق کی) بیماری ہے، آپ ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ یہود ونصاریٰ میں گھسے پڑتے ہیں، وہ کہتے ہیں: ہمیں اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہم پر کوئی مصیبت آپڑے، تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے فتح یا کسی اور بات سے نواز دیں، پھر یہ اپنے دل میں چھپائی ہوئی باتوں پر شرمندہ ہوں ﴿۱﴾ ﴿۵۲﴾ اور ایمان والے کہیں گے کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور وشور سے قسمیں کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں؟ ان کے (سارے) عمل برباد ہوئے اور وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگئے ﴿۵۳﴾ اے ایمان والو! تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے (وہ یاد رکھے) کہ عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لائیں گے، جن سے خدا محبت کرتے ہیں اور وہ خدا سے، وہ مسلمانوں کے مقابلہ نرمی برتنے والے اور کفر کرنے والوں کے مقابلہ زور آور ہوں گے، وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے اور برا کہنے والے کے برا کہنے سے نہیں ڈریں گے، ﴿۲﴾ یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں اسے عطا فرماتے ہیں، اور اللہ بڑی گنجائش والے اور علم والے ہیں۔ ﴿۵۴﴾

← ظاہر ہے یہ ایک طرح سے دوستی ہی کا معاہدہ تھا، اسی طرح اسلام نے یہودی اور عیسائی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، گویا ایک یہودی اور عیسائی عورت مسلمان کی ماں اور بیوی ہوسکتی ہے اور یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ ماں اور بیوی سے بڑھ کر محبت کا کوئی اور رشتہ نہیں ہوتا؛ اس لئے یہاں وہ یہود ونصاریٰ مراد ہیں جو مدینہ کی نوخیز اور چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بیخ وبُن اُکھاڑ دینے پر کمر بستہ تھے، تمام یہود ونصاریٰ مراد نہیں ہیں، —— دوسرے: ''ولی'' کے معنی نگران وسرپرست کے ہیں، یعنی ایسا تعلق جو اپنے رازہائے دروں کے ظاہر کرنے میں رکاوٹ نہیں بنتا، اس سے منع کیا گیا؛ اس لئے کہ اپنے دشمنوں پر اپنے راز کو ظاہر کردینا یقیناً نقصاندہ ہوسکتا ہے اور ہر مملکت اس کا لحاظ رکھتی ہے کہ اس کے بھید کی باتیں دشمنوں تک نہیں پہنچیں؛ چنانچہ اسی مضمون کو ایک اور مقام پر زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا: لا تتخذوا بطانة من دونكم ، (آلِ عمران: ۱۱۸) کہ ''تم ان کو رازدار نہ بناؤ''۔

﴿۱﴾ یہ ان لوگوں کی کیفیت کا ذکر ہے، جو نفاق میں مبتلا تھے، اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے تھے اور درون خانہ دشمنانِ اسلام سے ←

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تمہارے دوست تو اللہ، اس کے رسول اور وہ ایمان والے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۵۵﴾

← بھی تعلق رکھتے تھے، بہانہ یہ ہوتا کہ شاید کوئی مصیبت آجائے، یعنی اگر مسلمان شکست سے دو چار ہوں تو اس وقت یہ دوستی کام آجائے گی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا اُلٹا معاملہ کیا، یہود کے قبائل — بنونَضیر، بنوقُریظہ اور بنوقَینُقاع — پر مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح عطا فرمائی اور مشرکین مکہ پر بھی ہجرت کے آٹھویں سال دائمی فتح حاصل ہوگئی، اِس طرح اس آیت میں جس خوشخبری کا ذکر کیا گیا ہے، اُسے مسلمانوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

﴿۲﴾ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بعض افراد تو مرتد ہوئے، مگر کسی گروہ کے مرتد ہونے کا واقعہ پیش نہیں آیا، گویا یہ ایک پیشین گوئی تھی، جو آپ کی وفات کے فوراً بعد ظہور میں آئی، آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی ارتداد کا ایسا فتنہ پھوٹا کہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق صرف تین مسجدیں بچ گئیں، مسجد نبوی ﷺ، مسجد حرام اور بحرین میں جواثی نامی قلعہ کی مسجد، یہ مرتدین دو طرح کے تھے، ایک تو وہ تھے جنھوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں پر ایمان لے آئے، اپنے سابق مذہب کی طرف لوٹ گئے اور دوسرے وہ تھے، جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، یا تو زکوٰۃ کی فرضیت ہی کے منکر ہو گئے یا کہتے تھے کہ ہم بیت المال کو زکوٰۃ حوالہ نہ کریں گے، اس بڑے فتنہ کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اُٹھایا اور ان مرتدین کے خلاف فوج کشی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نہایت اہم کردار ادا کیا، یہاں تک کہ یہ فتنہ قلع قمع ہو گیا، (تفسیر قرطبی: ۶/ ۲۱۹ و دیگر کتابیں) اس فتنہ کے مقابلہ کی اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو بہ طور خاص توفیق عطا فرمائی، ان میں بہت سے نومسلم جیسے بنوثقیف وغیرہ شامل تھے، جو ان آیات کے اترنے کے وقت اسلام کے بدترین دشمن تھے، اسی طرح حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ اور ان کی قوم اس آیت کی مصداق ہے، طَبرانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور علامہ ھیثمی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کے تمام راوی بخاری کے رواۃ ہیں، (مجمع الزوائد: ۷/ ۱۹) اور حاکم نے اس کو مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے، (مستدرک حاکم: ۲/ ۳۱۳) بعض روایت میں دوسرے قبائل کا بھی ذکر آیا ہے، غور کیا جائے تو یہ آیت عام ہے کہ مختلف ادوار میں ارتداد کے فتنے اُٹھتے رہیں گے اور ان کے تدارک اور سرکوبی کے لئے بھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو پیدا کرتے رہیں گے، دین کے محافظین کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نرم خو ہوں گے، کفر کے معاملہ میں سخت رویہ رکھیں گے، صرف اللہ کی رضا کے لئے جہاد کریں گے اور منافقین کی طرح محض دکھاوے اور شرما شرمی میں شریکِ جہاد نہ ہوں گے — ''لا یخافون لومۃ لائم'' میں یہ تعلیم ہے کہ مسلمانوں کو دین پر عمل کرنے میں سماج کی طرف سے طعن و تشنیع کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے، کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مخلوق کے حکم پر مقدم ہے۔

﴿۱﴾ یعنی مسلمانوں کی دوستی دشمنان اسلام کے بجائے اللہ، اللہ کے رسول اور ان ایمان والوں سے ہونی چاہئے، جو نیک عمل کرتے ہوں، بعض حضرات نے اس آیت میں ''الذین آمنوا'' (ایمان والوں) سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے، بعض نے ←

ع ۸ ۱۲
وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ
اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور جو اللہ، اس کے رسول اور ایمان والوں کو دوست بنائے گا (وہ یاد رکھے کہ) اللہ ہی کا گروہ غالب آکر رہے گا《۱》﴿۵۶﴾ اے ایمان والو! جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے،《۲》—— یعنی تم سے پہلے کے اہل کتاب اور ایمان نہ لانے والے —— ان کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم واقعی ایمان والے ہو ﴿۵۷﴾ اور جب تم نماز کی طرف بلاتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں،《۳》 یہ اس لئے ہے کہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں۔ ﴿۵۸﴾

← حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، بعض نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو؛ لیکن اصل میں یہ آیت تمام صالح مسلمانوں کو شامل ہے اور 'ولی' بنانے سے مراد حکمراں اور خلیفہ بنانا نہیں ہے؛ بلکہ دوستی اور محبت کا تعلق رکھنا مراد ہے، خود امام زین العابدین رحمہ اللہ کے صاحبزادے محمد بن علی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا "الذین آمنوا" سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں؟ تو فرمایا: علی رضی اللہ عنہ بھی مومنوں میں شامل ہیں، یعنی تمام مسلمان مراد ہیں، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی داخل ہیں، (تفسیر قرطبی: ۶/۲۲۱) اگر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کوئی خاص صحابی مراد ہوتے، جیسا کہ شیعوں کا تصور ہے تو اللہ تعالیٰ ان کا نام ذکر فرما دیتے یا کم سے کم جمع کے بجائے واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔

《۱》 آج مسلمان جو مغلوب نظر آتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ، اللہ کے رسول اور اہل ایمان سے ان کا تعلق ہی کمزور ہے، یہی دیکھئے کہ دنیا میں کتنے مسلم ممالک ہیں؛ لیکن کوئی ایک بھی ایسا ملک نہیں، جہاں پورے طور پر اللہ کی شریعت نافذ ہو؛ لہٰذا آج مسلمانوں کا مغلوب ہونا اس آیت کے مغائر نہیں ہے؛ کیوں کہ غالب ہونے کا سبب رسمی مسلمان ہونا نہیں ہے، بلکہ اللہ، اس کے رسول اور ایمان والوں سے حقیقی محبت اور تعلق ہے، جس کا اظہار انسان کے عمل و کردار سے ہوتا ہے۔

《۲》 یہود اور مشرکین اپنی بدطینتی کی وجہ سے دین کا مذاق اڑانے کے درپے رہتے تھے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب مسلمان سجدہ میں جاتے تو یہود و مشرکین کا ایک گروہ تمسخر کے طور پر ہنسنے لگتا، اس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی، (تفسیر قرطبی: ۶/۲۲۳) غالباً ایسا اس لئے تھا کہ یہود اپنی عبادت میں سجدہ نہیں کیا کرتے تھے —— تاہم دین کا مذاق اُڑانے سے صرف سجدہ کا مذاق اُڑانا مراد نہیں ہے؛ بلکہ یہ پورے دین کو شامل ہے، ہمارے عہد میں پردہ کا، اسلام کے قانون طلاق اور قانون میراث کا، جرم و سزا سے متعلق احکام کا اور کن کن باتوں کا مذاق نہیں اُڑایا جاتا اور اس کو دقیانوسیت اور دہشت گردی کہا جاتا ہے، یہ سب اس آیت میں شامل ہے۔

《۳》 نماز کی طرف بلانے سے اذان مراد ہے، عبادت کے اعلان کے لئے اذان جیسے پاکیزہ اور اثر انگیز کلمات اسلام کی خصوصیت ہے، بعض فقہاء کے یہاں واجب یا فرض کفایہ بھی ہے، حنفیہ کے نزدیک جماعت کے ساتھ ادا کی جانے والی فرض نمازوں کے لئے سنت مؤکدہ ہے، یہاں تک کہ مسجد میں اذان کے بغیر جماعت سے نماز ادا کرنا مکروہ ہے، (فتاویٰ عالمگیری: ۱/۵۳-۵۴) —— جو لوگ ←

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ هَلۡ تَنۡقِمُوۡنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ
قَبۡلُ ۙ وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ قُلۡ هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكَ مَثُوۡبَةً عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ مَنۡ
لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيۡهِ وَ جَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَ الۡخَنَازِيۡرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ
مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۶۰﴾

آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب ! کیا تم ہم سے محض اس لئے عناد رکھتے ہو کہ ہم اللہ پر، اس کتاب پر جو ہم پر اُتاری گئی اور اس کتاب پر جو ہم سے پہلے اتاری گئی، ایمان رکھتے ہیں اور یقیناً تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں ﴿۵۹﴾
آپ کہہ دیجیے: کیا میں تم کو ان کے بارے میں بتادوں، جو اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ برے انجام والے ہیں؟ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اللہ کا غضب ہوا، اور جن میں سے بعض کو اللہ نے بندر اور سور بنادیا، اور جس نے غیر اللہ کی پرستش کی، ان کا انجام بہت ہی خراب ہے اور یہ راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۶۰﴾

← سنجیدگی کے ساتھ کلمات اذان کو سنیں اور سمجھیں تو اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے؛ لیکن یہود کے دل میں چوں کہ پہلے سے بغض اور کدورت تھی؛ اس لئے وہ بجائے کلمات اذان کو سننے اور عبرت حاصل کرنے کے اُلٹے مذاق اُڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کیسی چیخ پکار ہے؟ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تنبیہ فرمائی ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا تمسخر کرنے سے بھی نہیں چوکتے، تمہارے لئے کیسے روا ہوسکتا ہے کہ تم ان سے محبت اور دوستی کا تعلق رکھو؟ (دیکھئے: تفسیر بغوی: ۱/ ۶۹۲)

﴿۱﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابو یاسر بن اَخطب، رافع بن ابی رافع اور کچھ دوسرے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کن رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کا ذکر فرمایا؛ چوں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے تھے؛ اس لئے خفا ہوگئے اور کہنے لگے کہ تمہارے دین سے بدتر کوئی دین نہیں، (تفسیر بغوی: ۱/ ۶۹۲) اس واقعہ کے علاوہ بھی یہود و نصاریٰ کی عمومی روشِ دین حق کی مخالفت اور مسلمانوں سے دشمنی وعداوت کی تھی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ پر اور پہلی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان رکھنا تو قابل تعریف بات تھی؛ کیوں کہ جو ذاتی منفعت کے لئے کوئی دعوت لے کر اُٹھتا ہے، وہ اپنی دعوت کی بنیاد پہلوں کی نفی پر رکھتا ہے اور انبیاء چوں کہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ گذشتہ پیغمبروں کی عظمت ومحبت لوگوں کے دلوں میں بٹھاتے ہیں، مگر اس کے برخلاف تمہارا رویہ دین حق کے ساتھ انکار اور دشمنی کا ہے؛ حالاں کہ حقیقت میں برے تو تم ہو، جن پر خدا کی لعنت ہوچکی ہے اور جن کے ایک گروہ کو بہ طور سزا بندر اور ایک گروہ کو سور بنادیا گیا تھا، جو دعوت توحید کے حامل ہونے کے باوجود غیر اللہ کے پرستار ہوگئے ہیں، اور اس کے علاوہ آخرت میں جو انجام ہونے والا ہے، وہ اور بھی بدتر ہے، بندر وہ یہود بنائے گئے تھے، جنھوں نے تورات کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہفتہ کے دن شکار کیا تھا، سورۂ اعراف (آیت نمبر: ۱۶۶) میں اس کا ذکر ہے اور سور وہ لوگ بنادیئے گئے تھے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اترنے والے خوانِ غیبی کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے، اس کا ذکر سورۂ مائدہ (آیت نمبر: ۱۱۵) میں آیا ہے۔

وَ اِذَا جَآءُوۡکُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا وَ قَدۡ دَّخَلُوۡا بِالۡکُفۡرِ وَ ہُمۡ قَدۡ خَرَجُوۡا بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا
کَانُوۡا یَکۡتُمُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَ تَرٰی کَثِیۡرًا مِّنۡہُمۡ یُسَارِعُوۡنَ فِی الۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ
لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۲﴾ لَوۡ لَا یَنۡہٰہُمُ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ عَنۡ قَوۡلِہِمُ الۡاِثۡمَ
وَ اَکۡلِہِمُ السُّحۡتَ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ یَدُ اللّٰہِ مَغۡلُوۡلَۃٌ ؕ غُلَّتۡ
اَیۡدِیۡہِمۡ وَ لُعِنُوۡا بِمَا قَالُوۡا ۘ بَلۡ یَدٰہُ مَبۡسُوۡطَتٰنِ ۙ یُنۡفِقُ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ وَ لَیَزِیۡدَنَّ کَثِیۡرًا
مِّنۡہُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ طُغۡیَانًا وَّ کُفۡرًا ؕ وَ اَلۡقَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَ الۡبَغۡضَآءَ اِلٰی
یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ؕ کُلَّمَاۤ اَوۡقَدُوۡا نَارًا لِّلۡحَرۡبِ اَطۡفَاَہَا اللّٰہُ ۙ وَ یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰہُ
لَا یُحِبُّ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۴﴾

وقف لازم

اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے؛ حالاں کہ کفر کے ساتھ ہی آئے تھے اور کفر کے ساتھ ہی واپس ہوئے اور جو کچھ تم چھپا رہے ہو، اللہ اس سے بہ خوبی واقف ہیں ﴿۱﴾ ﴿۶۱﴾ آپ ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ گناہ، ظلم اور حرام کھانے پر گرے پڑتے ہیں، کیا ہی بدترین ان کے کرتوت ہیں ﴿۶۲﴾ مشائخ اور علماء ان کو بری بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ کتنی بری ہیں ان کی حرکتیں! ﴿۲﴾ ﴿۶۳﴾ اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں —— ہاتھ تو ان کے بندھے ہوئے ہیں اور اُن پر اُن کی اِس بدگوئی کی لعنت ہے، —— بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اللہ جیسے چاہتے ہیں، خرچ کرتے ہیں، ﴿۳﴾ اور آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے جو کلام اتارا گیا ہے، وہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر کے بڑھنے کا سبب بنے گا، ﴿۴﴾ اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت ڈال دی ہے، ﴿۵﴾ جب جب وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اسے بجھا دیتے ہیں، اور وہ زمین میں فساد پیدا کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۶﴾ ﴿۶۴﴾

﴿۱﴾ اس میں یہودی منافقین کا ذکر ہے، جو خود کو مسلمان ظاہر کرتے تھے؛ حالاں کہ ان کے دل ایمان سے خالی اور اسلام کی نفرت سے لبریز تھے۔

﴿۲﴾ اس میں علماء و مشائخ کے لئے تنبیہ ہے کہ ان کا اپنے مفادات یا دین سے بے اعتنائی کی وجہ سے برائی کو روکنے کی کوشش نہ کرنا خود برائی کا ارتکاب کرنے سے کم قابل مذمت نہیں۔

﴿۳﴾ بعض روایتوں میں بَنَّاش بن قیس کا ذکر آیا ہے، (مجمع الزوائد: ۲۰/۷، بحوالہ طبرانی) اور بعض میں فِنْحَاص کا، (تفسیر طبری: ۱۹۴/۶) یہ دونوں یہودی تھے، ان لوگوں نے اپنے مالی نقصان یا مسلمانوں کی غربت کو دیکھتے ہوئے کہا کہ تمہارا رب بخیل ہے، دوسرے: ←

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ
فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ ع ۹ ۱۳

اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان کے گناہ معاف کردیں گے، اور انھیں بھرپور نعمتوں والی جنت میں داخل کریں گے ﴿٦٥﴾ نیز اگر وہ تورات، انجیل اور ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اُترنے والی کتاب (قرآن مجید) کی پوری پابندی کریں، ﴿۱﴾ تو وہ اوپر سے بھی رزق پائیں گے اور نیچے سے بھی، ﴿۲﴾ ان میں سے ایک گروہ (تو) اعتدال پر ہے، ﴿۳﴾ اور (لیکن) ان میں سے زیادہ تر کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ ﴿٦٦﴾

← یہودیوں کو اس گستاخانہ بات پر نکیر کرنی چاہئے تھی؛ کیوں کہ کسی نہ کسی درجہ میں خدا پر وہ بھی ایمان رکھتے تھے، مگر ان میں دینی بے حسی اور بے غیرتی اس قدر پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اس پر مذمت و ناپسندیدگی کا دو کلمہ بھی کہنے کے روادار نہیں ہوئے؛ اسی لئے قرآن نے تمام ہی یہودیوں کی طرف اس گستاخانہ کلام کی نسبت کی ہے؛ کیوں کہ ایسے مواقع پر خاموشی بھی رضامندی ہوتی ہے — اُن کے اِن گستاخانہ کلمات کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاتھ تو خود ان کے بندھے ہوئے ہیں، یعنی وہ خود بخیل ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن ان کے ہاتھ بہ طور سزا کے باندھ دیئے جائیں گے۔

﴿۴﴾ قرآن مجید تو اصل میں ہدایت کی کتاب ہے اور روحانی بیماری کی دوا ہے، مگر جب مریض میں ضد پیدا ہوجائے کہ وہ دوا سے فائدہ اُٹھائے گا ہی نہیں، تو ظاہر ہے کہ صحت وشفا کی بجائے بیماری میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

﴿۵﴾ یعنی یہودیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان، یا یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان، آج اگرچہ یہودی وعیسائی متحد نظر آتے ہیں؛ لیکن یہ اتحاد صرف مسلمانوں کے مقابلہ میں ہے، ورنہ ماضی قریب تک یورپ کے ملکوں میں یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں نے جو سفاکانہ سلوک کیا ہے، وہ تاریخ کا انسانیت سوز واقعہ ہے۔

﴿٦﴾ یعنی یہود مسلمانوں کے خلاف جنگ کی سازشیں کرتے رہتے ہیں، مگر اس میں کامیاب نہیں ہوتے، اسی طرح دوسرے طریقوں پر بھی فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسے مسلمانوں میں باہمی اختلاف پیدا کرنا، خاندانی عصبیتوں کو جگانا اور نومسلموں کو بہکانا، جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ حرکتیں ہیں۔

﴿۱﴾ یعنی قرآن مجید کی۔

﴿۲﴾ یعنی اوپر سے کھیتی کو فائدہ پہنچانے والی بارش بھیجیں گے اور نیچے سے زمین خوب پیداوار دے گی — ''نیچے'' سے رزق پانے میں زرعی پیداوار کے علاوہ زمین کے اندر پائے جانے والے قدرتی وسائل سونا، چاندی، لوہا، پٹرول، اور گیس وغیرہ سب شامل ہیں۔

﴿۳﴾ جیسے: حضرت سلمان فارسی، حضرت عبداللہ بن سلام اور شاہ حبش نجاشی رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ
عَلٰى شَىْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

اے پیغمبر! آپ کے رب کی طرف سے جو کتاب آپ پر اُتاری گئی ہے، اسے (لوگوں تک) پہنچاتے رہئے اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کریں گے، ﴿۱﴾ اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو آپ نے پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا، ﴿۲﴾ بے شک اللہ اس گروہ کو ہدایت نہیں دیتے جو کفر پر مصر ہو ﴿٦٧﴾ آپ کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! تم کسی دین پر قائم نہیں ہو، جب تک تم تورات، انجیل اور جو کتاب تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے اُتاری گئی ہے، (یعنی قرآن مجید) کے پابند نہ ہو جاؤ، ﴿۳﴾ اور آپ کے رب کی جانب سے جو کتاب اُتاری گئی ہے، وہ ان میں سے بہتوں کے لئے سرکشی اور کفر میں اضافہ کا باعث بنے گی؛ ﴿۴﴾ اس لئے آپ کفر اختیار کرنے والے گروہ پر افسوس نہ کیجئے۔ ﴿٦٨﴾

﴿۱﴾ ایک سفر کے دوران آپ قافلہ کے ساتھ ایک جگہ اترے، صحابہ رضی اللہ عنہم سایہ کے لئے میدان میں پھیل گئے، ایک درخت کے نیچے آپ ﷺ نے بھی استراحت فرمائی اور تلوار اسی کی ایک ٹہنی سے لٹکا دی، اچانک آپ ﷺ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک دیہاتی تلوار ہاتھ میں لئے کھڑا ہے، اس نے پوچھا: تم کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ ﷺ نے اطمینان سے فرمایا: اللہ، یہ کہنا تھا کہ اس کے ہاتھ میں لرزہ طاری ہوا اور تلوار گر پڑی، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام غَوْرَثُ بنُ الحارِثِ تھا، (تفسیر قرطبی: ۶/ ۲۴۳) — آیت تو یہ یا اسی طرح کے بعض اور واقعات کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے، مگر اپنے معنی و مراد کے اعتبار سے عام ہے، اس میں اشارہ ہے کہ یہ اُمت اگر دعوت دین کا کام کرتی رہے گی، تو اللہ کی طرف سے اس کی حفاظت کا انتظام ہوگا۔

﴿۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی طرف سے جو احکام نازل ہوئے، آپ ﷺ نے انھیں بے کم و کاست اُمت تک پہنچا دیا، ایسا نہیں ہوا کہ آپ ﷺ نے اس کا کوئی حصہ چھپا دیا ہو، جیسا کہ روافض کا عقیدہ ہے، ورنہ — نعوذ باللہ — آپ ﷺ کو کارِ رسالت انجام دینے میں کوتاہ ماننا پڑے گا۔

﴿۳﴾ مقصد یہ ہے کہ تورات و انجیل پر ایمان کافی نہیں ہے؛ اس کے بعد جو کتاب اُتاری گئی ہے، یعنی قرآن مجید، اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور ان کتابوں پر ایمان کے ساتھ ساتھ ان کے احکام کو قائم کرنا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے، یہ شریعت محمدی پر عمل کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

﴿۴﴾ یعنی جس قدر احکام اتریں گے، یہ ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں گے، اس طرح ان کے کفر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾ لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ
وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا
وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ﴿٧٠﴾ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ
عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٧١﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ
الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾

یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں، نیز جو یہودی، صابئ اور نصرانی جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے اور نیک عمل کرتے تھے، نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، ﴿۱﴾ ﴿۶۹﴾ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف پیغمبروں کو بھیجا، ﴿۲﴾ جب بھی کوئی پیغمبر ان کے پاس ایسا حکم لایا، جو ان کی خواہشات نفس کے مطابق نہیں تھا تو انھوں نے کچھ پیغمبروں کو تو جھٹلایا اور کچھ کو قتل ہی کر ڈالا ﴿۳﴾ ﴿۷۰﴾ اور ان لوگوں نے خیال کیا کہ (اس پر) کچھ سزا نہیں ہوگی، غرض کہ وہ اندھے اور بہرے ہوگئے، پھر اللہ نے ان پر توجہ فرمائی، ﴿۴﴾ اس کے بعد بھی ان میں سے بہت لوگ اندھے اور بہرے ہی بنے رہے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہے ہیں ﴿۷۱﴾ جن لوگوں نے کہا: مسیح ابن مریم ہی خدا ہیں، انھوں نے کفر کیا؛ حالاں کہ (خود) مسیح نے کہا تھا: اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، ﴿۵﴾ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے، اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ﴿۷۲﴾

﴿۱﴾ ''عمل صالح'' اس عمل کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت نافذ کی گئی شریعت کے مطابق ہو، پس محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد چوں کہ شریعتِ محمدی ہی پوری انسانیت کے لئے واجب العمل ہے؛ اس لئے یہاں وہ اہل کتاب مراد ہیں، جو شریعتِ محمدی پر ایمان لاچکے ہوں اور اس کے پیرو ہوں، یا جو شریعتِ محمدی کے آنے سے پہلے توحید اور آخرت پر ایمان رکھتے اور عمل صالح کیا کرتے تھے۔

﴿۲﴾ بنی اسرائیل میں کثرت سے انبیاء آیا کئے ہیں اور قرآن مجید میں جن پیغمبروں کا ذکر آیا ہے، ان میں زیادہ تر بنو اسرائیل ہی تھے۔

﴿۳﴾ موجودہ تورات کے علاوہ انجیل میں بھی بنی اسرائیل کی اس بدخصلتی اور جسارت کا ذکر موجود ہے، (دیکھئے: متیٰ ۲۳: ۳۴) نافرمانیوں کی جڑ یہی ہے کہ انسان خواہشاتِ نفس کی پیروی کو زندگی کا اُصول بنالے، پھر وہ ایسا اندھا ہوجاتا ہے کہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ نہیں پاتا، اور ایسا بہرا ہوجاتا ہے کہ کلمۂ حق اس کے کان سے ٹکراتا ہے، مگر کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ طے نہیں کرپاتا۔

﴿۴﴾ یعنی ان کی سرکشی و نافرمانی کے باوجود اللہ نے ان کی طرف پیغمبر بھیجے۔

←

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

جن لوگوں نے کہا: اللہ تین میں کا تیسرا ہے، ﴿۱﴾ وہ یقیناً کافر ہیں؛ حالاں کہ خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اگر لوگ اپنی ایسی بات سے باز نہیں آئے تو ان میں سے جو لوگ کفر پر قائم رہیں گے، انھیں دردناک عذاب پکڑ لے گا ﴿۷۳﴾ کیا پھر بھی یہ لوگ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور معافی کے طلب گار نہیں ہوتے؛ حالاں کہ اللہ بے حد معاف کرنے والے اور مہربان ہیں ﴿۷۴﴾ مسیح ابن مریم بھی محض ایک رسول ہی تھے، (جیسا کہ) ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں اور ان کی ماں بہت ہی پاک باز خاتون تھیں، ﴿۲﴾ وہ دونوں کھانا (بھی) کھایا کرتے تھے، ﴿۳﴾ غور کرو کہ ہم ان کے لئے کس طرح (مسیح کے انسان ہونے پر) دلیلیں بیان کررہے ہیں؟ پھر دیکھئے وہ کدھر اُلٹے چلے جارہے ہیں؟ ﴿۷۵﴾ آپ کہہ دیجئے: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو، جو نہ تمہارے لئے نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نفع کا، ﴿۴﴾ اور اللہ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں۔ ﴿۷۶﴾

← ﴿۵﴾ چنانچہ بہت سی تحریفات کے باوجود آج بھی انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے توحید کی دعوت اور شرک کی نفی موجود ہے، انجیل متی میں ہے: تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر (دیکھئے: ۴:۱۰) یہی مضمون "لوقا" کی انجیل میں بھی آیا ہے، (دیکھئے: ۴:۸) ان کے علاوہ متعدد مقامات پر نہایت صراحت ووضاحت کے ساتھ یہ بات آئی ہے، مگر افسوس کہ عیسائی قوم نے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو خدا بنا دیا۔

﴿۱﴾ یہ عیسائیوں کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے، جو حضرت عیسیٰ، حضرت مریم علیہا السلام یا روح القدس اور اللہ تعالیٰ کو خدا مانتے ہیں، پھر ان میں بعض فرقے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید نے اس کا ذکر کیا ہے، (المائدہ: ۱۱۶) اور بعض "روح القدس" کو، آج کل عیسائی دنیا روح القدس کے خدا ہونے کی قائل ہے۔

﴿۲﴾ یعنی یہود کا ان پر بدکاری کی تہمت لگانا غلط ہے۔

﴿۳﴾ یعنی وہ غذا اور ضروریات زندگی کے محتاج تھے اور جو خود محتاج ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟

﴿۴﴾ عیسائیوں کو تنبیہ ہے کہ تمہارے عقیدہ کے مطابق تو عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو بھی دشمنوں سے بچا نہیں سکے، وہ نہ نفع کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نقصان کا، پھر وہ کیسے خدا ہوسکتے ہیں؟

قُلۡ یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوۡۤا اَہۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ
قَبۡلُ وَ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّ ضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿۷۷﴾ لُعِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ بَنِیۡۤ
اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیۡسَی ابۡنِ مَرۡیَمَ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوۡا وَّ کَانُوۡا یَعۡتَدُوۡنَ ﴿۷۸﴾
کَانُوۡا لَا یَتَنَاہَوۡنَ عَنۡ مُّنۡکَرٍ فَعَلُوۡہُ ؕ لَبِئۡسَ مَا کَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۷۹﴾

ع ۱۱ ۱۰ ۱۴

آپ کہہ دیجئے : اے اہل کتاب ! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، ﴿۱﴾ اوران لوگوں کے خیالات پر نہ چلو جو پہلے خود گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ سیدھے راستہ سے بھٹکے ہوئے تھے ﴿۷۷﴾ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت ہو چکی ہے، ﴿۲﴾ یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے ﴿۳﴾ ﴿۷۸﴾ وہ ایک دوسرے کو اس برائی سے روکتے نہیں تھے، جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے، ﴿۴﴾ یقیناً ان کا (یہ) عمل بہت برا تھا۔ ﴿۷۹﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے جس عقیدۂ وعمل کے لئے جو حد مقرر کر دی ہے، اس سے تجاوز کر جانا غلو ہے، اسی لئے افراط وتفریط دونوں باتیں غلو میں شامل ہیں، عیسائیوں کا غلو یہ تھا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بنا دیا، یہودیوں کا غلو یہ تھا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا رسول ماننے سے بھی انکار کر دیا، افسوس کہ یہ اُمت بھی اس بیماری سے محفوظ نہیں رہ سکی، کچھ لوگوں نے اپنے بزرگوں کو رسول کے اور رسول کو خدا کے درجہ میں کر دیا اور انھیں کائنات میں متصرف قرار دے دیا، کچھ لوگوں نے عام مسلمانوں کے لئے ائمہ مجتہدین کی تشریح وتوضیح قبول کرنے کو بھی شرک کہہ دیا؛ حالاں کہ بات صرف اتنی ہے کہ جیسے اسناد حدیث کی تحقیق میں محدثین کی رائے پر اعتماد کیا جاتا ہے، اسی طرح مقلدین معانی قرآن وحدیث کو سمجھنے میں فقہاء مجتہدین پر اعتماد کرتے ہیں، مقصد کتاب وسنت ہی کی پیروی ہے، یہ دونوں طرزِ فکر ''غلو'' میں شامل ہیں، اسی طرح شیعوں نے اہل بیت کی عقیدت میں ایسا غلو کیا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی تکفیر کر بیٹھے، دوسری طرف ایک گروہ ہے جس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دفاع کے نام پر یزید کی بھی تحسین شروع کر دی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بھی نقد کر دیا، یہ سب افراط وتفریط اور صراط مستقیم سے انحراف ہے۔

﴿۲﴾ حضرت داؤد علیہ السلام کی لعنت کا ذکر زبور (۷۸: ۲۱-۲۳) میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لعنت کا ذکر متیٰ (۲۳: ۳۱، ۳۲) میں اب بھی موجود ہے۔

﴿۳﴾ گویا دو باتیں بنیادی طور پر ''لعنت'' یعنی رحمت خداوندی سے محرومی کا باعث ہیں: اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز، یعنی غلو اور افراط وتفریط۔

﴿۴﴾ اہل ایمان کے لئے برائی سے بچنا کافی نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو بھی برائی سے بچانے کی کوشش کریں، جس کی صورت یہی ہے کہ برائی کرنے والوں کو برائی سے روکا جائے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ پہلی برائی جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوئی، وہ یہی تھی کہ ایک شخص کسی کو برائی کرتے ہوئے دیکھتا اور اس کو اس سے منع کرتا، ←

تَرٰی كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ
مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ
قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں،﴿۱﴾ انھوں نے اپنے جو اعمال آگے بھیج رکھے ہیں، وہ بھی بہت برے ہیں، (جس کی وجہ سے) اللہ ان سے ناخوش ہوئے، اور وہ لوگ ہمیشہ عذاب ہی میں رہیں گے ﴿۸۰﴾ اور اگر وہ اللہ پر، نبی پر اور نبی پر اُترنے والی کتاب پر ایمان رکھتے تو وہ ان (کفر کرنے والوں) کو دوست نہ بناتے؛ لیکن ان میں سے بہت سے لوگ نافرمان ہیں ﴿۸۱﴾ آپ لوگوں میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے اور آپ محبت کے اعتبار سے مومنوں سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پائیں گے، جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں اور اس لئے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔﴿۲﴾ ﴿۸۲﴾

← پھر اگلے دن اسی کا ہم نوالہ و ہم پیالہ بن جاتا، (سنن ابوداؤد، باب الأمر و النهی، حدیث نمبر: ۴۳۳۶) اس آیت کی روشنی میں اہل علم نے لکھا ہے کہ جو طاقت رکھتا ہو، اس کے لئے برائی سے روکنا فرض ہے، (قرطبی: ۶/ ۲۵۳) آج مسلمان بھی اس معاملہ میں بنی اسرائیل کے نقش قدم پر ہیں، برائی پر ٹوکنے کا مزاج ختم ہو گیا اور علماء و مشائخ بھی خلاف شرع اُمور کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے۔

﴿۱﴾ یہودیوں کو بہر حال اسلام سے قربت تھی، کہ دونوں مذاہب بنیادی طور پر عقیدۂ توحید کے حامل تھے، مگر عجیب بات ہے کہ مدینہ کے یہودی مشرکین مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اور آج بھی یہود و نصاریٰ عالم اسلام کے مقابلہ مشرک قوموں سے دوستی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اسی بغض و عناد کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔

﴿۲﴾ اس سے مراد وہ یہود و مشرکین ہیں، جن سے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء دوچار تھے، اگر کبھی یہودیوں یا مشرکوں کا کوئی گروہ اپنا رویہ بدل لے، تو یہ اس ارشاد خداوندی کے خلاف نہیں، اسی طرح اُس عہد کے عیسائیوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نسبتاً مسلمانوں سے قریب ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور تارک دنیا درویش موجود ہیں اور وہ گمراہ ہونے کے باوجود اس اخلاقی خوبی سے متصف ہیں کہ تکبر نہیں کرتے، جیسا کہ شاہ حبش نجاشی اور نجران کے عیسائی وفد کا رویہ تھا؛ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انھیں کی بابت یہ آیات نازل ہوئی ہیں، (قرطبی: ۶/ ۲۵۵) موجودہ دور میں عیسائیوں میں نہ مذہب کے حقیقی علماء ہیں، نہ تارک دنیا درویش و مشائخ ہیں اور نہ ان میں تواضع ہے؛ اس لئے مسلمانوں سے بغض و عداوت رکھنے میں وہ بھی یہود و مشرکین سے پیچھے نہیں ہیں، غرض کہ اس آیت میں یہود و مشرکین اور نصاریٰ کا جو مزاج بتایا گیا ہے، وہ عہد نبوی ﷺ کے لحاظ سے ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا
مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا
جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا
قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

ع ۹

جب وہ لوگ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اُتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو اُمنڈ آتے ہیں؛ اس لئے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے؛ اس لئے آپ ہمیں ماننے والوں میں لکھ لیں ﴿۸۳﴾ ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آچکا ہے، ایمان تو نہ لائیں؛ لیکن اُمید رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں نیک بختوں کے ساتھ (جنت میں) داخل کرے گا ﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾ ان کی اس بات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انھیں ایسی بہشتوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور نیک لوگوں کی یہی جزا ہے ﴿۸۵﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھٹلایا، وہی لوگ دوزخی ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۶﴾

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کے معاندانہ رویہ سے عاجز آکر صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی تھی، جہاں عیسائی بادشاہ کی حکومت تھی، اس بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا؛ لیکن اہل مکہ کو یہ بات کیسے گوارہ ہوسکتی تھی، انھوں نے ہدایا وتحائف لے کر مسلمانوں کے خلاف اپنا ایک وفد بھیجا، مسلمانوں کی طرف سے ان کے موقف کی وضاحت کے لئے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے سورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی، بعض روایتوں میں ہے کہ اس مذہبی مکالمہ کے لئے نجاشی نے عیسائی علماء ومشائخ کو جمع کیا، ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، بعض روایتوں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حبشہ ہجرت کرنے کے بعد وہاں سے ۲۰/افراد پر مشتمل ایک وفد مکہ مکرمہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک روایت میں ہے کہ مدنی زندگی میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ۷۰ عیسائی علماء کو لے کر حاضر ہوئے، جن میں ۶۲ کا تعلق حبشہ سے تھا اور ۸ کا شام سے، ایک اور روایت میں ہے کہ نجران سے قبیلہ بنی حارث کے ۴۰/اشخاص حاضر ہوئے تھے، ان کے ساتھ حبشہ سے ۳۲ اور شام سے ۶۸ نمائندے بھی شامل تھے (تفسیر قرطبی: ۶/۲۵۷-۲۵۵) ممکن ہے کہ اس طرح کے مختلف واقعات پیش آئے ہوں کہ آپ نے عیسائی علماء ومشائخ کے سامنے آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرمائی ہو، ان پر گریہ طاری ہوگیا ہو اور وہ اسلام کے دامن میں آگئے ہوں — اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علماء ربانی اور مشائخ حقانی کی پہچان یہی ہے کہ جب ان پر اللہ کا کلام پیش کیا جاتا ہے، تو ان کے دل نرم ہوجاتے ہیں اور ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں۔

﴿۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ ہمیشہ کے لئے صرف ان لوگوں کا ٹھکانہ ہوگا، جو ایمان سے محروم ہوں، مسلمانوں میں سے فاسق وفاجر سزا کے طور پر دوزخ میں داخل تو کئے جائیں گے؛ لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ
الْمُعْتَدِیْنَ۝۸۷ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ۝۸۸

اے ایمان والو! پاکیزہ غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، انھیں حرام نہ کرلو اور حد سے تجاوز نہ کرو، یقیناً اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے ۝۸۷ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو کچھ عطا کیا ہے، اس میں سے حلال اور لذیذ چیزوں کو کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ ﴿۱﴾ ۝۸۸

﴿۱﴾ شریعت اسلامی کا ایک امتیازی وصف اس کا اعتدال اور انسانی فطرت وضرورت سے ہم آہنگ ہونا ہے؛ اسی لئے اس نے جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے، وہیں دوسری طرف حلال ومباح چیزوں کے استعمال کی نہ صرف اجازت دی ہے؛ بلکہ خاص طور پر اس سے رُک جانے کو ناپسند بھی کیا ہے؛ چنانچہ صحابہ کے ایک گروہ نے جن میں حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل تھے، آپس میں طے کیا کہ وہ ہمیشہ روزے رکھا کریں گے، پوری رات عبادت میں گذاریں گے، بستر پر نہیں سوئیں گے، گوشت اور چکنی چیزیں نہیں کھائیں گے، عورتوں اور خوشبو کے قریب بھی نہ پھٹکیں گے، اور تارک دنیا ہو کر پھرتے رہیں گے، اسی پس منظر میں یہ آیات نازل ہوئیں اور انھیں ایسا کرنے سے منع کردیا گیا، (قرطبی: ۶/ ۲۶۰) اس طرح کی اور بھی روایات مفسرین نے ذکر کی ہیں کہ صحابہ نے ترک دنیا کی قسم کھالی یا اس کا پختہ ارادہ کرلیا، رسول اللہ ﷺ نے اس پر سختی سے نکیر فرمائی اور اس طریقہ کو اسلام سے ہٹا ہوا طریقہ قرار دیا؛ چنانچہ علامہ طبری نے اس آیت کی روشنی میں لکھا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اپنے آپ پر اچھے کھانے، لباس و پوشاک اور شادی بیاہ کو حرام کرلینا جائز نہیں (قرطبی: ۶/ ۲۶۲) اب حرام کرنے کے دو درجات ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کو اپنے عقیدہ کے اعتبار سے حرام سمجھنے لگے، یہ کفر ہے؛ کیوں کہ حلال وحرام کرنا صرف اللہ کا حق ہے، کسی انسان کا اپنے طور پر کسی چیز کو حرام قرار دینا گویا اپنے آپ کو خدا کا ساجھی وشریک قرار دینا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ عقیدہ کے اعتبار سے تو حرام نہ سمجھے؛ لیکن کسی عذر کے بغیر اس کو بالکل نہ کھانے کا ارادہ کرلے اور گویا عملاً ان کے ساتھ حرام کا سا معاملہ کرے؛ یہ گناہ اور بدعت ہے، اگر اس نے اس کے استعمال نہ کرنے کا صرف ارادہ کیا، یا قسم کھائے بغیر زبان سے اس عزم کا اظہار کیا تو اس کو اس سے توبہ کرنی چاہئے اور اگر قسم بھی کھالی ہو تو توبہ بھی کرے اور اس کا استعمال کرکے کفارہ بھی ادا کرے —— اللہ تعالیٰ نے کھانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے، حلالاً طیباً یعنی ایسی چیز کھاؤ، جو حلال بھی ہو اور تم کو مرغوب بھی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی حلال چیز کو حرام نہ سمجھے اور حرام کی طرح اس سے پرہیز بھی نہ کرے؛ مگر رغبت نہ ہونے کی وجہ سے اس کو استعمال نہ کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ حلال کو حرام کرنے کے درجہ میں نہ ہوگا۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ۚ
فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِیْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ
اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَیْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ
وَ احْفَظُوْۤا اَیْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اللہ تعالیٰ تمہاری بے ارادہ قسموں پر پکڑ نہیں فرمائیں گے؛ لیکن جن قسموں کو تم نے پختہ ارادہ کے ساتھ کھایا ہے، ان پر پکڑ کریں گے؛ لہٰذا اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، اوسط درجہ کا کھانا جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑے پہنانا، یا ایک غلام آزاد کرنا، پھر کسی کو یہ میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھ لے، جب تم قسم کھا بیٹھو تو یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اسی طرح اپنے احکام بیان فرماتے ہیں؛ تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ﴿۱﴾ ﴿۸۹﴾

﴿۱﴾ انسان اپنی بات کو مؤکد کرنے اور قوت پہنچانے کے لئے مختلف الفاظ کا استعمال کرتا ہے، انھیں میں سے ایک قسم بھی ہے، مختلف مذہب کے ماننے والے لوگ قسمیں کھایا کرتے ہیں اور عام طور پر اس میں اپنے عقیدہ کے مطابق مقدس ہستیوں کا حوالہ دیتے ہیں، آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کے لوگ ان دیویوؤں اور دیوتاؤں کی قسم کھاتے تھے، جن کی وہ پوجا کیا کرتے تھے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع کو شرک کے بجائے توحید کا مظہر بنا دیتا ہے؛ چوں کہ قسم کھانا انسان کے اندر ایک فطری داعیہ ہے؛ اس لئے گو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی؛ لیکن بالکل منع بھی نہیں کیا گیا؛ البتہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانے سے روک دیا گیا؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کو قسم کھانا ہو تو اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے ''من کان حالفاً باللہ أو لیصمت'' (بخاری، باب لاتحلفوا بآباءکم، حدیث نمبر: ۶۶۱۸) اللہ کی قسم میں لفظ اللہ تو شامل ہے ہی، اللہ کے صفاتی نام جیسے رحمن ورحیم وغیرہ بھی شامل ہیں، قرآن کی قسم کھائی جائے تو قسم ہوگی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے: کیوں کہ 'کلام' اللہ کی صفت ہے اور قرآن بھی اللہ کا کلام ہے؛ اس لئے بعض فقہاء نے اس سے بھی قسم کھانے کو درست قرار دیا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے اگرچہ اس سے مختلف ہے: لیکن قسم کے الفاظ میں عرف ورواج کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے بعد کے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی قرآن کی قسم کھائے یا قرآن اُٹھا کر کوئی بات کہے تب بھی قسم ہوجائے گی؛ (مجمع الانہر: ۱/۵۵۴) البتہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی جائے، جیسے ماں باپ کی، اولاد کی، بزرگوں کی، تو اس کا اعتبار نہیں؛ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر غیر اللہ کی قسم کھائی جائے تو ہی اس کا اعتبار نہیں ہے، اور جان بوجھ کر اللہ کے ماسوا کی قسم کھائی ہو تو گنہگار بھی ہوگا، قرآن مجید میں اس بات کا ذکر صراحتاً بھی آیا ہے کہ قسم اللہ ہی کی کھائی جائے؛ (المائدہ: ۵۳) لیکن چوں کہ اسلام کی نظر میں ''یمین'' (قسم) نام ہی اللہ کی قسم کھانے کا ہے، اس لئے اس آیت میں اگرچہ صراحتاً اس کا ذکر نہیں، مگر گویا ضمنی طور پر اس کا ذکر موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قسم سے متعلق چار احکام بیان کئے ہیں: پہلا یہ کہ یمین لغو کا کوئی اعتبار نہیں یعنی قسم منعقد نہیں ہوگی ←

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ
الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ
وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، مورتیاں اور فال نکالنے کے تیر گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں، ان سے بچو؛ تاکہ تمہارا بھلا ہو ﴿۹۰﴾ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوے کے ذریعہ دشمنی اور نفرت پیدا کردے، نیز تم کو اللہ کے ذکر اور نماز سے باز رکھے،تو کیا تم (شراب اور جوئے سے) باز آجاؤ گے؟ ﴿۹۱﴾

← اور اس کی وجہ سے کفارہ واجب نہیں ہوگا،یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ قسم کھانے کا ارادہ نہیں تھا؛لیکن بلاارادہ زبان سے قسم کے الفاظ نکل گئے، اس میں نہ قسم ہوگی اور نہ کفارہ واجب ہوگا،بعض لوگوں کے نزدیک یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ گذری ہوئی کسی بات کو سچ جانتے ہوئے قسم کھالے؛ حالاں کہ وہ بات خلافِ واقعہ تھی، اس صورت میں بھی کوئی کفارہ واجب نہیں ہوگا، دوسرا حکم یہ ہے کہ آئندہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے تو اس سے قسم منعقد ہوجاتی ہے (جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''یمین منعقدہ'' کہتے ہیں)، اگر آئندہ اس قسم پر قائم نہ رہ پائے ،یعنی جس بات کے کرنے کی قسم کھائی تھی، اسے نہیں کیا، یا جس سے بچنے کی قسم کھائی تھی اسے کرگذرا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''یمین منعقدہ'' کہا جاتا ہے، (بدائع الصنائع: ۹/۳) تیسرے: اِس قسم کا کفارہ بیان کیا گیا ہے کہ کفارہ کے طور پر چار عمل کئے جاسکتے ہیں، پہلے تین عمل میں اختیار ہے اور وہ ہے دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا جو اوسط درجہ کا ہو اور عام طور پر کھایا جاتا ہو اور اتنی مقدار میں ہو کہ وہ آسودہ ہوجائیں، یا دس محتاج شخص کے کپڑے بنانا، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر ان تینوں میں سے کسی پر قدرت نہ ہو تو چوتھی صورت یہ ہے کہ تین روزے رکھ لے: البتہ یہ تین روزے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر مسلسل ہونے چاہئیں، (فتح القدیر: ۷۶/۵) چوتھا حکم قسم کی حفاظت کا دیا گیا کہ آدمی کسی بہتر یا جائز بات کی قسم کھائے، تو اپنی قسم پر قائم رہنے کی کوشش کرنی چاہئے؛ البتہ اگر کسی ناجائز بات کی قسم کھائے تو قسم کا توڑنا واجب ہے، یا وہ شرعاً تو ناجائز نہ ہو؛ لیکن اس کے حالات کے موافق نہ ہو تو قسم کو توڑنے کی گنجائش ہے؛ البتہ دونوں صورتوں میں قسم کو توڑنے کے بعد کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قسم کی ایک اور صورت کا صراحتاً ذکر نہیں فرمایا ہے، گو اشارہ اس کی طرف بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ آدمی گذشتہ زمانے کے بارے میں جانتے بوجھتے جھوٹی قسم کھالے تو ایسی صورت میں کیا حکم ہوگا؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء کہتے ہیں کہ اس صورت میں وہ شخص گنہگار ہوگا، اسے توبہ کرنی چاہئے؛ البتہ کفارہ اس پر واجب نہ ہوگا، یعنی جھوٹی قسم کھانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ یہ کفارہ اس کے لئے کافی نہیں؛ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی کفارہ واجب ہوگا، (مغنی المحتاج: ۳۲۵/۴) اس حقیر کا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے پر عمل کرنے میں احتیاط ہے کہ توبہ بھی کرلے اور کفارہ بھی ادا کردے۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

اور اللہ کی فرمانبرداری کرو، رسول کی فرمانبرداری کرو، نیز (گناہوں سے) بچتے رہو، اگر تم نے اس سے بے رخی برتی تو ہمارے رسول پر تو صرف اچھی طرح پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ جو چیزیں انسان کے اخلاق کو بگاڑتی ہیں، ان میں سرفہرست شراب ہے؛ کیوں کہ جب نشہ چڑھتا ہے تو انسان ہوش وحواس کھو دیتا ہے اور اس حالت میں کسی بھی برائی کا ارتکاب کرسکتا ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے برائیوں کی جڑ قرار دیا ہے، (ابن ماجہ، باب الخمر، حدیث نمبر: ۳۳۷۱) اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ شراب پہلے ہی مرحلہ میں حرام کردی جاتی؛ لیکن اسلام سے پہلے لوگ اس کے بے حد عادی تھے، یہاں تک کہ مذہبی تقریبات بھی شراب سے خالی نہ ہوتی تھیں؛ اس لئے از راہ حکمت اس کو تین مرحلوں میں حرام قرار دیا گیا، پہلے فرمایا گیا کہ اس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ ہے (بقرہ: ۲۱۹) دوسرے مرحلہ میں حکم دیا گیا کہ جب نشہ کی حالت میں ہو تو نماز نہ پڑھو؛ بلکہ تاکید کے ساتھ کہا گیا کہ نماز کے قریب بھی نہ جاؤ ''لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' (نساء: ۴۳) تیسرے مرحلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس میں قطعی طور پر شراب کی حرمت کا اعلان کردیا گیا اور نہایت تاکید کے ساتھ کہ اول: تو تاکید کے لئے ''إنما'' کا لفظ استعمال کیا گیا، جو عربی زبان میں کسی بات کو بہت قوت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، دوسرے: شراب کی حرمت کو بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا، گویا یہ برائی شرک کے مماثل قرار پائی، تیسرے: حرام کہنے کی بجائے ''رجس'' یعنی ناپاک اور گندی چیز سے تعبیر کیا گیا، جس سے اور زیادہ تاکید مقصود ہے، چوتھے: اسے شیطانی عمل قرار دیا گیا، پانچویں: واضح طور پر فرمایا گیا کہ تم لوگ اس سے بچے رہو، چھٹے: اس کے حرام ہونے کا سبب بتایا گیا کہ اس سے آپس میں عداوت اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور یہ اللہ کی یاد سے غافل کردیتا ہے، چھٹے: حکم دینے کے بعد پھر ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا کہ تم اس سے باز آؤ گے یا نہیں؟ ساتویں: اسی پس منظر میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا اور دوبارہ اس سے بچنے کی تلقین کی گئی، آٹھویں: نہایت سختی کے ساتھ فرمایا گیا کہ اگر تم لوگوں نے روگردانی کی، تو ہمارے رسول کا کام تو صرف پہنچا دینا ہے، یعنی بات نہ مانو گے تو پکڑ ہوگی اور خود ہی نقصان اُٹھاؤ گے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف شراب کو حرام قرار دیا؛ بلکہ اس کی خرید وفروخت اور اس کو اُٹھا کر لے جانے والے پر بھی لعنت فرمائی (ابن ماجہ، باب لعنت الخمر الخ، حدیث نمبر: ۳۳۸۰) اسی لئے فقہاء متفق ہیں کہ جس طرح شراب کا پینا حرام ہے؛ اسی طرح اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے اور شراب کے کارخانے میں کام کرنا بھی جائز نہیں، اس آیت میں شراب کو ''رجس'' یعنی ناپاک کہا گیا ہے؛ اس لئے فقہاء متفق ہیں کہ شراب صرف حرام ہی نہیں؛ بلکہ ناپاک بھی ہے، اگر جسم پر یا کپڑے پر لگ جائے تو اس کا دھونا واجب ہے اور اگر ہتھیلی کی گہرائی کے برابر شراب جسم یا کپڑے پر لگی ہو تو اس کے دھوئے بغیر نماز درست نہیں ہوگی، یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب شراب کی حرمت کا یہ واضح اعلان آگیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس حکم کے سامنے اس طرح اپنا سر جھکا دیا کہ لوگوں نے شراب نکال کر سڑکوں پر بہادی اور جن کے منھ تک شراب آچکی تھی، ان کے حلق تک نہیں پہنچی۔ ←

ع ۱۲/۲

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، تو اس سے پہلے وہ جو کچھ کھا چکے ہیں، اس سلسلہ میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ انھوں نے گناہ کو چھوڑ دیا، ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے، پھر گناہوں سے بچتے رہے اور ایمان لائے، پھر گناہوں سے پرہیز کرنے پر قائم رہے اور نیک عمل کیا، اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۳﴾

← اس آیت میں شراب کے علاوہ تین اور گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک جوا، اور جوے سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز پر اس طرح رقم لگائی جائے کہ اس کا انجام معلوم نہ ہو، جیسا کہ کھیل وغیرہ میں شرط لگاتے ہیں، دوسرے: ''انصاب'' یعنی بت، معلوم ہوا کہ ویسے تو ہر جاندار کا مجسمہ بنانا حرام ہے؛ لیکن ایسی مورتیاں بنانا جن کی مشرک قومیں پرستش کرتی ہوں، سخت گناہ اور شدید حد تک حرام ہیں؛ بلکہ اگر تقدس کے جذبہ سے ایسی مورتیاں بنائی جائیں تو کفر ہے، تیسرے ''ازلام'' یعنی پانسے، عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی مل کر اونٹ ذبح کرتے، جس میں سب کے پیسے برابر ہوتے؛ لیکن حصوں کی تقسیم غیر مساویانہ اور نامنصفانہ ہوتی، کسی کے لئے آدھا، کسی کے لئے چوتھائی، کسی کے لئے دسواں حصہ اور کسی کے لئے کچھ نہیں، اس کے لئے قرعہ اندازی کی جاتی، جس کے نام پر جو مقدار نکل آئے اسے وہ دے دی جاتی، کوئی محروم ہوتا، کسی کو کم ملتا، کسی کو زیادہ ملتا اور کسی کو بہت زیادہ، یہ بھی جوے کی ایک صورت تھی؛ اس لئے اس سے منع کیا گیا؛ البتہ اگر کسی شئ کو تقسیم کرنا ہو، برابری اور انصاف کے ساتھ اس کے حصے بنائے جائیں اور حصوں کو متعین کرنے کے لئے قرعہ اندازی کرلی جائے کہ جس کے نام پر جو حصہ نکل آئے وہ اس کو لے لے تو یہ صورت جائز ہے —— اللہ تعالیٰ نے اس میں شراب اور جوے سے روکنے کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ اس سے آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے اور انسان اللہ کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے، غور کیا جائے تو یہ ایک اُصولی رہنمائی ہے، کہ جو کام آپسی اختلافات کا سبب بنتے ہوں اور شریعت نے اس کا حکم نہ دیا ہو یا وہ اللہ کی یاد سے غافل کردیتے ہوں تو مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے دور رکھیں جیسے شطرنج یا کرکٹ وغیرہ کے کھیل۔

﴿۱﴾ جب تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی تو ظاہر ہے کہ مسلمان بھی شراب پیا کرتے تھے، پھر جب اس کے حرام ہونے کا حکم آیا اور وہ بھی اس درجہ تاکید کے ساتھ، تو انھیں خیال ہوا کہ ہمارے بہت سے رفقاء شراب پیتے تھے اور جوا کھیلتے تھے، اسی حال میں وہ دنیا سے چلے گئے، ان کا کیا حال ہوگا؟ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی کہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے اگر کسی نے نشہ آور چیزیں کھائی پی ہوں تو ان پر کوئی گناہ نہیں؛ البتہ اب جب کہ ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا گیا ہے، اِن سے خوب اچھی طرح بچنا ہے، اس آیت میں تاکید کے طور پر تین دفعہ 'تقویٰ' یعنی گناہ سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شراب اور جوا کس قدر قابل اجتناب عمل ہے!

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ
لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۴﴾ یٰۤاَیُّهَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ
مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ
مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَ بَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ
فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا
لَّكُمْ وَ لِلسَّیَّارَةِ ۚ وَ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

اے ایمان والو ! اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور کچھ ایسے شکار کے سلسلے میں آزمائیں گے ، جن تک تمہارے ہاتھ اورتمہارے نیزے (بہ آسانی) پہنچ پاتے ہوں؛ تاکہ اللہ (ظاہری طور پر بھی) جان لیں کہ کون بغیر دیکھے ہوئے اللہ سے ڈرتا ہے؟ پھر جواس کے بعد زیادتی کرے گا،اس کے لئے دردناک عذاب ہے، ﴿۱﴾ ﴿۹۴﴾ اے ایمان والو! جب تم احرام کی حالت میں ہوتو شکار کو نہ مار ڈالو اور تم میں سے جو جان بوجھ کر شکار کو مار دے،تو اسی مارے ہوئے جانور کے مثل بطور بدلے کے واجب ہے،تم میں سے دو معتبر افراد اس کا فیصلہ کریں گے،یہ قربانی کعبہ تک پہنچائی جائے گی ، یا کفارہ (یعنی) چند مسکینوں کو کھانا (کھلایا جائے) ، یا اس کے برابر روزے (رکھے جائیں)؛ تاکہ وہ اپنے کئے کی سزا چکھ لے، جو پہلے ہو چکا ہے، اللہ نے اسے معاف کیا اور جو پھر ایسا کرے گا،تو اللہ اس سے بدلہ لیں گے اور اللہ زبردست ہیں اور انتقام لے سکتے ہیں ﴿۹۵﴾ تمہارے اور دوسرے مسافروں کے فائدے کے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا تمہارے لئے حلال کیا گیا ہے اور خشکی کا شکار —— جب تک تم حالت احرام میں ہو—— تم پر حرام کیا گیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو،جس کی طرف تم سب جمع کئے جاؤ گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۶﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کے امتحان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات گناہ کے کام کو آسان کردیا جاتا ہے؛ تاکہ بندہ کی حقیقی آزمائش ہو، کہ وہ اللہ کے خوف سے اپنے آپ کو گناہ سے بچائے رکھتا ہے، یا نفس کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیتا ہے؟ جیسا کہ یہودیوں کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا اور اسی دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آجایا کرتی تھیں؛ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع سے مسلمان حالتِ احرام میں تھے،تو کئی مواقع پر شکار ان کے سامنے سے گذرتے تھے،صحابہ جو احرام باندھے ہوئے تھے، نہ صرف خود اس سے باز رہتے تھے؛ بلکہ جو رفقاء حالت احرام میں نہیں تھے،ان کو بھی صراحتاً یا اشارۃً شکار کے بارے میں بتانے سے اجتناب کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر:۱/۵۲۱)

←

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ تعالیٰ نے عظمت والے گھر 'کعبہ' کو، بزرگی والے مہینہ کو، کعبہ کو لے جائے جانے والے قربانی کے جانور کو اوران جانوروں کو بھی، جن کے گلے میں نشانی کے پٹے ڈالے ہوئے ہیں (اس کے) قائم رہنے کا ذریعہ بنایا ہے، ﴿۱﴾ تا کہ تم جان لو کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ان سب کو جانتے ہیں اور بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ ﴿۹۷﴾

← ﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر: ۹۵،۹۶ میں شکار سے متعلق مختلف احکام بیان کئے ہیں، اول: یہ کہ جو شخص حالت احرام میں ہو، اس کے لئے شکار کرنا جائز نہیں، نہ حدودِ حرم میں اور نہ اس سے باہر، نہ ان جانوروں کا جن کا کھانا جائز ہے اور نہ ان جانوروں کا جن کا کھانا حرام ہے؛ البتہ شکار سے مراد جنگلی جانور ہیں، پالتو جانور جیسے گائے، بکری، مرغی وغیرہ کو ذبح کرنے میں حرج نہیں، دوسرے: اگر کوئی شکار کے جانور کو حالت احرام میں مار ڈالے تو اس پر اس کا بدل واجب ہوگا، قرآن نے یہاں جان بوجھ کر شکار کو مارنے کی بات کہی ہے، یہ بطور تاکید وتنبیہ کے ہے؛ کیوں کہ اکثر شکار قصد وارادہ ہی کے ساتھ کیا جاتا ہے، اگر کوئی شخص بھول کر شکار کرے یعنی اس کو حالت احرام میں ہونا یاد نہ ہو، یا غلطی سے شکار کرلے یعنی تیر کسی اور چیز پر پھینکا اور لگ گیا شکار کو، تو ان صورتوں میں بھی جزاء واجب ہوتی ہے، جس کا ذکر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار میں ہے، (الکشاف للزمخشری: ۱/ ۳۶۳) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ، امام مالک رحمۃ اللہ، امام شافعی رحمۃ اللہ وغیرہ کی یہی رائے ہے، (الکشاف للزمخشری: ۱/ ۳۶۴) تیسرے: بتایا گیا کہ جزا سے کیا مراد ہے؟ جزا سے مراد ہے اسی جانور کا مماثل، بعض فقہاء کے نزدیک اس سے خلقت اور صورت کی مماثلت مراد ہے، (ردالمحتار: ۳/ ۵۹۹) جیسے نیل گائے کا شکار کیا ہو تو گائے کی قربانی کرے، ہرن کا شکار کیا تو بکری کی قربانی کرے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک معنوی مماثلت مراد ہے، (ردالمحتار: ۳/ ۵۹۹) یعنی جس جانور کا شکار کیا ہے، اسی قیمت کے جانور کی قربانی کی جائے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے دو معتبر آدمیوں سے فیصلہ کرانے، قربانی کے بجائے مسکینوں کو کھانا کھلانے، یا اسی لحاظ سے روزہ رکھنے کے جو احکام دیئے ہیں، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جزا میں اصل اعتبار قیمت کا ہے، یا تو اسی قیمت کے جانور کی قربانی کی جائے، یا جتنی قیمت لگی ہو، اس سے گیہوں کی قیمت کا اندازہ کیا جائے اور ہر نصف صاع (ایک کیلو ۶۹۲ گرام) گیہوں ایک مسکین کو دیدے، یا ہر نصف صاع کے بدلے ایک روزہ رکھے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک قیمت لگانے میں دو معتبر مسلمان شخص کی رائے حاصل کی جائے گی اور ان کی رائے پر عمل کیا جائے گا، بہر حال اگر قربانی دینا منظور ہو تو ضروری ہے کہ یہ قربانی حرم میں دی جائے، قرآن میں اگرچہ ''کعبہ'' کا لفظ آیا ہے؛ لیکن اس سے مراد پورا حرم کا علاقہ ہے، (تفسیر بغوی: ۱/ ۱۳۷) چوتھی بات یہ بتائی گئی کہ ممانعت خشکی کے شکار کی ہے، دریائی شکار جیسے مچھلی وغیرہ کے شکار میں حرج نہیں، (البحرالرائق: ۳/ ۴۶) اسی طرح موذی جانور جیسے سانپ، کتا، بھیڑیا وغیرہ اگرچہ خشکی کے جانور ہیں؛ لیکن یہ بھی اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں، حالتِ احرام میں ان کو مارا جاسکتا ہے۔

﴿۱﴾ جزیرۃ العرب کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت نہیں تھی، جو امن وامان قائم رکھے اور نظم وضبط کی محافظ ہو، لوگوں کا ←

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ
الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۳/۳

جان لو کہ اللہ سخت عذاب بھی دیتے ہیں اور بڑے بخشنے والے اور بے حد مہربان بھی ہیں ﴿۹۸﴾ رسول کے ذمہ تو صرف (اللہ کے پیغام کو) پہنچا دینا ہے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو، اللہ سب جانتے ہیں ﴿۹۹﴾ آپ کہہ دیں کہ گندی اور صاف ستھری چیز برابر نہیں ہو سکتی؛ اگرچہ آپ کو ناپاک چیز کی بہتات متاثر کرتی ہو ﴿۱﴾؛ اس لئے اے عقل والو! اللہ سے ڈرا کرو؛ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ ﴿۱۰۰﴾

← ایک جگہ سے دوسری جگہ کوئی سامان لے کر جانا مشکل تھا، جان، مال، عزت وآبرو تینوں ہی چیزیں خطرہ میں رہتی تھیں، ان حالات میں دین ابراہیمی کی بچی کھچی چیزیں جو ان مقامات حج سے متعلق تھیں، لوگوں کے لئے امن وامان کا بہترین ذریعہ تھیں، ان میں ایک تو حرم کا احترام تھا، جس میں کعبۃ اللہ موجود تھا کہ ان حدود میں لوگ نہ صرف ایک دوسرے کی جان و مال کا احترام کرتے تھے؛ بلکہ شکار تک سے اجتناب کرتے تھے، دوسرے: چار مہینے، جو حرام مہینے (اشہر حرم) کہلاتے تھے، یعنی: رجب، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، ان مہینوں میں بھی وہ کسی پر حملہ کرنے کو برا سمجھتے تھے اور اس سے بچتے تھے، تیسرے: قربانی کے جانور جن کے گلے میں علامتی طور پر کوئی پٹا لٹکا دیا جاتا تھا اور اونٹ ہوتا تو اس کے کوہان سے خون نکال کر اسی کوہان پر مل دیا کرتے تھے، ایسے جانوروں کو بھی لوگ ہاتھ نہیں لگاتے تھے، ایک ایسے علاقہ میں جہاں نہ کوئی سلطنت تھی اور نہ کوئی قانون، ان باتوں سے امن وامان کو قائم رکھنے میں بڑی مدد ملتی تھی، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو لوگوں کے لئے قیام کا ذریعہ بنایا ہے؛ اسی لئے بعض اہل علم نے قیاماً للناس کے معنی کئے ہیں: ''لوگوں کے لئے امن کا ذریعہ ہے''۔

﴿۱﴾ اوپر کی آیات میں حلال وحرام سے متعلق بہت سے احکام بیان کئے گئے ہیں، بعض دفعہ حلال پر قناعت کرنے کی وجہ سے بظاہر مال میں کمی محسوس ہوتی ہے اور حلال وحرام کی تمیز اُٹھا دی جائے تو ظاہری طور پر مال کی کثرت نظر آتی ہے، غالباً اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حرام مال چاہے زیادہ ہو، وہ تھوڑے حلال مال کے برابر نہیں ہو سکتا؛ کیوں کہ اسی میں برکت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اس لئے مال حرام کی کثرت سے متاثر نہیں ہونا چاہئے، اس آیت میں اگرچہ بظاہر حضور ﷺ سے خطاب ہے؛ لیکن اصل خطاب اُمت سے ہے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں 'خبیث' اور 'طیب' سے مراد صرف حلال وحرام مال ہی نہیں ہے؛ بلکہ اچھے اور برے انسان بھی ہیں، یعنی ایمان نہ لانے والوں کی کثرت اور حلال وحرام کی تمیز نہ کرنے والوں کے یہاں دولت کی بہتات سے متاثر نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ایمان لانے والے اور ایمان نہ لانے والے اور حلال وحرام برابر نہیں ہو سکتے، ہیرے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پتھر کی ایک چٹان سے بھی زیادہ قیمتی ہوتا ہے، صرف کثرت اور قلت سے ان کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا
حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ
قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا
حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر ان کے بارے میں اس وقت پوچھو گے، جب کہ قرآن مجید نازل کیا جا رہا ہے، تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی، اللہ نے ان کے سوال کرنے کو معاف کردیا اور اللہ بہت بخشنے والے بردبار ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۰۱﴾ تم سے پہلے بھی کچھ لوگ ایسے سوال کر چکے ہیں، پھر ان کا انکار کرنے لگے ﴿۲﴾ ﴿۱۰۲﴾ اللہ نے نہ بحیرہ مقرر کیا نہ سائبہ نہ وصیلہ نہ حام؛ لیکن جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اللہ پر جھوٹ گھڑ رہے ہیں اور ان میں سے اکثر (دین کے معاملے میں) بے عقل لوگ ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۳﴾

﴿۱﴾ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک میں اپنی اِس جگہ پر موجود ہوں، جو بھی دریافت کرو گے، میں اس کے بارے میں بتاؤں گا؛ چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حذافہ کھڑے ہوئے اور دریافت فرمایا: اللہ کے رسول میرے والد کون ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: حذافہ، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی (بخاری، باب التعوذ من الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۸۹، مسلم، باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم وترک الخ، حدیث نمبر: ۶۱۲۱) اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تحقیق اور کرید مناسب نہیں ہوتی؛ کیوں کہ اگر اس کا سچا جواب سامنے آجائے تو اس سے ناگواریاں پیدا ہوں گی اور فتنے جاگیں گے، اور چوں کہ اس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا؛ اس لئے اس کا پورا امکان تھا کہ ایسے سوالات کے جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح کردیئے جائیں؛ اس لئے مسلمانوں کو لایعنی قسم کے سوالات سے منع کیا گیا ہے؛ البتہ اگر کوئی شخص شرعی مسائل یا دنیوی ضرورت کے بارے میں سوال کرے تو اس کی ممانعت نہیں، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابیٔ رسول کے اس عمل پر تنبیہ فرمائی؛ لیکن یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ اللہ نے معاف کردیا، صحابہ کی یہی شان ہے کہ اگرچہ وہ معصوم نہیں ہیں؛ لیکن ان سے جو کوتاہی ہوتی ہے، ان کی حسنات اور نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمادیتے ہیں، اس لئے اُمت کو حق نہیں ہے کہ ان کے بارے میں زبان کھولے اور ان کی لغزشوں کو موضوع بحث بنائے۔

﴿۲﴾ یعنی پچھلی قوموں میں بھی بعض لوگوں نے لایعنی مطالبات کئے اور جب ان کے سوال کو پورا کردیا گیا تو ماننے سے انکار کر بیٹھے؛ یہاں تک کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آگیا، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے پہاڑ سے اونٹنی کے نکلنے کا مطالبہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی التجا پر اس مطالبہ کو پورا فرمادیا، مگر پھر بھی وہ ایمان نہ لائے؛ یہاں تک کہ سب عذاب میں مبتلا کئے گئے اور پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹادی گئی؛ اگرچہ صحابہ کے سوال کی نوعیت الگ تھی اور ان قوموں کے سوال کی نوعیت الگ؛ لیکن چوں کہ دونوں ہی لایعنی اور بے مقصد سوالات تھے؛ اس لئے دونوں کا یہاں ذکر فرمایا گیا۔

←

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ
اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی طرف ، جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے، اور رسول کی طرف آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے تو وہی کافی ہے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اگر چہ ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور ہدایت سے محروم ہوں، ﴿۱﴾ (تو بھی یہ لکیر کے فقیر ہی بنے رہیں گے؟) ﴿۱۰۴﴾ اے ایمان والو! تم پر تمہاری ذمہ داری ہے، اگر تم خود راہ راست پر ہو، تو جو گمراہ ہو، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ، اللہ ہی کی طرف تم سب لوگوں کو لوٹ کر جانا ہے، پھر اللہ تم کو وہ سب بتادیں گے، جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۵﴾

← ﴿۳﴾ زمانۂ جاہلیت میں جانوروں کے سلسلے میں لوگوں نے کچھ من گھڑت تصورات قائم کر لئے تھے، ان میں مشترک بات یہ تھی کہ عام لوگوں کے لئے بعض جانوروں کے استعمال کو حرام سمجھا جاتا تھا اور انھیں معبودانِ باطل کی نذر و نیاز تصور کیا جاتا تھا؛ چنانچہ ''بحیرہ'' وہ مادہ جانور تھا، جس کا دودھ بتوں کے لئے وقف تھا اور بت خانوں کے پجاری ہی اس سے استفادہ کرتے تھے، دوسروں کے لئے اس سے فائدہ اُٹھانا ممنوع تھا،'سائبہ'وہ اونٹنی کہلاتی تھی، جس نے پانچ مادہ بچے جنے ہوں، ان کے درمیان کوئی نر نہ ہو، اس کی سواری اور اس کے بال کاٹنے کو ممنوع سمجھا جاتا تھا اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ نہیں پی سکتا تھا، (روح المعانی: ۶۱/۵) بکری کو اگر مادہ بچہ پیدا ہوتا تو اسے خود استعمال کرتے ، نر ہوتا تو اسے بتوں کا حق سمجھتے اور اگر ایک ہی شکم میں نر و مادہ دونوں پیدا ہوتے ، تو دونوں کو بتوں کا حق قرار دیتے ، اسی کو'' وصیلہ'' کہتے تھے، (روح المعانی: ۶۱/۵) جس نر اونٹ کی جفتی سے دس بچے پیدا ہوجاتے ، اس کی سواری وغیرہ کو اپنے لئے حرام تصور کرتے ، اسی کو'' حام'' کہتے تھے، (احکام القرآن: ۶۰۸/۲) قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ یہ سب مشرکین کے خودساختہ خیالات ہیں، اللہ تعالیٰ نے کبھی ان باتوں کا حکم نہیں دیا۔

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ جو رسم آباء واجداد سے چلی آئی ہو؛ لیکن اس پر کتاب وسنت کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکثر قوموں میں شرک کے پیدا ہونے اور بدعتوں کے رواج پانے میں اسی کا دخل رہا ہے، اِن ہی آباء واجداد کے زمانے سے مروج اُمور کو دلیل سمجھ لیا گیا؛ حالاں کہ دلیل کتاب وسنت ہے، نہ کہ بغیر سمجھے ہوئے کیا جانے والا عمل، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلف صالحین جو کتاب وسنت پر نظر رکھتے تھے اور شرعی دلائل واحکام کی روشنی میں عمل کرتے تھے اور رائے دیتے تھے، ان کے اقوال وافعال اس آیت میں مراد نہیں ہیں۔

﴿۲﴾ اس آیت کا خطاب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء سے ہے، جو مشرکین عرب پر دین پہنچانے کا حق ادا کر چکے تھے اور ان پر حجت پوری ہو چکی تھی؛ لیکن مسلمان ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے رنجیدہ ہوتے تھے اور غالباً انھیں یہ خوف رہتا تھا کہ ←

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا
عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ
الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا
وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا
اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ
بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى
اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
ع ۱۴ ۸ ۴ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی پر موت آئے، تو وصیت کرتے وقت تمہارے درمیان تمہیں میں سے دو معتبر شخص گواہ ہونے چاہئیں یا تمہارے علاوہ میں سے دو شخص ہوں، اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو، پھر تم پر موت کی مصیبت آجائے، اگر تم کو شک ہو تو تم ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو، وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس قسم کے عوض کوئی مال حاصل کرنا نہیں چاہتے؛ اگرچہ کہ وہ شخص ہمارا قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور ہم اللہ کے واسطے گواہی کو نہیں چھپا رہے ہیں، اگر ہم ایسا کریں تو بے شک گنہگاروں میں سے ہوں گے ﴿۱۰۶﴾ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے حق کو دبا لیا ہے، تو جن کا حق دبایا ہے، ان میں سے دو اور شخص جو میت کے قریبی رشتہ دار ہوں، ان کی جگہ کھڑے ہوں اور اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے، ورنہ ہم یقیناً ظالموں میں سے ہوں گے ﴿۱۰۷﴾ اس میں اُمید ہے کہ وہ لوگ واقعہ کے مطابق گواہی دیں گے یا ڈریں گے کہ کہیں ان کی قسم کے بعد ہماری قسمیں رد کر دی جائیں، اللہ سے ڈرتے رہو اور (ان کے احکام قبولیت کے جذبہ سے) سنو اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۰۸﴾

← کہیں اللہ کے یہاں اُن کا شمار ایسے لوگوں میں نہ ہو جائے، جنھوں نے دعوت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کی ہے؛ چنانچہ ان سے فرمایا گیا کہ آپ کے مخاطبین کا گمراہی پر جمے رہنا آپ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے؛ البتہ جب تک انسان دعوت کا حق ادا نہ کر دے، وہ اس سلسلہ میں اپنی کوتاہی پر جواب دہ ہوگا؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں گے اور اس کا ہاتھ نہیں پکڑیں گے تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان کو بھی پکڑ لے —— ''أو شك أن يعمهم الله بعذاب من عنده''۔ (سنن ترمذی: کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۱۲۶۸)

﴿۱﴾ تمیم داری اور ان کے بھائی عدی دونوں عیسائی تھے، یہ اور ان کے ساتھ عمرو بن عاص کے غلام بدیل (جو مسلمان ہو چکے تھے) ←

← تجارت کے لئے شام گئے، بدیل رضی اللہ عنہ بیمار ہوگئے اور انھیں اندازہ ہوگیا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے؛ چنانچہ انھوں نے اپنے سامان کی فہرست بنائی، سامان کے درمیان اس فہرست کو ڈال دیا، اپنے دونوں رفقاء کو اس کی اطلاع نہیں دی اور ان دونوں کو وصیت کی کہ ان کا یہ سامان جوں کا توں ان کے گھر پہنچا دیا جائے، اس کے بعد بدیل کا انتقال ہوگیا، ان دونوں نے اس سامان سے چاندی کا ایک پیالہ نکال لیا، جس پر سونے کے نقش ونگار تھے، غالباً اس کی قیمت تین سو دینار کو پہنچتی تھی، جب یہ حضرات واپس آئے تو بقیہ سامان ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیا، گھر کے لوگوں نے جب سامان کی تلاشی لی تو اس میں وہ فہرست مل گئی، جس میں برتن کا ذکر تھا، ان لوگوں نے تمیم اور عدی سے پیالے کا مطالبہ کیا، تو انھوں نے کہا کہ جو کچھ تھا ہم نے دے دیا، اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا؛ لیکن بعد میں ایسا ہوا کہ ایک تاجر کے پاس بدیل کے ورثہ کو یہ پیالہ مل گیا اور اس نے اقرار کیا کہ یہ عدی اور تمیم نے اس کے ہاتھ بیچا ہے، بدیل کے ورثہ آئے، انھوں نے قسم کھالی کہ ہماری گواہی ان لوگوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے اور ہم نے اس میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے؛ چنانچہ ان ورثہ نے پیالہ لے لیا، اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۶/ ۳۴۷-۳۴۶، مفاتیح الغیب: ۶/ ۱۷۳-۱۷۲) ترمذی کی روایت میں خود تمیم داری نے اس واقعہ کی تفصیل اس وقت بیان فرمائی، جب انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا (باب من سورة المائدة، حدیث نمبر: ۳۰۵۹) —— اس آیت سے چند مسائل معلوم ہوئے، اول: یہ کہ جب آدمی کی موت کا وقت آجائے اور وہ اپنے مال کے بارے میں کسی کو وصی ونگراں بنانا چاہے تو معتبر مسلمانوں کو اس پر گواہ بنالینا چاہئے، اگر سفر کی حالت ہو، مسلمان وہاں پر میسر نہ ہوں، تو دو غیر مسلموں کو بھی وصی اور ذمہ دار نامزد کیا جاسکتا ہے، دوسرے: اگر مرنے والے کے ورثہ کو ان لوگوں کے بیان پر اعتماد ہو، تب تو قسم کی ضرورت نہیں؛ لیکن اگر انھیں شبہ ہو تو انھیں حق ہے کہ وہ ان دونوں سے قسمیہ بیان لیں کہ ہم اس میں کچھ چھپا نہیں رہے ہیں؛ یہاں تک کہ جن دو آدمیوں کو ذمہ دار بنایا گیا ہے، وہ باہم رشتہ دار ہیں، تو یہ بھی کہیں کہ ہم اس میں قرابت داری کی بنیاد پر ایک دوسرے کی بات کو چھپا نہیں رہے ہیں، نیز قسم کو مؤکد کرنے کے لئے ان کو یہ بھی حق ہے کہ وہ نماز کے بعد اس طرح کی قسم لیں، بعض فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے؛ کیوں کہ یہ وقت اکثر قوموں کے نزدیک عبادت کا ہوتا ہے اور مقدس سمجھا جاتا ہے، اس طرح نماز کا وقت اور مسجد کا مقام انھیں جھوٹ بولنے سے روک سکے گا، اگر غیر مسلم ہوں تو ان سے ان کی عبادت کے وقت میں قسم لی جائے، تیسرے: اگر ان کے قسم کھانے کے بعد ان کے جھوٹ پر کوئی اور ثبوت مل جائے تو ورثہ ثبوت کو پیش کرتے ہوئے قسم کھائیں، ایسی صورت میں ان کی بات قابلِ قبول ہوگی اور پہلے لوگوں کی قسم رد کردی جائے گی، —— ایک قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں اگرچہ لفظ ''شہادت'' (گواہی) کا استعمال کیا گیا ہے؛ لیکن اصل میں مراد اس سے نگراں اور وصی بنانا ہے، جو غیر مسلم کو بھی بنایا جاسکتا ہے؛ اس لئے یہ آیت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی گواہی معتبر ہے، گو بعض فقہاء نے بہ حالت مجبوری مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کی گواہی کو اسی آیت کی روشنی میں معتبر مانا ہے؛ لہٰذا جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت تھوڑی ہو اور ایسے واقعات پیش آجائیں تو اس رائے سے بھی فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔

وقف لازم

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَا ذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ ﴿١٠٩﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَ الِدَتِكَ ۘ اِذْ
اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۗ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ
وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ
طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٠﴾

جس دن اللہ پیغمبروں کو جمع کریں گے پھر فرمائیں گے: تم کو (اپنی قوم کی طرف سے) کیا جواب ملا تھا؟ وہ عرض کریں گے، ہمیں کچھ معلوم نہیں، بے شک آپ ہی چھپی ہوئی باتوں کو بھی جاننے والے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿١٠٩﴾ جب اللہ فرمائیں گے: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! تم اپنے اوپر اور اپنی والدہ کے اوپر میرے احسان کو یاد کرو، جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری مدد کی، تم لوگوں سے گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی گفتگو کرتے تھے، جب میں نے تم کو لکھنے کی، دانائی کی باتوں کی اور تورات وانجیل کی تعلیم دی، جب تم مٹی سے پرندہ کی شکل کی مورت میرے حکم سے بناتے تھے، پھر اس میں پھونک دیتے تھے تو وہ میرے حکم سے (زندہ) پرندہ ہو جاتا تھا، اور تم پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے، جب تم میرے حکم سے مُردوں کو (قبر سے) نکال کر کھڑا کر دیتے تھے، جب میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک دیا، جب تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تھے، پھر ان میں سے جو کافر تھے، کہنے لگے: یہ تو محض کھلا ہوا جادو ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿١١٠﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ انبیاء کی دعوت کے مقابلے سرکشی کرنے والوں پر غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ان کی بجائے اپنے پیغمبروں سے سوال کریں گے کہ تمہاری دعوت کے مقابلہ ان کا کیا ردِ عمل رہا؟ انبیاء جواب دیں گے: ہمیں علم نہیں، یعنی ایمان کا تعلق تو دل سے ہے، انھوں نے ہماری پیش کی ہوئی دعوت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا یا نہیں؟ اس کا مجھے علم نہیں، انبیاء کا یہ فرمانا کہ آپ ہی غیب سے واقف ہیں، اس بات کا اقرار ہے کہ انبیاء کرام اپنی تمام عظمتوں کے باوجود عالم الغیب نہیں ہوتے تھے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا قرار دینے والوں کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اپنی شان کے متعلق سوال کریں گے، پہلے اپنے چند نمایاں احسانات کا ذکر فرمائیں گے، پھر پوچھیں گے کہ ان سب کے باوجود کیا تم نے لوگوں کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ میرے مقابلے تم کو اور تمہاری ماں کو معبود بنالیں؟ آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اپنی براءت کا اظہار فرمائیں گے، آیت نمبر: ۱۱۰ سے ۱۱۸ تک حق تعالیٰ کی اسی گفتگو کا ذکر ہے — یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ←

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ
السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ
قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَیْهَا مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِیْسَى ابْنُ
مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا
وَ اٰیَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈال دیا کہ مجھے پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ، تو وہ بول اُٹھے: ہم ایمان لائے اور آپ گواہ رہئے کہ ہم فرمانبرداری کریں گے ﴿۱۱۱﴾ جب حواریوں نے کہا: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا آپ کے پروردگار سے ہو سکے گا کہ ہم پر آسمان سے بھرا ہوا خوان اُتار دیں؟ عیسیٰ نے کہا: اگر تم صاحب ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو ﴿۱۱۲﴾ حواریوں نے کہا: ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں، ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا ہے، نیز ہم اس پر گواہ ہو جائیں ﴿۱﴾ ﴿۱۱۳﴾ مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا: اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر آسمان سے ایک بھرا ہوا خوان اُتار دیجئے، جو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید کا دن قرار پائے اور آپ کی طرف سے نشانی ہو جائے، نیز ہمیں روزی عطا فرمائیے، آپ ہی سب سے بہتر روزی دینے والے ہیں۔ ﴿۱۱۴﴾

← ان معجزات کا ذکر کرتے ہوئے ''بِاِذْنِی''، یعنی ''میرے حکم سے'' ارشاد فرمایا ہے، اس میں ایک طرف اس غلط فہمی کا ازالہ ہو گیا کہ یہ سارے کام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قدرت سے کرتے تھے اور واضح ہو گیا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کا نتیجہ تھا، اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طاقت و اختیار کا کوئی دخل نہیں تھا، دوسری طرف ان لوگوں کا جواب بھی ہو گیا، جو ایسے خلاف عادت معجزات کے واقع ہونے کا انکار کرتے ہیں، کہ خلاف عادت باتوں کا انسان کے ذریعہ واقع ہونا یقیناً ناممکن ہے؛ لیکن خدا کی قدرت بے پناہ ہے، وہ کسی عادت کا پابند نہیں؛ اس لئے اگر اُس کے حکم سے کوئی خلافِ عادت واقعہ وجود میں آئے تو اُس پر ہرگز حیرت نہ ہونی چاہئے۔

﴿۱﴾ یعنی ایمان تو ہم پہلے سے آپ کی نبوت و رسالت پر رکھتے ہیں؛ لیکن 'خوان' اُتارنے کی التجاء اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم بھوکے ہیں، اس معجزہ سے ہمیں کھانا مل جائے گا، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ہم دلیل سے تو جانتے ہیں اور زمین میں ظاہر ہونے والے بہت سے معجزات ہم نے دیکھے ہیں؛ لیکن اگر یہ آسمانی معجزہ بھی ظاہر ہو جائے تو ہمارے لئے مزید اطمینان کا باعث ہوگا اور ہم لوگوں کے سامنے بھی اس کی گواہی دے سکیں گے۔ (ملخص از: مفاتیح الغیب: ۱۹۴/۶)

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ ع ۱۵/۷ ۵
اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ
قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ
شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

اللہ نے فرمایا: بے شک میں تم پر خوان اُتار دوں گا، پھر تم میں سے جو شخص اس کے بعد بھی کفر کرے گا، تو اس کو میں ایسا عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہ دوں گا ﴿۱﴾ ﴿۱۱۵﴾ اور جب اللہ فرمائیں گے، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا تسلیم کرو؟ تو عیسیٰ جواب دیں گے: ''آپ کی ذات پاک ہے، مجھ سے کیسے ہوسکتا ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں؟ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا، آپ تو اس بات کو بھی جانتے ہیں، جو میرے دل میں ہے اور جو آپ کے دل میں ہے میں اسے نہیں جانتا، بے شک چھپی ہوئی باتوں کو بھی آپ ہی خوب جانتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۱۶﴾ میں نے ان کو اس کے سوا کچھ نہیں کہا، جس کا آپ نے حکم دیا تھا، کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، جب تک میں ان کے درمیان رہا، ان کی نگرانی کرتا رہا، پھر جب آپ نے مجھے اُٹھالیا، تو پھر آپ ہی ان کے نگراں رہے اور آپ تو ہر چیز سے باخبر ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۱۷﴾

﴿۱﴾ اس خوان میں کیا چیزیں اُتریں؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف باتیں نقل کی ہیں؛ لیکن وہ معتبر احادیث پر مبنی نہیں ہیں اور غالباً اس کی بنیاد اسرائیلی روایات ہیں؛ البتہ یہ 'خوان' اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اُتارا گیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کے اُترنے کے باوجود انکار کیا تو انھیں بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ کر دیا گیا۔ (روح المعانی: ۴/ ۲۵۷)

﴿۲﴾ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا؛ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دینے والوں کے سامنے غضب کے اظہار اور حجت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس طرح کا سوال کریں گے اور کافروں سے خطاب کرنا بھی گوارا نہیں فرمائیں گے۔

﴿۳﴾ یعنی جب تک میں ان کے درمیان تھا اس وقت تک تو انھوں نے مجھے خدا قرار نہیں دیا تھا، جب آپ نے مجھے اپنی قدرت سے ←

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۱۸ قَالَ اللّٰهُ
هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۱۹ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۲۰ ع ۱۶/۶

اگر آپ انھیں عذاب دیں تو وہ آپ ہی کے بندے ہیں اور اگر انھیں معاف کردیں، تو بے شک آپ زبردست بھی ہیں اور حکمت والے بھی'' ﴿۱﴾ ۝۱۱۸ اللہ فرمائیں گے: یہ وہ دن ہے، جس میں سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا، ان کے لئے ایسے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ہمیش اسی میں رہیں گے، اللہ ان سے خوش ہیں اور وہ اللہ سے، یہی ہے بڑی کامیابی! ﴿۲﴾ ۝۱۱۹ اللہ ہی کے لئے آسمان کی، زمین کی اور جو کچھ اس کے اندر ہے، ان سب کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ۝۱۲۰

← آسمان پر اُٹھالیا، تو انھوں نے یہ عقیدہ گھڑا، جس سے آپ بخوبی واقف ہیں، ''توفیتنی'' کے معنی یہاں موت دینے کے نہیں ہیں؛ بلکہ اُٹھا لینے کے ہیں؛ چنانچہ حسن بصری سے منقول ہے کہ قرآن مجید میں وفات تین معنوں میں استعمال ہوا ہے، موت: جیسے ''الله یتوفی الأنفس حین موته'' (الزمر:۴۲) نیند: جیسے ''هو الذی یتوفکم باللیل'' (الانعام:۶۰) اُٹھالیا جانا: جیسے ''یا عیسیٰ إنی متوفیک''۔ (آلِ عمران:۵۵)

﴿۱﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد اُس محبت کا مظہر ہے، جو ایک نبی کو اپنی اُمت سے ہوا کرتی ہے؛ چوں کہ غیر مسلموں کے لئے دُعاءِ مغفرت نہیں کی جاسکتی؛ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اشارۃً اپنی اُمت کے ساتھ نرمی کی درخواست فرمائی کہ اگر آپ معاف فرمادیں تو یہ بھی آپ کی قدرت میں ہے، آپ کو اس سے کوئی روک نہیں سکتا۔

﴿۲﴾ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا جواب ہے کہ قیامت کے دن ان لوگوں کے لئے کوئی سفارش کام نہیں آئے گی جو ایمان نہیں لائے اور جنھوں نے اللہ کے دین کی دعوت کو سچے دل کے ساتھ قبول نہیں کیا اور خدا پر جھوٹ بولتے رہے۔

سُورَةُ الأَنعَام

- سورہ نمبر : (٦)
- رکوع : (٢٠)
- آیتیں : (١٦٦)
- نوعیت : مدنی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ قرآن مجید کی چھٹی طویل سورت ہے، جو ۱۶۵ آیات پر مشتمل ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے ’’ اَنعام‘‘ یعنی چوپایوں کا ذکر فرمایا ہے اور جانوروں کے سلسلہ میں اہل مکہ کے بعض مشرکانہ خیالات اور خود ساختہ رسموں کی تردید فرمائی ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام ’’ اَنعام‘‘ ہے، حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت کے مطابق یہ پوری کی پوری سورت ایک ساتھ نازل ہوئی ہے، اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام اس کو لے کر اترے تو ۷۰ ہزار فرشتوں نے تسبیح پڑھتے ہوئے اس سورۃ کو رخصت کیا —— نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں صراحت ہے کہ یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے، (ابن کثیر: ۲/ ۱۲۲) اگرچہ کہ یہ روایت سند کے اعتبار سے ضعیف ہے؛ لیکن اس سورہ میں جو مضامین آئے ہیں، وہ عام طور پر اہل مکہ کے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان میں تسلسل اور غیر معمولی ارتباط پایا جاتا ہے، یہ اس کے مکی ہونے اور ایک ساتھ نازل ہونے کے سلسلہ میں ایک اندرونی شہادت کا درجہ رکھتی ہے؛ البتہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض آیتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں، جیسے آیت نمبر ’’۹۱‘‘ جس میں یہودیوں سے خطاب ہے، بعض حضرات نے تین اور بعض نے چھ آیتوں کو مدنی قرار دیا ہے، (دیکھئے: تفسیر المنار: ۷/ ۲۳۴) لیکن ظاہر ہے کہ چند آیتوں کا مدنی ہونا اس سورت کے مکی ہونے کے منافی نہیں ہے، ممکن ہے کہ مضمون کی مناسبت کے اعتبار سے کچھ مدنی آیتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس میں شامل کر دی گئی ہوں۔

اس سورت کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں ایمانیات اور عقائد پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، اللہ کے وجود اور اللہ کی توحید وصفات پر ان نشانیوں سے استدلال کیا گیا ہے، جو انسان کے وجود میں چھپی ہوئی اور کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، نبوت اور وحی کے نظام کو عقل اور محسوسات سے ثابت کیا گیا ہے اور مشرکین کے شبہات کا رد کیا گیا ہے، اسی طرح آخرت پر بھی عقلی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، اس سورہ میں ایک بنیادی بات یہ کہی گئی ہے کہ دین حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے، یعنی اسلام ’’ وحدتِ دین‘‘ کا قائل ہے، نہ کہ ’’ وحدتِ ادیان‘‘ کا، غرض کہ یہ سورہ ایمانیات اور ان کے دلائل وبراہین کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے۔

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ
ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲ وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ
وَیَعْلَمُ مَاتَكْسِبُوْنَ ۝۳ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۝۴

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیاں اور روشنی رکھیں، پھر بھی کفر کرنے والے (دوسروں کو) اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں ﴿۱﴾ ۝۱ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، ﴿۲﴾ پھر موت کا ایک وقت مقرر کر دیا اور اللہ کے پاس (ہر چیز کے لئے) ایک مدت مقرر ہے، پھر بھی تم شک کرتے ہو، ﴿۳﴾ ۝۲ وہی خدا ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، ﴿۴﴾ وہ تمہاری چھپائی ہوئی باتوں سے بھی واقف ہیں اور ظاہر کی ہوئی باتوں سے بھی، اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو، اسے بھی جانتے ہیں ۝۳ اور ان (مشرکین) کے پاس ان کے رب کی دلیلوں میں سے کوئی بھی دلیل آتی ہے، تو وہ اس سے بے رُخی ہی برتتے ہیں۔ ۝۴

﴿۱﴾ یہ اور اس کے بعد آنے والی آیات کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی توحید کو بیان کرنا ہے، دنیا کی اکثر قوموں میں شرک پیدا ہونے کا بنیادی سبب یہ عقیدہ رہا ہے کہ اتنی بڑی کائنات کو ایک ہی ذات کیسے پیدا کرسکتی ہے؛ اس لئے وہ مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کو الگ الگ چیزوں کا خالق قرار دیتے تھے، مجوسی خاص طور پر روشنی اور تاریکی کے لئے دو الگ خالق قرار دیتے تھے، پھر جن جن شخصیتوں کو خالق مانا جاتا تھا، انھیں عبادت کے لائق بھی سمجھا جاتا تھا؛ اس لئے قرآن مجید نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کسی کی شرکت کے بغیر پوری کائنات کے خالق ہیں۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور ان ہی کے ذریعہ انسانی نسل کا سلسلہ شروع ہوا، اس طرح بالواسطہ تمام انسان گویا مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، نیز خود انسان کے وجود میں مٹی اور مٹی کے آغوش میں پلنے والی چیزیں —— لوہا، پتھر، چونا وغیرہ —— کے اجزاء موجود ہیں، اس پہلو سے بھی انسان کی تخلیق میں مٹی شامل ہے۔

﴿۳﴾ یہاں تک کہ اس کائنات کے لئے بھی ایک مدت مقرر ہے، جب وہ مدت پوری ہوگی تو قیامت آجائے گی۔

﴿۴﴾ بعض مشرک قومیں زمین ہی میں مختلف دیویوں اور دیوتاؤں یہاں تک کہ درختوں، پتھروں، دریاؤں اور پہاڑوں نیز اپنے ہاتھوں کی تراشی ہوئی مورتیوں کو خدا مانتی رہی ہیں، اور بعض قوموں کا عقیدہ ہے کہ خدا کے شریک آسمان میں ہیں، جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس کو خدائی میں شریک سمجھتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ یہ دونوں آسمان میں اپنے باپ (خدا) کے ساتھ ہیں، قرآن مجید نے دونوں طرح کے معبودانِ باطل کی تردید کی کہ نہ آسمان میں کوئی اور خدا ہے اور نہ زمین میں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝۵ اَلَمْ
يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا
السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ
وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۝۶ وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ
بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۷ وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ
وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ۝۸ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا
وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ۝۹

چنانچہ حق ان کے پاس آچکا ہے، اس کے باوجود انھوں نے اسے جھٹلا دیا ہے، تو عنقریب جس بات کا وہ مذاق اُڑا رہے ہیں، ان کے سامنے اس کی حقیقت آجائے گی ۝۵ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم اُن سے پہلے کتنی نسلوں کو ہلاک کر چکے ہیں، جن کو ہم نے زمین میں تم سے بھی بڑھ کر طاقت دی تھی؟ اور وہ اس طرح کہ ہم نے ان پر مسلسل بارش برسائی اور ان کے نیچے سے نہروں کو بہایا، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ایک دوسری قوم کو پیدا فرما دیا، ﴿۱﴾ ۝۶ اور اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی تحریر بھی اُتار دیں اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو لیں، تب بھی کفر کرنے والے کہیں گے: یہ کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں ۝۷ اور وہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) پر فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ حالاں کہ اگر ہم فرشتہ اُتارتے تو قصہ ہی ختم ہو جاتا، پھر انھیں مہلت نہیں دی جاتی ۝۸ اور اگر ہم فرشتہ کو پیغمبر بناتے تو اس کو بھی انسانی شکل ہی میں بناتے اور جو شبہہ وہ اب کر رہے ہیں، اسی میں ہم ان کو اُس وقت بھی مبتلا کر دیتے۔ ﴿۲﴾ ۝۹

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب کسی قوم کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو پہلے اسے تمدنی اور معاشی ترقی میں اپنے عہد کی ترقی یافتہ قوم بنا دیا جاتا ہے اور وہ بظاہر مادی ترقی میں اوجِ کمال پر پہنچ جاتی ہے؛ لیکن جب اللہ کی ان نعمتوں کو دیکھ کر اس میں جذبۂ شکر پیدا نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ تکبر اور احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس گروہ کا نام و نشان مٹا دیتے ہیں اور کسی دوسرے گروہ کو دنیاوی سربلندی سے نوازتے ہیں، قرآن کریم جس سرزمین میں نازل ہوا، اس سے بالکل قریب قوم عاد اور قوم ثمود کے آثار موجود تھے، جو اپنے اپنے زمانہ میں ان کی ترقی کے گواہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اہل مکہ کو متنبہ کیا کہ وہ حق کو قبول نہ کرنے اور اللہ کے احکام کے مقابلہ سرکشی اختیار کرنے میں ایسے لوگوں کی پیروی نہ کریں اور ان کے نتائج کو سامنے رکھیں۔

﴿۲﴾ بعض اہل مکہ رسول اللہ ﷺ سے مخصوص قسم کے معجزات طلب کرتے تھے، جیسے یہ کہ کوئی فرشتہ ان کے سامنے کیوں نہ ←

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ قُلْ ع
لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے، پھر مذاق اُڑانے والوں کو اسی عذاب نے آگھیرا، جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ﴿۱﴾ ﴿۱۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۲﴾ ﴿۱۱﴾ آپ پوچھئے کہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں کس کی ہیں؟ پھر بتادیجئے کہ یہ سب اللہ ہی کی ہیں، جس نے اپنے اوپر مہربان ہونے کو لازم کرلیا ہے، ﴿۳﴾ وہ تمہیں ضرور قیامت کے دن اکٹھا کریں گے، جس (کے واقع ہونے) میں کوئی شک نہیں ہے، جن لوگوں نے اپنے لئے نقصان اُٹھانا ہی طے کرلیا ہے، وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ﴿۱۲﴾

← اُتارا گیا، (مفاتیح الغیب: ۲/۶ ۲۳) اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے کہ اصل مسئلہ معجزات کا نہیں قبول حق کے مزاج کا ہے، اہل مکہ نے طے کر رکھا ہے کہ وہ دین حق کو قبول نہیں کریں گے اور جب انسان کسی بات پر بضد ہوتا ہے تو کوئی دلیل اس کو مطمئن نہیں کرپاتی، اگر آسمان سے لکھی ہوئی کوئی تحریر اُتاردی جائے تب بھی شیطان انھیں بہکا سکتا ہے کہ یہ تو جادوگری ہے، اسی طرح اگر فرشتہ اُتاردیا جائے تو وہ بھی انسانی شکل ہی میں ہوگا؛ کیوں کہ وہ فرشتہ کو اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتے اور جب وہ انسانی شکل میں انھیں دیکھیں گے تو جو اعتراض اب کررہے ہیں، وہی اس وقت بھی کریں گے — دوسرے اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ اس اُمت پر اجتماعی عذاب نازل نہ ہو اور پوری قوم تباہ وبرباد نہ کردی جائے، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کسی قوم کا مطلوبہ معجزہ اللہ کی طرف سے ظاہر کردیا جاتا ہے اور پھر وہ حق کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹادی جاتی ہے، اب اگر اہل مکہ کو ان کا مطلوبہ معجزہ دے دیا جاتا اور پھر وہ ایمان نہ لاتے تو ان کا وہی حشر ہوتا، جو پچھلی سرکش قوموں کا ہوا ہے؛ حالاں کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ یہ اُمت ایسے عذاب سے دوچار نہ ہو اور اس کے ذریعہ پوری کائنات میں دین حق کی خدمت انجام پائے۔

﴿۱﴾ اس میں رسول اللہ ﷺ کی دلداری فرمائی گئی ہے کہ دشمنانِ حق کے مذاق اُڑانے اور برا بھلا کہنے کی وجہ سے آپ رنجیدہ نہ ہوں کہ گذشتہ پیغمبروں کے ساتھ بھی ان کی قوموں نے ایسی ہی بدسلوکی کی ہے، بعض روایتوں میں ہے کہ ایک موقع پر ابوجہل، اُمیَّہ بن خَلَف اور وَلید بن مُغیرہ نے آپ کے ساتھ استہزاء کیا، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، (روح المعانی: ۱۴۷/۵) گویا اس میں داعیانِ حق کے لئے پیغام ہے کہ دعوتِ دین کی راہ ایسی نہیں، جس میں پھولوں کی سیج بچھائی جائے اور لوگ خوش آمدید کہیں؛ بلکہ اس راہ کے مسافر کو اپنے آپ کو تکلیف دہ باتوں کے سننے اور اہانت آمیز سلوک کو برداشت کرنے کے لئے تیار رکھنا چاہئے۔

﴿۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بھی جائز مقصد کے لئے سفر کرنا جائز ہے، خواہ روزگار کے لئے ہو یا تفریح کے لئے؛ البتہ دینی مقاصد کے لئے سفر کرنے کی خصوصی فضیلت ہے، یہ سفر بعض حالات میں واجب ہے اور بعض حالات میں مستحب، دین کا علم ←

وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ
يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

دن و رات کی آغوش میں جو چیزیں بھی ہیں، سب اللہ ہی کی ہیں اور اللہ خوب سنتے اور جانتے ہیں، ﴿۱۳﴾ آپ فرمادیں: اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، جو کھلاتا ہے اور کھلایا نہیں جاتا، کیا اس کے سوا کسی اور کو میں دوست بنالوں؟ آپ کہہ دیں: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کی فرمانبرداری میں پیش پیش رہوں اور یہ کہ تو ہرگز شرک کرنے والوں میں نہ ہوجا ﴿۱۴﴾ آپ کہہ دیں: اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے بھی قیامت کے دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے، ﴿۱۵﴾ جو اس دن عذاب سے بچا دیا جائے، وہی دراصل رحمتِ خداوندی سے مالا مال ہوا اور یہی کھلی ہوئی کامیابی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۱۶﴾ اگر اللہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہیں، تو اس کے سوا کوئی اور اسے دور نہیں کرسکتا اور اگر نفع پہنچانا چاہیں تو ہر چیز اس کی قدرت میں ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۷﴾

← حاصل کرنا، دین کی دعوت دینا، احکامِ شریعت کی تحقیق کرنا، عبرت وموعظت کے لئے کسی خاص جگہ پر جانا یہ سب دینی مقاصد میں شامل ہے۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہیں، اللہ پر کوئی بات واجب نہیں، اسی اختیار کا ایک پہلو یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اپنے لئے کوئی سنت اور طریقہ مقرر فرمالیں؛ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے طے کرلیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر مہربانی کریں گے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کرنے کے بعد خود اپنے وعدہ کی ایک تحریر لکھی کہ میری رحمت میرے غضب سے بڑھ کر ہوگی، ''إن رحمتی تغلب علی غضبی'' اور اسے اپنے عرش کے نیچے رکھ لیا، (بخاری، کتاب بدأالخلق، حدیث نمبر: ۳۱۹۴) —— اس رحمت کا انسان دن رات مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ خدا کا منکر، نافرمان اور احکامِ الٰہی کا مذاق اُڑانے والا بھی خدا کی نعمتوں سے لمحہ لمحہ نفع اُٹھا رہا ہے۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں تو بے شمار ہیں؛ لیکن سب سے بڑی رحمت اور سب سے نمایاں کامیابی یہ ہے کہ انسان آخرت کے عذاب سے بچ جائے اور جنت میں داخل کردیا جائے؛ کیوں کہ دنیا کی نعمتیں بھی عارضی ہیں اور مصیبتیں بھی؛ لیکن آخرت کی نعمتیں اور مصیبتیں کبھی نہ ختم ہونے والی ہیں۔

﴿۲﴾ یہاں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے فرمایا گیا ہے کہ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے اس کے عذاب کا ڈر ہے، پھر خود رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ اللہ آپ کو کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو کوئی اسے دور نہیں کرسکتا، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ←

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۱۸ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ
شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ
لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۱۹ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ
خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۰ ع ۲ ۸

وہ اپنے بندوں پر غالب بھی ہیں اور بے حد حکمت والے اور نہایت باخبر بھی ۝۱۸ آپ کہہ دیں: سب سے بڑھ کر کس کی گواہی ہے؟ آپ کہہ دیں: اللہ کی! جو میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہیں، مجھ پر یہ قرآن اُتارا گیا ہے؛ تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو قرآن پہنچے، ان سب کو ڈراؤں، ﴿۱﴾ کیا تم لوگ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں؟ آپ کہہ دیں: میں (تو اس کی) گواہی نہیں دے سکتا، آپ کہہ دیں: وہی ایک معبود ہے اور میں تو تمہارے شرک کرنے سے بیزار ہوں، ﴿۲﴾ ۝۱۹ ہم نے جنھیں کتاب دی تھی، وہ اُن (محمد رسول اللہ ﷺ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے اپنی اولاد کو، (پھر بھی) جن لوگوں نے اپنے لئے نقصان ہی میں رہنا طے کرلیا ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ﴿۳﴾ ۝۲۰

← اگرچہ رسول اللہ ﷺ تمام مخلوقات میں افضل اور اللہ کے سب سے زیادہ محبوب بندہ ہیں، پھر بھی نفع اور نقصان پہنچانا یا نقصان کو دور کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے؛ یہاں تک کہ آپ اپنے آپ سے بھی کسی نقصان کو دور نہیں کرسکتے۔

﴿۱﴾ یعنی قرآن مجید نہ صرف ان لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے جو نزولِ قرآن کے زمانہ میں موجود تھے؛ بلکہ بعد میں آنے والوں کے لئے بھی یہی کتاب ہادی و رہنما ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد رسول اللہ ﷺ پر سلسلہ نبوت کے ختم ہوجانے کی واضح دلیل ہے، کہ چوں کہ آپ کی نبوت اور آپ پر اُترنے والی کتاب قیامت تک آنے والوں کے لئے ہے؛ اس لئے نہ آپ کے بعد کسی نبی کی ضرورت ہے اور نہ قرآن مجید کے بعد کسی اور الہامی کتاب کی۔

﴿۲﴾ بعض اہل علم نے اس آیت سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کو توحید و رسالت کا اقرار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا چاہئے کہ میں اسلام کے سوا تمام دیگر مذاہب سے بری ہوتا ہوں اور اس سے بیزاری و بے تعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔
(أحكام القرآن للجصاص، نیز دیکھئے: مفاتيح الغيب: ۶/۲۵۴)

﴿۳﴾ یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چوں کہ آخری نبی تھے اور قیامت تک انسانیت کو آپ ہی کی نبوت کے سایہ میں رہنا ہے؛ اس لئے گذشتہ مذاہب کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی علامتوں کو بڑی ہی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، بائبل میں حالاں کہ مسلسل تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں، اس کے باوجود اب بھی نبوت محمدی سے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود ہیں، مختلف علماء ←

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ يَوْمَ
نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾
ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى
اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہو اور اس کی آیتوں کو جھٹلا دیا ہو؟ بے شک ظلم کرنے والے کامیاب نہیں ہوں گے ﴿۲۱﴾ اور وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے جس دن ہم سبھوں کو جمع کریں گے، پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے: تمہارے وہ شریک کہاں ہیں، جنھیں تم عبادت کے لائق باور کیا کرتے تھے؟ ﴿۲۲﴾ پھر ان کا فریب یہ ہوگا کہ وہ کہیں گے: خدا کی قسم! — جو ہمارا پروردگار ہے — ہم تو شرک نہیں کرتے تھے ﴿۲۳﴾ ذرا دیکھو تو سہی، کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے؟ ﴿۱﴾ اور جن کے خدا ہونے کی جھوٹی بات وہ کہا کرتے تھے، وہ سب (اُس وقت) ان سے غائب ہو چکے ہوں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾

← اور خاص کر مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ نے 'اظہار الحق' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، (دیکھئے: ترجمۂ اظہار الحق: ۲۳۱/۳) چنانچہ عہدِ نبوی میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور مختلف اہل کتاب علماء ان ہی علامتوں کو دیکھ کر ایمان لائے، یہودی اور عیسائی مذہبی مآخذ کے علاوہ ہندوؤں کے یہاں بھی جو کتابیں مستند مانی گئی ہیں، وَیدیں اور پُران، حیرت انگیز طور پر ان میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح بشارتیں موجود ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن اکبر اعظمی کی ''گیتا اور قرآن'' نیز مولانا شمس نوید عثمانی کی ''اگر اب بھی نہ جاگے تو'' وغیرہ)

﴿۱﴾ میدان حشر میں جب سارے لوگ جمع کردیئے جائیں گے، تو ایک طویل وقت ایسا گذرے گا، جب منظر کی ہولناکی اور گھبراہٹ ان کی بے قراری کو بڑھاتی جائے گی؛ یہاں تک کہ انسان کہنے لگے گا کہ حساب وکتاب ہی ہوجائے؛ تاکہ اس ہولناکی سے باہر نکلا جاسکے، آخر سوال وجواب شروع ہوگا، پہلے مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو زبان سے بولنے کی اجازت دی جائے گی اور کفار ومشرکین اس موقع کو بھی ضائع نہ ہونے دیں گے اور جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو شرک کرتے ہی نہیں تھے، آیت میں اسی مرحلہ کا ذکر ہے، پھر ان کی زبان بند کردی جائے گی اور اعضاء وجوارح خود ان کے خلاف گواہی دینے لگیں گے؛ جیسا کہ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ہم ان کے منھ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ بولنے لگیں گے اور پاؤں گواہیاں دیں گے کہ وہ کیا عمل کر رہے تھے، (یٰسین: ۶۵) اب ان کے لئے جھوٹ بولنا ممکن نہیں رہے گا۔ (الانعام: ۳۳)

﴿۲﴾ یعنی جن معبودانِ باطل کے وہ قائل تھے، ان سے انھیں کوئی مدد نہیں ملے گی؛ اگرچہ کہ اہل مکہ دوبارہ زندہ کئے جانے اور قیامت قائم ہونے کے قائل نہ تھے؛ لیکن انھیں اس کا یقین تھا کہ جب انھیں کوئی مصیبت آئے گی تو یہی معبوداُن کے کام آئیں گے؛ لیکن جب یہ سب سے بڑی مصیبت آئے گی تو اُن کا کوئی اتہ پتہ نہ ہوگا۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۞۲۵ وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۞۲۶ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞۲۷ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۞۲۸

ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی بات کان لگا کر سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں بوجھ بھر دیا ہے، اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہ لائیں؛ ﴿۱﴾ یہاں تک کہ جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑے کرتے ہیں، یہ کفر کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ (قرآن مجید) تو محض پہلے لوگوں کے افسانے ہیں ۞۲۵ اور یہ لوگ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں، خود بھی دور بھاگے جاتے ہیں، ﴿۲﴾ اور یہ اپنے آپ ہی کو برباد کر رہے ہیں؛ اگرچہ ان کو اس کا احساس نہیں ہے ۞۲۶ اور وہ منظر بھی آپ کے دیکھنے کے لائق ہوگا، جب یہ دوزخ کے قریب کھڑے کئے جائیں گے، تو کہیں گے: کاش! ہمیں (دنیا میں) واپس لوٹا دیا جائے، تو ہم اپنے پروردگار کے احکام کو نہ جھٹلائیں اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جائیں! ۞۲۷ (مگر حقیقت یہ ہے کہ) وہ اِس سے پہلے جو کچھ چھپایا کرتے تھے، وُہی اُن کے سامنے کھل کر آ گیا ہے اور اگر وہ لوٹا دیئے جائیں تو پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا ہے اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔ ﴿۳﴾ ۞۲۸

﴿۱﴾ عبرت حاصل کرنے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ انسان کے اندر سننے اور سمجھنے کی صلاحیت ہو؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قبول کرنے کا جذبہ ہو، ورنہ فہم و شعور کا ہونا نہ ہونا برابر ہے اور آنکھوں اور کانوں میں دیکھنے اور سننے کی صلاحیتوں کا پایا جانا نہ پائے جانے کے درجہ میں ہے، قرآن مجید کہتا ہے کہ اہل مکہ کا یہی حال ہے کہ بظاہر احساس و ادراک کی صلاحیتیں ان میں موجود ہیں؛ لیکن حق کی دریافت کے جذبہ اور اس کو قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی یہ قرآن سے خود بھی بھاگتے ہیں اور دوسروں کو بھی دور کرتے ہیں، بعض اہل علم نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ دوسروں کو تو رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے سے روکتے ہیں؛ لیکن خود بھی دعوت حق قبول نہیں کرتے، یہ تشریح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کا بیان ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو قریش کو تو رسول اللہ ﷺ کی ایذاء رسانی سے روکتے تھے؛ لیکن خود ایمان نہ لاتے تھے، (مفاتیح الغیب: ۶/ ۲۶۸) —— اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و اتباع کے بغیر محبت کافی نہیں اور نہ اس سے آخرت کی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ کے احکام کو قبول نہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ ان سے بے خبر رکھے گئے تھے؛ بلکہ وہ جانتے بوجھتے جن سچائیوں کو ←

وَ قَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَ لَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ
قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع ۱۰ ۳ ۹
قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا
عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَ هُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ مَا
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو صرف دنیوی زندگی ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہیں کئے جائیں گے ﴿۲۹﴾ وہ منظر آپ کے لئے قابل دید ہوگا جب یہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے، پروردگار فرمائیں گے: کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ جواب دیں گے: کیوں نہیں؟ ہمارے پروردگار کی قسم! اللہ فرمائیں گے: تو اب اپنے کفر و انکار کا مزا چکھتے رہو ﴿۳۰﴾ جن لوگوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا ہے، وہ درحقیقت اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، جب اچانک ان کے سامنے قیامت آجائے گی تو کہیں گے: ہائے افسوس! ہماری کوتاہیوں پر، وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پشت پر اُٹھائے رہیں گے، آگاہ ہوجاؤ، کیا ہی برا بوجھ ہوگا، جسے وہ اُٹھائیں گے!﴿۱﴾ ﴿۳۱﴾ دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے اور یقیناً اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے آخرت ہی بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟﴿۲﴾ ﴿۳۲﴾

← چھپائے ہوئے تھے، اب وہ کھل کر سامنے آگئی ہے، تو بہانہ کر رہے ہیں کہ اگر اب لوٹا دیا جائے تو ہم اللہ کے احکام مانیں گے: چوں کہ ان کی یہ نافرمانی جان بوجھ کر اور سرکشی و انکار کی وجہ سے تھی؛ اس لئے اگر بالفرض وہ دنیا میں دوبارہ بھیج دیئے جائیں، تب بھی وہی کچھ کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔

﴿۱﴾ ان آیتوں اور ان سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں قیامت اور آخرت کا بار بار ذکر آیا ہے؛ کیوں کہ انسان کو آخرت کی فکر ہی ایمان اور عمل صالح پر لاتی ہے، جس شخص یا گروہ کو آخرت کی فکر نہ ہو، اسے کوئی چیز دنیا کے عیش و عشرت کے نقشہ میں خدا کی یاد نہیں دلا سکتی اور اِن راحتوں کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔

﴿۲﴾ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کی نظر میں دنیا ہی سب کچھ ہے؛ اس لئے کہا گیا کہ اہل ایمان کی اصل منزل آخرت ہے، جو ہمیشہ ہمیش کے لئے ہے، دنیا تو چند روزہ ہے، جیسے دنیا میں انسان کے اصل کام تو دوسرے ہوتے ہیں؛ لیکن کچھ وقت تفریح اور کھیل کود میں بھی گذار لیتا ہے، اسے مقصد نہیں بناتا، یہی مثال آخرت کے مقابلے دنیا کی ہے، اس آیت میں ایک طرف پوری انسانیت کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ دنیا ہی کو اپنا مقصود و مطلوب نہ بنالیں اور دوسری طرف مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ اگر دشمنانِ حق کو دنیا میں کچھ سربلندی و طاقت حاصل ہوجائے تو وہ اس سے متاثر نہ ہوں، کہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَیَحْزُنُكَ الَّذِیْ یَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ
اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰی مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰی
اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَ اِنْ كَانَ
كَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ
فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۵﴾

ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ آپ کے لئے رنج کا باعث ہے، تو وہ لوگ صرف آپ ہی کو نہیں جھٹلا رہے ہیں ؛ بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا بھی انکار کر رہے ہیں ﴿۳۳﴾ اور آپ سے پہلے کے رسولوں کو بھی جھٹلایا جا چکا ہے، انھوں نے جھٹلائے جانے اور تکلیف دیئے جانے پر صبر کیا ؛ یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد آپہنچی ، اللہ کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا اور آپ کو (گذشتہ) رسولوں کے بعض حالات معلوم ہو چکے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۳۴﴾ آپ کو ان کا بے رُخی برتنا گراں گزرتا ہے تو اگر آپ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان کی کوئی سیڑھی تلاش کر سکیں، کہ آپ ان کے پاس کوئی نشانی لے آئیں (تو ایسا کر لیں ،) اگر اللہ کو منظور ہوتا تو ان سبھوں کو ہدایت پر جمع کر دیتے ؛ لہٰذا آپ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے ۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۵﴾

﴿۱﴾ یعنی داعیانِ اسلام کو اپنے مخاطب کی طرف سے پیش آنے والی بے توقیری اور ان کے جھٹلانے کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے ؛ بلکہ مدعو کے مقابلہ میں صبر سے کام لینا چاہیئے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب کوئی حق کی دعوت کو لے کر اُٹھے تو اہل باطل کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے ، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نہ صرف عام لوگوں کے حق میں ہے ؛ بلکہ اس کے سب سے محبوب اور برگزیدہ بندوں ، پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ہے ۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو اگر یہ بات منظور ہوتی کہ تمام انسان ہدایت پا جائیں تو کوئی ایمان سے محروم نہ رہتا ، جیسا کہ ہر انسان کو دو آنکھیں اور دو کان دیئے گئے ہیں ، اسی طرح اللہ ہر انسان کو ایمان سے نواز دیتے ، مگر اللہ کا مقصود ہی انسان کا امتحان لینا اور کچھ لوگوں کا اس امتحان میں کامیاب ہونا اور کچھ کا ناکام ہونا ہے ؛ اس لئے آپ ان کی روگردانی اور سرکشی سے بے قرار نہ ہوں اور معجزات کے سلسلے میں ان کی خواہش کے پوری کئے جانے کی فکر نہ کریں —— اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس بات کو بھی واضح کرتا ہے کہ معجزات اور دنیا میں ہونے والے تصرفات کے سلسلے میں پیغمبر بھی خدا کے سامنے ویسا ہی بے بس ہوتا ہے ، جیسے عام انسان ، وہ خدا کے تصرف اور اختیار میں ذرا بھی شریک نہیں ہوتا —— اس آیت میں آپ سے فرمایا گیا ہے کہ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے ، یہ لفظ آپ کی تحقیر کے لئے نہیں ہے ؛ بلکہ اظہارِ شفقت و محبت کے طور پر ہے ، جیسے ایک باپ اپنے بیٹے یا استاذ اپنے محبوب شاگرد کو کہتا ہے کہ وہ ناسمجھی سے کام نہ لے ۔

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰی یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْ
لَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا
یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا
فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ
وَّبُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۹﴾

جولوگ سنتے ہیں، وہی قبول کرتے ہیں اور مُردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ فرمائیں گے، پھر اللہ ہی کی طرف وہ سب لائے جائیں گے ﴿۱﴾ ﴿۳۶﴾ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (محمد ﷺ) پر ان کے پروردگار کی جانب سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ آپ کہہ دیں: بے شک اللہ معجزہ اُتارنے پر قادر ہیں؛ لیکن ان میں سے اکثر لوگ (اس کے انجام سے) واقف نہیں ہیں ﴿۲﴾ ﴿۳۷﴾ زمین میں چلنے والے تمام چوپائے اور اپنے بازوؤں کی مدد سے اُڑنے والے تمام پرندے تمہاری ہی طرح کے گروہ ہیں، ہم نے ''لوحِ محفوظ'' میں کوئی چیز چھوڑی نہیں ہے، یہ سب اپنے رب کی طرف ہی جمع کئے جائیں گے ﴿۳﴾ ﴿۳۸﴾ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ہے، وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، (اور) طرح طرح کے اندھیروں میں (بھٹک رہے) ہیں، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت سے محروم رکھتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں، سیدھے راستہ پر ڈال دیتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۳۹﴾

﴿۱﴾ یعنی جولوگ نصیحت کے جذبہ کے ساتھ سنتے ہیں، ان ہی کو اللہ تعالیٰ ہدایت کو قبول کرنے کی توفیق بھی دیتے ہیں اور جولوگ اس کو قبول کئے بغیر مر جائیں تو پھر آئندہ زندگی میں انھیں اپنے اعمال کا حساب دینا ہی ہے، ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی ان شرارتوں کے باوجود خدا کی پکڑ سے بچ جائیں گے۔

﴿۲﴾ 'انجام' سے واقف نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ معجزات کے آنے کے باوجود ایمان نہ لانے کا انجام اجتماعی ہلاکت ہے۔

﴿۳﴾ یعنی جانور اور پرندے وغیرہ جو غیر مکلف ہیں، وہ بھی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں جمع کئے جائیں گے اور ان کے ساتھ بھی ان کی شان کے لحاظ سے جزاء وسزا کا معاملہ ہوگا؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن جانور اور پرندے جمع کئے جائیں گے اور انھیں ایک دوسرے سے بدلہ لینے کا موقع دیا جائے گا؛ یہاں تک کہ بغیر سینگ والی بکری سینگ والی بکری سے بدلہ لے گی، اس کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ تم مٹی ہو جاؤ اور یہ سب کے سب مٹی بن جائیں گے، اس وقت اہل کفر کہیں گے: کاش! میں بھی مٹی ہو جاتا ''یا لیتنی کنت ترابا'' (مستدرک حاکم: ۳۱۶/۲، وصحه علی شرح مسلم) تو جب غیر مکلف مخلوق سے جزا اور سزا کا معاملہ ہوگا تو انسان کیسے جزاء وسزا سے بچ سکتا ہے؟

﴿۴﴾ یعنی ایمان نہ لانے والے اور حق کو جھٹلانے والے بہروں اور گونگوں کی طرح ہیں؛ کیوں کہ وہ حق بات کو سننے اور سچی بات کہنے سے قاصر ہیں اور اصل روشنی ہدایت کی روشنی ہے، وہ اس روشنی سے محروم اور گمراہی کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ ع ۱۱/۱۰
يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْ لَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط
حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

آپ کہہ دیں تمہارا کیا خیال ہے اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت آجائے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم سچے ہو؟ ﴿۴۰﴾ بلکہ تم اسی خدا کو پکارو گے، پھر اگر اللہ چاہیں تو جس مصیبت کے سلسلہ میں تم دُعاء کر رہے ہو، اسے دور فرمادیں اور جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان کو (اس وقت) بھول جاؤ گے ﴿۱﴾ ﴿۴۱﴾ آپ سے پہلے بھی مختلف اُمتوں کی طرف ہم نے رسول بھیجے تو ہم نے ان کو تنگی اور تکلیف میں مبتلا کیا؛ تاکہ ان میں عاجزی پیدا ہو ﴿۴۲﴾ جب ان پر ہماری پکڑ آئی تو انھوں نے کیوں نہ عاجزی اختیار کی؟ بلکہ ان کے دل تو (اور) سخت ہوگئے اور شیطان اُن کو ان کے برے اعمال خوشنما کر کے دیکھاتا رہا ﴿۴۳﴾ پھر جن باتوں کی انھیں نصیحت کی گئی تھی، جب انھوں نے اسے بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے؛ یہاں تک کہ جب وہ ہماری دی ہوئی نعمتوں میں مست ہوگئے، تو ہم نے انھیں اچانک ہی پکڑ لیا، تب اس وقت وہ نااُمید ہوکر رہ گئے ﴿۴۴﴾ چنانچہ ان ظالموں کی جڑ تک کاٹ دی گئی اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۴۵﴾

﴿۱﴾ انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ خوشی کے وقت اور عام حالات میں خدا کو فراموش کر دیتا ہے؛ لیکن جب کوئی مصیبت کا وقت آتا ہے تو پھر خدا کو یاد کرتا ہے اور اس سے دُعاء اور التجا کرتا ہے، ایمان سے محروم لوگوں کی تو یہ کیفیت ہے ہی، یہاں تک کہ کئی ایسے لوگ جو خدا کا انکار کرتے تھے اور آخرت کا مذاق اُڑاتے تھے، دیکھا گیا کہ اخیر عمر میں تسبیح و مصلیٰ کی طرف ان کا ضمیر متوجہ ہوا، خود مسلمانوں کا بھی یہ حال ہے کہ اپنی زندگی میں خوشی و مسرت کے لمحات کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق گذارتے ہیں اور جب کسی مصیبت کا وقت آتا ہے تو اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب آنے سے پہلے انھیں دو طرح کی حالتوں سے دوچار کیا جاتا ہے، تکلیف اور تنگی و عسرت سے؛ تاکہ ان میں جھکاؤ پیدا ہو اور وہ خدا کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں، اور راحت و آسائش کا دروازہ کھول کر؛ تاکہ ان میں شکر کا جذبہ پیدا ہو اور شاید اس طرح وہ اپنے مالک کی طرف متوجہ ہوں؛ لیکن جب یہ دونوں تدبیریں کسی قوم کے ضمیر کو بیدار کرنے اور انھیں راہ راست پر لانے میں ناکام ہوجاتی ہیں تو اب ان پر اللہ کا عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے اور اس وقت حسرت و افسوس کے سوا کوئی اور چیز ان کے پاس باقی نہیں رہتی۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ
یَاْتِیْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ هُمْ یَصْدِفُوْنَ ۝۴۶ قُلْ اَرَءَیْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ
عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۷ وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا
مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۴۸
وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۝۴۹ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ
عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ؕ
قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰ ع ۵ ۱۱

آپ کہئے: تمہارا کیا خیال ہے، اگر اللہ تمہارے کانوں اور آنکھوں کو لے لیں اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دیں تو اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے، جو تم کو یہ واپس لوٹا دے؟ آپ دیکھئے کہ ہم کس کس طرح اپنی نشانیوں کو بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ بے رُخی ہی برتتے ہیں ۝۴۶ آپ کہہ دیں تمہارا کیا خیال ہے اگر اللہ کا عذاب تمہارے پاس اچانک یا علانیہ آجائے تو کیا ظلم کرنے والوں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا؟ ﴿۱﴾ ۝۴۷ ہم تو رسولوں کو صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ (ایمان لانے والوں کو) خوشخبری دیں اور (ایمان نہ لانے والوں کو) ڈرائیں، پھر جو ایمان لے آئیں اور اپنے آپ کو سنوار لیں، ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝۴۸ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے، اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے وہ عذاب سے دوچار ہو کر رہیں گے ۝۴۹ آپ کہہ دیں: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے فرشتہ ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں، ﴿۲﴾ میں تو صرف ان احکام کی پیروی کرتا ہوں، جو میری طرف اُتارے جاتے ہیں، ﴿۳﴾ آپ کہہ دیں: کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتا ہے؟ کیا تم غور وفکر نہیں کرتے؟؟ ۝۵۰

﴿۱﴾ یعنی تمہاری نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے تو کوئی طاقت تم کو اس سے بچا نہیں سکتی، اور عذاب بھی صرف تم پر آئے گا، جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ اس عذاب سے بچا لئے جائیں گے، اس میں سزا کی شدت کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ اگر کسی تکلیف میں بہت سے لوگ مبتلا ہوں تو مشقت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور کچھ لوگ تنہا کسی مصیبت سے دوچار ہوں اور دوسرے لوگ اس تکلیف سے آزاد ہوں تو اپنی تکلیف کا احساس بڑھ جاتا ہے اور جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ انسان ایک نفسیاتی کرب میں بھی مبتلا رہتا ہے۔

﴿۲﴾ اہل مکہ کا حال یہ تھا کہ وہ دعوتِ حق سے انکار کے لئے مختلف بہانے تراشا کرتے تھے اور طرح طرح کے مطالبے آپ کے سامنے رکھتے تھے، کبھی کہتے کہ اگر آپ واقعی نبی ہیں تو مال و دولت کے خزانے ہم پر کھول دیجئے اور ہمارے لئے پہاڑوں کو سونا بنا دیجئے، کبھی کہتے کہ اگر آپ واقعی نبی ہیں تو آئندہ کیا باتیں پیش آنے والی ہیں؟ ہمیں بتائیے، اور کبھی اعتراض کرتے کہ آپ تو ایک عام ←

← انسان کی طرح کھاتے پیتے ہیں، بازار میں چلتے ہیں، شادی بیاہ کرتے ہیں، آپ کیسے رسول ہو سکتے ہیں؟ قرآن مجید نے ان آیات میں اِن ہی بے جا سوالات کا جواب دیا ہے؛ چنانچہ پہلے اُصولی بات فرمائی گئی کہ رسول کا کام صرف اللہ کی فرمانبرداری پر بشارت دینا اور نافرمانی پر ڈرانا ہے نہ کہ لوگوں کی مادی خواہشات وضروریات کو پوری کرنا؛ اس لئے یہ مطالبات بے محل اور بے موقع ہیں، پھر ان کے ایک ایک مطالبہ کی وضاحت کی گئی اور آپ ﷺ سے کہلایا گیا کہ تم مجھ سے مال ودولت کے خزانے کا مطالبہ کرتے ہو؛ حالاں کہ میں نے کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میرے پاس اللہ کی دولت کے خزانے ہیں، تم مجھ سے آئندہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؛ لیکن میں صاف صاف اعلان کر رہا ہوں کہ مجھے غیب کا علم نہیں ہے، تمہیں میرے کھانے پینے اور انسان سے متعلق ضرورتوں کے انجام دینے پر اعتراض ہے، ان ضرورتوں سے تو اللہ نے اپنے فرشتوں ہی کو کنارہ کش رکھا ہے اور میں نے اپنے فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا؛ اس لئے ان غیر متعلق باتوں میں اُلجھنے کے بجائے تمہیں ہماری اصل دعوت پر — جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے — توجہ کرنی چاہئے، اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ کائنات کے خزانے اللہ نے اپنے کسی رسول کے حوالے نہیں کئے اور اسے مختارِ کل نہیں بنایا کہ وہ لوگوں پر رزق اور خوشحالی وآسانی کے دروازے کھولتا اور بند کرتا رہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے غیب کی بہت سی باتیں رسول اللہ ﷺ کو اور اُمت کی ضرورت کے مطابق آپ کے واسطہ سے اُمت کو بتائی ہیں، جیسے جنت ودوزخ وغیرہ؛ لیکن غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی نہیں، ''لا أعلم الغیب'' کا یہ مطلب بتانا کہ ''نہ یہ کہوں کہ آپ غیب جان لیتا ہوں'' درست نہیں؛ اس لئے کہ قرآن مجید نے ذاتی اور عطائی، اپنے آپ حاصل ہونے والے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہونے والے علم غیب کی کوئی تفصیل نہیں کی ہے؛ بلکہ مطلقاً فرمایا گیا کہ میں غیب کی باتوں کو نہیں جانتا ہوں، یہ بھی معلوم ہوا کہ پیغمبر بھی انسان ہوتے تھے اور انسانی ضرورتیں انھیں بھی پیش آتی تھیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت ورسالت خود اتنا بڑا اعزاز ہے کہ مخلوق کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اعزاز نہیں ہو سکتا — قرآن مجید میں بار بار رسول اللہ ﷺ سے اللہ کی قدرت کے مقابلہ اپنے عجز کا اظہار کرایا گیا ہے؛ تاکہ جیسے گذشتہ اُمتیں پیغمبروں، برگزیدہ شخصیتوں اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں غلو میں مبتلا ہو گئی تھیں، یہ اُمت اس بیماری میں مبتلا نہ ہو اور اپنے آپ کو گمراہی سے بچا کر رکھے؛ مگر افسوس کہ اس اُمت میں بھی ایک گروہ نے انبیاء ورسل اور اولیاء اُمت کے بارے میں وہی مبالغہ آمیز روش اختیار کی، اولیاء کو انبیاء کے درجہ پر پہنچا دیا اور انبیاء کو عملاً خدا کا ہمسر اور شریک ٹھہرا لیا، اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر قول وفعل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وحی کے حکم میں ہے، قرآن مجید — جس کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں — وحی متلو ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور حدیث نبوی — جس کے معانی اللہ کی طرف سے ہیں اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے — وحی غیر مَتلو ہے، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی؛ لیکن وہ بھی حجت ہے، قرآن نے ایک اور موقع پر بھی وضاحت کی ہے کہ آپ کی کوئی بات خواہش پر مبنی نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ وحی الٰہی ہوتی تھی — بعض حضرات نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صرف وحی پر عمل کرتے تھے، قیاس واجتہاد سے کام نہ لیتے تھے؛ لیکن یہ درست نہیں؛ کیوں کہ آپ سے اجتہاد کرنا ثابت ہے اور علماء نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے؛ البتہ عام لوگوں کے اجتہاد اور رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد میں فرق یہ تھا کہ اگر آپ سے اجتہاد میں کوئی لغزش ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر متنبہ فرما دیا جاتا تھا، اگر آپ نے اجتہاد فرمایا اور اللہ کی طرف سے اس پر کوئی تنبیہ نہیں آئی تو یہ من جانب اللہ آپ کے اجتہاد کو درست اور صائب قرار دینا ہے، جو خود وحی کے درجہ میں ہے؛ اس لئے آپ کا قیاس واجتہاد بھی وحی میں شامل ہے اور یہ آیت اس کی نفی نہیں کرتی۔

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ
لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ
مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ
مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

(اے رسول!) اس (کتاب) کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرائیے جو اپنے پروردگار کے سامنے اس حال میں جمع کئے جانے کا ڈر رکھتے ہیں، جس میں نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا، نہ کوئی سفارشی، شاید وہ لوگ نافرمانی سے بچیں ﴿۱﴾ ﴿۵۱﴾ جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی کی خوشنودی چاہتے ہیں، ان کو دور مت کر دیجئے، نہ آپ پر ان کی جوابدہی کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ ان پر آپ کی جوابدہی کی ذمہ داری ہے کہ آپ انھیں دور کر دیں، ورنہ آپ کا شمار ناانصافی کرنے والوں میں ہو جائے گا ﴿۵۲﴾ اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے؛ تاکہ یہ لوگ کہیں کہ کیا ہمارے درمیان یہی لوگ ہیں، جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے شکر گزار بندوں سے خوب واقف نہیں ہیں؟؟ ﴿۲﴾ ﴿۵۳﴾

﴿۱﴾ منکرین کے بے محل سوالات کا جواب دینے کے بعد اب آپ سے فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کو دوبارہ زندہ کئے جانے اور اللہ کے سامنے حاضر ہونے سے سرے سے انکار ہے اور وہ اپنے اس عقیدہ پر تردد کی کیفیت میں نہیں ہیں؛ بلکہ یقین کے درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں، ان کو ڈرانا نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا؛ اس لئے ان لوگوں کو حق کی دعوت دیجئے اور آخرت کی خبر سے آگاہ کیجئے جو دوبارہ زندہ کئے جانے اور اپنے اعمال کے بارے میں جواب دہ ہونے کا خوف رکھتے ہوں۔

اس آیت میں فرمایا گیا کہ آخرت میں انسان کے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا؛ حالاں کہ معتبر احادیث میں رسول اللہ ﷺ اور بعض صالحین کے شفاعت کرنے کا ذکر آیا ہے؛ اس لئے اس آیت کا منشاء یہ ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے کی ہمت نہیں کر سکے گا، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر آیا ہے، جیسے ارشاد ہے کہ اللہ کے پاس اسی کی شفاعت کام آئے گی، جس کو اللہ نے شفاعت کرنے کی اجازت دی ہے ''ولا تنفع الشفاعة عنده إلا لمن أذن له'' (سبا:۲۳) اسی طرح فرمایا گیا: کون ہے جو اللہ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟ ''من ذا الذی یشفع عنده إلا بإذنه''۔(البقرة:۲۵۵)

﴿۲﴾ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت صہیب، حضرت خباب، حضرت بلال اور حضرت عمار رضی اللہ عنہم وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے، یہ سب غلام یا غیر عرب تھے، جنھیں عرب حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اسی وقت اَقْرَع بن حابِسِ تمیمی، عُیَیْنَہ بن حِصْن فَزارِی اور بعض سردارانِ قریش کا گذر ہوا، وہ کہنے لگے: کیا آپ کو اپنی قوم میں سے یہی لوگ بہتر لگتے ہیں؟ کیا ہم ان کے تابع ہو جائیں؟ آپ انھیں اپنے پاس سے ہٹا دیجئے، اگر آپ ایسا کریں تو ممکن ہے کہ ہم لوگ ←

← آپ کی دعوت قبول کرلیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایمان والوں کو نہیں چھوڑ سکتا، تو کہنے لگے: کم سے کم اتنا تو کیجئے کہ جس وقت ہم آئیں، انھیں اُٹھا دیجئے، پھر ہم چلے جائیں تو اگر چاہیں تو بٹھا لیجئے، بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کا ردِعمل دیکھنے کے لئے آپ سے درخواست کی کہ اس کو قبول کرلیں؛ چنانچہ ان کے ایمان لانے کی خواہش میں آپ اس پر راضی ہوگئے، سردارانِ قریش نے کہا کہ اس کو لکھا بھی دیجئے، آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھانے کے لئے طلب فرمایا، اسی وقت قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں، (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۱۷۳/۳، و دیگر کتب تفسیر) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ شب و روز اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور آپ پر ایمان لائے ہیں، اُن کو اِن دشمنانِ حق کے مطالبہ پر چھوڑ دینا ہرگز انصاف کا تقاضا نہیں ہے، اول تو یہ سردارانِ قریش ایمان لانے والے نہیں ہیں، دوسرے: لائیں یا نہ لائیں، آپ پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے؛ اس لئے ایسے سرکش لوگوں کی وجہ سے مخلصین کو نظر انداز کردینا ہرگز مناسب نہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے مصلحت بھی بیان فرمادی کہ سردارانِ قریش کا دنیا میں معزز ہونا اور ایمان لانے والوں کا دنیوی اعتبار سے اس درجہ معزز نہ سمجھا جانا اللہ کی طرف سے ہے؛ تاکہ لوگوں کا امتحان ہو کہ جن کے دل پاک ہوں گے، وہ خاندان، نسب اور دنیا کی دولت کی وجہ سے نہ کسی بات کو قبول کریں گے اور نہ اسے نظر انداز کردیں گے؛ بلکہ یہ دیکھیں گے کہ حق اور سچائی کیا ہے؟ اور جس کے پاس بھی ہو اسے قبول کریں گے، سونا، اگر خوبصورت گلاس کے اندر ہو تب بھی اسے لیا جاتا ہے اور اگر کہیں کیچڑ میں گرا پڑا ہو تب بھی اسے لپک کر حاصل کیا جاتا ہے — ان آیات میں تین نکات قابل ذکر ہیں :

اول: یہ کہ ہر دور میں دشمنانِ حق کی یہ نفسیات رہی ہے کہ ان کی نظر حقائق سے زیادہ مادی ترقی پر ہوتی ہے، وہ ہر بات کو اسی ترازو میں تول کر دیکھتے ہیں اور کسی شخص کا درجہ و مقام اس کے اخلاق و کردار کی وجہ سے نہیں، اس کی دنیوی وجاہت اور مالداری کی بنا پر متعین کرتے ہیں، دوسرا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مختلف مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تنبیہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے اور آپ کی لغزش پر ٹوکا گیا ہے، یہ دراصل قرآن کے محفوظ ہونے اور آپ ﷺ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے، اگر قرآن محفوظ نہ ہوتا تو ایسی آیتیں نکال دی گئی ہوتیں؛ تاکہ قیامت تک کے لئے اللہ کی طرف سے ہونے والی تنبیہ محفوظ نہ ہوجائے اور اگر آپ نبی برحق نہ ہوتے اور آپ نے اپنی طرف سے احکام الٰہی میں کمی بیشی کی ہوتی تو نعوذ باللہ آپ ان آیات کو قرآن مجید سے ہٹا دیتے؛ تاکہ آپ کی ان لغزشوں کا آئندہ تذکرہ نہ ہو، تیسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ کو عتاب آمیز لہجہ میں تنبیہ کی گئی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ اگر کمزور مسلمانوں کو ہٹا دیں گے تو آپ ظلم کرنے والوں میں شمار کئے جائیں گے — ظلم کا لفظ اکثر مقام پر گناہ کے لئے استعمال ہوا ہے، تو بظاہر اس سے آپ ﷺ کے معصوم اور بے گناہ ہونے کے سلسلہ میں شبہ پیدا ہوتا ہے، مگر یہ شبہ صحیح نہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ] کا کمزور مسلمانوں کے تھوڑی دیر کے لئے ہٹ جانے کو قبول کرلینا تحقیر و توہین کے طور پر نہیں تھا؛ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس طرح ان رؤساء کو ایمان کی توفیق میسر آجائے اور ان رؤساء کا دامن ایمان میں آجانا ان کمزور مسلمانوں کے تھوڑی دیر کے لئے ہٹ جانے سے بڑی مصلحت ہے؛ اس لئے یہ اجتہادی چوک تو ہوسکتی ہے، جس کا صدور انبیاء سے بھی ممکن ہے، ایسا عمل نہیں جو گناہ کے دائرہ میں آتا ہو، رہ گیا ظلم کا لفظ، تو ظلم کے اصل معنی بے محل کام کرنے کے ہیں، گناہ کو بھی اسی لئے 'ظلم' کہا جاتا ہے کہ جو کام قابل اجتناب ہے، انسان اس کا ارتکاب کرتا ہے، تو مخلصین کو قریب رکھنا اور منکرین کو دور رکھنا موقع و محل کی رعایت ہے، منکرین حق کو قریب کرنا اور اور مخلصین کو ہٹا دینا موقع و محل کے خلاف کام ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ کی اس لغزش کو 'ظلم' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہاں ظلم 'بے محل کام' کے معنی میں ہے، نہ کہ گناہ کے معنی میں؛ اس لئے یہ آپ ﷺ کے معصوم ہونے کے مغائر نہیں ہے۔

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ
اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۴﴾
وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَ لِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۵۵﴾ۧ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ ع ۶/۱۲
تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾
قُلْ اِنِّیْ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ
یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾

اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، تو کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو، ﴿۱﴾ تمہارے پروردگار نے اپنے مہربان ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے، ﴿۲﴾ تم میں سے جو شخص ناواقفیت کی وجہ سے کوئی برا کام کر گزرے، پھر توبہ کرلے اور نیک بن جائے تو یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ﴿۳﴾ ﴿۵۴﴾ اسی طرح ہم دلائل کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں؛ تاکہ مجرموں کا طریقہ اچھی طرح واضح ہوجائے ﴿۵۵﴾ آپ کہہ دیں کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو، مجھے ان کی عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہے، آپ کہہ دیں کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کرسکتا، اگر ایسا کروں تو میں راہ راست سے ہٹ جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں باقی نہیں رہوں گا ﴿۵۶﴾ آپ کہہ دیں: میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں، جس کو تم لوگ جھٹلارہے ہو، جس چیز کی تم جلد بازی کررہے ہو، وہ (یعنی عذابِ الٰہی) میرے پاس نہیں ہے، اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چل سکتا، اللہ ہی حق کو بیان کرتے ہیں اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔ ﴿۵۷﴾

﴿۱﴾ یعنی جو مخلص مسلمان ہیں، ان کے ساتھ صرف یہی سلوک کافی نہیں کہ ان کو مجلس سے ہٹایا نہ جائے؛ بلکہ ان کو سلامتی کی دُعاء بھی دی جائے، جس کی ایک شکل مسنون طریقہ پر سلام کرنا ہے؛ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ جب دبے کچلے مسلمانوں کو دیکھتے تو سلام میں پہل کرتے اور فرماتے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میری اُمت میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ مجھے ان کو سلام کرنے میں پہل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (قرطبی: ۶/ ۴۳۵)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ انسان اور پوری کائنات کے مالک ہیں، وہ جیسے چاہیں اس میں تصرف کریں، اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے؛ کیوں کہ اس پر کسی چیز کا واجب ہونا اس کی شان کے مغایر ہے؛ لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ بے حد مہربان و کریم ہیں؛ اس لئے اپنی رحمت کو اپنے غضب پر غالب رکھتے ہیں اور عفو و درگذر سے کام لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنت کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت میں مسلمانوں کا ذکر ہے، یعنی جیسے کفر کا گناہ توبہ سے معاف ہوجاتا ہے، اسی طرح اس سے کم درجہ کے گناہ بھی ←

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

آپ کہہ دیں کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی ،جس کا تم جلد بازی کے ساتھ مطالبہ کررہے ہوتو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظلم کرنے والوں سے خوب واقف ہیں ﴿۱﴾ ﴿۵۸﴾ ان ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں، وہ خشکی اور دریا کی تمام چیزوں کا علم رکھتے ہیں، ایک پتّا بھی گرتا ہے تو وہ ان کے علم میں ہے، زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ؛ مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۵۹﴾

← معاف ہوجاتے ہیں، اس آیت میں ناواقفیت کی وجہ سے برا کام کرگذرنے کا جو ذکر فرمایا گیا ہے، اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ مومن کی شان یہی ہے کہ اگر اس سے شریعت کے خلاف کسی عمل کا صدور ہو تو ناواقفیت اور اَنجانے میں ہو نہ کہ جانتے بوجھتے۔

﴿۱﴾ ایمان نہ لانے پر ہر پیغمبر نے اللہ کے عذاب کا خوف دلایا ہے، خواہ دنیا میں ہی آجائے یا آخرت میں اس کا ظہور ہو؛ لیکن دنیا میں اللہ کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے، جب اس پر حجت پوری ہوجائے، دعوت کا حق ادا ہوجائے اور ظاہر ہوجائے کہ وہ حق کے قبول کرنے کی صلاحیت سے بالکل ہی محروم ہیں ؛ اس لئے اللہ کی طرف سے فوری عذاب نازل نہیں کیا جاتا تھا اور انھیں سنبھلنے کی مہلت دی جاتی تھی ، اس ڈرانے کا نام 'انذار' ہے، جو پیغمبر کے بنیادی فرائض میں ہے، تقریباً ہر پیغمبر کے ساتھ یہ صورت حال پیش آیا کرتی تھی کہ ان کی دردمندانہ دعوت اور عذابِ الٰہی کا خوف دلانے پر لوگ مذاق اُڑایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی ، قرآن میں متعدد جگہ اس کا ذکر موجود ہے، کبھی آپ سے کہا گیا کہ آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرادیجئے ''أو تسقط السماء کما زعمت علینا'' (بنی اسرائیل:۹۲) کبھی لوگوں نے کہا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسادیجئے ''فأمطر علینا حجارۃ من السماء'' (انفال:۳۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا اُصولی جواب اپنے رسول کی زبان سے دلوایا ہے کہ عذاب کا آنا اور نہ آنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، میرے اختیار میں نہیں ہے، اگر میرے اختیار میں ہوتا تو شاید اللہ کی شان میں یہ گستاخی ہمیں برداشت نہ ہوتی اور میں عذاب کا فیصلہ کردیتا ؛ لیکن اللہ بڑے بردبار اور حلیم ہیں ؛ اس لئے ڈھیل دیتے جارہے ہیں۔

﴿۲﴾ زیادہ تر مفسرین کے نزدیک کتاب مبین سے مراد 'لوحِ محفوظ' ہے، قیامت تک جتنی چیزیں پیدا ہوں گی اور جو جو واقعات جس ترتیب سے پیش آئیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے ؛ تاکہ فرشتے منشاء خداوندی کے مطابق نافذ کرتے رہیں، قرآن مجید میں ایک اور موقع پر زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر آیا ہے۔ (دیکھئے: الحدید:۲۲)

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى
اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۠ ﴿۶۰﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ ع ۵ / ۱۳
عِبَادِهٖ وَ یُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا
یُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾

وہی خدا ہے جو رات میں (عارضی طور پر) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور دن میں تم جو کچھ کرتے ہو، اسے بھی جانتا ہے، پھر تم کو دوبارہ دن میں اُٹھا دیتا ہے؛ تا کہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری ہو جائے، پھر اسی کی طرف تم لوگوں کی واپسی ہے، پھر جو کچھ تم کیا کرتے تھے، اس وقت اللہ تم کو اس کے بارے میں بتائیں گے، ﴿۱﴾ ﴿۶۰﴾ اللہ اپنے بندوں پر غالب ہیں اور تم پر نگرانی کرنے والوں کو بھیجتے رہتے ہیں؛ ﴿۲﴾ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی پر موت آتی ہے، تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اسے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ ﴿۶۱﴾

﴿۱﴾ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور قدرت کا ذکر کرتے ہوئے عقیدۂ آخرت کو سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم گذشتہ، موجودہ اور آئندہ زمانے کو حاوی ہے اور طاقت کا حال یہ ہے کہ پوری کائنات اس کے حکم کے تابع ہے؛ اس لئے جب وہ قیامت کے واقع ہونے کی خبر دے رہا ہے تو اس کو نہ ماننے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے؛ کیوں کہ قیامت کا آنا نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ لانا اس کی قدرت سے ماوراء، پھر اللہ تعالیٰ نے دن و رات پیش آنے والی موت اور دوبارہ زندگی سے ملتی جلتی ایک کیفیت کا ذکر فرمایا کہ جب انسان سوتا ہے تو ہوش و حواس سے محروم اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے؛ گویا اس پر ایک طرح کی موت طاری ہو جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اُس کی اِن صلاحیتوں کو لوٹا دیتے ہیں اور وہ بیدار ہو جاتا ہے، یہ گویا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کی ایک تمثیلی کیفیت ہے، جس سے آخرت کو سمجھا جا سکتا ہے —— اس سے فقہ کی ایک اہم اصل 'قیاس' کے معتبر ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے؛ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے موت کی کیفیت کو نیند کی عارضی کیفیت پر قیاس کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ نگرانی کرنے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں، جو انسان کے ساتھ رکھے گئے ہیں اور اس کے ایک ایک لمحہ کو ریکارڈ کرتے جا رہے ہیں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اِن فرشتوں کا ذکر آیا ہے، (دیکھئے: قٓ: ۱۸) اور ان فرشتوں کو 'کراماً کاتبین' کا نام دیا گیا ہے (انفطار: ۱۱) اپنے کام کو بہتر طور پر انجام دینے میں ان کا یہ حال ہوگا کہ قیامت کے دن جب نامۂ اعمال انسان کے سامنے پیش کئے جائیں گے تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ اس میں تو کوئی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بات بھی چھوٹی نہیں ہے، (الکہف: ۵۰) ان فرشتوں کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے ہیں، ایک دائیں جانب ہے، جو نیکیوں کو لکھتے ہیں، اور دوسرے بائیں جانب ہیں، جو انسان کے گناہوں کو تحریر کرتے ہیں۔ (مفاتیح الغیب: ۱۲/ ۳۴۹)

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ
يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ
تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ
اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

پھر وہ اپنے حقیقی مالک اللہ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے، ﴿۱﴾ آگاہ ہوجاؤ! تمام فیصلے اسی کے ہاتھ میں ہوں گے اور اللہ بہت تیزی سے حساب کرنے والے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۶۲﴾ آپ کہہ دیں: تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے؟ جب تم گریۂ وزاری کے ساتھ چپکے چپکے خدا کو پکارتے ہو، (اور کہتے ہو) اگر اللہ ہمیں اس سے نجات عطا فرمادیں، تو ہم ضرور ان کے شکرگزاروں میں شامل ہوجائیں گے ﴿۶۳﴾ آپ کہہ دیں: اللہ ہی تم کو اس سے اور ہر مصیبت سے نجات دیتے ہیں، پھر بھی تم شرک کئے جاتے ہو؟ ﴿۶۴﴾ آپ کہہ دیں: اللہ اس بات پر قادر ہیں کہ تم پر تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے عذاب بھیج دیں یا تم کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیں اور تم میں سے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی لڑائی کا مزا چکھائیں، ﴿۳﴾ آپ دیکھئے تو سہی، ہم کس کس طرح مختلف پہلوؤں سے دلائل بیان کرتے ہیں؛ تاکہ وہ سمجھ سکیں۔ ﴿۶۵﴾

﴿۱﴾ اسلام کا تصور یہی ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو اس کی روح نکال لی جاتی ہے اور اس شخص کے اعمال کے اعتبار سے وہ بلند یا پست مقام پر بھیج دی جاتی ہے، اس میں ان منکرین آخرت کی بھی تردید ہے، جن کا گمان ہے کہ موت انسان کے وجود کا مکمل خاتمہ ہے اور جسم و روح دونوں ہمیشہ ہمیش کے لئے فنا کردیئے جاتے ہیں، اور ان لوگوں کی بھی تردید ہے جو آواگون اور تناسخ کے قائل ہیں، کہ فرشتے روح کو قبض نہیں کرتے اور یہ روحیں اللہ کے حوالے نہیں کی جاتیں؛ بلکہ کسی اور مخلوق یا شخصیت کے قالب میں داخل ہوجاتی ہیں۔

﴿۲﴾ مفسرین نے اس پر گفتگو کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح حساب فرمائیں گے؟ کیا تمام مخلوق کا ایک لمحہ میں حساب ہوجائے گا یا اللہ تعالیٰ فرشتوں کی ایک بڑی جماعت کو الگ الگ لوگوں کے معاملات پر مامور فرمائیں گے؟ —— (دیکھئے: طبری: ۲۸۹/۳) تاہم آج کی الکٹرانک دنیا میں اس کا سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ جب انسانوں کے دماغ کا بنایا ہوا کمپیوٹر اربوں انسانوں کا ریکارڈ محفوظ کرسکتا ہے اور سکنڈوں میں پیش کرسکتا ہے تو خود خالق کائنات کی قدرت کا کیا کہنا، اس لئے 'اسرع الحاسبین' ''حساب کرنے والوں میں سب سے تیز حساب کرنے والا'' میں یہ بات شامل ہے کہ اللہ کا حساب الکٹرانک مشینوں سے بھی کہیں تیز ہوگا۔

﴿۳﴾ اللہ کا عذاب آنے کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اوپر کی طرف سے آئے، جیسا کہ قوم عاد و ثمود اور حضرت شعیب، ←

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۟﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّ سَوْفَ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾
وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾

آپ کی قوم اس (عذاب خداوندی) کو جھوٹ قرار دے رہی ہے؛ حالاں کہ یہ یقینی ہے، آپ کہہ دیں کہ میں تم پر (عذاب لانے کا) ذمہ دار نہیں ہوں ﴿۶۶﴾ ہر خبر کے واقع ہونے کا ایک وقت مقرر ہے اور جلد ہی تم کو (اس کا) پتہ چل جائے گا ﴿۶۷﴾ ﴿۱﴾ جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیات کے بارے میں نکتہ چینی کر رہے ہیں، تو اُن سے کنارہ ہو جائیے؛ یہاں تک کہ وہ دوسرے موضوع پر بات کرنے لگیں، اور اگر شیطان آپ کو بھلا دے، تب بھی یاد آنے کے بعد ان لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھئے جن کا شیوہ ظلم کرنا ہے ﴿۶۸﴾ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں، ان پر (قرآن مجید پر نکتہ چینی کرنے والوں کی) کوئی ذمہ داری نہیں ہے؛ البتہ نصیحت کرنا ان کے ذمہ ہے کہ شاید وہ بھی اِس (نکتہ چینی) سے اجتناب کرنے لگیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۹﴾

← حضرت لوط اور حضرت نوح علیہ السلام کی اقوام کے ساتھ ہوا، پتھر کا برسنا، طوفان کا آنا، آندھی کا چلنا، دل دہلانے والی چیخ کا مسلط کیا جانا، دوسری صورت یہ ہے کہ زمین کی طرف سے عذاب آئے، جیسے زمین میں دھنسا دیا جانا یا زلزلہ؛ جیسا کہ فرعون کے وزیر قارون اور اہل مدین کے ساتھ ہوا، تیسری صورت یہ ہے کہ باہمی عداوتیں بھڑک اُٹھیں اور باہمی قتل وقتال کی بنا پر قوم تباہ وتاراج ہو جائے، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی برکت سے یہ اُمت پہلے اور دوسرے عذاب سے انشاء اللہ محفوظ رہے گی؛ لیکن تیسرے قسم کے عذاب سے یہ اُمت بھی اپنے شامت اعمال کی وجہ سے دوچار ہوگی، (دیکھئے: قرطبی: ۱۱/۷) —— آج اُمت محمدیہ میں اس عذاب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

﴿۱﴾ چنانچہ غزوہ بدر کے موقع سے اس کا ظہور ہوا اور وہ تمام سردارانِ قریش جو اسلام کے سامنے کسی طرح اپنی گردن جھکانے کو تیار نہیں تھے، قتل کر دیئے گئے اور ان لوگوں کے ہاتھ قتل کئے گئے، جنھیں وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

﴿۲﴾ مکہ میں سردارانِ قریش کا طرز عمل یہ تھا کہ جب مسلمانوں کے ساتھ ان کا اُٹھنا بیٹھنا ہوتا تو ان کو تکلیف پہنچانے کے لئے خاص طور پر قرآن مجید کو موضوع بحث بناتے اور اس بہانے اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اُڑاتے، اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ جب وہ اللہ کی کتاب کو بدنیتی کے ساتھ موضوع بحث بنائیں تو ان سے کنارے ہو جائیے، یہاں تک کہ موضوع بدل جائے، اگر دوسرے موضوع پر بات ہو تو ان کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر پہلے سے خیال نہ ہو اور اس قسم کی گفتگو میں اتفاق سے بیٹھ گئے تب بھی یاد آنے کے بعد وہاں سے ہٹ جائیں، اس آیت میں خطاب تو رسول اللہ ﷺ سے ہے؛ لیکن مراد ←

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ
نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖۗ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا
یُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ
بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۟۷۰ ع ۸/۱۴

جن لوگوں نے کھیل تماشہ کو اپنا دین بنا رکھا ہے،﴿۱﴾ اور دنیوی زندگی نے ان کو فریب میں ڈال دیا ہے، ان کو چھوڑ دیجئے اور اِس (قرآن) کے ذریعہ نصیحت کرتے رہیے، کہ کوئی شخص (قیامت کے دن) اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑا نہ جائے، جب اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، اور اگر (گناہ کے کفارہ کے طور پر وہ) سب کچھ بطور فدیہ دینا چاہے، تب بھی اسے قبول نہیں کیا جائے گا، یہی لوگ ہیں جو اپنے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لئے جائیں گے، کفر کرنے کی وجہ سے ان کے لئے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا۔ ۷۰

← پوری اُمت ہے، اس ارشادِ ربانی سے معلوم ہوا کہ ایک تو جن لوگوں سے قرآن مجید کی اہانت اور احکامِ شریعت کی بے حرمتی کا قوی اندیشہ ہو، ان سے دینی موضوعات پر بات کرنے سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے؛ کیوں کہ اس طرح انسان بالواسطہ دین کے استہزاء کا سبب بنتا ہے، دوسرے: اگر کچھ لوگ خود ایسی باتیں کر رہے ہوں تو اس مجلس میں شریک نہ ہونا چاہئے، تیسرے: اگر پہلے سے اس قسم کی بات نہیں ہو رہی تھی اور بعد میں شروع ہوگئی تو مجلس سے اُٹھ جانا واجب ہے، چوتھے: جس مجلس میں مُنکَر کا ارتکاب کیا جائے اور خلافِ شریعت کام ہو، اس پر اگر قدرت ہو تو نکیر کرنی چاہئے، ورنہ کم سے کم یہ ضروری ہے کہ اس میں شریک نہ ہوا جائے، پانچویں: اس سے روافض کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ جہاں خلافِ شریعت باتیں ہوں، وہاں 'تقیہ' کے طور پر شرکت کی جاسکتی ہے اور ہاں میں ہاں ملائی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ ایسے لوگوں کی تائید کرنا تو کجا قرآن تو ان کے ساتھ بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا — البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ احکام عمومی گفتگو اور تبادلہ خیال سے متعلق ہیں، اگر دین کی بات بطور دعوت کے کہی جائے تو اگرچہ ان کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ہو پھر بھی کہنے میں حرج نہیں؛ کیوں کہ قرآن مجید میں انبیاء کے بہت سے واقعات موجود ہیں کہ انبیاء اپنی قوم کو بار بار توحید کی دعوت دیتے رہے؛ حالاں کہ وہ اس کے جواب میں مذاق اُڑاتے رہتے تھے۔

﴿۱﴾ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا جتنے مذاہب ہیں، انھوں نے کھیل تماشا کو اپنا مذہب بنا رکھا ہے، گانا بجانا، ڈھول، طبلے، رنگ، روشنی، یہاں تک کہ ایک دوسرے پر رنگ کا پھینکنا اور اسی طرح کے دوسرے افعال ہیں جن کو اکثر قوموں نے اپنے خیال کے مطابق عبادت کا نام دے رکھا ہے، یہ صرف اسلام ہے کہ اس نے عبادت کے ایسے طریقہ کی تلقین کی ہے، جس میں تواضع، بندگی، گریہ وزاری اور مسکنت کا اظہار ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا
اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى
ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِىْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ؕ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ
الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

الثلثة

آپ کہہ دیں: کیا ہم اللہ کے مقابلہ اس کی عبادت کریں، جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، اور ہم اللہ کی طرف سے ہدایت سے نوازے جانے کے بعد پچھلے پاؤں پلٹ جائیں؟ اس شخص کی طرح جس کو بیابان میں جنوں نے بھٹکا دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھر رہا ہو، اس کے کچھ ساتھی بھی ہوں، جو اسے صحیح راستہ کی طرف بلاتے ہوں کہ ہماری طرف آجاؤ؟ آپ کہہ دیں: بے شک اللہ ہی کا دیکھایا ہوا راستہ صحیح راستہ ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم تمام عالم کے پروردگار کے فرماں بردار بن کر رہیں ﴿۷۱﴾ اور اس بات کا بھی کہ نماز قائم کرو اور اللہ ہی سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب جمع کئے جاؤ گے ﴿۱﴾ ﴿۷۲﴾ وہی خدا ہے جس نے ٹھیک طریقہ پر آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا اور جس وقت وہ کہتا ہے: ہوجا، تو وہ ہوجاتا ہے، اس کا ارشاد حق ہے، جس دن صور پھونکا جائے گا، اسی کی بادشاہت ہوگی، وہی چھپی ہوئی اور کھلی ہوئی باتوں کا علم رکھنے والا ہے اور بڑا ہی دانا اور باخبر ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۷۳﴾

﴿۱﴾ یعنی گمراہی کا راستہ اختیار کرنا ویسے بھی حد درجہ نقصان کی بات ہے؛ لیکن انسان کے لئے کسی نعمت کو پانے کے بعد پھر اس سے محروم ہوجانا خاص طور پر بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، ایسی نعمت جس سے عارضی نفع متعلق ہو، جیسے دولت اور اقتدار سے محرومی بھی انسان کو شاق گذرتی ہے؛ لیکن ایمان کی دولت سے تو ہمیشہ ہمیش کی نجات و عافیت متعلق ہے، اس کی محرومی سے بڑھ کر اور کونسی محرومی ہوسکتی ہے؟ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلا دیا ہے کہ ہدایت حاصل ہونے کے بعد گمراہی کو کیسے پسند کیا جاسکتا ہے؟

﴿۲﴾ اس آیت میں قیامت کو ثابت کیا گیا ہے، لوگ خیال کر سکتے ہیں کہ اگر ایک پہاڑ کا اُٹھانا ہو تو اس کے لئے طویل مدت درکار ہے اور کسی سمندر کو پاٹنا ہو تو یہ عملاً ناممکنات میں سے ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی بڑی کائنات لمحوں میں تہس نہس کر دی جائے گی اور اس کو نیست و نابود کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہارا یہ سوچنا مخلوق کی طاقت اور اس کے امکانات کے لحاظ سے ہے، خالق کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، مخلوق کو اسباب کی ضرورت پڑتی ہے، خالق کو نہ وجود میں لانے کے لئے کسی سبب کی ضرورت ہے اور نہ کسی چیز کو فنا کرنے کے لئے، یہی آسمان و زمین پر مشتمل اس بڑی کائنات کو اللہ نے بالکل درست طریقہ پر بنا دیا ہے اور جب قیامت قائم کرنی ہوگی تو وہ صرف حکم دے گا کہ ختم ہوجا اور کائنات ختم ہوجائے گی، ←

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ابراہیم نے اپنے والد آزر ﴿۱﴾ سے کہا: کیا آپ بتوں کو خدا تسلیم کرتے ہیں؟ میں آپ کو اور آپ کی قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا دیکھ رہا ہوں۔ ﴿۷۴﴾

← یہ بھی ہوسکتا ہے کہ 'یوم یقول کن فیکون' کا تعلق صرف قیامت ہی سے نہ ہو، ہر کام؛ بلکہ ہر چیز سے ہو، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے تو فوراً وہ چیز وجود میں آجاتی ہے؛ بلکہ یہ ارشاد کہ ''اللہ کہتے ہیں: ہوجا'' بھی محض سمجھانے کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ کو اس کے کہنے کی بھی ضرورت نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ جس بات کا ارادہ فرماتے ہیں فوراً وہ شئ وجود میں آجاتی ہے؛ اس لئے قیامت کا قائم کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ دشوار نہیں۔

﴿۱﴾ تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''تارح'' ملتا ہے؛ اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا نام ''آزر'' بھی ہو اور ''تارح'' بھی، اور یہ بھی کہ ان میں سے ایک نام ہو اور دوسرا لقب، مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو اس میں خاصی تبدیلی آجاتی ہے؛ چنانچہ اسی ''تارح'' کو یہودیوں کی کتاب تالمود میں ''تراء'' اور انگریزی میں "Terah" لکھا گیا ہے اور بعض قدیم عیسائی مؤرخین نے ''آشر'' یا ''ہاتھر'' لکھا ہے، پھر یہی لفظ عربی میں ''آزر'' ہوگیا ہو تو قابل تعجب نہیں (تفسیر ماجدی) —— بعض مغربی مصنفین نے اس کو لے کر قرآن مجید پر اعتراض کیا ہے کہ قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام غلط ذکر کیا ہے؛ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں ہے، تورات کے تحریف شدہ نسخے کو قرآن کے مقابلے میں حجت قرار دینا اور اس کی وجہ سے قرآن مجید پر اعتراض کرنے کے کوئی معنی نہیں؛ اس لئے درست بات وہی ہے جو قرآن مجید میں ہے، اور اگر تورات کا بیان بھی صحیح ہو تو پھر وہی مطلب ہے جو اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں، جیسے حضرت اسحاق علیہ السلام کے ایک صاحبزادے کا نام اسرائیل بھی ہے اور یعقوب بھی، یا 'آزر' بدلی ہوئی شکل ہے، جیسا کہ مولانا دریابادی کی تحقیق ہے، ایک ہی شخصیت کو عبرانی میں 'یوحنا' اور عربی میں 'یحییٰ' کہا گیا ہے، یا عبرانی میں 'یسوع' اور عربی میں 'عیسیٰ' کہا گیا ہے، اسی طرح یہ نام بھی ہوسکتا ہے، اگر قرآن مجید کا یہ بیان خلاف واقعہ ہوتا تو سب سے پہلے یہود اور اہل مکہ جو اعتراض کا ادنیٰ سے ادنیٰ موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ضرور اس پر اعتراض کرتے؛ مگر ایسا نہیں ہوا، ہوتا تو قرآن مجید یا حدیث میں ضرور اس کا ذکر آتا، شیعہ حضرات کا خیال ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا تھے نہ کہ والد، اور یہاں بطور مجاز کے چچا کو والد کہہ دیا گیا ہے؛ کیوں کہ ان کے خیال میں نبی کے سلسلۂ نسب میں کوئی کافر نہیں ہوسکتا؛ لیکن نہ اس دعویٰ پر کوئی دلیل ہے اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ اس آیت میں مجازاً چچا کو باپ کہہ دیا گیا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو الفاظ آئے ہیں، ان کو ان کے حقیقی معنی پر محمول کیا جائے، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے مسلمان نہیں تھے؛ حالاں کہ بیٹے کی حیثیت باپ کے جز کی ہوتی ہے، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ایمان سے محروم تھیں؛ حالاں کہ تمام رشتہ داروں میں شوہر و بیوی کے درمیان سب سے زیادہ قربت ہوتی ہے؛ اس لئے کسی نبی کے والد یا متعلقین کا ایمان سے محروم ہونا تعجب خیز نہیں؛ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے کہ ہدایت و گمراہی کا تعلق رشتہ داری سے نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ
عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کا اور زمین کا نظام حکومت دیکھایا کرتے تھے؛ تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں رہے،《۱》﴿۷۵﴾ جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ستارہ کو دیکھا اور کہا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ جب ستارہ ڈوب گیا تو کہنے لگا: میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا، ﴿۷۶﴾ پھر جب چاند کو روشن دیکھا تو کہنے لگا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ جب چاند بھی ڈوب گیا تو بول پڑا: اگر میرے پروردگار کی ہدایت مجھے حاصل نہ رہے تو میں یقینا گمراہوں میں ہو جاؤں ﴿۷۷﴾ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہنے لگا: (کیا) یہ میرا رب ہے؟ یہ تو سب سے بڑا بھی ہے، پھر جب سورج بھی ڈوب گیا تو کہنے لگا: اے میری قوم! میں ان چیزوں سے بری ہوں، جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔《۲》﴿۷۸﴾

《۱》 قرآن مجید میں بار بار جن انبیاء کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، ان میں ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اس میں حکمت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ صرف یہودی نبی مانتے تھے؛ بلکہ عرب بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل قرار دیتے تھے، قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں سب سے پہلے ان کے اپنے والد کو دعوت دینے کا ذکر کیا ہے، غالباً یہ ترتیب اس لئے ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کیا تھا، معلوم ہوا کہ داعی کو دعوتی جد و جہد اپنے گھر سے شروع کرنی چاہئے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو عمومی دعوت دینے سے پہلے اپنے اہل خاندان کو دعوت دینے کا حکم دیا گیا ''وأنذر عشيرتک الأقربين'' (الشعراء: ۲۱۴) البتہ اگر گھر والے دعوت قبول نہ کریں تو اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو دعوت دینے کے سلسلے کو روک کر دینا درست نہیں؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ایمان نہیں لائے، مگر آپ اپنی قوم کو دعوت دیتے رہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ابتدائی دعوت پر بنو ہاشم میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ایمان لائے؛ لیکن آپ نے اِس وجہ سے اہل مکہ کی دعوت کو مؤخر نہیں فرمایا اور عمومی دعوت دیتے رہے۔

《۲》 نبی معصوم ہوتا ہے اور نبی بنائے جانے سے پہلے بھی شرک اور گناہ کی باتوں سے من جانب اللہ اس کی حفاظت کی جاتی ہے؛ اس لئے ان آیات کا یہ مقصد نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام واقعی تاروں کو اور چاند، سورج کو خدا یقین کرتے تھے اور پروردگار سمجھتے تھے؛ بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے یا تو بطور سوال و استفسار کے کہا تھا کہ کیا یہ ستارے میرے رب ہیں؟ کیا یہ چاند اور سورج میرے رب ہیں؟ یا بطور فرض کے کہا تھا، یعنی چلو، تھوڑی دیر تمہارے گمان کے مطابق مان لیں کہ یہ ستارے، چاند و سورج رب ہیں اور بطور فرض کے تو وقتی طور پر ناممکن باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے؛ اس لئے یہ مشرکانہ افکار کا اقرار نہیں ہے، ←

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۷۹﴾
وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ
یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ كَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ
اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع ۹ / ۱۲ / ۱۵

وقف لازم

میں نے اپنا رُخ یکسو ہوکر اس خدا کی طرف کرلیا، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ﴿۷۹﴾ اور (ہوا یہ کہ) ابراہیم سے اس کی قوم جھگڑنے لگی، ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو؛ حالاں کہ اللہ نے مجھے ہدایت سے نواز رکھا ہے اور جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے نہیں ڈرتا، سوائے اس کے کہ میرے رب ہی کو کچھ منظور ہو، ﴿۱﴾ میرے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۸۰﴾ اور تم جنھیں شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے کیوں ڈروں؟ حالاں کہ تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے پر نہیں ڈرتے؛ باوجودیکہ اللہ نے تم پر اس کے حق میں کوئی دلیل نہیں اُتاری، ﴿۲﴾ تو دونوں فریقوں میں سے کون اطمینان کا زیادہ حقدار ہے؟ (بتاؤ) اگر تم سمجھ رکھتے ہو ﴿۸۱﴾ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) کی آمیزش سے محفوظ رکھا، اُن ہی کے لئے اطمینان کا موقع ہے اور وہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۸۲﴾

← جس کی وجہ سے کسی شخص کے کافر ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے —— بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ اس کے عروج کو کوئی زوال نہ ہو اور وہ تغیر وتبدیلی سے دوچار نہ ہوتا ہو؛ کیوں کہ 'تغیر اور زوال' عجز وکمزوری کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالا وبرتر ہے۔

﴿۱﴾ یعنی مجھے ان دیویوں، دیوتاؤں کا ڈر نہیں کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا دیں گے؛ البتہ اگر اللہ ہی کی طرف سے کوئی آزمائش مقدر ہو اور میرے لئے کسی تکلیف کا فیصلہ ہو تو مجھے وہ نقصان پہنچ کر رہے گا۔

﴿۲﴾ یعنی شرک پر نہ تو کوئی الہامی دلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی پر اُتاری ہو اور نہ کوئی عقلی دلیل ہے، جس کو خدا نے اپنی کائنات میں پیدا کیا ہو۔

﴿۳﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ظلم سے مراد شرک ہے، خود قرآن مجید کی تعبیر میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے: کیوں کہ ظلم پر جو ''تنوین'' (ــٍ) ہے اس کا ایک معنی ''تعظیم'' یعنی کسی چیز کو بڑا ظاہر کرنا ہوتا ہے تو اب معنی یوں ہوا کہ ''جن لوگوں نے ←

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

یہ ہماری دلیل ہے، جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی، ہم جس کے چاہتے ہیں، درجات بلند کرتے ہیں، ﴿۱﴾ بے شک آپ کے رب بڑی حکمت والے اور بڑے علم والے ہیں ﴿۸۳﴾ ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب سے نوازا، ہر ایک کو ہدایت دی اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو بھی ہدایت دی تھی، نیز ابراہیم کی اولاد میں داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی ہدایت سے سرفراز کیا اور اسی طرح ہم نیک عمل کرنے والوں کو انعام دیتے ہیں ﴿۸۴﴾ ہم نے زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی ہدایت عطا فرمائی —— یہ سب نیک لوگوں میں تھے —— ﴿۸۵﴾ اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی، اور ان سب کو تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا فرمائی ﴿۸۶﴾ ان کے آباء و اجداد، اولاد اور بھائیوں میں سے بھی بعض لوگوں کو ہدایت پر رکھا، ہم نے ان کو منتخب کیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۷﴾

← اپنے ایمان کو ظلم عظیم کی آمیزش سے محفوظ رکھا'' اور قرآن مجید نے دوسرے موقع پر شرک کو ''ظلم عظیم'' قرار دیا ہے ''إن الشرک لظلم عظیم'' (لقمان: ۱۳) گویا مقصد یہ ہے کہ ایمان لانا کافی نہیں ہے؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایمان کے ساتھ کسی بھی درجہ میں شرک کی آمیزش نہیں ہونی چاہئے، ایک شخص اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا بھی ہو؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں غیر اللہ کو شریک بھی سمجھتا ہو، نبیوں اور ولیوں کے بارے میں عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ اولاد دے سکتے ہیں، صحت و حیات کے فیصلے کر سکتے ہیں، رزق دے سکتے ہیں، اسی طرح اللہ کے علاوہ کسی زندہ یا مردہ کو سجدہ کیا جائے اور کسی کے نام پر نذر و نیاز کا جانور چھوڑا جائے تو یہ سب مشرکانہ افعال ہیں اور یہ ایمان کے ساتھ شرک کی آمیزش ہے، ایسی باتوں سے بچے بغیر انسان ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا۔

﴿۱﴾ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلندیٔ درجات کی طرف اشارہ ہے، آخرت میں تو انھیں بلندی حاصل ہوگی ہی، دنیا میں بھی انھیں یہ اعزاز دیا گیا کہ اس وقت دنیا کے تین بڑے مذاہب —— اسلام، یہودیت اور عیسائیت —— کو ماننے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت و بزرگی پر متفق ہیں۔

﴿۲﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو اعزاز عطا فرمایا، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کے خاندان میں بہت سے سلسلوں کو ←

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ
فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ
قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع ۱۰/۱۶

یہی اللہ کی ہدایت ہے، اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، اِس سے نواز دیتے ہیں اور اگر وہ لوگ بھی شرک کرنے لگتے تو ان کے اعمال بھی ضائع ہوکر رہ جاتے، ﴿۱﴾ ﴿۸۸﴾ یہی حضرات ہیں جن کو ہم نے کتاب، قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی تھی، اگر یہ لوگ (یعنی مکہ والے) اِن باتوں کو نہ مانیں، تو ہم نے ایسے لوگوں کو مقرر کر رکھا ہے، جو ان کا انکار نہیں کریں گے، ﴿۲﴾ ﴿۸۹﴾ یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی تھی؛ لہٰذا آپ ان ہی کے طریقہ کی پیروی کیجئے، ﴿۳﴾ آپ کہہ دیں: میں تم سے اس پر کسی معاوضہ کا طلب گار نہیں ہوں، یہ تو تمام دنیا کے لئے صرف نصیحت ہے۔ ﴿۹۰﴾

← نبوت سے نوازا گیا؛ چنانچہ یہاں سترہ (۱۷) انبیاء کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں حضرت نوح علیہ السلام تو آپ کے اجداد میں ہیں اور بقیہ آپ کی اولاد میں ہیں، یعنی بیٹے، پوتے، بھتیجے، نواسے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں شمار کیا گیا ہے؛ حالاں کہ اُن کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی سے جو خاندان چلتا ہے، وہ بھی انسان کی ذریت میں شامل ہوتا ہے اور یہ بھی ایک خاندانی نسبت ہوتی ہے؛ اسی لئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندانی سلسلہ چلا ہے، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کے خاندان میں علماء، صلحاء اور دین دار لوگوں کا پیدا ہونا اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

﴿۱﴾ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور بے نیازی کا ذکر ہے کہ اگر یہ ہمارے برگزیدہ بندے گمراہی کا راستہ اختیار کرتے تو ان کے ساتھ بھی کوئی رورعایت نہیں ہوتی۔

﴿۲﴾ یعنی اگر اہل مکہ آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کررہے ہیں، تو آپ رنجیدہ نہ ہوں اور ہمت نہ ہاریں، عنقریب اہل مدینہ آپ کی دعوت پر ایمان لائیں گے اور آپ کے راستہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ جو آباء واجداد اور گذرے ہوئے لوگ ہدایت پر قائم ہیں، ان کی اتباع کرنی چاہئے، نہ یہ درست ہے کہ انسان آنکھ بند کر کے اپنے آباء واجداد کی باتوں کو اور رسوم وروایات کو قبول کرلے اور یہ نہ دیکھے کہ وہ حق پر تھے بھی یا نہیں؟ اور نہ یہ درست ہے کہ علماء صالحین کے طریقہ کو محض یہ کہہ کر رد کردیا جائے کہ یہ آباء واجداد کی پیروی ہے، نہ کہ اللہ اور رسول کی؛ کیوں کہ اگر علم اور تقویٰ کی بنیاد پر کسی شخص کی پیروی کی جائے تو یہ بالواسطہ اللہ اور اس کے رسول ہی کی اطاعت ہے۔

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ
الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا
وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ
خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ
الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ
یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

اوران لوگوں نے اللہ کی تعظیم کا حق ادا نہیں کیا، اس لئے کہ انھوں نے کہا: اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اُتاری، آپ پوچھیں: موسیٰ جس کتاب کو لے کر آئے، — جو لوگوں کے لئے روشنی اور ہدایت تھی، جس کے کچھ حصہ کو تم نے کاغذات میں رکھ رکھا ہے، اس کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ حصہ کو چھپا دیتے ہو — کو کس نے اُتارا؟ اور بہت سی ایسی باتوں کی تم کو تعلیم دی گئی، جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے آباء واجداد، آپ کہہ دیں: اللہ نے اُتارا، پھر انھیں ان کی خرافات میں مگن رہنے دیجئے، ﴿۱﴾ ﴿۹۱﴾ یہ بھی ہماری ہی اُتاری ہوئی کتاب ہے، جو برکت والی ہے، پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس لئے اُتاری گئی ہے کہ آپ مکہ اور اس کے گرد وپیش کے لوگوں کو ڈرائیں، اور (ہاں) جن لوگوں کا آخرت پر یقین ہے، وہ اِس (قرآن مجید) پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کے بھی پابند ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ یہودیوں کو رسول اللہ ﷺ سے ایسا بغض تھا کہ بعض اوقات وہ مخالفت کے جوش میں ان باتوں کا بھی انکار کر دیتے تھے، جن پر خود ان کے مذہب کی بنیاد ہے؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نازل کئے جانے کے متعلق وہ خود بھی ایمان رکھتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں کہنے لگے کہ اللہ نے کسی انسان پر اپنا کلام اُتارا ہی نہیں، یہاں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے اُتارے جانے کے قائل تو تم بھی ہو، جس کے ذریعہ لوگوں کو علم کی روشنی اور ہدایت حاصل ہوئی، پھر بھی تم کیسے اس کا انکار ہوتے ہو؟ — بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات یہودیوں نے نہیں؛ بلکہ مشرکین مکہ نے کہی تھی، انھیں اس مضمون سے اس لئے خطاب کیا گیا کہ بعض اوقات قرآن مجید کی تصدیق کے سلسلہ میں وہ یہ سمجھ کر یہودیوں سے رُجوع کرتے تھے کہ ان کے پاس آسمانی کتاب ہے؛ لیکن آیت کے مضمون سے ان لوگوں کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے، جنھوں نے اس آیت کو یہودیوں کے اعتراض کا جواب قرار دیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی جیسے بنی اسرائیل کی طرف تورات اُتاری گئی، بنو اسماعیل یعنی اہل مکہ کی ہدایت کے لئے قرآن مجید اُتارا گیا، تو کوئی وجہ نہیں کہ تورات کے نزول کو تو تسلیم کیا جائے اور قرآن کے نازل ہونے کو ناممکن سمجھا جائے — اس آیت کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید کا خطاب اہل مکہ تک محدود تھا؛ بلکہ آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید کا خطاب قیامت تک آنے والی پوری انسانیت سے ہے؛ کیوں کہ قرآن کو تمام انسانیت کے لئے ہدایت ''ھدی للناس'' (البقرۃ:۱۸۵) قرار دیا گیا ←

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے ، یا دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی اُتاری گئی ہے ؛ حالاں کہ اس پر کوئی وحی نہیں آئی ہو اور جو کہے کہ اللہ نے جیسا کلام اُتارا ہے، عنقریب میں بھی ایسا ہی کلام اُتاروں گا ، ﴿۱﴾ کاش ! آپ وہ منظر دیکھتے کہ جب یہ ظالم لوگ موت کی مدہوشی میں ہوں گے اور فرشتے ان کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور کہتے ہوں گے :) اپنی جانیں باہر نکالو، تم اللہ پر جو ناحق باتیں گھڑا کرتے تھے اور ان کے احکام کے مقابلہ تکبر کیا کرتے تھے، آج اس کے بدلہ تمہیں رسوا کن عذاب دیا جائے گا ۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۳﴾

← اور رسول اللہ ﷺ کو ’’کافۃ للناس ‘‘ (سبا:۲۸) یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہادی کہا گیا ہے ؛ چوں کہ آپ کے اولین مخاطب اہل مکہ تھے ؛ اس لئے خصوصی طور پر ان کا ذکر آیا ہے — اُم القریٰ کے معنی ہیں ، شہروں کا مرکز ، کائنات کی تخلیق کا آغاز کعبۃ اللہ کے مقام سے ہوا ، حکم ربانی سے پہلے یہ جگہ وجود میں آئی اور پھر ہر چہار طرف بچھتی چلی گئی ، اس طرح قرآن کے بیان کے مطابق مکہ تخلیقی اعتبار سے تمام روئے زمین کا مرکز ہے ، موجودہ دور میں جو سائنسی تحقیق سامنے آئی ہے ، اس کے مطابق مکہ مکرمہ زمینی کششوں کا بھی مرکز ہے ، یہ مقناطیسی اعتبار سے زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی کے بالکل وسط میں واقع ہے ، اگر یہاں قطب نما رکھ دیا جائے تو اس کی سوئی میں کوئی حرکت نہیں ہوتی ؛ کیوں کہ اس مقام پر قطب شمالی اور قطب جنوبی کی کششیں ایک دوسرے کو زائل کردیتی ہیں ، اس پہلو سے بھی مکہ ’اُم القریٰ‘ ہے ۔

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ پر جو وحی اُترا کرتی تھی ، اس کے لکھنے والوں میں ایک صاحب ’’عبد اللہ بن اُبی بن سَرح ‘‘ تھے ، جب آپ ﷺ پر انسان کی تخلیق سے متعلق آیات ’’ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین ... ‘‘ (مومن:۱۲) نازل ہوئی تو آپ نے اس کو لکھنے کے لئے عبد اللہ کو طلب فرمایا اور لکھاتے ہوئے جب ’’ثم أنشاناہ خلقاً آخر ‘‘ پر پہنچے تو عبد اللہ بڑا متاثر ہوا اور اس کی زبان سے نکلا ’’تبارک اللہ أحسن الخالقین ‘‘ (احکام القرآن للجصاص : ۲۶/۲) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ٹکڑا بھی مجھ پر نازل کیا گیا ہے ، یہ ایسی بات تھی کہ عبد اللہ بن سرح خوش ہوتا اور یہ بات اس کے لئے لائق افتخار ہوتی کہ جو کلمہ ان کی زبان پر آیا ، وہی اللہ کی طرف سے نازل بھی ہوا ؛ لیکن اس کے برخلاف اس نے اس کو اپنی گمراہی کا ذریعہ بنالیا اور کہنے لگا : کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ اپنی طرف سے آیات گھڑتے ہیں ، ان پر کوئی چیز نازل نہیں ہوتی ہے ؛ چنانچہ مرتد ہوگیا اور اہل مکہ سے جاملا ، جب مکہ فتح ہوا تو اس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پناہ دی اور چھپادیا ، جو ان کا رضاعی بھائی تھا ، یہ ان لوگوں میں شامل تھے ، جن کے ←

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ
وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ
وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۹۴ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ ع ۱۱/۱۷
الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۹۵ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ
الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۹۶

(اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:) تم لوگ تو ہمارے پاس تنہا تنہا ہی آئے ہو، جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، اور ہم نے جو اسباب تم کو دیئے تھے، ان کو پیچھے ہی چھوڑ آئے اور تمہارے ساتھ تمہارے سفارشی بھی نظر نہیں آتے، جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ وہ تمہارے معاملہ (یعنی ضرورتوں کی تکمیل) میں خدا کے شریک ہیں؟ یقیناً تمہارے درمیان رابطہ ٹوٹ چکا ہے اور تم جو کچھ گمان کرتے تھے، وہ تمہارا ساتھ چھوڑ چکے ہیں، ﴿۱﴾ ۝۹۴ بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والے ہیں، جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتے ہیں، وہ اللہ ہی ہے، پھر تم کہاں پلٹے جاتے ہو؟ ۝۹۵ وہی صبح کے نکالنے والے ہیں، اسی نے رات کو راحت وسکون کے لئے اور سورج و چاند کو حساب کے لئے بنایا ہے، یہ غالب اور خوب علم رکھنے والی ذات کا متعین کیا ہوا ہے۔ ۝۹۶

← بارے میں اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ غلافِ کعبہ میں چھپ جائیں تب بھی انھیں قتل کر دیا جائے، فتح مکہ کے بعد جب اطمینان کی صورت پیدا ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے امان چاہی، آپ کا منشا نہیں تھا؛ اس لئے آپ خاموش رہے، بعد میں انھوں نے توبہ کر لی اور افریقہ کے علاقہ میں بعض فتوحات بھی ان کے ہاتھوں ہوئیں، یہ آیات اسی پس منظر میں نازل ہوئی ہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ آیت جھوٹے مدعیانِ نبوت — اَسْوَد عَنْسی، مُسَیلِمہ کذّاب اور سَجَاح نامی خاتون — کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷/۴۰-۳۹)

﴿۲﴾ یعنی فرشتے ان کی روح اہانت آمیز طریقہ پر نکالیں گے اور گویا یہیں سے ان پر عذاب شروع ہو جائے گا؛ چنانچہ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ایمان نہ لانے والوں کی جان نکالنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے جائیں گے۔ (محمد: ۲۷)

﴿۱﴾ یعنی دنیا تو امتحان کی جگہ ہے؛ اس لئے یہاں تو مادی اسباب بھی کام آتے ہیں اور انسان بھی ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں؛ لیکن آخرت میں ان میں سے کوئی چیز انسان کے ساتھ نہ ہوگی، نہ دولت، نہ بال بچے، نہ دوست احباب، نہ کوئی مددگار، وہاں صرف ایمان اور عمل صالح انسان کے کام آئے گا۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ
لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ
فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

وہی ہے جس نے تمہارے لئے تارے بنائے ہیں ؛ تاکہ ان کے ذریعہ تم خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستے جان سکو، ہم نے جاننے والوں کے لئے نشانیوں کو کھول کر بیان کر دیا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۹۷﴾ وہی خدا ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا ہے، پھر ایک جگہ مستقل رہنے کی ہے اور ایک جگہ عارضی طور پر رہنے کی، ﴿۲﴾ ہم نے یہ نشانیاں سمجھ دار لوگوں کے لئے وضاحت سے بیان کر دی ہیں ۔ ﴿۹۸﴾

﴿۱﴾ یہ اور آگے آنے والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مختلف نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل ہیں ؛ کیوں کہ کوئی بنی ہوئی چیز بنانے والے کے بغیر وجود میں نہیں آتی اور کوئی انتظام کسی منتظم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ، یہاں پہلی نعمت دانوں اور گٹھلیوں کو پھاڑنے کی ذکر کی گئی ہے ، اگر اناج کے دانے اور پھل کی گٹھلیاں پتھر اور لوہے کی طرح سخت ہوتے اور پودے اور درخت نہیں نکلتے تو انسان کو غلہ اور پھل کیسے حاصل ہوتا ؟ مردہ سے زندہ کو نکالنے کی صورت یہ ہے کہ نطفے سے انسان اور حیوانات اور انڈوں سے پرندوں کا وجود ہوتا ہے ؛ گویا اس طرح مردہ سے زندہ نکل رہا ہے، پھر انسان اور حیوانات کے جسم سے نطفہ اور انڈہ نکلتا ہے، یہ زندہ سے مردہ کا پیدا ہونا ہے، یہ خدا کا تخلیقی نظام ہے، انسان کسی چیز سے اسی جیسی چیز بنا سکتا ہے، پتھر سے پتھر کی دیوار چنی جاسکتی ہے، لکڑی سے لکڑی کے فرنیچر بن سکتے ہیں ؛ لیکن یہ خدا کی قدرت ہے کہ کہاں ایک نطفۂ بے جان، اور پیدا ہوتا ہے اس سے ایک دیکھتا ، چلتا پھرتا انسان ! جیسے دن کی روشنی اللہ کی ایک نعمت ہے، رات کا اندھیرا بھی اس سے کم بڑی نعمت نہیں ، جس میں ساری خلقت سوتی اور آرام کرتی ہے اور ایک ساتھ سبھوں کے سونے کی وجہ سے انسان سکون محسوس کرتا ہے، اگر مختلف لوگ الگ الگ اوقات میں سوتے اور آرام کرتے ، کہیں بازار کھلا رہتا کہیں بند، کہیں کارخانوں کا شور ہوتا کہیں سکون ، تو وہ سکون حاصل نہیں ہوتا ، جو بیک وقت تمام لوگوں کے آرام کرنے سے ہوتا ہے، اسی طرح سورج اور چاند کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے روشنی حاصل ہوتی ہے ؛ لیکن ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کا پورا حساب وکتاب اور نظام الاوقات سورج اور چاند کی گردش سے متعلق ہے، اسی سے سال، مہینے اور دن بنتے ہیں اور اسی سے منٹ اور سکنڈ مقرر ہوتے ہیں ، اگر چاند، سورج کی گردش نہ ہوتی تو انسان کس طرح اپنے کاموں کے اوقات مقرر کرتا اور زندگی کا نظام مرتب ہوتا ؟ تارے کی روشنی ایسی نہیں ہوتی جس سے آدمی راستے چل سکے، مگر سمندر اور صحرا کی اتھاہ تاریکیوں میں یہی ستارے لوگوں کے لئے راستے جاننے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور غیر معمولی سائنسی ترقی کے باوجود آج بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے، ایسی ایسی نعمتیں کیا خود بخود وجود میں آگئیں ؟ نہیں اور یقیناً نہیں ، یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کے پیچھے خدا کی ذات کار فرما ہے۔

﴿۲﴾ قرآن میں دو مرحلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک ''مستقر'' دوسرے ''مستودع'' —— مستقر جائے قرار کو کہتے ہیں ، جہاں آدمی زیادہ عرصہ یا ہمیشہ ہمیش رہے، اور مستودع کے معنی 'امانت گھر' کے ہیں ، یعنی ایسی جگہ جہاں عارضی قیام ہو، اسی مناسبت سے ←

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ
وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ
ع ۱۲ ۶ ۱۸ وَ بَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا ہے، پھر کونپل سے ہری ٹہنیاں نکالی ہیں، جس سے ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں کے گچھوں میں سے زمین کی طرف لٹکتے ہوئے خوشے، نیز انگور، زیتون اور انار کے باغات، جن میں سے بعض ایک دوسرے کے جیسے ہیں، اور بعض جدا جدا ہیں، جب اس کا پھل آجائے تو اس کو دیکھو اور اس کے پکنے کو دیکھو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۹﴾ ان لوگوں نے جنوں میں سے اللہ کے شریک ٹھہرا لئے ہیں؛ حالاں کہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان لوگوں نے بغیر علم کے تہمت تراشی کی ہے کہ اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا بیٹھے، جو کچھ وہ لوگ کہتے ہیں، اللہ اس سے پاک اور بلند و برتر ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۰﴾

← اس آیت کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ مستقر سے مراد آخرت ہے، جہاں جنت و دوزخ میں انسان ہمیشہ کے لئے رہے گا اور مستوع سے مراد انسان کی عارضی قیام گاہ ہے، چاہے ماں کا پیٹ ہو، زمین پر اس کا قیام ہو، یا قبر کی منزل ہو، دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ان دونوں کا تعلق دنیا ہی سے ہے، مستقر سے مراد ماں کا پیٹ ہے، جس میں بچہ پیدائش سے پہلے زیادہ دنوں تک رہتا ہے اور مستودع سے مراد باپ کی صلب ہے، اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق مستقر سے مراد زمین کا قیام ہے اور مستودع سے مراد پیدا ہونے سے پہلے کے مراحل ہیں، —— اس حقیر نے پہلی تفسیر کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

﴿۱﴾ ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی مختلف غذائی نعمتوں کا ذکر ہے کہ اسی پانی کو —— جو چیزوں کو ڈبوتا اور بستیوں کو تخت و تاراج کر دیتا ہے —— اللہ نے انسان کے لئے پودوں اور درختوں کے اُگانے کا ذریعہ بنایا ہے، پانی ایک بہتا ہوا مادّہ ہے؛ لیکن اسی سے بالکل مختلف قسم کی ٹہنیاں اور دانے نکلتے ہیں، یہی پانی مختلف درختوں میں پہنچ کر کہیں کھجور بن جاتا ہے اور کہیں انگور، کہیں زیتون اور کہیں اناج، پھر پھلوں میں غیر معمولی تنوع ہے، بعض پھل شکل اور مزہ میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض ایک دوسرے سے بالکل مختلف، اِن پھلوں کے پکنے کا بھی خدا کی طرف سے ایک مقررہ نظام ہے، کوئی گرمی میں تیار ہوتا ہے اور کوئی سردی میں اور کوئی برسات میں، جس کے پکنے کے لئے جو درجہ حرارت کافی ہوتا ہے، وہاں اسی نسبت سے حرارت پہنچتی ہے، ←

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۰۳﴾

اللہ آسمانوں کو اور زمین کو وجود میں لانے والے ہیں، اس کی اولاد کیوں کر ہوسکتی ہے، جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے، اس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۰۱﴾ وہی خدا تمہارا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے؛ اس لئے اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کا کارساز ہے ﴿۱۰۲﴾ (دنیا میں) آنکھیں اس کا دیدار نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا دیدار کرسکتا ہے اور وہ بہت باریک بیں اور خبر رکھنے والا ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۳﴾

← کھجوروں کے پکنے کے لئے پچاس درجہ تمازت کی ضرورت ہوتی ہے، تو نخلستانی علاقوں میں اسی طرح تمازت پہنچتی ہے، یہ سب خدا کی قدرت کے جلوے اور اس کی وحدت کی نشانیاں ہیں۔

﴿۲﴾ اہل مکہ کہا کرتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اسی طرح بعض بد دینوں کا دعویٰ تھا کہ نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ اور ابلیس لعین دونوں بھائی ہیں، انسان اور حیوان کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور جنات، درندے اور بچھڑوں کو ابلیس نے، یہ اور اس طرح کے افکار کو رد کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرانا اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتانا محض افتراء اور جھوٹ ہے؛ کیوں کہ اللہ پوری کائنات کا بشمول انسانوں کے خالق ہے اور خالق وہ ہے جو کسی واسطہ کے بغیر چیزوں کو پیدا کرے، جب کہ والد اپنی اولاد کے لئے بالواسطہ ذریعہ بنتا ہے اور اپنے جوڑے کا محتاج ہوتا ہے؛ اس لئے خالق اور والد کے مقام میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

﴿۱﴾ اکثر مشرک قوموں نے خدا کا ایک پورا خاندان بنا رکھا ہے؛ یہاں تک کہ عیسائی جو اپنے موحد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسی کی تردید فرما رہے ہیں کہ عام فطرت کے مطابق اولاد کے لئے بیوی کا واسطہ ضروری ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیوی بنائی ہی نہیں ہے۔

﴿۲﴾ یعنی دنیا میں انسان کو جو آنکھیں دی گئی ہیں، ان کی صلاحیت محدود ہے، وہ تو سورج کی کرنوں پر بھی ٹھہر نہیں پاتیں؛ چہ جائے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں؛ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار الٰہی کی خواہش کی تو انھیں فرمایا گیا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے ''لن ترانی'' (الأعراف:۱۴۳) پھر کسی انسان یا مخلوق کی آنکھ کیوں کر اللہ کا دیدار کرسکتی ہے؛ اس لئے اس پر اتفاق ہے کہ دنیا میں عام انسان اللہ کا دیدار نہیں کرسکتا اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قیامت میں اہل جنت کو اللہ کے جو انعامات حاصل ہوں گے، ان میں سب سے بڑا انعام یہ ہوگا کہ وہ اللہ کا دیدار کرسکیں گے، سورۂ قیامت میں اس کی صراحت موجود ہے ''وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ، اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' (قیامه:۲۲-۲۳)؛ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا دیدار کیا ہے یا نہیں؟ اُم المومنین سیدہ عائشہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور بہت سے سلف صالحین اس کے قائل تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوا ہے اور اللہ کا ارشاد ''لقد راٰہ بالأفق المبین'' (تکویر:۲۳) سے مراد یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے ہوئے اُفق میں ←

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا
عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۶﴾

تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیلیں آچکی ہیں، پس! جو (عبرت کی نظر سے) دیکھے گا، وہ اپنے ہی نفع کے لئے دیکھے گا، اور جو اندھا ہو جائے گا، اس کا گناہ اسی پر ہوگا اور میں تم پر نگراں نہیں ہوں ﴿۱﴾ ﴿۱۰۴﴾ اور ہم اس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں؛ تاکہ وہ کہیں کہ آپ نے کسی سے پڑھ لیا ہے، ﴿۲﴾ اور تاکہ ہم اِن دلیلوں کو سمجھدار لوگوں کے لئے اچھی طرح واضح کر دیں ﴿۱۰۵﴾ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے جو وحی کی گئی ہے، اس کی پیروی کیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور شرک کرنے والوں کی طرف توجہ نہ دیجئے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۶﴾

← حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا ہے، اور ''ولقد رأہ نزلۃ اخری'' (نجم: ۱۳) کے بارے میں اُم المومنین نے فرمایا کہ میں نے خود ان آیات کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان آیات میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے؛ کیوں کہ ان ہی دو موقعوں پر میں نے ان کو ان کی اصل صورت و ہیئت میں دیکھا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انسان کے لئے رؤیت باری کے ممکن نہ ہونے پر دو آیتوں سے استدلال فرمایا ہے، ایک یہی ''لا تدرکہ الأبصار'' (انعام: ۱۰۳) کہ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں، دوسرے ''وماکان لبشر أن یکلمہ اللہ إلا وحیا أو من وراء حجاب'' (شوریٰ: ۵۱) یعنی کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے گفتگو کرے، سوائے اس کے کہ اللہ کی طرف سے وحی آئے یا حجاب کے واسطے سے گفتگو ہو — اس کے مقابلہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا ہے، اگر اس رائے کو قبول کیا جائے تو ''لا تدرکہ الأبصار'' کے معنی ہوں گے: دنیا کی یہ آنکھیں اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتیں (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۷/۵۶-۵۴) — ان میں سے پہلا نقطۂ نظر قرآن و حدیث سے زیادہ قریب نظر آتا ہے اور یہی زیادہ تر مفسرین اور محدثین کی رائے ہے۔

﴿۱﴾ یعنی جیسے بارش ہر زمین میں ہوتی ہے؛ لیکن جس میں صلاحیت ہوتی ہے، وہی اس سے بارآور ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کی دلیلیں تو ہر ایک کے سامنے ہیں؛ لیکن جو کھلے دل سے اس پر غور کرے گا، اس کو فائدہ ہوگا اور جو دیکھ کر بھی اَن دیکھی کرے گا، وہ ہدایت سے محروم رہے گا اور خود ہی نقصان اُٹھائے گا۔

﴿۲﴾ یعنی انھیں سمجھنا چاہئے کہ ایک اُمی شخص جو کسی استاذ کے سامنے بیٹھا تک نہیں، نہ کسی تعلیم گاہ سے استفادہ کیا، نہ اسے لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کا پڑھنا آتا ہے، وہ ایسی قیمتی اور معقول باتیں کیسے کہہ سکتا ہے؛ لیکن اس کے برخلاف ان کے سوچنے کا رُخ یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ آپ (ﷺ) یہ ساری باتیں کسی سے پڑھ کر آئے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی ان کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ نہ ہوئیے۔

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَ لَا
تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ
اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ
جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا
يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ
يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۳/۱۹

اگر اللہ چاہتے تو یہ شرک میں مبتلا نہ ہوتے اور ہم نے آپ کو ان پر نگراں نہیں بنایا ہے اور نہ آپ ان پر داروغہ ہیں ﴿۱۰۷﴾ اللہ کے سوا وہ جن کی عبادت کرتے ہیں، ان کو برا بھلا نہ کہو، کہ وہ بھی حد سے تجاوز کرتے ہوئے جہالت کی وجہ سے اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے، ﴿۱﴾ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے لئے ان کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر ان کے رب کی طرف ہی ان کی واپسی ہے، پس! اللہ ان کو ان کے اعمال کے بارے میں بتا دیں گے ﴿۱۰۸﴾ وہ خوب زور لگا لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی آ گئی تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے، آپ کہہ دیں کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور (اے رسول!) تمہیں کیا خبر کہ نشانیاں آ بھی جائیں تو وہ ایمان نہیں لائیں گے؟ ﴿۱۰۹﴾ اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسا کہ وہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا ہی رہنے دیں گے۔ ﴿۱۱۰﴾

﴿۱﴾ اس ارشاد سے دو اہم باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ آخرت میں تو حق و باطل کے اعتبار سے ثواب و عذاب ہوگا؛ لیکن دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مذاہب کی مقدس شخصیتوں کی بے احترامی نہ کی جائے، ورنہ اس سے جذبات مشتعل ہوں گے اور سماج کا امن و امان درہم برہم ہو جائے گا، دوسرے: جب تم ان کو برا بھلا کہو گے، جو دوسروں کے نزدیک مقدس اور قابل احترام ہیں تو وہ بھی تمہارے خدا کو، رسول کو اور مقدس شخصیات و مقامات کو برا بھلا کہیں گے، اس طرح گویا ہم خود اسلام کی مقدس چیزوں کو برا بھلا کہلانے کا سبب بنیں گے، اسی سے فقہاء کے ایک اُصول 'سَدِّ ذریعہ' کی تائید ہوتی ہے، یعنی اگر کوئی بات جائز بھی ہو؛ لیکن وہ کسی برائی کا ذریعہ بنتی ہو تو اس سے بچنا ضروری ہے؛ کیوں کہ گناہ کا ذریعہ بھی گناہ ہوتا ہے اور نیک کام کا ذریعہ بھی باعث اجر و ثواب ہے۔

وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ یَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ لِتَصْغٰۤى اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِیَرْضَوْهُ وَ لِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور اگر ہم ان پر فرشتوں کو اُتار دیتے، مردے ان سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم ان کے سامنے تمام چیزوں کو جمع کر دیتے، تب بھی جب تک اللہ نہ چاہتے، وہ ہرگز ایمان نہیں لاتے؛ لیکن ان میں سے اکثر علم سے بے بہرہ ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۱۱﴾ اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے انسان اور جِنّات میں سے شیاطین کو دشمن بنا دیا تھا، جن میں سے ایک دوسرے کو دھوکہ میں رکھنے کے لئے چکنی چپڑی باتیں کہا کرتے تھے اور اگر آپ کے پروردگار چاہتے تو وہ ایسا نہیں کرتے؛ اس لئے آپ ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو چھوڑ دیجئے ﴿۱۱۲﴾ اور اس لئے بھی کہ اس کی طرف ان لوگوں کا دل پوری طرح جھک جائے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ اسے پسند کرلیں اور جو کچھ گناہ کرنے والے ہیں، کرگزریں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۱۳﴾

﴿۱﴾ ولید بن مغیرہ مخزومی، عاص بن وائل سَہمی، اَسوَد بن عبد یغُوث زُہری، اَسوَد بن مُطّلب اور حارث بن طلاطلہ مشہور لوگوں میں تھے اور قرآن مجید کا مذاق اُڑانے میں پیش پیش رہتے تھے، انھوں نے اہل مکہ کے ایک وفد کے ساتھ آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ یا تو آسمان سے فرشتے اُتر آئیں اور وہ آپ (ﷺ) کے رسول ہونے کی شہادت دیں، یا ہمارے جو بزرگ مر چکے ہیں زندہ کردیئے جائیں؛ تاکہ ہم ان سے دریافت کرلیں کہ آپ کی دعوت حق ہے یا باطل؟ یا اللہ تعالیٰ اور فرشتے ہمارے روبرو آجائیں اور آپ کے دعویٰ کے درست ہونے کی ضمانت دیں، تب ہم ایمان لائیں گے، (الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/۴۱، ابن کثیر: ۱/۶۱۰) یہ اور اس طرح کے مطالبات کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی کہ اس طرح کے نامعقول مطالبات محض ان کے بہانے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محروم کردیئے گئے ہیں؛ اس لئے اگر یہ سارے مطالبات پورے کردیئے جائیں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿۲﴾ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور دلداری ہے کہ آپ ﷺ اہل مکہ کی عداوت و دشمنی پر رنجیدہ نہ ہوں؛ کیوں کہ ہر نبی برحق کے دشمن رہا کئے ہیں، یہ دشمن انسان بھی تھے اور جنات بھی، جو اُن کی پیروی کرنے والوں کو دھوکہ میں رکھا کرتے تھے؛ اس لئے عداوت ومخالفت کا پیش آنا دعوت حق کی پرانی سنت ہے اور ہر نبی کو کانٹوں بھرے راستہ سے گذرنا پڑا ہے، نیز اس کا پیش آنا خود اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے؛ اس لئے آپ اس کو خاطر میں لائے بغیر اپنے کام کئے جایئے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي
الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

کیا اللہ کے سوا میں کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں؛ حالاں کہ اللہ نے تمہاری طرف واضح کتاب اُتار دی ہے اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب سچائی کے ساتھ آپ کے پروردگار کی جانب سے اُتاری ہوئی ہے؛ لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجائیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۱۴﴾ اور آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، ﴿۲﴾ اس کے کلام میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا، ﴿۳﴾ اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۱۱۵﴾ اور اگر آپ زمین میں موجود اکثر لوگوں کا کہا ماننے لگیں تو وہ تو آپ کو اللہ کے راستہ ہی سے ہٹادیں گے، وہ صرف گمان کی پیروی کرتے اور محض اٹکل کی باتیں کرتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۱۶﴾

﴿۱﴾ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اپنی طرف سے ہونے کا فیصلہ کردیا اور اس کی معنوی شہادت خود اس کتاب میں موجود ہے کہ وہ زندگی میں پیش آنے والے احکام و مسائل کو تفصیل سے بیان کرتی ہے اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ گو زبان سے اقرار نہ کریں؛ مگر دل سے یقین کرتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ ہی کی طرف سے ہے تو پھر اس کتاب کے اللہ کی طرف سے ہونے کے بارے میں کسی اور سے فیصلہ کرانے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ — اس آیت کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کو تلقین کی گئی ہے کہ آپ (ﷺ) شک کرنے والوں میں نہ ہوجائیے، ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کو اس سلسلہ میں کیسے شک ہوسکتا تھا، جب کہ آپ پر خود وحی نازل ہوتی تھی، اصل میں یہ خطاب اِس اُمت سے ہے کہ ان کے دل میں قرآن مجید کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک و شبہ کا کوئی کانٹا نہیں چبھنا چاہئے۔

﴿۲﴾ قرآن مجید میں بنیادی طور پر دو طرح کے مضامین آئے ہیں، ایک: گذشتہ، موجودہ اور آئندہ کی خبریں اور واقعات، یہ سچائی پر مبنی ہیں، دوسرے: ایمانیات اور عملی زندگی سے متعلق احکام، یہ پوری طرف انصاف پر مبنی ہیں؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سچائی اور عدل و انصاف ہر دو اعتبار سے کامل و مکمل ہے۔

﴿۳﴾ یعنی نہ اللہ کے فیصلوں میں کوئی تبدیلی ہوسکتی ہے، نہ قرآن مجید کے الفاظ بدلے جاسکتے ہیں اور نہ معنی۔

﴿۴﴾ انسان کا عام مزاج یہ ہے کہ جس عقیدہ اور عمل کی طرف لوگوں کی بھیڑ دیکھتا ہے، اس کو قبول کرلیتا ہے، چاہے اس کے پیچھے کوئی دلیل ہو یا نہ ہو، اس آیت میں انسان کی اِسی نفسیاتی غلطی پر متنبہ کیا جارہا ہے کہ کسی بات کے قابل قبول ہونے کے لئے اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ عقلی اور الہامی دلیلوں سے ثابت ہے یا نہیں؟ اس بات کی اہمیت نہیں ہے کہ اس کو زیادہ لوگ مانتے ہیں یا کم لوگ؟ اگر زیادہ لوگ مانتے ہیں؛ لیکن بلا دلیل محض اندازہ اور تخمین کی بنا پر، تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۞۱۱۷ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ
اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۞۱۱۸ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ
بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۞۱۱۹

(اے رسول !) یقیناً آپ کے پروردگار ان لوگوں سے خوب واقف ہیں، جو اللہ کے راستہ سے ہٹ جاتے ہیں، اور صحیح راستہ پر رہنے والوں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں، ۞۱۱۷ اگر تم اللہ کے احکام پر ایمان رکھتے ہو تو جس (ذبیحہ) پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اسی میں سے کھاؤ ۞۱۱۸ اور کیا وجہ ہے کہ تم اس جانور میں سے نہیں کھاتے، جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جو چیزیں تم پر حرام کی گئی ہیں، اللہ نے ان کو تمہارے سامنے وضاحت سے بیان کردیا ہے، ﴿۱﴾ سوائے اس کے کہ تم اس کو کھانے پر مجبور ہو جاؤ، (تو مجبوری میں حرام چیز کو بھی کھانے کی گنجائش ہے) ﴿۲﴾ اور بہت سے لوگ اپنی خواہشات میں پڑ کر علم و آگہی کے بغیر بہکاتے رہتے ہیں، ﴿۳﴾ بلا شبہ آپ کے پروردگار زیادتی کرنے والوں سے خوب واقف ہیں۔ ۞۱۱۹

﴿۱﴾ مشرکین جانوروں کو مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کے نام سے ذبح کیا کرتے تھے، جس کے پیچھے یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ ان ہی معبودوں نے اُن کے لئے ان جانوروں کو پیدا کیا ہے، گویا انھوں نے ذبح و قربانی کو اپنی مشرکانہ فکر کا مظہر بنا دیا تھا، اسلام نے اس موقع پر شرک کی تردید اور دلوں میں عقیدہ توحید کو راسخ کرنے کے لئے حکم دیا کہ جانور اسی وقت حلال ہوگا، جب کہ اس پر اللہ کا نام لیا جائے اور اللہ کے سوا کسی اور کا نام نہ لیا جائے؛ چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اگر بھول کر بھی اللہ کا نام نہ لے تب بھی ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جان بوجھ کر اللہ کا نام لینا چھوڑ دے تب جانور حرام ہوتا ہے، اگر بھول کر اللہ کا نام نہ لے سکا تو ذبیحہ حرام نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ایک تو شریعت کے بنیادی اُصول میں سے یہ بھی ہے کہ بھول میں ہونے والا کام بہت سی صورتوں میں قابل عفو ہوتا ہے، جیسے روزہ میں بھول کر کھالے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، دوسرے: اللہ تعالیٰ نے اسی سورت کی آیت نمبر: ۱۲۱ میں اللہ کا نام نہ لئے ہوئے ذبیحہ کے کھانے کو فسق قرار دیا ہے اور فسق یعنی گناہ وہی عمل ہوتا ہے، جس میں قصد و ارادہ کا دخل ہو، بھول کر جو کام کیا جائے وہ بالاتفاق فسق نہیں ہے، یہی نقطۂ نظر مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ہے؛ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اصل مقصود یہ ہے کہ جانور پر غیر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اگر غیر اللہ کا نام لیا جائے تب جانور حرام ہوگا، رہ گیا مسلمان ذبح کرنے والے کا ذبیحہ پر 'بسم اللہ' کہنا تو یہ سنت ہے، اگر قصداً نہ کہے تب بھی ذبیحہ حرام نہیں ہوگا (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷/۷۶-۷۵) —— اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر قرآن و حدیث سے زیادہ ہم آہنگ بھی ہے اور اعتدال پر مبنی بھی، واللہ اعلم —— اس آیت میں یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن کے الفاظ کے اعتبار سے ہر کھائی جانے والی چیز پر بسم اللہ کہا جانا چاہئے؛ لیکن فقہاء نے آیت کے سیاق و سباق، دوسرے مواقع پر ذبیحہ سے متعلق وارد ہونے والے احکام اور احادیث کی روشنی میں اس کو جانوروں کے ذبیحہ سے متعلق رکھا ہے؛ لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کا بھی موجود ہے کہ انسان کوئی بھی حلال چیز کھائے یا پیئے اس کو بسم اللہ پڑھنا چاہئے؛ یہاں تک کہ مشہور فقیہ عطاء رحمہ اللہ تو اس کو واجب قرار دیتے ہیں۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۱۲/۵۴۵) ←

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا
یَقْتَرِفُوْنَ۝۱۲۰ وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ
لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ۝۱۲۱

ع ۱۴/۱

گناہ کھلے ہوں یا چھپے، ان کو چھوڑ دو، ﴿۱﴾ جو لوگ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، یقیناً انھیں جلد ہی گناہ کی سزا دی جائے گی ۝۱۲۰ اور ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، یہ یقیناً گناہ ہے، اور شیاطین اپنے دوستوں کو ورغلاتے رہتے ہیں کہ وہ تم لوگوں سے کج بحثی کریں اور اگر تم ان کی بات مان جاؤ تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ ﴿۲﴾ ۝۱۲۱

← ﴿۲﴾ یعنی انسان اپنی جان بچانے کے لئے مردار یا کسی حرام چیز کے کھانے پر مجبور ہو جائے تو اس کے لئے جان بچانے کے بقدر اسے کھا لینے کی گنجائش ہے۔

﴿۳﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بعض مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے بحث کی کہ تم لوگ اپنے ذبح کئے ہوئے جانور کو تو کھاتے ہو اور اسے حلال کہتے ہو، اور مردار — جو گویا اللہ تعالیٰ کے ذبح کئے ہوئے ہیں — کو حرام قرار دیتے ہو، ابوداؤد کی روایت میں مشرکین کی بجائے یہودیوں کا ذکر ہے کہ یہ عجیب بات ہے کہ جسے ہم مار ڈالیں، وہ تو حلال اور جسے خود اللہ تعالیٰ نے مارا ہے اسے حرام قرار دیتے ہو، (قرطبی: ۷/۴۹) اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ علم و آگہی کے بغیر بھٹکانے کی کوشش ہے؛ کیوں کہ ذبح کا مقصد یہ ہے کہ جسم میں پایا جانے والا بہتا ہوا خون — جو ناپاک بھی ہے اور صحت کے لئے نقصان دہ بھی — اچھی طرح بہہ جائے، اگر جانور کو ذبح نہ کیا جائے اور وہ اپنی موت آپ مر جائے تو یہ خون نکل نہیں پاتا، غرض کہ یہ لوگ حکم شریعت کی مصلحت کو جانے بغیر اعتراض کر رہے ہیں۔

﴿۱﴾ کھلے گناہ سے وہ گناہ مراد ہیں، جو اعضاء و جوارح سے کئے جاتے ہیں اور دیکھنے والے اس سے واقف ہو سکتے ہیں، اور چھپے ہوئے گناہ سے ان گناہوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا تعلق دل اور عقیدہ سے ہے، جیسے کفر و شرک، نفاق، کینہ وغیرہ، معلوم ہوا کہ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ضروری ہے، نہ یہ درست ہے کہ انسان ظاہر کی اصلاح کرے؛ مگر اپنے باطن کی طرف سے غافل رہے، اور نہ یہ صحیح ہے کہ ظاہر سے متعلق شریعت کے احکام کو نظر انداز کر دیا جائے اور کہا جائے کہ اصل تو باطن کی صفائی ہے، جیسا کہ بعض گمراہ نام نہاد صوفیاء کہتے ہیں کہ جو مقامِ ''حقیقت'' تک پہنچ گیا، وہ احکام شریعت کا پابند نہیں اور جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ آنکھوں کے پردے کی اہمیت ہے، دل کے پردے کی اہمیت نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اگر مشرکین کی باتوں سے متاثر ہو کر تم انھیں حلال سمجھنے لگے، تو یہ بھی شرک ہوگا، یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان صرف غیر اللہ کی عبادت کرنے ہی سے مشرک نہیں ہو جاتا؛ بلکہ اگر وہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام اور حرام کی ہوئی چیز کو حلال کہنے لگے؛ حالاں کہ اس پر کتاب و سنت کی یقینی دلیل موجود ہو تو اس سے بھی انسان ایمان کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

جو شخص مردہ ہو پھر ہم اسے زندہ کردیں اور اس کے لئے روشنی بھی مہیا کردیں، جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان چلے، کیا اس کی طرح وہ ہوسکتا ہے، جو تاریکیوں میں پڑا ہو، وہ اس سے نکل ہی نہیں پائے؟ اسی طرح ایمان نہ لانے والوں کو ان کے کام خوشنما معلوم ہوتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۲۲﴾ ایسے ہی ہم نے ہر شہر میں مجرموں کے سرغنے رکھ دیئے ہیں؛ تاکہ وہ اس میں مکر وفریب پھیلائیں، وہ اپنے آپ ہی کے ساتھ فریب کررہے ہیں، ﴿۲﴾ اور وہ (اس بات کو) سمجھ نہیں رہے ہیں۔ ﴿۱۲۳﴾

﴿۱﴾ اس میں مردہ سے مراد کفر کی حالت ہے اور زندہ کرنے سے مراد ایمان کی توفیق عطا فرمانا ہے، جیسے مردہ چیزوں کی حقیقتوں کے ادراک سے محروم ہوتا ہے اور زندہ شخص تمام چیزوں کو دیکھ بھی سکتا ہے اور سمجھ بھی سکتا ہے، اسی طرح جو ایمان سے محروم ہے، وہ غیبی حقیقتوں یعنی اپنے خالق کے وجود، آخرت اور جنت و دوزخ کو سمجھنے سے قاصر ہے اور مسلمان ان حقیقتوں کو سمجھتا بھی ہے اور اس پر یقین بھی رکھتا ہے، اسی طرح ایمان کو روشنی اور کفر کو تاریکی سے تعبیر کیا گیا ہے، روشنی میں چیزیں ویسی ہی نظر آتی ہیں، جیسی وہ ہیں، اور تاریکی میں یا تو چیزیں نظر نہیں آتیں یا پوری طرح درست اور صحیح نظر نہیں آتیں، ایمان کے ذریعہ انسان حقیقت اور سچائی سے واقف ہوتا ہے اور کفر میں خلافِ حقیقت باتوں کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے؛ اس لئے ایمان کے لئے روشنی اور کفر کے لئے تاریکی سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی تھی — پھر نور یعنی روشنی عربی گرامر کے لحاظ سے ''واحد'' یعنی (Singular) ہے اور کفر کے لئے 'ظلمات' یعنی ''تاریکیاں'' جمع (Plural) کا صیغہ ہے؛ اس لئے کہ ہدایت کا راستہ تو ایک ہی ہے اور گمراہی کے راستے اور کفر کی قسمیں بہت سی ہیں، خدا کا انکار بھی کفر ہے، اس کے ساتھ شرک بھی کفر ہے، انبیاء پر ایمان نہ رکھنا بھی کفر ہے، کسی نبی کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا بھی کفر ہے، کوئی شخص انبیاء پر ایمان رکھے مگر رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی نہ مانے اور آپ کے بعد اپنی یا کسی اور کی نبوت کا مدعی ہو، یہ بھی کفر ہے، نبوت محمدی پر ایمان رکھتا ہو؛ لیکن شریعت محمدی کی اتباع کو ضروری نہ سمجھتا ہو، یہ بھی کفر ہے، غرض کہ کفر اور گمراہی کی بہت سی صورتیں ہیں اور ہدایت کا ایک ہی راستہ متعین ہے۔

﴿۲﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی دلجوئی کی گئی ہے کہ سردارانِ مکہ جس سرکشی پر اُترے ہوئے ہیں اور بے جا مطالبات واعتراضات کئے جارہے ہیں، نیز دوسروں کو بھی گمراہ کرتے اور بھٹکاتے ہیں، اس سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ اس طرح کی صورتِ حال گذشتہ پیغمبروں کے ساتھ بھی پیش آتی رہی ہے، بظاہر یہ دوسروں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش ہے؛ لیکن چوں کہ وہ اللہ کے پاس خود ہی اس کی سزا پائیں گے، اس لئے دراصل وہ اپنے آپ ہی کو فریب دے رہے ہیں۔

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جب ان کے سامنے کوئی حکم آتا ہے تو کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک کہ ہمیں بھی وہ نہیں دے دیا جائے، جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا ہے، اللہ خوب واقف ہیں کہ اپنی رسالت، کس کو عطا فرمائیں؟ ﴿۱﴾ جن لوگوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے، عنقریب وہ اپنی شرارت کی وجہ سے اللہ کے سامنے ذلت اور شدید عذاب سے دوچار ہوں گے ﴿۱۲۴﴾ پس اللہ جسے ہدایت دینا چاہتے ہیں، اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں اور جس کو ہدایت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں، اس کے سینہ کو خوب تنگ کر دیتے ہیں؛ گویا کہ وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے، ﴿۲﴾ اسی طرح جو لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، اللہ ان پر (کفر کی) گندگی ﴿۳﴾ کو مسلط کر دیتے ہیں۔ ﴿۱۲۵﴾

﴿۱﴾ ابوجہل اور ولید بن مغیرہ وغیرہ کہنے لگے کہ مال و دولت، عمر اور تجربہ میں ہم آپ سے بڑھے ہوئے ہیں؛ اس لئے جب تک ہمیں نبوت نہ دی جائے اور جبرئیل ہمارے پاس وحی لے کر نہ آئیں ہم قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ارشاد فرمایا، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دولت، طاقت، عمر وغیرہ ایسی باتیں نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے کوئی شخص نبی بنا دیا جائے، نبوت محنت اور اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتی؛ بلکہ یہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قلبی کیفیت اور روحانی استعداد کی بنا پر جسے چاہتے ہیں، اپنی نبوت کے لئے منتخب فرماتے ہیں؛ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو بنایا تو ان کے قلوب میں جھانک کر دیکھا، ان میں جن کے قلوب سب سے زیادہ روشن تھے، انھیں اپنی نبوت کے لئے منتخب فرمایا، (تفسیر بغوی: ۲/ ۶۲) غرض کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ کسے نبی بنانا چاہئے؟

﴿۲﴾ درست عقیدہ اور عمل کے لئے دل کا کھل جانا ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، یہ بہت بڑی نعمت ہے اور سب سے بڑی بے توفیقی یہ ہے کہ انسان کا دل حق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو، اس کی مثال اس مریض کی ہے، جو بیمار ہو مگر دوا کو دیکھ کر اسے متلی آنے لگتی ہو — قرآن مجید کی یہ تعبیر کہ اس کا دل ایسا تنگ ہو جاتا ہے، گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہے، ایک تشبیہ ہے؛ کیوں کہ جب کوئی انسان زمین کی فضا سے باہر نکلتا ہے تو مختلف سیاروں کی کشش اس کے قلب کے لئے ناقابل برداشت ہونے لگتی ہے، گویا قرآن کی اس تشبیہ میں ایک ایسی سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس کا موجودہ دور میں انکشاف ہوا ہے۔

﴿۳﴾ گندگی سے مراد شرک ہے؛ کیوں کہ فکر و عقیدہ کے اعتبار سے یہ ایسی گندگی ہے کہ شاید پیشاب اور پائخانہ کی گندگی بھی اس سے کمتر ہے، 'رجس' کے اصل معنی گندگی ہی کے ہیں؛ چنانچہ قرآن مجید نے ایک اور موقع پر بھی شرک کو ''رِجس'' سے تعبیر کیا ہے ''فاجتنبوا الرجس من الأوثان'' (الحج: ۳۰) تاہم بعض اہل علم نے اس کا ترجمہ عذاب اور پھٹکار سے بھی کیا ہے، اور اس کی بھی گنجائش ہے۔ (تفسیر بغوی: ۲/ ۶۳)

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ
قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ
وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۸ ۲
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ
لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى
اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

یہ آپ کے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے نشانیوں کو واضح کر دیا ہے ﴿۱۲۶﴾ ان کے لئے ان کے (نیک) اعمال کی وجہ سے ان کے رب کے پاس سلامتی کی جگہ ہے اور اللہ خود ان کے کارساز ہیں ﴿۱۲۷﴾ اور جس دن اللہ اُن سب کو جمع کریں گے (تو اللہ فرمائیں گے) اے جنوں کے گروہ! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا شکار بنالیا، اور انسانوں میں سے ان کی پیروی کرنے والے بھی بول اٹھیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھایا ہے اور آپ نے ہمارے لئے جو مدت مقرر کی تھی، ہم اس کو آپہنچے ہیں، ﴿۱﴾ اللہ فرمائیں گے: آگ ہی تمہارا ٹھکانا ہے، تم ہمیشہ اسی میں رہو گے، سوائے اس کے کہ اللہ ہی کو (کچھ اور) منظور ہو، ﴿۲﴾ بے شک آپ کے رب خوب حکمت والے اور جاننے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾ اور اسی طرح ظالموں میں سے ایک کو دوسرے پر ہم ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے مسلط کر دیتے ہیں ﴿۱۲۹﴾ اے جن وانس کے گروہ! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے، جو تم پر میرے احکام کو بیان کرتے تھے اور تم کو آج کے اِس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے؟ ﴿۳﴾ وہ کہیں گے: ہم اپنے آپ کے خلاف گواہ ہیں، انہیں دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال دیا تھا اور وہ (اب خود) اپنے آپ کے خلاف گواہی دے رہے ہیں کہ وہ کافر تھے۔ ﴿۱۳۰﴾

﴿۱﴾ یعنی قیامت کے دن کفر کی طرف دعوت دینے والے سرداروں اور عام کافروں کا آمنا سامنا ہوگا؛ پھر وہ اپنی اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں گے، ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سرداروں کی بات مانی گئی اور اس طرح ان کو عزت حاصل ہوئی، یہ ان کا فائدہ ہے، عوام کے لئے یہ فائدہ تھا کہ اسلام قبول کرنے میں ظاہر ہے کہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی پابندیاں ہوں گی اور کفر کا راستہ اختیار کرنے میں اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کی مکمل آزادی ہے، نہ حلال وحرام کی ←

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ (پیغمبروں کو بھیجنا) اس لئے تھا کہ آپ کے پروردگار کسی آبادی کو ظلم کرنے کے باوجود اس حال میں ہلاک نہیں کرتے کہ وہ (اللہ کے احکام سے) بے خبر ہوں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۳۱﴾

← بندشیں ہیں نہ آخرت کا خوف، بہرحال اعتراف جرم کے بعد ان کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوگا آگ والے طبقے سے نکال کر بعض جہنمیوں کو ٹھنڈک والے طبقہ (جس کو زمہریر کہتے ہیں) میں ڈال دیں گے، یہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہ ہوگا؛ لیکن عذاب کی نوعیت بدلی ہوئی ہوگی۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ کا ان الفاظ میں قیامت کے دن، انسان اور جنات سے خطاب کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ جیسے انسانوں کا مستقل وجود ہے، اسی طرح جنات بھی ایک اَن دیکھی مخلوق ہیں؛ اس لئے ان کے وجود کا انکار کرنا کفر ہے اور ان کا نظر نہ آنا عقلی طور پر جنوں کے نہ پائے جانے پر دلیل نہیں؛ اس لئے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، اس کے برخلاف بہت سے واقعات اور شواہد پیش آتے رہتے ہیں، جن سے اِس اَن دیکھی مخلوق کا موجود ہونا معلوم ہوتا ہے — اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جنات بھی احکام شریعت کے مکلف ہیں، نیز ان میں بھی مسلمان اور غیر مسلم اور صالح اور فاسق وفاجر لوگ موجود ہیں، جیسے انسانوں کو اُن کے اچھے برے کاموں پر جزا اور سزا ملے گی، اسی طرح انھیں بھی ملے گی، اللہ کی طرف سے آنے والے پیغمبروں نے اپنی تعلیمات دونوں تک پہنچائی ہیں؛ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ کیا جنوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ان ہی میں سے پیغمبر آتے رہے یا انسانوں میں جو پیغمبر آئے، وہی ان سے بھی خطاب کیا کرتے تھے؟ بعض حضرات کی رائے ہے کہ جنوں میں مستقل انبیاء ورسل آتے رہے ہیں؛ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ نبی انسان ہی میں سے ہوئے ہیں؛ کیوں کہ انسان سب سے اشرف مخلوق ہے اور جنوں میں 'منذرین' (ڈرانے والے) ہوا کرتے تھے، منذر سے مراد وہ جنات ہیں جنھوں نے انبیاء کا کلام سنا اور پھر اسے اپنی قوم تک پہنچایا؛ البتہ اس کا تعلق انسان کی تخلیق کے بعد کے زمانہ سے ہے، اس سے پہلے دنیا میں جن ہی بسائے گئے تھے، ان میں پیغمبر بھی جنات ہی ہوا کرتے ہوں گے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کا تو اندازہ ہے کہ ہندو مذہب میں محیر العقول شکلوں کے جو اوتار بتائے جاتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ جن نبی رہے ہوں؛ کیوں کہ جن کو مختلف شکلیں اختیار کرنے کی سہولت دی گئی ہے؛ (تفسیر مظہری: ۱۵۰/۴) تاہم اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت انسانوں کی طرف بھی ہوئی اور جنات کی طرف بھی؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر نبی خاص طور پر اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا کرتے تھے اور مجھے ہر سرخ وسیاہ کی طرف بھیجا گیا ہے ''بعثت إلی کل اسود واحمر'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں میں تبلیغ بھی کی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ مشرف بہ ایمان بھی ہوئے ہیں۔ (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۵۷/۷)

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب تک کسی گروہ پر دعوت حق پہنچ نہیں جاتی اور دین کی حجت پوری نہیں ہوجاتی، اس وقت تک ایمان وعمل سے محرومی پر اس قوم کی پکڑ نہیں کی جاتی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت کا نظام رکھا ہے اور پوری انسانی تاریخ میں ←

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ
اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ
اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ؕ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى
مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ
وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى
شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے لحاظ سے مرتبے ہیں اور آپ کے رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں، ﴿۱۳۲﴾
آپ کے پروردگار بے نیاز اور رحمت والے ہیں، اگر چاہیں تو تم لوگوں کو رخصت کردیں اور تمہارے بعد جسے
چاہیں آباد کریں، جیسا کہ تم لوگوں کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۳۳﴾ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا
ہے، یقیناً وہ آکر رہے گا اور تم خدا کو عاجز نہیں کرسکتے ﴿۱۳۴﴾ آپ کہہ دیجئے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو اور میں
بھی عمل کرتا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ آخرت کا بہتر انجام کس کے لئے ہے؟ یقیناً ظلم کرنے والوں کا بھلا
نہیں ہوگا ﴿۱۳۵﴾ اور وہ لوگ کھیتی اور جانوروں کی پیداوار میں سے ایک حصہ اللہ کے لئے رکھتے ہیں، پھر اپنے گمان کے
مطابق کہتے ہیں: یہ اللہ کے لئے ہے اور یہ ہمارے معبودوں کے لئے، پھر جو حصہ ان کے معبودوں کا ہوتا ہے، وہ تو
اللہ تک نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہوتا ہے، وہ ان کے معبودوں تک پہنچ جاتا ہے، کیا ہی بدترین انصاف ہے! ﴿۲﴾ ﴿۱۳۶﴾

← ہر عہد اور ہر گروہ میں اللہ کے نبی بھیجے جاتے رہے ہیں؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا، اب آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے اور آپ ﷺ کے عہد نبوت میں ایسے وسائل پیدا ہوگئے ہیں کہ آپ ﷺ کا لایا ہوا پیغام پوری روئے زمین پر پہنچ چکا ہے۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان لانے اور نہ لانے سے بے نیاز ہیں، اگر اللہ چاہیں تو تمہاری جگہ دوسری قوم کو دنیا میں بسا دیں اور انھیں ایمان کی توفیق عطا فرمادیں، جیسے دنیا میں پہلے دوسرے لوگ تھے اور اللہ نے ان کی نسل سے تمہیں پیدا کیا، وہ نہیں رہے اور تم موجود ہو، ایسا ہی تمہارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔

﴿۲﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اہل مکہ اپنی زمینی پیداوار اور چوپایوں کا کچھ حصہ اللہ کے نام پر رکھتے تھے اور اسے فقراء و مساکین اور مہمانوں کی مد میں خرچ کیا کرتے تھے، اور کچھ حصہ اپنے معبودان باطل کے لئے رکھتے تھے اور ان کو اپنے مندروں کے پجاریوں وغیرہ کے لئے رکھتے تھے، اگر باطل معبودوں والا حصہ ختم ہوجاتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے متعین کئے ہوئے ←

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٧﴾

اسی طرح بہت سے مشرکین کے لئے ان کے (خیالی) معبودوں نے اولاد کے قتل کر ڈالنے کو خوشنما بنادیا ہے؛﴿۱﴾ تاکہ وہ انھیں ہلاک کردیں اور اُن پر ان کے دین کو خلط ملط کردیں، ﴿۲﴾ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو وہ ایسا نہیں کرتے؛ اس لئے ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو رہنے دیجئے۔﴿۱۳۷﴾

← حصہ میں سے اس مد پر خرچ کرنے لگتے اور اگر مہمانوں اور فقراء وغیرہ کے مد کا غلہ ختم ہوجاتا تو دوسرے مد سے اس میں پیسے خرچ نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تو غنی ہے اور ہمارے دیوی دیوتا محتاج وضرورت مند ہیں، (مفاتیح الغیب:۶/۵۹۲) —قرآن نے اسی پر تنقید کی ہے کہ ایک تو غیر اللہ کو اللہ کا شریک اور مخلوق میں حصہ دار قرار دینا ہی غلط ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ بتوں کے لئے مخصوص حصہ میں تو اللہ تعالیٰ والے حصہ میں سے لے لیا جائے، اور اگر فقراء اور مہمانوں کی مد میں کمی ہوجائے تو معبودانِ باطل کی مد میں سے نہ لیا جائے، یہ کیسی ناانصافی اور ناعقلی کی باتیں ہیں!

﴿۱﴾ دنیا کی مختلف قوموں میں اولاد کی قربانی کا جاہلانہ اور توہم پرستانہ تصور رہا ہے، خود ہندوستان میں اب بھی کہیں کہیں ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں، عربوں میں اسلام سے پہلے مختلف اسباب کے تحت اولاد کُشی کے واقعات پیش آتے تھے، لڑکیوں کو اِس بے جا جذبۂ غیرت کے تحت زندہ دفن کردیا جاتا تھا کہ اگر وہ رہیں گی تو کسی کو داماد بنانا پڑے گا اور داماد بنانے کو شرم وعار کی بات سمجھا جاتا تھا، قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، اِس کا رواج زیادہ رَبِیعہ اور مُضَر قبائل میں تھا، بعض لوگ فقر وافلاس کی وجہ سے اپنے بچوں کو مار ڈالتے تھے؛ چنانچہ قرآن مجید نے بھوک کی وجہ سے قتل اولاد کو منع کیا ہے (الانعام:۱۵۲)، ایک طریقہ وہ تھا جس کا اس آیت میں ذکر ہے کہ لوگ اپنے خیال کے مطابق معبودانِ باطل کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنے بچوں کی قربانی دیتے تھے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کے دادا عبد المطلب نے اس کی نذر مانی تھی اور آپ (ﷺ) کے والد ماجد حضرت عبد اللہ کی قربانی کرنا چاہتے تھے، (الجامع لأحكام القرآن:۴/۶۰) اللہ تعالیٰ نے اسی جاہلانہ رسم کا یہاں ذکر فرمایا ہے اور چوں کہ معبودانِ باطل کے نام پر قربانی کی جاتی تھی اور ان کی پرستش کا غیر معمولی جذبہ اس کا سبب بنتا تھا؛ اس لئے فرمایا گیا کہ ان مشرکین کے لئے انھوں نے اس عمل کو مزین کردیا ہے؛ تاکہ ان کی نسلوں کو ہلاک کردے۔

﴿۲﴾ یعنی عرب کہتے تھے کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام عقیدۂ توحید پر تھے اور اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی قربانی دینے کی کوشش کی؛ لیکن دین اسماعیلی میں اولاد کی قربانی کا کوئی عمومی حکم نہیں تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تو یہ عمل بطور امتحان کے کرایا گیا تھا؛ لیکن شیطان نے عربوں پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین کو خلط ملط کر کے رکھ دیا تھا، وہ توحید کی بجائے ان کی طرف شرک کی نسبت کرتے تھے اور اولاد کی قربانی کو دین اسماعیلی کا حصہ قرار دیتے تھے۔

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا یَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا افْتِرَآءً عَلَیْهِ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ بِمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ قَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مَّیْتَةً فَهُمْ فِیْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۳۹﴾

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتیاں وہ ہیں، جن کا استعمال ہر شخص کے لئے درست نہیں، اُن کے گمان کے مطابق اُن کو صرف وہی کھا سکتے ہیں، جن کو ہم چاہیں، اور کچھ چوپائے ہیں، جن کی سواری کو حرام کرلیا گیا ہے اور کچھ چوپائے ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے، (یہ سب) اللہ پر جھوٹ گھڑنا ہے، عنقریب اللہ اُن کو اُن کی افتراء پردازی کی سزا دیں گے ﴿۱۳۸﴾ اور وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے، وہ ہمارے مَردوں کے لئے خاص ہے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے، اگر مردار ہو تو اس میں سب برابر ہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ انھیں ان کی غلط بیانی کی سزا دیں گے، ﴿۱﴾ بے شک وہ حکمت والے اور خوب جاننے والے ہیں۔ ﴿۱۳۹﴾

﴿۱﴾ جو قومیں شرک میں مبتلا ہوتی ہیں، وہ توہمات اور نامعقول رسوم و رواجات کی اسیر بن جاتی ہیں، جو کہ آخرت کے نقصان کا سبب تو ہے ہی، دنیا میں بھی ان کے لئے نقصان اور محرومی کا باعث ہوتی ہیں، ان میں سے بعض رسوم جیسے قتلِ اولاد، معبودانِ باطل کے لئے پیداوار اور مویشیوں کے وقف کردینے کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح کے کچھ اور رسوم کا اِن آیات میں ذکر کیا گیا ہے، اِن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض اوقات وہ کچھ کھیتیاں معبودان باطل کے لئے چھوڑ دیتے تھے، جن کا استعمال صرف بت خانوں کے مجاور کے لئے درست سمجھا جاتا تھا اور کہتے تھے کہ یہی اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے، بعض جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے ان پر اپنے معبودانِ باطل کے ساتھ ساتھ اللہ کا نام بھی لیا کرتے تھے اور بعض کو دیویوں اور دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اس پر اللہ کا نام لینا درست نہیں، اسی طرح کچھ جانوروں کو دیویوں دیوتاؤں پر وقف کردیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان پر سواری کرنا درست نہیں، نہ ان کو ذبح کرنا درست ہے اور نہ ان کو کسی پانی یا چارہ سے روکا جاسکتا ہے، ایسے جانور کو 'بحیرہ' کہا جاتا تھا، یعنی وہ اونٹنی جو پانچ بچے جن چکی ہو اور آخری بچہ نر ہو، اسی طرح جو اونٹنی دس بچے جن چکی ہو، اسے 'وصیلہ' کہتے تھے، کہا جاتا تھا کہ اس کے دودھ صرف مرد پی سکتے ہیں، عورتیں نہیں پی سکتیں؛ البتہ اگر یہ مرجائے تو مرد و عورت دونوں اس میں سے کھا سکتے ہیں، اسی طرح ایک اور رسم 'حام' یا 'حامی' کی تھی، یہ ایسے نر اونٹ ہوتے تھے، جس کے جفتی کرنے سے دس نر بچے پیدا ہوچکے ہوں، ان پر بھی سواری کرنے اور اس سے کوئی فائدہ اُٹھانے کو ممنوع سمجھا جاتا تھا اور پانی یا چراگاہ سے اسے روکا نہیں جاسکتا تھا، (تفسیر ابن کثیر: ۱؍۶۲۵، قرطبی: ۷؍۶۳-۶۴) ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں نامعقول بھی تھیں اور بے سند بھی، اور ان کی خدا ناترسی کا حال یہ تھا کہ وہ ان احکام کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب بھی کرتے تھے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَی
اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۝۱۴۰ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وَّ النَّخْلَ وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ
ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖؗ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۝۱۴۱

جن لوگوں نے اپنی اولاد کو نادانی میں بغیر علم کے مار ڈالا اور اللہ نے انھیں جو عطا فرمایا ہے ان کو حرام کرلیا، انھوں نے نقصان اُٹھایا، یہ سب اللہ پر جھوٹ گھڑنا ہے، وہ گمراہ ہو چکے ہیں اور وہ ہدایت سے محروم ہی رہے ۝۱۴۰ وہی خدا ہے جس نے باغات پیدا کئے، وہ بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور وہ بھی جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے، نیز کھجور کے درخت اور کھیتی —— جن سے مختلف قسم کی کھانے کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں —— اور زیتون اور انار پیدا فرمائے، باہم ملتے جلتے اور الگ الگ، جب پھل آئے تو ان کے پھل کھاؤ اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کردو، نیز فضول خرچی نہ کرو کہ اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۱﴾ ۝۱۴۱

﴿۱﴾ اس آیت کا مقصد مشرکین کی فکر وعقیدہ کی کھوٹ کو ظاہر کرنا ہے کہ ہر قسم کے پھل، خواہ وہ ایسے پودوں سے پیدا ہوتے ہوں جوٹی پر چڑھائے جاتے ہیں یا ایسے پھل جو درخت سے پیدا ہوتے ہیں، خواہ زیتون ہوں یا کھجور وانار، جو عربوں کے یہاں کثرت سے کھائے جاتے تھے، اور ایسے پھل بھی جو ظاہری شکل یا مزہ میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں یا بالکل مختلف ہوں، سبھی اللہ کے پیدا کئے ہوئے اور اس کی صناعی کے شاہکار ہیں، پھر یہ بات کیسے درست ہوسکتی ہے کہ پیدا تو کیا ہو اسے اللہ نے، اور پروان چڑھ کر کھانے کے لائق تو وہ ہو اللہ کے حکم سے؛ لیکن اب ان کو وقف کردیا جائے غیر اللہ کے نام پر، اور ان کے بارے میں قانون چلایا جائے اپنی خواہش اور رسم ورواج کا؛ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تمام پھل اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اللہ نے انھیں انسانوں کے لئے حلال کیا ہے؛ اس لئے جب تک اللہ کی طرف کوئی ممانعت کا سبب نہ ہو، جیسے نشہ آور ہونا یا مہلک اور جان لیوا ہونا، انھیں کھایا کرو؛ البتہ دو باتوں کا لحاظ رہے، ایک یہ کہ جب کھیت کی کٹائی ہو اور اس کا پھل توڑا جائے تو اس کا حق ادا کیا جائے، —— حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم وغیرہ کے نزدیک اس سے کھیتیوں اور پھلوں کی زکوٰۃ مراد ہے، جو بارش کے پانی سے سیراب ہونے کی صورت میں دس فیصد واجب ہوتی ہے اور اگر کنویں وغیرہ سے سیراب کیا جائے تو پانچ فیصد، دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں نفلی صدقہ مراد ہے کہ کھیتی کٹنے اور پھل کے توڑے جانے کے موقع پر جو غرباء آجائیں، ان کا کچھ تعاون کردیا جائے، اس رائے کو اس بات سے تقویت پہنچتی ہے کہ یہ پوری سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور زکوٰۃ مدینہ میں فرض کی گئی تھی (الجامع لأحکام القرآن: ۶۶/۷) —— اگر یہ آیت زرعی پیداوار کی زکوٰۃ سے متعلق ہو تو اس سے احناف کے اس موقف کو تقویت پہنچتی ہے کہ زمینی پیداوار کی مقدار کم ہو یا زیادہ، اس میں عشر واجب ہے، اور پیداوار دیرپا ہو، یا جلدی خراب اور ختم ہوجانے والی، جیسے سبزیاں یا بعض پھل، سب میں زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؛ اس لئے کہ یہاں مطلق پھل میں زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے، ←

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ
لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ
الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ
فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع

اور چوپایوں میں سے کچھ بار برداری کے کام کے ہیں اور کچھ چھوٹے قد کے، تو اللہ نے تمہیں جو عطا فرمایا ہے، اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو کہ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿۱۴۲﴾ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو قسمیں بھیڑ کی (نر اور مادہ) اور دو قسمیں بکری کی (نر و مادہ)، آپ دریافت کیجئے: کیا اللہ نے دونوں نر کو حرام کیا ہے، یا دونوں مادہ کو، یا دونوں مادہ کے رحم میں موجود بچہ کو؟ اگر تم سچے ہو تو مجھے دلیل کے ساتھ بتاؤ، ﴿۱۴۳﴾ اونٹ میں بھی دو قسمیں اور گائے میں بھی دو قسمیں (پیدا کی ہیں)، آپ دریافت کیجئے کہ اللہ نے دونوں نر کو حرام کیا ہے، یا دونوں مادہ کو، یا دونوں مادہ کے رحم میں موجود بچہ کو؟ جب اللہ نے (تمہارے خیال کے مطابق) تمہیں اس کا حکم دیا تو کیا تم اُس وقت موجود تھے؟ پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر بلا دلیل جھوٹ گھڑے؛ تا کہ لوگوں کو گمراہ کرے، بے شک اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۴۴﴾

← اس آیت سے یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا حکم پیداوار کی کٹائی کے دن ہی سے متعلق ہوتا ہے، اس سے پہلے جو مال ضائع ہوگیا، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر کٹائی کے بعد زکوٰۃ ادا کرنے میں تاخیر کی اور کچھ مال ضائع ہوگیا تو زکوٰۃ پیداوار کی شرح کے لحاظ سے واجب ہوگی —— دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ غرباء کو دینے میں بھی فضول خرچی نہیں ہونی چاہئے، یعنی صدقہ میں بھی ایسی بے اعتدالی نہ ہو کہ خود اس کو دوسروں کے سامنے دست سوال پھیلانا پڑے۔

﴿۱﴾ ان آیات کا تعلق بھی گذشتہ مضامین سے ہے، مالک بن عوف وغیرہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اِن جانوروں کے رحم میں دودھ یا بچے کی شکل میں جو کچھ ہے، وہ صرف مردوں کے لئے جائز ہے، عورتوں کے لئے جائز نہیں، اسی طرح مختلف لوگوں کے لئے حلال جانوروں کی بعض قسموں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دیتے تھے؛ لیکن جانوروں کے نر اور مادہ میں فرق کرتے تھے، قرآن نے اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو اِن جانوروں کا خالق اور رب ہے، اسی کو تو ان کے حرام و حلال کرنے کا حق ہے، تو بتاؤ کہ ان کے حرام قرار دیئے جانے کے سلسلے میں اللہ کا کوئی حکم تمہارے پاس موجود ہے؟

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا
اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ
فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ عَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ
حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَایَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ
جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۖ٘ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

(اے رسول!) آپ کہہ دیں: مجھ پر اللہ کے جو احکام اُتارے گئے ہیں، میں اس میں —— کسی کھانے والے پر جو کھائے —— مردار، بہتا ہوا خون یا سور کے گوشت کے سوا کوئی چیز حرام نہیں پاتا، کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں، یا ناجائز ذبیحہ، جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، پس جو مجبور ہو جائے ، نافرمانی کرنے والا اور حد سے گذرنے والا نہ ہو، ﴿۱﴾ (تو اس کے لئے ضرورت کے بہ قدر ان حرام چیزوں کی گنجائش ہے) کیوں کہ آپ کے پروردگار بہت معاف کرنے والے اور خوب رحم کرنے والے ہیں ﴿۱۴۵﴾ اور یہودیوں پر ہم نے ہر ایک ناخن والا جانور حرام کر دیا تھا، نیز گائے اور بکری کی چربی بھی ان پر حرام کر دی تھی، سوائے ان چربیوں کے جو پشت یا آنتوں پر ہوں یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہوں، ہم نے یہ ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم یقیناً سچے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۴۶﴾

﴿۱﴾ یعنی جنھیں تم نے اپنے طور پر حرام کر لیا ہے وہ حرام نہیں ہیں ؛ بلکہ بنیادی طور پر چار قسم کے جانور حرام ہیں، ایک تو مردار جس کو ذبح نہ کیا جاسکا؛ البتہ حدیث سے وضاحت ہوتی ہے کہ اس سے ٹڈی اور مچھلی مستثنیٰ ہے، دوسرے: بہتا ہوا خون، جو رگوں میں پایا جاتا ہے، تیسرے: خنزیر کا گوشت، کہ یہ سب ظاہری اعتبار سے ہی ناپاک ہیں، چوتھے: وہ جانور جو ذبح تو کیا گیا ہو؛ لیکن غیر اللہ کے نام پر، کہ اس میں اعتقادی نجاست یعنی شرک پایا جاتا ہے، اصل میں ان چیزوں سے تمہیں بچنا چاہئے ،بعض مفسرین نے ’’فسقا أهل لغير الله به‘‘ سے وہ جانور مراد لئے ہیں، جن کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کر دیا گیا ہو، خواہ بتوں کے نام ہو یا کسی بزرگ یا ولی کے نام پر، کہ جب تک نامزد کرنے والا توبہ نہ کر لے یہ بھی حرام ہے، آگے مجبوری کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص مجبور ہو، لذت حاصل کرنے کے لئے نہ کھائے اور ضروری مقدار سے زیادہ نہ کھائے تو جان بچانے کے لئے حرام اشیاء کو بھی کھا لینے کی گنجائش ہے —— یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے، غالباً اس وقت یہی چیزیں حرام تھیں، پھر مردار کی مختلف شکلوں اور شراب کے حرام ہونے کا حکم سورۂ مائدہ (آیات نمبر: ۳، ۹۰-۹۱) میں نازل ہوا اور مدنی زندگی میں آپ ﷺ نے حرام جانوروں کے سلسلہ میں ایک اُصول مقرر کر دیا کہ جو جانور سامنے کے دانت (ناب) سے شکار کرتا ہو اور اس سے اپنی غذا کھاتا ہو، وہ حرام ہے ؛ اسی طرح ایسے پرندے جو پنجوں سے شکار کرتے ہوں ، ان کے کھانے کو بھی آپ (ﷺ) نے حرام قرار دیا ، (مسلم، باب تحریم اکل الخ، حدیث نمبر: ۴۹۹۴) غرض کہ حرام جانور اِن کے علاوہ بھی ہیں ؛ بلکہ فقہاء کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن جانوروں کے حلال ہونے کی صراحت نہ ہو، وہ سب بنیادی طور پر حرام ہیں ؛ بخلاف نباتات کے، کہ وہ اصل میں حلال ہیں؛ سوائے اس کے کہ نشہ آور اور مُہلِک ہوں ؛ کہ نشہ اور قتل کے حرام ہونے کی وجہ سے وہ حرام ہوں گے۔ ←

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۴۷
سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ
كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝۱۴۸ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ
الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۴۹ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ
حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۵۰
١٨ ع ٦ ٥

پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجئے: تمہارے رب کی رحمت بڑی کشادہ ہے اور جرم کرنے والوں سے ان کا عذاب نہیں ٹلے گا ۝۱۴۷ جن لوگوں نے شرک کیا ہے، وہ عنقریب کہیں گے: اگر اللہ چاہتا تو ہم نے اور ہمارے آباء واجداد نے شرک نہیں کیا ہوتا اور اور نہ ہم نے کوئی چیز حرام کی ہوتی، اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا؛ یہاں تک کہ ان کو ہمارے عذاب کا مزا چکھنا پڑا، آپ کہہ دیجئے: کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے، جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو؟ تم لوگ محض گمان کی پیروی میں لگے ہو، اور صرف اٹکل سے کام لے رہے ہو ۝۱۴۸ آپ کہہ دیجئے: اللہ کے لئے واضح دلیل ہے، اگر اللہ چاہتے تو تم سب کو ہدایت دیدیتے ﴿۱﴾ ۝۱۴۹ آپ کہہ دیجئے: تم اپنے گواہوں کو لاؤ جو گواہی دیں کہ اللہ نے ان کو حرام کیا ہے، پس اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو آپ ان کا اعتبار نہ کیجئے اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے، جنھوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا ہے، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جھوٹے معبودوں کو اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۝۱۵۰

← ﴿۲﴾ شریعت میں بعض احکام سرزنش کے طور پر بھی دیئے جاتے ہیں، تو یہودیوں پر ان چیزوں کا حرام کیا جانا اُن کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے تھا؛ اس لئے ضروری نہیں کہ یہ ہمیشہ حرام رہیں، اللہ تعالیٰ نے اُمت محمدیہ کے لئے ان چیزوں کو حلال رکھا ہے، جیسے ایک سمجھدار اور مریض شناس ڈاکٹر ایک ہی غذا کی کسی کو اجازت دیتا ہے اور کسی کو منع کرتا ہے، اسی طرح اللہ کی شریعت میں ایک ہی شئ کو کسی اُمت کے لئے منع کر دیا جاتا ہے اور کسی کو اس کے استعمال کی اجازت دی جاتی ہے۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ارادہ و اختیار کی طاقت عطا فرمائی ہے، پھر وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے، اللہ کی مشیت اس میں مدد ومعاون ہوجاتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لئے انبیاء بھیجے ہیں اور اپنی کتابیں اُتاری ہیں؛ تاکہ وہ اپنی صلاحیت کا صحیح استعمال کریں اور ان کا امتحان ہوجائے کہ اسی امتحان سے آخرت کی جزا وسزا متعلق ہے؛ ورنہ تو اللہ اگر چاہتے کہ سب لوگ ہدایت ہی کے راستہ پر آجائیں تو ایسا کر سکتے تھے، اللہ ان سے ارادہ و اختیار کی طاقت سلب کر لیتے اور وہ ایمان لانے پر اسی طرح مجبور ہوتے، جیسے انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ
وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا
ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ
وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ
كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

آپ فرمائیے: آؤ، میں سنادوں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا باتیں حرام کی ہیں؟ یہ بات کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ، والدین کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اپنی اولاد کو افلاس کی وجہ سے مار نہ ڈالو، ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی، کھلی ہوئی یا چھپی ہوئی بے حیائیوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، کسی جان کو — جس کے قتل کو اللہ نے حرام کیا ہے — قتل نہ کرو، سوائے اس کے کہ (شریعت کے حکم مطابق) حق کی بنیاد پر ان کا قتل ہو، اللہ تم کو اس کی نصیحت فرماتے ہیں؛ تا کہ تم سمجھو ﴿۱۵۱﴾ سوائے خیر خواہی کے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں، انصاف کے ساتھ پورا ناپ تول کرو، ہم کسی کو بھی اس کی طاقت کے مطابق ہی (احکام کا) پابند کرتے ہیں، اور جب بات کرو تو انصاف سے کام لو، چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، نیز اللہ کے وعدہ کو پورا کرو، اللہ نے تم کو تاکید کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے؛ تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۵۲﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں نو باتوں کی نصیحت فرمائی ہے:

اول: یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے، کسی بھی چیز میں معبودانِ باطل بھی شامل ہیں اور خدا کے نیک بندے بھی، کہ جیسے دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا حرام ہے، اسی طرح انبیاء کرام اور اولیاءِ اُمت کو خدا کا درجہ دے دینا، اُن کو یا اُن کی قبروں کو سجدہ کرنا، اُن سے دُعاء کرنا، اُن کے نام پر جانوروں کو چھوڑنا اور ان کو کائنات میں متصرف سمجھنا بھی شرک میں شامل ہے۔

دوسرا حکم: والدین کے ساتھ حسن سلوک کا دیا گیا ہے، بہتر سلوک میں ان کا احترام، ان سے محبت، ان کے ساتھ بہتر اخلاق، جسمانی خدمت اور معاشی کفالت سب شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کی طرف توجہ دلانے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ کے حق کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔

تیسرے: افلاس کی وجہ سے اولاد کے قتل کرنے کو منع کیا گیا ہے، موجودہ زمانہ میں 'مالتھوس' کے نظریہ کے مطابق قتل اولاد کی بدلی ہوئی شکل برتھ کنٹرول کی صورت میں مروج ہے؛ چنانچہ انسانی پیدائش کو روکنے کے لئے مرد وعورت کا نس بندی آپریشن کیا جاتا ہے، جو حمل قرار پاچکا ہو، اس کا اسقاط کرایا جاتا ہے، عارضی منع حمل کے لئے دواؤں کا اور کنڈوم کا استعمال ہوتا ہے، یہ ساری صورتیں اگر اس لئے اختیار کی جائیں کہ پیدا ہونے والے بچوں کی ضروریات کا کیا انتظام ہوگا؟ تو ناجائز ہے؛ البتہ آپریشن اور اسقاط حمل ←

← کی صورت حرام ہے اور کنڈوم اور عارضی مانع حمل ادویہ مکروہ؛ لیکن اگر طبی ضرورت ہو یعنی عورت یا پیدا ہونے والے بچے کی زندگی یا صحت کو غیر معمولی خطرہ ہو تو ان حالات میں نس بندی کی گنجائش ہے، جیسے شوہر یا بیوی ایڈس کی بیماری میں مبتلا ہو، یا عورت پاگل ہو اور حمل اور پرورش کی صلاحیت نہ رکھتی ہو، یا بچہ کے کسی خطرناک موروثی مرض میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، اگر حمل سولہ ہفتوں کا ہو چکا ہو، جس میں عموماً روح پیدا ہو جاتی ہے تو اب اس کا اسقاط حرام ہے اور یہ انسان کو قتل کرنے کی طرح ہے، اور اگر چار مہینہ سے کم مدت کا حمل ہو تو میڈیکل ضرورت کے تحت کسی معتبر، ماہر، مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان دستیاب نہ ہو تو غیر مسلم ڈاکٹر کے مشورہ پر حمل ساقط کرایا جاسکتا ہے؛ اسی طرح عارضی موانع حمل بھی طبی ضرورت کے تحت استعمال کئے جاسکتے ہیں، معاشی مقاصد کے لئے نہیں۔

چوتھا حکم یہ دیا گیا ہے کہ بے حیائی کی باتوں سے بچو، چاہے وہ چھپی ہوئی ہوں یا کھلی ہوئی، بعض دفعہ انسان بے شرمی میں اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے بھی برائی کرنے اور بے حیائی کے ارتکاب سے نہیں بچتا، آج مغربی معاشرہ میں فحش فلمیں، کلب، ساحلی تفریح گاہیں اس کی واضح مثال ہیں، اور چھپ کر کی جانے والی بے حیائی میں جہاں 'زنا' شامل ہے، وہیں موجودہ دور میں انٹرنیٹ کی فحش ویب سائٹیں اور مخرب اخلاق سیڈیاں سب شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب بھی نہ جانے کا حکم دیا ہے؛ کیوں کہ بے حیائی کی چیزیں نفس کے لئے مقناطیس کی طرح ہیں، جو قریب آنے والے کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ کسی انسان کا ناحق قتل نہ کیا جائے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس میں انسان کا خودکشی کرنا بھی شامل ہے؛ کیوں کہ یہ بھی قتل نفس میں شامل ہے''إلا بالحق'' کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اس کے کہ شریعت نے جس کے قتل کا حکم دیا ہو، شرعاً تین آدمیوں کے لئے قتل کی سزا مقرر ہے، ایک تو وہ شخص جس نے کسی کو جان بوجھ کر (بالارادہ) قتل کر دیا ہو، دوسرے: جو پہلے مسلمان تھا اور اب مرتد ہو گیا اور توبہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو، تیسرے: جو شخص شادی شدہ ہو اور اس کے باوجود اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہو، ایسے شخص کو سنگسار کیا جائے گا، حدیث میں ان کا ذکر موجود ہے''لا يحل دم إمرأ مسلم إلا باحدى ثلاث الثيب الزاني الخ'' (ابوداؤد، باب الحکم فی من ارتد، حدیث نمبر: ۴۳۵۲) لیکن ان سزاؤں کے جاری ہونے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو، دوسرے حاکم یا جو شخص اس کی طرف سے مجاز ہو، وہی قتل کر سکتا ہے، اپنے طور پر کوئی شخص ایسے شخص کو قتل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ یتیم کے بارے میں بہتر رویہ اختیار کیا جائے، یعنی اس کا مال ضائع نہ ہو اور اس کے مال کو بڑھانے کی کوشش کی جائے؛ یہاں تک کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دیا جائے، یوں تو دیانت داری سب کے لئے واجب ہے؛ لیکن یتیموں کے لئے خاص طور پر کہا گیا؛ کیوں کہ ان کے مال کا کوئی پُرسان حال نہیں ہوتا۔

ساتویں: ناپ تول کو پورا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی پیمانہ درست ہو اور خریدنے اور بیچنے کا پیمانہ ایک ہی ہو، پیمانے میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں، جن سے کسی چیز کی پیمائش کی جاتی ہے، چاہے وہ ترازو کے ذریعہ تولی جاتی ہو یا میٹر کے ذریعہ جیسے ٹیکسی کا کرایہ، الکٹرک بل، پٹرول پمپ کا کرایہ، یا وقت کو پیمانہ بنالیا گیا ہو، جیسے: ڈیوٹی کے اوقات، ان میں سے کسی میں بھی کمی بیشی کی جائے تو یہ کم تولنے اور کم ناپنے میں شامل ہے؛ البتہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ پابند نہیں بناتے؛ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر غیر ارادی طور پر کچھ کمی زیادتی ہو جائے تو اس میں ان شاء اللہ کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ ←

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ
ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ
ع ١٩ ٦ وَتَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ هٰذَا كِتٰبٌ
اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى
طَآىِٕفَتَیْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور یقیناً یہی میرا سیدھا راستہ ہے، اسی کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ یہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹادیں گے، اللہ تم کو اس کی نصیحت فرماتے ہیں؛ تاکہ تم (ان غلط راستوں سے) بچتے رہو ﴿۱۵۳﴾ پھر ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی؛ کہ (اس طرح) اچھا عمل کرنے والے پر اللہ کی نعمت پوری ہوجائے، ہر چیز کی وضاحت ہوجائے اور ہدایت و رحمت کا باعث بنے؛ تاکہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات پر ایمان لے آئیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۵۴﴾ اور ایک یہ کتاب (قرآن مجید) ہے، ہم نے ہی اس کو بھی اُتارا ہے، جو برکت والی ہے: اس لئے اس کی پیروی کرو اور نافرمانی سے بچو؛ تاکہ تم پر اللہ کی رحمت ہو ﴿۱۵۵﴾ (اس کے اُتارے جانے کا سبب یہ ہے کہ) کہیں تم کہتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دونوں گروہوں پر اُتاری گئی اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ ﴿۱۵۶﴾

← آٹھواں حکم یہ دیا گیا کہ جب بھی کوئی بات کہی جائے انصاف کی کہی جائے، فیصلہ کرنے اور گواہی دینے میں رشتہ داریوں کا خیال نہ کیا جائے؛ بلکہ بے لاگ اور سچی بات کہی جائے۔

نواں اور آخری حکم یہ ہے کہ اللہ کے وعدہ کو پورا کرو، اس میں وہ تمام باتیں شامل ہیں، جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور بحیثیت مسلمان ہم سب نے اس کے کرنے کا عہد کیا ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، وہ اس گناہ کے ساتھ ساتھ عہد شکنی کا گنہگار بھی ہوتا ہے: کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو توڑتا ہے، ان نو احکام کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سیدھا راستہ ہے، اس کی تم پیروی کرو، اس سے معلوم ہوا کہ یہ دین کے بنیادی احکام ہیں اور ان کو شریعت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (آیت نمبر: ۱۵۱، ۱۵۲ اور ۱۵۳) تینوں کے اخیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی وصیت کرتے ہیں، وصیت تاکیدی حکم کو کہتے ہیں، اس تعبیر سے اِن احکام کی خصوصی اہمیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہدایت کا اُترنا اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور رحمت ہے اور چوں کہ تورات نئی شریعت کی حامل تھی؛ اس لئے اس میں ایمانیات کے ساتھ ساتھ عملی احکام کی تفصیل بھی موجود تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ
يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِىَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِىَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ
نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِىْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

یا تم کہتے کہ اگر ہم پر کتاب اُتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت کو قبول کرنے والے ہوتے، تو اب تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر دلیل، رہنمائی اور رحمت خداوندی آگئی ہے، پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے احکام کو جھٹلائے اور ان سے کترائے؟ جو لوگ ہمارے احکام سے بے رخی برتتے ہیں، ہم عنقریب انھیں ان کی بے رُخی پر بدترین عذاب کی سزا دیں گے ﴿۱﴾ ﴿۱۵۷﴾ کیا وہ انتظار کررہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں یا خود آپ کا پروردگار آجائے یا آپ کے پروردگار کی بعض نشانیاں آجائیں؟ (تو یاد رکھو) جس دن آپ کے پروردگار کی بعض نشانیاں آجائیں گی، اس دن ـــــ جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو، یا جس نے ایمان کی حالت میں نیک عمل نہ کیا ہو، ـــــ کو اس کا ایمان لانا فائدہ نہ پہنچائے گا، آپ کہہ دیجیے: تم بھی انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۵۸﴾

﴿۱﴾ یعنی اہل مکہ کہہ سکتے تھے کہ تورات وانجیل عبرانی زبان میں نازل ہوئی ہے، جس سے ہم ناواقف ہیں اور خود آسمانی کتابوں کے حاملین کا حال یہ ہے کہ نہ انہوں نے کبھی ہمیں دعوت دی اور نہ ہمیں دعوت خداوندی کو سمجھانے کی کوشش کی؛ اس لئے ہم تو اس سے بے خبر تھے، اگر ہم پر کوئی آسمانی کتاب اُتاری گئی ہوتی تو ہم اُن سے بڑھ کر دعوت حق کو قبول کرتے؛ اس لئے تمہاری طرف قرآن مجید اُتارا گیا، جو تورات ہی کی طرح برکت والی ہے اور اب چوں کہ تم پر یہ حجت بھی پوری ہوچکی ہے؛ اس لئے اگر تم اس کی اتباع نہ کروگے تو مزید سزا کے مستحق ہوگے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کی ڈھٹائی اور حق کو قبول کرنے سے مسلسل انکار پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کیا انھیں انتظار ہے کہ ان کے پاس معجزاتی طور پر کوئی فرشتہ آجائے یا خود اللہ تعالیٰ آجائیں یا کوئی ایسی نشانی ظاہر ہوجائے جسے قربِ قیامت میں سامنے آنا ہے، (تفسیر مظہری: ۳۰۹/۳) یعنی یہ سب بے جا بہانے اور ناشائستہ مطالبات ہیں، پھر انھیں متنبہ کیا گیا کہ جب قیامت کی واضح علامت ظاہر ہوجائے گی، اس وقت توبہ کام نہیں آئے گی؛ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تین چیزیں ظاہر ہوجائیں گی تو انسان کے لئے ایمان لانا نفع بخش نہیں ہوگا، ایک: سورج کا مشرق کے بجائے مغرب سے نکلنا، دوسرے: دجال کا ظاہر ہونا اور تیسرے: دابّۃ الارض کا نکل آنا، یعنی ایک خاص قسم کا جانور زمین سے نکلے گا، جو جنتیوں اور دوزخیوں کو نشان زد کردے گا، (مسلم، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، باب بیان الزمن الذی الخ، حدیث نمبر: ۳۹۸) اس آیت میں جو یہ بات کہی گئی ہے کہ ←

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

(اے رسول!) جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کردیئے اور ان کے بہت سے فرقے ہوگئے، یقیناً آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ﴿۱﴾ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، پھر وہ جو کچھ کیا کرتے تھے، اللہ خود ان کو بتادیں گے ﴿۱۵۹﴾ جو نیک کام کرے گا، اس کے لئے اس کا دس گنا اجر ہے اور جو برائی کرے گا، اس کو اس کے عمل کے برابر سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۶۰﴾

← ''بعض نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد ایمان اور توبہ کام نہیں آئیں گے'' اس سے غالباً یہی نشانیاں مراد ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کا امتحان مقصود ہے؛ اسی لئے اَن دیکھی اور نظر سے اوجھل حقیقتوں پر اسے ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، جب یہ نشانیاں ظاہر ہوجائیں گی تو آخرت کا نظام گویا انسان کی نظروں کے سامنے ہوگا؛ اس لئے اس وقت ایمان لانے سے امتحان کا مقصد حاصل نہ ہوسکے گا؛ اسی لئے حدیث میں یہ بات بھی آئی ہے کہ انفرادی حیثیت میں بھی ہر شخص اپنی موت کے وقت ایک ایسے مرحلہ پر پہنچتا ہے، جب غیبی حقیقت اس کے لئے مشاہدہ بن جاتی ہے اور فرشتۂ موت اسے نظر آنے لگتے ہیں، اس وقت اگر کوئی انسان توبہ کرے تو اس کا اعتبار نہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ اسی وقت تک قبول فرماتے ہیں، جب تک کہ اس پر 'غرغرہ' کی کیفیت پیدا نہ ہو، یعنی اس کی روح حلق تک نہ پہنچ جائے''إن اللہ یقبل توبة العبد ما لم یغرغر''۔ (سنن ترمذی، باب ان اللہ یقبل الخ، حدیث نمبر: ۳۵۳۷)

﴿۱﴾ اس ارشاد خداوندی میں پچھلی اُمتوں کے گمراہ فرقوں کے ساتھ ساتھ، اس اُمت کی طرف بھی اشارہ ہے؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا کہ''إن الذین فرقوا دینهم شیعاً'' اس اُمت میں بدعت کا ارتکاب کرنے والے، نفس پرستی میں مبتلا لوگ اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والے افراد ہیں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! ہر گناہ گار کو توبہ کی توفیق ہوسکتی ہے؛ لیکن بدعت کرنے والے کو اور اپنی خواہش کے پرستار لوگوں کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، میں ان سے بری ہوں اور وہ ہم سے، (قرطبی: ۱۴۹/۷) غرض کہ آیت میں اِس اُمت کے گمراہ فرقوں کی طرف بھی اشارہ ہے، ایسے گمراہ فرقوں کے درمیان اس گروہ کی نشان دہی آپ ﷺ نے فرمائی ہے، جو حق پر قائم ہوگا، آپ ﷺ نے اس کے لئے معیار مقرر کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر قائم رہے گا، وہی فرقہ نجات پائے گا ''ما أنا علیه وأصحابي'' (سنن ترمذي، باب احیاء فی افتراق هذه الامة، حدیث نمبر: ۲۶۴۱) —— لہٰذا جن لوگوں کا عقیدہ وعمل کتاب وسنت کے خلاف ہو اور جن کا راستہ صحابہ کے راستہ سے ہٹا ہوا ہو، وہ ہدایت یافتہ گروہ نہیں ہوسکتا۔

﴿۲﴾ عام طور پر عیسائی مصنفین کہتے ہیں کہ قرآن نے ایک خطرناک اور قاہر وجابر خدا کا تصور پیش کیا ہے؛ لیکن یہ غلط ہے، ←

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ
الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ
وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَ لَا
تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ
فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

(اے رسول !) آپ کہہ دیجئے : بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھی راہ دیکھا دی ہے، یعنی درست دین کی، ابراہیم کا طریقہ، جو (اللہ کی طرف) یکسو تھے اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۱﴾ ﴿۱۶۱﴾ آپ کہہ دیجئے : میری نماز، میری عبادتیں، میرا جینا اور میرا مرنا یقیناً اللہ ہی کے لئے ہے، جو تمام عالم کے پروردگار ہیں ﴿۱۶۲﴾ اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں فرمانبرداری کرنے والوں میں سب سے پہلے ہوں، ﴿۲﴾ ﴿۱۶۳﴾ آپ کہہ دیجئے : کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کی تلاش کروں ؛ حالاں کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور (یاد رکھو) ہر شخص جو عمل کرتا ہے، اس کی ذمہ داری اسی پر ہے اور کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، ﴿۳﴾ پھر تمہارے رب کی طرف ہی تمہاری واپسی ہے، پھر وہ تم کو ان چیزوں کے بارے میں بتادیں گے، جن کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے۔ ﴿۱۶۴﴾

← حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ رحمت زیادہ ذکر کی گئی ہیں بمقابلہ صفاتِ غضب کے، اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ اللہ نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کرلیا ہے، اسی رحمت کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب بندہ کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کو دس گنا اجر ملتا ہے اور جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو برابر کا معاملہ کیا جاتا ہے، یعنی جتنا گناہ اتنی سزا۔

﴿۱﴾ یہودی، عیسائی اور خود مشرکین عرب یہ سبھی اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے اور اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل قرار دیتے تھے ؛ اس لئے قرآن مجید نے بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتیازی وصف یہ تھا کہ انھیں شرک سے نفرت تھی اور ایمان و عمل میں پوری طرح ان کا رُخ اللہ کی طرف تھا، اگر تم لوگ واقعی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہو تو پھر تمہیں اسی اُسوۂ ابراہیمی کو اختیار کرنا چاہئے۔

﴿۲﴾ یہ دونوں آیتیں حقیقی مومن کی زندگی کا عنوان ہیں، یعنی حقیقی صاحب ایمان وہ ہے جس کی نماز، جس کی عبادتیں، جس کا زندہ رہنا اور جس کا جان دینا اللہ کے لئے ہو، اس کی زندگی شرک سے پاک ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے اور عمل کرنے میں پیش پیش رہتا ہو، —— اس میں ایک لفظ ''نسکی'' کا آیا ہے، ''نسک'' کے معنی قربانی کے بھی ہیں، حج کے افعال کے بھی اور عبادتوں کے بھی، —— نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلایا گیا کہ میں پہلا مسلمان ہوں ؛ کیوں کہ ہر دین میں پہلا مسلمان وہ نبی ہوتا ہے، جس پر اللہ کی کتاب اُتاری جاتی ہے۔

﴿۳﴾ بعض مشرکین مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے کہ آپ ہمارے مذہب میں واپس آجائیں اور اس پر جو کچھ گناہ ہوگا، اس کا ←

وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَ رَفَعَ بَعۡضَكُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰكُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيۡعُ الۡعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۶۵﴾

النصف

ع ۲۰ / ۱۱

اسی خدا نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا ہے، اور ایک کو دوسرے کے اعتبار سے درجہ میں بلند کیا ہے؛ تا کہ تم کو نہیں دی ہوئی نعمتوں کے بارے میں آزمائیں، بے شک آپ کے رب جلد سزا دینے والے ہیں اور کوئی شبہ نہیں کہ وہ بہت معاف کرنے والے اور بے حد مہربان بھی ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۶۵﴾

← بوجھ ہم لوگ اُٹھالیں گے، قرآن مجید نے اسی کا جواب دیا ہے کہ میں اللہ کو پالینے کے بعد اس ہدایت سے محرومی کو کیسے گوارا کرسکتا ہوں اور تم میرا بوجھ کس طرح اُٹھا سکتے ہو، جب کہ آخرت کا نظام یہ ہے کہ ایک شخص کا بوجھ دوسرا شخص نہیں اُٹھا سکتا، شریعت میں بعض احکام ایسے ہیں جن میں نیابت رکھی گئی ہے، جیسے ''دیت'' (خون بہا) کا معاملہ ہے کہ اہل خاندان پر اس کو لازم قرار دیا جاتا ہے، یا ایک شخص دوسرے شخص کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے، ان سب کا تعلق احکام دنیا سے ہے، اور اس آیت کا تعلق احکام آخرت سے ہے، اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں ایصالِ عذاب کا کوئی تصور نہیں کہ ایک شخص گناہ کا مرتکب ہو اور دوسرے کو اس کا عذاب پہنچادے، جیسا کہ بعض باطل گروہوں کا خیال ہے، اسی طرح یہ آیت ایصالِ ثواب کے مغایر نہیں ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالتے ؛ لیکن ایک شخص کی نیکی کو یا اُس کی دُعاء کو قبول کرتے ہوئے اپنے فضل وکرم سے دوسرے کو پہنچادیں تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں ؛ جب کہ متعدد حدیثوں سے تلاوت قرآن اور نیک اعمال کے ثواب کا ایصال کرنا ثابت ہے۔

﴿۱﴾ 'خلیفہ' کے معنی اصل میں ایسی چیز کے ہیں، جو کسی اور چیز کے بعد آئی ہو؛ اسی لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کہا جاتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ان کی امارت قائم ہوئی، اس روئے زمین میں پہلے جنات کو بسایا گیا تھا، ان کے بعد انسان بسائے گئے اور انسانوں کو اس کرۂ ارضی کے اقتدار و اختیار کی کنجی حوالے کی گئی؛ اس لئے اس کو 'خلیفۃ الارض' کہا گیا ہے، پھر ان کے درمیان نعمتوں اور صلاحیتوں جیسے دولت، صحت، ذہانت، اخلاق وغیرہ میں فرق رکھا گیا؛ تا کہ ان کا امتحان ہو کہ وہ زمین کا اقتدار پا کر یہاں اللہ کا حکم نافذ کرتا ہے یا اپنی خواہشات پر چلتا ہے؟ جو لوگ اللہ کی نعمتوں میں فائق ہیں، ان میں شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یا تکبر آجاتا ہے؟ اور جو لوگ اللہ کی نعمتوں سے کم نوازے گئے ہیں، وہ صبر وقناعت سے کام لیتے ہیں یا بے صبری سے؟ پھر جن لوگوں کا جیسا معاملہ ہوگا، اسی کے مطابق اللہ کے یہاں جزاوسزا کی صورت حال پیش آئے گی۔

سُورَةُ الأَعْرَافِ

- سورہ نمبر : (۷)
- رکوع : (۲۴)
- آیتیں : (۲۰۶)
- نوعیت : مکی

عربی قواعد کے لحاظ سے ''أعراف'' عرف کی جمع ہے، جو چیز زمین کی سطح سے بلند ہو، اس کو عرب ''عرف'' کہا کرتے تھے، جنت اور دوزخ کے درمیان ایک بلند فصیل ہوگی، اس کو قرآن میں ''اعراف'' کہا گیا ہے، علامہ طبری رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی نیکیاں اور گناہ برابر ہو جائیں گے، وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے دوزخ سے نجات پا پا جائیں گے، اور برائیوں کے لحاظ سے جنت کے مستحق نہیں ہوں گے، انھیں اس جگہ رکھا جائے گا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ ان کے لئے فیصلہ فرمائیں گے، اور بظاہر یہ فیصلہ جنت کا ہی ہوگا؛ کیوں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، ان کو ''اصحاب اعراف'' کہتے ہیں۔

اس میں ۲۰۶ آیتیں ہیں اور یہ سورہ مکی ہے، یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے؛ البتہ ۸/آیتیں ۱۶۳-۱۷۰ مدنی ہیں، یعنی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہیں، اس سورہ میں بھی سورہ أنعام کی طرح توحید، نبوت، قرآن کی صداقت، آخرت وغیرہ پر گفتگو فرمائی گئی ہے اور دلیل کے طور پر اللہ کی قدرت کے مظاہر کو پیش کیا گیا ہے، اس سورہ میں انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات خاص طور پر ذکر کئے گئے ہیں؛ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوموں کا ان کے ساتھ رویہ، فرعون کی سرکشی، بنی اسرائیل کی نافرمانی اور ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب کے مضامین اس سورہ میں وضاحت کے ساتھ آئے ہیں۔

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓمّٓصٓ ۝۱ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲ اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا
مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف ، لام ، میم ، صاد ، ﴿۱﴾ ۝۱ یہ ایک کتاب ہے، جو آپ کی طرف اُتاری گئی ہے ؛ تا کہ آپ اس کے ذریعہ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لئے نصیحت کا ذریعہ بنے ؛ لہٰذا اس (کے پہنچانے) سے آپ کے دل میں کوئی تنگی نہ ہو ، ﴿۲﴾ ۝۲ (اے لوگو !) تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے جو کتاب اُتاری گئی ہے، اسی کی پیروی کرو، اس کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں (کی باتوں) کی پیروی نہ کرو، ﴿۳﴾ تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ ۝۳

﴿۱﴾ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں گذر چکا ہے، ان کو 'حروفِ مقطعات' کہا جاتا ہے، ان کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے، بندوں کا کام ہے کہ وہ بغیر سمجھے ہوئے ان کے اللہ کی طرف سے ہونے پر ایمان رکھیں۔

﴿۲﴾ یعنی مشرکین مکہ کے انکار و استہزاء کی وجہ سے آپ کوئی تنگی محسوس نہ کریں ؛ کیوں کہ آپ کی بعثت کا مقصد ایمان سے محروم لوگوں کو آخرت کی پکڑ سے ڈرانا اور مسلمانوں کو نصیحت کرنا ہے اور یہ دونوں مقصد دعوت دینے سے حاصل ہو جائے گا، رہ گیا ان کا انکار، تو یہ خود ان کے گناہوں میں اضافہ کرے گا —— اس میں عام مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے کہ مخالف ماحول میں دعوت واصلاح کی کوششوں کا مذاق اُڑایا جائے تو اس سے گھبرانا نہ چاہئے ؛ کیوں کہ اپنا کام فریضۂ دعوت کو ادا کرنا ہے، جو لوگ تمسخر کا راستہ اختیار کریں گے، وہ خود ہی عند اللہ جوابدہ ہوں گے۔

﴿۳﴾ کتاب اللہ کی پیروی میں سنت رسول کی پیروی بھی شامل ہے ؛ کیوں کہ وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے اُتاری ہوئی باتیں ہیں ؛ چنانچہ اللہ کا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں، خدا کی طرف سے فرماتے ہیں : '' وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى '' (النجم:۴) اور آپ ﷺ نے جو کچھ کیا ہے، اس کو انسانیت کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے : '' لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ '' (الاحزاب:۲۱) —— اس لئے اس آیت سے یہ استدلال کرنا غلط ہوگا کہ کتاب اللہ کی اطاعت کافی ہے، سنت رسول کی پیروی ضروری نہیں، دوسرے دوستوں کی پیروی سے مراد شیاطین کی پیروی ہے، یعنی وہ جنات وانسان جو اللہ کے دین کے باغی ہیں، ان کے بہکاوے میں نہ آؤ، فقہاء اور علماء صالحین تو قرآن وحدیث ہی کے ترجمان ہیں ؛ اس لئے ان کی باتوں پر عمل کرنا قرآن وحدیث ہی پر عمل کرنا ہے ؛ اس لئے ان کی پیروی سے منع نہیں کیا گیا ہے ؛ بلکہ اس کا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جو نہ جانتے ہوں وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کیا کریں : '' فَاسْئَلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ '' (الأنبياء:۷)

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ
جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶﴾ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ﴿۷﴾ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ
ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک و برباد کر دیا، ان کے پاس ہمارا عذاب راتوں رات یا اس وقت آیا، جب وہ دو پہر میں آرام کر رہے تھے ﴿۴﴾ جب ان پر ہمارا عذاب آ پہنچا تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکے کہ ہم واقعی خطا کار تھے ﴿۱﴾ ﴿۵﴾ ہم ضرور ان لوگوں سے بھی پوچھیں گے، جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے اور پیغمبروں سے بھی دریافت کریں گے، ﴿۶﴾ پھر چوں کہ ہمیں سب معلوم ہے، اس لئے ان کے سامنے خود ہی بیان کر دیں گے اور ایسا نہیں ہے کہ ہم موجود نہیں تھے ﴿۲﴾ ﴿۷﴾ اس دن یقینی طور پر (اعمال) تولے جائیں گے؛ چنانچہ جن (کی نیکیوں) کا وزن بڑھ جائے، وہی (اصل میں) کامیاب ہیں ﴿۸﴾ اور جن (کی نیکیوں) کا وزن کم ہو جائے یہی لوگ ہیں، جنھوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے؛ کیوں کہ وہ ہمارے احکام کے ساتھ حق تلفی کیا کرتے تھے۔ ﴿۳﴾ ﴿۹﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی سنت یہ ہے کہ لوگ غفلت کی حالت میں رہتے ہیں تو اچانک عذاب آتا ہے اور اُس وقت ان کو اپنی غلطیوں اور گناہوں کا احساس ہوتا ہے؛ مگر اب یہ پچھتاوا بے فائدہ اور لا حاصل ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں سے بھی پوچھیں گے کہ تمہارے پاس رسول میرا پیغام لائے یا نہیں؟ پھر ان کے سامنے ہی رسولوں سے بھی دریافت فرمائیں گے، اس کے بعد انبیاء کی طرف سے دعوت اور ان کی طرف سے انکار کا سارا ماجرا اللہ تعالیٰ خود بیان فرما دیں گے، غرض کہ یہ دریافت کرنا اس لئے نہیں ہوگا کہ 'نعوذ باللہ'، اللہ تعالیٰ ان باتوں سے بے خبر ہوں گے؛ بلکہ ان سے اقرار کرانے کے لئے اور ان کی شرمندگی اور رسوائی میں اضافہ کے لئے ہوگا۔

﴿۳﴾ قیامت میں انسان کی نیکیوں اور برائیوں کے تولے جانے کا ذکر مختلف آیتوں اور حدیثوں میں آیا ہے، اس لئے اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے؛ البتہ ایمان و اعمال کے وزن کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی تفصیل ذکر نہیں کی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے لئے کوئی خاص ترازو ہو، جیسے چاول و گیہوں کے وزن کرنے کے لئے الگ ترازو ہے، گرمی وٹھنڈک، بخار، بلڈ پریشر، شوگر کی مقدار، کولیسٹرول وغیرہ کا تناسب ہر چیز کی پیمائش کے لئے الگ الگ ترازو ہیں، اسی طرح ایمان و اعمال کی پیمائش کے لئے بھی اس کے مناسب حال ترازو ہوسکتی ہے —— یہ تولنا اس لئے نہ ہوگا کہ بندوں کی نیکیاں اور برائیاں پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں نہیں ہوں گی؛ بلکہ یہ بندوں پر حجت پوری کرنے، نیک لوگوں کی عزت میں اضافہ کرنے اور بدکاروں کی رسوائی کو بڑھانے کے لئے ہوگا۔

وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝۱۰ وَ لَقَدْ
خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖۗ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ
يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۝۱۱ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۝۱۲ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا
فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ۝۱۳

ع ۱ / ۸

(اے لوگو!) ہم نے تمہیں زمین میں بسایا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے اسباب فراہم کردیئے،«۱» (پھر بھی) تم لوگ کم ہی شکر ادا کرتے ہو۝۱۰ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو؛«۲» چنانچہ ابلیس —— جو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا —— کے سوا سب کے سب سجدہ ریز ہوگئے۝۱۱ اللہ نے فرمایا: میرے حکم کے باوجود سجدہ کرنے میں تم کو کیا رکاوٹ پیش آئی؟ ابلیس نے جواب دیا: یہ بات کہ میں اس سے بہتر ہوں؛ کیوں کہ آپ نے مجھے آگ سے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے،«۳»۝۱۲ اللہ نے کہا: پھر تو یہاں سے دور ہوجا، تو اس لائق نہیں کہ یہاں رہ کر بڑائی کرتا رہے، تو نکل جا، تیرا شمار اب ذلیلوں میں ہے۔«۴»۝۱۳

«۱» فضا میں آج تک جتنے سیارے دریافت ہوئے ہیں، ان میں صرف ’کرۂ ارض‘ (زمین) ہی ایسا سیارہ ہے، جس میں انسانی اور حیوانی زندگی کے وسائل فراہم ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انسان پر یہ اللہ کا کتنا بڑا انعام ہے!

«۲» معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسان کو افضل بنایا ہے؛ چنانچہ نور سے پیدا ہونے والی مخلوق فرشتوں سے بھی حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا، اس لئے رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے کا انکار اور نور کو آپ کا مادۂ تخلیق قرار دینا آپ ﷺ کے مقام کو کم کردینا ہے نہ کہ بلند کرنا۔

«۳» کسی چیز کا افضل ہونا اور کسی کا کم تر ہونا اللہ تعالیٰ کے مقرر کرنے سے ہے نہ کہ قیاس واندازہ سے؛ اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے آگ اور مٹی میں بہتر اور کم تر ہونے کا حکم جاری نہیں فرمایا تو پھر شیطان کا آگ کو افضل قرار دینا درست نہیں تھا —— اس ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دلیل نقلی —— کتاب وسنت —— اصل ہے، اس کے مقابلہ میں دلیل عقلی کا اعتبار نہیں، جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم دے دیا، تو پھر شیطان کی طرف سے عقلی دلیل پیش کرنا محض حیلہ وبہانہ تھا۔

«۴» بعض اہل علم کے نزدیک شیطان کو جنت سے نکالا گیا اور بعض کے نزدیک آسمان سے، بہرحال جو بھی صورت پیش آئی ہو، یہ بات واضح ہے کہ آسمان اور جنت صرف ان ہی لوگوں کی جگہ ہے جو اللہ کے نہایت مطیع وفرمانبردار ہوں، وہ سرکشوں کے رہنے کی جگہ نہیں، ہاں! دنیا امتحان کی جگہ ہے، یہاں فرمانبردار اور نافرمان سبھوں کو رہنے کی مہلت ہے؛ اس لئے شیطان سے کہا گیا کہ تو اب یہاں رہنے کے لائق نہیں۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ
لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ
وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآىِٕلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِیْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا
مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَ یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ
اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَیْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾

ابلیس نے کہا: (اے رب) مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے دیجئے، ﴿۱﴾ ﴿۱۴﴾ اللہ نے فرمایا: تجھے مہلت دی گئی ﴿۲﴾ ﴿۱۵﴾ شیطان نے کہا: چوں کہ آپ نے مجھے ہدایت سے محروم کر دیا ہے؛ اس لئے میں ان (کو راہ سے بھٹکانے) کے لئے آپ کے سیدھے راستہ پر ضرور بیٹھوں گا، ﴿۱۶﴾ میں آگے، پیچھے، دائیں، بائیں سے ان پر حملہ کروں گا، ﴿۳﴾ اور آپ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائیں گے، ﴿۱۷﴾ اللہ نے فرمایا: یہاں سے ذلیل ورسوا ہو کر نکل جا، ان میں سے جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے، (وہ جان لیں کہ) میں تم سبھوں سے جہنم کو بھر دوں گا، ﴿۱۸﴾ اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، جہاں سے چاہو کھاؤ، اور تم دونوں اِس درخت کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ تمہارا شمار زیادتی کرنے والوں میں ہو جائے گا۔ ﴿۱۹﴾

﴿۱﴾ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ اللہ نے ایک مقررہ وقت تک کے لئے شیطان کو مہلت دی ہے، إلی یوم الوقت المعلوم؛ (ص:۸۱) چنانچہ پہلا صور پھونکنے تک شیطان زندہ رہے گا، صور پھونکنے پر وہ بھی ہلاک ہو جائے گا اور صرف اللہ کی ذات باقی رہ جائے گی۔ (تفسیر طبری: ۴۱۱/۳)

﴿۲﴾ اللہ کی رحمت دیکھئے کہ شیطان کی دُعاء بھی قبول کی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمانوں اور نیک لوگوں کی طرح کافروں اور گنہگاروں کی دُعاء بھی قبول ہو سکتی ہے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ دُعاء کا قبول ہونا اس کی دلیل نہیں کہ اللہ کے دربار میں ''دُعاء کرنے والا'' مقبول بھی ہے، اگر دُعاء کے مقبول ہونے کے لئے نیک وصالح مسلمان ہونا ضروری ہوتا تو شیطان کی دُعاء قبول نہ کی جاتی۔

﴿۳﴾ یعنی میں ہر طرح انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش کروں گا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان تو رگ جاں میں بھی خون کی طرح داخل ہو کر انسان کو متاثر کر سکتا ہے، یجری من الإنسان مجری الدم۔
(بخاری، باب زیارۃ المرأۃ الخ، حدیث نمبر: ۲۰۳۸)

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰكُمَا
رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَ قَاسَمَهُمَآ
اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا
وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا
الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ
تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾

شیطان نے ان دونوں کے اندر وسوسہ پیدا کرنا شروع کر دیا؛﴿١﴾ تا کہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپی
ہوئی تھیں، کو ایک دوسرے کے سامنے بے پردہ کر دے اور اس نے کہا: تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے
صرف اس لئے روک دیا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے، ﴿٢٠﴾ شیطان نے
ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا نہایت خیر خواہ ہوں ﴿٢١﴾ غرض کہ شیطان نے ان دونوں کو دھوکہ
دے کر ہموار کر لیا، پھر جیسے ہی ان دونوں نے درخت کا مزا چکھا، ان کی شرمگاہیں کھل گئیں، دونوں اپنے اوپر جنت
کے پتے جوڑنے لگے ﴿٢﴾ اور ان کے پروردگار نے ان کو آواز دی: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں
کیا تھا اور میں نے کہا نہیں تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے؟ ﴿٢٢﴾ آدم اور اس کی بیوی نے کہا: اے
ہمارے پروردگار! ہم نے تو اپنے آپ پر بڑی زیادتی کر لی ہے، اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا اور اور ہم پر رحم
نہیں فرمایا، تو ہم یقیناً بڑے نقصان میں پڑ جائیں گے۔ ﴿٢٣﴾

﴿١﴾ وسوسہ دور سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے؛ اس لئے شیطان کا سانپ یا کسی اور شکل میں جنت میں داخل ہونا ضروری نہیں، سانپ کی شکل میں جنت میں داخل ہونے کی جو بات نقل کی جاتی ہے، وہ بائبل میں مذکور ہے، جو معتبر نہیں اور قرآن وحدیث میں اس کا ذکر نہیں، بائبل میں اس لغزش کا محرک حضرت حوا علیہا السلام کو قرار دیا گیا ہے؛ (پیدائش: ٣:٦) اسی لئے یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں عورت کو گناہ کا دروازہ سمجھا جاتا تھا، قرآن مجید نے آدم وحوا دونوں کی طرف اِس غلطی کی نسبت کر کے عورتوں کو اس تہمت سے باہر نکالا ہے، جو یقیناً دنیائے نسوانیت پر اس کا احسان ہے۔

﴿٢﴾ بائبل میں ہے کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام جنت میں شروع ہی سے برہنہ تھے اور ایک دوسرے سے شرماتے نہیں تھے، (پیدائش: ٢٥) مگر قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ وہ دونوں جنت کے لباس میں ملبوس تھے اور جونہی ان کے جسم سے لباس اُترا، وہ مارے شرم کے پتوں سے اپنی شرمگاہیں چھپانے لگے، اس میں اشارہ ہے کہ شرمگاہوں کو چھپا کر رکھنا انسان کی فطرت میں ہے اور انسان اول دن سے اس پر کاربند رہا ہے، مغرب میں جو لوگ عریانیت کی وکالت کرتے ہیں، وہ دراصل فطرت کے باغی ہیں۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ
فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا
يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَ رِيْشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

ع ۲ ۱۵

اللہ نے فرمایا: تم لوگ (جنت سے) اُتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے، ﴿۱﴾ تمہارے لئے کچھ عرصہ تک زمین میں رہنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت ہے، ﴿۲۴﴾ اللہ نے کہا: تم اسی زمین میں زندگی گذارو گے، اسی میں تمہاری موت ہوگی اور اسی سے (دوبارہ) اُٹھائے جاؤ گے ﴿۲۵﴾ اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس فراہم کیا ہے، جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپا دیتا ہے اور زینت کا ذریعہ ہے ﴿۲﴾ اور تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے، ﴿۳﴾ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے؛ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۶﴾

﴿۱﴾ یعنی آدم حوا علیہما السلام کی اولاد 'انسان' ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، یا انسان اور شیطان ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے — رہ گیا یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین میں کہاں اُترے؟ تو قرآن اور صحیح حدیثوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں، بعض روایتوں میں ہندوستان کے ساحل ''سرندیپ'' یعنی سری لنکا میں اُترنے کا ذکر آیا ہے، یہاں ایک پہاڑ بھی 'کوہِ آدم' کے نام سے معروف ہے۔ واللہ اعلم

﴿۲﴾ گویا لباس کا بنیادی طور پر دو مقصد ہے، اولین مقصد جسم کے قابل ستر حصہ کو چھپانا ہے، اگر کوئی لباس اس مقصد کو پورا نہ کرے، اتنا باریک ہو کہ جسم نظر آئے، اتنا چست ہو کہ جسم کی بناوٹ نمایاں ہو جائے، ایسا ادھورا ہو کہ جسم کے بہت سے حصے نظر آتے رہیں، تو یہ لباس حقیقت میں ''لباس'' نہیں ہے، لباس کا دوسرا مقصد زینت و آرائش بھی ہے؛ البتہ اس سلسلہ میں شریعت میں مردوں اور عورتوں کے درمیان فرق کیا گیا ہے، عورتیں ریشم اور زعفرانی رنگ کے کپڑے استعمال کر سکتی ہیں، مردوں کے لئے ان کی ممانعت ہے۔

﴿۳﴾ جیسے لباس انسان کو سردی و گرمی سے بچاتا ہے، اسی طرح تقویٰ یعنی عمل صالح اور گناہ سے پرہیز آخرت کی پکڑ سے محفوظ رکھتا ہے؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ ظاہری لباس کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا باطنی لباس بھی انسان کو اپنے وجود پر رکھنا چاہئے۔

﴿۴﴾ لباس اللہ کی نشانی اور بہت بڑی نعمت ہے، دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں، وہ لباس سے خالی ہیں، ان کی حفاظت کے لئے بالوں پر مشتمل چمڑے اور شرمگاہوں کو چھپانے کے لئے دم وغیرہ کی شکل میں ایک فطری پردہ موجود ہے؛ لیکن لباس کا تنوع، اس کے مختلف ڈیزائن اور مختلف رنگ و روپ سے جو خوبصورتی پیدا ہوتی ہے، اس سے سوائے انسان کے سب محروم ہیں۔

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ لَا یَفْتِنَنَّكُمُ الشَّیْطٰنُ كَمَاۤ اَخْرَجَ اَبَوَیْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
لِیُرِیَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ
اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَاۤ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا
بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ
بِالْقِسْطِ ۫ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ۬ كَمَا
بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ؕ

اے اولادِ آدم! شیطان تم کو بہکا نہ دے؛ جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا تھا، اس نے ان دونوں سے ان کے لباس اُتروا دیئے؛ ﴿۱﴾ تا کہ انھیں ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھائے، یقیناً وہ اور اس کا لشکر تم کو دیکھتا ہے، جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے، ﴿۲﴾ بے شک ہم نے شیطان کو ان ہی لوگوں کا دوست بننے دیا ہے، جو ایمان نہیں لائے ﴿۲۷﴾ اور جب وہ بے حیائی کا کوئی کام کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ان کو اس کا حکم دیا تھا، آپ کہہ دیجئے: اللہ ہرگز بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتے، کیا تم اللہ پر ایسی باتیں گھڑتے ہو، جس کا تمہیں علم نہیں ہے؟ ﴿۳﴾ ﴿۲۸﴾ آپ کہہ دیجئے: میرے پروردگار نے تو انصاف کا حکم دیا ہے اور اس بات کا کہ ہر نماز کے وقت اپنا رُخ (خدا کی طرف) سیدھا رکھا کرو، نیز اس طرح اللہ کی عبادت کرو کہ اسی کے لئے عبادت کو خالص رکھو، خدا نے جس طرح تم کو شروع میں پیدا کیا تھا، اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہوگے۔ ﴿۴﴾ ﴿۲۹﴾

﴿۱﴾ گویا بے لباسی اور عریانت شیطان کی خاص مہم ہے، انسان کو ہمیشہ اس سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا چاہئے۔

﴿۲﴾ یعنی شیطان وجنات ایسے جسم کے مالک ہیں کہ نظر نہیں آتے، یہ عام عادت کے اعتبار سے ہے، رسول اللہ ﷺ اور حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ نے بعض دفعہ جنات کو دیکھا ہے، یہ خلافِ عادت اتفاقی واقعہ ہے؛ اس لئے یہ دیکھنا اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کے خلاف نہیں ہے۔

﴿۳﴾ ''فاحشہ'' کھلی ہوئی برائی اور بے حیائی کو کہتے ہیں، مشرکین عرب میں سے جن کو اہل حرم کی طرف سے لباس نہیں ملتا تھا، وہ بے لباس ہوکر طواف کرتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ ایک تو ہمارے باپ دادا سے یہی طریقہ چلا آرہا ہے، دوسرے: اللہ ہی نے ان کو اس کا حکم دیا تھا، ان میں سے پہلی بات کا غلط ہونا ظاہر ہے؛ کیوں کہ نادان وناواقف باپ دادا کا عمل قابل پیروی نہیں ہوتا؛ اسی لئے اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا؛ البتہ دوسری بات کہ اللہ ہی نے اس کا حکم دیا تھا، نہایت غلط اور غلط فہمی میں ڈالنے والی بات تھی، قرآن مجید نے اس کا جواب دیا کہ اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتے۔

﴿۴﴾ یعنی بے لباس طواف وغیرہ کے من گھڑت رواج کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے سماج میں انصاف قائم کرو اور ظلم سے اپنے ←

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۭ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ
اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا
وَاشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ ع ۳ ۱۰
لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳۲

بعض لوگوں کو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور بعض لوگوں کے لئے گمراہ ہونا مقدر ہو چکا ہے، اِن لوگوں نے یقیناً اللہ کے مقابلہ شیطانوں کو اپنا دوست بنالیا ہے، اور (وہ اپنے آپ کے بارے میں) سمجھتے ہیں کہ وہی درست راستہ پر ہیں، ۝۳۰ اے اولادِ آدم! ہر نماز کے وقت اپنے لباس پہن لیا کرو، ﴿۱﴾ اور کھاؤ، پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، ﴿۲﴾ ۝۳۱ آپ دریافت کیجئے: اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو آرائش کے سامان اور رزق کے لئے پاک چیزیں پیدا کی ہیں، انھیں کس نے حرام کر دیا ہے؟ ﴿۳﴾ آپ بتا دیجئے کہ یہ نعمتیں دنیا میں بھی (اصل میں) ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو ان ہی کے لئے مخصوص ہوں گی، ﴿۴﴾ ہم اسی طرح احکام کو ان لوگوں کے لئے وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جو سمجھنا چاہیں۔ ۝۳۲

← دامن بچاؤ، انصاف ہی کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ عبادت صرف خدا کی کرو اور کسی اور کو عبادت میں شریک نہ کرو، ''رُخ سیدھا رکھنے'' سے مراد اللہ کی عبادت کرنا ہے، ''خالص رکھنے'' سے مراد کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا ہے: کیوں کہ اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور دوبارہ بھی پیدا کرے گا اور جو خالق ہو وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

﴿۱﴾ اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں حصۂ ستر کا چھپانا واجب ہے؛ کیوں کہ لباس کا مقصد ہی یہی ہے، طواف بھی بہت سے مسائل میں نماز ہی کے حکم میں ہے؛ اس لئے اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ طواف کے لئے بھی ستر ضروری ہے، حصۂ ستر مردوں کے لئے ناف سے گھٹنوں تک ہے اور عورتوں کے لئے چہرہ، ہتھیلیوں اور پاؤں کے سوا سارا بدن (احکام القرآن للجصاص: ۴۱/۳) ——لباس کو اللہ تعالیٰ نے یہاں ''زینت'' سے تعبیر فرمایا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز میں بہتر لباس پہننے کی کوشش کرنی چاہئے، ایسا نہ ہو کہ دنیوی تقریبات میں تو عمدہ لباس استعمال کریں اور نماز میں معمولی، یہ نماز کی بے توقیری ہے، اسی لئے بلا عذر ''مبتذل'' یعنی ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جس کا پہننا شائستگی کے خلاف سمجھا جاتا ہو۔ (احکام القرآن للجصاص: ۴۲/۳، ابن کثیر: ۲۶۷/۲)

﴿۲﴾ اسلام کی تمام تعلیمات کی روح اس کا اعتدال ہے، یہ بھی درست نہیں کہ آدمی کھانا پینا چھوڑ دے، نفیس لباس اور عمدہ کھانا استعمال نہ کرے اور یہ بھی روا نہیں ہے کہ فضول خرچی میں مبتلا ہو جائے۔

﴿۳﴾ مختلف قومیں کچھ حلال اور پاک چیزوں کو حرام سمجھتی تھیں، مشرکین عرب بھی حج کے دنوں میں عمدہ غذاؤں کو ممنوع ←

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

آپ فرما دیجئے کہ میرے پروردگار نے تو صرف کھلی اور چھپی ہوئی بے حیائی کی باتوں کو، گناہ کو، ناحق ظلم کرنے کو، اللہ کے ساتھ کسی کے شریک ٹھہرانے کو —— جس پر اللہ نے کوئی سند نہیں اُتاری ہے —— اور بغیر جانے بوجھے اللہ پر جھوٹی باتیں گھڑنے کو حرام قرار دیا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۳۳﴾ ہر گروہ کے لئے ایک مدت مقرر ہے، جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو وہ نہ اس سے ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۴﴾

← خیال کرتے تھے، اسی کی تردید کی جارہی ہے، کہ حلال وحرام کرنا اللہ کا حق ہے، انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، پھر جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، اسے تم کیسے حرام کر سکتے ہو؟

﴿۴﴾ یعنی دنیا میں اللہ کی جو نعمتیں ہیں، ان سے تو مسلمان وغیر مسلم سب فائدہ اُٹھاتے ہیں؛ مگر اصل میں اللہ نے ان کو ایمان والوں ہی کے لئے پیدا کیا ہے اور آخرت میں تو یہ ایمان والوں ہی کے لئے خاص ہوں گی، کافروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

﴿۱﴾ یعنی جن چیزوں کو اللہ نے حرام نہیں کیا، ان کو تم حرام کئے ہوئے ہو، اور جن باتوں کو حرام قرار دیا ہے، ان میں مبتلا ہو —— ''کھلی بے حیائی'' سے مراد علانیہ بے شرمی کا کام کرنا ہے؛ جیسا کہ مشرکین بے لباس طواف کیا کرتے تھے، 'چھپی ہوئی بے حیائی' سے چھپ کر برائی کرنا مراد ہے، گناہ میں تمام گناہ کی باتیں شامل ہیں، ''ناحق ظلم'' سے روکنے کا مقصد بندوں کے ساتھ حق تلفی اور ظلم وزیادتی کو منع کرنا ہے، شرک کو خاص طور پر منع کیا گیا اور چوں کہ مشرکین کہتے تھے کہ اللہ کے حکم ہی سے ہمارے آباء واجداد مشرکانہ افعال کرتے آئے ہیں؛ اس لئے اللہ کی طرف جھوٹی باتوں کی نسبت کرنے سے منع فرمایا گیا —— اسی سے معلوم ہوا کہ جو روایتیں موضوع ہوں، یعنی محدثین نے ان کو گھڑی ہوئی روایت قرار دیا ہو، رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کرکے بہ طور مثال ان کا ذکر کیا جا سکتا ہے، مثلاً یوں کہا جائے: اس سلسلہ میں جو فلاں روایت منقول ہے، وہ موضوع اور غیر معتبر ہے؛ لیکن موضوع ہونے کی وضاحت کے بغیر موضوع روایات کو نقل کرنا جائز نہیں؛ (تدریب الراوی: ۲۳۱/۱) کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جھوٹی بات کے نقل کرنے کو بھی جھوٹ بولنا قرار دیا ہے۔ (مقدمہ مسلم مع النووی: ۶۲/۱)

﴿۲﴾ موت ہمیشہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے وقت ہی پر آتی ہے، نہ زندگی کا عرصہ اُس سے زیادہ ہو سکتا ہے نہ کم، بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص وقت سے پہلے مر گیا، یا یہ کہ فلاں بات ہوگئی ہوتی تو اس کی جان بچ جاتی، یہ سب غلط ہے، ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ
مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا
كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا
هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

اے اولادِ آدم! جب تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر آئیں، جو تم پر میرے احکام بیان کریں تو (یاد رکھو کہ) جو اللہ سے ڈریں اور نیک عمل کریں، تو ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے ﴿۱﴾ ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا اور (ان کو قبول کرنے سے) تکبر کیا، وہ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے، ﴿۲﴾ ﴿۳۶﴾ پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے یا اللہ کے احکام کو جھٹلائے؟ ان کو (دنیوی زندگی میں) ان کے مقدر کا حصہ مل جائے گا؛ یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان نکالنے آئیں گے تو پوچھیں گے کہ اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کیا کرتے تھے، وہ کہاں ہیں؟ وہ جواب دیں گے: وہ تو ہم سے غائب ہو لئے اور اپنے آپ کے بارے میں اعتراف کریں گے کہ وہ واقعی کفر میں مبتلا تھے ﴿۳﴾ ﴿۳۷﴾ اللہ فرمائیں گے: ان جنات و انسان کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ، جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، جب بھی کوئی گروہ دوزخ میں داخل ہوگا تو وہ اپنے جیسے دوسرے گروہ پر لعنت بھیجے گا؛ یہاں تک کہ جب سب کے سب دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، تو بعد والے پہلے والوں کے بارے میں کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! یہی لوگ ہیں، جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا؛ اس لئے ان کو دوزخ کا دوہرا عذاب دیجئے، اللہ فرمائیں گے: ہر ایک کے لئے دوہرا عذاب ہی ہے؛ لیکن تم واقف نہیں ہو۔ ﴿۳۸﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روحوں سے کائنات کو پیدا کرتے وقت ہی یہ عہد لیا تھا؛ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کا سلسلہ شروع ہوا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا، اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا؛ جیسا کہ مختلف آیات واحادیث میں اس کی صراحت موجود ہے، قادیانی حضرات اس آیت سے دھوکہ دیتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا سلسلہ باقی ہے؛ حالاں کہ اگر یہ مقصود ہوتا تو قرآن مجید میں 'بنی آدم' کی بجائے 'اُمتِ محمدیہ' سے یا مومنون سے خطاب کیا جاتا۔ ←

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ
تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا ع ۸ ۱۱
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ لَهُمْ
مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور پہلے والے بعد والوں سے کہیں گے: تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے؛ اس لئے اب اپنی بداعمالیوں کی سزا چکھو، ﴿۱﴾ ﴿۳۹﴾ بے شک جن لوگوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ تکبر کیا ہے، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور ان کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے، جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں داخل ہونا، ﴿۲﴾ اور ہم جرم کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ﴿۴۰﴾ ان کے لئے دوزخ ہی کا بچھونا اور اوپر سے اسی کا اوڑھنا ہوگا اور ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں، ﴿۴۱﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا —— (اور واضح ہو کہ ہم کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر عمل کا پابند نہیں بناتے ﴿۳﴾ —— یہی جنتی لوگ ہیں، وہ ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے۔ ﴿۴۲﴾

← ﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لائے اور اسی حالت میں ان کی موت واقع ہوگئی، صرف وہی ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہیں گے، جو لوگ ایمان لائے اور گناہوں کے مرتکب ہوئے، وہ —— اگر اللہ چاہیں —— تو دوزخ میں جاسکتے ہیں، مگر سزا پا کر دوزخ سے نکل جائیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے۔

﴿۳﴾ مگر اس وقت کا اظہارِ ندامت اور توبہ کرنا معتبر نہ ہوگا اور ان کا شمار کافروں ہی میں ہوگا۔

﴿۱﴾ مصیبت کے وقت اگر مختلف لوگ تکلیف میں ہوں اور ایک دوسرے سے دلداری کی بات کریں تو اس سے بھی کسی قدر غم ہلکا ہوتا ہے؛ مگر دوزخیوں کو یہ بات بھی حاصل نہ ہوگی، سب کے سب عذاب میں بھی مبتلا رہیں گے اور ایک دوسرے کو لعن طعن بھی کریں گے۔

﴿۲﴾ ''آسمان کے دروازوں'' سے جنت کے دروازے مراد ہیں؛ جیسا کہ اگلے فقرہ میں صراحت ہے کہ جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں داخل ہونا ممکن نہیں، اسی طرح ایمان نہ لانے والوں کا جنت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

﴿۳﴾ یعنی نیک عمل کرنے اور گناہوں سے بچنے میں کچھ مشقت تو ضرور ہوتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ انسان کی طاقت وصلاحیت سے زیادہ ہو؛ اس لئے کہ ہمارے تمام احکام انسان کی طاقت کے لحاظ سے ہوتے ہیں، قرآن مجید نے اس جملہ میں شریعتِ اسلامی کے مزاج کو واضح فرمادیا ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دین کے ہر حکم میں انسان کی طاقت واستطاعت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، غریبوں پر زکوٰۃ وقربانی اور سفرِ حج فرض نہیں، بیماروں پر جہاد فرض نہیں، جو پانی استعمال نہ کرسکے، اس کے لئے تیمم کی اجازت ہے، جو نماز میں کھڑا نہ ہوسکے، وہ بیٹھ کر، جو بیٹھ نہ سکے وہ لیٹ کر اور جو حرکت نہ کرسکے وہ اشارہ سے نماز ادا کرسکتا ہے، جو بھوکا نہ رہ سکے، وہ روزہ رکھنے کی بجائے فدیہ ادا کردے، غرض شریعت کے تمام احکام میں انسان کی طاقت وصلاحیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ الۡاَنۡهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡكُمُ الۡجَنَّةُ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ وَ نَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ۙ الَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ یَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

الثلثۃ — وقف لازم

نیز ان کے دلوں میں (ایک دوسرے سے) جو کدورت ہوگی، اسے بھی ہم نکال دیں گے، ﴿۱﴾ ان کے نیچے سے نہریں بہتی رہیں گی، اور وہ کہیں گے: اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا، اگر اللہ ہدایت سے نہ نوازتے تو ہم ہرگز یہاں نہیں پہنچ پاتے، یقیناً ہمارے پروردگار کے بھیجے ہوئے پیغمبر سچی بات لے کر آئے تھے، اور انھیں پکار کر کہا جائے گا: تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے تم کو یہ جنت دی گئی ہے ﴿۲﴾ ﴿۴۳﴾ اور جنت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ''ہمارے پروردگار نے ہم سے جو کچھ وعدہ کیا تھا، ہم نے تو اس کو سچا پایا، تو کیا تم لوگوں نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا ہے''؟ وہ کہیں گے: ہاں، —— پھر ان کے درمیان ایک پکارنے والا پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو، ﴿۳﴾ ﴿۴۴﴾ جو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور یہ لوگ آخرت کے بھی منکر تھے۔ ﴿۴۵﴾

﴿۱﴾ چند لوگ اکٹھے ہوں اور ساری راحتیں میسر ہوں؛ مگر ایک دوسرے سے دل صاف نہ ہوں تو دل میں ایک چبھن باقی رہتی ہے، جو راحت و مسرت کے احساس کو مجروح کرتی ہے، جنت والوں کو اللہ تعالیٰ اس تکلیف سے بچانے کے لئے دل کی کدورتیں بھی صاف کردیں گے؛ تاکہ خوشی و مسرت کے ان لمحات میں کوئی بدمزگی باقی نہ رہے، حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما ایک جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مدمقابل تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اور زبیر و طلحہ بھی ان ہی لوگوں میں ہوں گے، جن کی باہمی کدورتیں قیامت کے دن ختم کردی جائیں گی، (تفسیر ابن کثیر: ۲؍۲۷۳) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پل صراط کے آخری حصہ میں —— دوزخ کو پار کرنے کے بعد —— اہل جنت کو ایک دوسرے سے بدلہ دلایا جائے گا، اس کے بعد پاک و صاف دلوں کے ساتھ یہ حضرات جنت میں قدم رکھیں گے۔ (بخاری، کتاب المظالم، باب قصاص المظالم، حدیث نمبر: ۲۴۴۰)

﴿۲﴾ اصل میں تو جنت میں داخل ہونا اللہ کے فضل و کرم سے ہوگا؛ لیکن انسان کی نیکیوں ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا فضل حاصل ہوتا ہے؛ اس لئے فرمایا جائے گا کہ تمہارے اعمال کی وجہ سے تم جنت میں داخل کئے گئے ہو۔

﴿۳﴾ یہ پکارنے والا فرشتہ ہوگا اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ دوزخ والوں کو اور زیادہ پچھتاوا اور شرمندگی ہو؛ کیوں کہ ندامت و افسوس بھی تکلیف کے احساس کو بڑھاتی ہے۔

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ
اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۟ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ
ع ۵/۸/۱۲ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ
رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾
اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَ لَاۤ
اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

ان کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور کچھ لوگ ''اعراف'' پر ہوں گے، یہ ہر ایک کو ان کی علامتوں سے پہچان لیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو! وہ جنت میں (ابھی) داخل تو نہیں ہوئے ہوں گے؛ مگر اس کے مشتاق ہوں گے ﴿۴۶﴾ اور جب ان کی نظر دوزخ والوں کی طرف جائے گی تو فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! ہمیں ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ رکھئے ،﴿۱﴾ ﴿۴۷﴾ اعراف والے کچھ لوگوں کو ان کی علامتوں ﴿۲﴾ سے پہچان کر دریافت کریں گے: تمہاری جمعیت اور تمہارا تکبر تمہیں کچھ بھی کام نہ آسکا؟ ﴿۴۸﴾ کیا یہی لوگ ہیں، جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ انھیں اللہ کی رحمت حاصل نہ ہوسکے گی، (حالاں کہ اللہ نے ان کے حق میں فرمان جاری کردیا کہ) تم جنت میں داخل ہوجاؤ، تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں اور نہ تم غم سے دوچار ہوگے۔﴿۳﴾ ﴿۴۹﴾

﴿۱﴾ جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی؛ البتہ قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیث کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ ایسے راستے یا روشن دان بھی ہوں گے، جن سے یہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے اور بات چیت کرسکیں گے، اسی دیوار کے بالائی حصہ کو ''اعراف'' کہتے ہیں، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوگی، ان کی جگہ ''اعراف'' ہوگی، جو بالآخر جنت میں داخل کردیئے جائیں گے (دیکھئے: الجامع لأحکام القرآن: ۷/۱۳۵) —— آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلام کرنے کا رواج جنت میں بھی رہے گا؛ کیوں کہ یہ دُعاء اور محبت و تعلق کا اظہار ہے۔

﴿۲﴾ علامتوں سے مراد یہ ہے کہ اہل جنت کے چہرے روشن اور خوبصورت ہوں گے اور دوزخیوں کے سیاہ اور بدھیئت؛ کیوں کہ شکل و صورت بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اہل جنت تمام نعمتوں سے مالا مال کئے جائیں گے اور اہل دوزخ اُن سے محروم رہیں گے، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ (دیکھئے: آلِ عمران: ۱۰۶، قیامۃ: ۲۴، عبس: ۳۸-۴۰ وغیرہ)

﴿۳﴾ غریب مسلمان جیسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ وغیرہ کے بارے میں سردارانِ مکہ یہی کہتے تھے کہ یہ ہمیشہ محروم ہی رہیں گے —— اور یہ کچھ اسی دور پر موقوف نہیں، ہر زمانہ میں بد دین لوگ اپنی دولت و آسائش اور نیک لوگوں کی غربت و افلاس کو دیکھ کر اسی طرح کی بات سوچتے اور کہتے ہیں، انھیں نہیں معلوم کہ دنیا کی دولت فانی اور آنی جانی ہے، اصل نعمت وہ ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی، جو کبھی ختم نہیں ہوگی اور جہاں خوشی کے ساتھ غم اور راحت کے ساتھ تکلیف کی ادنیٰ آمیزش نہ ہوگی۔

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ
قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ
رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَاۤ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا
ع ۶ ۱۳ نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے: ہم پر تھوڑا سا پانی یا اللہ نے تم کو جو عطا فرمایا ہے، اس میں سے کچھ دے دو، جنتی کہیں گے: اللہ نے ان دونوں چیزوں کو ایمان نہ لانے والوں پر حرام قرار دیا ہے،﴿۱﴾ ﴿۵۰﴾ یہ وہی لوگ ہوں گے، جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ ﴿۲﴾ بنالیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:) جس طرح ان لوگوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور جس طرح یہ ہمارے احکام کا انکار کیا کرتے تھے، اسی طرح آج ہم بھی ان کو بھلائے رہیں گے ﴿۳﴾ ﴿۵۱﴾ اور ہم نے ان کو ایسی کتاب عطا کی ہے، جس میں علم وآگہی کی بنیاد پر ہم نے پوری وضاحت کردی ہے، وہ ایمان لانے والوں کے لے ہدایت کا ذریعہ اور رحمت کا باعث ہے ﴿۵۲﴾ کیا یہ لوگ اس کی مراد (یعنی انجام) کے ظاہر ہونے کے منتظر ہیں؟ ﴿۴﴾ جس دن اس کی مراد ظاہر ہوجائے گی، اس دن جن لوگوں نے پہلے اسے فراموش کررکھا تھا، وہ کہہ پڑیں گے: یقیناً ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے، تو اب کیا ہمارے لئے کچھ سفارشی ہیں، جو ہماری سفارش کردیں یا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہمیں واپس لوٹا دیا جائے؟ کہ (اگر ایسا ہوجائے تو) اب ہمارے اعمال پہلے والے اعمال سے مختلف ہوں گے،﴿۵﴾ (مگر ان باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا؛ کیوں کہ) وہ اپنے آپ کو خود ہی نقصان میں ڈال چکے ہیں اور جو جھوٹی باتیں وہ گھڑا کرتے تھے، وہ سب آج گم ہوچکی ہیں۔﴿۶﴾ ﴿۵۳﴾

﴿۱﴾ ''حرام قرار دینے'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے اہل دوزخ کو جنت کی چیزیں دینے کی اجازت نہیں، ورنہ تو حلال وحرام کے قوانین اِس دنیا کے لئے ہیں، آخرت کے لئے نہیں۔

﴿۲﴾ اکثر وہ قومیں جو ایمان سے محروم ہیں، اپنے عقیدہ کے مطابق جو مذہبی افعال انجام دیتی ہیں، ان میں بھی تفریح اور کھیل کود کا رنگ داخل کردیتی ہیں، جیسے: ناچ، گانا، پٹاخہ بازی وغیرہ، ہندوؤں کے یہاں ہولی اور دیوالی وغیرہ اس کی مثال ہے؛ اسی لئے فرمایا گیا کہ انھوں نے کھیل تماشہ کو اپنا مذہب بنالیا ہے۔

﴿۳﴾ بھلا دینے سے مراد ہے کہ آج ہم بھی ان پر رحم نہیں کھائیں گے۔

←

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۫ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۴﴾

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا رب وہی اللہ ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت (سلطنت) پر جلوہ فرما ہوگیا، وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ رات دن کو جلدی سے آ پکڑتی ہے، اس نے سورج، چاند اور ستارے بھی پیدا کئے، جو اسی کے حکم کے فرمانبردار ہیں، ﴿۱﴾ آگاہ ہو جاؤ کہ وہی پیدا کرتا ہے اور اسی کا حکم چلتا ہے، ﴿۲﴾ اللہ بڑی برکت والے ہیں، جو تمام عالم کے رب ہیں۔ ﴿۵۴﴾

← ﴿۴﴾ یعنی اللہ کی نافرمانی پر قرآن مجید میں جس عذاب کی دھمکی دی جارہی ہے، کیا وہ چاہتے ہیں کہ یہ عذاب عملی طور پر ظاہر ہوکر سامنے آجائے؟

﴿۵﴾ جب قیامت آجائے گی، نیکیوں اور گناہوں کا حساب ہوگا اور دوزخ کا عذاب آنکھوں کے سامنے ہوگا، تو اب انھیں سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی اللہ کے رسولوں کی بات صحیح تھی، اس وقت تلاش کریں گے کہ کوئی سفارش کرنے والا مل جائے اور آرزو کریں گے کہ کاش! دوبارہ دنیا میں واپسی کا موقع مل جائے؛ تاکہ اب ہم اچھے اعمال کر کے آئیں؛ لیکن اس وقت سوائے حسرت و افسوس کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

﴿۶﴾ یعنی نہ آج وہ معبودانِ باطل ہیں، جن کی وہ پوجا کرتے تھے، نہ ان خودساختہ خیالات اور باپ دادا سے منقول رسوم ورواج کی کوئی حقیقت ہے، جن کو اختیار کرتے ہوئے وہ پیغمبروں کی دعوتِ حق کو ٹھکرائے ہوئے تھے۔

﴿۱﴾ چھ دنوں سے مراد ہے چھ دنوں کے اوقات کی مقدار؛ کیوں کہ تخلیق کا یہ عمل سورج اور زمین کی پیدائش سے پہلے کا ہے، جب کہ دن اور رات موجود ہی نہیں تھے، عرش (تخت) سے اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کا تخت مراد ہے، یہ تخت کیسا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس پر جلوہ افروز ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ قرآن و حدیث میں اس کی تفصیل ذکر نہیں کی گئی ہے، یقیناً وہ اللہ کی شان کے مطابق ہوگا، دن کو رات سے ڈھانپنے، سورج و چاند وغیرہ کے پیدا کرنے اور ان کے احکام الٰہی کے فرمانبردار ہونے کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ زمین وآسمان، چاند، سورج اور ستاروں کی مختلف قومیں پوجا کرتی رہی ہیں؛ حالاں کہ انھیں اللہ نے پیدا کیا ہے، اور زمین کی گردش ہو یا چاند، سورج اور دوسرے سیاروں کی، سب اللہ کے حکم سے ہے؛ اس لئے عبادت تو اللہ کی ہونی چاہئے، نہ کہ ایسی چیزوں کی جو اپنی تخلیق میں بھی خدا کے محتاج تھے اور اپنی حرکت وسکون میں بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں۔

﴿۲﴾ قرآن مجید نے ایک اُصولی بات واضح کردی ہے کہ جو خالق ہو، اسی کا حکم بھی چلے گا؛ کیوں کہ خالق اپنی مخلوق کی ضرورتوں، مصلحتوں، اس کی خواہشات وجذبات اور اس کے نفع وضرر سے جس قدر واقف ہے، خود مخلوق بھی اپنے بارے میں آگاہ نہیں، دوسرے خالق کو اپنی مخلوق سے محبت اور خیر خواہی بھی ہوتی ہے؛ اس لئے اس کے مقرر کئے ہوئے قانون سے بہتر کوئی ←

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝٥٥ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝٥٦

اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر چپکے چپکے دُعاء کیا کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ﴿۱﴾ ۝٥٥ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو، ﴿۲﴾ اور اللہ سے خوف اور اُمید کے ساتھ دُعاء کیا کرو، ﴿۳﴾ بے شک اللہ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں کے قریب ہی ہے۔ ۝٥٦

← اور قانون نہیں ہوسکتا؛ اسی لئے شرعی قوانین انسان کے لئے نہ صرف آخرت کے اعتبار سے مفید ہیں ؛ بلکہ دنیا میں بھی وہی ان کے لئے نافع اور ان کی مصلحتوں کے مطابق ہیں۔

﴿۱﴾ قرآن مجید کے اس ارشاد میں دُعاء کرنے کے آداب بتائے گئے ہیں: ’’تضرع‘‘ کے معنی گڑگڑانے کے ہیں، جس کا تعلق انسان کے پورے وجود سے ہے، یعنی اس کی حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کے سامنے نیازمندی اور عجز وفروتنی کا مظہر ہوں؛ اسی لئے دُعاء میں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا مسنون ہے، یہ ہاتھ پھیلانا رسم کے طور پر نہ ہو؛ بلکہ ایسا محسوس ہو کہ واقعی کوئی بھکاری بادشاہ کے آستانہ پر حاضر ہے، ’’خفیہ‘‘ کا تعلق آواز سے ہے، یعنی دُعاء آہستہ آہستہ چپکے چپکے کی جائے، اس میں اخلاص اور دیکھاوے سے بچنے کا پہلو بھی زیادہ ہے، آج کل ہندو پاک کی مسجدوں میں نمازوں کے بعد زور زور سے دُعاء کرنے کا جو رواج ہوگیا ہے، یہ مسنون طریقہ کے خلاف ہے اور اس میں دُعاء کی حقیقی روح پیدا نہیں ہوتی؛ بلکہ رسمی طور پر امام دُعاء کے کچھ مقررہ الفاظ پڑھتا ہے اور مقتدی حضرات اس پر ’’آمین‘‘ کہتے جاتے ہیں، —— اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ آمین آہستہ کہنا بہتر ہے؛ کیوں کہ آمین بھی ایک دُعاء ہے —— دُعاء کے آداب بتانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ’’اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے‘‘ اس کا تعلق یوں تو زندگی کے تمام مسائل سے ہے؛ لیکن چوں کہ آدابِ دُعاء کے ساتھ اس کا ذکر آیا ہے؛ اس لئے بہت سے مفسرین نے اس کو دُعاء کے آداب ہی سے متعلق رکھا ہے، دُعاء میں ’’زیادتی کرنا‘‘ یہ ہے کہ دُعاء غفلت کے ساتھ کی جائے، پُرتکلف الفاظ استعمال کئے جائیں، جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے، نمائش اور دیکھاوا ہو، غرض کہ دُعاء میں اس کے آداب کی رعایت نہ کی جائے۔

﴿۲﴾ اصلاح کا ایک روحانی پہلو ہے اور دوسرا مادی، روحانی پہلو یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب اور شریعت نازل فرما کر صالح زندگی کا ایک پورا نظام عنایت فرمادیا ہے، گناہ، بے حیائی اور ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرنا اس صلاح کو فساد اور بناؤ کو بگاڑ سے بدل دینا ہے، مادی پہلو یہ ہے کہ زمین اور اس کی فضا کو انسان کی زندگی، اس کی صحت اور اس کی غذا کے لئے نہایت موزوں اور موافق بنایا گیا ہے، زمین میں آلودگی پھیلا کر اس کو صحت کے لئے نقصان دہ اور زندگی کے لئے مہلک نہ بنادیا جائے اور ماحولیات کا تحفظ کیا جائے۔

﴿۳﴾ اس میں دُعاء کے دو اور آداب بتائے گئے ہیں، جن کا تعلق اندرونی کیفیت سے ہے، ایک یہ کہ دُعاء کرتے وقت اللہ کا خوف بھی ہو، کہ کہیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہماری دُعاء رد نہ ہوجائے، دوسرے: اللہ سے اُمید بھی ہو کہ وہ کریم ومہربان ہے، انشاء اللہ اپنی رحمت سے ہماری دُعاء قبول فرمالیں گے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیْحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ
لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ
اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ ع ۱۵/۱۴
یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ
الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور وہی ذات ہے، جو بارانِ رحمت (یعنی بارش) سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اُٹھا لیتی ہیں، تو ہم اسے کسی خشک علاقہ کی طرف ہنکا دیتے ہیں، پھر ہم اس سے پانی برساتے ہیں اور اس کے ذریعہ ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مُردوں کو بھی زندہ کریں گے، شاید تم غور کرو، ﴿۱﴾ ﴿۵۷﴾ نیز بار آور زمین سے تو اس کے رب کے حکم سے پودے نکلتے ہیں، اور جو زمین خراب ہے، اس سے پودے بہت کم نکلتے ہیں، اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے ان لوگوں کے لئے قدرت کی نشانیاں بیان کرتے ہیں، جو (ان کی) قدر کرتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۵۸﴾ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، مجھے تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے، ﴿۵۹﴾ اس کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا: ہم تو سمجھتے ہیں کہ تو کھلی ہوئی گمراہی میں (مبتلا) ہے ﴿۶۰﴾ نوح نے کہا: اے میری قوم! میں ہرگز گمراہ نہیں ہوں؛ بلکہ میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے پیغمبر ہوں، ﴿۶۱﴾ میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچا رہا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ ﴿۶۲﴾

﴿۱﴾ مردہ زمین کو بارش کے ذریعہ اللہ زندہ کر دیتے ہیں، اسی طرح مردہ انسانوں کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ فرمادیں گے، عبرت ونصیحت حاصل کرنے اور آخرت پر ایمان لانے کے لئے یہ واضح مثال ہے، جسے ہر شخص دن ورات اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

﴿۲﴾ یہ دراصل تشبیہ ہے، جیسے بارش زمین کو سیراب کرنے اور اس کی پیداواری صلاحیت کو اُبھارنے کے لئے ہے؛ لیکن جس زمین میں بار آور ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسی میں پیڑ پودے نکل آتے ہیں اور جو زمین پتھریلی اور بار آوری کی صلاحیت سے محروم ہو، بارش سے اس کو فائدہ نہیں پہنچتا، یا تو اس میں پیداوار ہی نہیں ہوتی یا ہوتی ہے تو معمولی، یہی حال انسانوں کا ہے، اللہ کا کلام اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت ایک بارانِ رحمت ہے؛ مگر دل کی زمین میں قبول کرنے کی صلاحیت ہو تو اسے فائدہ پہنچتا ہے اور کسی نے اپنی بداعمالی، ضد اور ہٹ دھرمی سے اسے سخت بنا لیا ہو تو وہ اللہ کے اثر انگیز کلام کو سن کر بھی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَ لِتَتَّقُوْا وَ لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ
ع ۱۵ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا
لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

کیا تمھیں اس بات پر حیرت ہے کہ تمہارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کی معرفت تمہارے رب کی طرف سے نصیحت کی بات آجائے؛ تاکہ وہ تمھیں ڈرائے ،تم (دوزخ سے) بچائے جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے؛ ﴿۶۳﴾ چنانچہ نوح کی قوم اس کو جھٹلاتی رہی ، پھر ہم نے نوح کو اور جو لوگ اس کے ساتھ کشتی میں تھے، ان کو بچالیا اور جن لوگوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا تھا ، انھیں ڈبو دیا ، بے شک وہ (دل کے) اندھے تھے ﴿۱﴾ ﴿۶۴﴾ ہم نے قومِ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا ، اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی بندگی کرو ، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ، کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۶۵﴾ اس کی قوم میں سے کافر سرداروں نے کہا: ہم تو تجھ کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور ہمارا گمان ہے کہ تو جھوٹا بھی ہے۔ ﴿۶۶﴾

﴿۱﴾ حضرت نوح علیہ السلام پہلے پیغمبر ہیں، جن کو مشرکین سے سابقہ پیش آیا، ان کی قوم عراق میں بستی تھی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے بامِ عروج پر تھی، حضرت نوح علیہ السلام آٹھ سو سال سے زیادہ اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتے رہے؛ مگر انھوں نے نہ صرف اس کو قبول نہیں کیا؛ بلکہ بڑی سرکشی اور ظلم و زیادتی کا ثبوت دیا ، جب حضرت نوح علیہ السلام ان کی طرف سے قبولِ حق سے نا اُمید ہوگئے تو ان کے لئے بددُعاء کی اور ایک ایسے طوفان میں — جس میں آسمان سے بارش ہو رہی تھی اور زمین سے پانی اُبل رہا تھا — پوری قوم غرق کر دی گئی ، صرف کچھ لوگ جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار تھے ، بچ گئے ، پھر ان ہی سے دوبارہ دنیا آباد ہوئی ؛ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام کو '' آدم ثانی '' بھی کہا جاتا ہے — ان کی قوم کو اعتراض تھا کہ ایک 'انسان' خدا کا رسول کیسے ہوسکتا ہے؟ یہاں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ رسول بنانا اور نہ بنانا خدا کے اختیار میں ہے ، اگر اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اپنا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کرلیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے! نیز انسان کی مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے: کیوں کہ نبی انسان کی فکری و عملی زندگی کے لئے نمونہ اور آئیڈیل ہوتا ہے ، اور انسان انسان ہی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتا ہے ، نہ کہ فرشتہ یا جن یا کسی اور مخلوق کو ، افسوس کہ یہ نادانش مندانہ تصور اب بھی موجود ہے ، بعض لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے کا انکار کرتے ہیں ، حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان کی قوم کیسی سخت کلامی سے پیش آتی ہے اور وہ اس کا جواب کس قدر متانت اور سنجیدگی سے دیتے ہیں؟ ۔ (حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کی زیادہ تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود میں آئی ہے ، وہاں دیکھی جاسکتی ہے)

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ اَنَا
لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ
لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ
فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ
يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ
رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ
بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ مَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾ ع ۹ / ۸ / ۱۲

ہود نے کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں؛ بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، ﴿۶۷﴾ تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے حق میں خیر خواہ اور امانت دار ہوں، ﴿۶۸﴾ کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہیں میں سے کسی شخص کے ذریعہ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نصیحت آئے؛ تاکہ تم کو ڈرائے، اور یاد کرو کہ اللہ نے نوح کی قوم کے بعد تم کو آباد کیا ہے اور ڈیل ڈول میں تم کو بڑھا ہوا بنایا ہے، پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو؛ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ، ﴿۶۹﴾ قوم کے لوگوں نے کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور ہمارے آباء واجداد جنھیں پوجتے آئے ہیں، انھیں چھوڑ دیں؟ ﴿۱﴾ تو اگر تم سچے ہو تو ہمیں جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لا کر تو دکھاؤ، ﴿۷۰﴾ ہود نے کہا: اب تو تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے، کیا تم ہم سے کچھ اپنے اور اپنے باپ دادا کے خود ساختہ ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو، جن (کے معبود ہونے) پر اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری ہے، تو تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں ﴿۷۱﴾ چنانچہ ہم نے ہود کو اور اس کے ساتھیوں کو تو اپنی رحمت سے بچا لیا اور جن لوگوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا تھا، ان کی جڑیں ہی کاٹ کر رکھ دیں اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔ ﴿۲﴾ ﴿۷۲﴾

﴿۱﴾ گمراہ قومیں ہمیشہ اپنے آباء واجداد کے عمل کو کسی بات کے درست ہونے کے لئے دلیل سمجھتی آئی ہیں؛ حالاں کہ جو لوگ خود ہدایت سے محروم ہیں، ان کا عمل دوسروں کے لئے کیسے نمونہ ہو سکتا ہے؟

﴿۲﴾ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادہ ''سام'' کی نسل سے قبیلہ ''عاد'' تھا؛ چوں کہ اس خاندان کے ایک مورثِ اعلیٰ کا نام ''عاد'' تھا؛ اس لئے یہ قبیلہ عاد کہلایا، حضرت نوح علیہ السلام کی چوتھی پشت میں ایک صاحب کا نام ''ارم'' تھا، ان پر عاد اور حضرت ہود علیہ السلام کا ←

وقف لازم

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ
بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا
بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي
الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا
تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان ہی کے بھائی صالح کو بھیجا، صالح نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے، جو تمہارے لئے نشانی ہے، تم اسے اللہ کی زمین میں کھانے کے لئے چھوڑ دو اور بُرے ارادہ سے اسے چھوؤ بھی نہیں، ورنہ تم کو دردناک عذاب آپکڑے گا، ﴿۷۳﴾ اور یاد کرو کہ اللہ نے عاد کے بعد ان کی جگہ تم کو آباد فرمایا اور تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا، کہ تم اس کے نرم حصہ میں محلات بناتے ہو اور پہاڑوں سے تراش تراش کر گھر بناتے ہو، پس! اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔ ﴿۷۴﴾

← سلسلۂ خاندان مل جاتا ہے؛ اس لئے قرآن مجید میں ایک اور موقع پر اس قوم کا ذکر ''ارم ذات العماد'' کے نام سے کیا گیا ہے، (الفجر: ۷) حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے تباہ ہونے کے بعد جب دوبارہ آبادی کا سلسلہ شروع ہوا اور تمدنی ترقی کا آغاز ہوا تو قوم عاد ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے اُبھری، اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی اعتبار سے بھی اونچے قد و قامت، چوڑے بدن اور توانا جسم کا مالک بنایا تھا، وہ پہاڑوں کو تراش کر محلات بناتے تھے، ان کی آبادیاں ایک روایت کے مطابق یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھیں اور یہ بڑے سرسبز و شاداب علاقے تھے؛ مگر افسوس کہ یہ قوم بھی آہستہ آہستہ بت پرستی میں مبتلا ہوگئی، حضرت ہود علیہ السلام نے دعوت دی اور ہر طرح سمجھایا؛ مگر قوم انکار و سرکشی ہی پر قائم رہی اور عذاب کا مطالبہ کرتی رہی؛ چنانچہ ان پر طوفانی ہوا کا عذاب بھیجا گیا، یہ طوفان تین دنوں تک جاری رہا، ان کے شاندار محلات و باغات اور خود انسان سب کے سب اس آندھی میں تباہ و برباد ہوگئے اور اس قوم کا نام و نشان مٹ کر رہ گیا، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ 'ان کی جڑیں ہی کاٹ دی گئیں' حضرت ہود علیہ السلام اپنے متبعین کے ساتھ ایک ''حظیرہ'' (مویشیوں کے باڑھ) میں قیام پذیر رہے، اللہ نے ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا، (دیکھئے: تفسیر بغوی: ۲/ ۱۱۴ و دیگر کتب تفسیر) ـــــ اس میں دو پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ کوئی قوم مادی اعتبار سے کتنی بھی ترقی کرلے، اگر اللہ کے احکام سے سرکشی کرے تو اس کا آخری انجام تباہی ہے، دوسرے: حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے ''بیوقوف'' کہا؛ مگر آپ کا جواب ہر طرح کے اشتعال اور غضب سے خالی ہے، دین کے داعیوں اور مبلغوں کی شان یہی ہے کہ قوم کی ناشائستہ گفتگو ان کو مشتعل نہ کردے اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ
صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا
بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا
بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ
لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

اس کی قوم میں سے متکبر سرداروں نے ’ان لوگوں سے جو کمزور سمجھے جاتے تھے اور ایمان لا چکے تھے‘ دریافت کیا: کیا تمہیں یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے پیغمبر ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: صالح کو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے، ہمیں تو اس پر پورا یقین ہے! ﴿۷۵﴾ ان تکبر کرنے والوں نے کہا: جس بات پر تم یقین رکھتے ہو، ہم اس کو نہیں مانتے، ﴿۱﴾ ﴿۷۶﴾ چنانچہ ان لوگوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالا، اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے: اے صالح! اگر تم پیغمبر ہو تو جس عذاب کی تم دھمکی دے رہے ہو، اسے لاکر تو دیکھاؤ؛ ﴿۷۷﴾ چنانچہ زلزلہ نے ان کو آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے منھ پڑے رہ گئے، ﴿۷۸﴾ صالح ان سے منھ پھیر کر چلے گئے اور کہا: اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا تھا اور تمہارے ساتھ خیر خواہی کی تھی؛ مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۷۹﴾

﴿۱﴾ انسانی تاریخ میں اکثر یہی ہوا ہے کہ جب بھی کوئی دعوتِ حق اُٹھی تو پہلے اس پر ان لوگوں نے لبیک کہا جو سماج میں کمتر سمجھے جاتے تھے اور ظلم و جور کا شکار تھے؛ کیوں کہ ان کے لئے ایمان لانے اور نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں نہ کوئی عار تھی نہ سرداری کے جانے کا خطرہ تھا، اور جو لوگ قوم کے سردار سمجھے جاتے تھے، انھیں ہمیشہ ایسی دعوت کو قبول کرنے میں تأمل ہوا؛ کیوں کہ ایک تو نبی پر ایمان لانے کے بعد انھیں دوسرے کی اتباع اور پیروی کرنی ہوتی، دوسرے: انھوں نے اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان اونچ نیچ کی جو مصنوعی دیوار بنا رکھی تھی، وہ بھی زمین بوس ہوکر رہ جاتی؛ کیوں کہ دین حق نے ہمیشہ انسانی وحدت اور مساوات کی تعلیم دی ہے اور پیدائشی طور پر اونچ نیچ کے تصور کو غلط ٹھہرایا ہے۔

﴿۲﴾ عاد اور ثمود دونوں بھائی تھے، جیسے عاد کی اولاد قومِ عاد کہلائی، اسی طرح ثمود کی اولاد کا سلسلہ قوم ثمود کہلایا، حضرت صالح علیہ السلام کا تعلق اسی خاندان سے تھا، قوم نوح اور قوم عاد پر آنے والے عذاب کے واقعات کو بہت عرصہ نہیں گذرا تھا؛ مگر دولت واقتدار کا نشہ انسان کو بدمست کر کے رکھ دیتا ہے؛ اس لئے یہ بھی شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئے، یہ عالی شان محلات اور بلند بالا عمارتوں کی تعمیر نیز پہاڑوں کو تراش تراش کر قلعہ نما مکان بنانے کے ماہر تھے، حضرت صالح علیہ السلام جوانی سے بوڑھاپے تک انھیں توحید کی ←

وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ
لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ مَا كَانَ جَوَابَ
قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور ہم نے لوط کو بھیجا، جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے شرمی کا کام کرتے ہو، جس کو تم سے پہلے پوری کائنات میں کسی نے نہیں کیا، ﴿۸۰﴾ تم عورتوں کی بجائے مردوں سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرتے ہو؛ بلکہ تم تو حد سے گذر جانے والے لوگ ہو، ﴿۸۱﴾ ان کی قوم کا جواب صرف اتنا ہوتا کہ کہتے: یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں، انھیں اپنے شہر سے نکال باہر کرو۔ ﴿۸۲﴾

← دعوت دیتے اور شرک سے روکتے رہے، آخر قوم کو ایک شرارت سوجھی کہ ایمان لانے کے لئے ایسی شرط رکھی جائے، جسے یہ پوری ہی نہ کرسکیں؛ چنانچہ انھوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے اپنی آبادی کے ایک پہاڑ کے بارے میں کہا کہ اس سے گابھن اونٹنی پیدا ہوجائے تو ہم ایمان لے آئیں گے، حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سے دُعاء کی، دُعاء قبول ہوئی، پہاڑ کی ایک چٹان پھٹی اور اس سے ان کے مطالبہ کے مطابق اونٹنی نکل آئی؛ چوں کہ یہ اونٹنی معجزاتی طور پر نکلی تھی؛ اسی لئے اسے ''ناقۃ اللہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کہا گیا ہے، مگر اب بھی وہ ایمان نہیں لائے، حضرت صالح علیہ السلام کو اندیشہ تھا کہ ایک تو یہ معجزہ ظاہر ہونے کے باوجود ایمان نہیں لائے، یہی اللہ کے عذاب کے اُترنے کے لئے کافی ہے، اب اگر انھوں نے اس اونٹنی کے ساتھ زیادتی کی تب تو ضرور ہی ان پر عذاب مسلط ہوجائے گا؛ چنانچہ آپ نے طے فرمادیا کہ ایک دن یہ اونٹنی کنویں سے پانی پیا کرے گی اور ایک دن لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے؛ مگر ہوتا یہ کہ اونٹنی اپنے دن تنہا پورا پانی ہضم کرجاتی، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جس دن یہ اونٹنی پانی پیتی، اس دن پانی کے برابر دودھ بھی انھیں دیتی تھی، آخر حضرت صالح علیہ السلام کی دردمندانہ نصیحت کے باوجود قوم نے نہ مانا اور اونٹنی کو مار ڈالا، حضرت صالح علیہ السلام نے بتادیا کہ اب تین دنوں کے اندر تم پر اللہ کا عذاب آجائے گا، (ہود: ۶۵) پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہوجائیں گے، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ، علامتیں ظاہر ہونے لگیں، اس کے باوجود انھیں توبہ واستغفار کی توفیق نہیں ہوئی، یہاں تک کہ اس کے بعد بہ طور عذاب ان پر رات میں چیخ اور زلزلہ مسلط کردیا گیا اور سوائے حضرت صالح علیہ السلام اور چند مسلمانوں کے سب کے سب ہلاک و برباد ہوگئے، یہ قوم جس علاقہ میں آباد تھی، سیرت کی کتابوں میں اس کا ذکر ''حجر'' کے نام سے آیا ہے اور آج کل یہ علاقہ ''مدائن صالح'' کہلاتا ہے، جہاں اب بھی پہاڑ سے تراشے ہوئے محلات کے کھنڈر موجود ہیں، اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے سرکش سرداران کفار کا ذکر ''متکبرین'' کے لفظ سے اور کمزور وستم رسیدہ مسلمانوں کا ذکر ''مستضعفین'' سے کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تکبر بہت بری چیز ہے اور مسلمانوں کا وقتی طور پر کمزور ہونا ایسی بات نہیں، جس سے وہ حوصلہ ہار جائیں، انشاء اللہ انجام کار وہی سربلند ہوں گے اور جو لوگ دین حق کے مقابلہ عداوت اور تکبر کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، وہ ناکام و نامراد ہوں گے، اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان نہ لانے والے گروہ پر اللہ کا عذاب اس وقت آتا ہے، جب ان پر اچھی طرح اسلام کی دعوت پیش کرکے حجت پوری کردی جائے، اور ان کے لئے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ ہم تو اللہ کے پیغام سے بے خبر تھے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖؗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۸۴﴾ؑ

ع ۱۰ / ۱۲ / ۱۷

چنانچہ ہم نے لوط کو اور اس کے خاندان کو بچالیا، سوائے اس کی بیوی کے جو (عذاب میں مبتلا ہونے والوں کے ساتھ) رہ جانے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾ اور ان پر (پتھروں کی) زبردست بارش برسائی، تو دیکھ لو کہ ان مجرموں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾

﴿۱﴾ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت فرمائی تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے، پھر اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تو بیت المقدس میں مقیم ہوگئے اور حضرت لوط علیہ السلام موجودہ اُردن کے علاقہ میں مقیم ہوئے، جس کا سب سے ممتاز شہر ''سدوم'' تھا، یہیں سے حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دینی شروع کی، یہ قوم کفر وشرک میں تو مبتلا تھی ہی، اس کے علاوہ ایک غیر معمولی اخلاقی بگاڑ ان میں یہ پیدا ہو گیا تھا کہ مرد مرد سے ہی اپنی جنسی خواہشات پوری کیا کرتے تھے، یہ ناشائستہ اور خلافِ فطرت حرکت اس سے پہلے روئے ارض پر کبھی نہیں کی گئی تھی، جب حضرت لوط علیہ السلام نے اس برائی سے ان کو روکا تو اُلٹے ان ہی کو شہر سے نکال باہر کرنے کے لئے تیار ہو گئے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب بھیجا، اس عذاب کے سلسلہ میں قرآن مجید میں تین طرح کے الفاظ آئے ہیں، ان پر بارش برسائی گئی ''امطرنا علیہم مطرا'' (الاعراف: ۸۴) صبح صبح ان کو چیخ کی آواز نے آ پکڑا ''فاخذتھم الصیحة مشرقین'' (الحجر: ۷۳) زمین کو پلٹ دیا گیا، یہاں تک کہ نچلا حصہ اوپر کر دیا گیا اور پتھر کی بارش کی گئی: ''جعلنا عالیھا سافلھا امطرنا علیھا حجارة...'' (ہود: ۸۲) ان آیات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چیخ بلند ہوئی، پھر بارش ہوئی، مگر پانی کی نہیں پتھر کی، اس کے بعد زمین کو پلٹ دیا گیا؛ البتہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی دونوں بیٹیاں جو ایمان لا چکی تھیں، کو اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ صبح سے پہلے سدوم سے نکل جائیں اور پلٹ کر دیکھیں بھی نہیں؛ چنانچہ وہ عذاب سے محفوظ رہے، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی جو ایمان نہیں لائی تھیں، وہ بھی عذاب سے نہیں بچ سکیں، اس شہر ''سدوم'' کی جگہ اب بھی 'بحر میت' کے نام سے موجود ہے، جو سطح سمندر سے بہت گہرا ہے، اور جس میں کوئی جاندار چیز زندہ نہیں رہ پاتی؛ اسی لئے اس کا نام ہی ''بحر میت'' ہے اور اس کو ''بحر لوط'' بھی کہتے ہیں۔

اس واقعہ میں عبرت ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی اللہ کے عذاب سے نہیں بچ سکیں؛ کیوں کہ ایمان اور عمل صالح ہی انسان کے لئے نجات کا ذریعہ ہے، یہ داستانِ عبرت بتاتی ہے کہ یہ خلافِ فطرت فعل کس قدر مذموم اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینے والا ہے؛ مگر افسوس کہ مغرب کی جاہلیت جدیدہ آج بھی اس برائی کو جواز عطا کر رہی ہے اور قانونی طور پر مرد کے مرد سے اور عورت کے عورت سے نکاح کو درست ٹھہرا رہی ہے، یہ دراصل حدیث کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہے کہ قیامت کے قریب ایسا ہوگا کہ مرد مرد سے اور عورت عورت سے اپنی خواہشات پوری کرنے لگیں گے۔ (مجمع الزوائد: ۷/ ۶۲۵، حدیث نمبر: ۱۲۴۳۴)

وَ اِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِیْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۸۶﴾

اور ہم نے (اہل) مدین کی طرف ان ہی کے بھائی شعیب کو بھیجا، شعیب نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل آچکی ہے؛ اس لئے تم ناپ تول پورا پورا کرو، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہیں کرو ﴿۱﴾ اور زمین میں اصلاح کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو، ﴿۲﴾ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے ﴿۸۵﴾ اور تم راستوں پر اس لئے نہ بیٹھ جاؤ کہ تم ایمان لانے والوں کو ڈراؤ دھمکاؤ، اللہ کے راستہ سے روکو اور اس میں کجی تلاش کرو، ﴿۳﴾ نیز اس بات کو یاد کرو کہ تم کم تھے اور اللہ نے تمہیں (تعداد میں) بڑھا دیا، ﴿۴﴾ اور غور کرو کہ فساد مچانے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۸۶﴾

﴿۱﴾ ناپ تول میں کمی یہ بھی ہے کہ تولتے یا ناپتے وقت کمی کر کے کم چیز دی جائے، کمی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کام کے لئے جو اوقات مقرر ہوں، ان میں کمی کر دی جائے، یا کسی چیز کے لئے جو معیار طے ہوا ہے، اس سے کم معیار کی چیز فراہم کی جائے۔

﴿۲﴾ اصلاح اور فساد کا لفظ عام ہے، اس کا تعلق عقیدہ سے بھی ہے، اخلاق سے بھی اور امن وامان سے بھی، یعنی توحید کی سچائی کے پھیل جانے کے بعد شرک وکفر کے اندھیرے کی طرف نہ بلاؤ، پچھلے پیغمبروں نے بہتر اخلاق سے اُمت کو آراستہ کیا تھا، تم اس کی جگہ بداخلاقی کے مبلغ نہ بن جاؤ، جیسے ناپ تول میں کمی، امن وامان جو قائم ہے، لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور اہل ایمان کے خلاف تشدد کر کے اسے برباد نہ کرو۔

﴿۳﴾ 'کجی تلاش کرنے' سے بے جا اعتراض کرنا مراد ہے۔

﴿۴﴾ علم وعمل کے ساتھ تعداد کی کثرت بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ قیامت میں اُمتِ محمدیہ کی کثرت پر فخر کریں گے، اس کے علاوہ کسی گروہ کا تعداد کے اعتبار سے گھٹتے جانا بھی ایک نعمت سے محروم ہونا ہے، اس وقت مغربی دنیا شریعتِ الٰہی سے بغاوت اور بے حیائی وبداخلاقی کی وجہ سے اسی صورتِ حال سے دوچار ہے اور بعض قوموں کی تو شرح پیدائش اس قدر کم ہوگئی ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

وَ اِنْ كَانَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآىِٕفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۸۷﴾

اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس دین پر ایمان لے آیا، جسے لے کر میں بھیجا گیا ہوں، اور ایک گروہ اس پر ایمان نہیں لایا ہے، تو صبر کرو؛ یہاں تک کہ اللہ ہی ہمارے درمیان فیصلہ کر دیں اور وہی بہتر فیصلہ فرمانے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۸۷﴾

﴿۱﴾ حق کی دعوت دینے والوں کا کام یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، فریضۂ دعوت ادا کریں اور اس کے بعد انجام اللہ کے حوالہ کر دیں، لوگوں کے حق کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے نہ نا اُمید ہوں اور نہ افسردہ۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ

قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ

عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ

اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا

بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾ وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ

شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۹۱﴾

الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۛۚ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۲﴾

اس کی قوم میں سے تکبر کرنے والے سرداروں نے کہا: ’’اے شعیب! ہم تم کو اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو ضرور ہی اپنے شہر سے نکال باہر کریں گے، ورنہ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ‘‘ ﴿۱﴾ شعیب نے کہا: ’’اگرچہ ہم ناپسند کرتے ہوں ؟ ﴿۸۸﴾ اللہ نے ہمیں تمہارے مذہب سے نجات عطا فرمادی ہے، اس کے باوجود اگر ہم (بالفرض) تمہارے مذہب میں لوٹ آئیں تو ہم تو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھنے والے ہوجائیں گے اور (حقیقت میں) ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم تمہارے مذہب میں لوٹ آئیں؟ سوائے اس کے کہ اللہ کو یہی منظور ہو، جو ہمارا رب ہے، ﴿۲﴾ ہمارے رب کا علم تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اللہ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے، اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمادیجئے اور آپ ہی بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں‘‘ ﴿۸۹﴾ اور جو سردار کفر پر بضد تھے، انھوں نے اپنی قوم سے کہا: اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم نقصان میں رہو گے ﴿۳﴾ ﴿۹۰﴾ چنانچہ زلزلہ نے انھیں آ پکڑا اور ان کی صبح ان کے گھروں میں اوندھے منھ ہوئی ﴿۹۱﴾ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا، وہ ایسے ہوگئے کہ گویا کبھی اس جگہ رہے ہی نہیں ہوں، جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہی نقصان میں رہے۔ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ جو لوگ دین حق کے مخالف ہوتے ہیں، ان کے پاس علمی و عقلی دلیل نہیں ہوتی؛ اس لئے وہ ہٹ دھرمی اور تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور دلیل سے مطمئن کرنے کی بجائے ان کو ملک سے نکل جانے کو کہتے ہیں، آج بھی مسلمان دنیا کے مختلف علاقوں میں اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔

﴿۲﴾ سچے اور پکے ایمان کی شان یہی ہے کہ بڑی سے بڑی آزمائش بھی صاحبِ ایمان کے قدم میں کوئی تزلزل پیدا نہ کرے۔

﴿۳﴾ اصحابِ مدین تجارت پیشہ لوگ تھے، ایک طرف ناپ تول میں کمی کرکے اپنا نفع بڑھاتے تھے اور دوسری طرف مسافروں اور راہ گیروں سے لوٹ مار کرکے اپنی دولت بڑھاتے تھے اور اس کو اپنا نفع تصور کرتے تھے؛ اسی لئے انھوں نے اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر تم حضرت شعیب علیہ السلام کی بات مان لو اور ان برائیوں سے باز آجاؤ تو تم سخت مادی نقصان سے دوچار ہوجاؤ گے۔ (ابن کثیر: ۲/ ۲۹۳)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى
قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱

پھر شعیب نے ان سے رُخ پھیر لیا اور کہا: اے میری قوم! میں تم لوگوں کو اپنے رب کا پیغام پہنچا چکا اور میں نے تمہارا بھلا چاہا، پھر بھی جو لوگ کفر پر جمے ہوئے ہوں، میں کیسے ان پر افسوس کر سکتا ہوں؟ ﴿۱﴾ ﴿۹۳﴾

﴿۱﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ ''قطورہ'' کے بطن سے آپ کے صاحبزادے ''مدین'' تھے، انہیں کی نسل سے حضرت شعیب علیہ السلام پیدا ہوئے، مدین کی نسل بحر احمر کے ساحل سے موجودہ فلسطین اور کوہ سینا تک کے علاقہ میں آباد ہوئی، اس علاقہ کا مرکزی شہر ''مدین'' سے منسوب ہو کر مدین کہلایا، اور یہیں حضرت شعیب علیہ السلام دعوتِ حق کے لئے مبعوث ہوئے، اس قوم میں کفر وشرک کے علاوہ متعدد اخلاقی برائیاں بھی تھیں، خاص طور پر مادی حرص ولالچ نے انھیں پاگل بنا رکھا تھا، انھوں نے ناپ تول میں کمی، لوگوں کے مال میں خیانت اور راستہ چلنے والوں کے مال واسباب لوٹ لینے کو کسبِ معاش کے مستقل طریقہ کے طور پر اختیار کر رکھا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام نے انھیں ہر طرح سمجھایا اور اللہ کا کلام ان تک پہنچایا؛ مگر اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کی بجائے وہ اُلٹے دھمکی دینے لگے کہ ہم تم کو اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو شہر سے نکال باہر کریں گے؛ بلکہ اگر تمہارے ساتھ تمہارے ماننے والے لوگوں کا جتھا نہ ہوتا تب تو ہم تم کو سنگسار ہی کر دیتے، (ہود: ۹۱) بالآخر ان پر اللہ کا عذاب آیا، یہاں عذاب کے طور پر زلزلہ کے آنے کا ذکر ہے اور دوسری جگہ ''چیخ'' کا، (ہود: ۹۴) اس سے معلوم ہوا کہ زلزلہ اور بھیانک آواز دونوں طرح کا عذاب ان پر آیا ہے، اب یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں عذاب یکے بعد دیگرے آیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ساتھ آیا ہو۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے: الجامع لأحکام القرآن: ۱۵۸/۷، صفوۃ التفاسیر: ۴۲۵/۱)

قرآن مجید میں ایک اور موقع پر فرمایا گیا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ''اصحابِ ایکہ'' کو ایمان کی دعوت دی تھی، اصحابِ ایکہ کو خطاب کرتے ہوئے بھی آپ نے ناپ تول میں کمی، بد دیانتی اور لوٹ وغارت گری سے اجتناب کرنے کی خاص طور پر تلقین فرمائی، مگر وہ کفر وبد اخلاقی پر بہ ضد رہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک چھتری کی شکل میں ان پر عذاب بھیجا، (الشعراء: ۱۷۶-۱۸۹) — ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، غالباً حضرت شعیب علیہ السلام پہلے اہل مدین کی طرف بھیجے گئے، پھر جب اپنی شامتِ اعمال کی وجہ سے یہ نیست ونابود کر دیئے گئے تو آپ علیہ السلام اصحابِ ایکہ کو دعوت دینے پر مامور کئے گئے، یہ بھی قطورا ہی سے پیدا ہونے والے بعض لڑکوں کی نسل سے تھے، جو حجاز اور شام کے درمیان آباد تھے؛ چنانچہ بعض حضرات نے ''تبوک'' ہی کا نام ''ایکہ'' بتایا ہے، دونوں خاندانوں میں قرابت اور جغرافیائی قربت کی وجہ سے اہل مدین کی برائیاں اِن میں بھی در آئی تھیں؛ اسی لئے حضرت شعیب علیہ السلام کو ایک ہی طرح کی نصیحت انھیں بھی کرنی پڑی، آخر انھوں نے بھی نافرمانی اور سرکشی کا ثبوت دیا اور ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا — قرآن مجید میں صرف چھتری کے عذاب کا ذکر ہے؛ لیکن تفصیل نہیں ہے اور صحیح ومعتبر حدیثوں میں بھی اس کی تفصیل نہیں آئی ہے: البتہ تفسیر طبری میں ہے کہ پہلے شدید گرمی ہوئی، یہاں تک کہ لوگوں نے گھر سے بھاگ کر میدان کی پناہ لی، اس وقت بادل کی ایک سایہ دار چھتری نمودار ہوئی، جو عارضی طور پر راحت بخش محسوس ہوئی، سارے لوگ اسی کے سایہ میں جمع ہو گئے، جب پوری قوم اس طرح اکٹھا ہو گئی تو اب اسی بادل سے آگ کے انگاروں کی بارش ہوئی اور پوری قوم جل کر خاکستر ہو گئی۔ (واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر طبری: ۴۷۰/۳)

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾
ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ
فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا
عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾
اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّ هُمْ نَآىٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ
یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ
ع ۱۲/۲ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے جب بھی کسی شہر میں پیغمبر کو بھیجا تو شہر والوں کو تنگی اور بیماری میں مبتلا کیا؛ تا کہ وہ عاجزی اختیار کریں، ﴿۹۴﴾ پھر ہم نے بدحالی کی جگہ خوش حالی پیدا کر دی؛ یہاں تک کہ انھیں خوب ترقی حاصل ہوئی اور وہ کہنے لگے: ہمارے باپ دادا کو بھی تو تکلیف اور راحت پیش آئی تھی؛ (اس لئے یہ کوئی اہم بات نہیں) چنانچہ ہم نے ان کو اچانک ہی پکڑ لیا؛ حالاں کہ ان کو اس کا گمان تک نہ تھا، ﴿۱﴾ ﴿۹۵﴾ اور اگر شہر کے لوگ ایمان لے آتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے برکتیں کھول دیتے؛ ﴿۲﴾ لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے بھی ان کو ان کی حرکتوں کی وجہ سے پکڑ لیا ﴿۹۶﴾ کیا پھر بھی شہر والوں کو یہ خوف نہیں ہے کہ ان پر راتوں رات —— جب وہ سوئے ہوئے ہوں —— ہمارا عذاب آ جائے؟ ﴿۹۷﴾ اور کیا شہر والے اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ دن چڑھتے —— جب وہ کھیل کود میں مشغول ہوں —— ہمارا عذاب آ جائے؟ ﴿۳﴾ ﴿۹۸﴾ کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بے فکر ہو گئے ہیں؟ تو اللہ کی تدبیر سے وہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں، جو نقصان اُٹھانے والے ہوں۔ ﴿۴﴾ ﴿۹۹﴾

﴿۱﴾ یعنی نہ نعمتوں کی وجہ سے ان میں جذبۂ شکر پیدا ہوا، نہ آزمائشوں کی وجہ سے خدا کا خوف، تب ان پر عذاب آیا۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ اللہ کی فرماں برداری آخرت کی کامیابی کے علاوہ دنیا میں بھی برکتوں کا اور اللہ کی نعمتوں کا سبب ہے۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب دن میں بھی آ سکتا ہے اور رات میں بھی، ایسا عذاب بھی آ سکتا ہے کہ پوری قوم کو تباہ و برباد کر دے اور اس کی جگہ کسی نئی قوم کو بسا دیا جائے، جس کی مثال لوگوں کے سامنے ہے کہ پہلے اس زمین پر دوسرے لوگ آباد تھے، اب ان کی جگہ تم آباد ہو، تو اسی طرح اللہ تعالیٰ تم کو ہٹا کر دوسروں کو آباد کرنے پر بھی قادر ہیں۔

﴿۴﴾ خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ نے خوب فرمایا ہے کہ مومن اللہ کی فرمانبرداری کرتا ہے، پھر بھی اللہ سے ڈرتا رہتا ہے، اور فاجر و بدکار شخص گناہ پر گناہ کئے جاتا ہے، پھر بھی مطمئن رہتا ہے، جیسے اس نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۳۴)

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ
وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ
جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ
عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ
لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

جولوگ زمین میں آباد پہلے لوگوں کی جگہ آباد ہوئے ہیں، کیا ان پر یہ بات واضح نہیں ہوگئی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردیں؟ اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگائے ہوئے ہیں؛ اس لئے وہ سنتے نہیں ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۰۰﴾ اِن شہروں کے کچھ واقعات ہم آپ سے بیان کررہے ہیں، صورتِ حال یہ تھی کہ اُن کے پاس ان کے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آچکے تھے؛ مگر چوں کہ وہ پہلے جھٹلا چکے تھے؛ اس لئے ایمان نہ لانے پر بہ ضد رہے، اسی طرح اللہ کفر کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگادیتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۰۱﴾ ہم نے ان میں سے زیادہ تر لوگوں کو وعدہ کا پابند نہیں پایا، ﴿۳﴾ اور ہم نے ان کی اکثریت کو نافرمان ہی پایا ہے۔ ﴿۱۰۲﴾

﴿۱﴾ بظاہر ’دل پر مہر لگایا جانا اور اس کی وجہ سے نہ سننا‘ بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ دل سے سمجھنے کا تعلق ہے اور کان سے سننے کا؛ لیکن یہاں مقصد یہ ہے کہ وہ سُنی کو اَن سُنی کردیتے ہیں، یعنی کسی بات کو سمجھنے کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عمل کریں؛ لیکن یہ عمل کرتے ہی نہیں ہیں تو گویا وہ سنتے ہی نہیں ہیں، عمل کرنے کی نیت سے سنیں تو بات سمجھ میں آئے اور عمل کرنے کی توفیق ہو۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں انسان کی ایک نفسیاتی کمزوری کا بیان ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے اکثر اوقات ضد اور اپنی کہی ہوئی بات کو وقار کا سبب بنالینا حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور انسان جو بات ایک دفعہ ناسمجھی میں کہہ دیتا ہے، اس پر بضد رہتا ہے، علماء ربانی کی شان یہ ہے کہ جب بھی ان پر سچائی واضح ہوجاتی ہے اور وہ اپنی غلطی کو محسوس کرلیتے ہیں تو وہ اپنے قول سے رُجوع کرلیتے ہیں؛ اسی لئے فقہاء کے یہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ جن سے انھوں نے بعد میں رُجوع کرلیا، اگر سلف صالحین کے رُجوع کئے ہوئے اقوال کو جمع کیا جائے تو شاید کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب ہوجائے، یہ ان اہل علم کی کوتاہ علمی نہیں ہے؛ بلکہ ان کے اخلاص کی اور خشیتِ الٰہی کی دلیل ہے۔ رحمهم الله رحمة واسعة۔

﴿۳﴾ اس آیت میں کس وعدہ کا ذکر ہے؟ اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ وعدہ مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ایک اللہ کی ذات پر ایمان رکھنے کے سلسلہ میں عالم ارواح میں لیا تھا، جس کو ”عہد الست“ کہا جاتا ہے، اس وعدہ کا اثر انسان کی فطرت میں موجود ہے اور اسی لئے گنہگار سے گنہگار انسان بھی مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رُجوع کرتا ہے؛ لیکن شرک کرنے والے لوگ اس عہد کو اور فطرت کی آواز کو نظر انداز کرکے شرک کرتے جارہے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے ہے کہ انسان مصیبت کے وقت اللہ کے حکم پر قائم رہنے کا وعدہ کرتا ہے اور جب مصیبت دور ہوجاتی ہے تو پھر سرکشی و نافرمانی کا ←

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ قَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى
اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ؕ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ
فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ۚۖ وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ۧ ع ۱۳ ۹ ۲

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے گروہ کے پاس بھیجا، ان لوگوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ناقدری کا معاملہ کیا، تو دیکھو کہ فساد مچانے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۱۰۳﴾ اور موسیٰ نے کہا: ''اے فرعون! میں تمام جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہوں، ﴿۱۰۴﴾ مجھ پر لازم ہے کہ میں اللہ پر سچ کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک کھلی ہوئی دلیل لے کر آیا ہوں؛ اس لئے تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو'' ﴿۱۰۵﴾ فرعون نے کہا: اگر تو کوئی نشانی لے کر آیا ہے اور تو سچا ہے تو پیش کر: ﴿۱۰۶﴾ چنانچہ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی، وہ فوراً ہی صاف اژدہا بن گیا ﴿۱۰۷﴾ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ نکالا تو دیکھنے والوں کو وہ خوب روشن نظر آنے لگا۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۰۸﴾

← راستہ اختیار کر لیتا ہے، یہی وعدہ مراد ہے، حسن بصری رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ہر پیغمبر اپنی اُمت سے توحید اور عمل صالح پر قائم رہنے اور شرک و نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کا عہد لیتے ہیں؛ لیکن ان پیغمبروں کے رخصت ہونے کے بعد اُمت اس پر قائم نہیں رہتی ہے، اس وعدہ خلافی کی طرف اشارہ ہے، (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۷/ ۲۱۳، قرطبی: ۷/ ۲۵۵) —— حقیقت یہ ہے کہ ان اقوال میں کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں، وعدہ اور اس کی خلاف ورزی کی ان تینوں صورتوں کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد شامل ہے۔

﴿۱﴾ اس سورت میں چھ قوموں کے واقعات پہلے آچکے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر بھیجے، اللہ کے پیغمبروں نے آخری حد تک انھیں سمجھانے کی کوشش کی؛ لیکن قوم نے مان کر نہیں دیا، بالآخر اللہ کا عذاب آیا اور ان کو ہلاک کر دیا گیا، آیت نمبر: ۱۰۳ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا ذکر ہے، اس واقعہ کا ذکر زیادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ ہے؛ کیوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو صاحب شریعت نبی بھیجے گئے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، نیز مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے علاوہ جس قوم سے سابقہ تھا، وہ ''یہود'' تھے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے —— آیت نمبر: ۱۰۳ سے لے کر ۱۲۱ تک جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت میں فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس اسلام کی دعوت دینے گئے، فرعون شاہانِ مصر کا لقب ہوا کرتا تھا؛ لیکن بتایا جاتا ہے کہ اِس فرعون کا نام ''قابوس'' تھا، بعض لوگوں نے 'ولید بن معصب' بھی بتایا ہے، (مفاتیح الغیب: ۷/ ۲۱۵) آپ نے فرعون کے سامنے دو باتیں پیش فرمائیں، اول یہ کہ میں اللہ کی طرف سے رسول ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں اللہ کی طرف سے کہتا ہوں، اس کا تقاضا ہے کہ تم ایمان لے آؤ، ←

← دوسرے یہ کہ کم سے کم قوم بنی اسرائیل —— جن کو تم نے جبراً اپنا غلام بنا رکھا ہے —— کو آزاد کردو؛ تاکہ وہ بیت المقدس کی طرف ہجرت کر جائیں اور اللہ کی عبادت کے لئے بنائی ہوئی جگہ کو شرک کی نجاست سے پاک کر کے اسے توحید کا مرکز بنا دیں، نیز آپ نے فرمایا کہ میرے اس دعویٰ پر بطور دلیل معجزہ بھی پیش کرسکتا ہوں، جو میرے پروردگار ہی کا عطا کیا ہوا ہے، فرعون نے معجزہ مانگا، آپ نے دو معجزے پیش کئے، ایک خوفناک اور گھبرا دینے والا معجزہ تھا، اور وہ یہ کہ آپ نے لاٹھی ڈالی تو وہ اژدہا بن گیا، دوسرا پُرکشش اور دل جیتنے والا معجزہ تھا، کہ اپنا ہاتھ گریبان یا بغل میں ڈالا تو وہ خوب روشن ہوگیا، ایسا روشن کہ دیکھنے والے دیکھنے میں کشش محسوس کریں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بہ قول ہاتھ ایسا روشن ہوگیا کہ آسمان وزمین کے درمیان پورا حصہ چمک اُٹھا، (قرطبی: ۷/۲۵۷) قرآن مجید ہی میں دوسری جگہ صراحت ہے کہ یہ ہاتھ کا سفید اور روشن نظر آنا بیماری یعنی برص کی وجہ سے نہیں تھا —— قرآن مجید میں ایک جگہ اس معجزہ کے ظاہر ہونے کے موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کا ذکر آیا ہے، (النمل: ۱۲) اور ایک میں بغل میں ہاتھ رکھنے کا (طٰہٰ: ۲۲) اس سے معلوم ہوا کہ دونوں صورتوں میں یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا، (مفاتیح الغیب: ۷/۲۲۲) اس زمانہ میں جادو کا بڑا غلبہ تھا اور جادوگر مختلف کرتب دکھایا کرتے تھے؛ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے کرتب سے ملتا جلتا معجزہ عطا کیا گیا، فرعون کے لوگوں نے اس کو معجزہ کی بجائے جادو قرار دیا اور عوام کی تائید حاصل کرنے کے لئے کہا کہ اس کا مقصد تم کو تمہارے ملک سے نکال دینا اور 'مصر' پر قبضہ کر لینا ہے، حاضرین نے مشورہ دیا کہ مختلف علاقوں سے ماہر جادوگر بلائے جائیں اور پھر موسیٰ سے ان کا مقابلہ ہو؛ چنانچہ ایک مقررہ تاریخ پر جادوگر اکٹھا کئے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے، جادوگر چوں کہ اللہ کے لئے کام نہیں کرتے، اُجرت ومزدوری ہی کے لئے کام کرتے ہیں؛ اس لئے انھوں نے پہلے فرعون سے معاملہ طے کرلیا کہ ہمیں اس پر کیا اُجرت حاصل ہوگی؟ فرعون نے کہا کہ ہم تمہیں اپنے نزدیکی لوگوں میں شامل کرلیں گے؛ کیوں کہ اس سے بڑا کوئی انعام نہیں ہوسکتا کہ دینے والا خود اس کے دوستوں اور نگہبانوں میں ہوجائے۔

جادوگر حالاں کہ آئے تھے مقابلہ کے لئے؛ لیکن انھوں نے ادب وشائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ پہلے آپ اپنی لاٹھی ڈالیں گے یا پہلے ہم کرتب دکھائیں اور رسی وغیرہ ڈالیں؟ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے ان لوگوں نے رسیاں ڈالیں اور لوگوں کی ایسی نظر بندی کہ یہ سب سانپ نظر آنے لگے، جب میدان میں ہر طرف چھوٹے بڑے سانپ رینگ رہے ہوں تو جو کیفیت ہوگی، وہ ظاہر ہے؛ چنانچہ لوگ ڈر گئے، دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خوفزدہ ہوگئے ''فأوجس في نفسہ خیفۃ موسیٰ'' (طٰہٰ: ۶۷) کیوں کہ سانپ کو دیکھ کر ڈرنا انسانی فطرت ہے، اس وضاحت کی ایک حکمت یہ ظاہر کرنا ہے کہ پیغمبر بھی کائنات کے نظام میں عاجز اور بے اختیار ہی ہوتا ہے اور انسانی فطرت سے ماوراء نہیں ہوتا، بہر حال اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ربانی ہوا کہ آپ اپنی لاٹھی ڈال دیں، لاٹھی ڈالنا تھا کہ یہ بہت بڑا اژدہا بن گیا اور چند لمحوں میں سارے سانپوں کو نگل گیا، جو انسان خود کسی فن سے واقف ہوتا ہے، وہ اس کی تفصیلات، اس کی صلاحیتوں اور اس کی حدود سے بھی واقف ہوتا ہے؛ اس لئے جادوگروں نے اندازہ کرلیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا جادو نہیں ہے؛ بلکہ واقعی معجزہ ہے، ان کے اندر حق کو قبول کرنے کی استعداد تھی؛ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا اور کہا کہ ہم تمام عالم کے رب یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے رب پر ایمان لاتے ہیں، مفسرین نے جادوگروں کی تعداد اور اس معجزاتی اژدھے کی لمبائی چوڑائی وغیرہ بھی ذکر کی ہے؛ لیکن یہ سب بے اصل اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں؛ اس لئے ان کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ←

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ
سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ
نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

فرعون کی قوم میں سے سرداروں نے کہا: ’’بے شک یہ بڑا ماہر جادوگر ہے ﴿۱۰۹﴾ تم کو تمہاری سرزمین سے نکال دینا چاہتا ہے؛ لہٰذا تم لوگوں کا کیا مشورہ ہے؟‘‘ ﴿۱۱۰﴾ لوگوں نے کہا: موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو مہلت دیجئے اور شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیجئے، ﴿۱۱۱﴾ جو تمام ماہر جادوگروں کو آپ کے پاس اکٹھا کر کے لے آئیں ﴿۱۱۲﴾ اور (آخرکار) بہت سے جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوگئے، انھوں نے استفسار کیا: اگر ہم غالب آگئے تو کیا ہمیں انعام بھی ملے گا؟ ﴿۱۱۳﴾ فرعون نے کہا: ہاں، اور تم یقیناً ہمارے قریبی لوگوں میں شمار کئے جاؤ گے۔ ﴿۱۱۴﴾

← اس واقعہ میں چند باتیں قابل توجہ ہیں، اول یہ کہ داعی کو اپنی بات پر پورا یقین ہونا چاہئے اور مدعو کی ظاہری جاہ وحشمت اور مال و دولت کو دیکھ کر مرعوب نہیں ہونا چاہئے؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری قوت کے ساتھ فرعون کے سامنے ایمان لانے کے لئے دعوت پیش فرمائی، دوسرے: انبیاء کے ہاتھوں جو معجزات ظاہر ہوتے ہیں، اس میں ان کی طاقت واختیار کا کوئی دخل نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے؛ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ’’ببینة من ربکم‘‘ (الاعراف:۱۰۵) فرمایا، تیسرے: اگر مسلمانوں کو کسی مقام پر رہتے ہوئے اپنے دین پر قائم رہنا مشکل ہوجائے اور وہ اس جگہ کو چھوڑنے پر قادر ہوں تو ان کے لئے وہاں سے ہجرت کر جانا اور ایسی جگہ جا کر رہنا، جہاں وہ احکامِ شریعت پر عمل کرسکیں، واجب ہے؛ اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے مصر سے نکل جانے کی اجازت طلب کی۔

چوتھے: دشمنانِ اسلام اور اعدائے حق ہمیشہ دلیل کے مقابلہ لوگوں کو غلط نعروں کے ذریعہ اکسانا اور اُبھارنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں سب سے مؤثر نعرہ یہی ہے کہ فلاں تمہارے ملک پر قبضہ کرنے کا خواہشمند ہے؛ اس لئے تم کو ان کی بات نہیں ماننی چاہئے، پانچویں: جادو حق ہے، جادو کے ذریعے حقیقت و ماہیت میں تبدیلی بھی ہوا کرتی ہے اور بعض اوقات یہ صرف نظر بندی تک محدود ہوتی ہے؛ چنانچہ اس واقعہ میں جادوگروں نے جو کچھ کیا وہ محض نظر بندی تھی، چھٹی بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک لفظ درست ہو؛ لیکن اس کو غلط مفہوم میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہو تو ایسے مبہم لفظ کے استعمال سے بچنا چاہئے اور واضح تعبیر اختیار کرنی چاہئے، جیسے جادوگروں کا یہ کہنا کافی تھا کہ ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لائے؛ لیکن فرعون بھی چوں کہ اپنے آپ کو ’’رب العالمین‘‘ کہتا تھا؛ اس لئے ان لوگوں نے ’’رب موسیٰ وہارون‘‘ سے وضاحت کردی کہ ہماری مراد اس رب کی عبادت کرنا ہے، جس کو موسیٰ اور ہارون رب قرار دیتے ہیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ظاہر ہونے والے اس معجزہ کو ’’مِسمِرزم‘‘ کہنا یا یہ سمجھنا کہ کسی شئ میں پارہ بھر دیا گیا تھا اور آگ پر رکھنے کی وجہ سے اس میں حرکت پیدا ہوگئی تھی، درست نہیں؛ کیوں کہ یہ تو ایک عام نوعیت کا واقعہ ہوتا اور ایسا کرتب ہوتا جو مداری سرِ بازار دکھاتے پھرتے ہیں، اگر نبی کا معجزہ بھی ایسا ہی ہوتا تو اسے اس اہتمام سے بیان کرنے کی کیا ضرورت ہوتی اور پھر لوگ اس منظر کو دیکھ کر کیوں متاثر ہوتے اور ایمان لاتے؟

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿١١٥﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا
اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿١١٦﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ
فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ
وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿١٢٠﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوْسٰى
وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٢﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي
الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٢٣﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٢٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ
اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿١٢٦﴾ ع ۱۴ ۱۸

جادوگروں نے پوچھا: اے موسیٰ! پہلے تم (اپنی لاٹھی) ڈالو گے یا پہلے ہم (رسی ولاٹھی وغیرہ) ڈالیں؟ ﴿١١٥﴾ موسیٰ نے کہا: تم ڈالو، پھر جب ان لوگوں نے ڈالا تو لوگوں کی نگاہوں کو متاثر کردیا، انھیں خوفزدہ کردیا اور بڑے پایہ کا جادو کر دکھایا ﴿١١٦﴾ اور ہم نے موسیٰ کو پیغام دیا کہ اپنی لاٹھی ڈال دو، تو اچانک یوں ہوا کہ یہ ان کے سارے کرتب کو نگلنے لگا؛ ﴿١١٧﴾ چنانچہ حق ظاہر ہوگیا اور ان کی تمام محنتیں رائیگاں ہوگئیں، ﴿١١٨﴾ اس طرح یہاں جادوگر مغلوب ہوگئے، رسوا ہوکر واپس ہوئے ﴿١١٩﴾ اور سجدہ میں گر پڑے، ﴿١٢٠﴾ نیز بول اُٹھے: ہم تمام جہانوں کے رب پر ایمان لائے، ﴿١٢١﴾ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے، ﴿١٢٢﴾ فرعون نے کہا: ''اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دوں، تم موسیٰ وہارون کے رب پر ایمان لے آئے؟ یہ ایک بنا بنایا پروگرام ہے، جو تم لوگوں نے شہر میں بنالیا تھا؛ تاکہ یہاں سے اس کے اصل باشندوں کو نکال دو، تو عنقریب تم (اس کا انجام) جان لوگے، ﴿١٢٣﴾ میں تم لوگوں کے اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالوں گا پھر تم سبھوں کو سولی پر چڑھادوں گا'' ﴿١٢٤﴾ جادوگروں نے کہا: ''ہمیں تو اپنے پروردگار کی طرف واپس ہونا ہی ہے، ﴿١٢٥﴾ تم ہمیں محض اس بات کی سزا دے رہے ہو کہ جب ہمارے رب کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے؟ اے ہمارے رب! ہمیں صبر کی طاقت عطا فرمائیے اور ہمیں اسلام کی حالت میں اُٹھائیے''۔ ﴿۱﴾ ﴿١٢٦﴾

﴿۱﴾ فرعون ایک ذہین حکمراں تھا، اس نے اپنے ہی بلائے ہوئے جادوگروں کو مسلمان ہوتے ہوئے دیکھ کر اپنا داؤ بدلا اور کہنے لگا کہ اصل میں یہ ایک سازش ہے جو تم نے آپس میں مل کر تیار کی ہے؛ تاکہ اس شہر کے اصل باشندوں کو نکال باہر کرو اور اس پر تم قابض ہوجاؤ؛ چنانچہ اس نے کہا کہ پہلے تو ہم ان جادوگروں سے نمٹیں گے اور ان کی سزا مقرر کی کہ ہم اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یا دایاں پاؤں اور بایاں ہاتھ، کہ اس طرح ان کی موت تکلیف دہ ہو، پھر انھیں سولی پر چڑھادیں گے: تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت ہو؛ لیکن ایمان کا نشہ ایسا نشہ ہے جو چڑھنے کے بعد اترتا نہیں ہے؛ اس لئے اِن نومسلم جادوگروں نے ←

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑ دیں گے کہ وہ زمین میں فساد مچائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ فرعون نے جواب دیا: عنقریب ہم ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور ہم تو ان کے اوپر غالب ہیں ہی ﴿۱﴾ ﴿۱۲۷﴾ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: ”اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، اس کا مالک بنا دیتے ہیں ہے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں ہی کے لئے بہتر انجام ہے“۔ ﴿۱۲۸﴾

← کہا کہ تم اپنے ناپاک ارادوں کو شوق سے پورا کرلو، ہم تو ایمان پر قائم رہیں گے؛ کیوں کہ ہماری موت سولی پر ہو یا نرم بستر پر، ہمیں جانا اللہ ہی کے پاس ہے، اور تم محض اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہمارے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو تو یقیناً ہم آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پائیں گے، پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی کہ ہمیں اس آزمائش پر صبر کی قوت عطا فرمائے اور ایمان پر ثابت قدم رکھتے ہوئے دنیا سے اُٹھائے —— اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی چند لمحات کی صحبت بھی دل کی دنیا کو بدل دیتی ہے اور انسان کو مومن کامل بنا دیتی ہے، جب ہی تو اتنے کم وقت میں اِن نو مسلموں میں ایسی استقامت پیدا ہوگئی، اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور ان کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

﴿۱﴾ فرعون کی قوم نے کہا کہ یہ حشر تو آپ نے جادوگروں کا کیا ہے، جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ موسیٰ کی پیروی کر رہے ہیں؛ لیکن خود موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے؟ ان کے مطالبہ پر فرعون نے ان کے لئے یہ سزا مقرر کی کہ ہم ان کے مردوں کو قتل کر دیں گے، عورتوں کو چھوڑ دیں گے؛ تا کہ وہ تمہاری خدمت اور لطف اندوزی کے کام آئیں —— ”نستحی نسائھم“ کا ایک مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم ان کی عورتوں کو بے آبرو کریں گے اور بنی اسرائیل چوں کہ ہمارے قابو میں ہیں؛ اس لئے ان کے بارے میں ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں —— اس آیت میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میں فرعون کے خداؤں کا ذکر کیا گیا ہے، جب کہ قرآن میں دوسری جگہ فرعون کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ”تم لوگوں کا میرے سوا کوئی خدا نہیں“ (القصص: ۳۸) اور ایک جگہ اس کا قول منقول ہے کہ ”میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں“ أنا ربکم الأعلی، (النازعات: ۲۷) اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ لوگ فرعون کی پوجا کرتے تھے؛ لیکن خود فرعون بعض مخلوقات کی پوجا کیا کرتا تھا، حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ بتوں کو پوجتا تھا اور سلیمان تیمی سے منقول ہے کہ بچھڑے کا پجاری تھا (قرطبی: ۲۶۱/۷) ممکن ہے اسی کو دیکھتے ہوئے بعد میں خود بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا کرنے لگے ہوں۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ
عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ع ۱۵/۳ ۵
بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا
هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

موسیٰ کی قوم نے کہا: تمہارے پیدا ہونے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جائیں گے، موسیٰ نے کہا: قریب ہے کہ تمہارے رب تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردیں اور ان کی جگہ تم کو (ان کی) زمین میں بسا دیں، بس اللہ دیکھ رہے ہیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو، ﴿۱﴾ ﴿۱۲۹﴾ اور ہم نے قحط اور پیداوار کی کمی کے ذریعہ فرعون کے لوگوں کی پکڑ کی ؛ کہ شاید وہ نصیحت حاصل کریں، ﴿۱۳۰﴾ تو جب ان پر بہتر حالات آتے تو کہتے : یہ تو ہمارا حق ہے، اور اگر ان پر کوئی مصیبت آتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے، سن لو، خبردار! یقیناً ان کی تقدیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (نہ کہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست)؛ ﴿۲﴾ لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں، ﴿۱۳۱﴾ اور وہ کہتے کہ تم ہمارے پاس کتنی بھی نشانیاں لے آؤ کہ ان کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ، ہم تو تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۳۲﴾

﴿۱﴾ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو تلقین کی کہ فرعون کی طرف سے جو آزمائش آئی ہے، اس پر صبر سے کام لو تو اللہ تعالیٰ اِس سرزمین پر بھی تم کو اقتدار عطا کردیں گے؛ لیکن بنی اسرائیل ایسی نافرمان قوم تھی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر لبیک کہنے کی بجائے اُلٹے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو برا بھلا کہنے لگی کہ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے بھی یہ مصیبت آئی تھی کہ ہمارے لڑکوں کو قتل کردیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تھا، اور تمہاری وجہ سے پھر یہی مصیبت آرہی ہے، ایسے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کی جاں نثاری کی عظمت بڑھ جاتی ہے کہ دین کے راستے میں پہنچنے والی کسی تکلیف پر وہ ’اُف‘ تک نہیں کہتے تھے، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صبر ہی اصل میں کامیابی کی کلید ہے، جس سے وقتی طور پر تو تکلیف پہنچتی ہے؛ لیکن پھر کامیابی اور آسانی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

﴿۲﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ’طائر‘ کے معنی ’’ماقضی علیهم وقدر لهم‘‘ فرمایا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ’’تقدیر‘‘ سے کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ اب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے مظالم کا انتقام لینا شروع کیا، سب سے پہلے ان پر قحط کا عذاب نازل کیا گیا، دیہاتوں میں قحط کی وجہ سے پیداوار نہیں ہوتی، شہروں میں اس کی وجہ سے پھل نہیں آتے، یہ قحط کی آزمائش کتنے دنوں رہی ←

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

پھر ہم نے ان پر طوفان، ٹڈیاں، گھُن، مینڈک اور خون کی واضح نشانیاں بھیجیں، پھر بھی انھوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ تھے ہی جرائم پیشہ لوگ۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۳۳﴾

← قرآن وحدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے اور نہ عام طور پر مفسرین نے ذکر کیا ہے؛ لیکن یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک طویل قحط تھا، جس سے قوم فرعون دو چار کی گئی اور وہ غذائی اشیاء کی قلت سے بلبلا اُٹھی؛ لیکن جب کسی قوم کے لئے بربادی مقدر ہوتی ہے تو وہ مصیبتوں سے سبق حاصل کرنے کے بجائے اُلٹا نتیجہ اخذ کرنے لگتے ہیں؛ چنانچہ جب قحط ہوتا تو لوگ کہتے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نحوست ہے اور جب حالات بہتر ہوتے تو کہتے کہ یہ تو ہمارا حق ہے۔

﴿۱﴾ قحط کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرعون کی قوم پر یکے بعد دیگرے پانچ مصیبتیں بطور عذاب کے بھیجیں، پہلے ان پر طوفان آیا اور مسلسل ایک ہفتہ اس طرح مسلط رہا کہ کوئی سورج دیکھ نہیں سکا اور لوگوں کا گھر سے نکلنا مشکل ہوگیا، لوگوں نے فرعون سے فریاد کی اور فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خواہش کی کہ وہ دُعاء کریں، اگر یہ دور ہوگئی تو ہم ایمان لے آئیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء کی، یہ مصیبت دور ہوئی اور بہترین پیداوار ہوئی؛ مگر یہ اپنے وعدہ سے مکر گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈیوں کا عذاب بھیجا، ٹڈیوں کا غول تمام پودوں کو کھا گیا، کہتے ہیں کہ ان کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ ایک پر ایک گرتے تھے اور جب غول بنا کر چلتے تھے تو سورج نظر نہیں آتا تھا، پھر اہل مصر کی درخواست پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء فرمائی اور اللہ کے حکم سے ایسی ہوا چلی کہ تمام ٹڈیاں سمندر میں جا گریں، اہل مصر کہنے لگے کہ جتنی کھیتی بچ گئی، وہ ہمارے لئے کافی ہے؛ اس لئے ہم ایمان نہیں لائیں گے، اب اللہ تعالیٰ نے ان پر گھُن کا عذاب نازل کیا، ان گھنوں نے جہاں بھی کوئی لکڑی نظر آئی اسے کھالیا، بعض حضرات نے ''قمل'' کا ترجمہ ''جوں'' یا ''کھٹمل'' سے کیا ہے؛ لیکن مفسرین کی تشریح کے لحاظ سے ''گھن'' زیادہ درست معلوم ہوتا ہے، اہل مصر کی فریاد پر پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء کی اور ایسی گرم ہوا چلی کہ یہ گھن ختم ہوگئے، مگر پھر انھوں نے عہد شکنی کرتے ہوئے ایمان لانے سے انکار کر دیا، اس کے بعد مینڈک کا عذاب آیا، دریاؤں سے نکل نکل کر مینڈک آبادی میں آگئے اور صورت حال یہ ہوگئی کہ کوئی کھانا، برتن، کپڑا نہ تھا، جو مینڈک سے محفوظ ہو، انسان کے جسم پر بھی مینڈک رینگتے رہتے تھے، تنگ آکر بنی اسرائیل نے پھر دُعاء کے لئے فریاد کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء سے ایسی بارش ہوئی، جس نے ان مینڈکوں کو دریا میں پہنچا دیا؛ لیکن حسبِ معمول پھر یہ اپنے وعدہ سے منحرف ہوگئے اور ایمان نہیں لائے، اب ان پر خون کا عذاب آیا، نہریں خون بن گئیں، برتن میں پانی لیا جاتا اور وہ خون بن جاتا، سات روز تک یہی کیفیت رہی، پھر ان کی خواہش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء فرمائی اور یہ عذاب ٹلا؛ لیکن قوم فرعون کی سرکشی اور بدعہدی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر بار وعدہ کرتی اور جب مصیبت دور ہوجاتی تو پھر اپنی روش پر لوٹ آتی، مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب ان پر ایک ایک ہفتہ رہتا اور ایک عذاب کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے کے درمیان ایک مہینہ کا وقفہ ہوتا، اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیس سال قوم فرعون کے درمیان گذارے؛ لیکن ان پر غفلت کا ایسا نشہ چھایا ہوا تھا کہ بیس سال کی مدت بھی ان کو بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں ہوئی۔ (ملخص از: مفاتیح الغیب: ۷/۲۵۰-۲۵۳)

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا
الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى
اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬
بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور جب ان پر عذاب آتا تو کہتے : اے موسیٰ ! ہمارے حق میں اپنے رب سے اُس وعدہ کی بنا پر دُعاء کردو جو تمہارے رب نے تم سے کر رکھا ہے، اگر تم ہم سے اس عذاب کو دور کردو تو ہم تم پر ضرور ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی ضرور ہی تمہارے ساتھ بھیج دیں گے، ﴿۱۳۴﴾ پھر جب ہم ان سے ایک مدت کے بعد جواُن کے لئے مقدر تھی، عذاب کو ہٹالیتے تو وہ وعدہ سے مکر جاتے تھے ﴿۱﴾ ﴿۱۳۵﴾ چنانچہ ہم نے ان سے بدلہ لیا کہ انھیں دریا میں ڈُبو دیا؛ اس لئے کہ وہ لوگ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے غفلت برتا کرتے تھے، ﴿۲﴾ ﴿۱۳۶﴾ اور ہم نے زمین کے تمام مشرق ومغرب —— جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں —— کا مالک اس قوم کو بنا دیا، جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا اور آپ کے رب کا بہترین وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا؛ کیوں کہ انھوں نے صبر سے کام لیا تھا، نیز فرعون اور اس کی قوم کے لوگوں کی صنعتوں اور بلند وبالا عمارتوں کو ہم نے تباہ وبرباد کرڈالا۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۳۷﴾

﴿۱﴾ فرعون پر آخری تباہ کن عذاب آنے سے پہلے آخری تنبیہ کے طور پر ایک مہلک عذاب طاعون (پلیگ) کا آیا، اس بار قوم بنی اسرائیل نے نہایت تاکید کے ساتھ عہد کیا کہ اگر ہم سے یہ عذاب دور ہوجائے گا تو ہم ضرور تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دیں گے؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دُعاء کی اور یہ عذاب بھی ان سے ہٹا دیا گیا؛ تاکہ اُن کے اِس آخری وعدہ کو بھی آزمالیا جائے، کہا جاتا ہے کہ یہ پلیگ اتنا سخت تھا کہ بقول سعید بن جبیر رحمہ اللہ صرف ایک دن میں ستر ہزار انسان مر گئے اور انھیں دفن بھی نہیں کیا جاسکا، (قرطبی: ۷/۱۷۲) پھر انھیں ایک مہلت دی گئی؛ لیکن وہ اب بھی اپنی وعدہ خلافی سے باز نہیں آئے، اس آیت میں ''رجز'' سے مراد اہل علم کے یہاں یہی طاعون کا عذاب ہے۔

﴿۲﴾ قوم فرعون پر سب سے پہلے طوفان کا عذاب آیا، پھر یکے بعد دیگرے پانچ عذاب آئے، پھر آخری ہلاکت خیز عذاب سے پہلے ساتویں نمبر پر طاعون کا عذاب آیا اور جب اس کے باوجود ان کی سرکشی میں کوئی فرق نہیں آیا تو آخر انھیں ڈبو دیا گیا، یہاں تک کہ فرعون اور اس کی پوری قوم جو''قبطی'' کہلاتی تھی، نیست ونابود کردی گئی، سورۂ بقرہ آیت ۴۹-۵۰ میں اس واقعہ کا ذکر آچکا ہے۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس دنیا میں کسی ایک قوم کا اقتدار ہمیشہ باقی نہیں رہتا؛ کیوں کہ جب کوئی قوم مسلسل حکمراں ←

وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی
اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ
وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾
وَ اِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶ / ۱۲

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کرادیا، پھر وہ ایک ایسی قوم کے پاس آئے جو اپنے بتوں کی پوجا میں مگن تھی، بنی اسرائیل نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی اِن ہی کے معبودوں کی طرح ایک معبود بنا دو، موسیٰ نے کہا: یقیناً تم لوگ جاہل ونادان ہو ﴿۱۳۸﴾ یہ لوگ جس کام میں لگے ہوئے ہیں، اسے تباہ کردیا جائے گا اور ان کے یہ کام بالکل بے بنیاد ہیں ﴿۱۳۹﴾ موسیٰ نے کہا: کیا میں تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں؛ حالاں کہ اللہ نے (اس عہد میں) تم کو تمام عالم پر فضیلت عطا فرمائی ہے؟ ﴿۱﴾ ﴿۱۴۰﴾ اور (اللہ نے فرمایا:) اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرعون کے لوگوں سے تم کو نجات عطا کی، جو تمہیں سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے، تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ باقی رکھتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بھاری آزمائش تھی۔ ﴿۱۴۱﴾

← یا دولت مندرہتی ہے تو اس میں ظلم، تکبر، عیش پرستی اور بہت سی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اسی سنت کے مطابق فرعون اور اس کی قوم کو تو تباہ کردیا اور بنی اسرائیل جو نہایت دبے کچلے تھے؛ یہاں تک کہ ان کی اولاد کو بے دردی سے قتل کردینا بھی کوئی جرم نہیں تھا، انھیں حکومت واقتدار سے نوازا گیا، اس میں عصر حاضر کے مسلمانوں کے لئے سبق ہے کہ گذشتہ دو تین سو سال سے دنیا پر مغربی قوتوں، اسلام کے دشمنوں اور امن وآشتی کے غارت گروں کے غلبہ کو دیکھ کر گھبرانا اور احساس محرومی میں مبتلا ہونا نہ چاہئے؛ کیوں کہ یہ ایک عارضی کیفیت ہے جو مستقل طور پر باقی نہیں رہ سکتی اور انجام کار اُمت مسلمہ کو غلبہ حاصل ہوگا؛ بشرطیکہ وہ دین حق کے ترجمان اور اس کے داعی بن کر رہیں۔

﴿۱﴾ انسان کی ایک فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کا اثر قبول کرتا ہے، فرعون کی قوم شرک میں مبتلا تھی اور جیسے ہی دریا پار کر کے بنی اسرائیل دوسری طرف پہنچے تو وہاں بھی ایک بت پرست قوم موجود تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تمام تعلیمات فراموش کر کے ان سے مصنوعی دیویوں، دیوتاؤں کا مطالبہ شروع کردیا، اس سے جہاں ایک طرف بنی اسرائیل کی بے توفیقی اور خدا ناترسی کا مزاج معلوم ہوتا ہے، وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی آبادی غیر مسلموں سے الگ رکھنی چاہئے، ورنہ وہ غیر اسلامی تہذیب کا اثر قبول کرنے لگتے ہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آبادی اور غیر مسلموں کی آبادی میں اتنا فاصلہ ہونا چاہئے کہ ایک طرف آگ سلگائی جائے تو دوسری طرف نظر نہ آئے (نسائی، حدیث نمبر: ۴۷۸۰) —— یہ حکم ←

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِیْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر اسے دس راتوں (کے اضافہ) سے مکمل کیا، اس طرح اس کے رب کی مقرر کی ہوئی مدت —— چالیس راتیں —— پوری ہوگئیں اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری عدم موجودگی میں میری قوم کا انتظام سنبھالنا، اصلاح کرتے رہنا اور بگاڑ پیدا کرنے والوں کے راستہ کی پیروی نہیں کرنا۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۴۲﴾

← کسی تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ اس لئے ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو بچا سکیں اور غیر اسلامی افکار کا شکار نہ ہوجائیں —— بنی اسرائیل کو تمام عالم پر فضیلت دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اللہ نے نبوت اور کلام الٰہی سے نوازا ہے اور بہت سارے پیغمبر تمہارے اندر پیدا کئے ہیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ پیدائشی طور پر بنی اسرائیل کی نسل کو دوسری نسلوں پر کوئی فضیلت حاصل ہے، اسلام نسلی امتیاز اور پیدائشی طور پر کسی خاندان کی برتری اور کسی خاندان کی کمتری کا قائل نہیں۔

﴿۱﴾ قوم بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکی تھی اور اسے فرعون سے نجات بھی مل چکی تھی؛ اس لئے اب ضرورت تھی کہ اسے شریعت کے احکام سپرد کئے جائیں، اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور کے پہاڑ پر طلب فرمایا اور انھیں پہلے تیس دن اور پھر مزید دس دن کی مدت دی گئی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول اس مدت میں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا، یہ ایک ماہ ذوقعدہ کا تھا اور دس دن ذوالحجہ کا پہلا عشرہ تھا، گویا دس ذوالحجہ کو اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا (قرطبی: ۷/ ۲۷۴)، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ انسان کے اخلاق و اعمال کی اصلاح میں چالیس دن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، دوسرے: اگر بظاہر کسی مشکل کام کا حکم دیا جائے تو داعیانہ حکمت یہ ہے کہ بتدریج احکام دیئے جائیں؛ چنانچہ پہلے تیس دن کے روزوں کا حکم دیا گیا، پھر دس دن کا؛ حالاں کہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے یہاں چالیس روزے مطلوب تھے؛ اسی طرح اُمتِ محمدیہ میں پہلے دو وقت کی نمازیں فرض تھیں، بعد میں پانچ وقت کی فرض کی گئیں، پہلے صرف نماز پڑھنے کے وقت شراب کی ممانعت کی گئی، پھر مکمل طور پر حرام کردی گئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص سے ادارہ، تنظیم یا جماعت وغیرہ کی ذمہ داری متعلق ہو اور اس کو چند روز کے لئے کہیں جانا پڑے تو اسے اپنی عدم موجودگی میں کسی کو ذمہ دار مقرر کردینا چاہئے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو مقرر فرمایا تھا، قرآن نے یہاں تیس دنوں کے بجائے تیس رات کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تاریخیں غروب آفتاب سے شروع ہوتی ہیں نہ کہ طلوع آفتاب سے، اور دن رات کے تابع ہوا کرتا ہے۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشیں بنایا تھا، اسی طرح حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض غزوات کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اپنی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جانشین بنایا اور فرمایا کہ میرے مقابلہ میں تمہاری حیثیت وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون کی تھی؛ البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا ''أما ترضی أن تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ إلا أنہ لا نبی بعدی'' (مسلم: باب من فضائل علیؓ: ۶۲۱۷-۶۲۱۸، ۶۲۰، بخاری: باب مناقب علیؓ: ۳۷۰۶، باب غزوۃ تبوک: ۴۴۱۶) اس سے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ پر غیر معمولی اعتماد کرنا ظاہر ہوتا ہے؛ لیکن اس کا یہ ←

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ
انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا
وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ قَالَ
يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ ۖ٭ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا
بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر آئے اور پروردگار نے ان سے گفتگو کی، تو موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، اللہ نے کہا: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے: لیکن پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے؛ چنانچہ ان کے رب نے پہاڑ پر اپنا جلوہ ظاہر فرمایا تو اس نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے، پھر جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے: آپ کی ذات پاک ہے، میں آپ کے حضور معذرت کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں ﴿۱﴾ ﴿۱۴۳﴾ اللہ نے کہا: ''اے موسیٰ! میں نے تم کو تمام لوگوں پر اپنی رسالت اور اپنی ہم کلامی کا شرف بخشنے کے لئے منتخب کر لیا ہے؛ لہٰذا جو کچھ میں تمہیں دے رہا ہوں، اسے لو اور شکر ادا کرتے رہو، ﴿۱۴۴﴾ اور ہم نے اس کے لئے چند تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر بات کی وضاحت لکھ دی تھی ﴿۲﴾؛ لہٰذا اسے مضبوطی سے تھام لو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ اسے اچھی طرح تھامے رہے، میں عنقریب تمہیں نافرمانی کرنے والوں کی جگہ بھی دیکھا دوں گا۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۴۵﴾

← مطلب نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعد کے لئے خلیفہ نامزد کر دیا تھا، اس کی حیثیت صرف عارضی طور پر اپنا نائب بنانے کی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی عدم موجودگی میں انتظامی کاموں کو انجام دیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے متعدد بار حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی اپنی عدم موجودگی میں مدینہ منورہ کا ذمہ دار مقرر فرمایا ہے، بعض دفعہ دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی مقرر کیا ہے تو کیا ان سب کو آپ ﷺ کے بعد خلیفہ سمجھا جائے گا؟

﴿۱﴾ آخرت میں انشاء اللہ اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا؛ کیوں کہ آخرت میں انسان کی تمام صلاحیتیں دنیا کے مقابلہ بہت بڑھی ہوئی ہوں گی، دنیا میں انسان محدود اور کمزور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے؛ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ تم دیکھ نہیں سکو گے اور اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر اپنی تجلیات کی ایک جھلک ظاہر فرمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ کا وہ حصہ ریزہ ریزہ ←

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ
يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
ع ۱۷ بِاٰيٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَ اتَّخَذَ
قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا
يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ وقف لازم
ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

عنقریب میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو بے توجہ کردوں گا ، جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں ، اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں ، تب بھی ایمان نہ لائیں ، اگر ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اختیار نہ کریں اور گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اختیار کرلیں ، ایسا اس لئے ہے کہ انھوں نے ہمارے احکام کو جھٹلا دیا تھا اور وہ ان سے غفلت برتا کرتے تھے ﴿۱۴۶﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلا دیا ، ان کے تو اعمال ہی برباد ہوگئے ، وہ اپنے کرتوت کی سزا پا کر رہیں گے“ ﴿۱۴۷﴾ موسیٰ کی قوم نے موسیٰ (کے جانے) کے بعد لوگوں کے زیورات سے بچھڑے کا بت بنالیا ، جس میں گائے کی آواز بھی تھی ، کیا وہ دیکھ نہیں رہے تھے کہ نہ وہ ان سے بات کرتا ہے اور نہ انھیں راستہ بتلاتا ہے ، (پھر بھی) انھوں نے اس کو معبود بنالیا اور وہ زیادتی کرنے والے تھے ، ﴿۱۴۸﴾ اور جب ان کو پچھتاوا ہوا اور انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ تو گمراہ ہو چکے ہیں تو کہنے لگے : اگر ہمارے رب نے ہم پر ترس نہیں کھایا اور ہمیں معاف نہیں کیا تو ہم تو نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۔ ﴿۱۴۹﴾

← ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو بالواسطہ تجلیات ربانی کی ایک جھلک دیکھی ، وہ بھی برداشت نہیں ہوسکی اور آپ بے ہوش ہوگئے ۔

﴿۲﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی جو تختیاں دی گئیں ، وہ کس چیز کی تھیں اور کیسی تھیں ؟ اس سلسلہ میں بعض مفسرین نے جو تفصیلات نقل کی ہیں ، ان کا نہ قرآن سے ثبوت ہے اور نہ حدیث سے ، اور نہ اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہے ۔

﴿۳﴾ نافرمانی کرنے والوں کی جگہ سے مراد ’ دوزخ ‘ بھی ہوسکتا ہے ؛ لیکن زیادہ تر مفسرین نے اس سے مصر اور شام مراد لیا ہے ؛ کیوں کہ مصر میں فرعون کی قوم آباد تھی اور شام میں عمالقہ کا قبضہ تھا اور یہ دونوں مشرک تھے ؛ گویا اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی کہ عنقریب ان دونوں ملکوں پر آپ کی قوم کو غلبہ واقتدار حاصل ہوجائے گا ۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ
اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ
اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ
ع ۱۸/۸ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ
مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو غصہ اور افسوس کی کیفیت ان پر طاری تھی، موسیٰ نے کہا: میرے بعد تم نے کیسی نامعقول حرکت کی ہے؟ تم نے اپنے رب کے حکم میں جلد بازی کیوں کی؟؟ اور موسیٰ نے تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کا سر پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے، موسیٰ کے بھائی نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ وہ مجھے قتل ہی کر ڈالتے؛ اس لئے مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دیجئے اور مجھے ظالموں میں شمار نہ کیجئے ﴿۱۵۰﴾ موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! مجھ کو اور میرے بھائی کو معاف کر دیجئے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لیجئے اور آپ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں، ﴿۱۵۱﴾ بے شک جن لوگوں نے بچھڑا بنایا ہے، ان کو ان کے رب کی طرف سے غضب اور دنیوی زندگی کی رسوائی عنقریب پکڑ لے گی اور ہم اسی طرح جھوٹ گھڑنے والوں کو سزا دیتے ہیں، ﴿۱۵۲﴾ ہاں، جن لوگوں نے برا عمل کیا، پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، بے شک آپ کے رب اس کے گناہ معاف کر دیتے اور رحم فرماتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۵۳﴾

﴿۱﴾ اِدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلام لانے کو طور کی طرف گئے اور اُدھر قوم بنی اسرائیل میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری تربیتی کوششوں پر گویا پانی پھیر دیا، اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کے پاس قوم فرعون کے کچھ زیورات تھے، یا تو یہ زیورات کسی قومی تقریب کے لئے عاریتاً لئے گئے تھے، یا انھیں بطور مالِ غنیمت کے قومِ فرعون سے حاصل ہو گیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ تیس دنوں بعد واپس آئیں گے؛ لیکن جب تیس دن پر واپس نہ آسکے اور حکم ربانی سے مزید دس دنوں کا قیام بڑھ گیا تو اس احسان ناشناس قوم کے ایک شخص نے جس کا نام ''موسیٰ بن ظفر'' بتایا جاتا ہے اور جس کا وطن ''سامرہ'' نامی گاؤں تھا، اِن زیورات کو جمع کر کے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور لوگوں کو اسی بچھڑے کی پوجا کرنے کی دعوت دی، یہ بچھڑا ظاہر ہے نہ سن سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا؛ لیکن لوگوں کے امتحان کے لئے اللہ کی طرف سے اس میں بچھڑے کی سی آواز پیدا کر دی گئی تھی اور بعض مفسرین کے بقول اس کے پیٹ میں خلا رکھتے ہوئے کچھ اس طرح اس کو ہوا کے رُخ پر رکھا گیا کہ ایک طرف سے ہوا آتی تھی ←

وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور جب موسیٰ کا غصہ کم ہوا تو اس نے تختیاں اُٹھالیں اور ان تختیوں میں لکھے ہوئے مضامین میں ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت تھی، جو اپنے خدا سے ڈرتے ہیں ۔ ﴿۱۵۴﴾

← اور دوسری طرف سے نکل جاتی تھی، اس کی وجہ سے اس میں کچھ آواز سی پیدا ہورہی تھی، بہر حال ہوا یہ کہ بنی اسرائیل جو پہلے سے بتوں پر فریفتہ تھے، انھوں نے سامری کی دعوت کو قبول کرلیا اور بت کی پوجا کرنے لگے، حضرت ہارون علیہ السلام نے بہت روکنے کی کوشش کی؛ لیکن لوگوں نے سن کر نہیں دیا؛ یہاں تک کہ مرنے مارنے پر اُتر آئے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو یہ صورتِ حال دیکھ کر انھیں غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا کہ اتنی تربیتی کوششوں کے باوجود اب تک ان کی نافرمانی کا مزاج نہیں بدلا، انسان کو جس پر بھروسہ ہوتا ہے، اس پر آدمی کو غصہ زیادہ آتا ہے؛ اس لئے پہلے تو آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف توجہ کی اور فرطِ غضب میں ان سے فرمایا کہ تم نے میرے بعد میری خوب نیابت کی کہ ان کو اس برائی سے روکا تک نہیں؟ حضرت ہارون علیہ السلام گو عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے؛ لیکن درجہ کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑھے ہوئے تھے؛ کیوں کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاون اور نائب تھے؛ اس لئے ان کے سر کے بال پکڑ کر بھی کھینچا —— اور اگر حق کے لئے ایسا کرنا پڑے تو یہ کوئی ناشائستہ بات نہیں؛ بلکہ یہ حق کے معاملہ میں رسوخ کی علامت ہوتی ہے، —— حضرت ہارون علیہ السلام نے معذرت کی کہ انھوں نے قوم کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی؛ لیکن ان کی زور آوری کے مقابلہ میں مجبور ہوگئے؛ کیوں کہ وہ تو قتل وقتال پر اُتر آئے تھے، اب قوم کے نافرمانوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا، شاید اس احساسِ ندامت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا کیا ہو؛ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دُعاء فرمائی کہ اے اللہ! مجھ کو اور میرے بھائی کو معاف کردیجئے؛ کیوں کہ ہم دونوں کی کوئی خطا نہیں ہے، پھر قوم سے فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، وہ لوگ اپنے رب کے غضب سے اور دنیا میں بھی ذلت سے دوچار ہوں گے؛ چنانچہ سورۂ بقرہ (۵۴) میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے جو لوگ اس گناہ سے محفوظ رہے، ان کے ہاتھوں غلطی کا ارتکاب کرنے والوں کو قتل کرایا گیا —— اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے عزیز کی جانب سے ہونے والی دینی کوتاہی پر اس کی گرفت کرنی چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ذاتی مفادات کے معاملے میں تو مرنے مارنے پر اُتر آئیں اور دینی معاملات میں کوتاہی کے وقت تساہل سے کام لیں اور اسے رواداری کا نام دیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غصہ اگرچہ بری چیز ہے؛ لیکن جو بات غصہ آنے کی ہو اور خاص کر جہاں اللہ اور اس کے رسول کا حکم ٹوٹتا ہو، وہاں غصہ آنا اور ناگواری پیدا ہونا ایمان کا تقاضا ہے، ایک قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ زیادہ تر مفسرین کی رائے کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کے سگے بھائی تھے؛ لیکن انھوں نے باپ کی بجائے صرف ماں کے رشتہ کا حوالہ دیا؛ کیوں کہ ماں محبت و پیار کا سرچشمہ ہوتی ہے؛ لہٰذا اگر کسی کو دین کی کسی بات کی طرف بلانا ہو اور اس سے کوئی ایسا رشتہ ہو، جو محبت کی چنگاری کو سلگا سکتا ہو اور اس کے دل کو نرم کرسکتا ہو تو اس رشتہ وتعلق کا حوالہ دینا چاہئے ۔ (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۷/ ۲۷۴-۲۹۲)

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ
اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ
بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ
الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر مردوں کو ہمارے مقررہ کئے ہوئے وقت کے لئے منتخب کیا، جب ان کو زلزلہ نے پکڑ لیا تو موسیٰ نے عرض کیا: ’’اے میرے رب! اگر آپ چاہتے تو ان کو بھی اور مجھے بھی پہلے ہی ہلاک کر دے سکتے تھے، تو کیا ہم میں سے کچھ بے وقوفوں کی حرکت کی وجہ سے آپ ہم سب کو ہلاک فرما دیں گے؟ یہ صرف آپ کی طرف سے آزمائش ہے، اس امتحان کے ذریعہ آپ جسے چاہیں، ہدایت سے محروم کر دیں اور جسے چاہیں، ہدایت پر قائم رکھیں، آپ ہی تو ہمارے آقا ہیں؛ اس لئے ہمیں معاف کر دیجئے اور ہم پر رحم فرمائیے اور آپ بہترین معاف کرنے والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۵۵﴾ نیز ہمارے لئے اس دنیا میں بھی بہتری کا فیصلہ کیجئے اور آخرت میں بھی، ہم آپ ہی کی طرف رُجوع کر رہے ہیں‘‘ اللہ نے فرمایا: ’’میں جس کو چاہتا ہوں اپنے عذاب سے دوچار کرتا ہوں اور (اس کے ساتھ ساتھ نہایت مہربان بھی ہوں؛ چنانچہ) میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے؛ اس لئے میں ان لوگوں کے لئے رحمت کا فیصلہ کروں گا، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں‘‘۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۵۶﴾

﴿۱﴾ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان ہوا اور آپ نے تورات کے احکام لوگوں کے سامنے پیش فرمائے تو بنی اسرائیل کہنے لگے کہ ہم کیسے سمجھ لیں کہ یہ احکام اللہ کی طرف سے ہیں، جب تک ہم اللہ کا فرمان سن نہ لیں، اسے قبول نہیں کریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی سرکشی کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی کہ ان کی یہ خواہش پوری ہو جائے، پھر اللہ کے حکم کے مطابق اپنی قوم میں سے ستر لوگوں کا انتخاب فرمایا اور انھیں اپنے ساتھ کوہِ طور پر لے گئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان احکام کی تصدیق کرتے ہوئے گفتگو فرمائی، جس کو اس قافلہ نے اپنے کانوں سے سنا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے اور فوراً تورات کے احکام پر لبیک کہتے؛ لیکن اس کی بجائے انھوں نے پھر اپنے مزاج کے مطابق سرکشی کرتے ہوئے کہا کہ ہم کیسے سمجھیں کہ یہ آواز اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی، جب تک ہم خدا کو دیکھ نہ لیں ہم نہیں مانیں گے، اس بدتمیزی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اوپر سے بجلی کا کڑکا آیا، جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہے (آیت نمبر: ۵۵) اور نیچے سے زلزلہ، جس کا ذکر یہاں ہے، اس کے نتیجے میں یہ سب کے سب ہلاک ہو گئے اور بعض مفسرین کے قول پر ہلاک ہونے کے قریب ہو گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر التجا کی کہ خداوندا! آپ تو انھیں وہاں بھی ہلاک کر سکتے تھے؛ ←

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ ؗ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ
وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع ۱۹/۶ ۹

جولوگ اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں، ﴿۱﴾ جن کا ذکر وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں پاتے ہیں، ﴿۲﴾ کہ وہ رسول نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے، پاک چیزوں کو حلال کریں گے، گندی چیزوں کو حرام قرار دیں گے، ﴿۳﴾ اُن سے ان کا بوجھ اور طوق، جو اُن کے اوپر ہیں، اُتار دیں گے، ﴿۴﴾ پس جو لوگ اس رسول پر ایمان لائے، ان کو قوت پہنچائی، ان کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی، ﴿۵﴾ جو ان کے ساتھ اُتاری گئی ہے، وہی کامیاب ہیں۔ ﴿۱۵۷﴾

← لیکن اب جو یہ ہلاکت ہوگی تو لوگ سمجھیں گے کہ یہ سب موسیٰ کی سازش ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے بھی ہلاک کردیں اور پوری قوم ہدایت سے محروم ہوجائے، جس سے بڑھ کر کوئی ہلاکت و بربادی نہیں ہوسکتی تو کیا آپ چند لوگوں کی وجہ سے ساری قوم کو ہلاک فرمادیں گے؟ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء قبول فرمائی اور وہ دوبارہ زندہ کردیئے گئے۔ (خلاصہ از: تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۴۹-۲۵۰)

﴿۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے، اس پر رحمت وشفقت کا غلبہ ہے اور وہ بڑا ہی کریم اور مہربان ہے، نہ یہ کہ وہ نہایت غضبناک ہے، جیسا کہ عیسائی حضرات کہتے ہیں؛ البتہ بعض دفعہ غضب اور سزا بھی رحمت کا تقاضا ہوتے ہیں، باپ اپنی اولاد پر غصہ کرتا ہے اور استاذ اپنے شاگردوں کو سزا دیتا ہے تو کیا ان کا یہ فعل بے رحمی ہے، اسی طرح قاتل اور ظالم کو سزا دینا مقتول اور مظلوم کے ساتھ رحم کا عین تقاضا ہے اور سزا نہ دینا ان کے ساتھ بے رحمی وناانصافی ہے۔

﴿۱﴾ اُمّی اصل میں (اُم) ماں سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو پڑھا لکھا نہ ہو؛ بلکہ وہ ویسا ہی ہو جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو؛ چنانچہ اُمّی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو لکھنا اور لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا نہ جانتا ہو، (مفاتیح الغیب: ۷/۳۰۶) البتہ اُمی کا ترجمہ ''جاہل'' کے لفظ سے نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ علم کا ذریعہ صرف تحریر ہی نہیں ہے، پہلے زمانہ میں علم سینہ بسینہ ایک دوسرے تک پہنچایا جاتا تھا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمی تھے اور حدیث میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اُمی لوگ ہیں ''إنا أمة أمية'' (بخاری: باب قول النبی لا نکتب ولا نحسب، حدیث نمبر: ۹۱۳، مسلم: باب وجوب صوم رمضان، حدیث نمبر: ۲۵۱۱) —— آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے؛ کیوں کہ اگر آپ لکھائی پڑھائی سے واقف ہوتے تو شبہ کیا جاسکتا تھا کہ شاید آپ نے پہلی آسمانی کتابوں سے پڑھ کر قرآن مجید کو مرتب کیا ہے اور گذشتہ اقوام کے واقعات نقل کئے ہیں؛ لیکن منجانب اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمّی رکھا گیا؛ تاکہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے، مگر افسوس کہ مغربی مصنفین اب بھی اس طرح کی باتیں کہتے رہتے ہیں، بعض ناسمجھ مسلمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے کا انکار کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ یہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے؛ حالاں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین نہیں؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کی دلیل ہے، لکھنا یا لکھی ہوئی چیز کو پڑھنا بجائے خود مقصود نہیں؛ بلکہ اصل ←

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاࣙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

آپ کہہ دیجئے: ''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجا گیا ہوں ، ﴿۱﴾ ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، ان کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی عطا کرتے ہیں اور موت سے دوچار کرتے ہیں؛ اس لئے اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی اُمّی پر ایمان لے آؤ، جو خود اللہ اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں، نیز ان کی پیروی کرو؛ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ''۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۵۸﴾

← مقصود علم ہے اور آپ کو وحی خداوندی کے ذریعہ ایسے علم سے نوازا گیا تھا، جس سے بڑھ کر کوئی اور ذریعۂ علم نہیں ہوسکتا۔

﴿۲﴾ اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر تورات وانجیل میں موجود ہے، وہیں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اگر توحید، رسالت، نبوت محمدی اور آخرت کا ذکر دوسری مذہبی کتابوں میں ہو تو ان کو ماننے والوں پر حجت پوری کرنے کے لئے دعوت دین کے مقصد کے تحت ان کا حوالہ دیا جاسکتا ہے اور اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ جو بات مخاطب کے نزدیک تسلیم شدہ ہو، اُسے قبول کرانا آسان ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے، وہ سب پاکیزہ ہیں، اور جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ سب ظاہری یا معنوی اعتبار سے گندی اور ناپاک ہیں۔

﴿۴﴾ اسلام سے پہلے کی شریعتوں میں بعض احکام دشوار تھے، جیسے کپڑوں کو پوری طرح پیشاب سے بچانے کا حکم تھا، یہاں تک کہ پیشاب لگ جائے تو کپڑے کے اس حصہ کو کاٹ دیئے جانے کا حکم دیا جاتا، جنگ میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا انہیں کھانے کی اجازت نہیں تھی، حائضہ عورت سے صرف ہم بستری ہی کی ممانعت نہیں تھی؛ بلکہ ان کے ساتھ بیٹھنے، کھانے پینے اور ساتھ سونے کو بھی منع کر دیا گیا تھا، ہفتہ کے دن کسبِ معاش کی ممانعت تھی، شریعت اسلامی میں ان تمام احکام میں نرمی پیدا کی گئی، اسی کو ''بوجھ اور طوق اُتارنے'' سے تعبیر کیا گیا ہے، (قرطبی: ۷/۳۰۰) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مشکل احکام ان کو تکلیف پہنچانے کے لئے دیئے گئے تھے؛ بلکہ یہ ان کی سزا اور ان کی شامتِ اعمال کا نتیجہ تھا؛ چنانچہ بعض روایتوں میں علماء اہل کتاب کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ سہولت دینی چاہی کہ وہ زمین میں جہاں چاہیں نماز پڑھ لیں، تورات کی زبانی تلاوت کرلیں، مٹی سے تیمم پر اکتفا کریں؛ لیکن بنی اسرائیل کے بزرگوں نے کہا کہ ہم ایسا نہیں چاہتے، ہم گرجوں ہی میں نماز پڑھیں گے، پانی ہی سے پاکی حاصل کریں گے، تورات دیکھ کر ہی تلاوت کریں گے اور جماعت کے ساتھ ہی عبادت کریں گے؛ چنانچہ ان پر اللہ کی طرف سے یہی احکام جاری کر دیئے گئے، (تفسیر قرطبی: ۷/۲۹۷) غرض کہ سختیاں خود ان کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کا نتیجہ تھیں۔

﴿۵﴾ روشنی سے مراد قرآن مجید ہے۔ (قرطبی: ۷/۳۰۱)

﴿۱﴾ یعنی آپ ﷺ کی نبوت تمام انسانیت کے لئے ہے، تمام انسان باعتبار علاقہ کے اور باعتبار زمانہ کے بھی قیامت تک آپ ﷺ ہی کی نبوت کے سائے میں رہیں گے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، آپ ﷺ کے ←

وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا
اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓــٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے مطابق انصاف کرتا ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۵۹﴾ اور ہم
نے ان کو بارہ خاندانوں اور بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا، اور جب موسیٰ کی قوم اس سے پانی کی طلب گار
ہوئی تو ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو فلاں پتھر پر مارو؛ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر گروہ نے
اپنے پینے کی جگہ پہچان لی اور ہم نے ان پر بادلوں کو سایہ فگن کر دیا، نیز ہم نے ان پر ''مَن'' اور ''سَلْویٰ'' اُتارے
(اور ان سے کہا کہ) ہماری دی ہوئی روزی میں سے پاک چیزوں کو کھاؤ، انھوں نے (نافرمانی کر کے) ہمارا کوئی
نقصان نہیں کیا؛ بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے، ﴿۱۶۰﴾ اور جب ان سے کہا گیا: ''اِس شہر میں رہو، جہاں سے چاہو،
کھاؤ پیو اور (داخل ہوتے وقت) کہتے جانا: (اے اللہ!) ہمیں معاف کر دیجئے اور (تواضع کے ساتھ) جھکے ہوئے
دروازہ میں داخل ہونا، تو ہم تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیں گے اور جو لوگ بہتر عمل کریں گے، ان کو مزید اجر بھی
عطا فرمائیں گے''۔ ﴿۱۶۱﴾

← بعد جو شخص نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعویٰ پر ایمان لائے، وہ دراصل قرآن مجید کا انکار کر رہا ہے۔

﴿۲﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ قول کی اتباع یہ ہے کہ جو بات کہی گئی ہے، اس پر عمل کیا جائے اور فعل کی اتباع یہ ہے کہ جس کام کو آپ ﷺ نے کیا ہو، اسے کیا جائے اور جس سے آپ ﷺ نے اجتناب برتا ہو، اس سے بچا جائے؛ البتہ جن افعال کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، (مفاتیح الغیب: ۷/۳۱۵) جیسے آپ ﷺ پر تہجد کا فرض ہونا یا آپ ﷺ کے لئے چار سے زیادہ نکاح کا جائز ہونا —— جو لوگ حدیث کو حجت نہیں مانتے وہ دراصل قرآن کے اس حکم کا انکار کرتے ہیں اور وہ صرف مُنکرِ حدیث ہی نہیں ہیں؛ بلکہ مُنکرِ قرآن بھی ہیں۔

﴿۱﴾ یعنی یہود میں کچھ لوگ وہ بھی ہیں جن میں حق کو قبول کرنے کی استعداد ہے، وہ راہ حق کی رہبری بھی کرتے ہیں، جیسے وہ یہود جو آپ پر ایمان لائے، —— اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی گروہ میں کچھ برائی ہو اور وہاں کچھ اچھے لوگ بھی موجود ہوں تو اچھے لوگوں کی اچھائی کا بھی اعتراف کرنا چاہئے۔

فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَهُمۡ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ
ع ۲۰ ۱۰ بِمَا كَانُوۡا یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾ وَ سۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡیَةِ الَّتِیۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ ۘ اِذۡ یَعۡدُوۡنَ فِی
السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِیۡهِمۡ حِیۡتَانُهُمۡ یَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّ یَوۡمَ لَا یَسۡبِتُوۡنَ ۙ لَا تَاۡتِیۡهِمۡ
كَذٰلِكَ ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ وَ اِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمًا ۙ اللّٰهُ
مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰی رَبِّكُمۡ وَ لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا
نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖۤ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَ اَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۭ
بَـِٔیۡسٍۭ بِمَا كَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُهُوۡا عَنۡهُ قُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً
خٰسِـِٕیۡنَ ﴿۱۶۶﴾

وقف لازم

تو ظالموں نے ان کو جو کہنے کو کہا گیا تھا، اسے بدل کر رکھ دیا، لہٰذا ان کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے بھی ان پر آسمان سے عذاب بھیجا، ﴿۱﴾ ﴿۱۶۲﴾ اور اُن لوگوں سے اس شہر کے بارے میں دریافت کیجئے جو دریا کے کنارے تھا، جب یہ ’’ہفتہ‘‘ کے دن زیادتی کر رہے تھے؛ کیوں کہ مچھلیاں ہفتہ ہی کے دن اُن کے پاس پانی کے اوپر آجاتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہیں ہوتا تو مچھلیاں ان کے پاس نہیں آتی تھیں، ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اس طرح پر ہم ان کی آزمائش کرنے لگے، ﴿۱۶۳﴾ اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ ایسے لوگوں کو تم کیوں نصیحت کرتے ہو، جن کو اللہ ہلاک کر دینے والے یا سخت عذاب دینے والے ہیں؟ تو اُن لوگوں نے کہا: اپنے رب کے سامنے عذر کرنے کے لئے اور اس لئے کہ شاید ان میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے، ﴿۱۶۴﴾ پھر جب ان لوگوں نے اس نصیحت کو بھلا دیا، جو انھیں کی گئی تھی، تو جو لوگ برائی سے روک رہے تھے، ان کو تو ہم نے بچا لیا اور (لیکن) زیادتی کرنے والوں کو گناہوں کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے سخت عذاب میں پکڑ لیا؛ ﴿۱۶۵﴾ چنانچہ جس بات سے انھیں منع کیا گیا تھا، جب انھوں نے اس کے ماننے سے سرکشی اختیار کی تو ہم نے ان کو کہا: ذلیل بندر بن جاؤ۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۶۶﴾

﴿۱﴾ ان واقعات واحکام کا ذکر سورۂ بقرہ آیت نمبر: ۵۷-۶۰ میں آچکا ہے۔

﴿۲﴾ بنی اسرائیل اللہ کے حکم کو توڑتے ہوئے ہفتہ کے دن شکار کرنے اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر (بقرہ، آیت نمبر: ۶۵-۶۶) میں آچکا ہے؛ البتہ اس آیت میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف نافرمانی کرنے والوں کو عذاب میں مبتلا کیا؛ بلکہ جن لوگوں نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی، ان کو بھی عذاب میں شامل رکھا گیا؛ البتہ جن لوگوں نے اس گناہ سے روکنے کی کوشش کی، انھیں عذاب سے بچا لیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کے لئے صرف برائی سے رُک جانا کافی نہیں؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی طاقت بھر اس کو روکنے کی کوشش کرے؛ ورنہ وہ بھی مجرم اور اللہ کے عذاب کا مستحق ہے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ
وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ؗ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ فَخَلَفَ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ
يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ
اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب آپ کے رب نے بتادیا کہ ہم قیامت کے دن تک ضرور یہودیوں پر ایسے لوگوں کو مسلط رکھیں گے، جو ان پر بدترین عذاب ڈھائیں گے، بے شک آپ کے رب جلد ہی سزا دے دیتے ہیں، اور وہ معاف کرنے والے اور مہربان بھی ہیں، ﴿۱۶۷﴾ اور ہم نے ان کو روئے زمین میں ٹکریوں میں بانٹ دیا، جن میں بعض نیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور نہ کرنے والے بھی، ﴿۱﴾ اور ہم نے ان کو سُکھ سے بھی آزمایا ہے اور دُکھ سے بھی: تا کہ وہ (نافرمانیوں سے) باز آجائیں ﴿۱۶۸﴾ ان کے بعد ان کے جانشیں آئے، جو کتابِ الٰہی کے وارث ہوئے، وہ (احکام الٰہی کے عوض) اس حقیر دنیا کے اسباب لے لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا؛ حالاں کہ اگر انھیں (دوبارہ) اسی جیسا سامان پھر مل جائے، تو اسے بھی لے لیں گے، کیا ان سے کتاب میں وعدہ نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی طرف حق کے سوا کسی بات کی نسبت نہیں کریں گے، نیز کتاب الٰہی میں جو کچھ ہے، اسے انھوں نے پڑھ بھی لیا ہے، ﴿۲﴾ اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے زیادہ بہتر ہے، جو تقویٰ اختیار کریں، (پھر اے یہود!) کیا تم لوگ سمجھتے نہیں ہو۔ ﴿۱۶۹﴾

﴿۱﴾ اس میں یہودیوں کے بارے میں دو پیشین گوئیاں ہیں، ایک یہ کہ ان پر ہمیشہ ایسے لوگ مسلط رہیں گے، جو انھیں تکلیف دیں گے، دوسرے یہ کہ ان کی آبادیاں منتشر رہیں گی، انھیں ایک جگہ اکٹھا ہو کر رہنا نصیب نہیں ہوگا؛ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کا ایک وقفہ اس سے مستثنیٰ ہے، جس میں تمام یہود فلسطین میں جمع ہو جائیں گے اور انھیں غیر معمولی طاقت حاصل ہو جائے گی، اسی حالت میں دجال کا ظہور ہوگا، جو پورے علاقہ پر زور زبردستی سے قابض ہو جائے گا، بالآخر حضرت مسیح علیہ السلام آسمان سے اُتریں گے اور یہودیوں کا نام ونشان مٹ جائے گا، اِس وقت حکومت اسرائیل دراصل اسی تاریخی وقفہ کا حصہ ہے؛ اس لئے مملکت اسرائیل کا وجود قرآن وحدیث کی پیشین گوئی کے خلاف نہیں۔

﴿۲﴾ اس آیت میں یہودیوں کا ذکر ہے اور ان کا ایک خاص مزاج بتایا گیا ہے کہ ان میں دین وشریعت سے زیادہ مال واسباب کی محبت ہے؛ چنانچہ آج بھی ان کی یہ نفسیات دیکھی جاسکتی ہے، تورات میں سود، شراب اور زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے؛ لیکن یہودیوں نے پوری دنیا میں سودی نظام قائم کر رکھا ہے اور شراب وزنا کے کلب بنا رکھے ہیں، اس آیت میں مسلمانوں کے لئے بھی ←

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ اِذْ
نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ
وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ۲۱ ع ۹ ۱۱
وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ
بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور جولوگ اللہ کی کتاب کو تھامے رہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو بے شک ہم بہتر عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے، ﴿۱۷۰﴾ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب ہم نے ان کے اوپر اس طرح پہاڑ اُٹھا لئے کہ گویا سائبان ہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ (نہ ماننے کی صورت میں) یہ ان پر گر کر رہے گا (پھر اللہ نے کہا:) جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں، اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور اس میں جو تعلیمات ہیں، انھیں یاد رکھو، شاید تم (اللہ کے عذاب سے) بچ جاؤ، ﴿۱﴾ ﴿۱۷۱﴾ اور (یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ) جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے خود ان کے بارے میں اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں، ہم اقرار کرتے ہیں! (اللہ نے یہ اقرار اس لئے لیا) کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے، ﴿۱۷۲﴾ یا کہو کہ ہمارے باپ دادا پہلے سے شرک کر رہے تھے اور ہم تو ان کے بعد آنے والی نسل ہیں، تو کیا آپ ہمیں ان گمراہوں کے فعل کی وجہ سے ہلاک کر دیں گے؟ ﴿۲﴾ ﴿۱۷۳﴾ اور اسی طرح ہم وضاحت سے احکام کو بیان کرتے ہیں اور اس لئے بھی کہ وہ (حق کی طرف) واپس آجائیں۔ ﴿۱۷۴﴾

← تنبیہ ہے کہ حکم شرعی سے واقف ہو جانے کے باوجود اس کی خلاف ورزی اور بھی بڑا گناہ ہے اور یہ آیت علماء وفقہاء کے لئے بھی قابل توجہ ہے کہ شریعت کے احکام کے مقابلہ میں کسی فرد، جماعت یا گروہ کی پاسداری، ان کی غلطیوں کو صحیح قرار دینا اور ان کی کوتاہیوں کی طرف سے آنکھیں موند لینا اللہ کے نزدیک سخت پکڑ کا باعث ہے۔

﴿۱﴾ بنی اسرائیل سے متعلق اس واقعہ کا ذکر سورۂ بقرہ آیت نمبر: ۶۳ میں آچکا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا گیا؛ تا کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف ہی نہیں تھے؛ کیوں کہ ایک تو عالم ارواح میں تم سب سے اللہ تعالیٰ اپنے رب ہونے کا عہد لے چکے ہیں، دوسرے میرے رسول بھی تمہارے درمیان آچکے ہیں، اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا کیا قصور ہے، ہم تو بے خبر تھے؛ اس لئے اپنے آباء واجداد کے طریقۂ شرک کو اختیار کر لیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اوران کواس شخص کا حال بھی سنا دیجئے ،جس کو ہم نے اپنے احکام دیئے تھے ، پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا ، توشیطان اس کے پیچھے لگ گیا؛ چنانچہ وہ گمراہوں میں شامل ہوگیا ﴿۱۷۵﴾ اور اگر ہم چاہتے تو اِن آیتوں کی برکت سے اس کو بلندی عطا کرتے ؛لیکن وہ تو (خود ہی) پستی کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہش کی پیروی کرنے لگا، پس !اس کی مثال کتے کی سی ہے کہ اگراس پر بوجھ رکھو تب بھی ہانپے گا اور چھوڑ دو تب بھی ہانپتا رہے گا،یہی ان لوگوں کی مثال ہے، جنھوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا ہے،تو آپ اِن حالات کو بیان کر دیجئے ،شاید وہ فکر سے کام لیں، ﴿۱۷۶﴾ کیا ہی بدترین مثال ہے ان لوگوں کی ،جنھوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا ہے اور وہ اپنے آپ ہی کا نقصان کررہے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۷۷﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے،حضرت عبداللہ بن مسعوداور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے بقول اس شخص کا نام بَلْعَم بن باعوراء تھا،اس کی زبان سینہ تک لٹک آئی تھی ، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر یہ عذاب کیوں ہوا؟ اس سلسلہ میں کئی باتیں منقول ہیں،ایک یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے شاہِ مدیَن کی طرف ایمان کی دعوت دینے کو بھیجا تھا،شاہِ مدین نے دعوت تو قبول نہ کی ؛لیکن اس کے ساتھ خوب داد و دہش کا معاملہ کیا،اس سے متاثر ہوکر یہ شخص مرتد ہوگیا، دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ رشوت لے کر ان ظالم وجابر لوگوں کا حلیف بن گیا،جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام برسرِ جنگ تھے،اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفقاء کے خلاف بددُعاء کرنے لگا ، وہ جتنی بددُعاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے کرتا ، اس کی زبان پر اُلٹے الفاظ جاری ہوتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے خلاف بددُعاء کے الفاظ نکلتے ،اس کے بعد بطورِ عذاب سینہ تک اس کی زبان لٹک آئی ، جب اس نے دیکھا کہ دنیا وآخرت دونوں برباد ہوچکی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو ایک چال سکھائی کہ وہ بنی اسرائیل میں اپنی جوان لڑکیوں کو بھیجیں اور انھیں برائی کرنے کا موقع دیں؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو زنا حد درجہ ناپسند ہے؛اس لئے ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا اور وہ برباد کردیئے جائیں گے؛ چنانچہ یہی ہوا اور عذاب کے طور پر بنی اسرائیل میں پلیگ کی بیماری پیدا ہوئی اور ایک ہی دن میں ستر ہزار لوگ ہلاک ہوگئے ،اسی طرح کی بعض اور روایات بھی نقل کی گئی ہیں؛ (دیکھئے:تفسیر قرطبی: ۷/۳۰۹) لیکن ان سب میں مشترک یہ بات ہے کہ ایک شخص ہدایت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے بعد مرتد ہوگیا اور بطورِ عذاب اس کی زبان باہر آگئی؛ تاکہ ہر شخص اسے عبرت کی نظر سے دیکھے ، یقیناً اس میں سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ فکر مند رہنا چاہئے اور اپنے بارے میں مطمئن نہ ہوجانا چاہئے کہ نہ معلوم انسان کب ہدایت سے محروم ہوجائے؟ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔ (آل عمران: ۸) ←

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

جسے اللہ ہدایت دیں، وہی ہدایت پائے گا اور جسے ہدایت سے محروم کردیں، وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں، ﴿۱۷۸﴾ اور یقیناً ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جنات و انسان پیدا کئے ہیں، ان کے پاس دل ہیں؛ لیکن سمجھنے سے محروم، ان کی آنکھیں ہیں؛ مگر بینائی سے عاری، ان کے کان ہیں؛ مگر سننے سے قاصر، وہ چوپایہ کی طرح ہیں: بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے، ﴿۱﴾ درحقیقت یہی لوگ غفلت میں ہیں، ﴿۱۷۹﴾ اور اللہ کے بہترین نام ہیں، اللہ کو ان ہی ناموں سے پکارا کرو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اللہ کے نام میں کج روی اختیار کرتے ہیں، ﴿۲﴾ وہ اپنے کئے کی سزا ضرور پائیں گے۔ ﴿۱۸۰﴾

← چوں کہ اس شخص کی زبان باہر نکل آئی تھی؛ اس لئے اسے کتے سے تشبیہ دی گئی، انسان اور ہر جاندار کو سانس لینے اور سانس چھوڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ ہر لمحہ اس عمل کو کسی مشقت اور تکلیف کے بغیر انجام دیتا ہے؛ لیکن کتا اسی کام کو زبان باہر نکال کر مشقت کے ساتھ انجام دیتا ہے، یہی کیفیت اس شخص کی تھی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کتے کی مثال دی۔

﴿۱﴾ یعنی جو لوگ ایمان و ہدایت سے محروم ہیں، ان کو اللہ نے حق کو سمجھنے، حق کی دلیلوں کو دیکھنے اور انھیں سننے کی پوری صلاحیت دی ہے؛ لیکن وہ قصداً اِن سے فائدہ نہیں اُٹھاتے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان سے محروم رکھا ہے، یہ محروم رکھنا اللہ کی طرف سے ظلم نہیں ہے؛ بلکہ خود ان کے عمل کی سزا ہے؛ گویا ان کی مثال بے عقل جانوروں کی ہے؛ لیکن انجام کے اعتبار سے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں؛ کیوں کہ جانور شرعی احکام کے مکلف اور پابند نہیں ہیں؛ اس لئے آخرت میں ان کی پکڑ نہیں ہوگی اور انسان کو تو آخرت میں بھی اپنی نافرمانی کی سزا ملے گی۔

﴿۲﴾ اس آیت میں ایک بات تو یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے 'اسماء حسنیٰ' یعنی بہترین نام ہیں، اس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے علاوہ تین اور مقامات پر آیا ہے: اسراء: ۱۱۰، طٰہٰ: ۸، حشر: ۲۴ —— ظاہر ہے کہ اس سے مراد معنی کے اعتبار سے ناموں کا بہتر اور اللہ کے شایانِ شان ہونا ہے کہ ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کا اظہار ہو رہا ہو اور بقول علامہ رازی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کمال کی بنیاد دو باتیں ہیں: ایک یہ کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں، دوسرے یہ کہ تمام چیزیں اللہ کی محتاج ہیں، (مفاتیح الغیب: ۳۶۷/۷) اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا ذکر حدیثوں میں بھی ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں، جو ان تمام ناموں کو یاد کرلے، ←

ع ۲۲ ۱۲
وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَ اُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَ لَمْ
یَتَفَكَّرُوْا ؕ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸۴﴾

اور ہماری مخلوق میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو حق کی رہنمائی کرتے ہیں، اور اسی کے مطابق انصاف کرتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۸۱﴾
اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے، جسے وہ سمجھ بھی نہیں پائیں گے، ﴿۱۸۲﴾
اور (ابھی) میں انھیں مہلت دے رہا ہوں، بے شک میری تدبیر مضبوط ہے، ﴿۱۸۳﴾ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان
کے ساتھی (محمد رسول ﷺ) کو جنون نہیں ہے، وہ تو صرف واضح طور پر ڈرانے والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۸۴﴾

← وہ جنت میں داخل ہوگا ''إن للہ تسعة و تسعین إسماً مائةً إلا واحداً من أحصاھا دخل الجنة'' علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۷/۳۲۵) اب بعض حضرات کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اسماء مبارکہ 'توقیفی' ہیں، یعنی جو نام قرآن وحدیث میں آئے ہیں، ان ہی کے ذریعہ اللہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام محدود نہیں ہیں؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ احتیاط کی جائے اور پوری طرح تحقیق کے بغیر کوئی نام اللہ کے لئے استعمال نہ کیا جائے کہ مبادا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف نہ ہوجائے، یہی زیادہ صحیح ہے۔ (اس حقیر نے اپنی تالیف ''قاموس الفقہ'' میں لفظ ''اللہ'' کے تحت اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے)

اس آیت میں دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ کے ناموں کے ذریعہ اللہ سے دُعاء کی جائے، یعنی جس بات کی دُعاء کرنی ہو، اس کے مطابق نام لیا جائے، جیسے کہا جائے: اے رحیم! مجھ پر رحم کیجئے، اے رزاق! مجھے رزق عطا کیجئے، (تفسیر قرطبی: ۷/۳۲۷) —— تیسری بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں 'الحاد' یعنی کجروی نہ کی جائے، اس کج روی کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ غیر اللہ کو اللہ کا نام دیا جائے، جیسے ہندو حضرات بعض دیوتاؤں کو رزاق قرار دیتے ہیں، یا جیسے زمانۂ جاہلیت میں ایک بت کو ''لات'' کہا جاتا تھا اور وہ کہتے تھے کہ یہ ''الٰہ'' یعنی خدا کی مؤنث ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کو ایسا نام دیا جائے جو اس کی شان کے خلاف ہے، جیسا کہ عیسائی حضرات اللہ کو 'باپ' کہتے ہیں، تیسرے: اللہ کو ایسے نام سے یاد کیا جائے، جس کے معنی کی تحقیق نہ ہو؛ کیوں کہ اس میں غلطی اور بے ادبی کا پورا امکان ہے، (مفاتیح الغیب: ۷/۳۷۵) آج کل بہت سے لوگ عبدالرحمٰن، عبدالرزاق نامی لوگوں کو رحمٰن، رزاق کے نام سے پکارنے لگتے ہیں، یہ قطعاً جائز نہیں؛ بلکہ ایسا کرنا گناہ ہے۔

﴿۱﴾ اس سے مراد اُمت محمدیہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اُترنے تک بھی میری اُمت کا ایک گروہ حق پر قائم رہے گا، (مفاتیح الغیب: ۷/۳۷۷) اس سے معلوم ہوا کہ اس اُمت میں حق پر قائم رہنے والی ایک جماعت کا تسلسل رہے گا اور یہ اُمت کبھی ایسے لوگوں سے بانجھ نہیں ہوگی، بعض لوگ اس طرح اصلاح کا جھنڈا بلند کرتے ہیں کہ ''گویا پوری اُمت دین وشریعت کو سمجھنے سے قاصر رہی اور پہلی بار انھوں نے اس کی حقیقت کو سمجھا ہے'' یہ غلط ہے۔

﴿۲﴾ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ پر تو کوئی انگلی اُٹھا نہیں سکتا تھا؛ اس لئے بعض کفار مکہ آپ کو مجنون یعنی دیوانہ کہتے تھے؛ ←

اَوَ لَمۡ يَنۡظُرُوۡا فِىۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ ۙ وَّ اَنۡ عَسٰٓى اَنۡ
يَّكُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ‌ ۚ فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَهٗ يُؤۡمِنُوۡنَ ۞۱۸۵ مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ‌ ؕ
وَ يَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۞۱۸۶ يَسۡـَٔـلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰٮهَا‌ ؕ قُلۡ اِنَّمَا
عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ‌ ۚ لَا يُجَلِّيۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ‌ ؔ‌ۚ ثَقُلَتۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ لَا تَاۡتِيۡكُمۡ اِلَّا
بَغۡتَةً‌ ؕ يَسۡـَٔـلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا‌ ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَ لٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا
يَعۡلَمُوۡنَ ۞۱۸۷ قُلْ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ‌ ؕ وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ
لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ ‌ۛۚ وَمَا مَسَّنِىَ السُّۤوۡءُ‌ ۛۚ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۞۱۸۸ ع ۲۳/۱۳

وقف لازم

کیا وہ آسمانوں میں، زمین میں اور اللہ نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اس میں غور نہیں کرتے؟ اور نہ اس بارے میں کہ شاید ان کی موت قریب آ گئی ہو، تو پھر وہ اس کے بعد کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ ۞۱۸۵ جسے اللہ ہدایت نہ دے، اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور اللہ اُن کو چھوڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں ۞۱۸۶ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کب واقع ہوگی؟ آپ کہہ دیجئے: ''اس کا علم تو میرے رب کو ہے، اپنے وقت پر وہی اس کو ظاہر کرے گا، وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا، پس وہ تم پر اچانک ہی آ جائے گی'' لوگ آپ سے اس طرح دریافت کرتے ہیں کہ گویا آپ اس سے واقف ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے: لیکن زیادہ تر لوگ سمجھتے نہیں ہیں، ﴿۱﴾ ۞۱۸۷ آپ کہہ دیجئے: میں تو اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے، اور اگر میں غیب کی باتوں سے واقف ہوتا تو بہت سی فائدہ کی چیزیں جمع کر لیا کرتا اور مجھے کوئی ناپسندیدہ بات پیش نہیں آتی، ﴿۲﴾ میں تو صرف (اللہ سے) ڈرانے والا اور ایمان لانے والوں کے لئے خوشخبری دینے والا ہوں۔ ۞۱۸۸

← کیوں کہ یہ ایک بیماری ہے، لوگوں کا اس پر یقین کرنا آسان تھا، اللہ تعالیٰ نے اسی کی تردید فرمائی —— اس میں موجودہ دور کے دشمنانِ اسلام کا بھی رد ہے، جو رسول اللہ ﷺ پر نزولِ وحی کی کیفیت کو ذہنی بیماری قرار دیتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے اور نہ آپ اس بات سے واقف تھے کہ قیامت کب آئے گی؛ البتہ آپ ﷺ نے قیامت کے قریب ہونے کی کچھ علامتیں بتائی ہیں، جن کا حدیثوں میں ذکر آیا ہے۔

﴿۲﴾ یہ اسی بات کی مزید تاکید ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں، اگر ایسا ہوتا تو آپ کبھی شکست اور نقصان سے دوچار نہ ہوتے اور ہر معاملہ میں فائدہ کے پہلو کو حاصل کر لیتے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا
حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا
لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ
عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾ اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ
نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ
عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ
اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

وہی اللہ ہے، جس نے تمہیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا (یعنی حوا کو) بنایا؛ تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے، پھر (اولاد آدم کا حال یہ ہوا کہ) جب مرد اپنی بیوی سے ہم آغوش ہوا تو بیوی کو حمل ٹھہر گیا، ہلکا سا حمل، وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہی، پھر جب بوجھل ہوگئی تو دونوں نے اللہ سے —— جو دونوں کا رب ہے —— دُعاء کی کہ اگر آپ ہمیں صحیح سالم فرزند عطا فرمائیں گے تو ہم شکرگزار رہوں گے ﴿۱۸۹﴾ پھر جب اللہ نے میاں بیوی کو صحیح وتندرست اولاد عطا فرما دی تو دونوں نے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت میں اللہ کے شریک ٹھہرا لئے، پس وہ لوگ جسے اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ اس سے بلند وبرتر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۹۰﴾ کیا وہ ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں، جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے: بلکہ وہ خود پیدا کئے ہوئے ہیں، ﴿۱۹۱﴾ نہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اگر تم انھیں راستہ کی طرف بلاؤ تو تمہاری بات سن نہیں سکیں گے، تمہارے لئے برابر ہے، چاہے تم انھیں پکارو یا خاموش رہو، ﴿۱۹۳﴾ (اے ایمان نہ لانے والو!) اللہ کے سوا تم جنھیں بلاتے ہو، وہ تو تمہاری ہی طرح اللہ کے بندے ہیں، انھیں پکارو تو سہی، اگر تم سچے ہو تو ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہئے۔ ﴿۱۹۴﴾

﴿۱﴾ اس آیت کی ابتداء میں حضرت آدم وحواء علیہما السلام کا ذکر ہے، بعد میں ان کی ذریت کا؛ کہ حضرت آدم وحوا علیہما السلام نے تو اولاد کے حاصل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور ان کی اولاد کا حال یہ ہے کہ وہ اولاد کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، جیسے ان کا نام عبد شمس، احمد بخش، پیر بخش وغیرہ رکھتے ہیں، یہ حد درجہ اللہ کی نافرمانی ہے، بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ شیطان کے بہکانے پر حضرت حوا علیہا السلام نے اپنی اولاد کا نام ''عبد الحارث'' رکھا تھا اور ''حارث'' شیطان کا نام ہے؛ مگر یہ روایت معتبر نہیں ہے اور اسرائیلیات میں سے ہے، جو حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے شایانِ شان نہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۳۳۸/۷)

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۟ اَمْ
لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّۧ اللّٰهُ
الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۚۖ وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا
يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَ لَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ
وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ
الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ۚ

کیا ان کو پاؤں ہیں، جن سے وہ چلا کریں؟ یا ان کو ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑا کریں؟ یا ان کو آنکھیں ہیں، جن سے وہ دیکھ سکیں؟ یا انھیں کان ہیں، جن سے وہ سن سکیں؟؟ آپ فرما دیجئے: ’’اپنے شرکاء کو بلا لو، پھر میرے خلاف تدبیریں کرلو اور مجھے مہلت بھی نہ دو ﴿۱۹۵﴾ میرے نگہبان اللہ ہیں، جس نے کتاب اُتاری ہے اور وہی صالح بندوں کی نگہبانی کرتے ہیں، ﴿۱۹۶﴾ اور اس کے مقابلہ میں تم لوگ جن کو بلاتے ہو، نہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی، ﴿۱۹۷﴾ اگر تم ان کو راستہ کی طرف پکارو تو بھی نہ سنیں گے، تم ان کو دیکھو گے کہ گویا وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں؛ حالاں کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے‘‘ ﴿۱﴾ ﴿۱۹۸﴾ (اے رسول!) آپ عفو و درگذر سے کام لیجئے، بھلائی کا حکم دیجئے اور اِن نادانوں سے پہلو تہی اختیار کیجئے، ﴿۱۹۹﴾ اور اگر شیطان کا وسوسہ آپ کو اُکسا دے تو اللہ کی پناہ چاہئے، ﴿۲﴾ یقیناً اللہ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں ﴿۲۰۰﴾ بے شک جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں، جب ان کو کوئی شیطانی وسوسہ چھو لیتا ہے، تو وہ چونک جاتے ہیں، پھر اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۰۱﴾

﴿۱﴾ یعنی شرک ایسی نامعقول بات ہے، جس کا غلط ہونا بالکل واضح ہے اور اگر انسان عقل سے کام لے تو ہرگز توحید کے مقابلہ شرک کو قبول نہ کرے۔

﴿۲﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اخلاقی خوبیوں کو جمع کر دیا ہے، اول یہ کہ عفو و درگذر سے کام لیجئے، دوسرے: لوگوں کا سلوک خواہ کیسا بھی ہو، آپ بھلائی کا حکم دیتے رہیں، تیسرے: جو لوگ نادانی اور زیادتی سے کام لیں، ان سے اُلجھنے کی بجائے درگذر کریں، پھر فرمایا گیا کہ اگر شیطان آپ کو غصہ دلانے کی کوشش کرے تو آپ اللہ کی پناہ چاہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو کسی بھی حال میں حسنِ اخلاق کا دامن چھوڑنا نہ چاہئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب غصہ آئے تو تعوذ (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھ لینا چاہئے، اس سے انشاء اللہ غصہ پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔

﴿۳﴾ گویا غلطی نیک لوگوں سے بھی ہوتی ہے اور برے لوگوں سے بھی؛ لیکن نیک انسان کی پہچان یہ ہے اس کو برائی کے بعد ←

وَ اِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴿۲۰۵﴾

اور جو شیاطین کے بھائی ہیں، شیاطین انھیں گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں، پھر وہ باز نہیں آتے، ﴿۲۰۲﴾ اور (اے رسول!) جب آپ ان کے سامنے (ان کا مطلوبہ) کوئی معجزہ نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ آپ یہ معجزہ کیوں نہیں لائے؟ آپ کہہ دیجئے: ''میرے رب کی طرف سے مجھ پر جو حکم اُتارا جاتا ہے، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں، یہ ایمان لانے والوں کے لئے تمہارے رب کی جانب سے دانائی کی باتیں، ہدایت اور رحمت ہے، ﴿۲۰۳﴾ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو؛ تا کہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱﴾ ﴿۲۰۴﴾ اور اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی کے ساتھ ڈرتے ہوئے دھیمی آواز میں یاد کرو، صبح کو بھی اور شام کو بھی، نیز غفلت برتنے والے لوگوں میں نہ ہو جاؤ۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۰۵﴾

← توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور برے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی میں آگے ہی بڑھتا چلا جائے اور اپنے گناہوں پر کوئی ندامت اور شرمساری نہ ہو، اگر کوئی انسان ایسی بے توفیقی میں مبتلا ہو جائے تو اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں اللہ کے پاس اس کا شمار کسی دوسرے زمرہ میں تو نہیں ہے۔

﴿۱﴾ قرآن کا ادب یہ ہے کہ جب کوئی شخص قرآن مجید کی تلاوت کرے تو دوسرے لوگ اسے توجہ سے سنیں، اس سے معلوم ہوا کہ بازاروں اور ایسی جگہوں میں —— جہاں لوگ مختلف کاموں میں مشغول ہوں —— زور زور سے قرآن مجید کی تلاوت کرنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ تلاوت کرنے والا قرآن مجید کی بے احترامی کا باعث بن رہا ہے، اسی طرح اگر تلاوت کی جارہی ہو اور حاضرین کو اس وقت کوئی دوسرا کام نہ ہو تو انھیں توجہ سے قرآن کو سننا چاہئے، اسی طرح قرآن خوانی کا مروجہ طریقہ کہ جس میں کئی لوگ ایک ساتھ قرآن مجید پڑھتے ہیں درست نہیں؛ کیوں کہ اس میں قرآن کے سننے کا جو حکم ہے اس پر عمل نہیں ہو پاتا —— متعدد روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اصل میں نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، خود اُمت کے سب سے بڑے مفسر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس کو نماز سے متعلق قرار دیا ہے، (دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۲/۱۸۰-۱۸۱) لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۂ فاتحہ یا کوئی اور سورت نہیں پڑھنی چاہئے۔ ←

الثالثۃ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَ لَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ع ۲۴ ۱۸ ۱۴

بے شک جو (فرشتے) تمہارے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے؛ بلکہ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اور اس کے سامنے سجدے بجالاتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۰۶﴾

← ﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے دُعاء اور ذکر کا ادب معلوم ہوا کہ آہستہ دُعاء کرنا اور آہستہ ذکر کرنا افضل ہے، آج کل ہندوپاک کی بہت سی مسجدوں میں نمازوں کے بعد زور زور سے دُعاء کرنے؛ بلکہ دُعاء کی کو قرآن کی تلاوت کے انداز پر پڑھنے کا جو رواج ہو گیا ہے، وہ مناسب نہیں ہے، اسی طرح آج کل اہلِ خانقاہ کے یہاں ذکر جہری کا رواج بڑھتا جا رہا ہے؛ حالاں کہ بعض فقہاء نے تو ذکر جہری کو بدعت تک قرار دیا ہے (بزازیہ مع الہندیہ: ۳/ ۳۷۵) خود صوفیاء میں سلسلۂ نقشبندیہ کے لوگ ذکر جہری کے قائل نہیں ہیں اور جو لوگ اس کے قائل ہیں، وہ بھی ذکر سری کو افضل سمجھتے ہیں؛ اس لئے اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

﴿۱﴾ یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے رہتے ہیں، اس سے سجدہ کی اہمیت معلوم ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے، جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے (مسند احمد، عن ابی ہریرۃؓ: ۲/ ۴۲۱) البتہ نماز سے باہر دو ہی سجدے ہیں، آیاتِ سجدہ کی تلاوت پر یا ان کے سننے پر سجدہ، یا کسی خوشی کی بات پر سجدۂ شکر، اس کے علاوہ عبادت یا دُعاء کے لئے صرف سجدہ کرنا حنفیہ کے نزدیک درست نہیں؛ کیوں کہ حدیث سے ایسا سجدہ ثابت نہیں؛ اس لئے زیادہ سجدے کرنے کی صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفل نمازیں پڑھی جائیں؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ سجدے کرنے کی سعادت حاصل ہو جائے —— یہ قرآن مجید کی پہلی آیت سجدہ ہے اور اس کے آیت سجدہ ہونے پر اُمت کا اجماع واتفاق ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۲۸۲) رہ گئے سجدۂ تلاوت سے متعلق فقہی احکام، تو ان کی تفصیلات کتبِ فقہ میں مذکور ہیں، ان سے رُجوع کرنا چاہئے۔

سُورَةُ الأَنفَال

- سورہ نمبر : (۸)
- رکوع : (۱۰)
- آیتیں : (۷۵)
- نوعیت : مدنی

ترتیب کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی ساتویں سورت ہے، یہ سورت پوری کی پوری مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے؛ اس لئے اس کا شمار مدنی سورتوں میں ہے، اگرچہ اس کی کچھ آیات کو بعض اہل علم نے مکی قرار دیا ہے، مگر جمہور کے نزدیک اس پوری سورت کا مدنی ہونا زیادہ درست ہے۔

یہ سورت غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ سورۂ بقرہ کے بعد سورۂ انفال نازل کی گئی ہے؛ لیکن اگر مضامین پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی بعض آیات مدنی زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں اور بعض آخری زمانے سے؛ اس لئے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سورۂ بقرہ کے نازل ہونے کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی درمیان میں سورۂ انفال کا نزول ہوا۔

''نفل'' جہاد میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کو کہتے ہیں، اسی کی جمع ''انفال'' ہے، پیغمبر اسلام ﷺ سے بعض حضرات نے مالِ غنیمت کا مصرف دریافت کیا تھا، سورہ کی ابتداء اسی سوال کے جواب اور اسی مسئلہ کی وضاحت سے ہوئی ہے؛ اسی لئے اس سورت کا نام ''انفال'' ہے۔

سورۂ انفال کا مرکزی مضمون 'جہاد' ہے، اس سورت میں غزوۂ بدر کے واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور صحابہ کے واسطے سے قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ فتح و کامیابی تمہاری قوت بازو اور مادی وسائل کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ اس کا تعلق اللہ کی مدد اور غیبی نصرت سے ہے: ''وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' (الأنفال:۱۰) مسلمانوں کی فتح وشکست کے سلسلہ میں قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے، اس سورہ میں اسلام کے قانون جنگ کو بیان کیا گیا ہے، مال غنیمت کی تقسیم کے احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے، مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی فوجی تیاری کا اہتمام کریں اور اس میں غفلت سے کام نہ لیں: ''وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ'' (الأنفال:۶۰) غیر مسلم اقوام کے سلسلہ میں یہ بنیادی اصول بتایا گیا ہے کہ جنگ پر صلح کو ترجیح دی جائے: ''وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا'' (الأنفال:۶۱) نیز کسی قوم سے جو عہد و پیماں ہو، اس کو ضرور پورا کرنے کی کوشش کی جائے: ''وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ'' (الأنفال:۷۲) اس سورت میں غیر مسلموں کی اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں بنیادی نفسیات کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک جسم بن کر رہنا چاہئے اور غیر مسلموں سے خیر خواہی کی اُمید نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

غرض یہ ایک اہم ترین سورت ہے، جو جنگ، امن، صلح، معاہدات اور مسلمانوں و غیر مسلموں کے درمیان تعلقات سے متعلق اسلام کے بنیادی تصورات کو واضح کرتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ①

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ○ لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: مالِ غنیمت اللہ اور رسول کا ہے؛ اس لئے اللہ سے ڈرو اور آپسی تعلقات کو بہتر رکھو، نیز اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانتے رہو، اگر واقعی ایمان رکھتے ہو۔ ﴿۱﴾ ①

﴿۱﴾ اصل سے زائد جو چیز ہو، اسے ''نَفَل'' کہتے ہیں؛ اسی لئے فرائض کے علاوہ جو عبادت کی جاتی ہے، اس کو 'نوافل' کہا جاتا ہے، پہلی اُمتوں پر جنگ میں حاصل ہونے والا مال حرام تھا، اُمت محمدیہ کے لئے اس کو حلال قرار دیا گیا، گویا یہ ایک زائد آمدنی ہے، جو مسلمانوں کو عنایت کی گئی؛ اسی لئے اس کو ''نَفَل'' کہتے ہیں، جس کی جمع ''انفال'' ہے (مفاتیح الغیب: ۷/۴۲۹) اس کو مال غنیمت بھی کہا جاتا ہے، اسلام سے پہلے دنیا میں جو حکومتیں قائم تھیں، ان میں مالِ غنیمت کو بادشاہ کا حق سمجھا جاتا تھا، عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں لڑتے تھے، وہی مال غنیمت کے حقدار سمجھے جاتے تھے؛ چنانچہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو مالِ غنیمت کے حقدار ہونے کے سلسلہ میں تھوڑا سا اختلاف ہوگیا، مدینہ مردوں سے بالکل خالی نہ ہوجائے، اس لئے اور بعض دوسری مصلحتوں کی وجہ سے آپ ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بہ شمول —— جو اپنی بیوی صاحبزادیِ رسول (حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا) کی تیمارداری کررہے تھے، (البدایۃ والنہایۃ: ۳/۳۰۳) —— تین مہاجرین کو اور پانچ انصار کو مدینہ میں چھوڑ دیا، جو لوگ جنگ میں شریک ہوئے، ان کی سوچ یہ تھی کہ ان حضرات کو مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ملنا چاہئے؛ کیوں کہ یہ عملی طور پر جنگ میں شریک نہیں ہوئے، اسی طرح میدانِ جنگ میں بھی یہ ہوا کہ جوان حضرات کو اگلی صفوں میں رکھا گیا؛ تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرسکیں اور معمر حضرات پیچھے رسول اللہ ﷺ کے گرد وپیش رہے، جس کا مقصد آپ ﷺ کی حفاظت بھی تھی، اب جوانوں کو خیال ہوا کہ چوں کہ ہم نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا؛ اس لئے مالِ غنیمت ہمارا حق ہے اور سن رسیدہ حضرات نے کہا کہ ہم پیچھے سے تمہارے لئے سہارا بنے ہوئے تھے، اگر خدانہ خواستہ تم کو شکست ہوتی تو تم ہماری ہی پناہ میں آتے؛ اس لئے مالِ غنیمت میں ہم کو بھی حصہ ملنا چاہئے، اسی پس منظر میں سورۂ انفال کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور فرمایا گیا کہ مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اللہ کا حکم چلے گا، رسول اللہ ﷺ حکم الٰہی کی ترجمانی کریں گے اور اس کے مطابق تقسیم فرمائیں گے، تمہاری ان دلیلوں کی بنا پر فیصلہ نہیں ہوگا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے تمام شرکاءِ جہاد کو برابر برابر حصہ دیا اور جن آٹھ افراد کو مدینہ میں رہنے کا حکم دیا تھا، ان کا بھی ان ہی کے برابر حصہ لگایا؛ کیوں کہ ان کو اس طرح روک دیا جانا بھی جنگی مصلحت ہی کے تحت تھا، (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۷/۴۳۱-۴۳۲، قرطبی: ۷/۳۶۱) پھر اللہ تعالیٰ نے اسی سورت کی آیت نمبر: ۴۱ میں مالِ غنیمت کے احکام کو بیان فرمادیا۔

←

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ
اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ كَمَاۤ
اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ
فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ
اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ
اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷

بے شک ایمان والے تو وہی لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، جب ان پر اللہ کے کلام کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ تو اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں ۝۲ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ عطا کیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۝۳ یہی لوگ در حقیقت ایمان والے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس بلند درجات ہیں، عفو و درگذر ہے اور عزت کی روزی ہے ۝۴ جیسا کہ تمہارے رب نے تم کو تمہارے گھر سے درست کام پر نکالا ہے؛ حالاں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ تو اسے ناپسند کر رہا تھا ۝۵ وہ حق ظاہر ہو جانے کے بعد بھی آپ سے اس کے بارے میں اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت ان کی نظروں کے سامنے ہے ۝۶ اور یاد کرو کہ اللہ تم سے دو میں سے ایک گروہ کا وعدہ کر رہے تھے کہ وہ تمہارے ہاتھ آئے گا اور تم چاہ رہے تھے کہ وہ گروہ تمہارے لئے ہو، جس میں کوئی تکلیف نہ ہو اور اللہ کو منظور تھا کہ اپنے فیصلوں کے ذریعہ حق کو ثابت کر دیں اور کفر کرنے والوں کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دیں۔ ﴿۱﴾ ۝۷

← نفل کی ایک اور صورت بھی مفسرین نے ذکر کی ہے اور وہ یہ ہے کہ مالِ غنیمت میں تو تمام مجاہدین برابر کے حقدار ہوتے ہیں؛ لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ امیر کسی خاص مہم پر خصوصی انعام کا اعلان کر دے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے بعض مواقع پر اعلان فرمایا کہ جو کسی دشمن فوجی کو قتل کرے تو اس مقتول کے بدن پر جو چیزیں ہوں، وہ اس کا حق ہے، اسی طرح کسی خاص دشوار مہم کے بارے میں بعض دفعہ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جو دستہ اس پر قابو پالے، اس کے لئے مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ خصوصی انعام کے طور پر ہوگا، وغیرہ، اس خصوصی انعام کو بھی ''نفل'' کہا جاتا ہے، اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کو خصوصی انعام کے اعلان کا حق حاصل ہے؛ کیوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔

﴿۱﴾ اس آیت میں غزوۂ بدر کی طرف اشارہ ہے، اصل میں قریش مکہ کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا، جس میں ←

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ
لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَئِنَّ
بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾ ع ۱۵

تا کہ اللہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دیں، گو اِن مجرموں کو یہ بات پسند نہ ہو ﴿۸﴾ (اے مسلمانو!) یاد کرو جب تم لوگ اپنے رب سے (مدد کی) التجا کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دُعا قبول کر لی کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا جو لگاتار آتے رہیں گے ﴿۹﴾ اللہ نے یہ صرف خوش کرنے اور مطمئن کرنے کے لئے فرمایا ﴿۱﴾ اور فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، بے شک وہ غالب اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۱۰﴾

← بہت سارا سرمایہ تھا، یہ چالیس افراد پر مشتمل تھا اور اہل مکہ مسلسل مدینہ سے مسلمانوں کو اُجاڑنے کی منصوبہ بندی بھی کر رہے تھے، جنگ میں مالی وسائل کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اس پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے محسوس کیا کہ اس قافلہ کو بڑھ کر روکنا ضروری ہے؛ تا کہ اہل مکہ اس دولت کا فوجی قوت اور مسلمانوں پر حملہ کے لئے استعمال نہ کریں؛ چنانچہ آپ ﷺ اپنے رفقاء کے ساتھ آگے بڑھے، ادھر اہل مکہ کو اور اس تجارتی قافلہ کو اس کی اطلاع ہوئی، قافلہ کو بچانے کے لئے ایک ہزار افراد پر مشتمل فوج مکہ سے روانہ ہوئی، دوسری طرف یہ تجارتی قافلہ ساحل سمندر کے راستے بچ کر نکل گیا، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائیں گے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا، کچھ لوگوں کی خواہش تھی کہ ہم چوں کہ تعداد میں بھی کم ہیں اور اسلحہ وسواری کی بھی بہت کمی ہے؛ اس لئے ہمیں بڑی فوج سے مقابلہ نہیں کرنا چاہئے، یہ حضرات تجارتی قافلہ سے مقابلہ چاہتے تھے؛ لیکن جب آپ ﷺ نے جہاد کی دعوت دی تو اکابر صحابہ حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم وغیرہ نے عہد کیا کہ وہ پوری بہادری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کریں گے؛ چنانچہ آپ ﷺ بدر کے میدان میں پہنچے، جہاں پہلے سے مشرکین مکہ پہنچ چکے تھے، ان آیات میں اسی کا تذکرہ ہے کہ جیسے تم تجارتی قافلہ سے مقابلہ چاہتے تھے اور اس بڑی فوج سے مقابلہ کرنا تمہیں ناگوار تھا؛ لیکن مصلحت یہ تھی کہ انہیں سے تمہارا مقابلہ ہو؛ تا کہ اہل مکہ پر اسلام کی دھاک بیٹھ جائے، ان کے بڑے بڑے سرغنے ہلاک کر دیئے جائیں اور ان کی جڑیں کٹ کر رہ جائیں، اسی طرح مالِ غنیمت کے سلسلہ میں بھی ان میں سے بعض لوگوں کی خواہش یہ ہے کہ وہ صرف تم پر تقسیم کر دیا جائے؛ لیکن اللہ کا فیصلہ یہ ہے اور اسی میں تمہارے لئے دنیا وآخرت کا فائدہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ جیسے چاہیں تقسیم فرمائیں۔

﴿۱﴾ اس کا ذکر ''آل عمران'' کی آیت نمبر: ۱۲۴ تا ۱۲۵ میں آچکا ہے، اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں فرشتوں سے جو مدد فرمائی، اس کا مقصد مسلمانوں کی تسلی تھی کہ وہ گھبرائیں نہیں، عملاً یہ سارے فرشتے جنگ میں شریک نہیں ہوئے؛ کیوں کہ اگر یہ سب جنگ میں شریک ہوتے تو دشمن کا ایک فرد بھی بچ کر واپس نہ جا سکتا تھا، بعض احادیث میں جو اکا دکا واقعات آئے ہیں کہ کسی اَن دیکھی قوت نے کسی مشرک کو ہلاک کر دیا تو ممکن ہے اس کا مقصد فرشتوں کی مدد مسلمانوں پر ظاہر کرنا ہو؛ تا کہ انھیں اطمینان ہو جائے کہ ←

اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمۡ بِہٖ
وَیُذۡہِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَ لِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَ یُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ ﴿۱۱﴾ اِذۡ یُوۡحِیۡ
رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا
الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَ اضۡرِبُوۡا مِنۡہُمۡ کُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ
وَرَسُوۡلَہٗ ۚ وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِکُمۡ فَذُوۡقُوۡہُ وَ اَنَّ
لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے سکون کے لئے اونگھ طاری کر رہے تھے، اور تم پر بارش برسا رہے تھے؛ تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں پاک کر دیں، تم سے شیطان کی وسوسہ اندازی دور کر دیں، تمہارے دلوں کو مضبوط کر دیں، اور اس کے ذریعہ تمہارے قدم جمائے رکھیں ﴿۱﴾ ﴿۱۱﴾ (اے رسول!) یاد کیجئے جب آپ کے رب فرشتوں کو حکم دے رہے تھے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں؛ اس لئے ایمان لانے والوں کو ثابت قدم رکھو، میں جلد ہی کفر کرنے والوں کے دلوں میں رُعب ڈال دوں گا؛ لہٰذا (اے مسلمانو!) تم (جنگ پر آمادہ فوجیوں کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ ﴿۲﴾ ﴿۱۲﴾ یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے (وہ یاد رکھے کہ) یقیناً اللہ بھی سخت سزا دینے والے ہیں ﴿۱۳﴾ تو (اب) اسے چکھو اور کفر کرنے والوں کے لئے (اس کے علاوہ) دوزخ کا عذاب بھی ہے۔ ﴿۱۴﴾

← اللہ تعالیٰ نے جس بات کا وعدہ فرمایا تھا، وہ ظہور میں آچکا ہے اور اس طرح اللہ کی مشیت سے چند فرشتوں نے محدود طریقہ پر جہاد میں شرکت کی ہو۔

﴿۱﴾ مشرکین مکہ چوں کہ پہلے بدر کے میدان میں پہنچے تھے؛ اس لئے وہ اس جگہ مقیم ہوئے جہاں کی مٹی بیٹھی اور جمی ہوئی تھی اور وہ پانی کے چشمہ پر بھی قابض ہو گئے، مسلمان بعد میں پہنچے، ان کے حصہ میں ریتیلی زمین آئی، جس میں پاؤں دھنس جاتے تھے اور ان کی طرف پانی بھی میسر نہ تھا، جس سے پیاس بجھاتے اور دوسری ضروریات پوری کرتے، اللہ کی طرف سے ایسا نظام ہوا کہ بارش ہو گئی، ریتیلی زمین بیٹھ گئی اور ریت کی آڑ بنا بنا کر پانی محفوظ کر لئے گئے، جب کہ مشرکین مکہ کی طرف زمین میں کیچڑ ہو گیا، اس طرح جو جگہ ناموافق تھی، وہی مسلمانوں کے لئے زیادہ بہتر ثابت ہوئی، دوسرا انعام یہ ہوا کہ مسلمانوں پر اونگھ طاری کر دی گئی، نیند فطری طور پر تکان کو دور کرتی ہے اور انسان کو تازہ دم کر دیتی ہے، اس طرح مسلمانوں کو فرشتوں کو بھیج کر، نیند طاری کر کے اور بارش برسا کر تینوں پہلوؤں سے راحت پہنچائی گئی۔

﴿۲﴾ یعنی پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کریں، پھر مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ دشمنوں پر وار ←

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ
اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

اے ایمان والو! جب کافروں کے لشکر سے تمہارا سامنا ہو تو انہیں پشت نہ دیکھاؤ ﴿۱۵﴾ اور جو اس دن انھیں پیٹھ دیکھائے گا، سوائے اس کے کہ جنگ کی تدبیر کے طور پر ہو یا اپنی فوج سے آملنے کے لئے ہو تو وہ اللہ کا غضب لے کر واپس ہوگا، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کیا ہی بُری جگہ ہے! ﴿۱﴾ ﴿۱۶﴾ پس، (درحقیقت) ان کو تم لوگوں نے قتل نہیں کیا؛ بلکہ انہیں اللہ ہی نے قتل کیا ہے اور جب آپ ان پر مشتِ خاک پھینک رہے تھے تو آپ نہیں پھینک رہے تھے؛ بلکہ اللہ پھینک رہے تھے اور (یہ مڈبھیڑ اس لئے ہوئی کہ) اللہ مسلمانوں کو اپنی بارگاہ سے اچھا انعام عطا فرمائیں، ﴿۲﴾ بے شک اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۱۷﴾ یہ تو ہو چکا اور یقیناً (اب) اللہ کفر کرنے والوں کی سازش کو کمزور کردیں گے۔ ﴿۱۸﴾

← کریں، علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دیا ہے، (مفاتیح الغیب: ۷/۴۵۸) دوسری رائے ہے کہ یہ حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا۔

﴿۱﴾ جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے بھاگ کھڑا ہونا گناہ کبیرہ ہے، حدیث میں بھی کثرت سے اس کے بارے میں وعید آئی ہے؛ کیوں کہ کسی فوج کا یہ عمل دوسرے فوجیوں کو بھی کم حوصلہ بنا دیتا ہے اور اس طرح یہ بات اجتماعی شکست کا باعث بنتی ہے؛ البتہ اگر جنگی تدبیر کے طور پر فوج پیچھے ہٹالی جائے یا کوئی فوجی ٹکڑی چاروں طرف سے دشمنوں سے گھر جائے اور جنگی مصلحت کے تحت ہتھیار ڈال دے؛ تاکہ اگر یہ فوجی زندہ بچ جائیں تو آئندہ جنگ میں حصہ لے سکیں گے یا اس لئے پیچھے ہٹے کہ فوج کے بڑے حصہ کے ساتھ مل کر یلغار کریں گے تو یہ جائز ہے —— ''متحرفا لقتال'' یعنی ''جنگ کی تدبیر کے طور پر پیچھے ہٹنے کا عمل ہو'' میں بڑی وسعت ہے، یہ تدبیر ہر زمانہ میں اس زمانہ کے وسائل اور حالات کے اعتبار سے ہوگی۔

﴿۲﴾ غزوۂ بدر کے موقع سے رسول اللہ ﷺ نے مشت خاک لی اور مشرکینِ مکہ کی طرف ''شاہت الوجوہ'' کہتے ہوئے پھینک دی، بعض روایات میں صرف ایک کا ذکر ہے اور بعض میں تین کا کہ ایک مٹھی دائیں جانب کے دستہ پر پھینکی، ایک بائیں جانب کے دستہ پر اور ایک سامنے کی جانب، اللہ کی قدرت سے یہ خاک مشرکین مکہ کی آنکھوں میں جا پڑی اور مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ مغلوب ہوگئے، (تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۹۲) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی کا تذکرہ فرمایا ہے اور ارشاد ہے کہ اصل میں یہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے پھینکا اور اللہ ہی نے اس خاک کو تمام مشرکین تک پہنچا دیا۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ
وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ ع ۲ ۹ ۱۶
اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
قَالُوْا سَمِعْنَا وَ هُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا
يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

(اے ایمان نہ لانے والو!) اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو فیصلہ تو تمہارے سامنے آچکا ہے (اب بھی) باز آجاؤ تو یہ
تمہارے ہی حق میں بہتر ہے اور اگر پھر وہی حرکت کرو گے تو ہم بھی وہی جواب دیں گے اور تمہارا جتھا تم کو کچھ کام
نہ آسکے گا، چاہے کتنا ہی زیادہ ہو (اس لئے کہ) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۹﴾ اے
ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو اور سننے کے باوجود اس سے منہ نہ موڑو ﴿۲۰﴾ نیز ان لوگوں کی
طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے تو ہیں کہ ہم نے سن لیا؛ لیکن (حقیقت میں) وہ سنتے نہیں ہیں، ﴿۲۱﴾ بے شک اللہ کے نزدیک
بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں، جو بہرے بھی ہیں، گونگے بھی (اور) ذرا نہیں سمجھتے ﴿۲۲﴾ اور اگر اللہ ان میں کچھ بھی خوبی
دیکھتے تو انھیں سننے کی توفیق عطا فرماتے اور اگر ان کو سنا بھی دیں تو وہ ضرور منہ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۳﴾

﴿۱﴾ اہل مکہ جب غزوۂ بدر کے لئے نکلے تو انھوں نے غلافِ کعبہ پکڑ کر دعاء کی کہ اے اللہ! دونوں فوجوں میں سے جو بہتر ہو، جو ہدایت یافتہ ہو، جو زیادہ معزز گروہ ہو اور جو افضل دین پر ہو، اس کی مدد کیجئے، بعض روایتوں میں ہے کہ ابوجہل نے خاص بدر کے دن بھی دُعاء کی کہ جو دین بہتر ہو، اس کی مدد فرما اور جو قطع رحمی کرنے والا ہو، اس کو ہلاک کردے، اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کافروں سے خطاب فرماتے ہیں کہ تم حق کی فتح چاہ رہے تھے؛ گویا تم نے اس جنگ میں فتح کو حق وباطل کے لئے ترازو بنالیا تھا تو اب تو مسلمانوں کی فتح تمہارے سامنے آگئی؛ اس لئے تمہاری آنکھ کھل جانی چاہئے، اب بھی اگر تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ تو اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۷/۴۶۶، قرطبی: ۷/۳۸۶)

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے؛ لیکن یہ صلاحیت اسی وقت کام آتی ہے، جب کسی بات کو قبول کرنے کے جذبہ سے سنا جائے؛ مگر مشرکین مکہ کا حال یہ ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے، غور کرنے اور قبول کرنے کے لئے دین کی باتیں سنتے ہی نہیں ہیں؛ اس لئے یہ نتیجہ کے اعتبار سے گویا بہرے، گونگے اور عقل سے محروم لوگ ہیں؛ چوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے ارادۂ واختیار اور فکر ونظر کی صلاحیت کو صحیح طور پر استعمال نہیں کرتے؛ اس لئے اللہ بھی انہیں اس کی توفیق عنایت نہیں کرتے؛ یہاں تک کہ ان کی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر یہ سن بھی لیں تو پہلے سے جو ضد ان کے اندر ہے، اس کے تحت قبول نہ کریں، گویا اللہ نے ان کو ہدایت سے محروم نہیں کیا؛ بلکہ وہ اپنے اس طرزِ عمل کی وجہ سے بے توفیقی میں مبتلا ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی بات قبول کرو، جب کہ وہ تمہیں ایسے کام کی طرف بلاتے ہیں، جس میں تمہارے لئے زندگی کا سامان ہے ﴿۱﴾ اور یہ جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتے ہیں ﴿۲﴾ اور یہ بھی جان لو کہ تم لوگ اللہ ہی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ﴿۲۴﴾ اور اس وبال (الٰہی) سے بچو، جو تم میں سے خاص کر گناہ کرنے والوں ہی تک محدود نہیں رہے گا اور آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۵﴾

﴿۱﴾ اس سے مراد شریعت کے احکام ہیں، یعنی شریعت کے احکام انسان کے لئے خوش گوار زندگی، امن وعافیت اور آخرت کی فلاح کا ذریعہ ہیں، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ شریعت کے احکام نہ صرف آخرت کے لئے نجات کا باعث ہیں؛ بلکہ دنیوی زندگی میں بھی ان سے انسانیت کی فلاح وکامیابی متعلق ہے —— بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے جہاد مراد ہے، یعنی جہاد کے ذریعہ تمہارا تحفظ وبقاء ہے اور اگر اسی راستہ میں موت آجائے تب بھی ہمیشہ کی زندگی ہے؛ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس میں دین وشریعت کے تمام احکام شامل ہیں، (قرطبی: ۳۸۹/۷) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن مجید بھی حجت ہے اور حدیث رسول بھی؛ کیوں کہ اس آیت میں احکام نبوی کی تعمیل کا اسی طرح حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ احکام الٰہی کے بجالانے کا۔

﴿۲﴾ دنیا میں ایک طاقتور سے طاقتور انسان دوسرے انسان کی جان وتن پر قابو حاصل کرسکتا ہے؛ لیکن اس کے دل کو اپنے قبضہ میں نہیں لاسکتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کے دلوں کو بھی اپنے قابو میں رکھتے ہیں؛ اس لئے اللہ کی توفیق کے بغیر انسان کوئی اچھا کام نہیں کرسکتا اور اگر انسان اپنے ارادہ کا بُرے کاموں کے لئے استعمال کرے، تب بھی خدا کی مشیت ہی اس میں کارفرما ہوتی ہے، یہ اہل ایمان اور صالحین کے لئے بڑی تنبیہ ہے کہ کوئی شخص اپنی موجودہ کیفیت پر مطمئن نہ ہوجائے؛ بلکہ اللہ سے ڈرتا رہے اور دُعاء کرتا رہے کہ اے اللہ! ہدایت کے بعد گمراہی سے بچائے رکھئے: ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا''۔ (آل عمران: ۸)

﴿۳﴾ اس آیت میں گناہ سے روکنے کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی گروہ میں اللہ کی نافرمانی عام ہوجاتی ہے، کچھ لوگ خود اچھا عمل کرتے ہیں؛ لیکن برائی کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے؛ پھر اس گروہ پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو یہ عذاب گناہ کرنے والوں ہی تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ وہ لوگ بھی اس کی پکڑ میں آجاتے ہیں، جو خود تو گناہ سے بچتے ہیں؛ لیکن دوسروں کو اس سے روکنے کی کوشش نہیں کرتے؛ چنانچہ اُم المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے دریافت کیا: کیا ہمارے درمیان نیک لوگ رہیں گے، پھر بھی ہم ہلاک کردئے جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، یہ اس وقت ہوگا، جب برائی کی کثرت ہوجائے گی: ''نعم، إذا كثر الخبث'' (صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قصة يأجوج ومأجوج، حدیث نمبر: ۳۳۴۶، صحيح مسلم، كتاب الفتن وإشراط الساعة، باب اقتراب الفتن وفتح ردم يأجوج ومأجوج، حدیث نمبر: ۷۴۱۶) نیز امام بخاری رحمہ اللہ نے ←

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ
فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۷ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ
ع ۳/۹/۱۷ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۸

اور اس وقت کو یاد کرو جب تم کم تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں، پھر اللہ نے تمہارے لئے پناہ گاہ فراہم کی، اپنی مدد کے ذریعہ تم کو طاقت پہنچائی اور تم کو پاکیزہ کھانے کی چیزیں عطا کیں؛ تاکہ تم شکر ادا کرتے ہو ۝۲۶ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ تم جانتے بوجھتے اپنی امانتوں میں خیانت کرو ۝۲۷ جان لو کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد آزمائش کا ذریعہ ہیں اور یقیناً اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔ ﴿۱﴾ ۝۲۸

← حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ارشاد نبوی نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب بھیجتے ہیں تو قوم میں موجود تمام لوگوں پر بھیجتے ہیں؛ البتہ آخرت میں ان کے ساتھ ان کے اعمال کے لحاظ سے معاملہ ہوگا: ''ثم بعثوا على أعمالهم'' (صحیح البخاري، کتاب الفتن، باب إذا أنزل الله بقوم عذابا، حدیث نمبر: ۷۱۰۸، صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب الأمر بحسن الظن بالله تعالىٰ عند الموت، حدیث نمبر: ۷۴۱۵) اس سے معلوم ہوا کہ برائی سے بچنا کافی نہیں ہے، اِس سے روکنا بھی ضروری ہے۔

﴿۱﴾ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور پر انسان مال واولاد کی وجہ سے خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ مال واولاد تمہارے لئے امتحان ہیں، ایسا نہ ہو کہ تمہاری نظر میں مال واولاد کی اہمیت بڑھ جائے اور ان کے بچانے کے لئے تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کرو، یہ آیت ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہے، یہودیوں کے قبیلہ بنو قریظہ نے غزوۂ خندق میں مسلمانوں کے ساتھ کھلی ہوئی وعدہ خلافی کی اور پہلے سے طے شدہ معاہدہ کے برخلاف مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ دیا؛ اس لئے اس جنگ کے ختم ہونے کے بعد بنوقریظہ پر فوج کشی کی گئی، اِن کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور کسی طرح فتح نہ ہو پاتا تھا؛ لیکن جب محاصرہ طویل ہوگیا تو تنگ آکر وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ حَکَم کے ذریعہ فیصلہ ہوجائے، آپ ﷺ نے ان سے گفتگو کے لئے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا، بنوقریظہ نے ان سے مشورہ کیا کہ کیا ہم لوگ حضور ﷺ کو حَکَم مان لیں؟ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بچے وہیں تھے، انھوں نے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے گردن کی طرف اشارہ کیا، یعنی اگر تم نے حضور ﷺ کو حَکَم مان لیا تو سب کے سب ذبح کردئے جاؤ گے، بالآخر وہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حَکَم بنانے پر راضی ہوئے، حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے جوں ہی یہ بات کہی فوراً انھیں احساس ہوا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے؛ لہٰذا سیدھے مسجد نبوی گئے اور اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا کہ یا تو موت آجائے یا اللہ کی طرف سے توبہ قبول ہوجائے، اس وقت تک وہ کچھ چکھیں گے ←

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ
لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝۲۹ وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ
اَوْ یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ۝۳۰

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت تم کو عطا فرمائیں گے، ﴿۱﴾ تم سے تمہارے گناہ دور کردیں گے اور تم کو معاف کردیں گے، اللہ بڑے ہی فضل والے ہیں ۝۲۹ یاد کیجئے: جب آپ کے ساتھ کفر کرنے والے سازش کررہے تھے؛ تاکہ آپ کو گرفتار کرلیں یا قتل کردیں یا نکال باہر کریں، وہ اپنی سازش کررہے تھے اور اللہ بھی تدبیر فرمارہے تھے، اور اللہ ہی بہتر تدبیر کرنے والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۳۰

← بھی نہیں، نو دن اسی طرح گذر گئے، یہاں تک کہ بعض دفعہ غش کھا کر گر بھی پڑے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، صحابہ ﷡ نے ان کی رسی کھولنی چاہی تو کھلوانے سے انکار کردیا اور قسم کھالی کہ جب تک حضور ﷺ خود نہ کھولیں، میں اسی حال میں رہوں گا، بالآخر آپ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے انہیں کھول دیا، فرطِ مسرت میں حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں اپنا پورا مال صدقہ کرتا ہوں، آپ ﷺ ہر کام میں اعتدال کو پسند فرماتے تھے؛ اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک تہائی صدقہ کردو، یہ کافی ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۲/۳۰۰) بعض اور واقعات بھی اس آیت کے سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں، —— اس واقعہ سے صحابہ ﷡ کے دلوں کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے کہ اگر ان سے کوئی بھول چوک ہوجاتی تھی تو کس طرح دل و جان سے توبہ کرتے تھے اور غلطی انھیں تڑپاتی اور بے قرار کرتی تھی؛ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صحابہ ﷡ سے ہونے والی لغزشیں بھی اُمت کے لئے نمونہ ہیں۔

﴿۱﴾ ''فرقانا'' کا ترجمہ ''حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت'' سے اس لئے کیا گیا ہے کہ محمد ابن اسحاق نے اس کا معنی لکھا ہے: ''فصلاً بین الحق والباطل''، نیز اور مفسرین کا بھی اسی طرف رجحان ہے۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۷/۴۸۱، ابن کثیر: ۲/۳۰۲)

﴿۲﴾ اہل مکہ نے جب آپ ﷺ کو دعوتِ حق سے روکنے کی تمام تدبیریں کرلیں اور اس میں ناکام ہوگئے تو اخیر میں انہوں نے مکہ مکرمہ میں مشورہ کے لئے مخصوص جگہ —— جس کو ''دار الندوہ'' کہتے تھے —— میں جمع ہوئے اور آپ ﷺ کو روکنے کی مختلف صورتوں کے بارے میں مشورہ کیا، بعض نے کہا کہ آپ ﷺ کو قید کردیا جائے، بعض لوگوں کی رائے تھی کہ شہر بدر کردیا جائے؛ لیکن اخیر میں جس بات پر اتفاق ہوا، وہ یہ کہ آپ ﷺ کو قتل کردیا جائے اور قتل بھی اس طرح کہ اس میں ہر قبیلہ کا ایک ایک نمائندہ موجود ہو؛ تاکہ قتل کرنے والوں سے بدلہ نہ لیا جاسکے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس سے مطلع فرمایا، حکم خداوندی کے مطابق آپ ﷺ نے اپنے بستر پر حضرت علی ﷛ کو لٹا دیا اور ایک مشت خاک پھینکتے ہوئے باہر نکل آئے، گھر کا محاصرہ کئے ہوئے لوگوں کو کچھ پتہ بھی نہ چل سکا، سیرت کی کتابوں میں واقعہ کی تفصیل موجود ہے، —— اس آیت میں اسی کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ دشمنانِ اسلام کتنی بھی سازشیں کرلیں، اللہ کی تدبیر کے مقابلہ ان کی سازشیں ناکام و نامراد ہوکر رہیں گی۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ
السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ
مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں: ''ہم نے سن لیا، اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام کہہ سکتے ہیں، یہ تو محض پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں'' ﴿۱﴾ ﴿۳۱﴾ اور (اے رسول!) یاد کیجئے: جب وہ کہنے لگے: ''اے اللہ! اگر یہی آپ کے پاس سے (اُترنے والا) سچا کلام ہے تو ہم پر (نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر کی بارش برسا دیجئے، یا ہم پر کوئی بھی دردناک عذاب لے آیئے'' ﴿۳۲﴾ حالاں کہ اللہ ان کو اس وقت تک عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے، جب تک آپ ان میں موجود ہیں، نیز اللہ ان کو عذاب نہیں دیں گے، جب تک وہ مغفرت طلب کرتے رہیں ﴿۳۳﴾ اور اللہ ان کو کیوں نہ عذاب دیں؛ حالاں کہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں؛ باوجودیکہ یہ لوگ اس کے متولی نہیں ہیں، مسجد حرام کے متولی تو تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں؛ لیکن ان میں سے زیادہ تر لوگ اس سے واقف نہیں ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۴﴾

﴿۱﴾ مکہ میں ایک شخص نضر بن حارث نام کا تھا، یہ حیرہ کا سفر کرتا تھا، وہاں اس نے قیصر وکسریٰ کے اور بعض دوسرے بادشاہوں کے قصے سن رکھے تھے؛ چنانچہ جب قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات ذکر کئے جاتے تو وہ کہتا کہ یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، ایسی کہانیاں تو ہم بھی سنا سکتے ہیں، یہاں اسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۴۸۶/۷)

﴿۲﴾ ابوجہل کہا کرتا تھا کہ اگر تمہارا لایا ہوا دین حق ہے تو پھر ہم پر کیوں عذاب نہیں آجاتا؛ کہ آسمان سے پتھر برس جاتا یا کوئی اور عذاب آجاتا؟ (صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب في قوله تعالٰی وماكان الله ليعذبهم وأنت فيهم، حدیث نمبر: ۷۲۴۲)، اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب تک کسی آبادی کے اندر اللہ کا نبی موجود ہوتا ہے، اس پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ ان کے درمیان موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ پچھلی اقوام پر بھی عذاب نازل کئے جانے سے پہلے نبی کو حکم دیا گیا کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں، دوسرے: اللہ تعالیٰ کی ایک سنت یہ ہے کہ جب تک کسی آبادی میں استغفار کرنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں، اس آبادی پر اجتماعی عذاب نازل نہیں ہوتا اور یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں مسلمان بھی موجود ہیں، جو اللہ کے حضور مغفرت کی التجا کرتے رہتے ہیں، نیز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی مشرکین مکہ ''غفرانک غفرانک'' کہتے رہتے تھے، یعنی ''اے اللہ! ہمیں معاف کر دیجئے، اے اللہ! ہمیں معاف کر دیجئے'' (تفسیر قرطبی: ۳۹۹/۷) اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی سنت اور فیصلہ کی وجہ سے تم پر عذاب نازل نہیں کر رہے ہیں، ورنہ تم تو عذاب کے مستحق ہو ہی؛ اس لئے کہ تم اللہ کی عبادت کرنے والوں کو مسجد حرام سے روکتے ہو، جو کھلا ہوا ظلم ہے؛ کیوں کہ وہ مسجدِ حرام کے زیادہ مستحق ہیں ←

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

ع ۴ ۹ ۱۸

اور بیت اللہ کے پاس ان کی عبادت تو محض تالیاں پیٹنا اور شور مچانا تھا (اللہ قیامت میں کہیں گے:) تو اب اپنے کفر کرنے کا مزا چکھو، ﴿۳۵﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اپنے مال اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے خرچ کرتے ہیں تو وہ ابھی خرچ کرتے ہی رہیں گے، پھر ان کے لئے یہی حسرت وافسوس کا باعث ہوگا اور آخر وہ مغلوب ہوکر ہی رہیں گے ﴿۱﴾ اور جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے، وہ دوزخ کی طرف جمع کئے جائیں گے؛ ﴿۳۶﴾ تاکہ اللہ ناپاک لوگوں کو پاک لوگوں سے الگ کردیں، نیز ناپاک لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کردیں، ان سب کو ملا دیں، پھر اکٹھا ان کو دوزخ میں ڈال دیں، یہی لوگ حقیقت میں نقصان اُٹھانے والے ہیں ﴿۳۷﴾ آپ کفر کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ کفر سے رک جائیں گے تو ان کے پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے ﴿۲﴾ اور اگر پھر بھی وہی دُہراتے رہیں گے تو (یاد رکھیں کہ) گذشتہ لوگوں کی سنت (یعنی عذاب کی آمد) گذر ہی چکی ہے۔ ﴿۳۸﴾

← اور انھیں کو اس گھر کا متولی بننے کا حق حاصل ہے، یہ عمل خود ان کی روایت کے اعتبار سے بھی ظلم تھا؛ کیوں کہ قریش کسی کو مسجدِ حرام کی زیارت سے منع نہیں کیا کرتے تھے؛ لیکن مسلمانوں پر انھوں نے مسجدِ حرام کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔

﴿۱﴾ یہ عجیب بات ہے کہ ہر زمانہ میں اکثر مشرک اور دین حق سے ہٹی ہوئی قوموں کا طریقۂ عبادت یہی رہا ہے: گانا بجانا، اُچھلنا کودنا، رنگ پھینکنا، آتش بازیاں کرنا، اگر مسلمان مذہب کے نام پر اس طرح کے رسمی کام کریں تو کافروں سے مشابہت کی وجہ سے یہ بھی سخت گناہ ہے اور یہ بھی اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے، افسوس کہ مسلمانوں نے بھی غیر مسلموں کو دیکھا دیکھی قوالی، گانا، بجانا، سبز رنگ پھینکنا، قمقموں اور روشنیوں سے گھروں اور بازاروں کو آراستہ کرنا وغیرہ شروع کردیا ہے، یہ دین کے نام پر بے دینی اور نیکی کے جذبہ سے گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔

﴿۲﴾ انسان پر اللہ کی رحمتوں میں سے ایک بڑی رحمت توبہ ہے کہ انسان کتنے ہی بڑے گناہ کا مرتکب ہو؛ لیکن جب اسے شرمندگی اور ندامت ہو اور وہ آئندہ بچے رہنے کے ارادہ سے اللہ کے سامنے معافی کا ہاتھ پھیلا دے تو اس کے وہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، یہ معاف کیا جانا اصل میں آخرت کے اعتبار سے ہے، دنیوی حکم کے اعتبار سے یہ تفصیل ہے کہ کفر کی حالت میں ←

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

ان سے جنگ کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور پورا کا پورا دین اللہ کے لئے ہوجائے،﴿١﴾ پھر اگر وہ اس سے رُک جائیں تو (جان لیں کہ) بے شک اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں ﴿٣٩﴾ اور نہ مانیں تو (رنج کی بات نہیں ؛ بلکہ) جان لو کہ اللہ تمہارے دوست ہیں، وہ کیا ہی بہتر دوست اور کیا ہی بہتر مددگار ہیں! ﴿٤٠﴾

← اس نے اللہ کے حقوق سے متعلق جو گناہ کئے، وہ تو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے معاف ہوجائیں گے، جیسے کسی نے حالت کفر میں گناہ کیا، شراب پیا تو اب مسلمان ہونے کے بعد اس پر زنا اور شراب کی حد جاری نہیں ہوگی ؛ لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں ہوں گے، جیسے کسی انسان کو قتل کردیا تھا اور مقتول کے ورثہ قاتل کے قتل کئے جانے کے دعویدار ہوں تو وہ قصاص میں قتل کردیا جائے گا، اگر وہ خون بہا پر راضی ہوجائیں تو قاتل کو خون بہا ادا کرنا ہوگا، اگر کوئی سامان چوری کیا تھا تو گو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا ؛ لیکن اسے وہ سامان یا اس کا بدل واپس کرنا پڑے گا، اگر کسی کی کوئی چیز ضائع کردی تھی یا غصب کرلیا تھا تو اس کا واپس کرنا اس پر واجب ہوگا، غرض کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق معاف ہوجائیں گے اور انسان کے حقوق معاف نہیں ہوں گے۔ (تفسیر قرطبی: ۷/ ۴۳)

﴿١﴾ یہاں فتنہ سے مراد وہی ہے جس کا ذکر پہلے آیا ہے، یعنی مسلمانوں کو اللہ کے دین سے روکنا، حاصل یہ ہے کہ ان مشرکین سے اس وقت تک جنگ کرتے رہنا ہے، جب تک کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین و مذہب پر عمل کرنے سے روکنا چھوڑ نہ دیں، اب اس کی دو صورتیں ہیں : یا تو وہ اسلام قبول کرلیں، یا مسلمانوں سے معاہدۂ امن کرلیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک وہ ایمان نہ لائیں ان سے جنگ کرتے رہو ؛ کیوں کہ یہ تو دین کے معاملہ میں جبر ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے —— ''پورا کا پورا دین اللہ کے لئے ہوجائے'' کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کے راستہ سے روکا نہیں جائے گا اور دعوت دین کے لئے فضا ہموار ہوجائے گی تو اس دین کی کشش لوگوں کو اسلام کی طرف لے آئے گی اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوجائے گا ؛ چنانچہ صلح حدیبیہ کے موقع سے مسلمان چودہ سو تھے اور فتح مکہ کے موقع پر مسلمانوں کی فوج دس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور اس کے صرف دو سال بعد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے بھی زیادہ افراد رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب تھے، یہ دعوتِ اسلام کا اثر تھا اور یہ اخلاق کی تلوار تھی، جس نے لوگوں کے دلوں کو فتح کیا۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۷/ ۴۹۵)

○ ○ ○

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

اور اگر تم اللہ پر اور ہمارے ان احکام پر ایمان رکھتے ہو، جو ہم نے حق و باطل کے فیصلہ یعنی دونوں فریقوں کی مڈبھیڑ کے دن اتارے تھے، ﴿۱﴾ تو جان لو کہ تم جو بھی مالِ غنیمت حاصل کرو، اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے، رسول کے لئے، (رسول کے) قرابت داروں کے لئے، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ﴿۲﴾ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ﴿۴۱﴾

﴿۱﴾ حق و باطل کے فیصلہ کے دن سے مراد ''غزوۂ بدر'' ہے، جو حق و باطل کے درمیان پہلا فیصلہ کن معرکہ تھا۔

﴿۲﴾ جو چیز محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل کی جائے، اسے عربی زبان میں ''غنیمت'' کہتے ہیں، جہاد سے بڑھ کر محنت و مشقت کیا ہوگی؟ اس لئے جنگ کی بنیاد پر دشمن کا جو مال ہاتھ آئے، اسے ''مالِ غنیمت'' کہا جاتا ہے اور اسلامی حکومت کو صلح کی بنا پر غیر مسلم علاقوں سے جو مال حاصل ہوا، وہ ''فئ'' کہلاتا ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے موقع سے نازل ہوئی؛ کیوں کہ پہلی بار مسلمانوں کو مالِ غنیمت حاصل ہو رہا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مال کے سلسلے میں مہذب احکام مقرر فرمائے کہ لوٹ کھسوٹ کا طریقہ اختیار نہ کرو کہ جو چیز جس کے ہاتھ آئی، وہ اس کو لے کر چلتا بنا؛ بلکہ تہذیب و شائستگی سے کام لو کہ سارا مال پہلے جمع کیا جائے، پھر اس کا چار حصہ مجاہدین پر تقسیم کردیا جائے اور ایک حصہ سرکاری خزانہ میں جائے، آپ ﷺ کے زمانہ میں پھر اس حصہ کے پانچ حصے کئے جاتے تھے، جس میں ایک حصہ آپ ﷺ کے لئے ہوتا تھا، اس کو آپ ﷺ زیادہ تر سرکاری ضروریات پر خرچ فرماتے تھے، ایک حصہ آپ ﷺ کے قرابت داروں کا ہوتا تھا، جس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پانچ خاندان شامل تھے: علی بن ابی طالب، عقیل بن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب، حارثہ بن عبد المطلب، عباس بن عبد المطلب (بدائع الصنائع: ۲/۱۶۲) آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کا حصہ اور آپ ﷺ کے اہل بیت کا خصوصی حصہ باقی نہیں رہا، اب تین مصارف باقی رہ گئے: یتیم، مسکین اور مسافر، غور کیا جائے تو یہ تین مصارف تمام ضرورت مندوں کو شامل ہیں؛ البتہ اب بھی رسول اللہ ﷺ کے اہل قرابت کو فقر و حاجت مندی کی بنیاد پر دیا جائے گا؛ بلکہ انھیں اس میں ترجیح حاصل رہے گی، ان تینوں مصارف میں ایک ایک تہائی خرچ کرنا ضروری نہیں؛ بلکہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی صواب دید سے ضرورت کو دیکھتے ہوئے خرچ کرے، چار حصے جو مجاہدین کے لئے ہیں، ان سے مراد وہ مجاہدین ہیں جو اللہ کے راستہ میں کسی اجرت اور تنخواہ کے بغیر شریک جہاد ہوں، اگر فوجی تنخواہ دار ہوں تو وہ مالِ غنیمت کے مستحق نہیں: ''لا حق في الغنائم للحشوة كالأجراء'' (تفسیر قرطبی: ۱۶/۷)؛ اس لئے آج کل جو تنخواہ دار فوج ہوتی ہے، وہ مالِ غنیمت کی مستحق نہیں ہے۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ
تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۬ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ
هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ
فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ
فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع ۵ ۱

یہ وقت تھا جب تم اِدھر والے کنارے پر تھے اور وہ اُدھر والے کنارے پر، اور (تجارتی) قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا، اگر تم آپس میں (جنگ کا) وقت طے کرتے تو مقررہ وقت کے سلسلہ میں اختلاف کا شکار ہو جاتے ؛ لیکن اللہ کو وہ کام کر ہی ڈالنا تھا، جو مقدر ہو چکا تھا؛ تاکہ جو ہلاک ہو، وہ دلیل (دیکھنے) کے باوجود ہلاک ہو اور جو زندہ رہ جائے، وہ بھی دلیل کی بنیاد پر زندہ رہے اور بے شک اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۴۲﴾ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اللہ نے آپ کو خواب میں ان لوگوں (مشرکین مکہ) کو کم تعداد میں دیکھایا، اگر اللہ نے آپ کو انہیں زیادہ تعداد میں دیکھایا ہوتا تو (مسلمانو!) تم لوگ ہمت ہار جاتے اور جنگ کے معاملہ میں جھگڑنے لگتے ؛ لیکن اللہ ہی نے اس سے بچایا، بے شک اللہ دلوں کے حال سے خوب واقف ہیں ﴿۴۳﴾ اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مقابلہ کے وقت اللہ ان کو تمہاری نظر میں کم تعداد دیکھا رہے تھے اور ان کی نظر میں تم کو کم دیکھا رہے تھے : تاکہ اللہ اس بات کو پوری کر دیں، جسے ہو کر ہی رہنا تھا اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۴۴﴾

﴿۱﴾ ’’اِدھر والے کنارے‘‘ سے مراد مدینہ کی جانب اور ’’اُدھر والے کنارے‘‘ سے مراد مکہ کی طرف کا علاقہ تھا، ’’نیچے کی طرف‘‘ سے مراد ہے ساحلِ سمندر کا علاقہ، جدھر سے ابوسفیان کا قافلہ مکہ پہنچا، مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو شاید اپنی تعداد اور وسائل کی کمی، نیز دشمن کی کثرت اور ان کے جنگی وسائل کی بہتات کی وجہ سے تأمل کرتے اور اِس وقت جہاد کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اس میں اختلاف پیدا ہوتا؛ لیکن اللہ کو منظور تھا کہ یہ معرکہ ہو کر رہے اور اس میں غیر معمولی فرق کے باوجود مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو؛ تاکہ ہلاک ہونے والے مشرکین بھی اس معجزہ کو دیکھ لیں اور مسلمان جو باقی رہ جائیں، وہ بھی اس معجزہ کا مشاہدہ کر لیں، اسی طرح جو کفار مکہ بچ جائیں، اللہ کی یہ نشانی ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے۔

﴿۲﴾ یعنی غزوۂ بدر ہو کر رہے، اس کے لئے ضروری تھا کہ مسلمان و مشرکین مکہ دونوں مقابلہ کے لئے تیار ہوں؛ چنانچہ مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اول تو حضور ﷺ کو خواب میں مشرکین کا لشکر دکھایا گیا، جو آپ ﷺ کو معمولی محسوس ہوا، آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیان کیا تو ان کی ہمت بلند ہوئی، دوسرے: جب میدان میں آمنا سامنا ہوا تب بھی مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ ←

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۴۵
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۴۷ وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا
غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ
وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴۸ ۶ ع ۲

اے ایمان والو! جب کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہوتو ثابت قدم رہو، اللہ کا خوب ذکر کرو؛ تاکہ تم کامیاب ہوسکو، ۝۴۵
اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کیا کرو اور آپس میں لڑو نہیں ؛ کہ ایسی صورت میں تم ناکام ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی ، نیز صبر سے کام لو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۝۴۶
ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جو (بدر میں) اپنے گھروں سے تو اِتراتے ہوئے اور لوگوں کو دیکھاتے ہوئے نکلے اور (در پردہ) وہ اللہ کے راستہ سے روک رہے تھے، اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ﴿۱﴾ ۝۴۷
نیز اس وقت کو یاد کرو جب شیطان نے ان کو ان کی بداعمالیاں خوش نما کر کے دیکھا دیں اور کہا کہ '' آج تم پر کوئی انسان غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں''، پھر جب دونوں فوجوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہوا تو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ گیا اور کہنے لگا: میں تم لوگوں سے بری ہوں، جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، تم نہیں دیکھ رہے ہو، مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے اور اللہ سخت سزا دیتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۴۸

← جیسے مشرکین مکہ کم تعداد میں ہیں، اس سے ان کی ہمت اور بڑھی، دوسری طرف مشرکین مکہ کو جنگ شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں کی تعداد کم محسوس ہوئی؛ اس لئے ان کا ارادہ بھی پختہ ہوگیا اور جنگ کی نوبت آ کر رہی؛ کیوں کہ اللہ کی حکمت یہی تھی کہ جنگ ہو اور اس میں مسلمان غالب اور دشمنانِ اسلام مادی وسائل کے باوجود مغلوب ہوں۔

﴿۱﴾ ان آیات (۴۵-۴۷) میں جہاد کے خصوصی آداب بتائے گئے ہیں کہ ایک تو دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی اختیار کرو، دوسرے: اپنی طاقت اور مادی وسائل پر بھروسہ نہ کرو؛ بلکہ اللہ کا خوب ذکر کرو، اللہ کے ذکر میں دونوں باتیں شامل ہیں، دل سے اللہ کو یاد کرنا اور زبان سے اللہ کا ذکر کرنا، تیسرے: عین جنگ کے وقت بھی اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، چوتھے: آپس میں اختلاف سے بچو؛ کیوں کہ جو فوج آپس ہی میں ایک دوسرے سے دل شکستہ ہو، شکست اور ناکامی اس کا مقدر ہے، پانچویں: جنگ کے درمیان ناگوار باتیں پیش آتی ہی ہیں، ایسی باتوں پر صبر سے کام لو، اخیر میں ایک نصیحت یہ بھی کی گئی کہ تکبر کا اظہار اور اپنی طاقت کی نمائش کا جذبہ ہرگز نہ ہونا چاہئے، جیسا کہ کفار کا طریقہ ہے ـــــ یہ احکام اگرچہ جہاد کے موقع پر ←

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾

وہ وقت بھی یاد رکھنے کے لائق ہے، جب منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری ہے، کہہ رہے تھے: ''ان کو ان کے دین نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے''، اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے تو بے شک اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۴۹﴾ کاش! آپ دیکھتے جب فرشتے کافروں کی جان نکالتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ جلنے کا عذاب چکھو۔ ﴿۵۰﴾

← دیئے گئے ہیں؛ لیکن یہ صرف جہاد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، عام حالات میں بھی ضروری ہے کہ مسلمان اسے ملحوظ رکھیں۔

﴿۲﴾ یعنی پہلے تو شیطان نے مشرکین مکہ کو خوب اکسایا کہ وہ مقابلہ پر آجائیں اور انھیں ضرور ہی فتح حاصل ہوگی؛ لیکن جب مقابلہ ہوا تو یہ شیطانی قوت کچھ کام نہ آئی، بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ اس روز شیطان سُراقہ بن جُعشُم کی شکل میں آیا، جو قبیلہ بنو کنانہ کے سردار تھے، یہ عرب کا ایک بڑا اور بہادر قبیلہ تھا، اس کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور وہ لوگوں کو کہہ رہا تھا کہ آج تم ہی کو فتح حاصل ہوگی؛ لیکن جب مقابلہ شروع ہوا، اس وقت اس کا ہاتھ حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا، اس نے حارث کا ہاتھ جھٹکا اور بھاگ نکلا، جب کہا گیا کہ تم اس حال میں چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو تو کہنے لگا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ رہے ہو، یعنی میں مسلمانوں کے شانہ بہ شانہ فرشتوں کو دیکھ رہا ہوں، آخر جب اہل مکہ واپس آئے اور انھوں نے کہا کہ سراقہ نے ہمیں رسوا کیا تو سراقہ نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ بدر میں ان کے ساتھ تھے، انھوں نے کہا کہ ہمیں تو اب تم لوگوں کے شکست کھانے کی خبر مل رہی ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۷/۵۰۹، قرطبی: ۸/۲۶)

﴿۱﴾ منافقین سے مراد وہ اہلِ مدینہ ہیں جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے؛ لیکن حقیقت میں مسلمان نہیں تھے اور ''جن کے دلوں میں بیماری ہے'' سے مراد کچھ اہل مکہ ہیں، جو ایک درجہ میں مسلمان ہوگئے تھے؛ لیکن ابھی ان کے ایمان میں پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی، شکوک وشبہات کے کانٹے ان کے دلوں میں موجود تھے، وہ بھی مشرکین مکہ کے ساتھ مل گئے اور ان کا ارادہ تھا کہ اگر مسلمان اچھی پوزیشن میں ہوں گے تو ہم مسلمانوں کے ساتھ چلے جائیں گے، جب وہ بدر کے میدان میں آئے اور انھوں نے مشرکین کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تھوڑی تعداد دیکھی تو اب ان کے ایمان پر شک غالب آگیا اور وہ مشرکین کے ساتھ لڑے، یہاں تک کہ یہ سب کے سب قتل کئے گئے، (مفاتیح الغیب: ۷/۵۱۲) آیت میں اسی کا ذکر ہے اور مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ تعداد اور اسبابِ جنگ وحرب اصل میں قابل بھروسہ نہیں ہیں؛ بلکہ جو اسباب میسر ہوں، ان سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھا جائے؛ کیوں کہ اصل طاقت اللہ ہی کی ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا
بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

یہ تمہاری پچھلی حرکتوں کی وجہ سے ہے اور یقیناً اللہ بندوں کے ساتھ ظلم نہیں کرتے ﴿۱﴾ ﴿۵۱﴾ جیسا کہ فرعون کے لوگوں کا اور ان سے پہلے اللہ کے احکام کا انکار کرنے والوں کا حال ہوا؛ کہ اللہ نے اُن کو اُن کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا، بے شک اللہ بہت طاقتور اور سخت عذاب والے ہیں ﴿۵۲﴾ یہ اس لئے کہ اللہ کسی قوم کو جس نعمت سے نوازتے ہیں، اسے بدلتے نہیں ہیں، جب تک وہ خود اپنے (اچھے) کردار کو بدل نہ ڈالیں اور بے شک اللہ خوب سننے والے اور جاننے والے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۵۳﴾ جیسا کہ فرعون کے لوگوں کا اور ان سے پہلے کے لوگوں کا حال ہوا؛ کہ انھوں نے اپنے رب کی باتوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور فرعون کے لوگوں کو ڈبو دیا ﴿۳﴾ اور یہ سب کے سب ظلم کرنے والے لوگ تھے۔ ﴿۵۴﴾

﴿۱﴾ یعنی فرشتے کافروں کی جان نہایت ذلت آمیز طریقہ پر نکالتے ہیں اور ان کو عذاب بھی دیتے ہیں، اس سے قبر کا عذاب ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہاں موت کے وقت اور اس کے بعد کے عذاب کا ذکر ہے، جس کا تعلق عالم برزخ سے ہے؛ اس لئے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ قبر کا عذاب وثواب حق ہے۔

﴿۲﴾ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودی وعیسائی تو ایک نبی کے منتظر تھے ہی، ان سے سن سنا کر اہل مکہ کا ذہن بھی ان کی دعوت پر لبیک کہنے کو آمادہ تھا، یہ ہدایت کو قبول کرنے کی استعداد اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت تھی، پھر یہود ونصاریٰ اس لئے ایمان نہیں لائے کہ آپ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے نہیں تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تھے، مکہ کے بعض قبائل جیسے بنواُمیہ کے زیادہ تر لوگ بنو ہاشم سے پرانی رقابت کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوئے اور بعضوں نے سوچا کہ آپ پر ایمان لے آئیں گے تو ان کی سرداری خطرہ میں پڑ جائے گی، غرض کہ پہلے تو ہدایت کو قبول کرنے کا جذبہ تھا اور اب ہدایت سے محروم رہنے پر اصرار پیدا ہو گیا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی نعمت اور اس نعمت کی بنا پر حاصل ہونے والی دنیا وآخرت کی سربلندی سے محروم کر دیا، جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو جان لینے کے باوجود ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقتدار کی جو نعمت انھیں صدیوں سے حاصل تھی، وہ ختم ہو کر رہ گئی اور فرعون اور اس کے متبعین سمندر میں غرق کر دیئے گئے۔

﴿۳﴾ اس واقعہ کا ذکر اعراف آیت نمبر: ۱۳۶ میں آچکا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ
مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ط
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ط اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

(اے رسول !) بے شک اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق (یہ) کفر کرنے والے لوگ ہیں ؛ چنانچہ یہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۵۵﴾ جن سے آپ عہد لیتے رہے ہیں، پھر بھی وہ ہر بار اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں ہیں ﴿۵۶﴾ تو جب کبھی آپ جنگ میں ان پر قابو پالیں تو ان کو ایسی سزا دیں کہ جو لوگ ان کے پیچھے ہیں، وہ بھی ڈر جائیں ؛ شاید وہ عبرت حاصل کریں ﴿۱﴾ ﴿۵۷﴾ اور اگر آپ کو کسی قوم سے بد دیانتی کا اندیشہ ہو تو برابری کے ساتھ ان سے معاہدہ ختم کردیں، بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ﴿۲﴾ ﴿۵۸﴾ کفر کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھاگ نکلے، یقیناً وہ (خدا کو) عاجز نہیں کرسکتے۔ ﴿۳﴾ ﴿۵۹﴾

﴿۱﴾ ”فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ“ کے معنی مشہور مفسر سعید بن جبیر سے منقول ہے ”أنذر بهم من خلفهم“ (ان کے ذریعہ پیچھے رہنے والوں کو ڈرائیے) اسی لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے —— ان آیات میں مدینہ کے یہودیوں کا ذکر ہے، یہودی قبائل بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر کی جانب سے کئی بار عہد ہوا اور پھر عہد شکنی ہوئی، یہاں تک کہ غزوۂ خندق کے موقع سے جب اہل مکہ نے بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ مدینہ پر حملہ بول دیا اور کوشش کی کہ مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے، اس وقت یہود بغلی دشمن ثابت ہوئے اور انھوں نے سارے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف مدینہ کی مدافعت میں مسلمانوں کی مدد نہیں کی ؛ بلکہ دشمنوں کے ساتھ جا ملے، اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں کہ اب وہ کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں، —— اس میں یہودیوں کے ساتھ قطعاً کوئی ناانصافی اور مسلمانوں کی طرف سے تشدد نہیں ؛ بلکہ جن لوگوں نے بار بار مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا اور آپ ﷺ کو زہر دیا، ان لوگوں سے نجات حاصل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ اب انھیں مزید کوئی موقع نہیں دیا جائے۔

﴿۲﴾ یہودیوں کی وعدہ خلافی کا ذکر کرنے کے بعد ایک اُصولی بات بتائی گئی ہے کہ اگر قرائن وشواہد سے اندازہ ہوجائے کہ کوئی گروہ جس کا تم سے معاہدہ ہو، وہ اس معاہدہ کو توڑنے والا ہو اور تمہارے خلاف منصوبہ بندی کررہا ہو تو تم اپنی طرف سے خیانت اور بدعہدی نہ کرو اور اچانک ان پر حملہ نہ کردو ؛ بلکہ پہلے معاہدہ کے ختم کردینے کا اعلان کردو اور انھیں اس سے مطلع کردو —— یہ یقیناً قرآن مجید کی منصفانہ تعلیمات ہیں، جب کہ آج نام نہاد مہذب قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ سارے عہد کو بالائے طاق رکھ کر اپنے سے کم زور پڑوسیوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی غزوۂ بدر میں جو لوگ بچ گئے اور ان بچ جانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کو ←

وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمۡ
وَ اٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فِىۡ سَبِيۡلِ
اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۝۶۰ وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۶۱ وَ اِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِىۡۤ
اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝۶۲

اور (اے مسلمانو!) ان کے مقابلہ جہاں تک ہو سکے، طاقت اور گھوڑوں کی تیاری رکھو، جن سے اللہ کے دشمن، اپنے دشمن اور ان کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی —— جن کو تم نہیں جانتے، اللہ جانتے ہیں —— تمہاری دھاک قائم رہے اور جو بھی تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو گے، تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ حق تلفی نہیں ہوگی، ﴿۱﴾ ۝۶۰ اور اگر وہ صلح کے لئے تیار ہوں تو تم بھی صلح کے لئے تیار ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بے شک اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ۝۶۱ اور اگر ان کا ارادہ آپ کو دھوکہ دینے کا ہو تب بھی اللہ آپ کے لئے کافی ہیں؛ اسی نے آپ کو اپنی مدد کے ذریعہ اور مسلمانوں کے ذریعہ طاقت پہنچائی ہے۔ ﴿۲﴾ ۝۶۲

← اور آپ ﷺ کے رفقاء کو اذیتیں پہنچائی تھیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ گئے ہیں؛ کیوں کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو آئندہ پھر اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی گرفت میں دے سکتے ہیں؛ چنانچہ فتح مکہ کے موقع سے ایسا ہی ہوا۔

﴿۱﴾ یہ جہاد کی تیاری کا حکم ہے، یعنی جو مسلمان جس قسم کا جہاد کر سکتا ہے، وہ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے، جیسے اسلامی ملک میں بسنے والے فوجی ٹریننگ حاصل کریں اور اسلامی حکومت اپنے عہد کے لحاظ سے اسلحہ حاصل کرے اور ان کا تجربہ کرے، گھوڑے کا خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس زمانہ میں جنگی نقطۂ نظر سے گھوڑے کی بڑی اہمیت تھی، موجودہ دور کے لحاظ سے وہی اہمیت جنگی جہاز، میزائیل، توپ اور ٹینک وغیرہ کی ہے، پھر یہ بھی فرما دیا گیا کہ یہ اسلحہ بہ درجۂ مجبوری استعمال کے لئے ہیں، ان کا اصل مقصد تباہی مچانا اور خون ریزی کرنا نہیں ہونا چاہئے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ دشمنوں پر دھاک قائم رہے؛ تاکہ کوئی اسلامی ملک پر جارحیت کی ہمت نہ کر سکے، قرآن نے اس میں ان دشمنوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو اس وقت موجود تھے، یعنی مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ، اور ان دوسرے لوگوں کا بھی، جن سے مقابلہ درپیش ہونے کو مسلمان نہیں جانتے تھے، جیسے روم و فارس، جن سے عہد نبوی کے بعد جنگ کی نوبت آئی؛ بلکہ اس میں قیامت تک مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار دشمنوں کی طرف اشارہ موجود ہے —— غیر مسلم ممالک میں بھی مسلمانوں کے لئے جہاد کا راستہ کھلا ہوا ہے اور وہ ہے ''جہاد باللسان'' (زبان وقلم سے جہاد) یعنی اللہ کے دین کی طرف دعوت دینا، یہ بھی ایک جہاد ہی ہے؛ بلکہ یہ جہاد کا مقصد ہے؛ کیوں کہ اصل مقصود اللہ کے بندوں کی ہدایت اور ان کو دوزخ کے ابدی عذاب سے بچانا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی اسلام میں اصل جنگ نہیں ہے؛ بلکہ صلح و امن ہے؛ لہٰذا اگر کوئی قوم صلح کے لئے آمادہ ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ پر ←

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ‌ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ
اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۶۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلَى الۡقِتَالِ‌ ؕ اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ عِشۡرُوۡنَ ع ۸
صٰبِرُوۡنَ يَغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ‌ ۚ وَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ ﴿۶۵﴾

اور اسی نے مسلمانوں کے دلوں میں آپسی محبت ڈال دی ہے، زمین میں جو کچھ ہے اگر تم ان سب کو خرچ کر دیتے، تب بھی ان کے دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے، اللہ ہی نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی ہے ﴿۱﴾ بے شک وہ غالب اور حکمت والے ہیں ﴿۶۳﴾ اے نبی! آپ کے لئے اللہ اور آپ کی پیروی کرنے والے مسلمان کافی ہیں ﴿۲﴾ ﴿۶۴﴾ اے نبی! ایمان والوں کو جہاد کی ترغیب دیجئے، اگر تم میں سے بیس بھی ثابت قدمی اختیار کرنے والے موجود ہوں تو وہ دوسو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب رہیں گے؛ اس لئے کہ وہ (دین کے اعتبار سے) ناسمجھ لوگ ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۶۵﴾

← بھروسہ کرتے ہوئے صلح کا راستہ اختیار کریں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ بہ ظاہر صلح کے لئے آمادہ ہوتا ہے؛ حالاں کہ ان کی نیت صاف نہیں ہوتی، پھر بھی مسلمانوں کو تعلیم دی گئی کہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کر کے صلح کو قبول کر لینا چاہئے؛ کیوں کہ اگر انھوں نے دھوکہ بازی سے کام لیا تو مسلمانوں کے لئے اللہ کی ذات کافی ہے۔

﴿۱﴾ انصار کے دو قبائل اوس وخزرج کے درمیان پرانی لڑائی چلی آرہی تھی؛ لیکن اسلام کے ذریعہ اسلامی اخوت کا ایسا دور دورہ ہوا کہ وہ سب شیر وشکر ہو گئے، اسی طرح جب مہاجرین میدانِ بدر میں آئے تو اہل مکہ سے قرابت کو خاطر میں نہ لائے اور انصار کے ساتھ بھائی بھائی بن کر دشمن کا مقابلہ کیا، پس اسباب جنگ کی طرح یہ آپسی محبت بھی کامیابی اور فتح مندی کا مؤثر ذریعہ ہے جو صرف اللہ کی قدرت سے مسلمانوں کو حاصل ہوا؛ چنانچہ ارشاد ہوا کہ صرف اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

﴿۲﴾ یہ آیات غزوۂ بدر کے موقع سے نازل ہوئیں، مطلب یہ ہے کہ دشمن کی تعداد، ہتھیار اور جنگی اسباب سے آپ کو کوئی خوف نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ غیبی مدد کے اعتبار سے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات اور ظاہری اعتبار سے وفادار و جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی رفاقت آپ کے لئے کافی ہے؛ کیوں کہ جب دونوں طرف سے مادی طاقت کا مقابلہ ہو تو افراد اور ہتھیار کی کثرت غلبہ کا سبب بن سکتی ہے؛ لیکن یہاں مقابلہ غیبی طاقت اور مادی طاقت کا ہے اور جب ان دونوں کا مقابلہ ہوگا تو یقیناً غیبی طاقت ہی فتح مند ہوگی، اور وہ غیبی طاقت ہے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد جس کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔

﴿۳﴾ یہاں بہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ کم مسلمان زیادہ کافروں پر غالب آجائیں گے؛ تاکہ اس خبر کو سن کر مسلمانوں کو ←

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا
مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾ مَا
كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ
يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

(اچھا) اب اللہ تم سے حکم کو ہلکا کررہے ہیں اور اللہ نے جان لیا ہے کہ تمہارے اندر ہمت کی کمی ہے، تو اگر تم میں سو ثابت قدمی اختیار کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور تم میں سے ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے، اور اللہ ثابت قدمی اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہیں ﴿۱﴾ ﴿۶۶﴾ نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ جب تک زمین میں (دشمنوں پر) اچھی طرح قابو حاصل نہ ہوجائے، ﴿۲﴾ اس کے پاس قیدی ہوں، تم دنیا کے مال واسباب چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو (سنوارنا) چاہتے ہیں، اور اللہ غالب اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۶۷﴾

← یقین ہوجائے؛ لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک حکم ہے، یعنی مسلمانوں کو اپنے دشمن کی دس گنا تعداد کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہنا چاہئے اور اس ثابت قدمی کا راز یہ ہے کہ مسلمان ایمان کی دولت سے سرفراز ہیں اور شہید ہونے کی صورت میں انھیں آخرت کی نعمتوں کے حاصل ہونے کا یقین ہے، یہ یقین ان کو ثابت قدم رکھنے میں معاون و مددگار ہے، اس کے برخلاف جو لوگ ایمان سے محروم ہیں، وہ تو ناسمجھ ہیں، یعنی وہ دین سے ناآشنا اور آخرت کے یقین سے محروم ہیں؛ اس لئے ان کا حوصلہ وہمت ہار جانا کوئی قابلِ تعجب بات نہیں۔

﴿۱﴾ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے، اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا؛ اس لئے مادی طاقت کا اس درجہ تفاوت کہ ایک طرف ایک آدمی کھڑا ہے اور دوسری طرف سو، یقیناً انسان کے لئے حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے، اس نفسیاتی کمزوری کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے حکم میں آسانی پیدا فرمادی کہ کم سے کم اگر مسلمانوں اور کافروں کا مقابلہ سو اور دو سو کا ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ مقابلہ پر جمے رہیں اور تعداد کی کمی کو خاطر میں نہ لائیں، اگر صبر و ثابت قدمی ہو تو انہیں اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوگا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ صبر و استقامت اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور اللہ جس کے ساتھ ہوں، وہی غالب آکر رہے گا۔

﴿۲﴾ قرآن مجید نے ''اثخان'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی خوب قتل کرنے، غلبہ وقدرت حاصل کرنے اور زیر کرنے کے ہیں۔ (دیکھئے: قرطبی)

﴿۳﴾ غزوۂ بدر مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پہلی باضابطہ جنگ تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی فتح عطا فرمائی، جو ظاہری حالات کے بالکل برعکس تھی، اس جنگ میں بڑے بڑے سرداران قریش مارے گئے مارے جانے والوں کی تعداد ستر تھی، اسی طرح ستر افراد قید کئے گئے، ان میں بھی کئی معزز رؤساء تھے، باقی حضرات بھاگ نکلے، بہ ظاہر جنگی حکمتِ عملی کا تقاضہ یہ تھا کہ ←

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

ع ۵ / ۵

اگر اللہ کی طرف سے پہلے سے طئے نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے، اس کی بنا پر تم کو کوئی بڑا عذاب آ پکڑتا ﴿۱﴾ ﴿۶۸﴾ پس، جو کچھ حلال اور پاکیزہ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اس میں سے کھاؤ ﴿۲﴾ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ معاف کرنے والے اور مہربان ہیں۔ ﴿۶۹﴾

← ابھی جنگ جاری رکھی جاتی اور اچھی طرح ان کی طاقت توڑ دی جاتی؛ تاکہ آئندہ انہیں مسلمانوں کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہ ہو؛ لیکن دشمنوں کی شکست دیکھ کر صحابہ ﷡ نے سمجھا کہ اب جنگ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے؛ اس لئے دشمنوں کے مال اپنے قبضہ میں لینے لگے؛ کیوں کہ یہ مال بھی مسلمانوں کی معیشت کو بہتر بنانے اور آگے کی جنگی کاروائیوں کی تیاری کے لئے بہت اہم تھا، جب یہ ستر قیدی لائے گئے تو آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا، ان قیدیوں میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباس (﷛)، حضرت علی ﷛ کے بھائی عقیل (﷛) اور مختلف مہاجرین کے قریبی اعزہ موجود تھے؛ چنانچہ حضرت ابوبکر ﷛ نے مشورہ دیا کہ یہ آپ ہی کی قوم اور خاندان کے لوگ ہیں، بہتر ہوگا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے، ممکن ہے اللہ تعالیٰ انہیں کفر سے توبہ کی توفیق عطا فرمائیں؛ البتہ ان سے فدیہ لے لیا جائے؛ تاکہ مسلمانوں کو اس سے مدد ملے، حضرت عمر ﷛ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو تہہ تیغ کر دیا جائے اور ہر مسلمان اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کر دے، رسول اللہ ﷺ سراپا رحمت تھے اور نرم خوئی وعفو ودرگذر آپ ﷺ کا خاص مزاج تھا؛ اس لئے آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر ﷛ کی رائے کو ترجیح دی اور ان قیدیوں سے فدیہ وصول کیا گیا، نیز جو لوگ لکھائی پڑھائی سے واقف تھے ان کو کہا گیا کہ وہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، (طبقات ابن سعد، ذکر غزوۂ بدر: ۲/ ۲۲) ان دونوں باتوں پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کہ موجودہ حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ دشمن کی طاقت اچھی طرح توڑ دی جائے، مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کی بجائے ان کو جانی نقصان پہنچانے پر توجہ دی جائے اور قیدیوں سے فدیہ لینے کی بجائے انھیں جانی نقصان پہنچایا جائے؛ تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اُٹھا سکیں، مگر تم لوگوں نے اس مصلحت کو پیش نظر نہیں رکھا۔

﴿۱﴾ اس آیت کی مختلف تشریحات کی گئی ہیں، محمد ابن اسحاق کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ اور سنت یہ ہے کہ جب تک کسی گروہ کو اپنے احکام سے مطلع نہیں کر دیتے، اس حکم کی خلاف ورزی پر عذاب نہیں دیتے اور پہلے سے ان جنگی مصالح کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہیں آیا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی عذاب نازل نہیں فرمایا، (مفاتیح الغیب: ۷/ ۵۴۵) اور تنبیہ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

﴿۲﴾ اس فقرہ میں اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کا حکم بیان فرمایا ہے کہ پچھلی اُمتوں کے لئے مالِ غنیمت حرام تھا؛ لیکن تمہارے لئے ہم نے اسے حلال کر دیا ہے؛ اس لئے تم شریعت کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قیدیوں سے متعلق احکام بیان نہیں فرمائے ہیں؛ لیکن سورۂ محمد (آیت نمبر: ۴) میں وضاحت فرمادی گئی کہ جب ←

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۰﴾

اے نبی! جو قیدی آپ کے ہاتھوں میں ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں بھلائی پائیں گے تو تم کو اس سے بہتر عطا فرمائیں گے، جو تم سے لیا گیا ہے اور تم کو معاف بھی کردیں گے، اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۷۰﴾

← اچھی طرح دشمن کی کمر توڑ دو تو اب قیدی بنانے میں کوئی حرج نہیں، پھر ان قیدیوں کے ساتھ چاہے احسان کا معاملہ کرو اور یوں ہی رہا کردو یا فدیہ لے کر رہا کرو: ''فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً'' (محمد:۴) اس کے علاوہ دو صورتیں اور ہیں جو حدیث سے ثابت ہیں، وہ یہ کہ قیدیوں کو معاشرہ کا حصہ بناتے ہوئے غلام اور باندی بنالیا جائے اور اس حیثیت سے ان کے حقوق ادا کئے جائیں اور اگر کسی قیدی کو قتل کرنا مصلحت کا تقاضا ہو تو اسے قتل کردیا جائے۔

﴿۱﴾ غزوۂ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے، ان میں بعض وہ بھی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے؛ لیکن اپنے ایمان کو ظاہر نہیں کرتے تھے، اور بعض وہ تھے جنھیں زبردستی اہل مکہ میدان جنگ میں لے کر آئے تھے؛ چنانچہ حضور ﷺ نے پہلے ہی اپنے رفقاء سے فرما دیا تھا کہ بنو ہاشم زبردستی جنگ میں لائے گئے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) پر قابو پالے تو انھیں قتل نہ کرے؛ چنانچہ جب بدر کے قیدیوں سے فدیہ وصول کیا گیا تو حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ میں تو مسلمان تھا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے مسلمان ہونے سے اللہ واقف ہے، اگر بات وہی ہو جو آپ کہہ رہے ہیں تو اللہ آپ کو اس کی جزاء عطا فرمائیں گے؛ اس لئے آپ اپنے اور اپنے بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارثہ بن عبد المطلب، نیز اپنے حلیف عقبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کریں، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) چوں کہ صاحب ثروت تھے؛ اس لئے ان کا فدیہ بھی زیادہ مقرر ہوا؛ چنانچہ انھوں نے اپنا فدیہ بھی ادا کیا اور اِن حضرات کا بھی، اور لوگوں کا فدیہ تو چالیس اوقیہ تھا؛ لیکن ان کا فدیہ اسّی (۸۰) اوقیہ مقرر ہوا، اور ان سے مزید بیس اوقیہ لیا گیا؛ کیوں کہ اہل مکہ کے لشکر کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری جن لوگوں کی طے ہوئی تھی، ان میں ایک حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) بھی تھے، اس مد میں انھوں نے بیس اوقیہ رکھ رکھا تھا، جو جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی ان سے وصول کر لئے گئے، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ آپ نے مجھے اس حال میں چھوڑا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، قریش کے سامنے ہاتھ پھیلا کر زندگی گذاروں، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر وہ سونا کہاں ہے جو آپ نے اپنی بیوی ام فضل کے پاس رکھ چھوڑا ہے؟ حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا: کون سا سونا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہی سونا جو آپ نے ان کو حوالہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس بار میرے ساتھ کیا صورتِ حال پیش آئے گی، اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو یہ تمہارے لئے اور تمہارے بچوں کے لئے ہیں، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے دریافت کیا: آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی ہے، حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں اور آج مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؛ ←

وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا
وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ
وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا
عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو وہ اس سے پہلے بھی اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں، پھر اللہ نے ان کو گرفتار کرا دیا تو اللہ اب بھی یہی کر سکتے ہیں اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۷۱﴾ بے شک جو ایمان لائے، دین کے لئے وطن چھوڑا اور اپنی جان و مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ﴿۲﴾ اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں ﴿۳﴾ اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر (قدرت کے باوجود) ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں، تم لوگوں کی ان سے کوئی دوستی نہیں اور اگر وہ دین کے کام میں تم لوگوں سے مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، مگر ایسی قوم کے مقابلہ میں نہیں، جن کا تم سے معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۷۲﴾

← کیوں کہ اس واقعہ سے وہی با خبر ہو سکتا ہے، جو چھپی ہوئی باتوں کا بھی جاننے والا ہو، پھر اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گئے (قرطبی: ۸/ ۵۲-۵۳)؛ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے خطاب کیا گیا کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو تو فدیہ کی اس معمولی رقم کی ادائیگی سے رنجیدہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ تم کو دنیا میں اس سے بہتر بدل عطا فرمائیں گے اور آخرت میں مغفرت سے نوازیں گے؛ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا نعم البدل عطا فرمایا کہ دولت بھی عطا فرمائی اور زم زم کی خدمت سے بھی نوازا، جو مجھے تمام اہلِ مکہ کی دولت سے بھی زیادہ محبوب ہے اور میں اب اپنی پروردگار کی مغفرت کا منتظر ہوں۔ (مفاتیح الغیب: ۷/ ۵۴۸)

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں سے عہد لیا تھا کہ وہ پھر دوبارہ مسلمانوں سے جنگ نہیں کریں گے، اس سلسلہ میں آپ ﷺ کو اطمینان دلایا گیا کہ اگر انھوں نے جھوٹا وعدہ کیا اور خیانت و بدعہدی کی تو آپ فکر مند نہ ہوں، جیسے انھوں نے پہلے خیانت کی اور اللہ نے آپ کو ان پر قدرت عطا فرمائی، یہی صورت حال آئندہ بھی ہو سکتی ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۷/ ۵۵۰)

﴿۲﴾ آیت نمبر: ۷۲ سے ۷۵ تک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے مسلمانوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں، اس فقرہ میں پہلی قسم کا ذکر ہے، یعنی وہ مسلمان جو آپ ﷺ پر ہجرت سے پہلے ایمان لائے، پھر انھوں نے ہجرت کی، انھوں نے جان سے بھی جہاد کیا اور اپنے مال سے بھی، صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا درجہ سب سے اونچا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ←

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡضُھُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ تَکُنۡ فِتۡنَۃٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ فَسَادٌ کَبِیۡرٌ ﴿ؕ۷۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ھَاجَرُوۡا وَ جٰھَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۴﴾

اور کفر کرنے والے ایک دوسرے کے دوست ہیں، اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد پھیل جائے گا ﴿۱﴾ ﴿۷۳﴾ جو لوگ ایمان لائے ، ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، نیز جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی ، وہی سچے مسلمان ہیں، ان کے لئے (آخرت میں) بخشش اور بہترین رزق ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۷۴﴾

← اللہ ان سے راضی ہیں اور وہ اللہ سے: ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡہُ ''۔(التوبۃ:۱۰۰)

﴿۳﴾ یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے، یعنی انصار، جن کو ہجرت کی ضرورت تو پیش نہیں آئی؛ لیکن انھوں نے مہاجرین کو پناہ دی، اگرچہ مہاجرین کی طرح انھیں دین کے لئے آزمائشوں سے گذرنا نہیں پڑا؛ لیکن انھوں نے اپنی پوری دنیا رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں رکھ دی اور ایثار وقربانی کی ایسی نظیر پیش کی کہ تاریخ انسانیت میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، —— اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہیں، بعض لوگوں نے ایک دوسرے کے ولی ہونے کا مطلب یہ لیا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ترکہ میں وارث ہیں؛ لیکن راجح یہی ہے کہ یہاں دوستی اور تعلق مراد ہے، یعنی یہ دشمنوں کے مقابلہ میں متحد اور ایک دوسرے کے لئے جان نثار کرنے والے ہیں۔ (مفاتیح الغیب:۷/ ۵۵۴)

﴿۴﴾ اس میں مسلمانوں کی تیسری قسم کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو لوگ ایمان تو لائے؛ لیکن ہجرت نہیں کی تو ان سے مسلمانوں کا دوستانہ تعلق نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ اسلام کی تائید وتقویت میں کوئی کردار ادا نہیں کررہے ہیں؛ البتہ اگر وہ ہجرت کرجائیں تو ان کا حکم عام مسلمانوں کی طرح ہوگا، ظاہر ہے کہ جو مسلمان مجبوری کی وجہ سے ہجرت نہ کرپائے، وہ اس عتاب میں شامل نہیں ہیں، اس آیت میں یہ بات بھی بتائی گئی کہ اگر مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں پھنسے ہوئے ہوں تو مسلمان حکومتوں کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی مدد کریں، اگر اس غیر مسلم ملک سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا اور جنگ کی قدرت حاصل ہو تو جنگی کارروائی کرنا بھی ضروری ہے اور اگر ایک دوسرے کے معاملہ میں دخیل نہ ہونے کا کوئی معاہدہ پہلے سے ہو چکا ہے تو اخلاقی دباؤ ڈال کر مظلوم مسلمانوں کی مدد کی جائے، نہ یہ کہ ان کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ آج کل فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ پڑوسی مسلمان ملکوں کا حال ہے؛ کیوں کہ پوری دنیا کے مسلمان علاقہ ومکان سے بالاتر ہوکر ایک اکائی ہیں اور ان میں سے ایک فرد پر زیادتی دراصل پوری امت کے ساتھ زیادتی ہے —— یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں مسلمانوں کے لئے دین پر قائم رہنا دشوار ہوجائے اور ان کے لئے کسی ایسی مامون جگہ پر منتقل ہونا ممکن ہو، جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے دین پر عمل کرسکتے ہوں تو ایسے مسلمانوں کے لئے اس مقام سے ہجرت کرجانا واجب ہے۔ (مفاتیح الغیب:۷/ ۵۵۹)

﴿۱﴾ یعنی جیسے پوری دنیا کے مسلمان ایک اکائی ہیں، اسی طرح پوری دنیا کے غیر مسلم بھی ایک ملت کا درجہ رکھتے ہیں؛ ←

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا مَعَكُمۡ فَاُولٰٓئِكَ مِنۡكُمۡ ؕ وَ اُولُوا الۡاَرۡحَامِ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰى بِبَعۡضٍ فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۵﴾ ع۱۰ رکوع

اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے ، ہجرت کی اور انھوں نے تمہارے ساتھ جہاد کیا ، وہ بھی تم لوگوں ہی میں ہیں ﴿۱﴾ اور اللہ کے فیصلہ کے مطابق رشتہ دار ایک دوسرے (سے میراث) کے زیادہ حقدار ہیں ﴿۲﴾ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہیں ۔ ﴿۷۵﴾

← لہٰذا اگر مسلمان اسلام سے برسر جنگ اور آمادۂ پیکار غیر مسلموں سے دوستی کا تعلق رکھیں تو یہ فتنہ وفساد کا سبب بنے گا ، یعنی جنگ وجدال کی نوبت آئے گی اور کفر کو غلبہ حاصل ہوجائے گا۔

﴿۲﴾ اس آیت میں مزید تاکید کے طور پر پہلے دونوں گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سب سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہیں ۔

﴿۱﴾ یہ مسلمانوں کی چوتھی قسم کا ذکر ہے ، یعنی جو لوگ ایمان تو لائے ؛ لیکن آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہیں کی ؛ بلکہ بعد میں ہجرت کی اور جہاد میں شریک بھی ہوئے ، ان کا درجہ مہاجرین اولین اور انصار سے کم تر ہے : '' فَاُولٰئِکَ مِنۡکُمۡ '' (یعنی وہ بھی تم لوگوں ہی میں ہیں) کی تعبیر میں اس کا اشارہ موجود ہے ۔ (مفاتیح الغیب : ۷/ ۵۵۹)

﴿۲﴾ دوستی اور ولایت کے لفظ سے شبہ ہوسکتا تھا کہ رشتۂ ایمان کی بنا پر یہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے ؛ اس لئے وضاحت فرمادی گئی کہ میراث کی بنیاد صرف خاندانی رشتہ ہے ، یعنی خاندانی رشتہ داری کی بنا پر لوگوں کو ایک دوسرے سے میراث ملے گی ، جس کا ذکر تفصیل سے سورہ نساء (آیت نمبر : ۱۷۶) میں آیا ہے : '' فِیۡ کِتَابِ اللّٰہ '' (اللہ کے فیصلہ کے مطابق) سے ان ہی احکام میراث کی طرف اشارہ ہے ، فقہاء کی اصطلاح میں کچھ رشتہ دار 'ذوی الفروض' کہلاتے ہیں ، جن کے حصے خود قرآنِ پاک میں ذکر کئے گئے ہیں ، دوسرے : عصبات ، یعنی جن سے مردوں کے واسطہ سے رشتہ داری ہے ، تیسرے : اولوالارحام یا ذوی الارحام ، یعنی دوسرے رشتہ دار ، — البتہ اس آیت میں جو 'اولوالارحام'' کا لفظ ہے ، اس میں وہ تمام رشتہ دار شامل ہیں ، جنھیں درجہ بہ درجہ ترکہ ملے گا ، اس سے 'ذوی الارحام' کی فقہی اصطلاح مراد نہیں ہے ؛ کیوں کہ یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے — دراصل ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے کا وارث قرار دیا گیا ، سورۂ انفال کی اس آیت نے اس حکم کو منسوخ کردیا اور واضح کردیا کہ خاندانی رشتہ وتعلق کی بنیاد پر ترکہ کی تقسیم عمل میں آئے گی ، اُخوتِ اسلامی کی بنیاد پر میراث کا جو نظام قائم کیا گیا تھا ، وہ ایک عبوری نظام تھا ، اگر ہمیشہ اسی کو باقی رکھا جاتا تو بڑی دشواری ہوتی ؛ کیوں کہ کسی بھی شہر میں مسلمانوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں میں ہوسکتی ہے ، ایک شخص کی میراث کا اتنے حصوں میں تقسیم کرنا ایک دشوار بات ہوتی اور لوگوں کو میراث اتنی کم مقدار میں ملتی کہ انھیں اپنی زندگی کے مسائل حل کرنے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی ۔

سُوۡرَةُ التَّوۡبَة

- سورہ نمبر : (۹)
- رکوع : (۱۶)
- آیتیں : (۱۲۹)
- نوعیت : مدنی

آسان تفسیر قرآن مجید

چوں کہ اس سورت میں غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کی توبہ قبول کئے جانے کا ذکر ہے؛ اس لئے اسے ''توبہ'' کہا گیا ہے، نیز اس سورت کے شروع ہی میں مشرکین سے ''براءت'' کا اظہار کیا گیا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام ''سورۂ براءت'' بھی ہے، اس کے علاوہ اور بھی متعدد نام مروی ہیں، جو اس سورت کے مضامین سے مناسبت رکھتے ہیں، یہ سورت ۹/ہجری میں غزوۂ تبوک کے موقع سے نازل ہوئی اور زیادہ تر آیات اسی واقعہ سے متعلق ہیں۔

اس سورہ میں بھی زیادہ تر وہی مضامین ہیں، جو سورۂ انفال میں ہیں؛ بلکہ مضامین واحکام کے اعتبار سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ سورت سورۂ انفال کا تکملہ ہے، اس سورت میں بنیادی طور پر مشرکین اور اہل کتاب سے جہاد کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اسی کے ضمن میں یہ بات بھی آئی ہے کہ جن مشرکین سے کوئی معاہدہ ہوا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہیں تو ان سے معاہدہ باقی رہے گا؛ لیکن دوسرے مشرکین کو چار ماہ کے بعد جزیرۃ العرب میں رہنے کی اجازت نہیں ہوگی؛ کیوں کہ یہ توحید کا مرکز ہے اور کوئی ملک اپنے دار الخلافہ میں دشمنوں کے رہنے کا روادار نہیں ہوسکتا، یہ بھی حکم دیا گیا کہ مشرکین کو مسجدِ حرام میں داخل ہونے اور حج میں شریک ہونے کی اجازت نہیں، اہل کتاب کے سلسلہ میں جزیہ کا حکم دیا گیا اور دین کے تمام شعبوں کی رعایت کرتے ہوئے ہدایت دی گئی کہ اگرچہ جہاد فرض ہے؛ لیکن دین کا علم حاصل کرنا کچھ کم بڑا فریضہ نہیں؛ اس لئے ایک گروہ ایسا بھی ہونا چاہئے، جو علم دین کے حاصل کرنے اور پہنچانے کے لئے یکسو رہے۔

دوسرا بنیادی مضمون اس سورت میں منافقین کے مختلف گروہوں کا ہے؛ چنانچہ منافقین کے مختلف گروہوں کے طرزِ عمل مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور بہانہ جوئیوں وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اسی ضمن میں ''مسجدِ ضرار'' کا ذکر آیا ہے، اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو موسم حج میں مکہ روانہ فرمایا اور اعلان کرادیا کہ آئندہ مشرکین کو حج میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس سورت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نہیں لکھا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ پر بعض دفعہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں، جب ایک سورت مکمل ہوتی تھی اور دوسری سورت کو اس کے بعد رکھا جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا تھا، تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی آیت بھی نازل ہوتی تھی؛ لیکن سورہ توبہ رسول اللہ ﷺ پر آخری وقت تک نازل ہوتی رہی، آپ ﷺ نے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھوایا اور اس سورت کی جگہ بھی متعین نہیں فرمائی، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے سورۂ انفال کے مضامین سے مناسبت کی وجہ سے اِس کی جگہ سورہ انفال کے بعد متعین کی؛ لیکن چوں کہ حضور ﷺ نے بسم اللہ نہیں لکھایا تھا؛ اس لئے بسم اللہ نہیں لکھایا؛ البتہ دونوں سورتوں میں امتیاز کے لئے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی، اس سے قرآن مجید کی صداقت اور اس کا مستند ومعتبر ہونا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جس چیز کو جس طرح لکھایا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو اسی طرح باقی رکھا اور اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی؛ چنانچہ جب کوئی شخص اوپر سے قرآن مجید پڑھتا ہوا آئے تو سورۂ توبہ سے پہلے بسم اللہ نہ پڑھے؛ البتہ اگر سورۂ توبہ ہی سے تلاوت شروع کرے تو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید کی کسی سورت کی درمیان سے بھی تلاوت کی جائے تو اس موقع پر تعوذ اور تسمیہ پڑھنا مستحب ہے۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖٓ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ؕ﴿۱﴾ فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ وَّ اعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰہَ مُخْزِی الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲﴾

(مسلمانو!) جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کر رکھا ہے، ان سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دستبرداری (کا اعلان کیا جاتا) ہے ﴿۱﴾ پس (اے ایمان نہ لانے والو!) اس ملک میں چار ماہ تک گھوم پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یقیناً اللہ کفر کرنے والوں کو رسوا کر کے رہیں گے۔ ﴿۱﴾ ﴿۲﴾

﴿۱﴾ ہجرت کے چھٹے سال حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ سے دس سال کی مدت کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوا تھا، پھر اس معاہدہ میں مسلمانوں کی طرف سے بنوخُزاعہ اور اہل مکہ کی طرف سے بنوبکر بھی شامل ہو گئے، یہ دونوں قبیلے ابھی ایمان نہیں لائے تھے، اس کے بعد مختلف دوسرے قبائل کے ساتھ بھی آپ ﷺ نے امن و آشتی کے معاہدے فرمائے، بعضوں سے تعیین مدت کے ساتھ معاہدہ تھا اور بعضوں سے بلاتعیین مدت؛ لیکن اہل مکہ اور بنوبکر نے اپنے عہد کو پورا نہیں کیا، مدینہ میں یہودیوں سے بھی مسلمان بار بار دھوکہ کھا چکے تھے، دوسری طرف جزیرۃ العرب چوں کہ اسلام کا مرکز تھا؛ اس لئے ضروری تھا کہ اس پورے علاقہ پر توحید کا رنگ قائم رہے اور وہ کفر و شرک سے محفوظ ہو؛ اس لئے ہجرت کے نویں سال اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان آیا کہ اب کفار و مشرکین سے مسلمانوں کے معاہدات ختم کئے جاتے ہیں، جن قوموں سے معاہدہ تھا، وہ تین قسم کی تھیں: ایک وہ جن کی مدت چار ماہ سے کم رہ گئی تھی، دوسرے: وہ جن سے معاہدہ کی کوئی مدت متعین نہیں تھی، ان دونوں کے لئے حکم دیا گیا کہ چار ماہ گذرنے پر معاہدہ ختم سمجھا جائے گا، تیسرے: وہ لوگ تھے، جن سے چار مہینے سے زیادہ کی مدت کا معاہدہ تھا، ان کے لئے آگے کی آیت میں حکم دیا گیا کہ ان کی مقررہ مدت تک معاہدہ باقی رہے گا، چار ماہ سے مراد یوم عرفہ سے چار مہینہ کی مدت تھی۔

ہجرت کے نویں سال حج میں رسول اللہ ﷺ نے خود شرکت نہیں فرمائی، ایک تو اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے طور پر سال میں کچھ ایام بڑھا لئے تھے، اس لحاظ سے ۹ رہجری میں حج اپنے اصل وقت سے دس دن پہلے ہو رہا تھا، دوسرے: عرب کے بہت سے مشرکین —— جن کو اہل مکہ سے کپڑا نہیں مل پاتا تھا —— بے لباس ہو کر حج کرتے تھے، آپ ﷺ کو اس ماحول میں حج کرنا منظور نہیں تھا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ، اس حج میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یوم ترویہ یعنی آٹھ ذی الحجہ، یوم عرفہ یعنی نو ذی الحجہ، یوم نحر یعنی دس ذی الحجہ، نیز بارہ ذی الحجہ کو حج کے خطبات دیئے اور ہر خطبہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے معاہدات کے ختم ہونے کا اعلان فرمادیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے اپنے نمائندہ کی حیثیت سے اس لئے بھیجنا ضروری سمجھا کہ عربوں کی قدیم روایت کے مطابق وہی اعلان معتبر سمجھا جاتا تھا، جو خود صاحبِ معاملہ کی طرف سے ہو یا کم سے کم اس کے خاندان کے کسی فرد کے ذریعہ ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر سورہ توبہ کی ابتدائی چالیس آیات پڑھ کر مجمع کو سنائیں۔ (تفسیر قرطبی: ۸؍ ۶۴-۶۸)

اس سلسلہ میں چند باتیں قابلِ وضاحت ہیں: اول یہ کہ یہ اعلان مشرکین کے لئے تھا نہ کہ اہل کتاب کے لئے، دوسرے: یہ اعلان جزیرۃ العرب کے لئے تھا نہ کہ اس کے باہر کے لئے؛ چنانچہ اس اعلان کے بعد عہدِ نبوی اور خلافت راشدہ میں جزیرۃ العرب کے ←

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ۬ وَرَسُوۡلُهٗ ‌ؕ فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ‌ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍۙ ۝۳

بڑے حج کے دن ﴿۱﴾ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان ہے کہ اللہ اور اس کا رسول شرک کرنے والوں سے بے تعلق ہیں؛ لہٰذا اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے ہی حق میں بہتر ہے اور اگر تم نہ مانو گے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور کفر کرنے والوں کو دردناک عذاب کی ''خوشخبری'' سنادیجئے۔ ﴿۲﴾ ۝۳

← باہر کے مشرکین سے معاہدے کئے گئے؛ اس لئے یہ آیت غیر مسلموں سے معاہدہ امن کو روکتی نہیں ہے، تیسرے: معاہدہ سے دست برداری کا مقصد یہ تھا کہ مشرکین جزیرۃ العرب کو اپنا وطن نہیں بنا سکتے اور مستقل سکونت نہیں رکھ سکتے، ان کی آمد ورفت پر پابندی نہیں تھی؛ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ حدودِ حرم میں غیر مسلموں کو آنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔

﴿۱﴾ ''حج اکبر'' سے کون سا حج یا حج کے دنوں میں سے کون سا دن مراد ہے؟ — اس میں اختلاف ہے، زیادہ تر حضرات کی رائے ہے کہ حج اکبر سے مراد وقوفِ عرفہ ہے؛ کیوں کہ وقوفِ عرفہ ہی حج کا رکنِ اعظم ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ سے یہی منقول ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے ۱۰/ ذی الحجہ مراد ہے، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے، حضرت مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صراحتاً منقول ہے کہ حج اکبر کا دن یوم عرفہ ہے: ''یوم الحج الأکبر یوم عرفة'' اب ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہر سال کا حج ''حج اکبر'' (بڑا حج) ہے اور حج اکبر کا دن یوم عرفہ یا یوم قربانی ہے اور حج کو حج اکبر عمرہ کے مقابلہ میں کہا گیا ہے، گویا عمرہ ''حج اصغر'' (چھوٹا حج) ہے اور حج ''حج اکبر'' ہے، یہی زیادہ درست ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا تھا، وہ حج اکبر تھا، (تفسیر قرطبی: ۸/۶۹-۷۰) — عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ اگر یوم عرفہ جمعہ کو پڑے تو وہ ''حج اکبر'' ہے؛ لیکن یہ درست نہیں ہے، یہ حسنِ اتفاق ہے کہ حجۃ الوداع کے سال یوم عرفہ کے دن جمعہ تھا؛ البتہ اہل علم کے نزدیک جمعہ کو یوم عرفہ پڑے تو اس میں مزید فضیلت ہے؛ کیوں کہ اس طرح یوم عرفہ اور یوم جمعہ دونوں کی برکتیں جمع ہوجاتی ہیں، اس سلسلہ میں بعض ضعیف روایتیں بھی منقول ہیں۔ (دیکھئے: فتح الباری: ۸/۲۷۱، حدیث نمبر: ۴۶۰۶)

﴿۲﴾ کفار و مشرکین سے بے تعلق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے ساتھ کوئی سیاسی معاہدہ نہیں ہوگا، ورنہ تو دنیا میں رحمت و رأفت کا تعلق اللہ اور اس کے رسول کا ہر مخلوق کے ساتھ ہے، اسی تقاضۂ رحمت کے تحت انھیں تلقین کی جارہی ہے کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرلیں کہ یہ ان کے لئے دنیا و آخرت میں بھلائی کا ذریعہ ہے اور اگر وہ توبہ نہیں کریں تو یاد رکھیں کہ وہ اللہ کے قابو میں ہیں، اللہ جب چاہیں انھیں سزا دے سکتے ہیں، وہ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلق کی اصل بنیاد دعوت ہے؛ اسی لئے معاہدہ کے ختم کئے جانے کا یہ اعلان بھی دعوتِ اسلام کو شامل ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ
الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ
وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

سوائے ان مشرکین کے جن سے تمہارا معاہدہ ہوا ہو، پھر انھوں نے تمہارے ساتھ (عہد پورا کرنے میں) کوئی کوتاہی نہ کی ہو اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی ہو، تو ان سے طئے پانے والی مدت تک ان کے ساتھ عہد پورا کرو، بے شک اللہ احتیاط کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں ﴿۱﴾ ۝۴ پھر جب حرام مہینے ختم ہوجائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو، انھیں گرفتار کرو، ان کا محاصرہ کرو اور ہر تاک کی جگہ میں ان کے لئے بیٹھو، ﴿۲﴾ پھر اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، ﴿۳﴾ یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔ ۝۵

﴿۱﴾ جس وقت قرآن مجید کا یہ حکم آیا اس وقت بعض قبائل کی مدت معاہدہ میں سے نو مہینے باقی تھے اور ان کی طرف سے عہد شکنی یا مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد جیسی کوئی بات ہی پیش نہیں آئی تھی، اس آیت میں ان ہی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ معاہدہ کی مدت کو پورا کیا جائے، اس آیت میں اس بات کا اشارہ بھی موجود ہے کہ قرآن نے جن معاہدات کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے، وہ یک طرفہ نہیں تھا؛ بلکہ اعداء اسلام کی طرف سے وعدہ خلافی کے جو واقعات پیش آئے اور خفیہ طور پر مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرنے اور پوشیدہ طور پر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جو صورت حال سامنے آئی، اس کی وجہ سے یہ معاہدات منسوخ کردیئے گئے۔

﴿۲﴾ حرام مہینوں سے مراد ہیں: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، ان چاروں مہینوں میں جنگ میں پہل کرنے سے منع فرمایا گیا، ان کے علاوہ مہینوں میں کفار و مشرکین سے جہاد کی اجازت دی گئی؛ لیکن یہ حکم ان کفار و مشرکین کے لئے ہے، جو مسلمانوں سے عداوت کا برتاؤ کرتے ہوں اور ان سے برسر پیکار ہوں، جو لوگ مسلمانوں کے ساتھ امن و آشتی کا رویہ اختیار کریں اور مسلمانوں کا ان کے ساتھ امن معاہدہ ہو، ان کے خلاف جنگ کرنا جائز نہیں، جیسا کہ النساء: ۹۰ میں فرمایا گیا ہے، پس یہ اور اس طرح کی آیات اس پس منظر میں ہیں، جس سے اُس وقت مسلمان دوچار تھے اور ایسے ہی کفار و مشرکین کے خلاف کاروائی کا حکم ہے، جو مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ تھے، ہر کافر و مشرک کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

﴿۳﴾ یعنی جو لوگ ایمان بھی نہ لائے ہوں اور ایمان لانے والوں سے آمادۂ جنگ بھی ہوں، ان سے جنگ بندی کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ مسلم حکومت کی اطاعت قبول کرلیں اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کریں، یا اسلام قبول کرلیں، یہاں اسی ←

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۟۶ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ ع ۶/۷
اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۟۷

اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دیا کریں؛ تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں، یہ اس لئے کہ یہ ناواقف لوگ ہیں ﴿۱﴾ ۶ مشرکین کا اللہ اور اس کے رسول سے عہد کیسے رہ سکتا ہے؟ سوائے ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے، تو جب تک وہ معاہدہ پر قائم رہیں، تم بھی ان سے معاہدہ پر قائم رہو، بے شک اللہ احتیاط کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۷

← دوسری صورت کا ذکر ہے کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو ان کی پچھلی سرکشیوں اور شرارتوں کی وجہ سے ان کا پیچھا نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ انھیں چھوڑ دیا جائے گا، کفر سے تائب ہونے اور مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اس آیت کی بنا پر بعض فقہا کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھے تو اسے قتل کر دیا جائے گا؛ لیکن اکثر فقہاء کے نزدیک یہاں نماز و زکوٰۃ کا ذکر شرط ایمان کے طور پر نہیں ہے؛ بلکہ علامتِ ایمان کے طور پر ہے، ہاں اگر کوئی شخص نماز پڑھنے سے انکار کر جائے یا زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرے تو وہ دائرہ ایمان سے باہر ہو جاتا ہے، ایسا شخص اگر توبہ نہ کرے اور اسلامی حکومت ہو تو قاضی مرتد ہونے کی بنا پر اس کے قتل کئے جانے کا حکم دے سکتا ہے؛ اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے جہاد فرمایا، جنھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ (مفاتیح الغیب: ۷/۵۷۴)

﴿۱﴾ اس سے دعوت دین کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے غیر مسلم بھائیوں کو موقع دینا چاہئے کہ وہ ان کے درمیان آ کر رہیں اور دین کو سمجھیں کہ شاید یہ اِن کے لئے ہدایت کا باعث ہو، اس آیت میں خاص طور پر کلام اللہ کے سننے کا ذکر کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس زمانہ میں علم کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ سننا اور سنانا تھا، وہ پریس اور لٹریچر کا دور نہیں تھا، ہمارے عہد کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر اور قرآن مجید کا ترجمہ غیر مسلم بھائیوں تک پہنچایا جائے، اللہ تعالیٰ کے اس حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مختلف قوموں کی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ ہونا چاہئے؛ تاکہ وہ اللہ کے کلام کو سمجھ سکیں، یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان ملکوں کو غیر مسلم ملکوں کے شہریوں کو ویزا فراہم کرنا چاہئے، اگر وہ دین کو سمجھنے اور سیکھنے کے لئے کسی اسلامی ملک میں آنا چاہیں، اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ جب کوئی غیر مسلم مسلمانوں کی آبادی میں آئے تو اس کی حفاظت کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی غیر مسلم یا مسلمان کسی دین سے واقف مسلمان سے دین کے بارے میں کوئی بات دریافت کرے تو اس شخص پر واجب ہے کہ اس کی رہنمائی کرے۔

﴿۲﴾ یعنی وہ مشرکین جن سے بار بار عہد شکنی اور وعدہ خلافی کا تجربہ ہو چکا ہے، ان کے عہد پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ ←

كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرۡضُوۡنَكُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَتَاۡبٰى
قُلُوۡبُهُمۡ ۚ وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۞ ۸ اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ
اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۞ ۹ لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الۡمُعۡتَدُوۡنَ ۞ ۱۰ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى الدِّيۡنِ ؕ
وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۞ ۱۱

ان کے وعدہ کی کیوں کر رعایت کی جائے؛ حالاں کہ اگر وہ تم پر غلبہ حاصل کرلیں تو تم سے، نہ رشتہ اور قرابت کا خیال کریں، نہ عہد و پیاں کا، وہ اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو راضی کر رہے ہیں، مگر ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے اور ان میں سے زیادہ تر بُرے ہی لوگ ہیں «۱» ۸ یوں لوگوں نے اللہ کے احکام کو تھوڑی قیمت میں بیچ ڈالا ہے، اور اس کے راستہ سے روکا ہے، یقیناً ان کے اعمال بہت ہی بُرے ہیں ۹ یہ کسی مسلمان کے معاملہ میں نہ رشتہ کا لحاظ کرتے ہیں نہ وعدہ کا، اور یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں ۱۰ پھر اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہوجائیں گے اور ہم ان لوگوں کے لئے اپنے احکام کو وضاحت سے بیان کر رہے ہیں، جو سمجھدار ہیں۔ «۲» ۱۱

← پھر اس کے ساتھ قرآن مجید نے اُصولی حکم دیا کہ اگر غیر مسلم اپنے وعدہ پر قائم رہیں تو مسلمانوں کے لئے بھی اپنے عہد پر قائم رہنا واجب ہے؛ کیوں کہ وعدہ کو وفا کرنا دین کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔

«۱» یہ خیال ہوسکتا تھا کہ مشرکینِ مکہ سے جو عہد و پیاں ہوچکا ہے، ان کو کیسے یک طرفہ طور پر ختم کردیا جائے؟ اسی کا جواب دیا جارہا ہے کہ ان مشرکین کی صورتِ حال یہ ہے کہ نہ ان کے نزدیک رشتہ وقرابت کی اہمیت ہے، نہ عہد و پیان کا لحاظ ہے، یہ کچھ امن وآشتی کی بات بھی کرتے ہیں تو اللہ کو معلوم ہے کہ یہ صرف زبان کی حد تک ہے، ان کے دل مسلمانوں کے خلاف بغض وعناد سے بھرے ہوئے ہیں؛ اس لئے ان سے معاہدہ باقی رکھنا آستین میں سانپ پالنے کے مترادف ہے۔

«۲» آیت نمبر: ۹ تا ۱۱ میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب موجود تھی، مگر تھوڑے سے دنیوی مفاد کے لئے انھوں نے اس کتاب کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، جن میں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں، ان کا حال بھی مشرکین مکہ سے مختلف نہیں ہے، ان کے یہاں بھی نہ رشتہ کا لحاظ ہے، نہ وعدہ کا پاس، اور ان کے لئے بھی وہی حکم ہے کہ اگر وہ کفر سے توبہ کرلیں اور ایمان کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے نماز و زکوۃ کا اہتمام کریں تو یہ عام مسلمانوں کی طرح ہوجائیں گے اور دنیا اور آخرت کی کامیابی سے سرفراز ہوں گے۔

وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور اگر یہ لوگ وعدہ کرنے کے بعد بھی اپنے عہد توڑ دیں اور تمہارے دین پر اعتراض کریں تو سردارانِ کفر سے جنگ کرو کہ ان کی قسموں کا اعتبار نہیں؛ ممکن ہے کہ وہ (اس طرح بدعہدی سے) باز آجائیں ﴿۱﴾ ﴿۱۲﴾ کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کروگے، جو خود اپنی قسموں کو توڑ چکے ہیں اور جنھوں نے رسول کو نکال دینے کا ارادہ کرلیا تھا اور انھوں نے خود تم سے چھیڑ خوانی میں پہل کی ہے، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؛ حالاں کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۳﴾

﴿۱﴾ عوام چوں کہ اپنے قائدین کے تابع ہوتے ہیں اور ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں؛ اس لئے خاص طور پر سرداران کفر سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کی گردنیں جھک جائیں تو عوام خود بہ خود اسلام کے سامنے سر جھکا دیں گے، —— اس آیت کی روشنی میں علماء نے اس بات پر بحث کی ہے کہ اگر مسلمان ملک میں کسی غیر مسلم نے اسلام کے بارے میں برا بھلا کہا تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ بعض فقہاء کے نزدیک ایسے شخص کی شہریت ختم ہوجائے گی اور وہ قتل کا مستحق ہوگا، خاص طور پر اگر اس نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اہانت آمیز ریمارک کئے ہوں، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسے شخص سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ اپنی بات سے رجوع کرے اور معذرت خواہی کرے، اگر وہ معذرت خواہی کرے تو اس کی معذرت قبول کی جائے گی اور اگر اس سے انکار کرے تو پھر اس کی مناسب سرزنش کی جائے گی؛ لیکن اس کی شہریت اس وقت تک ختم نہیں ہوگی اور اس سے جنگ نہیں کی جائے گی، جب تک کہ وہ عہد کو نہ توڑے؛ کیوں کہ قرآن نے دو باتوں کے مجموعہ پر ان سے جنگ کا حکم دیا ہے، ایک: اسلام پر طعن، دوسرے: عہد کی خلاف ورزی، یہی حکم اس شخص کے لئے ہے جو رسول اللہ ﷺ کی توہین کرے؛ البتہ ایسا شخص سخت سزا کا مستحق ہے اور یہ سزا قتل بھی ہوسکتی ہے (دیکھئے: قرطبی: ۸/ ۸۳) —— ''دین میں طعن کرنا'' سے مراد اسلام پر اہانت آمیز اعتراض کرنا ہے، اگر اسلام کے کسی حکم پر سنجیدہ عقلی تنقید ہو اور یہ تنقید مہذب الفاظ میں ہو تو اس سے قتل کا حکم متعلق نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا بنو نجران سے مباحثہ ہوا، انھوں نے اسلام پر اعتراضات بھی کئے اور آپ ﷺ نے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش فرمائی۔

﴿۲﴾ یعنی اہل مکہ نے تو خود جنگ میں پہل کی ہے کہ حدیبیہ میں جو معاہدہ ان سے ہوا تھا، انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی اور بنوخزاعہ پر حملہ کردیا تو ایسے وعدہ خلافی کرنے والے لوگوں سے جنگ کرنے میں کیا تأمل ہے؟ —— نیز جب انھیں کی طرف سے پہل ہوئی ہے تو تمہارا ان سے جہاد کرنا پوری طرح انصاف کے مطابق ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٥﴾
اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾ ع ٢/٨

تم کفر کرنے والوں سے جنگ کرو، اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیں گے، انھیں رسوا کریں گے، ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کریں گے، مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کریں گے ﴿١٤﴾ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کر دیں گے، ﴿١﴾ نیز اللہ جس کو چاہیں گے توبہ نصیب فرمائیں گے اور اللہ خوب جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں ﴿١٥﴾ کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی چھوڑ دئے جاؤ گے؛ حالاں کہ تم میں سے جن لوگوں نے جہاد کیا اور اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی خصوصی دوست نہیں بنایا، اللہ نے (عملی اعتبار سے) انھیں دیکھا ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے سبھی کاموں سے خوب باخبر ہیں۔ ﴿٢﴾ ﴿١٦﴾

﴿١﴾ صلح حدیبیہ میں یہ بات طے پائی تھی کہ امن قائم رکھنے اور جنگ نہ کرنے کا یہ معاہدہ مسلمانوں کے اور اہل مکہ کے حلیفوں کو بھی شامل ہوگا، بنوخُزاعہ نامی قبیلہ مسلمانوں کا حلیف بنا اور بنوبکر نامی قبیلہ مشرکین مکہ کا، بنوبکر کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخانہ توہین آمیز اشعار کہے، بنوخزاعہ کے ایک شخص نے اس کو ایسے اشعار پڑھنے سے منع کیا اور کہا کہ اگر آئندہ ایسا کرے تو میں منھ توڑ دوں گا؛ چنانچہ اس نے دوبارہ بدتمیزی کی اور اس خُزاعی شخص نے اس کے منھ پر مُکہ رسید کر دیا، اس کے نتیجہ میں لڑائی بھڑک اٹھی اور بنوخزاعہ کے کچھ لوگ قتل کر دیئے گئے، آخر عمرو بن سالم خزاعی ایک وفد کے ساتھ بارگاہِ نبوی (ﷺ) میں حاضر ہوئے اور انھیں اطلاع دی، حضور ﷺ نے ان کی مظلومیت کا حال سن کر فرمایا کہ اگر میں ان کی مدد نہ کروں تو میری مدد نہ کی جائے، ظاہر ہے کہ اس وقت بنوخُزاعہ، بنوبکر اور ان کے حلیف مشرکین مکہ کے جور وفتن سے بے حد آزردہ تھے اور فطری طور پر ان کے اندر غیظ وغضب اور انتقام کا جذبہ تھا، اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد کریں گے، اسلام کے دشمنوں کو رسوا کریں گے، ان مظلوموں کو دل کا سکون حاصل ہوگا اور ان کے غصہ کی آگ بھی بجھ جائے گی۔ (قرطبی: ۸/ ۸۷)

﴿٢﴾ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے ظاہر وباطن سے خوب واقف ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ عملی طور پر انسان کی سوچ ظاہر ہو جائے اور اس کا طرزِ عمل لوگوں کے سامنے آجائے، اِس کے لئے ان کا امتحان لیا جاتا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جب تک عملی طور پر یہ بات ظاہر نہ ہو جائے کہ تم میں سے کون لوگ اسلام کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں، اس وقت تک انھیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۱۷ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝۱۸

شرک کرنے والوں کو حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں؛ حالاں کہ انھیں خود ہی اپنے کافر ہونے کا اقرار ہے، یہی لوگ ہیں جن کے عمل اکارت ہو چکے ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے ۝۱۷ اللہ کی مسجدوں کو وہی آباد کریں، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں، جو نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور صرف اللہ ہی سے ڈریں تو اُمید ہے کہ وہ ہدایت پانے والوں میں شامل ہو جائیں گے۔ ﴿۱﴾ ۝۱۸

﴿۱﴾ تعمیر مسجد کی دو صورت ہے: ایک ہے مسجد میں نماز پڑھنا اور عبادت کرنا، دوسرے: مسجد کی عمارت بنانا اور اس کی مرمت کرنا، تو ظاہر ہے کہ مسجد میں عبادت کرنا مسلمانوں کا حق ہے اور مسجد کی تعمیر بھی اصل میں مسلمانوں کی ہی ذمہ داری ہے، سوال یہ ہے کہ کیا غیر مسلم مسجد میں داخل ہو سکتے ہیں اور کیا مسجد کی تعمیر میں ان کا تعاون قبول کیا جا سکتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ غیر مسلموں کے لئے مسجد میں آمد ورفت کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو ثقیف اور بنو نجران وغیرہ غیر مسلم قبائل کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا تھا، اسی طرح جو غیر مسلم گرفتار کئے جاتے تھے، انھیں بھی مسجد ہی میں قید کیا جاتا تھا، —— جہاں تک تعمیر مسجد میں غیر مسلموں کے تعاون قبول کرنے کی بات ہے تو احناف کے نزدیک یہ بھی جائز ہے، اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق اسے کارِ ثواب سمجھ کر انجام دے، جیسا کہ فقہاء نے بیت المقدس کے بارے میں لکھا ہے کہ یہودیوں یا عیسائیوں کا وقف بیت المقدس کے لئے درست ہے (ردالمحتار: ۶/ ۵۲۴)؛ اس لئے اگر غیر مسلم بادشاہ نے اپنی رعایا کے لئے مسجد تعمیر کرائی ہو تو وہ مسجد شرعی ہوگی اور مسجد ہی سے متعلق احکام اس پر جاری ہوں گے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نبی بنائے گئے تو کعبۃ اللہ کی عمارت مشرکین مکہ کی تعمیر کی ہوئی تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے اس کو تبدیل کرنا ضروری نہیں سمجھا، اسی طرح ایک مسئلہ مساجد پر غیر مسلموں کے متولی ہونے کا ہے، فقہاء نے عام طور پر متولی کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے، (ردالمحتار: ۶/ ۵۷۸)؛ لیکن اس آیت کی رو سے بہتر یہی ہے کہ خود مسلمان مسجد کے متولی ہوں، تاہم اگر کسی غیر مسلم بادشاہ نے مسجد تعمیر کی اور کسی غیر مسلم شخص کو ہی اس کا منتظم مقرر کیا، تب بھی وہ مسجد، مسجد باقی رہے گی اور کراہت کے ساتھ اس غیر مسلم کی تولیت درست ہوگی، حضور ﷺ نے مکہ فتح ہونے کے بعد کعبۃ اللہ کی کنجی قبیلۂ بنو شیبہ کے عثمان کو واپس کر دی تھی (البدایہ والنہایہ: ۴/ ۳۰۱)؛ حالاں کہ وہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس سے احناف کے اس موقف کو تقویت پہنچتی ہے، —— جہاں تک اس آیت کی بات ہے تو یہاں مسجد کو آباد کرنے سے مراد حج کرنا ہے؛ کیوں کہ خود حج بیت اللہ بھی مسجد حرام کو آباد کرنے کی اعلیٰ ترین شکل ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حسن بصری رحمہ اللہ اور مختلف لوگوں نے یہاں مسجد حرام ہی مراد لیا ہے۔ (قرطبی: ۸/ ۸۹)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا
نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا
تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ
وَاَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ
تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ
بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

وقف لازم

ع ۸/۳

(اے مشرکین مکہ!) کیا تم نے حاجی کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے (عمل کے) ہم پلہ بنا دیا، جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا ہو، اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہیں ﴿۱﴾ اور اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے ﴿۱۹﴾ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بلند ہے اور وہی حقیقت میں کامیاب لوگ ہیں ﴿۲۰﴾ ان کو ان کے رب اپنی رحمت اور خوشنودی کا نیز ایسے باغوں کا مژدہ سناتے ہیں، جن میں ہمیشہ کا آرام رہے گا، ﴿۲۱﴾ وہ ہمیشہ اسی میں رہا کریں گے، بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے ﴿۲﴾ ﴿۲۲﴾ اے ایمان والو! اگر تمہارے باپ دادا اور بھائی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو ان کو دوست نہ بناؤ اور تم میں سے جو لوگ انھیں دوست بنائیں گے، وہی زیادتی کرنے والے ہوں گے ﴿۲۳﴾ (اے رسول!) آپ کہہ دیجئے، اگر تمہارے باپ دادا، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، مال و اسباب جن کو تم نے حاصل کیا ہے، (تمہاری) تجارت جس کے بیٹھ جانے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور وہ رہائش گاہیں جنھیں تم پسند کرتے ہو، اگر تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ جاری کر دیں، ﴿۳﴾ اور اللہ نافرمانی کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے۔ ﴿۲۴﴾

﴿۱﴾ اہل مکہ کا دعویٰ تھا کہ ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں، مسجد حرام کا انتظام و انصرام کرتے ہیں اور کعبۃ اللہ کے خدام ہیں؛ اس لئے ہمیں فضیلت حاصل ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بعض اوقات یہودیوں سے دریافت کرتے کہ ہم یہ خدمتیں انجام دیتے ہیں ←

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىۡ مَوَاطِنَ كَثِيۡرَةٍ ۙ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَـتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـئًا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ‌ۚ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَـتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا‌ ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا‌ ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡـكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۶﴾

اللہ نے تم لوگوں کی بہت سے موقعوں پر مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی، جب کہ تم کو تمہاری کثرت نے خود پسندی میں مبتلا کر دیا تھا، پھر تم کو کوئی چیز کام نہیں آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ دیکھاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے ﴿۲۵﴾ اس کے بعد پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی، اللہ نے ایسے لشکر اتارے جن کو تم دیکھ نہیں رہے تھے، اور کفر کرنے والوں کو سزا دی، اور کافروں کی سزا یہی ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۶﴾

← تو ہم افضل ہیں یا محمد ﷺ اور ان کے رفقاء؟ تو یہود بھی ان کی پیٹھ ٹھونکتے کہ تم ان سے بہتر ہو، ان آیات میں اسی کی تردید ہے کہ ایمان اور حق پر استقامت کے لئے قربانی اور اس راہ میں جہاد اور ہجرت یہ اصل میں فضیلت کی باتیں ہیں اور ان کا مقابلہ ان بے روح خدمتوں سے نہیں کیا جاسکتا، جن کے پیچھے اللہ کی رضاء کا جذبہ نہ ہو اور جو صرف نام ونمود کے لئے انجام دی جائیں۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایمان، ہجرت، جہاد اور احکامِ خداوندی کی تعمیل پر اجر وثواب ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا گیا تو بعض اوقات بیٹا تیار ہوگیا، باپ نے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا، باپ تیار ہوگیا اولاد تیار نہیں ہوئی، شوہر ہجرت پر آمادہ تھا اور بیوی آمادہ نہ تھی، یہ بھی فکر دامن گیر تھی کہ ہجرت کی بنیاد پر مکہ کے گھر جائیداد سے محروم ہوجائیں گے، یہ صورتِ حال بعض لوگوں کے لئے ہجرت سے رکاوٹ کا باعث بن رہی تھی، ان ہی افکار کو قرآن نے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ اگر تمہارے متعلقین ایمان پر کفر کو ترجیح دینے لگیں، یعنی ہجرت نہ کرنے کا کافرانہ عمل کریں تو تمہاری ان سے دوستی نہیں ہونی چاہئے؛ بلکہ اللہ کی اور اس کے رسول کی محبت ان تعلقات اور دنیا کے مال ومتاع کی محبت پر غالب ہونی چاہئے —— ''اللہ اپنا فیصلہ جاری کر دیں'' سے مراد یہ ہے کہ عنقریب مکہ فتح ہوجائے گا اور جن لوگون نے ہجرت نہیں کی، ان کو پچھتاوا ہوگا۔

﴿۱﴾ ان آیات میں واقعہ حنین کا ذکر ہے، ہجرت کے آٹھویں سال رمضان المبارک میں مکہ فتح ہوا، اہل مکہ کے بعد اس خطہ کے جن قبائل کو جزیرۃ العرب میں بڑی قدر ومنزلت حاصل تھی، ان میں نمایاں نام ہَوَازن اور ثَقیف کا تھا، انھیں بھی اہل مکہ کی طرح اسلام سے بڑا بغض تھا، یہ تیراندازی اور جنگ وجدال میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے اور انھیں اپنی صلاحیت پر ناز بھی تھا؛ اس لئے آپ نے فتح مکہ کے بعد ان قبائل کا رخ کیا کہ اگر اہل مکہ کی طرح ان کی گردنیں بھی اسلام کے سامنے جھک جائیں تو پھر پورے جزیرۃ العرب کا اسلام قبول کرنا آسان ہوجائے گا، اس وقت آپ ﷺ کے پاس ایک بڑی فوج مہیا تھی، دس ہزار تو وہ ←

← جاں نثار تھے، جو مدینہ سے آپ ﷺ کے ساتھ آئے تھے، پھر مکہ میں بہت سے لوگ مسلمان ہوئے، کچھ وہ لوگ بھی تھے جو ابھی باضابطہ مسلمان نہیں ہوئے تھے؛ لیکن انھوں نے مسلمانوں کی برتری کو قبول کرلیا تھا اور موجود اصطلاح میں ہتھیار ڈال دیا تھا، اس طرح مختلف راویوں کے اندازہ کے مطابق بارہ تا سولہ ہزار فوجی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے مکہ میں صَفْوَانِ بن اُمیَّہ اور رَبِیْعَہ مَخْزومی سے سواری اور ہتھیار وغیرہ بھی حاصل کئے اور اس طرح مسلمانوں کی اس وقت تک کی تاریخ کا سب سے بڑا لشکر لے کر حنین کی طرف بڑھے، دوسری طرف مخالف فوج کم وبیش چار ہزار افراد پر مشتمل تھی، لشکر اسلام میں وہ لوگ بھی تھے، جنھوں نے بدر کے معرکہ میں مسلمانوں کی بے سروسامانی، تعداد کی کمی اور اس کے مقابلہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ تعداد کی کثرت اور وسائلِ جنگ کی بہتات کو دیکھا تھا اور وہ لوگ بھی شامل تھے جن کے سامنے غزوۂ خندق کا منظر تھا کہ بیس ہزار کا وسائلِ جنگ سے لیس لشکر تین چار ہزار فاقہ کش مسلمانوں کا محاصرہ کئے ہوا ہے، پھر بھی ان معرکوں میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی؛ چنانچہ بعض حضرات کو یہ خیال گذرا کہ جب اس وقت ہم نے اپنے دشمنوں کو شکست دیدی اور ہم فتح یاب ہوئے تو آج ہمیں کون شکست دے سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا خیال ہے جو فطری طور پر ایسے مواقع پر پیدا ہوجاتا ہے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے رفقاء کے مرتبہ ومقام کے لحاظ سے یہ جملہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا؛ چنانچہ جب مسلمان حنین کی 'وادیِ اَوْطَاس' میں پہنچے تو قبیلۂ ہوازن کے لوگ ہٹ گئے اور جب مسلمان مالِ غنیمت اکٹھا کرنے میں لگ گئے تو اچانک ان پر تیروں کی بارش کردی، یہ واقعہ اس قدر اچانک اور غیر معمولی تھا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور صرف دس صحابہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت سفیان بن حارث، ان کے بیٹے جعفر، حضرت اسامہ بن زید، ایمن بن عبید، فضل بن عباس اور قثم بن عباس رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی سواری کی لگام تھامے ہوئے تھے اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ رکاب، ان ہی ثابت قدم لوگوں میں حضرت اُمِ سُلَیم رضی اللہ عنہا بھی تھیں، جنھوں نے اپنے شوہر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کو پکڑ کر رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں خنجر رکھے ہوئی تھیں؛ لیکن ان حالات میں بھی رسول اللہ ﷺ کے پائے استقامت میں کوئی جنبش نہیں ہوئی، زبان مبارک پر معرکۂ جنگ کی مناسبت سے یہ پُرجوش نعرۂ حق تھا کہ میں سچا نبی ہوں، جھوٹا مدعیِ نبوت نہیں ہوں، اور میں عبدالمطلب جیسے قائد عرب کی اولاد میں سے ہوں: ''أنا النبي لا كذب، أنا ابن عبد المطلب'' پھر آپ ﷺ کے حکم پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو آواز دی، لوگ واپس ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے چند مشت خاک دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا محمد کے رب کی قسم! اب یہ شکست کھا کر رہیں گے: ''إنهزموا وربّ محمد''، بعض راویوں کا بیان ہے کہ مخالف فوجیوں میں کوئی آنکھ نہ تھی، جو اس سے خاک آلود نہ ہوئی ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور اہل ایمان کو انعامات سے نوازا، پہلا انعام یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں جو خوف وہراس پیدا ہوگیا تھا، اس کے بجائے ان کا سکون واعتماد بحال ہوگیا؛ کیوں کہ کسی فوج کے لئے میدان جنگ میں سب سے اہم بات یہی ہوتی ہے کہ اس کے حوصلے بلند ہوں اور دل مضبوط ہوں، ''ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ . . .'' دوسرے: اللہ تعالیٰ نے دشمنان اسلام کو مرعوب کرنے کے لئے فرشتوں کی فوج بھیجی، جو اگرچہ عملاً جنگ میں شریک نہیں ہوئے؛ لیکن کفار ومشرکین کو نظر آتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی اور ان کی ہمتیں پست ہوگئیں، اور دشمنوں کا حوصلہ ہار جانا کسی بھی فوج کے لئے کامیابی کی کنجی ہوتی ہے: ''وَأَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا . . .'' ←

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

پھراس کے بعد اللہ جسے چاہیں توبہ نصیب کردیں، اللہ بہت معاف کرنے والے نہایت مہربان ہیں ﴿۲۷﴾ اے ایمان والو! بے شک مشرکین (اپنے عقیدہ میں) ناپاک ہیں ﴿۱﴾ اس لئے وہ اِس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب بھی نہ آئیں اور اگر تمھیں اِفلاس کا اندیشہ ہو تو اگر اللہ چاہیں تو اپنے فضل سے تم کو عنقریب محتاج نہیں رکھیں گے، بے شک اللہ خوب جانتے ہیں اور بڑے حکمت والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۸﴾

← تیسرا انعام یہ کہ دشمنوں پر اللہ نے اپنا عذاب نازل کیا، یعنی انھیں مغلوب کردیا، وہ مسلمانوں کے ہاتھ مارے گئے، قید کئے گئے اور ان کے مال واسباب مسلمانوں کے ہاتھ آگئے۔ (ملخص از: مفاتیح الغیب: ۷/۶۱۲، تفسیر قرطبی: ۸/۹۶-۱۰۲)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اگرچہ اسباب ووسائل کی بھی اہمیت ہے اور اس کی فراہمی بھی اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے؛ لیکن مسلمانوں کا بھروسہ اس پر نہیں ہونا چاہئے، ان کا یقین اللہ تعالیٰ کی مدد اور طاقت پر ہونا چاہئے، اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ فتح وشکست کے فیصلے اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں؛ یہاں تک کہ انبیاء کے ہاتھ میں بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ موجود ہیں، پھر بھی غزوۂ حنین کے ابتدائی مرحلہ میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

﴿۱﴾ مشرکین کے ناپاک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، رسول اللہ ﷺ نے مشرکین سے مصافحہ فرمایا ہے، ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا ہے، ان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا ہے، ان کی دعوت قبول کی ہے، ان کا پانی استعمال کیا ہے، اسی طرح مشرکین کی ایک قسم اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی ہے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا شرک تھا، اس کے باوجود اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی اور ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا، اگر مشرکین جسمانی طور پر ناپاک ہوتے تو ان کے ساتھ کیسے اس طرح کے معاملات روا رکھے جاتے؟ —— پس یہاں ناپاک ہونے سے مراد عقیدہ کی ناپاکی ہے: ''إن كفرهم الذي صفة لهم بمنزلة النجاسة'' (مفاتیح الغیب: ۷/۶۱۹) اسی لئے اہل علم نے نقل کیا ہے کہ مشرکین کے جسم کے پاک ہونے پر فقہاء متفق ہیں: ''وأما الفقهاء فقد اتفقوا على طهارة أبدانهم'' (حوالۂ سابق) نیز قرآن مجید سے پہلے کی مذہبی کتابوں میں بھی اہل باطل کے لئے اس طرح کی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں، جیسے ''شودر'' کے لئے ''قابل نفرت ملیچھ لوگ'' کا لفظ (منوسمرتی: ۲۱۱:۴) اسی طرح ''اتھروید'' میں بھی غیر مذہب کے لوگوں کے لئے بعینہٖ پلید وناپاک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (۸:۳:۶-۷-۱۰)

﴿۲﴾ یہ آیت آپ ﷺ پر فتح مکہ کے اگلے سال ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور غیر مسلموں کو حج میں شریک ہونے سے منع فرمادیا گیا، ←

قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ
وَ لَا يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّ هُمۡ
صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾ ع ۵ ۱۰

اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے ، اللہ کی اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے ، ان سے جنگ کرتے رہو، جب تک کہ وہ رعیت بن کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہ کریں۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۹﴾

← اس آیت کی روشنی میں فقہاء نے اس بات پر بحث کی ہے کہ غیر مسلم مسجد میں آسکتا ہے یا نہیں؟ — امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کسی بھی غیر مسلم کو کسی بھی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی ، امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک خاص طور پر مسجد حرام میں غیر مسلموں کا داخلہ ممنوع ہوگا اور مسجد حرام سے مراد پورا حرم مکی ہے ؛ کیوں کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ مسجد حرام سے پورا حرم شریف مراد لیا گیا ہے ، (اسراء:۱) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مسجد حرام کے بشمول کسی بھی مسجد میں غیر مسلم کو داخل ہونے کی اجازت ہے ، ان کے نزدیک اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ غیر مسلم حج میں شریک نہیں ہوسکتے ؛ (مفاتیح الغیب : ۷/ ۶۲۰) کیوں کہ یہ آیت اصل میں غیر مسلموں کی حج میں شرکت کو روکنے ہی کے لئے نازل ہوئی ہے — غور کیا جائے تو امام شافعی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر قرآن کے الفاظ ، رسول اللہ ﷺ کے معمول مبارک اور شریعت کے مصالح ، نیز دین کے مزاج سے سب سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے ، یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ اس میں دوسرے مذہب کے لوگوں سے تعصب برتا گیا ہے ، حقیقت یہ ہے کہ حرم اقدس دین توحید کا مرکز اور اس کا دارالخلافہ ہے ، جیسے ملک کی پارلیمنٹ اور اس کے دفاعی مراکز پر غیر متعلق لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی ، اسی طرح دین حق کا مرکز ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں دی گئی ، جو اس مقام کے ساتھ محبت واحترام اور عقیدہ وایمان کا تعلق نہیں رکھتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کو خیال ہوا کہ جب آئندہ مشرکین حج میں نہیں آئیں گے تو تجارت متاثر ہوگی اور لوگوں کو معاشی نقصان سے دو چار ہونا پڑے گا ؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں فقر وافلاس کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے ؛ کیوں کہ روزی دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے ، یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ''إن شاء '' (اگر اللہ چاہیں تو تمہیں محتاج نہیں رکھیں گے) یعنی اگرچہ رزق کے لئے اسباب ووسائل کو اختیار کرنا جائز ہے ؛ لیکن یقین اللہ پر ہونا چاہئے کہ اللہ کی مشیت سے ہی رزق میں کشادگی اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔

﴿۱﴾ یہاں جنگ کا قانون بیان کیا گیا ہے ، جس کا تعلق اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے ، کہ جیسے مشرکین عرب سے جنگ کی ضرورت پڑ رہی ہے ، اسی طرح یہود و نصاریٰ سے بھی جہاد کی ضرورت ہے ؛ کیوں کہ کسی قوم کے مؤمن ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتی ہو ، آخرت کی جزاء وسزا پر اس کا یقین ہو ، جن چیزوں کو ان کی شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے ، ان کو حرام سمجھتی ہو اور جب بھی دینِ حق سامنے آجائے ، اس کے سامنے سر جھکا لیتی ہو ؛ لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کا حال یہ ہے کہ ←

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ٌ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، یہ سب ان کی منھ کی باتیں ہیں، وہ ان ہی لوگوں کی سی بات کرتے ہیں، جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا تھا، اللہ انھیں غارت کرے، وہ کہاں اُلٹے جارہے ہیں؟﴿۱﴾ ﴿۳۰﴾

← وہ اللہ کے ساتھ اس کے بندوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، اسی طرح اللہ پر ان کا ایمان نہیں ہے، وہ آخرت کو صرف روحانی راحت و تکلیف قرار دیتے ہیں؛ اس لئے آخرت پر وہ حقیقی ایمان سے محروم ہیں، توریت کی شریعت پر وہ عمل نہیں کرتے اور محمد رسول اللہ ﷺ جس دین حق کو لے کر آئے، انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے: اس لئے اگرچہ وہ اہل کتاب ہیں؛ لیکن پھر بھی ان سے جہاد کرنا چاہئے؛ البتہ اگر وہ جزیہ ادا کرنے پر تیار ہوجائیں تو ان سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے۔

جزیہ مفسرین کی تحقیق کے مطابق 'جزاء' سے ماخوذ ہے، یعنی یہ رقم بدلہ اور معاوضہ کے طور پر وصول کی جاتی ہے، بعض احناف نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مملکت کا دفاع اور اس کی حفاظت غیر مسلم شہریوں کے ذمہ نہیں رکھی گئی؛ بلکہ مسلمانوں نے خود اُن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ وصول کیا جاتا ہے: ''إنما وجب بدلاً عن النصر والجهاد'' (تفسیر قرطبی: ۸/۱۱۴) عام طور پر جزیہ کے بارے میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے، اصل یہ ہے کہ کسی بھی مملکت کا انتظام اور دفاع مالی وسائل کے بغیر نہیں ہوسکتا؛ چنانچہ مسلمانوں سے اس مقصد کے لئے زرعی پیداوار میں عشر اور دوسرے مالوں میں زکوۃ لی جاتی ہے، اگر یہی زکوۃ اور عشر غیر مسلموں پر واجب قرار دیا جاتا تو یہ ان کی مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا اور ان کو مسلمانوں کے ایک مذہبی عمل پر مجبور کرنا لازم آتا؛ اس لئے ان کے لئے ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا، جو زرعی پیداوار میں 'خراج' کے نام سے ہے، اور دوسرا جزیہ ہے، جزیہ کے واجب کئے جانے کا سبب محض غیر مسلم ہونا نہیں ہے؛ اگر غیر مسلم ہونے کی وجہ سے جزیہ واجب ہوتا تو بوڑھوں، بچوں، عورتوں، معذوروں، سب پر واجب ہوتا؛ لیکن یہ صرف ایسے جوانوں پر واجب ہے، جو کمانے کی طاقت رکھتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیہ کی جو شرح مقرر کی وہ مالداروں پر سالانہ ۴۸/درہم، متوسط آمدنی کے لوگوں پر ۲۴/درہم اور کم آمدنی والوں پر ۱۲/درہم، (مفاتیح الغیب: ۷/۶۲۸) سالانہ ۱۲/درہم تقریباً ۴۰/گرام چاندی بنتی ہے، غور کیا جائے کہ یہ کتنا ہلکا اور معمولی ٹیکس ہے، —— اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ'' (یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں، اس حال میں کہ وہ حقیر ہیں) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ پیش کریں اور جزیہ ادا کرتے وقت ان کی تذلیل وتحقیر کی جائے؛ بلکہ اس سے مراد ہے تابعداری قبول کرنا، یعنی کسی گروہ کا دوسرے گروہ کی تابعداری قبول کرلینا اس کی کمتری کو ظاہر کرتا ہے؛ اسی لئے ترجمہ کیا گیا ہے: جب تک کہ وہ رعیت بن کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہ کریں؛ چنانچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جزیہ دینا ہی اپنی کمتری کو قبول کرنے کے مترادف ہے: ''معنى الصغار هاهنا هو نفس إعطاء الجزية''۔ (مفاتیح الغیب: ۷/۶۲۷)

﴿۱﴾ یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقے رہے ہیں، ان کے عقائد ایک دوسرے سے مختلف تھے، عیسائیوں کی ←

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا
اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِــُٔوْا
نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو، نیز مسیح بن مریم کو اللہ کے مقابلہ میں رب بنالیا ہے؛ حالاں کہ ان سب کو ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ لوگ جسے شریک وہمسر ٹھہراتے ہیں، اللہ ان کے شرک سے پاک ہے ﴿۱﴾ ﴿۳۱﴾ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منھ سے اللہ کے نور کو بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرکے ہی رہیں گے، اگرچہ کفر کرنے والوں کو ناپسند ہو۔ ﴿۳۲﴾

← غالب اکثریت تو ابھی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا (Son of God) قرار دیتی ہے، موجودہ یہودی عام طور پر حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار نہیں دیتے؛ لیکن ممکن ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانے میں کسی فرقہ کا یہ عقیدہ رہا ہو۔

واضح ہو کہ بائیل میں حضرت عزیر علیہ السلام کا عزرا کے نام سے تذکرہ کیا گیا ہے، یہود آپ علیہ السلام کو اپنا بڑا محسن تصور کرتے ہیں؛ کیوں کہ جب بُختِ نصر نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور توریت کے نسخے نذرِ آتش کردئے تو حضرت عزیر علیہ السلام ہی نے اپنی یادداشت سے اسے دوبارہ تحریر فرمایا، (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۷/۶۳۰) —— اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کسی اور کی بات نقل کرتے ہوئے کلمۂ کفر کا ذکر کیا جائے تو یہ کفر نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں بولنے والا خود اپنے عقیدہ کا اظہار نہیں کرتا؛ بلکہ دوسروں کے عقیدہ کو نقل کرتا ہے؛ اس لئے اس کی وجہ سے کسی کے کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے۔

﴿۱﴾ ''حِبْر'' کا معنی بڑے عالم وفقیہ کے ہیں، اس کی جمع ''أحبار'' ہے، یعنی علماء اور فقہاء، ''راھب'' کے معنی زاہد اور خشیت اختیار کرنے والے کے ہیں، اس کی جمع ہے ''رھبان'' اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ عیسائیوں نے اللہ کے مقابلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اپنے علماء ومشائخ کو رب کا درجہ دے رکھا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو یہ ظاہر ہے؛ کیوں کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا کرتے تھے، علماء ومشائخ کو اگرچہ وہ خدا اور رب نہیں کہتے تھے؛ لیکن اللہ کے مقابلے میں وہ ان کے احکام کو ترجیح دیتے تھے؛ چنانچہ جب حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے (جو اس وقت تک عیسائی تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ آیت سنی تو عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے علماء ومشائخ کی عبادت تو نہیں کرتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس چیز کو اللہ نے حلال کیا ہے، یہ لوگ اس کو حرام کہتے ہیں اور تم لوگ بھی اس کو حرام سمجھتے ہو، اور اللہ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، بعض اوقات یہ اسے حلال کہتے ہیں اور تم بھی اسے حلال باور کرتے ہو، حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ایسا تو ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی تو ان کی عبادت کرنا ہے: فذلک عبادتھم، (مفاتیح الغیب: ۷/۶۳۵) —— معلوم ہوا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مقابلہ علماء ومشائخ کے اقوال کی اہمیت نہیں ہے؛ البتہ جو لوگ براہ راست احکام شریعت کو جاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ یہ سمجھ کر کسی عالم ←

النصف

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَ لَوۡ کَرِہَ
الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ
النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا
یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿ۙ۳۴﴾

وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے؛ تاکہ اسے تمام مذاہب پر غلبہ عطا فرمائے، اگرچہ شرک کرنے والوں کو یہ پسند نہ ہو ﴿۱﴾ ﴿۳۳﴾ اے ایمان والو! بے شک بہت سے (یہودی وعیسائی) علماء ومشائخ ناحق طریقہ پر لوگوں کے مال کھالیتے ہیں، اور اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں، ﴿۲﴾ اور جولوگ سونا، چاندی کا خزانہ جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔ ﴿۳۴﴾

← کی بات کو قبول کرلیں کہ انھوں نے قرآن وحدیث کو صحیح طور پر سمجھا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مقابلہ میں علماء کی ہدایت پر عمل کرنا نہیں ہے؛ بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل کرنے کے لئے علماء ومشائخ کی رہنمائی حاصل کرنا ہے۔

﴿۱﴾ اللہ کے نور سے مراد اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا 'دینِ حق' ہے، جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ انسانیت تک پہنچا ہے؛ کیوں کہ جیسے روشنی تاریکیوں پر غالب آجاتی ہے، اسی طرح اللہ کی طرف سے جب دین حق آتا ہے تو باطل افکار منھ چھپانے پر مجبور ہوجاتے ہیں، کفر کی طاقتیں چاہتی تھیں کہ دین کے اس ننھے پودے کو پروان نہ چڑھنے دیں، اس کے لئے ایک طرف یہود ونصاریٰ رسول اللہ ﷺ سے متعلق توریت وانجیل کی پیشین گوئیوں کو چھپاتے تھے، دوسری طرف اسلام کے بارے میں پروپیگنڈے کرتے اور غلط فہمیاں پھیلاتے تھے، تیسرے: فوجی طاقت اور ظلم وجور کا مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوتا تھا؛ یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں تمام مشرک اور یہودی قبائل مسلمانوں کے مقابلہ ایک جٹ ہوکر کھڑے ہوگئے، دین حق کو ختم کرنے کی یہ سازشیں جاری تھیں؛ لیکن قرآن مجید بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ اہل کفر وشرک کے ہزار ناپسند کرنے کے باوجود دین حق کو غالب کرکے رہیں گے اور اس دین کو تمام ادیان ومذاہب پر غلبہ حاصل ہوجائے گا، یہ غلبہ علم واستدلال کے اعتبار سے ہے؛ کیوں کہ اسلام حد درجہ انسانی عقل کے مطابق، فطرت سے ہم آہنگ اور مصلحتوں وحکمتوں کے موافق ہے، نیز اسلامی تعلیمات کے مآخذ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت وسیرت محفوظ ہیں اور پوری طرح تاریخ کی روشنی میں ہیں، کسی اور مذہب کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے؛ اس لئے یہ تو ہوسکتا ہے کہ مسلمان کسی خطہ میں عددی اعتبار سے کم ہوجائیں یا فوجی لحاظ سے شکست کھاجائیں؛ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اسلام مغلوب ہوجائے اور علم واستدلال کے اعتبار سے وہ کمزور ثابت ہو۔

﴿۲﴾ یہودی اور عیسائی مذہبی رہنما لوگوں سے نذر ونیاز کے نام پر پیسے حاصل کرتے تھے، جولوگ اس نوعیت کے ہدایا اور تحائف پیش کرتے تھے، ان کو ان کی خواہش کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے اور اپنے مریدوں کو تاکید بھی کرتے رہتے تھے کہ وہ ہرگز اسلام قبول نہ کریں، یہاں ان کے اسی مزاج کا ذکر کیا گیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۸/۱۲۲) —— رشوت خوری کا یہ مزاج اس حد تک بڑھ گیا کہ ←

يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَـنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ وَظُهُوۡرُهُمۡ‌ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ۝۳۵

اس دن دوزخ کی آگ میں اس خزانہ کو گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا:) یہی ہے وہ خزانہ جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا؛ لہٰذا اب اپنے جمع کرنے کا مزا چکھو۔ ﴿۱﴾ ۝۳۵

← یورپ میں چرچ مرنے والوں کے لئے مغفرت نامے فروخت کرنے لگے اور بالآخر مذہبی طبقہ کی اس حرکت کے خلاف لوگوں نے اس طرح علَم بغاوت بلند کیا کہ مغرب نے اپنے آپ کو مذہب ہی سے آزاد کرلیا اور چرچ کے احاطہ سے باہر انسانی زندگی میں مذہب کا کوئی رول باقی نہیں رہا، رشوت تو حکام اور سرکاری افسران بھی لیا کرتے ہیں؛ لیکن قرآن مجید نے خاص طور پر مذہبی طبقہ کی رشوت خوری کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ جب یہ طبقہ برائی میں مبتلا ہوجاتا ہے تو پھر پورا سماج اس برائی سے متأثر ہوتا ہے؛ کیوں کہ جس طبقہ سے اصلاح کی اُمید ہو، اگر وہی بگڑ جائے تو پھر وہ معاشرہ کیسے صحیح راستہ پر آسکتا ہے؟

﴿۱﴾ کوئی بھی مال جمع کرنا اور اس میں سے غریبوں کا حق ادا نہیں کرنا سماج کے ساتھ ظلم و زیادتی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے؛ لیکن سونا اور چاندی چوں کہ ایک طویل دور تک کرنسی کی حیثیت سے مروج رہے ہیں، وہ دولت کی پیمائش کا ذریعہ رہے ہیں اور انھیں چھپا کر رکھنا آسان ہوتا ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر سونے اور چاندی کا ذکر فرمایا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اس آیت کو عام خیال کرتے تھے، یعنی اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی مال انسان اپنے پاس رکھے، وہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے اور اس کے لئے دردناک عذاب ہے؛ لیکن اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ جب کسی مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے تو وہ 'کنز' میں شامل نہیں ہے، یعنی ایسا مال محفوظ رکھنے پر — انشاء اللہ — اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ نہیں ہوگی؛ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی گئی ہو، وہ کنز نہیں ہے، چاہے سات زمین کے نیچے ہو، یعنی زیادہ مقدار میں ہو اور اسے خوب چھپا کر رکھا گیا ہو، اور جس مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی ہو، وہ 'کنز' ہے، خواہ زمین کے اوپر ہو، یعنی کم مقدار میں ہو اور اسے زیادہ چھپانے کی کوشش نہ کی گئی ہو، یہی مضمون حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، (تفسیر قرطبی: ۸/۱۲۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی یہی رائے ہے، (مفاتیح الغیب: ۷/۶۴۴) بہت سی روایات ہیں، جن میں ایسے لوگوں کے لئے عذاب کی وعیدیں ذکر کی گئی ہیں، جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ ادا کردے تو اس کی بچی ہوئی دولت 'کنز' شمار نہیں ہوگی، — ایسے لوگوں کو دوزخ میں گرم لوہے سے داغا جائے گا اور خاص طور پر چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغنے کا ذکر کیا گیا ہے؛ کیوں کہ چہرے کے داغنے میں انسان کی تحقیر کا پہلو ہے، پیٹھ اور پہلو کے حصے زیادہ حساس ہوتے ہیں اور اسے جلایا جائے تو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے، بعض اہل علم نے یہ نکتہ بھی لکھا ہے کہ جب انسان کسی محتاج اور مانگنے والے کو دیکھتا ہے تو پہلے اس کی پیشانی پر شکن آجاتی ہے اور چہرے پر ناگواری ظاہر ہوتی ہے، پھر جب اس سے سوال کرتا ہے تو اپنا پہلو بدل لیتا ہے اور جب سوال کرنے میں زیادہ الحاح و خوشامد کرتا ہے تو پھر بالکل ہی مڑ جاتا ہے اور اپنی پیٹھ اس کی طرف کردیتا ہے؛ اس لئے انسان کی معصیت کے لحاظ سے آخرت میں اس کو سزا دی جائے گی۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/۱۲۹)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ
مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ ۫ وَقَاتِلُوا
الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ
زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا
حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع ۵ ۸ ۱۱

بے شک مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ ہے، جو اللہ کے فیصلہ کے مطابق اسی دن سے ہے، جس دن کہ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا، ان میں سے چار مہینے خاص ادب کے ہیں، یہی درست حساب ہے،﴿۱﴾ تو تم ان مہینوں کے سلسلہ میں اپنے آپ پر زیادتی نہ کرو، اور تمام مشرکین سے جنگ کرو، جیسا کہ وہ تم سبھوں سے جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہیں ﴿۳۶﴾ بے شک مہینوں کا آگے پیچھے کرنا زمانۂ کفر کی بڑھائی ہوئی بات ہے، جس کے ذریعہ کفر کرنے والوں کو گمراہ کیا جاتا ہے، اسی مہینہ کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال حرام؛ تاکہ اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کی گنتی پوری کرلیں، اس طرح اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں، ان کے لئے ان کی بداعمالیاں خوشنما بنا دی گئی ہیں اور اللہ کفر پر جمے رہنے والوں کو ہدایت نہیں دیتے۔﴿۲﴾ ﴿۳۷﴾

﴿۱﴾ اسی آیت میں ''دین قیم'' کا معنی علامہ قرطبی ؒ نے ''الحساب الصحیح'' (درست حساب) سے کیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۸/ ۱۳۴) گویا ''دین'' کے معنی ''طریقۂ حساب'' کے ہوئے اور ''قیم'' کے معنی ''درست'' کے۔

﴿۲﴾ ان آیات میں زمانۂ جاہلیت میں مروج بعض ایسی باتوں کی اصلاح کی گئی ہے، جو درست نہیں تھیں اور جن کو لوگوں نے اپنے طور پر گھڑ لیا تھا، پہلی بات یہ ہے کہ ایک سال بارہ مہینوں ہی پر مشتمل ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کے لوگ بارہ ماہ پندرہ دن کا سال مانتے تھے، اس طرح حج جیسی عبادت جسے مشرکین عرب بھی بڑے اہتمام سے انجام دیتے تھے، اپنے وقت سے ہٹ کر ادا کیا جاتا تھا، دوسرے: اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت سے ہی یہ بارہ مہینے ہیں، جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے، کتاب سے مراد ''لوحِ محفوظ'' ہے، کہ لوح محفوظ میں بارہ مہینوں کا سال پہلے سے مقرر شدہ ہے، یا یہ مطلب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی فطرت ہے، جو زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت سے جاری ہے؛ کیوں کہ بارہ مہینوں میں سورج کے گرد زمین کی گردش مکمل ہوتی ہے، تیسرے: ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرام یعنی حرمت والے ہیں، ان مہینوں میں عرب جنگ کرنے سے بچتے تھے، اسلام میں یہ حکم باقی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، ایک رائے یہ ہے کہ ←

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾
اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۬ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹے جاتے ہو، کیا تم آخرت کے مقابلہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟ تو دنیوی زندگی کا لطف تو آخرت کے مقابلہ بہت ہی حقیر ہے! ﴿۳۸﴾ اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ تم کو دردناک سزا دیں گے، تمہاری جگہ دوسری قوم کو لائیں گے اور تم ان کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۳۹﴾

← شریعتِ محمدی میں بھی ان مہینوں میں جنگ میں پہل کرنا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر دشمن حملہ کریں تو دفاع ضرور کیا جائے، دوسری رائے ہے کہ یہ حکم ابتدائی دور میں تھا، اب یہ حکم باقی نہیں رہا، ان چار مہینوں سے مراد ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب، جو جمادی الاخری اور شعبان کے درمیان واقع ہے، اس کو 'رجب مُضَر' بھی کہا جاتا تھا؛ کیوں کہ قبیلۂ مضر کے لوگ اسے رجب کہتے تھے، اور بعض قبائل ماہ رمضان کو رجب کہتے تھے، اپنے اوپر ظلم نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ گناہ کے ارتکاب سے بچو؛ کیوں کہ گناہ کا ارتکاب اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنا ہے، گناہ کرنے کی ممانعت تو ہمیشہ ہی ہے؛ لیکن ان مہینوں کی اہمیت اور حرمت کی وجہ سے خاص طور پر ان میں گناہ کرنے سے منع فرمایا گیا، چوتھے: زمانہ جاہلیت میں عربوں کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ مہینوں میں اُلٹ پھیر کیا کرتے تھے؛ چوں کہ بعض قبائل لوٹ مار ہی سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرتے تھے؛ اس لئے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم مسلسل تین مہینوں تک جنگ کی ممانعت ان کو گراں گزرتی تھی اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے کبھی تو وہ محرم کو اپنی جگہ پر برقرار رکھتے اور کبھی صفر کو محرم بنا دیتے اور محرم کو صفر، اسی عمل کو 'نسیئ' کہا جاتا تھا، جس کے اصل معنی زیادتی کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس طرح کی حرکت ان کے کفریہ اعمال میں اضافہ کررہی ہے اور اس طرح اہل کفر کے پیشوا اپنے آپ کو گمراہ کررہے ہیں؛ کیوں کہ کسی مہینے کو حرام قرار دینا اور نہ دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے نہ کہ بندوں کا، —— پہلی بار اس طرح کا عمل کس نے شروع کیا؟ اس میں اختلاف ہے، بعض نے قَلَمَّسْ نامی شخص کا ذکر کیا ہے، جس کا تعلق بنو فُقَیم سے تھا، بعض نے اس کا موجد عَمرو بن لُحَیّ کو اور بعض نے بنوکنانہ کے نُعَیم بن ثَعْلَبَہ کو قرار دیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۸/ ۱۳۲-۱۴۰) —— اس سے اہل علم نے یہ بات بھی اخذ کی ہے کہ احکام شرعیہ کے لئے وہی کلینڈر معتبر ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت عرب میں مروج تھا، جو بارہ مہینوں پر مشتمل تھا اور جس کی بنیاد چاند پر تھی، شرعی احکام میں کسی اور کلینڈر کا اعتبار نہیں۔ (حوالہ سابق: ۸/ ۱۳۳)

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب کوئی گروہ اللہ کے دین سے منھ موڑ لیتا ہے یا اپنے فریضہ کو انجام نہیں دیتا ہے تو اللہ اس کی جگہ دوسرے گروہ کو اٹھاتے ہیں، ان سے اپنے دین کی خدمت لیتے ہیں اور اس کی وجہ سے انھیں عزت وعظمت بخشی جاتی ہے، ←

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اگر تم رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (یاد رکھو) اللہ ہی نے ان کی مدد کی تھی، جب کہ کفر کرنے والوں نے ان کو (وطن سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے؛ کہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے: گھبراؤ مت، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہیں؛ چنانچہ اللہ نے ان پر اپنی طرف سے سکون وطمانینت اتاری، اللہ نے ان کو ایسے لشکر سے تقویت پہنچائی، جن کو تم نے نہیں دیکھا، کفر کرنے والوں کی بات کو اللہ نے نیچا کر دیا اور اللہ ہی کا کلمہ سربلند رہا اور اللہ زبردست اور حمت والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۴۰﴾

← غور کیجیے کہ حجاز کے اُفق سے اسلام کا سورج طلوع ہوا اور صحابہ کی جاں نثاریوں سے بہت جلد جزیرۃ العرب کے حدود کو پار کر کے دوسرے ملکوں میں داخل ہو گیا، پھر جب عربوں نے عیش وعشرت کا راستہ اختیار کیا اور انھیں اسلام سے زیادہ اپنی حکومتوں کی فکر دامن گیر ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے ایران کے مجوسی النسل نومسلموں سے خدمت لی اور انھیں کے ذریعہ تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، تصوف یہاں تک کہ خود عربی زبان وقواعد جیسے اہم علوم پایۂ کمال کو پہنچے، آج جن بلند پایہ محدثین وفقہاء اور مفسرین وصوفیاء کا ذکر ہماری زبانوں پر رہتا ہے، یہ زیادہ تر ایرانی النسل ہی تھے، پھر مختلف ادوار میں ترکوں نے، تاتاریوں نے اور ہندوستان میں بسنے والے مختلف گروہوں نے، نیز مشرقِ بعید انڈونیشیا اور ملیشیا وغیرہ کی اقوام نے اسلام قبول بھی کیا اور مختلف جہتوں سے اسلام کی خدمت بھی کی؛ اس لئے کسی شخص یا گروہ سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت لے رہے ہیں تو اسے تکبر سے بچنا اور اللہ سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں اسے خدمت دین کے اس اعزاز سے محروم نہ کر دیا جائے اور کسی اور گروہ کو اس کے لئے منتخب نہ کر لیا جائے۔

﴿۱﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ کی مدد کرو اور یاد رکھو کہ دین کی مدد کرنا تمہارے ہی لئے سعادت اور کامیابی کی بات ہے، ورنہ اللہ اس کے محتاج نہیں ہیں؛ چنانچہ اللہ کی قدرت دیکھو کہ جب محمد رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو یہ قافلہ صرف دو افراد پر مشتمل تھا، محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، ان دونوں نے مکہ سے نکل کر 'ثور' نامی پہاڑ کی بلندی پر ایک غار میں پناہ لی، دشمن تلاش کرتے کرتے قریب تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بے قرار ہو گئے، مگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں اطمینان دلایا کہ گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہیں: ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' اس ارشاد نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا، انھیں سکون حاصل ہو گیا اور فرشتوں کی اَن دیکھی طاقتوں سے ان حضرات کی حفاظت کی گئی، اس طرح اللہ نے کفر کی سازشوں کو پامال کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو بلند وبالا فرمایا، جب اللہ اتنے مشکل حالات میں اپنے نبی کی حفاظت کر سکتے ہیں تو کیا اب ان کی حفاظت نہیں کر سکتے؟ —— اس آیت میں ''ثَانِيَ اثْنَيْنِ'' (دو میں کے دوسرے) اور ''صَاحِبِه'' (رسول اللہ ﷺ کی ساتھی) سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں؛ گویا اس اُمت میں ←

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ
لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ
عَلَیْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ یُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ
وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾ ع ۶/۵ ۱۲

تھوڑے سامان کے ساتھ ہو یا زیادہ سامان کے ساتھ، نکل کھڑے ہو اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اگر تم (واقعی) سمجھدار ہو ﴿۱﴾ ﴿۴۱﴾ اگر نزدیک میں مال حاصل ہوتا اور ہلکا سفر ہوتا تو یہ (منافقین) ضرور آپ کے ساتھ چلے ہوتے؛ لیکن ان کو تو مسافت ہی لمبی نظر آنے لگی، اور بعید نہیں کہ یہ اللہ کی قسم کھائیں کہ اگر بس میں ہوتا تو ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ ضرور نکلتے، یہ لوگ (جھوٹ بول کر) اپنے آپ ہی کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ کو معلوم ہے کہ یہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ﴿۴۲﴾

← حضور ﷺ کے بعد سب سے اونچا درجہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے، اور ان کا مخلص صحابی ہونا اللہ تعالیٰ کی جانب سے تصدیق شدہ ہے، بعض اہل علم نے '' ثَانِیَ اثْنَیْنِ '' کی تعبیر سے رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفۂ راشد ہونے پر بھی استدلال کیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۴۸/۸) ہجرت کا یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی روشنی میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے، خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جب اس آیت پر پہنچے تو اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ مجھ کو جہاد کے لئے تیار کر دو، صاحبزادوں نے عرض کیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ حضور ﷺ کے ساتھ جہاد کرتے رہے، پھر آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی وفات تک جہاد کیا، اب ہم لوگ تو آپ کی طرف سے جہاد کر ہی رہے ہیں؛ لیکن انھوں نے نہیں مانا اور ایک سمندری لڑائی میں شرکت فرمائی، اسی میں شہید ہوئے، ان کے رفقاء سات دنوں تک ان کو دفن کرنے کے لئے خشکی کی کوئی جگہ تلاش کرتے رہے، تب جا کر ایک جزیرہ ملا اور وہاں انہیں دفن کر دیا گیا، سات دن گذرنے کے بعد بھی ان کی لاش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی؛ (تفسیر قرطبی: ۱۵۰/۸) تاہم اکثر فقہاء کی رائے ہے کہ یہ حکم غیر معمولی حالات میں ہے، اگر ایسے حالات نہ ہوں تو جہاد فرض کفایہ ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا کہ ضعیفوں اور بیماروں پر جہاد نہیں ہے: ''لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَی الْمَرْضٰی'' (التوبہ: ۹۱) —— مال سے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وسائل جہاد میں مال سے مدد کی جائے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مجاہد کو اسباب جنگ فراہم کر کے جہاد کے لئے تیار کیا یا اس کے غائبانہ میں بہتر طور پر اس کے اہل وعیال کی نگہداشت اور کفالت کی، اس نے خود جہاد کیا: ''من جهز غازيا في سبيل الله فقد غزا ، ومن خلفه غازيا في أهله بخير فقد غزا''۔

(صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب فضل إعانة الغازي في سبيل الله بمركوب وغيره وخلافته في أهل بخير، حدیث نمبر: ۳۵۱۱، ۳۵۱۲)

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾
لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً
وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ
مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَاْوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ
الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

(اے رسول !) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا، آپ نے انھیں اجازت کیوں دے دی تھی ؟ (اجازت نہیں دینی چاہئے تھی) تا کہ سچ بولنے والے آپ کے سامنے واضح ہوجاتے اور آپ جھوٹ بولنے والوں سے بھی واقف ہوجاتے ﴿۴۳﴾ جو لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے میں آپ سے (غیر حاضر رہنے کی) اجازت نہیں چاہیں گے اور اللہ تقویٰ والوں سے خوب واقف ہیں ﴿۴۴﴾ جو لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہی آپ سے (جہاد سے غیر حاضر ہونے کی) اجازت مانگا کرتے ہیں، ان کے دل شک وشبہ میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک میں سرگرداں ہیں، ﴿۴۵﴾ اگر ان کا ارادہ نکلنے کا ہوتا تو اس کا کچھ تو سامان کر کے رکھتے ؛ لیکن اللہ کو ان کا جانا پسند نہیں تھا؛ اس لئے اللہ نے انھیں ٹھہرا دیا اور کہا گیا کہ تم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ﴿۴۶﴾ اگر وہ لوگ تمہارے ساتھ نکلتے تو فساد ہی کا اضافہ کرتے اور تم کو فتنہ میں مبتلا کرنے کے لئے تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے، نیز تمہارے اندر بھی ان کے جاسوس موجود ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب آگاہ ہیں ﴿۴۷﴾ وہ اس سے پہلے بھی فتنہ کے درپے رہے ہیں اور آپ کے معاملات کو اُلٹ پلٹ کرتے رہے ہیں ؛ یہاں تک کہ سچا وعدہ آپہنچا اور اللہ کا حکم غالب ہو کر رہا؛ حالاں کہ انھیں یہ ناگوار ہی گذرتا رہا۔ ﴿۱﴾ ﴿۴۸﴾

﴿۱﴾ آیت نمبر ۳۸ / سے ہی واقعہ تبوک کا ذکر چل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ تشریف لائے تو شام کی طرف سے آنے والے ایک قافلہ سے معلوم ہوا کہ روم کے بادشاہ ہرقل نے ایک زبردست فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کی ہے اور یہ شام کی سرحد پر واقع ''تبوک'' نامی شہر میں خیمہ زن ہے، آپ نے ضروری سمجھا کہ فوری طور پر مسلمان ان کے مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوں؛ تا کہ رومیوں کے حوصلے بڑھ نہ جائیں، ایک تو صحابہ مکہ اور حُنین کی مہم سے ←

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ ؕ اَلَا فِی الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیۡطَةٌۢ
بِالۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۴۹﴾ اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡكَ مُصِیۡبَةٌ یَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ
اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ یَتَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۵۰﴾

ان (منافقین) میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں: مجھ کو (جہاد میں نہ جانے کی) اجازت دے دیجئے او مجھے فتنہ میں نہ ڈالئے، آگاہ ہوجاؤ کہ وہ تو فتنہ میں پڑے ہوئے ہیں ہی، اور بے شک دوزخ کفر کرنے والوں کو گھیر کر رہے گی ﴿۱﴾ ﴿۴۹﴾ اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کو ناگوار گذرتا ہے اور اگر آپ پر کوئی آزمائش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اپنا معاملہ پہلے ہی درست کرلیا تھا اور وہ خوشیاں کرتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔ ﴿۵۰﴾

← فارغ ہوکر ابھی ابھی اپنے گھر واپس آئے تھے، پھر یہ زمانہ سخت گرمی کا تھا، جس میں سفر دشوار ہوتا ہے، نیز اہل مدینہ کا اصل ذریعۂ معاش کھجور کے باغات تھے اور یہی زمانہ کھجور کی کٹائی کا تھا؛ لیکن دوسری طرف مقابلہ اس وقت کی سب سے بڑی طاقت سے تھا؛ اس لئے تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کے لئے نکل جائیں، منافقین —— جو حقیقت میں مسلمان نہیں تھے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے —— کے لئے یہ حکم بہت ہی ناگوارِ خاطر تھا، انھوں نے حیلے بہانے شروع کردئے اور حضور ﷺ کے سامنے اپنے خود ساختہ عذر پیش کرنے لگے، آپ ﷺ کے اندر نرم خوئی اور شفقت بے پایاں تھی، اس کے تحت آپ ﷺ نے ان کا عذر قبول فرمالیا، ان آیات میں اسی کا ذکر ہے، سب سے پہلے تو آپ ﷺ کو تنبیہ فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر آپ ﷺ نے ان کی معذرت کیوں قبول فرمائی؟ اگر آپ ﷺ نے معذرت قبول نہ کی ہوتی تو مخلص اور غیر مخلص مسلمان اور منافق آپ ﷺ کے سامنے واضح ہوجاتے، پھر فرمایا گیا کہ جو مخلص مسلمان ہیں، وہ آپ ﷺ سے رخصت نہیں مانگتے، جن لوگوں کا آخرت پر، اللہ پر ایمان نہیں ہے، وہ معذرت چاہتے ہیں، پھر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ وہ ان کے جہاد میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے آزردہ نہ ہوں؛ کیوں کہ اگر وہ تمہارے ساتھ ہوتے، تب بھی ان سے خیر کی اُمید نہیں تھی؛ بلکہ یہ بگاڑ ہی پیدا کرتے اور جاسوسی کرتے، اس سے پہلے بھی غزوۂ احد میں تجربہ ہوچکا ہے کہ انھوں نے عین میدان جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا؛ البتہ اگر انھیں اندازہ ہوتا کہ قریب کا سفر ہے اور مالِ غنیمت ہاتھ آنے والا ہے تو ضرور ساتھ ہولیتے، بہر حال رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تبوک تشریف لے گئے، جس میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی، آپ رجب میں تشریف لے گئے اور رمضان المبارک کے کچھ دنوں گذار کر واپس تشریف لائے، (تفسیر قرطبی: ۲۸۰/۸) مسلمانوں کی اس حوصلہ مندی نے رومیوں کے دل میں رعب ڈال دیا اور انھیں مدینہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

﴿۱﴾ قبیلہ بنو سلمہ کا ایک شخص جدّ ابن قیس نام کا تھا، یہ منافق تھا، رسول اللہ ﷺ نے جب اس کو غزوۂ تبوک میں شرکت کی دعوت دی تو اس نے کہا: ''میں عورتوں کا بہت دلدادہ ہوں، رومی عورتوں کو دیکھ کر صبر نہیں کرپاؤں گا؛ اس لئے مجھے فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے اور رک جانے کی اجازت دے دیجئے؛ البتہ میں مال کے ذریعہ آپ کی مدد کرسکتا ہوں'' (ترجمہ شیخ الہند: ۲۵۸/۱) آپ ﷺ نے اس کا ←

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ
هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ
بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا
اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

آپ کہہ دیجئے: اللہ نے ہمارے لئے جو مقرر فرمایا ہے، اس کے سوا ہرگز کوئی آزمائش ہم پر نہیں آسکتی، وہی ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے ﴿۵۱﴾ آپ کہہ دیجئے: تم لوگ ہمارے حق میں دو میں سے ایک بھلائی ہی کا انتظار کر رہے ہو اور ہم بھی تمہارے لئے انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تم کو اپنی طرف سے عذاب میں مبتلا کریں یا ہمارے ہاتھوں سے، پس، تم بھی انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۵۲﴾ آپ کہہ دیجئے کہ تم خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو یا ناگواری کے ساتھ، تم لوگوں سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، یقیناً تم لوگ نافرمان لوگ ہو۔ ﴿۲﴾ ﴿۵۳﴾

← مالی تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اسے رک جانے کی اجازت دے دی، اس آیت میں اسی شخص کا ذکر ہے کہ وہ تو پہلے ہی سے فتنہ میں مبتلا ہے، جب ہی تو حیلہ و بہانہ کا راستہ اختیار کر رہا ہے۔

﴿۱﴾ یعنی مسلمانوں کو تو دو میں سے ایک نعمت حاصل ہو کر رہے گی، یا تو مالِ غنیمت حاصل ہوگا جو دنیا کا انعام ہے، یا شہادت حاصل ہوگی جو آخرت کا انعام ہے، اور جو اسلام کے دشمن ہیں، ان پر بھی دو میں سے کوئی ایک عذاب آکر رہے گا، یا تو اللہ تعالیٰ کا براہ راست عذاب آجائے گا، جیسے زلزلہ، طوفان وغیرہ، یا مسلمانوں کے ذریعہ ان پر عذاب آئے گا، یعنی وہ شکست کھائیں گے اور مسلمانوں کو ان پر غلبہ حاصل ہوگا۔

﴿۲﴾ یعنی جو لوگ ایمان نہ لائے ہوں، ان کا خرچ کرنا اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، خواہ وہ خوشدلی کے ساتھ خرچ کریں یا ناگواری کے ساتھ، فقہاء نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ اگر حالت کفر میں نیکی کا کوئی کام کیا جائے تو اس پر کچھ اجر و ثواب حاصل ہوگا یا نہیں؟ احادیث سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ آخرت میں اس کی نیکی پر کوئی اجر حاصل نہیں ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ابن جُدعان زمانہ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتے تھے اور مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، کیا ان کو اس سے کچھ نفع حاصل ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں؛ کیوں کہ اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا کہ میرے پروردگار! قیامت کے دن میری غلطی کو معاف فرما دیجئے: ''رب اغفر لي خطيئتي يوم الدين'' (صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الدلیل علی أن من مات علی الکفر لا ینفعه عمل، حدیث نمبر: ۵۴۰)؛ البتہ دنیا میں ان کے بہتر عمل کی جزاء انھیں دی جاتی ہے؛ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی مؤمن کی نیکی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، دنیا میں بھی نیکی کی وجہ سے اسے عطاء ←

وَ مَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوۡلِهٖ وَ لَا يَاۡتُوۡنَ
الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمۡ كُسَالٰى وَ لَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَ هُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَ لَاۤ
اَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَ تَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَ هُمۡ
كٰفِرُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ ؕ وَ مَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَ لٰـكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ ﴿۵۶﴾
لَوۡ يَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَيۡهِ وَ هُمۡ يَجۡمَحُوۡنَ ﴿۵۷﴾

اور ان کی خیرات کے قبول کرنے سے یہی بات رکاوٹ بنی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرتے ہیں، نماز نہیں ادا کرتے؛ مگر سستی کے ساتھ، اور نا گواری کے ساتھ ہی خرچ کرتے ہیں؛ ﴿۵۴﴾ اس لئے آپ کو ان کے مال و دولت اور اولاد سے تعجب نہ ہو، اللہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ان کو دنیوی زندگی میں سزا دیں اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں جائیں ﴿۱﴾ ﴿۵۵﴾ اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں؛ حالاں کہ وہ تم میں سے نہیں ہیں؛ لیکن وہ لوگ (مسلمانوں سے) ڈرتے ہیں ﴿۵۶﴾ اگر انھیں کوئی ٹھکانہ یا غار یا سر گھسانے کی جگہ مل جائے تو لگام توڑ کر سرپٹ اسی طرف بھاگ نکلیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۵۷﴾

← کیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کو جزاء دی جاتی ہے، اور کافر کو ان کے اچھے عمل کے بدلے دنیا ہی میں کچھ بھلائیوں سے نواز دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ آخرت میں ان کے لئے کچھ باقی نہیں بچتا (صحیح مسلم، کتاب صفة القیامة والجنة والنار، باب جزاء المؤمن بحسناته في الدنيا والآخرة وتعجيل حسنات الكافر في الدنيا، حدیث نمبر: ۲۷۶۷)، اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا میں اس کے بہتر رویہ کو دیکھتے ہوئے ایمان کی توفیق عطاء کر دی جائے، حضرت حکیم ابن حزمؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۲۰ رسال کی عمر پائی، ۶۰ رسال اسلام سے پہلے اور ۶۰ رسال اسلام قبول کرنے کے بعد، حالت کفر میں بھی ۶۰ رغلام آزاد کئے اور ۴۰ راونٹ کی سواری سے لوگوں کی مدد کی اور یہی عمل زمانۂ اسلام میں بھی کیا، انھوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ زمانۂ کفر میں جو میں نے اچھے کام کئے ہیں، کیا مجھے ان پر کوئی اجر حاصل نہیں ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے جو نیکیاں کی تھیں، ان ہی کی وجہ سے تمہیں اسلام کی توفیق میسر آئی: ''أسلمت على ما أسلفت من خير''۔ (صحیح مسلم، کتاب الإيمان، باب بيان حكم عمل الكافر إذا أسلم بعده، حدیث نمبر: ۳۳۸)

﴿۱﴾ یعنی ایمان نہ لانے والوں کا دنیا میں دولت مند ہونا یا دنیوی اعتبار سے بہتر حالت میں ہونا تعجب کی بات نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے مہلت ہے؛ تاکہ وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں؛ یہاں تک کہ عذاب کے مستحق قرار پائیں۔

﴿۲﴾ یعنی منافقین اندر سے مسلمان نہیں ہیں، وہ محض مسلمانوں کے خوف سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، اگر مسلمانوں سے بچ نکلنے کا راستہ انھیں مل جائے تو ادھر بھاگ نکلنے کو پوری طرح تیار ہیں۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ
يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۙ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ ع ۱۷ ۱۳
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ
السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

اوران میں سے بعض لوگ آپ پر خیرات (کی تقسیم) کے سلسلہ میں طعنہ کرتے ہیں ؛ چنانچہ اگر ان کو اس میں سے (ان کی خواہش کے مطابق) دے دیا جائے تو خوش ہوجاتے ہیں اور اگر اس میں سے (ان کے منشا کے مطابق) نہیں دیا جائے تو ناراض ہوجاتے ہیں ﴿۵۸﴾ کیا ہی بہتر ہوتا کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول انھیں عنایت کرتے ، وہ اس پر راضی رہتے اور کہتے : ہمارے لئے اللہ کافی ہیں ، عنقریب اللہ بھی ہمیں اپنے فضل سے نوازیں گے اور اس کے رسول بھی ، ہمیں تو اللہ ہی (کی خوشنودی) چاہئے ﴿۱﴾ ﴿۵۹﴾ زکوٰۃ تو غریبوں ، حاجت مندوں ، صدقہ وصول کرنے پر متعین کارکنوں ، وہ لوگ جن کی دل جوئی مقصود ہو ، غلاموں ، مقروضوں ، اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کا حق ہے ، یہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ خوب جاننے والے اور حکمت والے ہیں ۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۰﴾

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ کچھ مال تقسیم فرمارہے تھے کہ 'ذُوالخُوَیصَرہ تمیمی' نامی شخص ـــ جس نے بعد میں فرقہ خوارج کی بنیاد رکھی ـــ حاضر ہوا اور کہنے لگا : اللہ کے رسول ! انصاف سے کام لیجئے ، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : اگر میں انصاف سے کام نہ لوں تو کون انصاف سے کام لے گا ؟ تمہارے لئے بربادی ہو : ''ویلک من یعدل إذا لم أعدل'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ، (صحیح البخاري ، کتاب الأدب ، حدیث نمبر : ۵۶۹۷) یہ صرف اسی شخص کی بات نہ تھی ؛ بلکہ بدباطن منافقین رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے کے لئے اس طرح کے فقرے کستے رہتے تھے ، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی شان یہ بتائی کہ انہیں زیادہ ملے ، کم ملے یا کچھ نہ ملے ، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے پر راضی رہتے ہیں اور ''حسبنا اللہ'' (اللہ کافی ہے) کا کلمہ ان کی زبان پر رہتا ہے ، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان غربت وافلاس کی آزمائش سے دوچار ہو تو اسے اللہ سے شکوہ نہ کرنا چاہئے یا کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے ، جس سے خدا کے فیصلہ پر ناراضگی کا اظہار ہوتا ہو۔

﴿۲﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کا ذکر فرمایا ہے ، اسی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زکوٰۃ کی نوعیت ایک حد تک دوسرے صدقات سے مختلف ہے ؛ کیوں کہ عام صدقات کے مصارف متعین نہیں ہیں اور زکوٰۃ کا مصرف متعین ہے ، ان مصارف کا ذکر کرنے کے بعد مزید تاکید کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے متعین کیا ہوا ہے ، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مصارف زکوٰۃ میں اجتہاد کی اور تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے ، زکوٰۃ کے کل آٹھ مصارف ہیں : ←

← پہلا مصرف فقیر ہے اور دوسرا مسکین، ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، مسکین سے مراد ہے غریب اور فقیر سے مراد ہے بہت غریب، احناف کے نزدیک جو شخص بنیادی ضروریات کے علاوہ اتنی اشیاء یا جائیداد کا مالک نہ ہو، جس کی قیمت سونے کے نصاب یعنی ساڑھے ستاسی گرام سونے یا محتاط قول کے مطابق چاندی کے نصاب یعنی ساڑھے ۵۲ رتولہ یعنی ۶۱۲ گرام چاندی کو پہنچ جائے، وہ فقیر و مسکین ہے اور اس کے لئے زکوٰۃ لینی جائز ہے، جو شخص اتنے مال کا مالک ہو؛ لیکن وہ مخصوص اموال اس کے پاس نہ ہوں، جن میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو اگرچہ اس شخص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛ لیکن اس کے لئے زکوٰۃ لینی بھی درست نہیں ہے۔

زکوٰۃ کا تیسرا مصرف 'عاملین' ہیں، یعنی وہ لوگ جن کو اسلامی حکومت نے مقرر کیا ہو، اسے زکوٰۃ میں سے اس کے کام کی اُجرت دی جائے گی، زکوٰۃ کے حساب وکتاب کے عملہ کو بھی اس مد سے کام کی اُجرت ادا کی جاسکتی ہے، موجودہ دور میں دینی مدارس اور دینی تنظیمیں جن لوگوں کو زکوٰۃ کی وصولی کے لئے مقرر کرتی ہیں، وہ اگرچہ اصطلاحی طور پر عاملین میں نہیں ہیں؛ لیکن چوں کہ کام اور مقصد ایک ہی ہے؛ اس لئے جہاں اسلامی حکومت اور بیت المال نہ ہو، وہاں ان کو بھی عاملین کے درجہ میں رکھتے ہوئے زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ ادا کی جاسکتی ہے، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی ؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ (کفایت المفتی: ۲۶۹/۴، جواب نمبر: ۳۴۱)

چوتھا مد 'مؤلفۃ القلوب' کا ہے، یعنی اول: ان غیر مسلموں کی امداد واعانت جن کے اسلام قبول کرنے کی اُمید ہو، دوسرے: ان غیر مسلم قائدین کی مدد کہ جن کے شر سے مسلمانوں کو بچانا مقصود ہو، تیسرے: وہ نومسلم جن کا ایمان ابھی کمزور ہو اور اُمید ہو کہ ان کی مدد انھیں دین پر ثابت قدم رکھے گی، (فتح القدیر: ۲۰۰/۲) یہ مد باقی ہے یا ختم ہوگئی؟ اس سلسلہ میں حنفیہ اور مالکیہ کی رائے ہے کہ اب یہ مد باقی نہیں رہی، حنابلہ کا نقطۂ نظر ہے کہ یہ مد باقی ہے اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اور امام شافعی ؒ سے دونوں طرح کی رائیں منقول ہیں، (حوالہ کے لئے دیکھئے: شرح المهذب: ۱۹۷/۴، الجامع لأحکام القرآن: ۱۸۱/۸، المغنی: ۲۸۰/۲) موجودہ حالات میں حنابلہ کا قول شریعت کے مقاصد ومصالح سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے اور شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ (حجۃ اللہ البالغۃ مع الترجمہ: ۱۰۵/۲)

پانچواں مصرف 'گردنوں کو چھڑانا' ہے، یعنی غلاموں کو آزاد کرنا، اب یہ مصرف باقی نہیں ہے؛ لیکن اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ملی اور دینی خدمت کی پاداش میں جو لوگ قید کئے جاتے ہیں، قانونی کاروائی کے ذریعہ انھیں رہائی دلانا کیا گردن چھڑانے میں شامل نہیں ہے، جب کہ یہ بے قصور محروسین غلاموں سے زیادہ تکلیف میں ہیں؟

چھٹا مصرف 'غارمین' ہیں، حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد وہ مقروض ہیں، جو خود اپنا قرض ادا کرنے کے لائق نہ ہوں، عام فقراء کے مقابلہ ایسے شخص کو زکوۃ دینی زیادہ بہتر ہے، (تاتارخانیہ: ۲۷۰/۲) شوافع، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک غارمین کے مصداق وہ لوگ ہیں، جو دو مسلمانوں کے درمیان صلح اور رفع نزاع کے لئے کوئی مالی ذمہ داری قبول کرلیں۔ (شرح المهذب: ۲۰۷/۶، تفسیر قرطبی: ۱۸۴/۸)

ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے، جمہور فقہاء کے نزدیک اس سے مراد مجاہدین ہیں اور بعض نے علوم دینیہ کے طلبہ کو بھی اس میں شامل رکھا ہے، (البحر الرائق: ۲۴۲/۲، تاتارخانیہ: ۲۷۰/۲) آٹھواں مصرف ابن سبیل یعنی مسافرین ہیں، کوئی شخص صاحب ثروت ہو؛ لیکن حالت سفر میں محتاج ہوجائے تو اس کے لئے بھی زکوٰۃ لینے کی گنجائش ہے۔ ←

وَ مِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۟﴿۶۱﴾ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ
كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾

الثلثة

اوران میں سے بعض وہ ہیں جو نبی کواذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کان کے کچے ہیں، آپ کہہ دیجئے: کان ہیں تمہارے بھلے ہی کے لئے، جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں، اور ایمان والوں کی بات پر بھروسہ کرتے ہیں، اورتم میں سے ایمان لانے والوں کے لئے رحمت ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱﴾ ﴿۶۱﴾ یہ (منافقین) تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں؛ تاکہ تم کو راضی کرلیں؛ حالاں کہ اگر واقعی وہ ایمان والے ہیں تو اللہ اور اس کے رسول اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ انھیں راضی کرتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۲﴾

← فقہاءِ احناف کے نزدیک عاملین کے سوا زکوٰۃ کے جتنے مصارف بیان کئے گئے ہیں، وہ اسی وقت زکوٰۃ کے حقدار ہیں، جب کہ فقر و احتیاج سے دوچار ہوں، گویا اصل مصرف فقراء ومساکین ہیں، بقیہ مصارف فقراء کی ترجیحی شکلیں ہیں، جن کو کسی خاص ضرورت کے تحت زکوٰۃ دی جاتی ہے، (زکوٰۃ اور اس کے مصارف سے متعلق احکام کے سلسلہ میں کتبِ فقہ سے مراجعت کی جاسکتی ہے، راقم الحروف نے اپنی تالیف ''اسلام کا نظام عشر وزکوٰۃ'' میں زکوٰۃ وعشر کے احکام پر ایک گونہ تفصیل سے گفتگو کی ہے) —— بہرحال زکوٰۃ کے ان آٹھوں مصارف کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر زکوٰۃ کے دو مقاصد ہیں: ایک فقراء اور حاجت مندوں کی ضرورت کو پوری کرنا، دوسرے: اسلام کی سربلندی، فی سبیل اللہ اور مؤلفۃ القلوب اس دوسرے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہے اور بقیہ مدات پہلی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے۔

﴿۱﴾ جو لوگ بھی کوئی عذر پیش کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ اپنی شرافت، خوش اخلاقی اور نرم خوئی کی وجہ سے اسے سن لیتے تھے اور ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑتے ہوئے قبول فرمالیتے تھے، منافقین بجائے اس کے کہ اپنی شرارتوں کے باوجود آپ کی خوش اخلاقی سے متأثر ہوتے اور اپنے آپ پر شرمسار ہوتے، اُلٹے حضور ﷺ کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ ان کے پاس تو صرف کان ہے، ہر بات سن لیتے ہیں اور قبول کرلیتے ہیں، خاص کر نَبْتَلْ بن حارث نامی ایک شخص جو اپنی ظاہری شکل وصورت میں بھی وحشت ناک نظر آتا تھا، وہ آپ کی شان میں اس طرح کی باتیں کہنے میں پیش پیش رہتا تھا، اس آیت میں ان کے اس رویہ کی مذمت کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ حضور ﷺ تمہارے ہی بھلے کے لئے سنتے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ پر اور اپنے صاحبِ ایمان ساتھیوں پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اہل ایمان کے لئے سراپا رحمت ہیں۔

﴿۲﴾ ایک بار ایسا ہوا کہ کچھ منافقین —— جن میں جُلاس ابن سُوید اور وَدِیعہ بن ثابت بھی تھے —— جمع ہوئے، ان میں ←

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ
الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ
اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ
وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ
ع ۸ ۱۴ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا، اس کے لئے یقیناً دوزخ کی آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی رسوائی ہے، ﴿۶۳﴾ منافقین ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہوجائے، جو مسلمانوں کو منافقین کے دلوں کا حال بتادے، آپ کہہ دیجئے: مذاق اُڑالو، جس بات سے تم ڈر رہے ہو، اللہ اس کو ظاہر کر کے رہیں گے ﴿۱﴾ ﴿۶۴﴾ اور اگر آپ ان سے تحقیق حال کے لئے دریافت کریں گے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو صرف ہنسی مذاق کر رہے تھے، آپ کہہ دیجئے: کیا اللہ کے ساتھ، اللہ کے احکام کے ساتھ اور اللہ کے رسول کے ساتھ تم مذاق کر رہے تھے؟ ﴿۶۵﴾ بہانے نہ کرو، حقیقت یہ ہے کہ تم (بظاہر) ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف چلے گئے، اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کی طرف سے (توبہ کرنے کے سبب) درگذر بھی کر جائیں تو ایک گروہ کو تو ضرور ہی ان کے جرم کا ارتکاب کرنے کی سزا دیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۶﴾

← عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نامی ایک انصاری نوجوان بھی موجود تھے، منافقین نے ان سے تحقیر آمیز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ حق ہو تو ہم لوگ گدھے سے بھی بدتر ہیں، حضرت عامر رضی اللہ عنہ کو اس پر غصہ آگیا اور انھوں نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں، وہ حق ہے اور تم لوگ واقعی گدھے سے بھی گئے گزرے ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس گفتگو کی اطلاع دی گئی تو وہ قسم کھا بیٹھے کہ عامر جھوٹے ہیں، حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھاتے ہوئے کہا؛ بلکہ وہ لوگ جھوٹے ہیں اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! ہم لوگ اور وہ لوگ الگ نہ ہوں، جب تک کہ سچے کا سچ اور جھوٹے کا جھوٹ ظاہر نہ ہوجائے؛ چنانچہ حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی اور ایک بنیادی بات فرمائی گئی کہ جو شخص واقعی اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہوگا، اسے اللہ اور اس کے رسول کو راضی کرنے کی فکر ہوگی اور وہ اپنی زبان کو ایسی باتوں سے محفوظ رکھے گا، نہ یہ کہ اس کو لوگوں کو راضی کرنے کی فکر ہوگی اور وہ اس کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا۔

﴿۱﴾ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منافقین کے نام بتادیئے گئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفقاء میں سے صرف حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دی تھی؛ اسی لئے ان کا لقب صاحب السر ہے، (بخاری، باب مناقب عمار وحذیفہ، حدیث نمبر: ۳۷۴۳، اسد الغابہ: ۱/۵۷۳) لیکن آپ نے عمومی طور پر اس راز کا افشاء نہیں فرمایا؛ کیوں کہ عام طور پر ان کی اولاد مخلص ←

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ
وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ
الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ
وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

منافق مرد وعورت ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں، جو برائی کا حکم دیتے ہیں، بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں، اُن لوگوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے تو اللہ نے بھی ان کو بھلا دیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ منافقین گنہگار لوگ ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۶۷﴾ اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے، یہی ان کے لئے کافی ہے، نیز ان پر اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لئے ہمیشہ برقرار رہنے والا عذاب ہے۔ ﴿۶۸﴾

← مسلمان تھی، اگر لوگوں میں یہ بات عام ہو جاتی تو انھیں شرمندگی ہوتی اور لوگ انہیں عار دلاتے۔

﴿۲﴾ غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کے ساتھ چند منافقین بھی شامل ہو گئے تھے، یہ لوگ حضور ﷺ سے آگے آگے گزر رہے تھے، انھوں نے ایک دوسرے سے حضور ﷺ کا تمسخر کرتے ہوئے کہا: ذرا ان کو دیکھو، یہ شام کے محلات اور رومیوں کے قلعے فتح کرنے چلے ہیں! —— آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے اس کی خبر دی گئی، آپ ﷺ نے اس قافلہ کو روکا، پھر دریافت فرمایا: کیا تم نے ایسا ایسا نہیں کہا ہے؟ یہ لوگ کہنے لگے کہ ہم نے مذاق سے کہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مذاق کرتے ہو —— ان میں دو شخص تو وہ تھے، جنھوں نے عملاً تمسخر میں حصہ لیا، اور تیسرے شخص مُخاشن بن حُمیر نامی تھے، یہ صاحب گفتگو کے سننے میں تو شریک تھے؛ لیکن انھوں نے خود کچھ نہیں کہا، اسی پس منظر میں فرمایا گیا کہ اگر ہم بعض شرکاء کو معاف بھی کر دیں؛ لیکن سبھوں کو تو معاف نہیں کر سکتے، جن کو معاف کیا گیا، وہ یہی 'مخاشن' تھے، انھوں نے نفاق سے توبہ کر لی، اپنا نام عبدالرحمن رکھ لیا اور جنگ یمامہ میں شہید ہوئے، (تفسیر قرطبی: ۸/۱۹۷-۱۹۹) —— معلوم ہوا کہ دین وشریعت کے معاملہ میں تمسخر اور مذاق قطعاً جائز نہیں، مشہور مفسر قاضی ابوبکر ابن عربی نے نقل کیا ہے کہ ہنسی مذاق کے انداز پر کفریہ بات کہنا بھی کفر ہے اور اس پر اُمت کا اتفاق ہے: ''فإن الهزل بالكفر كفر لا خلاف فيه بين الأمة'' (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/۱۹۷) بعض لوگ نماز، روزہ کا، اذاں کا، داڑھی کا اور دین کے شعائر کا مذاق اڑانے لگتے ہیں، یاد رکھنا چاہئے کہ یہ چیز ان کو ایمان کے دائرے سے باہر کر دیتی ہے، (اللہ تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے) —— اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس مجلس میں کوئی بری بات ہوتی ہو، یا خلاف شریعت کام کیا جاتا ہو تو اگر اس پر نکیر کرنے کی جرأت ہو تو شریک ہو اور اس پر ناراضگی کا اظہار کرے، ورنہ ایسی مجلس میں شریک ہونے سے گریز کرے؛ چنانچہ ان منافقین میں تیسرے شخص استہزاء میں شریک نہیں تھے؛ لیکن اس مجلس میں موجود ہونے کی وجہ سے ان کی بھی گرفت کی گئی۔

﴿۱﴾ اس آیت میں منافقین کی روش یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بھلائی کے بجائے برائی کی دعوت دیتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں، ←

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا
بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ
كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ۝۶۹ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۥ وَ قَوْمِ
اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۷۰ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ
بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱ وقف لازم

ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے تھے، وہ تم سے زیادہ طاقتور بھی تھے اور مال و اولاد میں بھی بڑھ کر تھے؛ چنانچہ انھوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اُٹھالیا، تم بھی اپنے حصہ سے فائدہ اُٹھالو، جیسا کہ پہلے لوگوں نے اپنے حصہ سے اُٹھایا تھا، اور تم ان ہی کی چال چلتے ہو، یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں غارت ہوکر رہ گئے اور یہی نقصان اُٹھانے والے لوگ ہیں ۝۶۹ کیا انھیں اپنے سے پہلے لوگوں —— قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، اصحابِ مدین اور اُلٹی ہوئی بستیوں کے باشندوں ﴿۱﴾ —— کی خبریں نہیں پہنچیں؟ جن کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے، اللہ کی شان نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرتے؛ لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے ۝۷۰ مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز کی پابندی کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ جلد ہی ان پر اللہ کی رحمت ہوگی، بے شک اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۷۱

← بخل سے کام لیتے ہیں اور خدا فراموشی میں مبتلا ہیں، اس وقت مغربی دنیا کی بالکل یہی صورت حال ہے، یہ لوگ زبان سے اپنے آپ کو یہودی یا عیسائی کہتے ہیں؛ لیکن خود اپنی مذہبی کتابوں پر عمل نہیں کرتے، انھوں نے اپنی زندگی میں خدا کا کوئی حصہ نہیں رکھا ہے اور انھوں نے ایسا سرمایہ دارانہ نظام قائم کیا ہے، جس کے ذریعہ چند ہاتھوں میں پوری دنیا کی دولت سمٹ آئے، گویا نفاق کے اسی کردار کو آج پوری دنیا میں فروغ دیا جارہا ہے۔

﴿۱﴾ قوم نوح کا ذکر سورۃ الاعراف: ۹۶ میں قوم عاد کا ذکر سورۃ الاعراف: ۶۵ میں قوم ثمود کا ذکر سورۃ الاعراف: ۷۳ میں، ←

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ
طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ ع ۹/۶ ۱۵
جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

اللہ نے مؤمن مردوں اور عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ فرمایا ہے —— جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے —— نیز ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں نفیس رہائش گاہوں کا بھی، (وعدہ ہے) اور اللہ کی خوشنودی جو حاصل ہوگی، وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، یہی بڑی کامیابی ہے!﴿۱﴾ ﴿۷۲﴾ اے نبی! کفر ونفاق میں مبتلا لوگوں سے جہاد کیجئے اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آیئے، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ کیا ہی بدترین ٹھکانہ ہے!﴿۲﴾ ﴿۷۳﴾

← قوم ابراہیم کا ذکر سورۃ الانعام: ۷۴ تا ۸۴ میں اور اصحابِ مدین کا ذکر سورۃ الاعراف: ۸۵ میں آچکا ہے، اُلٹی ہوئی بستی سے مراد قوم لوط ہے، جس کا ذکر سورۃ الاعراف: ۸۰ میں آچکا ہے، —— یعنی یہ واقعات اسی لئے ذکر کئے گئے ہیں کہ بعد میں آنے والے لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی دوستی کی بنیاد دین ہے، ایک مسلمان پر اپنے مسلمان دوست کا یہ حق ہے کہ وہ اسے نیکی کی طرف بلائے، برائی سے روکے، خود اچھے کام کرے اور دوسروں کو اس کی دعوت دے، وہ دوست نہیں دشمن ہے جو نیکی کی ترغیب دینے کے بجائے برائی پر اکساتا ہو اور جو خلافِ شریعت کاموں میں اس کا تعاون کرتا ہو۔

﴿۱﴾ ایک غلام کے لئے اس سے بڑھ کر خوش بختی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا مالک وآقا اس سے راضی ہوجائے؛ کیوں کہ اس کی خوشنودی ہی سے تمام نعمتیں اور راحتیں متعلق ہیں۔

﴿۲﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو لوگ کھلے طور پر کافر ہیں، ان سے تلوار سے جہاد کرنے کا حکم ہے اور جو حقیقت میں کافر ہیں، مگر بظاہر مسلمان ہیں، یعنی منافقین تو ان سے زبان کے ذریعہ جہاد کا حکم دیا گیا، یعنی ان پر دین کی دعوت پیش کی جائے، معلوم ہوا کہ دعوت دین بھی جہاد ہی کی ایک صورت ہے؛ بلکہ جہاد کا پہلا مرحلہ یہی ہے کہ دعوت حق پیش کی جائے اور جن ملکوں میں مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان صلح ومعاہدہ کی وجہ سے تلوار سے جہاد والی صورت نہ ہو، وہاں بھی زبان ہی سے جہاد کیا جائے گا، یعنی اسلام کی دعوت پیش کی جائے گی، اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سختی سے پیش آنے کا حکم دیا جارہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نرمی اور خوش اخلاقی بہت اچھی چیز ہے؛ لیکن جب کوئی کام شریعت کے خلاف ہو تو وہاں اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے سختی اور کسی قدر درشت کلامی بھی ضروری ہوتی ہے، ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی ذات کے معاملے میں تو فولاد بن جائے اور دین کے معاملے میں موم کی ناک بن جائے، اسے جدھر چاہے موڑ دے، ایسے طرز عمل سے سماج میں برائیاں پروان چڑھتی ہیں اور بدکاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوۡا ؕ وَلَقَدۡ قَالُوۡا كَلِمَةَ الۡكُفۡرِ وَكَفَرُوۡا بَعۡدَ اِسۡلَامِهِمۡ وَهَمُّوۡا بِمَا لَمۡ
يَنَالُوۡا ۚ وَمَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰٮهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۚ فَاِنۡ يَّتُوۡبُوۡا يَكُ خَيۡرًا لَّهُمۡ ۚ
وَاِنۡ يَّتَوَلَّوۡا يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡ
وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۷۴﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰٮنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ
الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰٮهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعۡقَبَهُمۡ
نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾

وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے نہیں کہی ہے؛ حالاں کہ انھوں نے کفر کی بات کہی ہے اور (بہ ظاہر) مسلمان ہوجانے کے بعد کفر کا ارتکاب کیا ہے، نیز انھوں نے اس کام کی بھی سازش کی، جسے وہ نہیں کر پائے، ﴿۱﴾ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں جو خوش حالی عطا کی، یہ اسی کا بدلہ دے رہے ہیں؟؟ ﴿۲﴾ اور زمین میں کوئی ان کا یار و مددگار نہیں ہوگا ﴿۷۴﴾ ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازیں گے تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ضرور نیک بن جائیں گے ﴿۷۵﴾ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو وہ اس میں بخل کرنے لگے اور منھ پھیر لیا اور وہ (تو اپنے وعدہ سے) منھ پھیر لینے کے عادی ہیں ہی ﴿۷۶﴾ چنانچہ اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا ہے، جو خدا کے پاس جانے کے دن تک رہے گا؛ اس لئے کہ انھوں نے وعدہ خلافی کی اور اس لئے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ ﴿۷۷﴾

﴿۱﴾ منافقین وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کے غائبانہ میں آپ کی شان میں بدگوئی کیا کرتے تھے، جن میں سے بعض واقعات کا گذشتہ آیات میں ذکر آچکا ہے، اس کے علاوہ غزوۂ تبوک کے موقع سے انھوں نے ایک وادی میں آپ کے قتل کئے جانے کا ناپاک منصوبہ بھی بنایا، جس میں بارہ لوگ شریک تھے، رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سازش کے بارے میں مطلع کردیا گیا اور اس طرح آپ محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''وهموا بما لم ينالوا'' سے اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے، آپ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان کے نام بھی بتادیئے تھے، انھوں نے درخواست کی کہ ان کے قتل کا حکم صادر فرمایا جائے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عرب کہیں گے کہ محمد (ﷺ) نے جب اپنے ساتھیوں کے ذریعہ فتح حاصل کرلی تو اب ان ہی کو قتل کررہے ہیں، ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے'' —— جب کسی گروہ کے پاس علم اور دلیل کی طاقت نہیں ہوتی تو وہ قتل و خون اور سازشوں پر اُتر آتا ہے؛ اس لئے مسلمان ہمیشہ اور بالخصوص داعیانِ دین ایسے مرحلوں سے گزرتے رہے ہیں، یہ دراصل اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ آپ کے مخالف کے پاس دلیل کا ہتھیار نہیں ہے؛ اس لئے وہ تشدد کا ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔

﴿۲﴾ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب عموماً اور اہل مدینہ خصوصاً نہایت تنگی اور افلاس سے دوچار تھے؛ لیکن آپ ﷺ کی برکت سے مدینہ منورہ اور پورا جزیرۃ العرب ایک خوشحال علاقہ بن گیا اور لوگ معاشی اعتبار سے بھی بہتر زندگی گذارنے لگے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ
الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ
مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے راز اور ان کی سرگوشیوں سے بھی واقف ہیں اور بے شک اللہ غیب کی باتوں کو بھی خوب جاننے والے ہیں ﴿۱﴾﴿۷۸﴾ جو لوگ نفل صدقہ کرنے والے مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہیں، اور جن مسلمانوں کو اپنی محنت مزدوری کی (قلیل آمدنی) سے زیادہ میسر نہیں، ان کا مذاق اُڑاتے ہیں تو اللہ بھی ان کے مذاق کا جواب دیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔﴿۲﴾﴿۷۹﴾

﴿۱﴾ یہ آیات بعض منافقین جیسے نبتل ابن حارث، جدّ ابن قیس اور مُعَطِّب بن قشیر وغیرہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ آیت کے اگلے اور پچھلے مضمون سے واضح ہے، بعض مفسرین نے حضرت حاطِب بن بَلْتَعہ یا حضرت ثَعْلَبہ بن حاطب رضی اللہ عنہم کو اس کا مصداق قرار دیا ہے؛ لیکن یہ غلط ہے؛ کیوں کہ یہ وہ مخلص صحابہ ہیں، جو غزوۂ بدر میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک رہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ان لوگوں کے بارے میں ہے جو نفاق میں مبتلا ہیں (تفسیر قرطبی: ۲۱۰/۸) —— اس آیت سے دو فقہی مسائل بھی ثابت ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اگر آدمی کسی اچھے کام کی نذر مان لے تو اس کو پورا کرنا واجب ہے، اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے؛ (موسوعۃ الاجماع نمبر: ۴۰۵۲، ۱۱۶۰/۳) کیوں کہ بعض منافقین نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ مال (فضل) عطا فرمائیں گے تو وہ صدقہ کریں گے؛ لیکن انھوں نے صدقہ نہیں کیا، ان کے اس عمل کی مذمت فرمائی گئی اور واجب کے چھوڑنے پر ہی مذمت کی جاتی ہے، مستحب کے چھوڑنے پر مذمت نہیں کی جاتی، دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر انسان کسی چیز کا مالک نہ ہو؛ لیکن اس نے نذر مانی ہو کہ جب وہ چیز اس کی ملکیت میں آجائے گی تو وہ فلاں کام کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے وہ چیز عطاء فرمادی تو اس کے لئے اس چیز کا پورا کرنا واجب ہے، یہی فقہائے احناف کی رائے ہے، (ردالمحتار: ۵۲۶/۵) بعض فقہاء کے نزدیک انسان جس چیز کا مالک نہ ہو، اگر اس کے بارے میں وہ کوئی نذر مان لے تو اس کا اعتبار نہیں ہے۔

﴿۲﴾ جن کے دل یقین واخلاص سے خالی ہوتے ہیں، ان کا مزاج دوسروں کے کام میں عیب نکالنے اور برائی تلاش کرنے کا ہوتا ہے، منافقین کا یہی مزاج تھا، حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مرفہ الحال صحابہ میں تھے، ایک موقع پر جب تعاون کی ضرورت تھی، ان کی کل دولت آٹھ ہزار دینار یا درہم پر مشتمل تھی، اس میں سے نصف انھوں نے اللہ کے راستے میں پیش کر دیا، منافقین کو یہ بات اچھی نہیں لگی، وہ کہنے لگے کہ یہ شخص ریاء کار ہے، دکھاوے کے لئے خرچ کر رہا ہے، حضرت ابو عَقِیل انصاری رضی اللہ عنہ غریب صحابی تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے، انھوں نے اپنی گنجائش کے مطابق تھوڑی سی کھجور پیش فرمائی تو کہنے لگے: واہ، کیا اللہ کو اسی کی حاجت تھی؟ غرض کہ بہر صورت وہ مذاق اُڑاتے تھے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے مذاق کا جواب دیں گے، جو سخت عذاب کی صورت میں ہوگا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۸۰ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ ع ۱۰ ۸ ۱۶
بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۱ فَلْيَضْحَكُوْا
قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ
فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ
رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝۸۳

آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں ؛ بلکہ اگر آپ نے ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت کی دُعاء کریں تو اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کریں گے ، یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتے ﴿۱﴾ ۝۸۰ اللہ کے رسول کے جانے کے بعد یہ پیچھے رہ جانے والے اپنے بیٹھے رہ جانے پر خوش ہوگئے ، انھیں اپنی جان و مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ناگوار ہے اور وہ کہتے ہیں کہ گرمی میں نہ نکلو ، آپ کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ زیادہ گرم ہے ، کاش ! وہ لوگ سمجھداری سے کام لیتے ۝۸۱ وہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں ، اور اپنی بداعمالیوں کی سزا میں بہت دنوں روتے رہیں ﴿۲﴾ ۝۸۲ پس ، اگر اللہ ان کے کسی گروہ کی طرف آپ کو واپس لائے ، پھر وہ آپ سے (جہاد میں) نکلنے کی اجازت چاہیں تو کہہ دیجئے : تم میرے ساتھ کبھی بھی ہرگز نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر دشمن سے جنگ کرو گے ، تم پہلی بار بیٹھنے پر راضی ہوگئے تو (اب) پیچھے رہ جانے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو ۔ ۝۸۳

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی موت حالتِ اسلام پر نہ ہوئی ہو ، ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا یا ان پر نماز جنازہ پڑھنا یا ان کے لئے ایصال ثواب کرنا قطعاً جائز نہیں : ’’وشرائطها ستة ، أولها : إسلام الميت ؛ لأنها شفاعة وليست لكافر‘‘ (مراقي الفلاح مع الطحطاوي : ۳۸۳ ، نیز دیکھئے : بدائع الصنائع : ۲/۴۷) اور اس بات میں کوئی معقولیت بھی نہیں ہے کہ جو شخص آخرت کے ثواب و عذاب پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا ، آپ اس کے لئے اجر و ثواب کی دُعاء کریں ، عام مسلمان تو کیا اللہ کے رسول ﷺ سے فرمایا گیا کہ اگر وہ بھی ستر بار ان کے لئے دُعاءِ مغفرت کریں تو اللہ کے یہاں اسے قبول نہیں کیا جائے گا ۔

﴿۲﴾ یہ آیت بھی منافقین ہی سے متعلق ہے ، اس میں بطور حکم کہا گیا ہے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں ؛ لیکن مفسرین نے اس کو خبر و اطلاع کے معنی میں لیا ہے ، یعنی انھیں خبردار ہوجانا چاہئے کہ دنیوی زندگی کے چند دن رہ گئے ہیں ، انھیں میں ان کے لئے ←

وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ لَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

نیز ان (منافقین) میں سے کسی کی موت ہوجائے تو آپ اس پر کبھی بھی نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں، بے شک ان لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ نافرمانی (کفر) ہی کی حالت میں مرے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾ اور آپ کو ان کے مال و اولاد سے حیرت نہ ہو، اللہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ان کو دنیا میں عذاب دیں اور کفر کی حالت ہی میں ان کی جان نکلے ﴿۸۵﴾ اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کرو تو ان میں سے خوشحال لوگ آپ سے (جہاد میں شریک نہ ہونے کی) اجازت چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے، ہم ٹھہر جانے والوں کے ساتھ رہ جاتے ہیں ﴿۸۶﴾ انھیں پیچھے رہ جانے والوں ﴿۲﴾ کے ساتھ رہنا پسند ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی ہے؛ اس لئے وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ ﴿۸۷﴾

← ہنسنے کا موقع ہے، پھر موت کے بعد قبر سے لے کر دوزخ تک ان کے لئے رونا ہی رونا ہے، اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس بات کا بھی ہوگیا کہ یوں تو ہنسنا اور رونا ایک فطری چیز ہے؛ بلکہ بعض دفعہ تو انسان اس سلسلہ میں بے قابو ہوجاتا ہے؛ لیکن دنیا میں انسان کا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ خواہ مخواہ ہنسنے ہنسانے کو اپنا مشغلہ نہ بنالے؛ بلکہ ہنسنے سے بچے اور خشیت خداوندی سے اس کی آنکھیں تر رہیں، آج کل لوگوں نے لطیفہ گوئی، مزاح نگاری اور ہنسنے اور قہقہہ لگانے کو ایک آرٹ قرار دے دیا ہے، اس کے لئے محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں اور اس پر ضخیم کتابیں شائع کی جاتی ہیں، اسلام کی نظر میں یہ پسندیدہ طریقہ نہیں ہے۔

﴿۱﴾ غزوۂ تبوک میں پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دینے کی وجہ سے ان کے لئے دو سزائیں مقرر کی گئیں: ایک یہ کہ آئندہ اگر وہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونا بھی چاہیں تو انھیں شریک نہ کیا جائے، دوسرے یہ کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب منافقین کے سردار عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ (جو مخلص مسلمان تھے) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ آپ میرے والد کے کفن کے لئے اپنی قمیص عنایت فرمائیں اور ان کی نمازِ جنازہ پڑھادیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے اپنی قمیص عنایت فرمائی، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو جب آپ نے جوڑا عنایت فرمایا تو آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دراز قامت ہونے کی وجہ سے ←

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ
الْخَيْرٰتُ ٝ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
ع ۹/۱۷ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ
وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

لیکن رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لاچکے ہیں، وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، ان ہی کے لئے بھلائیاں ہیں اور وہی کامیاب ہیں، ﴿۸۸﴾ اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان ہی باغات میں رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے، ﴿۸۹﴾ اور دیہاتیوں میں سے کچھ بہانہ باز آپہنچے کہ انھیں (جہاد میں شریک نہ ہونے کی) اجازت دے دی جائے اور جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا تھا، وہ بالکل ہی بیٹھ گئے، ان منافقین میں سے جو کفر پر قائم رہیں، عنقریب انھیں دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۰﴾

← ان پر کوئی کپڑا فٹ نہیں آرہا تھا، عبداللہ بن اُبی کا قد بھی اونچا تھا، اس نے اپنا کپڑا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لئے پیش کیا، جو انھیں پہنایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص دے کر اس حسن سلوک کا بدلہ ادا کردیا، جب آپ نے نماز جنازہ پڑھانی چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت اصرار کے ساتھ روکنا چاہا؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات نہ مانی اور نماز پڑھادی، جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے، یہ آیت آپ پر نازل ہوئی۔

(صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب الكفن في القميص الذي يكف أو لا يكف ومن كفن بغير قميص، حدیث نمبر: ۱۱۹۰، نیز دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/۲۱۸)

﴿۲﴾ پیچھے رہ جانے والوں سے مراد عورتیں، بچے اور معذور لوگ ہیں۔

﴿۱﴾ گذشتہ آیات میں ان منافقین کا ذکر تھا، جو مدینہ میں موجود تھے، اس آیت میں ان منافقین کا ذکر کیا گیا ہے، جو مدینہ کے مضافات اور دیہاتوں میں تھے، جیسے بنو اسد، بنو غطفان، بنو عامر بن طفیل، یہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بے جا عذر لے کر آئے کہ اگر ہم آپ کے ساتھ نکل جائیں تو قبیلہ طیٔ کے لوگ ہمارے قبیلہ پر ٹوٹ پڑیں گے، اس آیت میں ان کا ذکر ہے کہ وہ دنیا میں حیلہ بہانہ سے کام لے سکتے ہیں؛ لیکن آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکیں گے، —— یہاں ''معذّرون'' (ذال پر تشدید) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے ایسا شخص مراد ہے، جو معذور نہ ہو؛ لیکن خود کو معذور ظاہر کرتا ہو: ''الذي يعتذر بلا عذر'' (مفاتیح الغیب: ۸/۱۳۰) —— اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان لوگوں میں سے جو کافر ہیں انھیں عذاب پکڑ لے گا؛ حالاں کہ منافقین تو سبھی کافر تھے تو اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو بعد میں اخلاص کے ساتھ اسلام قبول کریں گے اور ان کی موت ایمان کی حالت میں ہوگی، وہ —— انشاء اللہ —— اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔ (حوالۂ سابق: ۸/۱۳۰)

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا
نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّ لَا عَلَى
الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ
مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ؕ

(جہاد میں شریک نہ ہونے پر) کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں کے لئے جو خرچ نہیں پاتے کوئی گناہ نہیں ہے؛ بہ شرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ ہوں، نیک عمل کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے، اور اللہ بخشنے والے اور مہربان ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۱﴾ اور ان لوگوں پر گناہ نہیں، جو آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آپ ان کے لئے سواری کا نظم کر دیں (مگر) آپ نے کہا: ''میرے پاس سواری مہیا نہیں ہے''؛ چنانچہ وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ مارے غم کے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے: کہ انھیں (جہاد میں شرکت کے لئے) اخراجات مہیا نہیں ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ اسلامی شریعت کا بنیادی امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کی صلاحیت اور گنجائش ہی کے لحاظ سے احکام دیتی ہے، جہاد وہی شخص کر سکتا ہے جو جوان اور طاقت ور ہو، بوڑھا نہ ہو، صحت مند ہو، بیمار نہ ہو، سفر جہاد کے لئے سواری میسر ہو؛ لہٰذا قرآن نے واضح کر دیا کہ اگر کوئی جہاد میں شریک ہونے سے واقعی معذور تھا، ضعیف تھا، بیمار تھا یا سواری سے محروم تھا اور وہ اس عذر کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکا تو اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ دنیا میں اس کا یہ عمل قابل گرفت ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے خیر خواہی کا جذبہ رکھتا ہو اور دین کے معاملے میں اس کا رویہ بہتر ہو۔ — ''مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ'' کو فقہاء نے ایک اہم اُصول مانا ہے کہ اگر کسی کام کو انجام دینے والا اپنی کوشش کے مطابق صحیح طور پر انجام دے؛ لیکن وہ اس حد سے آگے بڑھ جائے، جو شریعت کی طرف سے مقرر ہے، جیسے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے؛ لیکن ہاتھ کاٹنے کے نتیجے میں اس شخص کی موت واقع ہو گئی تو بالاتفاق ہاتھ کاٹنے والا گنہگار نہیں ہوگا؛ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس پر خون بہا واجب ہوگا اور مالکیہ اور شوافع کے نزدیک خون بہا بھی واجب نہیں ہوگا، گویا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حکم آخرت سے متعلق ہے اور دوسرے فقہاء کے نزدیک دنیا و آخرت دونوں سے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/۲۲۷)

﴿۲﴾ بنو مقرّن میں سے تین بھائی مَعْقِل، سُوَید اور نعمان نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ وہ جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں؛ اس لئے ان کے لئے سواری کا انتظام کر دیا جائے، آپ ﷺ نے ان سے معذرت کر دی کہ اس وقت یہ اسباب مہیا نہیں ہیں، اس سلسلہ میں بعض اور صحابہ کا بھی ذکر آیا ہے، (تفسیر قرطبی: ۸/۲۲۶، مفاتیح الغیب: ۸/۱۲۴) یعنی ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو جہاد میں جانے سے دل چراتے تھے اور ایک طرف یہ مخلص صحابہ تھے کہ جہاد میں شرکت کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ←

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ
وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

ہاں ! یقیناً ان لوگوں پر الزام ہے، جو مالدار ہونے کے باوجود آپ سے (جہاد میں شریک نہ ہونے کی) اجازت مانگ رہے تھے، انھیں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رک جانا پسند تھا، اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے؛ اس لئے وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ ﴿۹۳﴾

← اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مخلصین پر کوئی پکڑ نہیں ، معلوم ہوا کہ کسی دینی کام کو انجام دینے کی قدرت نہ ہو تب بھی ایک صاحبِ ایمان کے دل میں اس کو کرنے کی تڑپ ہونی چاہئے ، —— ان شاء اللہ —— اس عزم وارادہ پر بھی ان کے لئے اجروثواب ہے۔

○ ○ ○

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ
اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا
عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

(مسلمانو!) جب تم لوگ ان کی طرف لوٹو گے تو وہ لوگ (منافقین) تمہارے سامنے بہانے لے کر آئیں گے تو آپ کہہ دیں: تم بہانے نہ کرو، ہم ہرگز تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے، اللہ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کردیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول آئندہ بھی تمہاری کارگذاری دیکھیں گے، پھر تم لوگ اس ذات (اللہ تعالیٰ) کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے، جو چھپی ہوئی باتوں سے بھی باخبر ہیں اور کھلی ہوئی باتوں سے بھی؛ چنانچہ اللہ تم کو تمہارے اعمال کے بارے میں بتادیں گے ﴿۹۴﴾ جب تم لوگ ان کی طرف واپس ہوگے تو وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسم کھائیں گے؛ تاکہ تم ان کے معاملہ میں درگذر سے کام لو؛ اس لئے آپ ان سے درگذر ہی کرتے رہیئے، بے شک یہ لوگ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جو ان ہی کی حرکتوں کی سزا ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۵﴾

﴿۱﴾ گذشتہ آیات میں ان منافقوں کا ذکر تھا، جنھوں نے مسلمانوں کے جنگ پر نکلنے سے پہلے ہی بہانے بازی شروع کردی تھی؛ تاکہ جھوٹا سچا عذر پیش کرکے جہاد میں جانے سے بچ جائیں، اب ان لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے پہلے سے تو اجازت حاصل نہیں کی؛ لیکن بلا اجازت ہی مدینے میں رُک گئے؛ چنانچہ مدینہ آنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو مطلع کردیا گیا کہ اب یہ لوگ شریک سفر نہ ہونے کے سلسلہ میں جھوٹے بہانے پیش کریں گے، ایسے موقع پر مسلمانوں کا کیا ردِ عمل ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں دو باتوں کی ہدایت دی گئی: اول یہ کہ مسلمان ان کی جھوٹی معذرت خواہی کا یقین نہ کریں اور چکنی چپڑی باتوں میں نہ آجائیں، دوسرے یہ کہ اس پر کوئی بدلہ و انتقام نہ لیں؛ بلکہ درگذر سے کام لیں؛ کیوں کہ جن لوگوں کی دشمنی واضح ہوچکی ہے، ان کی بات پر بھروسہ کرنا ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جانے کے مترادف ہے اور انتقامی کارروائی سے اس لئے منع کیا گیا کہ جب اپنی ہی صفوں میں کچھ دشمن گھسے ہوئے ہوں اور بہ ظاہر ان کو آپ کا دوست سمجھا جاتا ہو تو ان کے خلاف کارروائی کرنے پر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اپنی صلاحیت طاقتور دشمنوں کے مقابلہ ان لوگوں پر خرچ ہونے لگتی ہیں، جو آپ کو اس درجہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، گویا یہ مسلمانوں کے لئے ایک دائمی ہدایت ہے کہ اُمت کی صفوں میں جو منافق قسم کے لوگ موجود ہوں، ان کے ساتھ یہی رویہ ہونا چاہئے کہ ان پر بھروسہ بھی نہیں کیا جائے اور ان کے خلاف کارروائی میں اپنے آپ کو اُلجھایا بھی نہ جائے —— ''فأعرضوا منھم'' کے معنی اکثر مفسرین کے نزدیک یہی ہیں کہ ان سے درگذر کیا جائے، بعض اہل علم نے اس سے مراد لیا ہے کہ ان کی طرف سے رُخ پھیر لینا اور سلام وکلام بند کرلینا چاہئے (مفاتیح الغیب: ۱۳۷/۸) اور ''إنھم رجس'' (بے شک وہ لوگ ناپاک ہیں) میں جسمانی ناپاکی مراد نہیں؛ بلکہ معنی یہ ہے کہ ان کا عمل ناپاک ہے، (تفسیر قرطبی: ۲۳۱/۸) یا امام رازی رحمہ اللہ کے الفاظ میں وہ روحانی طور پر ناپاک ہیں (مفاتیح الغیب: ۱۳۷/۸) اور ارشاد خداوندی کہ ''اللہ اور اس کے رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایسے گناہ کے بعد بھی وہ توبہ کرلیں اور اپنے عمل کو درست کرلیں تو ان کی توبہ قبول کی جاسکتی ہے۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ
بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ
لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ۱۲ ع ۱

وہ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں؛ تاکہ تم ان سے راضی ہوجاؤ، تم ان سے راضی بھی ہوجاؤ تو اللہ تو نافرمانی پر قائم رہنے والوں سے راضی نہیں ہوں گے ﴿۹۶﴾ دیہات کے لوگ کفر و نفاق میں بہت بڑھے ہوئے ہیں اور وہ اسی لائق ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو احکام نازل کئے ہیں، ان سے نابلد رہیں اور اللہ بہت جاننے والے اور حکمت والے ہیں ﴿۹۷﴾ بعضے دیہاتی وہ ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے جرمانہ سمجھ لیتے ہیں اور تم لوگوں پر مصیبتوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں، ان ہی پر بُرا دن آنے والا ہے اور اللہ خوب سننے والے اور خوب باخبر ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۸﴾ اور بعضے دیہاتی وہ ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں انھیں اللہ کی نزدیکی اور رسول کی دُعائیں حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں، آگاہ ہوجاؤ کہ یہ ان لوگوں کے حق میں نزدیکی کا ذریعہ ہے، اللہ عنقریب انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلیں گے، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والے اور بے حد رحم کرنے والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۹﴾

﴿۱﴾ ''اعرابی'' کے معنی ''دیہاتی'' کے ہیں، اس کی جمع ''اعراب'' ہے، (مفاتیح الغیب: ۱۳۸/۸) اس آیت میں ان منافقین کا ذکر ہے، جو دیہاتوں میں بسے ہوئے تھے اور ایمان سے محروم تھے، دیہات کے لوگوں میں شدت زیادہ ہوتی ہے اور تہذیب و تمدن سے نا آشنا بھی ہوتے ہیں؛ چنانچہ فرمایا گیا کہ دیہات میں بسنے والے منافقین بہت ہی سخت اور احکامِ خداوندی سے نابلد ہیں، اسی مزاج کا نتیجہ ہے کہ اگر اچھے کاموں میں کچھ خرچ بھی کرتے ہیں تو رغبت سے خرچ کرنے کی بجائے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ گویا ان سے جرمانہ وصول کیا جارہا ہے اور مسلمانوں سے بدخواہی کا حال یہ ہے کہ ان پر کسی مصیبت کے آپڑنے کے انتظار میں رہتے ہیں؛ حالاں کہ خود ان پر دنیا و آخرت میں برا وقت آنے والا ہے، غرض کہ برا حال تو مدینہ کے منافقین کا بھی ہے اور قرب وجوار کے دیہاتوں میں رہنے والوں کا بھی؛ لیکن مدینہ کے لوگ چوں کہ شب و روز حضور ﷺ کا وعظ سنتے اور آپ ﷺ کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں اور دیہات کے لوگ اس سے محروم رہتے ہیں، اس لئے ان کا حال زیادہ برا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی دیہات کے رہنے والے سب کے سب برے نہیں ہیں، ان میں مسلمان بھی ہیں، جو اجر و ثواب اور رسول اللہ ﷺ کی دُعاء حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور مغفرت حاصل ہوگی؛ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ جن سے زکوٰۃ لیں ان کو دُعائیں دیں (التوبة: ۱۰۳) اس لئے مخلص صحابہ اس مقصد کے تحت بھی صدقہ پیش کیا کرتے تھے: تاکہ آپ ﷺ کی دُعائیں حاصل ہوجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ چاہے کوئی شخص ذاتی طور پر ہدیہ پیش کرے یا کسی کارِ خیر میں دے، اس کے لئے دُعاء کے کلمات کہنے چاہئیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں سے دُعائیں حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ وَالَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۰۰﴾ وَمِمَّنۡ حَوۡلَـكُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ۛؕ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ ؔۛ مَرَدُوۡا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعۡلَمُهُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُهُمۡ ؕ سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ ثُمَّ يُرَدُّوۡنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۰۱﴾

اللہ مہاجرین وانصار میں سے سبقت اور پہل کرنے والے اور اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والوں سے راضی ہوئیں اور وہ لوگ بھی اللہ سے راضی ہیں، اللہ نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کئے ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی رہیں گی، وہ ہمیشہ ہمیش اسی میں رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۰۰﴾ کچھ آپ کے گرد وپیش والے (جو مدینہ کے مضافات میں رہتے ہیں) اور کچھ اہل مدینہ میں سے نفاق میں مبتلا ہیں، وہ نفاق پر اَڑے ہوئے ہیں، آپ ان سے واقف نہیں ہیں، ہم ان سے واقف ہیں، ہم انھیں دوہرا عذاب دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۱﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین گروہوں کی تعریف کی: ایک تو وہ مہاجرین جو پہلے ایمان لائے، دوسرے: انصار جو پہلے مسلمان ہوئے، ان دونوں کا درجہ بہ مقابلہ دوسرے صحابہ کے اونچا ہے — اب سوال یہ ہے کہ ایمان میں سبقت اور پہل کرنے والوں سے کون سے مہاجرین وانصار مراد ہیں؟ اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو قبلہ بنانے سے پہلے پہلے جو لوگ ایمان لائے، وہ اس میں شامل ہیں، یہ واقعہ ہجرت کے سولہ سترہ مہینے کے بعد پیش آیا، دوسری رائے یہ ہے کہ جو لوگ بیعت رضوان میں شامل تھے، جو ۶ رہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع سے ہوئی، وہ سب اس میں شامل ہیں اور اس کے بعد ایمان لانے والے دوسرے درجہ میں ہیں، تیسرے طبقہ کا ذکر ''الذين اتبعوهم بإحسان'' (اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے) سے کیا گیا ہے، یعنی وہ صحابہ جو ان کے بعد ایمان لائے؛ لیکن وہ اپنے ایمان لانے میں مخلص تھے، پھر صحابہ کے ان تینوں گروہوں یعنی تمام صحابہ کے بارے میں تین باتوں کی خبر دی گئی: ایک یہ کہ اللہ ان سے راضی ہیں، دوسرے: یہ تمام لوگ اللہ کے احکام اور فیصلوں پر راضی رہیں، تیسرے: ان کے لئے ہمیشہ ہمیش کی جنت ہے، یہ واضح اشارہ ہے کہ تمام صحابہ قابل احترام ہیں، ان کے بارے میں بدگمانی یا بدزبانی قطعاً جائز نہیں؛ بلکہ سراسر محرومی ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب بعض صحابہ کی شکایت کی گئی تو آپ نے فرمایا: میرے صحابہ کے معاملہ میں مجھے چھوڑ دو، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی ہر دن اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان میں سے کسی کے ایک مُد (۷۸۷ گرام ۲۰ ۳ ملی گرام) یا آدھے مُد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا ''فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهباً ما بالغ مُد أحدهم ولا نصفهٗ'' (بخاری، باب فضل أبي بكر، كتاب فضائل أصحاب النبیؐ، حدیث نمبر: ۳۶۷۳) — بعض مفسرین نے ''السابقون الاولون'' میں تمام صحابہ کو شامل رکھا ہے اور ''اتبعوهم بإحسان'' سے تابعین کو مراد لیا ہے؛ لیکن جو وضاحت یہاں کی گئی ہے، وہ قرآن کے الفاظ سے زیادہ قریب ہے اور یہی اکثر مفسرین کی رائے ہے۔

﴿۲﴾ بعض منافقین تو وہ تھے جن کا منافق ہونا آپ پر ظاہر تھا؛ لیکن یہاں ان منافقین کا ذکر کیا جارہا ہے، جن کا نفاق حضور ﷺ ←

وَ اٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنھیں اپنے گناہوں کا اعتراف ہے، انھوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے ملے جلے عمل کئے ہیں، قریب ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دیں، یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور بہت رحم کرنے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۰۲﴾

← پر بھی واضح نہیں کیا گیا تھا، ان میں کچھ تو خود مدینہ کے تھے اور کچھ مدینے کے گرد و پیش رہنے والے تھے، جن میں سے مفسرین نے 'جُهَيْنَه، اَسْلَم، مُزَيْنَه، غِفَار اور اَشْجَع' نامی قبائل کا ذکر کیا ہے کہ ان میں بھی بہت سے منافق چھپے ہوئے تھے، (قرطبی: ۲۴۰/۸) یہ اپنے نفاق اور کفر میں بھی زیادہ پختہ تھے؛ اس لئے فرمایا گیا کہ ہم انھیں دوہرا عذاب دیں گے، ایک نفاق کا، دوسرے اس پر ضد اور اصرار کا، اب یا تو اس سے عذاب کی کثرت مراد ہے یا آخرت کے عذاب سے پہلے دنیا میں عذاب سے دوچار کئے جانے اور قبر کے عذاب میں مبتلا کئے جانے کا ذکر ہے، یا دنیا ہی میں مختلف نوعیت کے دو عذاب دیئے جائیں گے (مفاتیح الغیب: ۱۴۹/۸) —"مردوا علی النفاق" کے معنی ہیں "جو نفاق پر اڑے ہوئے ہیں" "أی ثبتوا واستمروا فیه۔ (مفاتیح الغیب: ۱۴۹/۸)

﴿۱﴾ اس میں ان حضرات کا ذکر ہے جو اپنے ایمان میں تو مخلص تھے اور سچے پکے مسلمان تھے؛ لیکن سستی اور کسل مندی کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ دس تھے جو غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا، ان میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا ذکر تو سبھوں نے کیا ہے، ان کے علاوہ اَوْس ابن ثَعلبہ اور وَدِیعہ ابن حزام رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے تو اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق مسجد نبوی میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز ادا فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان حضرات کو ستونوں سے بندھا ہوا دیکھا تو صورتِ حال معلوم کی، بتایا گیا کہ ان حضرات نے قسم کھائی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے، جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسی نہ کھول دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی ان کے بندھن نہیں کھول سکتا، جب تک اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہ آجائے؛ چنانچہ یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رسیاں کھول دیں (مفاتیح الغیب: ۱۵۰/۸) ان کا اچھا عمل یہ تھا کہ یہ مخلص مسلمان تھے اور ہمیشہ جہاد میں شریک رہتے تھے، غلطی یہ تھی کہ غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوئے، اس آیت سے ایک تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت واضح ہوتی ہے کہ اگر انسان ہونے کی حیثیت سے ان سے کوئی غلطی بھی ہو جاتی تو فوراً انھیں ندامت اور شرمساری ہوتی اور سچی پکی توبہ فرماتے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کی نیکیاں اُمت کے لئے اُسوہ ہیں، اسی طرح ان کی لغزشیں بھی اُسوہ ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کی نافرمانی کر بیٹھے تو اس کے بعد اس کا کیا رویہ ہونا چاہئے، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ سے جو بھول چوک ہوتی تھی، توبہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء کے ذریعہ وہ اللہ کی طرف سے معاف کر دی جاتی تھی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

آپ ان کے مال میں سے صدقہ قبول کر لیجئے؛ تا کہ آپ اس کے ذریعہ انھیں پاک صاف کر دیں اور انھیں دُعا دیجئے، بے شک آپ کی دُعا ان کے لئے طمانینت کا باعث ہے اور اللہ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۰۳﴾

﴿۱﴾ جن حضرات نے اپنی اس غلطی کی وجہ سے خود کو ستونوں سے باندھ لیا تھا، جب انھیں رہائی ملی تو انھوں نے شکرانہ کے طور پر صدقہ پیش کیا؛ بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے پیشکش کی کہ ان کا پورا مال صدقہ کے طور پر قبول کر لیا جائے؛ کیوں کہ اسی مال کی فکر ہمارے پیچھے رہ جانے کا سبب بن گئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے تمہارا مال لینے کا حکم نہیں دیا گیا ہے؛ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی، آپ ﷺ نے ایک تہائی کی حد تک ان کے مال کو قبول فرمایا اور دو تہائی ان کے لئے چھوڑ دیا (مفاتیح الغیب: ۱۵۴/۸) —— قرآن کے اس حکم سے متعدد باتوں پر روشنی پڑتی ہے: اول یہ کہ صدقہ میں گناہ کا کفارہ بننے کی صلاحیت ہے؛ اس لئے اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو شریعت میں جس طریقہ پر اس کی توبہ مقرر ہے وہ تو کرے ہی، ساتھ ساتھ صدقہ بھی کر دے، بعض مفسرین کے نزدیک ''تطهرهم'' کا تعلق ''صدقة'' سے ہے، یعنی صدقہ انھیں پاک کر دے گا، اس سے اِس پہلو کی مزید تائید ہوتی ہے، دوسرے: جب کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو اس موقع پر بھی کچھ صدقہ کرنا چاہئے؛ کیوں کہ جب صحابہ کی توبہ قبول کر لی گئی، جس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی، تب انھوں نے صدقہ کی یہ پیشکش فرمائی، تیسرے: انسان کو پورا کا پورا مال صدقہ نہیں کر دینا چاہئے کہ اس کے حقدار محروم ہو کر رہ جائیں؛ بلکہ کچھ مال ہی صدقہ کرنا چاہئے، جس کی زیادہ سے زیادہ حد ایک تہائی ہے اور بقیہ اپنے ورثہ اور حقداروں کے لئے رکھنا چاہئے، چوتھے: جب کوئی شخص دینی مقاصد کے لئے تعاون پیش کرے تو اس کے لئے دُعا کے کلمات کہنے چاہئیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا، جب کوئی صدقہ لاتا تو آپ ﷺ ان کے لئے دُعا فرماتے، بنی ابی اوفی کے لوگوں نے صدقہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے ان کے لئے دُعاء فرمائی: ''اللهم صلي على آل أبي أوفى'' (بخاری، کتاب الدعوات، باب ہل یصلی علی غیر النبیؐ الخ، حدیث نمبر: ۶۳۵۹)؛ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جو شخص تعاون پیش کرے اس کے حق میں دُعا کے یہ کلمات کہے جائیں: ''اجرك الله فيما اعطيت و بارك لك فيما أبقيت'' (تم نے جو کچھ دیا، اللہ تم کو اس کا اجر عطا فرمائیں اور تم نے جو کچھ بچا کر رکھا، اللہ اس میں برکت دیں)، پانچویں: قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بظاہر یہاں صدقہ سے عام صدقہ مراد ہے نہ کہ زکوٰۃ؛ لیکن بعض مفسرین نے اس سے زکوٰۃ مراد لی ہے، اگر یہ مراد ہو تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ بالغوں پر واجب ہے، نابالغوں پر نہیں؛ کیوں کہ زکوٰۃ کو گناہوں سے پاک کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور نابالغ کے افعال پر گناہ کا اطلاق نہیں ہوتا؛ اس لئے کہ جب تک بالغ نہ ہو جائیں، وہ شرعی احکام کے مخاطب ہی نہیں ہیں، چھٹی قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں ''صل عليهم'' سے مراد صدقہ دینے والوں کو دُعا دینے کے ہیں؛ کیوں کہ آپ کی دُعاء مسلمانوں کے لئے طمانینت کا باعث تھی؛ لیکن چوں کہ لفظ ''صلاة'' کا استعمال انبیاء کے لئے ہونے لگا اور یہ ایک شناخت بن گئی ہے؛ اس لئے اب انبیاء کے علاوہ کسی اور کے لئے ''صلاۃ'' کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ ہدایت منقول ہے: ''لا تنبغي الصلاة من أحد على أحد إلا في حق النبي عليه الصلاة والسلام''۔ (مفاتیح الغیب: ۱۵۸/۸)

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ
الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا
یُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا
وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَیَحْلِفُنَّ
اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کیا انھیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے درگذر کرتے ہیں اور صدقہ قبول فرماتے ہیں، بے شک اللہ خوب توبہ قبول کرنے والے اور بے حد مہربان ہیں ﴿۱۰۴﴾ آپ کہہ دیجئے: عمل کرتے جاؤ، اللہ، اللہ کے رسول اور اہل ایمان عن قریب تمہارے عمل کو دیکھ لیں گے اور تم لوگ جلد ہی اس ذات کی طرف بھیج دیئے جاؤ گے، جو ہر چھپی اور کھلی ہوئی بات سے واقف ہے، وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں بتلا دیں گے ﴿۱﴾ ﴿۱۰۵﴾ نیز کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی ہے، یا تو اللہ انھیں سزا دیں گے یا ان کی توبہ قبول فرمالیں گے، اور اللہ بہت جاننے والے اور خوب حکمت والے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۰۶﴾ اور جن لوگوں نے نقصان پہنچانے، کفر کی باتیں کرنے، مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور جو لوگ پہلے اللہ سے اور اس کے رسول سے جنگ کرچکے ہیں، کے لئے پناہ گاہ فراہم کرنے کی غرض سے مسجد بنائی ہے اور (اب) وہ قسمیں کھائیں گے کہ بھلائی کے سوا ہماری کچھ اور نیت نہیں تھی، اور (لیکن) اللہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔ ﴿۱۰۷﴾

﴿۱﴾ یعنی دنیا میں انسان جو چاہے عمل کرسکتا ہے؛ لیکن اس کا کوئی عمل چاہے لوگوں کی نظر کے سامنے ہو یا اوجھل، اللہ کی نظر سے اوجھل نہیں؛ اس لئے آئندہ اپنے عملی رویہ کو بہتر بنائیں جو اللہ کے سامنے تو ہے ہی، اور اللہ کے رسول اور مسلمان بھی اسے دیکھ سکیں۔

﴿۲﴾ مخلص مسلمانوں کا ایک گروہ تو وہ تھا جنھوں نے اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا تھا: ''وآخرون اعترفوا بذنوبھم'' میں ان کا ذکر ہے، یہ سات حضرات تھے، تین حضرات ـــــ حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع، ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہم ـــــ وہ تھے، جنھوں نے اپنے آپ کو اس طرح ستونوں سے باندھ کر اپنے گناہوں کا اعلانیہ اعتراف نہیں کیا تھا؛ لیکن اپنے عمل پر شرمندہ تھے اور انتظار میں تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائیں، ان کا ذکر ہے کہ ابھی ان کا معاملہ موقوف رکھا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کا بائیکاٹ کرنے کا حکم فرمادیا کہ نہ ان سے بات چیت کی جائے، نہ ان کی بیویاں ان سے تعلق رکھیں، نہ ان کے ساتھ سلام وکلام ہو، پچاس دنوں تک ان کا یہ بائیکاٹ جاری رہا، پھر ان کی توبہ قبول کرلی گئی، جس کا ذکر آگے آیت نمبر: ۱۱۷ میں آرہا ہے، حدیث کی کتابوں میں تفصیل سے اس کا ذکر آیا ہے، ان ہی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ ابھی ان کا معاملہ موقوف ہے، جب تک اللہ کی طرف سے کوئی فیصلہ نہ آجائے۔

لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا ؕ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ اَحَقُّ اَنۡ تَقُوۡمَ فِيۡهِ ؕ فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾

تو آپ ان کی مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہوں ﴿۱﴾؛ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں کہ وہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی ایسے پاک رہنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۸﴾

﴿۱﴾ منافقین ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگے رہتے تھے، اسی سلسلہ کا ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ دس، بارہ منافقین نے قبا میں مسجد قبا سے قریب ہی ایک عمارت تعمیر کی، اسے مسجد کا نام دیا اور عین اس وقت جب آپ ﷺ تبوک کے سفر کے لئے تیاری فرما رہے تھے، آپ ﷺ کو دعوت دی کہ بوڑھے اور کمزور لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے ہم لوگوں نے ایک مسجد بنائی ہے، آپ ﷺ اس مسجد میں نماز پڑھا کر اس کا افتتاح فرما دیجئے، بظاہر اس کا مقصد برکت حاصل کرنا تھا؛ لیکن حقیقت میں نیت یہ تھی کہ اگر آپ ﷺ نماز پڑھا دیں گے تو مسلمان مطمئن ہو جائیں گے، یہ شبہ نہ ہوگا کہ اسے کسی سازش کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا ہے، اور ہم بہ آسانی اسے ایک مرکز کے طور پر استعمال کریں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی تو میں تبوک کے سفر پر جا رہا ہوں، انشاء اللہ واپسی کے بعد یہاں نماز پڑھوں گا، جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو یہ آیات نازل ہوئیں، جس میں فرمایا گیا کہ اگرچہ منافقین نے اس کو 'مسجد' کا نام دیا ہے اور اچھی نیت کا اظہار کر رہے ہیں؛ لیکن حقیقت میں یہ مسجد نہیں ہے؛ بلکہ اسے اس لئے بنایا گیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا جائے، کفر و انکار کی جو باتیں کھلے عام نہیں کی جا سکتیں، وہ چھپ چھپ کر یہاں کی جائیں، مسلمانوں کو گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے، اب ایک گروپ سابق مسجد میں نماز پڑھنا چاہے گا اور ایک گروپ اس مسجد میں، اس طرح ان میں گروپ بندی پیدا ہو جائے گی، نیز ان کا ارادہ ہے کہ اسے اعداء اسلام کی پناہ گاہ بنائی جائے، یہ بات خاص طور پر اس لئے فرمائی گئی کہ مدینہ میں آباد 'ابو عامر' نامی ایک شخص عیسائی ہو گیا تھا، اس نے رسول اللہ ﷺ سے نازیبا گفتگو بھی کی تھی، غزوۂ حنین میں مشرکین کے ساتھ شریک بھی ہوا اور پھر شام کی عیسائی مملکت میں بھاگ گیا، وہ ان منافقین سے رابطہ میں تھا اور ترغیب دیتا تھا کہ وہ مدینہ میں ایک مرکز بنائیں، خفیہ طور پر وہاں ہتھیار جمع کریں اور وہ شام کی طرف سے عیسائیوں کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوگا، اس خبر کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اس مسجد میں نماز کے لئے ہرگز کھڑے نہ ہوں؛ چنانچہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مالک ابن دُخشم، مَعن ابن عدی، عامر ابن سکنؓ اور حضرتِ حمزہ کے قاتل وحشی (رضی اللہ عنہ) کو اس مسجد کو منہدم کرنے کا حکم دیا، ان حضرات نے اس عمارت کو منہدم اور نذر آتش کر دیا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے (دیکھئے: ۸/۲۵۲-۲۵۸) —— اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک مسجد کے قریب بلا ضرورت دوسری مسجد تعمیر کرنے سے بچنا چاہئے؛ بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہی نہیں ہے؛ البتہ چوں کہ لوگ کسی کی نیت پر آگاہ نہیں ہو سکتے؛ اس لئے اب اس بات کی گنجائش نہیں رہی کہ اگر کچھ مسلمان مسجد تعمیر کریں، خواہ وہ دوسری مسجد کے قریب ہی کیوں نہ ہو تو اس کو 'مسجد ضرار' کا نام دیا جائے، منہدم کر دیا جائے اور اس میں نماز ←

اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی تَقۡوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانٍ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی شَفَا
جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿١٠٩﴾ لَا یَزَالُ
بُنۡیَانُهُمُ الَّذِیۡ بَنَوۡا رِیۡبَةً فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَقَطَّعَ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿١١٠﴾ ع ١٣ ٢

کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی ناپائیدار گرتی ہوئی گھاٹی کے کنارے پر رکھی ہو، پھر وہ عمارت اس کو لے کر دوزخ کی آگ میں گرجائے ؟ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے ﴿١٠٩﴾ ان کی تعمیر کی ہوئی یہ عمارت ان کے دلوں میں شک کا سبب بنی رہے گی ، سوائے اس کے کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں اور اللہ خوب جاننے والے اور حکمت والے ہیں ۔ ﴿١﴾ ﴿١١٠﴾

← پڑھنا جائز نہ ہو؛ کیوں کہ وحی کا سلسلہ بند ہونے کے بعد اب فیصلہ لوگوں کے ظاہری اعمال اور ان کی بتائی ہوئی نیتوں کے مطابق ہوگا نہ کہ گمان وخیال پر۔

﴿٢﴾ یعنی منافقین کی یہ عمارت اس مسجد کا درجہ کیسے حاصل کرسکتی ہے، جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، بعض حضرات نے اس سے 'مسجد قبا' مراد لی ہے؛ کیوں کہ یہ مسجدِ ضرار اسی کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی ، بعض حضرات نے 'مسجدِ نبوی' مراد لی ہے؛ لیکن واقعہ کے پس منظر اور آیت کے آگے پیچھے کے مضامین کے لحاظ سے پہلی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے؛ البتہ اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ آیت عام ہے، یعنی جو مسجد اخلاص اور تقویٰ کے ساتھ بنائی جائے ، وہی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے، اسی بنا پر آپ ﷺ کو مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ آپ ﷺ عامۃً ہفتہ میں ایک دن قبا تشریف لے جاتے تھے اور یہاں نماز ادا فرمایا کرتے تھے (بخاری، باب مسجد قبا، حدیث نمبر: ١١٩١) —— آیت کا اگلا ٹکڑا بھی اہل قبا کے بارے میں ہے کہ یہاں ایسے لوگ ہیں، جو پاک رہنے کا خاص اہتمام کرتے ہیں، حضور ﷺ نے جب ان سے دریافت کیا کہ تمہارے پاک صاف رہنے کی تعریف کی گئی ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان حضرات نے عرض کیا کہ ہم لوگ پیشاب پاخانہ کے بعد پانی سے استنجاء کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، (سنن ابن ماجہ: باب الاستنجاء بالماء، حدیث نمبر: ٣٥٥) —— اس سے معلوم ہوا کہ استنجاء کے لئے پانی کا استعمال بہ مقابلہ مٹی وغیرہ کے افضل ہے، نیز نجاست دور کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ موثر ذریعہ سے کام لینا بہتر ہے۔

﴿١﴾ جب رسول اللہ ﷺ نے مسجدِ ضرار کو منہدم کرنے کا حکم فرمایا تو منافقین کا غیظ وغضب اور بڑھ گیا اور کفر کا جو کانٹا ان کے دلوں میں چبھا ہوا تھا، وہ اور پیوست ہوگیا، اسی سلسلہ میں فرمایا گیا کہ ان کے دلوں میں پہلے ہی سے جو شک کی بیماری موجود ہے، یہ تعمیر اس میں اضافہ کا سبب بن گئی ہے اور انھیں توبہ کی توفیق نہیں ہوسکتی ، جب تک ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فنا نہ ہوجائیں، اس وقت تک شک کا کانٹا ان کے دلوں میں چبھتا ہی رہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾

بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے عوض خرید کرلیا ہے، وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہیں، وہ قتل بھی کرتے ہیں اور شہید بھی ہوتے ہیں، جہاد کرنے پر ان سے تورات، انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ کیا گیا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے؟ توتم اس تجارت سے خوش ہوجاؤ، جوتم نے اللہ کے ساتھ کی ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔﴿۱﴾ ﴿۱۱۱﴾

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے خاص طور پر حج کے اجتماع کا استعمال فرماتے تھے؛ چنانچہ نبوت کے گیارہویں سال آپ کی دعوت پر مدینہ کے چھ افراد مسلمان ہوئے اور مدینہ میں اسلام کی روشنی پھیلنے لگی، آئندہ سال بارہ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، جن میں سات نئے تھے اور پانچ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، تیسرے سال ستر اہل مدینہ نے اسلام قبول کیا، جن میں حضرت عبداللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، یہ بیعت چوں کہ منیٰ میں خفیہ طور سے ایک پہاڑی پر یا اس کے دامن میں ہوئی تھی، عربی زبان میں پہاڑ کی گھاٹی کو ''عقبہ'' کہتے ہیں؛ اس لئے اس کو ''بیعت عَقَبَہ'' کہا جاتا ہے اور تیسرے سال کی بیعت کو ''بیعت عقبہ کُبریٰ'' — پہلے دونوں سال آپ نے صرف ایمان پر بیعت لی تھی؛ لیکن تیسرے سال اس بات پر بھی بیعت لی کہ اگر مسلمان ہجرت کرکے مدینہ جائیں تو اپنی جان و مال کی طرح وہ ان کی حفاظت کریں گے، سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے (البدایہ والنہایہ: ۳/ ۱۴۷)؛ اسی موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں، جس میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اب جہاد کی اجازت دے دی گئی؛ اس لئے اس کو اجازتِ جہاد سے متعلق پہلی آیت شمار کیا گیا ہے، یہ بھی فرمایا گیا کہ جہاد کا حکم صرف قرآن ہی میں نہیں ہے؛ بلکہ تورات وانجیل میں بھی ہے؛ چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی رائے ہے کہ جہاد کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے ہوا (تفسیر قرطبی: ۸/ ۲۶۸) آج کل عیسائی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ عیسائی مذہب میں جہاد کا تصور نہیں ہے؛ لیکن یہ غلط ہے، عیسائیت میں قانونِ شریعت کا درجہ تورات کو حاصل ہے اور تورات میں اب بھی جہاد کے احکام اور واقعات موجود ہیں؛ بلکہ موجودہ تورات میں جنگ کے احکام حد درجہ شدت پر مبنی ہیں، (دیکھئے: استثناء، ب: ۲، اعداد، ب: ۳) انجیل میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ حکم موجود ہے کہ پوشاک بیچ کر تلوار خریدو، (لوقا: ۲۲: ۳۶) ظاہر ہے کہ تلوار جہاد ہی کا آلہ تو ہے، پس یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عیسائیت میں جہاد کا تصور نہیں، اگر عملی طور پر دیکھا جائے تو عیسائیوں نے جتنی خون ریزی کی ہے اور آج بھی وہ پوری دنیا میں جس طرح جنگ وجدال کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں، اس میں کوئی قوم ان کی ہمسری نہیں کرسکتی، صرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء) میں ستر (۷۰) لاکھ لوگ مارے گئے اور دو کروڑ سے زیادہ زخمی ہوئے اور جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹ء-۱۹۴۵ء) میں ساٹھ سے ستر ملین لوگ مارے گئے اور ڈیڑھ ٹریلین ڈالر کا مالی خسارہ ہوا، (الموسوعۃ العربیہ العالمیہ) یہ دونوں جنگیں اصل میں عیسائی اکثریت ملکوں ہی کی مسلط کی ہوئی تھیں، حقیقت یہ ہے کہ: ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے''۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَ لَوْ کَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ
اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِیَّاهُ ۚ
فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

یہ توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اللہ کی حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، نماز میں رُکوع وسجدہ کرنے والے، بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کے احکام کی پابندی کرنے والے ہیں اور ان ایمان والوں کو آپ خوشخبری سنا دیجئے ﴿۱﴾ ﴿۱۱۲﴾ نبی اور ایمان والوں کے لئے یہ بات درست نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لئے — یہ ظاہر ہوجانے کے باوجود کہ وہ دوزخی ہیں — دُعاءِ مغفرت کریں، اگرچہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں؟ ﴿۱۱۳﴾ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دُعاء کرنا محض اس وعدہ کی وجہ سے تھا، جو انھوں نے اپنے باپ سے کر رکھا تھا، پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ اللہ کے دشمن ہیں تو انھوں نے اس سے بے تعلقی کا اظہار کر دیا، بے شک ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۱۴﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں بیعت عَقَبَہ میں شریک ہونے والوں کی آٹھ صفات بیان کی گئی ہیں اور اخیر میں ایک جامع صفت ذکر کی گئی ہے: ''والحافظون لحدود الله''یعنی اللہ کے احکام کی حفاظت کرنے والے، اس میں ''السائحون'' سے مراد ''روزہ دار'' ہیں، سیاحت کے اصل معنی چلنے کے ہیں، جب آدمی سفر کی حالت میں ہوتا ہے تو اسے کھانے پینے اور میاں بیوی کے تعلق کی فکر نہیں ہوتی؛ بلکہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، روزہ دار اسی طرح کھانے پینے اور صنفی تعلق سے دور رہتا ہے: اس لئے اس سے روزہ دار مراد لئے گئے، خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی یہی تفسیر منقول ہے: ''سیاحة هذه الأمة الصیام''(عمدۃ القاری، باب فضل الجہاد والسیر، کتاب الجہاد والسیر) یہ آیت نیک مسلمانوں کے لئے ایک ایجنڈہ کے درجہ میں ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ سورۂ توبہ مدنی ہے؛ بلکہ یہ اخیر زمانے میں نازل ہونے والی سورت ہے؛ لیکن آیت نمبر: ۱۱۱، ۱۱۲ مکہ میں بیعتِ عقبہ کے موقع سے نازل ہوئی ہے، اور مضامین جہاد کی مناسبت سے اس مدنی سورت شامل فرمائی گئی ہے۔

﴿۲﴾ یہ آیت کس موقع پر نازل ہوئی؟ اس سلسلہ میں مختلف روایتیں مفسرین نے نقل کی ہیں، (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۸/۱۹۴) لیکن بخاری ومسلم کی روایت کے مطابق جب حضرت ابوطالب کی وفات کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے ان کو ایمان کی دعوت دی اور فرمایا کہ آپ ''اشهد ان لا إله الا الله'' کہہ دیں، میں اللہ کے پاس آپ کے حق میں گواہی دوں گا، انھوں نے پوری زندگی رسول اللہ ﷺ کی جو پشت پناہی کی اور آپ ﷺ کی نصرت واعانت کے راستہ میں آزمائشیں بھی سہیں، اس کی بنا پر آپ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئیں، مگر وہیں پر ابوجہل اور عبداللہ بن اُمیہ بھی موجود تھے، وہ بار بار کہتے جاتے تھے کہ کیا تم عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دوگے؟ بہرحال، آخری جملہ حضرت ابوطالب کی زبان سے نکلا ''علی ملة عبد المطلب'' (عبدالمطلب کے دین پر!) ←

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾

اللہ تعالیٰ کسی گروہ کو ہدایت دینے کے بعد ہدایت سے محروم نہیں کرتے ، جب تک کہ ان پر اچھی طرح ان باتوں کو واضح نہ کر دیں ، جن سے انھیں بچنا چاہئے ، بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہیں ۔ ﴿۱﴾ ﴿١١٥﴾

← آپ ﷺ کو اس سے بڑا رنج ہوا اور آپ ﷺ نے فرمایا : جب تک مجھے روک نہ دیا جائے ، میں آپ کے لئے دُعاء مغفرت کرتا رہوں گا ؛ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی اور جن لوگوں کی موت کفر وشرک پر ہوتی ہو ، ان کے لئے دُعاء مغفرت کرنے سے منع فرما دیا گیا ، یہ خیال ہوسکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے مشرک باپ کے لئے دُعاء کی تھی تو اس کی وضاحت فرما دی گئی ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لئے دُعاء مغفرت کریں گے '' سأستغفر لک ربی '' (مریم : ٤٧) اس لئے جب تک ان کے باپ زندہ رہے اور ہدایت کی اُمید باقی رہی ، ان کے لئے دُعاء فرماتے رہے ، جب کفر پر موت ہوگئی اور واضح ہو گیا کہ ان کے لئے ہدایت مقدر نہیں تھی تو دُعاء کرنی چھوڑ دی —— نماز جنازہ اور ایصالِ ثواب بھی استغفار ہی کی مختلف صورتیں ہیں ، پس معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی موت حالتِ کفر میں ہوئی ہو ، ان کے لئے نہ ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے ، نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی (بدائع الصنائع : ٢ / ٤٧ ، فصل : الکلام فی صلوٰۃ الجنازۃ ، طحطاوی علی المراقی : ٣٨٣) اور نہ ان کے لئے استغفار کیا جائے گا ؛ البتہ اگر قریبی رشتہ داری ہو یا مصلحت کا تقاضا ہو تو آخری رسومات میں مدد کرنے ، یا ان کے جلوسِ جنازہ میں شریک ہو جانے کی گنجائش ہے ، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے حضرت ابوطالب کی تجہیز وتکفین کے بارے میں حکم دیا تھا ، (نصب الرایہ : ٢ / ٢٨١) ؛ بلکہ مشہور تابعی مکحول کی روایت میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی حضرت ابوطالب کے جنازہ کے ساتھ گئے ، مگر ان پر نماز نہیں پڑھی (مصنف عبدالرزاق : ٦ / ٣٨) ، حضرت ثابت بن قیس کی رضی اللہ عنہ کی والدہ عیسائی تھیں ، انھوں نے حضور ﷺ سے اپنی والدہ کے جلوس جنازہ میں شرکت کی اجازت چاہی ، آپ ﷺ نے فرمایا : شریک ہو ، مگر آگے آگے چلو ۔

(نصب الرایہ : ٢ / ٢٨١ ، سنن ابی داؤد ، باب الرجل یموت لہ قرابۃ مشرک ، کتاب الجنائز ، حدیث نمبر : ٣٢١٤)

—— حضرت ابوطالب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا واقعہ سامانِ عبرت ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں محض نسب اور خاندانی نسبت کی اہمیت نہیں ؛ اس لئے انسان کو ہمیشہ اپنے بارے میں فکر مند رہنا چاہئے کہ کہیں ہدایت حاصل ہونے کے بعد ہدایت سے محرومی اس کے لئے مقدر نہ ہو ، یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے خونی اور خاندانی رشتہ اصل نہیں ہے ، ایمان کا رشتہ اصل رشتہ ہے ، قریب ترین رشتہ دار بھی اگر ایمان سے محروم ہو تو مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ان سے دینی لحاظ سے بے تعلقی برتے —— اگر یہ آیات حضرت ابوطالب کی وفات کے موقع پر نازل ہوئی ہوں تو یہ دونوں آیات بھی '' مکی '' قرار پائیں گی ۔

﴿۱﴾ ان آیات کے اُتارے جانے سے پہلے عام طور پر مسلمان اپنے بزرگوں کے لئے دُعاء مغفرت کیا کرتے تھے جو کفر وشرک کی حالت میں دنیا سے چلے گئے ، کافروں کے لئے استغفار کی ممانعت کا یہ حکم سن کر انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارے اِس فعل پر پکڑ نہ ہو ؛ چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ جب تک کسی چیز کے ممنوع اور قابل اجتناب ہونے کو واضح نہیں کر دیتے ، اس وقت تک اس پر پکڑ نہیں فرماتے ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ يُحۡىٖ وَ يُمِيۡتُ ؕ وَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ
وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۱۶﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِىِّ وَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ فِىۡ سَاعَةِ
الۡعُسۡرَةِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ فَرِيۡقٍ مِّنۡهُمۡ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّهٗ بِهِمۡ رَءُوۡفٌ
رَّحِيۡمٌ ۙ﴿۱۱۷﴾

یقیناً اللہ ہی کے لئے آسمانوں کی اور زمینوں کی حکومت ہے، وہی زندگی عطا کرتے ہیں اور وہی موت دیتے ہیں اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۱۶﴾ اللہ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار پر — جنھوں نے مشکل گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا، اس کے باوجود کہ ایک گروہ کے دل میں تزلزل پیدا ہوگیا تھا — مہربانی کی، پھر ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک اللہ ان کے ساتھ مہربانی اور رحم کرنے والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۱۷﴾

﴿۱﴾ ''ساعة العُسرة''، یعنی 'مشکل گھڑی' سے مراد 'غزوۂ تبوک' کا موقع ہے، دشواریوں کا حال یہ تھا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سواری کی بھی تنگی تھی، غذائی اشیاء کی بھی اور پانی کی بھی، ایک اونٹنی پر باری باری کئی لوگ سوار ہوتے تھے، کئی لوگوں کو ملا کر کھجور کے چند دانے ہوتے تھے، لوگ کھجور کو چوس چوس کر اپنے ساتھیوں کو دیتے جاتے اور اس پر ایک گھونٹ پانی پی لیا کرتے، اسی لئے تبوک کی فوج کو ''جیش العسرة'' کہا جاتا ہے، ایک مرحلہ ایسا آیا کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹنیوں کو ذبح کرنے کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں اور کم ہوجائیں گی؛ اس لئے آپ لوگوں کو حکم دیں کہ جن کے پاس جو کچھ ہو، وہ اسے جمع کریں، سب نے کھانے پینے کی جو چیز مہیا تھی، یکجا کردی، مگر اس کی مقدار بہت تھوڑی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق آپ نے برکت کی دُعاء فرمائی تو ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھایا پیا اور اپنے برتنوں میں محفوظ کیا، پھر بھی کچھ بچ رہا، یوں تو چند افراد کو چھوڑ کر تمام ہی مہاجرین وانصار خوش دلی کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے؛ لیکن کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم وہ بھی تھے، جو ایمان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں کمی کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ موسم کی شدت اور اسباب کی قلت کی وجہ سے حوصلہ ہارنے لگے، دل میں خیال پیدا ہوگیا کہ اس وقت اس مہم میں شریک نہ ہوا جائے؛ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کے دل مضبوط کردیئے اور وہ جہاد میں شریک رہے، اس آیت میں اسی کا ذکر ہے کہ اللہ نے ان سب کی توبہ قبول فرمالی، اور توبہ کا حاصل ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت، تو گویا غزوۂ تبوک کے تمام شرکاء کے لئے یہ مغفرت اور بخشش کا وعدہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ گناہوں سے معصوم تھے؛ لیکن بشریت کے تقاضے سے بھول چوک ہوجایا کرتی تھی اور یہ نبی ہونے کے منافی نہیں، جیسے اسی واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منافقین کے عذر کو قبول کرلینا جو اللہ تعالیٰ کا منشا نہیں تھا، اس لحاظ سے آپ کی بھی توبہ قبول فرمائی گئی۔

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيۡنَ خُلِّفُوۡا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ وَضَاقَتۡ عَلَيۡهِمۡ
اَنۡفُسُهُمۡ وَظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيۡهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيۡهِمۡ لِيَتُوۡبُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿١١٨﴾

۱۴/۸۴

اوران تین لوگوں پر بھی مہربانی فرمائی ، جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا ، یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی ، ان پر خود ان کا وجود بوجھ بن گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اللہ کے سوا کوئی اور جائے پناہ نہیں ، تو اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی ؛ تاکہ وہ توبہ کرلیں ، بے شک اللہ خوب توبہ قبول کرنے والے اور مہربان ہیں ۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۱۸﴾

﴿۱﴾ یہ آیت تین انصاری صحابی 'حضرت کعب بن مالک ، مُرارہ بن رَبیعہ اور ہِلال ابن اُمَیَّہ رضی اللہ عنہم ' سے متعلق ہے ، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنی آپ بیتی تفصیل سے ذکر کی ہے ، جو حدیث کی دوسری کتابوں کے علاوہ بخاری و مسلم میں بھی نقل کی گئی ہے ، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک کے علاوہ صرف غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو پایا ؛ کیوں کہ بدر میں ہر ایک کو شرکت کی پابندی نہیں تھی ، اس کے علاوہ کسی غزوہ سے بھی غیر حاضر نہیں رہا ؛ بلکہ میں تو 'بیعت عَقَبہ' میں بھی شریک رہا ، جو مجھے غزوۂ بدر کی شرکت سے بھی زیادہ محبوب ہے ، حقیقت یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر میں بالکل صحت مند و توانا تھا اور مجھے دو دو سواریاں میسر تھیں ، مسلمانوں کا بڑا مجمع حضور ﷺ کے ساتھ تھا ، حضور ﷺ لوگوں کو جہاد میں جاتے ہوئے قبل از وقت منزل سے آگاہ نہیں کرتے تھے : لیکن غزوۂ تبوک کے موقع سے آپ ﷺ نے مطلع بھی فرمادیا تھا ، یہ موسم پھلوں کے آنے کا تھا ، رسول اللہ ﷺ کا قافلہ نکل گیا اور میں یہ سوچ کر آج کل کرتا رہا کہ میرے پاس سواری ہے ، میں بعد میں بھی نکلا تو پہنچ جاؤں گا ، جب حضور ﷺ اپنی منزل کو پہنچ گئے اور میں نہیں جاسکا تو مجھے یہ دیکھ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا تھا کہ مدینہ میں بچے ہوئے لوگ یا تو معذورین تھے یا منافقین ، یہاں تک کہ اطلاع ملی کہ حضور ﷺ تبوک سے واپس آرہے ہیں ۔

اب میری فکر بڑھنے لگی اور سوچنے لگا کہ کیا بہانہ کر کے حضور ﷺ کی ناراضگی کو دور کروں ؟ یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے ، حسبِ معمول سفر سے واپسی کے بعد مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرمائی اور لوگ آپ ﷺ کے گرد بیٹھ گئے ، اب پیچھے رہ جانے والے لوگ آآ کر معذرت کرنے اور قسمیں کھانے لگے ، یہ ۸۰ سے کچھ اوپر لوگ تھے ، رسول اللہ ﷺ ان کی ظاہری معذرت خواہی کو قبول کرتے گئے اور ان کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ فرماتے چلے گئے ، یہاں تک کہ میں حاضر ہوا ، آپ اس طرح مسکرائے ، جیسے کوئی ناراض شخص مسکراتا ہے ، آپ ﷺ نے سامنے آنے کا حکم دیا ، میں آکر بیٹھ گیا ، آپ نے فرمایا : کیا تم نے سواری خرید نہیں کی تھی ، تم کیوں پیچھے رہ گئے ؟ میں نے عرض کیا : اگر میں آپ کے علاوہ دنیا کے کسی اور شخص کے سامنے ہوتا تو کوئی بہانہ کر کے نکل جاتا ؛ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو اللہ آپ کو مطلع فرمادیں گے ، حقیقت یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر نہیں تھا ، میں اس وقت جتنا صحت مند تھا اور راحت کی حالت میں تھا ، پہلے کبھی نہیں تھا ، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : یہ سچ بول رہا ہے ، پھر مجھ سے فرمایا : اِس لئے تم کھڑے ہوجاؤ ، یہاں تک کہ خود اللہ تعالیٰ تمہارے بارے میں فیصلہ کردیں ، لوگوں نے مجھے سمجھایا کہ تم بھی کوئی عذر کردیتے ، پھر حضور ﷺ استغفار کردیتے تو تمہارا گناہ معاف ہوجاتا ، میں نے دریافت کیا : کیا میری طرح کسی اور نے بھی اس طرح کی بات کہی ہے ؟ لوگوں نے کہا : ہاں مُرارہ بن رَبیع اور ہِلال ابن اُمَیَّہ ، مجھے اطمینان ہوا ؛ اس لئے کہ یہ دونوں بدر کے ←

← شرکاء میں تھے اور نیک لوگوں میں تھے، حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم فرما دیا کہ کوئی ہم سے بات بھی نہ کرے، میں مسجد آتا، نماز کے بعد حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتا، سلام کرتا اور غور کرتا کہ جواب کے لئے حضور ﷺ کے مبارک ہونٹوں میں جنبش ہوئی کہ نہیں؟ حضور ﷺ سے قریب نماز پڑھتا اور چوری چوری آپ کی نگاہ کو دیکھتا، جب میں نماز کی طرف متوجہ رہتا تو حضور مجھے دیکھتے اور جب میں حضور ﷺ کی طرف دیکھتا تو نگاہ پھیر لیتے۔

مدینہ اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو چکا تھا، اسی دوران ایک دن ایسا ہوا کہ میں بازار میں تھا کہ شام کا ایک شخص جو غذائی اشیاء بیچنے کے لئے مدینہ آیا تھا، میرے بارے میں پوچھ رہا تھا، لوگوں نے میری طرف اشارہ کر دیا، اس نے مجھے غسّان کے بادشاہ کا خط دیا، جس میں لکھا ہوا تھا: ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی نے تمہارے ساتھ زیادتی کر رکھی ہے؛ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ذلت کا درجہ نہیں رکھا ہے؛ اس لئے تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہارے غمخوار رہیں گے'' میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، میں نے اسے تنور میں ڈال کر جلا دیا، جب چالیس دن گذر گئے تو حضور ﷺ کا قاصد آیا کہ تم اپنی بیوی سے بھی الگ ہو جاؤ، میں نے دریافت کیا: کیا میں اس کو طلاق دے دوں؟ قاصد نے کہا: نہیں؛ البتہ اس کو الگ کر دو اور اس سے صحبت نہ کرو، یہی حکم ہمارے ان دونوں ساتھیوں کو بھی دیا گیا، ہِلال ابن اُمیہؓ چوں کہ عمر دراز اور ضعیف تھے اور روتے روتے ان کا برا حال تھا؛ اس لئے ان کی بیوی کی درخواست پر انھیں خدمت کرنے کی حد تک شوہر کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی، میں نے کہا کہ میں تو جوان آدمی ہوں، میں اس کی اجازت نہیں مانگوں گا، دس دن اور گذر گئے، یہاں تک کہ پچاس دن پورے ہو گئے، اور میں فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مکان کی چھت پر اسی فکر میں رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا کہ سَلَع کی پہاڑی سے ایک شخص کو آواز دیتے ہوئے سنا: خوش ہو جاؤ، میں سمجھ گیا کہ اللہ کی طرف سے معافی آئی ہے؛ چنانچہ فوراً سجدہ میں گر پڑا، لوگ مجھے توبہ قبول کئے جانے کی مبارک باد دینے لگے، میں مسجد پہنچا، جہاں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور صحابہ آپ ﷺ کے گرد تھے، میں نے آپ کو سلام کیا، آپ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا، ایسے کہ گویا چاند کا ٹکڑا ہو، آپ ﷺ نے فرمایا: تمہاری پیدائش کے بعد سب سے مبارک دن کی خوشخبری ہے! میں نے دریافت کیا: یہ خوشخبری اللہ کی طرف سے ہے یا آپ ﷺ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی طرف سے، میں نے عرض کیا: اس توبہ کی خوشی میں میرا پورا مال اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کچھ مال اپنے پاس بھی رکھو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا، میں نے عرض کیا: میں اپنا خیبر والا حصہ اپنے پاس رکھتا ہوں، اسی موقع پر قرآنِ مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں۔ (بخاری، کتاب المغازی، حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر: ۴۴۱۸)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ میں نصیحت کے بہت سے پہلو ہیں، اول یہ کہ آدمی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہئے، جھوٹ بول کر وقتی فائدہ تو اُٹھایا جا سکتا ہے؛ لیکن انجام کار یہ چیز انسان کے لئے ذلت و رسوائی کا سبب ہوتی ہے، دوسرے: اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرنے میں کتنی بھی آزمائش آئے، ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کا، اس کے رسول کا اور مسلمانوں کا وفادار رہے، اسلام دشمن طاقتوں کا آلۂ کار نہ بن جائے، جیسا کہ شاہ غسان کے معاملہ میں حضرت کعب نے فرمایا، تیسرے: جس کام کا جو وقت مقرر ہو، اس کو اسی وقت کر لینا چاہئے، تاخیر اور ٹال مٹول سے بعض دفعہ مخلص ہونے کے باوجود انسان اس کام کو نہیں کر پاتا، چوتھے: برائی کو روکنے کے لئے حکمت کے ساتھ دباؤ کا طریقہ بھی اختیار کرنا چاہئے؛ اسی لئے آپ نے منافقین کے تو حیلے بہانے قبول فرما لئے؛ لیکن چوں کہ اِن صحابہ کے اخلاص پر پورا اطمینان تھا، اس لئے ان کی سرزنش فرمائی، ←

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِیۡنَةِ وَ مَنۡ حَوۡلَهُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ یَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰهِ وَ لَا یَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِهِمۡ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ لَا یُصِیۡبُهُمۡ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخۡمَصَةٌ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ لَا یَطَـُٔوۡنَ مَوۡطِئًا یَّغِیۡظُ الۡكُفَّارَ وَ لَا یَنَالُوۡنَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّیۡلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو ﴿۱﴾ ﴿۱۱۹﴾ مدینہ والوں اور ان کے گرد و پیش رہنے والے دیہاتیوں کے لئے یہ بات زیبا نہیں تھی کہ وہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں اور رسول کی جان سے زیادہ اپنی جان کو عزیز رکھیں، یہ اس لئے کہ ان (جہاد کرنے والوں) کو اللہ کے راستہ میں جو پیاس لگتی ہے، جو تھکان ہوتی ہے، جو بھوک لگتی ہے اور وہ جو قدم رکھتے ہیں —— جس سے کفار کا غصہ بھڑکتا ہے —— اور دشمن سے جو کچھ حاصل کرتے ہیں، اس کے بدلے ان کے لئے ایک ایک نیک کام لکھا جاتا ہے، بے شک اللہ اچھے عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔ ﴿۱۲۰﴾

← پانچویں: خلافِ شرع کام پر قطع تعلق کرنا جائز ہے، جیسا کہ حضرتِ کعب رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا؛ البتہ اُمت کے لئے تین دنوں سے زیادہ عام حالات میں سلام وکلام ترک کرنے کی ممانعت ہے، چھٹی بات یہ ہے کہ جب کوئی خوشی کی بات ہو تو سجدۂ شکر ادا کرنا چاہئے اور صدقہ بھی کرنا چاہئے؛ لیکن اتنا نہیں کہ ہاتھ بالکل خالی ہو جائے، ساتویں: جب کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو اس پر مبارک باد دینا چاہئے، خاص کر اگر دینی پہلو سے کوئی اچھی بات سامنے آئی ہو، آٹھویں: صحابہ کی خطائیں بھی اس پہلو سے اُمت کے لئے نمونہ ہیں کہ وہ اپنی خطاؤں پر کس درجہ نادم اور شرمسار ہوا کرتے تھے؟۔

﴿۱﴾ یہ آیت یوں تو غزوۂ تبوک کے پس منظر میں نازل ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اچھے لوگوں کی صحبت اور رفاقت اختیار کرنی چاہئے نہ کہ منافقین کی؛ لیکن یہ ایک عمومی حکم بھی ہے کہ آدمی کو ہمیشہ اچھی صحبت اختیار کرنی چاہئے؛ کیوں کہ انسان پر صحبت وہم نشینی اور دوستی کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے، جو لوگ اہل دین کے ساتھ رہتے ہیں، ان میں دین کی طلب پیدا ہوتی ہے، اچھے اعمال میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، برائیوں سے نفرت ہوتی ہے اور مال کی محبت کم ہوتی ہے، جو لوگ گنہگاروں اور دنیا کے پرستاروں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں، دنیا ان کی منزل مقصود بن جاتی ہے اور برائیاں ان کو ہلکی نظر آنے لگتی ہے —— ''صادقین'' کے معنی ''سچے لوگوں'' کے ہیں، صدق کا تعلق قول سے بھی ہے اور عمل سے بھی، قول میں صدق یہ ہے کہ کوئی خلافِ واقعہ بات نہ کہے، اور عمل کا صدق یہ ہے کہ عمل اخلاص کے ساتھ ہو، اس میں ریا اور دکھاوے کا جذبہ نہ ہو۔

وَ لَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّ لَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ
اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢١﴾ وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ
فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ
ع ١٥ ٤ يَحْذَرُوْنَ ﴿١٢٢﴾

اور وہ جو کچھ بھی کم یا زیادہ خرچ کرتے ہیں اور کوئی میدان طے کرتے ہیں تو ان کے لئے اسے بھی لکھ لیا جاتا ہے ؛ تا کہ اللہ اُن کو اُن کے کاموں کا بہترین بدلہ عطا فرمائیں ﴿١﴾ ﴿١٢١﴾ مسلمانوں کے لئے یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب نکل جائیں ، پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے بڑے گروہ میں سے ایک چھوٹا گروہ نکل جاتا ؛ تا کہ (جو لوگ رہ جائیں) وہ دین کا فہم حاصل کریں اور جب (جہاد کرنے والے) ان کی طرف واپس آئیں تو انھیں واقف کرائیں ؛ تا کہ وہ بھی (اللہ کی نافرمانی سے) بچتے رہیں ۔ ﴿٢﴾ ﴿١٢٢﴾

﴿١﴾ یعنی اصل مقصود تو ہے جہاد ؛ لیکن اس مقصود کو پانے میں ضمنی طور پر آدمی جن مرحلوں سے گذرتا ہے ، ان پر بھی ان کو اجر حاصل ہوتا ہے ، جیسے ایک شخص نماز ادا کرنے کے لئے مسجد جائے تو اصل مقصد تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا ہے ؛ لیکن اس کا ہر قدم جو مسجد کی طرف اُٹھے گا اور ٹھنڈک اور گرمی کی ہر تکلیف جو جاتے ہوئے اُٹھائے گا ، وہ بھی اس کے لئے نیکی شمار ہوگی اور اس پر بھی اسے اجر حاصل ہوگا ، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص ہے ، ورنہ تو دنیا کا نظام یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صبح آٹھ بجے اپنے گھر سے نکلا ، مشقتیں اُٹھاتے ہوئے دس بجے اپنے دفتر کو پہنچا تو اس کی ڈیوٹی دس بجے سے شمار ہوتی ہے ، اس سے پہلے کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا ۔

﴿٢﴾ یعنی کچھ لوگ جہاد کے لئے جائیں اور کچھ لوگ علم دین حاصل کرنے میں مشغول رہیں ؛ تا کہ جب مجاہدین واپس آئیں تو یہ طالبانِ علم اُن تک علم کی روشنی پہنچائیں ، اس سے علم دین کی فضیلت معلوم ہوئی کہ اس میں مشغول رہنے والوں کو جہاد جیسی عبادت میں شریک نہ ہونے کی اجازت دی گئی ؛ کیوں کہ مقصد دونوں کا ایک ہے ، جہاد کا مقصد بھی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو نافذ کرنا ہے اور علم دین کے مقاصد بھی یہی ہیں ـــــ قرآن میں یہاں ’’ تفقه ‘‘ کا لفظ آیا ہے ، عربی زبان میں اس وزن پر جو الفاظ آتے ہیں ، ان میں تکلف اور خصوصی محنت و جستجو کے معنی ہوتے ہیں ، تو تفقہ کے معنی ہوئے خوب تدبر ، گہرائی اور بصیرت کے ساتھ علم حاصل کرنے کے ’’ أي يتبصروا ‘‘ (قرطبی : ۸ / ۲۹۴) اس درجہ کا علم حاصل کرنا ہر شخص پر فرض نہیں ؛ بلکہ یہ فرضِ کفایہ ہے ، مسلمانوں میں ایک ایسے گروہ کا ہونا کافی ہے جو اس درجہ کا علم حاصل کیا ہوا ہو ؛ اسی لئے ایک گروہ کو اس کا حکم دیا گیا ہے ، پوری اُمت کو نہیں ، اور اس قدر علم کہ جس سے انسان اپنی ذات سے متعلق شرعی احکام پر عمل کرلے ، ہر شخص پر ذاتی حیثیت میں فرض ہے ، جیسے نماز پڑھنے کا طریقہ ، جن پر زکوٰۃ فرض ہے ان کے لئے زکوٰۃ کے احکام وغیرہ ۔

(ملتقی الأبحر مع مجمع الانہر : ۲ / ۲۷ ، باب الکراھیة)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ
فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو، جو تمہارے قریب ہیں، ان کو تمہارے اندر سختی (وطاقت) محسوس کرنی چاہئے اور جان لو کہ اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۲۳﴾ اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کردیا؟ تو جو لوگ ایمان لاچکے ہیں، ان کے ایمان میں (تو واقعی) ترقی ہوتی ہی رہتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں ﴿۱۲۴﴾ اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری تھی، ان کی گندگی میں اور گندگی بڑھ گئی اور وہ کفر کی حالت میں ہی مرگئے ﴿۱﴾ ﴿۱۲۵﴾ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک دو بار آزمائے جاتے ہیں، پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں؟ ﴿۳﴾ ﴿۱۲۶﴾

﴿۱﴾ یعنی جنگی تدبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ پہلے اپنے قریبی دشمنوں کو زیر کرلیا جائے؛ تاکہ ان کی طرف سے اطمینان ہوجائے، پھر دور کے دشمنوں کی خبر لی جائے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے مدینہ اور اس کے گردآباد یہودی قبائل کو فتح کیا، پھر مکہ کو، پھر عرب کے دوسرے علاقوں کو، اس کے بعد صحابہ نے روم اور ایران کی طرف توجہ فرمائی —— ''ان کو تمہارے اندر سختی محسوس کرنی چاہئے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ بدمزاجی، درشت زبانی اور بداخلاقی سے پیش آنا چاہئے؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو جنگی تیاری کے اعتبار سے طاقتور ہونا چاہئے، ان میں دینی حمیت اور غیرت ہونی چاہئے؛ تاکہ مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کے حوصلے بڑھ نہ جائیں۔

﴿۲﴾ یعنی جب قرآن مجید کے نئے احکام آتے ہیں تو مخلص مسلمانوں کے ایمان میں ترقی ہوتی ہے؛ کیوں کہ وہ جن باتوں پر ایمان لائے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ کے احکام پر ان کا یقین بڑھتا جاتا ہے، اور جو لوگ نفاق اور کفر میں مبتلا ہیں تو وہ ہر اُترنے والی آیت کا انکار ہی کرتے چلے جاتے ہیں؛ اس لئے ان کے اندر کفر کی ناپاکی بڑھتی چلی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے معنی ومفہوم کو سمجھنا ایمانی کیفیت میں ترقی کا باعث ہے اور جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے اور اس سے توبہ نہیں کرتا تو گناہ کی طرف اس کی رغبت بڑھتی جاتی ہے۔

﴿۳﴾ یعنی قحط، بیماری اور اس طرح کی مصیبتیں ان منافقین پر آتی رہتی ہیں، عام طور پر مصیبتیں انسان کے دلوں کو نرم کردیتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان میں اپنے عمل پر پچھتاوا پیدا ہوتا ہے؛ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اس کے باوجود ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور نافرمانیوں سے باز رہنے کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا —— اس کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ہر سال ایک دو بار سفر جہاد کی نوبت آتی ہے اور اس میں اپنے نفاق کی وجہ سے ان کو شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے، اس کے باوجود ان کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، پہلی تفسیر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے اور دوسری قتادہ رحمہ اللہ سے۔ (مفاتیح الغیب: ۲۲۶/۸)

وَ اِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ نَّظَرَ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ ؕ هَلۡ يَرٰٮكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوۡا ؕ
صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ ﴿١٢٧﴾ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ
عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿١٢٨﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ
١٦ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿١٢٩﴾
ع ٥

اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھ تو نہیں رہا ہے؟ پھر وہ چل دیتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے؛ کیوں کہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں ﴿١﴾ ﴿١٢٧﴾ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں، تمہاری مشقتیں ان پر نہایت گراں گذرتی ہیں، وہ تمہارے بڑے ہی بہی خواہ ہیں، مومنوں کے ساتھ بہت شفیق اور مہربان ہیں ﴿٢﴾ ﴿١٢٨﴾ (اے رسول!) پھر بھی اگر وہ منھ پھیر لیں تو کہہ دیجئے: میرے لئے اللہ ہی کافی ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ان ہی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرشِ عظیم کے مالک ہیں۔ ﴿٣﴾ ﴿١٢٩﴾

﴿١﴾ یعنی جب ایسی آیات نازل ہوتی ہیں، جن میں ان کے نفاق اور ان کی غلط حرکتوں کا ذکر ہوتا ہے تو انھیں اِس سچائی کو سن کر تکلیف ہوتی ہے اور وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کہیں کوئی مخلص مسلمان تو نہیں سن رہا ہے؛ کیوں کہ فضیحت کی باتیں اگر دوسروں کے سامنے ہوں تو یہ انسان کے لئے زیادہ ندامت اور شرمندگی کا باعث ہوتی ہیں، اس کے علاوہ ان کا مزاج یہ بھی تھا کہ جب قرآن مجید کے احکام کو سنتے تو اپنی بے توفیقی کی وجہ سے ان کا مذاق اُڑاتے؛ لیکن یہ بھی خیال ہوتا کہ کہیں ان کے قریب مخلص مسلمان تو موجود نہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا نفاق لوگوں کے سامنے آجائے، اس لئے وہ ادھر اُدھر دیکھتے کہ کوئی انھیں دیکھ تو نہیں رہا ہے، پھر موقع دیکھ کر وہاں سے کھسک جاتے۔

﴿٢﴾ سورۂ توبہ میں کثرت سے جہاد کے احکام، کفار و مشرکین سے براءت کا اظہار، ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی تلقین وغیرہ کے مضامین ہیں؛ اسی لئے سورۂ توبہ کی ان آخری آیتوں میں دین کے اصل مزاج کو واضح کیا گیا کہ اصل میں نبی پوری انسانیت سے محبت کرنے والا، ان کا بہی خواہ اور ان کے ساتھ شفیق و مہربان ہوتا ہے؛ لیکن جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچوں کی بھلائی کے لئے ان کی سرزنش بھی کرتا ہے اور جیسے ایک ماہر اور فرض شناس طبیب اپنے مریض کے علاج کے لئے بعض اوقات تکلیف دہ طریقے بھی اختیار کرتا ہے، اسی طرح جہاد کا حکم اور کفر و شرک سے براءت کی حیثیت بھی اسی علاج اور تادیب کی ہے (مفاتیح الغیب: ٨/٢٣٠) —— ''تمہارے رسول تم ہی میں سے آئے'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ ﷺ بھی انسانوں میں سے ایک انسان ہی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ''۔ (حم السجدة: ٦)

﴿٣﴾ اس آیت میں ایمان نہ لانے والوں کا ذکر ہے کہ آپ کی مشفقانہ دعوت کے باوجود اگر ان کے دل پگھلنے کو تیار نہیں ہیں تو آپ اس کی پرواہ نہ کریں اور فرمادیں کہ میرے لئے اللہ کافی ہیں، حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ، حسن بصری اور امام سعید ابن جبیر رحمہم اللہ نے ←

← نزول کے اعتبار سے ان دو آیتوں کو قرآنِ مجید کی سب سے آخری آیت قرار دیا ہے (مفاتیح الغیب: ۲۳۳/۸) عہد صدیقی میں جب قرآنِ مجید کو مصحف میں جمع کیا گیا تو اس میں صرف یادداشت کو کافی نہیں سمجھا گیا؛ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تحریری نوشتوں سے بھی مدد لی گئی، ہر آیت پر جب کم سے کم دو تحریری نوشتے موجود ہوتے تو ان کو قبول کیا جاتا تھا؛ لیکن یہ آخری دو آیتیں صرف حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تنہا ان کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا تھا؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تنہا ان کی تحریر کو کافی قرار دیا (قرطبی: ۳۰۳/۸) —— سنن ابی داؤد میں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص صبح وشام ''حسبی اللہ، لا إله الا هو، علیه توكلت، وهو رب العرش العظیم'' سات بار پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کفایت فرمائیں گے اور تمام کاموں کو آسان کردیں گے۔

(ابوداؤد، کتاب الأدب، باب مایقول إذ أصبح، حدیث نمبر: ۵۰۸۱)

سُوۡرَةُ یُوۡنُس

- سورہ نمبر : (۱۰)
- رکوع : (۱۱)
- آیتیں : (۱۰۹)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ مکی سورت ہے اور ایک سو نو (۱۰۹) آیات پر مشتمل ہے، اس سورت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ہر اُمت میں رسول کا بھیجنا — تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف ہوجائیں — سنتِ الٰہی رہی ہے، نبوت کی ضرورت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے نبی ہونے پر روشنی ڈالتے ہوئے ان شبہات کو دور کیا گیا ہے، جو نبوت و رسالت کے منکرین کی طرف سے اُٹھایا جاتا تھا اور اہل مکہ کو چیلنج بھی کیا گیا ہے کہ اگر تم محمد رسول اللہ ﷺ کو نبی نہیں مانتے اور قرآن کو کلام اللہ تسلیم نہیں کرتے؛ بلکہ ایک انسانی تصنیف خیال کرتے ہو تو تم خود اس جیسی ایک سورت تصنیف کر کے دیکھا دو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے ایک ہونے پر ان نشانیوں سے استدلال کیا گیا ہے، جن کو انسان رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

اس سورت میں انبیاء اور ان کی اقوام کے تین واقعات کا بھی ذکر آیا ہے، ایک: حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم سے متعلق، دوسرے: حضرت موسیٰ علیہ السلام، ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کے متبعین سے متعلق، تیسرے: حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم سے متعلق — قرآن میں مذکور دوسرے قصص و واقعات کے مقابلہ ایک بات ایسی ہے جو حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعہ کو ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ کہ قومِ یونس کے علاوہ جن لوگوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا، ان قوموں کو قبل از وقت توبہ کی توفیق نہیں ہوئی اور اس طرح وہ اللہ کے عذاب سے دوچار ہوئے؛ جب کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کے آثار دیکھتے ہی اللہ کے سامنے گریہ وزاری شروع کردی اور عذاب ان سے ٹل گیا، غالباً قومِ یونس کے واقعہ کی اس خصوصیت و اہمیت کی وجہ سے اس سورہ کا نام ہی منجانب اللہ ''یونس'' رکھا گیا۔

○ ○ ○

منزل ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ
اَنْذِرِ النَّاسَ وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ
هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ
اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الٓرٰ ﴿۱﴾، (اے لوگو!) یہ حکمت و دانش سے لبریز کتاب کی آیتیں ہیں ﴿۲﴾ ۝۱ کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک شخص پر وحی بھیجی ہے کہ وہ لوگوں کو ڈرائے ، اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دے کہ ان کا ان کے پروردگار کے پاس اونچا مرتبہ ہے؟ کفر کرنے والوں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا ہوا جادوگر ہے ﴿۳﴾ ۝۲ یقیناً تمہارا پروردگار وہی خدا ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر عرش پر جلوہ گر ہوگیا، وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرسکتا، وہی خدا تمہارا پروردگار ہے؛ لہٰذا تم اسی کی عبادت کیا کرو، کیا تم غور نہیں کرتے؟ ﴿۴﴾ ۝۳

﴿۱﴾ یہ حروف مقطعات ہیں، جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں ''الٓمٓ'' کا لفظ ہے، اس کی حقیقی مراد سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہیں۔ (سورۂ بقرہ کے حاشیہ نمبر ایک کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات حکیم و دانا ہے، اس کی حکمت و دانائی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات کو اس نے پیدا بھی کیا ہے اور اس کی تدبیر سے یہ نظام چل بھی رہا ہے، یقیناً ایسی حکیم و دانا ذات کی ہر بات حکمت و دانش ہی پر مبنی ہوگی، اور قرآن مجید اسی کا کلام ہے؛ اس لئے قرآن کی ہر بات عقل و دانش سے ہم آہنگ اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی کم فہمی کی وجہ سے بعض احکام کی حکمتوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے؛ لہٰذا اگر قرآن کی کوئی بات انسان کی محدود عقل کے پیمانہ میں نہیں آسکے تو اس کا انکار کر جانا غلط ہے؛ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن کا بیان صحیح ہے؛ البتہ وہ ہماری ناقص عقل سے اونچی بات ہے۔

﴿۳﴾ اہل مکہ کو اس بات پر تعجب اور اعتراض تھا کہ اگر اللہ کو کسی انسان کو رسول بنانا ہی تھا تو ابوطالب کے یتیم بھتیجے کو کیوں بنایا، کیا خدا کو کوئی اور شخص نہیں ملا تھا؟ پھر جب وہ قرآن مجید جیسے معجزاتی کلام کا کوئی جواب پیش نہیں کر پاتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے، یہ زبان سے اپنے جادو جگاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی پس منظر میں فرمایا کہ جب خدا ساری کائنات کا مالک ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ جس انسان کو چاہے، اپنی پیغمبری کے لئے منتخب کرے، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اور جس کتاب کو تم جادو کہتے ہو اور اس کی وجہ سے کتاب لانے والے پر جادوگر ہونے کا الزام لگاتے ہو، وہ ایسی کتاب ہے جو حکمت و دانش کے موتیوں سے لبریز ہے، تو تم کو تو اس کتاب اور اس کے لانے والے کا ثنا خواں اور مداح ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اُلٹے تم ان پر جادوگر ہونے کا الزام لگادو۔

﴿۴﴾ چھ دنوں میں کائنات کو پیدا کرنے سے مراد ہے چھ دنوں کے بہ قدر وقت میں کائنات کا پیدا کیا جانا؛ کیوں کہ اس وقت تو ←

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۴

اللہ ہی کی طرف تم سبھوں کی واپسی ہے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، بے شک وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ بھی پیدا کرے گا؛ تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، ان کو انصاف کے ساتھ بدلہ عطا کرے، اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لئے ان کے کفر کی وجہ سے کھولتا ہوا پینے کا پانی اور دردناک عذاب ہے۔ ﴿۱﴾ ۝۴

← چاند اور سورج تھے ہی نہیں؛ اس لئے ہم لوگ جس کو رات اور دن کہتے ہیں، اس کا وجود ہی نہیں تھا، سورۂ اعراف آیت نمبر: ۵۴ میں اس کا ذکر آچکا ہے، یہاں خاص طور پر اس بات کو واضح فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ خود کائنات کی تدبیر فرماتے ہیں، یعنی ایسا نہیں ہے کہ خدا نے کائنات کو پیدا کر دیا ہے اور اب خدا نے اسے چھوڑ دیا ہے، یہ کائنات خود بہ خود قانونِ فطرت کے مطابق چل رہی ہے؛ بلکہ کائنات اپنے وجود اور بقا میں ہر لمحہ خدا کی محتاج ہے، اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہوگئی کہ کسی مخلوق کو کائنات میں قدرت واختیار تو کیا حاصل ہوگا، انھیں تو خدا کے سامنے سفارش کرنے کی بھی ہمت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو اجازت دیں گے، وہی سفارش کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

﴿۱﴾ اس آیت میں آخرت کے واقع ہونے کی دلیل بھی بتادی گئی اور اس کا مقصد بھی واضح کر دیا گیا، دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہلی دفعہ کائنات کو پیدا کیا تو یقیناً وہ اس کو دوبارہ بنانے پر بھی قادر ہے؛ کیوں کہ جو پہلی بار کسی چیز کو بنا سکتا ہے، وہ دوسری بار بہ درجہ اولیٰ اس کو وجود میں لاسکتا ہے؛ اس لئے کہ ایک بار کسی چیز کو بنانے کے بعد اس کو دوبارہ بنانا آسان ہوتا ہے —— آخرت کا مقصد ہے اچھے لوگوں کو پورا پورا انعام دینا اور نافرمانوں کو پوری پوری سزا دینا؛ کیوں کہ دنیا میں نہ نیکی کا مکمل انعام دیا جاسکتا ہے اور نہ برائی کی مکمل سزا دی جاسکتی ہے، اگر آپ نے کسی بیمار شخص کی مدد کی، علاج کے ذریعہ اس کو صحت حاصل ہوگئی، تو دنیا میں زیادہ سے زیادہ یہی انعام دیا جاسکتا ہے کہ وہ بھی آپ کو آپ کے تعاون کے بہ قدر رقم دے دے یا اس سے کچھ زیادہ دے دے؛ لیکن کیا یہ آپ کی نیکی کا مکمل بدلہ ہے؟ صحت مند ہونے کے بعد اس نے سالہا سال کمائے، بہت سارے اچھے کام کئے، اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دی اور ان کو کام کے لائق بنایا، بہ ظاہر علاج نہ ہونے کی وجہ سے اس کی موت ہوگئی ہوتی تو وہ یہ سب کچھ نہیں کر پاتا، کیا تعاون کی اس رقم کے لوٹانے سے ان سب کا بدلہ ادا ہوجائے گا؟ اسی طرح ایک ظالم شخص نے کسی کو قتل کر دیا تو زیادہ سے زیادہ بطور سزا کے اسے قتل کیا جاسکتا ہے؛ لیکن اس نے مقتول کو زندگی ہی سے محروم نہیں کیا؛ بلکہ اس کی بیوی بیوہ ہوئی، اس کے بچے یتیم ہوئے اور یتیمی کے داغ نے ان کو تعلیم و تربیت اور بہتر زندگی سے محروم کر دیا، پھر جب جہالت نے ایک پشت پر سایہ کیا، تو کئی پشتوں تک یہ خاندان علم کے جوہر سے اور باعزت زندگی سے محروم رہا، کیا کسی قاتل کو دنیا میں ان تمام جرائم کی سزا دی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں —— لہٰذا مکمل جزا اور مکمل سزا کی جگہ آخرت ہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ
وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِیْ
اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶ اِنَّ
الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَ رَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا
غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ۝۸ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝۹

وہی خدا ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا، اور اس کے لئے منزلیں مقرر کردیں؛ تا کہ سالوں کی تعداد اور (تاریخوں کا) حساب جان سکو، اللہ نے ان کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے، اللہ ان لوگوں کے لئے نشانیوں کو واضح فرما رہے ہیں، جو سمجھ دار ہیں ۝۵ بے شک رات اور دن کے بدلنے میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں میں اور زمین میں پیدا کی ہیں، ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو اللہ سے ڈرتے ہیں ﴿۱﴾ ۝۶ جو لوگ ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے اور دنیوی زندگی پر راضی اور اسی پر مطمئن ہیں اور جو ہماری نشانیوں کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ۝۷ بے شک ان کی بداعمالی کی وجہ سے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے ۝۸ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، ان کے ان کا پروردگار ان کے ایمان لانے کی وجہ سے منزل مقصود تک پہنچا دیں گے، (یعنی) راحت بخش باغات میں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ۝۹

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ہماری دنیا کے لئے دو بڑی اہم چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ایک: سورج، جو دن میں روشن ہوتا ہے اور جس کی روشنی بہت تیز ہوتی ہے؛ تا کہ لوگ کسبِ معاش اور زندگی کے دوسرے مسائل کو اچھی طرح انجام دے سکیں، دوسرے: چاند، جو رات میں روشن ہوتا ہے، جس کی روشنی ٹھنڈی اور دھیمی ہوتی ہے؛ تا کہ رات کی نیند اور آرام میں خلل نہ ہو، دن اور رات دونوں کی ضروریات کے لحاظ سے یہ دونوں ہی روشنیاں اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں؛ چنانچہ عربی زبان میں ضیاء کے معنی ''تیز روشنی'' کے اور ''نور'' کے معنی معتدل روشنی کے ہیں (مفاتیح الغیب: ۲۷۸/۸) —— منزل کے معنی رکنے، ٹھہرنے اور اُترنے کی جگہ کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ سورج اور چاند کی گردش کے لئے اللہ تعالیٰ نے دائرے متعین کردیئے ہیں، اسی دائرہ میں رہتے ہوئے سورج اور چاند اپنی گردش مکمل کرتے ہیں اور ہر سال اسی نظام کے مطابق مہینے آتے ہیں اور موسموں کی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے وجود کی زبردست نشانی ہے کہ ہزاروں سال سے اپنے مقررہ دائرہ سے ہٹے بغیر سورج، چاند اور ہمارے نظام شمسی سے جڑے ہوئے تمام سیارے گردش کررہے ہیں، نہ ان میں کوئی تصادم ہوتا ہے، نہ ان کی رفتار میں فرق آتا ہے، نہ ان کی رفتار اور روشنی کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے، نہ فضاء میں تیرتے ہوئے ان ستاروں کو کسی مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے، اتنا بڑا نظام کسی مدبر، منتظم اور کنٹرولر کے بغیر کیسے قائم رہ سکتا ہے —— غور کیا جائے تو یہی آخرت کے لئے بھی دلیل ہے کہ کائنات کے خالق و مالک نے اتنا بڑا نظام کسی مقصد کے بغیر کیوں کر قائم کیا ہوگا اور انسان کو اتنی ساری نعمتوں کا حساب و کتاب لئے بغیر کیسے چھوڑ دیا جائے گا؟

دَعۡوٰىهُمۡ فِيۡهَا سُبۡحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمۡ فِيۡهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعۡوٰىهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ
ع ۱ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۱۰ وَلَوۡ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَهُمۡ بِالۡخَيۡرِ لَقُضِىَ اِلَيۡهِمۡ اَجَلُهُمۡ ؕ
۲ فَنَذَرُ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۱۱

جنت میں ان کی صدا ہوگی: ''سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ'' (اے اللہ! آپ کی ذات پاک ہے) اس میں ان کی باہمی ملاقات سلام کے ذریعہ ہوگی، اور ان کی آخری بات ہوا کرے گی: ساری تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جو تمام جہانوں کے پروردگار ہیں ﴿۱﴾ ۝۱۰ جس طرح لوگ بھلائی کے معاملہ میں جلد بازی کرتے ہیں، اگر اسی طرح اللہ ان کے ساتھ برائی کے معاملہ میں جلدی فرمایا کرتے، تو ان کی مہلت کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی، مگر جو لوگ ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے ہیں، ہم انھیں چھوڑے رکھتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۱۱

﴿۱﴾ اہل جنت کو یوں تو تمام نعمتیں حاصل ہوں گی اور لمحہ لمحہ ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی؛ لیکن ان کی گفتگو کیا ہوگی، ان کا کسی چیز کو طلب کرنا کس طرح ہوگا اور وہ شکر یہ کس طرح ادا کریں گے؟ —— اس سلسلے میں تین باتیں اس آیت میں ذکر کی گئی ہیں، اول: یہ کہ سبحانک اللّٰھم ان کی دُعا ہوگی، دُعا سے مراد یا تو ذکر ہے، (مفاتیح الغیب: ۲۹۱/۸) یعنی جنت میں لوگ 'سبحانک اللّٰھم' کا ورد کیا کریں گے، یا یہ کہ کوئی چیز مانگنی ہوگی تو ''سبحانک اللّٰھم'' کہہ کر پھر مطلوب شئے طلب کریں گے، دوسرے: جنت میں ملاقات کا کلمہ سلام ہوگا، وہ ایک دوسرے سے ملیں گے تو ''سلام علیکم'' کہیں گے، جیسا کہ اس آیت میں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اہل جنت کو سلام پہنچایا جائے گا، فرشتے بھی اہل جنت کو سلام کیا کریں گے: ''وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡھِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ، سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ'' (الرعد: ۲۳-۲۴) یعنی جنت جس طرح سلامتی کی جگہ ہے، اسی طرح وہاں سلام کا تبادلہ بھی ہوتا رہے گا، تیسرے: ان کا کلام 'الحمد للہ رب العالمین' پر ختم ہوگا، آیت کی روشنی میں علامہ قرطبی ؒ نے لکھا ہے کہ کھانا پینا 'بسم اللہ' سے شروع اور 'الحمد للہ' پر ختم کرنا چاہئے؛ تا کہ اہل جنت کی پیروی ہو، نیز دُعا کرنے والے کو بھی چاہئے کہ دُعا ختم کرتے ہوئے کہے ''وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین'' اور مزید بہتر یہ ہے کہ سورۂ صافات کی آخری آیتیں ''سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ، وَسَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ ، وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ'' پڑھی جائیں؛ کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بھی ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے سلام کا تحفہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی حمد پر خاتمہ بھی۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۳۱۴/۸)

﴿۲﴾ ابو حُذیفہ بن مُغیرہ ایک مشرک تھا، وہ اور بعض اور مشرکین کہا کرتے تھے کہ خداوندا! اگر قرآن مجید واقعی آپ کی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے، یا کوئی اور عذاب نازل کر دیجئے، (الانفال: ۳۲) لیکن اللہ تعالیٰ کا کرم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی بددُعا کو جلدی قبول نہیں کرتے؛ بلکہ اسے مؤخر کرتے اور ڈھیل دیتے رہتے ہیں؛ تا کہ ان کی سرکشی پوری طرح واضح ہو جائے اور ان کے لئے عذر کا کوئی موقع نہ رہے —— معلوم ہوا کہ اگر گناہوں کی کثرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہو تو اس سے مطمئن نہ ہو جانا چاہئے کہ ہمارا عمل مقبول ہے یا یہ کہ اللہ سزا دینے پر قادر نہیں ہیں۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ لَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، لیٹا ہو یا کھڑا ہو یا بیٹھا ہو، پھر جب ہم اس سے اس کی مصیبت دور کردیتے ہیں تو اس طرح (رُخ پھیر کر) گذر جاتا ہے کہ جیسے اس نے ہمیں تکلیف سے دوچار ہونے کے وقت پکارا ہی نہ ہو، اسی طرح حد سے گذر جانے والوں کے لئے ان کے کام خوشنما بنادیئے گئے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۲﴾ اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کو اس وقت ہلاک کرکے رکھ دیا، جب انھوں نے ظلم کیا؛ حالاں کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آچکے تھے، اور وہ تو ایمان لانے کو تیار ہی نہیں تھے، ہم جرم کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۱۳﴾ پھر میں نے ان کے بعد ان کی جگہ تم کو زمین میں آباد کیا؛ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو؟ ﴿۱۴﴾

﴿۱﴾ انسان کی فطرت یہ ہے کہ انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے، تو اس وقت وہ جس حالت میں بھی ہو، لیٹا ہو، کھڑا ہو یا بیٹھا ہو، خدا ہی کو پکارتا ہے، ان تینوں کیفیتوں کا ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ جب کوئی شخص تکلیف میں بے قرار ہوتا ہے، تو کسی ایک حالت پر نہیں رہتا، کبھی لیٹتا ہے، کبھی بیٹھتا ہے، کبھی کھڑا ہوتا ہے اور چوں کہ زیادہ تر لوگ اس حالت میں لیٹے رہنا چاہتے ہیں؛ اس لئے سب سے پہلے اسی کیفیت کا ذکر فرمایا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دُعا کرنے کے لئے کوئی خاص کیفیت ضروری نہیں، دُعا کھڑے ہوکر بھی کی جاسکتی ہے، بیٹھ کر بھی اور لیٹ کر بھی —— اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسان کی ایک اور نفسیاتی کمزوری کو بھی بتادیا ہے کہ جب اس پر خوشی، فراوانی اور آسانی کے دن آتے ہیں، تو وہ مصیبت کی گھڑیوں اور پریشانی کے لمحات کو بھی بھول جاتا ہے اور اپنے محسنوں کو بھی بھلا بیٹھتا ہے؛ اس لئے انسان کو ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ کہیں وہ احسان فراموشی میں تو مبتلا نہیں ہے۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم پر دین کی طرف دعوت دینے اور حق کی طرف بلانے کا حق ادا کردیا جاتا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے ہیں، تب ان پر اللہ کا عذاب آتا ہے، آج پوری دنیا میں ایمان سے محروم لوگوں کی طرف سے مسلمانوں پر زیادتی کا سلسلہ جاری ہے؛ لیکن پھر بھی اللہ کی طرف سے ان کی پکڑ نہیں ہوتی، یہ اسی لئے کہ مسلمانوں نے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی اور تبلیغ دین کا حق ہی ادا نہیں کیا؛ لہٰذا مسلمان بظاہر تو مظلوم ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس قانون کے مطابق ظالم ہیں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں تک اس امانت کو نہیں پہنچایا، جو ان کی بنیادی ذمہ داری تھی۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ
اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ
اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ
اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۫ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

جب ان پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں جو بالکل واضح ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کا یقین نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں: اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم ہی کردو، آپ فرما دیجئے: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی ردو بدل کردوں، مجھ پر جو کچھ وحی کی جاتی ہے، میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب کا ڈر لگتا ہے ﴿۱۵﴾ آپ کہہ دیجئے، اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں اس کی تلاوت تمہارے سامنے نہیں کرتا، اور نہ اللہ تم لوگوں کو باخبر فرماتے؛ ﴿۱﴾ کیوں کہ میں تو اس سے پہلے بھی تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ﴿۲﴾ ﴿۱۶﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کی شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی خواہشات اعتدال سے باہر نہ ہوجائیں، انسان کی بہت سی خواہشات اخلاقی تقاضوں کے مغائر ہوتی ہیں اور بہت سی دوسرے انسانوں کے ساتھ حق تلفی اور ظلم وزیادتی کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں، شرعی قوانین کے ذریعے انھیں پابند کیا جاتا ہے کہ ان کا کوئی عمل ظلم وزیادتی، بداخلاقی اور بے شرمی کے دائرہ میں نہ آجائے؛ اسی لئے جو لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں اور جو اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا نہیں چاہتے، انھیں یہ احکام ناگوار گزرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تورات لے کر آئے، تو ان کی قوم کو یہی اعتراض تھا کہ اس میں جو سخت احکام آگئے ہیں، ان میں تبدیلی کی جائے، یہاں تک کہ ان پر کوہِ طور اُٹھالیا گیا، تب جاکر انھوں نے تورات پر عمل کرنے کی ہامی بھری، (البقرۃ: ۶۳) اسی طرح قرآن مجید کے بارے میں اہل مکہ کا مطالبہ تھا کہ یا تو دوسرا قرآن مجید اُتارا جائے یا قرآن مجید کے موجودہ احکام میں تبدیلی لائی جائے، اسی کی تردید کی گئی ہے اور آپ ﷺ کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے، ہمیں اس میں ادنیٰ درجہ کی تبدیلی کا بھی حق نہیں —— ہر دور میں مذہب بیزار اور نفس کے پرستار لوگوں کا یہی مزاج رہا ہے کہ وہ خدائی تعلیمات میں تبدیلی کے خواہاں رہتے ہیں، موجودہ دور میں پردہ کی مخالفت، سود، قمار اور شراب کی اجازت، زنا اور ہم جنسی کے تعلق کو درست ٹھہرانا وغیرہ اسی نوعیت کے مسائل ہیں، ان اُمور سے متعلق قریب قریب تمام مذاہب کی تعلیمات یکساں ہیں، ہر مذہب میں سود، قمار، زنا، ہم جنسی اور بے پردگی کی ممانعت ہے؛ لیکن پھر بھی مغربی دنیا اپنے آپ کو عیسائی یا یہودی کہنے کے باوجود ان احکام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور خواہشات کی غلام بنی ہوئی ہے۔

﴿۲﴾ پیغمبروں کے داعیِ حق اور سچے ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ عام انسانی سماج کا ایک حصہ ہوتے ہیں، سماج ہی کے درمیان ان کی زندگی گزرتی ہے؛ لیکن اخلاق وکردار کے اعتبار سے ان کی زندگی اتنی بے داغ ہوتی ہے کہ کسی کے لئے ان پر انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی، پھر جو شخص اپنے جیسے انسانوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بولتا اور دھوکہ نہیں دیتا؛ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے خالق کے بارے میں جھوٹ بولے اور دھوکہ دیا کرے؟

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾
وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ
فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ گھڑے، یا اللہ کے احکام کو جھٹلائے، یقیناً ایسے مجرموں کا بھلا نہیں ہوگا ﴿۱﴾ ﴿۱۷﴾ وہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں، جو نہ ان کو نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع، وہ کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں ﴿۲﴾، آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم لوگ اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو، جس کا خود اس کو علم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، اللہ کی ذات پاک اور ان لوگوں کے شرک سے بالا و برتر ہے ﴿۱۸﴾ اور (شروع میں) تمام لوگ ایک ہی طریقے (یعنی اسلام) پر چلنے والے تھے، پھر انھوں نے اختلاف پیدا کرلیا اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے سے ایک بات مقرر نہ ہوچکی ہوتی، تو ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ ہی کردیا گیا ہوتا، جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۹﴾

﴿۱﴾ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بھی اللہ ہی کی طرف سے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ حدیث میں الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں؛ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ حدیثیں گھڑنا یا گھڑی ہوئی روایتوں کو بغیر وضاحت کے بیان کردینا جائز نہیں ہے، اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ جو احکام حدیث سے ثابت ہوں، ان کا انکار کردیا جائے۔

﴿۲﴾ کسی بھی سماج میں شرک اسی طرح دبے پاؤں داخل ہوتا ہے کہ لوگ کسی فرضی بت یا شخصیت کی یہ کہہ کر پرستش کرنے لگتے ہیں کہ اگرچہ اصل خدا تو ایک ہے؛ لیکن ان بتوں اور بزرگ شخصیتوں کے واسطہ اور سفارش ہی سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، آج بھی مسلم معاشرے میں قبروں اور آستانوں کو سجدہ کرنے والے یہی کہتے ہیں کہ یہ خدا کے اور ہمارے درمیان واسطہ اور ہمارے سفارشی ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی پہلی سورت ''سورۂ فاتحہ'' ہی میں اس تصور کی جڑ کاٹ دی اور واضح کردیا کہ عبادت براہ راست اللہ تعالیٰ کی ہے اور ہر بندہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے اپنی مرادیں مانگ سکتا ہے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ''۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ تمام انسان ابتداءً توحید پر قائم تھے، کفر و شرک کی مصیبت بعد میں آئی؛ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے حضرت نوح علیہ السلام تک جو طویل عرصہ گزرا ہے، جو بعض مفسرین کے بیان کے مطابق دس نسلوں پر مشتمل ہے، اس میں لوگ توحید پر قائم اور شرک سے محفوظ تھے، (مفاتیح الغیب: ۳۱۳/۸) اس لئے توحید ہی انسان کی فطرت ہے؛ البتہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں امتحان کے لئے غیبی حقیقتوں کو چھپائے رہیں گے اور اگر کسی قوم پر غیبی نظام کو آشکارا کردیں گے، پھر بھی وہ ایمان نہ لائے تو اس پر اجتماعی عذاب نازل کیا جائے گا اور خدا کے یہاں یہ بھی طے تھا کہ اہل مکہ پر اجتماعی عذاب نازل نہیں فرمائیں گے؛ اسی لئے ان حقیقتوں سے پردہ نہیں اُٹھایا جارہا ہے، ورنہ ان کو مطلوبہ معجزہ فراہم کردیا جاتا اور ایمان نہ لانے کی صورت میں ان پر عذاب نازل کرکے اس اختلاف کو جڑ سے ختم کردیا جاتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ
الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ ع ۲ ۷
قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿٢١﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ
عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ
الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ ان (محمد ﷺ) پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتاری گئی؟ آپ کہہ دیجئے کہ غیب کی باتیں تو اللہ ہی کو معلوم ہیں؛ لہٰذا تم بھی انتظار کرو اور تمہارے ساتھ میں بھی انتظار کرتا ہوں (۱) ﴿۲۰﴾ اور ہم جب لوگوں کو کسی مصیبت سے دوچار کرنے کے بعد کسی نعمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ ہماری نشانیوں کے بارے میں حیلے بہانے کرنے لگتے ہیں، آپ کہہ دیجئے، اللہ زیادہ تیز تدبیر کرنے والے ہیں، بے شک ہمارے فرشتے تمہاری حیلہ بازیوں کو لکھتے جارہے ہیں ﴿۲۱﴾ وہی خدا ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو، کشتیاں لوگوں کو موافق ہوا کے ساتھ لے کر چلتی رہتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوجاتے ہیں، کہ اچانک کشتیوں پر ہوا کا تیز جھونکا آجاتا ہے اور ہر طرف سے موجیں ان پر یلغار کرنے لگتی ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ سب گھیرے میں آگئے، تو اللہ ہی کے لئے بندگی کو خالص کرکے اسی سے التجا کرتے ہیں کہ اگر آپ نے ہمیں اس سے بچالیا تو ہم ضرور شکرگزار رہیں گے۔ ﴿۲۲﴾

---

(۱) قرآن مجید تو خود ایک معجزہ ہے؛ لیکن اہل مکہ کی فرمائش تھی کہ کوئی مادی معجزہ ظاہر کیا جائے، اسی کا جواب دیا گیا کہ معجزہ کا ظاہر ہونا اور نہ ہونا اللہ کے اختیار میں اور اس کی مرضی پر ہے اور ان کی یہ فرمائش پوری ہوسکے گی یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہی کو اس کا علم ہے؛ کیوں کہ غیب کی باتوں اور مستقبل کی خبروں سے صرف اللہ ہی واقف ہیں، اللہ کے پیغمبر بھی واقف نہیں ہیں —— ویسے ان کے فرمائشی معجزات کے پورے نہ ہونے کی مصلحت قرآن نے دوسرے موقع پر ذکر کی ہے کہ گزشتہ قوموں کا تجربہ یہ ہے کہ ہٹ دھرم لوگ معجزہ کے آنے کے باوجود ایمان نہیں لاتے اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب کسی قوم کو ان کی فرمائش کے مطابق معجزہ دے دیا جاتا ہے، پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے ہیں تو پوری قوم کا نام ونشان مٹادیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی قوم مکمل طور پر تباہ کردی جائے؛ کیوں کہ اسی کی نسلوں کے ذریعے پوری دنیا تک اسلام کے پیغام کو پہنچنا ہے۔

فَلَمَّآ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡيُكُمۡ عَلٰٓى
اَنۡفُسِكُمۡ ۙ مَّتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۫ ثُمَّ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُكُمۡ فَنُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾
اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا يَاۡكُلُ
النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّيَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ
عَلَيۡهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى
صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۵﴾

پھر جب اللہ ان کو نجات عطا کر دیتے ہیں تو وہ فوراً ہی زمین میں ناحق کی سرکشی کرنے لگتے ہیں، اے لوگو! تم لوگوں کا یہ سرکشی کرنا تمہارے ہی لئے وبال ہے، دنیا کی (چند روزہ) زندگی سے فائدہ اُٹھالو، پھر تم سب کو ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تب ہم تم کو تمہارے سارے کرتوت بتادیں گے ﴿۱﴾ ﴿۲۳﴾ بے شک دنیوی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے، جس کو ہم نے آسمان سے اُتارا، پھر اس سے زمین کے پودے گھنے ہو کر نکل آئے، جس میں سے انسان بھی کھاتے ہیں اور جانور بھی، یہاں تک کہ جب کھیتی اپنی بہار پر آ گئی، خوب سنور گئی، اور زمین والوں کو خیال ہوا کہ اب تو یہ ان کے قابو میں ہے، اچانک دن یا رات میں ہمارا حکم آ پہنچا اور ہم نے اس کو ایسا کٹا ہوا ڈھیر بنا دیا کہ گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں، اسی طرح ہم سوچنے سمجھنے والوں کے لئے نشانیوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾
اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتے ہیں، اور جس کو چاہتے ہیں سیدھے راستہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۵﴾

﴿۱﴾ انسان کا عام مزاج یہ ہے کہ مصیبت کے وقت اس کا دل قبولیت کی طرف مائل ہوتا ہے اور جب دولت آتی ہے، راحت و آرام کے نقشے سج جاتے ہیں، تو کبر و غرور کا نشہ چڑھتا ہے اور وہ اپنے محسنوں کو پہنچانا بھی چھوڑ دیتا ہے، حد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بھی احسان ناشناس بن جاتا ہے، قرآن مجید میں بار بار اس مضمون کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں تنبیہ ہے کہ عیش و عشرت کے سامان کی زیادتی انسان کو غفلت میں ڈال دیتی ہے؛ اس لئے جب اللہ تعالیٰ راحت و آسائش کے دروازے کھول دیں، تو اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ کہیں وہ اسی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہو رہا ہے؟

﴿۲﴾ اس میں ایک مثال کے ذریعے انسان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ لگی لگائی کھیتی کو لمحوں میں بھونسوں کا ڈھیر بنا سکتے ہیں؛ اسی طرح تمہارے عیش و عشرت کے نقشے پلک جھپکتے تہ و بالا کئے جا سکتے ہیں؛ اس لئے کبھی بھی خدا کو بھولنا نہ چاہئے کہ انسان جو کچھ برائی کرتا ہے، اس کا وبال بالآخر اسی کے اوپر آتا ہے۔

﴿۳﴾ جنت ایسی جگہ ہے، جہاں انسان کو نہ کوئی غم ہوگا، نہ کسی چیز کا خوف، نہ بیماری، نہ زندگی سے محروم ہونے کا اندیشہ، نہ نعمتوں کے ختم ہو جانے کا خطرہ، غرض کہ یہ ہر طرح کی مصیبت، غم اور خطرات سے حفاظت و سلامتی کی جگہ ہے؛ اسی لئے اس کو "دار السلام" (سلامتی کی جگہ) کا نام دیا گیا ہے۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ ؕ وَ لَا یَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَ تَرْهَقُهُمْ
ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَاۤ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ؕ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ یَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ
اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَ شُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا
تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۲۹﴾

جن لوگوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے بھلائی اور مزید فضل خداوندی ہے،﴿۱﴾ ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائی ہوئی ہوگی اور نہ رسوائی، یہی ہیں جنتی لوگ، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے ﴿۲۶﴾ اور جن لوگوں نے برے عمل کئے ہیں، ان کو برائی کا اُسی جیسا بدلہ ملے گا اور ذلت و رسوائی اُن پر چھائی رہے گی، انھیں کوئی اللہ سے بچانے والا نہیں ہوگا، گویا ان کے چہروں پر اندھیری رات کے ٹکڑے لپیٹ دیئے گئے ہوں ﴿۲۷﴾ اور جس دن ہم ان سبھوں کو جمع کریں گے، پھر ہم شرک کرنے والوں سے کہیں گے: تم اور تمہارے بنائے ہوئے شرکاء اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوجاؤ، پھر ہم ان کے درمیان آپس میں اختلاف پیدا کردیں گے، ان کے شرکاء کہیں گے: تم ہماری بندگی تو کرتے نہیں تھے؟ ﴿۲۸﴾ ہمارے تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے، ہمیں تو تمہاری بندگی کرنے کی خبر تک نہیں تھی۔ ﴿۲۹﴾

﴿۱﴾ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل کردیئے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: کیا تم کوئی اور نعمت بھی چاہتے ہو، جو میں عطا کروں؟ اہل جنت عرض کریں گے: آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات عطا فرمائی، جنت میں داخل فرمایا، ہمارے چہروں کے رنگ بھی گورے ہوگئے، یعنی جس نعمت کا دنیا میں اپنی خواہش کے مطابق ملنا ممکن نہیں تھا، وہ نعمت بھی مل گئی، اِس کے بعد مزید کیا نعمت چاہیئے؟ اب اللہ تعالیٰ اپنے رُخِ مبارک سے حجاب اُٹھائیں گے، جب لوگ اپنی آنکھوں سے اللہ کا دیدار کریں گے تو اب تک جو نعمت ملی تھی، وہ سب اس کے مقابلے میں ہیچ محسوس ہوگی، وہ کہیں گے: اس سے زیادہ نظر کو بھانے اور آنکھوں کو ٹھنڈی کرنے والی چیز دیکھی ہی نہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: ''للذین أحسنوا الحسنی وزیادة''، یعنی ''زیادہ'' سے مراد یہی دیدار الٰہی ہے، (مسلم: کتاب الایمان، باب اثبات رؤیة المومنین، حدیث نمبر: ۴٦۸) —— اسی مضمون کی روایت امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے، (ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ یونس، حدیث نمبر: ۳۱۰۵) یہی تفسیر حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت حذیفہ، حضرت عُبادہ بن صامت، حضرت کعب ابن عُجرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳۳۰/۸)

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
ع ۳/۸ يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ النصف
يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ
فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى
تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

وہاں ہر شخص اپنے کئے ہوئے کاموں کو جانچ لے گا ﴿۱﴾، اور یہ سب اللہ کی طرف — جو ان کا حقیقی مالک ہے — لوٹا دیئے جائیں گے، اور انھوں نے جو جھوٹے معبود تراش رکھے تھے، وہ سب ان سے غائب ہو جائیں گے ﴿۲﴾ ﴿۳۰﴾ آپ دریافت کیجئے: تم کو آسمان وزمین سے کون روزی عطا کرتا ہے؟ یا کون کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ کون ہے جو بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے؟ اور کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟؟ تو وہ ضرور کہیں گے: ''اللہ'' تو آپ کہئے: پھر بھی تم (اللہ کے ساتھ شرک سے) بچتے نہیں ہو؟ ﴿۳۱﴾ پس یہی اللہ ہیں، جو تمہارے حقیقی پروردگار ہیں، پھر حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کیا رہ جاتا ہے ﴿۳﴾ تو آخر تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو؟ ﴿۴﴾ ﴿۳۲﴾

﴿۱﴾ یعنی کفار و مشرکین اور جو لوگ ان کے رہنما تھے، دونوں اپنے اپنے عمل کی حقیقت جان لیں گے اور ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ وہ غلطی پر تھے۔

﴿۲﴾ مصیبت کے وقت اگر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہوں تو غم ہلکا ہو جاتا ہے؛ لیکن آخرت میں مشرکین کے لئے ذہنی تکلیف کا ایک سامان یہ بھی ہوگا کہ وہاں لوگ ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں گے، یہاں تک کہ زندگی بھر جن باطل معبودوں کی پرستش کی تھی، وہ بھی انھیں پہچاننے سے انکار کر جائیں گے۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حق کے بعد گمراہی کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، اس آیت کی روشنی میں علماء نے لکھا ہے کہ عقیدۂ توحید اور بنیادی عقائد کے باب میں جو بات حق ہوگی، اس کے مقابلے میں یقینی طور پر دوسری بات باطل ہوگی، اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں؛ البتہ فروعی مسائل کی نوعیت اس سے مختلف ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے؛ لیکن ان کے درمیان کچھ چیزیں مشتبہ ہیں، (مسلم، کتاب المساقات، باب أخذ الحلال وترک الشبهات، حدیث نمبر: ۴۱۷۸) اس لئے ایسے مسائل میں اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے اور ان کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بنیادی طور پر دونوں نقطۂ نظر کے حاملین حق پر ہیں۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۳۳۶/۸)

﴿۴﴾ ''فانی تصرفون'' کی وضاحت علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے کی ہے: ''فکیف تنقلبون وتنصرفون عن الحق الی الباطل'' اسی کی روشنی میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيۡنَ فَسَقُوۡۤا اَنَّهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ قُلۡ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآٮِٕكُمۡ
مَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۳۴﴾ قُلۡ
هَلۡ مِنۡ شُرَكَآٮِٕكُمۡ مَّنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهۡدِىۡ لِلۡحَـقِّ ؕ اَفَمَنۡ يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الۡحَـقِّ
اَحَقُّ اَنۡ يُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا يَهِدِّىۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّهۡدٰى ۚ فَمَا لَـكُمۡ ۟ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ
اَكۡثَرُهُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغۡنِىۡ مِنَ الۡحَـقِّ شَيۡـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۳۶﴾

اسی طرح آپ کے پروردگار کی یہ بات کہ ’’وہ ایمان نہیں لائیں گے‘‘ نافرمانی کرنے والوں سے متعلق ثابت ہوچکی ہے ﴿۳۳﴾ آپ دریافت کیجئے: تم جن کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان میں سے کوئی ہے جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرے، پھر اسے دوبارہ زندہ کرے؟ آپ کہہ دیجئے: اللہ ہی مخلوق کو پہلی بار بھی پیدا فرماتے ہیں، پھر اسے دوبارہ بھی زندہ فرمائیں گے، تو تم کہاں پلٹے جارہے ہو؟ ﴿۳۴﴾ آپ پوچھئے: تم جنھیں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان میں سے کوئی ہے جو حق کا راستہ بتاسکے؟ آپ فرمادیجئے: اللہ ہی راہِ حق بتاتے ہیں، تو جو ذات حق کا راستہ بتاتی ہو، وہ زیادہ قابل پیروی ہے یا وہ ذات جو بتائے بغیر خود بھی راستہ نہ پاسکے، تو آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ تم کس طرح فیصلے کرتے ہو؟ ؟﴿۱﴾ ﴿۳۵﴾ تم میں سے اکثر لوگ محض بے بنیاد گمان کی پیروی کررہے ہیں، یقیناً ایسا گمان حق کو جاننے کے سلسلہ میں ذرا بھی فائدہ مند نہیں، وہ جو کچھ کررہے ہیں، یقیناً اللہ کو ان سب کی خبر ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۶﴾

﴿۱﴾ انسان کی سب سے بڑی ضرورت زندگی ہے، اور زندگی حاصل ہونے کے بعد سب سے بڑی حاجت ہدایت ہے کہ انسان اپنے رب کو پہچانے اور اس کے احکام پر عمل کرے، ان میں سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور دوسری چیز اللہ تعالیٰ کی توفیق پر مبنی ہے، جب یہ دونوں ضرورتیں اللہ ہی پوری کرتے ہیں تو پھر اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق کیسے ہوسکتا ہے؟ اس بات کو واضح کرتے ہوئے شرک سے بچنے کی تلقین کی جارہی ہے —— یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ معبودانِ باطل کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا؛ لیکن ان کے نام نہیں لئے گئے؛ کیوں کہ دعوتِ دین میں اس حکمت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مخاطب میں ضد پیدا نہ ہوجائے؛ اس لئے بعض دفعہ لوگ جن پیشواؤں کی پوجا کرتے ہیں اور جن شخصیتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں، اگر متعین طور پر ان سے روکا جائے تو ضد پیدا ہوجاتی ہے۔

﴿۲﴾ یہاں ایسے گمان کی پیروی سے منع کیا گیا ہے، جس کے لئے کوئی بنیاد و دلیل موجود نہ ہو، جس گمان کے لئے کوئی دلیل موجود ہو، وہ اس میں داخل نہیں ہے، جیسا کہ فقہاء بعض مسائل میں ’’قیاس‘‘ کے ذریعہ احکام مستنبط کرتے ہیں، قیاس کو ’’دلیل ظنی‘‘ کہا جاتا ہے، مگر اس کی بنیاد ایک ایسے غالب گمان پر ہوتی ہے، جس کے پیچھے دلیل بھی ہوتی ہے؛ لہٰذا قیاس پر عمل کرنا بے بنیاد گمان کی پیروی میں داخل نہیں ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۸/۳۵۷)

وَ مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

یہ قرآن اللہ کے سوا کسی کا اپنے طور پر بنایا ہوا نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو گذشتہ کتابوں کی تصدیق اور ان کی وضاحت کرتا ہے، ﴿۱﴾ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام عالم کے پروردگار کی طرف سے ہے ﴿۳۷﴾ کیا لوگ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے اسے گھڑ لیا ہے؟ آپ کہئے: اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا تم جن کو (مدد کے لئے) بلا سکو، انھیں بھی بلا لو۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۸﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک جو کتابیں آئی ہیں، ان کی بنیادی تعلیم توحید، رسالت، آخرت وغیرہ میں کوئی فرق نہیں؛ اس لئے قرآن ان ہی تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، اگر قرآن اللہ کی بجائے کسی انسان کی تصنیف ہوتی تو قرآن اور گزشتہ آسمانی کتابوں کے درمیان اس درجہ یکسانیت نہیں پائی جاتی؛ کیوں کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان سوچ اور ذوق و مزاج میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے اور اس فرق کی وجہ سے ان کے خیالات میں بھی بکثرت فرق واقع ہوتا رہتا ہے، پس معلوم ہوا کہ قرآن مجید اور گزشتہ آسمانی کتابوں کا سرچشمہ ایک ہی ذات ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات — اس آیت میں دوسرا لفظ ہے ''تفصیل الکتاب'' یہاں کتاب سے یا تو قرآن مجید میں لکھے ہوئے احکام مراد ہیں اور اسی کے مطابق اکثر مترجمین نے ترجمہ کیا ہے، یا کتاب سے پچھلی آسمانی کتابیں ہی مراد ہیں، یعنی قرآن مجید گزشتہ کتابوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان کی وضاحت بھی کرتا ہے، مشہور مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے دونوں تفسیریں ذکر کی ہیں اور غالباً ان کا رجحان اسی دوسری تفسیر کی طرف ہے، جس کے مطابق یہاں ترجمہ کیا گیا ہے؛ کیوں کہ پہلی تفسیر کو انھوں نے ''قیل'' کے لفظ سے ذکر کیا ہے جو عام طور پر کسی رائے کے کمزور سمجھے جانے کا اشارہ ہوتا ہے: ''والتفصیل التبیین أی یبین ما فی کتاب اللہ المتقدم والکتاب اسم الجنس وقیل: أراد بتفصیل الکتاب مابین فی القران من الأحکام'' (قرطبی: ۸/۳۴۴) — گزشتہ کتابوں کی وضاحت سے مراد یہ ہے کہ گزشتہ کتابوں میں ایمان و عمل سے متعلق جو تعلیمات ذکر کی گئی ہیں، ان میں ملاوٹ بھی پیدا کردی گئی ہے، ان میں سے بعض منسوخ بھی ہوگئے ہیں اور بعض احکام باقی ہیں، قرآن مجید ان کی وضاحت کرتا ہے۔

﴿۲﴾ جو لوگ پیغمبر اسلام ﷺ پر اعتراض کرتے تھے کہ انھوں نے اپنے طور پر قرآن مجید کو گھڑ لیا ہے، ان دونوں آیتوں میں ان کا جواب دیا گیا ہے، پہلا جواب یہ ہے کہ محمد ﷺ نے نہ کسی استاذ سے باضابطہ علم حاصل کیا، نہ علماء اہل کتاب سے آپ کا کوئی ربط و تعلق ہوا، نہ آپ ان علاقوں میں گئے جہاں یہود و نصاریٰ کی آبادیاں تھیں، کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا، جس کے ذریعے آپ گزشتہ پیغمبروں کی تعلیمات اور سابقہ الہامی کتابوں کے مضامین سے واقف ہوتے؛ لیکن قرآن مجید میں کثرت سے گذشتہ انبیاء کے واقعات اور آسمانی کتابوں کی تعلیمات پیش کی گئی ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب علم کا ایک ہی سرچشمہ ہو، جس سے گزشتہ آسمانی کتابیں بھی سیراب ہوئی ہوں اور اسی سرچشمہ سے قرآن مجید میں آنے والی معلومات بھی ماخوذ ہوں، اور وہ سرچشمہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات، دوسرے: محمد ﷺ مکہ ہی میں پیدا ہوئے، نبوت کا دعویٰ کرنے سے پہلے ان کو علم و حکمت اور زبان و بیان کے ←

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ
وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ ع ۴ / ۹
مِمَّآ اَعْمَلُ وَ اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ
الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس بات کو وہ سمجھ نہیں پائے اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے آئی ہی نہیں ہے، وہ اس کو جھٹلا رہے ہیں ﴿۱﴾ اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا تو آپ دیکھ لیجئے کہ ان زیادتی کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۳۹﴾ ان میں بعض وہ ہیں جو قرآن پر ایمان لے آئیں گے اور بعض وہ ہیں جو اس سے محروم ہی رہیں گے اور آپ کے پروردگار بگاڑ پیدا کرنے والوں کو خوب جانتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۴۰﴾ اگر وہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجئے: میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل، تم پر میرے عمل کی اور مجھ پر تمہارے عمل کی ذمہ داری نہیں ﴿۳﴾ ﴿۴۱﴾ ان میں سے بعض آپ کی طرف کان لگا لگا کر سنتے ہیں؛ لیکن کیا آپ بہروں کو سنا سکیں گے؛ گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو؟ ﴿۴۲﴾

← اعتبار سے کوئی امتیازی شان حاصل نہیں تھی، اب انھوں نے ایک ایسا کلام پیش کیا ہے اور اس کی خدا کی طرف نسبت کی ہے، جو زبان و بیان کی رعنائی، معنویت، علم و حکمت، تاریخ بیانی اور مستقبل کی درست پیشین گوئی ہر جہت سے ایک بے مثال کلام ہے کہ تم لوگ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہو، یہ خود اِس کلام کے برحق ہونے کی دلیل ہے، اگر یہ انسانی کاوش کا نتیجہ ہوتا، تو جیسے انسان کی دوسری صلاحیتوں میں تم محمد ﷺ کا مقابلہ کر سکتے ہو، اس میں بھی مقابلہ کرنے پر قادر ہوتے۔

﴿۱﴾ یعنی کسی بات کو جھٹلانا دو صورتوں میں درست ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ جھٹلانے والے کو اس بات کا پورا علم ہو؛ حالاں کہ یہاں ایسا نہیں ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قرآن مجید کے تصنیف کر لینے کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ معترضین کہہ سکیں کہ ہمیں اس کا علم ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ جو بات کہی گئی ہو، واقعات و احوال کے ذریعے معلوم ہو جائے کہ یہ بات نادرست اور خلافِ واقعہ ہے، جیسے قرآن نے جنت و دوزخ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، تو ایسا نہیں ہے کہ ان باتوں کا غلط ہونا واقعاتی طور پر ثابت ہو گیا ہو؛ کیوں کہ ابھی اس کا وقت ہی نہیں آیا ہے ''ولما یاتھم تأویلہ'' کا ایک مطلب یہی ہے، دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ قرآن کو جھٹلانے پر دنیا ہی میں جو عذاب آنے والا ہے، وہ ابھی ان کے سامنے نہیں آیا ہے؛ اس لئے وہ اسے جھٹلا رہے ہیں؛ حالاں کہ کسی بات کے پیش آنے میں تاخیر اس کے مستقبل میں واقع نہیں ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ (تفسیر قرطبی: ۸/۳۴۵)

﴿۲﴾ یعنی اس وقت جو لوگ آپ کے مخاطب ہیں، آپ نا اُمید نہ ہوں کہ یہ سب کے سب کفر و انکار ہی پر قائم رہیں گے؛ بلکہ ان میں ایک گروہ کو ایمان کی توفیق ہوگی اور ایک گروہ اپنی ہٹ دھرمی اور ذہنی بگاڑ کی وجہ سے ایمان نہیں لائے گا۔

﴿۳﴾ مطلب یہ ہے کہ آپ تو دین کی طرف بلاتے رہے، اس کے باوجود جو لوگ ہٹ دھرمی اور کج بحثی سے کام لے رہے ہیں، ان کے ساتھ اُلجھنا اور خواہ مخواہ بحث و مباحثہ کرنا اپنی صلاحیت کو ضائع کرنا ہے؛ اس لئے انھیں یہ کہنے پر اکتفا کیا جائے کہ تم اپنی مرضی کا عمل کرتے رہو اور اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ
النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۴۴ وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً
مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۴۵ وَ اِمَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝۴۶

اُن میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھا کرتے ہیں؛ لیکن کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکیں گے؛ گو ان کو سوجھ بوجھ بھی نہ ہو؟ ۝۴۳ بے شک اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں فرماتے؛ لیکن لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ﴿۱﴾ ۝۴۴ اور جس دن اللہ ان کو جمع کریں گے (تو انھیں محسوس ہوگا) کہ گویا محض دن کی ایک گھڑی وہ (برزخ میں) رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کو پہنچانتے بھی ہوں گے، ﴿۲﴾ واقعی وہ لوگ بڑے نقصان میں پڑ گئے، جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہدایت سے محروم رہے ۝۴۵ ہم ان سے جن باتوں کا وعدہ کر رہے ہیں، ان میں سے کچھ ہم آپ کو دکھا دیں، یا ہم آپ کو وفات دے دیں، ان سب کو تو ہماری طرف لوٹنا ہی ہے، پھر جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ تو اس پر گواہ ہیں ہی۔ ﴿۳﴾ ۝۴۶

﴿۱﴾ یعنی مشرکین گو آپ کی باتوں کو سنتے ہیں؛ لیکن ان کے دل و دماغ کے کان بند ہیں، وہ نصیحت حاصل کرنے کے جذبہ سے نہیں سنتے، اس لئے سننے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اسی طرح وہ سر کی آنکھوں سے آپ کو دیکھتے ہیں؛ لیکن دل کی آنکھیں بند ہیں،، یا کم سے کم بصیرت اور سوجھ بوجھ کے حامل ہوتے تو ان کو راستہ بتایا جا سکتا تھا، مگر وہ اس سے بھی محروم ہیں، اس دعوتِ دین کا ان پر اثر نہیں ہوتا، اور ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم کیا ہے؛ بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے توفیقی اور محرومی کا شکار بنے ہوئے ہیں۔

﴿۲﴾ یہ بات کہ قیامت میں دوبارہ زندہ کئے جانے کے بعد انھیں محسوس ہوگا کہ انھوں نے محض ایک دن کا کچھ وقت گزارا ہے، اس سے قبر و برزخ کی زندگی بھی مراد ہو سکتی ہے اور اس کا تجربہ تو انسان کو اس دنیا میں بھی ہوتا رہتا ہے کہ بعض دفعہ انسان لمبی نیند لے کر اُٹھتا ہے اور اُٹھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر پہلے سویا تھا، ایسی صورت میں ''یتعارفون بینھم'' کا تعلق میدان حشر سے ہوگا کہ وہ وہاں ایک دوسرے کو پہچان بھی رہے ہوں گے، انسان ایک دوسرے کو پہچانے؛ لیکن قریب ترین رشتہ داری اور تعلق کے باوجود ایک دوسرے کے کام نہ آ سکے اور ایک دوسرے کو بچا نہ سکے تو بے چارگی اور بے سہارگی کی یہ کیفیت تکلیف میں اضافہ کر دیتی ہے —— دوسری صورت یہ ہے کہ ''یوم یحشرھم کأن لم یلبثوا الاساعۃ من نہار'' (گویا محض دن کی ایک گھڑی وہ رہے) کا تعلق اسی دنیا سے ہے، یعنی آخرت کی طویل نہ ختم ہونے والی زندگی کے مقابلے لوگ دنیا کی زندگی کو دن کے ایک لمحہ کا قیام محسوس کریں گے، جو انھیں ایک دوسرے سے جان پہچان اور تعارف کے لئے عطا کی گئی تھی، یہ دوسری تفسیر حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/ ۳۴۷)

﴿۳﴾ یعنی ایمان نہ لانے پر اللہ کی طرف سے انھیں جس عذاب کی دھمکی دی جا رہی ہے، اور اسلام کے غلبہ کا وعدہ کیا جا رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کا ایک حصہ آپ کی زندگی میں سامنے آجائے اور آپ سر کی آنکھوں سے اس کو دیکھ لیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ←

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا
شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

ہر اُمت کے لئے ایک پیغمبر (آیا کئے) ہیں، پھر جب ان کے رسول آجاتے تھے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کردیا جاتا تھا اور ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاتی رہی ہے ﴿۱﴾ ﴿۴۷﴾ اور وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ ﴿۴۸﴾ آپ فرما دیجئے: میں تو اپنے لئے بھی کسی نقصان یا نفع کا اختیار نہیں رکھتا، سوائے اس کے جو اللہ کو منظور ہو، ہر گروہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا مقررہ وقت آپہنچے گا تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے ﴿۲﴾ ﴿۴۹﴾ آپ کہئے: تمہارا کیا خیال ہے اگر اللہ کا عذاب تمہارے اوپر رات یا دن کو آجائے (تو تم کیا کرلو گے؟ عذاب) کون ایسی (بہتر) چیز ہے کہ جس کے لئے مجرمین جلد بازی کر رہے ہیں؟ ﴿۵۰﴾

← کی وفات ہوجائے، اس کے بعد ان پر اللہ کا عذاب آئے، نیز اگر دنیا میں ان کو مہلت دے بھی دی گئی تو ان کو مرنے کے بعد بہر حال اللہ ہی کی طرف جانا ہے اور اصل سزا کی جگہ تو آخرت ہی ہے، اور انھیں سزا دیئے جانے کے لئے کسی خبر اور گواہی کی بھی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ اللہ خود ان کی حرکتوں پر گواہ ہیں، غرض کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا دینے میں اور اسلام کے غالب ہونے میں تاخیر تو ہوسکتی ہے اور مجرموں کو مہلت تو مل سکتی ہے؛ لیکن وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے اور اسلام کے غلبہ کو روک نہیں سکتے؛ چنانچہ غزوۂ بدر اور فتح مکہ کی شکل میں اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والوں کی سزا بھی ہوئی، ان کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اور اسلام کو پورے جزیرۃ العرب میں غلبہ بھی حاصل ہوگیا، نیز آپ کی وفات کے بعد ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ایشیا، یورپ اور افریقہ میں دور دور تک اسلام کی روشنی پہنچ گئی۔

﴿۱﴾ یوں تو انسان کو کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ کر اور اپنی فطرت کی آواز کو سن کر توحید کا اقرار کرنا اور شرک سے بچنا چاہئے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے انصاف اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی رحمت کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اپنی سنت یہ رکھی ہے کہ جب تک کسی قوم میں اپنا رسول نہ بھیج دیں، جو لوگوں کو اچھی طرح حق اور باطل کا فرق سمجھا دے، اس وقت تک گمراہوں کے لئے اپنے عذاب کا فیصلہ نہیں فرماتے، رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوچکا اور نبوت کا کام یعنی دعوتِ دین کی ذمہ داری اُمت محمدیہ کو سونپ دی گئی؛ اس لئے اب اس اُمت کا فریضہ ہے کہ وہ انسانیت تک دینِ حق کی دعوت کو پہنچائے۔

﴿۲﴾ یہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے صاف صاف اعلان کرادیا کہ میں نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، یعنی اگرچہ آپ تمام مخلوقات میں افضل ہیں؛ لیکن آپ بھی کائنات میں مختار نہیں ہیں کہ جس کو جو چاہیں عطا فرمادیں، افسوس ان لوگوں پر ہے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اس کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ کو ''مختارِ کل'' کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ کی روشنی میں وہ خود اپنا جائزہ لیں، وباللہ التوفیق۔

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا
ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۖ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ وقف النبی ﷺ
قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ
لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُونَ ﴿٥٤﴾ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا
يَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٥٦﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ
رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۙ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾

وقف النبی ﷺ　ع ۵ ۱۳/۱۰

کیا جب عذاب آجائے گا تب اس کا یقین کروگے؟ (اس وقت تم سے کہا جائے گا) تم نے اب جا کر تسلیم کیا اور تم اسی کے لئے جلدی مچا رہے تھے؟ ﴿۵۱﴾ پھر گناہ کرنے والوں سے کہا جائے گا: ہمیشہ کا عذاب چکھتے رہو، تم کو تمہارے ہی کئے کا بدلہ دیا جا رہا ہے ﴿۱﴾ ﴿۵۲﴾ اور وہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا یہ بات سچ ہے؟ آپ کہہ دیجئے: ہاں، میرے پروردگار کی قسم! یقیناً یہ سچ ہے اور تم (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ﴿۵۳﴾ اگر ہر گنہگار شخص کو وہ تمام چیزیں میسر ہو جائیں، جو زمین میں ہیں، تب بھی وہ اس کو دے کر اپنی جان بچانا چاہے گا، وہ جب عذاب دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے ﴿۲﴾ اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، نیز ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی ﴿۵۴﴾ آگاہ ہو جاؤ کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اللہ ہی کا ہے، سن لو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے؛ لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں ﴿۵۵﴾ اللہ ہی جان ڈالتے ہیں اور جان نکالتے ہیں اور اللہ ہی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے ﴿۵۶﴾ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت اور دلوں کی بیماری کا علاج آچکا ہے اور وہ ہدایت کا ذریعہ اور مسلمانوں کے لئے رحمت کا باعث ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۵۷﴾

﴿۱﴾ یعنی جب قیامت کی ہولناکیاں سامنے آجائیں گی، حشر کے میدان میں تمام لوگ جمع کر دیئے جائیں گے تو اس وقت جو لوگ آخرت کا انکار کرتے تھے، ان کے لئے بھی تسلیم واقرار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوگا؛ لیکن اس وقت کا تسلیم کرنا کچھ کام نہیں آئے گا؛ کیوں کہ انسان سے مطلوب ہے غیب پر ایمان لانا، اور اب آخرت کے نظام سے غیب کا پردہ ہٹ چکا ہوگا اور وہ انسان کے مشاہدہ میں ہوگا۔

﴿۲﴾ مصیبت کے وقت جو لوگ لیڈر قسم کے ہوتے ہیں، وہ اپنی شوکت وجاہ کو بچانے کے لئے شرمندگی کو چھپاتے اور رونے دھونے سے بچتے ہیں، میدانِ حشر میں کفار ومشرکین کے سردار ابتداءً ایسا ہی کرنے کی کوشش کریں گے؛ لیکن جب عذاب شروع ہو جائے گا تو پھر آہ وواویلا کرنے لگیں گے، جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں صراحت کی گئی ہے۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ نے یہاں قرآن مجید کی چار صفات بیان کی ہیں، اول: یہ کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے نصیحت ہے، ←

قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَ بِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّاۤ
اَنۡزَلَ اللّٰہُ لَکُمۡ مِّنۡ رِّزۡقٍ فَجَعَلۡتُمۡ مِّنۡہُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلۡ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمۡ اَمۡ عَلَی اللّٰہِ
تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۹﴾

آپ کہہ دیں کہ اللہ کی مہربانی اور اس کی رحمت پر انھیں خوش ہونا چاہئے ، یہ ان چیزوں سے بہت بہتر ہے ، جن کو وہ لوگ جمع کر رہے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۵۸﴾ آپ فرما دیجئے : بتلاؤ تو سہی ، تمہارے لئے رزق تو اللہ نے اُتارا ہے ، پھر تم نے اس میں (اپنے طور پر) کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال ٹھہرا لیا ہے ، آپ دریافت فرمائیے کہ کیا اللہ نے تمھیں اس کی اجازت دی تھی یا تم اللہ پر جھوٹ گھڑ رہے ہو؟ ﴿۵۹﴾

← یعنی اس میں نصیحت و اصلاح کی باتیں ہیں اور اس انداز پر پیش کی گئی ہیں کہ اس سے تمہارے دل نرم پڑ جاتے ہیں ، دوسرے : یہ دل کے لئے شفا ہے ، یعنی دل میں شکوک وشبہات کے جو کانٹے غلط فہمیوں کی وجہ سے چبھتے ہیں یا پروپیگنڈہ کے ذریعے چبھائے جاتے ہیں ، قرآن مجید انھیں نکال دیتا ہے ، تیسرے : یہ ہادی و رہنما ہے ، زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کو صحیح طرزِ عمل ، درست رویہ اور دنیا و آخرت کے لئے مفید طریقۂ زندگی کی رہنمائی کرتا ہے ، چوتھے : یہ رحمت اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے ، قرآن مجید کی برکت سے اس اُمت کو ''خیر اُمت'' کا درجہ حاصل ہوا ہے اور قرآن کو پوری انسانیت تک پہنچانا اس اُمت کی ذمہ داری ہے ؛ اس لئے یہ اُمت اب قیامت تک کے لئے انبیاء کے مقام پر ہے ، نیز چوں کہ قرآن مجید آخری کتاب ہے ، اس کے بعد کوئی کتاب آنے والی نہیں ہے ، اس لئے یہ اُمت اجتماعی عذاب سے محفوظ ہے ، یہ ساری رحمتیں اور نعمتیں یقیناً قرآن مجید کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں ؛ لیکن جیسے بارش ہر زمین پر ہوتی ہے مگر اس کا نفع زمین کے اسی ٹکڑے کو پہنچتا ہے ، جس میں بارآور ہونے کی صلاحیت بھی ہو ، اسی طرح قرآن مجید کی ان صفات سے وہی لوگ فیض پاتے ہیں ، جو قرآن پر ایمان بھی رکھتے ہیں ؛ اسی لئے قرآن کی ان صفات کو بیان کرنے کے بعد اخیر میں فرمایا گیا : ''للمؤمنین'' یعنی اہل ایمان ہی اس سے فیض اُٹھائیں گے ۔

﴿۱﴾ یہاں دو الفاظ کہے گئے ہیں : 'فضل اللہ' یعنی اللہ کا فضل اور 'رحمۃ' یعنی اللہ کی رحمت ، بعض نے ان دونوں سے ایک ہی معنی مراد لیا ہے ، یعنی قرآن مجید —— اور بعض نے دونوں سے الگ الگ معنی مراد لئے ہیں ؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فضل سے قرآن مجید اور رحمت سے اسلام مراد ہے ، ان ہی دونوں سے یہ بھی منقول ہے کہ فضل سے قرآن اور رحمت سے مسلمانوں کو ایمان کی توفیق میسر آنا مراد ہے ، حسن بصری رحمہ اللہ اور کچھ اور بزرگوں سے منقول ہے کہ فضل سے مراد ایمان ہے اور رحمت سے مراد قرآن ، (تفسیر قرطبی : ۸/ ۳۸۳ ، نیز دیکھئے : مفاتیح الغیب : ۸/ ۳۹۱) مشہور مفسر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فضل سے ہدایت اور رحمت سے دینِ حق مراد لیا ہے ، (تفسیر ابن کثیر : ۲/ ۴۲۱) سب کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی جمع کی ہوئی دولتِ دنیا پر ریجھنا نہیں چاہئے کہ یہ تو متاعِ فانی ہے ، اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن مجید اور ایمان کی جس نعمت سے نوازا ہے ، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے —— عام طور پر مفسرین نے فضل اور رحمت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراد ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے ؛ لیکن اگر اس سے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مراد لیا جائے ، تو اس کی بھی پوری گنجائش ہے ؛ کیوں کہ قرآن میں نبوت محمدی کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے : ''ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ'' (آل عمران : ۷۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے : ←

وَ مَا ظَنُّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۶۰﴾ ع ۶ / ۱۱

جولوگ اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کررہے ہیں، قیامت کے دن کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ کوئی شک نہیں کہ انسانوں پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے؛ لیکن اکثر لوگ ناقدری کیا کرتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۶۰﴾

← ''وَمَا أَرۡسَلۡنَاکَ إِلاَّ رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِیۡنَ'' (الحج:۱۰۷) اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کو قرآن اور حامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ سے نسبت پر خوش ہونا چاہئے تو یہ ایک برمحل بات ہوگی؛ لیکن خوش ہونا اور بات ہے اور خوشی منانا اور بات ہے، فرحت کے معنی خوش ہونے کے ہیں اور اسی سے ''فلیفرِحوا'' ماخوذ ہے، تفریح کے معنی خوش کرنے کے ہیں، اس میں ایک حد تک خوشی منانے کا مفہوم پایا جاتا ہے، اگر قرآن مجید میں خوشی منانے کا حکم دیا گیا ہوتا تو کہا جاتا ''فلیفرّحوا'' افسوس کہ آج کل لوگ رسول اللہ ﷺ کے یوم پیدائش کے موقع پر گانا بجانا کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، آتش بازیاں کی جاتی ہیں، روشنیاں اور قمقمے جلا کر فضول خرچی کی جاتی ہے اور بہت سے غیر شرعی اُمور کئے جاتے ہیں اور استدلال اس آیت سے کیا جاتا ہے، جس کا غلط ہونا ظاہر ہے، پھر شریعت میں خوشی کے اظہار کا طریقہ بھی متعین ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور اُسوۂ محمدی کو اپنے زندگی میں لانے کا بھرپور عزم کیا جائے، حد یہ ہے کہ بعض لوگوں نے ۱۲/ربیع الاول کو ''عید'' کا نام دے دیا ہے اور بعض مقامات پر خطبہ بھی دیا جارہا ہے اور دو رکعت نماز بھی پڑھی جارہی ہے؛ حالاں کہ جب بعض صحابہ کے دل میں خیال آیا کہ ایرانیوں کی طرح ''نیروز'' اور ''مہرجان'' کے تہوار منائے جائیں تو آپ ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا اور کہا کہ ہمارے لئے عید کے دو دن مقرر ہیں، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ، (نسائی، کتاب صلاۃ العیدین، حدیث نمبر:۱۵۵۶) اس کے بعد مزید ایک عید کا اضافہ کرنا اور اس میں خطبہ ونماز کا سلسلہ قائم کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ یہ یقیناً بدعت ہے، اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی انسان کو دوزخ تک لے جاتی ہے: ''کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة'' (ابوداود، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة، حدیث نمبر:۴۶۵۷) اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائیں اور محبت رسول کے نام پر ایسے کام کرنے سے بچائیں، جو خود رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی کا باعث ہیں —— اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مومن کے لئے اصل خوشی کا موقع وہ ہے، جب دینی اور روحانی اعتبار سے اسے کوئی چیز حاصل ہو، دنیا کی نعمتوں پر خوش ہونا اگرچہ ایک فطری بات ہے اور جائز ہے؛ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ حقیقی خوشی کا موقع نہیں —— قرآن مجید میں ایک اور موقع پر خوش ہونے سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''لاَ تَفۡرَحۡ إِنَّ اللهَ لاَ يُحِبُّ الۡفَرِحِيۡنَ'' (القصص:۷۶)؛ لیکن وہاں فرحت سے ''اِترانا'' مراد ہے، یعنی کوئی اچھی چیز حاصل ہوجائے تو اس پر اترانا نہیں چاہئے، خوش ہونے کا ایسا انداز نہ ہو کہ دوسروں کی تحقیر ہونے لگے۔

﴿۱﴾ یعنی حلال وحرام کرنا اور جائز وناجائز قرار دینا اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے؛ کیوں کہ اسی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور خالق ہی کا حق ہے کہ مخلوق کے لئے اس کی صلاحیت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے قانون بنائے، اسلام کے نظام سیاست کی بنیاد یہی ہے کہ قانون بنانا اصل میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے، انسان کا کام اس کو نافذ کرنا ہے —— زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنے طور پر بعض جانوروں کو حلال اور بعض کو حرام کرلیا کرتے تھے، سورۂ انعام آیت نمبر:۱۳۸ تا ۱۴۳ میں اس کا ذکر آچکا ہے، اس آیت میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَ مَا تَکُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّ مَا تَتۡلُوۡا مِنۡہُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّ لَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیۡکُمۡ
شُہُوۡدًا اِذۡ تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ ؕ وَ مَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ
وَ لَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡبَرَ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا
ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿ۚۖ۶۲﴾ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿ؕ۶۳﴾

آپ کسی بھی حال میں ہوں، کہیں سے قرآن کی تلاوت کریں اور کچھ بھی کام کریں؛ مگر جب آپ اس میں مشغول رہتے ہیں تو ہم آپ کے پاس موجود ہوتے ہیں اور آپ کے پروردگار سے زمین و آسمان کی ذرہ برابر چیز بھی مخفی نہیں رہ سکتی اور نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی؛ مگر یہ سب ایک واضح کتاب (لوحِ محفوظ) میں مذکور ہے ﴿۱﴾ ﴿۶۱﴾ یاد رکھو! جو لوگ اللہ کے دوست ہیں، یعنی جو لوگ ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا نہ انھیں کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۲﴾ ﴿۶۳﴾

﴿۱﴾ اس میں رسول اللہ ﷺ کی دلداری ہے کہ آپ کفار و مشرکین کی عداوتوں اور سازشوں سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہوں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی نگہبانی آپ کے ساتھ ہے اور جب خالق خود کسی کا نگہبان ہو تو اگر تمام مخلوق مل کر بھی اس کی دشمن ہو جائے، تب بھی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

﴿۲﴾ ولی کے معنی دوست کے ہیں؛ لہٰذا ''اولیاء اللہ'' کے معنی 'اللہ کے دوستوں' کے ہوئے، ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں اولیاء اللہ کو ملنے والے خصوصی انعام کا ذکر کیا گیا ہے کہ نہ انھیں غم ہوگا اور نہ خوف، غم کا تعلق ماضی سے ہے، یعنی گزری ہوئی بات پر کوئی غم نہیں ہوگا اور خوف کا تعلق مستقبل سے ہے، (مفاتیح الغیب: ۴/۴۰۱) بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں باتوں کا تعلق آخرت سے ہے کہ اللہ کے اولیاء جنت میں داخل کئے جائیں گے، جہاں وہ ہر طرح کے خوف اور غم سے آزاد ہوں گے، (حوالۂ سابق) لیکن اگر اس سے مراد آخرت کا انعام ہو تو اس میں اولیاء اللہ کا کیا امتیاز باقی رہ گیا؛ کیوں کہ جو بھی جنت میں جائے گا، وہ خوف و غم سے آزاد ہوگا؛ اس لئے صحیح یہ ہے کہ اس کا تعلق دنیا ہی سے ہے، جو لوگ دنیا دار ہوتے ہیں، وہ مال و دولت اور سامانِ عیش و عشرت کا کتنا بڑا خزانہ بھی حاصل کرلیں، انھیں ہمیشہ دنیا کی کچھ نعمتوں کے چھوٹ جانے کا غم اور بہت سی آرزوؤں اور اُمیدوں کے پورے نہ ہونے کا خوف دامن گیر ہوتا ہے، اس کے برخلاف اولیاء اللہ کی نظر آخرت پر رہتی ہے، دنیا ان کی نگاہ میں بے قیمت ہوتی ہے، اس لئے ان کو نہ کسی چیز کے نہ ملنے کا غم ہوتا ہے اور نہ ان کے دل میں ایسی آرزوئیں کروٹ لیتی ہیں کہ ان کے پورے نہ ہونے کا خوف ہو، رہ گیا کسی واقعہ پر فطری غم کا پیدا ہونا تو یہ اللہ کی ولایت کے مغایر نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوطالب، اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم اور اپنی صاحبزادیوں کی وفات اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ہوا، اسی طرح جانی دشمنوں کا اور درندہ جانوروں کا خوف فطری چیز ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اژدہے کی شکل کو دیکھ کر گھبرا گئے یا انھیں فرعون کے پاس آنے سے اس لئے خوف محسوس ہوا کہ کہیں انھیں قبطی مقتول کے بدلے میں قتل نہ کر دیا جائے، اس طرح کا حزن و ملال اور خوف و اندیشہ انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اس سے انبیاء اور اولیاء بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں اولیاء اللہ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، جن کا خلاصہ دو باتیں ہیں: ایمان اور تقویٰ، ایمان کی بنیاد ←

لَهُمُ الۡبُشۡرٰى فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ ‌ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ‌ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ؕ‏ ﴿۶۴﴾

ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی ، اللہ کی باتیں بدلتی نہیں ہیں ، یہی بڑی کامیابی ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۶۴﴾

← توحید پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات کے اعتبار سے بھی ایک ماننا اور صفات و اختیارات کے اعتبار سے بھی، کہ اللہ ہی رزق عطا فرماتے ہیں، وہی اولاد دیتے ہیں، کامیابی و ناکامی، جیت اور ہار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، توحید ہی کے تقاضے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کچھ حقوق اللہ تعالیٰ کے ہیں، جن میں کسی اور کو شریک کرنے کی گنجائش نہیں، جیسے: کسی اور کی عبادت، جانور کے ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لینا، اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا، کسی اور سے مرادیں مانگنا، کسی اور کے نام سے جانور چھوڑنا، یا جانور کی قربانی کرنا، کسی اور کے سامنے دُعا کے ہاتھ پھیلانا، یہ سب مشرکانہ افعال ہیں، جو لوگ اس کے مرتکب ہوں، یا دوسروں سے اس طرح کا عمل کرائیں، وہ ہرگز اللہ کے ولی نہیں ہوسکتے — اولیاء اللہ کی دوسری صفت تقویٰ ہے، تقویٰ سے مراد ہے اللہ کی محبت اور اللہ سے خوف کا پاس رکھتے ہوئے ان باتوں سے بچنا، جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یعنی فرائض وواجبات کو ادا کرنا اور جو باتیں حرام یا قریب بہ حرام ہیں، ان سے اجتناب کرنا، نیز حتی المقدور سنتوں کی پیروی، مستحبات پر عمل کرنے اور خلاف مستحب باتوں سے بچنے کی کوشش کرنا، اگر کوئی شخص شریعت کے خلاف عمل کرتا ہو، جیسے نماز نہیں پڑھتا ہو، داڑھی نہیں رکھتا ہو، غیر محرموں کے ساتھ اختلاط کرتا ہو، یا اس طرح کے اور گناہوں میں مبتلا ہو اور ان سے توبہ بھی نہیں کرتا ہو، وہ ہرگز اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا — تقویٰ کے تقاضوں میں ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ بدعت میں مبتلا نہ ہو؛ کیوں کہ بدعت تمام گناہوں سے بڑھا ہوا گناہ ہے، دوسرے گناہوں میں مبتلا لوگوں کو توبہ کی توفیق ہوجاتی ہے؛ لیکن بدعت کا ارتکاب کرنے والے ثواب کا کام سمجھ کر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں؛ اس لئے انھیں توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، افسوس کہ آج کل بہت سے لوگ خود اولیاء اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؛ حالاں کہ وہ مختلف کبیرہ گناہوں میں بھی مبتلا ہیں اور بدعات وخرافات میں بھی؛ البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ نبوت کی طرح ''ولایت'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مقرر کیا ہوا عہدہ نہیں ہے، جس کی ان بندوں کو اطلاع دی جاتی ہو، جو اللہ کی نظر میں اس کے اولیاء ہیں، اور نہ دوسرے لوگوں کو خدا کی جانب سے پیغام پہنچتا ہے کہ فلاں فلاں حضرات میرے اولیاء ہیں، ان کے ساتھ تم خصوصی سلوک کرو، نہ اولیاء کی ولایت پر ایمان لایا جائے گا اور نہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی کی ولایت سے انکار کرجائے، تو وہ کافر یا فاسق ٹھہرے، جیسا کہ انبیاء کی نبوت کا انکار کرنا کفر کا باعث ہے اور صحابہ کے بارے میں بدزبانی فسق ہے، اسی طرح کسی شخص کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اللہ کا ولی ہے، صرف گمان رکھا جاسکتا ہے، نہ عالم ہونا ولی ہونے کی دلیل ہے اور نہ شیخ طریقت ہونا؛ بلکہ تقویٰ کے اعتبار سے ولایت کے مختلف درجات ہوسکتے ہیں، ایمان وتقویٰ کے اعتبار سے جس کی حالت جتنی بہتر ہو، وہ اُسی درجہ اعلیٰ مرتبہ کا ہوگا؛ لیکن بہر حال بظاہر جس کی زندگی ایمان اور تقویٰ کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہو، اس سے دشمنی اور عداوت رکھنا آخرت کے لئے بے حد نقصان دہ ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میرے ولی سے دشمنی رکھی، وہ میری لڑائی کا مستحق ہے ''من آذی لی ولیا فقد استحق محاربتی''۔ (مسند أبی یعلی، حدیث نمبر: ۷۰۸۷)

﴿۱﴾ یعنی یہ جو اللہ کے نیک بندوں کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری دی گئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا طے شدہ فیصلہ ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

وَ لَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُهُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا ؕ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿٦٥﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنۡ فِی
السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَا یَتَّبِعُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُرَکَآءَ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ
اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ هُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡهِ وَ النَّهَارَ
مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ هُوَ الۡغَنِیُّ ؕ
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنۡ عِنۡدَکُمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا
تَعۡلَمُوۡنَ ﴿٦٨﴾ قُلۡ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَفۡتَرُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ لَا یُفۡلِحُوۡنَ ﴿٦٩﴾ؕ

وقف لازم

ان کی بات سے آپ رنجیدہ نہ ہوں ، بے شک تمام تر غلبہ اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ خوب سننے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿٦٥﴾ سن لو! جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، سب اللہ ہی کا ہے اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شریکوں کی عبادت کرتے ہیں ، وہ کس کی پیروی کررہے ہیں؟ وہ محض بے دلیل گمان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں! ﴿٦٦﴾ وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو (توجہ کے ساتھ اللہ کے کلام کو) سنا کرتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿٦٧﴾ وہ لوگ کہتے ہیں: اللہ نے (اپنا) بیٹا بنایا ہے، اللہ کی ذات اس سے پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے، تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو، جس کا تم علم نہیں رکھتے ؟ ﴿۲﴾ ﴿٦٨﴾ آپ کہہ دیجئے: بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔ ﴿٦٩﴾

﴿۱﴾ یعنی دن اس لئے ہے کہ انسان دوڑ دھوپ کر کے روزی حاصل کرے اور رات اس لئے ہے کہ تاریک ہونے کی وجہ سے سارے کے سارے لوگ ایک ساتھ آرام کریں اور سب کو سکون حاصل ہو، اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لینے اور یہاں کی سہولتوں سے منھ موڑ لینے کی تعلیم نہیں دیتا، وہ چاہتا ہے کہ انسان دن میں روزی حاصل کرنے کے لئے تگ ودو بھی کرے، رات میں سوئے اور آرام بھی کرے؛ البتہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو اور خدا کی نافرمانی سے اپنا دامن بچائے رکھے۔

﴿۲﴾ یعنی خدا کا رشتہ تمام مخلوقات سے ملکیت کا ہے، اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور تمام مخلوقات اللہ کی ملکیت ہیں؛ اس لئے کوئی بھی مخلوق اللہ کی اولاد نہیں ہوسکتی؛ کیوں کہ صاحبِ اولاد ہونا مخلوق کے لئے تو کمال ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے باعث کمال نہیں؛ کیوں کہ باپ کی بہت سی صفات اولاد میں منتقل ہوتی ہے، یہاں تک کہ شکل وصورت، صحت وبیماری اور آواز میں بھی اولاد اپنے والدین کے مشابہ اور مماثل ہوتی ہے، پس اگر اللہ تعالیٰ کی اولاد ہو، تو اس میں صفاتِ خداوندی کا ظہور ہوگا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے یکتا اور بے مثال ہونے کے مغایر ہے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا
وقف لازم ع ۷ ۱۰ ۱۲ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ الثلٰثة
وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْۤا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ
عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْۤا اِلَيَّ وَ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِي
الْفُلْكِ وَ جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَ اَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا
لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

دنیا میں تھوڑا سا عیش و آرام ہے، پھر ان سب کو ہماری ہی طرف واپس ہونا ہے، اس کے بعد ہم ان کو ان کے کفر کے بدلہ سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے ﴿۷۰﴾ آپ ان کو نوح کا قصہ سنایئے، جب نوح نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اگر تم کو میرا رہنا اور اللہ کے احکام کی نصیحت کرنا گراں گذرتا ہے تو میں نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اب تم سب مل کر اپنی تدبیریں کرلو اور جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، ان کو بھی اکٹھا کرلو، پھر تم کو اپنی تدبیر (پوری طرح روبہ عمل لانے) میں کوئی شبہ نہ رہ جائے، اس کے بعد (تمہیں جو کچھ کرنا ہے) میرے ساتھ کر گذرو اور مجھ کو (ذرا بھی) مہلت نہ دو ﴿۷۱﴾ پھر بھی اگر تم منھ پھیروگے تو (سمجھ لو) کہ میں تم سے کسی معاوضہ کا طلب گار نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں فرمانبرداری کرنے والوں میں رہوں ﴿۷۲﴾ پھر بھی وہ لوگ ان کو جھٹلاتے ہی رہے؛ چنانچہ (نوح کی قوم پر طوفان کا عذاب آیا اور) ہم نے نوح اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے، کو بچا لیا اور ان کو (طوفان ختم ہونے کے بعد) زمین میں آباد کیا اور جن لوگوں نے ہماری باتوں کو جھٹلایا تھا، انھیں غرق کردیا، پھر دیکھ لو کہ جن لوگوں کو ڈرایا جاچکا تھا، ان کا کیا انجام ہوا؟ ﴿۱﴾ ﴿۷۳﴾ پھر ہم نے نوح کے بعد اور پیغمبروں کو بھی ان کی قوم کی طرف بھیجا؛ چنانچہ وہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے؛ مگر وہ لوگ جس بات کو پہلے جھٹلا چکے تھے، یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس پر ایمان لے آئیں، ﴿۲﴾ اسی طرح ہم حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ ﴿۷۴﴾

﴿۱﴾ حضرت نوح علیہ السلام، ان کی دعوت اور ان کی قوم پر عذاب کا ذکر اعراف: ۶۰-۷۲، ہود: ۲۶-۴۹ کے ضمن میں آچکا ہے —— یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کافروں کے اس گروہ پر ہوتا ہے، جس پر ''انذار'' یعنی دعوتِ دین کا حق ادا کردیا گیا ہو، آج اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کے باوجود اعداءِ اسلام پر عذاب کا نہ آنا اسی قانون کے تحت ہے؛ کیوں کہ ان پر اسلام پیش ہی نہیں کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ حق اور سچی بات سے انکار کرنے اور ان کے نہ ماننے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ جب پہلے کسی بات کا انکار ←

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی وَ هٰرُوْنَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا
قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ
مُوْسٰۤی اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا
لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا وَ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِیَآءُ فِی الْاَرْضِ ؕ وَ مَا نَحْنُ لَكُمَا
بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۸﴾ وَ قَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِیْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ
مُّوْسٰۤی اَلْقُوْا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
سَیُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۸۱﴾

پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، وہ تکبر کرنے لگے اور وہ تھے ہی جرم کے خوگر لوگ ﴿۱﴾ ﴿۷۵﴾ پھر جب ان کے پاس ہماری طرف سے صحیح دلیل آ پہنچی تو کہنے لگے: یہ یقیناً کھلا ہوا جادو ہے ﴿۷۶﴾ موسیٰ نے کہا: تمہارے پاس صحیح دلیل آ پہنچی ہے، پھر بھی تم اس کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟؟ حالاں کہ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے ﴿۷۷﴾ وہ کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس اسی لئے آئے ہو کہ ہم کو اس طریقہ سے ہٹا دو، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور زمین میں تم دونوں کو سرداری حاصل ہو جائے؟ ہم تو تم دونوں کو کبھی نہیں مانیں گے ﴿۷۸﴾ فرعون نے (اپنے سرداروں سے) کہا: میرے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لے آؤ ﴿۷۹﴾ پھر جب جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے کہا: تم کو جو کچھ ڈالنا ہے ڈال دو ﴿۸۰﴾ آخر جب ان لوگوں نے ڈال دیا تو موسیٰ نے کہا: تم نے جو کچھ کیا ہے، یہ جادو ہے، یقیناً اللہ اس کو ابھی درہم برہم کر دیں گے، بے شک اللہ فساد مچانے والوں کے کام کو بننے نہیں دیتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۱﴾

← کر دیتے ہیں تو پھر اس کو وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور کسی طرح اپنی بات سے واپس نہیں ہوتے، اس آیت میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے، اس لئے ہمیشہ کوشش کرنی چاہئے کہ اپنی بات پر اَڑا نہ جائے، دین و شریعت کے کسی حکم میں اپنی رائے کو وقار کا مسئلہ نہ بنا لیا جائے؛ بلکہ دلیل کی روشنی میں جو درست بات سامنے آ جائے، اسے قبول کر لیا جائے، سلف صالحین کو دیکھئے کہ بڑے بڑے اہل علم کا حال یہ تھا کہ جب ان کے سامنے اپنی رائے کے خلاف کوئی دلیل آ جاتی، خواہ اپنے چھوٹوں کی طرف سے آ جائے، تو فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔

﴿۱﴾ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی دعوت، فرعون اور اس کی قوم نیز بنی اسرائیل کے رویہ پر سورۂ اعراف کی آیت نمبر: ۱۰۳ تا ۱۷۱ کے ضمن میں مختصر نوٹ آ چکا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی بعض دفعہ بظاہر منکرین حق کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے؛ لیکن وہ باقی نہیں رہتا، بالآخر جو بات حق ہے، اسی کو قبولیت ملتی ہے اور غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

٨ ع ١٣
وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى
خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡىِٕهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَ قَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ
مُّسْلِمِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَ نَجِّنَا
بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ
بُيُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٧﴾

اور اللہ سچائی کو اپنے حکم سے ثابت کر دکھاتے ہیں، اگرچہ کہ مجرموں کو ناگوار گذرے ﴿٨٢﴾ پس فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ انھیں تکلیف نہ پہنچائیں، موسیٰ کی قوم کے کچھ ہی لوگ موسیٰ پر ایمان لائے، واقعی فرعون اس ملک میں بڑی طاقت رکھتا تھا اور وہ حد سے گذر جایا کرتا تھا ﴿٨٣﴾ اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور واقعی فرمانبردار ہو، تو اللہ ہی پر بھروسہ رکھو ﴿٨٤﴾ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظلم کرنے والے لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنایئے ﴿٨٥﴾ مہربانی کر کے ہمیں ان کافروں سے نجات عطا فرما دیجئے ﴿٨٦﴾ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم دیا کہ اپنی قوم کے لئے مصر میں چند گھروں کو مقرر کر لو، اپنے گھروں کو قبلہ رُخ بناؤ، نماز قائم کرو اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ ﴿١﴾ ﴿٨٧﴾

﴿١﴾ قوم بنی اسرائیل کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں ہی نماز ادا کیا کریں؛ لیکن فرعون نے اپنے جابرانہ حکم کے ذریعے ان کی تمام مسجدیں منہدم کرادیں، ایسی صورت علیہ السلام میں انھیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنے گھروں میں عبادت کرلیا کریں؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے ان کا رُخ قبلہ کی طرف ہو، اس میں اختلاف ہے کہ بنی اسرائیل کا قبلہ کعبۃ اللہ تھا یا بیت المقدس؟ بعض مفسرین کے نزدیک شروع سے ہی بیت المقدس قبلہ تھا اور بعض حضرات کے نزدیک شروع میں قبلہ کعبۃ اللہ تھا، بعد میں بیت المقدس ہوا، بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ گذشتہ اُمتوں کے لئے بھی قبلے مقرر تھے اور ان پر بھی قبلہ رُخ ہو کر عبادت کرنا لازم تھا (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۸/۸۲-۳۸۱) —— رسول اللہ ﷺ کی برکت سے اس اُمت کو یہ خصوصیت دی گئی کہ وہ روئے ارض پر کہیں بھی نماز ادا کر سکتے ہیں، مسجد میں نماز ادا کرنا ضروری نہیں؛ البتہ فرض نمازوں کو مسجد میں ادا کرنا واجب علی الکفایہ ہے، (الفتاویٰ التاتارخانیہ: ۲/۲۸۰) اور سنن و نوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے، (ہندیہ: ۱/۱۱۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عذر یا خوف کی بنا پر مسجد کی بجائے گھر میں نماز ادا کرلی جائے، تو اس کی گنجائش ہے (ہندیہ: ۱/۹۳) —— بعض مفسرین نے ''واجعلوا بیوتکم قبلۃ'' کی تشریح یہ کی ہے کہ کچھ رہائشی گھروں کو نماز کے لئے مخصوص کرلیا جائے؛ تاکہ وہ فرعون کی دسترس سے محفوظ رہیں اور بنی اسرائیل وہاں عبادت کرلیا کریں۔

وَ قَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور موسیٰ نے کہا: اے ہمارے پروردگار! آپ نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیوی زندگی میں طرح طرح کے مال اور رونق و آرائش کے سامان عطا کردیئے ہیں، اے ہمارے پروردگار! یہ اس واسطے ہیں کہ وہ آپ کے راستے سے بہکایا کریں؟ اے ہمارے پروردگار! ان کے مال کو تباہ و برباد کردیجئے اور ان کے دلوں کو سخت کردیجئے؛ تاکہ یہ ایمان سے محروم ہی رہیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں ﴿۱﴾ ﴿۸۸﴾ اللہ نے فرمایا: تم دونوں کی دُعا قبول کرلی گئی؛ لہٰذا تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے راستہ پر مت چلو جو ناواقف ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۹﴾

﴿۱﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کی رفاقت میں پہلے تو فرعون اور اس کی قوم کو ہدایت کی طرف لانے کی بھرپور کوشش فرمائی، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو واضح مادی معجزات عطا فرمائے، ان کو بھی فرعون اور اس کی قوم نے دیکھ لیا، اس کے باوجود خود بھی ایمان نہیں لائے اور دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے رہے، اور جب کسی قوم کے بارے میں یقین ہو جائے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو ان کے لئے بددُعا کرنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بددُعا فرمائی تھی کہ روئے ارض پر کافروں کا کوئی گھر باقی نہ رکھئے: ''رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا'' (نوح:۲۶) تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم فرعون کے لئے دو بددُعائیں کی، ایک کا تعلق دنیا سے اور دوسرے کا تعلق آخرت سے ہے، پہلی بددُعا یہ ہے کہ ان کے مال کو تباہ و برباد کردیجئے، اس کا تعلق دنیا کے عذاب سے ہے؛ چنانچہ ان کی معیشت تباہ ہوگئی؛ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر مفسرین کی روایت کے مطابق ان کا سونا چاندی درہم و دینار سب پتھر بنادیئے گئے، (تفسیر قرطبی:۸/۳۷۴) دوسری بددُعا یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہوجائیں اور یہ ایمان سے محروم ہی رہیں، یہاں تک کہ ان پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ بددُعا اس بات کا پورا اندازہ کرلینے کے بعد سامنے آئی کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے؛ بلکہ ایمان نہ لانے کے سبب ان پر جو عذاب آتا، آپ نے اسی کی دُعا کی تھی اور ایسا ہوتا ہے کہ سبب کا ذکر کیا جاتا ہے اور مقصود وہ چیز ہوتی ہے، جو سبب کے ذریعے وجود میں آئے؛ چنانچہ فرعون اور اس کی قوم پر یہ عذاب اس طرح آیا کہ یہ سب کے سب سمندر میں غرق کردیئے گئے۔

﴿۲﴾ دُعاء کرنے والا کتنا بھی نیک و صالح شخص ہو، ضروری نہیں کہ اس کی دُعاء فوراً قبول ہوجائے؛ چنانچہ مفسرین کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دُعاء کا اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا، جب یہ سب سمندر میں غرق کئے گئے، اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون کو تلقین کی گئی کہ دُعا تو قبول کرلی گئی؛ لیکن اس کا نتیجہ ظاہر ہونے کا انتظار کریں اور جب تک دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیتے رہیں، عجلت سے کام نہ لیں کہ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے، جو دُعا کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے واقف نہیں ہیں، (مفاتیح الغیب:۸/۴۳۴) —— اگرچہ دُعاء کے کلمات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہے تھے؛ لیکن حضرت ہارون علیہ السلام بھی اس پر آمین کہتے جاتے تھے، جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ تم دونوں کی دُعاء قبول کرلی گئی، (حوالۂ سابق) معلوم ہوا کہ دُعا پر آمین کہنا بھی دُعا کرنا ہے اور دُعا کا ادب قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ پست آواز میں کی جائے، (الاعراف:۵۵) اسی لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نماز میں آہستہ آمین کہنے کو بہتر قرار دیتے ہیں، عام حالات میں بھی آہستہ دُعاء کرنا افضل ہے۔

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتۡبَعَهُمۡ فِرۡعَوۡنُ وَ جُنُوۡدُهٗ بَغۡیًا وَّ عَدۡوًا ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَهُ
الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۹۰﴾
آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾ فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ
خَلۡفَکَ اٰیَةً ؕ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ ﴿۹۲﴾ وَ لَقَدۡ بَوَّاۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ع ۹ ۱۴
مُبَوَّاَ صِدۡقٍ وَّ رَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡا حَتّٰی جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ
بَیۡنَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡهِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۳﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کرادیا، پھر فرعون اور اس کا لشکر ظلم وزیادتی کے ارادہ سے ان کے پیچھے پیچھے آیا، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا تو بول پڑا: میں ایمان لاتا ہوں کہ جس خدا پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور میں بھی فرمانبرداروں میں شامل ہوتا ہوں ﴿۹۰﴾ (جواب دیا گیا) اب تو ایمان لاتا ہے؛ حالاں کہ تو، تو اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں میں شامل رہا ﴿۱﴾ ﴿۹۱﴾ تو آج ہم تیری لاش کو بچائے دیتے ہیں؛ تاکہ تو اپنے بعد آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت بنا رہے اور یقیناً بہت سے لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں ﴿۲﴾ ﴿۹۲﴾ اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی اچھی جگہ عطا کی اور کھانے کو نفیس چیزیں دیں، پھر ان لوگوں نے علم حاصل ہوجانے کے باوجود اختلاف کیا، (بہرحال) وہ جس بات میں اختلاف کررہے ہیں، یقیناً آپ کے رب قیامت کے دن اس کا فیصلہ فرمادیں گے۔ ﴿۹۳﴾

﴿۱﴾ مطلب یہ ہے کہ اب تیرے ایمان کا اعتبار نہیں؛ کیوں کہ ایمان تو وہ معتبر ہے جو اختیار کے ساتھ ہو، اور فرعون اس وقت اضطرار کی حالت میں تھا؛ اس لئے اس وقت کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں، جس کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جت تک غرغرہ کی کیفیت نہ ہوجائے، اسی وقت تک توبہ معتبر ہے، جب نزع کی حالت شروع ہوجائے تو اس وقت کی توبہ کا اعتبار نہیں، (ترمذی، باب فضل التوبۃ والاستغفار، حدیث نمبر: ۳۵۳۷) کیوں کہ ایمان تو غیبی حقیقتوں پر لانا ہے اور جب نزع کی کیفیت شروع ہوجاتی ہے، تو موت کے فرشتے انسان کے سامنے آجاتے ہیں اور غیب کا پردہ ہٹ جاتا ہے —— فرعون کی موت حالت کفر میں ہوئی، اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے، بعض صوفیاء سے جو فرعون کے مومن ہونے کی بات منقول ہے، غالباً وہ ان کی کتابوں میں تحریف ہے۔ واللہ اعلم

﴿۲﴾ عام طور پر اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر فرعون کا خوف اس قدر مسلط تھا کہ فرعون کے غرق کئے جانے کے بعد بھی ان کو اس واقعہ کا یقین نہیں ہورہا تھا؛ چنانچہ اللہ کی قدرت ظاہر ہوئی اور سمندر کی لہروں نے فرعون کی لاش کو ساحل پر پھینک دیا، بنی اسرائیل نے جی بھر کر دیکھا، پھر انھیں اس کا اطمینان ہوا؛ (تفسیر قرطبی: ۸/۳۷۹) لیکن موجودہ دور میں ماہرین آثار قدیمہ کو مصر کے شہر تھیبس (Thebes) میں ایک لاش حاصل ہوئی ہے، جس کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ جس فرعون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوتِ ایمان دی تھی، یہ اسی کی لاش ہے، اب یہ لاش قاہرہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے، عجب نہیں کہ اس آیت کی یہی مراد ہو کہ فرعون کی لاش ایک نشانِ عبرت کی حیثیت سے مدتوں باقی رہے گی۔

فَاِنۡ كُنۡتَ فِیۡ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكَ فَسۡـَٔلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَقَدۡ
جَآءَكَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الَّذِیۡنَ كَذَّبُوۡا
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡهِمۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۶﴾
وَ لَوۡ جَآءَتۡهُمۡ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوۡ لَا كَانَتۡ قَرۡیَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ
اِیۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ یُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا
وَ مَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾

ہم نے آپ پر جو کتاب اُتاری ہے، اگر (بالفرض) آپ کو اس کے بارے میں شک ہو تو ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو آپ سے پہلے کی کتابوں کو پڑھتے ہیں، یقیناً آپ کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے حق آچکا ہے؛ اس لئے آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جائے ﴿۱﴾ ﴿۹۴﴾ اور آپ ان لوگوں میں سے بھی نہ ہو جائیں، جنھوں نے اللہ کے احکام کو جھٹلایا ہے کہ پھر تو آپ نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿۹۵﴾ بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا (ایمان نہ لانے کا) فیصلہ ہو چکا ہے؛ اگرچہ ان کے سامنے ساری نشانیاں آجائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، جب تک وہ دردناک عذاب کو نہ دیکھ لیں، ﴿۹۶﴾ ﴿۹۷﴾ ایسا کیوں نہ ہوا کہ یونس کی قوم کے سوا کوئی بستی ایمان لے آتی، پھر اس کو اس کا ایمان لانا کام آجاتا، یونس کی قوم کے لوگ جب ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے دنیوی زندگی میں رسوا کن عذاب ہٹا دیا، اور ایک مدت تک عیش و آرام کا موقع دیا۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۸﴾

﴿۱﴾ ان آیات میں خطاب تو رسول اللہ ﷺ سے ہے؛ لیکن مقصود اس قوم سے خطاب کرنا ہے، جس کی طرف آپ ﷺ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ناراضگی کے اظہار کے لئے جن لوگوں کو خطاب کرنا مقصود ہوتا ہے، ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، توجہ دوسروں کی طرف ہوتی ہے اور مراد یہ ہوتے ہیں۔

﴿۲﴾ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں ہیں، قرآن مجید میں سورۂ انبیاء میں 'ذوالنون' کے نام سے اور سورۂ صافات میں ''یونس'' کے نام سے بھی آپ کا ذکر آیا ہے، حدیث میں یونس بن متی کے نام سے آپ کا تذکرہ ملتا ہے، (ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب ذکر البعث، حدیث نمبر: ۴۲۷۴) مفسرین نے قرآن وحدیث اور بائبل وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے، حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا جو تذکرہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ یَرُبعان نامی اسرائیلی بادشاہ — جس کا زمانہ ۷۸۱ تا ۷۴۱ ق م ہے — میں عراق کے دارالحکومت ''نِیْنَوٰی'' میں دریائے دجلہ کے کنارے واقع آبادی ''موصل'' میں پیدا ہوئے، یہاں کے لوگ بت پرست تھے، آپ نے چھوٹے سے گروہ کو شرک سے باز رکھنے اور توحید کی طرف لانے کی پوری پوری کوشش کی اور کہا جاتا ہے کہ ۹ر سال آپ نے شب وروز اس کی جدوجہد جاری رکھی، حضرت یونس علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ وہ قوم کو بتا دیں کہ اب ان پر اللہ کا عذاب ←

وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّهُمۡ جَمِیۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُکۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۹﴾

اگر آپ کے پروردگار کو منظور ہوتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے ،تو کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟ ﴿۹۹﴾

← آیا ہی چاہتا ہے اور اس کے لئے ایک روایت کے مطابق تین دنوں اور ایک روایت کے مطابق چالیس دنوں کی مہلت دی گئی ، قوم نے آپس میں گفتگو کی کہ یہ شخص جھوٹ نہیں بولتا؛ اس لئے اس پر نظر رکھو، اگر یہ شہر میں رکا رہتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ عذاب نہیں آئے گا اور اگر شہر سے چلا جاتا ہے، تو عذاب کا نازل ہونا یقینی ہے، حضرت یونس علیہ السلام راتوں رات وہاں سے ہجرت کر گئے ، اور عذاب کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں ؛ چنانچہ اصل عذاب کے آنے سے پہلے ہی یہ تمام لوگ توبہ کے لئے ٹاٹ کا لباس پہن کر صحراء میں نکل آئے ، بچوں کو ماؤں سے اور جانوروں کے بچوں کو بھی ان کی ماؤں سے الگ کردیا؛ تاکہ سب مل کر روئیں ، جن لوگوں کا حق باقی تھا، جلدی جلدی ان کا حق ادا کردیا، یہاں تک کہ اگر ناحق کسی کا پتھر لے کر اس پر اپنے مکان کی بنیاد رکھی تھی ،تو اس بنیاد کو بھی اُکھاڑ کر صاحب حق کے حوالہ کردیا، آخر ان کی گریہ وزاری اللہ کے دربار میں مقبول ہوگئی اور عذاب ان پر نہیں آیا، (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۸/ ۳۸۴، مفاتیح الغیب: ۸/ ۴۴۹، تفسیر ماجدی: ۳/ ۷۰) —— اس کے بعد آگے کے واقعات سورۂ انبیاء اور صافات میں آئے ہیں، جس میں مچھلی کے حضرت یونس علیہ السلام کو نگل جانے کا بیان ہے، (ان ہی آیات کے ذیل میں اس کا ذکر آئے گا) —— یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے قوم فرعون کا ذکر کیا، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی مدد کو دیکھا، پھر بھی ایمان نہیں لائے ، جب خود اس پر اللہ کا عذاب ظاہر ہوگیا، تب اپنے ایمان لانے کا اعلان کیا، اکثر قومیں جن پر عذاب نازل ہوا ہے، ان کا یہی مزاج رہا ہے، پچھلی قوموں میں صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا استثناء ہے کہ وہ آثارِ عذاب کو دیکھ کر عذاب کے آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئی اور توبہ کرلی؛ اس لئے ان کی توبہ قبول کی گئی ، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے مفسر زجاج رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر بعینہٖ عذاب دیکھ لئے ہوتے ،تو ان کا ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا: ’’وإنما رأوا العلامة التی تدل علی العذاب و لو رأوا عین العذاب لما نفعهم الإیمان‘‘ اور الفاظ کے فرق کے ساتھ فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے : ’’فإنهم لما ظهرت لهم أمارات دلت علی قرب العذاب تابوا قبل أن شاهدوا فظهر الفرق‘‘ (مفاتیح الغیب: ۸/ ۴۴۹) اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے فریضہ رسالت کو پوری طرح ادا نہیں کیا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی سنت کے برخلاف عذاب آنے کے بعد پھر ٹل گیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم اللہ کا عذاب آنے سے پہلے ہی ایمان لے آئی ؛ اسی لئے ان کا ایمان ان کے لئے نافع ہوا، یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم کو عذاب ِ الٰہی کی اطلاع حکم خداوندی ہی سے دی تھی، تو اگر اس قوم پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور حضرت یونس علیہ السلام نے حق پیغمبری نہ ادا کردیا ہوتا، تو کیوں کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں حکم دیا جاتا کہ وہ اپنی قوم کو عذاب کی آمد کے بارے میں بتادیں ، رہ گئی یہ بات کہ حضرت یونس علیہ السلام پر کیوں کر عتاب ہوا اور مچھلی کے نگلنے کا واقعہ پیش آیا؟ تو اس کا ذکر ان شاء اللہ ’’سورۂ انبیاء‘‘ میں آئے گا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾ قُلِ
انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَ النُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾
فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ
الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ قُلْ ١٠ ع١١ ١٥
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ
اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ
حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾

کوئی بھی شخص اللہ کی توفیق کے بغیر مسلمان نہیں ہوسکتا اور جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے، اللہ ان کو (کفر کی) گندگی میں آلودہ ہونے دیتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿١٠٠﴾ آپ فرمائیے: دیکھو تو سہی، کیا کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے؟ اور جو لوگ ایمان لانے پر تیار ہی نہ ہوں، ان کو نہ دلیلیں کام آتی ہیں اور نہ ڈرانے والے، ﴿۲﴾ ﴿١٠١﴾ تو کیا یہ لوگ ان ہی حالات کا انتظار کر رہے ہیں، جو پچھلی قوموں پر بیت چکے ہیں، آپ کہہ دیجئے: تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں ﴿١٠٢﴾ پھر ہم اپنے پیغمبروں کو اور جو لوگ ایمان لائے ان کو بچالیتے ہیں، اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم تمام ایمان لانے والوں کو نجات عطا کریں گے ﴿۳﴾ ﴿١٠٣﴾ آپ کہہ دیجئے: اے لوگو! اگر تمہیں میرے (لائے ہوئے) دین کے بارے میں شک وشبہ ہے تو اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو، میں تو ان کی عبادت نہیں کرسکتا؛ بلکہ میں تو اس خدا کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں موت دیتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے رہوں ﴿۴﴾ ﴿١٠٤﴾ نیز اس بات کا کہ ''سب طریقوں سے الگ ہو کر اپنا رُخ اسی دین (توحید) کی طرف رکھو اور ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ ﴿١٠٥﴾

﴿۱﴾ ''نجاست'' سے مراد کفر کی معنوی گندگی ہے۔

﴿۲﴾ چنانچہ تفسیر قرطبی میں ہے: ''الأيات أي الدلالات والنذر أي الرسل''۔ (قرطبی:۸/۳۸۶)

﴿۳﴾ اس میں دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لئے خوشخبری ہے کہ دعوت انسان کے لئے نہ صرف آخرت میں نجات کا باعث ہے؛ بلکہ دنیا میں بھی اللہ کی طرف سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔

﴿۴﴾ یعنی میرا کام احکام شریعت کو وضع کرنا نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، میری ذمہ داری احکام شریعت کو ماننا، اس پر عمل کرنا اور اس کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ
بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا
عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٨﴾ؕ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۖۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿١٠٩﴾ ع ١١ ١٦

اور اللہ کے سوا ایسی چیز کی عبادت نہ کرو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان، اگر تم نے ایسا کیا تو اس وقت تمہارا اشمار بھی ظالموں میں ہوگا'' ﴿١٠٦﴾ اور اگر اللہ تم کو کسی تکلیف سے دوچار کردیں تو اللہ کے سوا کوئی اور اسے دور نہیں کرسکتا اور اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچانا چاہیں تو اس کی مہربانی کو کوئی روک نہیں سکتا، اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مہربانی فرمائیں اور اللہ ہی بخشنے والے اور بڑی رحمت والے ہیں ﴿١﴾ ﴿١٠٧﴾ آپ کہہ دیجئے: ''اے لوگو! تمہارے اوپر تمہارے پروردگار کی طرف سے (دین) حق پہنچ چکا، اب جو ہدایت کو اختیار کرے گا تو وہ اپنی ہی بھلائی کے لئے ہدایت کے راستہ پر رہے گا اور جو گمراہ ہوگا تو گمراہی کا وبال اسی پر ہوگا، اور میں تم لوگوں پر داروغہ نہیں ہوں'' ﴿١٠٨﴾ اور جو حکم آپ پر اُتارا جائے، آپ اس کی پیروی کرتے رہیے، اور صبر کیجئے، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردیں اور اللہ ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔ ﴿١٠٩﴾

﴿١﴾ اس بات کو بار بار اور یہاں بھی قرآن مجید نے واضح کیا ہے کہ نفع ونقصان اور کامیابی وناکامی سے دوچار کرنا صرف اللہ کی قدرت میں ہے، انبیاء کو بھی اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہیں ہے۔

سُورَةِ هُودٌ

- سورہ نمبر : (١١)
- رکوع : (١٠)
- آیتیں : (١٢٣)
- نوعیت : مکی

یہ بھی مکی سورتوں میں سے ہے، جس میں ایک سو تیئیس (۱۲۳) آیتیں ہیں؛ البتہ آیت نمبر: ۱۲، ۱۷، اور ۱۱۴ مدنی ہیں — مکی سورتوں میں عام طور پر ایمانیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سورت میں بھی زیادہ تر مضامین ایمانیات ہی سے متعلق ہیں، جس میں قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے پر، اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور آخرت پر روشنی ڈالی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کی اور مسلمانوں کی تسلی و دلداری کے لئے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، ان ہی واقعات میں ایک حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا بھی ذکر آیا ہے اور آیت نمبر: ۵۰ تا ۶۰ میں ان کی سرکشی کی روداد پیش کی گئی ہے، اسی مناسبت سے اس سورت کا نام سورۂ ہود ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشّمس کورت'' نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے، دریافت کیا گیا کہ سورۂ ہود کی کس چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس حکم نے ''فاستقم كما أمرت''، یعنی: جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس پر ثابت قدم رہئے، (سنن ترمذی؛ عن ابن عباس، حدیث نمبر: ۳۲۹۷، نیز دیکھئے: شعب الایمان، حدیث نمبر: ۲۲۱۵)

حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کے دن سورۂ ہود پڑھا کرو ''إقراءوا سورة هود يوم الجمعة''۔

(سنن الدارمی، باب فضائل الانعام والسور، حدیث نمبر: ۳۴۴۶، ۳۴۴۷، نیز دیکھئے: شعب الایمان، حدیث نمبر: ۲۲۱۴)

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓرٰ ۣ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝١ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ
لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۝٢ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى
اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝٣

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف، لام، را، ﴿١﴾ یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیتیں محکم ہیں ﴿٢﴾ نیز ایک باخبر، دانا ہستی کی طرف سے اِن کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے ﴿٣﴾ ۝١ یہ کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، ﴿٤﴾ —— بے شک میں تم لوگوں کو اللہ ہی کی طرف سے ڈراتا اور خوشخبری سناتا ہوں ۝٢ —— اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے مغفرت کی دُعا کرو، پھر اسی کی طرف رُجوع کرتے رہو، ﴿٥﴾ اللہ تم کو مقررہ وقت تک راحت کی زندگی سے نوازیں گے اور ہر بہتر عمل کرنے والے کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے ﴿٦﴾ اور اگر تم منھ پھیر لو گے، تو میں تم پر بڑے دن (قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ ﴿٧﴾ ۝٣

﴿١﴾ یہ حروف مقطعات ہیں، جس کی مراد سے اللہ ہی واقف ہیں۔ (دیکھئے: سورۂ بقرہ کا حاشیہ نمبر: ١)

﴿٢﴾ ''محکم'' کے معنی ہیں: مضبوط، جو چیز مضبوط ہوتی ہے، وہ نقص وخلل سے محفوظ ہوتی ہے؛ کیوں کہ کسی شئے میں کمزوری اور کمی ہی سے نقص پیدا ہوتا ہے، پس اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں تعبیر و بیان اور دلیل و برہان کے اعتبار سے کوئی خلل اور کمی نہیں ہے، اسی لحاظ سے اسے محکم کہا گیا ہے، کسی کتاب کے بارے میں مضبوطی کا ایک اور پہلو یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے مضامین ہمیشہ کے لئے قابل عمل ہوں، اس کا کوئی حکم ختم ہونے والا نہ ہو، اس لحاظ سے بھی قرآن مجید محکم ہے؛ کیوں کہ پچھلی کتابیں تو منسوخ ہوچکیں؛ لیکن قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی یہی تشریح کی ہے، (تفسیر قرطبی: ٢/٩) —— حقیقت یہ ہے کہ محکم کے لفظ میں دونوں ہی معنوں کی گنجائش ہے اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ یہ کتاب بیان و وضاحت اور دلائل کے لحاظ سے پختہ کلام بھی ہے، اور اس کے احکام قیامت تک باقی بھی رہیں گے، اس کے منسوخ ہونے کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

﴿٣﴾ ''ثم'' کا لفظ عام طور پر ایک کام کے بعد تھوڑے فاصلہ سے دوسرے کام کے ہونے کو بتاتا ہے، جس کو عربی گرامر کی اصطلاح میں ''تراخی'' کہتے ہیں؛ لیکن بعض دفعہ یہ معنی مراد نہیں ہوتا؛ بلکہ ادنیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے زیادہ بہتر کی طرف ترقی کو واضح کرنا مقصود ہوتا ہے، یعنی: صرف یہی بات نہیں ہوئی؛ بلکہ اس سے بڑھ فلاں بات بھی ہوئی؛ چنانچہ یہاں بھی ''ثم'' تراخی کے معنی میں نہیں ہے، (مفاتیح الغیب: ٣٦٦/٨) مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی آیتیں صرف محکم ہی نہیں ہیں؛ بلکہ اس میں باتیں کھول کھول کر اور وضاحت کے ساتھ بیان بھی کر دی گئی ہیں۔

﴿٤﴾ یعنی قرآن مجید کی بنیادی دعوت یہی ہے کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا کسی اور عبادت نہ کی جائے۔

﴿٥﴾ پچھلے گناہوں پر مغفرت چاہنا کافی نہیں؛ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے بعد پوری طرح خدا کی طرف لوٹ آؤ اور اسی کی عبادت واطاعت کرتے رہو۔

←

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۵﴾

اللہ ہی کی طرف تم لوگوں کی واپسی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں ﴿۴﴾ سنو! وہ لوگ اپنے سینے دہرے کئے دیتے ہیں؛ تاکہ اللہ سے (اپنی باتوں کو) چھپائے رہیں، آگاہ ہو جاؤ! وہ اپنے کپڑے اوڑھے ہوئے ہونے کے وقت جو کچھ چپکے چپکے کرتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ ان سب کو جانتے ہیں، بے شک اللہ تو دلوں کے راز سے بھی واقف ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۵﴾

← ﴿۶﴾ مقررہ وقت سے مراد موت ہے، (تفسیر قرطبی: ۴/۹) جس کا وقت اللہ کے نزدیک متعین ہے، یعنی اگر اللہ کی طرف رجوع ہو، تو اللہ دنیا کی زندگی میں بھی راحت عطا فرمائیں گے اور آخرت میں بھی، ایسا نہیں ہے کہ اس کی دنیوی زندگی محرومی کی زندگی ہوگی؛ جیسا کہ اسی سورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اطاعت وفرمانبرداری کی زندگی گذاروگے تو اللہ تم کو بارانِ رحمت سے نوازیں گے ''وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا'' (ہود: ۵۲) اور ایک اور موقع پر فرمایا گیا کہ جو مرد وعورت اچھے عمل کریں، اللہ تعالیٰ ان کو خوشگوار زندگی عطا کریں گے (النحل: ۹۷) — البتہ اس سلسلے میں دو باتیں خود قرآن مجید سے واضح ہوتی ہیں، ایک: یہ کہ دنیا میں کافروں اور نافرمانوں کو بھی بعض دفعہ نعمتیں دی جاتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت ہوتی ہے نہ کہ انعام؛ چنانچہ فرعون وقارون اور نمرود وہامان کو بھی دنیا کی کتنی ہی نعمتوں سے نوازا گیا تھا؛ لیکن آخر اس کا انجام یہ ہوا کہ عذاب الٰہی میں مبتلا کیا گیا، دوسرے: اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو بھی وقتی طور پر آزمائش سے دوچار فرماتے ہیں؛ بلکہ جس کو اللہ کا جتنا قرب حاصل ہوتا ہے، وہ اسی قدر آزمایا جاتا ہے، اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان وتربیت ہے؛ اس لئے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے: ''ويؤتِ كل ذي فضل فضله'' یعنی ہر نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کا اجر عطا کریں گے، اس کا تعلق آخرت سے ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۳۵)

﴿۷﴾ بڑے دن سے قیامت کا دن مراد ہے؛ کیوں کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن اپنے وقت کے لحاظ سے بڑا ہوگا اور یہ کہ اس دن جو مصیبتیں آئیں گی، اس لحاظ سے بھی لوگوں کو یہ دن بڑا محسوس ہوگا۔

﴿۱﴾ بعض منافقین کی صورت حال یہ تھی کہ جب حضور ﷺ کے پاس سے گزر ہوتا تو اپنے سینے اور پشت کو سمیٹ لیتے، سر جھکا لیتے اور چہرہ ڈھک لیتے؛ تاکہ آپ انھیں دیکھ نہ سکیں، انھیں ڈر لگا رہتا تھا کہ اگر آپ نے دیکھا تو انھیں ایمان کی طرف دعوت دیں گے اور اپنی بے توفیقی کی وجہ سے یہ بات ان کو بڑی ناگوار گزرتی تھی، اسی پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ تم چھپنے کی لاکھ کوشش کرو اور گو اپنے آپ کو کپڑوں میں لپیٹ لو، پھر بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے چھپا نہیں سکتے۔ (تفسیر قرطبی: ۵/۹)

○ ○ ○

وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُهَا وَیَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ کُلٌّ فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶﴾ وَ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ کَانَ عَرۡشُهٗ عَلَی الۡمَآءِ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ لَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۷﴾

اور زمین پر جو بھی چلنے والی چیز ہے، اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اللہ اس کے ٹھہرنے کی اور سونپے جانے کی جگہ سے بھی واقف ہیں، تمام باتیں ایک روشن کتاب (لوحِ محفوظ) میں موجود ہیں ﴿۱﴾ ﴿۶﴾ وہی خدا ہے جس نے چھ دنوں میں آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اُس وقت اُس کا تخت پانی پر تھا ﴿۲﴾ (پھر اللہ نے دنیا میں تم کو بسایا)؛ تاکہ تم لوگوں کو آزمائیں کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے؟ اور اگر آپ کہیں کہ تم لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے تو کفر کرنے والے لوگ ضرور کہیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ﴿۷﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کے لئے رزق کا انتظام فرماتے ہیں، مالتھوس (T.R. Malthus) نے ۱۷۹۸ء میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے اعتبار سے ۳۰ سال کے عرصہ کے بعد دنیا میں کھانے پینے کے وسائل ختم ہوجائیں گے اور لوگوں کے بھوکوں مرنے کی نوبت آجائے گی اور اس کے ۱۰۰ سال بعد ۱۹۹۸ء میں سرولیم کروکس (Sir William) نے تو چیلنج کیا تھا کہ صرف ۳۰ سال تک ہی موجودہ وسائل ہماری ضروری پوری کرسکیں گے؛ لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ آج آبادی کے کئی گنا ہوجانے کے باوجود زرعی پیداوار سے لے کر، مرغی، انڈے اور مچھلیاں وغیرہ تک تمام ضروریاتِ زندگی اتنی وافر مقدار میں موجود ہیں کہ ماضی میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور صنعتی پیداوار نے انسان کو جو سہولتیں مہیا کی ہیں، ان کا تو کوئی شمار وحساب ہی نہیں، یہ سب کچھ قرآن مجید کے اس بیان کی عملی تصدیق ہے کہ جیسے جیسے اللہ کی مخلوق میں اضافہ ہوگا، وسائل میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا — 'مستقر' کے معنی ایسی جگہ کے ہیں، جہاں تھوڑی مدت کا قیام ہو، اور 'مستودع' ایسی جگہ ہے جہاں زیادہ وقت کے لئے اس کی رہائش ہو؛ اس لئے مستقر سے 'دنیا کا گھر' مراد ہے اور مستودع سے قبر، یعنی یہ بات اچھی طرح اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ دنیا میں انسان کا قیام کب تک رہے گا اور کہاں اس کی موت ہوگی اور وہ کہاں دفن کیا جائے گا؟ — ''لوحِ محفوظ'' گویا کائنات کا 'ریکارڈ رجسٹر' ہے، اس میں اللہ کی طرف سے پہلے سے یہ ساری باتیں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

﴿۲﴾ گویا اللہ تعالیٰ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور آسمان وزمین بعد میں پیدا کئے گئے ہیں؛ اس لئے یہ سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا تھا کہ اس کائنات کے پیدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کا اقتدار کس شئے پر قائم تھا؟ تو اس کی وضاحت فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کا تخت پانی پر تھا، اس سے مراد تخت اقتدار ہے، یعنی اس وقت پانی پر اللہ تعالیٰ کی حکومت تھی، اس سے معلوم ہوا کہ زمین وآسمان سے پہلے اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا فرمایا، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوا کہ جیسے اِس وقت زمین کی پشت پر سمندر اور دریا بہہ رہے ہیں، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اُس وقت ہوا کے اوپر پانی کو رکھا گیا تھا۔

وَ لَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ
مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۸ۧ وَ لَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ع ۱/۸
ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۹ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ
ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۱۰ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۱۱ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَ ضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا
لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۱۲ؕ

اور اگر ہم عذاب کو تھوڑے دنوں تک ملتوی رکھیں تو کہنے لگیں گے کہ کیا چیز اس عذاب کو روک رہی ہے؟ یاد رکھو! جس دن اُن پر عذاب آجائے گا تو پھر ٹلے گا نہیں اور جس عذاب کا وہ مذاق اُڑا رہے تھے، وہ ان کو اپنے گھیرے میں لے لے گا ﴿۱﴾ ۸ۧ اگر ہم انسان کو اپنی کوئی نعمت چکھانے کے بعد پھر اس سے چھین لیتے ہیں، تو وہ نا اُمید ہوجاتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے ۹ اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور اس کے بعد ہم راحت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ اب مجھ سے مصیبتیں رخصت ہوگئیں؛ چنانچہ اترانے اور شیخی بگھاڑنے لگتا ہے ﴿۲﴾ ۱۰ۙ سوائے ان لوگوں کے، جنھوں نے صبر کیا اور نیک عمل کرتے رہے، ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے ۱۱ یہ بات توقع سے بعید ہے کہ آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے، آپ ان میں سے بعض کو چھوڑ بیٹھیں ﴿۳﴾ اور اس کی وجہ سے آپ کا دل تنگ ہوجائے، اس بنا پر کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اُتارا گیا، یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ (حالاں کہ) آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر چیز پر اختیار رکھنے والے تو اللہ ہی ہیں۔ ﴿۴﴾ ۱۲ؕ

﴿۱﴾ یعنی کوئی مستحقِ عذاب اس سے بچ نہیں سکے گا۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ سے تعلق کا تقاضہ یہ ہے کہ جب اللہ اپنی نعمتوں سے نوازیں تو بندہ اللہ کا شکر ادا کرے، اگر اللہ ان نعمتوں کو چھین لیں، تو اللہ سے شکوہ نہ کرے اور نہ نا اُمید ہو، پھر جب اللہ کی طرف سے آزمائش دور ہوجائے تو ان میں اور زیادہ فرمانبرداری اور شکر گزاری کا جذبہ کروٹ لینے لگے، آزمائش کے وقت نا اُمیدی و ناشکری اور آزمائشیں ختم ہونے کے بعد کبر وغرور یہ تعلق مع اللہ کے نہ ہونے کا یا کم ہونے کا نتیجہ ہے، —— یہاں دنیوی نعمت کے حاصل ہونے کو 'چکھانے' سے تعبیر کیا گیا ہے؛ چکھی جانے والی چیز معمولی مقدار میں ہوتی ہے، اس میں گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں آخرت کے مقابلے میں مقدار اور کیفیت دونوں ہی اعتبار سے بہت ہی معمولی ہیں۔

﴿۳﴾ یہاں ''لعل'' اُمید ہونے کے معنی میں نہیں ہے؛ بلکہ اُمید نہ ہونے کے معنی میں ہے ''قیل : إن لعل هنا ليست للترجي بل هي للتبعيد'' (روح المعانی: ۱۲/۱۹) اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ 'بعید از توقع' سے کیا ہے۔

﴿۴﴾ سردارانِ مکہ آپ سے نامعقول مطالبات کرتے رہتے تھے، کوئی کہتا کہ اگر آپ نبی ہیں تو غریب کیوں ہیں، (تفسیر الخازن، سورۂ ہود: ۱۲) اسی کا جواب دیا گیا کہ نبی کو حق کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجا جاتا ہے نہ کہ خزانہ دنیا لٹانے کے لئے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ
دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝١٣ فَاِلَّمۡ يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ
لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ۝١٤ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا نُوَفِّ
اِلَيۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِيۡهَا وَهُمۡ فِيۡهَا لَا يُبۡخَسُوۡنَ ۝١٥ اُولٰۤـئِكَ الَّذِيۡنَ لَـيۡسَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا
النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِيۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝١٦ اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ
وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ وَمِنۡ قَبۡلِهٖ كِتٰبُ مُوۡسٰٓى اِمَامًا وَّرَحۡمَةً‌ ؕ اُولٰۤـئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ‌ ؕ وَمَنۡ
يَّكۡفُرۡ بِهٖ مِنَ الۡاَحۡزَابِ فَالنَّارُ مَوۡعِدُهٗ‌ ۚ فَلَا تَكُ فِىۡ مِرۡيَةٍ مِّنۡهُ‌ ۗ اِنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكَ
وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝١٧

کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو آپ نے خود گھڑلیا ہے، آپ فرما دیجئے: ''اگر تم سچے ہو تو اسی کے مثل گھڑی ہوئی دس سورتیں تو لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں بلا سکو، انھیں بھی بلالو؟'' ﴿١﴾ ۝١٣ پھر اگر وہ تمہاری اس بات کو پوری نہ کرسکیں تو جان لو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے اُتارا گیا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، (اے کفر کرنے والو!) پھر کیا اب بھی تم اسلام لاتے ہو؟ ۝١٤ جو لوگ محض دنیوی زندگی اور اس کی رونق کے طلب گار ہوتے ہیں، ان کو ہم ان کے اعمال کا پورا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور ان کے ساتھ کمی نہیں کی جاتی ۝١٥ یہی لوگ ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے دوزخ کے سوا کوئی چیز نہیں ہے، جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا تھا، وہ سب اکارت ہو جائیں گے، اور جو کچھ وہ لوگ کر رہے ہیں، وہ بھی بے فائدہ ہیں ﴿٢﴾ ۝١٦ (جو شخص کافر ہو اور دنیا کا طالب ہو، کیا وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے) جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل پر ہو، اس کے ساتھ ایک گواہ (قرآن) بھی موجود ہو، اور اللہ کی طرف سے موسیٰ کی کتاب —— جو رہنما اور باعث رحمت ہے —— (بھی اس پر گواہ ہو؟) ﴿٣﴾ یہی لوگ ہیں، جو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور مختلف گروہوں میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے؛ ﴿٤﴾ لہٰذا آپ قرآن کے سلسلے میں شبہ میں نہ پڑ جائیے، کوئی شک نہیں کہ یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے (اُتاری جانے والی) سچی کتاب ہے؛ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ ﴿٥﴾ ۝١٧

﴿١﴾ عین اس وقت جب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان بپا تھا، قرآن مجید نے بار بار چیلنج کیا، کبھی دس سورتیں لانے کا، کبھی محض ایک سورت لانے کا، اور کبھی صرف ایک آیت لانے کا، (یونس: ٣٨، ہود: ١٣، طور: ٣٤) لیکن عرب جن کو اپنی زبان دانی پر ناز تھا اور جو اسلام کو نیچا دکھانے کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھے، انھیں اس کی ہمت نہیں ہوئی، قرآن مجید کا یہ چیلنج آج بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔

←

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَ یَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿١٨﴾ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٩﴾

اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا، جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور گواہی دینے والے کہیں گے: یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کے بارے میں جھوٹی باتیں کہی تھیں، سن لو! ایسے ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿١﴾ ﴿١٨﴾ جو خدا کے راستے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اس میں شبہات نکالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ ﴿١٩﴾

← ﴿٢﴾ اصل میں تو یہ آیت کافروں سے متعلق ہے کہ اگر یہ کچھ اچھے کام بھی کرتے ہیں تو چوں کہ آخرت پر ان کا یقین نہیں ہے، صرف دنیا کا فائدہ مقصود ہے؛ لہٰذا وہ دنیا ہی کے لئے کرتے ہیں اور دنیا ہی میں اللہ کی طرف سے ان کو اس کا فائدہ بھی مل جاتا ہے، آخرت میں اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا —— اس میں مسلمانوں کے لئے بھی سبق ہے کہ جس عمل کا مقصد اللہ کی رضا اور آخرت کا اجر نہ ہو، ریا اور دکھاوے کے جذبہ کے ساتھ کئے گئے ایسے عمل پر آخرت میں کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا۔

﴿٣﴾ اس آیت میں ''کھلی ہوئی دلیل، موجود گواہ'' اور ''پہلے گواہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں؛ لیکن جو بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کھلی ہوئی دلیل سے مراد خود رسول اللہ ﷺ کی ذات والاصفات ہے، آپ کی پاکیزہ و بے داغ زندگی بجائے خود آپ کے سچے ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے، ''گواہ'' سے مراد قرآن مجید ہے؛ کیوں کہ اپنے معنوی محاسن، واقعاتی صداقت، تعبیر و بیان کی خوبصورتی اور لوگوں کا اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہونا، غرض کہ ہر جہت سے یہ گواہی دے رہی ہے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تصنیف نہیں ہے؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے، ''ومن قبله كتاب موسیٰ'' کے معنی یہ ہیں کہ قرآن سے پہلے بھی، تورات وانجیل نبوت محمدی کی گواہی دیتی رہی ہے، اس طرح تین تین دلیلیں اور گواہیاں نبوت محمدی ﷺ کی صداقت اور قرآن کی حقانیت پر جمع ہوگئی ہیں، اس کے باوجود جو لوگ ایمان لانے سے انکار کریں، وہ اور ایمان لانے والے کیسے برابر ہوسکتے ہیں؟ —— یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ''تورات'' کا ذکر فرمایا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب ''انجیل'' کا ذکر نہیں آیا، غالباً اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے؛ بلکہ آپ شریعتِ موسوی ہی پر عمل کی دعوت دیتے تھے؛ گویا ایک درجہ میں انجیل تورات کے تابع تھی؛ اس لئے اس کا مستقلاً ذکر نہیں فرمایا گیا۔

﴿٤﴾ یعنی اب قیامت تک انسانیت کی نجات و فلاح قرآن مجید اور اسوۂ نبوی ہی سے متعلق ہے، قرآن پر ایمان لائے اور قرآن مجید کی تفسیر ''اُسوۂ محمدی'' کو قبول کئے بغیر کسی شخص کا ایمان معتبر نہیں ہوسکتا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہی ہوگا۔

﴿٥﴾ اس میں بظاہر رسول اللہ ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے؛ لیکن حقیقت میں عام لوگوں سے خطاب ہے؛ کیوں کہ آپ ﷺ پر تو خود قرآن مجید نازل ہورہا تھا، تو آپ ﷺ کے شک وشبہ میں مبتلا ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

﴿١﴾ یہ گواہی دینے والے فرشتے ہوں گے، جو انسان کے تمام افعال کو دیکھ بھی رہے ہیں اور بعض ان کو نوٹ کرنے پر بھی مامور ہیں۔

وقف لازم
اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ
لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٠﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ
الْاَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ
ع ٢ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۫ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٦﴾

یہ لوگ زمین میں اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کا مددگار ہو سکتا ہے، ان کو دوہرا عذاب ہوگا، ﴿١﴾ یہ تو (بغض و عداوت کی وجہ سے) نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے ﴿٢﴾ ﴿٢٠﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے آپ اپنا نقصان کرلیا اور انھوں نے جو معبود تراش لئے تھے، وہ سب ان سے غائب ہوگئے، ﴿٢١﴾ ضرور یہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے ہوں گے، ﴿٢٢﴾ یقیناً جو لوگ ایمان لائے، نیک عمل کیا اور اپنے پروردگار سے عاجزی کی، ﴿٣﴾ یہی لوگ جنتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے ﴿٢٣﴾ ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک تو اندھا اور بہرا اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا، کیا دونوں کا حال برابر ہوسکتا ہے؟ پھر کیا تم لوگ غور نہیں کرتے؟ ﴿٢٤﴾ اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، (اس نے کہا): میں تم کو صاف صاف ڈراتا ہوں کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو ﴿٢٥﴾ مجھے تم پر ڈر لگتا ہے کہ تم ایک دردناک دن کے عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے۔ ﴿٢٦﴾

﴿١﴾ ان کو دہرا عذاب اس لئے ہوگا کہ یہ عقیدۂ حق کو قبول کرنے سے گریز کر رہے تھے اور دوسروں کو بھی روک رہے تھے۔

﴿٢﴾ یعنی ان کا بغض و عناد اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ تو احکام الٰہی کو سننے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں، اور جب انسان پہلے سے کسی چیز کو نہ ماننے کی ٹھان لے اور مجبوری میں کسی بات کو سن لے یا دیکھ لے تو ظاہر ہے کہ وہ حقیقت اور سچائی کو سمجھ نہیں سکتا اور اسے ماننے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

﴿٣﴾ ''اِخبات''، یعنی عاجزی اختیار کرنے کا لفظ بڑا ہی جامع ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے خشوع و خضوع، اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری، یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ٢١/٩)

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٩﴾ وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣٠﴾

تو نوح کی قوم میں سے کفر کرنے والے سرداروں نے کہا: ''ہم تو تجھ کو ہم ہی جیسا ایک انسان پاتے ہیں اور ہم میں سے جو کم تر لوگ ہیں، انھوں نے ہی بغیر سوچے سمجھے تمہاری پیروی کی ہے اور ہمیں تو نظر نہیں آتا کہ تم کو ہم پر کوئی امتیاز حاصل ہے؛ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو'' ﴿٢٧﴾ نوح نے کہا: ''اے میری قوم! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی جانب سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت (یعنی نبوت) سے نوازا ہے، پھر وہ چیز تم کو سُجھائی نہ دے، تو کیا باوجودیکہ تم اس سے بیزار ہو؟ ہم تم کو اس (کے قبول کرنے) پر مجبور کر سکتے ہیں ﴿٢٨﴾ اور اے میری قوم! میں تو اس پر تم سے کسی مال کا بھی طلب گار نہیں ہوں، میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے ﴿١﴾، اور میں ایمان لانے والوں کو چھوڑ نہیں سکتا کہ یہ لوگ بھی اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں؛ البتہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ نادانی سے کام لے رہے ہو ﴿٢﴾ ﴿٢٩﴾ اور اے میری قوم! اگر میں ان کو چھوڑ دوں، تو اللہ کے مقابلے کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم غور نہیں کرتے۔ ﴿٣٠﴾

﴿١﴾ عام طور پر جو لوگ کوئی ڈھونگ رچاتے ہیں، ان کا مقصد اپنے تقدس کی عمارت کھڑی کرنا اور لوگوں سے نذرانے وصول کرنا ہوتا ہے؛ اسی لئے ہر قوم میں آنے والے نبی نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ میں تم سے کسی نذر و نیاز اور اُجرت و تنخواہ کا طلب گار نہیں ہوں، اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ داعی کو ان لوگوں سے اپنی ذات کے لئے کوئی مالی مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، جن کو وہ دعوت دے رہا ہے۔

﴿٢﴾ انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ دنیا میں ہر چیز کو مادیت کی ترازو میں تولتا ہے، وہ انسان کی قدر و قیمت، علم و عمل اور اخلاق و کردار کے ذریعہ متعین نہیں کرتا؛ بلکہ مال و اسباب کے ذریعہ سے متعین کرتا ہے اور جو لوگ مادی اعتبار سے کمزور ہیں، ان کو اتنا حقیر سمجھتا ہے کہ اُن کے ساتھ بیٹھنا بھی نہیں چاہتا ہے؛ لیکن مسلمانوں اور خاص کر دینی رہنماؤں کی شان یہ ہے کہ وہ مادی وسائل سے مرعوب نہ ہوں؛ بلکہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے لوگوں کو درجہ دیں۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ
تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣١﴾
قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٣٢﴾
قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ
اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٤﴾
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿٣٥﴾ ع ١١ ٣/٢

اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ مجھے غیب کی باتوں کا علم ہے اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، ﴿۱﴾ اور جو لوگ تمہاری نظر میں حقیر ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ اللہ ان کو بھلائی سے نہیں نوازیں گے، ان کے دلوں میں جو کچھ ہے، اس سے اللہ ہی بخوبی واقف ہیں، اگر میں ایسا کہوں تو ظالم قرار پاؤں گا'' ﴿٣١﴾ ان لوگوں نے کہا: ''تم نے ہم لوگوں سے جھگڑ لیا اور بہت جھگڑ چکے؛ لہٰذا اگر تم سچے ہو تو اس چیز کو لے ہی آؤ، جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہے رہو'' ﴿٣٢﴾ نوح نے کہا: ''اگر اللہ کو منظور ہوگا تو اللہ اس کو تمہارے سامنے لے آئیں گے اور تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے ﴿۲﴾ ﴿٣٣﴾ اگر میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں؛ لیکن اللہ کو تمہیں گمراہ رکھنا ہی منظور ہو تو میری نصیحت تمہیں کچھ کام نہ آئے گی، وہی تمہارا پروردگار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے'' ﴿٣٤﴾ (اے رسول!) کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد نے خود قرآن گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اپنی طرف سے اسے گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ ہی پر ہے اور میں تم لوگوں کے گناہ سے بریٔ الذمہ ہوں۔ ﴿٣٥﴾

﴿۱﴾ یعنی پیغمبر اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوتا ہے، وہ اللہ کے خزانہ کا مالک نہیں ہوتا کہ جس کو جو چاہے دے دے، اس سے ان خوش عقیدہ لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کو مختارِ کل یا بزرگوں کو کائنات میں متصرف سمجھتے ہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ انبیاء کو غیب کا علم حاصل نہیں ہوتا، عالم الغیب صرف اللہ کی ذات ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء بھی بشر ہی ہوتے ہیں، انبیاء فرشتوں کی طرح نوری مخلوق نہیں ہوتے؛ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام سے کہلایا گیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اور نبی کے فرشتہ نہ ہونے کی حکمت یہ ہے کہ نبی اپنے متبعین کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہوتا ہے اور انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ فرشتہ کو اپنے لئے نمونہ بنائے۔

﴿۲﴾ حضرت نوح علیہ السلام نے عذاب کی پیشین گوئی کرتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ اگر اللہ کو منظور ہوگا ''إن شاء'' انبیاء کی شان یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ہر عمل کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور وضاحت کردیتے ہیں کہ جو بھی واقعہ پیش آتا ہے، اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے؛ تاکہ بعد کے لوگوں کو غلط فہمی نہ ہوجائے اور وہ انبیاء کو قادر و مختار نہ سمجھنے لگیں۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا
يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ
مُّغْرَقُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَ كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ
تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿٣٨﴾

اور نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، تمہاری قوم میں سے ان کے سوا کوئی اور ہرگز ایمان نہیں لائے گا؛ لہٰذا تم ان لوگوں کی حرکتوں پر رنجیدہ نہ ہو ﴿١﴾ ﴿٣٦﴾ اور ہماری نگرانی میں ہمارے حکم سے کشتی بناؤ ﴿٢﴾ نیز (دیکھو) مجھ سے ان ظالموں کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرنا، یہ سب ضرور غرق کردیئے جائیں گے ﴿٣﴾ ﴿٣٧﴾ اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان پر ان کی قوم کے سردار گزرتے تو ان کا مذاق اُڑاتے، نوح کہتے: اگر تم ہم پر ہنس رہے ہو، تو تمہارے ہی ہنسنے کی طرح ہم بھی تم پر ہنسیں گے۔ ﴿٣٨﴾

﴿١﴾ یعنی رنجیدہ تو ان پر ہونا چاہئے جو قابل رحم ہوں، اس قوم نے ظلم و زیادتی اور کفر و شرک پر اصرار کے ذریعے اللہ کے عذاب کو خود خرید لیا ہے اور یہ قطعاً اس لائق نہیں ہیں کہ اُن پر رنجیدہ ہوا جائے۔

﴿٢﴾ اس زمانہ میں سمندری سفر کا آج کل کی طرح رواج نہیں تھا؛ اس لئے ایسی بڑی جہاز نما کشتی بھی نہ بنتی رہی ہوگی؛ لہٰذا ہماری نگرانی میں ہمارے حکم سے کشتی بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کی تعلیم دی اور ان ہی تعلیمات کی روشنی میں انھوں نے کشتی بنائی، تفسیری روایتوں میں ہے کہ یہ کشتی کم سے کم تین سو ہاتھ لمبی، چوڑی تھی، اس کی تین منزلیں تھیں، نچلی منزل چرند و پرند اور درندہ جانوروں کے لئے، درمیانی منزل کھانے پینے کی چیزوں کے لئے اور بالائی منزل انسانوں کے لئے، سانپ بچھو بھی اس شرط کے ساتھ داخل کئے گئے کہ کسی سوار کو نقصان نہ پہنچائیں گے؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ''سلام علی نوح فی العالمین'' (الدر المنثور، تفسیر سورۂ ھود: ٤٠) پڑھ لے تو اس کو سانپ بچھو نقصان نہ پہنچائیں گے، (تفسیر قرطبی: ٩/ ٣٢) —— معلوم ہوا کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کوئی بری بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ انبیاء کی سنت ہے، صنعت وٹکنالوجی میں مسلمانوں کو آگے بڑھنا چاہئے اور جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی یہ کشتی لوگوں کو بچانے کے لئے تھی؛ اسی طرح صنعت وحرفت ایسی ہونی چاہئے، جو لوگوں کے لئے نافع ہو نہ کہ مہلک اور نقصان دہ۔

﴿٣﴾ جب کسی فرد یا گروہ کے بارے میں یہ بات متعین ہو جائے کہ اس کی موت کفر ہی پر ہونی ہے اور دنیا میں یا آخرت میں اس پر اللہ کا عذاب آنا یقینی ہے، تو پھر ان کے لئے دُعاء مغفرت کرنا جائز نہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بارے میں یہ بات پہلے سے طے ہو چکی تھی کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے اور عنقریب عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے؛ اس لئے ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کی گذارش کرنا جائز نہیں تھا، نبی چوں کہ اپنی اُمت پر بے حد شفیق ہوتا ہے؛ اس لئے اندیشہ تھا کہ کہیں غلبۂ محبت میں حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے ان کی بخشش کے لئے دُعاء کر بیٹھیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے ہی متنبہ فرما دیا، معلوم ہوا کہ انبیاء کی دُعاء بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے دائرے ہی میں ہوتی ہے، اسی سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا کہ جس شخص کا انتقال کفر کی حالت میں ہو، اس پر نماز جنازہ پڑھنا، یا اس کے لئے ایصالِ ثواب کرنا جائز نہیں۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ
اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ
الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَ قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا
وَ مُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون اُس عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے، جو کبھی ختم نہ ہوسکے گا؟ ﴿۳۹﴾ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور تنور ﴿۱﴾ سے پانی اُبلنا شروع ہوگیا، تو ہم نے کہا: ہر قسم میں سے ایک ایک نر اور مادہ —— یعنی دو عدد —— کشتی میں چڑھا لیجیے، اور جن کے بارے میں پہلے (ہی عذاب کا) فیصلہ ہو چکا ہے، ان کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو، نیز دوسرے ایمان والوں کو بھی سوار کر لیجیے، اور نوح کے ساتھ بس تھوڑے ہی لوگ ایمان لائے تھے ﴿۲﴾ ﴿۴۰﴾ نوح نے کہا: ''تم لوگ کشتی میں سوار ہوجاؤ، اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا بھی ہے اور ٹھہرنا بھی، بے شک میرے پروردگار بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں''۔ ﴿۳﴾ ﴿۴۱﴾

﴿۱﴾ تنور سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں؛ لیکن دو قول زیادہ مشہور ہیں، ایک: یہ کہ اس سے وہی مشہور تنور مراد ہے جس میں روٹی وغیرہ پکائی جاتی ہے، یہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، دوسرے: یہ کہ اس سے زمین کی اوپری سطح مراد ہے، بہر صورت اس میں اللہ کی قدرت کا اظہار ہے، جہاں آگ جلائی جاتی ہو، وہاں کی زمین میں نمی تک نہیں ہوتی؛ لیکن وہاں سے پانی بالکل اوپر کی سطح سے نکل آیا، گویا قدرت کا اشارہ تھا کہ یہ عام پانی کی طرح نہیں ہے؛ بلکہ ایک غیر معمولی طوفان کا پیش خیمہ ہے، یہ تنور کہاں واقع تھا جس سے پانی اُبلنا شروع ہوا، اس سلسلے میں مختلف اقوال منقول ہیں، ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ تنور ہندوستان میں تھا، (ملخص از: مفاتیح الغیب: ۵۲۶/۸) اگر یہ رائے درست ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہندوستان میں ہوئی تھی اور قوم نوح علیہ السلام اسی خطہ میں واقع تھی۔

﴿۲﴾ زوجین یعنی نر و مادہ دونوں کو اس لئے لیا گیا؛ تاکہ دوبارہ ان کی نسل چلتی رہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن جانوروں کی پیدائش میں نر و مادہ کا دخل نہیں تھا، وہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار نہیں تھے، حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے خاندان کے ان لوگوں کو سوار کرنے کی اجازت نہیں تھی، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں طے ہو چکا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے، معلوم ہوا کہ دنیا تو اسباب کی جگہ ہے اور اس لئے یہاں رشتہ و تعلق کام آجاتا ہے؛ لیکن آخرت میں صرف ایمان ہی کام آئے گا اور رشتوں کا تو کیا شمار نبی کی قرابت بھی ایمان و عمل کے بغیر کام نہیں آئے گی؛ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی بیوی اور اپنے لڑکوں —— سام، حام، یافث —— کو تو ان کی بیویوں کے ساتھ سوار کر لیا؛ لیکن کنعان اور اس کی بیوی جو آپ پر ایمان نہیں لائی تھی، ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا۔ (مفاتیح الغیب: ۵۲۹/۸)

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ سواری پر چڑھتے ہوئے بھی اللہ کا ذکر کرنا چاہئے اور خاص کر دریائی سفر میں: ''بسم اللہ مجرٖھا و مرسٰھا'' پڑھنا چاہئے، جیسے کشتی یا پانی جہاز پانی میں تیرتا ہے، اسی طرح ہوائی جہاز بھی فضا میں ہوا کی پشت پر تیرتا رہتا ہے؛ اس لئے ←

وَ هِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَ نَادٰى نُوْحُ ۨ ابْنَهٗ وَ كَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا
وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ
مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ وَ قِيْلَ يٰۤاَرْضُ
ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَ يٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَ غِيْضَ الْمَآءُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ اسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَ قِيْلَ
بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

کشتی ان لوگوں کو لے کر پہاڑ جیسی موجوں کے درمیان چلی جارہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو —— جو کچھ فاصلہ پر تھا —— آواز دی: اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجاؤ اور کافروں کے ساتھ مت رہو ﴿۴۲﴾ اس نے کہا: میں کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا، جو مجھے پانی سے بچالے گا، نوح نے کہا: آج اللہ کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا، سوائے اس کے کہ جس پر اللہ ہی ترس کھائیں اور (اس کے بعد) ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی؛ چنانچہ وہ بھی ڈوب گیا ﴿۱﴾ ﴿۴۳﴾ اور حکم دیا گیا: اے زمین، اپنے پانی کو نگل جا، اے آسمان! تھم جا اور پانی گھٹ گیا اور قصہ تمام ہوگیا، نیز کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی اور کہہ دیا گیا کہ ظالموں پر لعنت ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۴۴﴾

← مناسب ہے کہ جب جہاز ایر پورٹ کے رَن وے پر چلنا شروع کرے تو خشکی کے سفر کی دُعاء ''سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا له مقرنین'' پڑھی جائے اور جب جہاز پرواز کرنا شروع کرے تو ''بسم اللہ مجرھا و مرسھا'' پڑھا جائے۔ واللہ اعلم

﴿۱﴾ مشہور ہے کہ اِن صاحبزادہ کا نام ''کنعان'' تھا، بعضوں نے ''حام'' کہا ہے، (تفسیر قرطبی: ۹/۳٦) انھوں نے اسے عام قسم کا طوفان سمجھا اور سوچا کہ بازو میں تیرنے کی طاقت ہے اور اونچے پہاڑ موجود ہیں، پھر کسی اور سہارے کی کیا ضرورت ہے؟ جب انسان کی اللہ کی طرف سے پکڑ ہوتی ہے تو غرور وتکبر اسی طرح اُسے الٹی اور غلط سوچ میں مبتلا کر دیتا ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ پانی کی موجیں پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی پندرہ ہاتھ اونچی تھیں، غالباً یہ مقدار بائبل سے لی گئی ہے، تورات کے صحیفہ ''پیدائش'' میں بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔ (پیدائش: ۷-:۱۷-۲۱)

﴿۲﴾ تفسیری روایتوں میں ہے کہ ۱۰/رجب کو حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے، چھ ماہ چلتی رہی، اس درمیان ''بیت اللہ شریف'' کا سات چکر طواف بھی کیا، جس کو اللہ تعالیٰ نے اوپر اُٹھالیا تھا، بالآخر ۱۰/محرم کو ''جودی'' نامی پہاڑ کی چوٹی پر رُک گئی، تب اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مطابق زمین نے پانی جذب کرلیا اور اوپر سے بارش تھم گئی، جس روز کشتی زمین پر لگی، اس دن حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رفقاء کے ساتھ روزہ رکھا، (تفسیر قرطبی: ۹/۳٦) ممکن ہے کہ ۱۰/محرم کا روزہ حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے ہی شروع ہوا ہو، —— تورات میں طوفان کی مدت کہیں پانچ مہینہ چالیس دن بتائی گئی ہے، (پیدائش: ۲۴) کہیں اس سے کم اور کہیں اس سے زیادہ، تورات کے بیان کے مطابق کشتی ''اراراط'' پہاڑ پر رُکی (پیدائش: ۸:۵) ''اراراط'' ایک پہاڑی سلسلہ ہے، اسی کی ایک چوٹی کا نام ''جودی'' ہے؛ اس لئے قرآن مجید اور بائبل کے بیان میں کوئی تضاد نہیں، کہا جاتا ہے کہ سطح زمین سے اس پہاڑ کی بلندی تین ہزار فٹ ہے، (تفسیر ماجدی: ۱۰۸/۳) گویا اس طوفان کی موجیں تین ہزار فٹ بلندی پر اپنا غضب دکھا رہی تھیں۔

وَ نَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ
الْحٰكِمِیْنَ ﴿٤٥﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖۗ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ
لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا
لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿٤٧﴾ قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ
بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿٤٨﴾

اور نوح نے اپنے پروردگار سے التجا کی: اے میرے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میرے ''گھر والوں'' میں داخل ہے
اور یقیناً آپ کا وعدہ سچا ہے اور آپ ہی سب سے بڑے حاکم ہیں ﴿٤٥﴾ اللہ نے ارشاد فرمایا: بے شک اس کے عمل
اچھے نہیں ہیں؛ لہٰذا تم ایسی چیز کی درخواست نہ کرو، جس سے تم واقف نہیں ہو، میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادان
نہ بن جاؤ ﴿١﴾ ﴿٤٦﴾ نوح نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں اس بات سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ آئندہ آپ
سے ایسی چیز کی درخواست کروں، جس کا مجھے علم نہ ہو، اور اگر آپ مجھے معاف نہ کردیں اور مجھ پر رحم نہ فرمائیں تو
میں نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوجاؤں گا ﴿٢﴾ ﴿٤٧﴾ ارشاد ہوا: اے نوح! اُتر جاؤ، تم پر اور تمہارے ساتھ رہنے
والے گروہوں پر ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہوں گی اور دوسرے ایسے گروہ بھی ہوں گے، جنھیں ہم کچھ
دنوں عیش کا موقع دیں گے، پھر ان کو ہمارا دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ ﴿٣﴾ ﴿٤٨﴾

﴿١﴾ غالباً حضرت نوح علیہ السلام کا یہ لڑکا منافق تھا، کھلے طور پر کفر میں مبتلا نہیں تھا، عدم واقفیت کی بنا پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے دُعاء کی تھی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو جس بات کا علم نہیں ہے، اس کے بارے میں سوال نہ کرو ''فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم''۔

﴿٢﴾ ایک پیغمبرِ خدا کی بندگی و عاجزی دیکھئے کہ اپنے عمل کی دلیل پیش کرنے کی بجائے فوراً اپنی کوتاہی کا اعتراف فرمالیا اور عفو ودرگذر کی درخواست کرنے لگے؛ ورنہ عرض کرسکتے تھے کہ جب میں واقف ہی نہیں تھا تو پھر میرا کیا قصور کہ مجھے تنبیہ کی جارہی ہے؟

﴿٣﴾ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے ڈھیر سارے وسائل بھی تو مطلوب تھے اور طوفان نے ان سب کا خاتمہ کردیا تھا، غالباً اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا گیا: ''سلام منا'' (میری طرف سے سلامتی کے ساتھ) یعنی زندگی کی بقاء و سلامتی کے وسائل بھی سب میسر ہوں گے اور ان میں برکت بھی رہے گی، یعنی یہ قائم و دائم بھی رہیں گے، سلامتی اور برکت کی خوشخبری نہ صرف حضرت نوح علیہ السلام کے لئے دی گئی؛ بلکہ ان کے رفقاء اور ان کی اولاد و ذریت کے لئے بھی دی گئی؛ کیوں کہ اُمت ایک فرد کو نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ ایک گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں؛ لیکن بالآخر نسل انسانی میں جو مسلسل اضافہ ہوتا رہا، ←

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ
فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٩﴾ وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾ يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى
الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٥١﴾ وَ يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ
عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا
بِبَيِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٣﴾

ع ٤

یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، جن کو وحی کے ذریعے ہم آپ تک پہنچاتے ہیں، ان سے نہ آپ پہلے واقف تھے اور نہ آپ کی قوم واقف تھی ﴿۱﴾؛ لہٰذا آپ صبر کیجئے، یقیناً بہتر انجام تقویٰ اختیار کرنے والوں ہی کے لئے ہے ﴿٤٩﴾ اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان ہی کے بھائی ہود کو بھیجا، انھوں نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے سوا میرا کوئی اور معبود نہیں، تم تو (اللہ کا شریک ٹھہرا کر) محض بہتان لگا رہے ہو، ﴿۲﴾ ﴿٥٠﴾ اے میری قوم! میں اس پر تم سے کسی معاوضہ کا بھی مطالبہ نہیں کرتا، میرا اجر تو صرف اس ذات کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ ﴿٥١﴾ اور اے میری قوم! تم اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، پھر اسی سے رُجوع ہو جاؤ، اللہ تم پر موسلا دھار بارش برسائیں گے اور تمہاری طاقت میں خوب اضافہ کر دیں گے، ﴿۳﴾ تم گناہ کرتے ہوئے منھ نہ پھیرلو'' ﴿٥٢﴾ ان لوگوں نے کہا: ''اے ہود! تم ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آئے ہو اور ہم محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہ اپنے معبودوں کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ تم پر ایمان لا سکتے ہیں۔ ﴿٥٣﴾

← وہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین مسلمان صاحبزادوں —— سام، حام، یافث —— سے، اس طرح تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں؛ اسی لئے قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ہم نے نوح کی ''ذریت'' ہی کو باقی رکھا: ''وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبَاقِيْنَ'' (الصافات: ۷۷) پھر یہ بھی واضح فرما دیا گیا کہ اب جو نسل چلے گی، یہ سب کی سب مسلمان ہی نہ ہوگی؛ بلکہ اس میں ایمان نہ لانے والے بھی ہوں گے، جن کو دنیا میں چند دنوں کا عیش دیا جائے گا اور اس کے بعد ہمیشہ کا دردناک عذاب ہوگا۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۸/ ۴۵-۳۴۴)

﴿۱﴾ یعنی گذشتہ انبیاء اور ان کی اقوام کے ان واقعات کے علم کا آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے؛ لہٰذا یقیناً یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے!

﴿۲﴾ قومِ عاد کا ذکر اعراف: ۶۵-۷۲ میں آچکا ہے۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام پر قائم رہنے میں صرف آخرت ہی کی بھلائی نہیں ہے، دنیا کی بھی کامیابی ہے اور اس کی وجہ سے یہاں بھی اللہ کی رحمتیں متوجہ ہوں گی۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٥٥﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ
وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٦﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ
اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿٥٧﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿٥٨﴾ وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ
وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٥٩﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا
كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿٦٠﴾ ع ۵ ۱۱ ۵

ہم تو کہتے ہیں کہ ہمارے بعض معبودوں نے تم کو کسی بیماری میں مبتلا کردیا ہے'' ﴿۱﴾ ہود نے کہا: ''میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم لوگ بھی گواہ رہو کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ﴿٥٤﴾ لہٰذا تم لوگ سب مل کر میرے بارے میں (نقصان پہنچانے کی) تدبیریں کرلو، پھر مجھ کو مہلت بھی نہ دو ﴿٥٥﴾ میرا تو اللہ پر بھروسہ ہے، جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی، کوئی جاندار نہیں جس کی پیشانی اس کے ہاتھ میں نہ ہو، بے شک میرے پروردگار سیدھے راستہ پر ہیں ﴿۲﴾ ﴿٥٦﴾ پھر اگر تم لوگ منھ موڑتے ہو تو مجھے جو پیغام لے کر تمہاری طرف بھیجا گیا تھا، وہ میں تم کو پہنچا چکا، میرے پروردگار تمہاری جگہ کسی اور قوم کو آباد کردیں گے اور تم اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے، بے شک اللہ ہر چیز پر نگہبان ہیں'' ﴿٥٧﴾ اور جب ہمارا حکم (یعنی: عذاب) آپہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بچالیا اور ہم نے انھیں ایک نہایت سخت عذاب سے محفوظ رکھا ﴿٥٨﴾ اور یہ قوم عاد تھی جس نے اپنے پروردگار کی باتوں کا انکار کیا تھا، اس کے رسولوں کی نافرمانی کی تھی اور وہ ظالموں اور سرکشوں کی پیروی کرتے رہے، ﴿٥٩﴾ اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی لعنت ان کے پیچھے لگادی گئی ہے، یاد رکھو کہ قوم عاد نے اپنے پروردگار کا انکار کیا تھا، سن لو! ہود کی قوم عاد پر لعنت ہے! ﴿۳﴾ ﴿٦٠﴾

﴿۱﴾ یعنی جنون اور دماغی خلل۔ (مفاتیح الغیب: ۸/ ۵۵۲)

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہی سیدھے راستہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔

﴿۳﴾ سورۂ ہود میں سات انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعہ کی اہمیت کی وجہ سے اس سورہ کا نام ''سورۂ ہود'' ہے، یہ ایک طاقتور اور بہادر قوم تھی، (الفجر: ۸) جو بت پرستی میں مبتلا تھی، (ہود: ۵۳-۵۴) ان پر طوفانی ہوا کا عذاب آیا، (فصلت: ۱۶) جو انھیں بلندی تک اُڑاتی اور پھر اوندھے زمین پر دے مارتی تھی، (مجمع الزوائد: ۷/ ۱۱۳، حدیث نمبر: ۱۱۳۶۶) ←

وقف لازم

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ هُوَ أَنشَأَكُم
مِّنَ الْأَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا فَاسْتَغْفِرُوهُ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي قَرِيبٌ مُّجِيبٌ ﴿٦١﴾
قَالُوا يَا صَالِحُ قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَٰذَا ۖ أَتَنْهَانَا أَن نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا
لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي
وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾
وَيَا قَوْمِ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ
فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ وَعْدٌ
غَيْرُ مَكْذُوبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ
خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان ہی کے بھائی صالح کو بھیجا، صالح نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اللہ
کے سوا تم لوگوں کا کوئی معبود نہیں، اللہ ہی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور زمین میں بسایا ہے؛ لہٰذا اسی سے
گناہوں کی معافی چاہو، پھر اسی کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا پروردگار قریب ہے اور قبول کرنے والا ہے'' ﴿٦١﴾
ان لوگوں نے کہا: ''اے صالح! تم سے تو اس سے پہلے ہم لوگوں کو بڑی اُمیدیں تھیں، کیا تم ہمیں اس بات سے منع
کرتے ہو کہ جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، ہم بھی ان کی عبادت کریں؟ تم جس بات کی طرف بلا
رہے ہو، ہم کو اس کے بارے میں ایسا شک ہے کہ دل نہیں مانتا'' ﴿٦٢﴾ صالح نے کہا: ''اے میری قوم! بتاؤ تو سہی،
اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پاچکا ہوں اور مجھے اس نے اپنی رحمت سے نوازا ہے ﴿١﴾، پھر بھی
میں اس کی نافرمانی کروں، تو پھر مجھے اللہ سے کون بچائے گا؟ تم تو مجھے اور زیادہ نقصان ہی پہنچاؤ گے ﴿٦٣﴾ اور اے
میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے، تم اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اس کو برائی کے
ساتھ ہاتھ بھی نہ لگاؤ، ورنہ تم کو بہت جلد عذاب آ پکڑے گا'' ﴿٦٤﴾ پھر بھی ان لوگوں نے اس کو مار ڈالا؛ چنانچہ صالح
نے کہا: اب تم لوگ اپنے گھروں میں تین دن اور رہ بس لو، یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوسکتا، ﴿٦٥﴾ پھر جب ہمارا
حکم آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات عطا فرمادی اور اس دن کی
رسوائی سے بچالیا، بے شک آپ کے پروردگار بڑی قوت والے اور غلبہ والے ہیں۔ ﴿٦٦﴾

← اس طرح یہ پوری قوم ہلاک و برباد کردی گئی، صرف حضرت ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے بچ گئے۔ (ہود:٥٨)

﴿١﴾ یعنی مجھے اپنا نبی بنایا؛ کہ نبی بنائے جانے سے بڑھ کر کونسی رحمت ہوسکتی ہے؟

وَ اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ
اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ع ۶
قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ
نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَامْرَاَتُهٗ
قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ
وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

اور جن لوگوں نے زیادتی کی تھی، ان کو ایک ہولناک آواز نے آ پکڑا؛ چنانچہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے، ﴿۱﴾ ﴿۶۷﴾ جیسے وہ کبھی اس جگہ بسے ہی نہ تھے، سن لو! ثمود نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، سن لو کہ ثمود کے لئے پھٹکار ہے، ﴿۲﴾ ﴿۶۸﴾ اور ابراہیم کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے خوشخبری لے کر آئے، فرشتوں نے سلام کیا، ابراہیم نے بھی سلام کا جواب دیا، پھر کچھ دیر نہ لگی کہ ابراہیم ایک تلا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے ﴿۶۹﴾ جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں، تو اس کو ان سے وحشت ہونے لگی اور دل ہی دل میں ان سے ڈرنے لگا، فرشتوں نے کہا: ڈرو مت، ہم لوگ قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۷۰﴾ ابراہیم کی بیوی کھڑی ہوئی تھی، وہ ہنس پڑی تو ہم نے انھیں اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی ﴿۷۱﴾ وہ کہنے لگی: ہائے خرابی! کیا میں بڑھیا ہو کر بچہ جنوں گی؟ اور یہ میرے شوہر بھی بالکل بوڑھے ہیں، واقعی یہ تو بڑے ہی تعجب کی بات ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۷۲﴾

﴿۱﴾ یہ ایک غیر معمولی آواز تھی، قرآن مجید نے یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز کس چیز کی تھی؟ نہ صحیح حدیثوں میں اس کا ذکر آیا ہے؛ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ بجلی کی کڑک تھی اور بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی چیخ تھی۔ (مفاتیح الغیب: ۸/ ۵۶۴)

﴿۲﴾ حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر اعراف: ۷۳-۷۹ میں آ چکا ہے۔

﴿۳﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ انعام: ۷۴، نیز بعض اور آیات میں آ چکا ہے، یہاں کئی باتیں قابل ذکر ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ان فرشتوں کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی تعداد تین تھی: حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام، بعضوں نے آنے والے فرشتوں کی تعداد نو یا گیارہ بھی ذکر کی ہے، دوسرے: اس آیت سے معلوم ہوا کہ آنے والے مہمان کو چاہئے کہ میزبان کو سلام کرے اور سلام میں اس کو پہل کرنی چاہئے، دوسرے: میزبان کو سلام کا جواب دینا چاہئے، تیسرے: میزبان کو آنے والے شخص کی ضیافت کرنی چاہئے، یہاں تک کہ مشہور فقیہ ''لیث بن سعد'' کے نزدیک تو مہمان نوازی واجب ہے، چوتھے: جب مہمان آئے تو کھانا پیش کرنے میں جلدی کرنی چاہئے اور جو بے تکلف پیش کر سکیں، کرنا چاہئے، ←

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ
مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَ جَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ
اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ
وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَ ضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا وَّ قَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

فرشتوں نے کہا: کیا تمہیں اللہ کے حکم پر تعجب ہے؟ اے خاندان کے لوگو! تم پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں، بے شک اللہ بے حد تعریف کے لائق اور بڑی شان والے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۷۳﴾ پھر جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور اس کے پاس خوشخبری بھی آگئی تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا، ﴿۲﴾ ﴿۷۴﴾ واقعی ابراہیم بڑا بردبار، نرم گو اور رقیق القلب تھا، ﴿۳﴾ ﴿۷۵﴾ (ارشاد باری ہوا) اے ابراہیم! اس سلسلے میں بات نہ کرو، اب تو تمہارے پروردگار کا حکم آچکا ہے اور ان پر عذاب آنے ہی والا ہے، جو ٹل نہیں سکتا ﴿۷۶﴾ اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی وجہ سے وہ بہت رنجیدہ ہوئے، اُن کے دل میں کڑھن پیدا ہونے لگی اور کہنے لگے: آج کا دن بڑا سخت ہے۔ ﴿۷۷﴾

← پانچویں: جب کھانا پیش کیا جائے تو مہمان کو چاہئے کہ جلدی اور رغبت ظاہر کرتے ہوئے کھانا کھائے؛ تاکہ میزبان کے لئے خوشی کا باعث ہو، چھٹے: مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ میزبان نظر گڑائے بغیر دیکھتا رہے کہ مہمان کھاتا ہے یا نہیں؟ تاکہ اس کو متوجہ کرسکے، (ملخص از: تفسیر قرطبی: ۹/ ۶۲-۶۵) —— غالباً اس قوم میں جو لوگ غلط ارادہ مثلاً لوٹ مار کے لئے —— کسی کے گھر جاتے تھے، وہ ان کے یہاں کھانا نہیں کھاتے تھے؛ اسی لئے جب فرشتوں نے ہاتھ روک لیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گھبراہٹ ہوئی۔

﴿۱﴾ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے؛ لیکن ابھی تک حضرت سارہ علیہا السلام کی گود خالی تھی؛ اس لئے اس خوشخبری پر کہ آپ کو اسحاق اور پھر اسحاق کو یعقوب پیدا ہوں گے، ایک طرف مسرت بھی ہوئی اور بے ساختہ مسرت آمیز ہنسی بھی آگئی، اور دوسری طرف اپنے بوڑھاپے کی وجہ سے تعجب بھی ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت بہ قدر ضرورت مرد غیر محرم عورت سے اور عورت غیر محرم مرد سے گفتگو کرسکتے ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام خوب الحاح اور گریہ وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجا کرنے لگے کہ قوم لوط سے عذاب ٹل جائے۔

﴿۳﴾ معلوم ہوا کہ داعی دین اور رہنمائے قوم کو بردبار، خوش اخلاق اور بات چیت میں نرم مزاج ہونا چاہئے۔

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ
بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾
قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ
قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

اورلوط کے پاس ان کی قوم دوڑی ہوئی آدھمکی اور وہ پہلے ہی سے بدکاریاں کیا کرتے تھے، لوط کہنے لگے: یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، جوتمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں، ﴿۱﴾ تم اللہ سے ڈرواور مجھے میرے مہمانوں کے معاملے میں رسوانہ کرو، کیاتم میں کوئی بھی بھلاآدمی نہیں ہے؟ ﴿۷۸﴾ وہ لوگ کہنے لگے: آپ کوخوب معلوم ہے کہ ہمیں آپ کی بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں اورہم جو چاہتے ہیں اس سے بھی آپ خوب واقف ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۷۹﴾ لوط کہنے لگے: کاش! مجھے تم لوگوں پرقابوحاصل ہوتا، یامیں کسی مضبوط سہارے کی پناہ پاتا۔ ﴿۳﴾ ﴿۸۰﴾

﴿۱﴾ نبی کی حیثیت اُمت کے مقابلے میں ایک شفیق باپ کی سی ہوتی ہے؛اس لئے حضرت لوط علیہ السلام نے کہا کہ یہ جوتمہاری بیویاں ہیں، یہ میری بیٹیاں ہی تو ہیں،تم ان سے اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہو، یہ تمہارے لئے حلال ہیں اور جو چیز حلال ہوتی ہے، وہ روحانی اعتبار سے پاکیزہ ہوتی ہے، افسوس کہ اس حلال طریقہ کوچھوڑ کرتم اپنے ہم جنس کی طرف دوڑتے ہواورفطرت کے خلاف عمل کرنا چاہتے ہو۔

﴿۲﴾ جیسے شراب ایک گندی اور بدبودار شئے ہے؛لیکن جولوگ اس کے عادی ہوجاتے ہیں، ان کواسی میں لطف آنے لگتا ہے، اسی طرح قوم لوط خلافِ فطرت فعل کے عادی ہوگئے تھے؛ اس لئے انھیں عورتوں سے رغبت نہیں تھی، نوجوان لڑکوں سے اپنی خواہش پوری کیا کرتے تھے۔

﴿۳﴾ اصل سہاراتو اللہ کی ذات ہے؛لیکن یہ دنیا اسباب کی جگہ ہے، یہاں اسباب کے درجہ میں کسی ظاہری سہارے کی ضرورت پڑتی ہے؛اس لئے حضرت لوط علیہ السلام نے اسی کا ذکرفرمایا کہ یا تو میں اتنا طاقتور ہوتا کہ ان کا مقابلہ کرسکتا، یا کوئی ایسی جماعت میرے ساتھ ہوتی جومدافعت میں میری مدد کرتی اور میرا سہارا بنتی، حضرت لوط علیہ السلام نے یہ بات اس وقت فرمائی، جب حضرت لوط علیہ السلام کے لاکھ سمجھانے اورخوشامد کرنے کے باوجودقوم ان کے گھر پر چڑھی آرہی تھی، یہاں تک کہ دروازہ توڑنے اور دیوار میں نقب لگانے کے درپے تھی، فرشتوں نے اب تک اپنی حقیقت حضرت لوط علیہ السلام پرظاہرنہیں کی تھی، حضرت لوط علیہ السلام کی اس بیقراری کو دیکھ کرفرشتوں نے اپنا تعارف کرایا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ آپ دروازہ سے ہٹ جائیں اورانھیں اندرآنے دیں، وہ جیسے ہی اندرداخل ہوئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پرمارا، جس سے یہ سب اندھے ہوکر بھاگے اور کہنے لگے: بچاؤ، بچاؤ، لوط کے گھر میں روئے ارض کے سب سے بڑے جادوگرآگئے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۹/ ۷۸-۷۹) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پررحم فرمائیں کہ جوایک طاقتورسہاراحاصل کرنے پرمجبور ہوگئے، اس کے بعد جب بھی اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کوبھیجا، تواس کے کنبہ کواس کا حمایتی بنادیا، (بخاری: کتاب احادیث الأنبیاء، حدیث نمبر: ۳۳۷۲، ۶۹۴۹، مسنداحمد: ۸۹۶۲) چنانچہ بنوہاشم اوربنومطلب یہ سبھی اگرچہ کہ رسول اللہ پرایمان نہیں لائے تھے، مگراس کے باوجود انھوں نے پوری طرح آپ کی پشت پناہی کی۔

قَالُوۡا يٰلُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡۤا اِلَيۡكَ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ وَ لَا يَلۡتَفِتۡ
مِنۡكُمۡ اَحَدٌ اِلَّا امۡرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيۡبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمۡ ؕ اِنَّ مَوۡعِدَهُمُ الصُّبۡحُ ؕ اَلَيۡسَ النصف
الصُّبۡحُ بِقَرِيۡبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ
ع ۱۵ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنۡدَ رَبِّكَ ؕ وَ مَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۳﴾ وَ اِلٰى مَدۡيَنَ
اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ وَ لَا تَنۡقُصُوا الۡمِكۡيَالَ
وَالۡمِيۡزَانَ اِنِّىۡۤ اَرٰٮكُمۡ بِخَيۡرٍ وَّاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ مُّحِيۡطٍ ﴿۸۴﴾

فرشتوں نے کہا: اے لوط! ہم آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے،
آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے کسی حصہ میں نکل جائیں اور آپ میں سے کوئی مُڑ کر بھی نہ دیکھے، سوائے آپ
کی بیوی کے، (کہ وہ دیکھے بغیر نہ رہے گی)، جو آفت اِن لوگوں پر آنے والی ہے، وہ اس پر بھی آئے گی ﴿۱﴾، ان پر
(عذاب کا) مقررہ وقت صبح کا ہے، کیا صبح قریب ہی نہیں ہے؟ ﴿۸۱﴾ پھر جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے زمین کے اوپر کی
سطح کو نیچے کی سطح بنا دیا اور ہم نے ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش کر دی، جو لگا تار گر رہے تھے، ﴿۲﴾ ﴿۸۲﴾ جو
آپ کے پروردگار کی طرف سے نشان زد تھے ﴿۳﴾ اور یہ بستی اِن ظالموں سے کچھ دور بھی نہیں ہے! ﴿۴﴾ ﴿۸۳﴾ اور مَدیَن کی
طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، انھوں نے کہا: ''اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی
عبادت کے لائق نہیں، اور ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودہ حال دیکھ رہا ہوں (اس لئے تم کو ایسا کرنے کی
ضرورت بھی نہیں ہے) اور مجھے تم پر ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے جو سب کو گھیرے میں لے گا۔ ﴿۵﴾ ﴿۸۴﴾

﴿۱﴾ عبرت کا مقام ہے کہ شوہر و بیوی کا رشتہ قریب ترین رشتہ ہوتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود جب حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی ایمان نہیں لائیں اور اللہ کی نافرمانی کا راستہ اختیار کیا تو نبی سے ازدواجی رشتے کی نسبت بھی بچا نہیں سکی، تورات میں بھی ذکر ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی نے پیچھے سر پھیر کر دیکھا اور وہ نمک کا کھمبا بن گئی۔ (پیدائش: ۱۹:۲۶)

﴿۲﴾ اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لئے پتھروں کی بارش ہی کافی تھی؛ لیکن سطح زمین کو بھی پلٹ دیا گیا، شاید اس میں ان کے جرم کی مناسبت تھی کہ جیسے انھوں نے قانون فطرت کو اُلٹ کر رکھ دیا تھا، ایسے ہی زمین کو ان پر اُلٹ کر رکھ دیا گیا، تورات میں ہے کہ ان پر گندھک اور آگ کی بارش برسائی گئی، (پیدائش: ۱۹:۲۳-۲۵) غالباً اس میں کوئی تضاد نہیں؛ کیوں کہ جب آتش فشاں پھٹتے ہیں تو ان کے لاوے رنگ میں پکی ہوئی مٹی اور سختی میں پتھر کے مانند ہوتے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چوں کہ عام فطرت سے ہٹ کر بطور عذاب کے پتھر برسائے گئے تھے، اس لئے ان پر ایک خاص طرح کا نشان بھی تھا۔

﴿۴﴾ قوم لوط کی یہ بستی اُردن کے پاس دریائے یَرون کی وادی میں واقع تھی، جن کے دو بڑے شہر سدوم اور عمُورہ کہلاتے تھے، جہاں اب بحر مردار واقع ہے، اہل مکہ کا شام کے سفر میں اس علاقہ سے گزر ہوتا تھا؛ اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ قوم ←

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي
الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ
بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ
اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾

اور اے میری قوم! انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا رکھا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو، ﴿۱﴾ ﴿٨٥﴾ اللہ کا دیا ہوا جو بچ رہے، وہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم واقعی ایمان والے ہو ﴿۲﴾ اور میں تم پر پہرہ دار تو ہوں نہیں'' ﴿٨٦﴾ وہ لوگ کہنے لگے: کیا تمہاری نماز تم کو سکھاتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی ہمارے آباء واجداد پوجا کیا کرتے تھے، یا ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کریں؟ ﴿۳﴾ واقعی تم تو بڑے ہی ''باوقار'' اور ''نیک چلن'' آدمی ہو! ﴿۴﴾ ﴿٨٧﴾

← لوط کی جائے عبرت تمہارے قریب ہی ہے، ایسا نہ ہو کہ تم بھی اللہ کی نافرمانی کرو اور عذابِ خداوندی میں مبتلا کئے جاؤ۔

﴿۵﴾ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۂ اعراف آیت نمبر: ٨٥ تا ٩٣ میں آچکا ہے۔

﴿۱﴾ موجودہ دور میں ایسی تدبیریں اختیار کرنا جن سے افراطِ زر پیدا ہوتا ہو، سکوں کی قدر گھٹ جاتی ہو، جعلی نوٹ چھاپنا، یا کسی ملک کا بین الاقوامی قانون نظر انداز کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ کرنسی چھاپ لینا بھی ناپ تول میں کمی ہی کی شکلیں ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ مثلاً ایک شخص نے دس سال پہلے ایک لاکھ روپے قرض دیئے، اب وہ قرض وصول کرتا ہے تو اس کی قوت خرید آدھی سے بھی کم ہو جاتی ہے۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ کی طرف سے جو حلال روزی تمہیں میسر ہے، چاہے کم ہو، وہ تمہارے لئے اس حرام سے بہتر ہے جو اللہ کی پکڑ کا باعث بن جائے۔

﴿۳﴾ اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان کے پاس جو دولت ہے، وہ اللہ کی امانت ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی اس میں تصرف کرنے کی گنجائش ہے، ہر زمانہ میں مادیت پرست نظام معیشت کی بنیاد اسی پر رہی ہے کہ ہم اپنے مال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کر سکتے ہیں، چاہے اس سے دوسروں کو فائدہ ہو یا نقصان، سود، قمار، ذخیرہ اندوزی، مارکٹ میں مصنوعی طور پر قلت پیدا کرنا یہ سب اسی اُصول پر مبنی ہیں، موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ نظام کی اساس بھی یہی ہے کہ جس طور پر بھی ہو سکے، اپنی دولت میں اضافہ کیا جائے، چاہے اس کے لئے دوسروں کا خون چوسنا پڑے، حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اسی مزاج کی حامل تھی۔

﴿۴﴾ ان کی یہ بات طنز کے طور پر تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ رَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ مَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَ يٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْۤ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَاۤ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَ لَوْ لَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْۤ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

شعیب نے کہا: ’’اے میری قوم! غور تو کرو جب میں اپنے پروردگار کی جانب سے واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے عمدہ رزق بھی عطا فرمایا ہے (تو کیا میں تمہاری طرح باطل معبودوں کی پرستش کروں اور ناپ تول میں کمی کر کے زیادہ کماؤں) اور میں نہیں چاہتا کہ میں تمہیں جن کاموں سے روک رہا ہوں، میں خود ان کو کرنے لگوں، ﴿۱﴾ میں تو جہاں تک ہو سکے اصلاح ہی چاہتا ہوں اور میری کامیابی اللہ ہی کے فضل سے ہے، میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رُجوع کرتا ہوں، ﴿۲﴾ ﴿۸۸﴾ اور اے میری قوم! تمہیں میری مخالفت اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا نہ کر دے، جو نوح یا ہود یا صالح کی قوموں پر آچکی ہے اور قوم لوط تو تم سے دور بھی نہیں ہے ﴿۸۹﴾ اور اپنے رب سے گناہوں کی معافی چاہو، پھر اسی کی طرف لوٹ آؤ، بے شک میرے پروردگار! بڑے مہربان اور بے حد محبت کرنے والے ہیں‘‘ ﴿۹۰﴾ لوگوں نے کہا: اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہمیں سمجھ میں نہیں آتیں اور ہم تو تم کو اپنے میں کمزور ہی دیکھ رہے ہیں، ﴿۳﴾ اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تو تم کو سنگسار کر چکے ہوتے اور ہماری نگاہ میں تمہاری کوئی عزت نہیں ہے ﴿۹۱﴾ شعیب نے کہا: ’’اے میری قوم! کیا تمہارے نزدیک اللہ کے مقابلہ میرے خاندان کی زیادہ اہمیت ہے؟ اور اللہ ہی کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو یقیناً اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ داعی اور رہنما کا فریضہ ہے کہ وہ جس بات کی دعوت دے، خود اُس کا بھی اس پر پورا پورا عمل ہو۔

﴿۲﴾ یعنی داعیانِ دین کی کوشش تو مخلوق پر ہو؛ لیکن نظر خالق پر ہونی چاہئے؛ کیوں کہ اللہ کی مدد کے بغیر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

﴿۳﴾ مادہ پرست قوموں کا مزاج پہلے بھی یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ وہ انسان کو اور اس کی دعوت کو دلیل و اخلاق کی ترازو میں تولنے کی بجائے، طاقت اور دولت سے تولتے ہیں اور جو شخص اس پہلو سے پیچھے ہو، اس کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ
هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَ ارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ اَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ
لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا ع ۸/۱۲ ۸
وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ىِٕهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ مَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾
يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ
لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا
قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَ مَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

اور اے میری قوم ! تم اپنی جگہ عمل کئے جاؤ اور میں بھی عمل کر رہا ہوں، عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے؟ تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں'' ﴿۹۳﴾ اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے اپنی مہربانی سے شعیب اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو بچالیا اور ظالموں کو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا، وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے ﴿۹۴﴾ گویا وہ وہاں کبھی آباد ہی نہیں تھے، سن لو! جیسے ثمود پر پھٹکار ہے، ویسے ہی مدین والوں پر بھی پھٹکار ہے؛ ﴿۹۵﴾ اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل لے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا ﴿۹۶﴾ وہ لوگ فرعون ہی کے حکم پر چلتے رہے؛ حالاں کہ فرعون کا حکم بالکل درست نہیں تھا ﴿۹۷﴾ قیامت کے دن فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر ان کو دوزخ میں پہنچادے گا، کیا ہی بری ہے یہ جگہ جہاں یہ پہنچائے جائیں گے؛ ﴿۹۸﴾ ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن کے لئے بھی لعنت لگادی گئی ہے اور کیا ہی برا انعام ان کو دیا گیا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۹۹﴾ (اے رسول!) یہ مختلف بستیوں کی کچھ سرگذشتیں ہیں، جو ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں، ان میں بعض تو موجود ہیں اور بعض بالکل ہی ختم ہوگئی ہیں ﴿۱۰۰﴾ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا ہے؛ بلکہ خود انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے ﴿۲﴾، جب تمہارے پروردگار کا حکم آگیا تو ان کے وہ معبود جنھیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آئے؛ بلکہ اُلٹا ان کو نقصان ہی پہنچایا۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۱﴾

﴿۱﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام، ان کی قوم اور فرعون کا واقعہ سورۂ اعراف میں آیت نمبر: ۱۰۳ تا ۱۷۱، نیز سورۂ یونس میں آیت نمبر: ۷۵ تا ۹۳ میں تفصیل سے آچکا ہے۔

﴿۲﴾ کیوں کہ انھوں نے خدا کے احکام پر عمل نہ کر کے خود ہی اپنے آپ کو عذاب خداوندی کا مستحق بنالیا تھا۔

﴿۳﴾ چنانچہ ان کو دوزخ جیسی تکلیف دہ جگہ میں پہنچادیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾
وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِىٌّ وَّ
سَعِيْدٌ ﴿١٠٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿١٠٦﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى
الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾

اور جب ظلم میں مبتلا بستی والوں پر آپ کے پروردگار کی پکڑ ہوتی ہے تو ایسی ہی ہوتی ہے، بے شک اس کی پکڑ بڑی تکلیف دہ اور سخت ہے، ﴿١٠٢﴾ اس میں ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یہ وہ دن ہے جس میں تمام لوگ جمع ہوں گے اور ایسا دن ہے جس میں سب حاضر کئے جائیں گے، ﴿١﴾ ﴿١٠٣﴾ اور ہم اس کو محض تھوڑی مدت کے لئے مؤخر کئے ہوئے ہیں ﴿٢﴾ ﴿١٠٤﴾ جب وہ دن آئے گا تو کوئی شخص خدا کی اجازت کے بغیر بول بھی نہیں سکے گا، ان میں کچھ تو بدنصیب ہوں گے اور کچھ خوش نصیب ﴿١٠٥﴾؛ چنانچہ جو لوگ بدنصیب ہیں وہ تو دوزخ میں ہوں گے، وہاں وہ چیختے چلاتے رہیں گے، ﴿١٠٦﴾ وہ ہمیشہ ہمیش دوزخ ہی میں رہیں گے، جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہے، سوائے اس کے کہ آپ کے رب کو کچھ اور منظور ہو، ﴿٣﴾ بے شک آپ کے پروردگار جو چاہتے ہیں کر ڈالتے ہیں ﴿١٠٧﴾ اور جو لوگ خوش قسمت ہیں، وہ جنت میں رہیں گے، وہ ہمیشہ ہمیش جنت ہی میں رہیں گے؛ جب تک آسمان وزمین قائم ہے سوائے اس کے کہ آپ کے پروردگار ہی کو کچھ اور منظور ہو، یہ ایسا انعام ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ﴿٤﴾ ﴿١٠٨﴾

﴿١﴾ یعنی قیامت کا دن اور حشر کا میدان۔

﴿٢﴾ اگرچہ بظاہر قیامت کا دن بہت دور معلوم ہوتا ہے؛ لیکن آخرت کی نہ ختم ہونے والی زندگی کے مقابلہ دنیوی زندگی کا یہ عرصہ بہت مختصر ہے۔

﴿٣﴾ لیکن قرآن مجید میں بار بار منشاء ربانی واضح کردیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین ہمیشہ ہمیش دوزخ میں رہیں گے اور کبھی ان کو اس سے رہائی نصیب نہیں ہوگی، یہاں آیت کے اس ٹکڑے ''الا ماشاء ربک'' کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیش ان کو دوزخ میں رکھنے پر مجبور نہیں ہیں۔

﴿٤﴾ دنیا میں انسان کو جو نعمتیں میسر ہیں وہ بھی فانی ہیں اور ان نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے والے بھی فانی ہیں، آخرت کی نعمتیں بھی لافانی ہوں گی اور جن لوگوں کو ان نعمتوں سے نوازا جائے گا وہ بھی لافانی ہوں گے۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَ اِنَّا
لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ لَوْ لَا ع ۹ ۱۴ ۹
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا
لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ
مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

یہ لوگ جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، اس سے آپ شک وشبہ میں نہ پڑ جائیں، بس یہ لوگ اسی طرح پوجتے جارہے ہیں، جیسے ان سے پہلے ان کے آباء واجداد پوج رہے تھے اور ہم بے کم وکاست ان کو ان کا حصہ (عذاب) پہنچا کر رہیں گے ﴿۱﴾ ﴿۱۰۹﴾ اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو اس میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، ﴿۲﴾ اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے پہلے ہی ایک بات مقرر نہ ہوچکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ ہوچکا ہوتا، اور یقیناً وہ ایسے (بے جا) شک میں ہیں جو ان کے لئے تذبذب کا باعث ہے ﴿۳﴾ ﴿۱۱۰﴾ اور جب وقت آئے گا تو آپ کے پروردگار سبھوں کو ان کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیں گے، یقیناً اللہ ان کے اعمال سے باخبر ہیں؛ ﴿۱۱۱﴾ لہٰذا جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے، اسی طرح آپ بھی ثابت قدم رہئے ﴿۴﴾ اور وہ لوگ بھی جنھوں نے آپ کے ساتھ توبہ کی ہے، اور تم لوگ حد سے تجاوز نہ کرو، تم لوگ جو کچھ کرتے ہو، یقیناً اللہ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ ﴿۱۱۲﴾

﴿۱﴾ انسان کی گمراہی کا ایک دیرینہ سبب اپنے آباء واجداد کے طریقے اور سماج میں پائے جانے والے رسم ورواج کی اندھی پیروی بھی رہا کیا ہے؛ لیکن آخرت میں یہ عذر نہ سنا جائے گا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کا دیکھا دیکھی یہ حرکت کی تھی؛ بلکہ اُن کو اُن کے عمل کی پوری پوری سزا ملے گی۔

﴿۲﴾ یعنی آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُترنے والی کتاب سے متعلق اختلاف میں پڑ جانا اور کچھ لوگوں کا اس کو قبول کرنا اور کچھ لوگوں کا قبول نہیں کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے؛ بلکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوا، کچھ نے اس کو مانا اور کچھ نے نہیں مانا۔

﴿۳﴾ یعنی آخرت کے واقع ہونے اور اللہ کی طرف سے بداعمالیوں پر سزا دیئے جانے کے سلسلے میں بے یقینی میں مبتلا ہیں۔

﴿۴﴾ ثابت قدم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو صرف ماننا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ایک دوبار عمل کرلیا جائے، پھر اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزاری جائے؛ بلکہ ضروری ہے کہ پوری زندگی ہمیشہ اللہ کے حکم کے مطابق بسر کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول جامع ارشادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صحابی رسول حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی ایسی مختصر بات بتادیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی اور سے پوچھنا نہ پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قل : أمنت بالله ثم استقم'' (مسلم: کتاب الایمان، باب جامع اوصاف الاسلام، حدیث نمبر: ۱۵۹) یعنی کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر ثابت قدم رہو —— اور صوفیاء کا مشہور قول ہے: ''الاستقامة فوق الكرامة'' یعنی احکام شریعت پر قائم رہنا کرامت سے بڑھ کر ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور ظالموں کی طرف نہ جھک جاؤ، ورنہ ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی دوزخ کی آگ پکڑ لے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ ہو، پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے، ﴿۱﴾ ﴿۱۱۳﴾ دن کے دونوں کناروں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کیجئے، ﴿۲﴾ بے شک نیکی گناہوں کو مٹا دیتی ہے، ﴿۳﴾ یہ نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے یاددہانی ہے۔ ﴿۱۱۴﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کا ظلم اور گناہ سے خود بچنا ہی کافی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والوں سے بے تعلقی برتنا، ان کی صحبت سے بچنا، ان کی حوصلہ افزائی سے باز رہنا اور ان کی ایسی تائید وتوقیر سے اجتناب برتنا بھی ضروری ہے، جو ظلم وزیادتی اور گناہ ونافرمانی کے سلسلے میں ان کا حوصلہ بڑھاتی ہو، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی بدعت کرنے والے کی توقیر کی، اس نے دین کو منہدم کردیا: ''من وقر مبتدعا فقد هدم الدين'' (الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث نمبر: ۹۰۸۲) یہ ارشاد نبوی بھی اس آیت کی تشریح ہے، خاص کر علماء کا بد دین لوگوں کے پاس دنیوی مفادات کے لئے آمد ورفت رکھنا ایک بدترین عمل ہے اور یقیناً ظالموں کی طرف جھکنے میں شامل ہے۔

﴿۲﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دن کے دونوں کناروں کی نماز سے مراد فجر اور مغرب کی نماز ہے، ایسی صورت میں ''زلفا من الليل'' سے مراد عشاء کی نماز ہوگی، گویا اس میں تین نمازوں کا ذکر کیا گیا ہے، جو ابتدائے شب سے انتہائے شب تک مکمل ہوتی ہے، ان اوقات میں اپنے آپ کو عبادت کے لئے فارغ کرنا دشوار ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر ان تینوں نمازوں کا ذکر فرمایا گیا، ایک رائے یہ ہے کہ ''طرفی النهار'' دن کے دونوں کناروں سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے اور ''زلفا من الليل''، یعنی رات کے کچھ حصوں میں نماز سے مراد مغرب، عشاء اور فجر ہے، ایسی صورت میں گویا پانچوں فرض نمازوں کا اس آیت میں ذکر ہے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۹/۱۰۹)

﴿۳﴾ یعنی جیسے دوائیں انسان کو طاقت بھی پہنچاتی ہیں اور بیماری کے اثر کو زائل بھی کرتی ہیں، اسی طرح نیکیاں ثواب بھی پہنچاتی ہیں اور گناہوں کے اثر کو دور بھی کرتی ہیں؛ البتہ یہاں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہے، (تفسیر قرطبی: ۹/۱۱۰) —— حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صاحب نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، اس شخص نے دریافت کیا: اللہ کے رسول! کیا یہ سہولت صرف میرے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لجميع امتي كلهم'' یہی حکم میری پوری اُمت کے لئے ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۵۲۶، ۴۶۸۷) چوں کہ نیکیوں کی وجہ سے برائیوں کے معاف ہوجانے کا ذکر نماز کے پس منظر میں آیا ہے؛ اس لئے بعض اہل علم کے نزدیک گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت کا تعلق نماز سے ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ کوئی مسلمان گناہ کرے اور وضوء کرکے دو رکعت نماز پڑھ لے تو اس کا گناہ معاف کردیا جائے گا: ''ما من مسلم يذنب ذنبا فيتوضاء ويصلي ركعتين الا غفر له'' (ابوداود، حدیث نمبر: ۱۵۲۱) ←

وَ اصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾ فَلَوۡ لَا كَانَ مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ
اُولُوۡا بَقِيَّةٍ يَّنۡهَوۡنَ عَنِ الۡفَسَادِ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّمَّنۡ اَنۡجَيۡنَا مِنۡهُمۡ‌ ۚ وَاتَّبَعَ
الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَاۤ اُتۡرِفُوۡا فِيۡهِ وَكَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى
بِظُلۡمٍ وَّ اَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً‌ وَّ لَا يَزَالُوۡنَ
مُخۡتَلِفِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّكَ‌ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمۡ‌ ؕ وَتَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمۡلَئَنَّ
جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

اور صبر کرتے رہو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے ﴿۱۱۵﴾ جو لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں، ان میں کچھ ایسے سمجھ دار لوگ کیوں نہیں ہوئے ، جو زمین میں فساد مچانے سے روکتے ، سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے، جن کو ہم نے بچالیا تھا اور جو لوگ زیادتی کرنے والے تھے، وہ جس ناز و نعمت میں تھے،اسی کے پیچھے پڑے رہے ﴿۱﴾ اور وہ تھے ہی گنہگار لوگ! ﴿۱۱۶﴾ اور ایسا نہیں ہے کہ آپ کے پروردگار ظلماً بستیوں کو تباہ و برباد کر دیں؛ حالاں کہ وہاں کے لوگ نیک ہوں ﴿۱۱۷﴾ اور اگر آپ کے رب چاہتے تو تمام لوگ ایک ہی راستہ اختیار کر لیتے ، اور (لیکن) وہ ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے ﴿۱۱۸﴾ سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے پروردگار نے مہربانی فرمائی اور اسی (اختلاف باقی رہنے ہی) کے لئے تو ان کو پیدا کیا ہے، اور آپ کے پروردگار کی یہ بات پوری ہوئی کہ ہم دوزخ کو انسانوں اور جناتوں سے بھر دیں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۱۹﴾

← لیکن نماز کے علاوہ اور بھی مختلف اعمال صالحہ پر گناہوں کے معاف کئے جانے کا ذکر احادیث میں مذکور ہے؛ اس لئے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ حکم نماز ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے؛ بلکہ تمام افعال خیر ،صغیرہ گناہوں کے لئے کفارہ بنتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۴۶۲)

﴿۱﴾ یعنی اکثر و بیشتر اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمتیں اور عیش و آرام کے نقشے لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں؛ اس لئے اگر دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں، تو خاص طور پر اپنا محاسبہ کرتے رہنے چاہئے کہ کہیں ہم نفس کے دھوکہ میں آکر غلط راستہ پر تو نہیں چل رہے ہیں۔

﴿۲﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو نہ ہدایت کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور نہ گمراہی کا راستہ اختیار کرنے پر؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق یہ بات مقدر ہے کہ سارے کے سارے لوگ ایک ہی راستہ پر نہیں چلیں گے اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد دوزخ ہی کی طرف جائے گی، اللہ تعالیٰ کا منشا ہی یہی ہے کہ اختلاف باقی رہے؛ تاکہ انسان کا امتحان ہو۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَ جَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ
وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا
عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ
الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ ع ۱۰

اورانبیاء کے یہ واقعات ہم آپ سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہم آپ کے دل کو تسلی دیں، آپ کے پاس ان قصوں کے ضمن میں ایسی بات پہنچی ہے جو حق بھی ہے اور مسلمانوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی بھی، ﴿۱﴾ ﴿۱۲۰﴾ اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ہیں آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم اپنی جگہ عمل کرتے جاؤ اور ہم بھی عمل کرتے جاتے ہیں ﴿۱۲۱﴾ تم بھی انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں ﴿۱۲۲﴾ اللہ ہی کو آسمانوں کی اور زمین کی تمام غیب کی باتوں کا علم ہے، اسی کی طرف سب لوٹائے جاتے ہیں؛ لہٰذا اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو اور جو کچھ تم کررہے ہو، تمہارے پروردگار اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ ﴿۱۲۳﴾

﴿۱﴾ جب کوئی شخص دعوت پیش کرے اور لوگ اسے قبول نہ کریں، وہ ان پر محبت کے پھول پھینکے اور لوگ اس کے راستہ میں نفرت کے کانٹے بچھائیں، وہ لوگوں پر پیار کی شبنم نثار کرتا ہو اور لوگ اس کی طرف دشمنی کے شعلے پھینکتے ہوں، تو فطری بات ہے کہ اس سے انسان رنجیدہ ہوتا ہے اور دل کا آبگینہ چور چور ہوجاتا ہے، انسانی فطرت کے لحاظ سے یہ کیفیت آپ ﷺ پر بھی گزرتی تھی اور آئندہ بھی داعیان حق پر گزرتی رہے گی؛ اسی لئے گذشتہ انبیاء کی یہ سرگزشتیں سنائی گئی ہیں؛ تاکہ آپ کی اور آپ ﷺ کی اُمت میں پیدا ہونے والے داعیان حق کی دل داری ہو اور ایسی باتوں سے ان کے حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں۔

سُورَۃ یُوسُف

- سورہ نمبر : (۱۲)
- رکوع : (۱۲)
- آیتیں : (۱۱۱)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے، جو ایک سو گیارہ (۱۱۱) آیتوں پر مشتمل ہے اور اہم بات یہ ہے کہ یہ پوری سورۃ ایک ساتھ نازل ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کے اُولوالعزم پیغمبروں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام (جن کا نام اسرائیل بھی تھا) بھی نبی تھے، حضرت یوسف علیہ السلام کے دادا حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ کے پیغمبر تھے اور ان کے والد جو حضرت یوسف علیہ السلام کے پردادا ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، جو نہ صرف خود نبی تھے؛ بلکہ ان کے بعد جو انبیاء پیدا ہوئے، وہ عام طور پر ان ہی کی نسل سے تھے اور آخری پیغمبر خود محمد رسول اللہ ﷺ بھی ان ہی کی نسل مبارک سے پیدا ہوئے۔

اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو 'کریم بن کریم بن کریم بن کریم' کہا ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۳۲۰۲) ان کی زندگی کو حضور ﷺ کی زندگی سے بڑی مماثلت تھی، دونوں ہی کا ابتدائی دور صبر و آزمائش، تکلیف و مشقت اور مغلوبیت کا تھا، دونوں ہی اپنے قریبی رشتہ داروں کے بغض و حسد اور عداوت و دشمنی کا نشانہ بنے اور دونوں ہی بالآخر ایسے غالب و فاتح ہوئے کہ مخالفین کی گردنیں ان کے سامنے جھک گئیں، نیز دونوں ہی نے غلبہ پانے کے بعد اپنے مخالفین کے ساتھ بے حد عفو و درگزر کا معاملہ فرمایا۔

یہ سورت پوری کی پوری حضرت یوسف علیہ السلام کی اسی داستانِ حیات پر مشتمل ہے، عام طور پر قرآن مجید میں کسی پیغمبر یا قوم کے واقعات اس طرح آئے ہیں کہ مختلف مقامات پر واقعات کا مختلف حصہ ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر تو سورۂ یوسف کے علاوہ دو اور سورتوں (انعام: ۸۴، غافر: ۳۴) میں بھی آیا ہے؛ لیکن ان سے متعلق تمام واقعات اسی سورہ میں یکجا ذکر کئے گئے ہیں، جس میں قدم قدم پر عبرت و موعظت کے لعل و گوہر بکھرے ہوئے ہیں —— چوں کہ یہ پوری سورت حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ پر مشتمل ہے، اس لئے ان ہی کے نام سے اس کو موسوم کیا گیا ہے۔

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الٓرٰ ۫ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۝۱ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲ نَحْنُ نَقُصُّ
عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖۗ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف ، لام ، را ، ﴿۱﴾ یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ﴿۲﴾ ۝۱ یقیناً ہم نے قرآن کو عربی زبان میں اُتارا ہے؛ تا کہ تم سمجھ سکو ﴿۳﴾ ۝۲ ہم نے آپ پر جو یہ قرآن اُتارا ہے، اس کے ذریعہ ہم آپ سے ایک بہترین قصہ بیان کرتے ہیں؛ حالاں کہ آپ کو پہلے بالکل اس کی خبر نہیں تھی ۔ ﴿۴﴾ ۝۳

﴿۱﴾ ان کو حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے، سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کا ذکر آچکا ہے۔

﴿۲﴾ اکثر و بیشتر مابعد الطبیعی اُمور کو جب بیان کیا جاتا ہے اور فلاسفہ ان کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو ان کی گفتگو نہایت پیچیدہ، اُلجھی ہوئی، عام لوگوں کے لئے نا قابل فہم اور پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی دقت طلب ہوتی ہے، فلسفہ اور عقیدہ وکلام کی کتابوں میں بہ آسانی اس کیفیت کو دیکھا جاسکتا ہے؛ لیکن قرآن مجید کا کمال ہے کہ وہ ایسی باتوں سے بحث کرتا ہے، جو انسان کے ادراک سے باہر ہے اور جن کا تعلق اِس عالم مادّہ سے نہیں ہے؛ لیکن پھر بھی اس کی بات نہایت واضح اور عوام وخواص سب کے لئے سمجھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اس پر دلائل بھی ایسی چیزوں سے پیش کئے جاتے ہیں، جس کو انسان رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جیسے انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر نیند کے بعد بیدار ہونے اور زمین کے خشک اور مردہ ہوجانے کے بعد دوبارہ لہلہا اُٹھنے سے استدلال، یا اللہ تعالیٰ کی توحید پر یہ دلیل کہ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو نظام کائنات درہم برہم ہوجاتا: ''لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا'' (الأنبیاء: ۲۲) کیوں کہ یہ دن و رات کا مشاہدہ ہے کہ چند سربراہ مل کر ایک ملک کا نظام نہیں چلا سکتے، —— پس، قرآن اپنے مضامین اور ان کے دلائل کو پیش کرنے کے اعتبار سے نہایت واضح کتاب ہے۔

﴿۳﴾ ''إنا أنزلناه قرآناً عربیاً'' کا ترجمہ اور طریقوں سے بھی کیا گیا ہے؛ لیکن یہ ترجمہ بعض دوسری آیات کے زیادہ مطابق ہے، جس میں قرآن مجید کے عربی زبان میں نازل کئے جانے کا ذکر ہے، مثلاً: ''... بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ'' (الشعراء: ۱۹۵) چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کا معنی بتاتے ہوئے لکھا ہے: ''یجوز أن یکون المعنی إنا أنزلناه قرآناً عربیاً'' (قرطبی: ۱۰۸/۹) —— اسی آیت میں یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ عربی زبان میں اس کتاب کے نازل کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کے جو اولین مخاطب ہیں، وہ اسے اچھی طرح سمجھ لیں، پھر ان کے ذریعہ یہ پیغام پوری انسانیت تک پہنچے، اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ قرآنی تعلیمات اور شریعت محمدی صرف عربوں کے لئے ہیں؛ بلکہ یہ کتاب پوری انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے؛ جیسا کہ مختلف آیات (السبا: ۲۸، الاعراف: ۱۵۸، الزمر: ۲۷ وغیرہ) واحادیث (صحیح بخاری، باب جعلت لی الارض مسجدا وطهورا، حدیث نمبر: ۴۳۸، وغیرہ) میں اس کی صراحت موجود ہے۔

﴿۴﴾ تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ علماء یہود نے اہل مکہ سے کہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کریں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام سے مصر کس طرح منتقل ہوئی، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ کس طرح پیش آیا؟ (مفاتیح الغیب: ۴۲۶/۸) —— اسی موقع پر یہ پوری سورت نازل کی گئی، ان کا یہ سوال تحقیق کے لئے نہیں تھا؛ بلکہ امتحان کے طور پر تھا؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ←

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ﴿۴﴾

وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے، جب یوسف نے اپنے والد سے عرض کیا: ابا جان! میں نے گیارہ ستاروں کو، سورج کو اور چاند کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کررہے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۴﴾

← آپ ﷺ اس واقعہ سے واقف نہیں تھے، ہم نے آپ ﷺ پر وحی اُتار کر اس سے واقف کرایا ہے، اور مشرکین مکہ کے سوال کا جواب دے دیا ہے؛ لہٰذا یہی جواب آپ ﷺ کے نبی ہونے کی اور آپ ﷺ پر اللہ کا کلام اُتارے جانے کی واضح دلیل ہے؛ کیوں کہ مکہ میں اس واقعہ کا کوئی چرچا نہیں تھا اور آپ ﷺ نے کبھی تورات پڑھی نہیں تھی، نہ یہودیوں سے آپ ﷺ کا کوئی علمی رابطہ تھا اور اگر رابطہ ہوتا بھی تو آپ ﷺ اسی قدر بتا پاتے جو تورات میں ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن قرآن نے بعض ایسی باتیں بھی ذکر کی ہیں، جن کو تورات نے بیان نہیں کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب آپ پر آپ کے خالق و مالک کی طرف سے اُتاری جارہی ہے —— قرآن مجید نے انبیاء اور ان کی اقوام کے بہت سے واقعات عبرت وموعظت کے لئے بیان کئے ہیں؛ لیکن قرآن نے اِس واقعہ کو ''احسن القصص'' (سب سے بہتر قصہ) قرار دیا ہے؛ اس لئے کہ اِس ایک ہی واقعہ میں عبرت وموعظت کی بہت سی باتیں جمع ہوگئی ہیں، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ انسان کی کامیابی وناکامی کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں، اللہ اگر کسی کے لئے کامیاب ہونے کو مقدر کردیں تو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ حسد وجلن انسان کے لئے بالآخر رسوائی کا سبب بنتا ہے اور یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صبر سہولت وآسانی اور کامیابی کی کنجی ہے، (مفاتیح الغیب: ۴۴۸/۸) —— غور کیا جائے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اس وقت مکہ میں مسلمان اسی طرح کے امتحان سے گزر رہے تھے، جس سے حضرت یوسف علیہ السلام دوچار ہوئے تھے؛ اس لئے یہ واقعہ جہاں اہل مکہ کا جواب تھا، وہیں مسلمانوں کے زخم پر مرہم اور ان کی تکلیف ومشقت کے بعد دلداری وتسلی کا سامان بھی تھا۔

﴿۱﴾ قرآن مجید میں مختلف انبیاء کے واقعات تکرار کے ساتھ اور ٹکڑوں میں ذکر کئے گئے ہیں؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام اور ان سے متعلق یہ مکمل واقعہ صرف ایک سورت میں ذکر کیا گیا ہے اور واقعہ کی اتنی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو عام طور پر قرآن مجید میں بیان نہیں کی جاتی ہے، شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر یہود تہمت لگاتے تھے، قرآن مجید نے ان کی ذات سے بہتان تراشی کے اس غبار کو صاف کیا اور غالباً اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت خاص طور پر بیان فرمائی، آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے محترم شخصیت کس کی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو خود نبی تھے، جن کے والد نبی تھے، جن کے دادا نبی تھے، اور جن کے پردادا خلیل اللہ تھے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام (بخاری: کتاب الانبیاء، باب أم کنتم شهداء الخ، حدیث نمبر: ۳۱۹۵) اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ''کریم ابن کریم بن کریم ابن کریم'' قرار دیا، (بخاری: کتاب الانبیاء، باب أم کنتم شهداء الخ، حدیث نمبر: ۳۲۰۲) —— حضرت یوسف علیہ السلام نے جو یہ بات کہی کہ انھوں نے چاند، ستاروں اور سورج کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، اس سے خواب کی حالت مراد ہے، جیسا کہ آگے حضرت یعقوب علیہ السلام کے جواب سے ظاہر ہے کہ اپنا خواب کسی سے بیان نہ کرنا، گیارہ ستاروں سے ان کے گیارہ بھائی اور سورج، چاند سے والد اور والدہ مراد ہیں، اور سجدہ کرنے کی تعبیر یہ ہے کہ یہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کے اقتدار کے تحت آجائیں گے اور ان کے سامنے تواضع اختیار کریں گے، (مفاتیح الغیب: ۶۴۸/۸) یا ان کو تعظیم واحترام کے طور پر سجدہ کریں گے؛ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ خواب بعینہٖ حقیقت بن کر ظاہر ہوا۔

قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۵ وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ
عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
ع ٢ ١١ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۶

انھوں نے جواب دیا: ’’میرے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا؛ ورنہ وہ تمہارے خلاف سازشیں کرنے لگیں گے، یقیناً شیطان تو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے ہی، ﴿۱﴾ ۵ اسی طرح تمہارے پروردگار تم کو منتخب کریں گے، تمھیں خوابوں کی تعبیر کا علم دیں گے اور تم پر اور یعقوب کی اولاد پر اپنی نعمت پوری فرمائیں گے، جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے باپ، دادا —— ابراہیم و اسحاق —— پر اپنی نعمتیں پوری فرمائی تھیں‘‘ یقیناً آپ کے پروردگار بڑے علم اور حکمت والے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۶

﴿۱﴾ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں ’بنیامین‘ ان کے سگے بھائی تھے اور بقیہ دس سوتیلے بھائی، حضرت یوسف علیہ السلام کی اور ان کی والدہ الگ الگ تھیں، سوتیلا پن سے اکثر رقابت اور حسد کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے؛ اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے انھیں اپنا خواب بیان کرنے سے منع فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ چاہے کسی شخص کا تعلق خانوادۂ نبوت اور نیک لوگوں کے گھرانہ سے ہو، پھر بھی اس میں اچھے اور برے دونوں طرح کے جذبات موجود ہوتے ہیں، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہر خواب کا سچا ہونا ضروری نہیں ہے؛ لیکن بعض خواب سچے بھی ہوتے ہیں، ایسے خواب بعض اوقات غیر مسلم حضرات بھی دیکھتے ہیں، سیرت کی کتابوں میں اس نوعیت کے بعض واقعات موجود ہیں؛ لیکن اللہ کے نیک بندوں کو اس طرح کے خواب نسبتاً زیادہ دکھائے جاتے ہیں، جس میں کبھی ان کے لئے خوشخبری ہوتی ہے، کبھی مستقبل کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور کبھی تنبیہ ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو بعض خوابوں میں فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی، غزوۂ اُحد کے موقع سے آپ ﷺ نے ایک ایسا خواب دیکھا، جس میں مسلمانوں کے نقصان کی طرف اشارہ تھا، نیز بعض احکام بھی آپ ﷺ کو خواب کے ذریعہ دیئے گئے، جیسے: صلح حدیبیہ کے موقع سے مکہ کا سفر کرنے کا حکم؛ اس لئے انبیاء کا خواب تو حجت و دلیل ہے اور وحی میں شامل ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبوت کا ایک جزء باقی رہ گیا ہے، جو اللہ کے نیک بندوں کو بھی میسر ہوگا کہ ان کو سچے خواب دکھائے جائیں گے: ’’أنه لم يبق من مبشرات النبوة إلا الرؤيا الصادقة في النوم‘‘ (سنن أبي داود، كتاب الصلوٰة، باب في الدعاء في الركوع والسجود، حدیث نمبر: ۸۷۶) حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب دیکھا تو وہ نابالغ تھے، مفسرین کے بیان کے مطابق ان کی عمر مبارک اس وقت سات یا بارہ سال کی تھی، (مفاتیح الغیب: ۸/۴۵۰، تفسیر قرطبی: ۹/۱۲۶) اس لئے اگرچہ یہ خواب حجت و دلیل کا درجہ نہیں رکھتا تھا؛ کیوں کہ حجت تو نبی کا خواب ہوتا ہے اور نبوت اس عمر میں دی جاتی ہے، جب انسان بالغ ہو چکا ہو؛ بلکہ وہ فہم و شعور کے اعتبار سے بھی پختگی کو پہنچ گیا ہو؛ البتہ یہ ایک سچا خواب تھا، جو حرف بہ حرف پورا ہوا۔

﴿۲﴾ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس فرمان میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ اول یہ کہ اللہ ان کو ←

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝۷ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۝۸ۚۖ

یقیناً یوسف اور اس کے بھائیوں کے معاملہ میں دریافت کرنے والوں کے لئے (آپ کی نبوت کی) دلیلیں موجود ہیں، ﴿۱﴾ ۝۷ وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب یوسف کے بھائیوں نے گفتگو کی کہ یوسف اور اس کے بھائی ہمارے والد کے ہم سے زیادہ چہیتے ہیں؛ حالاں کہ ہم لوگ ایک مضبوط گروہ ہیں، یقیناً ہمارے والد کھلی ہوئی غلطی میں مبتلا ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۸

← منتخب کریں گے، منتخب کرنے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کو نبوت و رسالت کے لئے چنیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حکومت واقتدار پر تمہارا انتخاب کریں گے، یہ دوسرا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ نبوت کی طرف حضرت یعقوب علیہ السلام نے آگے اشارہ فرمایا ہے، دوسری بات یہ فرمائی کہ تمہیں خوابوں کی تعبیر کا علم دیں گے، بیداری میں جو چیز سنی جاتی ہے یا دیکھی جاتی ہے، وہ بالکل واضح ہوتی ہے، خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے وہ اشارات ہوتے ہیں؛ اس لئے ان کو سمجھنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے، نیز حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہی علم ایک خوشگوار انقلاب کا باعث بننے والا تھا اور اس کے ذریعہ وہ قید کی تنہائی سے نکل کر تختِ اقتدار پر جلوہ افروز ہونے والے تھے؛ اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا؛ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مختلف اور باتوں کا علم مراد لیا ہے؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے پس منظر میں یہ تشریح زیادہ واضح ہے، تیسرے یہ کہ جو نعمت اللہ نے تمہارے باپ، دادا ابراہیم واسحاق علیہما السلام کو دی تھی، وہی نعمت تمہیں بھی عطا فرمائیں گے، اس سے مراد نبوت سے نوازا جانا ہے کہ جیسے حضرت ابراہیم واسحاق علیہما السلام نبوت سے نوازے گئے، اسی طرح تمہیں بھی اس عظیم سعادت سے نوازا جائے گا۔

﴿۱﴾ اہل مکہ نے یہودیوں کے اُکسانے پر آپ ﷺ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تھا، قرآن نے صرف اس سوال کا جواب ہی نہیں دیا؛ بلکہ فرمایا کہ اس میں ان کے لئے عبرت ونصیحت کے بہت سے پہلو ہیں، مثلاً مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء اسی طرح مجبور ومقہور تھے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، ان کے بھائی جوان اور طاقتور تھے، نیز تعداد کے اعتبار سے بھی فوقیت رکھتے تھے، جیسا کہ مشرکین مکہ، جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اپنے وطن سے نکال پھینکا، اسی طرح آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے رشتہ داروں نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کا اقتدار حاصل ہوا اور ان کے بھائیوں نے ان کے سامنے گردنیں جھکا دیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ مدینہ میں فرمانروا بنے اور بالآخر اہل مکہ کو ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا پڑا، پھر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا تھا، اسی طرح فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا، اس لئے سوال کرنے والوں کو متنبہ کیا گیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے عبرت حاصل کریں، مسلمانوں کی کم تعداد اور مادی نعمتوں سے محرومی کی بنا پر ان کو حقیر نہ سمجھیں اور یاد رکھیں کہ ان کے عروج واقبال کا ستارہ بلند ہونے والا ہے۔

﴿۲﴾ انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی طاقت وقوت اور تعداد کی کثرت کو دیکھ کر اس کے قریب ہو جاتا ہے؛ لیکن ماں باپ میں شفقت کا غیر معمولی عنصر رکھا گیا ہے، اس کے تحت ان کا حال یہ ہے کہ وہ اچھے اخلاق وعادات اور اولاد کی کمزوری وناطاقتی کو ←

اقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا
صٰلِحِیْنَ ۝۹ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ
السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝۱۰

یوسف کو یا تو قتل ہی کر ڈالو یا کسی علاقہ میں پھینک آؤ؛ تاکہ تمہارے والد کی توجہ پوری طرح تمہاری طرف ہوجائے اور اس کے بعد تم لوگ شریف بن جاؤ﴿۱﴾ ۝۹ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: اگر تم کو کرنا ہی ہے تو یوسف کو قتل نہ کرو؛ بلکہ اس کو کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو؛ تاکہ کوئی گذرنے والا اسے نکال لے جائے۔﴿۲﴾ ۝۱۰

← دیکھ کر اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اخلاق وعادات کی وجہ سے محبت پیدا ہوتی ہے اور کمزوری و بیچارگی کی وجہ سے شفقت ورحم دلی کا جذبہ اُبھرتا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی میں یہ دونوں باتیں جمع تھیں، وہ اخلاق وعادات کے اعتبار سے بھی اپنے بھائیوں سے بہتر تھے اور کم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ توجہ کے مستحق بھی تھے؛ اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کی توجہ اپنے اِن دونوں بیٹوں کی طرف زیادہ تھی، اس کے پیچھے ناانصافی یا جانبداری کا جذبہ کارفرما نہیں تھا؛ بلکہ یہ ایک فطری جذبہ تھا، جو ہر ماں باپ میں ہوتا ہے، اس کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اپنے باپ کی غلطی تصور کرلیا؛ حالاں کہ یہ سوچ خود غلط تھی، انسان کا ایک بچہ تین چار سال کا اور ایک اُٹھارہ بیس سال کا ہو تو وہ تین چار سال کے بچے کو گود میں لیتا ہے، اسے اپنے آپ سے چمٹاتا ہے، اس سے پیار کرتا ہے، یہ ایک فطری تقاضہ ہے، یہ بڑی عمر کے بچوں کے ساتھ ناانصافی نہیں —— تورات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے نام ذکر کئے گئے ہیں، (پیدائش: ۳۵: ۲۳-۲۶) مگر ان کے نقل کرنے کا فائدہ نہیں اور قرآن کے ان ناموں کے ذکر نہ کرنے میں شاید یہ حکمت ہو کہ بلاضرورت غلطی کا ارتکاب کرنے والوں کے نام ذکر کرنا اخلاق ومروت کے خلاف ہے۔

﴿۱﴾ شیطان کے دھوکہ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ جرم کرنے کے عادی نہیں ہوتے اور جن میں ایمان کی چنگاری اور خدا کے خوف کی کوئی کیفیت باقی ہوتی ہے، وہ ان کو پھنسانے کے لئے کہتا ہے کہ توبہ کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے ہی، بس ایک دفعہ گناہ کرلو، پھر اچھے طریقہ پر زندگی گزار لینا، یہی بات شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دل میں ڈالی؛ حالاں کہ توبہ کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ انسان پہلے سے گناہ کا ارادہ دل میں چھپائے رکھے اور پھر توبہ کرلے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کو اپنے گناہ پر پشیمانی وندامت نہیں ہے، اور ندامت کے بغیر توبہ ہو ہی نہیں سکتی —— اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان اللہ کی توفیق سے ہی گناہوں سے بچ سکتا ہے؛ ورنہ پیغمبروں سے قرابت اور ان کی صحبت بھی اللہ کی توفیق کے بغیر گناہوں سے بچا نہیں سکتی۔

﴿۲﴾ یہ مشورہ دینے والے اگرچہ اس اجتماعی سازش میں شامل تھے؛ لیکن پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے اور خدا کے خوف سے بالکل خالی نہیں تھے، یہ کون صاحب تھے؟ اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے صاحبزادے یہوذا تھے، بعض حضرات نے کچھ اور بھائیوں کے نام ذکر کئے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۹/۱۳۲) وہ چاہتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسے کنویں میں ڈالا جائے، جس میں پانی نہ ہو کہ وہ ڈوب نہ جائیں؛ چنانچہ تورات ←

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

سبھوں نے کہا: اے ہمارے ابا جان ! کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے ؟ حالاں کہ ہم لوگ تو اس کے خیر خواہ ہیں ﴿۱۱﴾ آپ کل یوسف کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ خوب کھائے ، کھیلے ، ہم لوگ اس کی پوری حفاظت کریں گے ﴿۱۲﴾ یعقوب نے کہا: مجھے اس بات سے گھبراہٹ ہوتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں بھیڑیا اسے کھا نہ جائے اور تم لوگ اس سے غافل رہ جاؤ۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۳﴾

← میں ہے کہ اس کنویں میں بالکل پانی نہ تھا، (پیدائش: ۲۴:۲:۷)اور وہ رہ گزر پر بھی ہو؛ تاکہ کوئی قافلہ گذرتے ہوئے انھیں لے کر چلا جائے ، یعنی یوسف کی موت بھی نہ ہو اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظر سے اوجھل بھی ہوجائیں ؛ تاکہ قتل کے گناہ سے بھی بچ جائیں اور والد کی توجہ بھی پوری طرح ہم لوگوں کی طرف ہوجائے —— معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص صاحبِ ایمان ہو، خواہ وقتی غیظ وغضب کے تحت گناہ میں مبتلا ہوجائے ؛ لیکن اس میں گناہ کی شناعت کا احساس اور اپنے بھائی کے بارے میں اُخوت کا جذبہ باقی رہتا ہے۔

﴿۱﴾ ایسا لگتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس سے پہلے اپنے والد سے درخواست کی تھی کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ جانے دیں ؛ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو قبول نہیں فرمایا تھا؛ اسی لئے انھوں نے عرض کیا کہ آپ یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے ؛ حالاں کہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں ، پھر ایک بار نہایت تاکید اور اصرار کے ساتھ والد سے درخواست کی کہ آپ انھیں بھیج دیں ؛ تاکہ کھانے ، پینے ، دوڑ بھاگ کرنے اور تفریح کرنے کا موقع ملے اور ہم پوری چوکسی کے ساتھ ان کی حفاظت کریں گے ، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس پر دو عذر فرمائے : ایک یہ کہ یوسف کی دوری میرے لئے تکلیف دہ اور باعث رنج ہے ، میں چاہتا ہوں کہ ہر وقت وہ میرے پاس رہے ، دوسرے : مجھے ڈر ہوتا ہے کہ تم لوگ اسے جنگل میں لے جا کر —— جہاں بھیڑیے بھی ہوتے ہیں —— بے توجہ ہوجاؤ اور بھیڑیئے اسے کھا جائیں —— اس سے معلوم ہوا کہ تفریح کرنا اور جائز حدود میں کھیل کود کے ذریعہ دل بہلانا خلافِ شرع کام نہیں ہے اور نہ بزرگی ونبوت کے منافی ہے ، ہاں اگر تفریح شرعی حدود سے باہر چلی جائے تو نبی کیا ایک عام انسان کے لئے بھی جائز نہیں ہے ، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس میں اپنے حزن (غم) اور خوف (ڈر) کا بھی ذکر فرمایا ہے ، اس سے معلوم ہوا کہ انسان پر جو فطری کیفیات طاری ہوتی ہیں ، ان سے انبیاء اور اللہ کے نیک بندے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں ، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انبیاء کو خصوصاً اور دوسرے نیک بندوں کو عموماً غیر معمولی فراست ، قوتِ فیصلہ اور حالات وواقعات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے ؛ اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جو عذر پیش کرنے والے تھے ، حضرت یعقوب علیہ السلام نے پہلے ہی اس کی طرف اشارہ فرمادیا۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ؕ

ان لوگوں نے جواب دیا: ہماری پوری ایک جماعت ہے، اس کے باوجود اگر اس کو بھیڑیا کھا جائے تو ہم نے تو سب کچھ گنوا دیا ﴿۱﴾ ﴿۱۴﴾ آخر جب یوسف کو لے کر چلے اور سب نے پختہ ارادہ کرلیا کہ اسے کسی اندھیرے کنویں میں ڈال ہی دینا ہے تو ہم نے یوسف کو خبر کردی کہ (ایک وقت آئے گا کہ) تم ان لوگوں کو ان کے اس عمل کے بارے میں بتاؤ گے اور وہ پہچان بھی نہ سکیں گے ﴿۲﴾ ﴿۱۵﴾ اور وہ لوگ (اپنی اس سازش پر عمل کرنے کے بعد) رات کے وقت روتے ہوئے اپنے والد کے پاس پہنچے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۶﴾ؕ

﴿۱﴾ حفاظت اور مدافعت میں کامیابی کا ظاہری ذریعہ تعداد کی کثرت ہوتی ہے اور ظاہری نظر رکھنے والے لوگ ہمیشہ اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں، اسی پس منظر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یاد دلایا کہ ہم لوگ طاقتور اور جوان بھی ہیں اور ایک مناسب تعداد بھی رکھتے ہیں؛ اس لئے ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم لوگوں کے جیتے جی بھیڑیا حضرت یوسف علیہ السلام کو کھا جائے۔

﴿۲﴾ تفسیر کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دوسرے بھائی آپ کو قتل کردینے ہی کے درپے تھے؛ لیکن بڑے بھائی یہوذا نے اس سے منع کیا اور مشورہ کے بعد اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اندھیرے کنویں میں ڈال دیا جائے، اس وقت اللہ کی طرف سے حضرت یوسف علیہ السلام کو الہام ہوا کہ وہ اس آزمائش سے گھبرائیں نہیں، عنقریب وہ وقت آئے گا، جب اللہ تم کو ان ظالم بھائیوں پر غلبہ عطا فرمائیں گے اور تم ان پر ان کی حرکتوں کو واضح کرو گے، اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام یہی ہے کہ جب اپنے کسی پیغمبر کو کسی امتحان میں مبتلا کرتے ہیں تو ان کی دلداری کا سامان بھی فرماتے ہیں؛ تاکہ وہ بآسانی اس امتحان سے پار اُتر جائیں، ـــ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کس طرح اطلاع دی ؟ اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ انھیں اسی وقت نبوت سے نوازدیا گیا اور ان پر وحی اُتاری گئی، دوسری رائے ہے کہ یہ خبر دینا الہام کے طور پر تھا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اس بات کو اچھی طرح بٹھادیا، الہام غیر نبی پر بھی ہوتا ہے؛ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر الہام کا تذکرہ خود قرآن مجید میں موجود ہے، (القصص:۷) یا شہد کی مکھی پر الہام کا ذکر آیا ہے، (النحل:۶۸) چوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت نابالغ تھے اور نبوت عقل وشعور پر پہنچنے کے بعد دی جاتی ہے؛ اس لئے یہ دوسری رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۲۶۶/۸)

﴿۳﴾ ''عشاء'' سے مراد رات کا وقت ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۴۴/۹) رات میں اس لئے پہنچے کہ جب تاریکی کا وقت ہوتا ہے اور انسان انسان کو نظر نہیں آتا، آنکھیں ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرتیں تو جھوٹ بولنے اور مصنوعی طور پر آہ و بکا کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ
بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَ لَوْ كُنَّا صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ وَ جَآءُوْ عَلٰى قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ
اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

الثلثة

کہنے لگے: ابا جان! ہم سب تو دوڑ کے مقابلہ میں لگ گئے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا؛ یہاں تک کہ بھیڑیا اس کو کھا گیا اور گو ہم (کتنا ہی) سچ بولیں، آپ تو ہماری بات کا یقین کریں گے نہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۷﴾ اور وہ لوگ یوسف کے کُرتے پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگالائے تھے، یعقوب نے کہا: بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے، بہر حال صبر کرنا ہی بہتر ہے، اور تم لوگ جو باتیں بنارہے ہو، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کا خواستگار ہوں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۸﴾

﴿۱﴾ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے روتے ہوئے سارا مصنوعی قصہ اپنے والد کو سنایا اور اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہا کہ ہم کتنا بھی سچ کہیں، آپ یقین تو کریں گے نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا اپنے مدعا کو بیان کرتے ہوئے رونا اس کے سچ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، فتویٰ دینے والوں اور فیصلہ کرنے والوں کو ایسی اداکاریوں سے ہرگز متاثر نہیں ہونا چاہئے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بات کو تاکید کے ساتھ سچ قرار دینا بھی اس بات کے درست ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے دعویٰ کرنے والے کے پاس ثبوت موجود ہو تو دوسرے فریق کے قسم کھانے کی وجہ سے اس کا ثبوت رد نہیں ہوگا؛ بلکہ ثبوت و گواہی کو مقدم رکھا جائے گا، اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی جائز کھیل کے مقابلہ میں حصہ لینا شرعاً جائز ہے؛ بشرطیکہ اس میں جوا نہ ہو، اگر یہ ناجائز ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے اس عمل پر نکیر فرمائی ہوتی۔

﴿۲﴾ تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ایک بکری کے بچہ کو ذبح کردیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو اس کے خون میں ڈبو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے پیش کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے صاحبزادوں کی بات پر یقین کرلیا اور کہا کہ یوسف بے شک پھاڑا گیا، (دیکھئے: پیدائش: ۳۷: ۳۱) لیکن قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی فراست سے ان کی اس حرکت کو سمجھ لیا؛ کیوں کہ کپڑا تو خون میں تر بہ تر تھا؛ لیکن تھا بالکل صحیح سالم، اگر درندہ کسی شخص کو کھا جائے تو انسان سے پہلے وہ کپڑے کو پھاڑ ڈالے گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے شکار کا کپڑا اُتارے، پھر اسے کھائے، اسی قرینہ کی بنیاد پر حضرت یعقوب علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ لڑکے ان کو دھوکہ دے رہے ہیں، معلوم ہوا کہ کسی بات کی صداقت کو جاننے اور کسی واقعہ کو پرکھنے میں قرائن و علامات کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے؛ اسی لئے فقہاء نے ''قرینۂ قاطعہ'' یعنی واضح علامت کو بھی فیصلہ کرنے کی ایک بنیاد قرار دیا ہے، (البحر الرائق، کتاب الدعویٰ: ۷/ ۳۵۰، معین الحکام: ۱۶۶) اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر جب انسان کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور اس پر پردہ ڈالتا ہے تو اللہ کی طرف سے بعض ایسی علامتیں باقی رہ جاتی ہیں یا مجرم کی نظر سے چوک جاتی ہیں، جو اس کی دروغ گوئی کو ظاہر کردیتی ہیں، آج کل جینیٹک سائنس کی وجہ سے اس کو سمجھنا اور آسان ہوگیا ہے —— حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان تمام زیادتیوں کے مقابلہ صبر جمیل کرنے کا ارادہ فرمایا، رسول اللہ ﷺ سے ''صبر جمیل'' کی حقیقت دریافت کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، ایسا صبر جس کے ساتھ کوئی شکوہ نہ کیا جائے، (تفسیر ابن کثیر: ۲/ ۴۷۱) اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے کہلایا گیا ہے کہ میں اللہ ہی کی مدد کا خواستگار ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کتنے ہی اونچے مقام پر ہو؛ لیکن وہ بہر حال خدا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا کی مدد کے بغیر وہ کسی نقصان سے بچ نہیں سکتا۔

وَجَآءَتْ سَیَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰی دَلْوَهٗ ؕ قَالَ یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ
وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِیْهِ مِنَ
ع ۲ ۱۴ ۱۲ الزّٰهِدِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَالَ الَّذِی اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِیْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤی اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ اَوْ
نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۫ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ؕ وَاللّٰهُ
غَالِبٌ عَلٰۤی اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور ایک قافلہ (اس اندھیرے کنویں کی طرف) آنکلا، ان لوگوں نے اپنے پانی لانے والے کو بھیجا؛ چنانچہ اس نے اپنا ڈول ڈالا اور بول اُٹھا: بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو ایک لڑکا ہے! اُس شخص نے یوسف کو مالِ تجارت سمجھ کر چھپالیا اور جو کچھ وہ کررہے تھے، اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف تھے ﴿۱۹﴾ ان لوگوں نے یوسف کو معمولی قیمت —— یعنی گنتی کے چند درہم —— کے بدلہ بیچ دیا، اور وہ لوگ اُس کے قدرناشناس تھے ﴿۱﴾ ﴿۲۰﴾ جس شخص نے یوسف کو مصر میں خریدا تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا: اس کو عزت کے ساتھ رکھنا، ہوسکتا ہے کہ ہم لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے، یا ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں، اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اچھی طرح جمادیا؛ تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر بتانا سکھادیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر قادر ہیں؛ لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۱﴾

﴿۱﴾ یعنی قافلہ کے لوگوں نے ایک شخص کو پانی لانے کے لئے بھیجا، پھر جب اس نے کنویں میں حضرت یوسف علیہ السلام جیسے حسین وجمیل شخص کو دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سمایا اور رفقاءِ سفر کو بتایا بھی نہیں؛ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپالیا؛ تاکہ جب ان کو فروخت کرے تو وہ تنہا قیمت کا مالک قرار پائے، کسی اور کی شرکت نہ ہو، پھر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے بازار میں بیچ ڈالا، یوں تو حضرت یوسف علیہ السلام کی جو بھی قیمت ادا کی جاتی، وہ ان کے مقام اور حیثیت کے اعتبار سے کم ہی ہوتی؛ لیکن ان لوگوں نے ویسے بھی بہت کم قیمت میں بیچ دیا؛ کیوں کہ جو چیز چوری کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے، عام طور پر لوگ اسے اَونے پَونے بیچ دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدرومنزلت اور مقام سے واقف نہیں تھے؛ اس لئے ان کے قدرشناس بھی نہ تھے، یہی مطلب ہے ''وکانوا فیہ من الزاھدین'' کا، کہا جاتا ہے کہ یہ قافلہ شام سے مصر کی طرف جارہا تھا —— ''بثمن بخس'' کے معنی معمولی قیمت کے ہیں؛ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس کے معنی حرام کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص آزاد ہو، اسے بیچنا حرام ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے، (مفاتیح الغیب: ۹/۱۴) —— فرمایا گیا: ''بدراھم معدودۃ''، یعنی گنتی کے چند سکے، معلوم ہوا کہ سکوں اور کرنسیوں کی مقدار گن کر معلوم کی جاتی ہے، اگر اس میں تھوڑا بہت وزن کا فرق ہو تو کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ اس میں تعداد کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۹/۱۵۶) —— حضرت یوسف علیہ السلام جیسے شخص کو چند درہم کے بدلے بیچ دیا گیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ صرف بیس درہم قیمت لگائی گئی، (مفاتیح الغیب: ۹/۱۵) —— اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قیمتی شیئ اگر معمولی قیمت میں بیچ دی جائے تو جائز ہے اور یہ معاملہ بیچنے اور خریدنے والے دونوں کے حق میں لازم ہوگا۔ (تفسیر قرطبی: ۹/۱۵۷)

←

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۲﴾

اور جب یوسف اپنی پختگی کی عمر کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو حکومت سے نوازا اور ہم بھلے کام کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۲﴾

← ﴿۲﴾ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس قافلہ کے ساتھ مصر لے جایا گیا؛ اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام جن مصائب سے دوچار کئے گئے، بعض مفسرین نے ان کا بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن اس سلسلے میں کوئی معتبر روایت موجود نہیں ہے، بہر حال جب مصر پہنچے تو بعض مفسرین کے بیان کے مطابق خود مصر کے فرمانروا نے آپ کو خرید کرلیا، جو ''عزیز'' کہلاتا تھا، (تفسیر قرطبی: ۹/۱۵۸) اور بائبل کے بیان کے مطابق شہنشاہ کے مقرب لوگوں میں ایک شخص ''نوطیقار'' نام کا تھا، جو امراء سلطنت میں تھا اور فرعون کے لشکر کا سپہ سالار بھی تھا، اس نے خریدا تھا، (پیدائش: ۲:۷۔۳۶) —— تاہم جس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا ہو تو چوں کہ جوہری جوہر شناس ہوتا ہے؛ اس لئے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی ان کی شرافت، خاندانی وجاہت اور غیر معمولی صلاحیت کو معلوم کرلیا، خدا کو منظور تھا کہ کنعان سے غلام بنائے ہوئے یوسف علیہ السلام کی مصر کے دربار شاہی میں شہزادہ کی طرح پرورش ہو؛ اس لئے منجانب اللہ بادشاہ اولاد سے محروم تھا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ممکن ہے کہ یہ ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں؛ چنانچہ جس یوسف علیہ السلام کو اس کے بھائیوں نے اندھیرے کنویں میں ڈال دیا تھا اور جس کی گردن میں گذرنے والے قافلے نے غلامی کا طوق ڈال لیا تھا، وہی یوسف آج دربار شاہی میں ناز ونعم اور اکرام واحترام کے ساتھ پالے جارہے تھے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک اجنبی زمین میں طاقت وقوت دی اور ان کو خواب کی تعبیر سکھائی، جو ان کی کامیابی کے لئے پہلا زینہ ثابت ہوا، یہ سب کہنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ اپنے فیصلے کو نافذ کرنے کی پوری قدرت رکھتے ہیں کہ غلام کو آقا اور عاجز وبیچارہ کو دوسروں کا چارہ گر بنادیں ''واللہ غالب علی أمرہ'' اس میں عقیدۂ توحید کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ سب کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنی صلاحیت اور قوت بازو کا نتیجہ ہے؛ بلکہ یہ سب اللہ ہی کی کارسازی ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سب سے زیادہ فراست کا ثبوت تین لوگوں نے دیا ہے، ایک: عزیز مصر نے، جنھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا کہ ہمیں اس سے فائدہ پہنچے گا، دوسرے: حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں نے، جنھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا کہ یہ ایک طاقتور امانت دار شخص ہے اور ملازم رکھے جانے کے لائق ہیں، تیسرے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنھوں نے اپنے بعد کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کیا تھا۔ (طبرانی، حدیث نمبر: ۸۸۳۹)

﴿۱﴾ ''اَشُدّ'' کے معنی جوانی کے، یا اس عمر کے ہیں جس میں آدمی کی عقل پختہ ہوجاتی ہے، اس دوسرے مفہوم کے لحاظ سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے تیس سال سے زیادہ کی عمر مراد لی ہے اور حسن بصری رحمہ اللہ نے چالیس سال کی عمر کہا ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۷۳) —— جب حضرت یوسف علیہ السلام ایک اچھی عمر کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں نظام حکومت چلانے کا طریقہ اور نبوت کے ذریعہ احکام دین کا علم عطا کیا، حکم سے مراد حکومت کی صلاحیت ہے، اور علم سے مراد نبوت ہے، اس کے سوا کچھ اور بھی تفسیریں کی گئی ہیں؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری سیرت کے لحاظ سے یہ تشریح زیادہ موزوں نظر آتی ہے، اخیر میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا کہ جو شخص بھی ایمان وعقیدہ اور اخلاق وعمل میں بہتر ہوتا ہے، اس کے ساتھ اللہ کا یہی معاملہ ہوتا ہے، نااُمیدیوں کے اندھیرے میں اُمید کی روشنی جل اُٹھتی ہے اور مصیبت وآزمائش کی موجوں کے درمیان سے راحت وسکون کا ساحل نصیب ہوجاتا ہے۔

وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ
اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ
بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ
اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَ شَهِدَ
شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اِنْ كَانَ
قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ
مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾ یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۖۚ
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۳ ۹ ۱۳

یوسف جس عورت کے گھر میں تھے، وہ اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے اس کو پھنسلانے لگی، اس نے دروازے بند کردیئے اور کہنے لگی: بس آہی جاؤ، یوسف نے کہا: اللہ کی پناہ! بے شک وہ میرا آقا ہے اور اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے، یقیناً احسان فراموشی کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے ﴿۲۳﴾ اور اس عورت نے تو یوسف سے برائی کا ارادہ کرہی لیا تھا، اگر یوسف نے اپنے پروردگار کی دلیل نہ دیکھ لی ہوتی تو اس کو بھی اسی طرح کا خیال پیدا ہوجاتا، اسی طرح (ہم نے اسے متنبہ کردیا)؛ تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں، بے شک یوسف ہمارے منتخب بندوں میں تھے ﴿۲۴﴾ وہ دونوں آگے پیچھے دروازہ کی طرف لپکے؛ اس حال میں کہ اس عورت نے پیچھے کی طرف سے یوسف کا کرتا چاک کرڈالا تھا اور دروازہ کے پاس دونوں نے اس عورت کے شوہر کو پایا، کہنے لگی: قید یا دردناک عذاب کے علاوہ اس شخص کی کیا سزا ہوسکتی ہے، جو تیری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے؟ ﴿۲۵﴾ یوسف نے کہا: (بلکہ) یہی مجھے پھنسلا رہی تھی، اور خود عورت ہی کے خاندان سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر یوسف کا کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہو تو یہ عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے ﴿۲۶﴾ اور اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہو تو وہ جھوٹی ہے اور یوسف سچا ہے ﴿۲۷﴾ تو جب اس شخص نے دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو کہا کہ یہ یقیناً تم عورتوں کی مکاری ہے، یقیناً تم عورتوں کی مکاری غضب کی ہوتی ہے ﴿۲۸﴾ یوسف! اس سے درگذر کردو، اور (اے عورت!) تو اپنے قصور کی معافی مانگ، اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ہی قصوروار ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۲۹﴾

﴿۱﴾ آیت نمبر: ۲۳ سے حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی ـــ جن کا نام یہودی روایات میں زلیخا بتایا گیا ہے ـــ کے درمیان جو واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر شروع ہوتا ہے اور آیت نمبر: ۲۹ پر اس کا پہلا مرحلہ مکمل ہوتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ←

← کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی اور حیرت انگیز حسن و جمال سے نوازا تھا، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں اس کا ذکر موجود ہے، (مسند احمد، عن انس، حدیث نمبر: ۱۴۰۴۴) عزیز مصر نے ان کے ساتھ اپنی اولاد کا سا سلوک روا رکھا اور تورات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دولت اور حکومت عملاً حضرت یوسف علیہ السلام کے حوالہ کر دی تھی، (دیکھئے: پیدائش ۳۹: ۴-۶) —— اگرچہ عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے درمیان سن و سال کے اعتبار سے کوئی جوڑ نہیں تھا؛ لیکن حضرت یوسف کے غیر معمولی حسن نے عزیز مصر کی بیوی کو ان پر فریفتہ کر دیا اور وہ انھیں کھل کر گناہ کی دعوت دینے لگی، حضرت یوسف علیہ السلام انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ ایک دن اس نے بے حد اصرار کیا اور اپنے اصرار پر حضرت یوسف علیہ السلام کو آمادہ کرنے کے لئے دروازے بھی بند کر لئے، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کو سمجھانے کے لئے تین باتیں کہیں: پہلی، یہ کہ میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، یعنی اگر میں ایسی حرکت کروں تو اللہ کی نافرمانی ہوگی، دوسری: یہ کہ تم اس شخص کی امانت ہو، جس نے میری نہایت محبت و شفقت کے ساتھ پرورش کی ہے، تو یہ فعل اس شخص کے ساتھ بھی خیانت ہوگی، تیسرے: یہ یقیناً زیادتی کی بات ہوگی اور زیادتی کرنے والے لوگ انجام کے اعتبار سے کامیاب نہیں ہوتے؛ لیکن عزیز مصر کی بیوی کے دل میں کچھ اس طرح عشق کا سودا سمایا ہوا تھا کہ ان نصیحتوں کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا؛ بلکہ اس نے ٹھان لیا کہ وہ ضرور ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو اس گناہ پر آمادہ کرے گی، حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں برائی کا ارادہ تو نہیں پیدا ہوا، جو گناہ ہے؛ بلکہ اس کے شدید اصرار پر ایک خیال سا گزرا، جس میں انسان کے ارادہ و اختیار کو دخل نہیں ہوتا، اسی کو قرآن مجید نے ''وھم بھا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن پیغمبر معصوم ہوتے ہیں، اللہ کی طرف سے بچائے جاتے ہیں؛ اس لئے فوراً یہ خیال بھی جاتا رہا، قرآن نے کہا ہے کہ اپنے خدا کی ''برہان'' یعنی دلیل یوسف کے سامنے آگئی، ''برہان رب'' سے بعض مفسرین نے اللہ کا خوف مراد لیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے وہاں موجود مورتی کو ڈھانپ دیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے پوچھنے پر بتایا کہ میں اپنے دیوتا کے سامنے کیسے برائی کرسکتی ہوں؟ حضرت یوسف علیہ السلام کو خیال آیا کہ جب اس کو اس کے باطل معبود کا خیال ہے تو میں کیسے اپنے معبود برحق کا خیال نہ کروں؟ ایک قول یہ بھی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی تصویر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے آگئی، بہر حال اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس، خاندانی نسبت کا لحاظ اور خود حضرت یوسف علیہ السلام کی صحیح و سلیم فطرت نے اس وقت چراغِ راہ کا کام کیا اور یہ خیال بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے دل سے جاتا رہا؛ چنانچہ آپ گناہ سے بچنے کے لئے دروازہ کی طرف لپکے، جو پہلے سے بند تھا؛ لیکن اللہ کی قدرت سے کھل گیا، حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکلے اور پیچھے پیچھے عزیز مصر کی بیوی بھی بھاگتے ہوئے آئی، اتفاق کہ سامنے خود عزیز مصر موجود تھا، عزیز مصر کی بیوی بظاہر ایک ذہین اور حاضر دماغ خاتون تھی، اس نے فوراً پینترا بدلا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو مجرم قرار دینے کے لئے شوہر سے کہا کہ جو شخص تمہاری بیوی کی عصمت و آبرو سے کھیلنا چاہتا ہو، قید خانہ یا دردناک سزا کے سوا اس کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے؟ اگر اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام خاموش رہ جاتے تو ایک نبی کی حیثیت مجروح ہوجاتی؛ اس لئے آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی عورت نے مجھے پھنسلانے کی کوشش کی تھی، پاکباز بندے کی پاکبازی کو ظاہر کرنے کے لئے اللہ کی مدد ظاہر ہوئی اور ایک شیر خوار بچہ نے کہا کہ اگر دامن آگے سے پھٹا ہوا ہو تو قصور وار یوسف ہیں: کیوں کہ انھوں نے اقدام کیا ہوگا اور عورت نے اپنی مدافعت میں اس کے کپڑے پھاڑ دیئے ہوں گے، اور اگر پیچھے کا دامن پھٹا ہوا ہو تو قصور وار عورت ہے کہ یوسف گناہ سے بچنے کے لئے بھاگے ہوں گے اور عورت نے پیچھے سے ان کا دامن تھاما ہوگا، اس واقعہ کا ذکر حدیث میں بھی ہے کہ تین بچے ایسے ہیں، جنھوں نے ماں کی گود میں گفتگو کی ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے، (مستدرک حاکم کتاب التواریخ المتقدمین من الانبیاء والمرسلین، حدیث نمبر: ۴۱۶۱) اگر کسی بڑے اور بولتے ہوئے شخص نے یہ بات کہی ہوتی تو شاید یہ بات اس درجہ قابل قبول نہ ہوتی؛ لیکن جو بچہ ابھی گویائی سے محروم ہو، اس نے یہ بات کہی، اس سے ظاہر ہوا کہ یہ شہادت دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس لئے عزیز مصر کو اپنی بیوی کی غلطی تسلیم ←

← کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا اور اس نے کہا کہ تم عورتوں کا مکر بہت بڑھا ہوا ہوتا ہی ہے، پھر ایک طرف حضرت یوسف علیہ السلام سے گذارش کی کہ وہ اس واقعہ سے درگزر کریں، درگزر کرنے میں دونوں باتیں شامل ہیں، یہ بھی کہ معاف کردیں اور یہ بھی کہ دوسروں سے اس کا چرچا نہ کیا جائے، (تفسیر قرطبی: ۹/ ۱۷۵) اور بیوی سے کہا کہ تم اپنی غلطی کی معافی چاہو، کس سے معافی چاہو؟ اس سلسلہ میں تینوں باتوں کی گنجائش ہے، اپنے شوہر سے، یا حضرت یوسف علیہ السلام سے، یا اپنے باطل عقیدہ کے مطابق دیوتاؤں اور دیویوں سے، اس پورے واقعہ میں عبرت وموعظت کے مختلف پہلو اور احکامِ شرعیہ کے بہت سے نکات ہیں :

- عزیز مصر کے مکان کو قرآن نے اس کی بیوی کا گھر ''بیتها'' قرار دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کی حیثیت صرف ایک خادمہ کی نہیں؛ بلکہ اپنے شوہر کے گھر کی مالکن اور انچارج کی ہوتی ہے؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''المرأة راعية على بيت بعلها''۔ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضیلۃ الامام العادل، حدیث نمبر: ۱۸۲۹)
- قرآن نے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے برائی کا ارادہ کیا تو گھر کے دروازے بند کرلئے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مرد وعورت کے درمیان صنفی تعلق میں مکمل پردہ اور لوگوں کی نگاہ سے حفاظت کی رعایت ضروری ہے، افسوس کہ مغربی تہذیب نے آج اس مرحلہ کے لئے بھی پردہ کو ضروری نہیں سمجھا ہے۔
- حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی بیوی کو منع کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ تمہارے شوہر نے میرے ساتھ بہتر سلوک کیا ہے! اس سے معلوم ہوا کہ کوئی مسلمان احسان کرے یا غیر مسلم، کسی نیک و پارسا شخص نے احسان کا معاملہ کیا ہو یا گنہگار شخص نے، بہر حال محسن کا پاس ولحاظ رکھنا چاہئے۔
- یہ بھی معلوم ہوا کہ عزم وارادہ کے بغیر اختیاری طور پر دل میں کسی برائی کا خیال آجائے؛ لیکن انسان اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو بچالے، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تو یہ گناہ نہیں ہے؛ کیوں کہ گناہ وہ ہے جس میں انسان کے ارادہ واختیار کو دخل ہو۔
- یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی انسان کی دینی نسبتیں اس کے لئے 'برہان رب' کا درجہ رکھتی ہیں، اگر انسان کا قدم کسی برائی کی طرف بڑھنے لگے، اس وقت اپنی نسبتوں کو ذہن میں تازہ کرلینا چاہئے۔
- بند دروازے کے کھل جانے سے معلوم ہوا کہ جب انسان کسی رائے سے بچنے کا عزم مصمم کرلیتا ہے تو اس کو غیبی مدد حاصل ہوجاتی ہے۔
- اگلے دامن یا پچھلے دامن کے پھٹے ہونے کو جو مجرم کی پہچان کی علامت قرار دیا گیا، اس سے یہ حکم مستنبط ہوا کہ کسی معاملے کے ثابت ہونے میں قرائن کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور فیصلے تک پہنچنے میں اس سے مدد لی جاسکتی ہے۔
- عزیز مصر کو اس کی بیوی کے آقاء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ''والفيا سيدها'' —— یہ اس لئے کہ مصر کے قبطی سماج میں بیویاں اپنے شوہروں کو آقا کہا کرتی تھیں، (تفسیر قرطبی: ۹/ ۱۷۸) —— اس سے واضح ہوتا ہے کہ مصری معاشرہ میں عورت کی حیثیت ملکیت اور پراپرٹی کی تھی، یہ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے شوہر اور بیوی کو معاہدہ کے دو فریق کے حیثیت دی نہ کہ مالک اور مملوک کی۔
- عزیز مصر کی بیوی نے جیل کی سزا کا مطالبہ کیا، معلوم ہوا کہ مصر متمدن ملک تھا اور وہاں مجرموں کی سزا کے لئے جیل خانہ کا نظام موجود تھا۔
- عزیز مصر نے عورت کے مکر کو بڑا مکر (کید عظیم) قرار دیا، اور دوسری جگہ شیطان کے مکر کو 'کید ضعیف' یعنی 'کمزور مکر' قرار دیا گیا ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا عورت کا مکر شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے؟ مفسرین نے جواب دیا ہے کہ یہاں عورت کے مکر کا ذکر مرد کے مقابلے ←

وَ قَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا
لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً
وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ
اَیْدِیَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ
لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَىٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ
وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

اور شہر میں کچھ عورتیں کہنے لگیں: عزیز کی بیوی اپنا مطلب نکالنے کے لئے اپنے ہی غلام کو پھنسلاتی ہے، وہ اس کے عشق میں دیوانی ہوگئی ہے، ہمارا تو خیال ہے کہ وہ کھلی ہوئی بے راہ روی میں مبتلا ہے ﴿۳۰﴾ پھر جب عزیز مصر کی بیوی نے ان عورتوں کی بدگوئی کے بارے میں سنا تو انھیں بلا بھیجا، ان کے لئے مسندیں آراستہ کیں اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی اور (یوسف سے) کہا: ان کے سامنے تو آجاؤ، جب ان عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو ششدر رہ گئیں، اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں: ہائے اللہ! یہ تو انسان نہیں، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے! ﴿۳۱﴾ عزیز مصر کی بیوی نے کہا: یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم لوگ مجھے لعن وطعن کررہی ہو، یقیناً میں نے اس کو پھنسلانے کی کوشش کی؛ لیکن یہ پاکبازی پر قائم رہا اور میں جس بات کا حکم دے رہی ہوں، اگر اس نے اس کو نہیں کیا تو یقیناً قید میں ڈالا جائے گا اور بے عزت ہوکر رہے گا۔ ﴿۳۲﴾

← میں ہے، یعنی مرد کے مقابلہ عورت زیادہ مؤثر طور پر مکاری کا ارتکاب کرسکتی ہے اور ''إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفاً'' (النساء:۷۶) میں اللہ کی تدبیر کے مقابلہ شیطان کے مکر کو کمزور کہا گیا ہے؛ اس لئے اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورت شیطان سے بڑھ کر مکار ہوسکتی ہے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کی جو داستان عزیز مصر کے سامنے آئی، بظاہر اس کا تقاضا یہ تھا کہ عزیز مصر کی غیرت اسے تڑپا دیتی اور مجرم کو قرار واقعی سزا دیتا؛ لیکن عزیز مصر نے ایسا نہیں کیا، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لئے کہ اس میں غیرت کی کمی تھی ''انہ لم یکن غیورا'' (قرطبی:۹/۱۷۵) لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف عزیز مصر کا معاملہ نہیں تھا؛ بلکہ مصری تہذیب میں بے حیائی اس درجہ پہنچ گئی تھی کہ اِس معاشرہ میں ایسے واقعات کا ہوجانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، جب بھی کوئی قوم شریعت الٰہی سے محروم ہوجاتی ہے تو جو برائیاں اس میں پیدا ہوجاتی ہیں، ان میں ایک اہم برائی یہ ہے کہ وہ شرم وحیا کو خیر باد کہنے لگتی ہے، آج کل مغربی تہذیب اس کی واضح مثال ہے!

○ عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ اس کا چرچا نہ کیجئے اور قرآن نے کسی تبصرہ کے بغیر اسے نقل کیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی برائی ہوجائے تو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کا زیادہ چرچا نہ ہو؛ کیوں کہ برائی کے ذکر سے بھی برائی پھیلتی ہے۔

○ عزیز مصر نے اپنی بیوی کو 'استغفار' کا حکم دیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو گناہ سزا کے درجہ کو نہ پہنچا ہو یا پہنچ گیا ہو؛ لیکن سزا جاری کرنے کا موقف نہ ہو، یا اس کی برائی لوگوں پر ظاہر نہ ہو تو اس کو خاص طور پر استغفار کا اہتمام کرنا چاہئے؛ کیوں کہ اس کے لئے گناہ کی تلافی کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۳۵﴾

ع ۶ ۱۴

یوسف نے دُعاء کی ''اے میرے پروردگار! جس چیز کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دے رہی ہیں، قید خانہ مجھ کو اس سے زیادہ پسند ہے اور اگر آپ نے ان کے مکر وفریب سے مجھے نہیں بچایا تو میں نادانوں میں سے ہو جاؤں گا'' ﴿۳۳﴾ چنانچہ ان کے پروردگار نے ان کی دُعاء قبول کر لی اور یوسف کو ان کے مکر وفریب سے بچالیا، بے شک اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں ﴿۳۴﴾ وہ لوگ (یعنی: عزیز مصر اور ان کے اہل دربار) جو ثبوت دیکھ چکے تھے، اس کے بعد ان کو یہی بات مناسب محسوس ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت کے لئے قید میں رکھ دیں۔ ﴿۱﴾ ﴿۳۵﴾

﴿۱﴾ یہ اس واقعہ کا دوسرا مرحلہ ہے، جب دربار شاہی میں کوئی واقعہ پیش آتا ہے اور خاص کر جب اس کا تعلق شاہی بیگمات سے ہوتا ہے تو وہ چھپائے نہیں چھپتا؛ چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کا یہ واقعہ آہستہ آہستہ شاہی محل سے باہر چلا گیا اور عورتوں میں اس کا چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے ہی پروردہ غلام کے بارے میں برا ارادہ رکھتی ہے اور اس پر فریفتہ ہوگئی ہے؛ چنانچہ عزیز مصر کی بیوی نے سرکردہ بیگمات کی دعوت کا خصوصی اہتمام کیا، محل کو سجایا سنورا گیا، گاؤ تکئے لگائے گئے، دسترخوان کچھ اس طرح چنا گیا کہ چھریاں بھی رکھی گئیں، غالباً کھانے میں ایسی چیز رہی ہوگی، جن کے لئے چھری کانٹے کی ضرورت ہو، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان عورتوں کی تعداد چالیس تھی، جب ساری تیاری مکمل ہوگئی، تو اب عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت دی کہ وہ باہر آئیں، سعید بن جبیر رحمہ اللہ کے بقول حضرت یوسف علیہ السلام یوں ہی خوبصورت ترین شخص تھے: لیکن ان خاتون کے حکم سے ان کی بھی زیبائش وآرائش کی گئی تھی (قرطبی: ۱۷۹/۹) اب جو حضرت یوسف علیہ السلام سامنے آئے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، ان کی حیرت کی انتہاء یہاں تک پہنچ گئی کہ ہاتھ میں چاقو تو دیئے گئے تھے پھل وغیرہ کاٹنے کو؛ لیکن حسنِ یوسف کے دیدار نے کچھ ایسی بے خبری پیدا کی کہ پھل کاٹنے کے بجائے ہاتھ زخمی ہوگئے اور بے ساختہ کہہ اُٹھیں کہ یہ تو انسان نہیں؛ بلکہ پیکر حسن وجمال فرشتہ ہے، فرشتہ کہہ کر ان کی خوبصورتی کی طرف بھی اشارہ ہو گیا اور ان کی پاکدامنی کی طرف بھی، حسن وجمال کے ساتھ اگر پاکدامنی اور ناز وانکار بھی شامل ہو تو کشش اور بھی بڑھ جاتی ہے، اب عزیز مصر کی بیوی نے پوری جرأت کے ساتھ کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی ہو اور اب میں اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یقیناً اسے برائی کی دعوت دی تھی؛ لیکن اس نے اپنے دامن عفت پر کوئی داغ آنے نہیں دیا، جب کسی انسان کا راز کھل جاتا ہے تو اس کی جرأت بڑھ جاتی ہے؛ اس لئے اس نے آگے بڑھ کر کہا: اگر ابھی بھی اس نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو قید اور ذلت ورسوائی اس کا مقدر ہوگی، ایسا لگتا ہے اور مفسرین نے اس کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس دعوت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش اور بڑھ گئی اور جو بیگمات اس دعوت میں حاضر ہوئی تھیں، وہ بھی آپ کو دعوت گناہ دینے لگیں، مگر آپ کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا اور آپ نے التجاء کی کہ اس دعوتِ گناہ کو قبول کرنے سے بہتر میرے لئے قید کی زندگی ہے، بادشاہ پر اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی ←

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَ قَالَ الۡاٰخَرُ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ
اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡكُلُ الطَّیۡرُ مِنۡهُ ؕ نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِیۡلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۳۶﴾
قَالَ لَا یَاۡتِیۡكُمَا طَعَامٌ تُرۡزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاۡتُكُمَا بِتَاۡوِیۡلِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیۡ
رَبِّیۡ ؕ اِنِّیۡ تَرَكۡتُ مِلَّةَ قَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ هُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّةَ
اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنۡ نُّشۡرِكَ بِاللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنۡ
فَضۡلِ اللّٰهِ عَلَیۡنَا وَ عَلَی النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

یوسف کے سامنے جیل میں دو اور نوجوان بھی داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا: میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اُٹھائے ہوا ہوں، جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، آپ ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیے کہ آپ ہم کو نیک آدمی نظر آتے ہیں ﴿۳۶﴾ یوسف نے کہا: تم دونوں کو دیا جانے والا کھانا آنے سے پہلے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتادوں گا، یہ میرے رب کے دیئے ہوئے علم کا حصہ ہے، میں نے تو ان لوگوں کا مذہب چھوڑ رکھا ہے، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ﴿۳۷﴾ میں اپنے باپ دادا —— ابراہیم، اسحاق اور یعقوب —— کے مذہب کی پیروی کرتا ہوں، ہمارے لئے روا نہیں ہے کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، یہ ہم پر اور پوری انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے؛ لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہوتے ہیں۔ ﴿۳۸﴾

← پوری طرح واضح ہو چکی تھی؛ لیکن اپنے مشیروں سے رائے مشورہ کے بعد اسی میں مصلحت محسوس ہوئی کہ کچھ مدت کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرلیا جائے؛ تاکہ یہ چرچا ختم ہوجائے اور جو بدنامی پھیل گئی ہے، اس میں کچھ تو کمی آئے؛ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام قید میں رکھوا دیئے گئے —— اس واقعہ میں سبق ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی پاکدامنی اور عزت و آبرو کی حفاظت قید و بند کی مشقت سے بچے رہنے سے بھی زیادہ عزیز رہنی چاہئے، یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر ایک شخص کو مجبور کیا جائے کہ یا تو تم زنا کا ارتکاب کرو یا جیل کی سزا کو قبول کرو تو ایسی حالت میں اس کے لئے زنا کا ارتکاب کر لینے کی اجازت نہیں ہوگی، (قرطبی: ۱۸۷/۹)
اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بعض دفعہ کسی دینی یا اخلاقی مصلحت کے تحت وقتی طور پر قید کئے جانے کی گنجائش ہے؛ اسی لئے احناف کے نزدیک غیر شادی شدہ زنا کے مرتکب کو ایک سال کے لئے مصلحتاً قید کیا جاسکتا ہے، (ہندیہ: ۱۴۷/۲)
اور دوسرے فقہاء کے نزدیک ایسے شخص کو شہر بدر کردیا جائے گا، ان کے یہاں ''تغریب عام'' —— جس کا حدیث میں ذکر آیا ہے (صحیح مسلم، باب حد الزنا، حدیث نمبر: ۴۴۱۴ - ۴۴۱۷) —— سے یہی مراد ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں ایک امرد شخص سے فتنہ محسوس کرتے ہوئے اس کے سر کے بال منڈا دیئے تھے اور اسے وقتی طور پر شہر بدر فرما دیا تھا۔ (فتح القدیر: ۲۲۹/۵)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ
دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ
رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾ وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ
عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ ع ۵ ۱۵
اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا
الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ
بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَ قَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ
بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

اے جیل کے ساتھیو! کیا مختلف الگ الگ خدا بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب سے زبردست ہے؟ ﴿۳۹﴾ اللہ کو چھوڑ کر تم
لوگ جس کی عبادت کرتے ہو، وہ محض چند (فرضی) نام ہیں، جو تم لوگوں نے اور تمہارے آباء واجداد نے رکھ لئے
ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی دلیل نہیں بھیجی ہے، حکومت اللہ ہی کی ہے، اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی
عبادت کرو، یہی درست دین ہے؛ لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں ہیں ﴿۴۰﴾ اے جیل کے رفقاء! تم میں سے ایک تو
اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور دوسرے کو سولی دے دی جائے گی، پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے،
جس کے بارے میں تم دونوں سوال کر رہے ہو، (اللہ کے پاس) اس کا فیصلہ ہو چکا ہے ﴿۴۱﴾ ان دونوں میں سے جس
کے بارے میں یوسف کو گمان تھا کہ وہ بچ جائے گا، اس سے کہا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی ذکر کر دینا؛ لیکن آقا
کے سامنے اس بات کے تذکرہ کو شیطان نے بھلا دیا؛ چنانچہ یوسف کئی سال تک جیل ہی میں رہے ﴿۴۲﴾ بادشاہ نے کہا:
میں نے خواب دیکھا ہے کہ سات فربہ گائیں مل کر سات دبلی گایوں کو کھائے جارہی ہیں، نیز سات سرسبز بالیاں ہیں
اور سات خشک بالیاں ہیں، اے سردارو! اگر تم لوگ خواب کی تعبیر بیان کرتے ہو تو مجھ کو میرے خواب کی تعبیر بتاؤ ﴿۴۳﴾
ان لوگوں نے کہا: یہ تو خواب ہائے پریشاں (یعنی: بے معنی خواب) ہیں، ہم لوگ ایسے خوابوں کی تعبیر سے واقف
نہیں ہیں ﴿۴۴﴾ اور ان دو قیدیوں میں سے جس کو رہائی مل گئی تھی پھر ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا تو اس نے کہا: میں
آپ کو اس خواب کی تعبیر بتاتا ہوں، آپ ذرا مجھے (جیل خانہ) جانے دیجئے۔ ﴿۴۵﴾

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

اے سچائی کے پیکر یوسف ! ہمیں (اس خواب کی تعبیر) بتائیے کہ سات فربہ گائیں ہیں، جنھیں سات دبلی گائیں کھائے جارہی ہیں، نیز سات سرسبز بالیاں ہیں اور سات خشک بھی ہیں ؛ تا کہ میں لوگوں (یعنی : بادشاہ اور ان کے درباریوں) کی طرف واپس جاؤں (اور ان کو بتادوں) کہ ان کو بھی معلوم ہوجائے ۔ ﴿۱﴾ ﴿۴۶﴾

﴿۱﴾ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان حیات کا تیسرا مرحلہ ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو اور نوجوان بھی جیل بھیجے گئے تھے، مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ان میں ایک بادشاہ کا نان بائی تھا، جو روٹی بنایا کرتا تھا، اور دوسرا ساقی تھا، جو بادشاہ کو پانی اور مشروبات پیش کیا کرتا تھا، ان دونوں پر الزام تھا کہ انھوں نے زہر دے کر بادشاہ کو مار ڈالنے کی سازش کی تھی، ان قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی وجاہت اور چال ڈھال کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ یہ کوئی نیک اور بزرگ ہستی ہے؛ بلکہ تورات کے بیان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی دیانت و امانت اور حسن اخلاق سے متاثر ہوکر جیلر نے آپ کو جیل کا نگراں اور انچارج بنا دیا تھا، (دیکھئے: پیدائش: ۳۹:۲۱-۲۳) چنانچہ ان سے اپنا خواب بیان کیا اور تعبیر بتانے کی خواہش کی، ساقی کا خواب یہ تھا کہ میں نے دیکھا ہے کہ بادشاہ کے انگور کا شیرہ نچوڑ رہا ہوں، نان بائی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میں نے اپنے سر پر روٹیاں اُٹھا رکھی ہیں، جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا کھانا آنے سے پہلے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر بتادوں گا؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کردی کہ جو کچھ بتاؤں گا، وہ میرے پروردگار کے عطا کئے ہوئے علم کا نتیجہ ہے؛ تاکہ لوگ آپ کو غیب داں اور کاہن نہ تصور کرلیں، پھر آپ نے ایک پیغمبر کی شان کے مطابق خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے توحید اور آخرت کی حقیقت واہمیت ان پر واضح فرمائی، آپ نے کہا کہ ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں، جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، —— معلوم ہوا کہ دنیوی معاملات میں مسلمان ایک غیر مسلم سے ربط و تعلق رکھ سکتا ہے؛ لیکن اپنے افکار و نظریات میں غیر مسلم گروہوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے اور اسے کفر و شرک کی کسی بات کو ہرگز قبول نہیں کرنا چاہئے، حضرت یوسف علیہ السلام نے توحید و آخرت کا ذکر فرمایا؛ کیوں کہ ایمان کی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں اور ان ہی دونوں باتوں پر ایمان لانے سے انسان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح متعلق ہے، اللہ کے پیغمبروں اور کتابوں کے بھیجے جانے کا مقصد بھی اصل میں ان ہی دونوں عقیدوں کو سمجھانا اور ان کی طرف دعوت دینا ہے اور اسی حیثیت سے ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے؛ کیوں کہ مصر میں شرک عام تھا اور توحید کو بنی اسرائیل اور کنعانیوں کا دین سمجھا جاتا تھا، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ابراہیم و اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے دین کی پیروی کرتا ہوں، آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام غالباً اس لئے نہیں لیا کہ مصر کے لوگ انبیاء بنی اسرائیل سے ہی واقف تھے، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام ان کے لئے ایک اجنبی نام ہوتا، پھر شان نبوت دیکھئے کہ یہ بھی فرمایا کہ دین و توحید پر ایمان کی جو توفیق حاصل ہوئی ہے، یہ محض اللہ کا فضل ہے، اس میں کسی کی صلاحیت اور قوت بازو کو دخل نہیں، پھر آپ نے لوگوں کو عقل و تجربہ کی روشنی میں سمجھایا کہ کسی نظام کے لئے ایک طاقتور مالک بہتر ہے یا متفرق مالکوں کا مجموعہ؟ پھر فرمایا کہ تم جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کرتے ہو، نہ اس فعل کے لئے کوئی عقلی دلیل ہے؛ کیوں کہ یہ تو چند نام ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں، نہ ان بتوں میں کوئی نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ کچھ نقصان پہنچانے کی، اور نہ اس پر کوئی دلیل نقلی ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کوئی دلیل نہیں بھیجی، کائنات میں صرف خدا کا حکم جاری ہے؛ اس لئے وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے ۔ ←

← حضرت یوسف علیہ السلام کے اس خطاب میں سبق ہے کہ جب کوئی ضرورت مند سامنے آئے اور دعوت دین کا کوئی موقع نکل سکتا ہو تو ایسے موقع پر اس کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے ، اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے تعبیر بتادی ہوتی تو شاید لوگ اس توجہ کے ساتھ آپ کے اس خطاب کو نہ سنتے ؛ اس لئے آپ نے پہلے ان کے سامنے دعوت ایمان رکھی ، پھر انھیں خواب کی تعبیر بتائی کہ ساقی کو نجات مل جائے گی اور نان بائی سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے ، مفسرین نے لکھا ہے کہ بادشاہ کی تحقیق میں یہی ثابت ہوا کہ شراب میں زہر نہیں تھا اور روٹی میں زہر تھا ؛ کیوں کہ جب یہ روٹی جانور کو کھلائی گئی تو وہ فوراً ہی ڈھیر ہو گیا ؛ چنانچہ جب یہ ساقی رہا کیا جانے لگا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ عزیز مصر کے سامنے میرا تذکرہ بھی کر دینا ، مقصد یہ تھا کہ آپ کی رہائی کا فیصلہ بھی ہو جائے ؛ لیکن ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان کسی مصیبت سے نجات پاتا ہے تو برے وقت کے ساتھیوں کو بھول جاتا ہے ؛ چنانچہ یہی ہوا کہ شیطان نے اسے بھلا دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے مزید کئی سال جیل میں گزر گئے —— آیت : ۴۲ میں چند باتیں قابل ذکر ہیں :

○ **اول :** یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے ساقی سے فرمایا کہ اپنے رب کے پاس میرا ذکر کرنا ، یہاں رب کے معنی آقا و مالک کے ہیں ؛ کیوں کہ وہ بھی اپنے غلام کی پرورش کرتا ہے ؛ لیکن چوں کہ رب اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حقیقی رب تو اللہ ہی کی ذات ہے ؛ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی غلام اپنے مالک کو رب نہ کہے ؛ بلکہ 'سید' یا 'مولیٰ' وغیرہ ، کے الفاظ کہے اور کوئی مالک اپنے غلام کو عبد نہ کہے ؛ بلکہ غلام یا دوسرے الفاظ کہے : ''لا یقل احدکم اسقی ربک اطعم ربک ... ولیقل سیدی مولای الخ'' (مسلم : عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ : کتاب الألفاظ من الأدب باب حکم إطلاق لفظة العبد والأمة الخ ، حدیث نمبر : ۲۰۱۴) اس لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ پچھلی اُمتوں میں اس کی ممانعت نہیں تھی ، شریعت محمدی چوں کہ آخری شریعت ہے ؛ اس لئے بعض ایسی باتیں جن کی پچھلی اُمتوں میں اجازت تھی ؛ لیکن ان سے شرک کا وہم پیدا ہوسکتا تھا ، اس اُمت میں منع کر دی گئیں ، ان ہی میں سے غالباً یہ تعبیر بھی ہے ۔

○ **دوسرے :** قرآن نے کہا کہ ''شیطان نے بھلا دیا'' ، اس میں حسن اخلاق کی تعلیم ہے کہ اگر کسی غلطی کے ارتکاب میں انسان کے قصد و ارادہ کو دخل نہ ہو تو اس کی نسبت خود اس کی طرف کر کے اسے شرمندہ نہ کیا جائے ؛ بلکہ اس کی نسبت شیطان کی طرف کر دی جائے ؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے ممنوعہ پھل کھانے کی غلطی کو براہ راست حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی طرف منسوب کرنے کے بجائے شیطان کی طرف منسوب کر دیا : ''فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ'' ۔ (البقرة : ۳۶)

○ **تیسرے :** بعض مفسرین کا خیال ہے کہ : ''فانساه الشیطان ذکر ربه'' سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس بات سے غافل کر دیا کہ وہ اپنے پروردگار سے التجا کرتے ، اس کے بجائے انھوں نے اس قیدی کو توجہ دلانے پر اکتفا کیا ، اس سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت نقل کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کاش ! حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو یاد دلانے کی بات نہ کہی ہوتی تو ان کے قید کی مدت مزید دراز نہ ہوتی ؛ لیکن صحیح تفسیر وہی ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے کہ ساقی عزیز مصر سے ذکر کرنا بھول گیا ، یہی بات حضرت یوسف علیہ السلام کی شان نبوت کے مطابق ہے ، اگر حضرت یوسف علیہ السلام خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے تو آپ نے اپنے جیل کے رفقاء کو کیوں کر ایمان کی دعوت دی ہوتی ؟ رہ گئی عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما والی روایت تو وہ حد درجہ ضعیف ہے ، اس میں ایک راوی سفیان بن ذکی ہیں جو ضعیف ہیں ، دوسرے راوی ابراہیم بن یزید ہیں ، وہ ان سے بھی بڑھ کر ضعیف ہیں ؛ اسی لئے علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بہت ہی ضعیف قرار دیا ہے : ''وهذا الحدیث ضعیف جداً'' (ابن کثیر : ۲/۵۸۳) بلکہ اسی واقعہ سے بعض مفسرین نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اللہ پر یقین کے ساتھ انسان کو ظاہری اسباب بھی اختیار کرنا چاہئے ، ←

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ
يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ ع ۶ / ۱۶
الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ
عَلِيْمٌ ﴿۵۰﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ
سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

یوسف نے کہا: تم سات سال مسلسل کاشت کاری کرتے جاؤ، پھر جو فصل کاٹو تو تھوڑی مقدار کھانے کی چھوڑ کر اس کو
بالی ہی میں لگا رہنے دو ﴿۴۷﴾ پھر اس کے بعد سات سال ایسے سخت آئیں گے کہ جو کچھ تم نے پہلے محفوظ رکھا تھا، یہ اسے
کھا جائیں گے، سوائے تھوڑی مقدار کے جس کو تم بچا کر رکھ چھوڑے ہوگے ﴿۴۸﴾ اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا،
جس میں لوگوں پر خوب بارش ہوگی اور وہ اس میں شیرہ بھی نچوڑیں گے ﴿۴۹﴾ بادشاہ نے کہا: یوسف کو میرے پاس لاؤ،
جب ان کے پاس قاصد پہنچا تو اس نے کہا: اپنے آقا کی طرف واپس جاؤ اور دریافت کرو کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا
ہوا، جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ بے شک میرے پروردگار ان کے عمل سے اچھی طرح واقف ہیں ﴿۵۰﴾
بادشاہ نے (عورتوں سے) پوچھا: تم لوگوں نے جو یوسف کو پھنسلانے کی کوشش کی تھی، اس سلسلہ میں تمہارا واقعہ کیا
ہے؟ عورتوں نے جواب دیا: اللہ کی پناہ!﴿۱﴾ ہم لوگوں نے یوسف میں کوئی برائی نہیں پائی، عزیز مصر کی بیوی نے کہا:
اب سچی بات پوری طرح واضح ہوگئی، میں نے ہی اسے پھنسلانے کی کوشش کی تھی اور یوسف یقیناً سچے ہیں، ﴿۵۱﴾
یہ سب (وضاحت) اس لئے (کرائی گئی) کہ (عزیز مصر کو) معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیچھے میں بھی اس کے
ساتھ کوئی خیانت نہیں کی اور اس میں شک نہیں کہ اللہ خیانت کرنے والوں کی چال چلنے نہیں دیتے۔ ﴿۵۲﴾

← حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین تھا کہ نجات اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی سے حاصل ہو سکے گی؛ لیکن ظاہری سبب کے درجہ میں آپ نے اس ساقی کو یاددہانی کی تاکید بھی فرمائی۔

○ **چوتھی :** قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کتنی مدت قید میں رہے؟ اس سلسلہ میں ''بضع سنين'' کے الفاظ آئے ہیں 'بضع' کا لفظ عربی زبان میں تین سال سے نو سال تک پر بولا جاتا ہے؛ لہٰذا بظاہر یہی مدت آپ کے جیل میں رہنے کی ہوگی، گو مفسرین کے یہاں اس سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں، (قرطبی: ۹/۱۹۶) —— بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک صاحبِ ایمان جہاں بھی جائے، اپنے اخلاق و کردار کے نقوش چھوڑ جائے اور دعوت دین سے غافل نہ رہے۔

﴿۱﴾ قرطبی نے ''حاش لله'' کا ترجمہ ''معاذ اللہ'' سے کیا ہے۔ (قرطبی: ۹/۲۰۷)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖۤ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْنٌ اَمِیْنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۵﴾ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

ع ۷

میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ، یقیناً نفس تو برائی کا حکم دیتا ہی ہے ، سوائے اس کے جس پر میرے پروردگار کی مہربانی ہوجائے ، بے شک میرے پروردگار بہت معاف کرنے والے اور بڑے مہربان ہیں ﴿۵۳﴾ بادشاہ نے کہا: یوسف کو میرے پاس لاؤ ، میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا ، پھر جب بادشاہ نے یوسف سے گفتگو کی تو کہا: آج سے تم ہمارے پاس صاحب اختیار اور قابل اعتماد ہو ﴿۵۴﴾ یوسف نے کہا: مجھے ملک کے خزانوں پر ذمہ دار بنادیجئے ، میں ان کی حفاظت بھی کروں گا اور (اس کام سے) خوب باخبر بھی ہوں ﴿۵۵﴾ اس طرح ہم نے یوسف کو زمین میں صاحب اختیار بنادیا کہ وہ جہاں چاہیں رہیں ، ہم جسے چاہتے ہیں اپنی رحمت سے نواز دیتے ہیں اور اچھے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۵۶﴾ نیز آخرت کا اجر ان لوگوں کے لئے کہیں بڑھ کر ہے ، جو صاحبِ ایمان ہیں اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں ۔ ﴿۱﴾ ﴿۵۷﴾

﴿۱﴾ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کی دلچسپ داستانِ زندگی کا چوتھا مرحلہ شروع ہوتا ہے ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ مصر نے خواب میں دیکھا کہ سات فربہ گائیں ہیں جس کو سات دُبلی گائیں کھائے جارہی ہیں ، اور سات سرسبز وشاداب بالیاں ہیں ، جن کے ساتھ ساتھ سات سوکھی ہوئی بالیاں بھی رکھی ہوئی ہیں ، بعض تفسیری روایت میں ہے کہ اس میں ایک سوکھی ہوئی بالی کو دیکھا کہ وہ تروتازہ بالیوں کو کھائے جارہی ہے ، بادشاہ اس خواب سے گھبرا گیا اور اپنے درباریوں سے کہا کہ اگر تمہیں خواب کی تعبیر آتی ہو تو مجھے اس کی تعبیر بتاؤ ، درباریوں نے کہا کہ یہ بے معنی قسم کا خواب ہے اور ہم لوگ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے ، اسی دوران حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ساتھی کو حضرت یوسف علیہ السلام کی یاد آئی اور اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں جیل میں قید یوسف سے اس کی تعبیر پوچھ آؤں ، اجازت ملی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں آکر خواب بیان کیا ، حضرت یوسف علیہ السلام فرما سکتے تھے کہ بادشاہ پہلے میری رہائی کا فیصلہ کرے ، پھر میں اس کی تعبیر بتاؤں گا ؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی شرافت ہے کہ انھوں نے بغیر کسی شرط کے نہ صرف خواب کی تعبیر بتائی ؛ بلکہ اس خواب میں جس آنے والی مصیبت کی طرف اشارہ تھا ، اس سے بچاؤ کی تدبیر بھی بتادی ، جس کا حاصل یہ ہے کہ سات سال بہت خوشحالی کے ہوں گے اور سات سال بہت ہی خشک سالی کے ؛ لہٰذا جو زمانہ ←

← خوشحالی کا ہو، غذائی ضرورت کے مطابق پیداوار نکال لی جائے اور بقیہ بالیوں میں رہنے دی جائے؛ تاکہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہے، پھر خواب سے آگے بڑھ کر یہ بھی بتادیا کہ خشک سالی کے ان سات سالوں کے بعد پھر سرسبز و شادابی کا سال آئے گا، بادشاہ نے تعبیر سن کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے دربار میں طلب کیا، ایسے موقع پر انسان جلد بازی سے کام لیتا ہے؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر و متانت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے قاصد سے کہا کہ جن عورتوں نے مجھ پر الزام تراشی کرتے ہوئے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے تھے، پہلے ان کا موقف واضح اور صاف ہونا چاہئے، عزیز مصر نے جب مصر کی ان بیگمات سے اس بارے میں دریافت کیا تو سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں پائی، عزیز مصر کی بیوی جس نے اصل میں الزام لگایا تھا، وہ بھی بول اُٹھی کہ اب سچائی پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ غلطی میری ہی تھی اور یوسف پاکباز تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے وضاحت فرمائی کہ میں نے یہ تحقیق محض اس لئے کرائی ہے کہ بادشاہ کو اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی ہے، اب بادشاہ نے کہا کہ یوسف علیہ السلام کو میں اپنے لئے خاص کرتا ہوں کہ وہ اب میرے معاون و مشیر خصوصی ہوں گے اور آج سے یہ ہمارے پاس معزز اور بااختیار شخص کی حیثیت سے رہیں گے، حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے خواہش کی کہ وہ زمین مصر کی حفاظت و نگرانی پر ان کو ذمہ دار بنادیں اور یقین دلایا کہ میرے اندر اِن کی حفاظت کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور علم بھی، اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سرزمین مصر میں اقتدار عطا فرمایا، یہ عجیب بات ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش بھی ایک خواب ہی سے شروع ہوئی تھی، جب انھوں نے سورج اور چاند ستاروں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی کامیابی اور عزت و وقار کے عروج کا دور بھی ایک خواب ہی سے شروع ہوا، جسے بادشاہ مصر نے دیکھا تھا۔

قصۂ یوسف علیہ السلام کے اس حصہ میں بھی عبرت و نصیحت کی مختلف باتیں ہیں اور شریعت کے متعدد احکام کی طرف بھی اشارہ ہے، جن کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

- حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ بعض خواب سچے بھی ہوتے ہیں، بالخصوص انبیاء کے خواب؛ لیکن خواب کے سچے ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ خواب دیکھنے والا نیک اور صالح شخص ہی ہو؛ کیوں کہ عزیز مصر کافر تھا، پھر بھی اس کا خواب سچا ثابت ہوا۔
- یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی خواب کی جو تعبیر پہلے دی جاتی ہے، وہی ظہور میں آتی ہے، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے بادشاہ کے خواب کو اس کے درباریوں نے پہلے خواب پریشاں قرار دیا تھا؛ لیکن بعد میں جو تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بتائی، وہی صحیح ثابت ہوئی۔ (قرطبی: ۲۰۱/۹)
- حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف خواب کی تعبیر ہی نہیں بتائی ؛ بلکہ قحط کے حالات سے نمٹنے کی تدبیر بھی بتلائی، اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی مصلحتوں کی تدبیر اور اس کی رہنمائی دین میں مطلوب اور شریعت کا مقصود ہے۔ (قرطبی: ۲۰۳/۹)
- حضرت یوسف علیہ السلام اگر صرف خوشحالی اور خشک سالی کا ذکر کر دیتے تو خواب مکمل ہوجاتا؛ لیکن اللہ نے آپ کو جو علم عطا کیا تھا، اس کے تحت آپ نے یہ بھی بتادیا کہ قحط سالی کے بعد پھر خوشحالی کا سال آئے گا، اس سے معلوم ہوا کہ سوال کرنے والے کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے جواب میں ایسی بات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، جو اس کے لئے فائدہ مند ہو۔
- حضرت یوسف علیہ السلام کا صبر دیکھئے کہ اتنی طویل مدت کے بعد جب آپ کی رہائی کا وقت ہوا تو فوراً نکل آنے کی بجائے آپ نے قاصد کو واپس کر دیا کہ پہلے مجھ پر لگائے گئے الزام کی تحقیق ہونی چاہئے ؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے ←

← اس وصف کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم کریں، وہ بڑے صابر اور بردبار تھے، جتنے دنوں وہ قید میں رہے، اگر میں رہتا تو فوراً بلانے والے کی بات پر لبیک کہتا اور کچھ عذر نہیں کرتا، (قرطبی: ۹/۲۰۶) —— اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جو لوگ دین کی کسی خدمت پر مامور ہوں، ان کو اپنے آپ کو مقام تہمت سے اونچا رکھنا چاہئے اور اگر کوئی شخص تہمت لگا دے تو اپنی پوزیشن کو صاف کر دینا چاہئے؛ تاکہ خود دین پر لوگوں کا اعتماد متزلزل نہ ہو جائے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ ادب بھی قابل توجہ ہے کہ آپ نے عمومی طور پر عورتوں کا ذکر فرمایا، خاص طور پر عزیز مصر کی بیوی کا ذکر نہیں فرمایا؛ کیوں کہ جب متعین طور پر کسی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اس کی تذلیل واہانت ہوتی ہے۔

○ پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ نہیں فرمایا کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہوا، جنھوں نے مجھے برائی کی دعوت دی تھی؛ بلکہ فرمایا ان عورتوں کا کیا معاملہ ہوا جنھوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لئے تھے، یعنی نہ اپنے زبان پر برائی کا ذکر لائے اور نہ ان عورتوں کی طرف کھل کر برائی کی نسبت کی۔ (مفاتیح الغیب: ۹/۷۴)

○ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان دیکھئے کہ خود نبی، ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نبی، دادا حضرت اسحاق علیہ السلام نبی اور پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ''کریم بن کریم بن کریم بن کریم'' قرار دیا ہے، (صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب أم کنتم شهداء إذ حضر الخ، حدیث نمبر: ۳۳۷۴) اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ میں اپنے نفس کو پاکباز نہیں کہتا کہ نفس تو برائی کی دعوت دیتا ہی ہے اور نفس کے جال سے وہی بچ سکتا ہے، جس پر اس کے پروردگار کی رحمت ہو، یہ ایک زبردست تنبیہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اپنے نفس کے بارے میں مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے اور جو گناہ سے بچ جائے اسے سمجھنا چاہئے کہ اِس میں اُس کا کمال نہیں ہے؛ بلکہ یہ اللہ کی رحمت ہے۔

○ رسول اللہ ﷺ نے عہدہ کو طلب کرنے سے منع فرمایا؛ لیکن یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے گویا مالیات کی نگرانی کا عہدہ طلب فرمایا ہے، اس میں حقیقتاً کوئی تضاد نہیں ہے، جب کسی ذمہ داری کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے کئی لوگ موجود ہوں تو عہدہ کا طلب کرنا جائز نہیں؛ لیکن جب ایک ہی شخص اس کی صلاحیت رکھتا ہو تو عہدہ طلب کرنا جائز؛ بلکہ بعض حالات میں واجب ہے؛ کیوں کہ اس میں صرف اسی کی بھلائی نہیں ہے؛ بلکہ عام عام لوگوں کی مصلحت ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے عہدہ طلب کرنے کا یہی سبب تھا۔

○ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مسلمان غیر مسلم فرد یا حکومت کی ملازمت کر سکتا ہے؛ بشرطیکہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا ہو، وہ خود جائز و درست ہو۔

○ اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے اور وہاں انتخاب میں حصہ لینے کے لئے خود اُمیدوار بننا پڑتا ہو، وہاں کسی مسلمان کا مخلوق کی خدمت کی نیت سے اپنے آپ کو اُمیدوار کی حیثیت سے پیش کرنا جائز ہے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر سے یہ بھی فرمایا کہ میں حفیظ بھی ہوں اور علیم بھی، یعنی دیانتدار بھی ہوں اور صاحب علم بھی، معلوم ہوا کہ کسی کام کی اہلیت کے لئے بنیادی طور پر یہ دونوں باتیں ضروری ہیں، دیانت وامانت اور علم وآگہی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں ضرورت ہو، وہاں ایک انسان کے لئے اپنی صلاحیت، اچھی صفات، ڈگریوں اور عہدوں کو ظاہر کرنے کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ یہ بطور تکبر کے نہیں ہے، بطور تعارف کے ہے۔

○ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کا نام زلیخا تھا اور بعد کو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آئیں اور آپ سے ان کو اولاد بھی ہوئی۔ (تفسیر خازن: ۲/۵۸، آیت نمبر: ۵۷)

وَ جَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ
بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَ اَنَا خَیْرُ
الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ
اَبَاهُ وَ اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ قَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا
انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤی اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤی اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا
الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ
اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤی اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَمَّا فَتَحُوْا
مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَیْهِمْ ؕ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِیْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ
اِلَیْنَا ۚ وَ نَمِیْرُ اَهْلَنَا وَ نَحْفَظُ اَخَانَا وَ نَزْدَادُ كَیْلَ بَعِیْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾

اور یوسف کے بھائی آئے، پھر یوسف کے دربار میں داخل ہوئے، یوسف انھیں پہچان گئے؛ مگر ان لوگوں نے یوسف کو نہیں پہچانا ﴿۵۸﴾ جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا، تو کہا: تم میرے پاس اپنے باپ شریک بھائی کو بھی لانا، تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور میں بہت مہمان نواز بھی ہوں ﴿۵۹﴾ اگر (اس بار) تم اس کو بھی میرے پاس نہیں لائے تو تمھیں میرے پاس سے غلہ نہیں ملے گا اور تم لوگ میرے قریب بھی نہ آنا ﴿۶۰﴾ ان لوگوں نے کہا: ہم اس کے بارے میں اپنے والد کو آمادہ کر لیں گے اور ہم یہ ضرور کر کے رہیں گے ﴿۶۱﴾ یوسف نے اپنے کارکنوں سے کہا: ان کی پونجی بھی ان کے سامان ہی میں رکھ دو؛ تاکہ جب وہ اپنے لوگوں کے پاس پہنچیں تو اسے پہچان لیں (اس طرح) شاید وہ لوٹ کر آئیں ﴿۶۲﴾ پھر جب یہ لوگ اپنے والد کے پاس واپس گئے تو کہنے لگے: ہم کو غلہ سے روک دیا گیا ہے؛ لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجیں؛ تاکہ ہم غلہ حاصل کر سکیں اور ہم لوگ اس کی خوب حفاظت کریں گے ﴿۶۳﴾ یعقوب نے کہا: کیا میں اس کے بارے میں تم لوگوں پر ویسے ہی بھروسہ کر لوں، جیسے اس سے پہلے اس کے بھائی کے بارے میں کیا تھا؟ بہرحال اللہ ہی بہترین نگہبان ہیں اور وہی سب مہربانی کرنے والوں سے بڑھ کر مہربان ہیں ﴿۶۴﴾ جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا تو انھیں اپنی پونجی بھی مل گئی، جو انھیں واپس کر دی گئی تھی، ان لوگوں نے عرض کیا: ابا جان! ہمیں اور کیا چاہئے، یہ ہماری اصل پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے، ہم اپنے گھر والوں کے لئے سامان لائیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور مزید ایک اونٹ کا بوجھ غلہ لائیں گے، یہ تو تھوڑا سا غلہ ہے! ﴿۶۵﴾

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ
اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ
وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا
كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ
لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ ع ۸ ۱۱ ۲
اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا
تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا
تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

یعقوب نے کہا: ہم اس کو تم لوگوں کے ساتھ ہرگز نہیں بھیجیں گے؛ جب تک تم اللہ کی قسم کھا کر پکا عہد نہ کرو گے کہ تم ضرور اس کو میرے پاس واپس لاؤ گے؛ سوائے اس کے کہ تم لوگ خود گھر جاؤ، جب ان لوگوں نے یعقوب سے پکا وعدہ کیا تو یعقوب نے کہا: اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہیں ﴿۶۶﴾ اور کہا: اے میرے بیٹو! تم لوگ ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا؛ بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا اور میں اللہ کے حکم کے مقابلہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتا، فیصلہ تو اللہ ہی کا ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور بھروسہ کرنے والے کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئے ﴿۶۷﴾ اور جب یہ لوگ اپنے والد کے حکم کے مطابق داخل ہوئے تو اللہ کے حکم کے مقابلہ کوئی چیز کام نہ آسکتی تھی، یہ تو یعقوب کے دل میں محض ایک خواہش تھی، جس کو اس نے پورا کرلیا، بے شک یعقوب صاحب علم تھے؛ کیوں کہ ہم نے اس کو علم سے نوازا تھا؛ لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے ﴿۶۸﴾ اور جب یہ لوگ یوسف کے پاس آئے تو اس نے اپنے (حقیقی) بھائی کو اپنے پاس رکھا، یوسف نے کہا: میں تمہارا بھائی ہوں، تم اِن لوگوں کی حرکتوں سے رنجیدہ نہ ہونا ﴿۶۹﴾ پھر جب اُن کا سامان تیار کردیا تو پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا، پھر ایک پکارنے والے نے اعلان کیا: اے قافلہ والو! تم لوگ ضرور چوری کے مرتکب ہوئے ہو ﴿۷۰﴾ یعقوب کے بیٹوں نے اُن کی طرف متوجہ ہوکر دریافت کیا کہ تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے؟ ﴿۷۱﴾ اُن لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں شاہی پیمانہ نہیں مل رہا ہے، جو اس کو لے کر آئے گا، اس کو ایک اونٹ کا بوجھ غلہ دیا جائے گا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں ﴿۷۲﴾ یعقوب کے بیٹوں نے جواب دیا: تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم لوگ زمین میں فساد مچانے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔ ﴿۷۳﴾

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ ۝۷۴ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ
كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۝۷۵ فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ
اَخِیْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ
دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ ۝۷۶ قَالُوْۤا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ
قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
تَصِفُوْنَ ۝۷۷ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَیْخًا كَبِیْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ
مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۷۸ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا
لَّظٰلِمُوْنَ ۝۷۹ فَلَمَّا اسْتَیْــٴَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ
اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی
یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ۝۸۰

ان لوگوں نے کہا: اگر تم جھوٹے نکلے تو اس کی کیا سزا ہوگی؟ ۝۷۴ اِن حضرات نے جواب دیا: جس کے سامان میں وہ پیمانہ پایا جائے، وہ شخص خود اس کا بدلہ ہے، ہم لوگ زیادتی کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں؛ ۝۷۵ چنانچہ یوسف نے اپنے (حقیقی) بھائی کے تھیلے سے پہلے دوسروں کے تھیلوں کی تلاشی لی، پھر اپنے (حقیقی) بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کرلیا، اسی طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر فرمائی، یوسف بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو رکھ نہیں سکتے تھے؛ مگر اللہ کو یہی منظور تھا، ہم جس کے چاہتے ہیں، مرتبے بلند کردیتے ہیں اور ہر صاحبِ علم سے اوپر کوئی صاحبِ علم موجود ہے ۝۷۶ یوسف کے بھائیوں نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، یوسف نے اسے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور ان پر ظاہر نہیں کیا، یوسف نے کہا: تم لوگ تو اور بھی برے ہو اور تم جو کچھ بیان کررہے ہو، اللہ اس سے خوب واقف ہیں ۝۷۷ وہ لوگ کہنے لگے: اے عزیز! اس کے والد بہت بوڑھے ہیں، آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو لے لیجئے، یقیناً ہم آپ کو نیک مزاج پاتے ہیں ۝۷۸ یوسف نے کہا: اس بات سے اللہ کی پناہ کہ جس کے پاس ہمیں اپنا سامان ملا ہے، ہم اس کے سوا کسی اور کو پکڑ کر رکھیں، یقیناً ایسی صورت میں ہم ناانصافی کرنے والے ہوں گے ۝۷۹ جب یہ لوگ یوسف سے نااُمید ہوگئے تو الگ ہوکر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا: کیا تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کی قسم دلا کر پکا وعدہ لیا تھا؟ اور اس سے پہلے بھی یوسف کے بارے میں تم کوتاہی کرچکے ہو؛ اس لئے میں تو اس جگہ سے ٹلوں گا نہیں؛ جب تک میرے والد مجھ کو اجازت نہ دے دیں، یا اللہ میرے حق میں کوئی فیصلہ نہ فرمادیں، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والے ہیں۔ ۝۸۰

اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْكُمْ فَقُوْلُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَ مَا كُنَّا لِلْغَیْبِ حٰفِظِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ الَّتِیْ كُنَّا فِیْهَا وَالْعِیْرَ الَّتِیْۤ اَقْبَلْنَا فِیْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۸۳﴾ وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ یُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِیْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّیْ وَ حُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

تم لوگ اپنے والد کی طرف واپس جاؤ پھر عرض کرو: ابا جان! آپ کے بیٹے نے تو چوری کرلی، ہمیں جو کچھ معلوم تھا، ہم نے وہی کہا تھا اور ہم غیب کی باتوں سے تو واقف تھے نہیں ﴿۸۱﴾ نیز آپ اُس شہر والوں سے پوچھ لیجئے، جہاں ہم تھے اور اس قافلہ سے بھی دریافت کرلیجئے، جس کے ساتھ ہم لوگ آئے ہیں، اور یقیناً ہم سچ بول رہے ہیں ﴿۸۲﴾ یعقوب نے کہا: بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے؛ لہٰذا صبر کرنا ہی بہتر ہے، اُمید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئیں گے، بے شک اللہ بڑے علم والے اور بڑی حکمت والے ہیں ﴿۸۳﴾ یعقوب نے ان سے منھ پھیر لیا اور کہنے لگے: ہائے یوسف! مارے غم کے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور وہ ضبط کئے ہوئے تھے ﴿۸۴﴾ بیٹوں نے کہا: خدا کی قسم! آپ یوسف کو یاد کرکر کے گُھل کر رہ جائیں گے یا جان ہی دے دیں گے ﴿۸۵﴾ یعقوب نے کہا: میں اللہ ہی سے اپنے دُکھ اور رنج والم کا گلہ کررہا ہوں اور مجھ کو اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہیں، جو تم نہیں جانتے ہو۔ ﴿۱﴾ ﴿۸۶﴾

﴿۱﴾ آیت نمبر: ۵۸ سے آیت نمبر: ۸۶ تک حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کو اس خوبصورت اور سبق آموز داستان کا پانچواں مرحلہ کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب قحط شروع ہوا تو اس سے کنعان کا علاقہ بھی متاثر ہوا، جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام رہتے تھے، اِدھر حضرت یوسف علیہ السلام نے قحط سے بچنے کی جو صورت اختیار فرمائی، اس کے نتیجہ میں مصر میں غذائی اشیاء کی وافر مقدار حکومت کے خزانے میں موجود تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام پوری فیاضی کے ساتھ حاجت مندوں کو تقسیم فرماتے تھے، یہاں تک کہ دور دور سے ضرورت مندوں کے قافلے آنے لگے، یہ خبر کنعان تک بھی پہنچی، حضرت یوسف علیہ السلام کے دس سوتیلے بھائی اسی سلسلے میں مصر پہنچے، حضرت یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین جو سب سے چھوٹے تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے انھیں اپنے پاس روک لیا، بھائیوں کا یہ قافلہ جب شاہی دربار میں اُترا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے تو انھیں اچھی طرح پہچان لیا؛ لیکن ان کے بھائی انھیں پہچان نہیں سکے، ایک تو بچپن اور جوانی کے چہرہ میں یوں ہی غیر معمولی فرق ہوجاتا ہے اور پھر یہ بات ←

← ناقابلِ تصور تھی کہ جس شخص کو ذلت وحقارت کے ساتھ اندھیرے کنویں میں پھینک دیا گیا تھا اور جس کے بارے میں گمان تھا کہ کسی قافلہ نے ان کو کنعانی غلام سمجھ کر اپنی خدمت کے لئے رکھ لیا ہوگا، وہ آج مصر کے تحت اقتدار پر بیٹھا ہوگا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ہر بھائی کے لئے الگ الگ سامان بھر پور طریقہ پر عنایت فرمایا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان بھائیوں نے بتایا کہ ان کے بوڑھے باپ اور ایک اور بھائی بھی ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرمایا کہ آئندہ تم اپنے اس بھائی کو بھی لاؤ تو میں تمھیں اور بڑھ کر دوں گا اور اگر بھائی کو ساتھ نہ لائے تو پھر میرے قریب بھی نہ آنا، بھائیوں نے کہا ہم پوری کوشش کر کے اپنے والد کو اس پر راضی کریں گے، دوسری طرف اپنے کارکنوں سے فرمایا: یہ جو کچھ سامان بطور قیمت کے لائے تھے، انھیں بھی ان کے سامان ہی میں ڈال دو؛ تاکہ جب اپنے گھر پہنچ کر اس داد و دہش کو دیکھیں تو پھر واپس آئیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سونے چاندی یا کسی اور چیز کی کرنسی کا رواج نہیں ہوا تھا؛ بلکہ ایک سامان سے دوسرے سامان کا تبادلہ ہوتا تھا؛ اس لئے یہ حضرات سامان لے کر آئے تھے، بہر حال یہ قافلہ واپس گیا اور انھوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے عرض کیا کہ اگر ہم اپنے ساتھ بِنْیَامین کو نہ لے جائیں تو ہم پر آئندہ مدد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے؛ لہٰذا آپ اس کو بھی ہمارے ساتھ بھیجیں اور ہم اس کی پوری حفاظت کریں گے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جیسے میں نے یوسف کے معاملے میں تم لوگوں پر بھروسہ کیا تھا، تم چاہتے ہو کہ میں ویسے ہی اس کے معاملہ میں بھی کروں، حفاظت کرنے والی ذات تو اللہ کی ہے، پھر جب ان بھائیوں نے سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی اصل پونجی بھی واپس لوٹا دی گئی ہے، اس سے اور زیادہ خوش ہوئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے عرض کیا کہ حکومت مصر کے یہ ذمہ دار اتنے خوش اخلاق ہیں کہ اصل سامان بھی واپس کر دیا اور مطلوبہ سامان بھی دے دیا، اس لئے ہم پھر دوبارہ بِنْیَامین کو لے کر جائیں گے اور زیادہ مال لے کر آئیں گے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے پچھلے تجربہ کی روشنی میں فرمایا کہ میں بِنْیَامین کو اسی وقت تمہارے ساتھ بھیجوں گا؛ جب کہ تم اللہ کی قسم کھا کر یقین دلاؤ کہ تم اسے لے کر ہی واپس آؤ گے، سوائے اس کے کہ تم خود ہی گھر جاؤ۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ تم لوگ شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہو، الگ الگ دروازوں سے داخل ہو، اصل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکے قد و قامت اور شکل وصورت میں مصر کے قبطیوں کے مقابلہ میں ممتاز تھے، ایک اندیشہ تو یہ تھا کہ کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے اور یہ بھی خطرہ رہا ہوگا کہ کہیں اتنے سارے اجنبی چہرے اور حلیے کے لوگ ایک ساتھ داخل ہوں تو مقامی لوگ اس کو کسی سازش پر محمول نہ کریں: اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے احتیاط کے طور پر نصیحت فرمائی، مگر واضح فرما دیا کہ یہ بطور سبب کے ہے اور اپنی تشفی کے لئے ہے؛ ورنہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے، بہر حال یہ حضرات والد کی نصیحت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کسی طرح ایسی صورت پیش آئی کہ بِنْیَامین حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تنہا ہو گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے انھیں حقیقت حال بتا دی کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں، تم پریشان نہ ہونا، پھر جب ان کا سامان تیار کیا گیا تو وہ پیالہ جس میں بادشاہ پانی پیا کرتا تھا، جو مفسرین کی روایت کے مطابق چاندی یا کسی اور دھات کا بنا ہوا تھا، وہ بِنْیَامین کے سامان میں ڈال دیا گیا اور پہلے سے بنے ہوئے منصوبہ کے مطابق ایک منادی نے ندا لگائی کہ اے قافلہ والو! تم لوگوں نے چوری کی ہے، ان حضرات نے پوچھا کہ تمہاری کونسی چیز غائب ہے؟ شاہی کارکنوں نے کہا کہ بادشاہ کا پیالہ غائب ہے اور پھر انعام کا اعلان ہوا کہ جو یہ پیالہ لائے گا، اس کو ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر سامان دیا جائے گا، حضرت یوسف علیہ السلام کے ←

← بھائیوں نے کہا: ہم زمین میں فساد مچانے نہیں آئے اور نہ ہم لوگ چور اُچکّے ہیں، کارکنوں نے پوچھا: اگر تم لوگ جھوٹے نکلے تو کیا سزا ہوگی، (قرطبی: ۲۳۶/۹) حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چوری کی سزا یہ تھی کہ جو جس کا مال چوری کرتا تھا، اس کا غلام بنا دیا جاتا تھا، اسی کے مطابق ان حضرات نے کہا کہ جس کے سامان میں چوری کا یہ سامان ملے گا، وہ تمہارے حوالہ ہو جائے گا اور تمہاری ملکیت قرار پائے گا؛ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی؛ مگر پیالہ نہیں ملا، پھر بنیامین کے سامان کی تلاشی لی تو اس میں پیالہ موجود تھا؛ چنانچہ بنیامین کو حضرت یوسف علیہ السلام نے روک لیا، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو ان دونوں سوتیلے بھائیوں سے جو بغض تھا، اس کا پھر اس موقعہ پر ظہور ہوا اور وہ کہنے لگے: اگر اس نے چوری کی ہے تو کیا تعجب کہ اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سنا؛ لیکن خاموش رہے اور ان سے صرف اتنا فرمایا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس کی حقیقت سے اللہ ہی واقف ہیں۔

مفسرین نے ان کے اس الزام کے مختلف پس منظر بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پھوپھی جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بڑی بہن تھی، آپ کو بہت چاہتی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ وہ ان ہی کے پاس رہیں؛ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام مُصر تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ان کے پاس رہیں؛ حضرت اسحاق علیہ السلام کا ایک کمربندان کے پاس تھا، انھوں نے اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کے کپڑے میں رکھ دیا؛ چنانچہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی شریعت کے مطابق ان کی وفات تک حضرت یوسف علیہ السلام کو ان ہی کے حوالہ کر دیا، (قرطبی: ۲۳۹/۹) شاید اسی تدبیر کو یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے اختیار فرمایا، —— بھائیوں نے بہت التجا کی کہ ان کے والد بہت بوڑھے ہیں، ہم میں سے کسی کو ان کی جگہ لے لیں اور بنیامین کو چھوڑ دیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ غلطی ایک نے کی ہو اور سزا دوسرے کو دی جائے؟ جب اُمید باقی نہیں رہی تو بڑے بھائی پر تو اتنا اثر تھا کہ انھوں نے کہا: اس سے پہلے بھی یوسف کے معاملے میں تم زیادتی کر چکے ہو اور اب یہ دوسری زیادتی کر رہے ہیں، والد کو کیا جواب دوں گا؛ اس لئے میں تو مصر سے ہٹوں گا نہیں؛ سوائے اس کے کہ یا تو والد مجھے واپس آنے کی اجازت دیں یا اللہ کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے، یعنی بنیامین واپس کر دیا جائے؛ البتہ تم لوگ والد کے پاس واپس جاؤ اور ان کو پوری صورت حال بتا دو کہ ہم لوگوں نے ضرور قسم کھائی تھی اور بنیامین کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا؛ لیکن ہم غیب کی باتوں سے تو واقف تھے نہیں، اور کیا جانتے تھے کہ یہ صورت حال پیش آجائے گی؟ اگر آپ چاہیں تو مصر والوں سے یا وہاں سے آنے والے قافلوں سے دریافت کر لیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کو اندازہ تھا کہ ان کا تربیت یافتہ بیٹا چور نہیں ہو سکتا؛ اس لئے فرمایا یہ سب تمہارے نفس کے دھوکے ہیں، بہر حال میں پھر صبر ہی سے کام لوں گا، مجھے اُمید ہے کہ اللہ ان سبھوں کو یعنی یوسف، بنیامین اور بڑے بیٹے کو مجھ سے ملا دے گا، یہ کہتے ہوئے بوڑھے باپ نے اپنا چہرہ پھیر لیا، حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کا زخم پھر تازہ ہو گیا، کہنے لگے: ہائے یوسف، یہاں تک کہ مارے غم کے رو رو کر آنکھیں سفید ہو گئیں اور بینائی جاتی رہی، بیٹوں نے کہا کہ آپ یوسف کو یاد کر کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنی مصیبت اور اپنا غم خدا کے حضور ہی میں پیش کرتا ہوں اور مجھے وہ بات معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے، یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یاد تھا؛ اس لئے انھیں یقین تھا کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ جب یوسف مل جائیں گے، یوسف کے سامنے ہم سب تعظیماً سجدہ ریز ہوں گے اور اس طرح اس خواب کی تعبیر مکمل ہوگی۔
←

← قصۂ یوسف کے اس حصہ میں بھی عبرت وموعظت کے بہت سے پہلو اور بعض شرعی اور فقہی احکام موجود ہیں :

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے لین دین کا جو نظام رکھا، اس سے معلوم ہوا کہ سامان کی سامان کے بدلے خرید وفروخت جائز ہے، سونا چاندی اور کرنسی ہی کے بدلے سامان خریدنا ضروری نہیں۔

○ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر سامان کا تبادلہ ہوجائے ؛ لیکن پھر ایک فریق دوسرے فریق کو اس کا سامان بطور ہدیہ واپس کردے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ؛ بلکہ یہ حسن سلوک کی ایک صورت ہے۔

○ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی اہم کام کے لئے دوسرے فریق سے قسم کھلا کر مطلوبہ حق کی ادائے گی کا وعدہ لیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے صاحبزادوں سے بنیامین کے سلسلہ میں قسم لی تھی۔

○ جس شخص پر کوئی چیز واجب ہو، اس کی طرف سے دوسرا شخص ذمہ داری قبول کرلے، اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''کفالت'' کہتے ہیں، کفالت مال کی بھی ہوتی ہے، ایسی صورت میں اگر اصل آدمی پیسہ واپس نہ کرے تو کفیل پر ان پیسوں کی ادائے گی واجب ہوگی، اور کفالت افراد واشخاص کی بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص اصل شخص کو عدالت کے سامنے حاضر کرنے کا ذمہ لے ؛ البتہ اگر اصل شخص سزا کا مستحق ہو اور کفیل اس کو حاضر نہ کرسکے تو کفیل پر اس کی سزا جاری نہیں کی جائے گی، اس کو ''کفالت بالنفس'' کہتے ہیں، یہی احناف کا اور اکثر فقہاء کا مسلک ہے، (فتح القدیر: ۷/۱۶۷) حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے صاحبزادوں کو اس بات کا ذمہ دار بنانا کہ وہ ''بنیامین کو واپس لے کر آئیں'' سے کفالت کی اس قسم کا ثبوت ملتا ہے۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے صاحبزادوں کو یہ حکم دینا کہ وہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں، حفاظت کے ظاہری سبب کو اختیار کرنا ہے، معلوم ہوا کہ اسباب کو اختیار کرنا جائز ہے اور یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ نظر لگنا حق ہے، حدیث میں بھی یہ بات آئی ہے، اس طرح کے بعض واقعات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آئے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا علاج بتایا کہ جب آدمی کسی چیز کو دیکھے اور وہ بھلی معلوم ہو تو اس کے لئے برکت کی دُعاء کرے، مثلاً کہے: ''تبارک اللہ احسن الخالقین'' (قرطبی: ۹/۲۲۷) اور اگر نظر لگ گئی اور اندازہ ہو کہ فلاں کی نظر لگی ہے تو وہ شخص غسل کرکے اپنا پانی دے اور 'جس کو نظر لگ گئی ہے' اس کو اس پانی سے غسل کرایا جائے۔ (سنن ترمذی، باب ماجاء أن العین حق الخ، حدیث نمبر: ۲۰۶۲)

○ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو تدبیر بتائی تھی، قرآن نے اس کے بارے میں کہا کہ اللہ کے فیصلے سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی ؛ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اطمینان وتشفی کے لئے بات کہی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ اسباب کو اختیار کرنا چاہئے ؛ لیکن ان کو موثر حقیقی نہیں سمجھنا چاہئے، اصل مؤثر اللہ کی ذات ہے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے پیالہ رکھنے کی تدبیر اس لئے کرائی کہ بادشاہ مصر کے قانون کے مطابق کسی اجنبی شخص کو مصر میں رکھا نہیں جاسکتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ جو مسلمان غیر مسلم حکومت میں ہوں، انھیں وہاں کے قانون کی پیروی کرنی چاہئے، سوائے اس کے کہ وہ قانون صریحاً شریعت کے خلاف ہو، تو اس کو بدلوانے کے لئے پُرامن جدوجہد کرنی چاہئے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو شخص شاہی پیمانہ تلاش کرکے پیش کرے گا اسے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر سامان دیا جائے گا، یہ اعلان بطور انعام کے تھا، نہ کہ بطور اُجرت اور معاوضہ کے، اور انعام کی مقدار کا متعین ہونا ضروری نہیں ؛ اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ بھی ہوسکتا ہے اور کم بھی، ایسی مبہم اُجرت کیوں متعین کی گئی۔ ←

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَ اَخِیْهِ وَ لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْهِ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ وَ جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَ تَصَدَّقْ عَلَیْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ﴿۸۸﴾

اے میرے بیٹو! جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت سے وہی لوگ نا اُمید ہوتے ہیں جو کافر ہیں، جو ایمان نہیں رکھتے ﴿۸۷﴾ پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے اور التجاء کی کہ اے عزیز! ہم اور ہمارے گھر والے بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں، ہم ایک حقیر پونجی لے کر حاضر ہوئے ہیں، پھر بھی آپ ہمارے لئے پورا غلہ عنایت کر دیجئے اور ہمارے ساتھ مہربانی کا معاملہ کیجئے ، بے شک اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے والوں کو بہتر اجر عطا فرماتے ہیں۔ ﴿۸۸﴾

← ○ اس اعلان میں یہ بھی فرمایا گیا کہ میں اس کا ضامن ہوں، اس سے مال کی کفالت کا درست ہونا ثابت ہوا کہ ایک شخص دوسرے شخص کی طرف سے کسی مالی ذمہ داری کو قبول کر سکتا ہے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے پیمانہ رکھوانے کی جو تدبیر کی، اس پر یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ گویا انھوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ یا مصر کے بادشاہ کے ساتھ دھوکہ کا معاملہ کیا؛ کیوں کہ آپ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ'' (یوسف: ۷۶) — اور جو عمل اللہ کے حکم کے تحت کیا جائے، وہ چاہے عام حالات میں گناہ ہو؛ لیکن اس خاص صورت میں گناہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ کسی کام کو کرنا اور نہ کرنا اصل مقصود نہیں ہے، اصل مقصود اللہ کے احکام کو بجالانا ہے۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کے بجائے کسی اور بھائی کو روکنا قبول نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کی شریعت کا قانون بھی یہی تھا کہ ایک شخص کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دی جاسکتی، بخلاف عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کے، کہ ان کے عقیدہ کے مطابق غلطی حضرت آدم علیہ السلام نے کی اور کفارہ میں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو سولی دے دی گئی۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں کا اپنے والد سے گزارش کرنا کہ ''آپ اس واقعہ کے بارے میں اہل مصر سے اور آنے والے قافلوں سے دریافت کر لیں'' سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص حق پر ہو؛ لیکن لوگوں کو اس کے بارے میں کسی وجہ سے بدگمانی ہو سکتی ہو تو اسے چاہئے کہ شواہد و ثبوت کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کر دے اور انھیں بدگمانی سے بچائے۔

○ یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص گناہ اور زیادتی کرے تو اس سے چہرہ پھیر لینا اور بے رخی برتنا جائز ہے؛ جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا چہرہ پھیر لیا تھا۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام غم سے چور تھے اور اس غم کا اظہار دل کی بے قراری کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے آنسوؤں سے بھی ←

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ
قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ
اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ
عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ
ع ۱۰ / ۴ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَ اْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ
لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ
جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚۙ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾

تو یوسف نے کہا: تمہیں یاد ہے جب تم نادان تھے تو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ ﴿۸۹﴾ بھائیوں نے دریافت کیا: کیا تم ہی یوسف ہو؟ یوسف نے کہا: ہاں، میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے؛ واقعی اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے، جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اچھے عمل کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے ﴿۹۰﴾ بھائیوں نے عرض کیا: خدا کی قسم، اللہ نے آپ کو ہم لوگوں کے اوپر برتری عطا فرمائی ہے اور یقیناً ہم ہی خطا کار تھے ﴿۹۱﴾ یوسف نے کہا: آج تم لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے، اللہ تم کو معاف فرمادیں اور اللہ تمام مہربانی کرنے والوں سے بڑھ کر مہربان ہیں ﴿۹۲﴾ تم لوگ میرا کرتا لے کر جاؤ اور اسے میرے والد کے چہرہ پر ڈال دو، ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور اپنے تمام گھر والوں کو لے کر میرے پاس آجاؤ ﴿۹۳﴾ جب قافلہ چلا تو ان کے والد کہنے لگے: اگر تم لوگ مجھے بوڑھاپے میں بہکی بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو مجھے تو یوسف کی خوشبو آرہی ہے ﴿۹۴﴾ لوگوں نے کہا: آپ تو اپنے پرانے وہم میں مبتلا ہیں ﴿۹۵﴾ پھر جب خوشخبری لانے والا آپہنچا اور اس نے یوسف کا کرتا ان کے چہرے پر ڈال دیا، تو فوراً ہی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی، یعقوب نے کہا: کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ مجھ کو اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہیں، جو تم کو معلوم نہیں ہیں؟ ﴿۹۶﴾ بیٹوں نے عرض کیا: ابا جان ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی مغفرت کی دُعاء فرمادیجئے، یقیناً ہم ہی خطا کار تھے۔ ﴿۹۷﴾

← ہوتا رہا، یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، معلوم ہوا کہ اگر انسان کی زندگی میں حزن والم کی کوئی بات پیش آجائے، اس کی وجہ سے اس کا دل متاثر ہو اور اس کی آنکھیں اشک بار ہوں تو یہ تقویٰ، اللہ پر بھروسہ اور صبر کے خلاف نہیں ہے؛ کیوں کہ جو فعل انسان کے اختیار سے باہر ہو، وہ اس کا مکلف نہیں ہوتا۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى
اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا
لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ
اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ
اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ
وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ
تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

یعقوب نے کہا: میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے دُعاءِ مغفرت کروں گا، یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والے اور نہایت مہربان ہیں ﴿۹۸﴾ پھر جب یہ سب یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا: مصر میں — انشاء اللہ — امن وچین کے ساتھ قیام فرمایئے ﴿۱﴾ ﴿۹۹﴾ یوسف نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا اور سب لوگ یوسف کے سامنے سجدے میں گر پڑے، یوسف نے کہا: ابا جان! یہی میرے خواب کی تعبیر ہے، جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا اور مجھ پر کرم فرمایا کہ مجھے قید خانہ سے رہائی عطا کی، میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان شیطان نے جو فساد ڈال دیا تھا، اس کے بعد آپ لوگوں کو گاؤں سے (یہاں) لے آیا، یقیناً میرے پروردگار کو جو منظور ہوتا ہے، اس کو لطیف تدبیر کے ساتھ پورا فرما دیتے ہیں، بے شک اللہ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں ﴿۱۰۰﴾ اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے حکومت عطا کی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کے علم سے نوازا، اے آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے والے! آپ ہی دنیا و آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھے مسلمان رہنے کی حالت میں اُٹھایئے اور مجھے نیک بندوں کے ساتھ رکھئے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۱﴾

﴿۱﴾ امام رازی رحمہ اللہ نے "ادخلوا مصر" کا ترجمہ کیا ہے: "أقیموا بها آمنین" (مفاتیح الغیب: ۱۵۱/۹) یعنی مصر میں امن کے ساتھ قیام فرمائے، اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ آیت نمبر: ۸۷ سے آیت نمبر: ۱۰۱ تک قصہ یوسف کا آخری مرحلہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی وجہ سے — جو حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا — یقین تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے انشاء اللہ ملاقات ہوگی؛ اس لئے انھوں نے پھر ایک بار اپنے بیٹوں کو تلقین کی کہ یوسف اور بنیامین کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو، اِدھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہاں غذائی اشیاء بھی ختم ہو چکی تھیں؛ چنانچہ آپ کے صاحبزادے پھر تیار ہوئے، اِس بار ان کے پاس خریدنے کے لئے سرمایہ بھی بہت معمولی اور ناقص تھا؛ اس لئے دربارِ یوسف میں پہنچے اور درخواست کی کہ ان کا ناقص سرمایہ قبول کر لیجئے؛ لیکن غلہ پورا پورا دیجئے اور بڑھ کر دیجئے "تصدق" کا معنی ہے ہمیں صدقہ دیجئے؛ لیکن انبیاء اور ان کی اولاد کے لئے صدقہ لینا حرام ہے؛ اس لئے یہاں مراد ہے کہ ہمارے ساتھ فضل وکرم کا معاملہ فرمائے اور کھوٹی پونجی ہونے کی وجہ سے ہمارے حصہ میں کمی نہ کیجئے؛ چنانچہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ←

← ’’تصدق علینا‘‘ کا ترجمہ کیا ہے: ’’تفضل علینا‘‘ (قرطبی: ۹/ ۲۵۴) ترجمہ میں اس کی رعایت کی گئی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام اپنے خاندان کی غربت اور بھائیوں کی حاجت دیکھ کر پگھل گئے اور فرمایا کہ تم نادانی میں یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے، تمہیں کچھ یاد بھی ہے؟ — حضرت یوسف علیہ السلام کی شرافت ہے کہ انھوں نے ان کی زیادتی کے لئے ان کی نادانی کو سبب ٹھہرا کر ایک حد تک ان کے جرم کو ہلکا کر دیا، اب ان حضرات نے حضرت یوسف علیہ السلام کو پہچان لیا اور پوچھنے لگے: کیا تم ہی یوسف ہو؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ’’ہاں، میں یوسف ہوں ور یہ بنیامین میرا بھائی ہے، یہ سب اللہ کا ہم پر احسان ہے اور یہ پاکبازی اور صبر کا نتیجہ ہے‘‘ بھائیوں نے کہا: یقیناً اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا کی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ہم ہی قصوروار ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کی عالی ظرفی کا حال یہ ہے کہ ایک جملہ بھی شرمندہ کرنے کا نہیں کہا اور فرمایا: آج تم لوگوں پر کوئی الزام نہیں، میں نے بھی معاف کیا اور اللہ بھی تم کو معاف کر دیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص ان کے حوالے کی اور کہا کہ اسے لے جاؤ ’والد ماجد کے چہرہ پر ڈال دو‘ انشاء اللہ ان کی روشنی واپس آ جائے گی اور سب لوگوں کو لے کر یہیں آ جاؤ، اِدھر قافلہ نکلا، اُدھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت کروٹ لینے لگی اور ان کی وجدانی طاقت کو حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس ہونے لگی، جب انھوں نے اس کا ذکر کیا تو حاضرین نے اس کو وہم سمجھا؛ لیکن جب یہ قافلہ خوشخبری لے کر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص ان کے چہرہ پر ڈالی تو سارا غم کافور ہو گیا اور آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی، عجیب اتفاق ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے ایک کُرتے نے (جس کو خون میں ڈبو کر ان کے بھائی لے گئے تھے) حضرت یعقوب علیہ السلام کو رنج واندوہ سے دوچار کیا تھا اور روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں، اور آج بھی پھر حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی قمیص ہے، جو مسرت وشادمانی کا پیغام بن کر آئی ہے اور بوڑھے باپ کی آنکھوں کے اندھیرے کو روشن کر رہی ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ میں تم سے کہتا نہ تھا کہ جو بات مجھے معلوم ہے تمہیں معلوم نہیں، صاحبزادوں نے عرض کیا: ہم خطا کاروں کے لئے اپنے رب سے دُعاءِ مغفرت کیجئے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً دُعاء نہیں کی؛ بلکہ دُعاء کرنے کا وعدہ فرمایا، شاید آپ کو قبولیتِ دُعاء کے کسی خاص وقت کا انتظار تھا، بہر حال یہ قافلہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی سرپرستی میں مصر کی طرف روانہ ہوا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کا استقبال کیا اور ان سے مصر میں قیام کرنے کی گذارش کی، نیز اپنے والدین کو اس تخت پر بٹھایا، جو صاحب اقتدار کے لئے مخصوص تھا، اب یا تو یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حقیقی والدہ تھیں یا ان کی خالہ جو والدہ کی وفات کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں آئی تھیں؛ کہ خالہ بھی ماں کے درجہ میں ہوتی ہے، خاص کر جب کہ وہ باپ کے نکاح میں بھی ہو، نیز غالباً اس وقت تک حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے با اقتدار فرمانروا بن چکے تھے؛ اسی لئے وہ تختِ حکومت پر اپنے والدین کو بٹھا سکے اور بنیامین کو روکنے کے لئے جو تدبیر کرنی پڑی تھی، اپنے اہل خاندان کو مصر میں روکنے کے لئے ایسی کوئی تدبیر کرنی نہیں پڑی، بس اسی دوران حضرت یوسف علیہ السلام کے والدین اور ان کے گیارہ بھائی مصر کے رواج کے مطابق احترام وتعظیم کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، حضرت یوسف علیہ السلام کو یاد آیا کہ یہی اس خواب کی تعبیر ہے، جو میں نے دیکھا تھا، آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان جو نفرت پیدا کر دی تھی، اسے بھی اللہ نے دور کر دیا، نیز اللہ سے دُعاء فرمائی کہ مجھے اسلام کی حالت میں دنیا سے اُٹھائیے اور صالح اور نیک لوگوں کے ساتھ میرا حشر فرمائیے — قصۂ یوسف کے اس حصہ میں جو باتیں قابل توجہ ہیں، ان میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

○ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنی مالی تنگی اور مشقت کا عزیز مصر کے سامنے تذکرہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ ←

← بلاضرورت اپنی پریشانی کو دوسروں کے سامنے بیان کرنا اور دست سوال پھیلانا بہتر نہیں ہے؛ لیکن اگر آدمی واقعی مشقت میں مبتلا ہو تو ایسے آدمی کے سامنے اپنی ضرورت کو رکھنا جائز ہے، جس سے اُمید ہو کہ وہ اس کی ضرورت کو پوری کردے گا۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام آنے والوں سے ان کی پونجی لے کر اس کے بدلے میں غذائی اجناس بیچ رہے تھے اور خود ناپ ناپ کر دے رہے تھے؛ جیسا کہ آیت نمبر: ۵۹ میں اور آیت نمبر: ۶۳ میں ذکر آچکا ہے اور آیت نمبر: ۸۸ میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے ناپ کر دینے کا مطالبہ کیا، اس سے معلوم ہوا کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں بیچی جانے والی شئے کو وزن کرنے یا ناپنے کی ذمہ داری بیچنے والے پر ہے، نہ کہ خریدنے والے پر؛ لہٰذا اگر اس کام کے لئے کچھ اخراجات بھی آتے ہوں تو بیچنے والے پر اس کی ذمہ داری ہوگی۔

○ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا: ''لا تثریب علیکم الیوم'' تثریب کے معنی اصل میں ''عار دلانے'' کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سے غلطی ہو جائے اور وہ اس پر نادم ہو تو اس کو مزید عار دلانا اور رسوا کرنا درست نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی کی باندی زنا کی مرتکب ہو جائے تو اس کو اس کی سزا دے دو؛ لیکن اس کو عار نہ دلاؤ: ''ولا یثرب علیھا''۔ (دارقطنی، کتاب الحدود والدیات، حدیث نمبر: ۲۳۶)

○ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص چہرہ پر ڈالنے سے بینائی کا واپس آجانا یا دور سے اس کی خوشبو محسوس کرنا دراصل ایک معجزہ تھا، جو اللہ کی طرف سے اللہ کے پیغمبروں کو عطا کیا جاتا ہے، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

○ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں خوشخبری آئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دینی کیفیت کے بارے میں سوال کیا: ''تم لوگوں نے یوسف کو کس دین پر چھوڑا ہے؟'' جب لوگوں نے کہا کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اسلام پر چھوڑا ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام بہت خوش ہوئے اور کہا: اب نعمت خداوندی کی تکمیل ہوگئی ''الآن تمت النعمۃ'' (قرطبی: ۲۶۱/۹) — اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو صرف اپنی اولاد کی مادی ترقی کو دیکھ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے؛ بلکہ اِس سے بڑھ کر اُس کی دینی کیفیت کے بارے میں بھی فکرمند رہنا چاہئے۔

○ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے حضرت یعقوب کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور دُعاء مغفرت کی درخواست کی، اس سے معلوم ہوا کہ اگر انسان سے کسی کے حق میں زیادتی ہو جائے تو اسے چاہئے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے اس سے معاف کرالے، احناف کے یہاں اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ غائبانہ میں جو زیادتی ہوئی ہو، اس کو واضح بھی کرے؛ بلکہ اگر مطلق غلطیوں کا اعتراف کر کے اس کو معاف کرالے تو یہ بھی کافی ہے، (الموسوعۃ الفقھیۃ: ۱۵۴/۱) یہ آیت بھی اسی کو بتاتی ہے؛ کیوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے اپنے زیادتی کا اعتراف تو کیا؛ لیکن اس کی تفصیلات والد کے سامنے نہیں رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جس نے اپنے بھائی کی عزت و آبرو یا کسی اور معاملے میں زیادتی کی ہو تو اسے چاہئے کہ اُس دن کے آنے سے پہلے جب درہم و دینار نہیں ہوں گے، اسے حلال کرلیں، مطلب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے ہی اسے معاف کرالیں، ورنہ اس کا نیک عمل مظلوم کو دے دیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو مظلوم کے گناہ اس کے حصہ میں ڈال دیئے جائیں گے: ''فلیحللہ منہ الیوم قبل ألا یکون دینار ولا درھم الخ''۔ (بخاری، عن ابی ہریرۃؓ، کتاب المظالم، باب من کانت لہ مظلمۃ عند الرجل، الخ، حدیث نمبر: ۲۳۱۷)

○ حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے صاحبزادوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا؛ حالاں کہ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا ←

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ
یَمْكُرُوْنَ۝۱۰۲ وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ۝۱۰۳ وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ
هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ۝۱۰۴ وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَ هُمْ عَنْهَا ع ۱۱/۵
مُعْرِضُوْنَ۝۱۰۵

یہ غیب کی خبریں ہیں، جن سے ہم آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کرتے ہیں؛ حالاں کہ جب ان لوگوں (یوسف کے بھائیوں) نے پختہ ارادہ کرلیا تھا اور وہ (یوسف کو پھینک دینے کی) سازشیں کررہے تھے، اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۝۱۰۲ آپ کتنا بھی چاہیں، اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۝۱۰۳ اور آپ ان لوگوں سے اس پر کسی معاوضہ کے طلب گار بھی تو نہیں ہیں، قرآن تو تمام دنیا جہان کے لئے صرف نصیحت ہے۝۱۰۴ آسمان وزمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں، جن سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں؛ لیکن وہ ان پر دھیان نہیں دیتے۔﴿۱﴾۝۱۰۵

← جائز نہیں، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف وضاحتیں کی ہیں؛ لیکن اس میں دو باتیں دل کو لگتی ہیں، ایک یہ کہ یہ سجدہ عبادت و بندگی کے طور پر نہیں تھا؛ تعظیم و احترام کے طور پر تھا، اور پچھلی شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی کی اجازت تھی؛ بلکہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت تک سجدۂ تعظیمی کی اجازت دی گئی تھی؛ رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں سجدۂ تعظیمی کو بھی منع فرمادیا گیا؛ کیوں کہ یہ عمل آہستہ آہستہ شرک کی طرف لے جاتا ہے، (ابن کثیر: ۲/ ۴۰۹۱) —— دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کو بطور شکرانہ کے کیا گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی حیثیت اس میں ''مسجود'' کی نہیں تھی؛ بلکہ صرف قبلہ کی تھی۔ (مفاتیح الغیب: ۹/ ۱۵۳، قرطبی: ۹/ ۲۶۴)

○ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ عالی ظرفی بھی ایک نمونہ ہے کہ بھائیوں نے جو کچھ زیادتی کی، ان کی نسبت ان کی طرف کرکے انھیں شرمندہ نہیں فرمایا اور ان حرکتوں کو دوہرایا بھی نہیں؛ بلکہ صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا، یہ ہے پیغمبرانہ اخلاق و مروت۔

○ جب حضرت یعقوب علیہ السلام تشریف لائے اور بچھڑے ہوئے باپ بیٹے کی ملاقات ہوئی تو یہ کتنی خوشی کا وقت تھا، اکثر ان اوقات میں انسان کچھ اس طرح جشن مسرت منانے میں مشغول ہوجاتا ہے کہ مالک حقیقی کو بھول جاتا ہے؛ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اللہ کا شکر ادا کیا اور دنیا کی ساری نعمتیں مہیا ہونے کے باوجود آخرت کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ سے دُعاء کی کہ جب کبھی موت آئے تو اسلام کی حالت میں آئے اور آخرت میں اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ حشر ہو۔

﴿۱﴾ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے بارے میں یہودیوں کے کہنے پر اہل مکہ نے بطور امتحان کے آپ ﷺ سے سوال کیا تھا، اس کا تقاضہ یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اس سورت کے نازل ہونے کے بعد اہل مکہ بھی ایمان لے آتے اور خود یہودی بھی مسلمان ہوجاتے؛ کیوں کہ یہ واقعہ آپ ﷺ کی ولادت کے صدیوں پہلے کا تھا، مکہ کے لوگ تو اس سے بالکل ہی واقف نہ تھے، ←

وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ
اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى
بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

اکثر لوگ اللہ پر ایمان لاتے بھی ہیں تو وہ بھی اس طرح کہ شرک بھی کئے جاتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۱۰۶﴾ کیا وہ اس بات سے بے فکر ہوگئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب میں سے کوئی آفت آجائے ، یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور وہ سمجھ بھی نہ پائیں ؟ ﴿۱۰۷﴾ آپ کہہ دیجئے : یہی میرا راستہ ہے کہ پوری بصیرت کے ساتھ خود میں بھی اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور میری پیروی کرنے والے بھی ، اور اللہ کی ذات پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں ۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۸﴾

← یہودیوں سے آپ ﷺ کی ملاقات نہیں تھی ، آپ ﷺ نے نہ تو تورات پڑھی تھی ، نہ پڑھنا جانتے تھے اور نہ تورات کی زبان سے واقف تھے ، اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل کئے جانے کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے آپ ﷺ کو حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قصہ معلوم ہو پاتا ، آپ کو بھی اُمید تھی کہ چوں کہ ان کے مطالبہ پر یہ سورۃ نازل ہوئی ہے ؛ اس لئے وہ ایمان لے آئیں گے ؛ مگر نہ اہل مکہ کو ایمان لانے کی توفیق ہوئی نہ یہودیوں کو ، اسی پس منظر میں قرآن کی آیت نازل ہوئی کہ آپ نے غیب کی خبریں بھی ان تک پہنچادیں اور کوئی معاوضہ بھی طلب نہیں کیا ، اس کے باوجود یہ ایمان نہیں لائے ، یہ اس لئے کہ ان میں سے اکثر لوگوں کا ایمان لانا مقدر ہی نہیں ہے ، آپ اس کی وجہ سے آزردہ خاطر نہ ہوں ، اگر یہ خلوص کے ساتھ کھلے ذہن سے غور کرتے تو آسمان وزمین میں اللہ کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں ، جن کو دن ورات دیکھتے ہیں ؛ لیکن ان کے بارے میں غور نہیں کرتے ، اگر غور وفکر سے کام لیتے تو یہ نشانیاں ہی ان کے ایمان لانے کے لئے کافی تھیں ۔

﴿۱﴾ اس آیت میں ایک اہم حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور وہ یہ کہ انسانیت کی اکثریت ہر زمانہ میں خدا کے وجود کی قائل رہی ہے ، خدا کا انکار کرنے والے ہر زمانہ میں کم رہے ہیں ؛ لیکن بدقسمتی سے خدا کے ماننے والوں نے خدا کے ساتھ بہت سی مخلوقات کو شریک وساجھی بنادیا ، غور کیا جائے تو آج دنیا میں جتنے مذاہب موجود ہیں ، سب کی ابتدا توحید سے ہوئی ؛ لیکن مذہب کے متبعین نے آہستہ آہستہ شرک کا راستہ اختیار کرلیا ، اس سے صرف دین محمدی ﷺ کا استثناء ہے کہ آج بھی قرآن وحدیث میں شرک کی آمیزش اور ملاوٹ کے بغیر توحید کا صاف ستھرا عقیدہ موجود ہے ، مگر افسوس کہ خود مسلمانوں میں بھی بزرگوں کی اور ان کی قبروں کی اسی طرح پرستش ہونے لگی ، جیسے غیر مسلم حضرات اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کی کیا کرتے ہیں ۔

﴿۲﴾ یعنی قرآن مجید جس عقیدہ وعمل کی دعوت دیتا ہے ، وہی میرا طریقہ ہے ، جس کی بنیاد عقیدۂ توحید کو ماننے اور شرک کا انکار کرنے پر ہے ، نیز ہماری یہ دعوت محض آباء واجداد کی پیروی میں بغیر کسی دلیل کے نہیں ہے ؛ بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ ہے —— اس سے معلوم ہوا کہ یوں تو شریعت کا کوئی حکم انسانیت کے لئے نفع سے خالی نہیں ہے ؛ لیکن غیر مسلم بھائیوں کو بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دینا چاہئے اور داعی کو علم اور بصیرت کا حامل ہونا چاہئے کہ وہ جس بات کو پیش کر رہا ہے ، عقل ونقل کی دلیلوں سے اس کو ثابت بھی کرسکے ۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ؕ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ
فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا
تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹ حَتّٰۤی اِذَا اسْتَیْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّیَ مَنْ
نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝۱۱۰ لَقَدْ كَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ؕ
مَا كَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَ لٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ تَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی
وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۱۱ ع ۱۲

آپ سے پہلے بھی ہم نے مختلف بستی والوں میں سے مَردوں ہی کو بھیجا، جن کی طرف ہم وحی کیا کرتے تھے، کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی ہے کہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا کیسا انجام ہوا؟ اور آخرت کا ٹھکانا ان لوگوں کے لئے زیادہ بہتر ہے، جو تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو ﴿۱﴾ ۝۱۰۹ یہاں تک کہ جب اللہ کے پیغمبر نا اُمید ہوگئے اور لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ ان سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا، تو ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی، پھر ہم نے جس کو بچانا چاہا، وہ بچالیا گیا، اور ہمارا عذاب جرم کرنے والوں سے ٹلتا نہیں ہے، ۝۱۱۰ بے شک ان لوگوں کی داستانوں میں سمجھ دار لوگوں کے لئے عبرت کا سامان ہے، یہ کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ اُن کتابوں کی تصدیق ہے، جو پہلے نازل ہوچکی ہیں، نیز ہر چیز کی وضاحت اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت و رحمت ہے۔ ﴿۲﴾ ۝۱۱۱

﴿۱﴾ یعنی 'آپ کا اللہ کی طرف سے رسول بنایا جانا' کوئی پہلا اور نیا واقعہ نہیں ہے؛ بلکہ آپ سے پہلے بھی ہر عہد میں اور مختلف شہروں میں رسول بنا کر بھیجے جاتے رہے ہیں؛ اس لئے آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے، —— اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبوت کے لئے ہمیشہ مردوں کا انتخاب کیا گیا ہے، کسی عورت کو نبی نہیں بنایا گیا، بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام تو ہوا کہ جو بات اللہ کو منظور تھی، وہ ان کے دل میں ڈال دی گئی؛ لیکن ان پر باضابطہ اللہ تعالیٰ کے احکام نہیں اُتارے گئے اور ان کو تبلیغ و دعوت کا حکم نہیں دیا گیا، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صحرا اور جنگل میں کسی کو نبی نہیں بنایا گیا، انبیاء کرام علیہم السلام شہروں میں بھیجے گئے، (مفاتیح الغیب: ۱۷۰/۹) بلکہ قرآن مجید میں جن انبیاء کا ذکر ہے، وہ سب مرکزی شہروں سے تعلق رکھتے تھے؛ کیوں کہ نبوت کا مقصد صرف نبی پر احکام کا اُتار دینا نہیں ہے؛ بلکہ ان احکام کی تبلیغ و اشاعت بھی ہے اور صحراؤں اور جنگلوں میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

﴿۲﴾ یعنی قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام اور دوسری قوموں کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، یہ اصحاب عقل و دانش کے لئے ←

← نصیحت اور عبرت کا ذریعہ ہے، یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص اپنی عقل کا استعمال نہ کرے، جیسے بینائی حاصل ہونے کے باوجود آنکھ بند رکھنے والوں کو کوئی چیز نظر نہیں آسکتی، اسی طرح عقل کی نعمت حاصل ہونے کے باوجود جو لوگ اس کا استعمال نہیں کریں گے، وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاسکیں گے، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے پانچ اوصاف بیان کئے ہیں، اول: یہ کہ یہ گڑھی ہوئی اور انسان کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے، دوسرے: یہ پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ ان سب کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، تیسرے: اس میں زندگی گزارنے کے درست طریقہ کی اور حلال وحرام کی تفصیلات کہیں اُصول کی شکل میں کہیں جزئیات کی شکل میں موجود ہیں، چوتھے: یہ کتاب انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ ہے، پانچویں: یہ رحمت ہے؛ لیکن اس کی ہدایت اور رحمت سے وہی لوگ فائدہ اُٹھاسکتے ہیں، جو اس پر ایمان رکھتے ہیں، جو شخص کسی بات کو ماننے ہی کو تیار نہ ہو، وہ اس سے کس طرح فائدہ اُٹھاسکتا ہے؟

سُورَةُ الرَّعْدْ

- سورہ نمبر : (۱۳)
- رکوع : (۶)
- آیتیں : (۴۳)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ سورت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اور تینتالیس (۴۳) آیتوں پر مشتمل ہے، اس سورت میں رعد یعنی ''کڑک'' کا ذکر آیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام 'رعد' ہے — اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اللہ کی وحدانیت، دوبارہ زندہ کئے جانے اور جزاء وسزا دیئے جانے کو ثابت کیا گیا ہے، فرشتوں کے وجود کا ذکر آیا ہے، مثالوں کے ذریعہ حق وباطل اور توحید وشرک کو سمجھایا گیا ہے، یہ بات بتائی گئی ہے کہ پیغمبر بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسانی ضروریات وعوارض ان کو بھی پیش آتے ہیں، غرض کہ یہ سورت مدنی ہے؛ لیکن اس میں مکی سورتوں کی طرح زیادہ تر گفتگو عقائد اور ایمانیات پر ہے۔

○ ○ ○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا
یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ
الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ یُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ بِلِقَآءِ
رَبِّکُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ﴿۲﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف، لام، میم، را، ﴿۱﴾ یہ کتاب کی آیتیں ہیں،
اور آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے؛ لیکن اکثر لوگ یقین نہیں کرتے ﴿۱﴾
وہی خدا ہے جس نے کسی ستون کے بغیر آسمانوں کو بلند کیا، تم اسے دیکھ رہے ہو، ﴿۲﴾ پھر وہ عرش پر جلوہ افروز ہوا، ﴿۳﴾
اور اس نے سورج اور چاند کو قابو میں رکھا، ہر ایک متعینہ وقت کے لحاظ سے چلتا رہتا ہے، اللہ ہی تمام کاموں کی تدبیر
فرماتے ہیں ﴿۴﴾ اور نشانیوں کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں؛ تاکہ تم اپنے پروردگار سے ملاقات کا یقین کرو۔ ﴿۲﴾

﴿۱﴾ یہ حروف مقطعات ہیں۔ (دیکھئے: سورۂ بقرہ کا حاشیہ نمبر: ۱)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی چند نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے، جو زبردست تدبیر کا نمونہ ہیں، دنیا میں کسی مادی اور وزنی چیز کو اوپر برقرار رکھنے کے لئے ستونوں کی ضرورت پڑتی ہے، مگر آسمان جیسی وسیع چیز جو کائنات کو ڈھانپے ہوئے ہے، وہ بغیر کسی ستون کے ہمارے سروں پر قائم ہے، آسمان سے مراد اصل آسمان بھی ہوسکتا ہے، جو فرشتوں کا مسکن ہے، جہاں لوحِ محفوظ ہے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ کے فرمان جاری ہوتے ہیں، اور ''سماء'' کے معنی بلند چیز کے بھی آتے ہیں، ایسی صورت میں زمین کی فضاء کے اوپر جو بھی سیارے اور ستارے موجود ہیں، جنھیں ہم رات دن دیکھتے ہیں، وہ سب آسمان میں شامل ہیں، انھیں اپنی جگہ پر برقرار رہنے میں کسی ستون کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے مختلف سیاروں میں قوتِ کشش کو ان کے لئے ایک طرح کا ستون بنادیا ہے۔

﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ کے عرش پر بیٹھنے سے مراد مخلوق کی طرح بیٹھنا نہیں؛ بلکہ یہ پوری کائنات پر حکومت و اقتدار کا ایک تخت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق جلوہ افروز ہوتے ہیں، جیسے ایک عام انسان سورج کی گرمی اور سمندر کے پھیلاؤ کو ناپ نہیں سکتا؛ اسی طرح کسی مخلوق کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ خالق کی کیفیات کا ادراک کرسکے۔

﴿۴﴾ سورج اور چاند جیسی عظیم الشان مخلوق بھی اللہ کے قابو سے باہر نہیں ہے، اللہ کی طرف سے سورج، چاند اور نظامِ شمسی سے جڑے ہوئے سیاروں کے لئے گردش کا جو نظام مقرر ہے، وہ ذرا بھی اس سے ہٹ نہیں سکتا، اگر اس کی گردش میں فرق آجائے تو کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہوجائے، کائنات میں ہر لمحہ جو کچھ ہورہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر سے ہورہا ہے، مثلاً پھلوں کی پیداوار ہی کو دیکھ لیجئے کہ کاشتکار زمین کو کورنے اور اس میں بیج ڈالنے سے زیادہ کوئی کام نہیں کرتا، پھر کس طرح بیج سے کونپلیں نکلتی ہیں، یہ رفتہ رفتہ لمبے پودے اور تناور درخت بن جاتے ہیں، کون ہے جو ان کی پتیوں پر ہرا رنگ کرتا ہے، کون ان کے پھولوں پر سرخیوں کو سجاتا ہے، کون ہے جو پھلوں کے اندر مٹھاس کو بھرتا، اسے پکاتا اور کھانے کے لائق بناتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہے، ←

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳

وہی خدا ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا رکھ دیئے، نیز ہر پھل کی دو دو قسمیں بنائیں، وہ رات کو دن سے ڈھانک دیتا ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔ ﴿۱﴾ ۝۳

← انسان جس عمل کو اپنی تدبیر سمجھتا ہے، اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے استعمال کا طریقہ جان لیتا ہے، اس کے بنانے میں اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔

﴿۱﴾ زمین اگرچہ گول ہے؛ لیکن اس کی سطح پھیلی ہوئی مسطح شکل میں ہے اور اسی لئے وہ انسان کے رہنے کے لائق ہے، اگر زمین اس طرح پھیلی ہوئی اور مسطح نہ ہوتی؛ بلکہ ہر جگہ پہاڑ کی طرح سمٹی ہوئی ہوتی تو انسان کے لئے زمین میں رہائش اور کھیتی باڑی کتنی دشوار ہوتی، پھر زمین میں جغرافیائی توازن برقرار رکھنے کے لئے اس میں پہاڑ بھی بنادیئے گئے، ورنہ شاید زمین میں کثرت سے زلزلے آتے، زندہ چیزوں کے باقی رہنے کے لئے پانی کا نظام بھی ضروری تھا: اس لئے اونچے پہاڑوں پر برف کا خزانہ رکھ دیا گیا، یہ گویا قدرت کی طرف سے بنائی ہوئی ٹنکی ہے، جو ہر موسم میں ضرورت کے مطابق پانی سپلائی کرتی رہتی ہے اور پھر اس پانی کو دور دور تک پہنچانے کے لئے چھوٹی ندیاں اور بڑے بڑے دریا بنادیئے گئے؛ تاکہ ایک طرف دریا کے بہاؤ سے لوگوں کو پانی ملتا رہے اور دوسری طرف زمین میں اس کا پانی جذب بھی ہوتا رہے؛ تاکہ زمین کے اندر پانی کا خزانہ محفوظ رہے، —— پھل کی دو دو قسمیں ذائقہ، شکل، رنگت اور بڑے چھوٹے ہونے کے اعتبار سے بھی ہوسکتی ہیں کہ ایک ہی درخت میں میٹھا پھل بھی ہوتا ہے اور کھٹا بھی، ایک ہی درخت سے بڑے پھل بھی نکلتے ہیں اور چھوٹے پھل بھی، بالکل سبز چھلکے کے بھی اور سرخی یا زردی مائل بھی، اور اس کا مطلب وہ بھی ہوسکتا ہے، جو موجودہ سائنسی تحقیق کا نتیجہ ہے کہ حیوانات کی طرح نباتات میں بھی نر اور مادہ ہیں، قرآن مجید کی تعبیر زوجین سے یہی بات راجح معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ زوجین کا لفظ بنیادی طور پر نر و مادہ کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ دو شکلوں کے لئے، انسان کو زندگی کی ضروریات کے لئے رات کی بھی ضرورت ہے اور دن کی بھی، یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ رات کی تاریکی پر دن کی روشنی کی چادر اوڑھادی جاتی ہے، قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات پر پہلے رات کے اندھیروں کا قبضہ تھا، جب اللہ تعالیٰ نے سورج کو پیدا فرمایا تو دن ہونے شروع ہوئے، یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے روشنی کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ تاریکی کو مغلوب کردیتی ہے، بہرحال کائنات کا یہ وسیع نظام اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک ایسی طاقت موجود ہے، جو اس کو وجود میں لائی ہے اور جو تدبیر مسلسل کے ذریعہ اس کو قائم رکھے ہوئی ہے، یقیناً وہی اللہ کی ذات ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ذات اکیلی ہے؛ کیوں کہ اگر یہ نظام متعدد شخصیتوں کے ہاتھوں میں ہوتا تو فساد و بگاڑ سے محفوظ نہیں رہتا، یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین، سورج، چاند، پہاڑ اور دریا جن کی مشرک قومیں پرستش کرتی ہیں، وہ پرستش کے لائق نہیں ہیں؛ کیوں کہ یہ سب خود پیدا نہیں ہوئی ہیں؛ بلکہ پیدا کی گئی ہیں اور ان کی حرکت اپنی مرضی سے نہیں ہے؛ بلکہ وہ اللہ کے حکم کی پابند ہیں، ایسی عاجز مخلوق کس طرح عبادت کے لائق ہوسکتی ہے؟

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ
يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ۝۴ وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ۬ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝۵

زمین کے ٹکڑے آزو بازو ہی ہیں، انگوروں کے باغات ہیں، کھیتیاں ہیں، گنجان اور کُھلے کھلے کھجور کے درخت ہیں، یہ سب ایک ہی پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم پھلوں میں ایک کے مقابلہ دوسرے کو عمدہ بنادیتے ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو عقل سے کام لیتے ہیں ﴿۱﴾ ۝۴ اور اگر آپ تعجب کریں تو تعجب کے لائق تو ان کی یہ بات ہے کہ جس دن ہم خاک ہوجائیں گے تو کیا یہ نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے؟ یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ہے، ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے، یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ ہمیش دوزخ ہی میں رہیں گے۔ ﴿۲﴾ ۝۵

﴿۱﴾ انسان جب کوئی چیز بناتا ہے تو ایک طرح کے مادہ سے ایک ہی رنگت اور ذائقہ کی چیز تیار ہوتی ہے، مرچ کو جس طرح بھی پکایا جائے، اس میں تیزی ہوگی، شکر کو جس طرح بھی بنایا جائے، اس میں مٹھاس ہوگی، چاندی کو جس شکل میں ڈھالا جائے، وہ سفید نظر آئے گی اور سونے کو جو بھی شکل دی جائے، اس میں اس کا سنہرا پن نمایاں ہوگا، ایسا نہیں ہوتا ہے کہ شکر کو باقی رکھتے ہوئے کوئی چیز بنائی جائے اور کہیں وہ میٹھی ہو، کہیں پھیکی اور کہیں کڑوی، ایسا ممکن نہیں کہ چاندی سے مختلف چیزیں ڈھالی جائیں، کوئی چیز پیتل کی بن جائے، کوئی چیز مٹی کی اور کوئی چیز پتھر کی؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تخلیق دیکھئے کہ ایک ہی طرح کی زمین ہے، جو آس پاس میں واقع ہے، بارش کا ایک ہی پانی ہے، جو سب کو سیراب کرتا ہے، ایک ہی سورج ہے، جو سب کو تپش پہنچاتا ہے؛ لیکن جو پیداوار حاصل ہوتی ہے، وہ مختلف رنگتوں اور مختلف ذائقوں کی ہے، کوئی چیز پھیکی ہے، جیسے: چاول اور گیہوں، کوئی شئے میٹھی ہے اور مٹھاس میں بھی کمی وزیادتی، اور اس کے ذائقہ اور مزے میں بھی فرق ہے، انگور کی مٹھاس اور کھجور کی مٹھاس یکساں نہیں ہوتی، یہ یقیناً ایک ایسی ہی ہستی کا کارنامہ ہوسکتا ہے، جس کی قدرت وطاقت بے پناہ ہو، نیز جس کی تدبیر کی صلاحیت تصور سے بھی بڑھ کر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، انسان اگر صرف اسی نکتہ پر غور کرلے تو اس کی ہدایت اور ایمان لانے کے لئے کافی ہوجائے۔

﴿۲﴾ اہل مکہ کو خاص کر قیامت کے قائم ہونے اور انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر بڑی حیرت تھی اور وہ اس بات کو عقل کے خلاف تصور کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا قابل تعجب نہیں، اس کو ناممکن سمجھنا خود قابل تعجب ہے؛ کیوں کہ کسی کام کا ممکن ہونا اور نہ ہونا کام کرنے والے کی طاقت کے لحاظ سے ہے، اگر ایک بچہ دودھ پیتا ہو اور اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ابھی سے روٹی گوشت کھانے لگا ہے تو یقیناً یہ بات قابل تعجب ہوگی؛ لیکن ایک جوان آدمی کے بارے میں بتایا جائے کہ اس نے روٹی گوشت کھایا اور اس کے معدوں نے اسے ہضم کرلیا تو اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوگی؛ ←

وَ يَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ وَ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ
مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۞ وَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡ لَاۤ
اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۞

ع ۱

اور یہ لوگ عافیت سے پہلے مصیبت کے لئے جلدی کررہے ہیں ؛ حالاں کہ ان سے پہلے بھی عذاب کے واقعات پیش آچکے ہیں، یقیناً آپ کے پروردگار لوگوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کو معاف کرتے رہتے ہیں اور بے شک آپ کے پروردگار سخت عذاب بھی دیا کرتے ہیں ﴿۱﴾۞ جن لوگوں نے کفر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتاری گئی؟ یقیناً آپ تو محض ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے ایک رہبر ہوتے رہے ہیں ۔ ﴿۲﴾۞

← بلکہ اگر کوئی شخص کہنے لگے کہ جب یہ دو مہینہ کا بچہ روٹی اور گوشت نہیں کھا سکتا تو بیس سال کا جوان کیسے کھا سکتا ہے تو لوگ اس کی عقل پر ماتم کریں گے، اسی طرح اگر کسی مخلوق کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ وہ کسی مردہ کو خاک ہوجانے کے بعد دوبارہ زندہ کرسکتا ہے تو اس پر یقیناً تعجب ہونا چاہئے ؛ لیکن اگر یہی بات کائنات کے خالق کے بارے میں کہی جائے تو اس پر تعجب کا کوئی موقع ہی نہیں ؛ بلکہ یہ تعجب کرنے والوں کی ناعقلی سمجھی جائے گی ؛ کیوں کہ کوئی ذات پہلی دفعہ جب کسی چیز کو پیدا کرسکتی ہے تو وہ دوبارہ بدرجہ اولیٰ پیدا کرسکتی ہے اور جس کی قدرت کا حال یہ ہے کہ ایک ہی زمین، ایک ہی پانی، ایک ہی دھوپ سے وہ مختلف شکلوں، مختلف رنگوں اور مختلف مزوں کی چیزیں بنا سکتا ہے تو اس کے لئے مردہ کے ذرات کو دوبارہ ترکیب دینا اور اس کو اپنی پہلی شکل میں کھڑا کردینا کیا مشکل ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں ہونے والے عذاب میں سے ایک عذاب کا ذکر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے، اس کا ذکر قرآن کی بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے، (الغافر:۷۱) گلے کا طوق ایک تکلیف دہ چیز بھی ہے، خاص کر دوزخ میں، جہاں آگ کی شدت اسے تپا رہی ہو، نیز اس میں ان کی رسوائی اور تذلیل کی طرف بھی اشارہ ہے ؛ کیوں کہ قدیم زمانہ میں غلاموں کے گلے میں طوق رکھا جاتا تھا اور اس لئے کہ انھیں طوق اور زنجیروں کے ساتھ وہاں گھسیٹا بھی جائے گا، پس آخرت کے انکار کی وجہ سے آخرت کے عذاب سے ان کو ڈرایا جارہا ہے۔

﴿۱﴾ قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے کہ اہل مکہ کہتے تھے کہ آپ اگر نبی برحق ہیں تو ہم پر ہمارے انکار کرنے کی وجہ سے اللہ کا عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ اللہ تعالیٰ نے اسی پر تنبیہ فرمائی ہے کہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اللہ سے راحت و آرام اور اچھی زندگی مانگتا ہے ؛ لیکن اِن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے قرب وجوار ہی میں ان قوموں کے ویران شہر موجود ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوچکا ہے، اس کے باوجود عذاب ہی طلب کررہے ہیں ؛ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں عفو و درگزر کا دروازہ وسیع نہ ہوتا تو یہ اب تک عذاب میں مبتلا کردیئے گئے ہوتے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو درگزر اور رحمت کا معاملہ نہ ہوتا تو کسی شخص کو خوشگوار زندگی میسر نہ ہو پاتی۔ (تفسیر قرطبی: ۹/۲۸۵)

﴿۲﴾ یعنی پیغمبر کا کام معجزہ لانا نہیں ہے اور نہ اس کی قدرت میں ہے، پیغمبر کا کام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ
بِمِقْدَارٍ ۸ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۹ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ
جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۱۰ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ
خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ
اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۱۱

ہر عورت کے حمل میں کیا ہے؟ اور رحم میں جو کمی بیشی ہوتی ہے، اللہ اس سے واقف ہیں اور ہر چیز اللہ کے پاس ایک
مقررہ اندازے کے مطابق ہوا کرتی ہے ۸ اللہ چھپی اور کھلی ہوئی چیزوں کو جاننے والے، بڑے اور بلند مرتبہ
والے ہیں ۹ تم میں سے کوئی آہستہ بات کرے یا زور سے، رات میں چھپا ہوا ہو یا دن میں چل پھر رہا ہو (اللہ
کے لئے) برابر ہے ﴿۱﴾ ۱۰ ہر شخص کے لئے باری باری آنے والے فرشتے (مقرر) ہیں، اس کے آگے بھی پیچھے بھی،
جو اللہ کے حکم سے اس کی نگہبانی کرتے رہتے ہیں، ﴿۲﴾ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے، جب تک کہ وہ
خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے، نیز جب اللہ کسی قوم کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہ ٹل نہیں سکتی
اور نہ اللہ کے مقابلہ کوئی ان کا مددگار ہو سکتا ہے۔ ﴿۳﴾ ۱۱

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا علم بے پناہ اور تمام چیزوں پر حاوی ہے، کسی عورت کے حمل میں جو بچہ پرورش پا رہا ہے، یہ لڑکا ہے یا لڑکی، نیک خصلت ہے یا بد خصلت، خوبصورت ہے یا بدصورت؟ اللہ تعالیٰ کو ان ساری باتوں کا یقینی اور بلا واسطہ علم ہے، ڈاکٹروں کو لڑکا یا لڑکی کے ہونے کے بارے میں جو علم ہوتا ہے وہ اندازہ اور تخمینہ پر مبنی ہے؛ اس لئے وہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے —— رحم میں ایک بچہ ہے یا دو یا اس سے زیادہ جڑواں بچے ہیں، بچہ تخلیقی اعتبار سے ناقص ہے یا مکمل ہے، ولادت نو ماہ میں ہوگی یا اس سے زیادہ میں یا اس سے کم مدت میں، بچہ مکمل حالت میں پیدا ہوگا یا ناقص صورت میں ساقط ہو جائے گا، اس کا یقینی اور براہ راست علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، (مفاتیح الغیب: ۹/۲۰۰) اور صرف اسی پر موقوف نہیں؛ بلکہ کائنات میں جو واقعات پیش آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے سے ہی اس کی مقدار متعین ہے، انسان کسی بات کو چھپ کر چوری سے کہے یا علی الاعلان کہے، وہ کہیں رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو، کسی صورت میں وہ اللہ کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا حال یہ ہے کہ وہ بلا واسطہ ہر چھوٹی بڑی چیز سے واقف ہیں؛ لیکن اس نے کائنات کے لئے ایک نظام بھی بنا دیا ہے اور اس نظام کو بگاڑ سے بچانے اور اس میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے فرشتوں کی شکل میں کارندے بھی مقرر کئے ہیں، جو انسان کی نگرانی بھی کرتے ہیں اور اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں؛ چنانچہ ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو باری باری انسان کے پاس آتے رہتے ہیں، ان میں سے بعض کو دائیں بائیں آگے پیچھے حفاظت اور پہرہ داری کی ڈیوٹی دی گئی ہے، مختلف احادیث میں —— جو عام طور پر تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہیں —— اس کی صراحت و وضاحت آئی ہے، (تفسیر قرطبی: ۹/۲۹۴، ۲۹۵) کہ فرشتے انسان کو مہلک حادثات سے بچاتے ہیں، سوائے اس کے کہ ان کے لئے موت مقدر ہو چکی ہو، یہ فرشتے انسان کو ←

هُوَ الَّذِیۡ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿ۚ۱۲﴾ وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ
بِحَمۡدِهٖ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِهٖ ۚ وَ یُرۡسِلُ الصَّوَاعِقَ فَیُصِیۡبُ بِهَا مَنۡ یَّشَآءُ وَ هُمۡ
یُجَادِلُوۡنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِیۡدُ الۡمِحَالِ ﴿ؕ۱۳﴾

وہی خدا ہے جو تمہیں بجلی دِکھلاتا ہے، جو خوف کا سبب بھی ہے اور اُمید کا ذریعہ بھی، نیز پانی سے لبریز بادلوں کو بلند کرتا ہے ﴿ۚ۱۲﴾ بجلی کی کڑک اللہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تسبیح پڑھتی ہے اور فرشتے بھی اللہ سے ڈرتے ہوئے یہی کرتے ہیں، اللہ ہی بجلیوں کو بھیجتے ہیں، پھر جس پر چاہتے ہیں بجلی گرادیتے ہیں اور یہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہیں؛ حالاں کہ اللہ زبردست تدبیر والے ہیں۔ ﴿۱﴾ ﴿ؕ۱۳﴾

← گناہوں سے بچاتے ہیں اور نیکی کی طرف دعوت دیتے ہیں، یہ انسان کے اعمال کو لکھتے جاتے ہیں، اس یقین کی وجہ سے انسان کے اندر آخرت کی جواب دہی کا خیال تازہ ہوتا ہے اور گناہ سے بچنا اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے، (مفاتیح الغیب: ۲۶۰/۹) ان کو ''مُعقِّبات'' اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ایک دوسرے کے بعد آنے والے کے ہیں؛ چنانچہ جب دن کے فرشتوں کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے تو رات کے فرشتے آجاتے ہیں، (صحیح بخاری، عن ابی ہریرہ ؓ، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر: ۳۲۲۳) اس لئے انھیں ایک دوسرے کے بعد آنے والا کہا گیا ہے۔ (مفاتیح الغیب: ۲۰۴/۹)

﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی شفقت کا حال یہ ہے کہ اس نے انسان کی حفاظت کے لئے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، اسی طرح جو قوم اچھی حالت میں ہو، عافیت اور سکون کی زندگی گزار رہی ہو تو بلا سبب اللہ کی طرف سے اسے مصیبت اور تکلیف میں مبتلا نہیں کیا جاتا؛ بلکہ جب ان میں عقیدہ و عمل کا بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے حالات کو بدل کر عافیت کی بجائے مصیبت، راحت کی بجائے مشقت اور سکون کی بجائے اضطراب اور بے سکونی ان پر مسلط کردیتے ہیں۔

﴿۱﴾ یعنی یہ بجلی بھی اللہ کی قدرت ہے، بادل پانی سے بھرا ہوتا ہے اور فضاء کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد بے حد ٹھنڈا ہوجاتا ہے؛ لیکن اسی سے بجلی جیسی چیز پیدا ہوتی ہے، جو آگ کے شعلہ کی طرح ہوتی ہے اور جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر خاک کردیتی ہے؛ حالاں کہ آگ اور پانی اپنی خصوصیت کے اعتبار سے دو متضاد چیزیں ہیں، اسی طرح بادلوں کا بلندی پر اُڑتے رہنا اور جہاں ضرورت ہو وہاں جاکر برسنا خدا کی قدرت ہے، پانی ایک وزنی چیز ہے اور جو چیز بوجھل ہوتی ہے، وہ اوپر سے نیچے کی طرف گر جاتی ہے؛ لیکن بادل ہوا کی پشت پر سوار ہوکر فضا میں تیرتا رہتا ہے، یہ بجلی خدا کے حکم سے چمکتی ہے، یہ بھی خوف ہوتا ہے کہ کہیں کسی پر گر نہ جائے اور یہ بھی اُمید ہوتی ہے کہ اس کے بعد بارش ہو اور انسان کے کھیت سیراب ہوں، قرآن مجید نے یہ بھی بتایا کہ بجلی کی گرج اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کی ایک شکل ہوتی ہے، اس میں بہت سی مشرک قوموں کے اس خیال کی تردید بھی ہوگئی کہ بجلی دیویوں اور دیوتاؤں کا ہتھیار ہے، تعریف و تسبیح کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بجلی اسی گرجدار آواز میں اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتی ہو اور اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بجلی جیسی آگ والی مخلوق ہو یا فرشتوں جیسی نور والی مخلوق، سب احکام الٰہی کے آگے سر جھکائے ہوئے ہیں، یہ سر جھکانا خود زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کی تعریف و تسبیح ہے، ـــــ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مشرک ←

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة

اسی کو پکارنا حق ہے اور لوگ خدا کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ تو ان کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے، گویا (ان کا حال) اس شخص کی طرح ہے، جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوا ہو کہ پانی اس کے منھ تک پہنچ جائے؛ حالاں کہ پانی اس شخص تک پہنچ نہیں سکتا، اور کافروں کی پکار محض اکارت ہوتی ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۴﴾ جو چیزیں آسمانوں میں اور زمین میں ہیں، وہ سب خواہی نہ خواہی اللہ کے سامنے جھکی رہتی ہیں، اور صبح وشام ان کے سائے بھی۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۵﴾

← سردار کو ایمان کی دعوت دی، وہ تمسخر کے طور پر پوچھنے لگا کہ تمہارا خدا چاندی کا ہے یا سونے کا یا تانبہ کا؟ اس گستاخانہ سوال کے نتیجہ میں اس پر بجلی گری اور وہ ہلاک ہوگیا، (تفسیر قرطبی: ۲۹۸/۹) حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص بجلی کی کڑک کے وقت تین دفعہ: ''سبحان من یسبح الرعد بحمده والملٰئکة من خیفته'' پڑھ لے تو انشاء اللہ اس سے محفوظ رہے گا۔

﴿۱﴾ یعنی اللہ کو پکارنا اور اس سے دُعاء مانگنا ہی دُعاء کا صحیح طریقہ اور سچی پکار ہے، مخلوق کو خدا بنا دینا اور ہاتھ پھیلانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پانی سے یہ اُمید باندھ لے کہ وہ اس کے پکارنے پر خود بخود منھ تک پہنچ جائے گا اور اس کی پیاس کو دور کردے گا، جیسے اس شخص کا پکارنا ضائع ہوجاتا ہے، اسی طرح اللہ کے سوا کسی اور سے مانگنا اپنی دُعاء کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

﴿۲﴾ قرآن مجید میں یہاں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان کے معنی یہ ہیں کہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں اللہ کو سجدہ کرتی ہیں، یہاں سجدہ سے مراد ہے: اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت وفرمانبرداری ''السجود عبارة عن الانقیاد والخضوع وعدم الامتناع'' (مفاتیح الغیب: ۲۲۰/۹) —— اطاعت وفرمانبرداری کے سلسلہ میں ایک اختیاری نظام ہے جو انسان اور جنات سے متعلق ہے؛ چوں کہ انسان وجنات اس دنیا میں امتحان کے لئے رکھے گئے ہیں؛ اس لئے ان کو ارادہ واختیار کی قوت دی گئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بھی کرنے پر قادر ہیں اور نافرمانی بھی؛ البتہ نافرمانی کرنے پر گنہگار ہوں گے، پس انسان اور جنات میں سے نیک بندے اطاعت وفرمانبرداری کے جو کام کرتے ہیں، وہ اختیاری اطاعت ہے، دوسرا نظام تکوینی ہے، جس میں ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہیں، وہ اطاعت ہی کرنے پر مجبور ہیں، انسان اور جنات کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں، چاہے سورج و چاند ہو، درخت اور سمندر ہو یا حیوانات ہوں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ڈوری میں بندھے ہوئے اور ہر وقت اللہ کے احکام کو بجالانے میں لگے ہوئے ہیں، زمین وآسمان کی تمام چیزوں یہاں تک کہ ان کے سایوں کا بھی اللہ کے سامنے جھک جانے کا یہی مطلب ہے، —— بعض مفسرین کے نزدیک یہاں سجدہ سے حقیقی معنوں میں سجدہ ہی مراد ہے، (تفسیر قرطبی: ۳۰۲/۹) —— لہٰذا مومن تو اپنی مرضی سے سجدہ کرتا ہے اور دوسری چیزیں سجدہ کرنے پر مجبور ہیں۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ
لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ
وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ
شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۱۶ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ
السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ
كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ
فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝۱۷

آپ دریافت فرمایئے: آسمان وزمین کا رب کون ہے؟ آپ کہہ دیجئے: اللہ، آپ دریافت کیجئے کہ کیا تم نے اللہ کے سوا ان کو کارساز بنا رکھا ہے، جو خود اپنے لئے بھی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ آپ کہئے: کیا اندھا اور بینا برابر ہوسکتا ہے؟ یا کہیں تاریکی اور روشنی برابر ہوسکتی ہیں؟ یا انھوں نے اللہ کے لئے جو شریک ٹھہرا رکھے ہیں، انھوں نے اللہ کے پیدا کرنے کی طرح کسی کو پیدا کیا ہے، جس سے تخلیق کے معاملہ میں ان کو اشتباہ پیدا ہوگیا ہو؟ ﴿۱﴾ آپ کہہ دیجئے: اللہ ہی ہر چیز کے پیدا کرنے والے ہیں اور وہ ایک اور غالب ہیں ۝۱۶ جس نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر وادیاں اپنی وسعت کے مطابق بہہ پڑیں، پھر یہ بہاؤ خس وخاشاک کو اوپر لے آیا اور جن چیزوں کو زیور یا سامان بنانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں، ان میں بھی اسی طرح کی جھاگ ہے، اللہ اِس طرح حق وباطل کی مثال بیان کرتے ہیں کہ جھاگ تو ضائع ہوجاتے ہیں اور جو چیز انسان کے لئے نفع بخش ہے، وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے، اسی طرح اللہ مثالیں دیتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۱۷

﴿۱﴾ یعنی جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی مثال بینا لوگوں کی ہے، جو کسی چیز کو دیکھ کر صحیح فیصلہ کرتے ہیں اور جن لوگوں نے مخلوق کو یہاں تک کہ خود اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے، ان کی مثال اندھوں کی سی ہے، جو بغیر دیکھے اور سمجھے ہوئے کسی چیز کے بارے میں غلط رائے قائم کر لیتے ہیں تو قرآن نے ایک اُصول بتایا کہ جو ذات پیدا کرنے والی ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، تو اگر کچھ چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہوتیں اور کچھ چیزوں کو ان کی دیویوں اور دیوتاؤں نے پیدا کیا ہوتا تب تو یہ سوچا بھی جاسکتا تھا کہ انھیں اپنے خالق کو جاننے میں اشتباہ ہوگیا؛ اس لئے وہ مخلوق کو معبود بنا بیٹھے؛ لیکن جب تمام چیزوں کی تخلیق اللہ ہی نے فرمائی اور کسی مخلوق کا اس میں دخل نہیں ہے تو پھر کیسے ان مشرکین نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے کا حکم دیا؟

﴿۲﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے افراد، قوموں، اداروں اور تنظیموں کے لئے فطرت کا ایک اہم قانون بیان کیا ہے کہ جو چیز انسانیت کے لئے نفع بخش ہوتی ہے، وہ باقی رہتی ہے اور جس چیز میں نفع دینے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے، وہ آپ سے آپ اپنے وجود کو کھودیتی ہے، دنیا میں قوموں کے عروج وزوال کی اصل بنیاد یہی ہے، آج مغربی دنیا بہت سی اخلاقی برائیوں کے باوجود ترقی اور مقبولیت کی چوٹی پر ہے، وہ اسی لئے کہ وہ اپنی صنعت، ٹکنالوجی، راحت بخش ایجادات اور اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے انسان کو —— مادی ہی ←

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَ الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ۬ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ
ع ۱۱/۲ ۸ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا النصف
الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ
اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ؕ

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی باتوں کو مان لیا، ان کے لئے بھلائی ہے اور جن لوگوں نے نہیں مانا، وہ اگر چہ زمین کی ساری چیزیں اور مزید اس کے برابر اپنی طرف سے فدیہ کے طور پر دے دیں، (جب بھی) ان کا سخت حساب ہوگا، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے! ﴿۱﴾ ﴿۱۸﴾ جس شخص کو معلوم ہے کہ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے، کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو اندھا ہو؟ یقیناً سمجھ دار لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ جو اللہ کے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور عہد کو توڑتے نہیں ہیں ﴿۲۰﴾ اللہ نے جس (رشتہ) کے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، اس کو جوڑے رکھتے ہیں، اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب و کتاب کی سختی سے سہمے رہتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۱﴾

← طور پر سہی — فائدہ پہنچا رہی ہے، مسلمان دین حق کے حامل ہونے کے باوجود ان میدانوں میں اپنی نافعیت کھو چکے ہیں؛ اس لئے اِس پہلو سے وہ مسلسل زوال، ناکامی اور رسوائی کی طرف بڑھ رہے ہیں، یہی حال دین و مذہب کے معاملہ میں ہے، مذہب کا مقصد بندہ کو خدا سے جوڑنا اور نفسانی خواہشات پر اخلاقی تقاضوں اور خداوندی احکام کو غالب رکھنے پر آمادہ کرنا ہے، یہ صلاحیت اب صرف دین محمدی ﷺ میں ہے؛ مسلمان بہت سی کوتاہیوں کے باوجود آج بھی اپنے مذہب سے وابستہ ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو سب سے بالاتر سمجھتے ہیں، دوسرے مذاہب اس صلاحیت سے محروم ہوگئے ہیں اور ان کے ماننے والوں کا مذہب سے رسمی سا تعلق رہ گیا ہے؛ اسی لئے آج مسلمانوں کی کوتاہیوں اور اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں اور پروپیگنڈوں کے باوجود اسلام دنیا کا سب سے مقبول مذہب ہے، خاص کر مغربی دنیا میں اسلام قبول کرنے کا خاصا رجحان پایا جاتا ہے، وہ اس لئے کہ مذہب کا جو مقصد ہے اس کو حاصل کرنے میں اسلام کی نافعیت واضح ہے، دوسرے ادیان اس معاملہ میں اپنی نافعیت کھو چکے ہیں؛ اس لئے یہ دین انشاءاللہ قیامت تک باقی رہے گا اور دوسرے باطل مذاہب اپنا وجود کھوتے چلے جائیں گے۔

﴿۱﴾ جیسے ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک میں نہیں چلتی، اسی طرح دنیا کے اسباب و وسائل آخرت میں بے قیمت ہوجائیں گے، وہاں مال کی کوئی قیمت نہیں ہوگی، اعمال کی ہوگی اور اہل دوزخ کے پاس اعمال کی پونجی تو ہوگی ہی نہیں۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے اور اس آیت میں صلہ رحمی کا حکم دے کر بندوں کے حقوق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور دین کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بندوں کا حق بھی۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً
وَّ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ
صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾

نیز وہ اپنے پروردگار کی خوشنودی کی طلب میں ثابت قدم رہتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، چھپا کر بھی اور ظاہر کر کے بھی اس میں سے خرچ کرتے ہیں، برے برتاؤ کا مقابلہ اچھے برتاؤ سے کرتے ہیں، ان ہی کے لئے بہترین انجام ہے ﴿۱﴾ ﴿۲۲﴾ وہ ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں خود داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ، شوہر و بیوی اور اولاد بھی، جو صالح ہوں، نیز فرشتے ہر دروازہ سے ان پر داخل ہوا کریں گے ﴿۲۳﴾ (وہ کہا کریں گے) آپ لوگوں نے جو صبر کیا، اس کے بدلہ آپ پر سلامتی ہو، تو اُس عالم میں یہ کیا ہی بہتر انجام ہے! ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾

﴿۱﴾ اگرچہ عمومی طور پر اللہ کے راستہ میں چھپا کر خرچ کرنا بہتر ہے؛ لیکن بعض دفعہ دکھا کر خرچ کرنا ضرورت مندوں کے حق میں مفید ہوتا ہے اور یہ دوسروں کے لئے ترغیب کا باعث ہوتا ہے — برے برتاؤ کا مقابلہ اچھے برتاؤ سے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرے تو فطری طور پر آپ بھی اس کے ساتھ اچھا رویہ ہی اختیار کریں گے؛ لیکن ایک اچھے مسلمان کا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرے، تب بھی آپ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں — اس آیت کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ نیکی کے ذریعہ برائی کو مٹا دیتے ہیں، یعنی اگر ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو پھر ایسے نیک عمل کرتے ہیں کہ اس گناہ کا اثر ختم ہو جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں ''إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ'' (ہود: ۱۱۴) اِس دوسرے معنی کی بھی گنجائش ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۹/۳۱۱)

﴿۲﴾ انسان جہاں جسمانی راحت و آرام سے سکون حاصل کرتا ہے، وہیں وہ اپنے لئے عزت و اکرام بھی چاہتا ہے، جس کا تعلق زبان سے ہے، آپ اچھے سے اچھے لباس میں ہوں، عمدہ سے عمدہ کھانا آپ کے سامنے ہو اور نفیس سے نفیس جگہ میں آپ کو ٹھہرایا گیا ہو؛ لیکن اگر آپ کے ساتھ کسی ترش رو اور بد اخلاق آدمی کو رکھ دیا جائے، جو بے ادبی اور بدتمیزی کے ساتھ آپ سے باتیں کرتا ہو تو سارا لطف جاتا رہتا ہے اور بد اخلاقی کی کڑواہٹ تمام راحتوں سے بڑھ جاتی ہے؛ مگر اہل جنت کو جہاں جسمانی راحتیں دی جائیں گی، وہیں انھیں خوب عزت بھی ملے گی، فرشتہ جیسی مخلوق ان کے پاس حاضر ہوا کرے گی اور پورے ادب و احترام کے ساتھ انھیں سلام کرے گی، اس طرح انھیں مادی نعمتوں کے ساتھ ساتھ عزت و احترام بھی حاصل رہے گا۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ
وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ ع ۳/۸
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ
وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ
تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

جولوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جن رشتوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، انھیں کاٹتے رہتے ہیں اور زمین میں فساد مچایا کرتے ہیں، ان پر لعنت ہے اور ان کے لئے برا انجام ہے ﴿۱﴾ ﴿۲۵﴾ اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں، رزق کشادہ فرما دیتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں، تنگ کر دیتے ہیں، یہ لوگ دنیوی زندگی پر اِترا رہے ہیں؛ حالاں کہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک حقیر سامان سے زیادہ نہیں ﴿۲﴾ ﴿۲۶﴾ جو کافر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اتارا جاتا؟ آپ فرما دیجئے: یقیناً اللہ جسے چاہتے ہیں، گمراہ رہنے دیتے ہیں اور جو اللہ سے رُجوع کرتا ہے، اسے ہدایت سے نواز دیتے ہیں ﴿۲۷﴾ (یعنی) وہ لوگ جو ایمان لائے اور اللہ کی یاد سے ان کے قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے، آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۸﴾

﴿۱﴾ گزشتہ آیتوں میں نیک بندوں کی صفات بیان کی گئی تھیں اور اِس آیت میں گنہگار بندوں کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کے عہد کو توڑتے رہتے ہیں، جو انسان کی ابتداءِ تخلیق کے وقت ان سے لیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب تسلیم کریں گے، اسی طرح وہ شخص جو مسلمان ہونے کے باوجود گناہ کرے، وہ بھی اسی میں داخل ہے؛ کیوں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنا اس بات کا عہد ہے کہ وہ اسلام کے تمام احکام پر عمل کریں گے، دوسرے: وہ رشتوں کا حق نہیں ادا کرتے ہیں، تیسرے: وہ فساد مچایا کرتے ہیں، فساد میں لڑائی جھگڑا، قتل وغارت گری اور ظلم وزیادتی کی تمام شکلیں شامل ہیں، اس سے وعدہ پورا کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھے سلوک کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

﴿۲﴾ یعنی آخرت میں نیک عمل کرنے والوں کے لئے بہترین رزق اور برے عمل کرنے والوں کے لئے عذاب متعین ہے؛ لیکن دنیا چوں کہ امتحان کی جگہ ہے؛ اس لئے کافروں کو بھی کشادہ رزق دی جاتی ہے اور اہل ایمان کو بھی رزق کی تنگی سے دو چار کیا جاتا ہے، یہ بطور انعام کے نہیں ہے؛ بلکہ بطور امتحان کے ہے۔

﴿۳﴾ عام طور پر مادی سہولتوں کو سکون واطمینان کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے؛ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، اطمینان دل کی اس کیفیت کا نام ہے کہ جس میں انسان کو قرار آجائے اور آگے کی لالچ باقی نہ رہے، جیسے ایک شخص کو کسی خاص شہر تک جانا ہے تو اس شہر کو ←

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ
هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ
قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا
قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾ ع ۱۰

جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا، ان کے لئے خوش حالی اور بہترین ٹھکانہ ہے ﴿۲۹﴾ اسی طرح ہم نے آپ کو ایک اُمت میں رسول بنایا ہے — اس سے پہلے بھی مختلف اُمتیں گذر چکی ہیں — تاکہ آپ اُن پر اُس کتاب کی تلاوت کریں، جو ہم نے آپ پر وحی کی ہے، وہ لوگ خدائے مہربان کی ناشکری کررہے ہیں، آپ کہہ دیجئے: وہی میرا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف واپس جانا ہے ﴿۳۰﴾ اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے ذریعہ پہاڑ چلادیئے جاتے، زمین کاٹ دی جاتی یا اس کے ذریعہ مردے بولنے لگتے (تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے)؛ بلکہ تمام اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، کیا ایمان لانے والے اس بات سے مطمئن نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہتے تو سارے انسانوں کو ہدایت عطا فرمادیتے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے، ہمیشہ ان کی حرکتوں کی وجہ سے ان پر یا ان کے گھر کے قریب مصیبت آتی رہے گی، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے، بے شک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ ﴿۱﴾ ﴿۳۱﴾

← پہنچنے کے بعد وہ مطمئن ہوجاتا ہے، اس سے پہلے خواہ اسے اچھے سے اچھا اور خوبصورت سے خوبصورت شہر نظر آجائے، انسان بےاطمینانی سے دوچار رہتا ہے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے طبیعت مضطرب رہتی ہے، مادی نعمتوں کی حرص جن لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالیتی ہے، اُن کی منزل کبھی آتی ہی نہیں، وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بےچین رہتے ہیں؛ لیکن جن لوگوں کا اللہ پر یقین ہوتا ہے، اللہ کی یاد سے ان کے دلوں کو طمانینت حاصل ہوجاتی ہے، اگر اس نے کم دولت بھی حاصل کی تو یہ سوچ کر کہ چوں کہ اللہ کا یہی فیصلہ ہے اور ہم اس پر راضی ہیں، اس کا دل مطمئن ہوجاتا ہے، مختلف مواقع کے لئے رسول اللہ ﷺ نے دُعائیں سکھائی ہیں، جیسے سواری کی، کسی شہر میں داخل ہونے کی وغیرہ، ایسے مواقع پر ہر مسلمان تجربہ کرتا ہے کہ ان دُعاؤں کے پڑھنے کے بعد اسے ایک طرح کا اطمینان حاصل ہوجاتا ہے؛ اس لئے حقیقت یہ ہے کہ قلب کے اطمینان وسکون کا حقیقی ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اس کا ذکر ہی ہے۔

﴿۱﴾ ابوجہل اور عبداللہ بن اُبی اُمَیَّہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے آپ ﷺ کو بلا بھیجا، آپ تشریف لائے تو یہ مطالبہ رکھا کہ مکہ شہر بہت تنگ ہے، اس کے راستے بھی کشادہ نہیں ہیں، آپ قرآن کے ذریعہ پہاڑوں کو چلاکر ←

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

آپ سے پہلے بھی پیغمبروں کا مذاق اُڑایا گیا ہے تو میں نے انکار کرنے والوں کو مہلت دی، پھر ان کو پکڑ لیا تو (دیکھو) کہ میرا عذاب کیسا (سخت) تھا؟ ﴿۱﴾ ﴿۳۲﴾ پھر کیا جو ذات ہر شخص کے ہر ہر عمل سے واقف ہے (ان کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دے گی؟) اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے شریک ٹھہرالیا ہے، آپ کہئے: ان کے نام تو لو، یا کیا تم لوگ اللہ کو ایسی چیز سے باخبر کر رہے ہو، جسے وہ زمین میں جانتا ہی نہیں ہے، یا یہ محض اوپر اوپر باتیں بناتے ہو؛ ﴿۲﴾ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) کفر کرنے والوں کی نظر میں ان مغالطہ انگیز باتوں کو خوشنما بنا دیا گیا ہے اور یہ صحیح راستہ سے محروم کر دیئے گئے ہیں، اور جس کو اللہ ہی ہدایت سے محروم رکھیں، اس کو کوئی صحیح راستہ پر نہیں لا سکتا۔ ﴿۳۳﴾

← آگے بڑھا دیجئے؛ تاکہ مکہ کے راستے اور مکہ کا شہر کشادہ ہو جائے، اسی طرح اس شہر میں نہ نہریں ہیں نہ چشمے ہیں، اگر یہ ہوتے تو ہم یہاں کھیتی کر سکتے تھے؛ اس لئے یہاں کی زمین کچھ اس طرح کٹ جائے کہ اس سے چشمے پھوٹ پڑیں اور نہریں بہنے لگیں، میرے گزرے ہوئے آباء و اجداد — خاص کر قُصَی بن کِلاب — کو زندہ کر دیجئے تاکہ ہم ان سے دریافت کرلیں کہ آپ کی دعوت حق ہے یا نہیں، اگر آپ ان مطالبات کو پورا کر دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، (قرطبی: ۹/۳۱۹) قرآن مجید اس طرح کے سوالات کا جو اُصولی جواب دیتا رہا ہے، وہ یہاں بھی دیا گیا ہے کہ مقصود تو غیبی اور اَن دیکھی سچائیوں پر ایمان لانا ہے، تبھی تو انسان کا امتحان ہو سکے گا، اگر اللہ تعالیٰ کو اس طریقہ پر ان لوگوں کا ایمان لانا منظور ہوتا تو سارے انسان ہدایت پا جاتے؛ اس لئے اس طرح کا مطالبہ بنیادی مقصد ہی کے خلاف ہے اور یوں اگر وہ عبرت حاصل کرنا چاہیں تو یہ بات کافی ہے کہ ان پر اللہ کی طرف سے مصیبتیں آتی رہیں گی، کبھی خود ان پر اور کبھی ان کے قریب؛ تاکہ وہ اپنی نافرمانی پر شرمندہ ہوں اور اپنے خالق کی طرف آجائیں۔

﴿۱﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ کے جھٹلانے والوں پر عذاب کا نہ آنا ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں؛ بلکہ یہ اللہ کی طرف سے مہلت ہے، جو گزشتہ انبیاء کی قوموں کو بھی دی جاتی رہی ہے، معلوم ہوا کہ کسی گناہ کے بار بار ارتکاب کے باوجود اگر اللہ کی طرف سے پکڑ نہ ہو تو انسان کو مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے؛ کیوں کہ یہ مہلت اور ڈھیل بھی ہو سکتی ہے۔

﴿۲﴾ یعنی تم خدا کے سوا جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتے ہو، ان کے نام تو بتاؤ کہ کیا ان کا حقیقی وجود بھی تھا اور جن فرضی ناموں کا تم ذکر کرتے ہو، ان کا خدا ہونا تم کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی بات سے باخبر کرنا چاہتے ہو، جس سے گویا تم واقف ہو اور ذرہ ذرہ سے آگاہ وہ ذات واقف نہیں، یا یہ ایک جھوٹ و غلط بیانی ہے، جو تم اپنی طرف سے کر رہے ہو؟

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ
الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى
الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ۭ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ۭ
اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ
مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۵/۱۱

ان کے لئے دنیوی زندگی میں بھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو کہیں بڑھ کر ہے، نیز اللہ کے مقابلہ ان کو کوئی بچانے والا بھی نہیں ہے ﴿۳۴﴾ جس جنت کا تقویٰ والوں سے وعدہ کیا گیا ہے، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس کے پھل اور اس کے سائے لافانی ہوں گے، یہی ان لوگوں کا انجام ہے، جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے اور کافروں کا انجام دوزخ ہے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی، وہ آپ کی طرف اُتاری گئی کتاب سے خوش ہو رہے ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جو اس کے بعض حصوں کا انکار کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کرتا رہوں، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، اسی کی طرف میں بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میں واپس جاؤں گا ﴿۱﴾ ﴿۳۶﴾ اور اسی طرح ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں قولِ فیصل بنا کر نازل کیا ہے، اگر علم سے سرفراز ہونے کے باوجود آپ ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو اللہ کے مقابلہ نہ آپ کا کوئی مددگار ہوگا نہ کوئی بچانے والا۔ ﴿۳۷﴾

﴿۱﴾ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو سچے اہل علم ہیں، جیسے: حضرت سلمان فارسی، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم وغیرہ، اسی طرح دوسرے ایمان لانے والے اہل کتاب، جیسے: بنونجران میں سے چالیس شخص، یمن کے آٹھ افراد اور حبشہ سے بتیس افراد، اس طرح کے لوگوں کے لئے قرآن مجید کا نازل ہونا خوشی کا باعث تھا، (مفاتیح الغیب: ۹/۲۵۷) اور یہود و نصاریٰ کی ایک بڑی تعداد وہ ہے، جو قرآن مجید کے بعض بیانات کو تو مانتی ہے، جیسے بنی اسرائیل کے واقعات وغیرہ، اور بعض کا انکار کر دیتی ہے — بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس آیت میں 'کتاب' سے خود قرآن مجید مراد ہے، کہ جو لوگ قرآن پر ایمان لا چکے ہیں، انھیں قرآن مجید کے مزید احکام کے آنے اور آیات کے اُترنے سے مسرت ہوتی ہے اور جو کفار و مشرکین ہیں، وہ اس کی بہت سی باتوں کا انکار کرتے ہیں — بہر حال اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، خدا کا ماننا اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک خدا کی پوری کتاب کو نہ مانا جائے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝۳۸ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹
وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝۴۰

ہم نے آپ سے پہلے بھی کئی پیغمبر بھیجے ہیں، ہم نے ان کو بھی بیویاں اور بچے عطا کئے، ﴿۱﴾ اور کسی پیغمبر کے بس میں نہیں تھا کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ لے آتے، ہر زمانہ کے لئے ایک کتاب ہوتی ہے ۝۳۸ اللہ (جن احکام کو) چاہتے ہیں، مٹا دیتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں اور اصل کتاب (لوحِ محفوظ) اسی کے پاس ہے ﴿۲﴾ ۝۳۹ جس بات کا ہم ان سے وعدہ کررہے ہیں، خواہ ان میں سے بعض آپ کو دکھادیں یا آپ کو وفات دے دیں، یقیناً آپ کے ذمہ تو صرف پہنچادینا ہے اور حساب لینا ہمارے ذمہ ہے۔ ﴿۳﴾ ۝۴۰

﴿۱﴾ یعنی پیغمبر بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسانی ضرورتیں جیسے بیوی بچے وغیرہ، ان سے بھی متعلق ہوتی ہیں؛ کیوں کہ پیغمبر کا کام لوگوں کو اللہ کے احکام سے مطلع کرنا اور اپنے قول وفعل کے ذریعہ احکام شریعت سے لوگوں کو واقف کرانا ہے، بیوی بچوں کا ہونا اس کے منافی نہیں؛ بلکہ اس مقصد میں مفید ہے؛ کیوں کہ اگر نبی کے بیوی بچے نہ ہوں تو بیوی بچوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں لوگوں کو عملی نمونہ نہیں مل سکے گا؛ اس لئے مشرکین کا یہ اعتراض بالکل بے جا ہے کہ آپ کیسے نبی ہوسکتے ہیں؛ جب کہ آپ کی بیوی اور بال بچے ہیں۔

﴿۲﴾ مختلف آسمانی کتابوں کے درمیان کچھ جزوی احکام میں فرق رکھا گیا ہے اور کچھ احکام بدلے جاتے رہے ہیں، بعض احکام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں بدل دیئے گئے، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی کہ — نعوذ باللہ — اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی کمی تھی کہ پہلے ایک حکم دیا گیا اور تجربہ کے بعد اسے بدل دیا گیا، قرآن مجید نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ ایک حکم کو بدل کر دوسرا حکم دینا نہیں ہے؛ بلکہ پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک مدت کے لئے ایک حکم مقرر تھا، جب وہ مدت پوری ہوگئی تو اب دوسرا حکم آگیا ''لکل أجلٍ کتاب'' چوں کہ اللہ ہی انسان کے خالق و مالک ہیں، تو اللہ جس حکم کو چاہتے ہیں باقی رکھتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ختم کردیتے ہیں، اگر کسی شخص نے اپنے مکان پر سفید کلر کیا اور کچھ دنوں کے بعد نیلا کلر کردیا تو کسی صاحب عقل کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا؛ کیوں کہ مالک مکان کو اختیار ہے کہ جب تک جو رنگ اسے پسند آئے، اسے اپنے مکان پر باقی رکھے، نیز اللہ تعالیٰ کا یہ عمل ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے نہیں ہے؛ کیوں کہ سارے احکام جو شروع سے اب تک دیئے جاتے رہے ہیں، وہ ''اُم الکتاب'' یعنی لوحِ محفوظ میں شروع ہی سے لکھے ہوئے ہیں: ''وعندہ أم الکتاب''۔

﴿۳﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی مدد اور مخالفینِ حق کی ناکامی کا جو وعدہ ہے، ممکن ہے کہ کچھ آپ کے سامنے پورا ہوجائے اور کچھ آپ کے بعد، جیسے مکہ وطائف آپ کی زندگی میں فتح ہوگیا اور روم وایران آپ کے بعد؛ لیکن آپ اس کی فکر نہ کریں؛ کیوں کہ آپ کے ذمہ صرف دعوت حق کو پہنچانا ہے — معلوم ہوا کہ داعیانِ دین کو اپنا کام کرتے جانا چاہئے اور نتائج کے حاصل ہونے کے لئے بے چین نہیں ہونا چاہئے؛ کیوں کہ ہماری ذمہ داری دعوت حق کا پہنچا دینا ہے اور یہی ہماری کامیابی ہے، مخاطب اس کو قبول کرے یا نہ کرے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ یَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ ؕ وَهُوَ
سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِیۡعًا ؕ یَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ
كُلُّ نَفۡسٍ ؕ وَسَیَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ
قُلۡ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾ ع ۶ / ۱۲

کیا وہ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے کم کرتے جارہے ہیں اور اللہ ہی فیصلہ فرماتے ہیں، اس کے فیصلے کو کوئی پیچھے نہیں ڈال سکتا، اور اللہ بہت جلدی حساب لینے والے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۴۱﴾ ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی چالبازیاں کی ہیں؛ حالاں کہ تمام تدبیریں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں، وہ ہر شخص کے عمل کو جانتے ہیں، کافروں کو جلد ہی علم ہوجائے گا کہ آخرت کا بہتر انجام کس کے لئے ہے؟ ﴿۴۲﴾ جو لوگ کافر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں، آپ کہہ دیجئے: کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ اور وہ لوگ جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا علم ہے، بطور گواہ کے کافی ہیں۔ ﴿۴۳﴾

﴿۱﴾ زمین کو کم کرتے آنے سے عام طور پر یہ بات مراد لی گئی ہے کہ کفار و مشرکین کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوتے جائیں گے، چاہے جنگ کے ذریعہ ہو یا قبولِ اسلام کے ذریعہ ہو، (مفاتیح الغیب: ۹/ ۲۶۷) لیکن موجودہ دور میں اس آیت کی ایک دوسری مراد بھی واضح طور پر سامنے آگئی ہے کہ دنیا میں خشکی کے جو علاقے ہیں، وہ مسلسل زیر آب آتے اور سمندر کا حصہ بنتے جارہے ہیں، اور سائنس داں پریشان ہیں کہ اگر اسی طرح حدت بڑھتی چلی گئی اور برف کے منجمد خزانے پگھلتے چلے گئے تو بہت سے چھوٹے بڑے جزیرے اور سمندروں کے کنارے — جہاں اس وقت اچھے خاصے شہر بسے ہوئے ہیں، — ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے اور سمندر کا حصہ بن جائیں گے، یہ جدید سائنسی تحقیق نہ صرف اس آیت کے مضمون کو واضح کرتی ہے؛ بلکہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ قرآن مجید اس خدا کی کتاب ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر ہے، یقیناً ایک نبی اُمی ایسی سائنسی حقیقتوں کا انکشاف نہیں کرسکتا تھا، جو صدیوں کی تحقیق کے بعد آج انسان کے سامنے آئی ہے، یہ خود اس رسول کے برحق ہونے اور اس کتاب کے منجانب اللہ نازل کئے جانے کی دلیل ہے۔

سُوۡرَةُ إِبۡرَاهِيمَ

- سورہ نمبر : (۱۴)
- رکوع : (۷)
- آیتیں : (۵۲)
- نوعیت : مکی

یہ مکی سورت ہے، جس کی آیتیں باون (۵۲) ہیں —— حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انبیاء کے درمیان ایک امتیازی شان حاصل تھی اور انھوں نے اللہ کی رضاء وخوشنودی کے لئے ہر جہت سے قربانی پیش کی تھی؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات وواقعات اور ان کے صبر واستقامت کی داستانیں قرآن کی مختلف سورتوں میں ذکر کی گئی ہیں، اس سورت میں بھی حیاتِ ابراہیمی کا ایک حصہ جو خاص کر مکہ مکرمہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق ہے، ذکر کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے تعمیر بیت اللہ کا ذکر بھی آیا ہے، اپنی نسل کے لئے ہدایت کی اور اور اہل مکہ کے لئے پھلوں کے مہیا کئے جانے کی جو دُعاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمائی تھی، وہ بھی نقل کی گئی ہے اور پھر ان اہل عرب کو جو اپنے آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کہتے تھے، بتایا گیا ہے کہ تم بُت پرستی میں مبتلا ہو؛ حالاں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بت پرستی سے منع فرمایا تھا —— حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اِسی تذکرہ کی مناسبت سے اس سورت کا نام سورۂ ابراہیم رکھا گیا۔

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی عام طور پر توحید، رسالت، آخرت کا بیان ہے، نیز مسلمانوں کی تسلی کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کے، عاد وثمود کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں اور ایک اہم بات یہ ذکر کی گئی ہے کہ اللہ نے ہر قوم میں اسی زبان کے بولنے والے نبی کو مبعوث فرمایا ہے؛ تا کہ لوگوں کے لئے اس کی دعوت کو سمجھنا آسان ہو۔

○ ○ ○

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ
الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۱ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ
عَذَابٍ شَدِيْدِ ۝۲ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ الف، لام، میم، را، ﴿۱﴾ ہم نے یہ کتاب آپ پر اس لئے اُتاری ہے کہ آپ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم کے مطابق تاریکیوں سے روشنی کی طرف یعنی قابل تعریف اور زبردست خدا کے راستہ پر لے جائیں ﴿۲﴾ ۝۱ وہی خدا جس کی ملکیت میں آسمان و زمین کی ساری چیزیں ہیں، اور کافروں کے لئے سخت عذاب کے ذریعہ ہلاکت ہے ۝۲ جو لوگ دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی تلاش کرتے رہتے ہیں، یہی لوگ سخت گمراہی میں ہیں۔ ﴿۳﴾ ۝۳

﴿۱﴾ دیکھئے: سورۂ بقرہ کے آغاز میں ''الٓمٓ'' پر وضاحتی نوٹ۔

﴿۲﴾ اس آیت میں آپ کی ذمہ داری مقرر کی گئی ہے کہ آپ تمام لوگوں کو ہدایت کی طرف لانے کی کوشش کریں، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت کے مخاطب صرف مسلمان نہیں ہیں، تمام انسان ہیں؛ بلکہ اس لحاظ سے کہ قرآن مجید میں ناس (لوگوں) کا لفظ زیادہ تر مشرکین کے لئے استعمال ہوا ہے، غیر مسلموں تک ایمان پہنچانے کی زیادہ ضرورت ہے اور صرف مسلمانوں میں رشد و اصلاح کا کام کر کے مطمئن ہو جانا اور سمجھ لینا کہ فریضۂ دعوت ادا ہو گیا خام خیالی ہے، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گمراہی کے بہت سے راستے ہیں؛ اسی لئے تاریکی کو 'جمع' کے لفظ سے بیان کیا گیا اور ''تاریکیاں'' کہا گیا، جب کہ ہدایت کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین اور آپ کی پیش فرمائی ہوئی شریعت، اس کے سوا کوئی راستہ نہیں جس سے انسان کو ہدایت حاصل ہو سکے۔

﴿۳﴾ یعنی انسان کی گمراہی کے بنیادی طور پر تین اسباب ہیں، ایک: دنیا کی محبت اور آخرت سے بے خوفی؛ کیوں کہ جب انسان اللہ کے احکام کو تسلیم کرے گا تو اس کو دنیا کی بہت سی خواہشات اور لذتوں سے کنارہ ہونا پڑے گا، اس کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا ہے، جو شخص سچائی کو سمجھ لینے کے باوجود اپنے کسی مفاد کے لئے دوسروں کو حق کے راستے سے روکے، جیسا کہ مکہ کے سردار یا مدینہ کے منافقین، کہ وہ اس لئے ایمان نہ لاتے تھے اور دوسروں کو بھی ایمان لانے سے روکتے تھے کہ ان کی سرداری ختم ہو جائے گی اور انھیں محمد رسول اللہ ﷺ کی قیادت کو قبول کرنا پڑے گا، تو اکثر ایسے بے توفیق لوگوں کے لئے ہدایت کا فیصلہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انھوں نے بہتوں کو گمراہ بھی کیا، تیسرا سبب ہے کجی کی تلاش، ہمارے گرد و پیش عام مکھیاں بھی ہوتی ہیں اور شہد کی مکھیاں بھی، شہد کی مکھی پھولوں اور پھلوں سے اس کے لذیذ، خوشبودار اور اچھے اجزاء کو کشید کرتی ہے، عام مکھیوں کا حال یہ ہے کہ وہ گندگیوں پر بیٹھتی ہیں، انھیں کو جمع کرتی ہیں اور انھیں کو پھیلاتی ہیں، اسی طرح اپنے مزاج کے اعتبار سے انسان بھی دو طرح کے واقع ہوئے ہیں، کچھ لوگ نیک فطرت ہوتے ہیں، وہ کسی شخصیت، کسی واقعہ اور کسی کلام سے خوبیوں کو اخذ کرتے ہیں ←

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ يَّشَآءُ وَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝۴

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو ان کی قوم کی زبان ہی میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے ؛ تا کہ وہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھا دیں، ﴿۱﴾ پھر اللہ جسے چاہتے ہیں، ہدایت سے محروم رکھتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں، ہدایت سے نواز دیتے ہیں، وہی غالب اور حکمت والے ہیں۔ ۝۴

← اور کچھ لوگ بدطینت اور کمینہ ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ برائی کے پہلو کو بہ تکلف نکالتے ہیں، جیسا کہ منافقین کا حال تھا کہ اگر کسی صحابی نے اللہ کے راستے میں زیادہ مال کی پیشکش کی، کہنے لگے کہ یہ ریا کار ہیں اور دکھاوے کا کام کرتے ہیں اور کسی صحابی نے اپنی غربت کی وجہ سے اپنی گنجائش کے مطابق کم تعاون پیش کیا، تو کہتے کہ ان کے دو چار پیسوں سے کیا ہونے والا ہے، ایسے لوگ حق کی بات قبولیت اور فائدہ اُٹھانے کی نیت سے نہیں سنتے اور نہیں پڑھتے ؛ اس لئے گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لہٰذا انسان کو ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ وہ کہیں ان بیماریوں میں تو مبتلا نہیں ہے؟ —— ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ انسان اپنی عقل یا اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر کوئی بات طے کر لیتا ہے کہ دین کا یہی حکم ہونا چاہئے اور پھر قرآن وحدیث کو بہ تکلف اسی مراد پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ صورت بھی کجی کی تلاش: ''یبغونھا عوجا'' میں شامل ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳۴۰/۹)

﴿۱﴾ اللہ کی کتاب کا مقصد لوگوں کی ہدایت ہے، ہدایت کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہدایت کے معنی اور اس کے مطالبات کو سمجھ سکے اور انسان وہی بات سمجھ پاتا ہے جو اس کی زبان میں کہی جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ کسی کتاب کے مخاطب ہوتے، ان ہی کی زبان میں وہ کتاب نازل کی جاتی ؛ تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں اور ان کے لئے نہ سمجھ پانے کا عذر باقی نہ رہے، اسی بنیاد پر قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا گیا ؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ صرف عربوں کے نبی تھے اور قرآن صرف عربوں کی کتاب ہے ؛ جیسا کہ بعض مغربی مصنفین تاثر دیتے ہیں ؛ چنانچہ قرآن مجید نے خود کہا کہ آپ کو پوری انسانیت کی طرف بھیجا گیا ہے: ''وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا'' (السباء: ۲۸) خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی پانچ خصوصیات کا ذکر فرمایا، جو دوسرے پیغمبروں کو نہیں دی گئی تھیں اور آپ کو دی گئیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گذشتہ انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے جاتے تھے اور آپ کو پوری انسانیت کی طرف بھیجا گیا: ''کان النبی یبعث إلی قوم خاصة وبعثت إلی الناس عامة'' (بخاری: ۳۲۸، کتاب التیمم) اب ظاہر ہے کہ عربی نہ جاننے والوں تک قرآنِ مجید کا پیغام قرآن مجید کے ترجموں کے ذریعے پہنچے گا، جس کا آغاز عہدِ صحابہ ہی سے ہو گیا تھا ؛ چنانچہ علامہ سرخسی حنفی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید یا اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ فارسی میں فرمایا تھا، (المبسوط، کتاب الصلوٰۃ، باب کیفیة الدخول فی الصلوٰۃ: ۳۵/۱) معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ کریں، نیز مختلف زبانوں کے اُسلوب اور لب ولہجہ میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہے، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے نئے ترجمے بھی کئے جائیں ؛ تا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں تک قرآن مجید کا پیغام پہنچے، —— اسی سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ قرآن مجید کی تلاوت تو بہت اجر وثواب ←

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ۬ وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ
اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝۶ۧ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ ع ۱۳/۲
شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝۷

ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ تم اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ اور انھیں اللہ کی طرف سے پیش آنے والے واقعات یاد دلاؤ، ﴿۱﴾ یقیناً اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے شخص کے لئے نشانیاں ہیں ﴿۲﴾ ۝۵ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: تم اپنے آپ پر اللہ کے انعام کو یاد کرو، جب اللہ نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات عطا فرمائی، جو تم کو بدترین اذیت پہنچاتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کردیتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی ۝۶ اور وہ وقت بھی یاد کرو: جب تمہارے پروردگار نے خبردار کردیا تھا کہ اگر تم شکر ادا کروگے تو تمہیں اور عطا کروں گا، اور اگر ناشکری کروگے تو یقیناً میرا عذاب بہت سخت ہے۔ ﴿۳﴾ ۝۷

← کا باعث ہے ہی اور وہ بذاتِ خود بھی مقصود ہے؛ لیکن معانی قرآن کو بھی پڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ یہ بھی قرآن مجید کا اہم ترین حق ہے، افسوس کہ اس زمانے میں اس سلسلے میں بھی بہت افراط وتفریط ہے، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو ترجمے کے بغیر صرف قرآن کی تلاوت کو بے فائدہ سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو قرآن کا ترجمہ بھی پڑھنے سے منع کرتے ہیں، یہ دونوں ہی سوچ قرآن کے مزاج کے خلاف ہے اور غلط ہے۔

﴿۱﴾ ''ایام اللہ'' سے مراد ہے اللہ کی طرف سے پیش آنے والے اہم واقعات، جیسے: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا فرعون سے نجات پانا، فرعون اور اس کے لشکر کا سمندر میں غرق کردیا جانا، وغیرہ؛ چنانچہ عربی زبان میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص عرب کے ایام سے واقف ہے، یعنی ان کے واقعات سے واقف ہے: ''فلان أعلم بأيام العرب أي بوقائعها''۔ (قرطبی: ۳۴۲/۹، نیز دیکھئے: تفسیر ابن کثیر: ۱۷۷/۸)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو اللہ کی طرف سے پیش آنے والی آزمائشوں پر صبر تو کرنا ہی چاہئے؛ لیکن اس حالت میں بھی شکر گزار ہونا چاہئے؛ اسی لئے مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی اگر کسی مصیبت میں بھی مبتلا ہو اور اس سے خیر و عافیت پوچھی جائے، تو اسے کہنا چاہئے کہ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے: ''الحمد لله علی کل حال''۔
(ابن ماجہ، کتاب الادب، باب فضل الحامدین: ۳۸۰۴)

﴿۳﴾ آدمی پر اگر بہتر حالات آئیں، تو وہ اِترانے اور شیخی بگھاڑنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، جس نعمت پر شکر ادا کرے گا، اللہ اس نعمت میں اضافہ فرمائیں گے اور اگر کوئی شخص ناشکری کرے، تو بعض اوقات دنیا میں بھی اس سے وہ نعمت چھین لی جاتی ہے اور اگر دنیا میں اللہ کی طرف سے ڈھیل قائم رہی، تب بھی آخرت میں تو اللہ کا سخت عذاب ہے ہی۔

وَ قَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۸ اَلَمْ
يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۬ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ لَا
يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَ قَالُوْٓا اِنَّا
كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۹ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ
شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۰

اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم لوگ اور روئے زمین کے سارے لوگ بھی ناشکری کرنے لگیں تو اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہیں ۝۸ کیا تم تک تم سے پہلے کے لوگ یعنی قوم نوح، عاد و ثمود اور ان کے بعد کے لوگوں کی خبر نہیں پہنچی؟ اللہ کے سوا انھیں کوئی اور نہیں جانتا، ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے؛ مگر انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منھ میں ڈال لئے اور کہنے لگے: تمہیں جن احکام کو لے کر بھیجا گیا ہے، یقیناً ہم ان کا انکار کرتے ہیں ﴿۱﴾ اور تم ہمیں جس بات کی دعوت دے رہے ہو، ہم تو اس کی طرف سے گہرے شک میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۲﴾ ۝۹ ان کے پیغمبروں نے کہا: کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا کے بارے میں کوئی شک ہے؟ اللہ تم کو بلاتے ہیں؛ تاکہ تمہارے گناہوں کو معاف کردیں اور ایک مقررہ وقت تک تمہیں زندہ رکھیں، وہ لوگ کہنے لگے: تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، تم چاہتے ہو کہ ہمیں اُن چیزوں سے روک دو، جن کی ہمارے آباء واجداد عبادت کیا کرتے تھے، تم ہمارے پاس کوئی کھلا ہوا معجزہ تو لے آؤ۔ ۝۱۰

﴿۱﴾ ''فردوا أیدیھم فی أفواھھم'' کا زیادہ تر اہل علم نے یہی ترجمہ کیا ہے کہ پیغمبر کی باتیں سن کر اس کو قبول کرنے کے بجائے وہ اپنے منھ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے، یہ ان کی طرف سے جھٹلانے کا اشارہ تھا، یا اپنی انگلیوں کو اپنے منھ سے غصہ کے اظہار کے لئے دبا لیتے تھے، (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۹/ ۲۹۴، تفسیر ابن کثیر: ۸/ ۱۸۲) اور بعض حضرات کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منھ پر رکھ دیتے تھے؛ تاکہ وہ بولنے نہ پائیں، ہر دو صورت میں ان کا مقصد پیغمبر کو جھٹلانا اور ان کی باتوں کو نہ ماننا ہوتا تھا —— اس آیت میں یہ بات بھی فرمائی گئی کہ یہ منکرین پیغمبروں سے کہا کرتے تھے کہ آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں، ہم اس کا کفر یعنی انکار کرتے ہیں: ''إنا کفرنا بما أرسلتم بہ'' اس سے معلوم ہوا کہ کفر کے معنی انکار کے ہیں، شریعت کی اصطلاح میں جو لوگ اسلام کے پیش کئے ہوئے عقیدوں کا انکار کر جائے، ان کو کافر کہتے ہیں، یہ اہانت آمیز اور تحقیر کے الفاظ نہیں ہیں، بدقسمتی سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ غیر مسلموں کو کافر کہہ کر ان کی توہین کی گئی ہے۔

﴿۲﴾ ''شک مریب'' کا معنی ہے: بہت زیادہ شک ''شکاً قویاً'' (تفسیر ابن کثیر: ۸/ ۱۸۳) اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ بڑے شک سے کیا ہے، (کشف الرحمٰن: ۲۹۴) اسی لئے اس کا ترجمہ ''گہرے شک'' سے کیا گیا ہے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَ مَا
لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ
ع ۲ ۶ ۱۴ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ
لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَ خَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

ان لوگوں سے ان کے پیغمبروں نے کہا کہ ہم ہیں تو تمہارے ہی جیسے انسان؛ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں، احسان فرماتے ہیں، اور ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر ہم کوئی معجزہ لے آئیں اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے ﴿۱﴾ ﴿۱۱﴾ اور ہم کیسے اللہ پر بھروسہ نہ کریں؛ حالاں کہ اس نے ہمیں ہمارے راستے بتادیئے اور تم ہمیں جو ایذا پہنچا رہے ہو، ہم ضرور اس پر صبر کرتے رہیں گے اور بھروسہ رکھنے والوں کو چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں ﴿۲﴾ ﴿۱۲﴾ اور ایمان نہ لانے والوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا: ہم تمہیں ضرور اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے، یا پھر تم ہمارے مذہب میں واپس آجاؤ، ﴿۳﴾ پھر ان کے پروردگار نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ ہم ضرور ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے ﴿۱۳﴾ اور ان کے بعد تم کو اس سرزمین میں آباد کریں گے، یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہو اور جو میری دھمکی کا خوف رکھتا ہو۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۴﴾

﴿۱﴾ انسان کی عجوبہ پسند طبیعت نے ہمیشہ اپنی بے عقلی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے وقت کے پیغمبروں سے یہی سوال کیا کہ جب آپ بھی میرے ہی جیسے انسان ہیں، تو ہم آپ کو کیسے نبی مانیں؛ حالاں کہ انسان دن ورات اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ ایک ہی جیسے انسانوں میں ایک عالم ہے اور دوسرا جاہل، ایک معالج ہے اور دوسرا مریض، ایک حاکم ہے اور دوسرا محکوم، ایک دولت مند ہے اور دوسرا غریب، تو جب اللہ تعالیٰ نے ان سب صلاحیتوں میں انسان اور انسان کے درمیان فرق رکھا ہے، تو یہ فرق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے کہ ایک کو وہ اپنا پیغمبر اور نمائندہ بنائے اور دوسرے کو اس کی پیروی کا حکم دے۔

﴿۲﴾ یعنی داعی کو مدعو کے تکلیف دہ رویہ کے مقابلہ صبر وبرداشت سے کام لینا چاہئے اور اس کا بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے، یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے مربوط ہیں، جب انسان کسی معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیتا ہے تو اس کے لئے اس پر صبر کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

﴿۳﴾ جن لوگوں کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی، ان کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ دھمکی اور تشدد پر اتر آتے ہیں، اس وقت بھی مشرق سے مغرب تک پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ یہی صورت حال ہے، مسلمانوں کی شہریت منسوخ کرنے یا انھیں کافرانہ تہذیب میں ضم ہوجانے کی دھمکی دی جارہی ہے۔

﴿۴﴾ یعنی اللہ کی مدد اس گروہ کو حاصل ہوتی ہے، جس کو اللہ کا خوف ہو اور خوف کا اظہار صرف زبان ہی سے نہیں ہوتا؛ بلکہ انسان کے عمل سے بھی ہوتا ہے۔

وَ اسْتَفْتَحُوْا وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۱۵ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۝۱۶
يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهٖ
عَذَابٌ غَلِيْظٌ ۝۱۷ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ
عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝۱۸ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۹ وَّ مَا ذٰلِكَ
عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۲۰ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ
تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ
سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ۝۲۱ ع ۳۹ ۹ ۱۵

ایمان نہ لانے والوں نے فیصلہ کردیئے جانے کی خواہش کی اور تمام سرکش ضدی لوگ ناکام ونامراد ہوکر رہے ﴿۱﴾ ۝۱۵ اس کے سامنے جہنم ہے، اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا ۝۱۶ وہ اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پئے گا اور اس کا اس کے حلق سے اُترنا دشوار ہوگا، ہر طرف سے اس پر موت کی یلغار ہوگی؛ لیکن وہ مر نہیں سکے گا اور اس کے سامنے ایک اور سخت تر عذاب ہوگا ﴿۲﴾ ۝۱۷ جو لوگ اپنے پروردگار کا انکار کرتے ہیں، ان کے اعمال کی حالت ایسی راکھ کی طرح ہے، جس کو تیز آندھی کے دن ہوا پوری قوت سے اُڑا کر لے جائے، انھوں نے جو کچھ کیا تھا، ان کو اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا، یہی تو بدترین گمراہی ہے ﴿۳﴾ ۝۱۸ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی نے آسمانوں کو اور زمین کو بالکل ٹھیک ٹھیک پیدا کیا ہے؟ اگر اللہ چاہیں تو تمہاری بساط لپیٹ دیں اور ایک نئی مخلوق کو لے آئیں ۝۱۹ اور اللہ پر یہ ذرا بھی دشوار نہیں ۝۲۰ اللہ کے سامنے سب کے سب پیش ہوں گے، پھر کمزور لوگ ان لوگوں کو —— جو بڑے بنتے تھے —— کہیں گے کہ ہم لوگ تو تمہارے تابع تھے، کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے کچھ بھی بچا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے: اگر اللہ نے ہم کو ہدایت سے نوازا ہوتا تو ہم تم کو بھی ہدایت پر لے آتے، ہمارے لئے برابر ہے؛ چاہے ہم آہ وزاری کریں یا صبر سے کام لیں، ہمارے لئے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ۝۲۱

﴿۱﴾ یعنی خود کفار ومشرکین نے دُعاء کی کہ جلد سے جلد ان کا فیصلہ کردیا جائے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شکل میں یہ فیصلہ سامنے آیا اور یہ سب نامراد ہوکر رہ گئے۔

﴿۲﴾ موت بھی انسان کے لئے تکلیف سے آرام کا ذریعہ ہوتا ہے، نیز ایک ہی درجہ کی تکلیف پہنچتی رہے تو انسان کے لئے اس کو برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے؛ لیکن دوزخ میں ایک تو انسان کو موت نہیں آئے گی، دوسرے ہر عذاب پہلے عذاب کے مقابلہ شدت کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہوگا؛ اس لئے نہ تکلیف ختم ہوگی اور نہ اس میں کمی واقع ہوگی۔ ←

وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا
كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا
اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ
اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَ اُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْۤ اُكُلَهَا
كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ
خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

اور جب فیصلہ ہو چکا ہوگا تو شیطان کہے گا: ''یقیناً اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، میں نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا، اور مجھے تم پر کوئی قابو تو تھا نہیں، سوائے اس کے کہ میں نے تم لوگوں کو بلایا اور تم نے میری بات قبول کر لی؛ لہٰذا مجھ کو ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی پر ملامت کرو، نہ میں تمہارا مددگار رہوں اور نہ تم میرے مددگار رہو، میں خود اس بات سے بیزار ہوں کہ تم نے اس سے پہلے مجھے خدا کا شریک ٹھہرایا تھا، یقیناً ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے'' ﴿۱﴾ ﴿۲۲﴾ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کئے، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ایسے باغات میں داخل کئے جائیں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ یہیں رہیں گے، وہاں ان کی آپسی ملاقات سلام کے ذریعہ ہوگی ﴿۲۳﴾ آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی ہے کہ اچھی بات ایک بار آور درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ گہرائی میں پیوست ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں ﴿۲۴﴾ وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتے ہیں؛ تاکہ لوگ خوب اچھی طرح سمجھ لیں ﴿۲۵﴾ اور بری بات کی مثال ایک خراب درخت کی سی ہے، جس کو زمین کے اوپر ہی سے اُکھاڑ لیا جائے، اس کو ذرا بھی ٹھہراؤ نہ ہو۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۶﴾

← ﴿۳﴾ یعنی ایمان کے بغیر کوئی اچھے سے اچھا عمل بھی آخرت میں انسان کے کام نہیں آئے گا، اگر غیر مسلم حضرات انسانی بھلائی کے کچھ کام کریں، تو ہوسکتا ہے کہ دنیا ہی میں ان کو کچھ فائدہ پہنچ جائے؛ لیکن آخرت میں اس کو کوئی نفع نہیں ہوگا۔

﴿۱﴾ گویا جہنم میں بھی ایمان سے محروم لوگوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کے درمیان بحث ومباحثہ اور جھگڑا برپا رہے گا اور اس طرح انھیں ذہنی تکلیف بھی پہنچتی رہے گی، پس باہمی جنگ وجدال اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور اتفاق واتحاد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس لئے دنیا میں بھی اختلاف سے بچنا چاہئے کہ یہ اہل جنت کا شیوہ نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی وہ درخت ناپائیدار ہوتا ہے اور اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں، ان دونوں مثالوں کے ذریعے قرآن نے اس بات کو ←

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ یُضِلُّ اللّٰهُ
الظّٰلِمِیْنَ ۙۛ وَ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ﴿۲۷﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا
قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا
عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَكُمْ اِلَی النَّارِ ﴿۳۰﴾ قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا
الصَّلٰوةَ وَ یُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر دنیا میں بھی ثابت قدم رکھتے ہیں اور آخرت میں بھی ، اللہ ظالموں کو گمراہی پر رہنے دیتے ہیں اور اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ﴿۱﴾ ﴿۲۷﴾ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کے احسان کے مقابلہ ناشکری کا رویہ اختیار کیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کی جگہ پہنچادیا ﴿۲﴾ ﴿۲۸﴾ یعنی جہنم ،جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے ! ﴿۲۹﴾ اور ان لوگوں نے اللہ کے لئے شریک ٹھہرا لئے ہیں ؛ تاکہ (لوگوں کو) اللہ کے راستہ سے ہٹادیں ، آپ کہہ دیجئے کچھ دن عیش کرلو پھر یقیناً تمہارا آخری ٹھکانہ دوزخ ہی ہے ﴿۳۰﴾ آپ میرے ان بندوں سے جو ایمان لا چکے ہیں کہہ دیجئے کہ اس دن کے آنے سے پہلے ، جس دن نہ کوئی خرید وفروخت ہو سکے گی اور نہ دوستی کام آئے گی ، نماز قائم کریں ، ہم نے جو کچھ ان کو عطا کیا ہے ، اس میں سے کچھ حصہ چھپا کر اور علانیہ خرچ کریں ۔ ﴿۳﴾ ﴿۳۱﴾

← واضح کیا ہے کہ جو بات خیر کی ہوتی ہے ، چاہے ابتدائی مرحلہ میں اس کے ماننے والے کم ہوں اور انھیں قوت حاصل نہ ہو ؛ لیکن اللہ تعالیٰ اسے پائیدار بناتے ہیں اور جس دعوت کی بنیاد فساد اور بگاڑ ہو ، چاہے ابتدائی مرحلہ میں طاقتور محسوس ہو ؛ لیکن اسے قرار حاصل نہیں ہوگا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ فکر یا اس فکر پر یقین رکھنے والا گروہ ختم ہوجاتا ہے ؛ اس لئے داعیان حق کو وقتی بے سروسامانی اور لوگوں کی بے توجہی سے گھبرانا نہیں چاہئے ؛ بلکہ اللہ پر یقین رکھنا چاہئے کہ بالآخر اسی دعوت کو کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوگی ۔

﴿۱﴾ ''القول الثابت'' (پکی بات) سے مراد کلمۂ توحید ''لا الہ الا اللہ'' ہے ، یہی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ، مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں بھی عقیدۂ توحید پر ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے ، قبر میں بھی جب سوال وجواب کا مرحلہ آتا ہے تو وہ عقیدۂ توحید پر ثابت قدم رہتا ہے ، (بخاری : عن براء بن عازبؓ ، کتاب الجنائز ، باب ماجاء فی عذاب القبر : ۱۳۰۳ ، وکذا کتاب التفسیر ، باب تفسیر سورۃ ابراہیم : ۴۴۲۲) —— اور آخرت کے حساب وکتاب کے وقت بھی وہ ان شاء اللہ ثابت قدم ہی رہے گا ۔ (تفسیر قرطبی : ۹/ ۳۶۳)

﴿۲﴾ یوں تو ایمان سے محروم لوگ ہر مرحلہ پر ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں سے فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں اور اس کا اقرار بھی نہیں کرتے ؛ لیکن سب سے بڑی ناشکری یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان بھیجے گئے اور وہ ان پر ایمان نہیں لائے ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی یہی تفسیر منقول ہے ۔ (قرطبی : ۹/ ۳۶۴)

﴿۳﴾ یعنی ہماری عطا کی ہوئی نعمتیں پوری کی پوری خیر کے کاموں میں خرچ نہ کرنا ؛ بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ؛ تاکہ اپنی ذات سے متعلق جو دوسرے حقوق ہیں انھیں بھی ادا کرسکیں ، اور جہاں علانیہ طور پر دینے میں غریبوں کی مصلحت ہو ، وہاں علانیہ طور پر دیں ، ورنہ خاموشی کے ساتھ دیں کہ اس میں زیادہ اخلاص ہے ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ سَخَّرَ
لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا
سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾ وَ اِذْ قَالَ ع ۵ ۱۷
اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ
اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾

اللہ وہی ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے پانی اُتارا ہے، پھر تمہاری روزی کے لئے اس سے پھل نکالے ہیں، نیز کشتیوں کو تمہارے قابو میں کر دیا ہے؛ تاکہ وہ اللہ کے حکم سے سمندر میں چلیں اور دریاؤں کو بھی تمہارے کام میں لگا دیا ہے ﴿۳۲﴾ اور تمہارے لئے سورج اور چاند بھی مسخر کر دیئے ہیں، جو مسلسل چکر لگا رہے ہیں، اور تمہارے لئے دن و رات کو بھی مسخر فرما دیا ہے ﴿۱﴾ ﴿۳۳﴾ اور جو کچھ تم نے مانگا اللہ نے تم کو ان میں سے عطا فرمایا ہے، اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے، یقیناً انسان بڑا نا انصاف اور نہایت ناشکرا ہے ﴿۳۴﴾ وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے جب ابراہیم نے کہا: ''اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن کی جگہ بنا دیجئے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بُت پرستی سے بچائے رکھئے ﴿۲﴾ ﴿۳۵﴾ اے میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، تو جو میری پیروی کرے، وہی میرا ہے اور جس نے میری بات نہیں مانی تو یقیناً آپ بہت معاف کرنے والے اور بڑے ہی مہربان ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۳۶﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں تمہارے اردگرد ہیں، تمہاری کسی محنت کے بغیر آسمان سے بارش ہوتی ہے، زمین سے پھل نکلتے ہیں، دریا میں پتھر کا ٹکڑا پھینک دیا جائے تو ڈوب جاتا ہے؛ لیکن بڑی بڑی کشتیاں انسان کے کنٹرول کے ساتھ چلتی رہتی ہیں، ندیاں مسلسل انسان کی خدمت میں مشغول ہیں، جو پائپ لائن کا کام کرتی ہیں، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی پہنچائے جانے میں لگی ہوئی ہیں، سورج اور چاند مسلسل گردش میں ہیں، جس سے وقت معلوم ہوتا ہے اور موسموں کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اتنی ساری نعمتیں نگاہوں کے سامنے ہیں، پھر بھی انسان خدا کا اقرار نہ کرے، تو اس سے زیادہ افسوس ناک بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

﴿۲﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعاء مکہ مکرمہ سے متعلق ہے؛ کیوں کہ مکہ اس وقت ایک ایسا صحرا تھا، جہاں کوئی انسانی آبادی موجود نہیں تھی اور ایسی جگہیں عام طور پر امن سے محروم ہوتی ہیں، یہ دُعاء اس شان سے پوری ہوئی کہ زمانہ جاہلیت میں بھی مکہ ایک پُرامن جگہ تھی، یہاں تک کہ کوئی شخص اگر اپنے باپ کے قاتل کو بھی یہاں دیکھ لیتا تو اپنی نگاہ کو جھکا لیتا، دوسری دُعاء یہ فرمائی کہ میری اولاد کو بُت پرستی سے بچائے رکھئے، اس میں اولاد سے آپ کی صلبی اولاد مراد ہے؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے اور یہ سب کے سب توحید پر قائم رہے، کوئی بت پرستی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ (تفسیر قرطبی: ۹/ ۳۶۸) ←

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِیْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ فِی
الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ
لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ ۖۗ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا
اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع ۶ / ۱۸

میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو آپ کے قابل احترام گھر کے پاس ایک ناقابل کاشت وادی میں آباد کردیا ہے، ہمارے پروردگار! یہ اس لئے کہ وہ نماز قائم کریں؛ لہٰذا آپ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردیجئے اور انھیں کھانے کے لئے پھل عنایت کیجئے؛ تاکہ وہ شکر گزار ہوں ﴿۱﴾ ﴿۳۷﴾ اے ہمارے پروردگار! ہم خواہ چھپائیں یا ظاہر کریں، آپ سب جانتے ہیں اور اللہ پر زمین وآسمان کی کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی ﴿۳۸﴾ ساری تعریف اسی خدا کے لئے ہے، جس نے بوڑھاپے میں مجھے اسماعیل واسحاق سے نوازا، بے شک میرے پروردگار دُعاؤں کو سننے والے ہیں ﴿۳۹﴾ میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا رکھئے، اے ہمارے پروردگار! اور ہماری دُعاء قبول کرلیجئے ﴿۴۰﴾ پروردگارا! جس روز حساب وکتاب قائم ہو، اس دن مجھ سے، میرے والدین سے اور تمام ایمان والوں سے درگزر فرمادیجئے''۔ ﴿۲﴾ ﴿۴۱﴾

← ﴿۲﴾ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شفقت بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے گنہگاروں کے لئے بھی اشارۃً اللہ تعالیٰ سے عفو ودرگزر کی گذارش کی، نیز آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو میری بات نہ مانے وہ دوزخی ہیں؛ بلکہ کہا کہ آپ معاف کرنے والے اور مہربان ہیں، معلوم ہوا کہ جب تک کسی کی موت کفر پر نہ ہوجائے، ہمیں حق نہیں کہ اس کے دوزخی ہونے کا فیصلہ کردیں۔

﴿۱﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعاء سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو مساجد اور دینی مدارس کے قریب آباد ہونا چاہئے؛ تاکہ دین سے ان کا رشتہ استوار رہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیوی ضرورتوں کی دُعاء کرنا تقویٰ اور توکل کے خلاف نہیں ہے؛ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھلوں کے لئے دُعاء فرمائی اور یہ سبق بھی ملا کہ دُعاء کرتے ہوئے صرف مادی ضرورتیں ہی انسان کے سامنے نہ ہوں؛ بلکہ دینی ضرورت بھی پیش نظر رہے؛ چنانچہ آپ نے پہلے ان کے لئے نماز کی دُعاء فرمائی؛ بلکہ ان دونوں سے پہلے یہ دُعاء فرمائی کہ لوگوں میں کعبۃ اللہ کی عظمت پیدا ہو؛ کیوں کہ جب کعبۃ اللہ کی عظمت پیدا ہوگی تو جو یہاں رہنے والے ہیں، ان کی عظمت بھی دلوں میں ہوگی، دوسرے یہ کہ جب لوگ اس مقام کی طرف متوجہ ہوں گے اور ان کی آمد ورفت ہوگی تو قابل کاشت نہ ہونے کے باوجود یہاں لوگوں کی آمد ورفت ہوتی رہے گی اور اس کی وجہ سے کھانے پینے کی اشیاء بھی مہیا ہوتی رہیں گی؛ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعاء اس شان کے ساتھ قبول ہوئی کہ مکہ مکرمہ میں نہ کھیتیاں ہیں اور نہ باغات؛ لیکن پوری دنیا کی عمدہ ترین غذاؤں اور اچھے اور تازہ پھلوں کا لگا انبار رہتا ہے۔ ←

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ
الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾
وَاَنْذِرِ النَّاسَ یَوْمَ یَاْتِیْهِمُ الْعَذَابُ فَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ
نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾
وَّسَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا
لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ
مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

اللہ کو ان ظالموں کے عمل سے بے خبر خیال نہ کیجئے ، یقیناً اللہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہے ہیں ، جس دن آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی ﴿۴۲﴾ وہ دوڑ رہے اور سر اُٹھائے ہوئے ہوں گے ، ان کی طرف ان کی نگاہ واپس نہ آسکے گی اور دل بالکل بدحواس ہوں گے ﴿۱﴾ ﴿۴۳﴾ نیز آپ لوگوں کو اس دن سے ڈرایئے ، جس دن اُن پر عذاب آئے گا ، جن لوگوں نے زیادتی کی تھی ، وہ کہیں گے : ''اے ہمارے پروردگار ! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لئے مہلت دیجئے ، ہم آپ کی دعوت قبول کریں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے'' (اللہ فرمائیں گے) : کیا تم نے پہلے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تمہیں دنیا سے کہیں اور جانا ہی نہیں ہے ؛ ﴿۴۴﴾ حالاں کہ تم ان ہی لوگوں کی بستیوں میں آباد تھے ، جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا اور ہم نے تم سے مثالیں بھی بیان کی تھیں ؟ ﴿۴۵﴾ ان لوگوں نے اپنی چالبازیاں کرلیں اور ان کی چالیں اللہ کے سامنے ہی تھیں ، واقعی ان کی چال ایسی تھی کہ اس سے پہاڑ بھی ٹل جائیں ﴿۴۶﴾ تم ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کریں گے ، بے شک اللہ غالب اور بدلہ لینے والے ہیں ۔ ﴿۴۷﴾

← ﴿۲﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد آذر کی موت کفر کی حالت میں ہوئی اور کافر کے لئے دُعاء مغفرت نہیں کی جاسکتی ؛ بظاہر اِس دُعاء کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافر والدین کے لئے دُعاء سے منع نہیں کیا گیا تھا ، (مفاتیح الغیب : ۹/۳۶۳) —— لیکن اب چوں کہ اس کی ممانعت ہو چکی ہے ؛ اس لئے کسی ایسے شخص کے لئے نماز جنازہ ، دُعاء مغفرت یا ایصالِ ثواب جائز نہیں ، جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کی موت کفر کی حالت میں ہوئی ہے ۔ (سورۂ توبہ : ۱۱۳)

﴿۱﴾ یعنی مارے خوف کے آنکھیں جھپکی بھی نہ لے سکیں گی ، ان پر بدحواسی کی کیفیت طاری رہے گی ۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ وَتَرَى
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّ تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ
وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع ۱۱/۱۹

جس دن زمین بدل کر دوسری زمین بنادی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیئے جائیں گے، اور سب کے سب قہر وغلبہ والے خدائے واحد کے سامنے پیش ہوں گے ﴿۱﴾ ﴿۴۸﴾ اس روز آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۴۹﴾ ان کے کرتے تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ لپٹ رہی ہوگی؛ ﴿۵۰﴾ تاکہ اللہ ہر شخص کو اس کی حرکتوں کی سزا دے دیں، بے شک اللہ بہت جلدی حساب لینے والے ہیں ﴿۵۱﴾ یہ لوگوں کے لئے ایک اعلان ہے اور اس لئے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ڈرایا جائے اور تاکہ معلوم ہوجائے کہ یقیناً ایک ہی خدا ہے، نیز اس لئے کہ سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔ ﴿۵۲﴾

﴿۱﴾ زمین کو بدل کر دوسری زمین بنائے جانے سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کی دو رائیں ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ اصل زمین تو باقی رہے گی؛ لیکن اس کی صفات بدل دی جائیں گی، پہاڑ اور غار سب مسطح ہوجائیں گے اور پوری زمین ایک میدان کی شکل اختیار کرلے گی؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جیسے چمڑے کو کھینچ دیا جائے، تو اس میں کہیں اُبھار اور کہیں گہرائی باقی نہیں رہتی، اسی طرح زمین ہموار اور برابر ہوجائے گی، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے، دوسری رائے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس زمین کی جگہ ایک دوسری زمین پیدا کی جائے گی، جو چاندی کی ہوگی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ منقول ہے؛ چنانچہ مسلم میں حضرت سہل ابن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ ایک ایسی زمین پر جمع کئے جائیں گے، جو میدے کی طرح سفید ہوگی اور اس میں کسی چیز کا کوئی نشان تک نہ ہوگا (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۹/ ۳۸۳-۳۸۴) علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا رجحان اسی دوسری رائے کی طرف ہے، —— اور آسمان کی تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ تارے بکھر جائیں گے، سورج لپیٹ دیا جائے گا اور چاند بے نور ہوجائے گا، (مفاتیح الغیب: ۹/ ۳۷۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آسمان سونے کا بنادیا جائے گا؛ تاہم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جس حدیث کا اوپر ذکر آیا ہے، اس میں یہ ہے کہ پہلے تو زمین چمڑے کی طرح برابر اور مسطح ہوجائے گی، پھر ایک جھٹکا آئے گا، تو انسان اپنے آپ کو اسی طرح کی دوسری جگہ میں پائے گا: ''ثم يزجر الله الخلق زجرة فإذا هم فى الثانية فى مثل مواضعهم من الأولى'' (قرطبی: ۹/ ۳۸۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں دو مرحلے ہوں گے، پہلے مرحلے میں زمین کی صفت تبدیل ہوگی اور اسے مسطح کردیا جائے گا، اور دوسرے مرحلہ میں اصل زمین ہی تبدیل کردی جائے گی، واللہ اعلم —— علامہ رازی رحمہ اللہ نے اپنی ایک خاص رائے کا اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ زمین کو بدل کر دوزخ بنادیا جائے اور آسمان کو بدل کر جنت۔ (مفاتیح الغیب: ۹/ ۳۸۳)

﴿۲﴾ اگر ایک زنجیر میں کئی لوگ جکڑے ہوئے ہوں تو زنجیروں کا گھیرا اور تنگ ہوجاتا ہے اور تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

سُوۡرَۃُ الۡحِجۡر

- سورہ نمبر : (۱۵)
- رکوع : (۶)
- آیتیں : (۹۹)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

حجر مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی کا نام تھا، جس میں قومِ ثمود آباد تھی، اس صورت میں چوں کہ اس واقعہ کا بھی ذکر آیا ہے؛ اس لئے اس کو سورۃ حجر کا نام دیا گیا۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اللہ تعالیٰ کی توحید پر کائنات کی نشانیوں سے استدلال کیا گیا ہے، قیامت اور قیامت کے بعد کے احوال ذکر کئے گئے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعہ کے علاوہ قومِ لوط، قوم شعیب اور قوم ثمود کے افکار وعقائد اور اور بالآخر ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر فرمایا گیا ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اہل مکہ کی سرکشی سے گھبرائیں نہیں کہ اس طرح کے واقعات گذشتہ انبیاء کو بھی پیش آتے رہے ہیں۔

○ ○ ○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ۝۱

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ۝۲ ذَرۡہُمۡ یَاۡکُلُوۡا وَ یَتَمَتَّعُوۡا وَ یُلۡہِہِمُ الۡاَمَلُ

فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ۝۳ وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا وَ لَہَا کِتَابٌ مَّعۡلُوۡمٌ ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں۝ الف، لام، را، ﴿۱﴾ ۝۱ یہ کامل کتاب اور واضح قرآن کی آیتیں ہیں ﴿۲﴾ ۝۲ کفر کرنے والے بار بار تمنا کریں گے کہ کاش، وہ مسلمان ہوتے! ﴿۳﴾ ۝۳ انھیں چھوڑ دیجئے کہ کھالیں، مزے اُڑا لیں اور (بے جا) اُمیدیں ان کو غفلت میں ڈالے رہیں، پھر عنقریب ہی (مرنے کے بعد) ان کو حقیقت معلوم ہوجائے گا ﴿۴﴾، اور جس بستی کو بھی ہم نے تباہ و برباد کیا ہے، اس کے بارے میں (پہلے سے) لکھا ہوا مقرر تھا۔ ۝۴

﴿۱﴾ ان کو حروف مقطعات کہا جاتا ہے، جس کی وضاحت سورۂ بقرہ حاشیہ نمبر: ۱ میں گزر چکی ہے۔

﴿۲﴾ یہاں قرآن مجید کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں، ایک اس کا کامل و مکمل ہونا؛ کیوں کہ اس میں زندگی کے تمام مسائل کی رہنمائی کی گئی ہے، بعض مسائل میں اس کی جزئیات و تفصیلات کو بھی بیان کردیا گیا ہے اور بعض میں بنیادی اُصول و قواعد بیان کردیئے گئے ہیں، دوسرے: اس کا واضح ہونا، واضح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دین کے بنیادی اُصولوں کو اور ان چیزوں کو جن پر نجات کا مدار ہے، اس طور پر بیان کردیا گیا ہے کہ اس میں کوئی ابہام اور التباس نہیں ہے، مثلاً عقیدۂ توحید کا ذکر انجیل میں بھی ہے؛ لیکن محبت و شفقت کے اظہار کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹے کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو اس بات کا موقع مل گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے بندے سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنادیا جائے، یا ہندو مذہب کی کتابوں میں جنت و دوزخ اور آخرت کا تذکرہ موجود ہے؛ لیکن اس کی تعبیر میں ابہام کی وجہ سے کچھ لوگوں کو اس بات کا موقع فراہم ہوگیا کہ انھوں نے جزاء و سزا کے لئے آواگون کا تصور گھڑ لیا کہ دنیا ہی میں انسان مختلف روپ میں پیدا ہوتا رہے گا، قرآن مجید نے توحید و آخرت کے مضامین کو اتنے واضح اور بے غبار الفاظ میں بیان کردیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس میں اس طرح کی معنوی تبدیلیاں کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔

﴿۳﴾ عربی زبان میں ربما کے معنی کم کے بھی آتے ہیں اور زیادہ کے بھی، یہاں زیادہ کے معنی ہیں: ''... وقد تستعمل فی الکثیر أی یود الکفار فی أوقات کثیرہ لو کانوا مسلمین'' (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱) اسی لئے ترجمہ کیا گیا ''کفر کرنے والے بار بار تمنا کریں گے''۔

﴿۴﴾ معلوم ہوا کہ دنیا کے اسباب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کی حرص انسان کو تباہ و برباد کردیتی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چار باتیں بدنصیبی کی علامت ہیں، آنکھوں کا جم جانا یعنی اپنے گناہوں پر انسان کو رونا نہ آئے، دل کا سخت ہوجانا، خواہشات کے سلسلے کا دراز ہوجانا اور دنیا کی حرص و طمع (مسند بزاز، حدیث نمبر: ۶۴۴۲)؛ اس لئے ایک مسلمان کو ہمیشہ اپنی کیفیت کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ کہیں دنیا کی لالچ نے اسے آخرت سے غافل تو نہیں کردیا ہے؟

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵ وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ
اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا
بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹ وَ لَقَدْ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۰ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۱
كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۲

کوئی گروہ اپنی مقررہ مدت سے نہ آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ پیچھے رہ سکتا ہے ۝۵ اور کفر کرنے والے کہتے ہیں: ’’اے وہ شخص جس پر قرآن اُتارا گیا ہے! تم تو دیوانہ ہو ۝۶ اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتے ؟‘‘ ۝۷ ہم فرشتوں کو فیصلہ کے ساتھ ہی اُتارتے ہیں، اور اس وقت ان کو مہلت بھی نہیں ملتی ﴿۱﴾ ۝۸ ہم ہی نے قرآن اُتارا ہے اور یقیناً ہم خود اس کے نگہبان ہیں ﴿۲﴾ ۝۹ ہم آپ سے پہلے گذشتہ قوموں میں بھی پیغمبر بھیج چکے ہیں ۝۱۰ جب بھی ان کے پاس کوئی پیغمبر آتا، وہ ان کا مذاق ہی اُڑاتے تھے ۝۱۱ اسی طرح ہم گنہگاروں کے دلوں میں (بے توفیقی کی وجہ سے) مذاق اُڑانا ڈال دیتے ہیں۔ ۝۱۲

﴿۱﴾ مکہ والے رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی تصدیق کے لئے فرشتے کیوں نہیں لے آتے؟ اس کا جواب دیا گیا کہ جب فرشتے اُتار دیئے جاتے اور پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے، تو پھر تو ان پر عذاب نازل کر دیا جاتا، انھیں کوئی مہلت نہیں ملتی اور ان کا نام ونشان تک مٹ جاتا؛ جب کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے کہ ان ہی کی نسلوں سے دین حق کی حفاظت اور سربلندی کا کام لیا جائے۔

﴿۲﴾ گذشتہ آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان اُمتوں کو سپرد کی گئی تھی ’’... بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ‘‘ (المائدۃ: ۴۴) مگر وہ لوگ اس کی حفاظت نہیں کر پائے، قرآن مجید سے چوں کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کی ہدایت متعلق ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت خود اپنے ذمہ رکھی ہے، قرآن مجید کی حفاظت میں الفاظِ قرآنی کی بھی حفاظت شامل ہے اور معانی قرآن کی بھی، حافظوں اور قاریوں کے ذریعے الفاظ کی حفاظت ہوئی اور محدثین اور فقہاء کے ذریعہ معانی کی حفاظت ہوئی، قرآن مجید کے معانی ومقاصد کو جاننے کا بنیادی ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں ہیں: لہٰذا قرآن مجید کی حفاظت کے وعدہ میں حدیث کی حفاظت بھی شامل ہے —— اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن مجید کے کچھ اجزاء ضائع کر دیئے گئے تو یہ خود قرآن مجید کا انکار ہونے کی وجہ سے کفر ہے (الملل والنحل لابن حزم: ۳/ ۱۸۲) اور اگر کوئی شخص پورے ذخیرۂ حدیث کو غیر محفوظ خیال کرتے ہوئے اس کے دلیل وحجت ہونے سے انکار کر دے، تو یہ سخت گمراہی ہے؛ کیوں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان کو پکڑے رہو گے، گمراہ نہ ہو گے، (مستدرک حاکم: ۱/ ۹۳، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۳۱۸) اسی طرح اگر قرآن مجید کی کسی آیت کا ایسا مفہوم بیان کیا جائے، جو لفظ کے ظاہری معنی سے بالکل ہٹا ہوا ہو اور جو سلفِ صالحین کی تشریح و وضاحت سے بالکل الگ ہو، جیسا کہ قادیانیوں، شیعوں اور بعض منکرین حدیث کی طرف سے کہا جاتا ہے، تو یہ سخت گمراہی اور قرآن مجید میں معنوی تحریف کی کوشش ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا
فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَلَقَدْ ع ۱۵ ۱
جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا
مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے، گذرے ہوئے لوگوں کی بھی یہی روش رہی ہے ﴿۱۳﴾ اور اگر ہم ان پر آسمان کا دروازہ کھول دیں، پھر یہ سارا دن اس میں چڑھتے رہیں ﴿۱۴﴾ تب بھی کہیں گے: ہماری نظر بندی کردی گئی ہے؛ بلکہ ہم لوگوں پر تو جادو کردیا گیا ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۵﴾ ہم نے آسمان میں ستارے بنادیئے ہیں اور ان کو دیکھنے والوں کے لئے آراستہ کردیا ہے، ﴿۲﴾ ﴿۱۶﴾ اور ہم نے ہر دھتکارے ہوئے شیطان سے اس کو محفوظ رکھا ہے، ﴿۱۷﴾ سوائے اس کے جو چوری چھپے سن لے؛ کہ چمکتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۸﴾

﴿۱﴾ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور دلداری ہے کہ مکہ والوں کے مذاق اُڑانے، ان کے دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے اور طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرنے کی وجہ سے آپ رنجیدہ نہ ہوں؛ کیوں کہ یہ سب کچھ گذشتہ پیغمبروں کے ساتھ بھی ان کی قوموں کی جانب سے ہوتا رہا ہے، نیز یہ خیال بھی نہ ہونا چاہئے کہ اگر ان کا مطلوبہ معجزہ پورا کردیا جاتا تو وہ ایمان لے آتے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی کیفیت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اگر ان کے طلب کئے ہوئے معجزے سے بڑھ کر بھی کوئی معجزہ ظاہر کردیا جاتا، جیسے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے اور سیڑھیاں بنادی جاتیں اور یہ خود ان سیڑھیوں پر چڑھتے، تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔

﴿۲﴾ عربی زبان میں 'بروج' کے مختلف معنی ہیں، مشہور مفسرین حسن رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے بروج سے ستارے مراد لئے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۹) اور سماء کے اصل معنی بلند چیز کے ہیں؛ اس لئے سماء سے وہ مستقل عالم بھی مراد لیا جاسکتا ہے، جس کو ہم آسمان کہتے ہیں اور وہ فضاء بھی مراد لی جاسکتی ہے جو آسمان کے نیچے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ''سماء'' سے پاک پانی اُتارا ہے: ''وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا'' (الفرقان: ۴۸) یہاں 'سماء' سے مراد بادل ہے؛ کیوں کہ پانی بادل سے برستا ہے اور یہ بادل فضاء میں ہوتا ہے، یہاں بھی یہی دوسرا معنی مراد ہے، یعنی ہم نے فضاء میں ستارے بنادیئے ہیں، جن کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی شیطان کو تو اللہ تعالیٰ نے آسمان ہی میں رہائش اختیار کرنے کی عزت بخشی تھی؛ لیکن اس کو یہ عزت راس نہیں آئی؛ چنانچہ اسے ایسا دھتکاردیا گیا کہ اب اس کو آسمان پر آنے کی بالکل اجازت نہیں، اگر وہ کبھی آسمان کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو چمکتے ہوئے انگارے اس کا استقبال کرتے ہیں، ان ہی انگاروں کو یہاں ''شہابِ مبین'' اور کہیں ''شہاب ثاقب'' (الصافات: ۱۰) سے تعبیر کیا گیا ہے، اِس کا تعلق آسمان کی اَن دیکھی اور غیبی دنیا سے ہے، عوام میں جن کو ''شہاب ثاقب'' کہا جاتا ہے، وہ دراصل فضاء میں چکر کھانے والے بڑے بڑے وزنی پتھر ہیں، جو ہوا کی رگڑ سے روشن ہوجاتے ہیں اور کبھی ٹوٹ کر زمین پر گر پڑتے ہیں، یہ وہ شہابِ ثاقب نہیں ہیں، جو آسمان پر شیطان کو بھگانے کے لئے پھینکے جاتے ہیں۔ (دیکھئے: تفسیر ماجدی: ۳/۳۰۷ حاشیہ نمبر: ۱۵)

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَ جَعَلْنَا
لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا
نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ
وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا
الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے، اس میں پہاڑ ڈال دیئے ہیں اور اس میں ہر چیز ایک مناسب مقدار میں اُگائی ہے، ﴿۱۹﴾
اور ہم نے اس میں تمہارے لئے بھی اور ان چیزوں کے لئے بھی جن کو تم روزی فراہم نہیں کرتے، روزی کا سامان
مہیا کر دیا ہے، ﴿۲۰﴾ اور جتنی بھی چیزیں ہیں، ہمارے پاس ان کے خزانے موجود ہیں، ہم ان کو ایک مقررہ مقدار کے
مطابق اُتارتے رہتے ہیں، ﴿۲۱﴾ اور ہم ہی (پانی سے) بوجھل ہوائیں چلاتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں،
پھر تم کو وہ پانی پلاتے ہیں؛ حالاں کہ تم اس کو جمع کر کے نہیں رکھتے، ﴿۱﴾ ﴿۲۲﴾ ہم ہی زندگی عطا کرتے ہیں اور موت
سے دوچار کرتے ہیں، اور ہم ہی باقی رہ جانے والے ہیں ﴿۲۳﴾ ہم تم میں اگلوں سے بھی واقف ہیں اور پچھلوں سے
بھی۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾

﴿۱﴾ یعنی دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں، ان کے لئے غذا، پانی، لباس اور مکان سب کا انتظام اللہ کی طرف سے ہوتا ہے؛ چنانچہ زمین کو اس طرح پھیلا دیا گیا کہ اس پر رہائش آسان ہو جائے، اگر پوری زمین پہاڑوں اور وادیوں پر مشتمل ہوتی تو مکانات کی تعمیر کس قدر دشوار ہوتی؟ پھر انسان اور دوسری مخلوقات جیسے جانور وغیرہ کی غذا کے لئے مناسب مقدار میں غذائی پیداوار ہوتی ہے، اگر ایک ہی ساتھ دس سال کی پیداوار ہو جاتی تو اتنے بڑے بڑے گدام کہاں سے آتے، جن میں غذائی اشیاء رکھی جائیں؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پانی عطا فرمایا گیا، اگر ہر شخص سے کہا جاتا کہ سال بھر کا پانی برسات ہی میں جمع کر لے، تو انسان کے لئے پانی کے لئے اتنا بڑا مخزن بھی بنانا دشوار ہوتا اور اس کو جراثیم اور آلودگی سے بچانا بھی مشکل ہوتا؛ لیکن زمین کی تہہ میں اور برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پانی کا اس طرح ذخیرہ کر دیا گیا کہ سال بھر انسان کی ضرورت بھی پوری ہوتی رہتی ہے اور وہ مضر جراثیم اور آلودگی سے بھی محفوظ رہتا ہے، انسان اس طرح پانی محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت اور اس کے رحم وکرم کی جھلکیاں ہے —— قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور قدرتوں کا بار بار اس لئے ذکر کرتا ہے کہ اکثر قوموں میں یہی بات شرک کا باعث بنتی رہی ہے کہ انھوں نے سوچا کہ اتنے سارے کام تنہا ایک خدا کیسے کر سکتا ہے؟ اس لئے انھوں نے ہر کام کے لئے الگ الگ دیوتاؤں اور دیویوں کو گھڑ لیا، قرآن مجید نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ ان تمام کاموں کو خود انجام دیتے ہیں؛ اس لئے اس کو کسی شریک اور ساجھی کی ضرورت نہیں۔

﴿۲﴾ یعنی جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں، ہم ان سے بھی واقف ہیں اور جو آئندہ پیدا ہوں گے، وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔

ع ۲/۲

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ
حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ
فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ
السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ
لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے پروردگار سب کو اکٹھا کریں گے، یقیناً اللہ بہت حکمت والے اور بڑے علم والے ہیں ﴿۲۵﴾ اور ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا ہے ﴿۱﴾ ﴿۲۶﴾ اور جنات کو لو کی آگ سے بنایا ہے، ﴿۲﴾ ﴿۲۷﴾ اور وہ وقت بھی یاد کئے جانے کے لائق ہے، جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں انسان کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کرنے والا ہوں، ﴿۲۸﴾ پھر جب میں اس کو پورا بنالوں اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونک دوں ﴿۳﴾ تو تم اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا؛ ﴿۲۹﴾ چنانچہ تمام فرشتے ایک ساتھ سجدہ میں گر پڑے، ﴿۳۰﴾ سوائے ابلیس کے، کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کردیا، ﴿۳۱﴾ اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا؟ ﴿۳۲﴾ ابلیس نے کہا: مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ایک ایسے انسان کو سجدہ کروں، جس کو آپ نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا فرمایا ہے۔ ﴿۳۳﴾

﴿۱﴾ قرآن مجید میں یہ بات بار بار آئی ہے کہ انسان کا اصل مادۂ تخلیق مٹی ہے، پھر اس مٹی پر جو مرحلے گزرے ہیں، مختلف جگہ اس کو ذکر فرمایا گیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اول مرحلہ میں یہ مٹی گیلی تھی: ''اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ'' (الصافات:۱۱) صرف گیلی ہی نہیں تھی؛ بلکہ اس میں سڑن بھی پیدا ہوگئی تھی، پھر وہ اس طرح خشک ہوگئی کہ اس سے آواز پیدا ہونے لگی، (الرحمٰن:۱۴) جیسا کہ مٹی کے سوکھے ہوئے برتنوں میں کھنکھناہٹ ہوتی ہے، یہاں اسی مرحلہ کا ذکر ہے۔

﴿۲﴾ ''نارسموم'' سے مراد ایسی آگ ہے، جس میں دھواں نہ ہو، جنوں کی پیدائش اسی طرح کی آگ سے ہوئی ہے، قرآن مجید میں ایک اور موقع پر بھی اس کا ذکر آیا ہے ''وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ''۔ (الرحمٰن:۱۵)

﴿۳﴾ جو چیز بنائی جاتی ہے، بنانے والے کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے، اسی طرح جو چیز کسی کی ملکیت ہوتی ہے، اس کو مالک کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلاں کمپنی کا جوتا، یا فلاں شخص کی گاڑی، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جوتا اس کمپنی کا یا گاڑی اس شخص کا جزو ہے، اسی طرح ''من روحی'' کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی روح، نہ یہ کہ انسان میں پھونکی جانے والی روح، نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کے وجود کا حصہ ہے، قرآن مجید میں ایک اور موقع پر حضرت مسیح کے بارے میں جو ''کلمة الله و روح منه'' (النساء:۱۷۱) کے الفاظ آئے ہیں، وہاں بھی یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ کے واسطہ کے بغیر براہ راست ان کی روح پیدا فرمائی۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ
فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾
قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ
مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ
سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾

اللہ نے حکم دیا: اچھا، یہاں سے نکل جا؛ کہ تو دُھتکارا ہوا ہے، ﴿۳۴﴾ اور تجھ پر قیامت کے دن تک پھٹکار رہے گی ﴿۱﴾ ﴿۳۵﴾
ابلیس نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! مجھے اس دن تک مہلت دیجئے، جب لوگ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، ﴿۳۶﴾
اللہ نے فرمایا: تجھے مقررہ وقت کے دن تک مہلت دی جاتی ہے، ﴿۳۷﴾ ﴿۳۸﴾ ابلیس نے کہا: اے میرے پروردگار! جیسے
آپ نے مجھے ہدایت سے محروم کردیا ہے، میں اُن کے لئے زمین میں (آپ کی نافرمانی کو) خوب خوشنما بنادوں گا
اور —— آپ کے منتخب بندوں کے سوا —— سبھوں کو بہکاؤں گا، ﴿۳۹﴾ ﴿۴۰﴾ اللہ نے فرمایا: یہ مجھ تک (پہنچنے کا) سیدھا
راستہ ہے، ﴿۴۱﴾ یقیناً تیری پیروی کرنے والے گمراہوں کے سوا میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ ﴿۲﴾ ﴿۴۲﴾

﴿۱﴾ ابلیس کو چوں کہ فرشتوں کے ساتھ رکھا گیا تھا؛ اس لئے جو احکام فرشتوں کو دیئے جاتے تھے، ان میں وہ بھی شامل ہوتا تھا اور شیطان اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا کہ شیطان کو سجدہ کرنے کا حکم خود اس سے بھی متعلق ہے؛ اسی لئے تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا، سجدہ کرنے میں اپنے تواضع کا اظہار ہوتا ہے اور جس کو سجدہ کیا جاتا ہے، اس کی بڑائی کا اعتراف ہوتا ہے؛ نیز کسی مخلوق کو بہتر اور کمتر قرار دیا جانا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت پر ہے، جیسے ایک مکان بنانے والا اینٹیں خریدتا ہے، وہ کچھ اینٹوں کو اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتا ہے اور کچھ کو اپنے بیت الخلاء اور حمام کی، اینٹوں کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ مکان بنانے والا ان کے درمیان اس طرح کی ناانصافی کیوں کر رہا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے بلندی عطا کردیں، اس لئے شیطان کا اعتراض بے جا تھا، شیطان نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہے —— اس میں سبق ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم آجائے تو انسان کو کج بحثی اور بحث ومباحثہ سے بچنا چاہئے اور کسی حکم کی حکمت ومصلحت سمجھ میں آئے یا نہیں؟ اس کو قبول کرنا چاہئے۔

﴿۲﴾ یعنی شیطان نے دُھتکارے جانے کے بعد بھی بارگاہِ خداوندی میں گذارش پیش کی کہ اس کو لوگوں کو گمراہ کرنے کی طاقت دی جائے، اللہ تعالیٰ نے اس کی اس درخواست کو قبول فرمایا؛ لیکن بتادیا کہ میرے حقیقی بندوں پر تیرا زور نہیں چلے گا، اس میں ایک سبق تو یہ ہے کہ انسان کو کبھی شیطان کے فریب سے مطمئن نہیں ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اس میں انسان کو بہکانے کی خاص صلاحیت رکھی گئی ہے، دوسرے: اللہ تعالیٰ کی مہربانی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے دُھتکارے جانے کے بعد بھی شیطان کی دُعاء قبول فرمائی —— گویا دُعاء قبول کئے جانے کے لئے انسان کا نیک وصالح ہونا ضروری نہیں، اللہ تعالیٰ گنہگاروں کی دُعاء بھی قبول فرماتے ہیں۔

ع ۳/۱۹/۳

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝۴۳ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝۴۴
اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝۴۵ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ۝۴۶ وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ
غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ۝۴۷ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ۝۴۸
نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝۴۹ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ۝۵۰ وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ
ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ ۝۵۱ اِذْ دَخَلُوْا عَلَیْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ۝۵۲ قَالُوْا لَا وقف لازم
تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ ۝۵۳

اور یقیناً تمام گمراہوں کے لئے دوزخ کا وعدہ ہے،۝۴۳ دوزخ کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے کافروں کا ایک حصہ مقرر ہے،﴿۱﴾ ۝۴۴ کوئی شبہ نہیں کہ گناہ سے بچنے والے باغات اور چشموں میں ہوں گے،۝۴۵ (ان سے کہا جائے گا:) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان جنت میں داخل ہو جاؤ۝۴۶ ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش ہوگی، ہم اسے نکال دیں گے، بھائی بھائی ہو جائیں گے اور آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے،﴿۲﴾ ۝۴۷ ان کو وہاں کوئی تکلیف چھوئے گی بھی نہیں، اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے،۝۴۸ میرے بندوں کو آگاہ کر دیجئے کہ میں بہت درگذر کرنے والا اور نہایت مہربان ہوں،۝۴۹ اور یقیناً میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے،۝۵۰ اور ان کو ابراہیم کے مہمان کا حال سنا دیجئے،۝۵۱ جب یہ مہمان ان کے پاس آئے تو ''سلام'' کیا،﴿۳﴾ ابراہیم نے کہا: ہم کو تو تم سے ڈر لگ رہا ہے،۝۵۲ انھوں نے کہا: آپ ڈریں نہیں، ہم تو آپ کو ایک صاحبِ علم بیٹے کی خوشخبری سناتے ہیں۔۝۵۳

﴿۱﴾ یعنی یہ سات دروازے سات درجات کے لئے ہوں گے اور یہ درجات اوپر نیچے ہوں گے، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ منافقین 'درک اسفل' یعنی جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے، (النساء: ۱۴۵) نیز ہر منزل میں جہنمیوں کا داخلہ ان کے اعمال کے لحاظ سے ہوگا، کسی میں گنہگار اہل توحید ہوں گے، کسی میں مشرکین کی کوئی خاص قسم ہوگی، جیسے نیکیوں کے اعتبار سے جنت والوں کے درجات ہوں گے، اسی طرح گناہوں کے اعتبار سے دوزخ والوں کے درجات ہوں گے۔

﴿۲﴾ یعنی جو لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے، ان کو ہر طرح کی جسمانی راحتیں تو حاصل ہوں گی ہی، قلبی سکون بھی حاصل ہوگا، اگر کسی انسان کو اپنے متعلقین کی طرف سے کدورت ہو تو اس سے بھی اسے تکلیف ہوتی ہے، دل بے سکون رہتا ہے؛ اس لئے اگر ان کے درمیان دنیا میں کدورتیں بھی رہی ہوں تو آخرت کے اندر ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل پاک صاف ہوں گے اور وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے۔

﴿۳﴾ لفظی معنی ہیں ''تو ان لوگوں نے کہا سلام'' مراد یہ ہے کہ فرشتوں نے (جو انسانی شکل میں مہمان بن کر آئے تھے) ان کو سلام کیا: ''أی سلموا سلاما''۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۵، نیز دیکھئے: کشاف: ۲/ ۳۱۵، ابن کثیر: ۲/ ۵۳۴)

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا
تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ
اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾
قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ اَتَيْنٰكَ
بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ
مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَ قَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَاۗءِ
مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَ جَاۗءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ ضَيْفِيْ فَلَا
تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا اَوَ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ هٰٓؤُلَاۗءِ
بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے بوڑھاپے میں (اولاد کی) خوشخبری دے رہے ہو، تو اب یہ کیسی خوشخبری ہے؟؟ ﴿۵۴﴾
انھوں نے کہا: ہم نے آپ کو سچی خوشخبری سنائی ہے؛ اس لئے آپ نا اُمید نہ ہوں، ﴿۵۵﴾ ابراہیم نے کہا: اپنے
پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون نا اُمید ہوتا ہے؟ ﴿۵۶﴾ ابراہیم نے کہا: اے اللہ کے بھیجے ہوئے
فرشتو! تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟ ﴿۵۷﴾ فرشتوں نے کہا: ہمیں ایک مجرم قوم (یعنی: قومِ لوط) کی طرف بھیجا گیا ہے، ﴿۵۸﴾
سوائے لوط کے خاندان کے، کہ ہم ان سب کو بچالیں گے، ﴿۵۹﴾ البتہ اس کی بیوی کے لئے ہم نے مقدر کردیا ہے کہ
وہ پیچھے رہ جانے والوں میں شامل رہے گی، ﴿۶۰﴾ پھر جب یہ بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے گھر آئے، ﴿۶۱﴾ تو لوط نے کہا:
تم تو اَن پہچانے لوگ ہو؟ ﴿۶۲﴾ فرشتوں نے کہا: بلکہ ہم تو آپ کے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں، جس کے بارے
میں یہ لوگ شک کرتے رہے ہیں، ﴿۶۳﴾ ہم آپ کے پاس یقینی طور پر واقع ہونے والی چیز (یعنی عذاب) لے کر آئے
ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں، ﴿۶۴﴾ اس لئے آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے لوگوں کو لے کر نکل جائیے اور آپ خود ان
کے پیچھے پیچھے چلئے، آپ میں سے کوئی مڑ کر بھی نہ دیکھے اور جہاں کا حکم دیا جارہا ہے، وہاں سب چلے جائیں، ﴿۶۵﴾
اور ہم نے لوط کو فیصلہ بھیج دیا کہ صبح ہوتے ہی اِن (قومِ لوط) کی جڑ کاٹ دی جائے گی، ﴿۶۶﴾ شہر والے خوشیاں مناتے
ہوئے پہنچ گئے، ﴿۶۷﴾ لوط نے کہا: یہ میرے مہمان ہیں، تم مجھے رسوا نہ کرو، ﴿۶۸﴾ اللہ سے ڈرو اور مجھے بے عزت نہ کرو، ﴿۶۹﴾
ان لوگوں نے کہا: کیا ہم لوگوں نے تجھ کو دنیا جہان (کی حمایت) سے روکا نہیں تھا؟ ﴿۷۰﴾ لوط نے کہا: اگر تم کو کرنا ہی ہے
تو میری بیٹیاں (یعنی: تمہاری بیویاں حاضر) ہیں۔ ﴿۷۱﴾

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا
سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهَا
لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ وقف لازم
فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۵ ۱۹ ۵

آپ کی جان کی قسم! (مگر) وہ تو اپنے نشہ میں بدمست تھے ﴿۱﴾ ﴿۷۲﴾ چنانچہ سورج نکلتے ہی ہولناک چیخ نے ان کو آ پکڑا، ﴿۷۳﴾ پھر ہم نے بستی کو پلٹ کر رکھ دیا اور ان پر کنکر کے پتھر برسا دیئے، ﴿۲﴾ ﴿۷۴﴾ اس میں صاحب ِفراست لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، ﴿۷۵﴾ اور یہ بستی تو ہمیشہ کے راستہ ہی پر واقع ہے، ﴿۳﴾ ﴿۷۶﴾ یقیناً اس میں ایمان والوں کے لئے نشانی ہے، ﴿۷۷﴾ اور بَن کے رہنے والے بھی ظالم ہی تھے ﴿۷۸﴾ ہم نے ان سے بھی بدلہ لیا اور یہ دونوں شہر کھلی شاہراہ پر واقع ہیں ﴿۴﴾ ﴿۷۹﴾ اور حِجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا۔ ﴿۸۰﴾

﴿۱﴾ انسان کے لئے حکم یہ ہے کہ اسے جب بھی قسم کھانی ہو تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے؛ کیوں کہ قسم ایسی چیز کی کھائی جاتی ہے، جو عظمت والی ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے زیادہ عظمت اور بڑائی والی ہے، مگر جب اللہ تعالیٰ کو قسم کھانی ہوتی ہے تو اپنی مخلوق میں سے ایسی چیز کی قسم کھاتے ہیں، جو انسانیت کے لئے بہت نفع بخش ہو؛ اسی لئے یہاں رسول اللہ ﷺ کی قسم کھائی گئی؛ کیوں کہ آپ ﷺ سے بڑھ کر انسانیت کے لئے نافع اور اس کائنات کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمت و رحمت اور کیا ہو سکتی ہے؟ — خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی قسم کھائی، اس میں آپ ﷺ کا اعزاز و اکرام اور آپ ﷺ کی عظمت و فضیلت کا اظہار بھی ہے۔

﴿۲﴾ آیت نمبر: ۵۱ سے آیت نمبر: ۷۷ تک حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آنے کا اور اس کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری سنانے کا واقعہ ہے، جس کا ذکر اس سے پہلے کئی مقامات پر بالخصوص سورۂ ہود آیت نمبر: ۶۹ سے آیت نمبر: ۸۲ تک آچکا ہے، وہاں واقعہ کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے — جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کیا گیا، تو حضرت لوط علیہ السلام کو اپنے رفقاء کے ساتھ راتوں رات نہ صرف نکل جانے کا حکم دیا گیا؛ بلکہ یہ بھی فرمایا گیا کہ ادھر کوئی شخص مڑ کر بھی نہ دیکھے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو جگہیں عذاب یافتہ قوموں کی ہیں، اگر انسان کو وہاں سے گزرنا پڑے تو بطور عبرت و نصیحت کے گزر جائے، اس کو تفریح و تماشہ کی جگہ نہ بنائے۔

﴿۳﴾ قوم لوط کی یہ بستی حجاز سے شام جانے والے راستہ پر اُردن کے علاقہ میں واقع ہے، جو سطح سمندر سے کافی گہرائی میں ایک دریا کی شکل میں موجود ہے، اس میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ پاتا؛ اس لئے اس کو 'بحر مَیِّت' (مردار سمندر) کہتے ہیں اور قوم لوط کی نسبت کی وجہ سے اسے 'بحر لوط' بھی کہا جاتا ہے۔

﴿۴﴾ 'اُصحاب الایکہ' یعنی جنگل کے رہنے والے حضرت شعیب علیہ السلام کی اُمت میں تھے، ان کا علاقہ بھی شام کے راستہ پر واقع تھا، جہاں سے جہاز کے قافلے گزرتے رہتے تھے، قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک اور قوم 'اُصحابِ مَدیَن' کا بھی ذکر آیا ہے، اب ایک رائے ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قوم تھی اور اُیکہ کے معنی درختوں کے گھنے جھنڈ کے ہیں، گویا شہر مدین میں ایسے جنگل بھی تھے؛ اسی لئے ان کو کہیں 'مدین والے' کہا گیا اور کہیں جنگل اور بَن والے سے تعبیر کیا گیا — دوسری رائے ہے کہ یہ دو الگ الگ ←

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَا خَلَقْنَا
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾
اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں، پھر بھی وہ اس سے بے اعتنائی ہی برتتے رہے، ﴿۸۱﴾ وہ پہاڑوں سے محفوظ گھر تراشا کرتے تھے، ﴿۸۲﴾ ان کو بھی صبح ہوتے ہی ایک زبردست چیخ نے آ پکڑا، ﴿۸۳﴾ پھر ان کی کمائی ان کے کام نہ آسکی، ﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾ ہم نے آسمانوں کو، زمین کو اور اِن کے درمیان کی چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ قیامت آکر رہے گی؛ اس لئے اچھی طرح درگذر کر دیجئے، ﴿۸۵﴾ یقیناً آپ کے پروردگار ہی پیدا کرنے والے اور خوب واقف ہیں ﴿۸۶﴾ ہم نے آپ کو بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۷﴾

← قومیں تھیں، دونوں قوموں کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا، دونوں میں ایک مشترکہ اخلاقی برائی یہ تھی کہ وہ ناپ تول میں کمی کیا کرتے تھے اور دونوں ہی پر ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل کیا گیا، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے خود آپ ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قومیں تھیں، اللہ نے ان دونوں کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا، (علل الحدیث لابن ابی حاتم، حدیث نمبر: ۱۷۸۶) اس روایت سے اِس دوسری رائے کی تائید ہوتی ہے؛ البتہ یہ روایت ضعیف ہے، سورۂ اعراف آیت نمبر: ۸۵ سے آیت نمبر: ۹۳ تک تفصیل سے حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، ان آیات کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

﴿۱﴾ حِجر کے معنی پتھر کے ہیں، جس مکان کے گرد پتھر کا احاطہ بنایا جاتا تھا، اس کو عربی زبان میں حجر کہتے ہیں، اسی مناسبت سے مدینہ اور شام کے درمیان ایک وادی کا نام حجر پڑ گیا، غالباً اس لئے کہ وہ دو پہاڑوں کے درمیان تھی، گویا قدرتی طور پر اس کے دونوں طرف پتھر کی دیواریں موجود تھیں، یہیں قومِ ثمود آباد تھی، جو پتھروں سے تراش تراش کر مکان بنانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اصحابِ حجر سے یہی قوم مراد ہے، جن کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اور جن پر ان کی سرکشی و گمراہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا، قومِ لوط، قومِ شعیب اور قومِ ثمود تینوں کے علاقے شام سے مدینہ کے راستے میں قریب ہی قریب واقع ہیں، رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع سے قومِ ثمود کی اس بستی سے گزرے تھے، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کو ہدایت فرمائی کہ جن قوموں پر اللہ کا عذاب ہوا ہے، ان کی آبادی میں روتے ہوئے داخل ہو، اگر رونا نہ آئے تو کم سے کم رونے کی شکل بناؤ، جو عذاب ان پر آیا ہے، کہیں تم پر نہ آجائے، (بخاری، باب تفسیر سورۃ الحجر، حدیث نمبر: ۴۴۲۵) حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اور ان پر عذاب کا واقعہ سورۂ اعراف آیت نمبر: ۷۹ کے حاشیہ میں آچکا ہے۔

﴿۲﴾ بار بار پڑھی جانے والی سات آیتوں سے مراد سورۂ فاتحہ ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ یہی ''سبع مثانی'' ہے، (سنن ابی داود، کتاب الوتر، باب فاتحۃ الکتاب، حدیث نمبر: ۱۴۶۰) ایک اور روایت میں ہے کہ یہی اُم القرآن، اُم الکتاب ←

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَ قُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ
جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾

آپ ان چیزوں کو نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو ہم نے کافروں میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو استعمال کے لئے دے رکھی ہیں، اور نہ آپ ان (کے ایمان نہ لانے) پر رنجیدہ ہوں، اور اپنے بازو ایمان والوں کے لئے جھکائے رکھیں، ﴿۱﴾ ﴿۸۸﴾ اور آپ فرما دیجئے کہ میں تو کھلے طور پر (اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والا ہوں، ﴿۸۹﴾ جس طرح ہم اُن حصہ بکھرا کرنے والوں پر (عذاب) نازل کر چکے ہیں، ﴿۹۰﴾ جنھوں نے اللہ کی کتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۱﴾

← اور سبع مثانی ہے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۱۴۵۹) — اگرچہ قرآن مجید میں سورۂ فاتحہ بھی شامل ہے؛ لیکن اس کی خصوصی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا مستقل طور پر ذکر فرمایا ہے۔

﴿۱﴾ بظاہر تو رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے؛ لیکن اصل میں مسلمانوں کو متوجہ کرنا مقصود ہے، دنیا میں ایمان نہ لانے والوں کے عیش و آرام کو دیکھ کر متاثر نہ ہونا چاہئے، یہ آرام و راحت چند روزہ ہے، اس کے بعد ان کے لئے محرومی ہی محرومی ہے۔

﴿۲﴾ اللہ کی طرف سے جو بھی کتاب آئی ہے اور شریعت کے جو احکام بھیجے جاتے رہے ہیں، ان میں بعض تو انسان کی مصلحت کے بھی مطابق ہوتے ہیں اور خواہش کے بھی، جیسے تجارت کا جائز ہونا، نکاح کی اجازت وغیرہ، کچھ احکام انسانی مصلحت کے مطابق ہوتے ہیں؛ لیکن وہ انسان کی خواہشات کے خلاف ہوتے ہیں، جیسے شراب، سود، زنا وغیرہ کی ممانعت، خواہش پرست انسانی سماج کا مزاج یہ رہا ہے کہ وہ پہلے قسم کے احکام تو قبول کر لیتے تھے اور دوسرے قسم کے احکام کو ماننا نہیں چاہتے تھے، یہاں اسی بات کا ذکر ہے کہ جن قوموں نے ایسا کیا ہے، ہم نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا ہے، قرآن مجید کے ساتھ بھی مشرکین اور اہل نفاق کا یہی رویہ تھا کہ جو باتیں مشرکین کے مزاج کے خلاف ہوتیں، وہ کہتے کہ یہ شعر ہے، جادو ہے، داستان گوئی ہے، اسی طرح یہودیوں کا حال تھا کہ جو باتیں ان کی خواہشات کے مطابق یا تورات کے موافق تھیں، ان کو وہ قبول کرتے اور جو باتیں ان کی خواہش سے ٹکراتی تھیں؛ خواہ تورات میں موجود ہوں، پھر بھی ان کے ماننے کے روادار نہیں تھے، غرض کہ اِن لوگوں نے اللہ کی کتاب کے ٹکڑے کر لئے تھے، کسی ٹکڑے کو قبول کر لیتے تھے اور کسی کا انکار کر دیتے تھے، دین بیزار اور خدا سے نہ ڈرنے والے لوگوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے اور آج بھی یہی حال ہے کہ مذہب کے جن احکام میں خواہشات سے ٹکراؤ نہ ہو، اسے قبول کر لو، اور جہاں اپنی خواہش کے خلاف پڑے، ان کو چھوڑ دو، آج عیسائی دنیا کرسمس مناتی ہے، اتوار کو بائبل کا کچھ حصہ پڑھ لیتی ہے، ہندو قوم اپنے تصور کے مطابق پوجا پاٹ کر لیتی ہے؛ لیکن سود اور زنا کی ممانعت ہر مذہب میں ہے، مگر اس کو تسلیم نہیں کیا جاتا — آیت نمبر: ۹۰ کا یہ ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا ہے کہ ''مقتسمین'' کے معنی ''تقسیم کرنے والے اور حصہ بکھرا کر دینے والوں'' کے ہے، بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ ''قسم کھانے والوں'' سے کیا ہے کہ اہل مکہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ لوگوں کو ایمان لانے سے روکیں گے، اس معنی کی بھی گنجائش ہے — نیز آیت نمبر: ۹۱ میں قرآن کا ترجمہ ''اللہ کی کتاب'' سے کیا گیا ہے، جس میں تمام آسمانی کتابیں شامل ہیں، بعض لوگوں نے اس سے صرف ''قرآن مجید'' مراد لیا ہے اور اس کی بھی گنجائش ہے۔

ع ۱
فَوَرَبِّكَ لَنَسۡـَٔلَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾ فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ
الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۹۴﴾ اِنَّا كَفَيۡنٰكَ الۡمُسۡتَهۡزِءِيۡنَ ﴿۹۵﴾ الَّذِيۡنَ يَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ‌ ۚ فَسَوۡفَ
يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾ وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ كُنۡ
ع ۶ ۲۰ ۶
مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ﴿۹۸﴾ وَ اعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ ﴿۹۹﴾

توآپ کے پروردگار کی قسم! ہم ان سب سے ان کی حرکتوں کے بارے میں ضرور سوال کریں گے، ﴿۹۲﴾ لہٰذا آپ کو جو کچھ حکم دیا جارہا ہے، اس کو صاف صاف سنا دیجئے اور مشرکوں کی پرواہ نہ کیجئے، ﴿۹۳﴾ یقیناً مذاق اُڑانے والوں کے مقابلہ آپ کی طرف سے ہم ہی کافی ہیں ﴿۱﴾ ﴿۹۴﴾ جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہراتے ہیں، تو وہ جلد ہی (حقیقتِ حال) جان لیں گے ﴿۹۵﴾ اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، ﴿۹۶﴾ تو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتے رہئے، سجدہ کرنے والوں میں سے رہئے ﴿۹۷﴾ اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہئے ﴿۹۸﴾ یہاں تک کہ آپ کو موت آجائے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۹﴾

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کی نافرمانی اور اس کا انکار کفر ہے؛ لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام کا اور اللہ کے نیک بندوں کا مذاق اُڑانا بہت ہی خطرناک بات ہے: اس لئے دین کے ہر ہر حکم اور رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک سنت کی دل میں عظمت ہونی چاہئے، اور زبان پر کوئی ایسی بات نہ آنی چاہئے، جس سے اس کی کم ہمتی کا اظہار ہوتا ہو۔

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ اگر لوگوں کی طرف سے تکلیف دہ بات پیش آئے اور انسان کا دل رنجیدہ ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے، تسبیح وتحمید کی جائے اور عبادت میں مشغول ہو جایا جائے، رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا کہ جب کوئی ناگوار بات پیش آجاتی تو فوراً نماز ادا فرماتے، (سنن ابی داود، باب وقت قیام النبیؐ من اللیل، حدیث نمبر: ۱۳۱۹) ایک روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: اے ابن آدم! دن کے شروع میں چار رکعت پڑھنے میں سستی نہ کروگے، تو میں دن کے آخر تک تمہارے لئے کافی ہو جاؤں گا، (مسند احمد، عن ابی درداءؓ، حدیث نمبر: ۲۷۵۵) غرض کہ ہر مسلمان اور خاص کر دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ ان کے درد کی دوا اللہ تعالیٰ کا ذکر اور ان کی عبادت ہے —— سورۂ حجر کی اس آخری آیت میں ''یقین'' سے مراد موت ہے؛ کیوں کہ انسان کے اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد موت سے زیادہ یقینی کوئی اور واقعہ نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت عثمان ابن مظعون رضی اللہ عنہما کے پاس آخری وقت میں تشریف لائے تو اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ ان کی وفات ہو چکی ہے، فرمایا: اِن پر یقین آچکا ہے اور میں اِن کے لئے خیر کی اُمید رکھتا ہوں: ''فقد جاء ه اليقين وإني لأرجو له الخير'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۴۹۷) اس حدیث میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یقین سے مراد موت ہے، بعض جاہل صوفیاء نے اس آیت کی یہ تشریح کی کہ اللہ تعالیٰ کا یقین حاصل ہونے تک عبادت کا حکم ہے، جب اللہ کا یقین حاصل ہو جائے، تو پھر عبادت کی ضرورت نہیں، یہ جہالت اور کھلی ہوئی گمراہی ہے، رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کس کا یقین تھا؟ لیکن وفات تک آپ ﷺ نہ صرف نماز کا بے حد اہتمام فرماتے رہے؛ بلکہ نماز آپ ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنی رہی اور آپ ﷺ اُمت کو بھی نمازوں کی تلقین فرماتے رہے۔

سُوْرَةُ النَّحْلِ

- سورہ نمبر : (۱۶)
- رکوع : (۱۶)
- آیتیں : (۱۲۸)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ سورت بھی مکی سورتوں میں ہے، جو ایک سو اٹھائیں (۱۲۸) آیتوں پر مشتمل ہے، اس سورت کی آیت نمبر: ۶۸، ۶۹ میں نحل یعنی شہد مکھی کا ذکر ہے، جو اپنی ذہانت اور سلیقہ مندی کی وجہ سے ایک عجوبہ مخلوق اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بہترین مظہر ہے؛ اس لئے اس کا نام ''نحل'' ہے —— چوں کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں کا ذکر آیا ہے؛ اسی لئے اس کو 'نِعَمْ' کا نام بھی دیا گیا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۶۵)

اس سورت میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد پر روشنی ڈالی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل کے طور پر کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جانوروں میں حلال وحرام کی رہنمائی کی گئی ہے، مشرکین اور یہود اپنے طور پر بعض چیزوں کو حرام کر لیتے تھے، ان کے اس طریقۂ کار کی مذمت کی گئی ہے؛ کیوں کہ حلال وحرام کرنا اللہ ہی کا حق ہے، اس بات کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کر دے تو وہ دائرۂ ایمان سے باہر نہیں ہوجاتا، ایفائے عہد یعنی وعدہ پورا کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے اور اس سورت میں قرآن مجید کی وہ آیت بھی آئی ہے، جس میں عدل واحسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور 'فَحْشَاء' (بے حیائی) 'مُنْکَر' (برائی) اور 'بَغِي' (ظلم وزیادتی) سے منع فرمایا گیا ہے (آیت نمبر: ۹۰)، جس کو مفسرین نے قرآن مجید کی سب سے جامع آیت قرار دیا ہے۔

سورت کے اخیر میں دعوت کے بنیادی اُصول اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ کتنی ہی دشمنی اور عداوت کا ماحول ہو؛ لیکن جوابی کاروائی میں انصاف کی حدوں سے تجاوز نہیں ہونا چاہئے۔

○ ○ ○

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝
اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰهِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡهُ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ۝۱ یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوۡحِ
مِنۡ اَمۡرِهٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ۝۲ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ۝۳ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ
خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ۝۴ وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا لَكُمۡ فِیۡهَا دِفۡءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۝۵ وَ لَكُمۡ
فِیۡهَا جَمَالٌ حِیۡنَ تُرِیۡحُوۡنَ وَ حِیۡنَ تَسۡرَحُوۡنَ ۝۶ وَ تَحۡمِلُ اَثۡقَالَكُمۡ اِلٰی بَلَدٍ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا
بٰلِغِیۡهِ اِلَّا بِشِقِّ الۡاَنۡفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۝۷

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ اللہ کا حکم آچکا ہے؛ اس لئے جلد بازی نہ کرو، اللہ کی ذات اِن (کفر کرنے والوں) کے شریک ٹھہرانے سے پاک اور بالاتر ہے، ﴿۱﴾ ۝۱ اللہ ہی فرشتوں کو وحی —— یعنی اپنا حکم لے کر —— جس بندے پر چاہتے ہیں، اُتارتے ہیں؛ کہ آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں؛ لٰہذا مجھ ہی سے ڈرو، ۝۲ جس نے آسمان اور زمین کو ٹھیک ٹھیک پیدا فرمایا، وہ ان کے شریک ٹھہرانے سے برتر ذات ہے، ۝۳ اللہ نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا، پھر وہ ایک دم سے کھلّم کھلاّ جھگڑنے والا ہوگیا، ۝۴ اور اللہ نے تمہارے لئے چوپائے بھی پیدا کئے، جن میں تمہارے لئے جاڑے کا لباس ہے، متعدد فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو، ۝۵ اور جس وقت تم شام میں اِن کو چرا کر واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو تو تمہارے لئے اِن میں رونق کا سامان بھی ہے، ۝۶ اور یہ چوپائے تمہارے بوجھ اُن شہروں تک اُٹھا کر لے جاتے ہیں، جہاں تم جان کو مشقت میں ڈالے بغیر پہنچ نہیں سکتے تھے، بے شک آپ کے پروردگار نہایت شفیق اور بے حد مہربان ہیں۔ ﴿۲﴾ ۝۷

﴿۱﴾ مکہ کے مشرکین کہتے تھے کہ آپ جس عذاب کی دھمکی دیتے رہتے ہیں، آخر وہ عذاب آتا کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ اب اس عذاب کی آمد بہت قریب ہے، جو مسلمانوں کی فتح، دشمنانِ اسلام کی شکست اور ان کے سورماؤں کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوگا؛ جیسا کہ غزوۂ بدر میں ظاہر ہوا۔

﴿۲﴾ کسی چیز کی علامتوں کو دیکھ کر اصل چیز کو جانا اور پہچانا جاتا ہے، اب اس کائنات کی حیرت انگیز نشانیوں کو دیکھئے کہ خود انسان ایک حقیر نطفہ سے پیدا کیا گیا ہے، جس کو نہ کان ہے، نہ آنکھیں ہیں، نہ ہاتھ پاؤں ہیں، نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے؛ لیکن خدا نے اس کو ایک چلتے پھرتے انسان کے سانچے میں ڈھال دیا ہے، جس کی صلاحیت کا حال یہ ہے کہ وہ جھگڑتا بھی ہے، جب کہ جھگڑنے اور بحث و مباحثہ کے لئے سوچنے سمجھنے کی، دیکھنے کی، بولنے کی، سننے کی اور سنانے کی بہت سی صلاحیتیں چاہئیں؛ ←

وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸﴾ وَ عَلَى اللّٰهِ
قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ ع ۷
السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ
وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾

نیز گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا فرمائے؛ تاکہ تمہاری سواری اور زینت کے کام آئیں، اور ایسی چیزیں بھی پیدا کریں گے جن سے تم ابھی واقف نہیں ہو، ﴿۱﴾ ﴿۸﴾ اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے (اس لئے اسی کو اختیار کرو) اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں، اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سبھوں کو ہدایت سے نواز دیتے، ﴿۲﴾ ﴿۹﴾ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اُتارا، جس میں سے کچھ پینے کا ہے اور کچھ پانی سے درخت (سیراب ہوتے) ہیں، جس میں تم چرایا کرتے ہو، ﴿۱۰﴾ اللہ اس سے تمہارے لئے کھیتی، زیتون، کھجوریں، انگور اور ہر قسم کے میوے اُگاتے ہیں، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے، جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ ﴿۱۱﴾

← اسی طرح جانور پیدا کئے گئے، جو انسان کے مختلف کام آتے ہیں، انھیں کھایا بھی جاتا ہے، ان سے گرم لباس بھی تیار کیا جاتا ہے، جو لوگ جانوروں کی پرورش کرتے ہیں، ان کے لئے جانوروں کا لانا اور لیجانا خوشی کا باعث ہوتا ہے، یہ انسانوں کا بوجھ بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہیں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں، یہ سب چیزیں کسی پیدا کرنے والے کے بغیر کیسے پیدا ہوسکتی تھیں؛ لہٰذا ان علامتوں کو دیکھ کر کائنات کے خالق و مالک کو پہچاننا چاہئے، نہ یہ کہ انسان ناشکری کرتے ہوئے اللہ کے وجود سے انکار کر جائے اور اسی کے بارے میں جھگڑنے لگے۔

﴿۱﴾ یعنی سواری کے کام آنے والے جانور تمہارے کام آچکے؛ لیکن تخلیق و پیدائش کا عمل ابھی رکا نہیں ہے؛ اس لئے نئی نئی چیزیں اور سواریاں وجود میں آتی رہیں گی؛ گویا اس میں جہاز، ٹرین، بسیں، تمام سواریاں اور ایجادات شامل ہیں —— یہاں اللہ تعالیٰ نے گھوڑے خچر اور گدھے کا صرف سواری کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان جانوروں کا مقصد بار برداری کی ضرورت کو پورا کرنا ہے نہ کہ غذائی ضرورت کو؛ اسی لئے فقہاء کا اتفاق ہے کہ خچر اور گدھے حرام ہیں، (المغنی: ۱۳/۱۳۰۷) گھوڑے کے سلسلے میں چوں کہ دو طرح کی روایتیں ہیں؛ اس لئے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک راجح قول کے مطابق گھوڑے کا گوشت مکروہ یعنی حرام کے قریب ہے، (ہدایہ: ۲/۴۴۰) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے زینت و آرائش کی اور چیزیں ہیں، ویسے ہی اس کا ایک ذریعہ سواری بھی ہے، آج نت نئے ڈیزائن کی کاریں، بسیں اور ٹرینیں بنائی جارہی ہیں، وہ اس کی مثال ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ زینت اپنے آپ کی ہو یا مکان یا سواری کی، اگر اس میں کوئی حرام چیز استعمال نہ کی جائے اور اس کا مقصد تکبر اور دوسروں کو نیچا دکھانا نہ ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

﴿۲﴾ انبیاء اسی لئے بھیجے گئے کہ انسان کو سیدھے راستے کی رہنمائی کریں؛ لیکن چوں کہ انسان کا امتحان مقصود ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ کی طاقت دی ہے کہ وہ جس راستہ پر چاہیں چلیں، اس کو مجبور نہیں کیا جائے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ
ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً
لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ
حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾
وَ عَلٰمٰتٍ ؕ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ اِنْ
تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸﴾

نیز اللہ نے رات، دن اور سورج، چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے، ستارے بھی اسی کے حکم سے ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو عقل رکھتے ہیں، ﴿۱۲﴾ نیز اللہ نے زمین میں تمہارے لئے جو کچھ پیدا کیا ہے، ان کے رنگ الگ الگ ہیں، بلا شبہ اس میں بھی سوچنے والوں کے لئے نشانی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۱۳﴾ اور وہی خدا ہے جس نے سمندر کو قابو میں رکھا ہے؛ تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھا سکو، ﴿۲﴾ اس میں سے اپنے پہننے کے زیورات نکال سکو، اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ پانی کو پھاڑتے ہوئے سمندر میں چلتی رہتی ہیں؛ تاکہ تم اللہ کی عطا کی ہوئی روزی تلاش کرو اور شکر ادا کرو، ﴿۱۴﴾ اور اللہ ہی نے زمین میں پہاڑ بھی رکھ دیئے ہیں کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے، ﴿۳﴾ اور نہریں اور راستے بھی بنا دیئے؛ تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو ﴿۱۵﴾ نیز بہت سی علامتیں بنا دیں (جن سے راستے معلوم ہوتے ہیں) اور ستاروں کے ذریعہ بھی لوگ راستہ معلوم کر لیتے ہیں، ﴿۴﴾ ﴿۱۶﴾ تو بھلا جو ذات پیدا کرتی ہے، وہ اسی کے برابر ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟؟ ﴿۱۷﴾ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہیں کر سکتے، بے شک اللہ بہت بخشنے والے اور نہایت مہربان ہیں۔ ﴿۱۸﴾

﴿۱﴾ یعنی زمین ایک ہے، پانی ایک ہے، پودے بھی قریب قریب ہی ہیں؛ لیکن ان کے رنگ الگ، ان کے ڈیزائن الگ اور ان کے مزے الگ ہیں، یہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت و تدبیر کا نتیجہ ہے!

﴿۲﴾ تازہ گوشت سے مراد مچھلیاں ہیں۔

﴿۳﴾ یعنی پہاڑوں کے ذریعے زمین میں توازن قائم رکھا گیا ہے، یہی توازن اگر معمولی طور پر متاثر ہو جائے تو زلزلے آتے ہیں اور چند سکنڈ میں ایسی تباہی آجاتی ہے کہ جس کے تصور سے بھی دل گھبراتا ہے۔

﴿۴﴾ یعنی درختوں، پہاڑوں، ٹیلوں اور کھائیوں وغیرہ کی شکل میں ایسی علامتیں بنا دیں کہ انسان آسانی سے راستہ کی شناخت کر سکے، ورنہ اگر پوری زمین صحرا اور چٹیل میدان کی طرح یکساں ہوتی تو راستہ معلوم کرنا کس قدر دشوار ہوتا؟ اسی طرح ستارے بھی راستہ اور سمت معلوم کرنے کا بڑا اہم ذریعہ ہیں، آج بھی سمندر کی اتھاہ وسعتوں میں ستاروں کے ذریعہ سفر کا رُخ معلوم کیا جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝۱۹ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ
شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۲۰ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝۲۱ اِلٰهُكُمْ ع ۲ ۸
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝۲۲ لَا
جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝۲۳ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمْ مَّا ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۲۴ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ
وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝۲۵ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ ع ۳ ۹
قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۲۶

تم جو کچھ چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، سب اللہ کے علم میں ہے، ۝۱۹ اور اللہ کے سوا جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے، وہ تو خود پیدا کئے جاتے ہیں، ۝۲۰ وہ مُردے ہیں، جن میں جان نہیں ہے اور انھیں خبر تک نہیں ہے کہ وہ کب اُٹھائے جائیں گے ﴿۱﴾ ۝۲۱ خدائے واحد ہی تمہارے معبود ہیں، تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور وہ مغرور ہیں، ۝۲۲ اس میں شک نہیں کہ وہ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ چھپاتے ہیں، اللہ ان سے واقف ہیں، بے شک اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، ۝۲۳ اور جب ان سے کہا جاتا ہے: تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا؟ تو کہتے ہیں: پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، ۝۲۴ اس کا نتیجہ ہے کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا بھی پورا پورا بوجھ اُٹھائیں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بھی، جن کو بلا تحقیق گمراہ کر رہے ہیں، سن لو! جو بوجھ وہ اُٹھا رہے ہیں، وہ بہت ہی بُرا ہے، ﴿۲﴾ ۝۲۵ ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی مکر وفریب سے کام لیا تھا، تو اللہ نے ان کی عمارتیں بنیاد سے اکھیڑ دیں؛ چنانچہ ان پر ان کے اوپر سے چھتیں گر پڑیں اور ان پر کچھ اس طرح سے عذاب آدھمکا کہ جس کا ان کو خیال تک نہ تھا۔ ﴿۳﴾ ۝۲۶

﴿۱﴾ کائنات میں جو نعمتیں بکھری ہوئی ہیں، ان سب کے تذکرہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کی دلیل ہیں، کسی پیدا کرنے والے کے بغیر یہ چیزیں وجود میں نہیں آسکتی تھیں اور جب تک کائنات کا یہ پورا نظام ایک ہی ہاتھ میں نہ ہو، یہ نظم قائم نہیں رہ سکتا تھا؛ اس لئے ایک ہی خدا ہے جو عبادت کے لائق ہے۔

﴿۲﴾ 'اساطیر' کے معنی بے سند اور غیر معتبر قصے کے ہیں، جب اہل مکہ سے حج یا کسی اور موقع پر باہر سے آنے والے لوگ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں دریافت کرتے تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ آپ (ﷺ) گزرے ہوئے لوگوں کی محض کچھ فرضی داستانیں سناتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایسے لوگوں پر دوہرا عذاب ہوگا، خود ان کی گمراہی کا بھی اور ان لوگوں کا بھی جن کو انھوں نے گمراہ کیا تھا —— اس میں تنبیہ ہے کہ انسان کو ایسے افکار و خیال کے ظاہر کرنے سے ضرور بچنا چاہئے، جو دوسروں کے لئے راہِ حق سے ہٹ جانے ←

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾
وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا
حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾

پھر قیامت کے دن بھی اللہ ان کو رسوا کریں گے اور فرمائیں گے: میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کے بارے میں تم جھگڑے کیا کرتے تھے؟ جاننے والے بول اُٹھیں گے: آج تو کفر کرنے والوں کے لئے رسوائی اور برائی ہی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۲۷﴾ فرشتوں نے جن کی روح کفر کی حالت میں قبض کی تھی، وہ اس وقت اطاعت وفرمانبرداری ظاہر کریں گے کہ ہم تو برائی نہیں کیا کرتے تھے، (کہا جائے گا:) ہاں، ہاں، جو کچھ تم کیا کرتے تھے، اللہ اس سے خوب واقف ہیں؛ ﴿۲﴾ ﴿۲۸﴾ لہٰذا اب دوزخ کے دروازوں میں داخل ہوجاؤ، ہمیشہ اسی میں رہوگے، تکبر کرنے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانہ ہے! ﴿۲۹﴾ اور جو لوگ گناہ سے بچتے ہیں، ان سے کہا جاتا ہے: تمہارے پروردگار نے کیا چیز نازل فرمائی ہے؟ تو کہتے ہیں: بہتر بات، ﴿۳﴾ جن لوگوں نے نیک کام کئے ہیں، ان کے لئے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت تو بہت ہی بہتر ہے، اور نافرمانی سے بچنے والوں کے کیا ہی بہترین گھر ہیں! ﴿۳۰﴾

← اور گناہ میں پڑ جانے کا سبب ہو، اس طرح وہ بیٹھے بیٹھے دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر اُٹھالیتا ہے۔

﴿۳﴾ یوں تو قرآن مجید کا یہ ارشاد عام ہے اور اس میں ان تمام قوموں کی طرف اشارہ ہے، جنھوں نے انبیاء کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جو بلند وبالا عمارتوں میں عیش وعشرت کی زندگی گزار رہے تھے؛ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض اور اہل علم سے نقل کیا گیا ہے کہ اس سے مراد نمرود اور اس کی قوم ہے جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے اور یہ شخص اپنے آپ کے خدا ہونے کا دعویٰ کرتا تھا، اس نے بلند سیڑھیاں بنوائیں؛ تاکہ اپنے خیال کے مطابق اوپر چڑھ کر اللہ پر تیر چلائے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار ہاتھ اونچی اور تین ہزار ہاتھ چوڑی سیڑھیاں تعمیر کرائیں؛ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تو تیز ہوا چلی اور یہ عمارت تہہ وبالا ہوکر رہ گئی۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۹۷)

﴿۱﴾ جاننے والوں سے فرشتے یا اہل ایمان مراد ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۹۸)

﴿۲﴾ معلوم ہوا کہ جو لوگ ایمان سے محرومی کی حالت میں مرتے ہیں، موت سے پہلے ایک ایسا لمحہ آتا ہے، جب آخرت کی حقیقت ان پر کھل جاتی ہے اور وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے احکام کو مان لینے کی پیشکش بھی کرتے ہیں؛ لیکن اس وقت کا ایمان لانا معتبر نہیں ہوتا؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود یہ اُصول بیان فرما دیا تھا کہ جب کسی گروہ پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے اور غیب کی حقیقتیں ←

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ
یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ طَیِّبِیْنَ ۙ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ۙ
ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾
فَاَصَابَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قَالَ الَّذِیْنَ ع ۹/۱۰
اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ
دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۳۵﴾

ہمیشہ باقی رہنے والے باغات ہیں، جن میں وہ داخل ہوں گے، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جو کچھ وہ چاہیں گے، ان کے لئے ان میں مہیا ہوں گی، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ عطا فرماتے ہیں، ﴿۳۱﴾ فرشتے ان کی روح اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوتے ہیں، فرشتے کہتے ہیں: تم پر سلامتی ہو، تم اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاؤ، «۱» ﴿۳۲﴾ کیا وہ (کفر کرنے والے) اسی کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کے پروردگار کا حکم آ پہنچے؟ ان کے پچھلے لوگوں نے بھی یہی حرکت کی تھی، ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا؛ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ستم کرتے رہے، ﴿۳۳﴾ چنانچہ ان کی بداعمالیوں نے ان کو آ پکڑا اور جس عذاب کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے، اس نے ان کو گھیر لیا، ﴿۳۴﴾ شرک کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتے تو ہم ان کے سوا کسی اور چیز کی پوجا نہ کرتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اللہ کے حکم کے بغیر ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی یہی حرکت کی تھی، تو کیا اللہ کے پیغمبروں پر واضح طور پر پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی اور ذمہ داری بھی ہے؟ ﴿۳۵﴾

← ان کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں، تو پھر ان کا ایمان لانا ان کے لئے فائدہ مند نہیں ہوگا: ''فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا''۔ (المومن: ۸۵)

«۳» یعنی قرآن کے بارے میں مشرک سردار تو کہا کرتے تھے کہ یہ محض کچھ قصہ کہانیاں ہے؛ لیکن مسلمان کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کلام بہتر کلام ہے —— اہل ایمان کی شان یہی ہے کہ وہ قرآن و حدیث میں آنے والے تمام احکام کو مانتے ہوئے اس میں خیر کے پہلو کو تلاش کریں۔

«۱» جنت میں داخل ہونا تو اصل میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہوگا؛ لیکن نیک اعمال ہی اللہ تعالیٰ کے اس خصوصی فضل وکرم کا سبب بنیں گے؛ اس لئے فرشتے اہل ایمان کی روح قبض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل جاؤ۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى
اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ
حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم نے ہر اُمت میں پیغمبر بھیجے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو، ﴿۱﴾ تو ان میں سے بعض کو تو اللہ نے ہدایت سے نواز دیا، اور بعض وہ ہیں جن پر گمراہی ثابت ہو کر رہی؛ لہٰذا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ ﴿۲﴾ ﴿۳۶﴾ آپ کو ان کے ہدایت پر آجانے کی کتنی ہی تڑپ ہو، (یاد رکھیں کہ) جس کے لئے ہدایت سے محروم رکھنا طے ہے، اللہ اس کو ہدایت عطا نہیں فرماتے، اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، ﴿۳۷﴾ وہ زور لگا کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جائے، اللہ اسے دوبارہ زندہ نہیں کریں گے، ضرور زندہ کریں گے، یہ پختہ وعدہ ہے؛ لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے، ﴿۳۸﴾

﴿۱﴾ یعنی ہر قوم میں اللہ کے رسول آتے ہیں اور اس قوم کی زبان میں ہی اللہ کا پیغام لاتے ہیں؛ اگرچہ انبیاء کے ذریعے آنے والے شرعی احکام میں لوگوں کی ضرورتوں اور اس زمانے کے احوال کے لحاظ سے اللہ ہی کی طرف سے کچھ فرق بھی رکھا جاتا تھا؛ لیکن سب کی مشترکہ دعوت یہی تھی کہ اللہ ایک ہیں اور وہی عبادت کے لائق ہیں —— اس لئے یہ بات عین ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی یہاں کی مقامی زبان میں کوئی رسول، اللہ کا کلام لے کر آئے ہوں، ہندو مذہب کی قدیم کتابیں وید اور پُران وغیرہ میں توحید، اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت وغیرہ کا ذکر بہت واضح طور پر موجود ہے، نیز ہندو قوم میں بعض ایسی اخلاقی تعلیمات اور رسوم وعبادات دیکھنے کو ملتی ہیں، جو قرآن مجید کی تعلیمات سے بہت قریب ہیں؛ اسی لئے ممکن ہے کہ اس قوم میں بھی اللہ کے نبی آئے ہوں، اللہ کی کتاب نازل کی گئی ہو، جس کو برہمنوں نے اپنے خاص مقاصد کے لئے چھپا دیا ہو، اس میں تبدیلی کر دی ہو یا اس کے معنی بدل دیئے ہوں، حضرت مسیح علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان چھ سو سال سے بھی کم کا فاصلہ ہے؛ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کو ایسا مسخ کر دیا گیا کہ اللہ کے رسول کو لوگوں نے اللہ کا بیٹا بنا ڈالا، تو وید کُ دھرم تو بہت قدیم ہے، اس میں کیا کچھ تبدیلیاں نہ آئی ہوں گی؛ البتہ جن شخصیتوں کے نبی ہونے کا قرآن وحدیث میں ذکر نہیں آیا ہے اور جن کتابوں کے آسمانی کتاب ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصدیق نہیں ہوئی ہے، ان کو ہم یقین کے ساتھ رسول یا آسمانی کتاب نہیں کہہ سکتے؛ اس لئے ہندو قوم کو اہل کتاب کے حکم میں نہیں رکھا جاسکتا، یا ویدوں کو یقینی طور پر آسمانی کتاب نہیں مانا جاسکتا، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں؛ کیوں کہ کسی بات کے ممکن ہونے اور واقع ہونے میں بہت فرق ہے۔

﴿۲﴾ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تاریخی مقامات یا تاریخی عمارتوں کو دیکھنا صرف سیاحت کے جذبہ سے نہ ہونا چاہئے؛ بلکہ عبرت کی غرض سے ہونا چاہئے کہ دنیا میں کیسے کیسے لوگ آئے اور گزر گئے، نہ ان کا اقتدار ان کو بچا سکا، نہ ان کی خوبصورت اور بلند وبالا عمارتیں ان کے کام آسکیں۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا
قَوْلُنَا لِشَىْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ
صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

وقف لازم ۵ع

(دوبارہ زندہ کیا جانا) اس لئے ہوگا کہ جس کے بارے میں وہ جھگڑ رہے تھے، اللہ ان کے سامنے اس کو واضح کردیں اور تاکہ کفر کرنے والوں کو معلوم ہوجائے کہ وہی جھوٹے تھے، ﴿۳۹﴾ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو اس چیز کو ہمارا حکم اس طرح ہوتا ہے کہ ہم اس کو کہتے ہیں: ہوجا! تو وہ ہوجاتی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۴۰﴾ جن لوگوں نے ستم ڈھائے جانے کے بعد اللہ کے لئے وطن کو چھوڑ دیا، ہم ضرور ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑھ کر ہے، کاش، وہ جانتے ہوتے! ﴿۲﴾ ﴿۴۱﴾ (یہ وہ لوگ ہیں) جنھوں نے صبر کیا اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ﴿۴۲﴾

﴿۱﴾ یعنی مخلوق کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے دو چیزوں کی محتاج ہوتی ہے، ارادہ کی اور اس کے بعد عمل کی، اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کی محتاجی سے بالاتر ہے، اللہ تعالیٰ جوں ہی کسی چیز کا ارادہ فرماتے ہیں، وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، یہ جو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "ہوجا" یہ صرف انسان کو سمجھانے کے لئے ہے؛ کیوں کہ لوگوں کی بول چال میں کسی بات کے جلد سے جلد ہوجانے کے لئے یہی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، ورنہ تو اللہ تعالیٰ کو اس کی بھی حاجت نہیں۔

﴿۲﴾ ہجرت ایک شرعی اصطلاح ہے، اس سے مراد ہے: اپنے دین کو بچانے یا دین کی دعوت دینے کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر دوسری ایسی جگہ منتقل ہوجانا، جہاں وہ دین پر عمل کرسکے اور لوگوں کو دین حق کی طرف دعوت دے سکے، مسلمان اگر کسی ایسے علاقہ میں ہوں، جہاں ان کو دین پر عمل کرنے سے روک دیا گیا ہو، یا انھیں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت نہ ہو، نیز وہ وہاں سے نکلنے پر قادر ہوں اور ان کے لئے ایسی جگہ مہیا ہو جہاں جاسکیں، تو ان کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر اس دوسری جگہ چلا جانا شرعاً واجب ہے؛ اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت دنیا کے بیشتر ممالک جمہوری نظام کے تحت چل رہے ہیں، جس میں ملک کے ہر شہری کو نجی زندگی میں اپنے پسندیدہ مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوتی ہے؛ اس لئے جو لوگ ایسے ملکوں میں مقیم ہوں، ان کا فریضہ ہجرت نہیں ہے؛ بلکہ ان کی ذمہ داری اسی ملک میں رہتے ہوئے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا ہے، جو لوگ کسبِ معاش کے لئے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک کا سفر کرتے ہیں تو اگرچہ یہ جائز ہے؛ بشرطیکہ اس دوسرے ملک کا سفر کرنے میں ان کے اور ان کی نسلوں کے دین و ایمان کے لئے خطرہ نہ ہو؛ لیکن یہ شرعی اصطلاح کے اعتبار سے ہجرت نہیں ہے —— اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہجرت سے آخرت میں تو ثواب ہوتا ہی ہے، دنیا میں بھی رزق میں کشادگی اور اسبابِ زندگی میں سہولتیں میسر آتی ہیں۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾ اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

النصف

اور آپ سے پہلے بھی ہم کچھ مردوں ہی کی طرف وحی بھیجتے رہے ہیں ؛﴿۱﴾ لہٰذا اگر تم کو معلوم نہیں ہے تو اہل علم سے دریافت کرلو،﴿۲﴾ ﴿۴۳﴾ ہم نے ان کو دلیلیں اور کتابیں لے کر بھیجا تھا، نیز ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لئے اُتارا ہے کہ آپ لوگوں پر ان ہدایات کو اچھی طرح واضح کردیں، جو ان کی طرف بھیجی گئی ہیں؛ تاکہ وہ غور وفکر کریں،﴿۳﴾ ﴿۴۴﴾ کیا سازشیں کرنے والے اس بات سے مطمئن ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسادیں، یا ان پر اس طرح عذاب آجائے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو۔ ﴿۴۵﴾

﴿۱﴾ یعنی انسانوں کی طرف نہ فرشتوں کو اور جنات کو نبی بنا کر بھیجا گیا اور نہ خود انسانوں میں عورتوں کو؛ بلکہ صرف مردوں میں سے انبیاء بھیجے گئے، جن اور فرشتے اس لئے انسان کے نبی نہیں بنائے گئے کہ انسان اپنے ہم جنس ہی سے مانوس ہوتا ہے اور اسی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتا ہے، وہ جن اور فرشتہ کو اپنے لئے آئیڈیل نہیں بنا سکتے تھے، عورتوں کو اس لئے نہیں بنایا گیا کہ انبیاء کو دین کی دعوت دینے اور لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لئے مختلف جگہ جانا پڑتا تھا، مختلف افراد سے ملاقات کرنی ہوتی تھی، مجمع سے خطاب کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، یہ سب کچھ مرد ہی کر سکتے تھے —— اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ اگرچہ دعوتِ دین کا فریضہ پوری اُمت سے متعلق ہے، جس میں عورتیں بھی شامل ہیں؛ لیکن خواتین کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس کام کو کرنا چاہئے، اجنبیوں سے ملاقات اور دور دراز کے اسفار وغیرہ سے اجتناب کرنا چاہئے۔

﴿۲﴾ اہل ذکر سے بعض مفسرین نے علماء یہود ونصاریٰ کو مراد لیا ہے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے قرآن کا علم رکھنے والے یعنی علماء اسلام مراد ہیں، اور بعض نے مطلق اہل علم مراد لیا ہے (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۰۸) —— بہرصورت اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن لوگوں کو احکامِ شریعت کا علم نہیں ہے، ان کو ان لوگوں سے دریافت کرنا چاہئے جو اصحابِ علم ہیں، تقلید بھی اسی کا نام ہے کہ جو لوگ اتنا علم نہ رکھتے ہوں کہ خود قرآن وحدیث سے احکام شرعیہ کو مستنبط کرسکیں، انھیں ان علماء کی وضاحتوں پر اعتماد کرنا چاہئے، جو براہ راست قرآن وحدیث سے احکام اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، پس اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عوام کو احکام شرعیہ میں تقلید واتباع کا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔

﴿۳﴾ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کام دیا گیا ہے، وہ صرف یہی نہیں ہے کہ آپ قرآن مجید کو اُمت تک پہنچادیں؛ بلکہ اپنے قول وفعل کے ذریعے قرآن مجید کی تشریح کرنا اور کتاب اللہ میں جو احکام اجمال کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، ان کو کھول کر بیان کرنا بھی آپ کی ذمہ داری میں شامل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حدیثیں بھی دین میں حجت اور دلیل ہیں؛ کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے ذریعہ قرآن مجید ہی کی تشریحات اور وضاحتیں ہیں۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ
لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾ اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ
وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ
دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

یا ان کو چلتے پھرتے ہی پکڑ لیں، تو وہ (خدا کو) عاجز نہیں کر سکتے، ﴿۴۶﴾ یا ان کو گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لیں، بے شک آپ
کے پروردگار نہایت شفیق اور بے حد مہربان ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۴۷﴾ کیا انھوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھا،
جن کے سائے دائیں بائیں حکم الٰہی کے تابع ہو کر ڈھلتے رہتے ہیں، اور وہ سب عاجز ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۴۸﴾ آسمانوں میں
اور زمین میں جو جاندار اور فرشتے ہیں، وہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ﴿۴۹﴾

﴿۱﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مختلف صورتیں ہیں: زمین میں دھنسا دیئے جائیں، چلتے پھرتے آندھی یا پتھر کی بارش کی شکل میں اچانک عذاب آجائے، یا پہلے آثار ظاہر ہوں اور پھر عذاب آئے —— ''یأخذهم علی تخوف'' کا ایک معنی یہی آخری صورت ہے کہ پہلے عذاب کے آثار لا کر انھیں خوفزدہ کیا جائے، پھر ان پر عذاب آجائے، ''تخوف'' سے ایک دوسرا معنی بھی مراد لیا گیا ہے کہ ان کے مال، مویشی، کھیتیاں اور بعض مفسرین کی رائے کے مطابق خود اس قوم کی تعداد گھٹتی چلی جائے، یہاں تک کہ پوری قوم کا نام ونشان مٹ جائے؛ چنانچہ مشہور محدث سعید ابن مسیب رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر لوگوں سے اس آیت کے معنی دریافت کئے، صحابہ عام طور پر خاموش رہے، مگر قبیلہ بنوہُذَیل کے ایک بوڑھے شخص کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ ہمارے قبیلہ کی زبان کا لفظ ہے، 'تَخَوُّف' کے معنی گھٹتے رہنے کے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ عربوں نے اپنے اشعار میں بھی اِس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے، انھوں نے عرض کیا: ہاں! اور ایک شاعر کا شعر بھی بطور دلیل کے پیش کیا، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱۰۸، مفاتیح الغیب: ۹/۵۳۵) اسی معنی کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے، موجودہ دور میں بہت سی قومیں وہ ہیں، جن کی نسلیں تیزی سے ختم ہوجاتی رہی ہیں اور وہ ناپید ہونے کے قریب ہیں، یورپ کے بعض ترقی یافتہ ملکوں میں اصل باشندوں کی شرحِ پیدائش صِفَر پر پہنچ گئی ہے، کیا عجب کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت ہو کہ جو قومیں پوری دنیا پر اپنی فتح مندی کا جھنڈا لہرا رہی ہیں، خود ان کا وجود تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔

﴿۲﴾ اللہ نے دنیا میں کچھ ایسی چیزیں پیدا کی ہیں، جو روشنی کے گزرنے میں رکاوٹ نہیں بنتیں، جیسے: ہوا، شیشے وغیرہ، یہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، ورنہ انسان مشقت سے دوچار ہوجاتا، اس کے مقابلہ بہت سی چیزیں ایسی بنائی ہیں، جو روشنی کو گزرنے سے روک دیتی ہیں اور ان کے ذریعے سائے بن جاتے ہیں، یہ بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، انسان اپنے آپ کو اور اپنے بہت سے افعال کو چھپانا چاہتا ہے، اس کو سکون، خلوت اور تنہائی مطلوب ہوتی ہے، اگر سایہ کا یہ قدرتی نظام نہ ہوتا تو ہر گھر ایک بڑے میدان کا کھلا ہوا حصہ نظر آتا اور انسان اپنے آپ کو بے سکون محسوس کرتا، سایہ دار چیزوں کا پایا جانا اور روشنی کے لحاظ سے ان کا دائیں بائیں آگے پیچھے جھکتے رہنا محض اللہ کی قدرت اور اسی کے حکم سے ہے۔

السجدة

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ
اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ
الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ
فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾
لِيَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ٙ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾

ع ۶ / ۱۲

وہ اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں ﴿۱﴾ اور جن باتوں کا حکم دیا جاتا ہے، ان کو انجام دیتے رہتے ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۵۰﴾ اللہ نے فرمایا: دو معبود نہ ٹھہرالو، معبود تو بس ایک ہی ہے؛ اس لئے مجھ ہی سے ڈرو، ﴿۳﴾ ﴿۵۱﴾ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، اور اسی کی فرمانبرداری کرنا لازم ہے، تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہو؟ ﴿۵۲﴾ اور تم کو جو کچھ بھی نعمت حاصل ہے، وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تم کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی کی طرف بلبلاتے ہو، ﴿۵۳﴾ اس کے بعد اللہ تم سے تکلیف دور کردیتے ہیں تو تم میں سے ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتا ہے؛ ﴿۵۴﴾ تاکہ جو نعمت ہم نے ان کو عطا کی ہے، اس کی ناشکری کریں، تو تھوڑا سا عیش کرلو، پھر جلد ہی تم کو معلوم ہوجائے گا۔ ﴿۵۵﴾

﴿۱﴾ ’’فوق‘‘ کے اصل معنی ’’اوپر‘‘ کے ہیں، بعض مفسرین نے ’’من فوقھم‘‘ سے عذاب مراد لیا ہے؛ کیوں کہ اکثر عذابِ الٰہی اوپر کی طرف سے آتا ہے، اسی معنی کے لحاظ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے اور بعض نے ’’قدرت‘‘ مراد لیا ہے؛ کیوں کہ قدرت وطاقت کو بھی اوپر ہونے اور بالادست ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے، (دیکھئے: قرطبی: ۱۰/۱۱۳) ایسی صورت میں ترجمہ ہوگا: ’’......قدرت سے......‘‘۔

﴿۲﴾ یعنی انسانوں اور جنوں کے علاوہ کائنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں، وہ سب مسلسل اللہ تعالیٰ کے احکام کو انجام دیتی رہتی ہیں، ان کی طرف سے کسی سرکشی اور نافرمانی کا اظہار نہیں ہوتا، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرے؛ کیوں کہ انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے، جیسے پوری ٹرین ایک رُخ پر چل رہی ہو اور ایک پہیا دوسرے رُخ پر چلنا چاہے تو اس سے نظام خراب ہوجائے گا؛ اسی طرح اگر انسان کائنات کے نظام سے ہٹ کر کوئی طریقہ اپنے لئے اختیار کرے تو یہ بگاڑ کا سبب ہوگا۔

﴿۳﴾ پارسیوں کا قرآن مجید کے نزول کے زمانہ سے ہی عقیدہ رہا ہے کہ دو خدا ہیں، ایک ’یزداں‘ جو اچھی چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور دوسرا ’اہرمن‘ جو بُری چیزوں کا پیدا کرنے والا، یہ اپنے آپ کو ’’زردتشت‘‘ نامی مذہبی پیشوا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ان کو اپنا پیغمبر قرار دیتے ہیں، آج کل یہ ’’ایزدی‘‘ کہلاتے ہیں اور عراق وغیرہ میں آباد ہیں، اس آیت میں ان کی صراحتاً تردید ہوگئی، اور بالواسطہ دوسرے مشرکین کی بھی؛ کہ جب دو خدا نہیں ہوسکتے تو دو سے زیادہ بدرجہ اولیٰ نہیں ہوسکتے۔

وَ يَجۡعَلُوۡنَ لِمَا لَا يَعۡلَمُوۡنَ نَصِيۡبًا مِّمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسۡـَٔلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ تَفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۶﴾
وَيَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰهِ الۡبَنٰتِ سُبۡحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمۡ مَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ
وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيۡمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى
هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ مَثَلُ
السَّوۡءِ ۚ وَلِلّٰهِ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى ؕ وَ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۶۰﴾ وَ لَوۡ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلۡمِهِمۡ ع ۱۰ / ۱۳
مَّا تَرَكَ عَلَيۡهَا مِنۡ دَآبَّةٍ وَّ لٰـكِنۡ يُّؤَخِّرُهُمۡ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا
يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

اوروہ ہماری دی ہوئی روزی میں سے ایک حصہ ان (بتوں) کے لئے مقرر کر لیتے ہیں، جن کے بارے میں ان کو کچھ علم نہیں ہے، خدا کی قسم! تم جو کچھ گھڑا کرتے تھے، ضرور ان کے بارے میں تم سے سوال ہوگا، ﴿۵۶﴾ اور وہ اللہ کے لئے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، جس سے اللہ کی ذات پاک ہے، اور خود اپنے لئے وہ ٹھہراتے ہیں، جو ان کو مرغوب ہیں (یعنی بیٹے)، ﴿۱﴾ ﴿۵۷﴾ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی (پیدا ہونے) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے، ﴿۵۸﴾ جو بری خبر اس کو سنائی گئی، اس کے باعث چھپتا پھرتا ہے کہ رسوائی قبول کرتے ہوئے اس کو رہنے دے یا اس کو مٹی میں دبا دے؟ کیا ہی برا اُن کا فیصلہ ہے! ﴿۲﴾ ﴿۵۹﴾ جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے، ان کی بری مثال ہے، اور اللہ کے لئے اعلیٰ درجہ کی صفات ہیں، ﴿۳﴾ اور وہ غالب اور حکمت والے ہیں، ﴿۶۰﴾ اگر اللہ نے لوگوں کی زیادتی کی وجہ سے ان کی پکڑ فرمائی ہوتی تو زمین پر کوئی چلنے والا نہ چھوڑتے؛ لیکن اللہ ان کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دے رہے ہیں، پھر جب ان کا وقت آپہنچے گا تو نہ ایک لمحہ پیچھے رہ سکیں گے اور نہ ایک لمحہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ﴿۶۱﴾

﴿۱﴾ قرآن مجید نے اِن مشرکانہ اعمال وافکار کا بار بار ذکر کیا ہے، حاصل سب کا یہ ہے کہ نہ مخلوق کو خالق کا درجہ دینا درست ہے اور نہ جن چیزوں کو نقص سمجھا جاتا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا روا ہے۔

﴿۲﴾ یہ تو قدیم جاہلیت ہے؛ لیکن افسوس کہ عصر حاضر کی جدید جاہلیت میں بھی دختر کُشی کا سلسلہ جاری ہے، ہندوستان میں اس وقت ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ میں نوسو سے کچھ ہی زیادہ لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اور بعض ریاستوں میں تو ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ لڑکیوں کی پیدائش چھ سو سے کچھ زیادہ ہے، اس طرح ماں کے رحم میں ہی بچیوں کو مار دیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور مردوں کی بڑھتی جاتی ہے، مستقبل میں اس کی وجہ سے جو سماجی بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں —— ایسے واقعات کا بنیادی سبب برصغیر میں شادی میں فضول خرچی، لڑکی والوں پر جہیز، رقمی مطالبات اور ضیافت کا بوجھ ڈالنا ہے، شاید ہم اسی جاہلیت کی طرف لوٹ رہے ہیں، جس کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

﴿۳﴾ تفسیر قرطبی میں اس کا یہی معنی بیان کیا گیا ہے: "أي الصفة العليا بأنه خالق، رازق، قادر و مجاز"۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱۱۹)

وَ یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰہِ مَا یَکۡرَہُوۡنَ وَ تَصِفُ اَلۡسِنَتُہُمُ الۡکَذِبَ اَنَّ لَہُمُ الۡحُسۡنٰی ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ
لَہُمُ النَّارَ وَ اَنَّہُمۡ مُّفۡرَطُوۡنَ ﴿۶۲﴾ تَاللّٰہِ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَزَیَّنَ لَہُمُ
الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَہُوَ وَلِیُّہُمُ الۡیَوۡمَ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۶۳﴾ وَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ
اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَہُمُ الَّذِی اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَ اللّٰہُ اَنۡزَلَ مِنَ
ع ۸ ۱۵ ۱۴ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۵﴾ وَ اِنَّ
لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا
سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

وہ اللہ کے لئے وہ چیزیں مقرر کرتے ہیں، جو خود ان کو پسند نہیں ہیں، «۱» اور ان کی زبانیں جھوٹا دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے لئے بھلائی ہے، یقیناً ان کے لئے دوزخ ہے اور بے شک وہ پہلے (دوزخ میں) بھیجے جائیں گے، «۲» ﴿۶۲﴾ خدا کی قسم! ہم نے آپ سے پہلے بھی مختلف گروہوں کی طرف پیغمبر بھیجے، پھر شیطان نے ان کے سامنے ان کی بداعمالیوں کو خوش نما کر کے دیکھا دیا، تو آج بھی شیطان ہی ان کا رفیق ہے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، ﴿۶۳﴾ اور ہم نے آپ پر کتاب اسی لئے اُتاری ہے کہ جن باتوں میں یہ جھگڑ رہے تھے، اُن باتوں (کی حقیقت) کو آپ اِن پر واضح کردیں اور یہ ایمان لانے والوں کے لئے سراپا ہدایت و رحمت ہے، ﴿۶۴﴾ اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی عطا فرمائی، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے، جو (نصیحت کے جذبہ سے) سنا کرتے ہیں، ﴿۶۵﴾ اور تمہارے لئے چوپایوں میں بھی عبرت کا سامان ہے، ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے، ہم ان ہی کے درمیان میں سے خالص اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دُودھ مہیا کرتے ہیں۔ «۳» ﴿۶۶﴾

«۱» یعنی ایک تو وہ بیٹیوں کو برا سمجھتے ہیں، پھر دوسری غلطی یہ ہے کہ جو چیز ان کی نظر میں حقیر ہے، اس کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔

«۲» 'مُفۡرَطُون' کے معنی ہیں دوزخ میں پہلے بھیجے گئے لوگ ''معجلون علی النار مقدمون علیهم''۔
(تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۲۰، مفاتیح الغیب: ۹/ ۵۶۴)

«۳» یعنی جانوروں کا معدہ فُضلہ اور خون کا مخزن ہے، یہیں یہ چیزیں تیار ہوتی ہیں اور یہی خون دودھ کی شکل اختیار کرتا ہے؛ اسی لئے عورت کو جب دودھ جاری ہوتا ہے تو حیض نہیں آتا، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ ایسی بدبودار، جلد سڑ جانے والی اور ناپاک شئے سے دودھ جیسی نفیس غذا تیار ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن جانوروں کا گوشت حلال ہے، ان کا دودھ بھی حلال ہے؛ کیوں کہ وہ اسی جانور کا ایک حصہ ہے، اس سے دودھ کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے؛ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کی اور چیزوں کے لئے دُعاء سکھائی کہ اس میں برکت عطا فرمائیے اور اس سے بہتر کھانے کی چیز دیجئے؛ لیکن دودھ پینے کی دُعاء سکھائی کہ اس میں برکت دیجئے اور مزید دودھ عطا فرمائیے: ''اللّٰھم بارک لنا فیه وزد منه'' (أبی داود، کتاب الاشربة، باب مایقول إذا شرب اللبن: ۳۷۳۰) گویا دودھ سب سے بہتر غذا ہے؛ اس لئے اس سے بہتر کی دُعاء نہیں کرائی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس کو انسان ←

وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِيۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَكَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَ اَوۡحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِىۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعۡرِشُوۡنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِىۡ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُكِىۡ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِيۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

نیز کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم شراب اور عمدہ کھانے کی چیز تیار کرتے ہو، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے، جو سمجھ رکھتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۶۷﴾ اور آپ کے پروردگار نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں، گھروں، درختوں اور لوگوں کے ڈالے ہوئے چھپروں میں گھر بنالے، ﴿۶۸﴾ پھر ہر طرح کے پھل کھا، پھر اپنے پروردگار کے ہموار کئے ہوئے راستوں میں چل، ان کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے، جو غور کیا کرتے ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۹﴾

← اور جانداروں کی پہلی غذا بنایا گیا ہے، جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے لئے مہیا کی جاتی ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۲۷) علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کی روشنی میں لکھا ہے کہ لذیذ چیزوں کا کھانا زہد وتقویٰ کے خلاف نہیں ہے، (حوالہ سابق) اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جب کسی شئے کی حقیقت بدل جائے، یعنی صورت بھی تبدیل ہوجائے اور صفات بھی بدل جائیں تو پھر ان کا حکم بھی بدل جاتا ہے، جیسے گوبر سے خون اور خون سے دودھ پیدا ہوا؛ لیکن جب اس نے دودھ کی شکل اختیار کرلی تو اب یہ پاک اور حلال ہوگیا۔

﴿۱﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے شراب کا بھی ذکر فرمایا، اس سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ شراب حرام نہیں ہے؛ لیکن یہ درست نہیں ہے، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۲۸) اور یہ بات بالکل واضح ہے؛ اس لئے کہ سبھوں کا اتفاق ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں اُتاری گئی ہے؛ جب کہ شراب کے حرام ہونے کا حکم مدینہ منورہ میں آیا ہے؛ لہٰذا چوں کہ اس وقت شراب کی اجازت تھی، اس لئے بہ طور نعمت اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ قدرتی طور پر پیدا ہونے والی غذا جیسے دودھ اور پھل ہے، اسی طرح شہد بھی ہے، شہد غذا کے کام بھی آتا ہے اور اس میں شفاء بھی ہے؛ کیوں کہ شہد مکھیاں مختلف صحت بخش پھلوں اور پھولوں سے رس حاصل کرتی ہیں اور ان کا شیرہ بنا کر انسان کے حوالے کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک غیر معمولی صلاحیت یہ رکھی ہے کہ شہد کے اندر سڑن نہیں پیدا ہوتی؛ اسی لئے یونانی دواؤں کو دیرپا بنانے کے لئے صدیوں سے شہد کا استعمال ہوتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو شہد جیسی نعمت سے نوازنے کے لئے مکھی جیسی چھوٹی مخلوق کو کیا کیا تدبیریں سُجھائی ہیں؟ وہ مطلوبہ پھلوں اور پھولوں تک پہنچنے کے لئے دور دور تک سفر کرتی ہے، پھر اپنی منزل کو واپس آتی ہے، گویا فضاء میں پھیلے ہوئے سارے راستے اسے یاد ہیں، پھر زمین پر چلنے والوں کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے پہاڑوں، گھر کی چھتوں اور درخت کی ٹہنیوں سے متصل اپنا گھونسلہ تعمیر کرتی ہے، جو انجینئرنگ کا ایک نادر نمونہ ہے، اپنے نظام کو قائم رکھنے کے لئے ساری مکھیاں ایک ملکہ کے تحت کام کرتی ہیں اور اگر کسی اجنبی نے داخل ہونے کی کوشش کی تو سب مل کر دفاع کرتی ہیں، غرض کہ ←

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ
ع ۹ ۱۵ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۷۰﴾ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا
بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر وہی تم کو موت دیتے ہیں اور تم میں سے بعض نکمی عمر (یعنی: سخت بوڑھاپے) کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں؛ تا کہ جان لینے کے بعد پھر کچھ نہ جانے، بے شک اللہ بہت جاننے والے اور بہت قدرت والے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۷۰﴾ اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ زیادہ روزی دی ہے، تو جن کو زیادہ روزی دی گئی ہے، وہ اپنی روزی اپنے غلاموں کو لوٹا نہیں دیتے کہ وہ سب روزی میں برابر ہو جائیں، کیا وہ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں؟ ﴿۲﴾ ﴿۷۱﴾

← ایک غیر معمولی نظام ہے، جو مسلسل اپنا کام کر رہا ہے، یہ خدا کی نعمت بھی ہے اور خدا کی معرفت کا ایک ذریعہ بھی، —— اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شہد میں شفاء رکھی ہے؛ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بیماری کے لئے شفاء ہو، جیسے کہا جائے کہ بادام صحت کے لئے مفید ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر مریض کے لئے بادام کھانا مفید ہے، نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک طریقہ سے استعمال کی جائے تو وہ مفید ہوتی ہے اور دوسرے طریقے پر اس کے استعمال سے فائدہ نہیں پہنچتا؛ اس لئے اگر کسی خاص مرض میں شہد سے فائدہ نہ ہو تو وہ قرآن مجید کے اس بیان کے خلاف نہیں —— اللہ تعالیٰ نے شہد کا ایک نعمت کے طور پر ذکر کیا ہے کہ اس میں لوگوں کے لئے شفاء بھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علاج کرانا تقویٰ اور توکل کے خلاف نہیں ہے؛ بلکہ فقہاء کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ علاج بعض حالات میں واجب، بعض حالات میں مستحب اور کم سے کم جائز ہے۔ (دیکھئے: مجموعہ فتاویٰ لابن تیمیہ: ۱۸/۱۲)

﴿۱﴾ یعنی انسان بچپن میں عقل و شعور نہیں رکھتا اور باتوں کو سمجھ نہیں پاتا، پھر جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، عقل بھی پختہ ہوتی جاتی ہے، جب انسان بوڑھاپے میں قدم رکھتا ہے تو جسمانی صلاحیت کے ساتھ ساتھ دماغی صلاحیت میں بھی فرق آنے لگتا ہے، یاد داشت کمزور ہو جاتی ہے، قوت برداشت کم ہو جاتی ہے، کسی بات کا سمجھنا اس کے لئے دشوار ہو جاتا ہے، یہ تو عمومی کیفیت ہے؛ لیکن بعض لوگ وہ ہیں جو طویل عمر تک زندہ رہتے ہیں اور عقل و شعور کی قوت بہت زیادہ متاثر ہو جاتی ہے، اس میں اللہ کی قدرت کا اظہار بھی ہے کہ بے عقل بچے کو عقل مند و دانا بنا دیتے ہیں اور سمجھدار و دانا جوان کو جب چاہتے ہیں پھر بچپن کی کیفیت کی طرف لوٹا دیتے ہیں، نعمت دینا اور لینا اللہ کے ہاتھ میں ہے؛ اس میں آخرت کی بھی دلیل ہے کہ جب اللہ بوڑھاپے میں بچپن کو لوٹا سکتے ہیں تو موت کے بعد زندگی کو بھی واپس لا سکتے ہیں —— درازیٔ عمر اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ہے، اگر ہوش و حواس بحال ہو اور انسان کے نیک عمل میں اضافہ ہوتا جائے، اور اگر عقل و شعور اور ہوش و حواس کو کھو دے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش و مصیبت بھی ہے؛ چنانچہ حضرت سعد بن وقاص ﷛ سے مروی ہے: ’’أعوذ بک أن أرد إلی أرذل العمر‘‘ (بخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من البخل، حدیث نمبر: ۶۰۰۹) بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ جو لوگ حدیث سے شغف رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ آخری عمر تک ان کے ہوش و حواس کو باقی رکھتے ہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے حق میں تر و تازہ رہنے کی دُعاء فرمائی ہے۔ (ابی داود، کتاب العلم، باب فضل نشر العلوم: ۳۶۶۲)

﴿۲﴾ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کا مالک ہو تو یہ ملکیت کم درجہ کی ہوتی ہے، اس درجہ کی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر حاصل ہے؛ ←

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَ حَفَدَةً وَّرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَ بِنِعۡمَتِ اللّٰهِ هُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ رِزۡقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰهِ الۡاَمۡثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّ مَنۡ رَّزَقۡنٰهُ مِنَّا رِزۡقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنۡفِقُ مِنۡهُ سِرًّا وَّ جَهۡرًا ؕ هَلۡ يَسۡتَوٗنَ ؕ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۵﴾

اور اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنادیں، تمہاری بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تم کو کھانے کے لئے عمدہ چیزیں عطا فرمائیں، کیا یہ لوگ جھوٹی باتوں کا یقین کرتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟ ﴿۷۲﴾ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں، جو اُن کو آسمان وزمین میں سے ذرا بھی روزی دینے کا اختیار نہیں رکھتے اور نہ اس کی طاقت رکھتے ہیں، ﴿۷۳﴾ لہٰذا اللہ کے لئے مثالیں نہ تراشا کرو، ﴿۱﴾ بے شک اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے، ﴿۷۴﴾ اللہ مثال دیتے ہیں کہ ایک غلام ہے، جو دوسرے کی ملکیت میں ہے، وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور ایک ایسا شخص ہے جس کو ہم نے عمدہ روزی دی ہے، وہ اس میں سے چھپے اور کُھلے خرچ کرتا ہے، کیا یہ برابر ہوسکتے ہیں؟ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں؛ لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۷۵﴾

← لیکن اس کے باوجود انسان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ غلام کو دے دے اور دونوں ایک سطح پر آجائیں، جب انسان کو یہ گوارا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات کیسے پسند آسکتی ہے کہ وہ اپنی قدرت اور ملکیت کا کچھ حصہ اپنے بندوں کو اس لئے منتقل کردیں کہ وہ خدا کے درجہ میں آجائیں اور ان کی بھی عبادت ہونے لگے — اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ مختلف انسانوں میں دنیا میں معاشی معیار کا جو فرق پایا جاتا ہے، وہ فطرت کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہی پیدا کیا ہوا ہے، اس کو مٹانے کی کوشش اور مکمل معاشی مساوات کی تدبیر ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتی۔

﴿۱﴾ یعنی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے مشابہ اور ہمسر قرار نہ دو؛ کیوں کہ مخلوق کا کوئی بھی فرد خالق تعالیٰ کی طرح نہیں ہوسکتا۔

﴿۲﴾ غلام کی مثال مخلوق کی سی ہے، جس کے طاقت اور اختیار میں کچھ نہیں ہے، اور آزاد شخص کی مثال ایک درجہ میں خالق کی سی ہے، جو مال ودولت کا مالک ہے اور اس میں سے خرچ کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے، تو جب ایک آزاد اور غلام برابر نہیں ہوسکتے تو خالق اور مخلوق کیسے برابر ہوسکتے ہیں؟ پھر کسی انسان کے لئے یہ بات کیوں کر درست ہوسکتی ہے کہ وہ عبادت میں خالق کے ساتھ مخلوق کو شامل کرے؟؟

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ ۙ اَيۡنَمَا
يُوَجِّهۡهُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ ؕ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ ۙ وَ مَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ
ع ۱۰ ۶ ۱۶ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۷۶﴾ وَ لِلّٰهِ غَيۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ مَاۤ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ
اَقۡرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۷۷﴾ وَ اللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ
شَيۡـًٔـا ۙ وَّ جَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۷۸﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى
الطَّيۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ
يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُيُوۡتًا
تَسۡتَخِفُّوۡنَهَا يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَ يَوۡمَ اِقَامَتِكُمۡ ۙ وَ مِنۡ اَصۡوَافِهَا وَ اَوۡبَارِهَا وَ اَشۡعَارِهَاۤ اَثَاثًا
وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۸۰﴾

اسی طرح اللہ نے مثال بیان فرمائی کہ دو آدمی ہیں، ان میں کا ایک گونگا ہے، کچھ کام نہیں کر سکتا اور اپنے آقا پر بوجھ ہے، اسے جہاں بھیجئے، درست کام کر کے نہیں لاتا، کیا وہ اور وہ شخص جو انصاف کا حکم دے اور خود بھی سیدھے راستہ پر قائم ہو، برابر ہو سکتا ہے؟ ﴿۱﴾ ﴿۷۶﴾ اللہ ہی کو آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کا علم ہے اور قیامت کا معاملہ تو بس ایسا ہے جیسے: آنکھ کا جھپکنا؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، ﴿۷۷﴾ اللہ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے پیدا فرمایا، جب تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے؛ تاکہ تم شکر ادا کرو، ﴿۷۸﴾ کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا، جو آسمان کی فضا میں مسخر ہیں، ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھامتا، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو ایمان لاتے ہیں، ﴿۷۹﴾ اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو سکون کی جگہ بنا دیا اور چوپایوں کے چمڑوں سے تمہارے لئے ایسے ڈیرے بنا دیئے، جن کو (سفر میں) چلنے کے دن اور ٹھہرنے کے دن ہلکا محسوس کرتے ہو، نیز بھیڑوں کے اُون، اُونٹوں کی بریوں اور بکریوں کے بالوں سے بہت سے سامان اور ایک وقت تک نفع کی چیزیں پیدا فرما دیں۔ ﴿۸۰﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ مختلف مثالوں سے توحید کے عقیدہ کو واضح فرماتے ہیں، یہ اسی سلسلے کی ایک اور مثال ہے کہ ایک شخص علم وعمل کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہو، وہ انصاف کی باتوں کا حکم بھی دیتا ہے اور خود بھی اس پر قائم رہتا ہے، اور دوسرا شخص گونگا بہرا ہے، قرآن مجید میں اگرچہ صرف گونگا کا لفظ آیا؛ لیکن گونگے عام طور پر بہرے بھی ہوتے ہیں، وہ نہ سن سکتا ہے کہ کسی کی بات سمجھ سکے اور نہ بول سکتا ہے کہ کسی سے اپنی بات کہہ سکے، کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ بے حد قدرت اور علم و دانائی والے ہیں اور یہ بت نہ کوئی طاقت رکھتے ہیں اور نہ کوئی عقل و شعور، پھر کیسے ان بتوں کو خدا کے درجہ میں رکھ کر ان کی عبادت کرنا درست ہو سکتا ہے؟

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ
سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ
لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ ع ۱۱ ۷ ۱۷
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اللہ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوق کے سایے بنا دیئے، پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنا دیں، اور تمہارے لئے ایسے لباس بنائے جو تم کو گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس بھی بنائے جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح اللہ تم پر اپنی نعمت پوری فرماتے ہیں؛ تاکہ تم فرمانبردار ہو جاؤ ﴿۱﴾ ﴿۸۱﴾ پھر بھی اگر وہ منھ موڑتے ہیں تو آپ کے ذمہ تو صرف وضاحت کے ساتھ پیغام پہنچا دینا ہے، ﴿۸۲﴾ وہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں، پھر بھی ان سے انجان ہو جاتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لوگ ناشکری کرنے والے ہیں، ﴿۸۳﴾ اور جس دن ہم ہر اُمت میں سے ایک ایک گواہ کھڑا کر دیں گے تو پھر کفر کرنے والوں کو نہ (معذرت کرنے کی) اجازت دی جائے گی اور نہ اللہ کو راضی کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا ﴿۸۴﴾ نیز جب ظالم لوگ عذاب دیکھ لیں گے تو نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ ﴿۸۵﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اپنی قدرت کا بھی ذکر فرمایا ہے اور اپنی نعمتوں کا بھی، یہ ساری نعمتیں ایسی ہیں کہ انسان دن رات ان کو دیکھتا ہے اور ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے، ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے اور اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سر نہ جھکائے کہ یہ بات ناانصافی کی ہے کہ پائے تو کسی اور سے اور اقرار کسی اور کا کرے —— ان نعمتوں کے ذیل میں ان چیزوں کا بھی ذکر آ گیا، جو جانوروں کے چمڑے اور بالوں سے تیار کی جاتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جانور کے اجزاء سے لباس اور دوسری ضروریات کی چیزیں تیار کرنا اور ان سے فائدہ اُٹھانا جائز ہے، اور جانور کا لفظ مطلق ہے، حلال جانور کی قید نہیں؛ لہٰذا جانور حلال ہو یا حرام، جب کسی تدبیر کے ذریعے اس کی آلائش کو صاف کر دیا جائے جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''دِباغت'' کہتے ہیں تو اب پاک ہونے کی وجہ سے ان کا استعمال جائز ہوگا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کچے چمڑے کو دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے؛ البتہ انسان اور سور کے چمڑے کا کسی بھی حال میں استعمال جائز نہیں، انسان اس لئے کہ وہ قابل احترام ہے اور اس کے چمڑے کا استعمال احترام و توقیر کے خلاف ہے اور سور اس لئے کہ اس کا پورا جسم ناپاک ہے اور کسی تدبیر سے پاک نہیں ہو سکتا۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِیْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ
الثلثة دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ۚ وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ یَوْمَىٕذِ ِالسَّلَمَ وَ ضَلَّ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ
الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَ یَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
وَجِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً
ع ۱۲/۶ ۱۸ وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۸۹﴾ؑ

اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو بول اُٹھیں گے : اے ہمارے پروردگار ! یہی تو ہیں ہمارے وہ شرکاء جن کو ہم آپ کے سوا پکارا کرتے تھے، تو شرکاء ان سے مخاطب ہو کر کہیں گے : یقیناً تم لوگ جھوٹے ہو، ﴿۸۶﴾ اور وہ اس دن اللہ کے سامنے فرمانبرداری کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ وہ بہتان باندھا کرتے تھے، وہ سب بھول جائیں گے، ﴿۸۷﴾ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، فساد مچانے کی وجہ سے ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے، ﴿۸۸﴾ اور وہ وقت یاد کئے جانے کے لائق ہے، جس دن ہم ہر اُمت میں ان ہی میں سے ان کے خلاف ایک گواہ کھڑا کردیں گے اور ان سب پر آپ کو گواہ بنائیں گے، ﴿۱﴾ ہم نے آپ پر کتاب اُتاری ہے، جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے، ﴿۲﴾ اور مسلمانوں کے حق میں ہدایت کا ذریعہ، رحمت کا باعث اور خوشخبری ہے۔ ﴿۸۹﴾

﴿۱﴾ یعنی یوں تو اللہ تعالیٰ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ گواہی کا مقصد تو کسی دیکھے ہوئے واقعے کی سچی خبر دینا ہے، اللہ سب سے زیادہ دیکھنے والے بھی ہیں، سب سے بڑھ کر باخبر بھی ہیں اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات کس کی ہوسکتی ہے؟ لیکن ایمان سے محروم لوگوں کو ابتداءً خود اپنی بات کہنے کا موقع دیا جائے گا، وہ یہاں بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنی حجت پوری کرنے کے لئے ہر اُمت میں آنے والے پیغمبر کو بطور گواہ کے کھڑا کردیں گے، پھر ان انبیاء پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنایا جائے گا اور آپ کہیں گے کہ قرآن مجید کی اطلاع کی بنیاد پر میں گواہی دیتا ہوں کہ انبیاء کرام نے توحید کی طرف دعوت دی تھی اور اِن لوگوں نے ان کی دعوت کو جھٹلایا تھا۔

﴿۲﴾ قرآن مجید کے ہر چیز کو واضح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین وشریعت سے متعلق تمام باتوں کو واضح کرتا ہے، جو اس کتاب کے اُتارے جانے کا اصل مقصود ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس وٹکنالوجی اور کائنات کے مادی حقائق سے متعلق تمام باتیں بھی بتادی گئی ہیں، پھر دینی وشرعی اُمور کی وضاحت کا بھی طریقہ یہ ہے کہ اس نے عقائد کو کھول کھول کر بیان کیا ہے؛ تا کہ اس میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہے؛ کیوں کہ عقائد کی حیثیت اسلام کی بنیاد کی ہے اور یہ مدارِ نجات ہیں، جب کہ عملی زندگی سے متعلق شرعی احکام کو دو طریقوں پر واضح فرمایا گیا ہے، کہیں تو جزوی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں، جیسے میراث کے احکام، نکاح کے حرام رشتے وغیرہ، ←

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

بے شک اللہ عدل کا، احسان کا اور قرابت داروں کے ساتھ مالی اعانت کا حکم دیتے ہیں، بے حیائی، بری بات اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، تم کو نصیحت فرماتے ہیں؛ تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔ ﴿۱﴾ ﴿۹۰﴾

← اور بقیہ احکام کے لئے اُصول بیان کردیئے گئے ہیں، مشہور مفسر امام رازی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید ہی سے اُمت کے اجماع، حدیث اور قیاس کا معتبر ہونا ثابت ہے؛ لہٰذا اگر ان میں سے کسی ذریعہ سے کوئی حکم ثابت ہوتا ہے تو وہ قرآن مجید ہی سے ثابت ہونے والا حکم ہے، (مفاتیح الغیب: ۹/ ۶۱۴) غرض کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام احکام شرعیہ کے جاننے کے لئے قرآن کافی ہے، حدیث کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ بعض منکرینِ حدیث کہا کرتے تھے۔

﴿۱﴾ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رشد و ہدایت اور خیر و بھلائی کے پانے کے لئے یہ سب سے جامع ترین آیت ہے (مفاتیح الغیب: ۹/ ۶۱۵) اس میں اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کا حکم دیا ہے: عدل، احسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک، عربی زبان میں عدل کے معنی ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھنے کے ہیں، گویا عدل یہ ہے کہ جس کا جو حق ہے، وہ اس کو ادا کردیا جائے، اس میں کمی نہ کی جائے، اس کے مقابلہ میں عربی زبان میں ''ظلم'' کا لفظ آتا ہے، جس کا معنی کسی چیز کو اپنے صحیح موقع محل پر نہ رکھنے کے ہیں؛ لہٰذا صرف اللہ کے سامنے سر جھکانا عدل ہے؛ کیوں کہ عبادت کا صحیح محل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اللہ کے سوا کسی اور کو معبود ماننا ظلم ہے، خدا کے سوا کوئی اس بات کا محل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے، اسی طرح شوہر و بیوی، والدین و اولاد، قرابت دار اور پڑوسی، سماج کے ضرورت مند لوگ، اگر ان کو ان کا حق دے دیا جائے تو یہ عدل ہوگا، اگر انسان دوسرے کا حق لے لے یا اس کو اس کے حق سے کم دینا چاہے تو یہ ظلم ہے، اس طرح غور کریں تو انسان کی پوری زندگی عدل اور ظلم کے درمیان ہے، اگر وہ قرآن و حدیث کی ہدایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے اور اللہ کے دوسرے بندوں کے حقوق ادا کر رہا ہے تو وہ عدل پر قائم ہے اور اگر حق تلفی کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ ظلم کے راستے پر ہے، تیسرا طریقہ وہ ہے جسے اس آیت میں ''احسان'' کہا گیا ہے، عدل ان چیزوں پر عمل کرنا ہے جو انسان پر واجب ہے اور احسان اس سے آگے بڑھ کر مستحب اور مستحسن طریقہ کو اختیار کرنا ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''العدل الانصاف والاحسان التفضل'' (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۶۱)؛ لہٰذا اپنا حصہ حق سے کم لینا اور دوسرے کو اس کے حصہ سے بڑھ کر دینا 'احسان' ہے، کسی عبادت کو اس کی ظاہری کیفیت کے ساتھ ادا کردینا، جیسے نماز میں قیام، رُکوع، سجدہ وغیرہ عدل ہے کہ اس سے نماز درست ہوجاتی ہے اور نماز میں خشوع و خضوع کو قائم رکھنا، اس بات کے استحضار کو برقرار رکھنا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم سے کم اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہے ہیں ''احسان'' ہے، پس احسان کا تعلق بھی زندگی کے تمام مسائل سے ہے؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے ہر چیز میں احسان کا حکم دیا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی قتل کا مستحق ہو اور اسے قتل کرو تو وہ بھی ''احسان'' کے ساتھ، یعنی بہتر طریقہ پر، کہ اسے تکلیف پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے، اور اگر کسی جانور کو ذبح کرنا ہو تو وہ بھی احسان کے ساتھ، یعنی اس طور پر کہ کم سے کم تکلیف پہنچے ''ان اللہ کتب الاحسان علی کل شئ الخ'' (مسلم، کتاب الصید والذبائح، باب الامر باحسان الذبح والقتل: ۵۱۶۷) انسان کو اختلاف کی نوبت زیادہ تر قرابت داروں کے ساتھ آتی ہے اور اکثر ان ہی کے ساتھ ←

وَ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدۡتُّمۡ وَ لَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَ قَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ
عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۹۱﴾ وَ لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّتِىۡ نَقَضَتۡ غَزۡلَهَا مِنۡۢ بَعۡدِ
قُوَّةٍ اَنۡكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوۡنَ اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًۢا بَيۡنَكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرۡبٰى مِنۡ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا
يَبۡلُوۡكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ مَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۹۲﴾ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنۡ يُّضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسۡـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنۡتُمۡ
تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًۢا بَيۡنَكُمۡ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِهَا وَ تَذُوۡقُوا
السُّوۡۤءَ بِمَا صَدَدۡتُّمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۹۴﴾ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۵﴾

اور جب تم آپس میں عہد کر چکے ہو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور پختہ قسمیں کھانے کے بعد انھیں توڑ نہ ڈالو:
حالاں کہ تم اپنے آپ پر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو، بے شک اللہ تمہارے تمام کاموں سے واقف ہے، ﴿۹۱﴾ اور اس عورت
کی طرح نہ ہو جاؤ، جس نے محنت کرنے کے بعد اپنے کاتے ہوئے سوت کو تار تار کر ڈالا کہ تم اپنی قسموں کو باہمی
فساد کا ذریعہ بنانے لگو، محض اس لئے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے، بس اللہ اس سے تمہاری آزمائش
کر رہے ہیں اور اللہ قیامت کے دن تمہارے سامنے ان باتوں کو اچھی طرح واضح فرمادیں گے؛ جن میں تم
اختلاف کر رہے تھے، ﴿۹۲﴾ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتے؛ لیکن اللہ جسے چاہتے ہیں،
ہدایت سے محروم رکھتے ہیں، اور جسے چاہتے ہیں، ہدایت سے نواز دیتے ہیں، اور تم جو کچھ کرتے ہو تم سے اس کے
بارے میں پوچھ ہو کر رہے گی، ﴿۹۳﴾ اور اپنی قسموں کو باہمی فساد کا سبب نہ بناؤ کہ قدم جمنے کے بعد پھر پھسل جائیں
اور تم کو اللہ کے راستے سے روکنے کی وجہ سے سزا بھگتنی پڑے اور تم کو بڑا عذاب ہوگا، ﴿۹۴﴾ اور اللہ کے عہد کو تھوڑے سے
نفع کے بدلے بیچ نہ ڈالو، بے شک اللہ کے پاس جو کچھ ہے، وہ تمہارے لئے کہیں بہتر ہے، اگر تم سمجھ دار ہو۔ ﴿۹۵﴾

← مفادات کا ٹکراؤ ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا — اس آیت میں تین باتوں سے منع فرمایا گیا ہے، ان تینوں کا ماحصل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے؛ لیکن نوعیت کا تھوڑا سا فرق ملحوظ ہے، فحشاء کے معنی ایسے گناہوں کے ہیں، جن میں بے حیائی کا پہلو بھی ہو، جیسے: زنا، خواہ آپسی رضامندی سے ہو یا جبر واکراہ کے ساتھ، ہم جنسی، عریانیت، فحش لٹریچر، بے حیائی پر مبنی فلمیں اور اشتہار، ڈرامے اور غزلیں، مخرب اخلاق گانے وغیرہ، سب اس میں شامل ہیں — 'بغی' سے مراد ظلم، دوسرے کے ساتھ زیادتی اور تکبر وغیرہ ہے، یعنی وہ گناہ جن کا تعلق دوسرے انسانوں کے حقوق سے ہے — اور ''منکر''، میں وہ تمام باتیں شامل ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۶۷) یہ آیت گویا ایک مسلمان کی زندگی کے لئے بنیادی ہدایت نامہ ہے، جس میں تمام نیکیوں اور گناہوں کی طرف اشارہ فرمادیا گیا ہے۔

مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا
كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ
وَ لَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ
مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ﴿۹۸﴾

تمہارے پاس جو کچھ ہے، وہ ختم ہوجائے گا اور اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ باقی رہے گا، اور جو لوگ ثابت قدم ہیں، ہم ان کو ان کے بہتر عمل پر ضرور ثواب عطا کریں گے، ﴿۱﴾ ﴿۹۶﴾ مرد ہو یا عورت، اگر مسلمان ہو تو جو بھی نیک عمل کرے گا، ہم اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے اور ہم ان کو ان کے اچھے کاموں کا اجر ضرور عطا فرمائیں گے، ﴿۲﴾ ﴿۹۷﴾ تو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں۔ ﴿۹۸﴾

﴿۱﴾ گذشتہ آیت میں عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے، عدل کے تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان جو وعدہ کرے، اس کو پورا کیا جائے؛ چنانچہ ان آیات میں مختلف پہلوؤں سے وعدہ وفا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، پہلی بات یہ کہی گئی کہ جب تم آپس میں کسی جائز بات کا وعدہ کرتے ہو، اس پر قسم کھاتے ہو، پھر وعدہ خلافی کر جاتے ہو تو تم نے صرف انسان ہی سے نہیں، اللہ سے بھی وعدہ خلافی کی، اب اس وعدہ میں وہ عہد بھی شامل ہے، جو کسی فرد سے ہو، اور وہ بھی جو کسی ملک و قوم سے ہو، دوسرے: اس کو ایک مثال سے سمجھایا گیا کہ مکہ میں ایک کم عقل خاتون تھیں، جو خوب محنت سے دھاگے بُنتی تھیں اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱۷۱) ان کی یہ ناسمجھی لوگوں میں مشہور تھی، تو اس خاتون کی مثال دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ کی قسم کھا کر اور خوب زور دے کر وعدہ کرنا اور پھر اسے توڑ ڈالنا نہ صرف غیر اخلاقی فعل ہے؛ بلکہ بے عقلی کا کام بھی ہے، تیسرے: لوگوں کی ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ ایک گروہ سے معاہدہ کر لیتے؛ لیکن پھر اس سے مضبوط دوسرا گروہ سامنے آگیا تو اس سے معاہدہ کر لیتے اور پہلے گروہ سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالتے (مفاتیح الغیب: ۹/۶۲۶) اس پر بھی نکیر کی گئی کہ اگر ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھا ہوا ہو تو پہلے معاہدہ کو توڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، چوتھے: ایسا نہ ہو کہ تم نے کوئی عہد کر رکھا ہو اور اس عہد کو توڑ دینے کی صورت میں کچھ وقتی مادی فائدہ حاصل ہو سکتا ہو تو محض اس مادی نفع کے لئے اپنے عہد کو توڑ ڈالو — غرض کہ ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ جس بات کا عہد کرے، خواہ مسلمان سے کرے یا غیر مسلم سے، اس کا تعلق دنیا سے ہو یا دین سے، اس عہد کو پورا کرنے میں ظاہری طور پر نفع ہو یا نقصان، ہر صورت میں انسان اپنے عہد کو پورا کرے، سوائے اس کے کہ ایسی بات کا عہد کر لیا گیا ہو جو شرعاً جائز نہ ہو۔

﴿۲﴾ یعنی اسلام کی نظر میں مردوں اور عورتوں کا مستقل وجود ہے، اور دونوں اپنی ذات اور اپنے مال کے بارے میں خود مختار ہیں، جب تک کہ اس سے شریعت کا کوئی حکم نہ ٹوٹ جائے، قرآن مجید کے اس ارشاد کو اس پس منظر میں دیکھنا چاہئے کہ اسلام سے پہلے عورتوں کو مرد کی املاک کا درجہ دیا جاتا تھا اور ان کو ایک مستقل وجود کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ
يَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ
قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ع ۱۳ / ۱۱ / ۱۹

کہ ایمان والوں پر اس کا کوئی زور نہیں چل پاتا اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۹۹﴾ یقیناً شیطان کا زور ان لوگوں پر چلتا ہے، جو اس کو دوست بناتے ہیں اور جو اس کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، ﴿۱۰۰﴾ اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم لاتے ہیں —— اور اللہ اس حکم سے خوب واقف ہیں جو اُتارتے ہیں —— تو کفر کرنے والے کہتے ہیں کہ تم تو اپنی طرف سے بنالائے ہو (نہیں)؛ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ علم سے محروم ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۰۱﴾

﴿۱﴾ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور شیطان کو اس سے زیادہ کسی بات سے گرانی نہیں ہوتی کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرلے، جس کا سب سے قوی ذریعہ قرآن مجید کی تلاوت ہے؛ اس لئے وہ قرآن پڑھنے والوں کو بہکاتا ہے، تلاوت سے غافل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور گمراہی کی طرف لے جاتا ہے؛ چنانچہ شیطان کی اس کارستانی کی مختلف شکلیں دن رات سامنے آتی رہی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے خاص طور پر قرآن مجید پڑھنے سے پہلے تعوذ (أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنے کا حکم دیا ہے، چاہے قرآن نماز کے اندر پڑھا جائے یا باہر، فقہاء متفق ہیں کہ تعوذ کا پڑھنا مستحب ہے؛ بلکہ عطاء نامی مشہور فقیہ کے نزدیک نماز میں بھی اور نماز سے باہر بھی تلاوتِ قرآن سے پہلے ''أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'' پڑھنا واجب ہے، (مفاتیح الغیب: ۹؍ ۲۳۳) نماز سے باہر تو جیسے چاہے تعوذ پڑھ سکتا ہے زور سے یا آہستہ؛ لیکن نماز کے اندر اس کو آہستہ پڑھنے کا حکم ہے، (نصب الرایہ، عن ابن مسعودؓ، باب صفۃ الصلوۃ: ۱؍ ۲۵۵) اس لئے نماز میں آہستہ تعوذ پڑھنا چاہئے، تعوذ سے مراد شیطان کی فتنہ انگیزی کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہنا ہے؛ اس لئے اس کے مشہور الفاظ تو یہی ہیں: أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم؛ لیکن حدیث میں بعض اور کلمات بھی آئے ہیں، جیسے: أعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم (أبوداود، کتاب الصلاۃ، باب من رأی الاستفتاح بسبحانک وبحمدک، حدیث نمبر: ۷۷۵) اگر ان الفاظ کے ذریعہ تعوذ پڑھ لیا جائے تب بھی درست ہے، —— یہ جو بات فرمائی گئی کہ ''ایمان والوں پر شیطان کا زور نہیں چلتا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو شیطان ہر ایک کو گمراہ کرتا ہے؛ لیکن جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ اس کے فتنہ پر قائم نہیں رہتے؛ بلکہ توبہ استغفار کرلیتے ہیں، جو لوگ ایمان سے محروم ہوتے ہیں، وہ لوگ نہ صرف شیطان کی چالبازی سے متاثر ہوتے ہیں؛ بلکہ اس پر قائم بھی رہتے ہیں۔

﴿۲﴾ کسی حکم میں تبدیلی یا تو اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکم دینے والا پہلے حکم کے نتائج واثرات سے واقف نہیں تھا، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس نے جو حکم کیا، وہ غلط تھا؛ چنانچہ انسان اپنے اس حکم کو بدل دیتا ہے، انسانی زندگی میں کثرت سے ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں؛ کیوں کہ مخلوق کا علم ناقص اور نامکمل ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انداز پر احکام میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، دوسری صورت یہ ہے کہ حکم میں تبدیلی حکمت ومصلحت کے تحت ہو، مثلاً ایک طالب علم چوتھی جماعت میں بھی ایک مضمون کو پڑھتا ہے اور اسی کو پانچویں اور چھٹی جماعت میں بھی پڑھتا ہے؛ لیکن ایک ہی مضمون کی کتاب ہر سال بدل جاتی ہے؛ اس لئے نہیں کہ کتاب مقرر کرنے والا ناواقف تھا؛ بلکہ حکمت کا تقاضا تھا کہ پہلے ایک مضمون اجمال کے ساتھ بیان کیا جائے، پھر اس کو ←

قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هُدًى وَّ بُشۡرٰى
لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ
اَعۡجَمِىٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهۡدِيۡهِمُ اللّٰهُ
وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفۡتَرِى الۡكَذِبَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰۤئِكَ هُمُ
الۡكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

آپ کہہ دیجئے: اس کتاب کو روح القدس (جبرئیل) نے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ اُتارا ہے؛ تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور تاکہ مسلمانوں کے حق میں ہدایت کا ذریعہ اور خوشخبری ہو، ﴿۱۰۲﴾ اور ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے تو آدمی سکھاتا ہے، جس شخص کی طرف اس کی غلط نسبت کرتے ہیں، اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ تو فصیح عربی زبان ہے، ﴿۱﴾ ﴿۱۰۳﴾ بے شک جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے، اللہ انھیں ہدایت نہیں دیتے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، ﴿۱۰۴﴾ یقیناً جھوٹ تو وہی لوگ گھڑتے ہیں، جو اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں رکھتے اور وہی لوگ جھوٹے ہیں۔ ﴿۱۰۵﴾

← تفصیل سے ذکر کیا جائے، پھر اس کی زیادہ شرح و وضاحت ہو، ایسے ہی طبیب مریض کے حالات کے لحاظ سے دوائیں بدل بدل کر دیتا ہے، بچہ کی غذا کو رفتہ رفتہ بدلا جاتا ہے، یہ مریض کی اور بچہ کی مصلحت کا تقاضا ہے، شریعت کے احکام میں جو تبدیلی ہوتی ہے، اس کی نوعیت یہی ہوتی ہے، کبھی پہلے نرم احکام دیئے جاتے ہیں؛ تاکہ ان کے لئے اس عمل کو چھوڑنا آسان ہو اور آہستہ آہستہ احکام میں سختی پیدا کی جاتی ہے، اور کبھی کسی برائی سے پوری طرح باز رکھنے کے لئے ابتداءً حکم میں سختی برتی جاتی ہے اور بعد کو اس کی جگہ آسان احکام دے دیئے جاتے ہیں، یہ تبدیلی حکمت و مصلحت کے طور پر ہوتی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے مغایر نہیں ہے، — قرآن مجید میں بعض احکام تبدیل کئے گئے، جن کو ''نسخ'' کہا جاتا ہے، کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا، قرآن نے اسی کا جواب دیا ہے کہ یہ ناواقفیت کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ یہ علم و حکمت کا تقاضہ ہے، واللہ أعلم بما ینزل، (اللہ اس سے خوب خوب واقف ہیں جو وہ اُتارتے ہیں)۔

﴿۱﴾ مکہ میں فاکِہَ بن مُغِیرَہ کا ایک غلام تھا، جس نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس کا نام جَبر تھا، وہ عجمی نژاد تھا، بعض اہل مکہ الزام لگاتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اسی سے پڑھ کر آیات پیش فرماتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا مالک اس کو مار پیٹ بھی کرتا تھا کہ تم ہی محمد ﷺ کو سکھاتے ہو، وہ غریب اور سچا غلام کہتا کہ خدا کی قسم ایسا نہیں ہے؛ بلکہ سچائی یہ ہے کہ محمد ﷺ مجھے تعلیم دیتے ہیں اور ہدایت سے نواز کر صحیح راستہ دکھاتے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱۷۷) بعض لوگوں نے بنی عامر کے غلام یَعِیش، عُتبہ بن رَبیعہ کے غلام عدّاس، بعض نے بَلعام رومی اور بعض نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا ہے، (مفاتیح الغیب: ۹/۲۶۷) یہ سب کے سب عجمی نژاد تھے اور قرآن مجید نہ صرف یہ کہ عربی زبان میں ہے؛ بلکہ عربی زبان کے اعلیٰ ترین اُسلوب پر ہے، پھر یہ بات کیسے درست ہوسکتی تھی کہ ان میں سے کسی آیات حضور ﷺ کو سکھادی ہوں، قرآن مجید نے اس آیت میں اسی بے بنیاد اعتراض کا جواب دیا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

جو ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کر جائے، سوائے اس شخص کے جس کو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہے) —— لیکن ہاں جو لوگ دل سے کفر کا ارتکاب کریں تو ان لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۰۶﴾

﴿۱﴾ اسلام کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے احکام انسان کی ضرورت ومصلحت کے مطابق ہیں، اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان اگر غلطی سے بچنے پر قدرت رکھنے کے باوجود ارادہ واختیار سے غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ گنہگار بھی ہوتا ہے اور دنیا وآخرت میں سزا کا مستحق بھی ہوتا ہے، اور اگر اس میں اس کے ارادہ واختیار کا دخل نہ ہو تو نہ وہ گنہگار رہتا ہے اور نہ سزا کا مستحق، انسان کے ارادہ واختیار سے محروم ہونے کی ایک صورت ''جبر واکراہ'' ہے، یعنی انسان کو کسی قول یا فعل پر اس طرح مجبور کر دیا جائے کہ اگر وہ اس کو نہ کرے گا تو قتل کر دیا جائے گا، یا اس کو کسی عضو سے محروم کر دیا جائے گا، یا اس کو شدید نقصان پہنچایا جائے، (الدر المختار: ۹/۱۷۸) اس حالت میں اگر کوئی شخص کلمۂ کفر کہہ دے، یا اپنی جان بچانے کے لئے کوئی ایسا فعل کر لے جو کفر کا ہو تو گناہ نہیں ہے —— اس آیت کے نازل ہونے کا پس منظر یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد شروع شروع میں جن حضرات نے اپنے مسلمان ہونے کو ظاہر کیا، وہ سات تھے، رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت خباب رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا، پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت ابوطالب اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ان کے خاندان کے لوگ ڈھال بن گئے، بقیہ یہ پانچوں غلام اور باندی تھے، ان میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے علاوہ بقیہ سب لوگ اپنی بات پر جمے رہے؛ چنانچہ ابوجہل نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ (جو ایمان لا چکے تھے) کو قتل کر دیا، اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی دونوں ٹانگیں دو اونٹوں میں باندھ کر دو مخالف سمت میں بھگا دیا اور ان کی شرمگاہ میں اس طرح نیزہ مارا کہ وہ ان کے منھ کی طرف سے نکل آیا، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ یہ دو پہلے مرد وعورت ہیں، جنھوں نے اسلام کے راستہ میں شہادت پائی، حضرت بلال رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو ناقابل برداشت تکلیفیں پہنچائی گئیں، ان سب کے باوجود حضرت بلال رضی اللہ عنہ کلمۂ توحید پر قائم رہے، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حد سے بڑھی ہوئی ایذاء رسانی سے بچنے کے لئے زبان سے ان کے مطالبہ کے مطابق کلمۂ کفر کہہ دیا؛ لیکن دل میں ایمان کا جو پودا لگا ہوا تھا، اس میں کوئی کمزوری نہیں آئی، حضرت عمار رضی اللہ عنہ روتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتِ حال بتائی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: تم اپنے دل کو کیسا پاتے ہو؟ عرض کیا: دل ایمان پر مطمئن ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر کچھ حرج نہیں، اگر دوبارہ ایسی نوبت آئے تو پھر کلمۂ کفر کہہ دینا، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۱۸۰-۱۸۱) ہاں، اگر خدانخواستہ انسان کفر کی بات یا کفر کا باعث بننے والے فعل سے راضی ہو تو پھر وہ دائرۂ ایمان سے باہر نکل جائے گا، آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی کفریہ بات کا صرف دل پر گزر ہو جائے اور اس خیال پر جماؤ اور یقین پیدا نہ ہو تو یہ کفر نہیں ہے۔

نیز اکراہ سے متعلق بہت سے احکام فقہاء نے بیان کئے ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ : ←

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۰۷
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۰۸
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۰۹ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا
فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱۰

ع ۱۴ / ۲۰

یہ اس لئے کہ انھوں نے آخرت کے مقابلے دنیوی زندگی کو عزیز رکھا اور بے شک اللہ کفر کرنے والوں کو ہدایت سے نہیں نوازتے ، (۱۰۷) یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی (انجام سے) غافل لوگ ہیں ، (۱۰۸) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں نقصان میں رہیں گے ، (۱۰۹) پھر جن لوگوں نے مصیبتیں اُٹھانے کے بعد ہجرت کی ، پھر جہاد کیا اور ثابت قدم رہے تو یقیناً آپ کے پروردگار ان باتوں کے بعد ان کو بہت بخشنے والے اور نہایت مہربان ہیں ۔ ﴿۱﴾ (۱۱۰)

← ○ اگر کوئی شخص اکراہ کے باوجود کلمۂ کفر نہ کہے اور اپنی جان دے دے تو یہ گناہ نہیں ہے ؛ بلکہ اس کی زیادہ فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ اجر ہے ۔ (الہدایہ:۲/ ۳۵۰)

○ اگر اکراہ کا تعلق کفر کے علاوہ حقوق اللہ کے دوسرے احکام سے ہو، جیسے : شراب پینا ، روزہ توڑ دینا ، وغیرہ ، تو جان بچانے کے لئے ان افعال کا ارتکاب نہ صرف جائز ؛ بلکہ واجب ہے ، اگر وہ اس کا ارتکاب نہ کر کے جان دے دے تو گناہ کا اندیشہ ہے ۔ (الدر المختار مع الرد:۹/ ۱۸۴)

○ اگر ایسے کسی فعل پر اکراہ کیا جائے ،جس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو، اور اس کی تلافی کی صورت نہ ہو تو اس کے لئے اکراہ کی وجہ سے وہ فعل جائز نہیں ہے ، جیسے : کسی دوسرے بے قصور شخص کو قتل کرنا ۔ (بدائع الصنائع:۶/ ۱۸۷، مع تحقیق: محمد عدنان بن یٰسین درویش)

○ اگر کسی مرد یا عورت کو زنا پر مجبور کیا جائے تو اس سے بچنا بہتر ہے ؛ لیکن اگر جان بچانے کے لئے اس کا ارتکاب کرلے تو گنہگار نہیں ہوگا اور نہ اس پر زنا کی سزا جاری ہوگی ۔ (الفتاویٰ الہندیہ:۵/ ۸۴)

○ اکراہ کی حالت میں کسی چیز کے بیچنے پر مجبور کیا جائے اور وہ اسے بیچ دے یا خرید لے تو یہ خرید وفروخت معتبر نہیں ہے ۔ (بدائع الصنائع:۶/ ۲۰۰)

○ اکراہ کی حالت میں نکاح ، طلاق اور رجعت (طلاق کے بعد بیوی کو لوٹانا) امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر ہے ، امام مالک رحمہ اللہ ، امام شافعی رحمہ اللہ ، امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر کے فقہاء کے نزدیک اس حالت میں نکاح وطلاق کا اعتبار نہیں ۔ (بدائع الصنائع:۶/ ۱۹۳)

جبر واکراہ کے مختلف درجات ہیں اور مختلف اُمور میں ان کے احکام الگ الگ ہیں ، فقہ کی کتابوں میں ''کتاب الاکراہ'' کا مستقل باب آتا ہے ، اس میں یہ ساری تفصیلات ذکر کی گئی ہیں ، اہل علم وہاں مراجعت کر سکتے ہیں ۔

﴿۱﴾ اس آیت میں بھی ان ہی مظلوم مسلمانوں کا ذکر ہے ، جنھیں ایمان لانے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی گئی ، پھر انھوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا ؛ لیکن بہر حال ایمان پر ثابت قدم رہے —— بظاہر یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے ؛ کیوں کہ اس میں ہجرت اور جہاد کا ذکر ہے ؛ جب کہ مکی زندگی کے ابتدائی دور میں نہ ہجرت کا حکم آیا تھا اور نہ جہاد کا ، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت مکی ہے اور اس کی کوئی آیت مدنی ہے ، یا ایک سورت مدنی ہے اور اس کی کوئی آیت مکی ہے ۔

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ
بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ
رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

جس دن ہر شخص اپنی اپنی طرفداری میں بحث کرتا ہوا آئے گا اور ہر شخص کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا، ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں ہوگی، ﴿۱۱۱﴾ اللہ ایک مثال بیان فرماتے ہیں: ایک بستی امن واطمینان کی حالت میں تھی، ہر جگہ سے وہاں کھانے کا سامان بہ فراغت آیا کرتا تھا، پھر انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی؛ چنانچہ اللہ نے ان کو ان کی حرکتوں کی وجہ سے بھوک اور خوف مسلط ہوجانے کا مزہ چکھا دیا، ﴿۱۱۲﴾ اور ان کے پاس ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھی آئے تھے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا؛ آخر ان کو اس حال میں عذاب نے آ پکڑا؛ کہ وہ زیادتی کررہے تھے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۱۳﴾

﴿۱﴾ ’’فأذاقها الله لباس الجوع والخوف‘‘ سے مراد یہ ہے کہ قحط نے ان کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا، (مفاتیح الغیب: ۶۵۱/۹) جب کوئی چیز کسی پر مسلط ہوجاتی ہے تو وہ پوری طرح اس کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے، اسی مناسبت سے بھوک اور خوف کے مسلط ہوجانے سے ترجمہ کیا گیا ہے —— اس آیت میں جس بستی کا ذکر کیا گیا ہے، عام طور پر مفسرین نے اس سے ’’مکہ مکرمہ‘‘ مراد لیا ہے؛ چوں کہ لوگ حج وعمرہ کے لئے مکہ آیا کرتے تھے اور پورے جزیرۃ العرب میں اس شہر کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی؛ اس لئے لوگوں کی معاشی حالت بھی بہتر تھی اور حرم ہونے کی وجہ سے امن وامان بھی قائم تھا؛ لیکن ان کی مسلسل نافرمانیوں کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان کے حق میں بددعاء فرمائی کہ خداوندا! ان کی سخت پکڑ فرمایئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قوم کی طرح ان پر قحط مسلط فرمادیجئے: ’’اللّٰھم اشدد وطأتک علی مضر واجعلھا علیھم سنین کسِنِيْ یوسف‘‘ (مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب القنوت: ۱۵۷۴) چنانچہ ان پر ایسا قحط مسلط ہوا کہ مردار اور ہڈیاں کھانے پر مجبور ہوگئے، (تفسیر قرطبی: ۱۹۵/۱۰) رسول اللہ ﷺ کی شان رحمت دیکھئے کہ آپ ﷺ سے سردارانِ مکہ نے درخواست کی کہ عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے اور آپ ﷺ تو صلہ رحمی اور درگذر کا حکم دیتے ہیں؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دُعاء کیجئے کہ یہ مصیبت ہٹ جائے، رسول اللہ ﷺ نے اس قحط کے دور ہوجانے کے لئے دُعاء بھی فرمائی، جن قبائل کے لوگوں کو مکہ غلہ پہنچنے سے روکنے کا حکم دیا گیا تھا، ان کو آپ ﷺ نے غلہ جانے دینے کی اجازت دے دی، (مفاتیح الغیب: ۶۵۳/۹) اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان خون کے پیاسوں کے لئے تعاون کے طور پر پانچ سو دینار بھی بھیجے، (ردالمحتار: ۳۰۲/۳، باب المصرف) —— اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کتنی ہی مبارک جگہ پر اور متبرک مقام پر ہو؛ لیکن اگر اللہ کی نعمتوں کی نافرمانی کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی پکڑ ہوسکتی ہے؛ اس لئے انسان کو مطمئن نہیں ہوجانا چاہئے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾
اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا
حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا
يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ؕ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا
عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

تو اللہ نے تم کو جو روزی دی ہے، ان میں سے حلال و پاک چیزیں کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو؛ اگر تم (واقعی) اسی کی عبادت کرتے ہو، ﴿۱۱۴﴾ اللہ نے تو تم پر صرف مردار، خون، سور کا گوشت اور اس جانور کو حرام کیا ہے، جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، پھر جو کوئی بے قراری کی حالت میں ہو، نہ نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھ جانے والا، تو یقیناً اللہ خوب معاف کرنے والے اور بے حد مہربان ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۱۵﴾ اور تمہاری زبانیں جو جھوٹ بنالیتی ہیں کہ ''یہ حلال ہے اور یہ حرام'' ایسا نہ کہا کرو کہ اس طرح تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے، بے شک جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، وہ فلاح نہیں پاتے، ﴿۲﴾ ﴿۱۱۶﴾ چند روزہ دنیوی زندگی کا عیش ہے اور پھر ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱۷﴾ اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں، جو ہم اس سے پہلے آپ کو بتا چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی تھی؛ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۱۸﴾

﴿۱﴾ سورۂ بقرہ آیت نمبر: ۱۷۳، مائدہ آیت نمبر: ۳، اور سورۂ انعام آیت نمبر: ۱۴۵ میں ان حرام چیزوں کا ذکر آچکا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی کسی شئے کو حرام یا حلال قرار دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے، بندوں کے لئے نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے طور پر کسی چیز کو حلال کرلیں اور نہ یہ گنجائش ہے کہ کسی چیز کو حرام کرلیں؛ البتہ فقہاء نے کتاب وسنت کے احکام اور شریعت کے مزاج و مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے واضح کیا ہے کہ عبادات میں اصل ممنوع ہونا ہے، سوائے اس کے کہ اس کا ثبوت ہو؛ اس لئے جو بات عبادت کے قبیل سے ہو، اس کے جائز ہونے کے لئے دلیل ہونی چاہئے، ورنہ اس کا شمار بدعت میں ہوگا، اور جن باتوں کا تعلق عبادت سے نہ ہو؛ بلکہ زندگی کے عام مسائل سے ہو، جن کو ''عادات'' کہا جاتا ہے، ان میں اصل جائز ہونا ہے اور اگر ان میں سے کسی چیز کو حرام قرار دیا جائے تو اس پر دلیل ہونی چاہئے —— اسی سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی قانون جس میں ایک فرد (جیسے: بادشاہ، یا ڈکٹیٹر) یا عوام (جیسے: پارلیمنٹ، یا عوام کا منتخب کردہ کوئی اور ادارہ) کسی بات کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اسلام کی نظر میں یہ درست نہیں ہے، اسلام کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ ہی کو حق ہے کہ کسی بات کو حرام یا حلال قرار دیں۔

﴿۳﴾ یہودیوں پر جو چیزیں حرام کی گئی تھیں، ان کا ذکر سورۂ انعام آیت نمبر: ۱۴۶ میں آچکا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ
ع ۱۵ / ۹ / ۲۱ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي
الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا
فِيْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

پھر آپ کے پروردگار (کے فضل وکرم کا حال یہ ہے کہ) ان لوگوں کو جو نادانی میں گناہ کر گزریں، پھر اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنے آپ کو سنوار لیں تو آپ کے رب توبہ کے بعد بخش دیں گے اور رحم فرمائیں گے، «۱» ﴿۱۱۹﴾ بے شک ابراہیم بڑے پیشوا، اللہ کے فرمانبردار اور اسی کی طرف یکسو تھے اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے، ﴿۱۲۰﴾ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، اللہ نے ان کو چن لیا تھا اور انھیں سیدھے راستہ پر ڈال دیا تھا، ﴿۱۲۱﴾ ہم نے اس کو دنیا میں بھی بہتری عطا کی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں شمار ہوں گے، ﴿۱۲۲﴾ پھر ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کریں، جو (صرف اللہ ہی کی طرف) یکسو تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے، «۲» ﴿۱۲۳﴾ ہفتہ کے دن کی تعظیم تو ان ہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی، جنھوں نے اس میں اختلاف کیا تھا اور یقیناً آپ کے پروردگار قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کردیں گے، جس میں وہ اختلاف کررہے تھے۔ «۳» ﴿۱۲۴﴾

«۱» توبہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ انسان سے کسی بھی گناہ کا ارتکاب ہوجائے، پھر جب وہ توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے گناہ معاف کردیتے ہیں، توبہ کی مثال اس کیمیکل کی ہے جس سے میلے کچیلے کپڑوں کے داغ دھبے صاف ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر کہ ’’جن لوگوں نے نادانی میں گناہ کرلیا‘‘ اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کسی سمجھدار انسان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ جانتے بوجھتے گناہ کا ارتکاب کرے۔

«۲» اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کی نو (۹) صفات کا ذکر فرمایا ہے، اول: یہ کہ وہ اپنے کمالات کے اعتبار سے ایک فرد ہونے کے باوجود ایک گروہ کے برابر تھے؛ اس لئے وہ اس لائق تھے کہ ان کی پیروی کی جائے، دوسرے: اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے، تیسرے: ان کا رُخ اللہ ہی کی طرف تھا، چوتھے: وہ ہر طرح کے شرک سے دور تھے، پانچویں: اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، چھٹے: اللہ تعالیٰ نے ان کو چن لیا تھا، ساتویں: اللہ نے ان کو سیدھے راستہ پر قائم رکھا تھا، آٹھویں: اللہ نے ان کو دنیا میں بھلائی سے نوازا تھا، نویں: آخرت میں بھی ان کا شمار اللہ کے نیک بندوں میں ہوگا، اتنی ساری خوبیوں کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی پیروی کی جائے۔

«۳» قرآن مجید میں وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو چھ دن میں پیدا فرمایا، (الاعراف: ۵۴، سجدہ: ۴) ←

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَ الۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ وَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾

(اے رسول!) آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلائیے اور ان سے بہتر طریقہ پر بحث کیجئے، یقیناً آپ کے پروردگار اس شخص سے بھی واقف ہیں، جو اپنے راستے سے بھٹک گیا اور راہ راست پر لگنے والوں کو بھی خوب جانتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۱۲۵﴾

← اور مفسرین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کا یہ عمل اتوار کو شروع ہوا اور جمعہ کو مکمل ہوا، پس جمعہ کا دن اصل میں شکر گزاری کا اور اظہار مسرت کا دن تھا؛ اس لئے جمعہ کی تعظیم کا حکم دیا گیا، یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بھی سنت تھی اور اسی کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو دیا تھا؛ مگر یہودیوں نے کج بحثی شروع کر دی اور کہنے لگے کہ ہم ’’ہفتہ‘‘ کے دن کی تعظیم کریں گے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہودیوں نے اسی دن کو اپنے لئے مقدس و محترم بنالیا؛ کیوں کہ اس دن اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات سے فارغ ہو چکے تھے، عیسائیوں کو چوں کہ یہودیوں سے بغض تھا؛ اس لئے انھیں یہودیوں کی مشابہت گوارہ نہیں ہوئی اور انھوں نے اپنے طور پر ’’اتوار‘‘ کو مقدس دن مان لیا؛ کیوں کہ تورات کے بیان کے مطابق اسی دن اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات کے عمل کو شروع فرمایا تھا، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۱۹۹) —— عجب نہیں کہ یہودیوں نے ہفتہ کو کام کاج نہ کرنے اور صرف عبادت کرنے کا دن اس لئے مقرر کیا ہو کہ تورات کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ سات دنوں تک کائنات کی تخلیق کا عمل انجام دیتے دیتے تھک گئے تھے اور اس دن آرام کیا تھا، اس بات کا غلط ہونا بالکل واضح ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالکل پاک ہے کہ اس کو تھکان ہو اور آرام کی ضرورت پڑے، بہر حال اس آیت کا منشا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہفتہ کے دن کو مقدس نہیں مانتے تھے، جیسا کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے۔

﴿۱﴾ دعوتِ دین کے آداب کے سلسلے میں یہ بنیادی آیت ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دعوت میں حکمت اور موعظتِ حسنہ کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، حکمت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت جو بات کہنی مناسب ہو، یا جس کے لئے جو بات موزوں ہو، وہ بات کہی جائے، جیسے اہل مکہ قیادت اور سرداری چاہتے تھے، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اس کلمہ حق کو قبول کرلو، تو عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے، یا بعض سمجھ دار اور دانشمند لوگوں سے کہا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو ہم تم کو بعض ذمہ داریاں سپرد کریں گے، یہ ’’حکمت‘‘ ہے، مثلاً ان لوگوں کو دعوت دی جائے، جن کو اچھوت اور کم ذات کا سمجھا جاتا ہو اور ان کے سامنے اسلامی مساوات کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات پیش کی جائیں، یا جیسے عورتوں کو اسلام کی طرف بلایا جائے اور ان احسانات کا ذکر کیا جائے، جو خواتین کے حق میں اسلام نے کیا ہے، تو یہ حکمت کا تقاضا ہوگا، موعظتِ حسنہ یعنی ’’بہتر پند و نصیحت‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ خیر خواہی اور محبت کے جذبہ کے ساتھ نرم الفاظ میں اسلام کی دعوت پیش کی جائے، قرآن مجید میں انبیاء کرام کی دعوت کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، ان کو پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی شفقت و محبت کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرتے تھے اور اگر مخالفین کی طرف سے بدزبانی ہوتی تھی، تب بھی نرم لب و لہجہ میں اس کا جواب دیتے تھے —— دعوت کے تو یہی دو طریقے ہیں، جدل احسن یعنی ’’خوش اُسلوبی کے ساتھ مباحثہ‘‘ اصل میں دعوت نہیں ہے، (مفاتیح الغیب: ۹/ ۲۶۴) لیکن چوں کہ بعض دفعہ نصیحت کافی نہیں ہوتی، مخاطب بحث پر ←

وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنی ہی تکلیف پہنچاؤ، جتنی تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۲۶﴾

← اُتر آتے ہیں، بحث و مباحثہ میں اکثر لب ولہجہ تیز ہو جاتا ہے اور نوبت لڑائی جھگڑے کی آجاتی ہے؛ اس لئے فرمایا کہ اگر بحث کی نوبت آئے تو بحث بھی کی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ اسلام کو دلیل کے اعتبار سے ضرور غلبہ حاصل ہوگا؛ لیکن اس صورت میں بھی لب ولہجہ شائستہ، مہذب اور مخاطب کے دل میں اُتر جانے والا ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اس میں مزید ضد پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر خاص کر اہل کتاب سے مباحثہ کے وقت بھی اس پہلو کو پیش نظر رکھنے کا حکم دیا ہے، (العنکبوت:۴۶) —— اخیر میں یہ بھی فرمادیا گیا کہ اللہ کو معلوم ہے کہ کس کو ہدایت حاصل ہوگی اور کون ہدایت سے محروم رہے گا؟ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ دعوت دینے والے کا کام دعوت پیش کر دینا ہے، اگر مخاطب دعوت کا اثر قبول نہ کرے تو اس سے رنجیدہ اور مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

﴿۱﴾ اس بات پر اکثر مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے، غزوۂ اُحد میں جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو ظالموں نے آپ کا پیٹ چاک کر دیا اور ناک اور کان کاٹ دیئے، رسول اللہ ﷺ کو اپنے محبوب چچا کی شہادت اور پھر ان کی لاش کے ساتھ بے حرمتی پر بڑا غم ہوا اور آپ ﷺ کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ میں اس کے بدلے ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا، (مستدرک حاکم، حدیث نمبر: ۴۸۹۴) اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو تم کو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی بدلہ لینا چاہئے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے صبر فرمایا اور اس شان سے صبر فرمایا کہ جب مکہ فتح ہوا تو وہ سارے لوگ آپ ﷺ کے سامنے موجود تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کو اذیتیں پہنچائی تھیں، یہاں تک کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتلین بھی موجود تھے؛ لیکن آپ نے سب کے ساتھ درگزر فرمایا اور معافی کا عام اعلان کر دیا۔

تکلیف اور نقصان پہنچانے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: جانی نقصان، مالی نقصان، اور زبان کے ذریعہ نقصان، جانی نقصان کے سلسلے میں قصاص کا حکم دیا گیا ہے، یعنی مجرم نے جتنی تکلیف پہنچائی ہو، اسی قدر اس کو بھی تکلیف پہنچائی جائے، جیسے قتل کیا ہو تو اس کو بھی قتل کیا جائے، ہاتھ کاٹ دیا ہو، تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں؛ البتہ اگر کسی شخص کو ایسی چوٹ پہنچائی کہ بدلہ لیتے ہوئے برابری کو باقی رکھنا دشوار ہو تو پھر جسمانی طور پر بدلہ لینے کے بجائے مالی ہرجانہ واجب ہوگا، جس کو ''دیت'' کہتے ہیں؛ اسی طرح اگر کسی کو تکلیف پہنچا پہنچا کر قتل کیا ہو، تو قصاص میں تلوار کے ذریعہ قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ اگر مجرم کو چوٹ پہنچائی جائے یا قاتل کو تکلیف پہنچا پہنچا کر قتل کیا جائے تو ضروری نہیں کہ تکلیف پہنچانے میں برابری باقی رہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قصاص تلوار ہی سے لیا جائے۔ (سنن ابن ماجہ، ابواب الدیات، حدیث نمبر: ۲۶۶۷)

دوسری شکل: مالی نقصان پہنچانے کی ہے؛ چنانچہ اگر کسی شخص نے دوسرے کا مال ظلماً لے لیا، یا قرض کے طور پر لیا اور اسے واپس نہیں کرتا، تو اسے حق ہے کہ اگر کسی طرح اس کو اس شخص کا مال حاصل ہو جائے تو وہ اس سے اپنا حق وصول کر لے؛ البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس جنس کا مال باقی ہے، اسی جنس کا مال حاصل ہو جائے، تب مظلوم اس میں سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے، جیسے روپے باقی تھے اور اس ظالم شخص کے روپے ہاتھ آ گئے، تو اپنا حق وصول کیا جاسکتا ہے، اگر باقی تھا گیہوں اور مل گیا روپیہ، تو وہ روپے سے ←

وَ اصۡبِرۡ وَ مَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا تَكُ فِيۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ
مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾ ع ۱۶/۹/۲۲

اور صبر کرتے رہئے ، آپ کا صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہے ، نیز آپ ان (ایمان نہ لانے والوں) پر غم نہ کیجئے اور نہ ان کی سازشوں سے تنگ دل ہویئے ، ﴿۱۲۷﴾ بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں ، جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو اچھے عمل کرتے رہیں ۔ ﴿۱﴾ ﴿۱۲۸﴾

← گیہوں کی قیمت کے برابر رقم وصول نہیں کرسکتا ، امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں یہ قید نہیں ہے ، ظالم کی کوئی بھی چیز مظلوم کے ہاتھ آجائے ، خواہ جو چیز باقی ہے ، وہ اسی کی جنس سے ہو یا اس کی جنس سے نہ ہو ، بہر صورت وہ اپنا حق وصول کرسکتا ہے ، فقہاء حنفیہ میں بھی بعد کے لوگوں نے اسی پر فتویٰ دیا ہے ۔ (دیکھئے: فتح القدیر: ۲۳۶/۴ ، ردالمحتار: ۲۱۹/۳ ، المغنی: ۲۵۴/۸ ، الشرح الکبیر: ۲۳۵/۴)

تیسری صورت : بات کے ذریعے تکلیف پہنچانے کی ہے ؛ اس سلسلے میں اُصول یہ ہے کہ سخت کلامی کا جواب سخت کلامی سے دیا جاسکتا ہے ؛ لیکن ایسی بات نہیں کہی جاسکتی ، جو حکم شریعت کے خلاف ہو ، جیسے : گالی کے جواب میں گالی دینا ، بہتان تراشی کے جواب میں بہتان لگانا جائز نہیں ۔

﴿۱﴾ آیت میں اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کی طرف بلائیں ، ان کو ہر حال میں صبر کا دامن تھامے رکھنا چاہئے ، لوگوں کی زیادتی کی وجہ سے حوصلہ نہ ہارنا چاہئے اور اس بات کا یقین رکھنا چاہئے کہ جو لوگ نیکی اور پرہیزگاری کے راستے پر رہیں گے ، بالآخر ان ہی کو اللہ کی مدد حاصل ہوگی ۔

سُورَةُ بَنِیۤ اِسۡرَآئِیۡل

- سورہ نمبر : (۱۷)
- رکوع : (۱۲)
- آیتیں : (۱۱۱)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

یہ پوری کی پوری سورت رسول اللہ ﷺ پر مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، اگرچہ کچھ آیات کے سلسلہ میں بعض مفسرین کی رائے ہے کہ وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہیں؛ لیکن راجح قول یہی ہے کہ پوری سورت مکی ہے، اس سورت کا آغاز واقعۂ معراج سے ہوا ہے اور معراج کا واقعہ ہجرت سے صرف سال دو سال پہلے پیش آیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ یہ سورت مکی زندگی کے اخیر زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔

اس سورت کا نام، اِسْراء بھی ہے اور بنی اسرائیل بھی، اسراء اس مناسبت سے کہ سورت کی ابتداء ہی اسراء ومعراج کے واقعہ سے ہوئی ہے، اور بنی اسرائیل اس لئے کہ اس سورت میں آیت نمبر: ۴ سے دور تک بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا ہے —— اس صورت کی فضیلت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ روزانہ رات میں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (ترمذی، باب قراءۃ سورۃ بنی اسرائیل والزمر قبل النوم، حدیث نمبر: ۲۹۲۰)

اس سورت میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعۂ معراج کے پہلے مرحلہ کا ذکر ہے جو مکہ سے شروع ہوکر مسجدِ اقصیٰ پر ختم ہوتا ہے اور جس کو ''اسراء'' کہا جاتا ہے، یہ واقعہ صرف اس جگہ ذکر کیا گیا ہے۔

عام طور پر مکی سورتوں میں بنی اسرائیل سے خطاب نہیں ہے؛ لیکن اس سورت میں بنی اسرائیل سے بھی خطاب ہے، گذشتہ زمانہ میں ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے انھیں جو سزا دی گئی اور ظالم حکمرانوں کو ان پر مسلط کیا گیا، اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ عنقریب آپ مکہ سے ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کریں گے، جہاں اہل کتاب بھی آپ کے مخاطب ہوں گے؛ چنانچہ اس کے بعد آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی، جہاں یہود آپ کی دعوت کے خاص مخاطب ہوئے —— ایک نئے معاشرہ کی تعمیر اور عدل وانصاف پر مبنی مملکت کی تشکیل کے لئے جن ہدایات کی ضرورت تھی، اس سورت کے دوسرے اور تیسرے رُکوع میں اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ہدایات دی گئی ہیں، یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب اسلام مغلوبیت سے غلبہ اور مسلمان عجز وکمزوری سے طاقت وشوکت کے دور میں داخل ہونے والے ہیں۔

اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کا کچھ حصہ اور ابلیس کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار اور انسان کے شرافت وکرامت سے نوازے جانے کا ذکر بھی آیا ہے، قرآن مجید کو تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی حکمت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، پانچ نمازوں کے فرض ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے خاص طور پر تہجد کے فرض کئے جانے کا ذکر فرمایا گیا ہے، نیز دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی توحید ورسالت اور آخرت کو مدلل طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی ، ﴿۱﴾ جس کے آس پاس میں ہم نے برکتیں رکھ دی ہیں ؛ ﴿۲﴾ تا کہ ہم ان کو اپنی قدرت کے کچھ نمونے دکھا دیں ، ﴿۳﴾ یقیناً اللہ ہی خوب سننے والے اور خوب دیکھنے والے ہیں ۔ ۝۱

﴿۱﴾ سورۃ کا آغاز ایک اہم واقعہ سے ہوتا ہے ، جس کو حدیث وسیرت کی کتابوں میں 'واقعۂ اِسراء' یا 'واقعۂ معراج' کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے ، اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ مکی زندگی میں ظاہری طور پر آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالب اور اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کو بڑا سہارا تھا ، حضرت ابو طالب کی وجہ سے آپ ﷺ کو بنو ہاشم کی تائید حاصل تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چوں کہ مکہ کی ایک مالدار اور معزز خاتون تھیں ؛ اس لئے مشرکین مکہ کو بھی اس کا پاس ولحاظ تھا ، جب حضرت ابو طالب کی اور ان کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی تو یہ ظاہری سہارے ٹوٹ گئے ، اہل مکہ کی روش کو دیکھتے ہوئے آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے کہ شاید انھیں ایمان کی توفیق ہو جائے ؛ لیکن وہ اہل مکہ سے بھی زیادہ سخت دل ثابت ہوئے اور آپ کو ایسی تکلیف پہنچائی کہ شاید اس سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ آپ ﷺ کی زندگی میں پیش نہیں آیا ، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دل داری کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو معراج کا شرف بخشا گیا ؛ کیوں کہ انسان جب اپنے محبوب کے لئے چوٹیں سہتا ہے اور پھر اس کے بعد اپنے محبوب ومطلوب کی طرف سے محبت وقربت کا اظہار ہوتا ہے تو سارے زخم مندمل ہو جاتے ہیں ۔

یہ واقعہ کب پیش آیا ؟ اس کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں ، ۲۷ / رجب کی تاریخ مشہور ہے ، علامہ اِبن قُتَیبَہ دِّینُوری رحمہ اللہ (متوفی : ۲۶۷ھ) علامہ ابن عَبد البَرّ رحمہ اللہ (متوفی : ۴۶۳) علامہ رَافعی رحمہ اللہ ، امام نَوَوِی رحمہ اللہ (متوفی : ۴۶۳ھ) اور علامہ زُرقانی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کو ترجیح دیا ہے ، سن کے بارے میں بھی اختلاف ہے ؛ لیکن عام طور پر ۱۲ نبوی کا ذکر کیا گیا ہے ۔

یہ واقعہ دو مرحلوں میں پیش آیا ، پہلا مرحلہ : مسجد حرام سے بیت المقدس تک ، جس کو 'اسراء' کہا جاتا ہے ، دوسرا مرحلہ : بیت المقدس سے آسمان کے سفر کا ہے ، جس کو 'معراج' کہتے ہیں ، اس واقعہ کو بکثرت حدیث وسیرت کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے ، قرطبی میں ہے کہ بیس (۲۰) صحابہ سے یہ واقعہ منقول ہے ، (تفسیر قرطبی : ۱۰ / ۲۰۵) اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے علامہ زُرقانِی رحمہ اللہ کے حوالے سے ۴۵ صحابہ کا ذکر کیا ہے ، (سیرت النبی ﷺ : ۳ / ۲۲۸) ان میں سات اکابر صحابہ وہ ہیں ، جن کی روایتیں بخاری اور مسلم میں ہیں ۔

واقعہ کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ حَطِیم کعبہ میں یا حضرت اُمِّ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر پر آرام فرما رہے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور نیند سے بیدار کیا ، سینۂ مبارک کو چاک کیا ، آبِ زم زم سے دھویا اور سونے کا ایک طشت جو ایمان اور حکمت سے ←

← بھرپور تھا، سینۂ مبارک میں اُنڈیل دیا، ان کے ساتھ ایک تیز رفتار سواری بھی تھی، جس کو ’بُرَاق‘ کا نام دیا گیا ہے، یہ گدھے سے بڑا، خچر سے چھوٹا، سفید رنگ کا لمبا سا جانور تھا، اس پر آپ ﷺ کو سوار کرایا گیا، یہ ایسی تیز رفتار سواری تھی کہ حدِّ نگاہ پر اس کا قدم پڑتا تھا، اس سواری سے آپ ﷺ بیت المقدس پہنچے، وہاں تمام انبیاء پہلے سے آپ ﷺ کے منتظر تھے، آپ کے تشریف لاتے ہی صف بن گئی اور آپ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی گئی، انبیاء کی تشریف آوری کی کیا شکل پیش آئی؟ یہ اللہ کو معلوم ہے یا تو انبیاء جسم سمیت وہاں لائے گئے یا ان کی روحیں لائی گئیں، یہاں سے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اور آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آسمان کی طرف تشریف لے گئے، اس موقع پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کی خدمت میں دو پیالے پیش کئے، جن میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی، آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ قبول فرمایا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: آپ ﷺ نے فطرت کو پسند کیا، اگر شراب کا پیالہ لیتے تو آپ ﷺ کی اُمت گمراہ ہو جاتی، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ آپ ﷺ آسمان پر چڑھے، جب پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا، فرشتوں نے دریافت کیا: کون؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا نام بتایا، پھر پوچھا گیا: تمہارے ساتھ کون ہیں؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: محمد (ﷺ)، استفسار کیا گیا کہ کیا انھیں بلایا گیا تھا؟ کہا گیا: ہاں! پھر دروازہ کھلا، اب آپ ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ اندر داخل ہوئے، یہی بات ہر آسمان پر پیش آئی۔

پہلے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات انسانیت کے جدِّ اَمجد حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، آپ ﷺ نے ان کو سلام کیا، حضرت آدم علیہ السلام نے پُرتپاک طریقہ پر آپ ﷺ کا خیر مقدم فرمایا اور کہا: فرزند صالح اور نبی صالح کو خوش آمدید ’’مرحباً بالنبیِّ الصالح والابنِ الصالح‘‘ آپ ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ آپ کے دائیں بائیں بہت سے لوگ ہیں، جب آپ دائیں دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے اور مسکراتے ہیں اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو غمگین اور رنجیدہ ہوتے اور روتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اس کا سبب دریافت فرمایا، تو بتایا گیا کہ دائیں طرف آپ کی جنتی اولاد ہیں اور بائیں طرف دوزخی —— اسی طرح مختلف آسمانوں سے آپ کا گذر ہوا، دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، تیسرے پر حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے پر حضرت اِدریس علیہ السلام، پانچویں پر حضرت ہارون علیہ السلام، چھٹے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، جہاں ’’بیتِ مَعْمُوْر‘‘ بنا ہوا تھا کہ ہر دن ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔

پھر آپ ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی اور اس مقام تک پہنچے، جہاں قلم تقدیر کے چلنے کی آواز آتی تھی، آگے بڑھ کر آپ ﷺ ’’سِدْرَۃُ الْمُنْتَہٰی‘‘ نامی مقام پر پہنچے، جس سے آگے فرشتوں کا بھی گذر نہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام یہیں رُک گئے؛ لیکن آپ ﷺ اس سے بھی آگے بلائے گئے، جہاں اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف بخشا، سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں نازل ہوئیں اور پچاس نمازوں کا تحفہ اُمت کے لئے حوالہ کیا گیا، اس شرف و اعزاز اور تحفۂ ربانی کے ساتھ جب واپس ہوئے تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پچاس نمازوں کی فرضیت کا حال معلوم ہوا تو بنی اسرائیل کے تلخ تجربہ کی روشنی میں مشورہ دیا کہ بارگاہِ الٰہی میں تخفیف کی درخواست کی جائے، آپ ﷺ بار بار تخفیف اور کمی کی درخواست فرماتے رہے اور نمازیں کم کی جاتی رہیں، یہاں تک کہ پانچ رہ گئیں؛ لیکن مژدۂ رحمت سنایا گیا کہ اجر پچاس نمازوں ہی کا ہوگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ آپ ﷺ مزید تخفیف کی ←

← درخواست کریں؛ لیکن آپ ﷺ اشارۂ خداوندی سمجھ چکے تھے، کہ ان پانچوں نمازوں کی فرضیت کو باقی رکھنا ہی مقصود ہے؛ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب پھر مجھے اللہ تعالیٰ سے مزید تخفیف کی درخواست کرنے میں حیا آتی ہے —— اس طرح پانچ نمازوں کی فرضیت باقی رہی۔

اتنا طویل سفر چند لمحوں میں اللہ نے کرایا، آسمانوں کی سیر ہوئی، انبیاء سے ملاقات ہوئی، جنت و دوزخ کے مناظر کا مشاہدہ ہوا، پیش گاہ ربانی میں حاضری ہوئی، ہم کلامی سے مشرف ہوئے اور تحفۂ نماز لے کر واپس آئے، یہ سب کچھ ہوا صرف چند ساعتوں میں، جو لوگ غیبی نظام پر یقین نہیں رکھتے تھے اور خدا کی قدرت کو اپنی قدرت کی ترازو میں تولتے تھے، انھیں ان باتوں پر یقین ہی نہ آتا تھا، وہ استہزا کرتے، مذاق اُڑاتے، تمسخر کرتے، جھٹلاتے، لوگوں نے سوچا کہ یہی موقع ہے کہ رفیق خاص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی تصدیق و تائید سے منحرف کردیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس بلکہ آسمان سے ہوکر آیا ہے تو یہ بھی کوئی قابل یقین بات ہوگی؟ فرمایا: ہرگز نہیں، کہنے والوں نے کہا: محمد (ﷺ) آج یہ دعویٰ کررہے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر آپ ﷺ کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں، میں نے کبھی فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؛ لیکن آپ ﷺ پر نزول وحی کی تصدیق کرتا ہوں، تو آخر اس بات کی تصدیق کیوں نہ کروں؟ یہی شانِ تصدیق ہے، جس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ''صِدّیق'' بنایا، پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط اور سمندر سے بھی زیادہ اتھاہ ایمان و یقین والی ہستی —— (سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے، خاص کر علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے ''سیرت النبی ﷺ'' کے تیسرے حصے میں واقعہ کی تفصیل ذکر کی ہے اور معتبر وغیر معتبر روایات پر بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے)۔

معراج کے بارے میں ایک قدیم اختلاف یہ ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے یا بیداری کا اور آپ ﷺ کو روحانی معراج حاصل ہوئی تھی یا جسمانی؟ اکثر صحابہ، سلف صالحین، محدّثین اور سیرت نگاروں کی رائے ہے کہ معراج کا یہ واقعہ بیداری میں پیش آیا اور جسمانی طور پر آپ ﷺ کا یہ سفر ہوا، کئی وجوہ سے یہی رائے قوی اور درست معلوم ہوتی ہے، پہلی بات: یہ ہے کہ اس مضمون کی ابتداء ''سبحان'' کے لفظ سے ہوئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کے عیب اور نقص سے پاک ہے، وہ اس کمزوری سے بھی پاک ہے کہ اپنے بندہ کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا سفر نہ کرا سکے، اگر یہ محض خواب کا واقعہ ہوتا تو اتنے اہتمام کے ساتھ اس اہم اور بامعنی لفظ سے آیت کا آغاز نہ ہوتا، دوسرے: فرمایا گیا: ''اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ'' (اپنے بندے کو لے گیا) اس طرح کی تعبیر جسمانی طور پر لے جانے کے لئے ہی استعمال ہوتی ہے، اگر معراج روحانی ہوتی تو کہا جاتا ''اَسْرٰی بِرُوْحِ عَبْدِهٖ'' (تفسیر قرطبی: ۱/ ۲۰۸) تیسرے: اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو اس کو اس قدر اہتمام سے ذکر نہ کیا گیا ہوتا، چوتھے: احادیث میں واقعۂ معراج کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، جن میں کئی روایتیں بخاری و مسلم کی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جسمانی طور پر یہ واقعہ پیش آیا تھا، پانچویں: احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے اس واقعہ کا ذکر حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا سے کیا، انھوں نے عرض کیا: آپ ﷺ لوگوں سے اس کا تذکرہ نہ کریں؛ ورنہ لوگ جھٹلائیں گے اور اس کا مذاق اُڑائیں گے، اگر خواب کی بات ہوتی تو حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی؛ کیوں کہ خواب میں تو کوئی بھی چیز دیکھی جاسکتی ہے، چھٹے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس واقعہ کی تصدیق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے اور اسی وجہ سے آپ ''صدیق'' کہلائے، اگر آپ ﷺ نے ←

← محض خواب دیکھا ہوتا تو اس کی تصدیق کرنا کوئی اہم بات نہیں تھی؛ کیوں کہ خواب تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، ساتویں: اسی سورۃ کی آیت نمبر: ۶۰ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے اس واقعہ کو لوگوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنادیا'' اس میں کفار ومشرکین کی مخالفت اور ان کے مذاق اُڑانے کی طرف اشارہ ہے، ظاہر ہے کہ اگر یہ واقعہ خواب کا ہوتا تو نہ کفار ومشرکین کو اس واقعہ پر حیرت ہوتی اور وہ آپ ﷺ کا تمسخر کرتے اور نہ یہ واقعہ لوگوں کے ایمان کے لئے آزمائش کا سبب ہوتا؛ اس لئے صحیح یہی ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) کی معراج جسمانی تھی، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ واقعۂ معراج مختلف علاقوں کے صحابہ سے منقول ہے اور تواتر کے درجے میں ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۰۵) یعنی اتنے لوگ اس واقعہ کے ناقل ہیں کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ممکن نہیں۔

صحابہ میں صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا رجحان معراج کے روحانی ہونے کی طرف ہے؛ لیکن اہل علم نے اس کو قبول نہیں کیا ہے؛ کیوں کہ اس واقعہ کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے نکاح میں نہیں آئی تھیں اور ان کی عمر بھی بہت کم تھی، نیز انھوں نے اس سلسلے میں خود رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نقل نہیں کی ہے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والدین تو اس وقت تک مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے، نیز حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس سلسلے میں خود رسول اللہ سے کوئی روایت نقل نہیں کی ہے؛ اس لئے یہ ان صحابہ کا اجتہاد ہے اور ایسے اُمور میں صحابی کا اجتہاد حجت نہیں ہے۔

اس آیت میں مسجد حرام سے ظاہر ہے کہ وہ مسجد مراد ہے جو کعبۃ اللہ کے چاروں طرف ہے، یا پورا حرم شریف مراد ہے؛ کیوں کہ یہ پوری جگہ اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہے، اور مسجد اقصیٰ سے بیت المقدس میں بنی ہوئی وہ مسجد مراد ہے، جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا ''اقصیٰ'' کے معنیٰ ''دُور'' کے ہیں؛ چوں کہ مسجد اقصیٰ مکہ مکرمہ سے کافی دوری پر واقع ہے اور اس وقت اس مسجد کے علاوہ یہی ایک مسجد تھی؛ اس لئے اس کو ''مسجد اقصیٰ'' کہا گیا، اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے ''عبد'' یعنی ''بندہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ کی طرف سے اس غیر معمولی سفر کی سعادت بخشی گئی، آپ ﷺ نے آسمانوں کی سیر کی اور عرش باری کے قریب پہنچائے گئے؛ لیکن اللہ کی طرف سے اس عزت ودلداری اور آپ ﷺ کے درجہ ومقام کی بلندی کی وجہ سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ آپ ﷺ عبد سے 'معبود' بن گئے ہیں اور بندگی کی سرحد سے نکال کر آپ ﷺ کو خدائی کا منصب عطا کردیا گیا ہے؛ جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا۔

﴿۲﴾ یعنی مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) کے گرد وپیش ہم نے برکتیں رکھی ہیں، مسجد اقصیٰ کے گرد وپیش میں مصر، شام وفلسطین اور موجودہ اُردن کا علاقہ شامل ہے، یہاں ایک تو مادی وظاہری برکتیں ہیں کہ یہ علاقہ سرسبز وشاداب باغات، چشموں اور نہروں پر مشتمل ہے، دوسرے: روحانی برکتیں ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اکثر پیغمبروں کی سکونت اسی علاقہ میں رہی ہے اور وفات کے بعد بھی زیادہ تر انبیاء اسی خطہ میں مدفون ہیں۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۱۲)

﴿۳﴾ انبیاء اس دنیا میں عالم بالا کے سفیر ہوا کرتے تھے؛ اس لئے ان کو کچھ ایسی غیبی حقیقتیں دکھائی جاتی تھیں، جو عام لوگوں کو نہیں دکھائی جاتی تھی، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوبارہ زندہ کئے جانے کا منظر دکھایا گیا، (البقرۃ: ۲۶۰) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہم کلامی کا شرف بخشا اور ان کے سامنے کوہِ طور پر اپنی تجلیات ظاہر فرمائیں (طٰہٰ: ۲۱) اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو معراج عطاء کی گئی، جس میں آپ ﷺ نے عالم بالا کے نظام کی ایک جھلک دیکھی، غالباً یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ جَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ۲
ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ۳ وَ قَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ فِی
الۡکِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِی الۡاَرۡضِ مَرَّتَیۡنِ وَ لَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا کَبِیۡرًا ۴ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىہُمَا
بَعَثۡنَا عَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَ کَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۵

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنایا تھا، ﴿۱﴾ کہ (اے بنی اسرائیل!) تم میرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز نہ بنالینا، ۲ اے ان لوگوں کی اولاد! جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا، یقیناً نوح بڑے شکر گزار بندے تھے، ﴿۲﴾ ۳ اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں صاف طور پر بتادیا تھا کہ تم زمین میں دوبار فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے، ﴿۳﴾ ۴ پھر ان میں سے پہلا وعدہ آیا، تو ہم نے تم پر اپنے سخت لڑا کو بندے بھیج دیئے، جو (تمہارے) گھروں میں گھس آئے اور اللہ کا یہ وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ ۵

﴿۱﴾ معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت خاص طور پر بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی اور تورات کے مخاطب بھی یہی تھے، رسول اللہ ﷺ کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پوری انسانیت کے لئے نہیں تھی اور قرآن مجید کی طرح بائبل کو عالمگیر کتابِ ہدایت کا درجہ نہیں دیا گیا تھا، جیسا کہ اس زمانے میں عیسائی حضرات دعویٰ کرتے ہیں۔

﴿۲﴾ اس آیت میں مشرکین کو خطاب کرتے ہوئے حضرت نوح علیہ السلام کی نسبت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی تم لوگ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے عالی مقام رفقاء کی اولاد ہو اور حضرت نوح علیہ السلام تو بڑے ہی شکر گزار بندے تھے؛ اس لئے وہ اور ان کے ماننے والے کس طرح کسی کو خدا کا شریک ٹھہرا سکتے تھے؟ —— اس میں داعیانہ حکمت عملی کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے، جس کو دعوت دی جارہی ہے، اگر اس کے خاندان میں ایسے بزرگ گزرے ہوں، جو دینی اعتبار سے ممتاز رہے ہوں تو ان کا بھی حوالہ دینا چاہئے؛ کیوں کہ انسان کے سامنے جب اس کے گذشتہ بزرگوں کے حوالہ سے کوئی بات آتی ہے تو وہ اس کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے —— حضرت نوح علیہ السلام کے شکر گزار ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ وہ کھانے سے پہلے، کھانے کے بعد، کپڑے اور جوتے پہنتے ہوئے اور استنجے سے فارغ ہونے کے بعد ایسی دُعائیں پڑھتے تھے، جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور احسان مندی ہوتی تھی۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۲۱۳)

﴿۳﴾ مختلف انبیاء کے ذریعے بنی اسرائیل کو جو تنبیہ کی گئی، بائبل میں اس کا ذکر اب بھی موجود ہے، خاص کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دو اور پیغمبر یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحائف میں تفصیل سے اس کا ذکر آیا ہے، (دیکھئے: احبار، باب: ۲۶، یرمیاہ، باب: ۳-۶) مثلاً کتاب یرمیاہ میں فرمایا گیا ہے: ''خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھ، شمالی ملک سے ایک گروہ آتا ہے اور انتہائے زمین سے ایک بڑی قوم برانگیختہ کی جائے گی، وہ تیر انداز، نیزہ باز ہیں، وہ سنگ دل اور بے رحم ہیں، ان کے نعروں کی صدا سمندر کی سی ہے'' (کتاب یرمیاہ: ۶/ ۲۲-۲۳) —— مگر افسوس کہ یہ اور اس طرح کی سخت تنبیہات کے باوجود بنی اسرائیل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، وہ سرکشی و نافرمانی میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۫ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا
وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷

پھر ہم نے تم کو ان پر غلبہ عطا کیا، مال واولاد سے تمہاری مدد کی اور تم کو زیادہ بڑے لشکر والا بنا دیا، ۝۶ اگر تم نے اچھے کام کئے تو اپنے ہی فائدے کے لئے کئے اور برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی لئے کی، پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا (تو ہم نے دوسروں کو مسلط کر دیا)؛ تاکہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور پہلی بار کی طرح مسجد (بیت المقدس) میں گھس آئیں اور جس جگہ ان کو غلبہ حاصل ہو جائے، اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔ ۝۷ ﴿۱﴾

﴿۱﴾ بنی اسرائیل پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہی و بربادی کے بہت سے واقعات پیش آئے ہیں؛ لیکن ان میں سے دو بڑے واقعات کو قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے؛ چوں کہ اس طرح کے متعدد واقعات کا ذکر بائبل میں اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے؛ اس لئے مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ جن دو واقعات کا ذکر یہاں کیا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کا جو تذکرہ ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ —— زیادہ تر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ پہلا واقعہ ۵۸۷ قبل مسیح میں پیش آیا، جب بُخْتِ نَصَّر ایک بڑی فوج کے ساتھ شام پر حملہ آور ہوا، جہاں بنی اسرئیل کی حکومت تھی اور بیت المقدس بھی اسی کا ایک حصہ تھا، بخت نصر نے یہودیوں کی مقدس عبادت گاہ 'ہَیْکَل سُلَیْمانی' کی اینٹ سے اینٹ بجادی، پورے بیت المقدس شہر کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا، بے شمار یہودی مرد وعورت، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا، جو زندہ بچ گئے، انھیں قیدی بنا کر بابُل لایا گیا اور غلاموں اور باندیوں کی حیثیت سے انھیں اپنی رعایا پر تقسیم کر دیا گیا، ۷۰ سال تک وہ اسی ذلت وخواری میں زندگی گزارتے رہے، اس ۷۰ سالہ قید کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، (دیکھئے: یرمیاہ: ۲۵/۹-۱۲) بخت نصر کے بعد بابل کی حکومت کمزور پڑ گئی اور فارس کے فرمانروا سائرس دوم (Cyrus II) —— جس کو بائبل میں خورس کے نام سے ذکر کیا گیا ہے —— نے بابل پر حملہ کیا اور شکست دے کر بابل پر قابض ہو گیا، بائبل کے صحیفہ ''کتاب عزرا'' میں اس واقعہ کا ذکر موجود ہے، (کتاب عزرا: ۱/۱-۳) اس بادشاہ نے ۵۳۹ قبل مسیح میں اعلان کیا کہ سارے یہودی بیت المقدس (یروشلم) میں جمع ہو جائیں؛ چنانچہ اس نے یہودیوں کو یہاں آباد کیا اور ہیکل سلیمانی کے تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، ۵۱۵ قبل مسیح میں ہیکل کی تعمیر نو مکمل ہوئی، آیت نمبر: ۶ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، افسوس کہ اس کے بعد بھی یہودیوں کی نافرمانیاں جاری رہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، انھوں نے یہودیوں کے مذہبی رہنماؤں کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا ہے: ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس، اے اندھے راہ بتانے والو! اے احمقو اور اندھو! اے سانپو! اے افعی کے بچو!'' (دیکھئے: کتاب متیٰ، باب: ۲۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے خطاب میں جو سخت اور ترش لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہودی اس وقت کس درجہ بگاڑ میں مبتلا تھے؛ چنانچہ اب وہ دوسرا واقعہ ظاہر ہوا، جس کا آیت نمبر: ۷ میں ذکر ہے اور وہ اس طرح کہ یہودیوں کے اور شام کی حکمراں رومی حکومت کے درمیان ←

وقف لازم

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ﴿۸﴾
اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ
لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ﴿۹﴾

بعید نہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار رحم فرمائیں اور اگر تم پھر اسی طرح کا عمل کرو گے تو ہم بھی وہی سلوک کریں گے (جو پہلے کر چکے ہیں) اور ہم نے دوزخ کو تو کافروں کا قید خانہ بنا ہی رکھا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۸﴾ یقیناً قرآن بالکل سیدھا راستہ دکھاتا ہے اور ان مسلمانوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں، خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹﴾

← اختلاف شروع ہو گیا، آخر ۶۷ عیسوی میں ٹائٹس (Titus) ساٹھ ہزار فوجیوں کے ساتھ فلسطین پر حملہ آور ہوا اور مختلف علاقوں کو فتح کرتے ہوئے اس نے ۷۰ عیسوی میں بیت المقدس پر قبضہ کر لیا، ہیکل سلیمانی کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، دس لاکھ سے زیادہ یہودی مارے گئے، اور ایک لاکھ سے زیادہ قید کئے گئے اور انھیں غلام اور باندی کی حیثیت سے بیچ دیا گیا، آیت نمبر: ۴-۷ میں ان تینوں واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس پر اس کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جائے اور اللہ کا عذاب صرف کفر و شرک ہی کی وجہ سے نہیں آتا؛ بلکہ اعمال کے بگاڑ کی وجہ سے بھی آتا ہے؛ کیوں کہ ان دونوں مواقع پر بنی اسرائیل ایک حد تک عقیدۂ توحید پر قائم تھے اور جن دشمنوں نے ان پر چڑھائی کی، وہ مشرک تھے، یہ سبق بھی ملا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ عقیدۂ توحید پر ایمان رکھنے والے کسی گروہ پر مشرکین کو مسلط کر دیا جائے، یہ ضروری نہیں ہے کہ جب بھی توحید پر عمل کرنے والوں کا اور شرک کرنے والوں کا مقابلہ ہو تو جو لوگ توحید پر عمل پیرا ہوں، ان ہی کو غلبہ حاصل ہو۔

﴿۱﴾ اس میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے یہودیوں سے خطاب ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو درست کر لو اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو تم پر اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کا دروازہ کھل جائے گا؛ لیکن اگر تم نے اپنی نافرمانی کی روش جاری رکھی، تو ہو سکتا ہے کہ پھر ماضی کی تاریخ دہرادی جائے، یہ تو دنیا کا معاملہ ہے، اس کے علاوہ آخرت میں بھی دوزخ میں داخل کئے جاؤ گے —— افسوس کہ یہودی اپنی اسی روش پر قائم ہیں، وہ ۱۹۴۸ء سے پہلے تک یورپ کے مختلف ملکوں سے نکالے اور دھتکارے جاتے رہے اور تباہ و برباد کئے گئے، ۱۹۴۸ء میں اگرچہ امریکہ و برطانیہ کی مدد سے یورپ نے اپنے اس کینسر کو فلسطین میں منتقل کر دیا؛ لیکن انشاء اللہ یہ عارضی کیفیت ہے، بالآخر مسلمانوں کو فتح ہوگی اور یہودیوں کو شکست؛ لیکن اس کے لئے صرف جنگی جد و جہد کافی نہیں؛ بلکہ ضروری ہے کہ اللہ سے تعلق مضبوط ہو اور اسی سے اُمیدیں لگائی جائیں۔

﴿۲﴾ ''أقوم'' کے معنی ایسے راستے کے ہیں جو سیدھا ہو، انصاف پر مبنی ہو اور درست ہو، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۲۵) مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید نے زندگی کے تمام مسائل میں ایسے طریقے کی رہنمائی کی ہے، جو انسان کے لئے فائدہ مند ہے اور عدل اور میانہ روی ←

وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۰﴾ وَ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ﴿۱۲﴾ ع۱

اور قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لئے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، ﴿۱۰﴾ انسان جیسے بھلائی کی دُعاء مانگا کرتا ہے، اسی طرح برائی کی دُعاء مانگنے لگتا ہے اور انسان ہے ہی بڑا جلد باز، ﴿۱﴾ ﴿۱۱﴾ اور ہم نے دن اور رات کو نشانیاں بنایا ہے، رات کی نشانی کو بے نور اور دن کی نشانی کو روشن؛ تاکہ اپنے پروردگار کی روزی تلاش کرو اور تاکہ سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلو اور ہم نے ہر چیز کھول کھول کر بیان کردی ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۱۲﴾

← پر مبنی ہے؛ اس لئے دنیوی فائدے کے اعتبار سے بھی یہی راستہ اختیار کئے جانے کے لائق ہے اور آخرت میں بھی اس پر اجر وثواب حاصل ہوگا۔

﴿۱﴾ یعنی انسان کی فطرت میں جلد بازی ہے، وہ نتیجہ کے لئے انتظار کرنا نہیں چاہتا، اسی جلد بازی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ پھر یہ عذاب مجھ پر کیوں نہیں آرہا ہے؛ چنانچہ نَضر بن حارث کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ وہ مارے بُغض کے کہا کرتا تھا کہ اے اللہ! اگر یہی آپ کی طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے یا کوئی بڑا عذاب لے آیئے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۲۵)

﴿۲﴾ یعنی رات اور دن دونوں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی واضح نشانیاں اور انسان کے لئے اللہ کی بڑی نعمتیں ہیں، رات کی تاریکی بھی بڑی نعمت ہے؛ کیوں کہ اسی تاریکی کی وجہ سے رات کے وقت سکون اور خاموشی چھائی رہتی ہے، کاروبارِ زندگی کا شور و ہنگامہ رکا رہتا ہے اور ہر انسان میٹھی نیند سوپاتا ہے، اور دن کا روشن ہونا بھی بڑی نعمت ہے؛ کیوں کہ اگر دن میں سورج کا چراغ نہ جلتا اور دنیا کے ذرہ ذرہ کو اپنی روشنی نہیں پہنچاتا تو لوگوں کے لئے روزی تلاش کرنا، کاموں کو انجام دینا اور مختلف مقامات کا سفر کرنا کتنا دشوار ہوتا، پھر دن اور رات کا ایک مشترکہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے سالوں، دنوں اور مہینوں کا حساب متعلق ہے، دنیا کے تمام دفتر، کارخانے اور زندگی کے تمام کاروبار اسی کے حساب سے انجام پاتے ہیں — ''محونا آیة الّیل'' کا ایک ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہم نے رات کی نشانی کو مدھم کردیا، ایسی صورت میں اس سے چاند مراد ہوگا، جو رات میں نکلتا ہے اور جس کی روشنی سورج کے مقابلے مدھم ہوتی ہے، جیسے سورج کی روشنی دن میں دوڑ دھوپ کو آسان کردیتی ہے، اسی طرح چاند کی روشنی آنکھوں کے لئے ٹھنڈک اور دل کے لئے سرور کا باعث ہوتی ہے۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾
اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ﴿ؕ۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى
نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَ اِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْیَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْهَا فَفَسَقُوْا فِیْهَا فَحَقَّ عَلَیْهَا
الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِیْرًا ﴿۱۶﴾

اور ہم نے ہر انسان کے (اچھے برے) عمل کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے، ہم قیامت کے دن اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا دیکھے گا، ﴿۱﴾ ﴿۱۳﴾ اس سے کہا جائے گا: اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے، آج تو خود ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے، ﴿۱۴﴾ جو شخص سیدھے راستے پر چلتا ہے تو یقیناً وہ اپنے ہی فائدے کے لئے چلتا ہے اور جو گمراہی کو اختیار کرتا ہے، اس کا نقصان اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا ﴿۲﴾ اور جب تک ہم کسی پیغمبر کو بھیج نہیں دیتے ہیں، سزا نہیں دیتے ہیں ﴿۳﴾ ﴿۱۵﴾ اور جب ہم کسی بستی کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو وہاں کے خوشحال لوگوں کو (اطاعت و فرمانبرداری کا) حکم دیتے ہیں، پھر جب وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو ان پر حجت پوری ہو جاتی ہے؛ چنانچہ ہم ان کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۶﴾

﴿۱﴾ عمل کو گلے کا ہار بنانے سے مراد یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص ہار پہنے ہوئے ہو تو وہ ہر وقت اس کے گلے میں لٹکتا رہتا ہے، اسی طرح انسان کے اعمال کا ریکارڈ ہر وقت لکھا جا رہا ہے، دن ہو یا رات، روشنی ہو یا تاریکی، لوگوں کے درمیان ہو یا تنہائی میں، انسان کے مرنے کے بعد یہ پورا ریکارڈ محفوظ کر دیا جائے گا۔

﴿۲﴾ عیسائیوں کا خیال ہے کہ ان کے گناہوں کا بوجھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُٹھا لیا ہے اور وہ کفارہ بن کر سولی پر چڑھائے جا چکے ہیں، بعض اور لوگوں کی بھی یہ سوچ تھی کہ وہ ہمیں گناہوں کے عذاب سے بچا لیں گے، خود مسلمانوں میں بھی کچھ لوگوں میں یہ خیال موجود ہے کہ ہمیں ہمارے پیر اور فلاں بزرگ گناہوں کے بوجھ سے بچا لیں گے، اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ اللہ کے یہاں سزا اور عذاب کا نظام یہ نہیں ہے کہ ایک شخص کا بوجھ دوسرا اُٹھائے؛ بلکہ ہر شخص کو خود اس کے عمل کا جواب دینا ہوگا اور ہر آدمی خود اپنے گناہ کی سزا پائے گا۔

﴿۳﴾ یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس وقت تک اپنا عذاب نازل نہیں فرماتے، جب تک کہ دعوتِ حق ان کو نہ پہنچا دی گئی ہو، یعنی اس آیت کا تعلق دنیا کے عذاب سے ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۳۱) —— رہ گئی یہ بات کہ جن لوگوں تک اللہ کا دین نہیں پہنچ پایا ہو اور اس بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات پر عمل نہیں کر پائے تو کیا آخرت میں عذاب ہوگا؟ اس سلسلے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ ان پر عذاب نہیں ہوگا، مشہور مفسر علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف معلوم ہوتا ہے، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۳۲) اور یہی بات زیادہ درست ہے۔

﴿۴﴾ ''اَمَرْنَا'' کا ایک معنی تو وہ ہے جو ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم کے ذی حیثیت لوگوں کو نیکی کے کرنے اور برائی سے بچنے کا حکم دیا جاتا ہے؛ لیکن اس کے دو اور معنی بھی بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اَمَرْنَا، اَمَّرْنَا کے ←

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ﴿۱۷﴾
مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ یَصْلٰىهَا
مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْیَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْیُهُمْ
مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

اور ہم نے نوح کے بعد بھی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے، آپ کے پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور خوب دیکھنے والے ہیں، ﴿۱۷﴾ جو شخص دنیا (کی بھلائی) چاہتا ہے، ہم اس کو دنیا ہی میں جو چاہتے ہیں اور جس کے لئے چاہتے ہیں مہیا کر دیتے ہیں، پھر ہم نے اس کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے، وہ وہاں برے حال میں دُھتکارا ہوا داخل ہوگا، ﴿۱﴾ ﴿۱۸﴾ اور جو لوگ آخرت کے طلب گار ہوں، اس کے لئے خوب کوشش کریں اور وہ صاحبِ ایمان بھی ہوں، تو ان کی کوشش کامیاب ہوگی، ﴿۲﴾ ﴿۱۹﴾ ہم آپ کے پروردگار کی نوازشیں ہر ایک کو پہنچاتے ہیں، اِن (دنیا کے طلب گاروں) کو بھی اور اُن (آخرت کے اُمیدواروں) کو بھی، اور (دنیا میں) آپ کے پروردگار کی نوازش (کسی پر) بند نہیں ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۰﴾

← معنی میں ہے، اس کے معنی ہیں: حاکم بنانا، یعنی ہم قوم کے سرکش لوگوں کو حاکم بنا دیتے ہیں، پھر جب وہ نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر عذاب آجاتا ہے، دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم ان میں نافرمان لوگوں کی تعداد بڑھا دیتے ہیں (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۲-۳۳) —— ترجمہ میں جو معنی اختیار کیا گیا ہے، وہ زیادہ بہتر ہے —— حاصل سب کا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تقاضۂ انصاف کو پورا کرتے ہوئے کسی قوم پر اسی وقت عذاب نازل کرتے ہیں، جب ان پر حُجّت پوری ہو جاتی ہے۔

﴿۱﴾ لہٰذا اگر دنیا میں کوئی شخص راحت و آرام کے اسباب اور مال و دولت کے خزانوں کا مالک ہو جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آخرت میں بھی اسے اللہ کی نعمتیں حاصل ہوں گی؛ کیوں کہ یہ حقیقت میں اللہ کا انعام نہیں ہے؛ بلکہ اللہ کی طرف سے ڈھیل ہے۔

﴿۲﴾ اس آیت میں تین باتیں قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آخرت میں اچھے انجام کی تمنا کافی نہیں؛ بلکہ اس کے لئے کوشش بھی ضروری ہے اور کوشش یہ ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل کرے، دوسرے: یہ تمنا اور کوشش بھی اس وقت کارآمد ہوگی، جب کہ ایمان لا چکا ہو، اگر ایمان تو نہیں لایا؛ لیکن دل میں جنت کی تمنا بسائے ہوئے ہے اور بظاہر اچھے کام کر رہا ہے، تب بھی آخرت میں نجات حاصل نہیں ہوگی، تیسرے: دنیا کے طلب گاروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور جتنا چاہیں گے دیں گے، سبھی کو دینے کا وعدہ نہیں فرمایا؛ لیکن جو لوگ آخرت کے طلب گار رہیں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہیں تو اللہ نے وعدہ فرمایا کہ ان سب کی کوششیں کامیاب ہوں گی اور انھیں اجر ملے گا۔

﴿۳﴾ یعنی دنیا میں اللہ کی نعمتیں مسلمانوں کو بھی دی جاتی ہیں اور کافروں کو بھی۔

اُنْظُرْ كَیْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَ لَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّ اَكْبَرُ تَفْضِیْلًا ﴿۲۱﴾ لَا
تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ۧ وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ
وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا
تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا ﴿۲۳﴾ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ﴿۲۴﴾ؕ

دیکھ لیجئے کہ ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دے رکھی ہے اور آخرت تو درجوں کے اعتبار سے اور بڑھ کر ہے اور فضیلت میں بھی بڑھی ہوئی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۲۱﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنالو، ورنہ بدحال اور بے یار ومددگار ہوکر بیٹھے رہ جاؤ گے، ﴿۲۲﴾ۧ اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ تم لوگ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ بہتر سلوک کرو، اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے ایک یا دونوں بوڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو، ان کے ساتھ خوب ادب سے بات کرو، ﴿۲۳﴾ ان کے سامنے نیازمندی سے عاجزی کے ساتھ جھکے رہو اور دُعاء کرتے رہو: اے میرے رب! جیسے ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش کی تھی آپ ان دونوں پر اسی طرح رحم فرمائیے۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾ؕ

﴿۱﴾ یعنی دنیا میں بھی نعمتوں اور راحتوں کے لحاظ سے سب ایک درجہ میں نہیں ہیں، اور آخرت میں تو ان کے درجوں میں اس سے بھی زیادہ فرق ہوگا، یہاں تک کہ کوئی جنت میں ہوگا اور کوئی دوزخ میں۔

﴿۲﴾ آیت نمبر: ۲۳ تا ۲۷ تک اللہ تعالیٰ نے زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق بنیادی ہدایت کا ذکر کیا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ انسان کا خدا سے کیا تعلق ہونا چاہئے اور خدا کے بندوں سے کیسا تعلق ہونا چاہئے؛ چنانچہ پہلا حکم اللہ سے متعلق دیا گیا کہ انسان کو خدا ہی کی عبادت کرنی چاہئے، خدا کے سوا کسی اور کے سامنے اس کی پیشانی جھکنی نہیں چاہئے، دوسرے: والدین کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم دیا گیا اور خاص طور پر جب وہ بوڑھاپے کو پہنچ جائیں، جب کہ انسان کو قدم قدم پر مدد کی ضرورت پڑتی ہے اور مزاج میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے تو خاص طور پر ان کے ساتھ صبر وبرداشت اور تحمل سے کام لو، جھڑکنا تو دور کی بات ہے، انھیں اُف تک نہ کہو اور اسی پر اکتفا نہ کرو؛ بلکہ ان کے لئے دُعاء کا بھی اہتمام کرو کہ میرے پروردگار! جس شفقت ومحبت کے ساتھ انھوں نے ہماری پرورش کی ہے، ہم تو ان کا بدلہ ادا نہیں کرسکتے؛ لیکن آپ اپنی رحمت کے ذریعہ اس کی جزا عطا فرمادیجئے، والدین کے حقوق کی جو اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے ساتھ والدین کے حق کا ذکر فرمایا کہ میرے ساتھ شرک نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتادوں کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ضرور ارشاد فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور والدین کے ساتھ نافرمانی کرنا (ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی عقوق الوالدین، حدیث نمبر: ۱۹۰۱) یعنی نیکیوں میں بھی توحید کے ساتھ والدین کی ←

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَ كَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَ لَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

تمہارے پروردگار تمہارے دل کی باتوں کو بھی خوب جانتے ہیں، اگر تم نیک بن کر رہو تو اللہ توبہ کرنے والوں کی خطاء معاف کردیتے ہیں، ﴿۲۵﴾ اور رشتہ داروں کو ان کا حق ادا کرتے رہو اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق، اور بے جا خرچ نہ کیا کرو، ﴿۱﴾ ﴿۲۶﴾ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے، ﴿۲۷﴾ اور اگر کبھی تم کو اپنے پروردگار کی طرف سے روزی کے انتظار میں —— جس کی تم کو اُمید ہے —— ان سے پہلو تہی کرنی پڑے تو ان سے نرم بات کہہ دیا کرو، ﴿۲﴾ ﴿۲۸﴾ نہ تو اپنے ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو اور نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت کا نشانہ بنے ہوئے خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۹﴾

← اطاعت کا ذکر فرمایا گیا ہے اور گناہ میں بھی شرک کے بعد والدین کی نافرمانی کا ذکر فرمایا گیا ہے؛ چنانچہ حدیثیں کثرت سے آئی ہیں، جن میں والدین کے احترام اور ان کے ساتھ بہتر سلوک کی، نیز ان کے ساتھ بے احترامی اور نافرمانی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

﴿۱﴾ اس آیت میں تیسرا اور چوتھا حکم ہے، تیسرا حکم یہ ہے کہ والدین کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جو اللہ کے دوسرے بندے ہیں، ان کے اور خاص کر رشتہ داروں، ضرورت مندوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرنا چاہئے اور چوتھا حکم یہ ہے کہ جن چیزوں میں پیسے خرچ کرنا درست نہیں ہے، ان میں پیسے خرچ نہ کرے؛ قرآن مجید میں ایک اور لفظ 'اسراف' کا استعمال ہوا ہے، اُردو زبان میں اس کا ترجمہ بھی فضول خرچی سے کیا جاتا ہے؛ لیکن عام طور پر مفسرین نے تبذیر اور اسراف میں فرق کیا ہے، ناجائز مصرف میں پیسے خرچ کرنا ''تبذیر'' اور جائز کام میں ضرورت سے زیادہ پیسہ خرچ کرنا ''اسراف'' ہے، یہ دونوں ہی ناپسندیدہ عمل ہیں، انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ جائز طریقہ پر مال کمائے اور جائز ہی طریقہ پر خرچ کرے، اس آیت میں تبذیر یعنی بے جا کام میں خرچ کرنے کی اور سورۂ فرقان کی آیت: ۶۷ میں اسراف یعنی جائز چیزوں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔

﴿۲﴾ یہ پانچواں حکم ہے کہ اگر کوئی شخص کچھ طلب کرے اور اس کو ابھی پورا کرنا دشوار ہو؛ کیوں کہ جس آمدنی کے حاصل ہونے کی اُمید ہے، وہ ابھی حاصل نہیں ہوئی ہے، یا تنگی کی وجہ سے رشتہ داروں وغیرہ کا حق ادا نہ کر پاؤ تو خفگی کے ساتھ جواب نہ دو؛ بلکہ نرمی اور دل جوئی کے ساتھ اپنی مجبوری واضح کردو۔

﴿۳﴾ یعنی جیسے کمانے میں حلال و حرام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسی طرح خرچ کرنے میں بھی اعتدال ہونا چاہئے، نہ ہاتھ ←

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَ لَا ع ۳ ۸
تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً
كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

بے شک آپ کے رب جس کے لئے چاہیں رزق وسیع کر دیتے ہیں اور جس کے لئے چاہیں رزق تنگ کر دیتے ہیں،
آپ کے پروردگار اپنے بندوں سے خوب باخبر ہیں اور ان کو دیکھ رہے ہیں، ﴿۳۰﴾ اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے
مار نہ ڈالو، ہم ہی ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی، یقیناً ان کو مار ڈالنا بہت بڑی غلطی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۳۱﴾ اور زنا کے
قریب بھی نہ پھٹکو، یقیناً یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۳۲﴾

← اتنا تنگ ہو کہ بخل کرنے لگو اور نہ اتنا کھلا ہوا ہو کہ فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے ؛ کیوں کہ بخل کرنے سے بھی آدمی لوگوں کی نظر سے گر جاتا ہے اور فضول خرچی کی وجہ سے جب آدمی مفلس اور تہی دست ہو جاتا ہے تو اس کو بھی لوگ نیچی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں —— یہ چھٹا حکم ہے۔

﴿۱﴾ زمانہ جاہلیت میں لوگ اس اندیشے سے بعض اوقات پیدا ہونے والے بچوں کو مار ڈالتے تھے کہ وہ ان کی پرورش کا انتظام نہیں کر سکیں گے، اسی سے منع فرمایا جا رہا ہے، یہ ساتواں حکم ہے، سورۂ انعام (۱۵۱) میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے، افسوس کہ موجودہ دور میں ان لوگوں نے برتھ کنٹرول کی تحریک چلا رکھی ہے، جو علم و معیشت کے اعتبار سے ترقی یافتہ قومیں ہیں، قرآن نے اس غلط تصور کا ایک ہی جملے میں جواب دے دیا کہ روزی مہیا کرنا تمہارا کام نہیں ہمارا کام ہے، دنیا کی جن قوموں نے برتھ کنٹرول کے راستے کو اختیار کیا، ان میں سے کئی قومیں وہ ہیں، جن کے یہاں پیدائش کی شرح خطرناک حد تک کم ہوگئی ہے اور اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے ان کی نسل بالکل ہی معدوم نہ ہو جائے ؛ اسی لئے معاشی دشواریوں کے خوف سے اولاد کی پیدائش کو روک دینا جائز نہیں، ہاں اگر میڈیکل ضرورت اور معالج کے مشورے سے کوئی عارضی تدبیر اختیار کی جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

﴿۲﴾ آٹھواں حکم یہ ہے کہ ''زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو'' —— اس تعبیر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف زنا سے بچنا کافی نہیں ؛ بلکہ ان باتوں سے بھی بچنا چاہئے، جو انسان کو زنا کی طرف لے جاتی ہیں، جیسے : عریانیت، مردوں اور عورتوں کا اختلاط، اجنبی مرد و عورت کی ایک دوسرے کے ساتھ تنہائی وغیرہ —— اور زنا کو 'بُرا راستہ' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا گیا کہ اس برائی کی وجہ سے آخرت میں جو گناہ ہوگا، وہ تو ہوگا ہی ؛ لیکن دنیا میں بھی اس سے بڑا بگاڑ پیدا ہوتا ہے، خطرناک بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، ناجائز اولاد پیدا ہوتی ہے، جو باپ سے محروم ہوتی ہے، ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے عورت کو جو احترام حاصل ہے، عورت اس سے محروم ہو جاتی ہے، اگر منکوحہ عورت سے بدکاری کی جائے تو آئندہ ان لوگوں کو میراث مل جاتی ہے جو حقیقت میں میراث کے مستحق نہیں ہیں اور جو اصل حقدار ہیں وہ محروم ہو جاتے ہیں، بہت سی دفعہ اس کی وجہ سے سماج میں جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور قتل و خون تک کی نوبت آجاتی ہے۔

وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾ وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرو اور جو شخص ظلماً قتل کر دیا گیا ہو، ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے تو اس کو بھی چاہئے کہ قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرے، (اور یاد رکھے کہ اللہ کی طرف سے) اس کو مدد دی گئی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۳۳﴾ اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ؛ سوائے اس طریقہ کے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں، ﴿۲﴾ اور وعدہ پورا کیا کرو، بے شک وعدہ کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ ﴿۳﴾ ﴿۳۴﴾

﴿۱﴾ یہ نواں حکم ہے جس کا تعلق قتل سے ہے، اس میں ضمنی طور پر تین احکام دیئے گئے ہیں، اول یہ کہ تین صورتوں میں شریعت کی جانب سے قتل کی سزا مقرر کی گئی ہے، ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا ہو اور وہ قصاص میں قتل کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا ارتکاب کیا ہو اور اسے سنگسار کر دیا جائے، تیسرے یہ کہ وہ مسلمان تھا، مرتد ہو گیا اور سمجھانے بجھانے کے باوجود گناہ سے توبہ نہیں کی، ان میں سے آخری دو صورتوں کا تعلق ایسے ملک سے ہے، جہاں اسلامی حکومت قائم ہو اور پہلی صورت میں بھی قتل کی سزا عدالت کے واسطے سے جاری ہوگی، ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل کرنا یا ان تین صورتوں میں بھی ایسے شخص کا قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا جس کو قانون نافذ کرنے کا اختیار نہیں، حرام ہے، دوسرا حکم یہ ہے کہ جس شخص کو ظلماً قتل کر دیا گیا ہو، اس کے ورثہ قصاص کا مطالبہ کر سکتے ہیں، تیسرا حکم یہ فرمایا گیا کہ قاتل سے قصاص لینے میں بھی زیادتی نہیں ہونی چاہئے، ایسا نہ ہو کہ قاتل کے بدلے جوشِ انتقام میں اس کے خاندان کے کسی اور شخص کو قتل کر دیا جائے، یا قاتل تو ایک ہے؛ لیکن مقتول کے بدلے دو شخص قتل کر دیئے جائیں، یا قاتل کو تکلیف دے دے کر یا اس کے اعضاء کو تراش تراش کر قتل کیا جائے، یہ سب باتیں حد سے تجاوز کرنے میں داخل ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰؍۲۵۵) حاصل یہ ہے کہ مجرم کو سزا دیتے ہوئے بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہئے، آخر میں مقتول کے ورثہ سے فرمایا گیا کہ یہ جو قصاص لینے کا حق دیا گیا ہے، یہ قانونِ الٰہی کے ذریعہ تمہاری مدد ہے، ورنہ اگر شریعت کی طرف سے اس کی گنجائش نہ ہوتی اور قانون تمہاری مدد نہ کرتا تو جس دبنگ آدمی نے تمہارے مورث کو قتل کر دیا ہے تم اس سے بدلہ نہیں لے پاتے؛ اس لئے بدلہ لینے میں اللہ تعالیٰ نے جن حدوں کو قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، تم ان کو قائم رکھو۔

﴿۲﴾ یہ دسواں حکم ہے کہ اگر کوئی شخص یتیموں کے مال کا محافظ ہو تو اسے پوری امانت و دیانت اور ہمدردی و بہی خواہی سے کام لینا چاہئے اور جب وہ جوان ہو جائیں تو خوش دلی کے ساتھ ان کا مال ان کو واپس کر دینا چاہئے، سورۂ انعام (۱۵۲) میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔

﴿۳﴾ وعدہ کسی فرد سے ہو یا قوم سے اور مسلمان سے ہو یا غیر مسلم سے، اس کا پورا کرنا واجب ہے، فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ←

وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَ زِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۞۳۵
وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ
مَسْـُٔوْلًا ۞۳۶

اور جب پیمانہ سے دو تو پورا بھر کر دو اور صحیح ترازو سے تولا کرو، یہ بہتر اور انجام کے اعتبار سے بھی اچھا ہے،﴿۱﴾ ۞۳۵
اور تم کو جس بات کی تحقیق نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑ جایا کرو، یقیناً کان، آنکھ اور دل، انسان سے اِن سب کے
بارے میں پوچھ ہوگی۔﴿۲﴾ ۞۳۶

← جب کوئی وعدہ کیا جائے تو دیانتاً اس کو پورا کرنا واجب ہے، یعنی اگر شدید عذر کے بغیر پورا نہ کرے تو گنہگار ہوگا؛ لیکن کیا وعدہ کو پورا کرنا ''قضاءً'' بھی واجب ہے، یعنی کیا عدالت وعدہ پورا کرنے پر مجبور کر سکتی ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، زیادہ تر حضرات کی رائے یہ ہے کہ ایک طرفہ وعدہ کو پورا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن امام مالک ؒ کے نزدیک اگر وعدہ کسی سبب سے متعلق ہے اور وہ سبب وجود میں آ چکا ہے تو اب وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے، جیسے کسی شخص نے کہا تم اپنا مکان گرا دو، میں نئے مکان کی تعمیر کے لئے تم کو اتنے روپے قرض دوں گا اور اسی وعدہ کی بنیاد پر اس نے اپنا مکان گرا دیا تو وعدہ کرنے والے شخص کو اپنا وعدہ پورا کرنے پر مجبور کیا جائے گا، آج کل اسلامی مالیاتی ادارے بھی اسی رائے کو اختیار کرتے ہیں —— احکام کا جو سلسلہ چل رہا ہے یہ ان میں سے گیارہواں حکم ہے۔

﴿۱﴾ یہ بارہواں حکم ہے، سورۃ الانعام (۱۵۲) میں بھی یہ حکم آ چکا ہے، اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ناپنا تولنا بیچنے والے کی ذمہ داری ہے؛ اگر کوئی چیز بیچی جا رہی ہو تو اس کی مقدار معلوم کرنے کے اخراجات بیچنے والے کے ذمہ ہوں گے —— صحیح ناپ تول کا ایک حکم تو بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ چیزوں کی ناپ تول میں امانت و دیانت سے کام لیا جائے؛ لیکن اسی حکم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ جب کسی شخص کے بارے میں رائے ظاہر کی جائے تو اس میں بھی انصاف کو قائم رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ جس سے عقیدت و محبت ہو، اس کے عیب کو بھی ہنر بنا دیا جائے اور جس سے اختلاف ہو، اس کے ہنر کو بھی عیب؛ بلکہ اس معاملے میں بھی پوری طرح عدل سے کام لیا جائے۔

﴿۲﴾ یہ تیرہواں حکم ہے، جو سماجی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اکثر انسان آنکھ سے زیادہ کان پر بھروسہ کرنے لگتا ہے اور سنی سنائی بات کو سچ مان کر بدگمانیوں کی پوری عمارت کھڑی کر لیتا ہے، معاشرے میں اختلاف، جھگڑے اور شکوہ و شکایت کی بنیاد زیادہ تر یہی بات بنتی ہے، یہاں اسی بات سے منع کیا گیا ہے؛ لہٰذا جب تک تحقیق نہ کر لی جائے اور کوئی بات غالب گمان کے درجہ میں نہ آ جائے، اس وقت تک اس کو قبول نہیں کرنا چاہئے؛ کیوں کہ قیامت کے دن انسان سے کان، آنکھ، دل، یعنی کسی بات کی تحقیق و تفتیش کے جو ذرائع ہیں، ان سب کے بارے میں سوال ہوگا اور وہ خود انسان کے خلاف گواہی دیں گے، قرآن مجید میں دوسرے مواقع پر بھی قیامت میں مختلف اعضاء جسم کے بولنے اور گواہی دینے کا ذکر آیا ہے۔ (یٰسین: ۶۵)

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ کُلُّ
ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْہًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰۤی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ؕ وَ لَا
تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَہَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ
وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا ؕ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ہٰذَا
الْقُرْاٰنِ لِیَذَّکَّرُوْا ؕ وَ مَا یَزِیْدُہُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ کَانَ مَعَہٗۤ اٰلِـہَۃٌ کَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا
لَّابْتَغَوْا اِلٰی ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ﴿۴۳﴾

ع

اور زمین پر اتراتے ہوئے مت چلو کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو، ﴿۱﴾ ﴿۳۷﴾ اِن (ذکر کئے گئے احکام) میں سے ہر بُری بات تیرے پروردگار کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہے، ﴿۲﴾ ﴿۳۸﴾ یہ باتیں آپ کے پروردگار کے اُتارے ہوئے حکیمانہ کلام میں سے ہیں اور اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہ بنالو کہ ملامت کئے اور دھتکارے جاتے ہوئے دوزخ میں ڈال دیئے جاؤ، ﴿۳۹﴾ کیا تمہارے پروردگار نے تم کو تو چن چن کر بیٹے دے دیئے اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں؟ یقیناً تم بڑی بات کہتے ہو، ﴿۳﴾ ﴿۴۰﴾ ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے سمجھایا ہے؛ تا کہ اچھی طرح سمجھ لیں اور صورت حال یہ ہے کہ ان کی نفرت ہی بڑھتی جاتی ہے، ﴿۴۱﴾ آپ فرمادیجئے: اگر اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہوتے، جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں، تو ان لوگوں نے عرش والے کی طرف ضرور کوئی راستہ ڈھونڈ لیا ہوتا، ﴿۴۲﴾ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اللہ کی ذات اس سے پاک اور بہت بلند و برتر ہے۔ ﴿۴﴾ ﴿۴۳﴾

﴿۱﴾ انسان کے مزاج و اخلاق کا اظہار صرف زبان ہی سے نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کی چال ڈھال سے بھی ہوتا ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت و اخلاق روایت کرنے والوں نے نقل کیا ہے کہ آپ کی ہر ادا سے تواضع و انکساری کا اظہار ہوتا تھا، پھر تکبر تو وہ کرے جس کو واقعی بڑائی حاصل ہو، انسان تو اتنا عاجز ہے کہ نہ زمین کی گہرائیوں میں پہنچ سکتا ہے اور نہ اپنے قد و قامت کے ذریعے پہاڑ کی بلندی کو چھوسکتا ہے، اس کو اس بات کا حق بھی کہاں ہے کہ وہ تکبر کرے؟

﴿۲﴾ یعنی گذشتہ باتوں میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے کرنے کا حکم ہے، اور کچھ باتیں وہ ہیں جن سے بچنے کا حکم ہے، تو جن سے بچنے کا حکم ہے، وہ سب بری باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہیں۔

﴿۳﴾ عرب کے بعض قبیلے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے؛ لیکن اپنے لئے بیٹی کو ننگ و عار کا سبب سمجھتے تھے، قرآن مجید نے کہا: یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز کو اپنے لئے باعث ننگ خیال کرتے ہیں، اس کو اللہ کے لئے ثابت کرتے ہیں!

﴿۴﴾ یعنی اگر واقعی کئی خدا ہوتے تو عرش پر قبضہ کرنے کے لئے انھوں نے ہلہ بول دیا ہوتا، خداؤں کے درمیان ایک جنگ چھڑ جاتی اور کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا، مگر ایسا کچھ نہیں ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا ایک ہی ہے نہ کہ کئی۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ
وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا
بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

ساتوں آسمان، زمین اور ان میں موجود ساری چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں، کوئی چیز نہیں جو اس کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی پاکی بیان نہیں کرتی ہو؛ لیکن تم لوگ اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے، بے شک اللہ بہت بردبار اور بے حد معاف کرنے والے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۴۴﴾ اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک نظر نہ آنے والا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ ﴿۴۵﴾

﴿۱﴾ آسمان و زمین اور اس میں موجود ساری چیزوں کے تسبیح پڑھنے کی کیا صورت ہے؟ اس سلسلے میں دو رائیں ہیں، ایک یہ کہ وہ سب زبان حال سے اللہ تعالیٰ کی ثناء خواں ہیں، اللہ نے جس کو جس حال میں رکھا ہے، وہ اس پر راضی ہے، وہ پوری فرمانبرداری کے ساتھ اپنی جگہ اور اپنی کیفیت پر قائم ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ وہ واقعی تسبیح پڑھتے ہیں؛ لیکن عام انسان اس کو سننے سے عاجز ہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ان کے ساتھ صبح و شام پہاڑ بھی تسبیح پڑھا کرتے تھے: ''اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِشْرَاقِ'' (ص:۱۸) اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بعض پتھر اللہ کی خشیت سے نیچے گر پڑتے ہیں: ''وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ'' (البقرۃ:۷۴) بعض احادیث میں بھی اس کی صراحت ہے، جیسے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ہم لوگ جب کھانا کھایا کرتے تھے تو کھانے کی تسبیح سنا کرتے تھے: ''لقد کنا نسمع تسبیح الطعام وھو یؤکل'' (بخاری، کتاب المناقب، باب علامۃ النبوۃ الخ، حدیث نمبر:۳۳۸۶) بعض اور روایات میں ہے کہ جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے تو کھانے کی تسبیح سنتے رہتے تھے، (ترمذی، کتاب المناقب، حدیث نمبر:۳۶۳۳) نیز مسلم میں حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں مکہ میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں، جو نبوت سے پہلے بھی مجھے سلام کیا کرتا تھا، (کتاب الفضائل، حدیث نمبر:۲۲۷۷) اس لئے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتی رہتی ہیں اور اپنے اندر احساسات رکھتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان کے احساسات جانداروں کے مقابلہ کم درجے کے ہیں اور ان کے اندر گویائی کی صلاحیت بمقابلہ انسان کے بہت کم ہے؛ اس لئے انسان ان کی آواز سن نہیں پاتا — جہاں تک عقلی نقطۂ نظر سے اس کے ممکن اور ناممکن ہونے کی بات ہے تو یہ تو انسان کے اعتبار سے ہے، اللہ تعالیٰ جو تمام کائنات کے خالق اور قادر مطلق ہیں، ان کے لئے کوئی چیز کیسے ناممکن ہوسکتی ہے؟ آج انسان نے اپنی کوشش کے ذریعہ کئی باآواز چیزوں کو ایجاد کرلیا ہے، جیسے: ٹیپ ریکارڈ، سی ڈی اور ویڈیو وغیرہ، تو کیا اللہ تعالیٰ کے لئے کسی چیز میں نطق اور گویائی کی قدرت پیدا کردینا اور انھیں بولنے کی صلاحیت بخش دینا دشوار ہے؟

وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ
وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ
هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ
الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا
لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾

اور (وہ اس طرح کہ) ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں؛ تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں، اور ان کے کان میں بوجھ ڈال دیتے ہیں، اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے پروردگار کا ذکر کرتے ہیں تو وہ پشت پھیر کر نفرت کرتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۴۶﴾ جس وقت یہ لوگ آپ کی طرف کان لگائے رہتے ہیں تو جس غرض سے یہ سنتے ہیں، ہم اس سے خوب واقف ہیں اور اس وقت بھی جب یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں، جب یہ بے انصاف لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ محض ایک ایسے شخص کے پیچھے پڑے ہوئے ہو، جس پر جادو کر دیا گیا ہے، ﴿۴۷﴾ دیکھئے تو سہی! یہ لوگ آپ کے لئے کیسی فرضی باتیں کہتے ہیں؟ تو یہ لوگ تو گمراہ ہو چکے، یہ (درست) راستہ نہیں پا سکتے، ﴿۲﴾ ﴿۴۸﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈی بن جائیں گے اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو پھر ہم از سر نو پیدا کر کے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے؟ ﴿۴۹﴾ آپ فرما دیجئے: پتھر بن جاؤ یا لوہا۔ ﴿۵۰﴾

﴿۱﴾ یعنی قرآن تو ایک روشنی ہے، جس سے اہل توفیق کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی شخص سورج کی روشنی پر پردہ گھیر لے تو ظاہر ہے کہ وہ اس روشنی سے محروم ہی رہے گا، یہی حال ان کفار و مشرکین کا ہے کہ انھوں نے قرآن اور اپنے درمیان ضد اور ہٹ دھرمی کا پردہ ڈال رکھا ہے؛ اس لئے ہدایت سے محروم ہیں —— بعض روایات میں آیا ہے کہ جب سورۂ دھر نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی اُم جمیل بپھری ہوئی اور ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے کعبہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑتی ہوئی آئی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، آپ ﷺ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی، وہ آپ ﷺ کو دیکھ نہ پائی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کچھ بات کہہ کر واپس چلی گئی۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۶۹)

﴿۲﴾ جب آپ کفار مکہ پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تو وہ اس کا جواب دینے سے تو قاصر ہوتے؛ لیکن آپس میں سرگوشیاں کرتے، کوئی کہتا: آپ مجنون ہیں، کوئی آپ کو جادوگر قرار دیتا، اور کوئی کہتا: خود آپ پر جادو کر دیا گیا ہے، غرض کہ وہ سمجھنے اور قبول کرنے کی نیت سے نہیں سنتے تھے؛ اس لئے ان کو گمراہی سے نجات نہیں مل پاتی۔

اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ
فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰی هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا ﴿۵۱﴾ یَوْمَ
یَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۵۲﴾ وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا ع ۵ ۱۲ ۵
الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾

یا اپنے خیال کے مطابق اس سے بھی بڑی کوئی مخلوق، (پھر بھی تم دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے) پھر عنقریب وہ پوچھیں گے: کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ آپ کہہ دیجئے: وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا،《۱》اس پر وہ اپنا سر ہلا ہلا کر آپ سے کہیں گے: یہ ہوگا کب؟ آپ فرما دیجئے: عجب نہیں کہ وہ وقت قریب ہی ہو، ﴿۵۱﴾ وہ دن کہ جب اللہ تم کو پکاریں گے، پھر تم اللہ کی تعریف کرتے ہوئے چلے آؤ گے اور خیال کرو گے کہ تم تو تھوڑے ہی دنوں (دنیا میں) رہے ہو،《۲》﴿۵۲﴾ اور میرے بندے سے کہہ دیجئے کہ وہی بات کہا کریں جو بہتر ہو کہ شیطان ان کے درمیان جھگڑے ڈال دیتا ہے، واقعی وہ انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔《۳》﴿۵۳﴾

《۱》 یعنی جس خدا نے کسی نمونہ کے بغیر پہلی دفعہ تمہیں پیدا کیا تھا، اس کے لئے تم کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟

《۲》 قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو پکارا جائے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے نام سے پکارے جاؤ گے؛ اس لئے اچھے نام رکھا کرو (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، حدیث نمبر: ۴۹۵) اس وقت جب لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر میدان حشر میں جمع ہوں گے، تو انھیں خیال ہوگا کہ انھوں نے قبر میں کچھ ہی مدت گزاری ہے، یا دنیا کی زندگی کے بارے میں یہ خیال ہوگا؛ جیسا کہ سو کر اُٹھنے کے بعد انسان خیال کرتا ہے کہ وہ تھوڑی ہی دیر کے لئے سویا تھا، بہر حال جب وہ بارگاہ ربانی کی طرف بڑھیں گے تو مسلمان ہوں یا کافر، ہر ایک کی زبان پر اللہ تعالیٰ کی حمد ہوگی اور ایمان سے محروم لوگ جس عمل سے دنیا میں انکار کرتے رہے، آج اس کو بجالانے پر مجبور ہوں گے، مگر اس وقت ان کا یہ عمل کچھ کام نہ آئے گا۔

《۳》 اہل مکہ میں سے کسی شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا، انھوں نے بھی سختی سے جواب دیا؛ بلکہ اس کو مار ڈالنا چاہا، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر مشرکین مکہ مسلمانوں سے اُلجھنے کی کوشش کریں، تو خوش اُسلوبی سے جواب دینے پر اکتفا کیا جائے، جھگڑے کی نوبت نہ آنے دی جائے، (قرطبی: ۱۰/۲۷۶) اسی طرح مکی زندگی میں مختلف صحابہ مشرکین کی اذیت رسانی سے تنگ آکر آپ ﷺ سے جنگ کی اجازت چاہتے، تو آپ ﷺ فرماتے کہ ابھی جہاد کی اجازت نہیں دی گئی ہے؛ اس لئے بھلی بات کے ذریعہ مسئلہ کو ٹال دیں، (حوالہ سابق) —— معلوم ہوا کہ مسلمان جہاں اقلیت میں ہوں، وہاں ان کو جہاں تک ہو سکے، لڑائی بھڑائی سے بچ کر دعوتِ اسلام کا کام کرنا چاہئے، لڑائی بھڑکا دینا اور نفرت کا ماحول پیدا کر دینا شیطانی طریقہ ہے، جس سے مسلمانوں کو اور خاص کر ان کی دعوتی کوششوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ
وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى
بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ
الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ لَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ
اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

تمہارے پروردگار تمہارے حال سے خوب واقف ہیں، اگر چاہیں تو تم پر رحم فرمادیں، اور چاہیں تو تم کو عذاب دیں اور ہم نے آپ کو ان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا، ﴿۱﴾ ﴿۵۴﴾ اور آپ کے پروردگار اُن سب چیزوں سے خوب واقف ہیں، جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت عطاء فرمائی ہے اور ہم نے ہی داؤد کو زبور دی تھی، ﴿۵۵﴾ آپ کہہ دیجئے: تم اللہ کے سوا جن کو (معبود) خیال کرتے ہو، انھیں کو بلالو، نہ وہ تم سے کسی تکلیف کو دور کرسکتے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں، ﴿۵۶﴾ یہ لوگ جن کو پکارا کرتے ہیں، وہ خود اپنے پروردگار تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کررہے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ نزدیک ہوجائے، وہ خود اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یقیناً آپ کے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کی چیز! ﴿۲﴾ ﴿۵۷﴾

﴿۱﴾ اس آیت کے پہلے فقرہ میں مکہ کے مشرکین سے خطاب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے خوب واقف ہیں، ایمان کی توفیق دے کر رحم بھی کرسکتے ہیں اور اس سے محروم رکھ کر عذاب بھی دے سکتے ہیں —— اس میں مسلمانوں کو ایک داعیانہ طریقہ بھی سکھایا گیا کہ اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے غیر مسلموں کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ تم سب دوزخی ہو، تم کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا؛ بلکہ نرم لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے کہنا چاہئے کہ تمہارے حال سے اللہ واقف ہیں، چاہے معاف کردیں یا عذاب دیں، دوسرے فقرہ میں حضور کے لئے تسلی ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، آپ کا کام دعوت پہنچانا ہے نہ کہ مسلمان بنادینا۔

﴿۲﴾ مختلف مشرک قومیں ایسی شخصیتوں کی پوجا کرتی رہی ہیں، جو خود اللہ کے نیک بندے اور اس کی عبادت کرنے والے تھے، جیسے عرب کے بعض قبائل فرشتوں کی پرستش کرتے تھے، یہود کے بعض قبائل حضرت عزیر علیہ السلام کو معبود خیال کرتے تھے؛ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں، بعض اہل مکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے؛ حالاں کہ خود بعض 'جن' آپ ﷺ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوچکے تھے، (قرطبی: ۱۰/۲۷۹) قرآن مجید نے یہاں ان سبھوں کو متنبہ کیا ہے کہ یہ حضرات تو خود ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کی پکڑ کے خوف سے لرزاں وترساں ہیں، ان کی عبادت کرنے اور اصل خدا سے غفلت برتنے کا کیا کوئی نفع ہوسکتا ہے؟ —— یہاں ''وسیلہ'' کے معنی قربت اور نیکی کے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۷۹) نہ کہ ذریعہ اور واسطہ کے، جیسا کہ عام طور پر اُردو زبان میں اس کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ
ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَ مَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ
وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَ اِذْ قُلْنَا
لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ
الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ ع ۶/۸

ایسی کوئی بستی نہیں جس کو قیامت سے پہلے ہم تہہ و برباد نہ کردیں یا اس کو سخت عذاب نہ دیں، یہ کتاب میں لکھا جاچکا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۵۸﴾ ہمیں نشانیاں بھیجنے سے محض اس بات نے روک رکھا ہے کہ پہلے لوگ اس کو جھٹلاتے رہے ہیں، ہم نے قوم ثمود کو بطور نشانی اونٹنی دی تو ان لوگوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی اور ہم ڈرانے کے لئے ہی نشانیاں بھیجا کرتے ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۵۹﴾ اور اس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے پروردگار نے اِن لوگوں کو گھیر رکھا ہے (لہٰذا ڈرنے کی ضرورت نہیں) اور ہم نے جو مناظر آپ کو دکھائے ہیں اور جس درخت پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے، اُن کو ہم نے اِن لوگوں کے لئے آزمائش بنادیا ہے اور ہم ان کو ڈراتے جارہے ہیں، پھر بھی ان کی سرکشی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ﴿۳﴾ ﴿۶۰﴾

﴿۱﴾ ہلاکت کا تعلق مسلمانوں اور غیر مسلموں سبھوں سے ہے کہ قیامت سے پہلے تمام انسان ختم کردیئے جائیں گے، اور عذاب کا تعلق ایمان نہ لانے والوں سے ہے کہ اللہ چاہیں گے تو ان کو عذاب کے ذریعہ ہلاک کردیں گے۔

﴿۲﴾ یعنی تم سے پہلے کی قوموں نے معجزات طلب کئے، پھر جب معجزات ان کے سامنے آگئے تو انھوں نے ایمان لانے سے انکار کردیا، جیسا کہ قومِ ثمود کا حال آگے ذکر کیا جارہا ہے؛ لہٰذا اگر اہل مکہ کے مطالبہ کے مطابق معجزات عطا کردیئے جائیں، پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں تو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق یہ ہلاک کردیئے جائیں گے؛ حالاں کہ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ان ہی میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں اور ان کی آئندہ نسلیں مسلمان ہوں، پھر ان کے ذریعہ پوری دنیا تک اسلام کی روشنی پہنچے: اس لئے ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا جارہا ہے۔

﴿۳﴾ ''رؤیا'' سے مراد واقعۂ معراج کے مناظر ہیں، ''شجرۃ ملعونۃ'' سے مراد ''زقوم'' کا درخت ہے، جو دوزخ میں ہوگا اور یہی درخت اہل دوزخ کی خوراک ہوگی، (الدخان: ۴۴) مطلب یہ ہے کہ واقعۂ معراج کو سن کر اہل کفر کا انکار اور بڑھ گیا اور انھوں نے اس کو ناممکن سمجھ کر رسول اللہ ﷺ کو جھٹلا دیا، بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ کچھ نومسلم بھی اس واقعہ پر مشرکین کی باتوں سے متاثر ہوکر مرتد ہوگئے، مگر یہ بات کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے؛ اس لئے علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اس سے انکار کیا ہے؛ لہٰذا صحیح یہی ہے کہ خود مشرکین مکہ کے لئے یہ واقعہ آزمائش کا سبب بن گیا —— ''زقوم'' کے درخت کے بارے میں ابوجہل کہتا تھا کہ جب دوزخ کی آگ انسان اور پتھر تک کو جلا کر رکھ دے گی تو یہ درخت دوزخ میں کس طرح باقی رہے گا؟ پس قرآن مجید کی ←

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ
طِیْنًاۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ
ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً
مَّوْفُوْرًا﴿۶۳﴾ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ
وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴿۶۴﴾ اِنَّ
عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰی بِرَبِّكَ وَكِیْلًا﴿۶۵﴾

اوراس وقت کو یاد کیجئے جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو؛ چنانچہ ابلیس کے سوا سب سجدہ میں گر پڑے، اس نے کہا: کیا میں ایسے شخص کو سجدہ کروں، جس کو آپ نے مٹی سے بنایا ہے؟ ﴿۶۱﴾ کہنے لگا: بھلا دیکھئے تو سہی! یہی وہ شخص ہے جس کو آپ نے مجھ سے بڑھا دیا؟ اگر آپ مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دیں تو کچھ کو چھوڑ کر میں اس کی اولاد کو اپنے قابو میں کرلوں گا، ﴿۱﴾ ﴿۶۲﴾ فرمایا: جا، (جو ہو سکے کرلے) پھر ان میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو تم سب کی پوری سزا دوزخ ہے، ﴿۶۳﴾ ان میں سے جن کو تو بہکا سکے، ان کو اپنی آواز سے بہکا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا دے، مال واولاد میں ان کا شریک بن جا اور ان سے (پُرفریب) وعدے کرلے —— اور ان سے شیطان کا وعدہ محض ایک دھوکہ ہے! ﴿۶۴﴾ یقیناً جو میرے (وفادار) بندے ہیں، ان پر تیرا زور نہیں چلے گا اور کام بنانے کے لئے آپ کے پروردگار کافی ہیں۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۵﴾

← یہ بات ان کے ایمان لانے کے لئے امتحان بن گئی کہ وہ اپنی سمجھ کو ترجیح دیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم کو؛ حالاں کہ آج ایسے فائر پروف مسالے نکل چکے ہیں، جن کو لگا کر انسان آگ سے گذر سکتا ہے یا کپڑے میں لگا دیا جائے تو کپڑا محفوظ رہتا ہے، پھر اللہ کی قدرت کے لئے کیا دشوار ہے کہ وہ دوزخ میں ایک فائر پروف درخت کی پرورش فرمادیں؟

﴿۱﴾ ''لَاَحْتَنِكَنَّ'' کا معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ''لأستولین علیھم'' (میں ان پر غلبہ حاصل کرلوں) سے کیا ہے؛ اسی لئے یہاں ترجمہ کیا گیا ہے: میں ان کو اپنے قابو میں کرلوں گا۔

﴿۲﴾ حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ سات سورتوں —— بقرہ، اعراف، حجر، اسراء، کہف، طٰہٰ، ص —— میں آیا ہے، ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے دو باتیں کہیں، ایک یہ کہ آپ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے، (ص:۷۶) اور مٹی بمقابلہ آگ کے کمتر درجے کی مخلوق ہے؛ کیوں کہ آگ بلندی کی طرف جاتی ہے اور مٹی پستی کی طرف آتی ہے، ظاہر ہے شیطان کا یہ اعتراض بے جا تھا؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کے مالک ہیں اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں سے جس کو جہاں چاہے رکھے، شیطان نے دوسری بات یہ کہی کہ آپ مجھے قیامت تک مہلت دیجئے کہ میں انسانوں کو بہکا سکوں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مہلت عطا فرمادی —— آگے ان پانچ حربوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کو شیطان ←

رَبُّكُمُ الَّذِیۡ یُزۡجِیۡ لَكُمُ الۡفُلۡكَ فِی الۡبَحۡرِ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمۡ رَحِیۡمًا ﴿۶۶﴾
وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الۡبَحۡرِ ضَلَّ مَنۡ تَدۡعُوۡنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمۡ اِلَی الۡبَرِّ اَعۡرَضۡتُمۡ ؕ
وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ كَفُوۡرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِكُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡكُمۡ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَكُمۡ وَكِیۡلًا ﴿ۙ۶۸﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَكُمۡ فِیۡهِ تَارَةً اُخۡرٰی
فَیُرۡسِلَ عَلَیۡكُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَكُمۡ بِمَا كَفَرۡتُمۡ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَكُمۡ عَلَیۡنَا
بِهٖ تَبِیۡعًا ﴿۶۹﴾

تمہارے پروردگار وہ ہیں جو تمہارے لئے سمندر میں کشتی چلاتے ہیں؛ تاکہ تم ان کی (دی ہوئی) روزی تلاش کرو، بے شک وہ تم پر بے حد مہربان ہیں، ﴿۶۶﴾ اور جب تم پر سمندر میں کوئی مصیبت آجاتی ہے تو خدا کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو، وہ سب غائب ہو جاتے ہیں، پھر جب اللہ تم کو خشکی کی طرف لاکر بچالیتے ہیں تو تم منھ پھیر لیتے ہو، اور انسان ہے ہی بڑا ناشکرا، ﴿۶۷﴾ کیا تم بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تم کو خشکی کی طرف لاکے دھنسا دیں یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دیں، پھر تم اپنے لئے کوئی نگہبان نہ پاؤ، ﴿۶۸﴾ یا کیا تمہیں اس کا اندیشہ نہیں ہے کہ اللہ تم کو دوبارہ سمندر میں لے جائیں، پھر تمہاری ناشکری کی وجہ سے تم پر ہوا کا طوفان بھیج دیں، جو تمہیں ڈبو کر رکھ دے، پھر تم کو کوئی ایسا بھی نہیں نہ مل پائے گا، جو ہم سے اس کی باز پرس کرنے والا ہو۔ ﴿۱﴾ ﴿۶۹﴾

← انسان کو بہکانے کے لئے استعمال کرتا ہے، ایک حربہ آواز کا ہے کہ وہ گانے بجانے کے ذریعہ انسان کو دین سے غافل کردیتا ہے، دوسرا حربہ طاقت کا ہے، سوار اور پیدل سے یہی مراد ہے کہ تم اپنے ماننے والے اسلام دشمن عناصر کو پوری قوت کے ساتھ چڑھادو، تیسرا حربہ مال کا ہے کہ حرام طریقہ پر ان سے مال کمواؤ اور غلط راستے میں خرچ کراؤ، چوتھا حربہ اولاد کا ہے کہ اولاد کی محبت میں ان سے گناہ کراؤ اور اولاد کی دینی واخلاقی تربیت سے ان کو غافل کردو اور پانچواں حربہ دل فریب وعدوں اور خوشنما آرزوؤں کا ہے، کہ اِن کے ذریعہ اُن کو صحیح راستہ سے ہٹادو، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ پانچوں حربے استعمال کرنے کی اجازت دے دی؛ لیکن فرمادیا کہ ان سب کے باوجود جو ہمارے سچے اور پکے بندے ہیں، وہ تمہارے دھوکہ میں نہیں آئیں گے۔

﴿۱﴾ یعنی یہ عجیب بات ہے کہ جب سمندر میں مصیبت آتی ہے تو خدا کو یاد کرتے ہو اور جب خشکی پر آتے ہو تو تمہارا رویہ بدل جاتا ہے اور کفر وشرک میں مبتلا ہو جاتے ہو؛ حالاں کہ اللہ جیسے سمندر میں تم کو غرق کرنے پر قادر ہیں، اسی طرح خشکی میں بھی تم پر اپنا عذاب بھیج سکتے ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوبارہ سمندر میں لے جائیں اور تم کو عذاب میں مبتلا کردیں، اس کی قدرت صرف سمندر کی موجوں ہی پر نہیں؛ بلکہ پوری کائنات پر ہے، وہ زمین میں دھنسا سکتا ہے، ہوا کا طوفان برپا کر سکتا ہے اور پتھر کی بارش کر سکتا ہے: اس لئے سمندر کی طرح خشکی پر آنے کے بعد بھی توحید پر قائم رہو۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى
كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴿۷۰﴾ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ع ۱۰/۷
فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ
اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا
غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

ہم نے اولادِ آدم کو عزت بخشی ہے، ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سواری دی ہے، ان کو پاکیزہ و نفیس رزق عطا فرمائی ہے اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت سے نوازا ہے، ﴿۱﴾﴿۷۰﴾ اس دن کو یاد رکھنا چاہئے جب ہم ہر گروہ کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے، پھر جن کو ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ اپنے نامۂ اعمال کو (خوش ہوکر) پڑھیں گے اور ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہیں ہوگی، ﴿۲﴾﴿۷۱﴾ اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا، نیز اور زیادہ ہدایت سے دور ہوگا، ﴿۳﴾﴿۷۲﴾ (اے رسول!) ہم نے آپ پر جو وحی بھیجی ہے، یہ (کفر کرنے والے) لوگ آپ کو اس سے ہٹا دینا چاہتے تھے؛ تاکہ آپ اِس کے سوا ہم پر کچھ اور گھڑ لیں اور ایسی صورت میں وہ آپ کو مخلص دوست بنا لیتے۔ ﴿۴﴾﴿۷۳﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف جہتوں سے دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے، جسمانی حسن و جمال، بولنے کی صلاحیت، بھلائی اور برائی کے درمیان تمیز کرنے کا شعور؛ لیکن سب سے بڑی فضیلت عقل کے ذریعہ عطا کی گئی؛ کیوں کہ انسان کی عقل ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ علم و تحقیق کے راستہ میں آگے بڑھتا رہتا ہے اور اسی ہتھیار سے فضا کی بلندیوں اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو مسخر کئے ہوا ہے، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے خوب لکھا ہے کہ شریعت کی حیثیت سورج کی ہے اور عقل کی حیثیت آنکھ کی ہے، (قرطبی: ۱۰/۲۹۴) جب وہ عقل کی آنکھیں کھولتا ہے تو ہدایت کا سورج اسے نظر آتا ہے اور جب عقل کی آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اس کے سامنے گمراہی کی تاریکیاں ہوتی ہیں اور وہ اسی میں بھٹکتا رہتا ہے۔

﴿۲﴾ امام سے مراد وہ شخص ہے جس کی پیروی کی جائے، خواہ وہ بہتر شخص ہو یا برا؛ چنانچہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر ایک پیروی کرنے والوں کو الگ الگ جمع فرمائیں گے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متبعین ایک جگہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین ایک جگہ، اسی طرح تمام پیغمبروں کی اُمتیں ان کے ساتھ ہوں گی، دوسری طرف شیطان کے پیروکار شیطان کے ساتھ رہیں گے اور بڑے بڑے گمراہوں کے متبعین ان کے ساتھ ہوں گے، دوسری رائے یہ ہے کہ یہاں ''امام'' سے نامۂ اعمال مراد ہے کہ تمام لوگ اپنے اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ بلائے جائیں گے، یہ دوسری تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/۲۹۶)

﴿۳﴾ کیوں کہ دنیا میں گمراہی کا علاج موجود ہے کہ انسان اس سے توبہ کر لے؛ لیکن آخرت میں تو یہ راستہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔

﴿۴﴾ ہر دور میں مخالفین اسلام کا یہی رویہ رہا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کچھ تبدیلیوں کو قبول کر لیا جائے ←

وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۗ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ
وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ
لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ
ع ۸/۸ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۠﴿۷۷﴾ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ
الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو بعید نہ تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر جھک جاتے ، ﴿۷۴﴾ (بالفرض) اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی دوہرا عذاب چکھاتے اور آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں پاتے ، ﴿۱﴾ ﴿۷۵﴾ اور یہ چاہتے ہیں کہ اس سرزمین (مکہ) سے آپ کا قدم اُکھاڑ دیں ؛ تاکہ آپ کو یہاں سے نکال باہر کریں اور اگر ایسا ہوا تو یہ بھی آپ کے بعد کم ہی رہ پائیں گے ، ﴿۷۶﴾ آپ سے پہلے بھیجے گئے رسولوں کے بارے میں بھی ہمارا یہی طریقہ رہا ہے اور آپ ہمارے طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے ، ﴿۲﴾ ﴿۷۷﴾ سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں پڑھا کیجئے اور فجر میں (خاص طور پر زیادہ) قرآن پڑھا کیجئے ، بے شک فجر کی نماز (فرشتوں کی) حاضری کا وقت ہے ۔ ﴿۷۸﴾

← اور انسان اپنی خواہشات کے معاملہ میں بے لگام ہوکر زندگی گزار سکے ، یہی حال اس دور میں بھی ہے اور جو نام نہاد مسلمان احکام دین میں تراش خراش کے لئے تیار ہوجاتے ہیں ، انھیں لبرل اور ترقی پسند مسلمان کہہ کر گلے بھی لگایا جاتا ہے ۔

﴿۱﴾ اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اسلام قبول کرنے کے لئے بعض شرطیں رکھتے اور کچھ رعایتیں چاہتے ، آپ ﷺ کے دل میں پوری انسانیت کی ہدایت پر آجانے کی جو شدید تڑپ تھی ، اس کے تحت آپ کو ایک درجہ میں خیال پیدا ہوتا کہ اسے قبول کر لینا چاہئے ، اسی پر تنبیہ فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں کسی چھوٹ اور رعایت کی گنجائش نہیں اور پھر سخت لب ولہجہ میں تنبیہ کی گئی کہ دین میں کسی بھی قسم کی مداھنت دنیا و آخرت دونوں جگہ اللہ کی پکڑ کا باعث ہوگی ، اس میں بظاہر تو رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے ؛ لیکن حقیقت میں یہ آپ کی اُمت سے خطاب ہے ، اس سے معلوم ہوا کہ ایک طرف داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لئے غیر معمولی تڑپ بھی ہونی چاہئے اور دوسری طرف اسے دین پر ثابت قدم بھی ہونا چاہئے کہ وہ ایسا عمل نہ کرے جو مداھنت کے دائرہ میں آجائے اور دوسروں کی بھلائی کے لئے وہ اپنی عاقبت خراب کر لے ۔

﴿۲﴾ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں فرمایا جارہا ہے کہ اہل مکہ آپ ﷺ کو یہاں سے نکال دینا چاہتے ہیں ؛ لیکن اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ بھی یہاں چین سے رہ نہیں پائیں گے ؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب کسی قوم نے اپنے نبی کو نکلنے پر مجبور کیا تو ان کے ہجرت کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر اپنا عذاب نازل فرمادیا ، یہاں تک کہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا گیا ، اہل مکہ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو صرف اُٹھارہ مہینوں کے بعد بدر کے میدان میں مشرکین مکہ کے تمام بڑے بڑے سردار قتل کر دیئے گئے ۔

وَ مِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ٭ۖ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾ وَ قُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّ اَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّ اجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا ﴿۸۰﴾

اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد پڑھئے ، یہ آپ کے لئے اضافہ ہے، اُمید ہے کہ آپ کے پروردگار آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائیں گے ، ﴿۱﴾ ﴿۷۹﴾ اور آپ دُعاء کیجئے : اے میرے پروردگار ! مجھے (جہاں لے جایئے) اچھی طرح لے جایئے اور (جہاں سے نکالئے) اچھی طرح نکالئے ، اور مجھے ایسا غلبہ عطا فرمایئے جس کے ساتھ (آپ کی) مدد شامل ہو۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۰﴾

﴿۱﴾ ان دونوں آیتوں میں مجموعی طور پر چھ نمازوں کا ذکر آیا ہے، سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک میں چار نمازیں شامل ہیں، آفتاب ڈوبنے سے پہلے کی دو نمازیں ظہر اور عصر، اور غروب آفتاب کے بعد کی دو نمازیں مغرب اور عشاء، پھر نماز فجر کا اس کی اہمیت کی وجہ سے مستقل طور پر ذکر کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا کہ یہ حاضری کا وقت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خود آپ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ اس وقت رات کے اور دن کے فرشتے جمع ہوجاتے ہیں، (ترمذی : کتاب التفسیر ، باب سورۃ بنی اسرائیل : ۵۳۱۳ ، بخاری : کتاب مواقیت الصلوٰۃ ، باب فضل صلوٰۃ العصر ، حدیث نمبر : ۵۳۰) چوتھے نماز تہجد کا ذکر فرمایا گیا، تہجد کے اصل معنی سو کر اُٹھنے کے ہیں ؛ اس لئے تہجد کا بہتر وقت یہی ہے کہ رات کے اخیر حصہ میں بیدار ہوکر یہ نماز ادا کی جائے گی ؛ لیکن یہ ضروری نہیں ہے، عشاء کے بعد کبھی بھی نماز تہجد ادا کی جاسکتی ہے، نماز تہجد کے فضائل اور احکام کے لئے حدیث وفقہ کی کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں ؛ البتہ قرآن مجید نے کہا ہے : '' نافلۃً لک '' یعنی یہ آپ ﷺ کے لئے زائد نماز ہے ؛ اس لئے اکثر اہل علم کی رائے ہے کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض ہونے سے پہلے ابتداءً نماز تہجد فرض کی گئی تھی ، بعد میں تہجد کا فرض ہونا اُمت کے حق میں منسوخ کر دیا گیا ؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کے حق میں اس کی فرضیت باقی رہی ، (مفاتیح الغیب : ۱۰/۱۶۶) ـــــ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمادی کہ جہاں ایک فرض آپ ﷺ کے ذمہ بڑھایا گیا ہے، وہیں آپ ﷺ کو عظیم مقام بھی عطا فرمایا جائے گا ، مقامِ محمود کے لغوی معنی ہیں لائق تعریف مرتبہ ، اور اس مرتبہ کی حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ کو قیامت کے دن شفاعت کا حق دیا جائے گا۔ (ترمذی ، عن ابی ہریرۃ : کتاب تفسیر القرآن ، باب سورۃ بنی اسرائیل ، حدیث نمبر : ۳۱۳۷)

﴿۲﴾ آیت نمبر : ۸۰ میں جو دُعاء آئی ہے، اس سے ہجرت کی طرف اشارہ ہے، رسول اللہ ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ دُعاء فرمائیں کہ مکہ سے ان کی روانگی بہتر طریقہ پر اور دشمن سے حفاظت و عافیت کے ساتھ ہو، پھر جب مدینہ منورہ پہنچیں تو وہاں بھی راحت وعافیت کا معاملہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی غیبی نصرت و مدد ہو کہ جس مقصد کے لئے آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی ہے، یعنی اسلام کی دعوت و اشاعت اس میں آپ ﷺ کو بھرپور کامیابی حاصل ہو، (دیکھئے : تفسیر قرطبی : ۱۰/۳۱۳ ، بحوالہ ترمذی ، عن ابن عباسؓ) ـــــ قرآن مجید کی بعض دوسری آیات میں اس دُعاء کی قبولیت کی طرف اشارہ موجود ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ لوگوں یعنی مشرکین سے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائیں گے ، (المائدۃ : ۶۷) اور حضور ﷺ پر یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ اللہ کی طرف سے مسلمان ہی بالآخر کامیاب ہوں گے ، (مجادلہ : ۲۲) اور یہ کہ اسلام دوسرے تمام ادیان پر غالب آکر رہے گا۔ (التوبۃ : ۳۳)

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ
شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ لَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

اور کہہ دیجئے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کہ باطل تو مٹنے ہی والا تھا، ﴿۱﴾ ﴿۸۱﴾ اور قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں، یہ ایمان والوں کے لئے تو شفاء اور رحمت ہے اور نافرمانوں کے حق میں اس سے اُلٹا نقصان ہی بڑھتا جاتا ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۲﴾

﴿۱﴾ ابھی تو رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت بھی نہیں فرمائی تھی؛ لیکن اسی وقت اس آیت میں پیشین گوئی کر دی گئی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ حق پوری آب و تاب کے ساتھ مکۃ المکرمہ اور عرب کی سرزمین پر چھا جائے گا اور باطل اپنی موجودہ تمام تر قوتوں کے باوجود اس سرزمین سے مٹ کر رہ جائے گا، ٹھیک اسی طرح جیسے سورج طلوع ہوتا ہے تو تاریکیاں منھ چھپانے پر مجبور ہوتی ہیں؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع سے جب آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو کعبۃ اللہ کے گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے، رسول اللہ ﷺ عصائے مبارک سے ایک ایک کو ٹھوکر لگاتے، وہ پیچھے کی طرف گر پڑتا اور آپ ﷺ کہتے جاتے: ''جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا'' (بنی اسرائیل:۸۱) پھر آپ ﷺ کے حکم سے یہ تمام بت توڑ دیئے گئے اور کعبۃ اللہ اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا گیا، (قرطبی:۱۰؍۳۱۴) —— اس اعتراض کا کوئی موقع نہیں کہ اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر و دباؤ کا قائل ہے اور وہ دوسری قوموں کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیتا ہے؛ اس لئے کہ کعبۃ اللہ اصل میں بت کدہ نہیں تھا، یہ تو مرکز توحید تھا، جسے اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر کیا تھا؛ اس لئے یہ دراصل اس مرکز کو اپنی حالت پر واپس لانا تھا نہ کہ کسی اور گروہ کی عبادت گاہ پر قبضہ کرنا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیزیں گناہ اور معصیت کو انجام دینے کا ذریعہ ہوں، جیسے گانے بجانے کے آلات وغیرہ، اگر ان کو توڑ دینا کسی مسلمان کے دائرۂ اختیار میں ہو تو وہ اسے توڑ دے، اسی طرح ایسی چیزوں کی خرید و فروخت بھی جائز نہیں، (تفسیر قرطبی:۱۰؍۳۱۴) اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جہاں اس طرح کے کام کو انجام دینا انسان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو اور اس سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو، وہاں اس طرح کا قدم نہیں اُٹھانا چاہئے، یہی وجہ ہے کہ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں آپ ﷺ نے ایسی کوشش نہیں کی، ۷ رہجری میں آپ ﷺ نے عمرہ فرمایا، اس وقت بھی آپ نے ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا؛ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے قدرت عطا فرمائی تو آپ نے اللہ کے گھر میں شرک کی اِس علامت کو مٹانے میں ذرا بھی تاخیر نہیں فرمائی۔

﴿۲﴾ اصل میں تو قرآن دل کی بیماریوں اور روحانی امراض کے لئے شفاء ہے، یہ انسان کو کفر سے ایمان کی طرف اور گناہ سے طاعت و فرمانبرداری کی طرف لاتا ہے، اور قرآن کی یہی مراد ہے؛ البتہ ضمنی طور پر اللہ نے اس میں جسمانی شفاء بھی رکھی ہے کہ بعض سورتوں اور آیتوں کے پڑھنے یا دم کرنے سے انسان کو جسمانی صحت و شفاء حاصل ہوتی ہے، متعدد حدیثیں اس سلسلہ میں منقول ہیں، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس طرح کی کئی روایتیں نقل کی ہیں، (دیکھئے: تفسیر قرطبی:۱۰؍۳۱۶-۳۲۰) لیکن بظاہر یہاں جسمانی صحت و شفاء مراد نہیں ہے، ورنہ ایمان والوں کی قید نہ ہوتی، جسمانی شفاء تو کافروں کو بھی حاصل ہو سکتی ہے اور جن احادیث سے ←

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـئُوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ
يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ ع۹
قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

اور جب ہم انسان کو نعمت عطاء کرتے ہیں تو وہ منھ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو نا اُمید ہو جاتا ہے، ﴿۸۳﴾ آپ فرما دیجئے: ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہے تو آپ کے پروردگار ہی بہتر جانتے ہیں کہ کون درست راستے پر ہے؟ ﴿۱﴾ ﴿۸۴﴾ اور لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں، آپ کہہ دیجئے: روح میرے پروردگار کے حکم سے بنی ہے اور تم کو تو بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۵﴾

← اس سلسلہ میں استدلال کیا جاتا ہے، خود ان میں بھی بعض روایات غیر مسلم سردار کے صحت یاب ہونے سے متعلق ہیں —— کافروں کا نقصان بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی نئی نئی آیتیں نازل ہوتی ہیں اور وہ ان کا انکار کرتے جاتے ہیں تو ان پر عذاب دیئے جانے کے مزید اسباب فراہم ہوتے جاتے ہیں۔

﴿۱﴾ ''شاکلہ'' کے معنی طریقہ، عادت اور فطری مزاج وغیرہ کے ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۲۳، مفاتیح الغیب: ۱۰/ ۴۱۷) اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے عمل اور کردار میں انسان کے مزاج اور ماحول کا بھی بڑا دخل ہے؛ البتہ انسان کو اپنے نفس کی ایسی تربیت کرنی چاہئے کہ اس کا مزاج حکم الٰہی کے تابع ہو جائے۔

﴿۲﴾ انسان اور جانداروں کا جسم تو نظر آتا ہے؛ لیکن ان کے اندر زندگی کس طور پر پیدا ہوتی ہے اور پھر کس طرح داغ فراق دے جاتی ہے؟ —— اس آنے اور جانے والی چیز کو نہ آنکھ دیکھ پاتی ہے، نہ ہاتھ چھو پاتا ہے اور نہ کسی اور طریقے پر اس کا ادراک ہو پاتا ہے؛ اسی لئے روح جس کا آنا جسم کے لئے زندگی کا سبب اور جس کا جانا موت کا باعث بنتا ہے، اس کے بارے میں ہمیشہ سے سائنسداں اور فلاسفہ حیران رہے ہیں اور شاید صبح قیامت تک ان کی یہ حیرانی دور نہیں ہو پائے گی؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے لوگوں نے بطور امتحان کے دریافت کیا تھا کہ روح کی حقیقت کیا ہے؟ بعض روایتوں میں ہے کہ یہودیوں کے اُکسانے پر مکہ کے مشرکین نے یہ سوال کیا تھا، (نسائی، کتاب التفسیر، باب سورۂ کہف: ۱۱۳۱۴، وترمذی، کتاب تفسیر القرآن، سورۂ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۳۱۴۰) اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود یہود نے مدینہ منورہ میں آپ ﷺ سے یہ سوال کیا تھا، (بخاری، کتاب التفسیر، باب سورۂ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۴۴۴۴، مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ، باب سؤال الیہود، حدیث نمبر: ۷۲۳۷) عجب نہیں کہ پہلے اہل مکہ نے یہ سوال کیا ہو، اسی موقع سے یہ آیت نازل ہوئی ہو، پھر مدینہ میں یہودیوں نے دوبارہ یہی سوال کیا ہو اور آپ ﷺ نے یہ سوچ کر وحی کا انتظار کیا ہو کہ شاید اس بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادہ وضاحت ہو؛ لیکن پھر بعینہٖ یہی آیت دوبارہ نازل کی گئی، جواب کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں تھوڑا سا علم دیا گیا ہے، جس مادی چیزوں کے ادراک کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، روح کوئی مادی چیز نہیں ہے؛ اس لئے صرف اتنا سمجھ لو کہ روح حکم الٰہی کا نام ہے، اللہ کے حکم دیتے ہی وہ جانداروں کے وجود میں پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح اللہ کا حکم آتے ہی دبے پاؤں ←

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً
مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ
یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾ وَ لَقَدْ
صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اس کو چھین لیں، پھر اس کے لئے آپ کو ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار بھی نہ ملے، ﴿۸۶﴾ سوائے اس کے کہ آپ کے پروردگار کی مہربانی ہوجائے، یقیناً آپ پر اللہ کی بڑی مہربانی ہے، ﴿۱﴾ ﴿۸۷﴾ آپ بتادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس قرآن کی طرح کی کتاب لانا چاہیں گے، تب بھی ایسا قرآن نہیں لاسکیں گے؛ اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں، ﴿۲﴾ ﴿۸۸﴾ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر طرح کی مثال دے کر طرح طرح سے سمجھایا ہے، پھر بھی اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے۔ ﴿۸۹﴾

← نکل جاتی ہے، یوں تو کائنات کی ساری ہی چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وجود میں آتی ہیں؛ لیکن ان میں مادہ کا واسطہ رکھا جاتا ہے؛ لیکن روح کسی مادی شئے کے واسطہ کے بغیر براہ راست حکم خداوندی سے وجود میں آتی ہے —— قرآن نے اس حقیقت کو بھی واضح کردیا کہ انسان اگرچہ اپنی معلومات اور نئی نئی ایجادات کی وجہ سے اپنے بارے میں غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے اور اپنے آپ کو علم کا سمندر خیال کرنے لگتا ہے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات سے متعلق بھی اس کا علم بہت حقیر اور قلیل ہے اور اس کو سمندر سے قطرہ کی نسبت بھی نہیں ہے۔

﴿۱﴾ مخلوق میں سب سے بڑا درجہ انسان کا اور انسان میں سب سے بڑا درجہ انبیاء کا اور انبیاء میں سب سے افضل شخصیت رسول اقدس ﷺ کی ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت وطاقت اور شوکت وجلال کے اظہار کے لئے آپ ﷺ کو مخاطب بنایا اور فرمایا کہ یہ جو آپ ﷺ پر وحی نازل کی گئی ہے، اللہ چاہیں تو اسے سلب بھی کرسکتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دل ودماغ سے اسے مٹا کر رکھ دیں، یہ ہماری قدرت وطاقت کا حال ہے، یہ اور بات ہے کہ آپ ﷺ پر ہماری بڑی مہربانی اور فضل وکرم ہے، اس لئے ایسا واقعہ پیش نہیں آئے گا —— قرآن مجید میں جا بجا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے انداز پر حضور ﷺ سے خطاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والے رسول کو خدا کا درجہ نہ دے دیں؛ جیسا کہ پچھلی قوموں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا، دوسرے یہ قرآن کی صداقت کی ایک اندرونی شہادت ہے، اگر قرآن اللہ کی طرف سے نہ ہوتا، خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اسے تصنیف کیا ہوتا تو ایسی آیات آپ قرآن کے اندر نہیں رکھتے، جن میں خود ان کو تنبیہ کی گئی ہے؛ بلکہ صرف ایسے مضامین ہوتے جن میں آپ کی تعریف ہوتی اور آپ ﷺ کی فضیلت وبڑائی کا اظہار ہوتا۔

﴿۲﴾ قرآن مجید نے بار بار یہ چیلنج کیا ہے، (دیکھئے: البقرۃ: ۲۳) اور یہاں بھی کیا جارہا ہے، یہ چیلنج اس وقت بھی تھا، آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا اور اس کا جواب نہ پہلے دیا جاسکا ہے نہ آج دیا جاسکتا ہے اور نہ آئندہ دیا جاسکے گا۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ
نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا
كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ
وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا
رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾ وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا ۱۰ ع ۹
رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ
مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

یہ لوگ کہتے ہیں: ''ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک آپ زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کردیں، ﴿۹۰﴾ یا آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہوجائے، پھر اس کے بیچ بیچ میں آپ نہریں نہ نکال دیں، ﴿۹۱﴾ یا جیسا کہ آپ کہا کرتے ہیں آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے گرادیں، یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں، ﴿۹۲﴾ یا آپ کے پاس سونے کا بنا ہوا گھر ہوجائے یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم تو آپ کے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے، جب تک آپ ہمارے پاس کوئی ایسی کتاب نہ اُتار لائیں، جس کو ہم خود پڑھ لیں'' آپ فرمادیجئے: سبحان اللہ! میں ایک انسان اور رسول ہونے کے سوا اور کیا ہوں؟ ﴿۱﴾ ﴿۹۳﴾ اور جب بھی انسان کے پاس ہدایت آئی تو یہی بات ان کے ایمان لانے میں رکاوٹ بن گئی کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے انسانوں کو رسول بنا کر بھیج دیا؟ ﴿۹۴﴾ آپ فرمادیجئے: کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے، پھرتے اور رہتے بستے، تو ہم ان کے لئے آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۵﴾

﴿۱﴾ اہل مکہ ایمان لانے کے لئے بطور شرط مختلف نامعقول مطالبات کرتے رہتے تھے، جن میں سے کئی مطالبات وہ ہیں، جن کا یہاں یکجا تذکرہ فرمایا گیا ہے، اس طرح کے مطالبات ایک ایسے شخص سے کیا جانا تو روا ہوسکتا تھا، جس نے خدا ہونے اور کائنات کے مالک و مختار ہونے کا دعویٰ کیا ہو؛ لیکن جس نے خدا کا بندہ اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہو، اس سے ان چیزوں کا مطالبہ ظاہر ہے کہ بے محل اور بے موقع ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے کہلایا گیا کہ میں نے تو صرف انسان اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے نہ کہ اس سے بڑھ کر کسی اور بات کا۔

﴿۲﴾ پیغمبر کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ انسانیت تک اس کے پروردگار کا پیغام پہنچادے؛ بلکہ وہ اس کے لئے عملی نمونہ پیش کرتا ہے اور کسی مخلوق کے لئے اُسی مخلوق کا فرد نمونہ ہوسکتا ہے، جیسے فرشتہ کے لئے فرشتہ اور انسان کے لئے انسان؛ لہٰذا اگر زمین میں فرشتے بسائے گئے ہوتے تو کسی فرشتے کو نبی بنایا گیا ہوتا، جب نبی انسان کی طرف بھیجے گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ انسان ہی میں سے نبی بھیجا جانا مناسب تھا۔

قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ﴿۹۶﴾ وَ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ
فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہُمۡ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ وَ نَحۡشُرُہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ
عَلٰی وُجُوۡہِہِمۡ عُمۡیًا وَّ بُکۡمًا وَّ صُمًّا ؕ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ کُلَّمَا خَبَتۡ زِدۡنٰہُمۡ سَعِیۡرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِکَ
جَزَآؤُہُمۡ بِاَنَّہُمۡ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ قَالُوۡۤا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا
جَدِیۡدًا ﴿۹۸﴾ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ
مِثۡلَہُمۡ وَ جَعَلَ لَہُمۡ اَجَلًا لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَاَبَی الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

النصف

آپ کہہ دیجئے: میرے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر ہیں اور (تمام احوال کو) خوب دیکھنے والے ہیں ﴿۹۶﴾ اللہ جس کو ہدایت سے نواز دیں، وہی ہدایت پاتا ہے، اور جس کو ہدایت سے محروم رکھیں، اللہ کے سوا ان کے لئے کوئی حامی و مددگار نہیں پاؤ گے، قیامت کے دن ہم ان کو اندھے، گونگے، بہرے منھ کے بل چلاتے ہوئے اکٹھا کریں گے، دوزخ ان کا ٹھکانہ ہوگا، جب بھی آگ دھیمی ہونے لگے گی، ہم ان پر اور زیادہ بھڑکا دیں گے، ﴿۱﴾ ﴿۹۷﴾ یہ ہے ان کی سزا؛ اس لئے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور کہا کرتے تھے: جب ہم ہڈی اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے؟ ﴿۹۸﴾ کیا وہ اتنی سی بات نہ سمجھ پائے کہ جس خدا نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے، وہ ان جیسوں کو (بہ درجۂ اولیٰ) پیدا کرنے پر قادر ہے، اللہ نے ان کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، جس میں کوئی شبہ نہیں، پھر بھی ان ظالموں کو ضد ہے کہ وہ انکار ہی کریں گے۔ ﴿۲﴾ ﴿۹۹﴾

﴿۱﴾ یعنی قیامت کے دن جب ایمان سے محروم لوگ قبروں سے نکلیں گے تو ان کو رسوا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوگا کہ وہ چہرے کے بل دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے اور چوں کہ دنیا میں انھوں نے حق کو سمجھنے کے لئے اپنی آنکھوں کا، حق کے اعتراف کے لئے اپنی زبان کا اور حق بات کو قبول کرنے اور اسے سننے کے لئے اپنے کانوں کا استعمال نہیں کیا تھا؛ اس لئے اندھے، گونگے، بہرے ہو کر دوزخ کی طرف چلتے رہیں گے، پھر بعد میں یہ تمام قوتیں لوٹا دی جائیں گی؛ تاکہ وہ اور زیادہ بہتر طور پر اپنے اوپر ہونے والے عذاب کو دیکھ سکیں، وہ اپنی آنکھوں سے دوزخ کو دیکھیں گے، (الکہف: ۵۳) چیخ و پکار کریں گے، (فاطر: ۳۷) اور جہنم کی ہولناک آوازیں بھی سنیں گے، (السجدۃ: ۱۲) غرض کہ اندھا، گونگا، بہرا ہونا بھی ان کی سزا ہوگی اور پھر سزا کو بڑھانے ہی کے لئے ان کی یہ صلاحیتیں واپس لے لی جائیں گی۔

﴿۲﴾ یعنی آسمان و زمین جیسی وسیع کائنات کو جب اللہ تعالیٰ وجود میں لا سکتے ہیں تو کیا اس مختصر سے انسان کو دوبارہ پیدا نہیں فرما سکتے؟

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ
قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْــَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ ع ۱۱
فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

آپ کہہ دیجئے: اگر تم میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو خرچ ہوجانے کے اندیشے سے تم ضرور ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے ﴿۱﴾ ﴿۱۰۰﴾ ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دی تھیں؛ چنانچہ آپ بنی اسرائیل سے پوچھ لیجئے، جب موسیٰ ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا: اے موسیٰ! میرا خیال ہے کہ تم پر جادو کردیا گیا ہے، ﴿۲﴾ ﴿۱۰۱﴾ موسیٰ نے کہا: تمہیں خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ آسمان اور زمین کے پروردگار ہی نے ان کو نشانِ عبرت بنا کے بھیجا ہے اور اے فرعون! میرا خیال ہے کہ ضرور تیری شامت آچکی ہے، ﴿۱۰۲﴾

﴿۱﴾ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے فضل و کرم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنی رحمت کے خزانے اپنے بندوں پر بغیر کسی روک ٹوک کے کھولے ہوئے ہیں، دھوپ ہو یا ہوا، پانی ہو یا روشنی، زمینی پیداوار ہو یا مویشی، اللہ کی ساری نعمتیں اتنی کثرت اور فراوانی کے ساتھ فراہم ہیں کہ انھیں شمار نہیں کیا جاسکتا، یہی اس کے خالق اور قادر مطلق ہونے کی دلیل ہے، ورنہ مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ چاہے اس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ بھی اللہ کی نعمتیں ہوں، پھر بھی وہ انھیں روک کر رکھنا چاہتا ہے۔

﴿۲﴾ ''آیت'' کے معنی نشان اور معجزہ کے بھی ہیں اور حکم الٰہی کے بھی، یہاں دونوں معنی مراد لئے گئے ہیں، نو معجزات جو دیئے گئے وہ ہیں: طوفان یعنی وبا، ٹڈی دل کا حملہ جو کھیتیوں کو برباد کردیتا تھا، جوں اور کیڑے جو پھلوں کو خراب کردیتے تھے، مینڈک جو اُن کے برتنوں میں، کھانوں میں اور بستروں میں گھس آتے تھے، خون کہ ان کی نہریں اور کنویں پانی کے بجائے خون بن جاتے تھے، ان پانچوں کا ذکر سورۂ اعراف: ۱۳۳ میں آیا ہے، اس کے علاوہ دو کھلے معجزات یہ تھے کہ آپ کا عصا سانپ بن جاتا تھا اور جب آپ اپنا ہاتھ بغل میں ڈال کر نکالتے تھے تو وہ روشن ہوجاتا تھا، ان کے علاوہ قحط اور پیداوار کی کمی، یہ وہ معجزاتی عذاب تھے، جن کے ذریعہ فرعون کی قوم کو بار بار متنبہ کیا گیا، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۳۳۶) —— دوسری رائے یہ ہے کہ یہاں نو احکام مراد ہیں؛ کیوں کہ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو یہودیوں نے حضرت محمد ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے نو (۹) احکام کا ذکر فرمایا کہ شرک نہ کرو، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، ناحق قتل نہ کرو، جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ، پاک دامن عورت پر تہمت نہ لگاؤ، میدانِ جنگ سے راہ فرار اختیار نہ کرو، کسی بے قصور کو اس طور پر حاکم کے پاس نہ لے جاؤ کہ وہ اسے ناحق قتل کردے اور یہودیوں کے لئے ایک زائد حکم یہ ہے کہ ہفتہ کے دن کا احترام کرو، (ترمذی: کتاب الاستئذان، باب ماجاء فی قبلۃ الید والرجل، حدیث نمبر: ۲۷۳۳) علامہ رازی رحمہ اللہ نے اسی دوسری تفسیر کو ترجیح دی ہے، (مفاتیح الغیب: ۱۰/۲۱۸) —— ان معجزات اور اس کے باوجود فرعون کی سرکشی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لانے کا ذکر کرکے رسول اللہ ﷺ کی دلداری فرمائی گئی کہ اہل مکہ آپ ﷺ سے جن معجزات کا مطالبہ کررہے ہیں، ان سے یہ اُمید نہ رکھیں کہ اگر یہ معجزے ظاہر ہو بھی جائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ۱۰۳ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ
اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ۱۰۴ وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ
وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ۱۰۵ وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ
عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ۱۰۶ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ
قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۱۰۷ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ
رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۱۰۸ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ۱۰۹ السجدۃ

وقف لازم

السجدۃ ۲

پھر فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو زمین سے اُکھاڑ پھینکے، تو ہم نے اس کو اور جو اُس کے ساتھ تھے، سب کو ڈبو کر رکھ دیا ۱۰۳ اور ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس زمین میں رہو سہو، پھر جب آخرت کا وعدہ آپہنچے گا، تو ہم تم سب کو سمیٹ کر لے آئیں گے، ﴿۱﴾ ۱۰۴ ہم نے سچائی کے ساتھ اس قرآن کو نازل کیا ہے اور سچائی ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور (اے رسول!) ہم نے آپ کو صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، ۱۰۵ نیز ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اور رفتہ رفتہ اس لئے اُتارا ہے کہ آپ اس کو لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں ﴿۲﴾ ۱۰۶ آپ کہہ دیجئے: تم لوگ اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، (مگر) اس سے پہلے جن لوگوں کو علم سے نوازا جاچکا ہے، جب ان کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں، ۱۰۷ اور کہتے ہیں: یقیناً ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا ۱۰۸ وہ روتے روتے ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور قرآن ان کے خشوع وخضوع کو اور بڑھا دیتا ہے۔ ﴿۳﴾ ۱۰۹ السجدۃ

﴿۱﴾ قوم فرعون پر عذاب اور بنی اسرائیل کے نجات پانے کا ذکر (البقرۃ: ۵۰) آچکا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی پہلی آسمانی کتابیں تو یکبارگی اُتار دی گئیں؛ لیکن قرآن مجید تھوڑا تھوڑا اُتارا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ سال میں اس کی تکمیل ہوئی، اس کی مصلحت یہ تھی کہ تھوڑے تھوڑے احکام لوگوں تک پہنچیں کہ اِس سے ان کا سمجھنا بھی آسان ہوجاتا ہے اور نفس پر گراں بھی نہیں گزرتا، اگر حلال وحرام کی تمام فہرست ایک ساتھ بھیج دی جاتی تو جو لوگ پہلے سے اِن حرام باتوں کے خوگر تھے، ان کے لئے اس سے یکلخت بچنا دشوار ہوجاتا۔

﴿۳﴾ اس میں ان اہل کتاب کا ذکر ہے، جن کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق ہوئی، گزشتہ آسمانی کتابوں کے برخلاف قرآن مجید کے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کئے جانے پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوا؛ بلکہ قرآن سن کر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں اور ان پر گریہ طاری ہوجاتا ہے، معلوم ہوا کہ ایک صاحب ایمان میں یہ صفت ہونی چاہئے کہ قرآن کی تلاوت پر اسے رونا آئے (اللہ تعالیٰ یہ کیفیت اس حقیر کو اور تمام مسلمانوں کو عطا فرمائیں، آمین) ——قرآن پڑھتے ہوئے رونے کی اللہ تعالیٰ نے ←

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَ لَا تَجْهَرْ
بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا وَ ابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ
وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

ع ۱۲ ۱۲ ۱۲

آپ کہہ دیجئے: تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے سارے ہی نام اچھے ہیں، ﴿۱﴾ اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز میں پڑھو اور نہ بالکل آہستہ، اس کے درمیان کا راستہ اختیار کرو، ﴿۲﴾ ﴿۱۱۰﴾ آپ فرما دیجئے: تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے نہ کسی کو اولاد بنایا ہے، نہ حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ وہ کمزور ہے کہ اس کو کسی مددگار کی ضرورت ہو، اور اللہ ہی کی خوب خوب بڑائی بیان کیجئے۔ ﴿۱۱۱﴾

← تعریف کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر نماز پڑھنے کے درمیان اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونا آجائے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۴۲)؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے رونے کی وجہ سے سینۂ مبارک سے ایسی آواز آتی تھی کہ گویا ہانڈی اُبل رہی ہو، (النسائی، باب البکاء فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر: ۱۲۱۴) فقہاء نے بھی صراحت کی ہے کہ اگر اللہ کے خوف کی وجہ سے رونا آئے تو اس سے نماز متاثر نہیں ہوگی اور اگر تکلیف کی وجہ سے رونا آئے، مگر وہ رونے پر مجبور نہ ہو اور اس سے کوئی حرف پیدا ہو جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (الفتاویٰ التاتارخانیہ: ۲/ ۲۲۴، کتاب الصلاۃ، الفصل الخامس فی بیان مایفسد الصلاۃ)

﴿۱﴾ بعض مشرکین کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) ہمیں تو ایک خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں؛ لیکن خود دو دو خداؤں کو پکارتے ہیں، اللہ کو اور رحمٰن کو، اسی کا جواب دیا گیا کہ اللہ اور رحمٰن ایک ہی ذات کے دو نام ہیں، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے اور بھی صفاتی نام ہیں، کسی بھی نام سے اللہ کا ذکر کیا جائے، مقصود اللہ تعالیٰ ہی کا ذکر ہے۔

﴿۲﴾ مکہ میں جب آپ اپنے رفقاء کو نماز پڑھاتے اور زور سے قرآن مجید پڑھتے تو مشرکین قرآن کو بھی، اللہ تعالیٰ کو بھی اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی برا بھلا کہتے اور گستاخیاں کرتے؛ اس لئے آپ ﷺ سے فرمایا گیا کہ قرآن بہت زور سے نہ پڑھیں کہ مشرکین سنیں اور گستاخی کریں، اور اتنا آہستہ نہ پڑھیں کہ نماز میں شریک صحابہ بھی نہ سن سکیں؛ بلکہ درمیانی راستہ اختیار کریں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس حکم کا یہی پس منظر نقل کیا گیا ہے، (بخاری: کتاب التفسیر، باب سورۂ بنی اسرائیل، حدیث نمبر: ۴۷۲۲، مسلم: باب التوسط فی القراءۃ فی الصلاۃ الجہریۃ، حدیث نمبر: ۱۰۲۹) —— صلوٰۃ کے اصل معنی دُعاء کے بھی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی دوسرا معنی مراد لیا ہے کہ دُعاء نہ بہت بلند آواز میں کی جائے اور نہ بالکل آہستہ، (قرطبی: ۱۰/ ۳۴۴، بحوالہ مسلم) —— بہر حال قرآن کے اس حکم سے معلوم ہوا کہ جہاں دین کی کسی بات کو زور سے کہنے سے فتنہ پیدا ہوتا ہو، اسلام کے دشمن اس کو گستاخی اور بے ادبی کا ذریعہ بناتے ہوں تو وہاں اِس سے احتراز کرنا چاہئے؛ تاکہ ہم بالواسطہ شعائر دین کی بے احترامی کا سبب نہ بنیں۔

سُورَةُ الكَهف

- سورہ نمبر : (۱۸)
- رکوع : (۱۲)
- آیتیں : (۱۱۰)
- نوعیت : مکی

آسان تفسیر قرآن مجید

’’کَھۡف‘‘ کے معنی غار کے ہیں، اس سورت کی ابتداء میں ہی اصحابِ کہف کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ کہف ہے، یہ ان پانچ سورتوں (فاتحہ، انعام، کہف، سباء، فاطر) میں سے ایک ہے، جس کی ابتداء ’’الحمد للہ‘‘ کے الفاظ سے ہوتی ہے، سورت کی فضیلت میں متعدد صحیح و معتبر روایات منقول ہیں، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات زبانی یاد کرے گا، وہ دجال سے محفوظ رہے گا، (مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل سورۃ الکہف، حدیث نمبر: ۸۰۹، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال، حدیث نمبر: ۴۳۲۵) اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور روایت میں یہی فضیلت سورۂ کہف کی آخری دس آیتوں کے سلسلہ میں نقل کی گئی ہے، (نسائی، کتاب عمل الیوم واللیلۃ، حدیث نمبر: ۱۰۷۸۶) اور نسائی کی ایک اور روایت میں مطلق دس آیت پڑھنے کا ذکر آیا ہے، (نسائی، کتاب عمل الیوم واللیلۃ، حدیث نمبر: ۱۰۷۸۵) —— ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سب سے بڑے فتنے یعنی فتنہ دجال سے محفوظ رہنے کے لئے سورۂ کہف کی تلاوت بے حد مفید ہے، خواہ شروع سے دس آیات کی تلاوت کرے یا آخر سے یا درمیان سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب میں سورۂ کہف پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھتا ہے تو دونوں جمعہ کے درمیان اس کے لئے نور ضوفشاں رہتا ہے، (مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الکہف، حدیث نمبر: ۳۳۹۲) ایک اور روایت میں شب جمعہ کا ذکر آیا ہے کہ جو جمعہ کی رات میں سورۂ کہف پڑھے گا تو اس کے پاس سے لے کر کعبۃ اللہ تک نور پھیل جائے گا، (دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل سورۃ الکہف، حدیث نمبر: ۳۸۰۷) —— اس سورت میں تین ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں، جو صرف اسی سورت میں آئے ہیں اور بڑے دلچسپ ہیں، ایک: اصحابِ کہف کا قصہ جو آیت: ۹ تا ۲۶ میں ہے، دوسرے: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا سفر نامہ جو آیت: ۶۰ تا ۸۷ میں ہے، تیسرے: ذوالقرنین کا واقعہ جو آیت: ۸۳ تا ۹۹ میں ہے —— اس کے علاوہ دو مثالیں بھی دی گئی ہیں، ایک ایسے دو دوستوں کی جن میں سے ایک مالدار لیکن ایمان سے محروم تھا اور اسے اپنی دولت اور اپنے حاشیہ برداروں کی کثرت پر ناز تھا، یہ مضمون آیت: ۳۲ تا ۴۴ میں آیا ہے، دوسرے: دنیوی زندگی کی بے ثباتی کی مثال۔ (آیت: ۴۵، ۴۶)

اس سورت میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کے واقعہ کا ایک حصہ بھی ذکر کیا گیا ہے، قیامت کی منظرکشی کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اُمت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ انسان کی توقیر و احترام، حسن سلوک اور دوستی کا پیمانہ ایمان و عمل کو بنائے نہ کہ دولت اور غربت کو، بگڑے ہوئے دولت مند لوگوں کو راضی کرنے کی غرض سے مخلص غریب مسلمانوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ﴿۱﴾ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا
شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾
مَّاكِثِیْنَ فِیْهِ اَبَدًا ﴿۳﴾ وَّ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا
لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ
نَّفْسَكَ عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ
زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والے ہیں ۝ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جس نے اپنے بندے پر کتاب اُتاری اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی، ﴿۱﴾ جو سیدھی اور درست کتاب ہے ﴿۱﴾؛ تاکہ اللہ کی طرف سے (آنے والے) سخت عذاب سے ڈرائے اور نیک عمل کرنے والے مسلمانوں کو اس بات کی خوشخبری سنائے کہ ان کے لئے (آخرت میں) بہترین بدلہ ہے، ﴿۲﴾ جس میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے ﴿۳﴾ اور ان لوگوں کو ڈرائے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا، ﴿۴﴾ نہ اِن کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے نہ ان کے باپ دادا کے پاس تھی، بڑی ہی نازیبا بات ہے جو ان کے منھ سے نکلتی ہے، یہ محض جھوٹ بکتے ہیں، ﴿۵﴾ تو اگر یہ لوگ اس بات (یعنی: توحید) پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ مارے غم کے ان کے پیچھے اپنی جان دے دیں گے! ﴿۲﴾ ﴿۶﴾ زمین پر جو چیزیں ہیں، ہم نے ان کو اسی لئے زمین کی رونق وآرائش کا ذریعہ بنا دیا ہے ﴿۳﴾؛ کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں کون عمل کے اعتبار سے زیادہ اچھے ہیں؟ ﴿۷﴾

﴿۱﴾ ''قیم'' کے معنی سیدھے کے بھی ہیں اور سیدھا کرنے والے کے بھی، اگر سیدھے کا معنی ہو تو یہ اس سے پہلے کے مضمون ''اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی'' کی مزید تاکید و وضاحت ہے، کجی ایک طرح کا نقص ہے اور سیدھا ہونا کمال ہے، یعنی قرآن اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی درجۂ کمال پر ہے اور اپنی تعلیمات کے اعتبار سے بھی انتہائی کامل اور ہر طرح کے نقص اور کمی سے خالی ہے، اور اگر ''سیدھا کرنے والا'' کے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسان کو صحیح راستہ پر لانے والی اور غلط طریقوں سے بچانے والی ہیں۔ (دیکھئے: مفاتیح الغیب: ۱۰/۲۳۳)

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آپ ﷺ کی داعیانہ تڑپ اور لوگوں کے راہِ ہدایت پر آجانے کے لئے بے قراری کو ظاہر کرتا ہے، یہ اُمت چوں کہ دعوتِ دین کے فریضہ کو ادا کرنے میں اپنے پیغمبر کی جانشین ہے؛ اس لئے انسانیت کی ہدایت کے لئے یہی تڑپ اور بے قراری اس سے بھی مطلوب ہے۔

وَ اِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ۸ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ۹

اور زمین پر جو کچھ ہے ہم (قیامت کے دن) اسے چٹیل میدان بنا دیں گے، ۸ کیا آپ کا خیال ہے کہ غار اور کتبہ والے ہماری نشانیوں میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے؟ (۱) ۹

← (۳) زمین پر جو چیزیں ہیں، اگر چہ ان میں سے بعض ہمیں انسان کے لئے نقصاندہ نظر آتی ہوں، جیسے درندے اور زہریلے جانوروں کا وجود؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہیں؛ کیوں کہ زمین کے ماحول کو انسانی زندگی کے لئے سازگار اور موافق بنائے رکھنے میں ان کا بھی نہایت اہم کردار ہے۔

(۱) یعنی اصحابِ کہف کا جو واقعہ آگے ذکر کیا جا رہا ہے، اگر چہ تمہیں حیرت انگیز محسوس ہو؛ کیوں کہ ایک انسان کا اتنی طویل مدت تک سوئے رہنا اور کھانے پانی کے بغیر زندہ رہنا عام عادت کے خلاف ہے؛ لیکن جس خدا نے سورج اور چاند، سمندر اور پہاڑ جیسی مخلوقات کو وجود بخشا ہے اور جو دن رات نئی نئی زندگیوں کو وجود میں لاتا ہے اور جب جس کو چاہتا ہے موت کی وادی میں پہنچا دیتا ہے، اس کے لئے اس طرح کا واقعہ کوئی تعجب کی چیز نہیں۔

آگے آیت نمبر: ۹ سے آیت نمبر: ۲۶ تک اصحابِ کہف کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ میں جو لوگ دعوت حق کی مخالفت میں پیش پیش تھے، ان میں ایک ''نَضر بن حارث'' بھی تھا، یہ قرب و جوار کے علاقے کا سفر کرتا رہتا تھا اور پرانے واقعات اور کہانیاں جو سینہ بسینہ لوگوں میں نقل ہوتی آتی تھیں، ان کو یاد کر لیتا تھا، جب رسول اللہ ﷺ قرآن مجید سناتے تو آپ ﷺ کے اُٹھنے کے بعد وہ وہاں بیٹھ جاتا اور کہتا کہ ان سے اچھے قصے میں سنا سکتا ہوں؛ چنانچہ یہ وہی سنی سنائی کہانی لوگوں کو سناتا؛ لیکن کہاں اللہ تعالیٰ کا کلام، قرآن مجید کے بلیغ الفاظ اور حکمت سے بھری تعلیمات اور کہاں یہ فرضی کہانیاں اور سنی سنائی بے معنی داستانیں؟ اس لئے لوگوں پر اس کی کہانی کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا، ادھر دعوتِ اسلام کے فروغ اور اسلام کی مقبولیت کو دیکھ کر اہل مکہ پریشان تھے؛ چنانچہ انھوں نے نَضر بن حارث اور عُقبہ بن ابی مُعیط پر مشتمل ایک وفد علماء یہود کے پاس بھیجا کہ وہ کچھ ایسے سوالات بتائیں، جو آپ ﷺ سے دریافت کئے جائیں؛ تاکہ سچ اور جھوٹ واضح ہو سکے اور تاکہ آپ ﷺ لاجواب ہو جائیں، یہودیوں سے رابطہ کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو آسمانی کتاب کا حامل کہتے تھے؛ اس لئے قریش مکہ اگر چہ ان کے دین کو قبول نہیں کرتے تھے؛ لیکن ان کو اپنے سے بڑھ کر صاحبِ علم خیال کرتے تھے؛ چنانچہ یہودیوں نے ان کو تین سوالات سکھائے، ایک سوال 'روح' سے متعلق تھا، جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ۸۵) میں آچکا ہے، دوسرا سوال 'ذوالقرنین' کے بارے میں تھا، جس کا ذکر اسی سورت میں آگے (آیت: ۸۳) آنے والا ہے، اور تیسرا سوال 'اصحابِ کہف' سے متعلق تھا، جن کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے، مفسرین کے یہاں راجح بات یہی ہے کہ اصحابِ کہف اصل میں عیسائی تھے اور اس وقت کے دین برحق دین عیسوی پر قائم تھے، اس لئے بظاہر یہودیوں کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی؛ لیکن غالباً دو اسباب کے تحت انھوں نے اس کو بھی اپنے سوال میں ←

← شامل کروایا، ایک یہ کہ اس وقت ان کو خطرہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ سے تھا، اسلام کی بالا دستی جزیرۃ العرب میں ان کی چودھراہٹ کو ختم کر دیتی؛ اس لئے انھوں نے عیسائیت سے عداوت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نئے اُبھرتے ہوئے دین برحق کو کمزور کرنا زیادہ مناسب سمجھا، جیسا کہ موجودہ دور میں اسلام کی مخالفت میں یہودی عیسائیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر کھڑے ہیں، دوسرے: اصحابِ کہف کو جس مشرک حکمراں کی وجہ سے غار میں روپوش ہونا پڑا، وہ بنو اسماعیل ہی کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا اور عرب بھی بنو اسماعیل میں سے تھے؛ اس لئے اہل مکہ کے لئے یہ سوال دلچسپی کا باعث ہوتا —— بہر حال اصحابِ کہف کے بارے میں قرآن مجید نے جو واقعہ بیان کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مشرک بادشاہ بزور قوت ملک میں بسنے والی تمام رعایا کو شرک پر مجبور کرتا ہے، چند صاحب ایمان اور صاحب عزیمت نوجوان دین حق پر قائم ہیں، کسی طرح دربارشاہی تک اس کی خبر پہنچتی ہے، بادشاہ کے دربار میں ان نوجوانوں کی طلبی ہوتی ہے اور ان سے ان کے عقیدہ و مذہب کے بارے میں تفتیش کی جاتی ہے، یہ نوجوان جرأت واستقامت کے ساتھ عقیدۂ توحید کا اعلان کرتے ہیں، یہ بات بادشاہ کے موقف کے خلاف تھی؛ اس لئے وہ ان کو شرک کی طرف واپس آنے کا حکم دیتا ہے اور اپنے معاملہ پر غور کرنے کے لئے چند دنوں کی مہلت دیتا ہے۔

ان نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر وہ شہر میں رہے تو یا تو انھیں مار ڈالا جائے گا یا مشرکانہ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا؛ اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ہم آبادی سے ہٹ کر کسی غار کی پناہ لیں اور وہیں اللہ کی عبادت میں مشغول رہیں؛ چنانچہ ان حضرات نے ایک کشادہ غار دیکھ کر اس مقصد کے لئے اس کا انتخاب کیا، یہ غار اندر سے خاصا کشادہ تھا، غار کے دونوں طرف دہانے تھے، جس کی وجہ سے ہوا اندر آتی جاتی رہتی تھی، غار کا منھ اُتر اور دکھن کی طرف تھا، اس کا فائدہ یہ تھا کہ روشنی تو اندر آتی تھی؛ لیکن سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے وقت دھوپ کی تپش وہاں نہیں پہنچتی تھی، اللہ کی قدرت سے انھیں نیند آگئی اور بہت طویل مدت تک وہ سوتے رہے، انسان اگر ایک ہی حالت پر سویا رہے تو اس کو زخم اور پھوڑے نکل آتے ہیں؛ اس لئے وہ نیند ہی میں دائیں بائیں کروٹ بھی لیتے رہتے تھے، ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا، جو غار کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا، باہر سے چوں کہ غار کا اندرونی حصہ تاریک نظر آتا تھا اور ایسی تاریکی میں اگر کچھ ہلکی پھلکی حرکت ہوتی نظر آئے تو انسان خوف محسوس کرتا ہے؛ اس لئے کسی کو غار کے اندر جھانکنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور وحشت محسوس کی جاتی تھی۔

آخر سالہا سال گزر گئے، یہاں تک کہ حکومت بدل گئی اور اقتدار ان لوگوں کو حاصل ہوا، جو دین عیسوی پر ایمان رکھتے تھے، اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں ایک پادری نے انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کر دیا، اب اللہ کو یہ بات منظور ہوئی کہ ان سوتے ہوئے دین حق کے حاملین کو بیدار کیا جائے؛ تاکہ وہ خود بھی اللہ کی قدرت کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھیں اور اس پادری کے اعتراض وانکار کا عملی جواب بھی ہو جائے کہ اگر کئی سو سال انسان اللہ کی قدرت سے نیند کی حالت میں رہ کر بیدار ہو سکتا ہے تو انسان مدتوں مردہ رہنے کے بعد زندہ کیوں نہیں ہو سکتا؛ چنانچہ غار میں سوئے ہوئے نوجوانوں کی آنکھ کھل گئی اور یہ ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ ہم کتنی مدت سوئے ہیں؟ کسی نے ایک دن کہا اور کسی نے اس سے کچھ کم یا زیادہ، پھر مشورہ ہوا کہ ایک ساتھی شہر سے کھانا لے کر آئے، وہ اپنے سکے لے کر شہر پہنچے، یہاں ساری دنیا بدلی ہوئی نظر آئی، ڈرتے ڈرتے ایک دکان پر پہنچے، کھانے کی کچھ چیزیں خریدیں اور جب قیمت ادا کی تو دکاندار نے دیکھا کہ یہ سکہ تو بہت قدیم اور مشرکانہ حکومت کے دور کا ہے، ←

← آخر لوگوں کو معلوم ہوا، انھوں نے ان بزرگوں کا استقبال کیا، خود ان کو بھی یہ معلوم ہوا کہ اب تمام لوگ مسلمان ہو چکے ہیں؛ لیکن ان کی خواہش یہی تھی کہ گوشۂ تنہائی میں اللہ کی عبادت میں اپنے آپ کو مشغول رکھیں؛ اسی لئے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے بچ بچا کر پھر غار میں واپس آگئے، اب یا تو لوگوں نے ان سے گزارش کی کہ وہ آبادی میں واپس آجائیں؛ لیکن وہ تیار نہیں ہوئے، بالآخر جب ان کی وفات ہوئی تو اسی غار کے اوپر لوگوں نے عبادت گاہ تعمیر کردی، یا بعض روایتوں کے مطابق وہ غار میں کچھ اس طرح گم ہوئے کہ لوگوں کو کچھ پتہ نہیں چل سکا؛ لیکن بہر حال انھوں نے اسی پہاڑ پر ایک عبادت گاہ بنادی، جس کے کسی غار میں اصحابِ کہف مقیم تھے۔

مفسرین کے درمیان اس واقعہ سے متعلق دو تین نکات میں اختلاف ہے؛ کیوں کہ قرآن میں مجمل طور پر واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں قصص کو بیان کرنے کا مزاج یہی ہے کہ صرف سبق آموز پہلوؤں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، یہ نکات بنیادی طور پر تین ہیں، ایک یہ کہ کہف کے معنی تو غار کے ہیں؛ لیکن رقیم سے کیا مراد ہے؟ دوسرے: اصحابِ کہف کا یہ غار کہاں واقع ہے؟ تیسرے: اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی؟ ——''رقیم'' سے کیا مراد ہے؟ —— اس سلسلہ میں مفسرین کی دو رائیں ہیں، ایک رائے یہ ہے کہ رقیم روم میں ''اَیلہ'' کے قریب ایک شہر کا نام ہے، جو اَب پیٹرا (Petra) یا ''بطرا'' کہلاتا ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ 'رقم' کے معنی لکھنے کے ہیں اور 'رقیم' کے معنی لکھی ہوئی چیز کے ہیں، اس غار پر لوگوں نے اصحابِ کہف کے نام کی تختی لگادی تھی، رقیم سے یہی تختی مراد ہے۔

اصحابِ کہف کا یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟ قرآن وحدیث میں اس کی واضح نشاندہی نہیں کی گئی ہے، دنیا میں اس انداز کے کئی غار پائے جاتے ہیں؛ اس لئے لوگوں نے اندازے قائم کئے ہیں اور زمانۂ قدیم سے مفسرین کے یہاں اختلاف رہا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں تین رائیں زیادہ مشہور ہیں، ایک یہ کہ خلیج عَقَبَہ (اَیلَہ) سے شمال میں پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ہیں، ان ہی میں سے ایک پہاڑ پر 'رَقیم' یا 'رَاقِم' نامی شہر آباد تھا، وہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا، آثار قدیمہ کی تحقیقات میں یہ شہر دریافت ہو چکا ہے، دوسری رائے —— جس کو اہل علم کے درمیان زیادہ قبولیت حاصل ہے —— یہ ہے کہ ترکی کے مغربی ساحل پر ''اِفسُوس'' (Ephesus) نامی ایک قدیم یونانی شہر واقع ہے، وہیں یہ واقعہ پیش آیا تھا، یہ ترکی کے موجودہ ''اِزمیر'' نامی شہر سے ۲۰، ۲۵ میل جنوب میں واقع ہے، جس کی آبادی پندرہ لاکھ سے زیادہ ہے، تیسری رائے وہ ہے جو ڈاکٹر شوقی ابو خلیل نے پیش کی ہے، انھوں نے قرآن مجید اور سیرت نبوی میں مذکور مقامات کی بڑی ہی باریک بینی کے ساتھ تحقیق کی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس سے مراد ترکی کا شہر ''طرسوس'' ہے —— جس بادشاہ کے زمانہ میں ان حضرات کو روپوش ہونا پڑا، کہا جاتا ہے کہ اس کا نام ''دَقیوس'' یا ''دَقیانُوس'' "Dacius" (۲۰۱ء تا ۲۵۱ء) تھا، اور جس کے عہد میں اصحابِ کہف پیدا ہوئے، اس کا نام شہنشاہ ''تھیودوسیس ثانی Theodosius'' (۴۰۸ء تا ۴۵۰ء) تھا۔

اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی؟ اس کا ذکر آیت نمبر: ۲۲ کے تحت، اور ان کے سونے کی مدت کیا تھی؟ اس کا تذکرہ آیت نمبر: ۱۹ کے تحت آئے گا، اصحابِ کہف کے اس واقعہ سے متعلق تقریباً تمام ہی اُردو عربی تفسیر کی کتابوں میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، ان کتابوں کے علاوہ اُردو زبان میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ کی ''الکہف والرقیم''، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی ''ارض القرآن''، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ کی ''قصص القرآن'' اور ڈاکٹر شوقی ابو خلیل رحمہ اللہ کی ''اطلس القرآن'' کا اُردو ترجمہ، نیز ''اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' مطبوعہ پاکستان اور سورۂ کہف کے تذکیری ودعوتی پہلو پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی ''تذکیر بسورۃ الکہف'' نیز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ''معرکۂ ایمان ومادیت'' خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

اِذۡ اَوَی الۡفِتۡیَۃُ اِلَی الۡکَھۡفِ فَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً وَّ ہَیِّیٴۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا
رَشَدًا ﴿۱۰﴾ فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِہِمۡ فِی الۡکَھۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾ ثُمَّ بَعَثۡنٰہُمۡ لِنَعۡلَمَ اَیُّ
ع ۱۲ / ۱۳ الۡحِزۡبَیۡنِ اَحۡصٰی لِمَا لَبِثُوۡۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾ نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ نَبَاَہُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ اِنَّہُمۡ فِتۡیَۃٌ
اٰمَنُوۡا بِرَبِّہِمۡ وَ زِدۡنٰہُمۡ ہُدًی ﴿۱۳﴾

(یہ واقعہ یوں ہے کہ) چند نوجوانوں نے غار کی پناہ لی اور دُعاء کی: ’’اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے سامانِ رحمت سے نوازیئے اور ہمیں ہمارے اس معاملہ میں درست راہ سُجھا دیجئے‘‘ ﴿۱﴾ ﴿۱۰﴾ چنانچہ ہم نے اس غار میں سالہا سال تک ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈالے رکھا، ﴿۲﴾ ﴿۱۱﴾ پھر ہم نے ان کو بیدار کردیا؛ تاکہ ہم معلوم کرلیں کہ دو گروہ ﴿۳﴾ میں سے کون اپنے (نیند کی حالت میں) رہنے کی مدت کو زیادہ صحیح شمار کرتا ہے؟ ﴿۱۲﴾ (تو لیجئے!) ہم آپ سے ٹھیک ٹھیک ان کا واقعہ بیان کرتے ہیں: وہ چند نوجوان تھے، جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ہم نے ان کو ہدایت میں اور ترقی عطا کردی۔ ﴿۴﴾ ﴿۱۳﴾

﴿۱﴾ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے لئے کسی خاص جگہ میں اسلام پر قائم رہنا دشوار ہوجائے تو اگرچہ اس کے لئے گنجائش ہے کہ جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر کہہ دے اور بہتر ہے کہ کلمۂ حق پر قائم رہتے ہوئے اپنی جان دے دے؛ لیکن اس کے لئے ایک جائز راستہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دین کو بچانے کے لئے ہجرت کرجائے اور کسی ایسی جگہ چلا جائے، جہاں اپنے دین پر قائم رہ سکتا ہو۔

﴿۲﴾ نیند کی حالت میں آنکھیں بند رہتی ہیں، منھ بھی بند رہتا ہے؛ لیکن کان کھلے رہتے ہیں؛ اس کے باوجود انسان اپنے گرد و پیش کی آواز نہیں سنتا، غالباً اسی لئے کان پر نیند کا پردہ ڈال دینے کی بات فرمائی گئی، اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ لوگ بہت گہری نیند سوئے ہوئے تھے؛ کیوں کہ گہری نیند ہی میں انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ کوئی آواز نہ سن سکے۔

﴿۳﴾ یا تو خود اصحابِ کہف میں سے دو گروہ ہوگئے، جن کا اندازہ دو الگ الگ مدتوں کا تھا، یا ایک گروہ اصحابِ کہف کا تھا، جو کم مدت کا اندازہ لگا رہے تھے، اور دوسرا گروہ باہر کے لوگوں کا تھا، جو سکوں کی قدامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ مدت کا اندازہ لگاتے تھے، یہ دوسری بات زیادہ قرین قیاس ہے۔

﴿۴﴾ قرآن مجید نے اصحابِ کہف کا ذکر بار بار ’’فتیۃ‘‘ یعنی چند نوجوانوں سے کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بوڑھوں اور عمر دراز لوگوں کے مقابلہ میں نوجوانوں کے اندر کسی حق بات کو قبول کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے؛ اسی لئے اکثر انبیاء کی دعوت پر نوجوانوں نے لبیک کہا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ابتدائی دور میں جن لوگوں نے قبول کیا، قریب قریب وہ سب جوان یا نوجوان تھے؛ چنانچہ سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق جب آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی تو تمام رفقاء سیاہ داڑھی والے تھے، سوائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہ ان کی داڑھی کے کچھ بال سیاہ کچھ سفید تھے۔

وَّ رَبَطۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۠ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ
اِلٰـہًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً ؕ لَوۡ لَا یَاۡتُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ
بِسُلۡطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ﴿ؕ۱۵﴾ وَ اِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡہُمۡ وَ مَا
یَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ فَاۡوٗۤا اِلَی الۡکَہۡفِ یَنۡشُرۡ لَکُمۡ رَبُّکُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِہٖ وَ یُہَیِّیٔۡ لَکُمۡ مِّنۡ
اَمۡرِکُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾ وَ تَرَی الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ کَہۡفِہِمۡ ذَاتَ الۡیَمِیۡنِ وَ اِذَا
غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُہُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ ہُمۡ فِیۡ فَجۡوَۃٍ مِّنۡہُ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ
فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ ع ۳ ۱۵ ۱۴

نیز ہم نے ان کے دل اس وقت خوب مضبوط کر دیئے، جب وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''ہمارا پروردگار تو وہی ہے، جو آسمانوں کا اور زمین کا پروردگار ہے، ہم اس کو چھوڑ کر کسی اور معبود کی عبادت نہیں کریں گے، اگر ہم نے ایسا کیا تو یقیناً ہم نے نہایت غلط بات کہی ﴿۱۴﴾ یہ ہماری قوم ہے، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود تراش لئے ہیں، وہ اس پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے؟ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس نے اللہ پر بہتان باندھی ہو؟'' ﴿۱۵﴾ اور (اے ساتھیو!) جب تم لوگوں نے ان سے اور اللہ کے سوا وہ جن کو پوجتے ہیں، ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو اب غار میں پناہ لے لو، تمہارے پروردگار تم پر اپنی رحمت پھیلا دیں گے اور تمہارے لئے تمہارے کام میں آسانی فراہم کر دیں گے ﴿۱﴾ ﴿۱۶﴾ اور تم سورج کو دیکھتے کہ جب نکلتا ہے تو وہ اس غار سے دائیں جانب ہٹ کر گزر جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو بائیں طرف ہٹا رہتا ہے اور وہ لوگ غار کی ایک کشادہ جگہ میں (سوئے ہوئے) تھے، ﴿۲﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، اللہ جسے ہدایت عطا فرما دیں، وہی ہدایت پاتا ہے، اور جسے ہدایت سے محروم رکھیں تو آپ اس کے لئے کوئی مددگار اور راستہ بتانے والا نہیں پائیں گے۔ ﴿۱۷﴾

﴿۱﴾ اس آیت میں یا تو اصحابِ کہف ہی کی باہمی گفتگو کو نقل کیا گیا ہے، یا اللہ تعالیٰ کا اصحابِ کہف سے خطاب ہے کہ وہ غار میں پناہ لے لیں، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی اور ان کے قلب کو مطمئن کر دیا۔

﴿۲﴾ یعنی اس غار کا دہانہ شمال کی جانب تھا؛ اس لئے سورج کے نکلتے اور ڈوبتے وقت سورج کی تپش اندر نہیں جاتی تھی اور غار کی جگہ بھی کشادہ تھی؛ تاکہ کروٹ لینے اور اُلٹنے پلٹنے میں دقت نہ ہو۔

وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ ۖۗ وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ ۖۗ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ
ذِرَاعَیْهِ بِالْوَصِیْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝۱۸
وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِیَتَسَآءَلُوْا بَیْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا یَوْمًا اَوْ
بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ
فَلْیَنْظُرْ اَیُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْیَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَ لْیَتَلَطَّفْ وَ لَا یُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝۱۹

نصف القرآن

(اگر ان کو دیکھنے کی نوبت آتی تو) آپ خیال کرتے کہ وہ جاگ رہے ہیں؛ حالاں کہ وہ سو رہے تھے، ہم دائیں بائیں ان کی کروٹیں بھی بدلوا رہے تھے ﴿۱﴾ اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا، اگر آپ ان کو جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے اور آپ کے اندر ان سے دہشت سما جاتی ﴿۲﴾ ۝۱۸ اور (جس طرح ہم نے انھیں سُلا دیا تھا) اسی طرح ہم نے ان کو جگا بھی دیا؛ تاکہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کریں، تو ان میں سے ایک کہنے والے نے دریافت کیا: تم کتنی دیر (نیند کی حالت میں) رہے ہوگے؟ ان لوگوں نے کہا: ایک دن یا اس سے کچھ کم، کچھ اور لوگوں نے کہا: تم کتنے دن (سوتے) رہے ہو؟ اس سے تمہارے پروردگار ہی واقف ہیں، ﴿۳﴾ اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپے لے کر شہر بھیجو، وہ تحقیق کرے کہ کونسا کھانا صاف ستھرا ہے؟ پھر وہ اس میں سے تمہارے پاس کچھ کھانا لے کر آئے، (ہاں) اسے چاہئے کہ خوش اخلاقی سے کام لے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ ﴿۴﴾ ۝۱۹

﴿۱﴾ انسان اگر ایک ہی ہیئت پر مسلسل سویا رہے تو جسم کا جو حصہ بستر سے لگا ہوتا ہے، اس حصہ کو پوری طرح آکسیجن نہیں مل پاتی اور اس کی وجہ سے جسم میں زخم اور پھوڑے نکلنے لگتے ہیں، جس کو ''بیڈ سول'' (Bedsore) کہا جاتا ہے؛ اس لئے قدرتی طور پر اصحابِ کہف نیند کی حالت میں کروٹیں بھی بدلتے رہتے تھے۔

﴿۲﴾ گویا ان کی حفاظت کا دہرا انتظام تھا، ایک تو باہر کتے کی موجودگی، جس سے انسان کو کاٹ کھانے کا خوف ہوتا ہے، دوسرے: اندر کا ماحول جس سے باہر سے دیکھنے والوں کو دہشت محسوس ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا جاتا، ہوسکتا ہے کہ جیسے رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے وقت اہل مکہ آپ ﷺ کی تلاش میں کوہ طور تک پہنچے اور ناکام رہے، اسی طرح عجب نہیں کہ اصحابِ کہف کی تلاش میں بادشاہ کے کارندوں نے پہاڑوں اور غاروں میں انھیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہو؛ اس لئے ان کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کیا گیا ہو۔

﴿۳﴾ جب کچھ لوگوں نے سونے کی مدت کا اندازہ لگانا شروع کیا تو کچھ نے کہا کہ ایک دن یا اس سے کم کی مدت رہی ہوگی، یہ بات انھوں نے اپنے گمان کے مطابق کہی تھی؛ لیکن تھی خلافِ واقعہ، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی بات غالب گمان کی بناء پر کہہ دی جائے، ←

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾
وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ
يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

اگر وہ لوگ تمہاری خبر پالیں تو تم کو پتھراؤ کر کے مار ڈالیں گے ﴿۱﴾ یا تم کو (جبراً) اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور ایسا ہوا تو ہرگز کبھی تمہارا بھلا نہ ہوگا، ﴿۲۰﴾ اور اس طرح ہم نے لوگوں پر ان کی خبر ظاہر کر دی؛ تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، ﴿۲﴾ وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب وہ آپس میں ان کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے، پھر کہنے لگے کہ ان کے (غار) کے اوپر ایک عمارت بنادو، ان کے پروردگار ان کے حال سے خوب واقف ہیں، پھر جو لوگ ان کے معاملات پر قابو رکھتے تھے، وہ کہنے لگے: ہم ان کی جگہ پر ضرور ایک مسجد بنادیں گے۔ ﴿۳﴾ ﴿۲۱﴾

← جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ ہو مگر وہ ہو واقعہ کے خلاف، تو یہ جھوٹ اور گناہ نہیں سمجھا جائے گا، (روح المعانی: ۳۳۱/۹) کچھ دوسرے ساتھیوں نے کہا کہ یہ بحث فضول ہے کہ کتنے دن ورات سوئے؛ کیوں کہ اس سے نہ کوئی دینی نفع متعلق ہے نہ دنیوی، اور اللہ تعالیٰ کو تو ساری حقیقتیں معلوم ہی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جن باتوں کو قرآن وحدیث میں واضح نہ کیا گیا ہو، مبہم چھوڑ دیا گیا ہو اور ان کے جاننے سے کوئی دنیوی یا دینی فائدہ متعلق نہ ہو، اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے کہ یہ محض وقت کا ضائع کرنا ہے، نیز جس بات کا علم نہ ہو اس کو اللہ کی طرف لوٹا دینا چاہئے اور بلا تحقیق بات کرنے سے بچنا چاہئے؛ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ صحابہ سے کوئی سوال کرتے تو اکثر ان کا جواب یہی ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہے۔

﴿۴﴾ معلوم ہوا کہ مسافر کا اپنے ساتھ توشۂ سفر رکھنا اور زادِ راہ لے کر چلنا توکل کے خلاف نہیں ہے، نیز فقہاء نے اس سے یہ بات اخذ کی ہے کہ اگر کئی لوگ مشترکہ پیسوں سے کھانا خریدیں اور مل جل کر کھائیں تو اگرچہ کہ کھانا کھانے کی مقدار کسی کی زیادہ اور کسی کی کم ہوسکتی ہے؛ لیکن ایسا کرنا جائز ہے، (احکام القرآن للجصاص: ۲۷۷/۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شہر میں حلال وحرام دونوں طرح کا کھانا ملتا ہو تو تحقیق کرکے حلال کھانا حاصل کرنا چاہئے، ''أزکیٰ'' کے معنی پاک، صاف ستھرے کے ہیں اور جو چیز حرام ہو وہ کیسے پاکیزہ اور صاف ستھری ہوسکتی ہے؟ نیز پاکیزہ ہونے کا تعلق کھانے کی کیفیت سے بھی ہے کہ کھانا عمدہ اور لذیذ ہو، گویا مزیدار کھانا کھانا اور اس کی خواہش رکھنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

﴿۱﴾ غالباً بادشاہ کے مذہب میں جو لوگ ان کا دین چھوڑ دیتے تھے، ان کو سنگسار کر دیا جاتا تھا۔

﴿۲﴾ شاید اس سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہو کہ جس زمانہ میں اصحابِ کہف اپنی نیند سے بیدار ہوئے، اسی زمانہ میں ایک پادری انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے (بعث بعد الموت) کا انکار کرنے لگا تھا، اس پادری کا نام ''تھیوڈر'' بتایا جاتا ہے، اس وقت وہاں ←

← اس موضوع پر لوگوں کے درمیان بحث ومباحثہ کا ایک معرکہ چھڑا ہوا تھا، اصحابِ کہف کے اس واقعہ کے انکشاف نے گویا اس مسئلہ کا فیصلہ کردیا کہ جب اتنی طویل مدت تک انسان کھائے پیئے بغیر سوتے ہوئے زندہ رہ سکتا ہے اور پھر بیدار ہوسکتا ہے تو اسی طرح ایک انسان طویل عرصہ تک موت کی حالت میں رہ کر (جو کئی پہلوؤں سے نیند کے مشابہ ہوتی ہے) دوبارہ زندہ کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

﴿۳﴾ جب لوگوں پر ان کا واقعہ اللہ کی طرف سے ظاہر کردیا گیا تو ظاہر ہے کہ بزرگی کا خوب چرچا ہوا ہوگا اور لوگوں کے دل میں ان کی عظمت بیٹھ گئی ہوگی، پھر عام مزاج کے مطابق وہاں آمد ورفت شروع ہوگئی ہوگی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو وفات دے دی، ایک تو یہ ایک طبعی بات تھی کہ جو پیدا ہوگا، وہ موت سے دوچار کیا جائے گا، دوسرے اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں لوگوں کے اندر ان کے بارے میں مبالغہ آمیز خیالات نہ پیدا ہوجائیں؛ اس لئے مصلحت یہی تھی کہ ان کی وفات ہوجائے اور لوگوں کو اس کی واقفیت بھی ہوجائے؛ چنانچہ ان کی وفات کے بعد اس بات پر بحث ہوئی کہ کیا ان کی یادگار کے طور پر کوئی عبادت گاہ بنادی جائے؟ یہاں 'مسجد' سے مسلمانوں کی مسجد مراد نہیں ہے؛ بلکہ عبادت گاہ مراد ہے؛ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس غار کے دہانے پر ابھی بھی عیسائیوں کی ایک خانقاہ موجود ہے۔ (تفسیر ماجدی: ۳/ ۱۰۸)

اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ کی قبر پر مسجد بنائی جاسکتی ہے، مگر یہ جائز ہونا گزشتہ اُمت کے لئے تھا، جو باتیں پہلی اُمتوں میں جائز تھیں اور وہ بتدریج شرک کا باعث بن گئیں، اس اُمت میں ان کو حرام قرار دے دیا گیا، جیسے گزشتہ اُمت میں بطور تعظیم واحترام کے سجدہ کرنے کی اجازت تھی، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھائیوں کے ان کو سجدہ کرنے کا ذکر آیا ہے؛ لیکن اس اُمت میں رسول اللہ ﷺ نے عبادت کے سجدہ کے ساتھ ساتھ تعظیمی سجدہ سے بھی منع فرمادیا، (ابن ماجہ: کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ، حدیث نمبر: ۱۸۵۳) یا گزشتہ اُمت میں مجسمے بنانے کی اجازت تھی جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں آیا ہے، (سبا: ۱۳) لیکن اس اُمت میں اس کو منع کردیا گیا؛ کیوں کہ یہ چیز مورتی پوجا کے رواج پانے کا ذریعہ بن رہی تھی، اسی طرح بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پہلے قبر پر مسجد بنانے کی عادت تھی؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس اُمت کے لئے اس کی ممانعت فرمادی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، قبر پر مسجدیں بنانے والوں پر اور قبر پر چراغاں کرنے والوں پر لعنت بھیجی ہے، (ترمذی: کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی کراہیۃ اَن یتخذ علی القبر مسجداً، حدیث نمبر: ۳۲۰) حضرت اُم سلمہ اور حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہما نے حبش میں ایسے چرچ دیکھے تھے، جن میں مجسمے بنے ہوئے تھے، انھوں نے حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے یہاں جب کوئی نیک آدمی گزر جاتا تو لوگ اس کی قبر پر مسجد تعمیر کرتے اور اس کا اسٹیچو بناتے، قیامت کے دن اللہ کے نزدیک یہ سب سے بدترین لوگ ہوں گے، (بخاری: ابواب المساجد، حدیث نمبر: ۴۱۷، مسلم: کتاب المساجد، باب النہی عن بناء المساجد علی القبور، حدیث نمبر: ۱۲۰۹) بلکہ جب رسول اللہ ﷺ مرض الوفات میں تھے تو آپ ﷺ نے چہرہ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنالیا، (بخاری: کتاب المغازی، حدیث نمبر: ۴۱۷۹، مسلم: کتاب المساجد، حدیث نمبر: ۱۲۱۵، عن عائشہؓ وابن عباسؓ) —— اس لئے اس اُمت کے لئے قبر پر مسجد کا بنانا یا مسجد کے اندر قبر بنادینا جائز نہیں؛ بلکہ قبر پر کسی طرح کی عمارت بنانا بھی جائز نہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر عمارت بنا بھی دی گئی تو اس کو منہدم کردینا چاہئے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۰/ ۳۸۱۵)

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ
وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا
تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ
فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّیْ
لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

ع ۳ ۵ ۱۵

بعید نہیں کہ بعض لوگ کہیں کہ وہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا اور بعض کہیں کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا، یہ سب بِن دیکھے اندازے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، آپ فرمادیجئے کہ میرے پروردگار ان کی تعداد سے خوب واقف ہیں، ان کی (صحیح تعداد) کا تھوڑے ہی لوگوں کو علم ہے، تو سرسری گفتگو کے سوا ان کے بارے میں زیادہ بحث نہ کیجئے اور آپ ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے دریافت بھی نہ کیجئے ﴿۱﴾ ﴿۲۲﴾ اور آپ ہرگز کسی چیز کے بارے میں یہ نہ کہا کیجئے کہ میں کل اس کام کو کردوں گا، ﴿۲۳﴾ مگر کہئے کہ اگر اللہ نے چاہا (تو کرلوں گا) اور جب آپ (انشاء اللہ کہنا) بھول جائیں تو اپنے پروردگار کا ذکر کرلیا کیجئے اور کہئے: اُمید ہے کہ میرا پروردگار مجھ کو ہدایت کا اس سے بھی قریبی راستہ بتادے۔ ﴿۲﴾ ﴿۲۴﴾

﴿۱﴾ اصحابِ کہف کی تعداد کیا تھی؟ اس سلسلہ میں ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ تعداد واضح نہیں کی گئی، اللہ ہی کو معلوم ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا؛ کیوں کہ قرآن مجید میں تین اور پانچ کا عدد ذکر کرنے کے بعد تردید کردی گئی کہ یہ اٹکل اور اندازہ ہے؛ لیکن سات کا عدد ذکر کرنے کے بعد اس کی تردید نہیں کی گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی صحیح تعداد کا علم تھوڑے ہی لوگوں کو ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان تھوڑے لوگوں میں میں بھی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا، نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ یہ سات لوگ تھے، جن میں چھ بادشاہ کے مقربین اور خاص مشیروں میں سے تھے، ایک چرواہا تھا اور اسی چرواہے کے ساتھ یہ کتا بھی آگیا تھا، (مفاتیح الغیب: ۲۸۱/۱۰) اخیر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحث میں پڑنے اور لوگوں سے اس کے بارے میں مزید استفسار کرنے سے منع کیا گیا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن باتوں سے کوئی نفع متعلق نہ ہو، ان کے بارے میں بحث ومباحثہ اور کھود کرید سے بچنا چاہئے۔

﴿۲﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اہل مکہ نے اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے میں سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل جواب دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم انشاء اللہ کہنا بھول گئے؛ حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انشاء اللہ نہ کہنا سہواً تھا اور بھول کر جو غلطی انسان سے ہوجائے، وہ معاف ہے؛ لیکن جو جتنے اونچے مقام کا حامل ہوتا ہے، اس کی پکڑ بھی اسی قدر ہوتی ہے؛ اس لئے اس بھول پر تنبیہ کرنے کے لئے پندرہ دنوں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل نہیں ہوئی، پھر وہ آیات نازل ہوئیں، جن میں اصحابِ کہف کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے اور تاکید کی گئی کہ جب بھی کوئی وعدہ کریں، انشاء اللہ ضرور کہیں اور اگر کہنا بھول جائیں تو جس وقت یاد آئے، اس وقت کہہ دیا جائے، ایک بڑے فقیہ علامہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ بعد میں انشاء اللہ کہنا صرف تبرک کے طور پر ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳۸۹/۱۰)

وَ لَبِثُوۡا فِیۡ کَہۡفِہِمۡ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیۡنَ وَ ازۡدَادُوۡا تِسۡعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثُوۡا ۚ لَہٗ
غَیۡبُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَبۡصِرۡ بِہٖ وَ اَسۡمِعۡ ؕ مَا لَہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ وَّلِیٍّ ۫ وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ
حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ وَ اتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ کِتَابِ رَبِّکَ ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ۟ وَ لَنۡ تَجِدَ مِنۡ
دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَ اصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ
وَجۡہَہٗ وَ لَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَ لَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ
عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ اتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَ کَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

اور (حقیقت یہ ہے کہ) وہ لوگ اپنے غار میں تین سو نو سال ٹھہرے رہے «۱» ﴿۲۵﴾ آپ کہہ دیجئے: ان پر گزری ہوئی مدت سے اللہ خوب واقف ہیں، آسمانوں کے اور زمین کے غیب کی باتیں اللہ ہی کو معلوم ہیں، اللہ کیا خوب دیکھنے والے اور کیا خوب سننے والے ہیں! اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور نہ اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک کرتے ہیں، «۲» ﴿۲۶﴾ آپ کے پروردگار کی جو کتاب آپ کی طرف اُتاری گئی ہے، اس کو پڑھ دیجئے، اللہ کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا اور آپ خدا کے سوا کہیں کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے، ﴿۲۷﴾ آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہئے جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں، وہ اسی کی خوشنودی کے طلب گار ہیں، دنیوی زندگی کی رونق کی طلب میں آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں، نیز آپ ان لوگوں کا کہا نہ مانیں، جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے، جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور ان کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔ «۳» ﴿۲۸﴾

«۱» یعنی اصحابِ کہف کے سوئے رہنے کی مدت تین سو نو سال ہے، پھر آگے اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر کہ اللہ زیادہ واقف ہیں، ان لوگوں کو تنبیہ کر دی، جو مختلف مدتوں کے سلسلہ میں اختلاف کر رہے تھے کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے مدت بیان کر دی تو اب یہ بحث بے محل اور بے موقع ہے —— قرآن مجید نے سیدھے تین سو نو سال کہنے کے بجائے فرمایا: تین سو سال اور اس پر نو کا اضافہ، یہ اس لئے کہ مسیحی حضرات ''شمسی کلینڈر'' سے حساب کرتے تھے اور شریعت محمدی ﷺ میں ''ہلالی کلینڈر'' کا اعتبار کیا گیا ہے، تو شمسی کلینڈر کے حساب سے تین سو سال کی مدت ہوئی اور قمری کیلنڈر کے حساب سے نو سال بڑھ گئے؛ گویا دونوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

«۲» یعنی نہ اللہ کے فیصلہ کو کوئی روک سکتا ہے اور نہ کوئی اس کے فیصلہ میں شریک ہو سکتا ہے، کسی بھی پہلو سے اللہ کے فیصلہ پر کوئی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

«۳» قبیلہ مُضَر کے سردار عُیَیْنَہ بن حِصن اور اَقرع بن حابس (جو بعد میں ایمان لے آئے تھے) وغیرہ جو معزز لوگ سمجھے جاتے تھے، آپ ﷺ کے پاس آئے، یہاں پہلے سے حضرت سلمان فارسی، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما اور کچھ غریب مسلمان موجود تھے، ←

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾

(اے نبی!) آپ فرمادیجئے: تمہارے پروردگار کی طرف سے دین حق آچکا ہے، پھر جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے، بے شک ہم نے تو ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے، آگ کی قناتیں اس کو گھیرے رہیں گی، اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کو تیل کی تلچھٹ ﴿۱﴾ کی طرح کا پانی دیا جائے گا، جو چہرے بھون ڈالے گا، کیا ہی بُری یہ پینے کی چیز ہوگی اور کیا ہی بری ہوگی یہ قیام گاہ! ﴿۲﴾ ﴿۲۹﴾ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا تو ہم ایسے لوگوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے، جنھوں نے اچھے کام کئے ہوں۔ ﴿۳۰﴾

← جواُون کے جبے پہنے ہوئے تھے، کپڑے بھی معمولی اور اس پر گرمی کی وجہ سے پسینہ، ان سرداروں نے آپ سے خواہش کی کہ آپ ذرا ان کو یہاں سے ہٹائیے؛ تاکہ بدبو نہ محسوس ہو، تب ہم آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھیں گے، تبادلۂ خیال کریں گے اور آپ ﷺ کی باتیں سمجھنے کی کوشش کریں گے، اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ان مغرور لوگوں کے کہنے میں نہ آیئے، جو انسان کی عظمت کو اخلاق وکردار سے نہیں، دولت وثروت سے تولتے ہیں، جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں اور اپنی خواہشات کے غلام ہیں اور ان غریب مخلص مسلمانوں کو ہرگز نظر انداز نہ کیجئے، (قرطبی: ۱۰/۳۹۰) —— اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی دنیوی وجاہت کی وجہ سے اس کا اکرام کرنے میں تو کوئی حرج نہیں؛ لیکن اس کی وجہ سے غریب مسلمانوں کو نظر انداز کردینا اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا جائز نہیں، اس طرح کے مطالبات اہل مکہ کی طرف سے بار بار آتے رہتے تھے؛ چنانچہ سورۂ انعام (آیت: ۵۲) میں بھی یہ مضمون آچکا ہے۔

﴿۱﴾ ''مھل'' کا معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے تیل کی تلچھٹ سے، امام مجاہد رحمہ اللہ نے خون اور پیپ سے اور ضحاک رحمہ اللہ نے کالے پانی سے کیا ہے اور ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ لوہا، تانبہ وغیرہ کے سیال کو 'مھل' کہا جاتا ہے، (قرطبی: ۱۰/۳۹۴) یہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ یعنی اہل دوزخ نہ صرف آگ میں جلائے جائیں گے؛ بلکہ ان کے گرد جو احاطہ ہوگا، وہ بھی آگ ہی کا ہوگا، جب انھیں پیاس لگے گی تو ایسا غلیظ سیاہ رنگ کا پانی دیا جائے گا، جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، اور جب دوزخی اسے چہرہ کے قریب کریں گے تو چہرہ کی جلد نکل آئے گی اور جب پئیں گے تو اس سے آنتیں کٹ جائیں گی، (قرطبی: ۱۰/۳۹۴، بحوالہ احادیث) گویا پانی گرم بھی ہوگا بدمزہ بھی، دیکھنے میں بھی خراب اور اس میں تیزابی کی کیفیت بھی ہوگی، اللہ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائیں۔ آمین

اُولٰٓئِکَ لَھُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمُ الْاَنْھٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ
وَّیَلْبَسُوْنَ ثِیَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّکِئِیْنَ فِیْھَا عَلَی الْاَرَآئِکِ ط نِعْمَ
ع ۹ الثَّوَابُ ط وَ حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾ وَ اضْرِبْ لَھُمْ مَّثَلًا رَّجُلَیْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِھِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ
۱۶ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰھُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَیْنَھُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾ کِلْتَا الْجَنَّتَیْنِ اٰتَتْ اُکُلَھَا وَ لَمْ تَظْلِمْ
مِّنْهُ شَیْئًا لا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَھُمَا نَھَرًا ﴿۳۳﴾ وَّ کَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ج فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَ ھُوَ یُحَاوِرُهٗٓ اَنَا
اَکْثَرُ مِنْکَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

ایسے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں، ان کے نیچے نہریں رواں ہوں گی، جنت میں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، وہ باریک اور دبیز ریشم کے کپڑے پہنیں گے، ﴿۱﴾ پلنگوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے، کیا ہی اچھا بدلہ ہے اور کیا ہی اچھی ہے یہ رہنے کی جگہ! ﴿۳۱﴾ اور (اے نبی!) آپ ان سے دو شخصوں کی مثال بیان کیجئے: جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ عطا کئے تھے، ان دونوں کو کھجور کے درختوں کی باڑھ سے گھیر رکھا تھا اور ان کے درمیان کھیتی بھی لگا رکھی تھی، ﴿۲﴾ ﴿۳۲﴾ دونوں باغ پورا پھل دیتے تھے، اور پھل میں کچھ کمی نہیں ہوتی تھی، نیز ہم نے ان دونوں کے درمیان نہر جاری کردی تھی ﴿۳۳﴾ اور اس شخص کے پاس (باغوں کے علاوہ) اور بھی مال واسباب تھے ﴿۳﴾؛ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں دولت کے اعتبار سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور میرا جتھ بھی زیادہ طاقتور ہے۔ ﴿۳۴﴾

﴿۱﴾ دنیا اور آخرت کے احکام الگ الگ ہوں گے، آخرت میں مرد بھی سونے کے زیورات پہنیں گے اور انھیں بھی ریشمی کپڑے پہنائے جائیں گے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر: ۳۲ سے ۴۴ تک دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی نعمتوں کے ہمیشہ برقرار رہنے، نیز اللہ کی ناشکری اور شکر گزاری کے نتائج کو سمجھایا ہے اور اس سلسلہ میں نام لئے بغیر ایک واقعہ ذکر کیا ہے، جو دو شخصوں کا ہے، ان میں سے ایک مسلمان ہے اور دوسرا ایمان سے محروم، جو ایمان سے محروم ہے، وہ دولت وعزت کا مالک ہے، وہ غرور میں مبتلا ہے، دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کرتا ہے، اپنے غریب دوست کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اللہ کا ناشکرا ہے، دوسرا شخص مسلمان ہے، غریب ہے؛ لیکن اللہ پر توکل رکھتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے، بالآخر اس متکبر دولت مند شخص کی ساری دولت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ختم ہوجاتی ہے اور ہرے بھرے باغات —— جن پر اسے ناز تھا —— چٹیل میدان سے بدل جاتے ہیں، یہ واقعہ کن لوگوں کا ہے؟ قرآن یا حدیث میں اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ہے، مفسرین نے بعض نام ذکر کئے ہیں، جو اندازوں پر مبنی ہیں، (تفسیر قرطبی: ۱۰/۳۹۹) حقیقت یہ ہے کہ دونوں مزاج کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں اور پائے جاتے رہیں گے، قرآن کی آیات ان سبھوں کے لئے مشعل راہ ہے۔

﴿۳﴾ ''ثمر'' کا معنی یہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سونے چاندی اور دوسرے مالوں سے کیا ہے، اسی لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (قرطبی: ۱۰/۴۰۳)

وَ دَخَلَ جَنَّتَهٗ وَ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ
قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَ هُوَ يُحَاوِرُهٗۤ
اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ
وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾ وَ لَوْ لَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ
تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۳۹﴾ فَعَسٰى رَبِّيْۤ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ يُرْسِلَ
عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ
تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

اور وہ اس حال میں اپنے باغ میں داخل ہوا کہ وہ خود اپنے آپ کے ساتھ زیادتی کر رہا تھا، ﴿۱﴾ اس نے کہا: میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی برباد بھی ہوسکتا ہے ﴿۳۵﴾ اور میرا گمان نہیں ہے کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر کبھی میں اپنے پروردگار کے پاس پہنچا بھی دیا گیا تو میں وہاں پہنچ کر اس سے بھی شاندار جگہ پاؤں گا ﴿۳۶﴾ اس سے اس کے ساتھی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا: کیا تو اس ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھ کو مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا، پھر تجھ کو صحیح سالم آدمی بنا دیا؟ ﴿۳۷﴾ لیکن میں تو یہی کہتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ﴿۳۸﴾ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو ''مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' (جو اللہ چاہتے ہیں، وہی ہوتا ہے اور اللہ کی مدد کے بغیر کوئی طاقت کام نہیں آسکتی) کیوں نہیں کہا؟ اگر تم مجھے دیکھتے ہو کہ میں مال و اولاد کے اعتبار سے تم سے کم ہوں ﴿۲﴾ ﴿۳۹﴾ تو کیا عجب ہے کہ میرے پروردگار مجھ کو تمہارے باغ سے بہتر باغ عطا فرما دیں اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی آسمانی آفت بھیج دیں کہ یہ باغ چٹیل میدان بن کر رہ جائے، ﴿۴۰﴾ یا اس کا پانی زمین کی گہرائی میں اُتر جائے پھر تم اس کو تلاش کے باوجود نہ پاسکو۔ ﴿۴۱﴾

﴿۱﴾ انسان کا اللہ کی نافرمانی کرنا دراصل اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے؛ کیوں کہ اس طرح وہ اپنے جسم کو دوزخ کا ایندھن بناتا ہے۔

﴿۲﴾ اسی لئے امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہو تو ''مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھا کرے اور وہب بن مُنَبِّہ رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے دروازہ پر ''مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کی تحریر لکھی ہوئی تھی، (قرطبی: ۴۰۶/۱۰) یہ شاید اس لئے کہ ہر آنے والا شخص اپنی زبان سے اس کلمہ کو پڑھ لے، نیز ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص گھر سے نکلتے ہوئے ''بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھ لے، اس کی حفاظت ہوتی ہے اور شیطان اس سے دور رہتا ہے۔ (ترمذی: کتاب الدعوات، باب مایقول إذا خرج من بیته، حدیث نمبر: ۳۴۲۶)

وَ اُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ يَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ
مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾ وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا
تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ
وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَ يَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَى
الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾

ع ۵ / ۱۷

اور (پھر یوں ہوا کہ) اس کے باغ کا سارا پھل برباد ہوگیا، نیز اس نے باغ پر جو کچھ خرچ کیا تھا، اس پر بھی ہاتھ ملتا رہ گیا اور اب وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا، وہ شخص کہنے لگا: کاش! میں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا ﴿۴۲﴾ اور اس کو کوئی ایسا گروہ میسر نہ ہوا، جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کرتا اور نہ وہ خود (اپنے کو) بچا سکا، ﴿۴۳﴾ یہاں تو سب اختیار خدائے برحق ہی کے لئے ہے، وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے ﴿۴۴﴾ اور (اے نبی!) ان سے دنیوی زندگی کی مثال بیان فرمادیجئے کہ یہ پانی کی طرح ہے، جسے ہم نے آسمان سے برسایا، پھر اس پانی سے زمین کے پودے گنجان ہوکر نکل آئے، پھر وہ ریزہ ریزہ ہوکر رہ گئے، جن کو ہوائیں اُڑائے پھرتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ﴿۱﴾ ﴿۴۵﴾ مال واولاد دنیوی زندگی کی رونقیں ہیں اور باقی رہ جانے والی نیکیاں ﴿۲﴾ آپ کے رب کے پاس ثواب کے اعتبار سے بہتر اور اُمید لگائے جانے کے اعتبار سے اچھی ہیں ﴿۴۶﴾ اور اس دن کو یاد رکھنا چاہئے جب ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ زمین کھلا میدان ہے اور ہم ان سب کو (ان کی قبروں سے نکال کر) جمع کردیں گے، ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ ﴿۳﴾ ﴿۴۷﴾

﴿۱﴾ یہ دنیا کی بے ثباتی کی مثال ہے، جیسے پودے کوشش ومحنت سے نکلتے ہیں؛ لیکن اگر ان پر کوئی آفت آجائے تو ان کے ختم ہونے میں دیر نہیں لگتی، اسی طرح دنیا میں انسان گاڑھا پسینہ بہا کر عیش وآرام کی چیزیں حاصل کرتا ہے؛ لیکن جب اللہ کو ان نعمتوں کا چھین لینا منظور ہوتا ہے تو لمحوں میں مفلس وقلاش ہوجاتا ہے، یا نعمتیں باقی رہتی ہیں اور انسان دنیا سے اُٹھالیا جاتا ہے، اس لئے دنیا کو اپنا مقصد زندگی نہیں بنالینا چاہئے۔

﴿۲﴾ یوں تو موت کے ساتھ ہی اعمال سے انسان کا رشتہ کٹ جاتا ہے؛ لیکن نیکیوں کا اجر آخرت میں باقی رہتا ہے، اسی کو باقی رہ جانے والی نیکیوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ یعنی قیامت کے دن جب پہلی بار صور پھونکا جائے گا تب تو تمام جاندار مرجائیں گے، دوسری بار صور پھونکنے کے بعد وہ منظر ہوگا ←

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ
لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا
مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ
وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ ع ٦ ٥ ١٨
مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ
بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

اور یہ سب آپ کے پروردگار کے سامنے صفیں باندھے ہوئے پیش کئے جائیں گے، (ہم کہیں گے:) آخر تم ہمارے پاس اسی طرح آپہنچے جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا،﴿۱﴾ ہاں، تم یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ ہم تم پر وہ وقت نہیں لائیں گے، جس کا وعدہ کیا گیا تھا ﴿۴۸﴾ نیز (ان کے سامنے) نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہائے ہماری شامت! اس نامۂ اعمال کا عجیب حال ہے کہ اس نے تو نہ کسی چھوٹے گناہ کو چھوڑا ہے نہ کسی بڑے گناہ کو، مگر سب کو ریکارڈ کرلیا ہے، وہ اپنے سارے اعمال کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اور آپ کے پروردگار کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے،﴿۲﴾ ﴿۴۹﴾ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب سجدہ میں گر پڑے، وہ جنات کی قوم میں سے تھا؛ چنانچہ اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی (اے آدم کی اولاد!) کیا تم مجھے چھوڑ کر شیطان کو اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو؛ حالاں کہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ ناانصافی کرنے والوں کے لئے بہت ہی بُرا بدلہ ہے۔ ﴿۵۰﴾

← جو یہاں بیان کیا گیا ہے کہ پہاڑ، ٹیلے، دریا ساری چیزیں ختم ہوجائیں گی اور پوری زمین چٹیل میدان بن جائے گی، تمام انسان اپنی اپنی قبروں سے نکل کر میدانِ حشر میں جمع ہوں گے۔

﴿۱﴾ قیامت کے دن انسان اسی طرح دوبارہ اُٹھایا جائے گا، جس طرح وہ پیدا ہوا تھا، ننگے پاؤں، ننگے بدن، بغیر ختنہ کیا ہوا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مرد وعورت سب اس طرح ہوں گے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! اس دن معاملہ اتنا سخت ہوگا کہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہوگی۔
(مسلم: کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا، حدیث نمبر: ۲۸۵۹)

﴿۲﴾ نامۂ اعمال میں انسان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا ریکارڈ موجود ہوگا، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نامۂ اعمال مقدار کے اعتبار سے اتنا چھوٹا ہو کہ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے؛ لیکن اس کی محفوظ کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ ہو کہ زندگی کی تمام ←

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ
عَضُدًا ﴿۵۱﴾ وَ يَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ
وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا
عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾ وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ ع ۱۹
اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

میں نے نہ آسمان وزمین کو بنانے کے وقت شیطان کو (مدد کے لئے) بلایا اور نہ خود ان کو پیدا کرنے کے وقت، اور میں ایسا نہیں ہوں کہ راہ حق سے بہکانے والوں کو مددگار بنالوں، ﴿۱﴾ ﴿۵۱﴾ اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ فرمائیں گے (اے شرک کرنے والو!) ذرا میرے ان شریکوں کو تو بلاؤ، جن کو تم (میرا) شریک خیال کرتے تھے، پھر وہ انھیں پکاریں گے؛ لیکن وہ ان کو کوئی جواب تک نہیں دیں گے اور ہم ان کے درمیان ایک رکاوٹ ڈال دیں گے، ﴿۲﴾ ﴿۵۲﴾ اور گناہ کرنے والے (دوزخ کی) آگ کو دیکھیں گے، وہ سمجھ لیں گے کہ وہ اسی میں گرنے والے ہیں اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے ﴿۳﴾ ﴿۵۳﴾ اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر طرح کی مثالیں طرح طرح سے بیان کردی ہیں ﴿۴﴾ اور انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ ﴿۵۴﴾

← چھوٹی بڑی باتیں اس میں موجود ہوں، انسان کا دماغ چند تولہ کا ہے، اس کا ایک مختصر سا حصہ حافظہ ہے اور اسی میں ساٹھ سال، ستر سال کے تمام واقعات، ہزاروں لوگوں کے نام، بے شمار کتابوں کے مضامین وغیرہ محفوظ ہوتے ہیں تو خالق کائنات کے لئے نامۂ اعمال کو وجود بخشنا کیا مشکل ہے؟ پھر کمپیوٹر کی ایجاد کے بعد اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہوگیا، ایک معمولی سی چپ (Chip) میں اربوں کھربوں صفحات، صورتیں اور واقعات محفوظ ہوجاتے ہیں۔

﴿۱﴾ یعنی شیطان کی اطاعت کرنے کے لئے دو صورتوں میں کوئی جواز ہوسکتا تھا، ایک یہ کہ وہ انسان کا دوست ہوتا، دوسرے: اس کو ایسی طاقت حاصل ہوتی کہ وہ اللہ کے کام میں شریک اور مددگار رہتا؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ وہ انسان کی پیدائش کے اول دن سے انسان کا دشمن ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے مدد لینے کی بات ہے تو نہ اللہ تعالیٰ کو کسی مددگار کی ضرورت ہے اور نہ اللہ نے کائنات کی تخلیق میں یا خود شیطان کے پیدا کرنے میں شیطان سے یا کسی اور سے مدد لی ہے اور اگر بالفرض مدد لیتے بھی تو نیک بندوں سے نہ کہ نافرمان اور گمراہ لوگوں سے۔

﴿۲﴾ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض دوسرے ماہرین لغت نے ''موبق'' کا ترجمہ 'حاجز' یعنی رکاوٹ سے کیا ہے، (التفسیر المنیر: ۱۵/۲۷۴) اسی لحاظ سے یہاں ترجمہ کیا گیا ہے، موبق کا ایک اور معنی 'ہلاکت کی جگہ' کے بھی ہیں، بعض حضرات نے اسی اعتبار سے ترجمہ کیا ہے اور یہ بھی درست ہے۔

﴿۳﴾ انسان جس تکلیف میں مبتلا کیا جانے والا ہو، اگر پہلے سے وہ تکلیف دکھادی جائے تو مشقت کا احساس بڑھ جاتا ہے ←

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَ یَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ
الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾ وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ
وَ یُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَ اتَّخَذُوْٓا اٰیٰتِیْ وَ مَآ اُنْذِرُوْا
هُزُوًا ﴿۵۶﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِیَ مَا قَدَّمَتْ یَدٰهُ ؕ اِنَّا
جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ
یَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

ہدایت کے آجانے کے باوجود ایمان لانے اور اپنے پروردگار سے مغفرت مانگنے سے لوگوں کو اسی بات نے روک رکھا ہے کہ ان پر بھی پہلے لوگوں کا سا معاملہ پیش آجائے، یا عذاب ان کے سامنے آجائے ﴿۱﴾ ﴿۵۵﴾ اور ہم رسولوں کو صرف اسی لئے بھیجتے ہیں کہ وہ (ایمان لانے والوں کو) خوشخبری سنائیں اور (ایمان نہ لانے والوں کو آخرت کے عذاب سے) ڈرائیں اور کفر کرنے والے ناحق جھگڑا کرتے ہیں؛ تاکہ وہ اس کے ذریعہ حق کو مٹادیں اور انھوں نے میرے احکام کو اور جس چیز (یعنی عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا ہے، اس کو مذاق بنا رکھا ہے ﴿۲﴾ ﴿۵۶﴾ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے پروردگار کے کلام کے ذریعہ نصیحت کی جائے، پھر بھی وہ اس سے منھ پھیر لے اور جو کچھ (بُرے عمل) وہ کرچکا ہے، اسے بھول جائے؟ ہم نے (ہٹ دھرمی کی وجہ سے) ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے، (کہ وہ اللہ کے کلام کو قبولیت کے جذبہ سے سن نہ سکیں) اگر آپ انھیں ہدایت کی طرف بلائیں، تب بھی وہ ہرگز کبھی درست راستہ پر نہیں آئیں گے۔ ﴿۳﴾ ﴿۵۷﴾

← اور انسان پہلے ہی سے تکلیف محسوس کرنے لگتا ہے؛ اس لئے اہل دوزخ کو پہلے ہی ان کا ٹھکانہ دکھا دیا جائے گا؛ تاکہ ان کے کرب میں اور اضافہ ہو۔

﴿۴﴾ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ کسی بات کو مثال کے ذریعہ بآسانی سمجھ جاتا ہے؛ اسی لئے قرآن مجید میں بہت سی باتوں کو مثال کے ذریعہ سمجھایا گیا ہے؛ تاکہ جو شخص جس طرح سمجھ سکتا ہو، اس طرح دین کی بات کو سمجھے، اِس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تدریس اور وعظ و نصیحت میں مثالوں کے ذریعہ کسی بات کو سمجھانا درست ہے اور تفہیم کے اس وسیلہ کو بھی استعمال کرنا چاہئے۔

﴿۱﴾ یعنی یا تو پچھلی قوموں کی طرح ایسا عذاب آئے کہ ایک ہی بار میں ان کو تباہ و برباد کردے اور یہ ہلاک ہوجائیں، یا یہ زندہ رہیں اور مختلف عذاب سے دوچار ہوتے رہیں، ایمان نہ لانے اور توبہ نہ کرنے کا گویا یہی مقصد ہے۔

﴿۲﴾ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے تو انسان کو لرز جانا چاہئے، مگر ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ جب اس سے ڈرایا جاتا ہے تو اُلٹا اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

←

وَ رَبُّكَ الۡغَفُوۡرُ ذُو الرَّحۡمَةِ ؕ لَوۡ یُؤَاخِذُهُمۡ بِمَا كَسَبُوۡا لَعَجَّلَ لَهُمُ الۡعَذَابَ ؕ بَلۡ لَّهُمۡ
مَّوۡعِدٌ لَّنۡ یَّجِدُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖ مَوۡىِٕلًا ﴿۵۸﴾ وَ تِلۡكَ الۡقُرٰۤى اَهۡلَكۡنٰهُمۡ لَمَّا ظَلَمُوۡا وَ جَعَلۡنَا
لِمَهۡلِكِهِمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۵۹﴾ؑ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤى اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ اَوۡ ع ۸ ۲۰
اَمۡضِیَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾

اور آپ کے پروردگار تو بڑے بخشنے والے اور رحمت والے ہیں، اگر اللہ ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو پکڑ لیتے تو فوراً ہی ان پر عذاب نازل کردیتے، مگر ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے، وہ اس کے مقابلہ ہرگز کوئی پناہ کی جگہ نہیں پائیں گے، ﴿۵۸﴾ اور یہ سب بستیاں ہیں کہ جب ان میں بسنے والوں نے زیادتی کی تو ہم نے انھیں ہلاک کر ڈالا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا ﴿۵۹﴾ اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کہا: میں جب تک دو دریاؤں کے سنگم تک نہ پہنچ جاؤں، چلتا رہوں گا، یا یوں ہی سالہا سال چلتا رہوں۔ ﴿۱﴾ ﴿۶۰﴾

← ﴿۳﴾ یعنی بظاہر وہ سنتے اور سمجھتے ہیں؛ لیکن انھیں ضد ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو نصیحت وعبرت کے ارادہ سے نہ سنیں گے نہ مانیں گے، یہ گویا ایک معنوی پردہ ہے جو انھوں نے اپنے دلوں پر ڈال رکھا ہے اور ایک میل کچیل ہے جس سے ان کے سننے کی صلاحیت متاثر ہوگئی ہے۔

﴿۱﴾ قرآن مجید میں ایک دلچسپ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، آیت نمبر: ۶۰ سے آیت نمبر: ۸۲ تک اسی واقعہ کی تفصیل ہے، تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ سے متعلق بہت سی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، جو زیادہ تر اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں اور ناقابل اعتبار ہیں؛ البتہ خود قرآن مجید نے یہ واقعہ خاصی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور مزید وضاحت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ہوتی ہے، جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے منقول ہے، (بخاری، باب حدیث خضر مع موسیٰ، حدیث نمبر: ۳۴۰۱) قرآن مجید کے بیان اور بخاری کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کررہے تھے، کسی صاحب نے سوال کیا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب اپنی جگہ بالکل درست تھا؛ کیوں کہ نبی اپنے عہد میں سب سے بڑا صاحب علم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل ہوتا ہے؛ لیکن تعبیر کے اعتبار سے یہ جواب اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا؛ کیوں کہ پیغمبر کے شایانِ شان بات یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے: اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ میرا ایک بندہ دو دریاؤں کے سنگم پر ملے گا، اس کا علم تم سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں ان سے کس طرح ملاقات کرسکتا ہوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مچھلی لے لو، اسے تھیلی میں رکھ کر چلو، جہاں مچھلی گم ہوجائے، وہیں ان سے ملاقات ہوگی؛ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تھیلی میں مچھلی رکھی اور اپنے خادم خاص حضرت یُوشع بن نون علیہ السلام کو ساتھ لیا، چلتے چلتے ایک چٹان پر پہنچے، یہاں دونوں لیٹ گئے، ←

← حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نیند آ گئی ، اِدھر ایک عجیب واقعہ یہ ہوا کہ مچھلی میں حرکت ہوئی اور وہ تھیلی سے نکل کر دریا میں چلی گئی اوراس کے جاتے ہوئے دریا میں ایسا راستہ بن گیا کہ گویا پانی کے اندر ایک سرنگ ہو، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے اور دونوں آگے چلے، یہاں تک کہ پوری رات چلتے رہے، جب اگلا دن آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع سے کہا: ذرا کھانا لاؤ؛ کیوں کہ سفر کے اس مرحلے میں مجھے بڑی تکان ہوگئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی منزل تک پہنچے نہیں تھے، تکان کا احساس نہیں ہوا تھا اور جب آگے بڑھ گئے، تب تکان محسوس ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کھانا مانگنے پر یوشع نے کہا: آپ کو وہ جگہ یاد ہے جہاں چٹان پر ہم لوگوں نے آرام کیا تھا؟ میں وہیں مچھلی بھول گیا اور مچھلی پانی کے اندر عجیب طریقہ سے سرنگ بناتے ہوئے چلی گئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اسی جگہ کی تو ہمیں تلاش تھی؛ چنانچہ پھر اسی راستہ سے اپنے نشاناتِ قدم دیکھتے ہوئے واپس ہوئے، ایک چٹان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب کپڑا لپیٹے ہوئے تشریف فرما ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا، ان بزرگ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ اس سرزمین میں سلام کہاں؟ یعنی اس علاقہ میں تو کوئی مسلمان ہے نہیں اور سلام کا رواج مسلمانوں میں ہے، تو تم نے کیسے سلام کیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا تعارف کرایا کہ میں موسیٰ ہوں، حضرت خضر علیہ السلام نے دریافت کیا: بنی اسرائیل والے موسیٰ؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: جی ہاں۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غرض پیش کی کہ آپ کو جو علم عطا کیا گیا ہے، مجھے بھی اس سے سرفراز فرمائیں، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: موسیٰ! میرا اور تمہارا علم ایک دوسرے سے مختلف ہے، جو علم مجھ کو ہے یعنی تکوینی اُمور کا علم، وہ آپ کو نہیں ہے، اور جو علم اللہ کی طرف سے آپ کو حاصل ہے، یعنی شریعت کا علم، وہ مجھے نہیں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ یہ ٹھیک ہے؛ لیکن کیا میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں اپنے علم کے تحت جو معاملات انجام دوں گا، وہ آپ کے لئے نا قابل برداشت ہوں گے اور آپ صبر نہیں کر پائیں گے؛ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان دلایا کہ ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ کو میرے ساتھ چلنے پر اصرار ہی ہے تو شرط یہ ہے کہ میں جو کچھ بھی کروں، آپ اس کے بارے میں کوئی سوال نہ کریں؛ البتہ میں بعد میں خود ان کی حقیقت آپ کو بتا دوں گا، اسی شرط کے ساتھ سفر شروع ہوا۔

دونوں ساحل سمندر پر چلتے رہے، ایک کشتی کا گزر ہوا، ان حضرات نے کشتی والے سے خواہش کی کہ وہ ان کو بھی سوار کر لے، کشتی کے مالک نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور نہ صرف یہ کہ سوار کر لیا؛ بلکہ کرایہ بھی نہیں لیا، کشتی چلنے کے دوران ایک گوریّا آئی اور کشتی کے کنارے بیٹھ کر اس نے سمندر میں چونچ ماری، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: موسیٰ! میرے اور تمہارے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم سے اتنی بھی نہیں ہے، جتنی اس پرندے کی چونچ میں آنے والے پانی کو اس دریا سے ہے، پھر حضرت خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑی لی اور کشتی کا ایک تختہ نکال دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رہا نہ گیا، کہنے لگے: یہ آپ نے کیا حرکت کر ڈالی، ان بیچاروں نے تو ہم سے کرایہ تک نہیں لیا اور آپ نے ان کی کشتی میں شگاف کر دیا؛ تاکہ کشتی کے سوار بھی ڈوب جائیں؟ یہ آپ نے بڑی ہی نامناسب حرکت کی ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے یاد دلایا کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ صبر نہیں کر پائیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی کہ میرا یہ سوال کرنا بھول جانے کی وجہ سے تھا اور بھول چوک پر پکڑ نہیں کی جاتی، بہرحال معاملہ رفع دفع ہوا، دریا سے کہیں خشکی پر اُترے، ایک جگہ سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ چند بچے کھیل رہے ہیں، حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک بچہ کو پکڑا ←

← اور اسے قتل کرڈالا، یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیسے برداشت ہوسکتی تھی، جن کی شریعت میں بے قصور شخص کا قتل حرام تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: آپ نے ایک معصوم اور بے گناہ شخص کو قتل کردیا، یہ تو آپ نے نہایت ہی غلط کام کیا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: پھر آپ نے سوال کرلیا؛ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ آپ صبر نہیں کرسکیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر معذرت کی کہ ایک اور موقع دے دیں، اب اگر میں نے سوال کیا تو مجھے ساتھ نہ رکھیں اور اب میری طرف سے عذر کا کوئی موقع نہیں رہے گا، بہر حال آگے چلے اور ایک گاؤں پر پہنچے، اس زمانہ میں کھانے اور رہنے سہنے کے ہوٹل نہیں ہوتے تھے، اس لئے آبادی کے لوگ مسافروں کو ٹھہراتے تھے، ان حضرات نے گاؤں والوں سے التماس کیا کہ ان کی مہمان نوازی کی جائے؛ لیکن وہ لوگ ایسے بداخلاق نکلے کہ میزبانی سے صاف انکار کردیا، گاؤں سے گزرتے ہوئے حضرت خضر علیہ السلام کی نظر ایک دیوار پر پڑی، جو جھکی ہوئی تھی اور گرنے کے قریب تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اسے ہاتھ لگایا اور دیوار درست ہوگئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ان گاؤں والوں نے تو باوجود مطالبہ کے میزبانی کرنا بھی گوارا نہیں کیا اور آپ نے مفت میں ان کی دیوار درست کردی؛ حالاں کہ آپ ان سے اُجرت تو لے سکتے تھے؟ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اب حد ہوچکی، اب ہمارا اور آپ کا ساتھ نہیں چل سکتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ اور صبر سے کام لیا ہوتا تو کچھ اور واقعات ہمارے سامنے آتے۔

اب حضرت خضر علیہ السلام نے ان واقعات کی حقیقت سے پردہ اُٹھایا، آپ نے کہا: میں نے جس کشتی میں شگاف کردیا تھا، اس کے آگے ایک ایسا ظالم بادشاہ تھا، جو زبردستی لوگوں کی کشتیاں لے لیتا تھا؛ اس لئے میں نے اس کو عیب دار کردیا؛ تاکہ اس کی کشتی بچ جائے، غالباً وہ اس طرح کی عیب دار کشتیاں نہیں لیتا رہا ہوگا —— جس بچہ کو میں نے قتل کیا اس کے والد نیک اور دین دار آدمی تھے، یہ بچہ بڑا ہوتا تو باپ کے لئے فتنہ کا باعث بنتا اور اسے بے دینی میں مبتلا کردیتا؛ اس لئے میں نے اسے قتل کردیا کہ اللہ اس کو اس کے بدلہ میں بہترین اولاد عطا فرمادیں —— جو دیوار درست کی، وہ دو یتیم بچوں کی تھی، ان کے والد نے اس دیوار کے نیچے کچھ خزانہ محفوظ کر رکھا تھا کہ جب یہ بڑے ہوں گے تو انھیں مل جائے گا —— غرض کہ حضرت خضر علیہ السلام کا عمل بھی درست تھا اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کا جو تکوینی نظام کارفرما ہے، وہ اسی پر مبنی تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ٹوکنا بھی درست تھا؛ کیوں کہ ایک رسول شریعت کا حامل بھی ہوتا ہے اور اس کا پاسبان بھی، تو جب شریعت کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو اس پر ٹوکنا اور روکنا اس کی ذمہ داری ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات جن بزرگ سے ہوئی، ان کا نام خِضَر علیہ السلام ہے، اس کی صراحت قرآن مجید میں نہیں آئی ہے، مگر بخاری کی روایت میں موجود ہے، بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کا نام 'خضر' اس لئے تھا کہ وہ جہاں بیٹھتے تھے، وہاں سبزہ اُگ آتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم یوشع بن نون کا نام بھی قرآن میں نہیں آیا؛ لیکن حدیث میں اس کی صراحت ہے، مفسرین کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ خضر اُن کا نام تھا یا لقب؟ لیکن حدیث میں خضر ہی کے لفظ سے ان کا ذکر آیا ہے؛ اس لئے اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں، اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ اللہ کے نیک بندہ اور ولی تھے یا پیغمبر تھے؟ لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے جس قسم کے عمل کئے، وہ بظاہر حکم شریعت کے خلاف تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے بغیر ایسے افعال کا مرتکب ہونا سمجھ میں نہیں آتا؛ اس لئے یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ نبی تھے نہ کہ صرف ولی، اس میں بھی اختلاف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا ان کی وفات ہوچکی؟ یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ ان کی وفات ہوچکی؛ کیوں کہ ہر انسان کو موت سے دوچار ہونا ہے اور اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے جانے کے وقت زندہ ہوتے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ←

فَلَمَّا بَلَغَا مَجۡمَعَ بَیۡنِهِمَا نَسِیَا حُوۡتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ فِی الۡبَحۡرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا
قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدۡ لَقِیۡنَا مِنۡ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَیۡتَ اِذۡ اَوَیۡنَاۤ اِلَی
الصَّخۡرَةِ فَاِنِّیۡ نَسِیۡتُ الۡحُوۡتَ ۫ وَمَاۤ اَنۡسٰنِیۡهُ اِلَّا الشَّیۡطٰنُ اَنۡ اَذۡکُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِیۡلَهٗ فِی
الۡبَحۡرِ ٭ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

پھر جب وہ دونوں اس سنگم پر پہنچ گئے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے، مچھلی نے دریا میں سرنگ کی طرح راستہ بنالیا (اور چلی گئی) ﴿۶۱﴾ پھر جب یہ دونوں آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے نوجوان (خادم) سے کہا: ہمارا ناشتہ تو لاؤ، ہمیں اپنے اس سفر میں بڑی تکان کا احساس ہورہا ہے ﴿۱﴾ ﴿۶۲﴾ اس نے جواب دیا: آپ کو اس وقت کا خیال ہے جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے؟ میں تو (اسی جگہ) مچھلی کو بھول گیا، شیطان ہی نے مجھے بھلا دیا کہ میں اس کا تذکرہ کرتا اور مچھلی نے تو عجیب طریقہ سے دریا میں اپنا راستہ بنالیا تھا۔ ﴿۲﴾ ﴿۶۳﴾

← اور آپ ﷺ کی تصدیق کرتے؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کرنی پڑتی۔

قرآن مجید نے یہ تو بتایا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی ملاقات دو دریاؤں کے سنگم پر ہوئی؛ لیکن یہ سنگم کس مقام پر واقع ہے؟ اس کی صراحت نہیں ہے، دنیا میں مختلف مقامات پر دو سمندر یا دو دریا ایک دوسرے سے ملتے ہیں؛ اس لئے مفسرین سے اس کی تعیین کے سلسلہ میں مختلف اندازے نقل کئے گئے ہیں؛ تاہم ان میں سے دو باتیں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں، ایک خلیج عَقبہ اور خلیج سُوئز کا مقام اتصال، جس کو ''رأس محمد'' کہتے ہیں اور جو جزیرہ نمائے سینا کے جنوب میں واقع ہے، ڈاکٹر شوقی ابوخلیل نے ''اطلس القرآن'' میں اسی کو ترجیح دی ہے، دوسرے: خُرطوم (سوڈان) میں دریائے نیل ابیض اور دریائے نیل ازرق کا سنگم، دونوں میں سے کوئی علاقہ اس لئے قرین قیاس ہے کہ یہ دونوں مصر اور وادی سینا سے قریب واقع ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داعیانہ جدوجہد کا مرکز مصر اور سینا کا علاقہ رہا ہے۔ واللہ اعلم

﴿۱﴾ انسان کے سامنے جب اس کی منزل ہوتی ہے تو تکان کا احسان کم ہوتا ہے؛ لیکن جب منزل سامنے نہ ہو تو سفر بوجھ بن جاتا ہے، غالباً یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔

﴿۲﴾ شیطان جن طریقوں سے انسان کو غلطی میں مبتلا کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ باتوں کو بھلا دیتا ہے، حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ یہی ہوا اور پھر پانی میں مچھلی نے سرنگ نما راستہ بنایا، جو ایک عجیب واقعہ تھا؛ تاکہ حضرت یوشع علیہ السلام (جن کو آئندہ نبوت سے نوازا جانا تھا) مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیں اور اگر یہ واقعہ فرعون کے غرق کئے جانے سے پہلے کا ہو تو اس جانب اشارہ تھا کہ جیسے مچھلی کے لئے سمندر میں راستہ بن گیا ہے، اسی طرح اہل ایمان کے لئے بھی سمندر میں راستہ بنا کر انھیں نجات دی جائے گی۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ
مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِىَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ
بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِىْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَآ اَعْصِىْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِىْ
فَلَا تَسْـَٔلْنِىْ عَنْ شَىْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ ع ۹/۲۱ ۱۱

موسیٰ نے کہا: یہی تو وہ جگہ ہے جس کی ہمیں تلاش تھی، پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس ہوئے،﴿۱﴾ ﴿۶۴﴾ چنانچہ انھوں نے (وہاں پہنچ کر) ہمارے بندوں میں سے ایک بندے (خضر) کو پایا، جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت سے نوازا تھا اور اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا کیا تھا،﴿۲﴾ ﴿۶۵﴾ موسیٰ نے ان سے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ اس مقصد کے لئے رہ سکتا ہوں کہ جو خصوصی علم آپ کو عطا کیا گیا ہے، اس میں سے مجھے بھی سکھا دیں ﴿۶۶﴾ انھوں نے کہا: تم ہرگز میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے ﴿۶۷﴾ اور جس چیز کی تم کو واقفیت نہیں ہے، اس پر تم صبر کر بھی کیسے سکتے ہو؟﴿۳﴾ ﴿۶۸﴾ موسیٰ نے کہا: انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا،﴿۴﴾ ﴿۶۹﴾ انھوں نے کہا: اگر تم کو میرے ساتھ رہنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں دریافت نہ کرنا، جب تک کہ اس کے بارے میں، میں خود ہی تم کو نہ بتا دوں۔﴿۵﴾ ﴿۷۰﴾

﴿۱﴾ اس زمانہ میں نہ سڑکیں ہوتی تھیں اور نہ راستہ کی رہنمائی کرنے والے پتھر نصب ہوتے تھے؛ اس لئے کسی منزل تک پہنچنے کے لئے قدموں کے نشان کی بڑی اہمیت تھی۔

﴿۲﴾ کائنات میں جو قدرتی واقعات پیش آتے ہیں، جیسے: طوفان، زلزلہ، گھر کا گر جانا، کسی کی موت واقع ہونا وغیرہ، ان کے علم کو 'علم تکوینی' کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو عام لوگوں سے چھپا کر رکھا ہے؛ لیکن حضرت خضر علیہ السلام کو خاص طور پر یہ علم دیا گیا تھا، اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿۳﴾ کیوں کہ بحیثیت نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بات پر مجبور تھے کہ اگر خلافِ شریعت کوئی بات دیکھیں تو اس پر روکیں اور ٹوکیں۔

﴿۴﴾ اس سے تعلیم و تعلم کا ادب معلوم ہوا کہ شاگرد اگر اپنے استاذ سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ استاذ کی کڑوی باتوں پر صبر سے کام لے اور جائز کاموں میں اس کی فرمانبرداری کرے۔

﴿۵﴾ استاذ اگر کسی مصلحت کے تحت مناسب سمجھے تو طالب علم کو سوال سے روک سکتا ہے؛ لیکن یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شکوک و شبہات کے جو کانٹے اُگتے ہیں، وہ انھیں نکالے اور مطمئن کرے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ
شَيْئًا اِمْرًا ﴿٧١﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٧٢﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ
وَ لَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا
زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا ﴿٧٤﴾

چنانچہ دونوں چلے، یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہو گئے تو ان صاحب نے کشتی میں سوراخ کر دیا، موسیٰ کہنے لگے: کیا آپ نے اس میں اسی لئے سوراخ کر دیا کہ کشتی میں سوار لوگوں کو ڈبو دیں؟ یقیناً آپ نے ایک بہت ہی نامناسب کام کیا ہے، ﴿٧١﴾ اُن صاحب نے جواب دیا: کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر پاؤ گے؟ ﴿٧٢﴾ موسیٰ نے کہا: میری بھول پر میری گرفت نہ کیجئے اور مجھ پر میرے اِس معاملہ میں زیادہ سختی نہ کیجئے، ﴿١﴾ ﴿٧٣﴾ پھر دونوں (آگے) چلے، یہاں تک کہ ان کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی، تو اُن صاحب نے اسے قتل ہی کر ڈالا، موسیٰ نے کہا: کیا آپ نے ایک بے گناہ شخص کو قتل کر ڈالا؛ حالاں کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا؟ یقیناً آپ نے بڑی ناپسندیدہ حرکت کی ہے۔ ﴿٧٤﴾

﴿١﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمت سے خطاء اور نسیان کو معاف کر دیا گیا ہے، (ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق المکرہ، حدیث نمبر: ۲۰۴۵) یہی حکم گزشتہ شریعتوں میں بھی تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تو بھول سے ہونے والی غلطی بالکل معاف ہے، جیسے نماز میں بھول ہو جائے تو اکثر صورتوں میں سجدۂ سہو کافی ہو جاتا ہے، روزہ میں بھول سے کھالے تو روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں بھول سے کوئی غلطی ہو جائے تو گناہ تو نہیں ہوگا؛ لیکن اگر اس کا بدل ادا کیا جا سکتا ہو تو بدل ادا کرنا واجب ہوگا، جیسے: کوئی شخص بھول کر کسی کی رقم خرچ کر دے تو یہ رقم واپس کرنی ہوگی۔

○ ○ ○

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ﴿٧٥﴾ قَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ عَنۡ شَىۡءٍۭ بَعۡدَهَا فَلَا تُصٰحِبۡنِىۡ ۚ قَدۡ بَلَغۡتَ مِنۡ لَّدُنِّىۡ عُذۡرًا ﴿٧٦﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ ٍ اِسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا فَوَجَدَا فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَـتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ﴿٧٧﴾ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاۡوِيۡلِ مَا لَمۡ تَسۡتَطِعۡ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ﴿٧٨﴾ اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِى الۡبَحۡرِ فَاَرَدْتُّ اَنۡ اَعِيۡبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ يَّاۡخُذُ كُلَّ سَفِيۡنَةٍ غَصۡبًا ﴿٧٩﴾ وَاَمَّا الۡغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤۡمِنَيۡنِ فَخَشِيۡنَاۤ اَنۡ يُّرۡهِقَهُمَا طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا ۚ ﴿٨٠﴾ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ زَكٰوةً وَّاَقۡرَبَ رُحۡمًا ﴿٨١﴾

ان صاحب نے کہا: کیا میں نے تم کو (پہلے ہی) کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر کر نہیں پاؤ گے؟ ﴿٧٥﴾ موسیٰ نے کہا: اگر اس کے بعد پھر میں نے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو مجھے ساتھ نہ رکھئے گا، میری طرف سے آپ معذور ہوں گے، ﴿٧٦﴾ پھر دونوں روانہ ہوئے، یہاں تک کہ ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا، ان دونوں نے گاؤں والوں سے کھانا طلب کیا تو انھوں نے ان کی میزبانی کرنے سے انکار کر دیا کہ اتنے میں انھیں اسی گاؤں میں ایک دیوار ملی جو گرنے کے قریب تھی، ان صاحب نے اس کو سیدھا کر دیا، موسیٰ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس پر مزدوری لے لیتے ﴿٧٧﴾ انھوں نے کہا: بس، اب میرے اور تمہارے درمیان علاحدگی کا وقت آ گیا، ﴿١﴾ اب میں تم کو ان باتوں کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں جن پر تم صبر نہیں کر پائے ﴿٧٨﴾ وہ جو کشتی تھی تو وہ چند غریب آدمیوں کی تھی، جو دریا میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار بنا دوں، صورتِ حال یہ تھی کہ ان کے آگے ایک بادشاہ تھا، جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا ﴿٧٩﴾ اور وہ جو لڑکا تھا تو اس کے ماں باپ مسلمان تھے تو ہم کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لڑکا اُن دونوں کو سرکشی اور کفر پر مجبور نہ کر دے ﴿٨٠﴾ تو ہم نے چاہا کہ ان کے پروردگار انھیں اس کے بدلہ ایسی اولاد عطا کر دیں، جو پاکیزگی میں اس سے بہتر اور محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو۔ ﴿٨١﴾

﴿١﴾ معلوم ہوا کہ اگر استاذ کو طالب علم کے مزاج سے مناسبت نہ ہو پائے یا وہ کوئی ایسی حرکت کر گزرے جو استاذ کے لئے قابل برداشت نہ ہو تو وہ اس کو اپنے حلقۂ درس سے باہر نکال سکتا ہے، تعلیمی اداروں میں جو بعض طلبہ کا داخلہ ختم کر دیا جاتا ہے، اس واقعہ میں گویا اس کی اصل موجود ہے۔

وَ اَمَّا الۡجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیۡنِ یَتِیۡمَیۡنِ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ وَ کَانَ تَحۡتَہٗ کَنۡزٌ لَّہُمَا وَ کَانَ اَبُوۡہُمَا
صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنۡ یَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّہُمَا وَ یَسۡتَخۡرِجَا کَنۡزَہُمَا ٭ۖ رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ ۚ وَ مَا
فَعَلۡتُہٗ عَنۡ اَمۡرِیۡ ؕ ذٰلِکَ تَاۡوِیۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعۡ عَّلَیۡہِ صَبۡرًا ﴿۸۲﴾ؑ وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنۡ ذِی ع ١٠ ١٢ ١
الۡقَرۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ سَاَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ مِّنۡہُ ذِکۡرًا ﴿۸۳﴾ؕ

اور رہ گئی دیوار، تو وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی، اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور ان کے والد نیک آدمی تھے، پس تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، یہ (ان پر) تمہارے پروردگار کی خاص رحمت تھی اور میں نے (ان میں سے) کوئی کام اپنی رائے سے نہیں کیا، ﴿۱﴾ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم سے صبر نہیں ہوسکا ﴿۸۲﴾ؑ اور وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: میں ابھی تمہارے سامنے ان کے کچھ حالات بیان کرتا ہوں۔ ﴿۲﴾ ﴿۸۳﴾ؕ

﴿۱﴾ کشتی میں شگاف پیدا کردینا اور بچہ کو قتل کردینا ایسے کام تھے جو شرعاً حرام تھے؛ اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے وضاحت کردی کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا ہے؛ بلکہ اللہ ہی کے حکم سے کیا ہے؛ کیوں کہ اللہ کی شریعت میں کسی کو تبدیلی کا حق نہیں ہے، آج کل بعض مسلم حکومتیں خلافِ شرع قانون بناتی ہیں اور بعض جھوٹے نام نہاد پیر وفقیر کہتے ہیں کہ اب میں شریعت کے احکام سے آزاد ہوگیا ہوں اور خلافِ شرع کاموں میں پڑے رہتے ہیں، یہ سب گمراہی ہے، غور کیجئے کہ حضرت خضر علیہ السلام مقامِ نبوت پر فائز ہیں، پھر بھی انھوں نے اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھی کہ شریعت کے حکم کو کوئی شخص بدل نہیں سکتا؛ البتہ میرا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے احکام ہی پر مبنی تھا۔

﴿۲﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحابِ کہف اور روح کے علاوہ ذوالقرنین کے بارے میں سوال کیا گیا تھا؛ چنانچہ آیت نمبر: ۸۳ سے ۹۹ تک ذوالقرنین کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، ''قَرن'' کے معنی سینگ کے ہیں، اس طرح ذوالقرنین کے معنی ہوئے دو سینگوں والے؛ چوں کہ ذوالقرنین نے مغرب اور مشرق میں دونوں جانب اس وقت جہاں تک رسائی ہو پائی تھی، اس کو فتح کرلیا تھا؛ اسی لئے 'ذوالقرنین' کہلائے، ذوالقرنین کا واقعہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک انصاف پرور اور بلند ہمت بادشاہ تھا، یہ پہلے اپنی فوج کے ساتھ مغرب کی جانب آگے بڑھا اور خشکی کے جس آخری حصہ تک پہنچا جاسکتا تھا، وہاں تک پہنچ گیا، سفر کی آخری منزل ایک ایسی جگہ تھی، جہاں سمندر کا گدلا کیچڑ والا پانی تھا اور سورج ڈوبتے وقت یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اسی کیچڑ میں سورج ڈوب رہا ہے، وہاں اس نے ایک ایسی قوم کو پایا، جو مسلمان نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا کہ وہ چاہیں تو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرے اور بہتر سلوک میں ایمان کی دعوت دینا بھی شامل ہے، یا ان کو سزا دے، اللہ تعالیٰ کا یہ حکم دینا یا تو کسی نبی کے واسطہ سے ہوا ہوگا یا اللہ نے ان کے دل میں القاء کیا ہوگا، ذوالقرنین نے وہ رویہ اختیار کیا، جو ایک انصاف پرور بادشاہ کا ہوسکتا تھا کہ بہتر عمل کرنے والوں کے ساتھ بہتر سلوک اور خراب عمل کرنے والوں کے ساتھ اسی کے مناسب سلوک۔ ←

← مغرب کی یہ مہم سر کرنے کے بعد اب انھوں نے مشرق کی طرف رُخ کیا، کامیابی ان کے قدم چومتی گئی، یہاں تک کہ وہ مشرق کی جانب بھی ایسی جگہ پہنچ گئے، جس کے آگے کوئی آبادی نہیں تھی، پھر اس کے بعد انھوں نے تیسری مہم شروع کی، جو علماء تفسیر اور اہل تاریخ کے بیان کے مطابق شمال کی جانب تھی، یہاں وہ ایک ایسی قوم تک پہنچے، جو اپنی زبان کے سوا کوئی اور زبان سمجھنے سے قاصر تھی، اس آبادی کے بعد فاصلہ سے دو پہاڑ تھے اور ان پہاڑوں کے پیچھے 'یاجوج ماجوج' نامی قوم تھی، یہاں کے لوگوں نے ذوالقرنین سے درخواست کی کہ اگر آپ ہمارے اور یاجوج ماجوج کے درمیان کوئی رکاوٹ کھڑی کردیں تو بڑا احسان ہوگا اور اس سلسلہ میں ہم اخراجات بھی ادا کریں گے؛ کیوں کہ یاجوج ماجوج بڑا فساد مچاتے ہیں؛ چنانچہ ذوالقرنین نے ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ کے درمیان کے خلا کو لوہے کی چادروں سے پاٹ دیا اور مزید مضبوط کرنے کے لئے اس پر لوہا پگھلا کر ڈال دیا، اس طرح یہ لوگ اِس غارت گری سے محفوظ ہوگئے، اس دیوار کی مضبوطی اور بلندی کو دیکھتے ہوئے ذوالقرنین نے کہا کہ اب یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھ پائیں گے نہ اس میں سوراخ کرسکیں گے؛ البتہ جب اللہ کا حکم ہوگا تو یہ مضبوط دیوار بھی ریزہ ریزہ ہوجائے گی۔

مغرب اور مشرق کی وہ حدیں کیا تھیں اور شمال میں دیوار کہاں بنائی گئی، خود ذوالقرنین کون شخص تھا اور یاجوج ماجوج کونسی قوم ہے؟ —— قرآن ہی میں نہیں بلکہ حدیث میں بھی اس کی زیادہ تفصیل نہیں ہے؛ البتہ مؤرخین نے تاریخی حقائق کو سامنے رکھ کر اندازے بیان کئے ہیں۔

مغرب کے بارے میں اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس زمانہ میں مغرب میں دو بڑی حکومتیں واقع تھیں، ایک ''میڈیا'' دوسری ''ریڈیا'' ذوالقرنین جن کا نام ''خورس'' بتایا جاتا ہے، انھوں نے ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ''میڈیا'' پر حملہ کردیا اور اس کے دارالحکومت ''سارڈیس'' کو فتح کرتے ہوئے مغربی ساحل پر پہنچ گئے، جس ساحل کا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور سورج کے ڈوبنے کا منظر ایسا ہوتا ہے کہ گویا اسی گدلے پانی میں سورج ڈوب رہا ہے۔

مشرق سے مراد ایران کے مشرق کا علاقہ ہے، جہاں اس زمانہ میں بعض وحشی اور خانہ بدوش قبائل تھے، جو عام طور پر مکانات نہیں بناتے ہیں، کھلے میدانوں میں خیمے لگا کر یا بغیر خیمے کے قیام کرتے ہیں، غالباً اسی لئے فرمایا گیا کہ اس قوم پر اس حال میں سورج نکلتا تھا کہ ان کے آگے کوئی آڑ نہیں تھی، یعنی دھوپ کو روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔

اس کی تیسری مہم ایران سے شمال کی جانب پیش آئی، جس میں وہ ''بحر کاسپین'' (خزر) کو داہنے جانب چھوڑتے ہوئے 'کاکیشیا' کے پہاڑی علاقہ تک پہنچ گئے، جہاں دو پہاڑوں کے درمیان ایک درّہ ہے، اس کے آگے یاجوج وماجوج تھے، یہیں انھوں نے وہ دیوار تعمیر کی، جس کو 'سدِّ ذوالقرنین' کہا جاتا ہے، درحقیقت ایشیاء کے شمالی مشرقی علاقہ میں کئی جگہ پہاڑوں کے درمیان ایسی دیواریں پائی جاتی ہیں؛ اس لئے مفسرین کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بعض لوگوں نے خود 'دیوار چین' بھی مراد لی ہے؛ لیکن قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوار ایک پہاڑ سے شروع ہوکر دوسرے پہاڑ پر ختم ہوتی ہے اور اس کی تعمیر میں لوہے اور تانبے کا استعمال کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اہل تحقیق کے نزدیک جس کا سد ذوالقرنین ہونا سب سے زیادہ قرین قیاس ہے، وہ دیوار ''قفقاز'' (Cacus) کے علاقہ داغستان میں ''دربند'' اور ''داریال'' کے درمیان واقع ہے، جو ۲۹ رفٹ اونچی، ۱۰ رفٹ چوڑی اور پچاس میل لمبی ہے۔ ←

← ذوالقرنین کس بادشاہ کا لقب ہے، اس کا اصل نام کیا تھا اور تاریخ میں جن بادشاہوں کا ذکر آیا ہے، ذوالقرنین کے لقب سے ان میں سے کونسا بادشاہ مراد ہے؟ اس سلسلہ میں یوں تو مختلف نام لئے گئے ہیں؛ لیکن تاریخی قرائن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ ایرانی بادشاہ مراد ہے، جس کو عربی میں ''خورس'' اور فارسی میں ''کوروش کبیر'' کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اس کا تلفظ "Cyrus" (سائرس) سے کیا جاتا ہے، اس کا دور عروج ۵۴۹ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے، اسی نے یہودیوں پر بخت نصر کے مظالم کے بعد یہودیوں کو دوبارہ بیت المقدس میں آباد کیا تھا؛ اسی لئے یہودی صحائف میں بھی اس فرمانروا کا ذکر خیر ملتا ہے، جہاں تک یاجوج ماجوج کی بات ہے تو قرآن مجید میں ان کی کوئی تفصیل مذکور نہیں، قرآن سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ مفسد اور غارت گر قبائل تھے، جو اپنے پڑوسیوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔

یاجوج ماجوج کے سلسلہ میں جو عجیب وغریب قسم کی باتیں منقول ہیں، نہ قرآن میں اس کا ذکر ہے نہ معتبر احادیث میں، یہ غیر معتبر اسرائیلی روایات ہیں جو کعب احبار سے منقول ہیں، یہ یہودی تھے جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، وہ یہودی مذہبی مآخذ میں نقل کئے گئے واقعات کو بھی سنایا کرتے تھے، بعض لوگوں نے ان کو اس طرح نقل کردیا کہ گویا یہ حدیث ہو؛ حالاں کہ نہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں اور نہ عقل وفطرت کے مطابق ہیں، محققین کا خیال ہے کہ وسط ایشیاء کی جو قومیں ہیں، وہ حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے سام بن نوح کی اولاد ہیں، اور شمال مشرقی ایشیاء میں جو لوگ آباد ہیں وہ 'یافث بن نوح' کی اولاد ہیں، ان ہی میں ایک نسل ''سیتھین'' کہلاتی تھی، جو جنگلی اور غیر مہذب لوگ تھے اور لوٹ مار کرتے تھے، ان ہی میں یاجوج اور ماجوج ہیں، جن کو یورپی زبان میں ''گاگ'' (GoG) اور ''مائی گاگ'' (May GoG) کہتے ہیں، چین، منگولیا اور روس وغیرہ کی آبادی دراصل اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے، حدیث سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ الگ قسم کی مخلوق ہیں یا الگ شکل وصورت کے انسان ہیں، جن روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ وہ دیوار کھودتے رہتے ہیں اور پھر دیوار برابر ہوجاتی ہے، قیامت کے قریب وہ دیوار میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور پھر زمین میں اس طرح اُبل پڑیں گے کہ پوری زمین کا پانی پی جائیں گے وغیرہ وغیرہ، اہل فن اور اصحابِ تحقیق کے نزدیک وہ نامعتبر ہیں۔

البتہ حدیث میں علاماتِ قیامت کے سلسلہ میں جو پیشین گوئیاں آئی ہیں، ان میں آخری علامتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور دجال کا عظیم فتنہ ظاہر ہوگا، آخر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مارا جائے گا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر کوہِ طور پر چلے جائیں گے، اس کے بعد یاجوج ماجوج نکلیں گے، جو اپنے شر وفساد کے ذریعہ پوری دنیا پر چھا جائیں گے، اس کے کچھ وقفہ کے بعد صور پھونکا جائے گا اور دنیا ختم کردی جائے گی، اس کی مراد یہی سمجھ میں آتی ہے کہ قربِ قیامت میں مشرق کے اس علاقہ سے کچھ وحشی قبائل اُٹھیں گے اور وسط ایشیاء تک کے علاقوں کو تباہ وتاراج کردیں گے؛ لیکن بہرحال یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان سے اُتارے جانے کے بعد پیش آئے گا اور قیامت کے بالکل قریب؛ اس لئے قادیانی حضرات کا یہ دعویٰ کہ انگریز اور روس کا تسلط یاجوج ماجوج کا خروج ہے، بالکل غلط ہے۔

(ذوالقرنین کی شخصیت نیز سد ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج پر مفسرین نے تفصیل سے قلم اُٹھایا ہے اور اُردو تفسیروں میں بھی نئی نئی معلومات کے ساتھ اس کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے، ان کتابوں کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن، اُردو دائرہ معارف اسلامیہ اور ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی اطلس القرآن میں اس پر بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، اہل ذوق ان کتابوں سے استفادہ کرسکتے ہیں)۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ
الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ
تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى
رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ اِلْحُسْنٰى
وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا
تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَ قَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ
خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾

ہم نے اسے زمین میں حکومت عطا کی اور ہر قسم کا سامان دیا، ﴿۸۴﴾ چنانچہ وہ ایک راستہ پر روانہ ہوا ﴿۸۵﴾ یہاں تک کہ جب غروب آفتاب کی جگہ تک پہنچ گیا تو آفتاب ایک کیچڑ والے چشمے میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیا اور انھوں نے وہاں ایک قوم کو پایا، ہم نے کہا: اے ذو القرنین (تمہیں اختیار ہے) چاہے تم ان کو سزا دو، یا ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو، ﴿۱﴾ ﴿۸۶﴾ ذو القرنین نے عرض کیا: جو زیادتی کرے گا تو اس کو تو ہم عنقریب سزا دیں گے، پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیا جائے گا تو اللہ اسے بڑا ہی سخت عذاب دیں گے ﴿۸۷﴾ اور جو ایمان لے آئے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کے لئے بہتر بدلہ ہوگا اور ہم اس کو ایسے احکام بجالانے کا حکم دیں گے، جو آسان ہو، ﴿۲﴾ ﴿۸۸﴾ پھر وہ ایک اور راستہ پر روانہ ہوا ﴿۸۹﴾ یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ پہنچا تو ایک ایسی قوم پر سورج نکلتے دیکھا کہ جن کے آگے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی تھی، ﴿۳﴾ ﴿۹۰﴾ یہ قصہ اسی طرح ہے، اور ذو القرنین کے پاس جو کچھ تھا، ہمیں ان سب کی پوری پوری خبر ہے، ﴿۹۱﴾ پھر وہ ایک اور راستہ پر چلا۔ ﴿۹۲﴾

﴿۱﴾ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ذو القرنین ایک صالح بادشاہ تھے نبی نہیں تھے؛ اس لئے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ ان کے ساتھ جو سلوک کرنا چاہیں کریں، جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی ''وأوحینا إلی أمّ موسیٰ'' (القصص: ۷) یہاں وحی سے مراد فرشتہ کے ذریعہ اللہ کا کلام اُتارنا نہیں ہے؛ بلکہ دل میں القاء کر دینا ہے —— یہاں بھی یہی معنیٰ مراد ہیں!

﴿۲﴾ یعنی اس کے لئے آخرت میں بھی بہتر بدلہ ہوگا اور دنیا میں بھی اس کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا۔

﴿۳﴾ یعنی وہ ایک خانہ بدوش وحشی قوم تھی، سورج کی دھوپ سے آڑ کے لئے کوئی مکان یا دیوار وغیرہ نہیں تھی اور غالباً وہ کپڑے بھی نہیں پہنتے تھے، جانوروں کی طرح بے لباس رہتے تھے۔ (مفاتیح الغیب: ۱۰/ ۳۸۷)

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا
يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ
تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ
وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ ۙ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ
حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ ؕ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا
اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ
رَبِّىْ حَقًّا ﴿۹۸﴾ ؕ وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىٕذٍ يَّمُوْجُ فِىْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ ۙ

یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان کے پیچھے ایک ایسی قوم کو پایا، جو مشکل ہی سے کوئی بات سمجھ پاتے تھے ﴿۱﴾ ﴿۹۳﴾ انھوں نے کہا: اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج نے اس علاقہ میں بڑا فساد مچا رکھا ہے، کیا ہم آپ کے لئے کچھ ٹیکس مقرر کردیں؛ بشرطیکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنادیں ﴿۹۴﴾ ذوالقرنین نے کہا: میرے پروردگار نے مجھے جو دے رکھا ہے وہ بہتر ہے؛ لہٰذا تم جسمانی محنت سے میری مدد کرو، ﴿۲﴾ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنادوں گا ﴿۹۵﴾ میرے پاس لوہے کی چادریں لے آؤ، یہاں تک کہ جب دونوں پہاڑوں کے درمیان خلا کو پاٹ دیا تو حکم دیا کہ (آگ) دہکاؤ، یہاں تک کہ جب انھیں آگ بنادیا تو کہا: میرے پاس (ضروری سامان) لاؤ کہ اس پر پگھلا ہوا تانبہ اُنڈیل دوں ﴿۹۶﴾ پھر یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ اس میں سوراخ کرسکیں ﴿۹۷﴾ ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اسے ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے، ﴿۳﴾ ﴿۹۸﴾ اور ہم اس دن انھیں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونکا جائے گا، پھر ہم سب کو ایک ایک کرکے اکٹھا کرلیں گے۔ ﴿۴﴾ ﴿۹۹﴾

﴿۱﴾ یعنی وہ اپنی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان اور خاص کر ذوالقرنین کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔

﴿۲﴾ یعنی تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے؛ البتہ تم ہاتھ پاؤں سے مدد کرو۔

﴿۳﴾ یعنی حفاظت کی انسانی تدبیر تو ہم نے کردی ہے؛ لیکن اللہ کے حکم کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہیں، جب اللہ کا حکم ہوگا تو لوہے اور تانبے کی یہ دیوار بھی ایک لمحہ میں ریزہ ریزہ ہوکر ختم ہوجائے گی۔

﴿۴﴾ مطلب یہ ہے کہ اب قیامت تک یاجوج ماجوج کے مختلف قبائل ایک دوسرے سے برسرپیکار رہیں گے، جیسے موجیں کبھی ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے علاحدہ ہوتی ہیں، یہی حال ان دونوں قوموں کا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کا صور پھونک دیا جائے گا اور آخرت کا نظام قائم کردیا جائے گا۔

وَّعَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۙ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ
وَكَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا ۙ﴿۱۰۱﴾ اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا عِبَادِىۡ مِنۡ دُوۡنِىۡۤ ع ۱۹ / ۲
اَوۡلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُمۡ بِالۡاَخۡسَرِيۡنَ اَعۡمَالًا ؕ﴿۱۰۳﴾
اَلَّذِيۡنَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ يَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ يُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾
اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ
الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾

اوراس دن ہم دوزخ کواُن کفر کرنے والوں کے بالکل سامنے لے آئیں گے ﴿۱۰۰﴾ جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ (اللہ تعالیٰ کی باتوں کو قبول کرنے کے جذبہ سے) سن بھی نہیں سکتے تھے ﴿۱۰۱﴾ کیا پھر بھی جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان لوگوں کا خیال یہی ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز بنالیں؟ ہم نے بھی کفر کرنے والوں کی مہمانی کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے، ﴿۱﴾ ﴿۱۰۲﴾ آپ کہہ دیجئے: کیا ہم تمہیں بتادیں کہ عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارہ میں کون لوگ ہیں؟ ﴿۱۰۳﴾ وہ لوگ جن کی دنیوی زندگی کی تمام کوششیں بے کار ہوگئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑے اچھے کام کررہے ہیں، ﴿۲﴾ ﴿۱۰۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی نشانیوں کا اور اس کی ملاقات کا انکار کرتے رہے؛ اس لئے ان کے سارے کام اکارت ہوکر رہ گئے؛ لٰہذا قیامت کے دن ہم ان کے لئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ ﴿۳﴾ ﴿۱۰۵﴾

﴿۱﴾ مہمان نوازی تو اچھی چیز سے کی جاتی ہے، یہاں یہ تعبیر طنز کے طور پر ہے۔

﴿۲﴾ کسی فرد یا قوم کے لئے سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ وہ غلط راستہ اختیار کرے اور اس خوش فہمی میں رہے کہ انھوں نے بہت صحیح راہ اختیار کر رکھی ہے۔

﴿۳﴾ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ جو شخص ایمان سے محروم ہو، اگر وہ دنیا میں انسانی خدمت اور اخلاقی مروت کے اعتبار سے کچھ اچھے کام کر جائے، تب بھی آخرت میں ان کے اس عمل پر کوئی اجر نہیں ملے گا، بھلے ہی دنیا میں دولت اور عزت کی شکل میں انھیں کچھ فائدہ پہنچ جائے، دوسرے: جو لوگ ایمان ہی سے محروم ہیں، قیامت میں ان کے اعمال تولے نہیں جائیں گے؛ کیوں کہ ان کا دوزخی ہونا متعین ہے، جن اہل ایمان کی نیکیاں بھی ہوں اور برائیاں بھی، ان کے لئے ترازو قائم کی جائے گی؛ تاکہ ان کو دکھا دیا جائے کہ ان کی نیکیاں زیادہ ہیں یا برائیاں؟ اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن ہم ایمان نہ لانے والوں کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال کو کوئی وزن نہیں دیں گے اور اللہ کی نظر میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔ (مفاتیح الغیب: ۱۰/ ۴۸۷)

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَ اتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَ رُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا
حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ
جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ
كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۲ ۹ ۴

یہی ان کا بدلہ ہے یعنی دوزخ؛ اس لئے کہ انھوں نے کفر کیا تھا اور میری باتوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق اُڑایا تھا ﴿۱۰۶﴾
بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے، ان کی مہمان نوازی کے لئے فردوس کے باغات ہوں گے ﴿۱۰۷﴾
وہ ہمیشہ اسی میں رہا کریں گے، وہ وہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہیں گے، ﴿۱﴾ ﴿۱۰۸﴾ آپ کہہ دیجئے: اگر میرے
پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو جائے تب بھی سمندر ختم ہو جائے گا، میرے پروردگار کی باتیں ختم
نہیں ہوں گی؛ اگر چہ کہ اسی کے جیسا ایک اور سمندر بھی وہ مدد کے لئے لے آئیں، ﴿۲﴾ ﴿۱۰۹﴾ آپ کہہ دیجئے: یقیناً
میں بھی تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں (البتہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے،
پس جس کو اپنے پروردگار سے ملاقات کا یقین ہو، اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں
کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ ﴿۱۱۰﴾

﴿۱﴾ دنیا میں کوئی کتنی بھی اچھی جگہ ہو؛ لیکن آدمی کچھ عرصہ رہنے کے بعد اُکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہے، مگر جنت ایسی خوشگوار جگہ ہوگی کہ جنتی وہاں سے کہیں اور جانا ہی نہیں چاہے گا۔

﴿۲﴾ سمندر سے سارے سمندر مراد ہیں؛ کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کے مقابلہ یہ سب مل کر بھی ناکافی ہیں۔